اردو کا علمی و ادبی ماہوار
رسالہ
ادبی دنیا
مشرق و مغرب کے جدید و قدیم ادبیات کا مرقع
مارچ ۱۹۳۰ء
ڈائرکٹر:- آنریبل جسٹس سر عبدالقادر
ایڈیٹر:- تاجور نجیب آبادی
سالانہ چندہ چار روپے بارہ آنہ مع محصول ڈاک

رجسٹرڈ **فہرست مضامین** ایل نمبر ۲۴۸۲

جلد ۲ | بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء | نمبر ۳

تصاویر:- (۱) لیلیٰ مجنوں (سہ رنگی) (۲) نورجہاں (چہار رنگی) (۳) زارانِ روس کا مدفن (یک رنگی) (۴) لعبتِ چین۔ (۵) حسن قرطبہ (۶) قانون دان اور انصاف (۷) ڈاکٹر اور موت (۸) وسط ایشیا کی ایک شہزادی۔

--- + ---

ملکۂ نور جہاں

ہے تجھ پر ہند نازاں نازشِ ہندوستاں تو ہے   نہیں کچھ ہند ہی پر منحصر نورِ جہاں تو ہے
جہاں اِک پیکرِ بیجاں ہے اِس پیکر میں جاں تو ہے   جہاں اِک آسماں ہے آفتابِ آسماں تو ہے

ترا حسنِ جہاں آرا جہاں افروزِ الفت ہے
ترا مہرِ تجلّی آسماں افروزِ الفت ہے

درخشاں سطحِ راوی پر ہے تیری آب و تاب اب تک   درخشانی ہے تیری سرمۂ چشمِ حباب اب تک
ترے نظّارے ہیں آسودۂ آغوشِ آب اب تک   ہے تیرا منتظر پانی میں عکسِ آفتاب اب تک

لبِ راوی کسی دن دیکھ پائی تھی جھلک تیری
کلیجے سے لگائے پھرتی ہیں موجیں چمک تیری

جہانداری کو تیری مانتا ہے ہر عقیل اب بھی   ہیں تیرے کارنامے کامرانی کی دلیل اب بھی
مسلّم کشور آرائی تری بے قال و قیل اب بھی   مورخ کی زباں پر ہے ترا ذکرِ جمیل اب بھی

زمیں گیری نے تیری کی ہے حاصل آسماں گیری
شکستہ قبر تیری دیتی ہے درسِ جہاں گیری

لگی ہے چپ تجھے لیکن زبانِ حال گویا ہے   تری خاموشیِ مرقد میں بھی اک بات پیدا ہے
تو زیرِ خاک ہے پھر بھی زیارت گاہِ دنیا ہے   شکستہ قبر تیری کعبۂ چشمِ تماشا ہے

زمینِ شاہدرہ! تو ہے حریفِ چرخِ مینائی
کہ تجھ میں دفن ہے ہندوستاں کی کشور آرائی

تاجور

رسالہ ادبی دنیا لاہور

ملکہ نور جہاں

قانون اور انصاف

موت اور آدمی

حال وقال

آنریبل جسٹس سر عبدالقادر

ناظرین ادبی دنیا یہ مژدۂ جانفزا سُن کر خوش ہونگے کہ ادبی دنیا کے محترم نگراں سر عبدالقادر پنجاب ہائی کورٹ کی ججی کے منصب پر سرفراز کیے گئے ہیں۔

شیخ صاحب کے اس شاندار اعزاز میں اُن کے ساتھ اُن کا ملک عموماً اور ملک کا علمی و ادبی طبقہ خصوصاً حصہ دار ہوگا کہ اُن کی ذات ملک کے لئے عام طور پر اور علمی و ادبی طبقے کے واسطے خاص طور پر باعث عزت و افتخار ہے۔ رسالہ ادبی دنیا کے لئے یہ امتیاز اُس کی سرشان اور خصوصیت سے زیادہ بلند اور گراں مایہ ہے کہ اُس کا ڈائرکٹر بین الاقوامی شہرت کا مالک اور ملک کی بڑی سے بڑی عزت سے سرفراز ہے۔ ہم اس گرانقدر اعزاز پر اپنی جانب سے اپنے اسٹاف اور ادبی دنیا کے لاکھوں ناظرین کی طرف سے سر موصوف کو ہدیۂ مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہم ملک کے علمی ادبی و تعلیمی خدمات انجام دینے والے طبقوں کی طرف سے پنجاب ہائی کورٹ کے تمام آنریبل ججوں اور آنریبل چیف جسٹس سر شادی لال قبلہ کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے اس منصب جلیلہ کے لئے سر عبدالقادر کا انتخاب فرما کر اپنی قدر شناسی کا ثبوت دیا۔

ملک کی تمام ادبی علمی و تعلیمی مجالس و ادارات کو آنریبل چیف جسٹس کے شکریہ کی قرارداد منظور کر کے برقی پیغامات کے ذریعہ ان تک پہونچانی چاہئے۔

رسالہ ادبی دنیا کی مانگ ملک کے ہر گوشے میں بڑھ رہی ہے۔ ہندوستان سے باہر انگلستان، فرانس امریکہ اور افریقہ کے اُن حصوں سے خریداروں کی درخواستیں پیہم چلی آرہی ہیں۔ جہاں ہندوستانی باشندے بودوباش رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں ہر طبقہ اس کا استقبال کر رہا ہے۔ غریب کلرکوں، ٹیچروں، طالبعلموں، دکانداروں، دستکاروں سے لیکر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر، یونیورسٹیوں کے چانسلر اور وائس چانسلر۔ کونسلوں کے ممبر حکومت اور ریاستوں کے وزیر تک ادبی دنیا کے مستقل طور پر خریدار ہیں۔

اس ہر دلعزیزی کی انتہا اس پر ہوتی ہے کہ ملک کے جن اخبارات و رسائل سے ہم عدم گنجائش یا زبان فہم نہ ہونے کے سبب تبادلہ منظور نہیں کر سکے۔ اُن کے محترم ایڈیٹروں نے خریدار بن کر ادبی دنیا کو قبول کرنا ضروری سمجھا۔

محترم ملک نواب مسعود جنگ بہادر وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی ادبی دنیا کو ترقی دینے میں مربیانہ امداد فرما رہے ہیں۔ آنریبل مرزا محمد اسمٰعیل صاحب قبلہ دیوان (وزیر اعظم) میسور ادبی دنیا کو خاص طور پر پسند فرماتے ہیں۔ ادبی دنیا کے رجسٹر خریداروں کو آپ کے نام گرامی سے بھی شرف حاصل ہے۔ آنریبل خان بہادر سر شہاب الدین پریذیڈنٹ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا ارشاد ہے کہ

"ادبی دنیا جیسے پرچے کی اشاعت تو کم از کم پندرہ ہزار ہونی چاہئے"

ادبی دنیا پر ان گراں پایہ حضرات کی توجہ کے ساتھ اُن نادار اور ادبی ذوق کے فہیدوں کے خطوط بھی التفات طلب ہیں جو لکھتے ہیں کہ اپنے ذاتی خرچ میں سے دو دو چار چار آنے جوڑ کر جمع کئے ہیں تاکہ ادبی دنیا کو خرید سکوں" غریب مدرسوں اور نادار طالبعلموں کے خطوط اس مضمون کے آئے دن آتے رہتے ہیں۔

ادبی دنیا کی یہ حیرتناک ہمہ گیری و ہمہ رسی ہمارے وہم وخیال میں بھی نہ تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ملک میں اپنے خدمتگذاروں کی قدر افزائی کا جذبہ عام ہو رہا ہے۔ اور یہ کہ اصل و نقل اور نور و ظلمت میں امتیاز قائم کرنے والوں کی ملک میں کمی نہیں ہے۔

ہندوستانی یونیورسٹیاں

ہندوستانی یونیورسٹیوں کی تعلیمی تحریکات کے متعلق ہم ایک سلسلۂ مضامین جاری کرنا چاہتے ہیں تاکہ ملک کے اس طبقے کو جو انگریزی زبان سے آشنا نہیں۔ ملک کے تعلیمی اداروں کی خدمات سے باخبر رکھا جا سکے۔ اس سلسلے میں ہم ہندوستانی یونیورسٹیوں کے ارباب حل وعقد سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی اپنی یونیورسٹی کی [illegible] تعلیمی پروگرام [illegible] فرمائیں۔

ایڈیٹر

آئینۂ عالم

لاسلکی اور تعلیم

انگلستان کے ایک علاقے میں ایک سال تک لاسلکی اسباق بطور تجربہ جاری رہے۔ تجربے کے بعد چالیس میں سے ۲۴ اسکولوں نے یہ تصریح کی ہے کہ آجکل تعلیم میں لاسلکی سے مدد لینا بہت بڑے تعلیمی نقصان کا باعث ہے۔ وہاں کے اساتذہ کی رائے میں لاسلکی اسباق سے مندرجہ ذیل فوائد ہوتے:-

۱۔ طلبہ کو حالات کے مطابق درست واقفیت بہم پہنچی۔
۲۔ طلبہ کی علمی اور ذہنی سرگرمیوں میں نمایاں طور پر شوق اور توجہ کا عنصر پیدا ہوگیا۔
۳۔ طلبہ کے دل و دماغ پر مفید مطلب اور مستحکم معلومات نقش کئے جا سکے۔
۴۔ ہوشیار طلبہ میں ذاتی کوشش سے معلومات بڑھانے کا شوق پیدا ہوگیا۔
۵۔ ایسے معلومات اور رائیں مہیا کی گئیں۔ جن کا مہیا کرنا مقامی اساتذہ کے لئے بیحد مشکل تھا۔
۶۔ نئے اسباق کی خاطر اساتذہ کے لئے نئے خیالات اور نئے موضوع مہیا کئے گئے۔
۷۔ بہت سے والدین اور سرپرست اپنے بچوں کی تعلیم میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔

مریخ تک پرواز

اوکلینڈ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر مسٹر الورٹ ہنٹ ایک ایسی مشین کی تعمیر میں مصروف ہیں جو انہیں مریخ تک پہنچا دیگی۔ مسٹر ہنٹ سے پہلے کئی ماہرین طبعیات ایسی مشین بنانے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ لیکن مسٹر ہنٹ کی مشین سب سے جداگانہ اور اسقدر تیز رفتار ہے کہ اپنے خیال کے مطابق وہ اس پر سوار ہو کر صرف پانچ منٹ میں مریخ تک پہنچ جائیں گے۔ یہ مشین ایک موٹر کی وضع کی ہوگی۔ اور بجلی یا تیل کے بدلے ایتھر کی فضائی لہروں سے حرکت کریگی۔ یہ تو خدا ہی کو معلوم ہے کہ مسٹر ہنٹ اپنی مہم میں کامیاب ہونگے یا ناکام مگر ان کی ہمت اور بلند پروازی بہر حال قابل داد ہے۔

انصاف کی قیمت

انگلستان کے ایک معمولی مقدمے میں فریقین کو ۳۲ پونڈ اور ۷۰ پونڈ اپنے اپنے وکلا کو بطور فیس ادا کرنے پڑے۔ اس تلخ حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہاں کے ایک فاضل جج مسٹر اسکروٹن ارشاد فرماتے ہیں:-

"اگر وکیلوں کی فیس کا معیار یہی رہا تو پھر عدالتوں کو بند ہی کرنا پڑیگا۔ کیونکہ عام لوگ اتنی گراں قیمت پر انصاف حاصل کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔"

ان اخراجات کو اُس ملک کے لوگوں کے لئے ناقابل برداشت بتایا گیا ہے جس میں روزانہ آمدنی فی کس ۶ روپیہ ۱۲ آنے ہے۔ اور اوسطاً ہر آدمی کے پاس ۳۵۰۰ روپے جمع ہیں۔ ذرا ہندوستانیوں کی بے بسی پر بھی غور کیجئے۔ جن کی روزانہ آمدنی فی کس چند پیسوں سے زیادہ نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں زندگی کے بعد سب سے گراں چیز انصاف ہے۔ اردو زبان کی یہ مثل کہ "مقدمے میں جو جیتا وہ ہارا جو ہارا وہ تباہ ہوا" ہندوستان میں انصاف کی گرانی پر اچھی طرح روشنی ڈال رہی ہے۔

روئی کا ایک جدید پودا

نو سال ہوئے برٹش گائنا کے سیاح محققین کی ایک جماعت نے ایک چڑیا کو دیکھا کہ روئی جیسی ایک چیز سے اپنا گھونسلا بنا رہی ہے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ ایک ایسے پودے کے ریشے ہیں جو اب تک بیکار سمجھا جاتا تھا۔ اس انکشاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج سینکڑوں ایکڑ کے رقبے میں اس جدید پودے کی کاشت ہو رہی ہے۔

صدیق طبیب

حالی کی تنقید نگاری

مندرجہ ذیل مضمون پروفیسر سوہن پال سنگھ ایم۔ اے سینیر پروفیسر انگلش دیال سنگھ کالج لاہور کی فکر ہنگامہ پرور کا نتیجہ ہے ۔ اور اصابت رائے اور تحقیق و تدقیق کا ایک نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔ ناظرین کرام کو یاد ہوگا کہ اس سے پہلے آپ کے قلم سے ادبی دنیا میں ایک تنقید "پنجاب میں اردو" مولفہ حافظ محمود خاں صاحب شیرانی پر شائع ہو چکی ہے ۔ اس محققانہ تنقید کو پڑھ کر اردو زبان کے وطن کے متعلق "پنجاب میں اردو" کے غیر تاریخی نظریئے بے اصل و بے اثر ہو جاتے ہیں۔

مندرجہ ذیل مضمون جس انداز میں لکھا گیا ہے اس سے ثابت ہے کہ مضمون نگار اعاظم پرستی کے مرض میں مبتلا نہیں ہے۔ اور جو کچھ لکھتا ہے جانچ تول کر لکھتا ہے ۔

اس مضمون کی اشاعت کے سلسلے میں یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ کہ ادارت کلیتہً پروفیسر صاحب موصوف کے نتائج سے متفق نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری کا مقصد تخلیق حسن و جمال ہے اور شعر کو معاشرتی یا اخلاقی پہلو سے جانچنا ایک بنیادی غلطی ہے لیکن مولینا حالی کا مقصد یہ نہ تھا کہ شاعری کو محض معاشرتی اور قومی اصلاح کا ذریعہ بنا لیا جائے ۔ اور اسے انہیں اعتبارات سے جانچا بھی جائے ان کا مقصد تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف اس حقیقت کی توضیح کر دیں کہ "شاعری" اور "صداقت" متضاد نہیں ہیں۔ اور شاعری پر تخلیق جمال کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد مترتب ہوتے ہیں ۔ اب اگر ایک چیز حسین بھی ہو اور سودمند بھی تو ظاہر ہے کہ محض سودمند ہونے سے اس کے حسن میں کوئی فرق نہ آئیگا ۔

فاضل مضمون نگار خود تسلیم کرتے ہیں کہ جس زمانے میں "مقدمہ حالی" لکھا گیا اس وقت کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ کتاب اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم رتبہ رکھتی ہے ۔

سچ تو یہ ہے کہ تنقید سے قطع نظر مقدمے میں اور کئی ایسی دلچسپیاں موجود ہیں ۔ جن کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت اور اہمیت میں کبھی فرق نہیں آ سکتا ——— ایڈیٹر

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں تنقید نگاری کا چنداں ذوق نہیں۔ مولینا حالی کو اس لحاظ سے ایک امتیازی درجہ حاصل ہے۔ کہ آپ نے اردو علم ادب کی تنقید کے میدان میں سب سے پہلے قدم رکھا۔ اگر اس زمانہ پر غور کیا جائے ۔جب اس مقدمہ کو تحریری جامہ پہنایا جا رہا تھا (اردو ادب کا دور تغیر) تو یہ تصنیف یقیناً حیرت انگیز ثابت ہوگی۔ حالی کوئی معمولی درجے کا شاعر نہیں ہے ۔ اردو نظم میں ایک نئے دور کی بنیاد رکھنے کا سہرا آپ اور مولینا آزاد ہی کے سر بندھتا ہے۔

ان کے مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے کی دقیانوسی شاعری کی مخالفت اور اس کی بجائے "نیچرل شاعری" کی حمایت شروع کر دی تھی۔ وہ شاعر بھی ہے اور نقاد بھی ۔ اور قوت تخلیق و تحقیق کا یہ اجتماع علم ادب میں عموماً بہت کم ہوتا ہے ۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ نظم کا بہترین نقاد خود شاعر ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ قول بذات خود دلفریب ہے۔ مگر اس میں حقیقت کا مشائبہ تک نہیں شاعر شاذونادر ہی نقاد ہوتے ہیں۔ بعض بڑے بڑے شاعر بہت برے نقاد تھے۔ کوئی خاص بات ضرور ہے جس کے باعث قوت نقد اور قوت تخلیق کمتر ایک شخص میں جمع ہوتی ہیں ۔

کی تصنیفات سے بھی تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اجتماع کمیاب ہے ۔ حالی کے مقدمہ کے مطالعہ سے بھی اس خیال کی صداقت کی تصدیق ہوتی ہے ۔

حالی کے مقدمے کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔

(۱) نظم کی نوعیت اور اثر کے متعلق حالی کی رائے۔

(۲) اردو نظم کی موجودہ حالت کے متعلق حالی کے خیالات ۔

(۳) اردو غزل قصیدہ اور مثنوی کی اصلاح کے متعلق مولینا حالی کے مشورے ان حصوں میں سے پہلا حصہ یعنی وہ حصہ جس میں حالی نے نظم کی نوعیت اور اثر پر اظہار خیال کیا ہے کم تسلی بخش ہے اس

حصہ میں مولانا حالی نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُن کو انگریز مصنفین سے بھی یک گونہ واقفیت ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی ادب کے مطالعے نے ان کی قوت نقد کو زیادہ فائدہ نہیں پہنچایا۔ انہوں نے انگریز مصنفوں کے بعض خیالات کو بلا حجت قبول کر لیا ہے اور زیادہ غور کئے بغیر انہوں نے ان خیالات کو اس کتاب میں پیش کر دیا ہے اکثر جگہ انہوں نے بے جوڑ اور غیر متعلق حوالے دئے ہیں۔ پہلے پہل تو انہوں نے یہ کہا ہے کہ افلاطون نے اپنی ریپبلک (جمہوری طرز کی حکومت) سے شاعروں کو نکال دیا ہے پھر کسی ظاہری مقصد کے بغیر اس بے جان نظریہ کو پیش کر دیا ہے جس کی تلقین مکالے نے کی ہے یعنی یہ کہ نظم کی ترقی جہالت اور تاریکی کے زمانے میں ہوا کرتی ہے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ شاعرانہ وصف کا برا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ پھر انہوں نے اس قیاس کا حوالہ دیا ہے۔ کہ شاعر پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر اس کی صداقت کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ بعض اوقات بچے نظم کو موزوں پڑھ لیتے ہیں۔ حالانکہ بعض لکھے پڑھے آدمی نظم کو صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ پھر وہ نظم کی طاقت کی تشریح کرتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے استعمال کی قدر کرتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

"الغرض یورپ میں لوگوں نے شعر سے بڑے بڑے کام لئے خصوصاً ڈراماٹک پوئٹری (ڈرامے کی نظم) نے یورپ کو جسقدر فائدہ پہنچایا ہے اس کا اندازہ کرنا نہایت مشکل ہے اس واسطے شیکسپیر کے ڈرامے جن سے پولیٹیکل سوشیل اور مورل ہر طرح کے بیشمار فائدے اہل یورپ کو پہنچے ہیں بائیبل کے ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں۔ بلکہ جو لوگ مذہب کی قید سے آزاد ہیں وہ ان کو بائیبل سے بھی زیادہ سودمند اور فائدہ رساں خیال کرتے ہیں"

حالی مرحوم کے تنقیدی فتووں کا یہ پہلا نمونہ ہے۔ وہ نظم کی قدر اس کے اخلاقی ملکی اور معاشرتی فوائد کی خاطر کرتے ہیں۔ آج یورپ کی تنقید نگاری میں نظم کے اثر کے متعلق دو نظریے رائج ہیں پہلے نظریے کے مطابق نظم کا مقصد باقی فنون لطیفہ کی طرح تخلیق حسن ہے۔ دوسرے نظریے کے مطابق اس کا مقصد صرف تہذیب اخلاق ہے۔ قابل غور یہ امر ہے کہ نظم کے اخلاقی نظریے کے بڑے حامی اُن فوائد کا دعوےٰ نہیں کرتے جن کا حالی نے شیکسپیر کے ڈراموں کے بارے میں کیا ہے اگر شیکسپیر کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اس کی تصانیف کا مطالعہ ان کے ملکی مجلسی اخلاقی اور دیگر فوائد کی خاطر کیا جاتا ہے۔ تو وہ خواب موت سے بیدار ہو جائے۔ قدرت کی خوبصورت اشیا کی طرح فنون لطیفہ کے شاہکاروں کا اثر بھی گہرا اور دیرپا ہوتا ہے مگر ارباب فن براہ راست وعظ نہیں کرتے اور اگر وہ وعظ کرنا شروع کر دیں تو وہ حسن اور خوبی نہیں رہتی۔ نظم کے اثر کے متعلق حالی مرحوم کے خیالات بھی اس بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ ہندوستان میں اکثر لوگوں کے لئے یہ امر ناممکن ہے کہ کسی خوبصورت چیز پر بحث کرنے میں اخلاقی معیار سے بلند تر ہو جائیں وہ اپنے احساسات کا مطالعہ کبھی نہیں کرتے ان کو اس بات کا احساس شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ کہ وہ کسی خوبصورت چیز کی تعریف کیوں کرتے ہیں۔

حالی مرحوم نے خود دو قسم کی نظمیں لکھی ہیں۔ ایک قسم کی نظمیں تو صریحاً اخلاقی ہیں ان نظموں کو منظوم وعظ خیال کیا جا سکتا ہے۔ دوسری قسم کی نظمیں پرانے رنگ میں لکھی ہیں اور اسی طرز کو انہوں نے ترک کرنے کی کوشش کی۔ باذاق ناظرین خود اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کے مندرجہ ذیل اشعار میں سے کونسے اشعار زیادہ اثر آفریں ہیں۔

ا- اُن کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کسی سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت

ب- تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح
واں پاؤں جمانے کے لئے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اس کے تھی یہ مشورہ دیتی
یہ حرف سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو

اپنے دیوان کے دیباچہ میں اس نظریے میں ترمیم کی ہے لیکن وہ واعظ و ناصح کو شاعر سے زیادہ بلند مرتبہ خیال کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:-

"........ مگر پھر بھی اس کو واعظ و ناصح کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ناصح کی غرض براہ راست ارشاد و ہدایت ہوتی ہے بخلاف شاعر کے کہ اس کا اصلی مقصود فطرت انسانی کی کرید ہے"

یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ شاعروں کو اپنے نظریے بھی شاذ و نادر ہی یاد رہتے ہیں۔ ورنہ وہ اس وقت نظم کی بجائے وعظ و فلسفہ کے دریا میں غرق ہو جاتے نظم کے اثر کے بارے

میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نہ تو وہ اخلاقی ہے اور نہ فلسفیانہ۔ وہ ایک رنگ حسن لئے ہوئے ہے۔ اگر شاعر اخلاق کی تلقین کرتے ہیں تو ان کو اس بات کا علم ہی نہیں کہ وہ ایسا کر رہے ہیں۔

چند صفحوں کے بعد وہ صاف طور پر اخلاق اور نظم کے گہرے تعلق کا بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

"شعر اگرچہ براہِ راست علم اخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا لیکن از روئے انصاف اس کو علم اخلاق کا نائب مناب، اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں"

وہ نظم کو باعث تصفیہ نفس و تزکیہ باطن اور وسیلہ قرب الٰہی خیال کرتے ہیں۔

اس امر کو فراموش نہیں کر دینا چاہیئے کہ نظم نہ تو اخلاقی تعلیم کا ذریعہ ہے نہ کھانے کے بعد کی تفریح اور نہ فنِ لطیف کے برائے نام عاشقوں کا کھلونا۔ حالی مرحوم نے جھوٹی یا بری شاعری پر چند صفحوں میں بحث کی ہے۔ جھوٹی شاعری سے ان کی مراد ایسی شاعری ہے جس میں خوشامد اور جھوٹی تعریف اور تقلیدی عشق یا متقدمین کی عشقیہ نظم کی شاندار نقل کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا جس میں

"خیالات میں۔ الفاظ میں۔ تراکیب میں اسالیب میں استعارات میں بحر میں، قافیہ میں، ردیف میں، غرضیکہ ہر ایک بات اور ہر ایک چیز میں انہوں نے ان کے قدم بقدم چلنا اختیار کیا۔"

اگرچہ نظم کے سلسلہ میں اخلاقی صفات مثلاً جھوٹی اور بری کا استعمال بے محل ہے تاہم اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جھوٹی شاعری سے ان کی مراد ایسی شاعری ہے جس میں اصلیت کا نام تک نہ ہو جس میں دوسروں کے خیالات جذبات اور احساسات کو ایسے الفاظ میں دھرایا جاتا ہے جو کم و بیش موزوں ہوتے ہیں اس قسم کی شے نظم نہیں ہوا کرتی یہ کوئی فن نہیں ہے۔ یہ زوال پزیر نظم ہے یہاں تک تو حالی مرحوم سچ کہتے ہیں لیکن بعد میں آگے چل کر وہ پھر اپنے اسی خیال میں غلطاں و پیچاں ہو جاتے ہیں جو سوسائٹی پر ایسی نظم کے اثر کے متعلق ان کے دماغ میں سمایا ہوا تھا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ علم ادب اور زبان کی ترقی کے لئے زوال پذیر بے سلیقہ اور نقلی شاعری مضر ہے لیکن جب وہ یہ کہتے ہیں کہ زوال پذیر شاعری کا انجام قومی اخلاق کی تباہی ہوتا ہے تو وہ اس غلط فہمی کا اظہار کر دیتے ہیں جو نظم کی تاثیر کے متعلق ان کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔

انگریزی ادبی نقادی کے قوانین کے متعلق ان کے ناقص علم کی ایک اور مثال لیجئے۔ وہ اس سوال پر بحث کرتے ہوئے کہ آیا شعر کے لئے وزن ضروری ہے یا نہیں۔ شعر اور نظم کے درمیان اس طرح سے تمیز کر کے لکھتے ہیں کہ جس طرح انگریزی میں نظم کے لئے وزن ضروری نہیں ہے بلکہ صرف شعر کے لئے ضروری ہے۔ اسی طرح سے اردو میں نظم کے لئے وزن ضروری نہیں ہونا چاہیئے بلکہ یہ پابندی فقط شعر کے لئے ہونی چاہیئے۔ یہ امر مشکوک ہے کہ آیا انگریزی میں نظم کے معنے شعر ہیں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ کے استعمال میں کچھ غلطی ہو گئی ہے۔ بہر حال نظم اور شعر کے استعمال سے ان کا مفہوم خواہ کچھ ہی ہو یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ انگریزی میں نظم کے لئے وزن کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرے اہم سوال کا تعلق نظم کی نوعیت یا اس کے لوازمات میں سے ہے۔ مولٰینا حالی کی رائے یہ ہے کہ وزن اور قافیہ نظم کے لئے ضروری نہیں ہیں اگرچہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ جدید اردو نظم کا دارومدار انہی پر ہے ان کے بغیر نظم نظم نہیں رہتی۔ نظم کے لوازمات میں سے پہلا لازمہ تخیل ہے۔ حالی مرحوم کے نزدیک شاعر کی عظمت اس کے تخیل کے تناسب کے مطابق ہوا کرتی ہے یہ پیدائشی جوہر ہے چنانچہ مندرجہ ذیل الفاظ میں آپ اس کی تعریف کرتے ہیں:۔

"وہ ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدے کے ذریعہ سے ذہن میں پہلے سے مہیا ہوتا ہے یہ اس کو مکرر ترتیب دیکر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اس کو الفاظ کے ایسے دلکش پیرایہ میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے۔" حالی مرحوم کو اس بات سے اتفاق ہے کہ تمام شاعروں کے لئے تخیل ضروری ہوتا ہے لیکن ان کی رائے یہ بھی ہے کہ اس کا عمل شاعر کے ہر ایک کلام میں یکساں نہیں ہوتا بلکہ کہیں زیادہ ہوتا ہے کہیں کم اور کہیں محض خیالات میں ہوتا ہے کہیں محض الفاظ میں"۔

اس فقرے میں حالی مرحوم نے تخیل کی حاصل کردہ مغربی تعریف کو بھی خیرباد کہدیا ہے اور صاف طور پر اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ ہر حالت پر اُن کی تعریف عائد نہیں ہو سکتی۔ اس تعریف کے متعلق قابل غور امر یہ ہے کہ تخیل شاعر کے خیالات اور الفاظ کو سانچے میں ڈھالتا ہے اور اگر وہ تخیل کے ذریعے ڈھلے ہوں تو خیالات اور الفاظ کے درمیان اختلاف نہیں ہو سکتا۔

اس تمام عبارت کو پڑھکر یہی نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ وزن اور قافیہ بقول حالی مرحوم حقیقت میں نظم کے لئے ضروری نہیں ہے۔

مگر اردو نظم میں وہ بالکل ضروری ہیں اور یہ کہ تخیل کا وہ ڈھالنے والا اثر جو خیالات اور الفاظ پر مشترکہ طور پر پڑتا ہے نظم کے لئے تو ضروری ہے مگر اردو نظم کے لئے ضروری نہیں ہے۔ بہ الفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو نظم کے قوانین انگریزی نظم کے قوانین نہیں ہیں یا اردو نظم نظم ہی نہیں ہے۔

مولینا حالی مرحوم کے نزدیک نظم کا دوسرا لازمہ قدرت اور فطرت انسانی کا مشاہدہ ہے حالی اس کو بڑی اہم صفت خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ مشاہدہ ایک ایسا مادہ مہیا کر دیتا ہے جس پر تخیل عمل کرتا ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں:۔

"قوتِ متخیلہ کوئی شے بغیر مادہ کے پیدا نہیں کر سکتی اور جو شخص شعر کی (ترتیب) میں اصلیت کو ہاتھ سے نہیں دیتا اور محض ہوا پر اپنی عمارت کی بنیاد نہیں رکھتا وہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ ایک مطلب کے جتنے اسلوبوں میں چاہے بیان کرے اس کا تخیل اسقدر وسیع ہوگا جسقدر اس کا مطالعہ وسیع ہے۔"

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالی مرحوم کو اس تخیل کا علم ہی نہیں ہوا جو شیکسپیر کے نقطۂ نگاہ کے مطابق ہوائی قلعوں کو قیود مقام میں لاکر اس کا ایک نام رکھدیتا ہے اور جیسے ورڈز ورتھ ایسی روشنی کہتا ہے جو نہ تو سمندر پر تھی اور نہ زمین پر

نظم کے تیسرے لازمہ کا تذکرہ کرتے ہوئے یعنی تفحص الفاظ کا حالی مرحوم پھر تخیل کے عمل کو اور بھی محدود کر جاتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"لیکن اگر شاعر زبان کے ضروری حصہ پر حاوی نہیں ہے اور ترتیب شعر کے وقت صبر و استقلال کے ساتھ الفاظ کا تتبع اور تفحص نہیں کرتا تو محض قوت متخیلہ کچھ کام نہیں آسکتی۔

اس کو کافی نہ خیال کر کے وہ فرماتے ہیں

"تخیل کو قوتِ ممیزہ کا محکوم رہنا چاہئے" (صفحہ ۹۷)

ان تمام حوالوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حالی مرحوم تخیل کو مقابلتاً کم اہمیت دیتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریز شاعروں اور شاعرانہ نقادی کے مطالعہ کی بدولت تخیل کو نظم کا ایک لازمہ خیال کرتے ہیں لیکن خود ان کو اس کے فائدے کا کلی یقین نہیں ہے نظم کے تینوں لوازمات پر بحث کر کے حالی مرحوم ملٹن کے نقطۂ نگاہ کے مطابق نظم کی تین خوبیوں پر طویل بحث کرتے ہیں یعنی یہ کہ وہ سادہ پر معنی اور مختصر ہو ملٹن نے ان الفاظ کو نظم کی تعریف کرنے کی نیت سے استعمال نہیں کیا تھا اس نے تو یہ الفاظ مقابلہ کے طور پر استعمال کئے تھے اس نے کہا تھا کہ نظم منطق اور زور بیان کی نسبت کم شاندار اور عمدہ ہوتی ہے لیکن زیادہ سادہ پُر معنی اور موثر ہوتی ہے۔"

ان باتوں سے یہ اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ اردو ادب میں ایسے الفاظ اور فقرے رائج ہو جائینگے جنکی اہمیت اور مفہوم بخوبی متعین اور واضح نہیں۔ لہٰذا ان صفات کی ساری بحث کو کچھ زیادہ وقعت حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ ان الفاظ سے خود ملٹن کی مراد یہ نہیں تھی کہ ان میں نظم کی مکمل تعریف ہے۔

لیکن یہ بحث اور بھی ناکارہ ہو جاتی ہے جب ہم ان معانی کا مطالعہ کرتے ہیں جو حالی مرحوم ان الفاظ کی جانب منسوب کرتے ہیں بے شک سادہ کے معنی وہ سادہ ہی لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

"ہمارے نزدیک کلام کی سادگی کا معیار یہ ہونا چاہئے کہ خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہو۔ مگر پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو اور الفاظ جہانتک ممکن ہو شاعری جسقدر روزمرہ کی بول چال سے بعید ہوگی اسی قدر سادگی کے زیور سے معطل سمجھی جائیگی۔

حالی مرحوم لفظ سادہ کو خیالات اور زبان دونوں پر عائد کرتے ہیں۔ سادگی کی تعریف جو انہوں نے کی ہے وہ نظم کی نسبت طرز بیان اور انداز تحریر پر زیادہ عائد ہوتی ہے۔ یہ تعریف پھر ان اعتراضات کا نشانہ بن جاتی ہے جو ورڈز ورتھ کے نظریے "شاعرانہ طرز" پر کئے گئے تھے۔ لفظ (Sensuous) پُر معنی کی جو تاویل وہ کرتے ہیں وہ اور بھی قابل اعتراض ہے۔ وہ اس کا ترجمہ "اصلیت پر مبنی" کرتے ہیں اور اس کی تشریح یوں کرتے ہیں:۔

"اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ مراد ہے کہ جس بات پر شعر کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ نفس الامر میں لوگوں کے عقیدے میں یا محض شاعر کے عندیہ میں فی الواقع موجود ہو؟

بظاہر یہ مفہوم لفظ (Sensuous) کی غلط تاویل پر مبنی ہے یہ واضح نہیں ہوتا کہ انہوں نے یہ تاویل کیسے کی لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔

اس تفصیل سے صاف ظاہر ہے کہ حالی مرحوم کی بحث کا یہ حصہ کسی کام کا نہیں۔ ہم نے قدرے تفصیل کے ساتھ نظم کی نوعیت اور اثر کی بحث پر حالی مرحوم کے مضمون کے پہلے حصہ کی تنقیدی تشریح کی ہے۔ ہم اس بات کے کہنے پر مجبور ہیں کہ حالی مرحوم کا یہ حصہ ہمیں کچھ زیادہ امداد نہیں دیتا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ حالی مرحوم نے انگریز شاعروں کے کلام کا مطالعہ اس غرض سے کبھی نہیں کیا کہ نظم کے قوانین معلوم کریں تاکہ وہ اردو نظم پر بھی اس طرح سے عائد کئے

جا سکیں۔ یہ اور بھی بدقسمتی کی بات ہے کہ انہوں نے مکالے ہی کو لئے قابل تقلید نقاد خیال کیا ہے۔ مکالے انگریزی علم ادب کے بدترین نقاد ہیں۔

حالی مرحوم کی تعریف میں اس امر کا اظہار ضرور کر دینا چاہئے۔ کہ ایسے ناقص مادے سے کام لیکر انہوں نے اردو میں ایک قابل قدر کتاب تصنیف کر دی۔ انہوں نے اردو نظم کی موجودہ حالت پر جو کچھ کہا ہے اور اس کی اصلاح کے لئے جو مشورے دئے ہیں وہ بہت ہی مفید ہیں کیونکہ یہیں تو ناقص ادبی اصولوں کی قید و بند سے آزاد ہو کر حالی کے جوہر نے آزادی کے ساتھ کام کیا ہے۔ اردو نظم کی مختلف صورتوں پر جو بحث انہوں نے کی ہے اس سے اور نیز ان کے باہمی تعلقات سے اصلیت، اور نقادی نیز فہمی کا اظہار ہوتا ہے۔ ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم دوسرے دو حصوں کی خوبیوں پر بحث کریں۔ لیکن نقاد کی حیثیت سے حالی کو جو شہرت حاصل ہے اس کا اندازہ مقدمہ کے پہلے ہی حصے سے نہیں لگایا جا سکتا۔ بلکہ اس کا اندازہ دوسرے اور تیسرے حصہ سے بھی لگانا پڑیگا۔

نکتہ چینی کا مذاق ناخوشگوار اور بے شکریہ ہے لیکن ہم نے یہ نکتہ چینی بحث چھیڑنے اور اس مبحث پر غور و خوض کرنے کے لئے کی ہے۔ حالی مرحوم کی کتاب کو پنجاب یونیورسٹی کے ایف اے کے طالب علم پڑھتے ہیں اور یہ طالب علم انگریزی نظم کا بھی تو مطالعہ کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اردو علم ادب کی ترقی میں اچھا خاصا حصہ لیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ ادبی اصولوں کو صاف طور پر ذہن نشین کر لیں مکالے اور دیگر مصنفوں کے وہ نقادی خرافات جو مولینا حالی مرحوم نے اختیار کئے ہیں۔ ان سے بجائے فائدے کے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ پبلک کا مذاق بگڑا ہوا ہے۔ اردو علم ادب کے تمام شائقین کا فرض ہے کہ وہ اس کو مشعل راہ نہ بنالیں۔ ان کو چاہئے کہ وہ پبلک کے سامنے ادبی نقادی کے صحیح اصولوں کا نمونہ پیش کریں۔ ضرورت ہے کہ مولینا حالی مرحوم کی اس کتاب کو بڑی احتیاط سے کانٹ چھانٹ کر کے مرتب کیا جائے اور پھر اس کو نوجوان طلبا کے ہاتھوں میں دیا جائے۔ ہمیں کم از کم اتنی تو امید ہے کہ اردو نظم کا کوئی ماہر ادیب کسی دن ادبی دنیا کے ناظرین کے سامنے مندرجہ ذیل مسئلہ پر روشنی ڈالیگا " وہ کونسے قوانین ہیں جن کے ذریعہ ہم کو اردو نظم کی وقعت کا اندازہ لگانا چاہئے کیا وہ قوانین وہی ہیں جن کی وساطت سے ہم انگریزی نظم کی جانچ کرتے ہیں۔

حالی مرحوم کی کتاب پر سرسری نظر ڈالتے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ جبتک ہم ان قوانین کی ساری پیچیدگی کو سمجھ نہ لیں تب تک اردو شاعری کی بحث میں مغربی شاعری کے قوانین کا داخل کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔

بھوپال سنگھ ایم۔اے

غزل

برداشت کی حدود سے بڑھنے نہ پائے ظلم
یہ مہر و التفات کا رشتہ نہ ٹوٹ جائے

اظہارِ اضطراب محبّت میں جرم ہے
یوں ضبط کر کہ ربطِ امید ٹوٹ جائے

اُنکی نگاہِ لطف کا دل کو ہے انتظار
وہ تیر پھینکدیں تو یہ آئینہ ٹوٹ جائے

فطرتؔ مجھے یہ ڈر ہے کہیں رہزن ہوس
آ کر نہ کاروانِ محبّت کو لوٹ جائے

فطرت

رومن شہنشاہ کی اپنے دل سے باتیں

"مارکو اوریلیوس انتونینس" قدیم رومن سلطنت کا ایک مشہور شہنشاہ گزرا ہے - یہ فرماں روا دوسرے عیاش اور خونریز بادشاہوں کے برخلاف فلسفی دماغ کا آدمی تھا - اُس نے ایک کتاب تصنیف کی تھی - جو اب تک موجود ہے - اور دنیا کی بہترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے - اس کتاب کا نام ہے "اپنے دل سے میری باتیں" کہا جاتا ہے یہ کتاب اس نے اپنے لڑکے کے لئے لکھی تھی - ذیل میں ہم اُس کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں :-

۱ - فلسفی بادشاہ کی تربیت

میرے دادا نے مجھے اس زریں اصول کی تعلیم دی تھی - کہ ہمیشہ سچ بولوں - اپنے جذبات پر قابو رکھوں اور اپنے نفس پر حکومت کرتا رہوں - اپنے باپ کی زندگی سے میں نے یہ سیکھا کہ افراط و تفریط سے دور رہ کر اعتدال کی راہ چلوں اور ہمیشہ غیور اور باہمت رہوں - میری ماں نے مجھے یہ سکھایا - کہ مذہب کی تعظیم کروں - سخی بنوں - کسی سے بھی بدی نہ کروں بلکہ برے سے برا خیال ہی دل میں نہ لاؤں -

میرے دادا کا مجھ پر اتنا بڑا احسان ہے - کہ لاکھ شکریہ ادا کروں اُس کا بوجھ ہلکا نہیں ہو سکتا - یہ اُسی کی کوشش اور توجہ کا نتیجہ ہے کہ میں اعلےٰ تعلیم و تربیت حاصل کر سکا -

اپنے اتالیق سے میں نے یہ سیکھا کہ کھیل کود میں وقت برباد نہ کروں - بلکہ زیور علم سے اپنا دماغ آراستہ کرنے اور اعلےٰ اخلاق سے اپنا نفس سنوارنے میں جان توڑ محنت اور کوشش کروں - اور یہ کہ دوسروں کے معاملات میں بے ضرورت کبھی دخل نہ دوں -

"دیوجینس" (رومن فلسفی) نے مجھے تعلیم دی کہ دوسروں کی آزادی کو برداشت کروں - اور جس طرح اپنے آپ کو آزاد دیکھنا پسند کرتا ہوں اُسی طرح تمام انسانوں کو آزاد دیکھ کر مجھے خوشی ہونی چاہئے - لہذا مجھے لوگوں کی حق گوئی پر خفا نہیں ہونا چاہئے - اگرچہ مجھے اُس حق گوئی سے کتنی ہی تکلیف پہنچے - نیز اس معلم نے میرے دماغ کو فلسفیانہ بنا دیا -

روسٹیکس نے میرے اخلاق و عادات درست کئے - اور بے ہودہ بحثوں - دور از کار فلسفیانہ موشگافیوں - اور الفاظ پر بے کار بحثوں سے دور رہنے کی نصیحت کی -

"اپولونیس" نے مجھے بتایا کہ آزاد خیالی کے ساتھ کس طرح غور و فکر کرنا چاہئے - اور یہ کہ خرافات اور فضول خیالات سے کس طرح بچنا چاہئے - نیز اُسی سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ نازک سے نازک موقعوں پر بھی میں کیونکر سنجیدہ - بردبار - اور اپنے حواس میں رہ سکتا ہوں -

"سیکسٹس" نے مجھے حاضر جوابی کی تعلیم دی - ہشاش بشاش رہنا سکھایا - نیز یہ اُسی کی تربیت کا نتیجہ ہے - کہ میں جاہلوں اور بے وقوفوں کو بھی برداشت کر لیتا ہوں - کبھی غصہ نہیں کرتا - ہمیشہ اپنے نفس کی نگرانی کرتا رہتا ہوں ہمیشہ اپنے کام سچائی اور محنت سے پورے کرتا ہوں -

میرا ایک منہ بولا باپ بھی تھا - وہ ایک عقلمند اور نیک آدمی تھا - اُس سے مجھے بہت فائدہ پہنچا - یہ اُسی کی تربیت کا اثر ہے کہ میرا چال چلن پاک ہے - طبیعت نیکی کی طرف مائل ہے - مزاج میں سختی اور شرارت نہیں ہے - شان و شوکت کا مالک ہونے اور دنیا کے سب سے بڑے تخت کا وارث ہونے پر بھی غرور کا مجھ میں نام تک نہیں - میں ہزار دلیلوں کے ساتھ غرور کو ناپسند کرتا ہوں - مجھے خوشامد اور چاپلوسی سے نفرت ہے - میں دولت جمع کرتا ہوں - مگر اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ اپنی قوم کے لئے میرا ذاتی خرچ بہت کم ہے - بجد کفایت شعار رہوں - میں دیوتاؤں کی پوجا نہیں کرتا - کیونکہ یہ جہالت ہے میرا دیوتا - میرا ملک ہے - اور اس کی خدمت میری سب سے بڑی عبادت ہے -

میں برحق معبودوں کا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ میرے تمام باپ دادے - بہن عزیز اقارب - دوست استاد سب

کے سب اچھے لوگ تھے - اور مجھے کبھی بھی ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی سختی کرنا نہ پڑی - نیز میں خوش ہوں کہ معبودوں نے اپنے اپنے فضل و کرم سے مجھے بیوی بھی ایسی دی جو محبت اور عزت کرنے والی اور بہت زیادہ کفایت شعار اور گھر گرست ہے (شہنشاہ یہ لکھتا ہے حالانکہ بعض بعض مورخین کا بیان ہے کہ ملکہ وفادار نہ تھی) معبودوں کا سب سے بڑا احسان مجھ پر یہ ہے - کہ انھوں نے مجھے ایسی عقل بخشی جو فلسفہ اور حکمت کی طرف راغب ہے اور آسانی سے حقیقت تک پہنچ جایا کرتی ہے -

مجھے اعتراف ہے کہ اتنی خصوصیتیں اور بخششیں حاصل نہیں ہو سکتی تھیں - اگر آسمان کے مالک کا مجھ پر خاص لطف و کرم نہ ہوتا -

۲ - عقل کے لئے سب سے بڑی تسکین

ہر صبح تمھیں خوب توجہ سے یاد کر لینا چاہئے - کہ شام سے پہلے تمھیں کوئی ایسا آدمی ضرور ملے گا - جو علم کا جھوٹا مدعی - حق کا منکر - بدزبان جھگڑالو بدمزاج اور تن پرور - اور تمھاری طبیعت پر گراں گذرے گا جب ایسا آدمی ملے - تو طے کر لو کہ تمھارے اور اس کے درمیان اختلاف صرف اس وجہ سے پیدا ہوا ہے - کہ اچھائی اور برائی کی حدیں مقرر کرنے میں دونوں کا مسلک جدا جدا ہے - تمھاری ایک راہ ہے اُس کی دوسری ہے لیکن اس اختلاف کی وجہ سے تمھیں اُن سے عداوت نہیں پیدا کرنی چاہئے - تمھارے لئے یہ کافی ہے کہ تم اپنی دانست میں نیک اور بد کی حقیقت سے واقف ہو - اگر تم یقین کر لو تو خطاکار بھی تمھارا ایک رشتہ دار ہے - کیونکہ دونوں کی عقل ایک ہی نور کے سرچشمے سے نکلی ہے - اور یہ کہ وہ کسی حال میں بھی تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکتا - کیونکہ تمھارا اخلاق مضبوط ہے - اور کوئی بھی تمھیں بدخلقی اختیار کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا - تو ظاہر ہے کہ تم اپنے مخالف سے ہرگز نفرت و عداوت نہیں رکھ سکو گے - بلکہ اُس کی بھلائی چاہو گے - اور اسے اپنے خاندان اور کنبے کا ایک آدمی سمجھو گے - کیونکہ تم دونوں اور تمام انسان باہمی مددگاری کے لئے پیدا کئے گئے ہیں - انسانیت کی خدمت میں الگ الگ آدمی کا درجہ وہی ہے - جو مجموعی جسم کی خدمت میں الگ الگ اعضائے جسم کا ہے -

اگر یہ صحیح ہے تو ثابت ہوجاتا ہے کہ انسانوں میں باہم لڑائی جھگڑا فطری نہیں ہے - بلکہ تعلیم و تربیت کا نہایت مکروہ نتیجہ ہے -

یہ مخلوق جو لفظ "میں" سے تعبیر کرتا ہے تین چیزوں سے مرکب ہے جسم - او سانس - اور وہ عجیب مشین جو پورے جسم کو چلاتی ہے - یہ تیری حقیقت ہے - اب تجھے کیا کرنا چاہئے ؟

جسم کی بس اتنی ہی پروا کر کہ وہ فوراً فنا ہو جانے والا ہے یعنی وہ کوئی چیز نہیں - لہذا اُس کی زیادہ فکر بھی ضروری نہیں - رہ گئی سانس تو وہ ہوا ہے جو ایک مرتبہ بدن کے اندر جاتی - اور دوسری مرتبہ نکل جاتی ہے -

لیکن ہاں تیرا جسم چلانے والی مشین - یعنی تیری عقل - سو ذرا ٹھہر اور خوب اطمینان سے اپنے اس تیسرے جزو کی اہمیت سمجھ لے - اے شخص میں تجھ سے کہتا ہوں اپنی عقل کی قدر کر کہ اس سے بڑھ کر کوئی دولت اور کوئی نعمت معبودوں نے تجھے نہیں دی - تو اپنی عقل کو کبھی کسی دوسری عقل کی غلامی میں دینے پر راضی نہ ہو - اُس پر اُس کی قوت سے زیادہ بوجھ نہ ڈال - جذبات کو اُس پر قبضہ کر لینے کا موقعہ نہ دے - تقدیر سے اُسے مت لڑا - ماضی کے غم میں اُسے نہ گھلا حاضر سے گھبرانے کا اُسے عادی نہ بنا - مستقبل کا ڈر اُس سے قریب بھی نہ ہونے دے -

قدرت کی کاریگری معبودوں کے ہر فعل میں جلوہ گر ہے - اور تیری عقل کو غور اور تدبر کی دعوت دے رہی ہے - غور کر ہمیشہ سوچتا رہ - قدرت کے قلم نے ذرّے ذرّے پر ایک ایک کتاب لکھدی ہے - یہ کتابیں ہی تیرے مطالعے کے لئے بہت ہیں - لہذا انہی میں مشغول رہ - آدمیوں کی لکھی ہوئی بے کار کتابوں میں اپنا وقت خراب نہ کر - اس طرح تجھے خوشی حاصل ہوگی - اور اس خوشی پر تو موت کے وقت معبودوں کا شکر ادا کر سکے گا -

ہمیشہ یاد رکھ کہ تو مرد ہے - اور رومن ہے - لہذا تیرا ہر کام - نیکی - بڑائی - سنجیدگی - انسانیت - آزادی - انصاف کا نمونہ ہونا چاہئے - اپنے ہر کام کو اس خلوص اور سچائی سے انجام دے - گویا وہ تیری زندگی کا آخری کام ہے - اور ہمیشہ یادگار رہنے والا ہے - نفاق - خودی - خودغرضی کو اپنے سے دور کر دے - یاد رکھ بہت تھوڑی محنت سے آدمی وہ خوش نصیبی حاصل کر سکتا ہے - جو خود دیوتاؤں کو حاصل ہے -

اب اس کے بعد تجھے موت سے ڈرنے کی کیا وجہ باقی رہجاتی ہے - اگر واقعی دیوتا موجود ہیں جیسا کہ لوگ کہتے ہیں - تو ظاہر ہے تجھے نڈر رہنا چاہئے - دیوتا خود تیری پاسبانی کریں گے - لیکن اگر نہیں ہیں یا ہیں مگر ہم فانیوں کی حفاظت نہیں کرتے - تو پھر ایسی دنیا میں ایک منٹ بھی زندہ رہنا خوشی کی بات نہیں جس کی پروا دیوتاؤں تک کو نہیں -

زندگی اور موت - عزت اور ذلت - خوشی اور غم - دولت اور غربت

یہ تمام چیزیں اچھوں اور بروں دونوں کے لئے یکساں طور پر مباح ہیں۔ لہٰذا وہ حقیقت میں نہ اچھی ہیں نہ بُری ہیں۔

ہماری زندگی چند روزہ ہے۔ ہمارا وجود تیز رفتار فنا کا دوسرا نام ہے۔ ہماری خواہشیں وہم و محض فت ہیں۔ ہمارے جسم بربادی کا ایندھن ہیں۔ ہمارے نفس آندھیاں ہیں۔ اور ہماری قسمتیں ہوائی کے پانسے ہیں۔ ہماری شہرتیں صرف اس لئے ہیں۔ کہ ایک دن گمنامی سے بدل جائیں۔

پھر وہ کیا چیز ہے جو حقیقی ہے اور جس پر ہمیں بھروسہ کرنا چاہئے؟ صرف فلسفہ۔ . . . یعنی ہمیں اپنا باطن پاک اور روح کو بدی اور عیب سے دور رکھنا چاہئے۔

۳۔ سب سے اچھا کیا ہے؟

قدرت کے اس کارخانے میں معمولی سے معمولی چیز اور ہر چیز کا ادنےٰ سے ادنےٰ خط و خال بھی اپنے اندر ایک اور رعنائی رکھتا ہے۔ روٹی پر جا بجا اُبھار اور شگاف پڑ جاتے ہیں۔ پکاتے وقت نان بائی یہ اُبھار اور شگاف نہیں ڈالتا۔ وہ خود بخود پڑ جاتے ہیں۔ اور آدمی میں اشتہا پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح ممکن ہے قدرت نے جان بوجھ کر کائنات میں یہ رعنائی کوٹ کوٹ کر نہ بھر دی ہو۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ پتا پتا اور چپہ چپہ چشمِ بینا کو مسحور کر رہا ہے۔ انجیر پک کر جا بجا پھٹ جاتی ہے۔ اور پھر اُس کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔ زیتون بھی جب سڑنے کے قریب ہوتا ہے تو نہایت لذیذ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح گیہوں کی بال کا جھکاؤ۔ شیر کا کھلا ہوا دہانہ۔ سور کے دانت یہ تمام باتیں کہنے کو محض معمولی اور ناقابلِ ذکر ہیں۔ لیکن دیدۂ عبرت کے لئے اپنے اندر عجیب عجیب اثر رکھتی ہیں۔

بنابریں اگر آدمی چاہے کہ کائنات میں سے حسین ترین چیزیں منتخب کر لے تو قطعاً ناکام رہے گا۔ کیونکہ کائنات میں کوئی تنکا بھی نہیں جو اپنے خاص حسن و جمال میں کسی بڑی سے بڑی چیز سے کمتر قرار دیا جا سکے۔

اپنا دماغ اور دل دوسروں کے ہاتھ نہ بیچو۔ دوسروں کے خیالات اور افعال کی کرید نہ کرو۔ صرف اپنے ہی دماغ میں سوچو۔ صرف اپنے ہی چال چلن پر نظر رکھو۔ ایسے بنو کہ اگر تمہارا دل چیر کر دیکھا جائے تو اس میں اخلاص۔ سچائی۔ آزادی۔ نیکی کے سوا کچھ اور نہ نکلے جو آدمی ایسا دل رکھتا ہے۔ وہ درحقیقت معبودوں کا چہیتا ہوتا ہے اور وہ خوبی کے ساتھ اپنی نیکی استعمال میں لا سکتا ہے۔

سدا خوش و خرم رہو۔ غیر کی مدد پر کبھی بھروسہ نہ کرو۔ اپنی خوش نصیبی کے لئے دوسروں کا سہارا نہ ڈھونڈو۔ مختصر یہ کہ اپنی ٹانگیں چھوڑ کر دوسرے کی لاٹھی کے سہارے نہ چلو۔

اگر اپنی پوری عمر میں کوئی ایک چیز بھی مثلیں انصاف۔ سچائی۔ پارسائی۔ ثابت قدمی سے بہتر نظر آئے۔ یا اپنی ٹھوس اور متین عقل سے بھی کوئی عقل معلوم ہو تو بے شک اپنی بھلائی اور سعادت کے لئے اُسکے حاصل کرنے کی پوری کوشش کرو۔ لیکن اگر کوئی ایسی چیز نظر نہ آئے تو پھر فضول باتوں کی چھان بین میں پڑ کر اپنے ذرا عقل سے غافل مت ہو۔

۴۔ عقل کی پیروی

لوگوں کا دستور ہے۔ کہ آرام لینے کے لئے غیر آباد مقامات، سمندر کے ساحلوں اور بلند پہاڑوں پر جایا کرتے ہیں۔ تم بھی بارہا ہی کر چکے ہو۔ اور تنہائی کی تلاش میں ادھر ادھر پھرے ہو۔ لیکن یہ تمام محنت بیکار ہے۔ کیونکہ اگر مضبوط ارادہ رکھتے ہو۔ تو ہر جگہ تنہائی حاصل کر سکتے ہو مجلس میں بھی خلوت پا سکتے ہو۔ دنیا میں اتنی تنہائی اور سکون کہیں بھی نہیں جتنی آدمی کے دل میں ہے۔ بشرطیکہ دماغ غور کا عادی ہو اور عقل میں ترتیب و سلیقہ موجود ہو۔ اگر تم ایسا دماغ اور عقل رکھتے ہو۔ تو اپنے دل کی طرف رجوع کرو۔ ہر مقام پر تنہائی حاصل کر لوگے۔

اگر ہم لوگوں میں تمیز کا مادہ معمولی ہے۔ تو عقل بھی جو اُس کی سرچشمہ ہے معمولی ہوگی۔ نیز وہ قوت مدرکہ بھی معمولی ہوگی جو اخلاق و عادات پر حکمرانی کرتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ماننا پڑے گا کہ پوری نوع انسانی ایک ہی قانون کی ماتحت ہے۔ ٹھیک اُسی طرح جس طرح ایک شہر یا ایک ملک کے باشندوں کے لئے ایک ہی قانون ہوتا ہے۔ نیز تمام انسان ایک ہی قوم ہیں۔ اور پوری دنیا در اصل ایک ہی جمہوریہ ہے کیونکہ دنیا میں صرف ایک ہی جماعت ہے جس سے انسان مانوس و متحد ہیں۔ اور وہ خود انسانی جماعت ہی ہے۔

لوگوں کی واہ واہ کی پروا نہ کرو۔ کیونکہ لوگ ہمیشہ جھوٹی تعریفیں کرتے ہیں۔ اپنی عقل کو اپنا رہبر قرار دو۔ اُسکے اشاروں پر چلو۔ ایسا کرنے سے جو لوگ آج تمہیں بیوقوف سمجھ رہے ہیں کل دیوتا سمجھ کر تمہاری پوجا کرنے لگیں گے۔

ہمارے اقوال اور افعال کا بڑا حصہ غیر ضروری ہے۔ اگر ہم صرف ضروری باتیں ہی کہا اور کیا کریں تو ہمارا بہت سا قیمتی وقت بچ جائے جس میں نیکی کے لئے زیادہ مہلت ملے اور پریشانیوں سے بہت کچھ نجات ملے۔ لوگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ خیالات اپنے دائرہ سے باہر نکل جاتے ہیں۔ جب دماغ میں بے تمیزی پیدا ہو جاتی ہے تو آدمی فضول باتوں میں پڑ جایا کرتا ہے۔

سلیمان خاں

دوست

افراد

لطیف احمد۔ نسیمہ کا خاوند۔
ضیا الدین۔ لطیف احمد کا لڑکا۔
عرفان۔ لطیف احمد کا ماموں زاد بھائی اور دوست۔

پردہ اُٹھتا ہے

سردیوں کے دن ہیں۔ لطیف احمد ضیا الدین نسیمہ اور عرفان آگ تاپ رہے ہیں۔ لطیف کی عمر ساٹھ برس کے قریب ہے۔ اس کی بیوی نسبتاً کم عمر ہے۔ ضیا الدین ۲۵ برس کا نوجوان ہے لطیف کا اکلوتا لڑکا ہے۔ اس کے چہرے پر شعلوں کا عکس ایک عجیب دلکش کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اس کی چمکتی ہوئی دلربا آنکھیں نور مسرت سے روشن ہیں۔ دو دن ہوتے ہیں اس کی نسبت لاہور کے ایک معزز گھرانے میں قرار پا چکی ہے۔ ایک مہینہ ہوا ہے وہ فوج میں لفٹنٹ کے عہدے پر فائز ہوا تھا۔ شادی کے لئے رخصت لیکر آیا ہے۔ شادی کے بعد اپنی فوج میں چلا جائیگا۔

لطیف ۔ (مذاق کے لہجے میں) عرفان تم بہت خوش نصیب ہو کہ تمہاری کوئی اولاد نہیں۔ لڑکا ہو یا لڑکی دونوں طرح مصیبت ہوتی ہے۔ اب ذرا ضیا کی طرف دیکھو۔ اسے پالا پوسا۔ پروان چڑھایا۔ جب دل میں اس کی محبت جاگزیں ہو گئی۔ تو اس نے ہمیں اطلاع دیدی کہ آئندہ سے وہ ملتان اپنی فوج کے ہمراہ رہا کریگا! کیا تماشا ہے!

عرفان ۔ (بظاہر دردناک آواز میں) کسقدر مصیبت ہے۔

نسیمہ ہنستی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

نسیمہ ۔ (عرفان سے) مجھے اجازت دیجئے۔ بھائی جان! نیند آ رہی ہے۔

عرفان ۔ میں بھی جا رہا ہوں بھابی جان!

لطیف ۔ بیٹھو بھی عرفان کہاں جاؤ گے؟ میں اسی کمرے میں سوتا ہوں۔

ضیا ۔ تشریف رکھئے چچا جان! آپ کو معلوم ہے ناوالد صاحب دیر تک جاگتے رہتے ہیں۔ آپ بیٹھئے اور مجھے بھی اجازت دیجئے۔ کل سے میرے سر میں خفیف سا درد ہے!

عرفان (مسکراتے ہوئے) جی! آپ کے سر میں درد ورد کوئی نہیں ہے! آپ اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھکر ایک فردوس تخیل بنانا چاہتے ہیں۔ اچھا جائیے۔

نسیمہ اور ضیا چلے جاتے ہیں۔

عرفان ۔ (سنجیدگی سے) لطیف! یہ کیا بات ہے؟ تم اس کمرے میں کیوں سوتے ہو؟ دیر تک کیوں جاگتے رہتے ہو؟

لطیف ۔ مجھے تاریکی سے خوف آتا ہے۔ رات کو میں لمپ جلائے رکھتا ہوں۔ اوپر کے کمروں میں روشنی ہونے سے ضیا کو نیند نہ آتی تھی۔ اس لئے میں نچلی منزل میں اُتر آیا ہوں۔

اس کے چہرے پر ملال کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ خاموش سر جھکائے ہوئے نظریں آتشدان پر گاڑے ہوئے بیٹھا ہے۔

عرفان (پریشانی کے عالم میں) لطیف!

لطیف ۔ کیا ہے؟

عرفان ۔ کیوں خاموش ہو گئے ہو اس طرح تم!

لطیف ۔ کیا کہوں! میرا خیال تھا کہ شراب کی لعنت سے میں بالکل بچ گیا ہوں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس خبیث عادت کے نتائج ضرور برآمد ہوتے ہیں۔

عرفان ۔ لیکن تم نے مدت سے شراب چھوڑ رکھی ہے؟

لطیف ۔ ہاں۔

عرفان - تو پھر کیا بات ہوئی؟

لطیف - شاید تمہیں معلوم ہے کہ جس دن سے میری شادی ہوئی اس دن سے میں اس عادت کو ترک کرنے کی کوشش کر رہا ہوں! میں سمجھتا تھا کہ نسیمہ کی زندگی میرے ہاتھوں میں ہے - نرم مٹی کی طرح - میں جس طرح چاہوں اس کو سانچے میں ڈھال سکتا ہوں! نسیمہ سے مجھے عشق تھا! میں نے دل پر جبر کر کے شراب کو ترک کرنے کی کوشش کی اور شکر ہے کہ بہت جلد اس میں کامیاب ہو گیا! جس آسانی سے یہ عادت شروع ہوئی تھی اسی آسانی سے جاتی بھی رہی!

عرفان ! لطیف ! کیا تمہارے ضمیر نے تمہارے اس فعل کے خلاف آواز نہیں اٹھائی -

لطیف ! ضمیر! میں اس شے کے وجود سے منکر ہوں! میرے دل کی گہرائیوں میں کبھی شراب کے خلاف نفرت کا احساس پیدا نہیں ہوا - نسیمہ سے شادی کرنے کے بعد میں نے چاہا کہ اس عادت کو ترک کر دوں اس لئے نہیں کہ یہ میرے لئے مضر تھی - بلکہ اس لئے کہ اگر نسیمہ کو اس عادت کا علم ہو جاتا تو اس کا دل مجروح ہو جاتا اور میری زندگی برباد ہو جاتی -

عرفان ! تو نسیمہ کو تمہاری ......

لطیف ! نہیں - اسے علم ہو گیا تھا! آہ وہ تاریک بارانی رات مجھے ابتک یاد ہے! نسیمہ کی آنکھوں میں افسردگی اور حیرت کی لہر پیدا ہو گئی تھی - اس کا اثر میرے دل پر اسی طرح ثبت ہے جس طرح کسی نے میرے جسم اور میری روح کو تازیانے مار مار کر زخم آلود کر دیا ہو - میں نے اپنا راز محفوظ رکھنے کی انتہائی کوشش کی تھی - اور عرفان کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ ایک اس گناہ کے علاوہ میری روح بالکل پاک تھی - میں جھوٹ سے گریز کرتا تھا - اپنے کاروبار میں ایمانداری برتتا تھا - مگر ان تمام باتوں کے باوجود میں شراب نہیں چھوڑ سکتا تھا - آخر کار اسے معلوم ہو گیا! وہ رات!

عرفان - جانے دو - لطیف - اس رات کا تذکرہ جانے دو - پھر کیا ہوا!

لطیف ! نسیمہ نے بیحد حوصلے سے کام لیا - میں نے کہا میں شراب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا - مگر نسیمہ نے میرا دل بڑھایا اور ہم دونوں نے اس خبیث عادت کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا - مگر بے سود! اس کی تمام کوششیں اکارت گئیں! آخر کار اس نے دل ہار دیا - مگر میں نے اپنی کوشش جاری رکھی - پھر ایک دن ایسا آیا کہ میرے دل میں شراب کا کوئی شوق باقی نہ رہا - ایک دن خود بخود یہ عادت مجھے چھوڑ کر چلی گئی!

عرفان - حیرت ہے!

لطیف - پہلے تو نسیمہ نے میرے الفاظ پر یقین نہیں کیا - مگر آخر کار اسے بھی یقین آ گیا کہ میں نے شراب چھوڑ دی ہے -

عرفان - تو اب اس کے نتائج کیا برآمد ہوئے ہیں؟ کیا ضیاالدین کو تمہاری اس عادت کا پتہ لگ گیا ہے؟

لطیف - نہیں نہیں! خدا نہ کرے ضیا کو اپنے باپ کی اس خبیث عادت کا علم ہو جائے -

عرفان ! پھر تم کس بات سے ڈرتے ہو؟

لطیف - تاریکی سے - عرفان! میں تاریکی سے ڈرتا ہوں! ذرا دیکھو - سایے دیواروں پر کیسی عجیب عجیب شکلیں اختیار کرتے ہیں!

عرفان - کیسے سایے - آگ کے شعلوں کے؟

لطیف (غصے سے بھڑک اٹھتا ہے) اور کیسے سایے - شعلوں ہی کے تو سایے ہیں!

عرفان (لطیف کے غیر متوقع غصے سے متعجب ہو کر) کیا بات ہے لطیف؟ تم کس بات سے ڈرتے ہو؟

لطیف - (شرمندگی کی ہنسی ہنس کر) کچھ نہیں کچھ نہیں - یکایک اُٹھ کھڑا ہوتا ہے - اس کی آنکھیں وحشتناک ہو جاتی ہیں -

لطیف ! سایے - ہاں - سایے - شعلوں کے نہیں! میرے گناہوں کے سایے دیواروں پر رقص کر رہے ہیں! شیطان میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہا ہے - خدا جانے یہ شیطانی ناچ کب تھمیگا -

عرفان ! کیا کہہ رہے ہو لطیف - تمہارا دماغ پھر گیا ہے -

لطیف - ہاں میرا دماغ پھر گیا ہے - اسی لئے میں تاریکی سے ڈرتا ہوں - تاریکی مجھے اپنی طرف بلاتی ہے - سایوں کی لانبی لانبی انگلیاں مجھے اشاروں سے موت کی طرف بلاتی ہیں اور میں ان کی طرف کھنچا جاتا ہوں - میں ڈرتا ہوں عرفان کہ میں

بھی ایکدن انہیں سایوں میں مل کر ایک سایہ بن جاؤنگا۔

عرفان - تم نے کسی اور سے بھی ان باتوں کا ذکر کیا ہے!

لطیف - صرف نسیمہ سے!

عرفان - میری مراد ڈاکٹر سے ہے۔

لطیف - (طنز سے) ڈاکٹر! ڈاکٹر میرے لئے کیا کر سکتا ہے؟

عرفان - ان خیالات سے متاثر ہونا فضول ہے۔ لطیف! ان باتوں کو بھلا دو اور یہ باتیں تمہیں بھلا دینگی! سایوں سے ڈرنا! کیا حماقت ہے!

لطیف - مجھے اب ان باتوں سے کوئی تسلی نہیں ہوتی۔ ہر وقت میرے سامنے یہ سایے رقص کرتے رہتے ہیں! سایے میری زندگی کے لئے لازم ہو گئے ہیں! سایے دوستوں کی طرح مجھے اپنے گلے سے لگانا چاہتے ہیں! میں ڈرتا ہوں۔ اپنی سزا کے خوف سے میری روح لرز رہی ہے۔ شراب نے میرے دماغ اور جسم کو نہیں چھوڑا۔ اس عادت کے نتائج کس لعنت کی صورت میں میرے سر پر نازل ہونگے! یہ سوچ سوچ کر میں کانپ اٹھتا ہوں۔ میں نے اس گناہ کا کفارہ ابھی ادا نہیں کیا!

عرفان کھڑا ہو جاتا ہے اور کھڑکی کے پاس جا کر باہر دیکھنے لگ جاتا ہے۔

عرفان - ہوا کتنی فرحت انگیز ہے۔ آج تمہیں جلدی نیند آ جائیگی۔ میں جاتا ہوں!

چلا جاتا ہے

عرفان کے جانے کے بعد لطیف آگ کی طرف نظر یں جمائے ہوئے کھڑا رہتا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد لمپ کی روشنی مدھم کر دیتا ہے۔ ایک آرام کرسی پر لیٹ جاتا ہے۔ انگیٹھی میں سے ایک شعلہ بھڑک اٹھتا ہے۔ سامنے کی دیواروں پر متحرک سایے دکھائی دیتے ہیں۔ کمرا اب تقریباً تقریباً تاریک ہے۔ ایک طرف الماری میں کچھ بوتلیں رکھی ہیں۔ جن میں شراب کی ایک بوتل ہے۔ پچھلے دنوں نسیمہ کو نمونیا ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر کے مشورے سے منگوائی گئی تھی۔ دروازہ کھلتا ہے۔ ضیا داخل ہوتا ہے۔ دبے پاؤں وہ آرام کرسی کے قریب آتا ہے۔ باپ کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتا ہے۔ پھر دوزانو ہو کر اس کے کوٹ کی جیب میں سے کنجیوں کا گچھا نکال لیتا ہے۔ دبے پاؤں الماری کی طرف جاتا ہے۔ اور الماری کھول کر شراب کی بوتل نکال لیتا ہے۔ لطیف کی نیند کھل جاتی ہے۔ وہ غور سے ضیا کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر یکایک چلا اٹھتا ہے۔

ضیا - آپ نے تو مجھے ڈرا دیا تھا۔ میں سمجھتا تھا آپ سو رہے ہیں۔

لطیف - کیا کر رہے ہو تم ضیا!

ضیا - اماں کو نیند نہ آتی تھی۔ میں ان کے لئے خواب آور دوا لینے آیا تھا!

لطیف - دوا میں اوپر لے جاتا ہوں۔

ضیا - میں ان سے وعدہ کر آیا تھا کہ آپ کو نہ جگاؤنگا۔

لطیف - ضیا!

ضیا - خدا کے لئے چپ رہئیے! ابا جان! آپ کی آواز سن کر اماں جاگ اٹھینگی۔

اس نے اپنا راز فاش کر دیا ہے۔

لطیف - آہ لڑکے!

ضیا - (ہاتھ ملتے ہوئے) آہ!

لطیف - کیا کر رہے تھے تم!

ضیا - میری طرف اس طرح نہ دیکھئے۔ ابا جان! میں زمین میں غرق ہو جاؤنگا۔

لطیف - کیوں آتے تھے تم نیچے!

ضیا - مجھے اپنی طبیعت پر قابو نہ تھا!

لطیف - تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟

ضیا - میرے ہاتھ میں۔ کچھ نہیں ابا جان!

لطیف - کیا ہے ضیا!

ضیا بوتل دکھاتا ہے۔

ضیا - ابا جان!

لطیف - اچھا! یہ بات ہے! ضیا اس سے پہلے تم نے شراب پی ہے!

ضیا - صرف ایکبار۔

لطیف - کہاں

ضیا - خواب میں۔

ضیا۔ ہاں۔ اس دن سے میں شراب پینے کے لئے بیتاب ہو رہا تھا۔ آج تو گویا اس طرح محسوس ہوا کہ اگر میں شراب نہ پیونگا تو مر جاؤنگا۔

سسکیاں بھر کے رونے لگتا ہے۔

لطیف۔ رومت۔ رومت بچے۔ تیرا کوئی قصور نہیں۔

ضیا۔ میں سوچتا ہوں کہ مجھ ایسا ذلیل اور کمینہ لڑکا کس طرح آپ ایسے شریف اور نیک شخص کے ہاں پیدا ہو گیا۔

لطیف۔ (بیتاب ہو کر) خاموش لڑکے۔ تو نہیں جانتا تو کیا کہہ رہا ہے!

نسیمہ داخل ہوتی ہے۔

نسیمہ۔ (لطیف سے مخاطب ہو کر) تمہیں معلوم ہو گیا؟

لطیف۔ ہاں۔

سر جھکا لیتا ہے۔ یکایک کچھ سوچکر چونک اٹھتا ہے۔

لطیف۔ تو تمہیں اس سے پہلے علم تھا کہ ضیا شراب پیتا ہے۔

نسیمہ۔ ہاں۔

لطیف۔ لیکن یہ تو کہتا ہے کہ اس نے آج پہلی بار شراب پینے کی کوشش کی ہے۔

نسیمہ۔ (حقارت سے) وہ بھی تمہاری طرح جھوٹا اور فریبی ہے۔

لطیف۔ نسیمہ!

نسیمہ۔ کیا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ میرے دل میں تمہاری کوئی عزت ہے؟ ذرہ برابر بھی نہیں۔ جس دن سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ضیا نے یہ عادت تم سے ورثہ میں پائی ہے اس دن سے میری محبت نے نفرت کی شکل اختیار کر لی ہے۔

ضیا۔ (چونک کر) ورثہ!

لطیف۔ ہاں! ضیا میں برسوں اس ملعون عادت کی آہنی تاروں میں جکڑا رہا ہوں۔ آج تمہیں معلوم ہونا چاہئے۔ کہ جس باپ کو تم نیکی اور محبت کا فرشتہ تصور کرتے تھے وہ ذلت اور گناہ کا پیکر ہے۔

ضیا اضطراب اور حیرت کے جوش میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

ضیا۔ آپ اباجان! آپ شراب پیتے رہے ہیں۔

لطیف۔ ہاں بیٹا۔ میں! آہ۔ مجھے خواب میں بھی یہ خیال نہ تھا (اس کی آواز بھرا جاتی ہے) کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا مجھے وہم بھی نہ تھا کہ میرے گناہ یہ صورت اختیار کرینگے۔

نسیمہ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم نے شراب کو چھوڑ دیا تھا تو شراب تمہیں بھی چھوڑ گئی تھی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ جبتک تمہارے جسم میں جوانی کا ایک شعلہ لرز رہا ہے۔ اس وقت تک یہ لعنت تمہارا پیچھا نہ چھوڑیگی۔ جب وہ تمہاری رگوں میں سے خون نچوڑ چکی۔ تمہارے دل میں سے حوصلہ نکال چکی۔ تمہاری آنکھوں میں سے نور چھین چکی۔ تمہاری ہڈیوں میں سے مغز کھا چکی تو تمہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ اور پھر دوستی کا حق ادا کرنے کے لئے تمہارے خون اور پوست سے آ ملی۔ مرجھائے ہوئے جسم کو چھوڑ کر صحت مند جسم میں داخل ہو گئی۔ شراب تمہاری بربادی کو دیکھ رہی تھی۔ آخرکار ایکدن وہ اس بیکار جسم میں رہتے رہتے تھک گئی اور تمہارے بیٹے کی روح میں داخل ہو گئی۔

ضیا۔ خدایا!

لطیف غش کر جاتا ہے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آتا ہے۔ مدھم لمپ بھڑک کر خاموش ہو جاتا ہے۔ کمرے میں تاریکی ہے۔ ہولناک۔ وحشت انگیز تاریکی انگیٹھی میں یکایک ایک شعلہ بلند ہوتا ہے۔ دیواروں پر متحرک سایے نظر آنے لگتے ہیں۔

ضیا۔ خدایا!

پردہ گرتا ہے

(مختار) جے ایم بیری

عابد

حضرت زاغ کا نظریہ

کوّوں کا ایک جھنڈ پارک میں ہے۔ ایک کوّا اپنی تحقیق کی بنا پر انسان کی اصل پر لکچر دے رہا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ انسان دراصل کوّا تھا، جو پستی کی طرف گرتا ہوا انقلاب ماہئیت کے بعد موجودہ صورت میں تبدیل ہوگیا ہے۔ معزز مقرر کا خیال ہے کہ انسان اپنی اس پست حالت پر متاسف ہے، اور متمنی اور کوشاں ہے کہ پھر اپنی اصل (یعنی صورت زاغ) پر واپس ہوجائے حضرت زاغ کے خیالات، ان کی تحقیقات کے ذرائع ونتائج خود انکی زبان سے سنئے اور جودتِ طبع کی داد دیجئے اس میں شک نہیں اگر مسٹر ڈارون اس حقیقت سے آشنا ہوتے، تو وہ دنیا کے سامنے مسئلہ ارتقا کو پیش نہ کرتے۔

حضرات! ہمارے لئے اس مخلوق کی اصل کی تحقیقات کرنی جسے ہم انسان کے نام سے یاد کرتے ہیں، نہایت ضروری ہے۔ انسان کا ہمارے ساتھ برتاؤ، اس کی بابت ہمارے جذبات۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن پر ہم کوئی رائے نہیں قائم کرسکتے جب تک کہ ہم انسان کی فطرت سے آگاہ نہوں۔ میں اپنی تحقیقات کو دو اصولوں پر تقسیم کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ ہر مضمون اور ہر موضوع کی اصلیت کا معلوم کرنا ایک عمدہ بات ہے، دوسرے یہ کہ اگر کوشش کی جائے تو ہر چیز کی اصل معلوم کرنی ممکن ہے۔ جو حضرات میری اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں وہ ذرا زمین سے جھک کر رضامندی کا ثبوت دیں... شکریہ! آپ کی اس ہمدردی کا شکریہ۔

"کیسے؟ کب؟ کہاں سے؟ اور کیوں؟ ہمارے سامنے یہ سوالات پیش ہیں اور ہمیں ان کے جواب دینے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یہ حقیر مخلوق زمین پر کیسے آئی اور کہاں سے آئی؟ انسان ہمارا دشمن کب سے ہے اور کیوں؟ آخر وہ زمین پر موجود ہی کیوں ہے۔ بیشک یہ نہایت اہم سوالات ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم ان کا جواب دیں ہمیں صورت حال پر نظر ڈالنی چاہئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان ہماری طرف بڑھتا ہے اور ہم بھاگ جاتے ہیں، وہ ہمارے پاس آتا ہے اور ہم اڑ جاتے ہیں، وہ ہمارے آشیانوں پر حملہ آور ہوتا ہے اور ہم وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ باتیں ہزارہا برس سے یوں ہی ہوتی آئی ہیں۔ ہمیں اس کا فوری سدباب کرنا بے حد ضروری ہے، ورنہ وہ وقت دور نہیں جبکہ ہماری زندگی ہمیں وبال اور دنیا ہمارے لئے تنگ ہوجائے۔

سوال یہ ہے کہ ہم انسان کے سامنے سے بھاگ کیوں جاتے ہیں۔ اس کا سبب 'خوف' ہے۔ ہم میں سے کوئی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ ایک نامعلوم عرصہ سے ہمارے دلوں میں انسان کی طرف سے ایک بزدلانہ خوف سما گیا ہے، 'خوف' کیا ہے؟۔ خوف کیوں ہے؟ اس کا جواب مجھے ہر طرف سے یہی ملا کہ اس کا باعث انسان کا ہم سے برتر ہونا ہے۔ اس لئے ہم اس کی موجودگی سے مرعوب ہوکر اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔ اس موقعہ پر میں خود بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار ہوں کہ میں بھی ایک عرصہ تک اس خیال کا مؤید رہا۔ میں نے قدیم مسکنوں کو اجڑتے، اور پرانے آشیانوں کو برباد ہوتے دیکھا تھا، میں انسان کے ظلم سے واقف اور اس کی ناانصافی سے باخبر تھا، تو پھر میں اس ہستی کے نام سے کیوں نہ لرزنے لگتا جو اس تمام بربادی و ویرانی کا اصل بانی ہے۔ لیکن اس جدید دور اجتہاد و تحقیق کے قربان، کہ میں ان فرسودۂ روزگار خیالات سے قطعی آزاد ہوگیا۔

"ہمارے بھاگ جانے کے "کیوں؟" کا جواب خوف، تھا، اور خوف، کے "کیوں؟" کا جواب انسان کی ہم پر برتری ... کم از کم اس برتری پر سب کو یقین تھا۔ لیکن اس کا ثبوت؟ میں نے اس کی موافقت میں ہر ایک سے ثبوت طلب کئے لیکن سب خاموش۔ ایک ذہین اور طباع ذات کے لئے یہ ایک نہایت اچھا موقعہ تھا۔ تمام باتیں پردۂ راز میں! نامعلوم! اور سب کی سب مسلّم! اور ثبوت؟ ثبوت کچھ نہیں! کیا تعجب ہے کہ اس کے بعد انسان کی برتری پر میرا یقین متزلزل ہونے لگا۔ کیا انسان واقعی ہم پر بزرگی رکھتا ہے؟ کیا یہ عقیدۂ پارینہ اور واہمۂ طفلانہ تو نہیں ہے؟ جس وقت میں نے اپنے دل میں اس قسم کے

سوالات کئے، فی الفور میرے خیالات نے پلٹا کھایا۔ اس کے بعد میں نے تحقیقات وانکشاف حقیقت کا بیڑا اٹھایا۔ اس محنت کا ثمرہ آج میں آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

"تمام ظاہری اور سطحی باتیں انسان کی فوقیت کے غلاف ہیں۔ ہم فضائے آسمان کی سیر کر سکتے ہیں لیکن انسان زمین پر چلتا ہے۔ ہماری پرواز آسمان تک ہے۔ لیکن انسان! انسان کی کل کائنات زمین سے ایک خفیف سی جست اور پھر زمین پر گر پڑنا ہے۔ اس کے علاوہ ہر دم جبکہ اس کی ایک ٹانگ اوپر کو اٹھتی ہے تو دوسری لامحالہ زمین پر ہوتی ہے۔ ورنہ یہ انسان جسے ہم بدقسمتی سے ابتک افضل تر خیال کرتے رہے ہیں بری طرح سے ناک کے بل گر پڑے۔ وہ اسی بھونڈے طریقے سے ایک جگہ سے دوسری جگہ چلتا پھرتا ہے۔

"ہم قدرتی، خوشنما اور چمکدار پروں کے لباس میں ملبوس ہیں۔ یہ عمدہ لباس، جو ہمیں گرمی کے دنوں اور سردی کے ایام میں ہر وقت میسر ہے۔ انسان کو دیکھو کہ وہ سمور، اور پروں دونوں سے محروم ہے جو اس کے علاوہ دنیا کے ہر ذی روح کو آرام بخشتے ہیں۔ اس کی تکلیف دہ کھال نہ گرمی کے لئے موزوں ہے، اور نہ سردی کے موافق۔ ہر موسم میں اُسے کپڑے لادنے پڑتے ہیں حیف! کیسا بھونڈا لباس! کیسا ناگوار بوجھ! یہ کیسی برتری ہے؟"

ایک اور فیصلہ کن مثال سنئے جس کی سچائی ہر فلسفی دماغ کو متاثر کرے گی یعنی ہماری جنس اور ہماری قوم اپنے ماحول، اور ہم میں سے ہر فرد اپنی ذات سے مطمئن ہے۔ برخلاف اس کے، انسان ہمیشہ غیر مطمئن رہتا ہے۔ قناعت اُسے چھو نہیں گئی، سکون اُسے نصیب نہیں۔ وہ تغیر پسند ہے، ہر وقت ہر لمحہ، تبدیلی کا خواہشمند رہتا ہے، جس کی وجہ سے نہ اُسے خود چین اور آرام ملتا ہے اور، جیسا کہ بدقسمتی سے ہمیں تجربہ ہو گیا ہے، نہ وہ دوسروں ہی کو چین لینے دیتا ہے۔ میرے دوستو! اگر بے اطمینانی ہی موجب فوقیت ہے تو اس سے کم رتبہ ہی ہونا اچھا۔ تف ایسی برتری پر، لعنت ایسی بزرگی پر جس میں قناعت و اطمینان عنقا ہو جائے۔

"مجھے یقین ہے کہ میری اس تقریر نے آپ کے دلوں سے پرانے خیالات کو دور کر دیا ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ اب آپ سب حضرات حقیقت کے سننے اور اس کے تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔ جو حضرات میرے ان دلائل سے مطمئن ہو گئے ہوں وہ زمین سے اوپر اٹھیں اور اظہار اتفاق رائے کے لئے ایک دفعہ کاؤں، کریں۔

"... اب ایک اعتراض باقی رہ گیا ہے۔ جب انسان ہمارے آشیانوں پر دست ظلم دراز کرتا ہے تو اکثر غم انگیز حادثات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ یہ کثیف ہستی، یہ انسان ہمارے بسیرا کرنے والے پیڑوں کے نیچے کھڑا ہو کر نہایت ہی حقیر و ذلیل جسامت والی لکڑیوں سے ہمارے آشیانوں پر نشانہ بازی کرتا ہے۔ لیکن کسی خاص ترکیب کی وجہ سے، جس پر غور کرنے کا مجھے موقعہ نہیں ملا ہے، اس میں سے نہایت ہی کرخت دھماکے کی آواز ہوتی ہے۔ اور بعد ناگوار دھواں نکلتا ہے۔ اور اس آواز کے ہوتے ہی یقیناً ہمارے چند بچے نیچے گر پڑتے ہیں جنھیں انسان بلا کسی مزید جدوجہد کے پکڑ کر اپنے ہمراہ لیجاتا ہے۔ اس داستان غم انگیز سے ہم میں سے کون واقف نہیں ہے؟ زیادہ ملال اس بات کا ہے کہ ہمارے پیارے بچوں کی پھر کچھ خبر نہیں ملتی۔

بعض اصحاب اس قسم کے ناگوار واقعات کو انسان کی برتری کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ فعل، جو سراسر ظلم اور جور پر مبنی ہے کس طرح بزرگی پر دلالت کر سکتا ہے۔ کیا یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ انسان آ کر ہمیں بے چین کرے اور ہم اس کی برتری ہی کے گیت گاتے رہیں۔ یہ کہاں کی بزرگی ہے؟ اور بھی زیادہ قابل تاسف یہ امر ہے کہ والدین ہزارہا برس سے اس خیال کو پشت در پشت اپنے بچوں پر منتقل کرتے چلے آئے ہیں جس کی وجہ سے معصوم بچوں میں ایک غیر معمولی دہشت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی بزدلی اور موروثی خوف کی وجہ سے نازک کم فہم، ناتجربہ کار بچے انسان کا شکار بن جاتے ہیں۔ یہ تو شاذونادر دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی تجربہ کار اور معمر کوا اس خوف کا شکار ہوا ہو..... اس معاملہ کی بابت میں بہت کچھ کہہ چکا۔ اب مجھے اپنے فرض کے خوشگوار حصے کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور انسان کی اصل پر بحث کرنی چاہئے۔ یہ مسئلہ حقیقت انسان اُن تمام پیچیدہ اور پوشیدہ اُمور پر نہایت خوبی اور وضاحت سے روشنی ڈالیگا جو اب تک پردۂ اخفا میں تھے۔

میرے دوستو! انسان ہم سے اعلیٰ نہ کبھی تھا نہ اب ہے بلکہ در اصل وہ ہماری ہی جنس کا ایک فرد پست اور خستہ حالت

اور دوسری ہئیت میں ہے۔ میں نہایت زور سے یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ ہزارہا سال پہلے، بہت ہی قدیم زمانے میں، انسان ہماری طرح کوا تھا۔ ہماری طرح وہ پروں میں ملبوس تھا، ہماری طرح پیڑوں پر رہتا تھا، بجائے چلنے کے اڑتا تھا، پتھر کے صندوق میں رہنے کے بجائے آشیانوں میں بسیرا کرتا تھا، اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہماری طرح خوش اور قانع تھا۔!

"یہ نہایت ہی زبردست نظریہ ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ اسے فوراً تسلیم کر لیں۔ لیکن اگر اس کو مختلف طریقوں سے آزمانے اور جانچنے کے بعد آپکو یہ ماننا پڑے کہ اس نظریہ کے ذریعے آپ ان مسائل کو حل کر سکتے ہیں جو ابتک لاینحل خیال کئے جاتے تھے، تو میں بہ بانگ دہل یہ کہنے کو تیار ہوں کہ آپ میرے اس نظریے کو اس سے بہتر اور کوئی نتیجہ پیش کئے بغیر، رد نہیں کر سکتے۔ میں اس مقدمہ پر قایم ہوں کہ اگر حقیقت حال اس طرح پر نہیں ہے جس طرح میں کہتا ہوں تو پھر کس طرح پر ہے۔؟ میں پھر آپ کو یہ یاد دلاتا ہوں کہ ہر چیز کا حل معلوم کرنا عمدہ ہے اور ممکن بھی ہے۔

"اب میں ایک قدم اور آگے بڑھتا ہوں۔ میں آپ کے سامنے ایک ایسا حل پیش کرتا ہوں جو واقعات اور حقیقت پر مبنی ہے۔ اور میں آپکو چیلنج دیتا ہوں کہ یا تو آپ میری رائے سے اتفاق کیجئے، یا میرے اس تحقیقاتی سوال کا جواب دیجئے کہ اگر حقیقت حال اس طرح پر نہیں ہے جس طرح میں کہتا ہوں تو پھر کس طرح پر ہے؟ ۔ معزز حاضرین جو میرے اس رویہ کو جائز و مناسب خیال کرتے ہیں اعتراف کے طور پر ایک کاؤں کہیں....

" بالکل متفقہ طور پر! صرف چند میرے بزرگ پس و پیش کرتے ہیں۔ اور عمر کا اقتضا ہے بھی یہی۔ جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے × × × × × × × × × فطری طور پر جدید خیالات سے نفرت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ میری امیدیں زیادہ تر جوانوں ہی سے وابستہ ہیں لیکن میں سب حضرات کو امید کی نظروں سے دیکھتا ہوں۔ حضرات میں ایک مرتبہ پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

اے فضائے آسمانی کی سیر کرنے والے پرندو! دنیا، اس کی حماقتیں، خودنمائی و خودپسندی ہماری طرح تمہارے دلوں میں بھی جاگزیں ہیں.... لیکن خاموش! تقریر پھر شروع ہوتی ہے۔

ابتدا اس طرح کیجئے کہ میرا نظریہ صحیح ہے، اور انسان اصل میں کوا تھا۔ تو اب اس کے دماغ کی کیا حالت ہوگی؟ اس کے جذبات کس قسم کے ہوں گے؟ اور ہمارے ساتھ جو اس کی اصل ہیں اس کا کیا سلوک اور کیسا برتاؤ ہوگا؟ کیا اصلیت سے دور ہو جانے اور پستی میں گھر جانے کا احساس اُسے اپنی موجودہ حالت سے غیر مطمئن نہ بنا دے گا؟ کیا یہ احساس اُسے مجبور نہ کرے گا کہ وہ اپنی اصلی اور ابتدائی حالت حاصل کرنے کی کوشش کرے اور اپنے حقیقی مورثوں کے ساتھ چھوٹے ہوئے تعلقات قائم کرنے میں کوشاں ہو۔ کیا اُسے ہم سے ملنے کی، ہمارے گروہ میں ہونے کی اور پھر ہم جیسا بننے کی تمنا نہ ہوگی۔ ہاں، ہوگی اور ضرور ہوگی! پھر تعجب ہی کیا ہے کہ وہ اپنی حالت سے، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں مطمئن نہیں ہے۔ اور حیرت کا کیا موقعہ ہے اگر وہ کوشش سے ہمارا پیچھا کرے، اور جب اُس کے پاس سے چلے جائیں، تو وہ قرب حاصل کرنے کی کوشش کو جاری رکھے۔ خدانخواستہ از راہِ کینہ نہیں، جیسا کہ بدقسمتی سے ہم ابتک خیال کرتے رہے، بلکہ.... تجدید تعلقات کے لئے، محبت جبلی کی وجہ سے!

"میرے دوستو! میری آنکھیں اس خیال سے اشکبار ہیں کہ اب تک انسان کی طرف سے ہمارے خیالات کسقدر غلط اور بے بنیاد تھے۔ افسوس انسان نے ہماری اُس بے اعتنائی اور بے مروتی سے کیا سمجھا ہوگا۔ وہ ہمیں کس قدر بے رحم، بے درد.... میرے جذبات کو معاف کرو.... اور ہمدردی کے اظہار کے لئے کاؤں کاؤں کرو۔"

اب ہمارے پیارے بچوں کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اُن کی گمشدگی کی وجہ، اور اس کے بعد کے حالات کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ اور ہمیں وہ منظر نظر آنے لگتا ہے جس پر ہم کو نازاں ہونا چاہیئے۔ میری تخیل کی آنکھیں اُنہیں دیکھتی ہیں۔ میں نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اُن پتھر کے صندوقوں میں، جن کے اندر ہم نہیں دیکھ سکتے، بہت خوبی اور آرام سے زندگی گزارتے ہیں۔ اُن کے قید کرنے والے ان کے ہر فعل کو نظر استحسان سے دیکھتے ہیں۔ انسان اُن کے ہر کام کی تقلید کرتے ہیں.... یہ صرف خیال ہی نہیں ہے بلکہ اصلیت و حقیقت کا سچا خاکہ ہے۔ جسے میں ناقابل تردید دلائل سے پایۂ ثبوت کو پہنچا دونگا۔ انسان صرف ہماری ظاہری صورت ہی کی نقل نہیں کرتا ہے بلکہ ہمارے اقوال و افعال، خصائل و عادات کی بھی تقلید کرنا باعث فخر سمجھتا ہے۔ انسان کا یہ کرنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ

ہمارے بچوں کا اس میں زبردست ہاتھ ہے اور وہی انسان کو اس شاہراہ پر چلانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ہاں۔ یہ ہمارے ہی مایۂ ناز فرزندوں کی کارگزاری کا شاہد ہے۔ ... ورنہ انسان کو اس طرح رہنمائی کرنے والا اور کون مل سکتا ہے؟

"دوستو! مجھے نہایت مسرت ہے کہ آج میں نے آپ کے سامنے سے وہ پردہ اٹھا دیا جس کی وجہ سے حقیقت پوشیدہ تھی۔ آج انسان کے اصلی ارادے، اور بظاہر مشکوک و ناگوار برتاؤ کا حقیقی مقصد ظاہر ہوگیا۔ آپ کہیں گے کہ یہ سب کچھ صحیح سہی، لیکن آخر کوے کس طرح انسان بن سکتے ہیں؟ یہ نہایت معقول سوال ہے اور میں اس کا نہایت مناسب جواب پیش کرونگا۔ میں آپ کو اس وقت کی حالت پر متوجہ کرتا ہوں۔ آپ اور میں، اس وقت، اس پہلے قدم کی، جو ہماری قوم کے ایک فرقے نے، ابتدا میں پستی کی طرف اٹھایا، زندہ مثال ہیں۔ اپنے آشیانوں سے دور، درختوں کو چھوڑ کر، ہر چہار طرف سے، ہم اسوقت انسان کی طرح اس پارک میں جمع ہوئے ہیں، انسان ہی کی طرح بھونڈے طریقے سے زمین پر چلتے ہیں، اُڑنے کے بجائے زمین پر پھدکتے ہیں... گویا کہ ہم نے یہ طے کرلیا ہے کہ آئندہ سے اُڑنا ہی چھوڑ دینگے، وغیرہ۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ ضروری اشیاء مطلوبہ، دانہ، روٹی، باداں اور تنکے وغیرہ چننے کے لئے تھوڑی دیر کو زمین پر اترنا اور بات ہے لیکن زمین پر اس وقت کی طرح مدت قیام کو طول دینا سراسر مضر و خطرناک فعل ہے۔ اور یہی مہلک فعل، عادت کی صورت اختیار کرکے، ہماری جنس کے ایک گروہ کی رسوائی اور پستی کا باعث ہوا۔ ممکن ہے کہ ہزار ہا سال گزر جائیں اور قوم کو اس مہلک عادت کا اثر، جو قوم کے ہر فرد پر حاوی ہو، محسوس نہ ہو، یا من حیث القوم متوجہ نہ کرسکے، کیونکہ تدریجاً سرایت کرنے والی برائی مشکل سے محسوس ہوتی ہے لیکن ان تدریجی اثرات کو (جو عرصۂ دراز میں پھیلے ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں معلوم ہوتے) یکجا جمع کرو اور پھر دیکھو کہ کتنے زبردست اور بظاہر ناممکن اور خلاف امید نتائج پیدا ہوتے ہیں! آپ میں سے جو مجھ سے مخالفت کرنے کی جراءت کرتا ہو تو اس کا اظہار کرے ..... آپ سب خاموش ہیں گویا آپ مجھ سے اتفاق رکھتے ہیں۔

"اب ذرا ازمنۂ قدیمہ پر نظر ڈالو۔ ہماری جنس کے افراد کا تصور کرو۔ اُن میں سے بعض دوسروں کے مقابلے میں نحیف و نزار ہوں گے۔ اُن کے قوائے پرواز میں عارضی کمزوری لاحق ہوگی۔ یا کوئی اور نقص واقع ہوگا۔ یہ کچھ بعید از قیاس امر نہیں کیونکہ من حیث القوم، ہر قوم میں چند خراب و خستہ، ناچار و کمزور افراد ہوتے ہیں خیر اس کمزوری کے باعث وہ کچھ عرصے کے لئے پرواز سے مجبور ہے۔ لہذا انہیں مجبوراً زمین ہی پر رہنا پڑا۔ لیکن بدقسمتی سے اُس کمزوری کے رفع ہوجانے پر بھی انہوں نے زمین پر رہنے کی آسان، لیکن مضرت رساں، عادت کو جاری رکھا۔ رفتہ رفتہ یہ مہلک طریقہ اُن کی سرشت میں داخل ہونے لگا۔ اور قدرتی طور پر وہ اڑنے سے کترانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زمین پر چلنے پھرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی قوت پرواز زائل ہوتی رہی۔ پَر اور پہلو کمزور ہونے لگے۔ یہ کمزوری پشت در پشت منتقل ہوتی رہی۔ قدرت کے قاعدے نے اپنا اثر ڈالنا شروع کیا۔ پر و بال جھڑ گئے کیونکہ ان کے نشوونما کے موافق آب و ہوا ہی میسر نہیں ہوتی... حتیٰ کہ عرصہ دراز کے بعد یہ کمزوری، جو ابتدا میں نہایت ہی معمولی معلوم ہوتی تھی، ترقی کرتے کرتے ناقابل تسخیر ہوگئی۔ ہماری قوم کا یہ فرقہ اڑنے ہی کے قابل نہ رہا۔ یہ تمام امور اس بات کے حامل ہیں کہ ان کے اصلی ڈینے اپنی خوبصورتی اور حسن سے محروم ہوگئے اور صرف وہ ننگا حصہ رہ گیا جو موجودہ انسان کے بازو اور پنجہ کا کام دیتا ہے۔ اشیاء مطلوبہ کی گرفت کے لئے یہی بھونڈا پنجہ کام میں لایا جاتا ہے۔ اس تحقیقات کی سچائی میں کچھ کلام نہیں ہوسکتا اگر اس بات کو پیش نظر رکھ لیا جائے کہ تغیر تدریجاً، آہستہ آہستہ، غیر محسوس انداز سے نہایت ہی وسیع و دراز عرصے میں واقع ہوا تھا۔

"میں نے انسان کی جو تصویر آپ کے سامنے پیش کی ہے اُسے دیکھئے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ جسامت میں بڑھ گیا ہے۔ آپ پوچھیں گے یہ کیسے؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ اس کی بھول خصائل و عادات کا اقتضا ہے جو اس قسم کی بالیدگی کا باعث ہوتی ہیں۔ اور نشوونما کی قوت جو پر و بال کی پیدائش پر صرف ہوتی تھی آخر کہاں جائے؟ وہ اب اس طرف رجوع ہوگئی اور انسان کی بڑی جسامت اسی قوتِ نشوونما کی مرہون منت ہے۔ پر و بال اس کے نہیں، کھال اس کی بے حد نازک، بیچارہ نہ پرندوں ہی میں سے اور نہ چرندوں میں ہی، دوپایہ، روئے زمین کے ہر جانور کی مدد کا محتاج، اپنے ماحول، اپنی ذات سے غیر مطمئن!۔ یہ ہے اُس بدنصیب خراب و خستہ جانور کی تصویر! کیا اس تصویر میں ہر کوئی انسان کی شبیہ نہیں دیکھ سکتا ہے۔؟ ... انسان کپڑے کیوں پہنتا ہے؟ یہ ظاہر ہے۔

ہر جانور کی طرح اسے بھی قدرتی لباس میسر تھا جسے اس نے اپنی نا اہلی سے ضائع کر دیا۔ اب حفاظت کی خاطر مصنوعی پوشاک مہیا کرتا پھرتا ہے۔

''معزز حضرات! تنگیٔ وقت کے باعث میں ہزارہا معلومات میں سے صرف چند پر اکتفا کروں گا۔ میں نے اپنی قطعی رائے قائم کرنے کے بعد بھی اپنی تحقیقات کو جاری رکھا۔ لیکن چونکہ ذاتی طور پر میری موجودگی بیک ساعت، ایک ہی جگہ ممکن تھی اس لئے میں نے اس نیک کام میں چند معزز احباب سے بھی مدد لی۔ جن میں مسٹر زاغ دشتی، مسٹر سیاہ منقار اور مسٹر سیاہ چشم خاص طور پر میرے مشکور ہیں۔ ان بزرگوں نے میرے ارادے اور غرض کو اچھی طرح سمجھ کر بہت سی معلومات بہم پہنچائی ہیں جن میں سے چیدہ چیدہ آپ کے گوش گزار کرتا ہوں،

مسٹر زاغ دشتی کا عین مقصد یہ تھا کہ وہ انسان کی اس جدوجہد کی بابت شہادت فراہم کریں، جو وہ اپنا اصلی سیاہ رنگ حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے۔ تکمیل تحقیقات کے لئے مسٹر موصوف نے اُن سنگین اور خشتی صندوقوں کے مجمع کے پاس جانے کے ناگوار کام سے گریز نہیں کیا جنہیں انسان شہر، قصبہ یا گاؤں کہتا ہے۔ تاکہ وہ وہاں کے باشندوں کے طرز معاشرت کو دیکھ سکیں۔ مسٹر دشتی یہ راز معلومات میرے پاس آئے۔ اُن کا بیان ہے کہ انسان سیاہ ہونے میں کوشاں ہے۔ سڑکوں پر سیاہ رنگ تمام اور رنگوں پر غالب ہوتا چلا جاتا ہے، سیاہ رنگ دیواروں کا، چھتوں کا، سیاہ رنگ انسان کی اس بدنما چیز کا جس سے وہ اپنا سر ڈھانکتا ہے! سیاہ رنگ اس کے بھونڈے بوٹوں کا جن سے وہ اپنے پیروں کو چھپاتا ہے! انھوں نے چھوٹے چھوٹے صندوقوں کے سوراخوں میں سے کالا رنگ نکلتے دیکھا! غرض سیاہ رنگ قریب قریب ہر چیز کا اور ہر جگہ! ایک اور دوسرے موقعہ پر، ملک کے بعض حصوں میں انھوں نے انسان کی قطاروں کو صبح کے وقت گھروں سے نکلتے دیکھا۔ وہ سفید تھے، اور شام کو لوٹتے ہوئے دیکھا، وہ سیاہ تھے سب کے سب! ان بیچاروں نے تمام دن سیاہ رنگ حاصل کرنے میں صرف کر دیا تھا۔ تب کہیں انہوں نے کالا رنگ پایا تھا۔ لیکن یہ نمایاں تغیر کن ذرائع سے روپذیر ہوا تھا، اسے مسٹر دشتی نہ معلوم کر سکے۔ کیونکہ وہ مقامات جن میں جاتے ہی انسان نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے یا تو گہرے گہرے غار تھے، یا آگ، گرمی اور دھوئیں سے بھرے ہوئے بڑے بڑے خشتی صندوق، جن میں جا کر کوئی پرندہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ مسٹر موصوف اس نتیجے پر پہنچے کہ وہاں ہر چیز سیاہ تھی، اور جو آدمی ان کے اندر عرصہ تک رہتے تھے وہ کالے ہو جاتے تھے۔ لیکن مسٹر زاغ کا بیان ہے کہ یہ رنگ صرف ایک ہی دن قائم رہتا تھا کیونکہ دوسرے دن صبح کو انہیں پھر سب سفید نظر آتے تھے۔ اور پھر وہ سیاہ بننے کی تمنا میں اتنے ہی مصائب برداشت کرنے کو تیار جن کو سہہ کر انہوں نے پہلے دن کالا رنگ حاصل کیا تھا!۔ انسان کی یہ جدوجہد مسلسل جاری ہے۔ افسوس! انسان اس چیتے رنگ کو حاصل کرنے کے لئے کیسی کیسی مصیبتیں برداشت کرتا ہے!

لیکن امر مسرت آگیں ہے کہ انسان کا ایک گروہ اس جدوجہد میں مستقل طور پر کامیاب ہو گیا ہے اس گروہ کے ہر فرد کا رنگ بالکل سیاہ ہے اور بہت پختہ رنگ ہے۔ اس گروہ نے کچھ ایسے ذرائع بہم پہنچائے ہیں کہ سیاہ رنگ تا مدت العمر یکساں رہتا ہے، اور سب سے زیادہ خوبی یہ ہے کہ یہ رنگ نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔ کاش یہ نسخہ سفید رنگ والوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ بیچارے کوؤں جیسا بننے کی کوشش میں مرے جاتے ہیں!... حضرات، یہ تمام حالات مسٹر دشتی کے چشم دید ہیں اس لئے اُن کی صداقت میں شمہ بھر شک کی بھی گنجائش نہیں ہے۔

اس کے بعد مسٹر سیاہ منقار کی خدمات بھی قابل تحسین ہیں۔ انہوں نے اس بات کی شہادت فراہم کی ہے کہ انسان پھر درختوں پر بودوباش اختیار کرنے کی فکر میں ہے۔ حضرت منقار کا بیان ہے کہ انہوں نے ملک کے اکثر حصص میں نہایت بلند۔ تنگ اور سیدھے خشتی صندوق استادہ دیکھے۔ جن کا دور ہمارے بڑے بڑے درختوں کی برابر ہے۔ وہ بہت کچھ درختوں سے مشابہ ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ اُن میں شاخیں نہیں ہوتیں۔ ان بلند ستونوں کے سروں پر سے انھوں نے سیاہ دھوئیں کے بادل کے بادل نکلتے ہوئے مشاہدہ کئے جس سے مسٹر زاغ دشتی کے بیان کی بھی تائید ہوتی ہے اور یہ بات بھی کلیتہً طے ہو جاتی ہے کہ آجکل انسان کے درمیان ابتدائی صورت کو حاصل کرنے اور قدیم طرز معاشرت کو لوٹنے کے لئے بہت کچھ کوششیں ہو رہی ہیں۔ جس کا ان درخت نما صندوقوں سے بخوبی پتہ چلتا ہے۔ اگر انسان شاخیں مہیا کرنے میں اور کامیاب ہو گیا تو دیکھ لینا کہ ایک عرصے میں۔ لفظ ''ایک عرصے'' بخوبی واضح رہے

انسان ان خشتی درختوں میں آشیانے بنائیں گے۔ جیسے کہ وہ کبھی قدرتی درختوں میں بنانے کے عادی تھے۔

آخر میں مسٹر سیاہ چشم کی معلومات کا تذکرہ کر دینا بھی ضروری اور مناسب ہے۔ کیونکہ وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ انسان کھوئی ہوئی قوت پرواز حاصل کرنے میں کوشاں ہے۔ پرواز ہی کے لئے اُس نے مشینیں اور غبارے ایجاد کئے ہیں جو بدنما اور بدنظر سہی؛ لیکن اس مسئلہ شہادت کی ایک زبردست کڑی ہیں جس سے یہ نظریہ پایہ تصدیق کو پہنچتا ہے کہ انسان واقعی اپنے مورث اعلیٰ کے خصائل و عادات حاصل کرنیکا متمنی ہے۔ وہ ہم پر اپنی بے بسی اور پستی کا اظہار کر کے ہماری استعانت اور مدد کا خواہاں ہے۔ وہ ہماری طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے کہ ہم اُسے آئندہ کی بہتری کی امید سے مایوس نہ کریں۔ لیکن عرصۂ غیر معلوم سے قطع تعلقات ہونے کے باعث اُس کی زبان بھی ہم سے مختلف ہو گئی ہے۔ جس کی وجہ سے تبادلۂ خیالات قریب قریب ناممکن سا نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو آوازیں وہ اپنے بے چونچ والے منہ سے نکالتا ہے اُن کے سُننے سے سخت کوفت ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ انسان کی کاربراری کے لئے کافی ہو لیکن ہمارے لئے وہ قطعی بے معنی جھنکار ہے انسان کے آپس میں بات چیت کرنے میں، اس کی مخلوط آوازوں میں، اس کے چیخنے اور چلانے میں، اس کے ہنسنے۔ نعرے مارنے، سیٹی بجانے میں.... نہ کچھ وقار ہی پایا جاتا ہے۔ نہ کچھ شان ہی ہوتی ہے، نہ شیرینی ہوتی ہے اور نہ ترنم!

میرے دوستو! اب میری تقریر ختم ہونے والی ہے آج میں نے آپ کے سامنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن کی صداقت میں کسی کو کلام نہیں۔ جس صبر سے آپنے میری تقریر کو سُنا اس کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کوّے سے انسان بن جانا، پھر انسان کی ابتدائی حالت پر واپسی کی تمنا، اور پھر تحصیل مدعا کے لئے اُس کی جد و جہد۔ یہ امور سب پر واضح و روشن ہو گئے۔ انسان کا اپنی کوششوں میں کبھی نہ کبھی کامیاب ہونا یقینی ہے۔ ہاں! اب آئندہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچو۔ انسان تمہیں خشتی آشیانوں میں بسیرا تے دکھائی دیگا ہماری طرح پروبال سے مزین و ملبوس، کیونکہ ضرورت اس کی مقتضی ہو گی کہ پرواز کے لئے پروبال نکلیں، اور انسان تمہیں شاہراہ ترقی پر گامزن نظر آئے گا.... یہاں تک کہ وہ اپنی موجودہ ذلیل حرکات کو چھوڑ دے گا۔ اس غیر موزوں زبان کو بھول جائے گا۔ اور اکبار پھر وہ ہماری طرح کوّا ہو کر بصد نغمۂ و ترنم کاؤں کاؤں کرنے لگے گا۔ ہاں وہ پھر قانع اور مطمئن ہو جائے گا..... ہماری آنکھیں اس مبارک دن کو دیکھیں۔ لیکن... دریغا، واحسرتا ... افسوس ہم نہ ہوں نگے!"

(مسز گیٹی)　　سید رضی الحسن چشتی

غزل

حسن کی جلوہ پاشیاں جب ہوں نظر کے سامنے　　دل ہو ہزار مرمریں خس ہے شرر کے سامنے

رنگ جمال خواب تھا یاد ہی اسقدر ہے مجھے　　کوند گئی تھیں بجلیاں میری نظر کے سامنے

عشق کی فتنہ کوشیاں۔ آنکھ کی خوں فروشیاں　　لالہ و گل ہیں داغ داغ قلب و جگر کے سامنے

دونوں جہاں کی چاندنی میری نظر میں آگئی　　آئے وہ چاندنی میں جب بزمِ قمر کے سامنے

شعلۂ جستجو ہے دل فتنۂ آرزو ہے دل　　عالم رنگ و بو ہے دل میری نظر کے سامنے

خود ہو شہیدِ جستجو شاکر تشنہ کام تو　　آبِ حیات کے لئے جھک نہ خضر کے سامنے

(غیر مطبوعہ)　　شاکر صدیقی

کیا تعلیم ایک بیکار چیز ہے

مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم اچھی طرح اس سوال پر غور کرلیں کہ موجودہ تعلیمی نظام کس وقت فائدہ مند ثابت ہوگا۔ اس گراں قدر درخت کے پھل لانے کا وقت کون سا ہے؛ اگر ہم اس نتیجے پر پہنچیں۔ کہ شاہ بلوط کی طرح یہ درخت صدیوں کے بعد پھل دیگا۔ تو اس صورت میں اس نظام کے حامیوں کو اپنے استدلال کی بنا مذہبی اصولوں پر قائم کرنا پڑے گی۔ جن لوگوں نے دنیا کی بڑی بڑی عبادت گاہیں تعمیر کی ہیں۔ اُن کا استدلال بھی مذہبی بناؤں پر قائم تھا۔ اور اس نظام کے لئے پروپیگنڈا کرنے والوں کے دلائل بھی مذہب ہی کے ذریعے تقویت پائیں گے۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں عمارت کی تکمیل کے لئے پشتہا پشت تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔

دوسری طرف اگر ہم اس نتیجے پر پہنچیں۔ کہ تھوڑے سے عرصے تک ہم کو فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ تو یہ تعمیری نظام یقیناً خودغرضی کے جذبات کے ماتحت قبول کر لیا جائے گا۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو کم از کم وہ دلچسپی جو ایک پشت کے لوگوں کو دوسری پشت کے لوگوں سے ہوتی ہے۔ اس بات کی ضامن ہوگی۔ کہ اس نظام کو قائم رکھا جائے۔

ہم اپنے نتائج کو یوں ترتیب دے سکتے ہیں۔

(۱) کیا اس سے مسرت میں کوئی اضافہ ہوگا؛ عام حالات پر تعلیم کا کیا اثر پڑے گا؛ متعلم کی زندگی مجموعی حیثیت سے کس طرح متاثر ہوگی؛

(۲) کسی فرد واحد کے تعلیم یافتہ ہونے کا اس کی قوم پر کیا اثر ہوگا۔ اور اس تعلیم سے کیا مادی فوائد حاصل ہونگے۔

(۳) نسل انسانی کے ارتقا میں تعلیم کس حد تک مدد دے گی۔

یہ امر بہت مشکوک ہے۔ کہ ایا پہلی شق کے ماتحت کچھ فائدے مترتب ہونگے یا نہیں۔ اس امر کے قاطع دلائل موجود ہیں۔ کہ علم کے ساتھ غم بھی یوماً فیوماً متزاید ہوتا جاتا ہے۔ اور جہاں تک مادی فوائد کا تعلق ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ زمانۂ ماضی میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے ہوئے آدمی نہ تو سب سے زیادہ دولت مند ہوتے تھے۔ نہ سب سے زیادہ با اقتدار اور یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کہ مستقبل میں اس کے خلاف واقع ہوگا۔

جن طریقوں سے دولت جمع کی جاتی ہے۔ ان کا سمجھنا دشوار نہیں لیکن جب یہ طریقے سمجھ میں آ جائیں۔ تو ان میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا چاہئے کہ کسب زر کے طریقے آسان ہیں۔ مگر ان پر عمل کرنا مشکل ہے۔ اور یہ ایک ایسا مرحلہ ہے۔ کہ ذہنی ارتقا اور تعلیمی اسناد کے باوجود ان طریقوں پر عمل کرنے میں کوئی آسانی نہیں ہوتی۔ علم کی بھوک جو باقی تمام خواہشات کو مغلوب کر لیتی ہے۔ تحصیل علم کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ اور یہ بغض ایک ایسی شے ہے۔ جس کو ایک بے لذت جذبے سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایک ایسا بے لذت جذبہ جس کی پیدا کی ہوئی آرزوئیں اور تمنائیں کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ جن لوگوں نے تعلیم کے انتہائی مدارج پر پہنچ کر دم لیا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ کہ ابھی بہت کچھ باقی ہے۔

حد حسن تو با دراک نشاید دانست
ویں سخن نیز باندازۂ ادراک منست

یہ خیال کہ تعلیم یافتہ اشخاص غیر تعلیم یافتہ اشخاص کی نسبت اپنی روزی زیادہ آسانی سے کما سکتے ہیں۔ غیر تعلیم یافتہ طبقے کا ایک وہم ہے۔ اگر کوئی شخص یہ ارادہ کرے۔ کہ میں اپنی اعلیٰ تعلیم کے ذریعے روزی کماؤں گا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس نے روزی کمانے کے لئے بہت مشکل کام کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ عام طور پر مشاہدہ اس بات کا گواہ ہے۔ کہ جتنی کوشش تعلیم یافتہ اشخاص کو کسب معاش میں صرف کرنی پڑتی ہے۔ وہ اس معین مقدار سے کہیں زیادہ ہے۔ جس کی پابندی معاشرت کے اصولوں کے ماتحت لازمی قرار دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں جس شخص نے اپنی زندگی کے بہترین لمحے تحصیل علم میں گزار دیئے ہیں وہ اس شخص سے کبھی مقابلہ نہیں کر سکتا جس کا مقصد سوائے کسب زر کے اور کچھ نہیں ہے۔ اور جو تعلیم سے بے نیاز ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے اثر و اقتدار کو اپنا مطمح نظر بنا لیا ہے۔ وہ ان عالموں سے بدرجہا زیادہ مقتدر ثابت ہونگے۔ جن کی ذہنی صلاحیتیں تحصیل علم نے جذب کر رکھی ہیں۔ تعلیم انسان کو کسی شعبۂ حیات میں کوئی خاص مدد نہیں دے سکتی۔ کسب زر ایک جادوگری ہے۔ اور عوام الناس کے قلوب پر ان عظیم الشان لوگوں کا دائمی اثر ہے۔ جن کے نام اور کام سے تعلیم یافتہ آدمی قطعاً ناواقف ہے۔ یا اگر ایسا نہیں تو پھر اقتدار ان لوگوں کو میسر ہے۔ جو تعلیم یافتہ طبقے کے خیالات سے بالکل بے پرواہ ہیں۔

صرف وہی شخص عوام الناس کی قیادت کر سکتا ہے۔ جو اس امر کی صلاحیت لے کر پیدا ہوا ہو۔ کہ وقت کے ساتھ عوام الناس کے جذبات کی پیروی کرتا ہے۔ اور انہیں خیالات و جذبات کا اعلان کرے۔ جو عوام الناس کے دل میں موجزن ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی شے ہے۔ جو اعلیٰ تعلیم کے منافی ہے۔

اس بات سے قطع نظر کسب زر کے وسائل سائنٹیفک اصولوں پر مبنی ہیں۔ اور اس لئے لازماً ان لوگوں کی محنتوں کا ثمرہ ہیں جنہوں نے اپنی تمام ذہنی اور جسمانی قوتوں کو ایک نقطۂ مرکزی پر جمع کر دیا ہے۔ اور اس طرح ...گیر دست کا احساس کرنے سے عاجز ہو گئے ہیں۔ اگر یہ لوگ اس بڑھتے ہوئے ذخیرے کو دیکھ سکنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ جس کو وسیع کرنے میں وہ خود ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔ پھر بھی اس بات کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ نہ تو اس ذخیرے کے جمع کا سہرا ان کے سر ہوگا۔ اور نہ وہ اس ذخیرے کو مناسب غرض کے لئے پر خرچ کرنے کے اہل ثابت ہوں گے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ جب شرکت افتکار کے وجود کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی اس کے قیام و تکمیل کے لئے صدیوں کا وقفہ درکار ہوتا ہے۔ سٹیم ریلوے کا نظام میرے دعوے کی تائید کرتا ہے۔ آخر کار نفع کا بیشتر حصہ ان لوگوں کو ملتا ہے۔ جنہوں نے نظام کی تعمیر و تکمیل میں کوئی گراں قدر حصہ نہیں لیا۔

کسی کے خیال یا نئی ایجاد کو لیجئے۔ اگر اس کی تاریخ کے مطالعے کے لئے کافی مسالہ موجود ہے۔ اور آپ اس مسالے کو تنقیدی نقطۂ نظر سے استعمال کرتے ہیں۔ تو آپ پر ثابت ہو جائے گا۔ کہ ہر ایک ایجاد یا نیا خیال زیادہ تر ان لوگوں کی محنتوں کا ثمرہ ہے۔ جو اپنی حیات میں اپنے لگائے ہوئے درخت کو بار آور ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکے۔ اور جنہوں نے ان مادی فوائد سے کوئی استفادہ نہیں کیا۔ جن کی وجہ سے دوسرے لوگ شاہانہ طریق پر رہنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

ان باتوں سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ تعلیم کسی ایک فرد کے لئے اتنا تو کر سکتی ہے۔ کہ وہ اس میں صحیح اور ثمر آور تفکر و تدبر کا مادہ پیدا کر دے۔ مگر اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتی۔ بظاہر تعلیم کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق کسی ایک قوم سے ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے صفحات اور ہمارے ذاتی مشاہدات تعلیم کے حامیوں کے تمام وہموں کی تکذیب کر دینگے۔ سائنس اور ادب کے تمام شعبوں کی ترقیوں کی تاریخ پڑھ لیجئے۔ آپ لازماً اس نتیجے پر پہنچینگے۔ تعلیمی اثر کے نتائج عام حالتوں میں صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس وقت یہ کہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ کہ آیا ترقی تعلیم کی پیدا کردہ ہے۔ یا کسی اور محرک کی۔

یورپ کے زمانہ جہالت کے بعد پہلا شخص جس نے بجلی کے کاموں میں دلچسپی لی۔ ڈاکٹر گلبرٹ تھا۔ وہ ۱۵۴۰ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۶۰۳ء میں فوت ہو گیا۔ اس شخص نے بجلی کے کرشمں کے متعلق بہت سی باتیں قلمبند کی ہیں۔ مگر اس کے مشاہدات کا عملی فائدہ کوئی نہیں نکلا۔ پھر ۱۶۷۲ء میں بایل کا عہد آتا ہے اس نے بھی کچھ نہیں کیا۔ پھر ۱۷۴۰ - ۱۷۰۰ میں فریکلس نے اپنی تحقیقات جاری رکھیں۔ بے سود۔

آخر الامر گلبرٹ کے ۴۰۰ سال بعد بجلی کے متعلق کچھ کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔

اب آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ تعلیم نے کسی قوم کو کتنا اور کس قدر جلد نفع پہنچایا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ تعلیم کی اشاعت اور ترویج اس بنا پر نہیں ہونی چاہئے۔ کہ اس سے پڑھنے والوں کو ان کی زندگی میں فائدہ ہوگا۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ تعلیم سے کسی آدمی کی مسرت میں اضافہ نہیں ہوتا۔ یہ غیر ایماندارانہ پروپیگنڈا ہے۔ کہ تعلیم سودمند ہے۔ جو لوگ سکول اور کالج قائم کرتے ہیں۔ وہ کبھی اپنی محنتوں کا پھل دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہتے۔ پروفیسری اور استادی دو ایسے پیشے ہیں۔ جن کی کوئی قدر نہیں۔ جن کے لئے کوئی میدان عمل نہیں۔

بڑے آدمیوں کی سوانح عمریاں اٹھا لیجئے۔ آپ کو بلا استثنا نظر آئیگا کہ جن لوگوں کے سوانح حیات قلمبند کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں۔ جس نے کوئی اثر اقتدار یا دولت حاصل کی ہو۔ اور تعلیم سے بہرور ہو چکا ہو۔ آپ دیکھینگے کہ یا تو اس کی تعلیم بہت معمولی تھی۔ اور یا وہ اپنے تعلیمی زمانے میں بہت کند ذہن تصور ہوتے تھے۔ جو لوگ اس مضمون کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر حضرات میری اس یاس آشنا ذہنیت پر ضرور مجھ کو کوسینگے۔ لیکن کچھ لوگ یقیناً ایسے بھی ہونگے۔ جو میرے ساتھ اس بات کا احساس کرینگے۔ کہ درحقیقت انسان اپنی محدود عمر میں ایک ایسی شے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جو اس مختصر وقفے میں کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

ایسے لوگوں کی خواہش ہوگی کہ وہ میرے خیالات اس بارے میں بھی سن لیں۔ کہ تعلیم نسل انسانی کے ارتقا کو کس طرح متاثر کرتی ہے۔

جہاں تک موجودہ شہادت کا تعلق ہے۔ ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں۔ کہ اگر تعلیم کا کوئی اثر ارتقائے نسل انسانی پر ہے۔ تو وہ اس قدر کم ہے۔ کہ اس کا

ذکر حذف کیا جا سکتا ہے۔

آج کل ایک ایسا گروہ موجود ہے۔ جس کی رائے ہیں خصایل کبھی توارث عمران کے طور پر ایک پشت سے دوسری پشت تک منتقل ہوئے تے ہیں۔ اور ان خصایل میں سے اکثر تعلیم کے پیدا کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر اس گروہ کی تعداد بہت کم ہے۔

لوگوں کا خیال ہے۔ کہ تعلیم کے عام ہو جانے کے بعد شادی بیاہ کے معاملے میں بہت حزم و احتیاط سے کام لیا جائے گا۔ دولہا دلہن اپنے آپ کو نسلِ انسانی کے ارتقا کی ایک لڑی سمجھکر اپنے بچوں کی صحت کی خاطر ایک دوسرے کا انتخاب بہت سنجیدگی اور احتیاط سے کیا کرینگے

یہ لوگ مدعی ہیں۔ کہ اس طرح آہستہ آہستہ بقائے اصلح کا اصول اپنا کام کرتا رہے گا۔ اور بالآخر وہ لوگ جو زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے فنا ہو جائینگے۔

تاہم میں یہ کہنے پر مجبور ہوں۔ کہ جب تک فطرت کی طرف سے کسی قوم میں ترقی کی صلاحیت نہ رکھی گئی ہو۔ تعلیم ان کو کوئی فائدہ نہیں بخش سکتی۔

نہ تعلیم کے فقدان سے کوئی نقصان۔ اور نہ تعلیم کی تحصیل سے کوئی فائدہ۔

جواد حیدر

درسِ خودداری

(از حضرت آغا حشر کاشمیری)

یقین اُن کی عنایت کا زینہار نہ کر — بہشت بھی جو یہ بت دیں تو اعتبار نہ کر

ہر ایک اشک تماشائے صد گلستاں ہے — امیدِ عیش کو شرمندۂ بہار نہ کر

وہ مرگ عشق کی لذت سے آشنا ہی نہیں — دعائے خضر پہ آمین بار بار نہ کر

ترانہ جنگ کا شورِ شکست دل کو سمجھ — کبھی اطاعتِ تقدیرِ روزگار نہ کر

جہاں میں کشمکشِ جہد کا ہے نام حیات — یقین مسئلہ جبر و اختیار نہ کر

متاعِ عیش فتوحاتِ سعی کا ہے صلہ
سپاس سنجیٔ ایامِ روزگار نہ کر

(منتخب)

ہنری برگساں

پیرس مئی ۱۹۱۲ء

مشہور فرانسیسی فلسفی برگساں کی تصانیف "مادہ اور حافظہ" "تخلیقی ارتقا" "خندہ" دنیا سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ دنیا کی تقریباً تمام زندہ زبانوں میں ان کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور اکثر ملک میں برگساں کے فلسفے کا اثر محسوس کیا جا رہا ہے۔ اہل انگلستان ان تصانیف کو بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے۔ کہ برگسان نے جو عمیق مطالعہ انگریزی فلسفیوں کے شاہکاروں کا کیا ہے وہی اس کے انداز فکر و استدلال کا ماخذ ہے۔

جرمن میں بھی اس کی تصانیف کا بہت گہرا اثر ہے۔ مشہور جرمن ہرمن گراف کیزرلنگ لکھتا ہے۔

"عمانوئل کانٹ کے بعد برگسان کا فلسفہ جدت اختراع کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ دوسرے فلسفیوں کے خلاف برگسان ایک ایسا پیغمبر ہے جس کی عزت کرنے میں اس کا وطن بھی پیش پیش ہے۔ قصہ مختصر اس کا فلسفۂ حیات عام و خاص میں مقبول ہے۔

برگسان تعمق فکر کے ساتھ ایک امتیازی انداز تحریر رکھتا ہے۔ اور اپنے خیالات و آرا کا اظہار اس خوبصورتی سے کرتا ہے۔ کہ آدمی عش عش کر اٹھتا ہے۔ یہ عظیم الشان فلسفی زندگی کے دوامی و ازلی مسائل کو ایک نئے پہلو سے دیکھتا ہے۔ اور اگرچہ اکثر کہا جاتا ہے۔ کہ برگسان کے ذہنی ارتقا میں بہت سے خارجی عناصر مدد دیتے رہے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اُس کا فلسفہ حیات بالکل اس کا اپنا ہے۔

برگسان نے کوئی خاص نظام کار پیش نہیں کیا۔ مگر اس نے ہمارے سامنے مستقبل کے دروازے کھول دیے ہیں۔ اور نئے مقاصد نئے امکانات نئے راستے دکھا دیے ہیں۔

مسٹر کار نے جو کچھ فلسفہ تغیر کے متعلق لکھا ہے۔ اس کے ضمن میں انھوں نے برگسان کے فلسفے کا لُبّ لباب یوں پیش کیا ہے

"فلسفہ اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے۔ جو ہمارے ذہن کے مطمح نظر کو مطمئن کر سکے۔ فلسفہ روح کی زندگی کو ظاہر کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ فلسفہ ہمیں خدا اور بقائے دوام تک نہ پہنچا سکے۔ وہ خدا اور وہ بقائے دوام جس کا ذکر مذہبی ادب میں بار بار آتا ہے۔ مگر وہ اس امر کی صراحت کر دیتا ہے۔ کہ انسانی زندگی اور انفرادی عمل دلچسپی کا بہت بڑا مرکز ہیں۔ زندگی کی حقیقت آزادی ہے۔ فلسفہ ہمیں اس مجبوری کے احساس سے رہائی دلاتا ہے۔ جو موجودہ زندگی کے فکر و عمل پر حاوی ہے۔ اور جو اس وجہ سے پیدا ہو گیا ہے۔ کہ سائنس کائنات کو ایک بند مشین کی طرح متصور کرتی ہے۔ زندگی وسیع کائنات میں آزاد ہو کر عمل کرنے کا نام ہے۔ ممکن ہے کہ ہم اس کل میں کوئی حیثیت نہ رکھتے ہوں۔ انسان اور وہ ناچیز کرہ جس پر انسان نے زندگی کے مسائل کو سلجھایا ہے کائنات کی زندگی میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ مگر انسانی زندگی بالآخر کائنات کی زندگی ہی کا ایک ضروری جزو ہے۔ جدوجہد محرک حیات ہے۔ ہماری روحانی زندگی کا مطلب صاف ہے۔

ماضی فنا نہیں ہوا مستقبل زیر تعمیر ہے"۔ . . .

میں پیرس میں پروفیسر موصوف سے ملا تھا۔ وہ امریکہ کے فلسفیوں کا بہت مداح تھا۔ اور خاص کر ولیم جیمز کی تعریف سے تو وہ تھکتا ہی نہ تھا۔

اس نے کہا۔ آپ لوگ فلسفے میں بڑا کام کر رہے ہیں۔ آپ کی نفسیات کی کتابیں تو لاجواب ہیں۔ میری نظر میں ولیم جیمز امریکہ کے سب سے بڑے آدمیوں میں سے ایک ہے۔ بلکہ دنیا کے بڑے آدمیوں میں سے۔ اور صرف اسی زمانہ کے نہیں۔ بلکہ تمام زمانے کے آدمیوں میں سے۔

میں نے پوچھا کیا آپ کسی اور تصنیف میں مشغول ہیں؟

برگساں نے کہا میرے کام کرنے کا طریقہ خاص ہے۔ میں اسے انارکسٹوں کا طریقہ کہا کرتا ہوں۔ جب میں کسی موضوع کا انتخاب کرلیتا ہوں تو اسکے اپنے خاص طریقے سے کام شروع کر دیتا ہوں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ کہ کسی موضوع کے متعلق سوچتے سوچتے مجھے کئی اور باتوں کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل ہوگئی ہیں۔ مگر ان باتوں کے باوجود تصنیف مکمل نہیں ہوتی۔ اس لئے میں یہ نہیں کہ سکتا۔ کہ میری نئی تصنیف کب مکمل ہوگی۔ میں عمارت کی تعمیر میں مصروف ہوں۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ آیا اُسے تکمیل تک پہنچا بھی سکوں گا یا نہیں۔ میرے فلسفہ کا کوئی نظام نہیں ہے۔ میرے لئے کوئی سادہ اصول نہیں ہے۔ جس سے کہ کام لیکر میں اپنے خیالات کو ایک منظم صورت دے سکوں۔ فلسفے میں بہت مشکل مسائل سامنے آتے ہیں۔ اور ہر مسئلہ خاص طریقے سے حل ہوتا ہے۔ جو طریقہ آپ نے ایک مسئلے کے حل کرنے میں صرف کیا تھا۔ وہ دوسرے مسئلے میں کارآمد نہیں ہوسکتا۔ ہر ایک کے سوال کا جواب نیا ہونا چاہیئے۔

ایک بار مجھے ایک شخص نے کہا تھا۔ میں چند سوالوں کا جواب دوں۔ میں نے صاف کہہ دیا تھا۔ کہ اس کے سوالات کے جواب تیار کرنے کے لئے کم از کم دس پندرہ سال کی مہلت درکار ہے۔

میں نے کہا مگر بعض عام سوال ایسے بھی تو ہوں گے جنکے متعلق آپ کی رائے قائم ہو چکی ہو گی۔

" ہاں! مشروط جواب تو میرے پاس بہت سے ہیں۔ مگر میری نظر میں اس رائے کی کوئی وقعت نہیں جو سرسری طور پر ظاہر کی جائے۔ کسی مسئلے پر رائے دینے کے لئے لازمی ہے کہ رائے دینے والا اس مسئلے میں غرق ہو جائے۔ اس نے اس مسئلے کو ہر پہلو سے جانچا ہو۔ اس کی قوت مشاہدہ بہتر ہو۔ اسکا ادراک اور اس کی باطنی حالت ارتقا یافتہ ہو۔ اب حس باطنی اور ادراک محض اندازہ ہی نہیں۔ وہ لوگ جو حس باطنی اور ادراک کو اندازہ کہتے ہیں غلطی پر ہیں۔ میری نئی تصنیف اخلاقیات اور روحانیات سے متعلق ہوگی۔ ان چیزوں کے اصولوں سے۔ میں پروفیسر ڈیوں کی کتاب سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ یہ کتاب قوت اختراع و فکر کا ایک بہت اعلےٰ نمونہ ہے۔ امریکہ میں جو تحریکات اشاعت تمدن پارینہ کی قائم ہوئی ہیں مجھے اُن سے بہت دلچسپی ہے۔ امریکہ میں مذہب اور اخلاقیات کا سوال بہت دلچسپ ہوگیا ہے۔ عملی طور پر کام ہو رہا ہے۔ یہاں یورپ میں تو صرف نظریئے قائم ہوتے ہیں اور کچھ نہیں ہوتا۔

میں نے پوچھا امریکہ اور یورپ کی مذہبی تحریکات میں یہ فرق کیوں پایا جاتا ہے؟

پہلے تو یہ امریکہ کے لوگ عملی لوگ ہیں۔ وہ اپنے اخلاق و تمدن کیلئے قواعد و ضوابط کا ایک مجموعہ طلب کرتے ہیں۔ یہ کیسی عجیب بات ہے۔ کہ موجودہ فلسفیوں نے اس خواہش کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لینبرٹز نے ایک مجموعہ مکارم اخلاق مرتب کیا ہے۔ مگر اس میں صرف کلیات سے بحث ہے۔ کانٹ نے اپنے شاہکار میں اخلاقیات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اسقدر مبہم اور غیر واضح ہے۔ کہ عملی زندگی میں اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔

کانٹ نے کہا ہے۔

"اس طرح عمل کرو۔ کہ تمھارا عمل کائنات کا اصول بنجائے۔"

عملی زندگی میں اس مقولے پر عمل کرنا دشوار ہے۔ آپ خود اس مقولے کو سرمایہ داری اور مزدوری کے حال پر منطبق کرکے دیکھئے۔ دونوں گروہوں میں سے ہر ایک اس طرح عمل کرے گا۔ کہ اس کا عمل کائنات کا اصول بن جائے۔ مگر یہ کون فیصلہ کرے گا۔ کہ ان لوگوں میں سے کون راستی پر ہے دونوں میں سے ہر ایک یہی کہے گا۔ کہ اُس کا عمل کائنات کا اصول بنا لیا جائے۔ یہ ٹھیک ہے۔ کہ فلسفی کے جواب حساب داں کے جوابات کی طرح صاف اور درست نہیں ہوسکتے۔

امریکہ نے محسوس کر لیا ہے کہ فلسفیوں نے ضروری سوالات کا واضح جواب نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ امریکہ میں مذہبی اور اخلاقی تحریکات زور پر ہیں مجھے مذہب اور اخلاق کے باہمی تعلق سے بہت دلچسپی ہے۔

میں نے پوچھا آپ نے اپنی اکثر کتابوں میں دوام روح کے متعلق لکھا ہے۔ کیا آپ نے اس معاملے میں کوئی مزید تحقیق کی ہے۔

" میں نے عقل اور حافظے کی بیماریوں کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ خاصکر ان صورتوں میں جب میں حافظے اور

عقل کا تعلق صاف صاف دیکھ سکتا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عقل اور دماغ کے عمل ایک نہیں ہیں۔ عقل جو کچھ کرتی ہے اس کا بہت تھوڑا حصہ دماغ کے سپرد ہوتا ہے۔ گویا عقل ایک ملک ہے اور دماغ اس کا ایک شہر ہے۔ ملک جو کام کرتا ہے وہ شہر کے کام سے بہت وسیع ہوتا ہے۔ دماغ کی موت کا امکان ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ دماغ کے فنا ہو جانے کے بعد عقل کام کرتی رہتی ہے۔ اس بات سے میں نے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ عقل جسم کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ میں صاف صاف نہیں کہہ سکتا کہ عقل فانی نہیں۔ مگر ظن غالب ہے کہ عقل کو فنا نہیں۔ موجودہ فلسفہ اس معاملے میں مزید تحقیق کر سکتا ہے۔ فلسفہ بھی سائنس کی طرح ترقی کر سکتا ہے۔

میں نے پوچھا آپ کو ادب وصنعت کی نئی تحریکات سے بھی کوئی دلچسپی ہے؟"

برگساں نے جواب دیا "مجھے ہر اس چیز سے دلچسپی ہے جس سے ذہانت کا اظہار ہوتا ہو۔ میں ادب کے مختلف نظریوں پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ ادب وصنعت میں سکول کوئی شے نہیں۔ جوہر قابل سب کچھ ہے۔ کچھ دن ہوئے میرے پاس ایک صاحب تشریف لائے۔ جو کیوبسٹ مصوروں کی کارفرمائیوں کے متعلق میری رائے دریافت کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا جوہر قابل جو طریقہ اختیار کرے وہی کامیاب ثابت ہوگا"

"آپ کو مصنفین میں سے کون کون سے حضرات پسند ہیں"

"میں بارریز کو بہت پسند کرتا ہوں۔ اس کے ہاں الفاظ کا جو ترنم ہے وہ اسے شاعر کا رتبہ بخش دیتا ہے مگر بدقسمتی سے اس کا انداز تحریر اسقدر انوکھا ہے۔ کہ ترجمے میں اس کی تمام دلچسپی جاتی رہتی ہے۔ روسی مصنفین میں مجھے دوسٹو ویسکی بہت پسند ہے۔ وہ کبھی اشیاء کے تصویر کھینچنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ وہ آپ کو وہی اشیاء دکھا دیتا تھا۔ محسوس کروا دیتا تھا اس نے انسانی روح کو عریاں دکھایا ہے۔ وہ انسان کے لطیف سے لطیف جذبے کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا تھا۔

میں نے پوچھا نسوانی تحریکات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

برگساں نے جواب دیا۔ میرا مشاہدہ بتاتا ہے۔ کہ مرد اور عورت کی عقل میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ عورتوں کو اس بات کا موقع نہیں دیا گیا۔ کہ وہ فلسفیانہ تصانیف کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ اکثر میں نے عورتوں اور مردوں کے مضمون ایک ہی موضوع پر لکھے دیکھے ہیں۔ آپ تمیز نہیں کریں گے کہ ان میں عورتوں کے کونسے مضامین ہیں اور مردوں کے

(ترجمہ)　وفا

صبح

جمالِ مہر انجم سوز محوِ گرمجوشی ہے　　گلوں میں ہر طرف ہنگامۂ شبنم فروشی ہے

چمن مطرب تجلی نغمہ زن عالم نشاط افزا　　اگر زاہد بھی پی لے مے تو وقتِ چشم پوشی ہے

شجر ہیں وجد میں سرشار ہے معمورۂ دنیا　　نسیم صبحگاہی مست شغلِ مے فروشی ہے

افق سے پھیلتی جاتی ہیں کرنیں مست ہے ہر شے　　چھلکتا جام ہے ٹوٹی ہوئی مہر خموشی ہے

شفق کا بادۂ گلرنگ اور یہ جام مینائی　　طلوعِ صبح بھی تمہید رسم بادہ نوشی ہے

(منتخب)

عزیز آزاد طائر شاخِ گل پر چہچہاتے ہیں
حیات اپنی مگر وابستۂ حلقہ بگوشی ہے

عزیز لکھنوی

"شراب"

"چاہ کند را چاہ در پیش"

آدھی رات کی خاموش تنہائی میں، نفع اٹھانے والا، "مارلو" اپنی لائبریری (کتبخانہ) میں بیٹھا ہوا، نقصان اٹھانے والے۔ موڈس کا وہ خط پڑھ رہا تھا جو اب اسے حفظ ہو گیا تھا۔ کسی شریف آدمی کو اس قسم کا کوئی خط موصول ہونا کوئی پسندیدہ بات نہ تھی۔ دوسرے لوگ مارلو کو ایک شریف آدمی تصور کرتے تھے اور شرافت کے اجزائے ترکیبی کے متعلق وہ خود بھی انتہا پسند نہ تھا۔ وہ آخری بار اس خط کو لفظ بہ لفظ اور جملہ بہ جملہ اس امید پر پڑھ رہا تھا کہ شاید اس وقت تک جملوں سے جو مطلب پیدا ہو رہا تھا اس میں کچھ تغیر ہو گیا ہو۔

یہ ایک کارڈ تھا اور گو اس پر تاریخ تحریر ثبت تھی مگر مقام تحریر نہ تھا۔

"یہ بہانہ کر کے کہ تمہاری ذمہ داریاں اور مشکلات گوناگوں ہیں تم مجھے نہایت معمولی وظیفے دے دے کر ٹالتے رہے ہو۔ لیکن اب مجھے باوثوق ذرائع سے معلوم ہو چکا ہے کہ تم کافی دولتمند اور خوشحال ہو اور تم پر سوائے اپنی ذاتی ذمہ داری کے اور کوئی فرض عاید نہیں ہے۔ مجھے معلوم نہیں (اور نہ میں اس کی چنداں پرواہ کرتا ہوں) کہ تمہاری اس موجودہ خوشحالی کی تعمیر میں میرا کوئی حصہ تھا یا نہیں، لیکن ہاں، یہ ضرور جانتا ہوں کہ اس دولت میں میں بھی نصف کا شریک ہوں۔ سات سال گذرے کہ میں نے اپنی زبان بند کر کے قید خانے جانا گوارا کر لیا تھا۔ لیکن میں گونگا نہیں۔ اور صرف تین لفظ پولیس کے سامنے کھنڈوں تو گڑے مردے اکھاڑنے کے لئے بالکل کافی ہونگے اگر تم نے مجھے دھوکہ میں مبتلا نہ رکھا ہوتا تو میں بھی تم سے سلامت روی سے پیش آتا لیکن خیر اب شرط یہ ہے کہ نصف، نصف بانٹ لینا چاہئے یعنی حساب کے موافق دو ہزار پونڈ میرے حوالہ کر دو۔

میں اس خط کے ذریعے سے تمہیں آگاہ کئے دیتا ہوں کہ اتوار کی رات، یا یوں کہئے پیر کی صبح کو ڈیڑھ بجے تم سے ملنے کے لئے آؤنگا۔ اس وقت تمہارے پڑوسی اور نوکر چاکر بھی سو رہے ہونگے۔ اور میرے خیال میں تم بھی اس وقت کو ترجیح دوگے۔ تنو انتو کے دو ہزار پونڈ کے نوٹ وقت پر تیار رکھنا۔ میں حسب سابق باغ کی جانب سے آؤنگا اور یہ توقع ہوگی کہ کھڑکی چوپٹ کھلی ہو۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر سمجھ لو کہ صدر دروازہ پر کسی پولیس افسر کے ہمراہ ہونگا۔"

"ڈبلیو، ایچ، موڈس"

نہیں، یہ کوئی خوشگوار خط نہ تھا اور بالآخر مارلو کو یہ نتیجہ نکالنا پڑا کہ خط میں جو کچھ لکھا تھا اس کے معنی صاف ہیں اور اس میں تغیر ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں۔ بہرحال اب اتنا وقت (آتشدان پر رکھی ہوئی گھڑی ایک بجکر دس منٹ کا وقت بتا رہی تھی) نہ تھا کہ الفاظ کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں ضائع کیا جاتا۔ اب کام کا وقت آ پہنچا تھا۔ وہ لکھنے کی میز پر سے اُٹھا اور آتشدان کے قریب پہنچکر اس خط کو کوئلوں پر رکھ کر اسے جلتا ہوا دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کا خوبصورت مگر کسی قدر بھدا، شالیتہ چہرہ جاذب توجہ معلوم ہو رہا تھا۔

اس کی لب بستگی اگر عزم کا اظہار کر رہی تھی تو دزدیدہ نگاہوں میں خوف کی جھلک بھی نظر آ رہی تھی۔ سپید رخساروں کی رگوں نے ارغوانی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔ مگر اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکیگا اپنے فیصلہ کو جو اس نے آج سے تین دن پہلے خط کو وصول کرنے کے پانچ منٹ بعد کر لیا تھا پورا کر کے رہیگا۔ یعنی موڈس کو ایک حبہ بھی دیگا اور اپنے آپ کو اس کی مزید پریشانیوں سے نجات دلانے کی غرض سے اس کا قصہ ہی پاک کر دیگا۔ لیکن قصہ پاک کرنے کی تجویز اس

نے ابھی ابھی سوچی تھی اور یہ اس کا آخری فیصلہ تھا ۔

آگ کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے اس نے اپنے دل سے سوال کیا۔ کیا کوئی بات رہ تو نہیں گئی ۔ مگر نہیں، اس نے ہر چیز کا بندوبست کر لینے کے علاوہ اس فیصلہ کے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کر لیا تھا ۔ مورٹن کے دوسرے خطوط کا کیا بندوبست ہونا چاہئیے ۔ انہیں محفوظ رکھنا بہتر ہوگا ۔ کیونکہ ان میں سوائے روپے کے مطالبے یا اظہار تشکر کے اور کچھ نہ تھا، علاوہ ازیں ممکن تھا کہ وہ کبھی کارآمد ثابت ہوں ۔

اس نے آگ کی طرف نگاہیں پھیر کر اس وسیع قطعہ مکان کو دیکھا جس میں ہر قسم کا سامان عشرت مہیا تھا اور جس کا نصف حصہ لائبریری اور نصف بلیرڈ (کھیل) کھیلنے کے کمرے کا کام دیتا تھا ۔ یہ کمرہ اس کی خوش آیند و غیر شادی شدہ زندگی کا ایک مکمل نمونہ تھا جس سے اس کی آرام طلب و خودغرضانہ فطرت کا اندازہ ہوتا تھا ۔

اب اس کی آنکھوں کا خوف ایک پرحسد غیظ کی صورت میں تبدیل ہو چکا تھا ۔ مگر وقت سر پر آپہنچا تھا اور اسے کام کرنا تھا ۔

ڈیسک کے قریب ہی ایک چھوٹی سی میز پر ایک کشتی میں جام شراب، بسکٹوں کی رکابی اور خود کاشتہ انگوروں کی شراب کا صبو (صراحی) رکھا ہوا تھا ۔ وہ میز کے پاس پہنچا پھر معلوم ہوا کہ وہ کچھ تذبذب کر رہا تھا۔ اس نے اپنی واسکٹ کی جیب میں سے ایک ننھی مختصر کاغذ کی پڑیہ نکالی اور اسے بہت احتیاط سے کھول کر اس میں بندھی ہوئی چیز (جو بلور کے ریزوں کی مانند تھی) نکال کر جام شراب میں ڈالدی اور اس میں شراب کی ذراسی مقدار ڈال کر اسے انگلی سے گھسنا شروع کیا۔ بالخصوص لبوں کے پاس سے ۔ اب جام کی ایسی ہیئت ہو گئی کہ گویا حال ہی میں استعمال ہو چکا ہے ۔

پھر پلیٹ میں بسکٹ اٹھایا، آدھا توڑ کر جام کے پاس رکھ دیا اور آدھا آگ کی نذر کر دیا ۔

ایک دفعہ اس نے پھر سوچنا شروع کیا کہ آیا معاملہ کے ہر پہلو پر اچھی طرح غور ہو چکا ہے یا نہیں،

منٹ برابر گزرتے چلے جا رہے تھے ۔

گھنٹہ کی بڑی سوئی آدھا بجانے ہی کو تھی کہ اسے محسوس ہونا شروع ہوا کہ اب عجلت سے کام لینا چاہئیے ۔ یہ سوچ کر وہ کھڑکی کے پاس پہنچے، موٹا پردہ باندھا اور لٹکی ہوئی چادر سرکا کر باہر جھانکنا شروع کیا، رات تاریک تھی ۔ باغ میں کوئی چیز متحرک نظر نہ آتی تھی ۔ دفعتاً سردی سے اس کا بدن کانپنے لگا ۔ اس نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی ۔ چادر اور پردے اٹھا کر پردے ملا دئے ۔

اس نے شیشی پر ایک آخری نظر ڈالی تو ایک خیال دماغ میں آیا جلدی سے ایک کاغذ کا پرزہ لیا اور اس پر "میرا انتظار کرو" کے الفاظ لکھکر جام سے لگا کر رکھ دیا۔ بیشک یہ پرزہ اسے شراب پینے پر آمادہ کر سکتا تھا مگر نہیں جہاں تک شراب کا تعلق تھا اسے کسی ترغیب کی ضرورت نہ تھی کیونکہ جیل جانے سے پہلے بھی وہ بڑا پکا شرابی تھا اور بالخصوص انگور کی شراب تو اسے بہت پسند تھی ۔ حتیٰ کہ وہ اس چھوٹے گلاس کی شراب پینے میں بھی تامل نہ کریگا ۔ اگر وہ بچی ہوئی شراب پھینک بھی دیتا تب بھی اسے ....

مارٹن وہاں سے روانہ ہوا اور کمرہ کے باہر نکل کر کواڑ کھینچے ۔ اور بند کر کے کنجی جیب میں ڈال لی وہ اب ہانپ رہا تھا وہ دیوار سے پشت لگا کر آواز سننے کی کوشش کرتا رہا چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد کھڑکی کے پردے کے سمٹنے کی آواز آئی اور وہ دبے پاؤں ہال کو طے کر کے زینہ پر چڑھ گیا، اس کی کنڈی لگا دی اور سیدھا اپنے خواب کے کمرہ میں چلا گیا جو عین لائبریری کے اوپر واقع تھا ۔ اپنے کپڑے جلدی سے اتارے اور شبخوابی کا لباس پہنا ۔ پلنگ کی چادر اور تکیہ ادھر ادھر بے ترتیبی سے سرکا دیا ۔ پھر خود فرش پر اوندھا لیٹ گیا اور ہمہ تن گوش ہو گیا ۔

(۲)

مورٹن نے کھڑکی کو بہت احتیاط سے بند کیا اور پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہو گیا ۔ اس نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ آپ خود خیال کر سکتے ہیں کہ اسے کمرہ خالی پا کر کتنی تشویش ہوئی ہوگی ۔ مگر وہ اپنے کندھوں کو حرکت دیتا ہوا لکھنے کی میز کے قریب آیا ٹھہر گیا اور اس پر رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھا ۔

مورٹن کوئی کریہہ المنظر شخص نہ تھا ۔ اس کی چمکدار آنکھیں بہت زیادہ مستعد تھیں، تنگ لب بہت پتلے پتلے تھے جن سے نزاکت اور ——— شراب پینے کی عادت کا اظہار ہوتا تھا ۔ ایک ہوشیار قیافہ شناس اسے ایک معتبر آدمی سمجھ لینے میں کوئی پس و پیش نہ کرتا ۔ اس کا لباس گو بہت سیدھا سادا اور سستا تھا مگر حقیر نہ تھا ۔

اب اس کی نظر آگ سے منتقل ہو کر کشتی پر آ جمی اور پھر فوراً ہی مارٹو کے پیغام پر پڑی ۔ اسے ایک دفعہ پھر کچھ شبہ ہوا

اور اس نے اپنے کندھے کو ہلاتے ہوئے زیرِ لب کہا "اب مارلو کو دھوکہ دینے کی جرأت نہیں ہو سکتی" اس نے یہ کہا اور کاغذ کا پرزہ ایک طرف پھینکدیا۔

"خود مفرحات کا استعمال کر رہا تھا، اور دوست کے لئے یہ غیر مصفا جام چھوڑ کر چلدیا مگر مجھے اب پہلے کی مانند بے احتیاطی نہیں کرنی چاہئے اور ہر وقت احتیاط سے کام لینا چاہئے"۔

اس نے یہ کہا اور صراحی اٹھائی۔ ڈھکنا علیحدہ کیا اور شراب کی طرف مخاطب ہو کر کہا "اگر تم پرانے انگوروں کی ہو تو کیا کہنے ہیں، دنیا میں ایک تم ہی تو ایسی چیز ہو جس کی "قیمت" اس کی قدر کی برابر ہے"۔ اس نے بہت احتیاط سے جام بھرا اور لبالب بھرا ——— صراحی ایک طرف رکھدی اور جام ہاتھ میں اٹھایا اور زور سے ایک چھینک لی۔ اس نے مسکرا کر کہا "قسم ہے ——— تم تو وہی "ہو"!"

وہ ابھی تک مسکرا رہا تھا اس نے جام اوپر اٹھایا اور برقی قمقمہ کی روشنی میں لیجا کر دیکھنا شروع کیا۔ اس کے ہاتھ میں مطلق جنبش نہ تھی۔

اس نے باآواز بلند کہا "یہ ہے انجام!" (اس کی محبت بھری نگاہیں شفاف ارغوانی جام کو تک رہی تھیں)

(۳)

جونہی مارلو کو دھم سے گرنے کی آواز سنائی دی اس کا جسم سر سے پاؤں تک لرز اٹھا مگر اس نے فرش پر سے اٹھنے میں مطلق عجلت نہ کی۔ غالباً اسے یہ خوف تھا کہ اگر اس وقت نیچے گیا تو اس کے اعصاب جواب دیدینگے، ہاتھ پاؤں پھول جائینگے اور سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائیگا۔ اسی طرح کئی منٹ تک لیٹے رہنے سے اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

مگر پھر اسے یہ خیال آیا کہ ابھی تو ابتدا ہوئی ہے اور اس فعل کی تکمیل کے لئے اسے ابھی ہمت سے کام لینا چاہئے، علاوہ ازیں رات ختم ہونے سے پیشتر تو اسے لاش کے سوا اور کسی چیز سے واسطہ بھی نہ پڑنے والا تھا۔ پھر دل میں بار بار خیال آیا کہ وقت کا بدترین حصہ تو ختم ہو چکا ہے، اب نیچے چل کر شراب اڑاؤ۔ یہ سوچ کر وہ فرش پر سے اٹھا اور آئندہ کا پروگرام سوچنے لگا۔

اس سوانگ کا اہم جزو وہ لباس تھا جو مارلو پہنے ہوئے تھا۔ اسے پہنے ہی پہنے وہ نیچے آیا اور بہت احتیاط سے (حالانکہ کوئی ضرورت نہ تھی) لائبریری کا قفل کھولا، مگر اس میں بلا توقف داخل ہونے سے پہلے تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا۔ ہر طرف بھونچکا ہو ہو کر دیکھا اور اسی حیرانی کی حالت میں اندر داخل ہوا۔

صرف ایک نظر نے بتا دیا کہ اب مورٹن اسے مزید پریشانیوں سے تکلیف دینے کے لئے زندہ نہیں ہے۔ اور اب سوا بجے اس کے کوئی مزا اڑانے والا نہ ہوگا۔

مورٹن آتشدان کے قریب بائیں کروٹ سے چہرہ کے بل ہاتھ پھیلائے ہوئے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ دونوں مٹھیاں بند تھیں۔ دائیں ہاتھ میں جام شراب کی ٹوٹی ہوئی پیندی تھی اور پیروں میں مارلو کے پیغام کا پرزہ پڑا ہوا تھا۔

مارلو کی یونہی نظر پرزہ پر پڑی اس نے دبے پاؤں آگے سرکنا شروع کیا اور اسے اٹھا کر آگ میں پھینک دیا اور پھر واپس ہو کر وہ کاغذ کا پرزہ نکالا جس میں سفوف بندھا ہوا تھا۔ اس پرزہ کو عین کرسی کے نیچے فرش پر گرا دیا۔

کمرہ میں خاموشی طاری تھی

پردوں کو کسی قدر سرکایا، کھڑکی کو تھوڑا سا کھول دیا تاکہ مورٹن کے کمرے میں داخل ہونے کا طریقہ بالکل عیاں نظر آنے لگے۔

چادروں کو ٹھیک ٹھاک کر کے لائبریری سے نکلنے اور ہال طے کرنے کے بعد "دار الطعام" (ڈائننگ روم) میں پہنچا اور برانڈی کی اچھی معقول مقدار نوش کی۔ جس سے وہ اپنے آپ کو زیادہ ہوشیار، مستعد اور مسرور محسوس کرنے لگا۔

گو لائبریری میں ٹیلیفون موجود تھا مگر وہ اس آلہ کے پاس پہنچا جو ہال کی پشت پر لگا ہوا تھا۔ وہاں پہنچکر پولیس چوکی کو بلا توقف مخاطب کیا۔ اپنا نام اور پتہ دینے کے بعد یہ کہا:۔

"جناب یہاں ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ جب میں اوپر سے اتر کر اپنی لائبریری میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک شخص فرش پر مردہ پڑا ہوا ہے۔ میں نے اسے فوراً ہی پہچان لیا کہ یہ وہی شخص تھا جسے میں مفلوک الحال سمجھ کر مدد دیتا رہتا تھا۔ کچھ عرصہ سے بعض مجبوریوں کی بنا پر میں نے اس کو مدد دینی بند کر دی تھی۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یکایک مر گیا ہے۔ ایک جام شراب اور کاغذ کا ایک پرزہ بھی پڑا ہوا ہے۔ مگر میں نے کسی چیز کو چھوا تک نہیں ہے اور ہر چیز اپنی اصلی ہیئت میں موجود

ہے۔ مہربانی فرما کر چند آدمیوں کو بھیجدیجئے نیز ایک ڈاکٹر کو بھی
ہمراہ بھیجئے گا۔"

چند مختصر سوالات کے جوابات دیکر وہ لائبریری میں واپس
آیا اور برانڈی دیکھ کر دل للچانے لگا کہ تھوڑی سی اور پیوں مگر
پھر یہ خیال آیا کہ وہ پہلے ہی بہت پی چکا ہے نیز پولیس کو ضرورت
سے زیادہ باتیں بتا گیا ہے اس وجہ سے مناسب یہی ہے کہ
فی الحال احتراز کیا جائے۔

پولیس کی موٹر کا انتظار رشتہ امل کی طرح طویل ہو گیا مگر
بارے خدا خدا کر کے موٹر آ پہنچی اور اس کے تیار ہونے سے
پہلے افسر دروازہ پر آ گیا۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا
جس کے کھلتے ہی ایک افسر سارجنٹ اور ایک کانسٹبل داخل
ہوا۔

چونکہ ڈاکٹر کو ایک ضروری کیس دیکھنا تھا اس وجہ سے
وہ چلا گیا تھا مگر پولیس نے اسے واقعہ کی تفصیل سے آگاہ کر
تھا اور وہ بھی عنقریب آنے ہی والا تھا۔

(۴)

ہارلو نے کہا "میں نے چوکیدار اور نوکروں کو مطلق نہیں
جگایا ہے تاکہ کوئی خلل واقع نہ ہو۔"

سارجنٹ نے اس طرح گردن ہلائی گویا وہ اس رائے سے
متفق تھا۔ لیکن اس کی متجسس نگاہیں ہارلو کے چہرہ کا جائزہ
لے رہی تھیں۔

"سارجنٹ صاحب مجھے جو کچھ معلوم ہے عرض کرتا
ہوں۔"

"نہیں نہیں، ابھی ٹھہرو پہلے اس شخص کو دیکھ لینے دو"
ہارلو نے اپنی ناراضامندی کو بڑی مشکل سے چھپایا اور انہیں
لائبریری میں لے آیا۔ اور دھیمی آواز میں کہا:۔

"میں نے کسی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگایا ہے ——
اسے چھوا تک نہیں۔ صرف یہ دیکھا تھا کہ آیا وہ مر گیا یا زندہ
ہے۔"

"وہ مکان میں کیسے داخل ہوا؟"

"میں نے رات کو سب دروازوں میں قفل ڈالدیا تھا۔
سوائے اس کھڑکی کے اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا"

"مسٹر ہارلو آپ آگ جلتی چھوڑ دیتے ہیں؟"

"میں —— میں —— جی ہاں ذرا آج دیر
سے سویا تھا!"

"اچھا، میں اس شخص کو دیکھنا چاہتا ہوں"۔
ہارلو نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "مجھے
معلوم نہیں کہ آپ اسے خودکشی کہینگے یا نہیں —— مگر یہ
ضرور ہے کہ یہ شخص ہوشمند نہ تھا۔"

سارجنٹ نے اس کا جواب دئے بغیر دوزانو ہو کر مردہ
کو دیکھنا شروع کر دیا اور کامل بیس سیکنڈ تک چہرہ پر نظریں
جمائے رکھنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا اور کہدیا کہ

"یہ شخص ہرگز نہیں مرا!"

مورٹن یہ سن کر اچھل پڑا اور کہا "یہی تو بات ہے" (اشارہ
کر کے) اسے اوپر اٹھا لیجئے۔ یہ کیا مذاق کیا ہے آپ نے"۔

سارجنٹ نے کسی قدر ترشرو ہو کر کہا "مگر اس مذاق سے
مطلب کیا ہے"۔

سارجنٹ فرش پر پڑے ہوئے شخص کو دیکھ ہی رہا تھا
کہ وہ بولا:۔

"میں اس کی تشریح کئے دیتا ہوں۔ سنئے میں یہاں آج
رات کو طے شدہ وعدہ کے بموجب، ڈیڑھ بجے کھڑکی کی راہ
سے داخل ہوا کیونکہ مسٹر ہارلو سے ایک بات کے متعلق گفت
و شنید کرنی تھی۔ مگر وہ رضامند نہ تھے۔ اور بات کو ٹال دینا
چاہتے تھے۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو اسے روشنی
سے جگمگاتا ہوا دیکھا مگر یہاں کوئی موجود نہ تھا، صرف ایک کاغذ
کا پرزہ جام شراب سے لگا ہوا رکھا تھا جس پر تحریر تھا۔ "میرا
انتظار کرو"۔

سرفیٹ نے پوچھا کہ "وہ پرزہ کہاں ہے"۔

"جب یہ شخص مجھے مردہ سمجھ کر اپنا اطمینان کرنے کی غرض
سے کمرے میں آیا تو سب سے پہلے اس کاغذ ہی کو آگ میں جلا
دیا —— خیر میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں سخت پیاسا تھا اس
وجہ سے میز پر شراب دیکھ کر ایک جام بھر لیا اور ——"

"میں نے بھی تو اسی صراحی سے تھوڑی دیر شراب پی
تھی —— " (ہارلو نے بمشکل تمام یہ الفاظ کہے)۔

سارجنٹ نے قطع کلام کر کے کہا "ایک وقت صرف ایک
شخص کلام کرے۔ ہاں تم کہو" (مورٹن کی طرف سر سے

اشارہ کیا)

مورٹن نے سلسلۂ کلام جاری کیا۔ "جب میں نے جام بھر لیا اور اسے سونگھا تو بہت اچھی خوشبو آئی اس وجہ سے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس کا رنگ بھی دیکھنا چاہیئے۔ میں نے جام کو روشنی میں لیجا کر دیکھنا شروع کیا مگر جونہی کہ میں اسے نیچا کر کے پی جانے کو تھا مجھے دفعتاً خیال آیا کہ میں نے جام کی تہ میں کوئی چمکدار چیز آہستہ آہستہ بیٹھتی ہوئی دیکھی تھی۔ اس میز پر خوردبین رکھی ہوئی ہے میں نے اسے اٹھایا اور استعمال کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ بلور کے سے ریزے تھے۔ میں سوچنے لگا اب کیا کرنا چاہیئے۔ سوچتے سوچتے یہ سمجھ میں آیا کہ اصلیت معلوم کر لی چاہیئے۔ میں ایک کرسی پر چڑھا اور بہت زور کے دھماکے کے ساتھ فرش پر دھم سے آگرا اور لیٹا ہوا انتظار کرنے لگا۔ میں لیٹے ہوئے انتظار کر ہی رہا تھا کہ دفعتاً خیال آیا کہ ہارلو کا ایک واقفکار ایک محقق کیمادان (ریسرچ کیمسٹ) ہے جس کا نام موکر ہے اور یہ کہ ہارلو اس کے ہاں آیا جایا کرتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کیمادان ہارلو کو یا کسی اور کو ایسا خوفناک زہر دیسکتا ہے مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ ہارلو جیسا شخص کے لئے جو اس کی لیبوریٹری (معمل) میں آیا جایا کرتا ہو آنکھ بچا کے زہر اڑا لینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ بہرحال آپ خود ہارلو سے دریافت فرما سکتے ہیں کہ وہ پچھلے تین دنوں میں اس کے معمل میں گیا تھا یا نہیں ـــــــــ"

"یہ جھوٹا ہے!" ہارلو نے ہانپتے ہوئے کہا

سارجنٹ بولا "میں دونوں سے کہتا ہوں کہ آپ جو کچھ بھی کہیں بہت احتیاط سے کام لیکر کہیں آپ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں ـــــــ"

"بس تقریباً ختم کر چکا ہوں" (مورٹن نے کہا) "صرف یہ کہنا اور باقی ہے کہ جب یہاں لیٹے لیٹے تھک گیا تو میں اکتا کر اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ یہ کمرہ میں داخل ہوا مگر میں نے اس وقت بھی کوئی حرکت نہیں کی۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اگر یہ مجھے دیکھنے کی غرض سے قریب آیا تو پھر اسے مزا چکھادونگا مگر اسوقت خیر گذری کہ وہ میرے قریب تک نہ آیا بلکہ کاغذ کا پرزہ اٹھا کر آگ میں ڈالدیا اور اس کی بجائے ایک دوسرا پرزہ ڈال دیا دیکھئے وہ فرش پر پڑا ہے اس کے نیچے ـــــــ"

"جھوٹ ہے! جھوٹ ہے! یہ بالکل جھوٹا ہے!" ہارلو نے قطع کلام کر کے کہا (اب وہ اپنے اوپر کسی قدر قابو پا چکا تھا) "اگر یہاں کہیں زہر ہے تو کہاں ہے ـــــــ میری شراب میں ہرگز زہر نہ تھا یہ جھوٹ بولتا ہے۔ دیکھئے وہ جام شراب رکھا ہوا ہے میں اس کا ثبوت دے سکتا ہوں اس گلاس کو اٹھا لائیے میں ابھی شراب پی کر بتا دیتا ہوں کہ یہ قطعی جھوٹا ہے، زہر کہیں نہیں ہے!"

کانسٹبل نے سارجنٹ کی طرف دیکھا اور اس نے سر ہلا کر آتشدان پر سے گلاس لانے کی اجازت دیدی۔

ہارلو گلاس ہاتھ میں لے کر کرسی کے پاس آیا۔

تینوں آدمی اس کی طرف متحیر و بیچین ہو ہو کر دیکھ رہے تھے۔ مورٹن تو اس پر اس طرح گھور گھور کر دیکھ رہا تھا کہ گویا وہ مسحور کردیا گیا ہے۔

ہارلو نے صراحی اٹھائی، جام بھرا اور اسے پھر اپنی جگہ پہ رکھکر جام لئے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹا، اور یونہی سر پیچھے جھکا کر اس نے جام پینا چاہا مورٹن جو اب اپنے خیالات کے سمندر سے باہر نکل آیا تھا ایک دم غل مچا کر ہارلو کی طرف بڑھا اور کہا "پکڑو پکڑو، ہرگز مت پینے دو ـــــــ"

ہارلو نے وحشیانہ انداز میں قہقہہ لگایا اور آدھا جام حلق میں انڈیل لیا۔ پھر ذرا دیر توقف کیا، اس کے چہرے پر ایک عجیب کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔

ہاتھ میں رعشہ ہوا۔ اور اس نے جام زور سے کھینچ کر دیوار پر پھینکدیا جو چکنا چور ہوگیا۔ اس کے منہ سے ایسے الفاظ نکلے جن کا تلفظ صحیح نہ تھا۔ جسم میں تشنج (اینٹھن) شروع ہوا موت کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور وہ غش کر کے کانسٹبل کے بازوں میں گر پڑا۔

سارجنٹ گھبرا کر آگے بڑھا اور گھگی بندھی ہوئی آواز میں بولا "یا خدا! یہ تو دم توڑ رہا ہے!"

اسی اثنا میں ڈاکٹر بھی آموجود ہوا۔ اس نے دیکھتے ہی بلا پس و پیش کہدیا کہ یہ زہر تھا اور کچھ نہیں۔ مگر کونسا، ابھی تک شناخت نہ ہوا تھا۔

* * * * * *

اس کے بعد مورٹن کو اکثر رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ اسے کیمادان

کی واقفیت والا واقعہ خوب وقت پر یاد آگیا ورنہ اس کے یہ کہنے کا کون یقین کر سکتا ہے کہ اس نے ایک ناگہانی خیال سے متاثر ہو کر بن چکھا ہوا جام دوبارہ صراحی میں الٹ دیا تھا!؟

(ترجمہ)

ظفر قریشی دہلوی

رباعیات

اللہ رے ستم کہ دل دکھاتے بھی نہیں
ہو کوئی اُداس تو رلاتے بھی نہیں
مایوس دلوں کو چھیڑ جاتے بھی نہیں
روتا ہو کوئی تو مسکراتے بھی نہیں

یہ درد کی دنیا ہے اِدھر دیکھ تو لے
کچھ اور نہیں کہتے مگر دیکھ تو لے
جس دل کا ہے یہ حال تغافل سے ترے
اُس دل کی طرف ایک نظر دیکھ تو لے

بیتاب ہیں تیرا نام لیتے بھی نہیں
ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیتے بھی نہیں
ایسا کب تھا ترا تغافل۔ لیکن
کچھ دل کی تڑپ سے کام لیتے بھی نہیں

گھر چھوڑے ہوؤں کی کوئی منزل نہ سہی
آساں نہیں ہوتی جو یہ مشکل نہ سہی
دن رات فراق اُداس رہنے کیلئے
ویرانہ سہی کسی کی محفل نہ سہی

اے دل تجھے حسن روئے تاباں کی قسم
اے دل تجھے گیسوئے پریشاں کی قسم
جینے سے ہے کس لئے تو اتنا بیزار
اے دل تجھ کو جمال جاناں کی قسم

(غیر مطبوعہ)

فراق

قومی تعصّبات

میں بھی اس قسم کے افراد میں سے ہوں جو اپنے وقت کا بیشتر حصّہ شراب خانوں۔ قہوہ خانوں اور دیگر عام مجالس میں گزارتے ہیں اس سلئے مجھے مختلف لوگوں کی عادات و خصائل کے مشاہدہ کا موقعہ ملتا ہے۔ میرے جیسے غور و فکر کرنے والوں کے لئے یہ مشغلہ مناظرِ قدرت یا صنعت کے خوبصورت مظاہر کے نظاروں سے کہیں زیادہ دلفریب ہے۔ ایک روز مجھے حسن اتفاق سے چند ایسے اشخاص کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا جو ایک قہوہ خانہ میں بیٹھے ہوئے کسی اہم سیاسی مسئلہ پر بحث کر رہے تھے۔ چونکہ ان کی رائیں بالکل مساوی تھیں اس لئے مجھے بطور ثالث طلب کیا گیا۔ چنانچہ مجبوراً مجھے بھی ان کی گفتگو میں حصّہ لینا پڑا۔

مختلف مسائل پر بحث چھڑ رہی تھی آخر کار جب یورپ کے مختلف اقوام کی عادات و خصائل کا ذکر آیا تو ایک صاحب نے اپنی ٹوپی درست کرتے ہوئے، ایسے لب و لہجہ میں گویا تمام انگریزی قوم کی قابلیت صرف انہیں کی ذات میں سمائی ہوئی تھی، یوں گلفشانی شروع کی "اہلِ ہالینڈ بیحد لالچی ہیں۔ فرانسیسی خوشامدی کتے ہیں۔ اہلِ جرمنی مخمور بے وقوف اور حیوانوں کی طرح پیٹو ہیں۔ اہلِ سپین مغرور۔ غصیلے اور حد درجہ ظالم ہیں۔ نیکی۔ شجاعت سخاوت۔ رحمدلی اور دیگر تمام صفات محمودہ میں انگریز تمام دنیا کی قوموں سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔"

اس منصفانہ فیصلہ کو سنکر تمام لوگوں نے مسکرا کر پسندیدگی کا اظہار کیا مگر میں جہاں تک مجھ سے ہو سکا سنجیدگی سے سنتا رہا۔ اور اپنے بازو پر سر کو جھکائے ہوئے ایک طرف کو نہایت انہماک کے ساتھ دیکھتا رہا گویا میں نے ان صاحب کے اس عاقلانہ فیصلہ کو سنا ہی نہیں بلکہ کسی اور خیال میں منہمک تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس طریقہ سے میں اپنی رائے کے اظہار سے محترز رہ کر ان کی مسرت برباد کرنے کے غیر دل خوش کن مشغلہ سے بچ جاؤنگا مگر ہمارے یہ جھوٹے قوم پرست، مجھے اس آسانی سے چھوڑنے والے نہ تھے۔ چنانچہ اس غرض سے کہ اپنی اس بکواس کا پورا صلہ پائیں۔ آپ نے ہر ایک سے تحسین وصول کرنے کے لئے پوچھنا شروع کیا کہ آیا اُن کا خیال بالکل بجا اور حق بجانب تھا۔ مجھ سے بھی یہی سوال پوچھا گیا۔

گو میری عادت ہے کہ میں اپنی رائے ہمیشہ محفوظ رکھتا ہوں۔ بالخصوص ایسے مواقع پر جب مجھے یقین ہوتا ہے کہ میرے خیالات رائے عامہ کے خلاف ہیں۔ لیکن جب کبھی مجبوراً مجھے کچھ کہنا ہی پڑتا ہے تو میں بلا پس و پیش اپنا مافی الضمیر بیان کر دیتا ہوں۔ چنانچہ میں نے صاف الفاظ میں ان سے کہہ دیا کہ "میں ایسے یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تاوقتیکہ تمام یورپ کا ایک دورہ نہ لگالوں اور ان تمام اقوام کی عادات و خصائل کا نہایت غور و خوض کے ساتھ مطالعہ کرلوں۔ شاید کوئی اور غیر جانبدار شخص یہ فیصلہ کرنے میں کوئی تامل نہ کرے کہ اہلِ ہالینڈ دستکاری اور کفایت شعاری میں، فرانسیسی ملنساری اور خوش اطواری میں اہلِ جرمنی محنت میں۔ اہلِ اسپین سنجیدگی اور مستقل مزاجی میں انگریزوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں اور انگریز جلد باز۔ متکلف اور کم حوصلہ ہوتے ہیں۔"

میں نے دیکھ لیا کہ میرے جواب کے ختم ہونے سے پہلے ہی تمام لوگ میری طرف زہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اور جوں ہی میں نے اپنا جواب ختم کیا ان مستفسر صاحب نے زہرخند کر کے فرمایا کہ "مجھے سخت حیرت ہے کہ وہ لوگ جو اپنے ملک سے کوئی الفت نہیں رکھتے اور اپنی قوم سے نفرت کرتے ہیں کیوں اسی ملک و قوم کی حکومت کے سایۂ عاطفت میں پل رہے ہیں۔" یہ دیکھ کر کہ میں نے اظہار خیالات کر کے ان لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیا ہے اور ایسے جہلا سے بحث کرنا بے سود ہوگا۔ میں نے چپ چاپ وہاں سے رخصت ہو کر اپنے گھر کی راہ لی۔ راستہ بھر دل میں قومی تعصبات کی بیہودگی پر غور کرتا رہا۔

قدیم اقوام میں کوئی قول ایسا نہیں جو کسی شخص کے لئے (بشرطیکہ وہ آزاد خیال اور منصف مزاج ہو) اس قول سے زیادہ مسرت بخش ہو سکتا ہو جو اس فیلسوف کی طرف منسوب ہے۔ جس سے اس کی قومیت کے بارے میں استفسار کیا گیا تھا اس

نے کہا تھا "مَیں دنیا کا باشندہ ہوں"۔ آج اس دنیا میں کتنے ایسے افراد ہیں جو یہی جواب دے سکتے ہیں؟ یا جن کے افعال و کردار اس قول کے مطابق ہیں؟ ہم لوگ آجکل کچھ اس طور سے انگریز۔ فرانسیسی۔ جرمن۔ یا ہسپانوی بنگئے ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی "دنیا" کا باشندہ نہیں رہا۔ ہم لوگ کسی خاص چھوٹے سے مقام یا چھوٹی سی قوم سے اس طرح وابستہ ہوگئے ہیں کہ اب ہم اپنے تئیں اس تمام کرۂ ارض کا باشندہ نہیں سمجھتے اور تمام بنی نوع انسان کی اس ایک عظیم الشان اور واحد قومیت سے اپنا کوئی تعلق نہیں سمجھتے۔

اگر یہ تعصبات محض وحشی قوموں میں پائے جاتے تو چنداں مضائقہ نہ تھا اس لئے کہ ان کو تعلیم یافتہ ہوکر اور دوسرے ملکوں کی سیر و سیاحت کر کے اپنے خیالات کے سدھارنے کا کوئی موقعہ نہیں ملتا مگر بدنصیبی تو یہ ہے کہ یہ خیالات ہمارے شرفا میں پائے جاتے ہیں اور ان لوگوں کے افعال تک سے ظاہر ہوتے ہیں شرفا سے میری مراد وہ اشخاص ہیں جن کے اس خطاب کے اہل ثابت ہونے میں سوائے قومی تعصبات کے اور کوئی شے حائل نہیں ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں ہر شریف انسان میں شرافت کی سب سے بڑی نشانی بے تعصبی ہونی چاہئے۔ کوئی شخص خواہ وہ کتنے ہی بڑے گھرانے سے تعلق رکھتا ہو۔ کتنا ہی دولتمند ہو اگر وہ قومی یا دیگر تعصبات سے بری نہیں تو میں اس کے روبرو کہنے کے لئے تیار ہوں کہ وہ ایک کمینہ شخص ہے۔ اور کسی صورت میں بھی شریف کہلانیکا مستحق نہیں ہوسکتا۔

یہ بات آپ عام طور پر دیکھیں گے کہ وہی لوگ اپنی قوم کی تعریف میں زیادہ رطب اللسان ہیں جو خود کسی قابل نہیں۔ کیونکہ انگور کی بیل شاہ بلوط کے گرد اسی لئے لپٹتی ہے کہ وہ خود اپنا بار اٹھانے کی طاقت اپنے میں نہیں پاتی۔

اگر قومی تعصبات کے حق میں یہ کہا جائے کہ "یہ حب الوطنی کے لئے قدرتی طور پر لازمی خیالات ہیں" تو مَیں اس کے جواب میں یہ عرض کرونگا کہ یہ محض وہم اور غلط فہمی ہے۔ میں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ قومی تعصبات کی وجہ سے ہمیں اپنے ملک و قوم سے محبت پیدا ہو جاتی ہے مگر یہ ہرگز نہیں مانوں گا۔ کہ یہ خیالات قدرتاً ضروری اور لابدی ہیں۔ یوں تو ضعف اعتقاد بھی مذہب کے عروج میں بہت مدد دیتا ہے لیکن ہے کوئی ایسا جو کہدے کہ اس پاک اور طیب پودے کی نشو و نما کے لئے ضعف اعتقاد کا ہونا لازمی ہے؟ اگر تم چاہو تو ان خیالات کو اس جنتی پودہ کی چند بیکار اور کمزور شاخیں کہہ سکتے ہو۔ لہذا اگر یہ شاخیں اس پودہ سے توڑ دی جائیں تو اصلی درخت پر اس کا کچھ اثر نہ ہوگا۔ بلکہ یوں کہئے کہ اگر ان بیکار شاخوں کو علیحدہ نہ کیا گیا تو درخت اچھی طرح نشو و نما نہیں پاسکیگا۔

کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے ملک کے ساتھ محبت رکھتے ہوئے دوسری قوموں سے بھی نفرت نہ کروں؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ مَیں شجاعت، دلیری، اور حد درجہ مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے ملک و قوم کی خدمت کروں اور اس کے حقوق کی حفاظت کروں مگر دوسری اقوام کے افراد کو گدھا یا بزدل نہ بتاؤں؟ بیشک یہ ممکن ہے۔ اور اگر یہ ناممکن ہو (مگر میں کیوں ایسی بات فرض کروں جو بالکل غلط ہے؟) تو میں فخر یہ اس خطاب سے ملقب ہونے کے لئے تیار ہوں جو زمانہ قدیم کے اس ادیب نے اپنے لئے اختیار کیا تھا۔ یعنی دنیا کا باشندہ۔ مَیں اس خطاب کو ہر ایک دوسرے خطاب کے مقابلہ میں ترجیح دونگا۔

(گولڈ اسمتھ)

توفیق حسن مسقطی

دشواریوں کو عشق نے آسان بنا دیا
غم کو سرور، درد کو درماں بنا دیا

موجِ شعاعِ حسن ہو یا اضطرابِ شوق
دونوں کو کشمکش نے پریشان بنا دیا

کس کی بہارِ حسن ہے میری نگاہ میں
جس سمت اُٹھ گئی چمنستان بنا دیا

بزمِ ازل سے جھاڑ کے دامن چلا جو مَیں
ذرّوں نے اٹھ کے عالم امکان بنا دیا

(معارف)

اقبال احمد سہیل

مینار کا سایہ

میں نے اس بات پر بہت غور کیا ہے۔ کہ اپنے مشاہدے کے مسودے کو کسی شخص کے حوالے کر جاؤں۔ پہلے تو میں نے سوچا تھا۔ کہ انہیں کسی سائنسدان کے سپرد کر دوں۔ مگر بعد میں اس ارادے کو ترک کرنا پڑا۔ میں خود ایک سائنس داں ہوں۔ اور اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ سائنس داں ہر ایک بات کو شک کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ میرے افسانے کو کوئی اہمیت نہیں دیں گے۔

پھر میں نے سوچا۔ کہ اپنے دوستوں میں سے کچھ حضرات کو اس عجیب و غریب واقعے کا مشاہدہ کرا دوں جو مجھے پیش آیا تھا لیکن افسوس میرے پاس وقت نہ تھا۔ خدائے قدوس نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ میری باقی ماندہ زندگی کے دن گنے ہوئے ہیں۔ جو کچھ میں نے دیکھا ہے اُس کے بیان سے انسان کے خزینۂ علم میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ سائنس کو اس قسم کی باتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ علم ایسے انکشافات سے ڈرتا ہے۔ یہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں۔ یہ واقعہ افسانوں اور داستانوں کی مملکت سے آیا ہے۔

.... میں .... راجپوتانے کے ایک مشہور شہر کے مضافات میں ٹھہرا ہوا تھا۔ (اس مشہور شہر کا نام ظاہر نہ کیا جائے گا) تفکر کے لئے .... سے زیادہ شاندار اور کوئی شہر موزوں نہ ہوگا۔ شام کا وقت تھا۔ اور وہ خموشی جو صبح اور شام کے ملتے وقت طاری ہوتی ہے چھائی ہوئی تھی۔ دائیں طرف ایک بلند مینار آسمان سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ پہاڑوں کے سلسلے پر مخملی مہادر کی طرح آسمان کا حیرت انگیز گہرا نیلا رنگ بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔

دریافت کرنے سے معلوم ہوا تھا۔ کہ اس مینار میں ایک راجپوت شہزادی زندہ چنوا دی گئی تھی۔

یہ حکایت اس طرح مشہور تھی۔ کہ مینار کے پاس ایک پرانا قلعہ ہوتا تھا۔ جو امتدادِ وقت کے ہاتھوں اب برباد ہو چکا تھا جو راجپوت سردار اس قلعے کی تعمیر میں مصروف تھا۔ اُسے خواب میں حکم دیا گیا تھا۔ کہ قلعے کے ساتھ ایک مینار تعمیر کرائے جس کی دیوار میں ایک عورت زندہ چنوا دی جائے۔ سردار نے اس حکم کی پروا نہ کی اور قلعہ کی تعمیر میں مصروف رہا دن کو قلعہ کا جتنا حصہ تعمیر ہوتا تھا شب کو گر پڑتا تھا۔ آخرکار ایک دن سردار صبح قلعے کے کھنڈروں کے سامنے کھڑا ہو گیا اور جو عورت سب سے پہلے اس طرف سے گذری اُسے زندہ چنوا دیا گیا۔

وہ عورت اس کی اپنی بیوی تھی۔

میں اس مقام پر کئی ماہ رہا۔ مینار کے آس پاس پرانے باغ تھے۔ ہر روز دھوپ کی سنہری روشنی میں پھولوں کا ایک بحرِ بیکراں افق کے کناروں میں جذب ہوتا ہوا نظر آتا تھا۔ صبح کی صاف ٹھنڈی فضا میں پراسرار مینار کا سایہ تمام چیزوں پر محیط معلوم ہوتا تھا۔

ہر روز میں خوشگوار دھوپ میں بے فکر خدائے قدوس کا شکر ادا کرتا تھا۔ کہ اس نے انسان کو اپنی نعمتوں سے بہرہ ور کیا۔ خوبصورت تیتریاں۔ مسکراتے ہوئے پھول۔ حتیٰ کہ مینار کے ارد گرد کی خالی جگہ بھی حسین معلوم ہوتی تھی۔ مینار کے پاس کے باغ میں میرے لئے مقناطیس کی سی کشش تھی میں نے کئی بار کوشش کی کہ اپنے ذہن کو اس طلسم کی بندشوں سے آزاد کر لوں۔ اور کسی اور تنہا مقام کا انتخاب کر لوں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا کوئی پراسرار قوت مجھے مینار کی طرف کھینچے ہوئے لئے جا رہی ہے۔ گھبرا کر میں اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھتا۔ اور پھر تھوڑے عرصہ کے بعد پھولوں کے حسن خموش کے پاس پہنچ جاتا۔ جہاں میں بیٹھا کرتا تھا وہاں سے تھوڑے فاصلے پر سورج مکھی کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور ہوا کی موجوں سے جھک جھک جاتے تھے۔ گویا سورج کی زرنگار شعاعوں کو بوسے دے رہے ہیں۔ اس منظر میں

میں مجھ پر مدہوشی کی سی کیفیت طاری ہوجاتی تھی - اور اٹھنا دشوار ہوجاتا تھا۔

میرے سامنے مینار پر اسرار مینار کی بلندی رفعت آسمان کو شرماتی تھی - اور سورج کی خیرہ کن شعاعیں مینار کا جزو معلوم ہوتی تھیں - مینار دھوپ اور روشنی میں بہا بہا جاتا تھا - مگر مینار کا سایہ کسی ہیبت ناک اور عظیم الجثہ دیو کی سوئی کی طرح لرزاں پھولوں کے رنگ پر تاریکی کی ایک لکیر کھینچ دیتا تھا۔

عین دوپہر کے وقت منظر کا اثر اور زیادہ گہرا ہوجاتا تھا - کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ دوپہر کا وقت آدھی رات کے وقت کی طرح ایک پر اسرار وقت ہے - سکون مکمل سکون طاری ہوجاتا ہے - ہر قسم کی حرکت بند ہوجاتی ہے - دنیا خاموش کسی چیز کے انتظار میں محو معلوم ہوتی ہے - خوف کا سامان پیدا ہوجاتا ہے - فطرت سانس روک لیتی ہے - اور بے رحم دھوپ اس خوفناک منظر کے تاثر کو اور بھی گہرا کردیتی ہے -

ہر چیز روشن ہوجاتی ہے - کوئی شے چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی کوئی جائے پناہ - کوئی سایہ نہیں رہتا - کائنات عریاں ہوجاتی ہے - اور دم روکے ہوئے آنے والے خطرے کے انتظار میں محو ہوجاتی ہے - نور کی تابندگی خلاف فطرت معلوم ہوتی ہے - چودھویں کے چاند کی طرح درخشاں سفید روشنی خوفناک نظر آتی ہے - میں ایسے وقتوں میں سر جھکائے ہوئے بیٹھا رہتا تھا - سر اٹھاتے ہوئے مجھے ڈر آتا تھا - میں سمجھتا تھا شاید یہ خوف سورج کی کرنوں نے پیدا کیا ہے - سورج آہستہ آہستہ سر پر آگیا ہے - اور اس کی سوزندہ کرنیں دنیا کی ہر شے کو لباس نور پہنا رہی ہیں - اس تمام روشنی میں صرف مینار کا سیاہ سایہ سنگ مزار کے سائے کی طرح ہیبت ناک اور مرعوب کن نظر آتا ہے -

اسی طرح کا ایک دن تھا - دس بجے کا وقت ہوگا اس وقت سورج گرم دہکتا دیوتا معلوم ہوتا تھا - صبح کی ہوا فرحت انگیز تھی - اور پہاڑیوں پر لطیف اور سبک سائے رقص کر رہے تھے - میں کتاب پڑھ رہا تھا - میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک دہقانی عورت گود میں ایک بچہ اٹھائے ہوئے چلی آرہی تھی - بچہ بیمار معلوم ہوتا تھا - اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اس کی نحیف آواز گریہ سے درد و کرب کا اظہار ہوتا تھا۔

عورت نے بچے کو مجھ سے دس گز کے فاصلے پر کپڑا بچھا کر لٹا دیا اور خود پاس کے ایک کھیت میں چلی گئی

بچہ خاموش لیٹا تھا - ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کا درد و کرب مٹ گیا ہے -

سورج بلند ہوتا جا رہا تھا - بلند اور بھی بلند رنگ برنگ کے پھول عجب طرح چمک رہے تھے - زمین پر ان کے سائے نادر اور عجیب شکلیں اختیار کرتے تھے - میری نگاہ نور اور رنگ کے اس امتزاج سے خیرہ ہوئی جاتی تھی - مجھے باغ لرزتا ہوا نظر آرہا تھا - چیزیں ایک دوسرے میں مدغم ہوتی جا رہی تھیں - مینار آسمان کے سامنے کانپتا ہوا معلوم ہوتا تھا - ایک تیتری ادھر ادھر دھوپ کی لرزاں کھیتی میں پرواز کر رہی تھی . . . .

میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

درخشاں تاریکی مخمل کی طرح نرم اور لطیف - میرے دماغ پر چھا گئی - نیلے اور سرخ نقطے جن کے گرد قوس قزح کے سے رنگوں کا حاشیہ تھا - میری آنکھوں کے سامنے حرکت کرنے لگے ایک نشان بلند ہوکر غائب ہوگیا -

دوپہر قریب تھی . . . .

یکایک ایک چیخ کی آواز آئی - میں نے ڈر کر اپنی آنکھیں کھولیں دوپہر ہوچکی تھی - ایسا محسوس ہو رہا تھا - گویا میں کسی اور دنیا میں آپہنچا ہوں - بے رحم سفید روشنی ہر شے پر منڈلا رہی تھی - ہیبتناک خاموشی اور باغ میں صرف مینار کا سایہ نظر آتا تھا اس سائے میں بچہ لیٹا ہوا تھا - اور گویا اس وقت کے خطرے کا احساس کرکے چیخ رہا تھا - کراہ رہا تھا۔

یکایک میرا دل ڈوب گیا - خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے - میں نے دیکھا مینار کا سایہ بچے پر چھایا ہوا ہے - پہلے بچہ [illegible] سائے میں نہیں لیٹا تھا - مینار کے سائے سے بہت دور تھا - میں نے سورج کی طرف دیکھا - اور پھر دوسرے سایوں کی طرف نظر دوڑائی - پھر میں نے مینار کے سائے کی طرف دیکھا -

بے شبہ علم مناظر و مرایا کے اصولوں کی مطابقت

میں مینار کے سائے کو اس جگہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔

سورج مینار کے اوپر تھا۔ ذرا بائیں طرف۔ اور اس صورت میں سورج کا سایہ مینار کے دائیں طرف ہونا چاہئے تھا۔ حالانکہ اس وقت سایہ بائیں طرف تھا۔ آپ تصور نہیں کر سکتے۔ کہ میرے دل کی کیا کیفیت ہو گئی۔ میں سائنس کے تجارب سے آشنا تھا۔ مگر اس عجیب و غریب منظر کی کوئی تصریح اس مشکل کا کوئی حل میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ چاروں طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی اور تمام سائے دائیں طرف تھے لیکن اندھیرا نہ تھا۔ کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ ہر شے صاف اور واضح اور ایک ناقابل تردید حقیقت کی طرح روشن تھی۔ جوں جوں میں اس عظیم سائے کو بچے پر چھایا ہوا دیکھتا تھا۔ توں توں میرا خوف بڑھتا جاتا تھا۔

دوپہر کی خاموشی میں بچہ رو رہا تھا۔ گویا وہ سمجھتا تھا۔ کہ جو سایہ اس پر چھایا ہوا ہے۔ وہ خلاف فطرت ہے۔ خوفناک ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس ایک سائے نے جو فطرت کے اصولوں کے خلاف عمل کر رہا تھا۔ دوپہر کی گرمی۔ طیور کی خاموشی اور بچہ کی آواز گریہ میں ایک نئے معنے پیدا کر دئے تھے۔

میں اس قدر متاثر ہو چکا تھا۔ کہ میرے ہاتھ پاؤں نے حرکت کرنے سے جواب دے دیا تھا۔ اتنے میں بچے کے رونے کی آواز سن کر اس کی ماں دیوانہ وار دوڑی ہوئی آئی اور بچے کو اٹھا کر لے گئی۔

میں چاہتا تھا۔ کہ اس واقعے کو ایک مرئی شعبدہ تصور کروں۔ مگر سایہ ابھی تک اپنی جگہ قائم تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی تک سرخ اور سبز نشان میری آنکھوں کے سامنے رقص کر رہے تھے۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیال پیدا ہو رہے تھے۔ میں نے سوچا تھا۔ کہ دوسرے اصحاب کو بھی اس واقعے کا مشاہدہ کرا دوں۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد بادل چھا گئے۔ اور جب ایک پیلی سی مخفی شعاع ظاہر ہوئی تو میں نے دیکھا۔ کہ مینار کا سایہ اب اپنی اصلی جگہ واپس چلا گیا تھا۔

کیا میں نے خواب دیکھا تھا؟ اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش میں میرا ذہنی سکون ضائع ہو گیا۔ اور اس اطمینان کی جگہ جو مجھے دیر سے حاصل تھا ایک اضطراب سا پیدا ہو گیا۔ آنکھیں بند کر کے میں نے پھر سائے کا تصور کرنا شروع کیا۔ اور اب مجھے محسوس ہوا کہ نہ صرف سایہ دائیں طرف کی بجائے بائیں طرف تھا۔ بلکہ اس کی لمبائی (اس نسبت کا خیال رکھتے ہوئے جو مینار اور باقی درختوں اور پودوں کے درمیان پائی جاتی تھی) باقی تمام سایوں کی لمبائی سے زیادہ تھی۔

اس سائے کی لمبائی کا بڑھ جانا معجزے سے کم نہ تھا۔

اس کے بعد کچھ دن آسمان پر بادل چھائے رہے۔ ایک ہفتے کے بعد آخر دھوپ نکلی۔ میں ڈرتا تھا۔ کہ شاید سایہ آج پھر اپنی فطرتی جگہ پر نہ ہو گا۔ مگر قریب جانے پر معلوم ہوا کہ یہ میرا خوف بیجا تھا۔ اسی دن مجھے اطلاع ملی۔ کہ اس دہقان عورت کا بچہ سایہ پڑنے کے دوسرے دن مر گیا تھا۔

میں نے اپنے ذہن سے اس احساس کو نکالنے کی بہتیری کوشش کی کہ سایہ اور بچے کی موت میں کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن یہ احساس اسی طرح دل میں قائم رہا۔

اس واقعے کے پندرہ دن کے بعد میں حسب معمول ایک بنچ پر بیٹھا تھا۔ میرے قدموں کے پاس میرا وفادار کتا سنو دھوپ سینک رہا تھا۔ سورج مکھی کے پھول مسکرا رہے تھے۔ گھاس پر ایک کبوتر خراماں تھا۔ میں نے مسکرا کر مینار کی طرف دیکھا۔ اور کہا۔ "اب تم مجھے دھوکا نہ دے سکو گے۔ وہ دھوپ جو اشیاء کو موڑ توڑ کے رکھ دیتی ہے زائل ہو گئی ہے۔ اور چیزیں اپنی اصلی حالت میں نظر آ رہی ہیں"

ابھی آخری لفظ میرے منہ میں ہی تھے کہ سائے نے حرکت کی اس نے دائیں طرف ایک نصف دائرہ بنایا۔ اور اس کے بعد گھڑی کے لٹکن کی طرح ہلنا شروع کیا۔

چاروں طرف خاموشی مسلط تھی۔ دوسرے سائے ساکن تھے مینار بھی اپنی جگہ پر قائم تھا۔ لیکن ان باتوں کے باوجود مینار کا سایہ لٹکن کی طرح ہل رہا تھا۔ گویا آفتاب خود لرزاں ہو۔ میں نے غور سے دیکھا صاف ظاہر تھا۔ کہ باقی ہر ایک چیز ساکن تھی۔ میں نے دیکھا کہ سایہ باغ کی روش سے گذر کر سڑک پر آیا دائیں بائیں ہٹتا ہوا۔ پھرتا ہوا لمبا ہو گیا۔

میں اس وقت کے احساس کا بیان نہیں کر سکتا۔ کبوتر گھبرا کر اڑ گیا۔ کتا ڈر کے مارے بھونکنے لگا۔ سورج مکھی

کے پھول کانپ اُٹھے۔

زمین اس سائے کے بوجھ سے دبی جاتی تھی سڑک کے پتھر گویا کوٹے جا رہے تھے۔ سبزہ اس سائے کے سامنے جھک گیا تھا۔ ایک نارنج کا درخت دوہرا ہوگیا۔ یکایک سائے نے اپنے آپ کو اس جگہ پھینک دیا جہاں کتا بیٹھا ہوا تھا۔ ایک سیاہ ہاتھ کی طرح سایہ کتے پر چھا گیا۔ اور وہاں ٹھہر گیا۔ کتا ہانپنے لگا۔ اور اس کے بعد درد سے کراہتا ہوا بھاگ گیا

میری روح میں اضطراب موجزن تھا۔ مجھے شروع سے معجزوں پر یقین رہا ہے۔ لیکن معجزوں کے مشاہدے اور معجزے پر اعتبار کرنے میں بڑا فرق ہے۔ وہ فرق میرے لئے مٹ گیا تھا۔ میں نے اسی جگہ بیٹھ کر اس راجپوت عورت کی روح کے لئے دعا مانگی جو مینار میں زندہ چنوا دی گئی تھی۔ پھر مجھے اس بچے کا خیال آیا جو سائے کے نیچے گویا دب گیا تھا۔

خدا کے کام انسانی عقل و فہم سے بالا ہیں۔ گناہ کا ثمرہ ملتا ہے۔ اور معصوم بچے بھی اپنے بزرگوں کی سزا سے مامون نہیں رہتے۔

دوسرے دن میں نے کتے کو سرِ راہ مرا ہوا دیکھا۔ اب مینار کی طرف دیکھ دیکھ کے میرا دل بیٹھ جاتا تھا۔ مجھے ڈاکٹروں کے لفظ یاد آگئے۔ انھوں نے کہا تھا۔ کہ میری زندگی کے دن گنے ہوئے ہیں۔

میں چاہتا تھا۔ کہ اس شہر سے چلا جاؤں۔ مگر کوئی پراسرار قوت دوسرے دن پھر مجھے اس مینار کے پاس کھینچ کر لے گئی میں خاموش بیٹھ گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ اب مینار کا سایہ مجھ پر بھی پڑے گا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد پھر سائے نے حرکت کی۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ اور دعا مانگتا رہا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ یکایک سایہ مجھ پر چھا گیا۔ اور سورج کی روشنی ایک لمحے کے لئے میرے لئے غائب ہوگئی۔

اس وقت بھی میرا دل دھڑک رہا ہے۔ عنقریب ایک دو دن تک میں وہاں جانے والا ہوں جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا ہے۔

(شمس الہدےٰ)

نوائے عشق

عروسِ حسن میں رنگیں گلو میں لحنِ دلجو میں — ترا جلوہ تری نکہت تری آواز پاتا ہوں

جمالِ صبحِ نور آگیں میں شامِ عنبریں بو میں — تری نیرنگیوں کے نت نئے انداز پاتا ہوں

غرض ہر چیز میں مستور تیرا راز پاتا ہوں

بہار لالہ و گل سے چمن سے سبزہ زاروں سے — ترے حسنِ جہاں افروز کا اظہار ہوتا ہے

اُمنڈتے بادلوں سے بجلیوں سے آبشاروں سے — جمالِ روح پرور کا ترے دیدار ہوتا ہے

فروغِ حسن تیرا کاشفِ اسرار ہوتا ہے

"تسکین"

لکھنؤی ایک شاعرہ

از

سید تمکین الکاظمی، منشی فاضل (حیدرآباد دکن)

افسوس ہے کہ کسی تذکرے میں اس شاعرہ کا ذکر نہیں جان صاحب لکھنؤ کے مشہور ریختی گو نے ایک غزل اس کی تعریف میں لکھ دی۔ سراپا اور موسیقی کی تعریف خوب کی ہے مگر شاعری کا ذکر تک نہیں کیا، مجھے مولوی آغا حیدر حسن دہلوی پروفیسر نظام کالج کے کتب خانے سے اس کا دیوان ملا، جو بڑی تقطیع کے ۹۳ صفحات پر حکیم وزیر علی صاحب مرزاپوری کی فرمائش اور عبدالجلیل صاحب شگفتہ بھگوان پوری و محمد حسن صاحب اشک، شاگردان نیّر بنارسی کے اصرار پر مطبع اکسیر اعظم مڈیل ہال محلہ مقیم گنج شہر بنارس میں طبع ہوا ہے۔ تاریخی نام "باغ شباب" ہے جس سے ۱۳۰۸ھ برآمد ہوتے ہیں اسپر دیوان بی حسین باندی طوائف شباب مقیم مرزاپور، لکھا ہوا ہے۔

(۱) سے (۴۲) صفحات تک غزلیات ہیں اور (۴۲) سے (۵۶) صفحات تک مثلثات، مخمسات، مسدس و ترجیع بند ہیں، (۵۶) صفحہ سے قطعات اور رباعیات (۵۹) صفحہ تک ہیں۔ اس کے بعد (۷۳) صفحہ تک تقریظیں لکھی گئی ہیں، بشیر لکھنوی، شائق، سیاح جہاں خیر، قیس رامپوری، مشتاق، نعیم، نیّر بنارسی کے حق تقریظ خوب ادا کیا ہے، اس کے ساتھ ہی ساتھ خبر، احید، اکبر، آشنا، احمد اوج، امیر، ادیب، بشیر، ثاقب، جوہر، حمید، حامی، خبیر، دانش، ذکی رضوان، رضا، زیبا، شائق، عانس، شمشاد، شیدا، شیفتہ، محمد شاہ، صابر صفدر، ضمیر، طالب، پیارے صاحب، عاشق، عشق، عطا، فگار، فروغ قیس، قطبی، قیس، کمال، کیفی، گوہر، لاغر، مشتاق، مقتول، نعیم، نقی، نیّر ناطق، ناجی، وارث، وکیل، واحی، ہنر، واحد نے بڑے طمطراق سے والہانہ انداز میں تقریظیں لکھی ہیں، تذکرۂ خمخانۂ جاوید کے علاوہ ہم نے کسی کتاب پر اس کثرت سے تقریظیں لکھی ہوئی نہیں دیکھیں۔ دوا دین میں تو اردو یا فارسی کا کوئی دیوان ابتک ایسا نظر نہیں آیا جسپر اس قدر کثرت سے تقریظیں لکھی گئی ہوں۔ صفحہ (۷۳) سے (۸۲) تک متفرقات مخمس، مبارکبادیں اور غزلیں ہیں اور صفحہ (۸۳) سے زنگی، عادل، محمود، آتش و برق، حمید، تسنیم، یوسف، عزیز، غش، عظمت، یاسین، خنجر، حکیم، نسیم، فرہاد، غنی، عظیم، لطیف، فضا، خواجہ، علی، نواب، شاکر، ذبیح، نادر، وجاہت حسین وجاہت جنجانوی کے قطعات تاریخ ہیں انہیں کے ساتھ بعض طوائفیں، حیاہ نجس حسن، بی شبن، لطیف، ناز کی تاریخیں ہیں اور درمیان میں ایک تقریظ کریم الدین صاحب کی آگئی ہے

اس دیوان میں دلچسپ ترین چیز تقاریظ ہیں ہر ایک نے والہانہ انداز میں تقریظ لکھی ہے، ایک صاحب نے دعا کی ہے کہ

"خدا کرے ان کے شباب کا باغ بھی ہمیشہ دخل خزاں سے محفوظ رہے"

ایک صاحب نے تعریف کی ہے کہ اس کلام کو

"جو کان سے سُننے دماغ کو فرحت ہو جو آنکھ سے دیکھے دونی بصارت ہو"

ایک صاحب نے بے ساختہ لکھدیا،

"اثر لبھانیکا پیاری ترے بیاں میں ہے
کسی کی آنکھ میں جادو تری زباں میں ہے"

قیس رامپوری نے اپنی مجنونیت کو تقریظ میں اس طرح نمایاں کیا ہے۔

"عروس سخن کے پیار کرنے والو آؤ "باغ شباب" کی سیر سے اپنے دل کا حوصلہ نکالو دیکھو کیسے کیسے خوشنما اور نظر فریب پھول کھلے ہوئے ہیں، کوئی پھول تم کو ایسا نظر نہ آئے گا جس سے رنگ شباب نہ ٹپکتا ہو شگفتگی خود پکار کے کہتی ہے کہ بی شباب، رنگین طبیعت نے اچھے اچھے گل کھلائے ہیں" الخ

ایک صاحب ذرا مزے میں آجاتے ہیں تو فرماتے ہیں۔

"ہاں صاحب، کیوں نہ ہو، شباب، کی اُمنگ جوانی کی ترنگ ہے، ایک تو معشوق دوسرے فصیح البیان سچ پوچھئے تو عشاق کے دل چھین لینے کا سامان ہے" الخ

ان تقریظوں سے شباب کے حالات پر صرف اسقدر روشنی پڑتی ہے کہ ترتیب دیوان کے وقت شباب کا عالم شباب تھا اور فصیح التحریر

بنارسی سے اصلاح لیتی تھی ۔ بھی سن لیجئے اس کا عنوان ہے۔

جان صاحب نے جو قصیدہ حسین باندی کی تعریف میں کہا ہے وہ ....

"قصیدہ در تعریف حسن وجمال وعلم موسیقی بی حسین باندی صاحبہ"

عالم میں ہو رہا ہے کیا کیا حسین باندی — صوتِ حسن کا تیرے شہرہ حسین باندی
جادو ہے ستاری کا ہر تان میں اثر ہے — ہے سحر ساز تیرا گانا حسین باندی
خرمن دل وجگر کی ہر دم میں پھونکتا ہے — آواز کا یہ تیری شعلہ حسین باندی
ہے پاٹ دار کیا ہی آواز ہے سریلی — تحریر ہے یہ موج دریا حسین باندی
ترویٹ، ترانہ، دھرپت، ٹپا، خیال، ٹھمری — جو تو نے گایا گایا اچھا حسین باندی
مرکی، گلے میں کھٹکا، سب زمزمہ عجائب — ہے بلبل خوش الحاں گویا حسین باندی
کیا نور کا ہے گانا کیا نور کی ہیں تانیں — ہے نور کا گلے میں جلوہ حسین باندی
لے تال، اور سر، سم لونڈی غلام تیرے — قابو میں تیرے سب کو پایا حسین باندی

ق

کہتا نہ کیوں سراپا تیرا حسین باندی — شیدا کا ہوں میں تیرے شیدا حسین باندی
تحسین صبح کا وہ تیرے ہوا ہے بندہ — اک بار جسنے تجھکو دیکھا حسین باندی
ہے خنجر جفا کا عالم شہید تیرے — اب کربلا ہے تیرا کوچہ حسین باندی
تیرا ہر ایک مجنوں لیلائے زلف کا ہے — ہر دل کو دیکھا اس کا سودا حسین باندی
صد رشک مہر و مہ ہیں رخسار دونوں بیشک — اک چاند کا ہے ٹکڑا مکھڑا حسین باندی
کعبہ ہے روئے زیبا محراب کعبہ ابرو — واجب ہے عاشقوں پر سجدہ حسین باندی
توڑے تو ہے دلوں کے مژگاں کے تیر وہ ہیں — چوکا نہیں نشانہ ان کا حسین باندی
عالم کو ہے دکھایا آنکھوں کی پتلیوں نے — اک طرفہ تر تماشا کیا کیا حسین باندی
گردن تو ہے صراحی آنکھیں ہیں جام صہبا — ہے اس میں خط ساغر سرمہ حسین باندی
ہے یہ صدائے بلبل صد رشک برگ گل ہے — کانوں کا تیر اک اک پتا حسین باندی

اس کے بعد کے چار شعر چونکہ ذرا عریاں ہیں اسلئے ترک کئے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق پروفیسر آغا حیدر حسن تحریر فرماتے ہیں۔

"چار شعر جن میں انار کی تشبیہ سے داستان کھٹے گئے ہیں اور دوسرے نامحرموں پر حرام چیزوں کا ذکر ہے"

(دیکھو مقدمۂ دیوان جان صاحب صفحہ ۴۶ مطبوعہ بدایوں)

اب ذرا دیوان شباب کا مطالعہ کیجئے بعض اشعار سے شباب کے حالات پر روشنی بھی پڑتی ہے ابتدا حمد اور نعت سے ہوئی ہے۔

سب سے ہیگانہ ہوا عاشق شیدا تیرا — وصف کس منہ سے کروں بارخدایا تیرا
تیری قدرت ہی کے جلوے نظر آتے ہیں مجھے — ہو گیا ہے دل وارفتہ کو سودا تیرا
نیک انجام نہ کیونکر ہو کہ آغاز ہیں آج — نام لیتا ہے شباب سخن آرا تیرا

نعت

زباں پر نام جب آیا شہنشاہ رسالت کا — ہوا ہر حرف میرا گویا اک بستان جنت کا
جہنم میں جگہ بے شک وہ پائے گا جو ہے منکر — ابوبکر و عمر عثمان و حیدر کی محبت کا

آخر الذکر شعر سے پایا جاتا ہے کہ شباب سنت والجماعت تھیں۔

بعض اشعار میں نیر کی اصلاح کا ذکر بھی ہوا ہے۔

شباب اصلاح نیر گر نہ ہوتی
تو اپنا اس قدر شہرہ نہ ہوتا

لطف و کرم میں نیر عالیجناب کے
مشہور اے شباب ہمارا سخن ہوا

حضرت نیر کے صدقے میں خدا کا شکر ہے
اے شباب اب تو مرتب ہم نے دیوان کر دیا

کبھی مزے میں آتی ہیں تو طبع دیوان کا خیال آتا ہے۔

لوگ مشتاق ہیں مدت سے شباب
اپنا دیوان نہ چھپوایئے گا ؞

معلوم ہوتا ہے کہ انکے چاہنے والے تو بہت تھے مگر شاعری کی داد دینے والے اور قدردان سخن کوئی نہ تھا کیا ظلم ہے!

لطف کیا بے قدرداں کے باغ عالم میں شباب
اس زمیں میں کی جو تم نے خامہ فرسائی تو کیا؟

مگر بعض لوگ اشعار پر جان کھونے والے بھی ملے لیکن شعر کو شعر کی حیثیت سے دیکھ کر نہیں بلکہ شباب کی محبت کی وجہ،

محبت بہت ہے شباب حزیں سے
جو اشعار پر جان کھوتے ہو صاحب!

گانا اچھا ہی گاتی ہوں گی اس لئے اسپر غرور بھی تھا۔

سن کے گانے کو مرے خلقت یہ کہتی ہے شباب
کیا مزے کا ہے یہ گانا پیارا پیارا آپ کا!

معلوم ہوتا ہے کہ شباب نے ترتیب دیوان کے قبل ہی شباب کو رخصت کر دیا تھا اور عمر ڈھلنے لگی تھی۔

ہے غضب لطف زندگی نہ رہا
کیوں نہ ماتم کروں جوانی کا

جس طرح اور شعر کہنے والی عورتوں نے اپنی زبانی نسائیت کو تباہ کر کے مردوں کا تتبع کیا ہے اور اپنے لئے مذکر ضمیریں استعمال کی ہیں اسی طرح شباب نے بھی کیا ہے، اگر سرورق اور تقریظیں اور تاریخیں نکال دی جائیں تو کوئی نہیں پہچان سکتا کہ یہ دیوان کسی عورت کا ہے یا مرد کا۔

بندے جو بیقراری دل یوں ہی رہ گئی
سن لیجئے گا آپ کا شیدا نہیں رہا

تم کو میں لکھتا تو کیا لکھتا بھلا بندہ نواز!
ہجر کا حال جو تھا لائق تحریر بھی تھا؟

شباب نے عموماً اچھے شعر کہے ہیں، ملاحظہ ہوں،

ساقیا! بدلی شب ہجراں میں ہے چھائی تو کیا؟
وہ نہ آیا باغ عالم میں بہار آئی تو کیا؟

بہت گھبرا گیا ہے دل ہمارا
کہیں کر غائب قاتل ہمارا

آج جا کر نہ کبھی آیئے گا!
جان نکلے تو چلے جایئے گا!

محبت میں تیری سیکھا ہے ہم نے
تڑپنا لوٹنا فریاد کرنا ؞

دکھاؤ خنجر و تیغ و سناں بہت اچھا
ہمارا لیتے ہو تم امتحاں بہت اچھا

فلک کانپے زمیں کو زلزلہ ہو ؞
جو تڑپے درد سے بیمار تیرا

نکلتیں حسرتیں کیا کیا نہ دل کی ؞
جو ہم سے آپ سے پردہ نہ ہوتا

رازداری خوب کی اے دوستو!
جس جگہ بیٹھے مرا چرچا کیا

جوانی گئی اور پیری بھی آئی
ابھی تک وہی حوصلہ ہے کسی کا

دل اپنا عاشق رخ جانانہ بن گیا، دیوانہ بن گیا
طور اپنا بے خودی میں فقیرانہ بن گیا

کس نے بوسے دست رنگیں کے لئے
ہاتھ سے رنگ حنا جاتا رہا ؞

وہ بناؤ کرتے ہیں بیٹھے تو سبھوں سے لیتے ہیں خدمتیں
کبھی مسی ملدی رقیب نے کبھی میں نے سرمہ لگا دیا

غش میں آنے کا بیاں حال تو کیجے ہم سے
طور پر آپ نے کیا حضرت موسیٰ دیکھا

سحر اٹھ کر چلے جانا کسی کا — وہ اشک آنکھوں میں بھر لانا کسی کا
وہ بوسہ مانگنا محفل میں میرا — چھپا کر منہ وہ شرمانا کسی کا
کسی کا بوسہ لینا منتوں سے — خفا ہو کر بگڑ جانا کسی کا
جوانی کی امنگوں میں کہیں کیا — شباب اپنی غزل گانا کسی کا
بھائے بیٹی ہے دل کو ہر اک ادا تیری — غضب ہے چشم سیہ مست فتنہ زا تیری
جب وہ کہتے ہیں شب وصل کہ سو جاتے ہیں — ایک نشتر سا کلیجے میں چبھو جاتے ہیں
مرے پاس آنے کو وہ گھر سے نکلتے کیونکر — نازکی مانع رفتار تھی چلتے کیونکر

دیوان میں بعض شعر ایسے بھی ہیں جو عمدہ کہلانے کے مستحق ہیں۔

عدو سے میل ہو اس سے تو ہم پر مہرباں کیوں ہو! — مرا ہم بزم کیوں ہو دوست کیوں ہو ہمزباں کیوں ہو؟
بس انکی آنکھوں میں چھائی مستی ہی تو خلوت کا وقت ہے اب! — اٹھا دے جام و سبو کو ساقی رہے گی بزم شراب کب تک
ڈھایا ہے غضب دل نے تڑپ کر شب فرقت — میں لاکھ سنبھلتا ہوں سنبھلنے نہیں دیتا
شمع کو عاشق بیتاب کو پروانے کو — کس کو کس کو تری محفل میں نہ جلتے دیکھا
اب شوق آہ و نالہ بھی اصلا نہیں رہا — وہ دل نہیں رہا وہ کلیجا نہیں رہا

بعض جگہ پھبتیاں بھی کہی ہیں۔

میں نے اس کاکل پہ پھبتی کوڑیالے کی کہی — پھول بیلے کا جو چوٹی میں پری نے رکھ لیا

ایک مثلث ناسخ کی غزل پر اور ایک خمسہ قدسی کی مشہور غزل پر کیا ہے اور آتش کی غزل پر بھی۔

مہندی ہمیں ملتے تھے ترے ہاتھوں کو اکثر — پھر تجھکو پہناتے تھے ہمیں پھولوں کا زیور
مسّی ہمیں ہر رات لگاتے تھے سمن بر — کنگھی ترے زلفوں کی ہمیں پر تھی مقرر
آئینہ دکھاتے تجھے ہر بار ہمیں تھے

خواجہ میر درد کے مشہور مصرعے "کس لئے آئے تھے اور کیا کر چلے" پر ترجیع بند ہے اور چند رباعیات بھی ہیں۔ چند قطعات بھی ساتھ ہی ساتھ کہے ہیں! مگر سب معمولی ہیں، ایک طویل شکایت نامہ بھی پرانی طرز کا ہے متفرقات کے تحت احد کی غزل پر خمسہ اور چند مبارکبادیں وغیرہ ہیں اور بعض غزلیات بھی جو غالباً ترتیب دیوان کے بعد کی ہیں، چونکہ شباب پرگو تھیں اس لئے عموماً مکتب میں داخل ہونیکی گوشوارے کی۔ مہندی کی، مسند نشینی کی، ختنہ کی مبارکبادیں کہیں ہیں۔ یہ گانے کی خاطر کہی گئی ہیں اس لئے کوئی خاص بات نہیں ہے

دیوان کے آخر میں قطعات تاریخ ہیں جن میں سے اکثر بعض طوائفین کے کہے ہوئے ہیں۔

گو شباب کے کلام میں کوئی شاعرانہ خوبی نہیں اور نہ عمدہ ترین شعر ہی کہے ہیں مگر ایک عورت کی شاعری کی حیثیت سے دیوان شباب کا مطالعہ کیا جائے تو کوئی برا خیال قایم نہیں ہو سکتا۔ اس زمانے میں عموماً عورتیں شاعری کرتی تھیں اور سب کا تقریباً یہی رنگ تھا،

سید تمکین کاظمی

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

محبّت موت سے زیادہ طاقتور ہے!

(از مشہور روسی افسانہ نگار ڈیمٹری میرچکووسکی)

فلورنس میں "البیری" نام ایک قدیم خاندان کے افراد، مدّتوں سے دو مختلف تجارتوں میں مشغول چلے آتے تھے۔ بعض قصّاب تھے، اور بعض اُون کا کاروبار کرتے تھے۔

"گوانی" اور "مانٹیو" دونوں بھائی بھی اپنے بزرگوں کی طرح یہی دو تجارتیں کرتے تھے۔ گوانی، پرانے بازار میں گوشت کی دوکان کا مالک تھا۔ اور مانٹیو نے شہر کے مضافات میں اُون کا کارخانہ کھول رکھا تھا۔

گوانی کی دوکان پر خریداروں کی ہمیشہ بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اس لئے نہیں کہ بازار میں وہی ایک اکیلی دوکان تھی۔ بلکہ اس لئے کہ دوکاندار نہایت ہنس مکھ، خوش مزاج، اور نیک دل آدمی تھا۔ دنیا میں کوئی مذاق، کوئی مسئلہ، کوئی فلسفہ ایسا نہ تھا جس پر وہ بے دھڑک تقریر شروع نہ کر سکتا ہو۔ بڑا ہی حاضر جواب تھا۔ راہ گیروں کی پھبتیوں اور پڑوسیوں کی چٹکیوں کے برجستہ فقرے اُس کی نوک زبان پر حاضر رہتے تھے۔ فلورنٹائن جمہوریت کی سیاسی غلطیوں، ترکی سلطان کے منصوبوں، شاہ فرانس کی سازشوں، غرضیکہ ہر موضوع پر زور شور کے ساتھ بحث کرنے کے لئے مستعد رہتا تھا۔ شاید ہی کبھی کسی شخص نے اس قصاب کے مذاق سے بُرا مانا ہو۔ اگر کبھی کوئی چین بجبین بھی ہوتا تو وہ اسے یہ پرانی کہاوت سنا کر خوش کر دیتا تھا کہ "مذاق سے کبھی کوئی بدنام نہیں ہوتا۔ مذاق سے زبان اُسی طرح تیز ہو جاتی ہے جس طرح سِل پر اُسترا تیز ہو جاتا ہے"۔

اس کا بھائی، مانٹیو، اون کا سوداگر اس سے مختلف مزاج رکھتا تھا۔ وہ ایک چالاک اور سازشی آدمی تھا۔ ہمیشہ خشک اور سنجیدہ رہتا تھا۔ اپنا کاروبار، اپنے لااوبالی مسخرے بھائی سے کہیں زیادہ عمدہ طور پر چلاتا تھا۔ ہر سال اون سے بھر کر دو جہاز قسطنطنیہ کی منڈی میں بھیجا کرتا تھا۔ اس کے ارادے بہت بڑے تھے، اور اپنی تجارت کو کسی اونچے سرکاری منصب پر پہنچنے کا ایک ذریعہ خیال کرتا تھا۔ نوابوں اور امیروں سے راہ و رسم رکھتا تھا جو فلورنس میں "موٹے آدمی" کہلاتے تھے۔ اپنے خاندان کو عروج دینے اور اپنے نام کو لازوال شہرت کی لوح پر جلی حروف میں لکھا دیکھنے کی آرزوئیں پرورش کیا کرتا تھا۔ بارہا اپنے بھائی پر اُس نے زور ڈالا کہ قصابی کا پیشہ چھوڑ دے۔ کیونکہ یہ ایک ذلیل پیشہ ہے، اور اپنا تمام روپیہ خود اس کے سرمایہ میں شامل کر دے۔ مگر گوانی اس کا مشورہ قبول نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے بھائی کی قابلیت کا معترف ضرور تھا لیکن دل ہی دل میں اس سے خائف رہتا تھا۔ اس نے کبھی کسی سے اپنا یہ خوف ظاہر نہیں کیا۔ لیکن اکثر تنہائی میں اس کے منہ سے یہ لفظ نکل جایا کرتے تھے "میٹھی زبان اور کینہ بھرا دل۔ یہ میرا بھائی ہے!"

ایک دن گرمی سخت تھی۔ گوانی، دوکان سے بہت خستہ اور پریشان گھر لوٹا حسب عادت خوب سیر ہو کر کھانا کھایا اور دل کھول کر ٹھنڈی شراب پی۔ اچانک سکتہ کا دورہ ہوا اور قبل اس کے کچھ کہتا سنتا یا وصیت کرتا اُسی غشی میں مر گیا۔

اس کی بیوہ، مونا ارسولا، نیک دل۔ رحیم۔ مگر بیوقوف عورت تھی۔ اس نے بے سوچے سمجھے اپنے متوفی شوہر کا کاروبار، اس کے بھائی مانٹیو کے سپرد کر دیا۔ مانٹیو خوب جانتا تھا کہ بیوہ کو چکنی چپڑی باتوں سے کیونکر فریب دیا جا سکتا ہے۔ اپنی چرب زبانی سے اس نے سادہ لوح بھاوج کو یقین دلایا کہ اس کے بے پروا شوہر اس حال میں مرا ہے کہ دیوالیہ ہونے کے بالکل قریب تھا۔ حساب کا بہی کھاتہ، نہایت نامکمل ہے اور یہ کہ اب بچاؤ کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں گوشت کی دوکان اٹھا دی جائے۔

شہر میں عام طور پر مشہور ہو گیا کہ مانٹیو نے اپنی بھاوج کو بڑی بے رحمی سے دھوکہ دیا ہے اور اپنی قدیم تجویز کے مطابق مرحوم بھائی کا تمام سرمایہ اپنی تجارت میں لگا دیا ہے۔ اصلیت کچھ بھی ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ مانٹیو کی تجارت نے اس حادثہ کے بعد ہی جلد ترقی حاصل کر لی۔ اب وہ سالانہ دو جہازوں کے بجائے پانچ چھ جہاز قسطنطنیہ بھیجنے لگا۔ پہلے معمولی اُون جاتا تھا۔ اب اعلیٰ درجہ کا اُون جانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسے کسی اونچے منصب پر مقرر کر دئے جانے کا وعدہ مل گیا۔ اپنی بھاوج کو وہ اسقدر کم گزارہ دیتا تھا کہ سخت تنگ حال رہتی

تھی۔ کیونکہ وہ تنہا نہ تھی بلکہ ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی کی ماں تھی۔ لڑکی کا نام جنیرا تھا۔ آج کل کی طرح اس زمانے میں بھی فلورنس میں بے جہیز کی غریب لڑکیوں کو دولہا نہیں ملتا تھا۔ تاہم خوش عقیدہ مونا ارسولا، ناامید نہ تھی۔ اپنی اکلوتی کے لئے اچھے بَر کی امید کرتی رہتی تھی۔ بڑے اعتقاد سے گڑگڑا گڑگڑا کر ولیوں اور شہیدوں خصوصاً قصابوں کے پشت پناہ سنٹ انٹونی سے دعائیں کیا کرتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ خدا جو بیواؤں اور یتیموں کا والی ہے، ضرور کبھی نہ کبھی اس کی بے جہیز کی لڑکی کے لئے اچھا اور لائق شوہر بھیج دیگا۔

اس ایمان کے علاوہ ایک دوسری چیز بھی تھی جو اس کی امیدیں بڑھایا کرتی تھی۔ جنیرا بہت ہی حسین دوشیزہ تھی۔ اسے دیکھ کر مشکل خیال کیا جا سکتا تھا کہ بدصورت گو انی کو خدا نے یہ چاند سی لڑکی دی ہوگی۔ جنیرا ہمیشہ سادہ سیاہ لباس پہنتی تھی۔ لمبی، نازک، خوبصورت گردن میں موتیوں کا کنٹھا پڑا رہتا تھا جس کے بیچ میں سیپ کی ایک سبک تختی پر کنواری مریم کی مورت کھدی تھی۔ سر پر ململ کا ایک ٹکڑا بندھا رہتا تھا جو اسقدر باریک تھا کہ اندر سے اس کے سنہرے گھنے بال صاف دکھائی دیتے تھے۔

جنیرا کے چہرے پر کنواری مریم کی سی لازوال معصومیت نظر آتی تھی۔ بچوں سے نازک، باریک، اچھوتے ہونٹ، خاموش نگاہیں بھاری پلکیں، سنجیدہ ادائیں، اسے تمام ہم عصروں سے ممتاز کرنے والی تھیں۔ اگرچہ رخساروں پر گلاب کی سی سرخی اور تازگی موجود تھی، مگر وہ خود اسقدر دبلی پتلی تھی گویا زندہ رہنے کے لئے بنائی ہی نہیں گئی ہے۔ قصاب کی یہ لڑکی جب کلیسا کو جاتی تھی تو فلورنس کی سڑکوں پر اسے پُرسکون، خاموش، نیچی نظریں کئے کتاب مقدس ہاتھ میں لئے جاتے دیکھ کر نوجوان کھڑے ہو جاتے تھے۔ ہر قسم کی ہنسی ٹھٹھا موقوف ہو جاتا تھا اور دور تک نگاہیں اس حسنِ خداداد کے تماشے میں محو ساتھ چلی جاتی تھیں۔

مانیٹو نے اپنی بھتیجی کی صورت و سیرت کی ہر زبان سے تعریفیں سن کر، دل میں یہ کھچڑی پکانا شروع کر دی کہ اس کی شادی جمہوریۂ فلورنس کے ایک سکریٹری۔ فرانسسکو گولانٹی سے کر دے۔ فرانسسکو گولانٹی ایک سن رسیدہ آدمی تھا۔ سب اس کی عزت کرتے تھے، اور شہر کے تمام حکام سے اس کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ وہ لاطینی زبان کا عالم اور ادیب تھا۔ اپنی تحریریں بہت نادر اور عبارت میں لکھا کرتا تھا۔ علمی انہماک نے اسے کسی قدر خشک، درشت، اور خلوت پسند بنا دیا تھا مضبوط اخلاق رکھتا تھا۔ قدیم رومن شرفاء کی طرح نہایت بے لوث اور ایماندار تھا۔ اس کا چہرہ بھی ایک قدیم رومن سینیٹر سے مشابہ تھا، اور قدیم رومنوں کی طرح فلورنس کے حکام کا گہرے سُرخ رنگ کا لبادہ پہنا کرتا تھا۔ اسے قدیم زبانیں سیکھنے کا اسقدر شوق تھا کہ جب عمانوئیل چیری زولورس نے یونانی زبان پر لیکچر دینا شروع کئے تو وہ اپنی اس عمر اور عہدے کا خیال نہ کرکے اسکول کی تپائیوں پر چھوٹے بچوں کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔ اس نے بہت جلد یونانی زبان سیکھ لی اور ارسطوطالیس اور افلاطون کی اصلی تصانیف کا مطالعہ کرنے لگا۔ غرضیکہ مجموعی طور پر وہ ایک ایسا آدمی تھا کہ چالاک مانیٹو اس سے بہتر اور نفع بخش رشتہ دار حاصل کرنے کی امید نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ اپنی بھتیجی کو عمدہ جہیز دیگا بشرطیکہ فرانسسکو اپنا نام اس کے خاندان کے نام سے متحد کر دے۔

اپنے منگیتر کی ان تمام خصوصیتوں کے باوجود جنیرا اپنے چچا کی تجویز کی مخالف اور اپنی شادی کو ایک سال کے بعد دوسرے سال پر برابر ٹالتی رہی۔ آخر کار ایک دن مانیٹو نے فوری اور قطعی جواب طلب کیا۔ جنیرا نے تنہائی میں اپنی ماں سے پوری جرأت کے ساتھ صاف کہہ دیا کہ اس کا ایک دوسرا منگیتر بھی موجود ہے جس سے وہ خود بھی بہت محبت رکھتی ہے۔ نیک دل خاتون یہ سُن کر خوفزدہ اور دم بخود رہ گئی کہ اس شخص کا نام "انٹونیو دی رونڈیلی" ہے۔ انٹونیو ایک نوجوان آدمی تھا۔ بت تراشی کا پیشہ کرتا تھا۔ مگر بہت غریب تھا۔ بازار کی ایک تنگ گلی میں چھوٹی سی دوکان کا مالک تھا۔

جنیرا سے اس کا تعارف چند مہینے پہلے خود جنیرا کی ماں کے گھر میں ہوا تھا۔ وہ اس لئے آیا تھا کہ لڑکی کے سر کا ایک مومی مجسمہ طیار کرے تاکہ اس کی خوبصورتی کو شہیدہ باربارا کی مورت طیار کرنے میں استعمال کر سکے۔ جس کی فرمائش ایک دولتمند نے اُسے دی تھی۔ مونا ارسولا ایک ایسے دینی معاملے میں انکار نہیں کر سکتی تھی۔ تصویر اتارتے ہوئے صناع اس حسین دوشیزہ پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا۔ اس کے بعد متعدد تہواروں اور سردی کی محفلوں میں دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہیں اس طرح ان کی محبت نے عشق کا درجہ حاصل کر لیا۔

مونا ارسولا نے ڈرتے ڈرتے مانیٹو کو بتایا کہ جنیرا ایک دوسرے آدمی سے محبت کرتی ہے۔ مانیٹو، انٹونیو کا نام سن کر غصہ سے لال ہو گیا۔ مگر حسب عادت ضبط کر کے بہت سنجیدہ مگر کڑی آواز میں بھاوج کہنے لگا:۔

"بھابی! اگر خود میں نے اپنے کانوں سے تمہاری زبان سے یہ بات سنی نہ ہوتی تو مجھے ہرگز یقین نہ آتا کہ تمہاری جیسی نیک اور سمجھدار خاتون ایک ناتجربہ کار اکھڑ لڑکی کی بیہودگی کو اہمیت دے سکتی ہے! معلوم نہیں آج کل دستور کیا ہے؟ میرے زمانے میں تو کمسن لڑکیوں کو ہرگز جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ اپنے منگیتر کے انتخاب میں ایک لفظ بھی زبان پر لا سکتیں - ہر معاملے میں والدین اور سرپرستوں کے حکم ہی کی بے چون وچرا اطاعت کیا کرتی تھیں - ذرا معاملے پر تو غور کرو --- انٹونیو، جسے میری بھتیجی نے اپنی پسند سے سرفراز کیا ہے - کون ہے؟ ممکن ہے تم ان بت تراشوں - مصوروں، شاعروں، گویوں کی حقیقت سے واقف نہ ہو - یہ لوگ حد سے زیادہ ذلیل اور آوارہ ہوتے ہیں - ان پیشوں کے سوا کبھی بھی معزز پیشے میں داخل ہی نہیں ہو سکتے - اس وسیع دنیا میں ان سے زیادہ بے وقوف اور ناقابل اعتماد آدمی مل نہیں سکتے - یہ لوگ شرابخور، بدچلن - بدمعاش، دہریے، لاابالی، فضول خرچ ہوتے ہیں - اپنا روپیہ بھی اڑاتے ہیں - اور دوسروں کی کمائی کا بھی خیال نہیں کرتے - خاص طور پر انٹونیو، سو ضرور ہے تم نے بھی وہ سب سنا ہوگا جو تمام فلورنس میں اس کی بابت مشہور ہے - میں اس کی طرف ایک حرکت کا اس وقت ذکر کرتا ہوں - اس کی دوکان میں ایک ٹوکری چھت سے لٹکی ہوئی ہے - ٹوکری میں ایک رسی بندھی ہوئی ہے - رسی ڈھیلی کر کے ٹوکری نیچے اتاری جاتی ہے - انٹونیو جو کچھ بھی کماتا ہے - بغیر گنے ہوئے اسی ٹوکری میں ڈال دیتا ہے - ہر شخص کو آزادی ہے، عام اس سے کہ اس کا شاگرد ہو یا ملاقاتی، کہ جب چاہے بے پوچھے گچھے رسی ڈھیلی کر کے ٹوکری نیچے اتارے اور جتنا بھی روپیہ چاہے نکال لے جائے - کیا تم سمجھتی ہو کہ میں اپنا روپیہ، یعنی وہ جہیز جو تمہاری لڑکی کو میں نے دینے کا وعدہ کیا ہے ایک ایسے لچے اور دیوانے کے حوالے کر دونگا؟

"یہی ایک بات نہیں - کیا تم نے یہ بھی سنا ہے کہ انٹونیو اپی قوری فلسفہ کی مکروہ دہریت کا ماننے والا ہے کہ جس کی تخم ریزی شیطان نے کی ہے وہ کلیسا نہیں جاتا - مقدس عبادتوں کا مذاق اڑاتا ہے - خدا پر ایمان نہیں رکھتا - اچھے آدمیوں نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ وہ بتوں کی پوجا کرتا ہے - برگزیدہ اولیاء اللہ کی تو تعظیم نہیں کرتا - مگر ناپاک بت پرستوں کی مورتوں کے سامنے جھکتا ہے - مجھ سے بہت آدمیوں نے بیان کیا ہے کہ وہ اور اس کے شاگرد رات کے وقت لاشیں لایا کرتے ہیں - یہ لاشیں بڑی قیمت پر شفاخانے کے آدمیوں سے خریدی جاتی ہیں - اور انہیں بے دردی سے چیر پھاڑ کر دیکھا جاتا ہے کہ انسانی جسم اور رگ پٹھے کیونکر بنے ہیں - اس کا دعویٰ ہے کہ یہ سب علمی تحقیقات کے لئے کرتا ہے - لیکن میرے خیال میں اصلیت کچھ اور ہی ہے - لاشوں سے اس کی غرض صرف یہ ہوتی ہے کہ اپنے گرو گھنٹال، ہماری نجات کے ازلی ابدی دشمن، ابلیس کو خوش کرے جس نے اسے جادو اور منتروں کا اثر ہے کہ اس بے دین نے تمہاری معصوم لڑکی کے دل پر بھی قبضہ حاصل کر لیا ہے۔"

اس طرح کی باتیں کر کے مانیٹو نے مونا ارسولا کو بالکل بدحواس کر ڈالا اور یقین دلا دیا کہ اس کا بیان حرف بحرف صحیح ہے تب سادہ لوح ماں نے اپنی لڑکی پر زور ڈالنا شروع کیا - منت سماجت کی - دھمکایا - بار بار کہا کہ اگر فرانسسکو سے شادی کرنے سے انکار کرتی رہوگی تو چچا وظیفہ بند کر دیگا اور ہم دونوں بھوکے مر جائیں گے - آخر کار معصوم لڑکی کو ماں کے آگے سر جھکا دینا پڑا - محبت پر فرض کو ترجیح دینا پڑی - بڑے ہی غم و غصہ کے ساتھ اس نے اپنے خودغرض چچا کی تجویز منظور کر لی -

اسی سال فلورنس پر ایک بہت بڑی مصیبت نازل ہوئی - نجومی اس کی پہلے سے پیشین گوئی کر رہے تھے، کیونکہ زحل اور مریخ، برج عقرب میں بہت قریب آ گئے تھے - مصیبت طاعون کی شکل میں ظاہر ہوئی - وبا اس طرح پھیلی کہ مشرق سے آنے والے سوداگر بیش قیمت ہندوستانی کپڑے کے گٹھوں میں اس کے جراثیم ساتھ لائے تھے - فلورنس کی سڑکوں پر دعا مانگنے والوں کے بڑے بڑے جلوس نکلے - نئے قانون اس غرض سے بنائے گئے کہ شہر میں کہیں کوڑا کرکٹ نہ پھینکا جائے بیمار اندر آنے نہ پائیں - اگر کسی گھر میں موت ہو جائے تو سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے اسے دفن کر دیا جائے - ورنہ سخت سزائیں مقرر کی گئی تھیں حتیٰ کہ بعض حالتوں میں قتل کی سزا بھی تجویز کی گئی تھی - خاص انسپکٹر شہر بھر کا دورہ کرتے تھے - دروازے دروازے پوچھتے پھرتے تھے - کہ کوئی مردہ یا بیمار تو موجود نہیں ہے - اگر چاہتے تھے تو گھروں کی تلاشی بھی لے لیتے تھے - سیاہ وردی والے سپاہی لالٹینیں اٹھاتے پھرتے تھے - عام طور پر لوگ "کالے شیطان" کہلائے جانے لگے تھے - کیونکہ مشہور ہو گیا تھا وہ مرنے سے پہلے بھی بیماروں کو اٹھا لیجاتے ہیں

طاعون، گرمی میں پورے عروج پر تھا - موسم خزاں میں اس کی شدت کم نہ ہوئی - حتیٰ کہ جاڑے کی سردی بھی، جو اس سال قبل از وقت شروع ہو گئی تھی - اسے روک نہ سکی - شہر کے خوشحال باشندے -

جنہیں ٹھہرنے کی کوئی مجبوری نہ تھی، دیہات بھاگ گئے جہاں ہوا صاف اور بیماری سے پاک تھی۔

بدطینت مانٹیو کو ڈر تھا کہ اس کی بھانجی کہیں ولٹے بدل نہ دے اس لئے اس نے یہ مصیبت غنیمت جانی اور بھاوج پر زور ڈالنا شروع کیا کہ لڑکی کو لے کر فوراً شہر سے نکل جائے۔ فرانسسکو نے جنیرا اور اس کی ماں کے لئے کوہ البانو پر اپنا خوبصورت بنگلہ خالی کر دیا تھا۔

یہ تجویز مانٹیو کی تھی اور پوری طرح کامیاب ہوئی۔ شادی کی تاریخ بھی قرار پا گئی۔ چند دن بعد نہایت سادگی سے تقریب انجام پائی۔ کیونکہ ان کٹھن دنوں میں یہی دستور ہو گیا تھا کہ دھوم دھام سے پرہیز کرتے تھے۔ نکاح کے وقت جنیرا اس طرح چپ اور زرد تھی گویا زندہ نہیں، مردہ ہے۔ مانٹیو کو یقین تھا کہ شادی کے بعد ہی یہ طفلانہ خیالات بدل جائیں گے۔ فرانسسکو اپنی حسین بیوی کا دل ضرور فتح کر لیگا۔

لیکن اس کا یقین جلد ناامیدی سے بدل گیا۔ دلہن کلیسا سے چل کر جوں ہی اپنے شوہر کے گھر میں داخل ہونے لگی۔ اسے چکر آ گیا زمین پر گر پڑی۔ شروع میں خیال کیا گیا کہ بیہوش ہو گئی ہے۔ سب ہی جتن کئے گئے۔ مگر ہوش نہ آنا تھا نہ آیا۔ سانس تدریج کمزور ہونے لگی۔ دیکھتے دیکھتے چہرے اور جسم پر زردی اور مردنی چھا گئی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ فوراً ڈاکٹر بلایا گیا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر کا بلانا، بہت خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ اس کا آنا، گھر میں طاعون کا ہونا یقین کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر نے جنیرا کے دودھ سے سفید ہونٹوں کے سامنے آئینہ رکھا، مگر آئینہ کی سطح پر سانس کی کوئی علامت بھی دیکھی نہ جا سکی۔

تب سب نے ناقابل بیان رنج والم کے ساتھ یقین کر لیا۔ کہ جنیرا واقعی مر گئی ہے۔ پڑوسیوں نے کہنا شروع کیا کہ خدا نے مانٹیو کو سزا دی ہے، کیونکہ اس نے ایسے نازک وقت میں بھتیجی کی شادی رچائی تھی۔ کلیسا سے پاؤں نکالتے ہی دلہن کو طاعون لگ گیا اور دم کے دم میں ختم ہو گئی! لڑکی کے رشتہ داروں نے اس کی غشی اور پھر موت چھپانے کی بہت کوشش کی، کیونکہ "کالے شیطانوں" سے ڈرتے تھے۔ مگر واقعہ ایسا جانگداز تھا کہ ذرا ہی دیر بعد شہر بھر میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ شام کے وقت "کالے شیطان" (انسپکٹر) بھی آ دھمکے۔ انہیں پڑوسیوں سے فرانسسکو کے گھر کے حادثے کی رتی رتی خبر مل چکی تھی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ مردے کو رشتہ دار یا تو ان کے حوالے کر دیں یا فوراً دفن کر دیں۔ لیکن ایک بڑی رشوت پر انہیں راضی کر لیا گیا کہ دوسرے دن شام تک لاش گھر ہی میں رہنے دی جائے۔

جنیرا کی موت میں اس کے کسی رشتہ دار کو بھی شک نہیں تھا۔ صرف اس کی ایک بوڑھی انّا برابر انکار کئے جاتی تھی۔ لیکن اُسے سب نیم مجنوں یقین کرتے تھے۔ اس نے دردناک آوازیں رو رو کر خوشامد شروع کی کہ جنیرا کو دفن نہ کریں۔ ڈاکٹر دیوانے ہیں۔ جنیرا ہرگز مری نہیں ہے۔ صرف سکتہ میں پڑی ہے۔ اس نے قسم کھائی کہ "میں نے جب اپنی چہیتی کے سینے پر ہاتھ رکھا تھا تو اس کا دل بہت ہی آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ اتنا آہستہ کہ تتلی کا پر بھی اتنا آہستہ نہیں ہلتا"۔

دن ختم ہو گیا، مگر جنیرا پر زندگی کی کوئی علامت بھی ظاہر نہ ہوئی۔ آخر ناامیدی ہو گیا۔ رونے دھونے کے بعد اُسے کفنایا گیا۔ اور تابوت میں رکھ کر کلیسا کو لے چلے۔ فلورنس کے امیرانہ قبرستان میں شاندار قبر تیار کی گئی۔ مانٹیو نے یہ قبر ایک گراں قیمت پر حاصل کی تھی۔ لیکن روپیہ اسی جہیز سے دیا تھا جو اپنی بھتیجی کو دینے والا تھا۔

دفن کی تقریب بھی بہت سنجیدہ اور مذہبی تھی۔ بہت سی شمعیں روشن کی گئی تھیں۔ جنیرا کے نام پر غریبوں کو اناج اور زیتون کا تیل بانٹا گیا تھا۔ سخت جاڑا اور طاعون کی ہولناکیوں کے باوجود قبرستان میں بڑی بھیڑ لگ گئی تھی۔ بہت سے اجنبی آدمی بھی اس دردناک موت کا حال سُن کر آ گئے تھے۔ ہر کوئی جوانا مرگ پر بے اختیار آنسو بہا رہا تھا۔ اور بار بار زبانوں سے یہ شاعرانہ لفظ نکل جاتے تھے:۔

"اس کے خوبصورت چہرے پر موت بھی خوبصورت نظر آتی ہے!"

فرانسسکو نے اپنی اچھوتی دلہن کی قبر پر ایک نہایت فصیح تقریر کی۔ لاطینی اور یونانی زبانوں کی مناسب حال بہت سی ضرب المثلیں بیان کیں۔ سقراط اور افلاطون وغیرہ فلسفیوں کے حکیمانہ مقولے نقل کئے۔ یہ اس زمانے میں ایک بالکل نئی بات ہے۔ سامعین نے تقریر بڑی دلچسپی سے سنی، حتیٰ کہ انہوں نے بھی جو یونانی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے تھے۔

تقریب کے خاتمہ پر کچھ گڑبڑ سی پیدا ہو گئی۔ وجہ یہ ہوئی کہ جب تابوت قبر میں رکھا گیا اور حاضرین کو مردے کے آخری دیدار کی دعوت دی گئی۔ تو ایک زرد رو آدمی نمودار ہوا۔ سیاہ ریشم کا ماتمی لباس پہنے تھا۔ بھیڑ کو چیرتا قبر تک چلا آیا۔ تابوت کا ڈھکنا اٹھایا۔ مردے کا منہ کھولا، اور اس کے پیلے چہرے پر ٹکٹکی باندھ کر دم بخود رہ گیا۔

ایک لمحہ تو سب حیرت زدہ رہے، پھر نو وارد سے مطالبہ کیا گیا کہ فوراً ہٹ جائے۔ کیونکہ کسی اجنبی کے لئے مناسب نہیں کہ عزیزوں کی موجودگی میں جنیرا کے قریب آئے۔ زرد آدمی نے جب سنا کہ وہ "اجنبی" سمجھا گیا ہے اور مانٹیو اور فرانسسکو "عزیز" قرار دیئے گئے ہیں، تو ایک زہر آلود تبسم اس کے لبوں پر ظاہر ہوا۔ اس نے مردے کے ہونٹوں کو بوسہ دیا۔ اس کا منہ پھر بند کر دیا، اور کچھ کہے سنے بغیر چپ چاپ سیدھا چلا گیا۔

مجمع میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ جانے والے کی طرف اشارے ہوئے۔ انٹونیو کا نام زبانوں پر بے ساختہ آگیا۔ کہا گیا "یہی وہ آدمی ہے جس سے جنیرا محبت کرتی تھی اور جس کی وجہ سے وہ مری ہے!"

اب سورج غروب ہو رہا تھا۔ غمناک تقریب بھی ختم ہو چکی تھی۔ مجمع برخواست ہو گیا۔ مونا ارسولا۔ لڑکی کی ماں ضد کر رہی تھی کہ رات بھر تابوت ہی کے پاس رہے گی۔ مگر مانٹیو نے روکا۔ وہ اسقدر غمزدہ تھی کہ ہر شخص اس کی ناگہانی موت کا اندیشہ کر رہا تھا۔ صرف پادری، مارنیو، دعائیں پڑھنے کے لئے تابوت کے پاس چھوڑا گیا۔ باقی سب لوگ چلے گئے۔

چند گھنٹے گزر گئے۔ پادری کی لگاتار گنگناہٹ، وقتاً فوقتاً گھڑیال بجنے کی دھیمی آواز، خاموش رات میں بازگشت پیدا کر رہی تھی۔ آدھی رات بعد پادری کو پیاس لگی۔ اس نے شراب کے چند جام چڑھائے کئی بار سرور سے سر کو جنبش دی۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ کسی کے کراہنے کی آواز اس کے کان میں آئی ہے۔

وہ سنبھل بیٹھا اور کان لگا دیئے۔ کراہنے کی آواز پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ اسے محسوس ہوا کہ آواز تابوت ہی سے آرہی ہے۔ ڈرتے ڈرتے تابوت پر نظر ڈالی تو اس کا ہلکا ڈھکنا کچھ ہلتا معلوم ہوا۔

اس کا تمام بدن سنسنانے لگا۔ سخت خوف و دہشت نے اسے گھیر لیا، مگر وہ ان معاملات میں ناتجربہ کار نہ تھا۔ خوب جانتا تھا کہ رات کو مردے کے ساتھ اکیلے رہنے میں بڑے بڑے آزمودہ کار بھی طرح طرح کے ڈراونے خیالات کا شکار ہو جایا کرتے ہیں۔ یہ سوچ کر دل مضبوط کیا اور تہیہ کر لیا کہ اس وہم کی ذرا بھی پروا نہیں کریگا۔ پھر زور سے دانت بھینچ کر سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور نہایت ذلدوز آوازمیں دعائیں پڑھنا شروع کر دیں۔

اچانک پادری کی آواز دوبارہ رک گئی۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ آنکھیں کھلی تھیں اور مردہ لڑکی کا منہ صاف سامنے دکھائی دے رہا تھا!

اب شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ واقعی مردے ہی کا منہ کفن سے باہر نکل آیا تھا۔ تابوت کا ڈھکنا جو سرک گیا تھا، اب بھی ہل رہا تھا۔ کیونکہ لڑکی سانس لے رہی تھی۔ پادری فوراً کھڑا ہو گیا اور قبرستان کے دروازے کی طرف بے تحاشا بھاگا۔ اسکا تمام بدن کانپ رہا تھا۔ کھلی ہوا میں پہنچ کر پھر رکا۔ سانس لی۔ دعائیں پڑھیں خیال کرنے لگا جو کچھ دیکھا ہے، کہیں وہم نہ ہو۔ چنانچہ صلیب کے نشان بناتا۔ لوٹ پڑا۔ مگر قبر پہ پہنچ کے اس کے منہ سے بے اختیا چیخ نکل گئی۔ لڑکی اپنے تابوت پر آنکھیں کھولے بیٹھی تھی!

اب پادری کے لئے ٹھہرنا ناممکن تھا۔ سرپٹ بھاگ نکلا اور قبرستان کے باہر سڑک پر پہنچ کے دم لیا۔ دماغ بے کار ہو چکا تھا۔ کچھ سوچ نہیں سکتا تھا۔ اس نے پیچھے گھوم کر دیکھا بھی نہیں۔ برابر بھاگتا ہی چلا گیا۔ سنسان رات میں برف سے ڈھکی ہوئی سڑک پر اس کی کھڑاؤں سے ایک ہیبت ناک شور برپا ہو گیا تھا۔

جنیرا اپنی لمبی نیند پا سکنے سے قبر میں بیدار ہوئی اور بڑی حیرت سے تابوت کو دیکھنے لگی۔ یہ سوچ کر کہ قبر میں زندہ اتار دی گئی ہے۔ خوف زدہ ہو گئی۔ بڑی جدوجہد کے بعد تابوت سے باہر نکل سکی کفن اوڑھ لیا اور قبرستان کے دروازے کی طرف بڑھی جسے پادری کھلا چھوڑ گیا تھا۔

قبرستان سے نکل کر کلیسا کے احاطے میں پہنچی۔ چاند کی روشنی، ابر کے بڑی تیزی سے اڑتے ہوئے ٹکڑوں میں سے چھن کر زمین پر پڑتی اور غائب ہو جاتی تھی۔ لیکن سامنے میدان میں گھنٹہ گھر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جنیرا کے خیالات پراگندہ تھے۔ سر چکرا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھنٹہ گھر کے ساتھ ابر پر اڑی چلی جا رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جیتی ہے یا مر گئی ہے۔ خواب دیکھ رہی ہے یا حقیقت سے دوچار ہے۔

اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کہاں جا رہی ہے؟ بہت سی سنسان سڑکوں سے گزرنے کے بعد وہ ایک ایسے گھر کے سامنے پہنچی جو اسے پہچانا ہوا معلوم ہوا۔ رک گئی۔ کچھ پس وپیش کے بعد دروازے کی طرف بڑھی اور دستک دی۔ یہ اسکے چچا مانٹیو کا گھر تھا۔

رات بہت گزر چکی تھی۔ مگر اُن کا سوداگر اب تک جاگ رہا تھا۔ قسطنطنیہ سے اس کے دو جہاز واپس آرہے تھے۔ شہر میں افواہ پھیلی ہوئی تھی۔ کہ سمندر میں سخت طوفان آیا ہے اور بہت سے جہاز ڈوب گئے ہیں۔ مانٹیو، ڈر رہا تھا کہ کہیں اس کے جہاز بھی ڈوب نہ گئے ہو۔

اسی فکر نے سونے نہیں دیا۔ جہازوں کی خبر سننے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔

قاصد کا انتظار کرتے کرتے اسے بھوک معلوم ہوئی۔ اپنی خادمہ ننسیا کو کھانا لانے کا حکم دیا۔ ننسیا، سرخ بالوں اور سفید دانتوں کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ مانیٹو نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ اور خادمہ کو بہت شوخ بنا دیا تھا۔ آج رات وہ باورچی خانہ ہی میں بیٹھا تھا کیونکہ باقی تمام کمرے بہت ٹھنڈے تھے۔ ننسیا نے آستینیں چڑھا کر مرغ بھوننا شروع کیا۔ روشنی میں رکھی ہوئی پلیٹیں جھل جھل چمک رہی تھیں۔

"ننسیا!" مانیٹو نے اچانک کہا "کیا ابھی تم نے بھی کوئی آواز سنی ہے؟"

"ہوا کی آواز ہوگی" شوخ خادمہ نے جواب دیا "اب میں نہیں جاؤنگی۔ تم تین مرتبہ بے فائدہ دروازے پر دوڑ چکے ہو۔"

"ہوا نہیں ہے۔ کوئی دستک دے رہا ہے۔ قاصد آگیا ہے۔ جاؤ دروازہ کھول دو۔"

موٹی تازی ننسیا آہستہ آہستہ زینے پر سے اترنے لگی۔ مانیٹو، ہاتھ میں لالٹین لئے اوپر کھڑا راستہ دکھا رہا تھا۔

"کون؟" خادمہ چلائی

"میں! ... میں! ... جنیرا! ..." ایک کمزور آواز بند دروازے کے اس پار سے سنائی دی۔

"مسیح! مسیح!" ننسیا کی چیخ بلند ہوئی "دروازے پر بھوت ہے!"

اس کے پاؤں ڈر سے کانپنے لگے۔ جلدی سے زینہ کی لکڑی نہ پکڑ لی ہوتی تو ضرور گر پڑتی۔ مانیٹو کا رنگ بھی فق ہو گیا۔ قریب تھا کہ لالٹین ہاتھ سے چھوٹ پڑتی

"ننسیا! ننسیا!" جنیرا خوشامد سے چلائی "دروازہ کھول۔ جلدی کر! میں سردی سے مری جاتی ہوں۔ دروازہ کھول۔ چچا سے کہہ کہ میں ...."

ماما، بھدی ہونے پر بھی بڑی تیزی سے بھاگی۔ لکڑی کی سیڑھیاں اس کے بوجھ سے چرچرانے لگیں۔

"دیکھا قاصد آگیا" منہ چڑھی ننسیا، غصہ اور خوف سے چلائی "میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اچھے عیسائیوں کی طرح خدا پر بھروسہ کرو اور سو جاؤ۔ اُہ! اُہ! پھر دستک ہو رہی ہے سنتے ہو؟ غریب جنیرا کی روح رو رہی ہے کیسی دردناکی سے رو رہی ہے! خدایا! ہمیں بچا۔ ہم گنہگاروں پر رحم کر! سنٹ لارنس! ہمارے لئے دعا کر!"

"سنو ننسیا! سنو" مانیٹو نے ہچکچاتے ہوئے کہا "میں نیچے جا کر دیکھتا ہوں کیا ہے؟ کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے؟ شاید..."

"ہاں ضرور! ضرور تم ضرور جاؤ گے!" ننسیا ہاتھ ملتی ہوئی چلائی "بڑے بہادر ہیں! واہ بڑے ہی بہادر ہیں! میں تمہیں ضرور جانے دونگی! موت کے منہ میں ضرور جانے دونگی! بیٹھو بھی۔ دیوانے ہوئے ہو! شکر کرو اگر خدا مصیبت سے بچا لے!"

پھر ننسیا نے جھٹ پٹ الماری سے مقدس پانی کی بوتل نکالی۔ اور ہر طرف چھڑکنے لگی۔ زینے پر بھی اور اوپر سے کھڑے کھڑے دروازے پر بھی۔ خود مانیٹو پر بھی ایک چھینٹا ڈالا جواب خاموشی اختیار کر چکا تھا۔ اپنی ماما کو پہلے ہی سے عقلمند سمجھتا تھا۔ اس موقعہ پر بھی خیال کرنے لگا کہ روحوں کے معاملات وہ زیادہ بہتر جانتی ہے۔

پھر ننسیا نے چلا کر یہ دعا پڑھی:۔

"روح! خدا تجھے برکت دے۔ خدا کے پاس لوٹ جا۔ مردوں میں واپس جا۔ خدا تجھے اچھوں کے ساتھ جگہ دے!"

اب جنیرا نے یقین کر لیا کہ اس گھر میں اس کی رسائی ممکن نہیں کیونکہ اسے مردہ سمجھا جا رہا ہے۔ ناامید ہو کر کسی دوسری جگہ پناہ لینے کے لئے روانہ ہو گئی۔

اپنے ٹھٹھرے ہوئے پیروں سے وہ بمشکل چلتی ہوئی ایک دوسری سڑک پر پہنچی۔ یہاں اس کے شوہر، فرانسسکو کا مکان تھا۔

جمہوریت فلورنس کا یہ سیکرٹری اس وقت لاطینی زبان میں اپنے ایک دوست کو طویل فلسفیانہ خط لکھ رہا تھا، جو خود بھی قدیم زبانوں کا بڑا مداح تھا۔ خط کیا، پورا ایک مضمون تھا۔ اس کا عنوان یہ تھا "اپنی پیاری بیوی جنیرا کی موت کی مناسبت سے روح کی ابدیت پر بحث"۔ فرانسسکو نے ارسطوطالیس کی تعلیم کا افلاطون کی تعلیم سے مقابلہ کرنے کے بعد نہایت مدلل طور پر ثابت کیا تھا کہ مس آگیونیز کا یہ خیال سراسر غلط ہے کہ ارسطو کا فلسفہ، رومن کیتھولک عقائد کا موید ہے۔ کیونکہ اس کے فلسفے کی بنیاد دراصل شک والحاد پر تھی۔ ہاں افلاطون کی تعلیم مسیحی تعلیمات کے مطابق ہے۔

لکھنے کی وسیع میز پر تانبے کا شمعدان رکھا جل رہا تھا۔ فرانسسکو

اب عقیدۂ تناسخ (آواگون) پر مذہبی نقطۂ نظر سے بحث کر رہا تھا۔ اچانک اُسے دروازے سے دستک کی خفیف آواز سنائی دی۔ فوراً پیشانی پر بل پڑ گئے۔ لکھتے وقت وہ کسی آواز کا سننا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم کھڑکی کی طرف بڑھا اور سر نکال کر باہر سڑک پر دیکھنے لگا۔ چاندنی میں جنیرا کفن اوڑھے صاف کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔

اب کہاں ارسطو اور کہاں افلاطون، فرانسسکو کے ہوش اُڑ گئے۔ جلدی سے کھڑکی بند کر لی۔ اتنی جلدی کہ جنیرا ایک لفظ بھی کہنے نہ پائی۔ کمرے میں لوٹ کر خوف سے اس کی بُری حالت تھی۔ وظیفے پڑھتا تھا۔ بار بار صلیب کے نشان بناتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح مانیٹو کے گھر میں کیا گیا تھا۔

مگر جلد ہی اس نے اپنے حواس درست کر لئے۔ اس بزدلی پر شرما گیا۔ پھر روح کے متعلق مختلف فلسفیوں کے قول یاد آ گئے۔ اب اس کی ہمت بڑھ گئی۔ طبیعت قابو میں آ گئی۔ پھر کھڑکی کھولی اور مضبوط آواز میں چلا کر کہنے لگا:-

"تو جو کوئی بھی ہو۔ آسمان کی روح ہو یا زمین کی روح، سیدھی چلی جا! اسی جگہ لوٹ جا جہاں سے آئی ہے۔ تیری یہ کوشش بیکار ہے کہ مجھے ڈرانا چاہتی ہے۔ جس آدمی کا دماغ، سچے فلسفے سے روشن ہو چکا ہے وہ کسی چیز سے بھی ڈر نہیں سکتا۔ ممکن ہے میری مادی آنکھیں دھوکا کھا جائیں۔ مگر میری روحانی آنکھوں کو تو دھوکا نہیں دے سکتی۔ لہٰذا اطمینان سے چلی جا۔ مردے، مُردوں ہی کے لئے ہیں!"

یہ کہہ کر اُس نے پھر کھڑکی بند کر لی اور عزم کر لیا کہ روحوں کے غول آ کر کتنا ہی چلائیں۔ اور دروازے کو کتنا ہی پیٹیں، ہرگز کھڑکی نہیں کھولے گا۔

جنیرا یہاں سے بھی نا امید لوٹی۔ اُس کی ماں کا گھر قریب تھا۔ سیدھی اُدھر چل پڑی۔

اسوقت مونا ارسولا جنیرا کی مغموم ماں، صلیب کے آگے جھکی ہوئی تھی۔ خاندان کا پادری اس کے قریب کھڑا تھا۔ پادری کا چہرہ خشک اور زرد تھا۔ جسم بھی بہت دبلا تھا۔ مونا ارسولا نے خوفزدہ نگاہیں پادری کی طرف اٹھا کر کہا:-

"باپ! میں کیا کروں؟ میری مدد کرو۔ دل کو کسی طرح تسکین نہیں ہوتی۔ تمام دعائیں ختم ہو چکی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے خدا نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اور میری روح برباد ہو جانے والی ہے"

"خدا کی اطاعت کرو۔ ہر چیز میں آخر تک" پادری نے کہا "بکواس مت کرو۔ نفسِ آمارہ پر قبضہ رکھو۔ اپنی لڑکی سے تمہاری اس درجہ محبت، محض مادے کی محبت ہے۔ روح کی نہیں ہے۔ اس لئے نہ آیا ہو کہ وہ توبہ کئے بغیر مر گئی ہے اور اللہ کے انصاف کی کرسی کے آگے ایک بڑے گنہگار کی صورت میں پیش کی جائے گی"

عین اسی وقت دروازے پر دستک پڑی:-

"ماں! ماں!" جنیرا کی آواز سنائی دی "میں ہوں، میں — دروازہ کھولو۔ جلدی کرو!"

"جنیرا!" ماں چلا اٹھی اور قریب تھا کہ اپنی بیٹی کے لئے دروازہ کھولنے کو دوڑ پڑے۔ مگر پادری نے روک دیا:-

"کہاں جاتی ہو؟ تمہاری لڑکی تو قبر میں پڑی ہے۔ مر چکی ہے۔ وہ اسوقت تک نہیں اٹھے گی جبتک قیامت کا دن نہ آ جائے۔ یہ خبیث روح ہے جو تمہاری لڑکی کی آواز بنا کر تمہیں بہکانے آئی ہے۔ تمہارے گوشت اور خون کی آواز بنا کر تمہیں گمراہ کرنا چاہتی ہے۔ دعا کرو۔ دعا کرو قبل اس کے کہ وقت نکل جائے اپنے لئے دعا کرو اور اپنی گنہگار لڑکی کے لئے دعا کرو۔ کہ تم دونوں دوزخ کا ایندھن نہ بنجاؤ!"

"ماں! ماں! آہ میری آواز سنتی نہیں! اُف میری آواز پہچانتی نہیں! میں ہوں۔ میں جنیرا ہوں۔ زندہ ہوں۔ مری نہیں ہوں!"

"باپ! مجھے جانے دو۔ مجھے جانے دو—" مونا ارسولا نے خوشامد کے کہا۔

یہ سن کر پادری، غصہ سے لال ہو گیا۔ فوراً دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھا دئے اور بددعا شروع کی:-

"جا، مگر سمجھ لے کہ تو صرف اپنی ہی نہیں، جنیرا کی روح کو بھی دوزخ میں جھونک رہی ہے۔ خدا تجھ پر اس دنیا میں بھی لعنت کرے اور اُس دنیا میں بھی!"

پادری کا چہرہ، غصہ سے اس طرح تمتما اٹھا تھا اور اس کی آنکھوں سے ایسے شعلے نکل رہے تھے کہ غریب مونا ارسولا خوف سے کانپنے لگی۔ اسکے گھٹنے زمین پر ٹک گئے اور ہاتھ دعا کے لئے اُٹھ گئے۔

پھر پادری دروازہ کی طرف مڑا۔ صلیب کا نشان بنایا اور کہنے لگا:-

"باپ کے نام پر، بیٹے یسوع کے نام پر، روح القدس کے نام پر! ہاں میں تجھے مسیح کے خون کی قسم دیتا ہوں، جو صلیب پر بہایا گیا تھا کہ چلی جا۔ غائب ہو جا۔ ملعون روح! چلی جا، کیونکہ یہ مقدس سرزمین ہے۔ خدایا ہمیں گمراہی میں جلنے سے روک! ہمیں شیطان کے مکر سے بچا!"

"ماں! ماں! مجھ پر ترس کھاؤ۔ مری جاتی ہوں!"

ماں ایک دفعہ پھر دوڑی۔ اپنے ہاتھ لڑکی کی طرف پھیلا دئے۔

مگر موت سے بھی زیادہ بے رحم پادری بیچ میں آگیا۔

جنیرا زمین پر گر پڑی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ برف سے جمی جاتی ہے۔ جان نکلی جاتی ہے۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اپنے گھٹنے پکڑ لیئے۔ سر جھکا لیا اور ارادہ کرلیا کہ اب نہیں اٹھیگی۔ یہیں پڑے پڑے مرجائیگی۔

"مردے، زندوں میں لوٹ کر نہیں آتے" وہ خیال کرنے لگی۔ فوراً ہی اُسے انٹونیو، اپنا عاشق یاد آگیا "کیا یہ ممکن ہے کہ وہ بھی مجھے پناہ نہ دیگا؟" انٹونیو کا خیال شروع سے اس کے دل میں تھا۔ مگر شرم اُدھر جانے سے روکتی تھی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ رات کو اکیلی اس کے گھر جائے۔ خصوصاً اب جبکہ ایک دوسرے شخص سے اس کی شادی ہوچکی ہے۔ لیکن اب اس نے دیکھ لیا کہ زندوں کی نظر میں وہ مرچکی ہے۔

چاند، بادل کے ایک کالے ٹکڑے میں چھپ گیا۔ برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ صبح صادق کے آسمان کے نیچے افق میں پیلے دکھائی دیتے تھے۔ جنیرا اپنی ماں کی چوکھٹ پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسکے خود اپنے گھر میں پناہ ڈھونڈنے کو روانہ ہوگئی۔

انٹونیو، رات بھر جنیرا کا مومی بت بناتا رہا تھا۔ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ وقت کس طرح گزر گیا۔ صبح صادق کا ٹھنڈا اُجالا اس کی کھڑکیوں پر آکے پھیل گیا۔ بت تراش کو اسکا ایک مقبول شاگرد، برٹولینو مدد دے رہا تھا۔ یہ ایک سترہ برس کا خوشنما بالوں اور خوبصورت چہرے کا لڑکا تھا، ایسا خوبصورت کہ لڑکیاں بھی رشک کرتی تھیں

انٹونیو کام میں منہمک تھا۔ ایک عجیب خاموشی اس پر چھائی ہوئی تھی۔ بت کے خط و خال میں قلم کی نوک سے کچھ اس طرح ترمیم کررہا تھا کہ خود اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ مرحومہ، موت کی ابدیت سے نکل کر لازوال زندگی کے آغوش میں آرہی ہے۔ آنکھیں ہلنے اور کھلنے کے لئے بالکل تیار معلوم ہوتی تھیں۔ سینہ ابھرتا اور ہلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ شبہ گزرتا تھا کہ خون، بدن اور رگوں میں بس دوڑ جانے والا ہے۔

اب صناع اپنا کام ختم کرچکا تھا۔ صرف اتنی کسر باقی تھی کہ جنیرا کے بت کے لبوں پر ایک معصوم تبسم نمودار کردے۔ عین اسوقت دروازے پر چوٹ پڑی۔

"برٹولینو!" انٹونیو نے بت پر سے نگاہ ہٹائے بغیر اپنے شاگرد سے کہا "دروازہ کھول دو"

لڑکا دروازے پر گیا اور پوچھنے لگا:۔

"کون؟"

"میں ــــ جنیرا!" ایک بہت ہی کمزور آواز سنائی دی جو شام کی ہوا کی طرح مرتعش تھی۔

برٹولینو بدحواس ہوکر بھاگا۔ بالکل پیلا اور سر سے پاؤں تک کانپتا ہوا۔

"مردہ!" اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا اور صلیب کا نشان بنایا۔ لیکن انٹونیو نے آواز پہچان لی تھی۔ ایک ہی جست میں کمرے کے باہر تھا۔ لڑکے کے ہاتھ سے کنجی جھپٹا مار کر چھین لی۔ اور دروازے کی طرف دوڑ پڑا۔

"استاد! دیکھو کیا کرتے ہو؟" شاگرد نے آہستہ سے کہا جس کے دانت خوف سے کٹکٹا رہے تھے۔

انٹونیو نے کچھ نہیں سنا۔ اس وقت اس کے کان بہرے ہو چکے تھے۔ دیوانہ وار دروازے پر پہنچا اور قفل کھول دیا۔ جنیرا چوکھٹ پر پڑی تھی۔ نیم مردہ ہوچکی تھی۔ آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور ان پر برف جم گئی تھی۔

انٹونیو ذرا بھی نہیں ڈرا۔ اس کا دل، رحم کے طاقتور جذبے سے لبریز ہوچکا تھا۔ محبت کا ایک نعرہ اس کے منہ سے بلند ہوا۔ ٹھٹھرے ہوئے نیم جان جسم پر جھک پڑا۔ اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھالیا اور اندر کمرے میں لے آیا۔

اس نے جنیرا کو اپنے بچھونے پر لٹادیا۔ تھوڑی سی شراب گرم کی اور جنیرا کے حلق میں اتاردی۔ شراب کی گرمی پاکر جنیرا آسانی سے سانس لینے لگی۔

جنیرا نے انٹونیو کو پاس بلایا۔ وہ بستر کے سامنے گھٹنے ٹیک کے کھڑا ہوگیا۔ جنیرا نے اپنا واقعہ کہہ سنایا۔

"آہ پیارے!" اپنی الم کہانی ختم کرکے جنیرا نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اکیلے اکیلے تم ہی مجھ بدنصیب سے نہیں ڈرے۔ صرف تم ہی نے مردے کو اپنے گھر میں جگہ دی ــ تمہارے سوا کسی نے بھی مجھ سے محبت نہیں کی۔" اب میرا کوئی عزیز نہیں۔ نہ شوہر، نہ چچا، نہ ماں۔ سب غیر ہوچکے ہیں۔ کیونکہ ان سب کے نزدیک میں مرچکی ہوں۔ صرف تم ہی میرے عزیز ہو، کیونکہ صرف تم ہی نے مجھے زندہ سمجھا ــ اب میں کسی کی نہیں۔ صرف تمہاری ہوں!"

"انٹونیو!" جنیرا نے بہت آہستہ سے کہا "مبارک ہے موت، کیونکہ اُس نے ہمیں محبت کرنا سکھایا! مبارک ہے محبت، جو موت سے بھی زیادہ طاقتور ہے!

عبدالرزاق ملیح آبادی

تاج اور اس کے باغات

ارجمند بانو کا فردوس منظر باغ - روضۂ تاج محل کے نام سے مشہور ہے - اس جمیل و دلکش عمارت کے متعلق سیاحوں اور صناعوں نے تعریف کے دفتر لکھ دئے ہیں - اور تصاویر کے ذریعے اب عوام بھی اس عمارت کی دلکشی سے متعارف ہو چکے ہیں - اس لحاظ سے بظاہر میرا اپنے تاثرات کو قلمبند کرنے کی کوشش کرنا تحصیل حاصل معلوم ہوتا ہے - مگر میں دیکھتا ہوں کہ اکثر ادیب محض روضے کی خوب صورتی سے اسقدر متاثر ہوئے ہیں - کہ انھوں نے تمام عمارات کے باہمی تناسب کا احساس نہیں کیا - صرف یہی نہیں بلکہ یہ بات بھی ان کی نظر سے پوشیدہ رہی ہے کہ باغ کا پہلا مجوزہ نقشہ ایک وسیع ترتیب و تشکیل کا ایک ضروری جزو تھا - میرے ذہن میں "تاج" کے پہلے نظارے کے تاثرات اب تک روشن ہیں - نومبر کی برفانی صبح کی سردی روح کو منجمد کئے دیتی تھی - وسیع شاہراہ پر کوئی بھولا بھٹکا گید ڑ بھوت کی طرح مبہم اور خوفناک نظر آجاتا تھا - ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی خبیث روح طلوع صبح کے خوف سے آشیانے کی پناہ لینے کے لئے بھاگی جا رہی ہے - مہتر سڑک کے کنارے خس و خاشاک جلا کر اپنے ٹھنڈے بدن کو گرم کرنے کی کوشش کر رہے تھے - اور دھوئیں کی ناخوشگوار بو - بڑھتی ہوئی کہر کی سردی میں مل گئی تھی - کارواں سرائے کے پاس کی دکانیں بند تھیں -

میرے مڑنے کے بعد دربان نے باغات کا دروازہ کھول دیا صاف معلوم ہو رہا تھا - کہ وہ اسقدر جلد دروازہ کھولنے کا عادی نہیں - اور صبح خیز تماشا یوں کا شاکی ہے - جب میں شاندار محراب کے نیچے پہنچا - تو روشنی پھیل گئی تھی - اندرونی دروازے سے "تاج" دھند اور کہر کے پردوں میں لپٹا ہوا دور سے افسردہ سا نظر آتا تھا - تاج کی یہ افسردہ منظری یقیناً آسمان کے ہلکے خاکستری سے رنگ سے مناسبت رکھتی تھی - سرو کے درختوں پر بھی دھند چھائی ہوتی تھی اور پانی میں ان کا عکس صاف نظر نہ آتا تھا - جب میں پانی کے کنارے پہنچا - تو وسطی گنبد کا طلائی کلس یکایک سورج کی ایک زرنگار شعاع سے جگمگا اٹھا - گلابی شعاعیں گنبد کی حسین گولائی کو روشن کرنے لگیں - سنگ مرمر کی صاف مروارید سطح روشنی میں نہانے لگی - تا اینکہ شعاعیں عمارت کے اطراف کو عبور کرنے کے بعد سنگ مرمر کے مربع چبوترے پر پہنچ گئیں - اور "تاج" کے تمام محرابی طاق اور حصے رنگ و نور کا ایک طلسم بن گئے - سنہری سائے اور اودے سے عکس فردوس نظر بن گئے - پرستان کا سا جلوہ پیدا ہو گیا - ایک روحانی عمارت نظر آنے لگی جس کے دروازے مروارید خالص کے بنے ہوئے تھے - اور جو دنیا میں صرف ایک لمحے کیلئے جھلملا کر غائب ہو جانے کے لئے آئی تھی - سورج کی گرمی سے باغ پر چھائی ہوئی دھند غائب ہونی شروع ہوئی اور فیروزی لہروں کی صورت میں ان گہرے سبز سرو کے درختوں کے درمیان سے گذر گئی - عکس اب صاف خاموش پانی میں نظر آ رہے تھے - اب ان گہرے سایوں کے درمیان تاج معجزے کی طرح جلوہ گر تھا -

کیا آئینہ خانے کا وہ عالم تیرے جلوے نے
کرے جو پر تو خورشید عالم شبنمستاں کا

یہ طلسمی منظر صرف ایک لمحے کے لئے قائم رہا - مگر اس ایک لمحے میں مجھے تاج کے صناعوں اور کاریگروں کی تخیلی تصویر صاف نظر آگئی - کسی نقاد نے کیا خوب لکھا ہے -

جو لوگ تاج کی صنعت تعمیر پر یہ اعتراض کرتے ہیں - کہ اس میں نسوانیت پائی جاتی ہے - وہ غیر محسوس طور پر گویا عمارت کی انتہائی تعریف کرتے ہیں - نسوانیت تاج میں ارادتاً پیدا کی گئی ہے - بحیثیت مجموعی و جزوی تاج کا ذرہ ذرہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں نزاکت کی تصویر ہوں - یہ عمارت تاج نہیں بلکہ خود ارجمند بانو بیگم ممتاز محل اپنی بہار حسن و جمال کے ساتھ جمنا کے کنارے ضیا افروز ہے - درخشاں صبح ہو یا روشن دوپہر دھندلی شام ہو یا گہری تاریکی ہر وقت کسی مہ جبین کا رعنا شباب جلوہ گر معلوم ہوتا ہے -

چاندی جیسی چاند کی روشنی میں ممتاز محل کی رعنائی لرزتی

۔سے اور سونے کے چاند کے حسن وجمال میں اس کی شگفتگی پنہاں ہے۔

یوں کہنا چاہئے۔کہ ہندوستان نے یہ عمارت بنا کے عورت کے حسن و جمال کو خراج عشق ادا کیا ہے۔"

روشنی تمام باغ پر چھا گئی اور سرو کے درختوں کی سایہ ارغوانی حسین تر ہوگئیں۔ مگر آم کے درخت ابھی تک دھندلے سے معلوم ہوتے تھے۔ اب مینا۔ ہشتی اور مالی شور و غوغا کرتے ہوئے باغ میں داخل ہوئے۔ اور طوطوں نے ایک طوفانِ نغمہ برپا کردیا۔

"تاج" ہندوستان کی صنعت کا وہ نمونہ ہے جس کو دیکھ کر تمام لوگ ہندو۔مسلمان۔عیسائی۔سکھ تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

دوپہر کی چمکتی ہوئی دھوپ میں سفید گنبد گہرے نیلے آسمان کے سامنے کہنہ عمارتوں اور مبتذل جدید اختراعوں کے مقابلے میں صنعت و ایجاد کی تکمیل معلوم ہوتا ہے۔

تاج کے موجودہ نقشوں میں سب سے پرانا نقشہ کرنل ہاڈکس سرویر جنرل انڈیا نے ۱۸۲۸ء میں ترتیب دیا تھا۔جس کے مطالعے سے صاف طور پر واضح ہوجاتا ہے۔کہ اگرچہ ان باغات کی بہت کچھ نگہداشت کی جاتی ہے۔مگر ان کی اب وہ صورت نہیں رہی۔ جو ان کے کاریگروں کے ذہن میں تھی۔بہت حد تک کئی چیزوں کو مغربی انداز میں رنگ دیا گیا ہے۔اور کہا جاسکتا ہے۔کہ اب تاج کے یہ حصے صناع کے اصلی مقصد کے آئینہ دار نہیں ہیں۔

گنجان درخت اراضی کو گھیرے ہوئے ہیں۔جنکی وجہ سے عمارت کی خوبصورتی کو کافی نقصان پہنچا ہے۔

"تاج" کا خاکہ سادہ ہے۔

باغ چار حصوں میں منقسم ہے۔ اور ان چار حصوں سے ہندوؤں کی فردوس سکون کے چار حصے مراد ہیں۔یہی ترتیب ہے جو باقی کل باغات میں ملحوظ رکھی گئی ہے۔صرف ایک بات ایسی ہے جو تاج محل کو دوسرے باغات سے مشخص کرتی ہے۔اور وہ یہ ہے کہ وسط میں ایک سنگ مرمر کا حوض واقع ہے۔ حالانکہ باقی تقریباً تمام باغات کے وسط میں ایک عمارت یا بارہ دری بنائی گئی ہے۔

تاج محل کا روضہ باغ کے اختتام پر جمنا کے چمکتے ہوئے پہنائے وسیع کے کنارے واقع ہے۔کیا بات تھی کہ شاہجہاں نے اپنے اصول کو خاص اس باغ کے مقابلے میں ملحوظ خاطر نہیں رکھا؟

کیا اُسے جمنا کے فطرتی مناظر پسند تھے؟ کیا اُس نے یہ جگہ اس لئے انتخاب کی تھی کہ اپنے قلعہ کے برجوں سے وہ تاج محل کے مرمریں اطراف کو طلوع صبح اور شفق شام کے سرخ رنگوں میں غرق ہوتا دیکھ سکے؟ شاید وہ راجپوتی اثر جو اُسے اپنی ماں کی طرف سے ورثے میں ملا تھا اس بات کا محرک ہوا ہو۔اور وہ چاہتا ہو کہ اصل عمارت کو دریا کے کنارے بنا کر وسط باغ میں دلشیز کے لئے کنول کے پھولوں کا حوض بنائے۔شاید یہ روایت درست ہو کہ "تاج" شاہجہاں سے مکمل نہ ہوسکا۔وہ چاہتا تھا۔کہ اس عمارت کے آگے دریا سے پار اپنے لئے بھی ایک روضہ بنوالے۔اور دریا پر سنگ سیاہ کا پل باندھ کر اس روضے کو اپنی قبر سے ملادے۔اور یوں مقدس جمنا مرکز اتصال رہے۔

برنیر نے سنہ ۱۸۶۰ء میں ان باغات کو دیکھا تھا - وہ لکھتا ہے -

"آخری بار جب میں تاج محل دیکھنے کے لئے گیا - تو میرے ہمراہ ایک فرانسیسی سوداگر بھی تھا جو سیر و سیاحت کے لئے ہندوستان آیا ہوا تھا - وہ بھی میری طرح سمجھتا تھا - کہ تاج کی تعریف نہیں ہو سکتی - پہلے تو میں نے اپنے تاثرات بیان کرنے سے انکار کیا - کیونکہ میں ڈرتا تھا - کہ شاید ہندوستان میں رہ کر میرا مذاق خراب ہو گیا ہے - مگر جب مجھے معلوم ہوا - کہ وہ نووارد فرانسیسی بھی جس پر تا حال ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا کوئی اثر نہیں ہے میرے ساتھ متفق ہے تو میں نے بڑے گرمجوشانہ الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا"

اس میں کوئی شک نہیں کہ تاج کی مکمل نگہداشت ہوتی ہے - سرو کے درخت نئے نصب کئے گئے ہیں - مگر وہ مرکزی دلچسپی جو اکثر مغل بادشاہوں کے باغات میں پائی جاتی ہے نابود ہو گئی ہے - سرو کے درختوں اور ثمردار اشجار کا وہ طلسمی امتزاج جس نے معہود ذہنی کی صورت اختیار کر لی تھی - اب تاج میں پایا نہیں جاتا -

تھوڑا عرصہ ہوا ہے - کہ تاج کے باغ میں کھجور کے درخت بھی نصب کئے گئے ہیں - ابھی تک تو یہ پودے بہت برے معلوم ہوتے ہیں - مگر اس میں شک نہیں - کہ جب نزدیک ہی مستقبل میں یہ پودے سرو کے بلند بالا درختوں سے بھی بڑھ جائیں گے - تو باغ کی خوبصورتی میں یقیناً معتدبہ اضافہ ہوگا - کیونکہ ان کی نازک میانی تاج کے چار میناروں کی نزاکت سے متناسب ہوگی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لیموں انار اور سنگترے کے درخت باغ کے چاروں حصوں میں پھر نصب کئے جائیں - اور یوں اس مقصد اعلیٰ کی تکمیل کی طرف ایک قدم اُٹھایا جائے جس کو سامنے رکھ کر مغل بادشاہ اپنے باغوں کے نقشے تیار کیا کرتے تھے -

ایک ماہ تک صبح و شام میں اس باغ کے جلووں سے لطف اندوز ہوتا رہا - اور روشن ایام میں ایک تاریک دن بھی مجھے بخوبی یاد ہے -

مینہ برس چکا تھا - کھلتی سردیوں کے دن تھے - سرکوں پر پانی کھڑا ہوا تھا - پودوں پر اور سرو کے درختوں پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے - دور - ارغوانی بادلوں کے سامنے تاج روضہ ہاتھی دانت سے بنا معلوم ہوتا تھا - صاف - نرم - ہاتھی دانت جس میں ہر ایک رنگ جلوہ گر تھا -

روضے کے چبوترے پر پانی کے قطرے درخشاں تھے - سنگ سیاہ و سفید کے خطوط توازن و تناسب کا ایک معجزہ نظر آتے تھے - دن کے وقت سورج کی روشنی میں ان پتھروں کی اس کاریگری پر کسی کی نظر نہیں جاتی - مگر اس وقت یہ چیزیں صاف نظر آ رہی تھیں +

اس منظر کو دیکھ کر میرے دل پر جو تاثرات ہوئے - وہ غالباً عرصے تک میرے ذہن اور حافظے سے فراموش نہ ہوں گے -

(ماخوذ)

. . . .

بیخودی پہ مرتا ہوں مےکشی سے ڈرتا ہوں
اخذِ کیف کرتا ہوں خوشہ ہائے پرویں سے

تاج کی نزاکت میں رفعتیں ہیں الفت کی
رنگِ عشق پیدا ہے نقش ہائے سنگیں سے

مسافر

(غیر مطبوعہ)

شبِ سیاہ تھی اور اک مسافرِ تنہا
کہیں سے جانبِ شہرِ حبیب جاتا تھا
ہوا تھا گامزنِ شاہراہِ اہلِ وفا
سکونِ خواب میں تھا ہر مسافرِ ہستی
مگر! وہ گرمِ سفر تھا بشانِ بیخبری

(۲)

اگرچہ رات کی تاریکیاں مزاحم تھیں!
اگرچہ دشت کی خاموشیاں مزاحم تھیں!
اگرچہ وقت کی تنہائیاں مزاحم تھیں!
مگر وہ عشق میں سرشار ہو کے بڑھتا تھا
خرامِ چشمۂ کہسار ہو کے بڑھتا تھا

(۳)

رہِ وفا میں جو ثابت قدم اُسے پایا
تو کائنات کے خالق کو اُس پہ رحم آیا
وہیں یہ ماہِ درخشاں کو حکم فرمایا
کہ اپنی منزلِ خلوت سے جلد باہر آ
اور اس مسافرِ بیکس کا ہمسفر بنجا

غرض! بلند ہوا آسماں پہ بدرِ منیر!
ہر اک شعاع ہوئی موجِ چشمۂ تنویر!
یہ دیکھ کر ہوا شاد اس مسافرِ دلگیر!
ادھر زمیں پہ وہ اپنا قدم بڑھاتا تھا
اُدھر فلک پہ قمر ساتھ ساتھ جاتا تھا

(۵)

فصیلِ شہر کے آثار جب قریب آئے
قدم کو روک لیا عشق کے مسافر نے
اک آہ بھر کے کہا یہ، "سفیرِ گردوں" سے
کہ اے غریب مسافر کے آشنا! رخصت!
ترے کرم کی خدا دے تجھے جزا! رخصت!

(۶)

یہی مقام جدائی ہے، اے رفیقِ لبیب!
کہ ہے جلالِ محبت کی جلوہ گاہ قریب!
یہاں سے دور نہیں خوابگاہِ نازِ حبیب!
کسی طرح نہ تجھے ساتھ لے سکونگا میں!
بس اس مقام سے تنہا سفر کرونگا میں!

روش صدیقی

خلفشارِ زندگی

(ایک معاشرتی افسانہ)

عام طور پر اُن آدمیوں کو متین نہیں سمجھا جاتا جو اپنے خانگی معاملات کے متعلق جو منہ میں آئے کھلم کھلا کہہ گزرتے ہیں۔ اور خصوصاً ایسے شخص کو تو بالکل ہی غیر مہذب سمجھا جاتا ہے جو اپنے اور اپنی بیوی کے تعلقات کو بھی عام لوگوں پر ظاہر کر دینے سے نہ چوکے۔ مگر جس بدقسمت کی بیوی اس کی طبیعت کے موافق نہیں ہے اور اس کی وجہ سے اس کی گھریلو زندگی اجیرن ہو رہی ہے۔ اُس کو اپنا دکھڑا سنانے کے ساتھ ہی راہ چلتوں کی لعن طعن برداشت کرنے کو بھی تیار رہنا چاہئے۔ کیونکہ اس کی ذات میں بھی کچھ نہ کچھ کمزوری ضرور ہوگی۔ ورنہ اُسے اپنی ذات پر اعتماد ہوتا اور اس کی قوت فیصلہ مضبوط ہوتی تو وہ اپنی خانگی بدنظمی کے باوجود اپنے کاروبار میں ترقی کرتا رہتا۔ اور اس کی کامیابی میں کوئی چیز حائل نہ ہوتی۔ ہزاروں آدمی بیمار عورتوں، نکمے لڑکوں اور اپاہج رشتہ داروں کا بار ہنسی خوشی برداشت کرتے ہوئے اپنے کاروبار میں ترقی کرتے جاتے ہیں اور چوں تک نہیں کرتے۔

دنیا ایسے لوگوں کو بنظرِ استحسان دیکھتی ہے۔ لیکن اُس نامرد اور بزدل شخص سے کوئی ہمدردی نہیں کی جاتی۔ بلکہ اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جو ہمیشہ دکھڑا روتا رہتا ہے کہ میرے بیوی بچے نہ ہوتے تو میں کہیں کا کہیں پہنچ گیا ہوتا۔

میں چاہتا ہوں کہ مجھے اس بزدل جماعت میں شمار کیا جائے۔ کیونکہ میں اُن سے یقیناً چند قدم آگے ہوں اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ نوے فیصدی بیاہے ہوئے مرد بن بیاہے آدمیوں سے زیادہ اطمینان اور زیادہ فراغت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور بہت سے لوگ تو صرف اپنی بیوی ہی کے طفیل میں آدمی بلکہ بڑے آدمی بن گئے ہیں۔ مگر یہ اسی وقت ہوتا ہے جب میاں بیوی اعتدال کی حد سے تجاوز نہ کریں۔

اپنی داستان شروع کرنے سے پہلے یہ کہدینا ضروری سمجھتا ہوں کہ عورت میرے نزدیک زندگی کا نصف اہم ہے۔ اس لئے امیدوار ہوں کہ عورتوں کے متعلق میرے جو الفاظ ناقدانہ یا معاندانہ معلوم ہوں انہیں بھی عورتوں کے احترام اور انکی توقیر پر محمول کیا جائے۔

میں اپنے بچپن کے دنوں کو یاد کرتا ہوں تو آجکل کی دنیا سے بالکل مختلف نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ آج عہدِ وکٹوریا کی باتوں پر ہنسی اڑائی جاتی ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ اگر ہماری بسراوقات آجکل کی طرح کا ہلانہ ہوتی تو آج مجھے اچھے بُرے کی تمیز نہ ہوتی۔ اور مجھے اپنی بگڑتی ہوئی حالت کے سدھارنے کا ذرا بھی احساس نہ ہوتا۔

میرا باپ جدید انگلستان کے ان باشندوں میں سے تھا جنہوں نے مغرب میں آباد ہونے کی ناعاقبت اندیشانہ جرأت کی تھی۔ وہ خود اعتمادی کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ وہ اپنے ضمیر کی ہدایت کے مطابق ہمیشہ اپنے اخلاق سنوارنے میں لگا رہتا تھا۔ اُسے پورا یقین تھا کہ میرا خدا ہر وقت میرے ساتھ ہے۔ اُس نے پُرانی چیزوں کی ایک دکان کھول رکھی تھی جس میں ضروریات زندگی کی ہر چیز ہر وقت مل سکتی تھی۔ اس پر اسے بڑا فخر تھا کہ شربت مفرح سے لیکر لوحِ مزار تک ساری چیزیں اس کے ہاں سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ میں بچپن میں ایک منشی کی حیثیت سے اسی دوکان میں کام کرتا تھا اور کم قیمت پر مال خرید کر تگنے چوگنے دام پر بیچنے کا چسکا مجھے یہیں سے پڑ گیا تھا۔ رسیدیں لکھنے اور بہی کھاتے کو صاف رکھنے کی عادت بھی یہیں پیدا ہوگئی تھی۔ روزانہ صبح کے ساڑھے سات بجے سے رات کے دس بجے تک اور ہفتہ کو گیارہ بجے دن تک میں اپنے باپ کے ساتھ اسی دوکان میں لگا رہتا۔ میرا باپ اس زندگی سے بہت خوش تھا۔ دکانداری تو اُسے ایسی اچھی آتی تھی کہ خواہ کتنے ہی گاہک آجائیں سبکو خوش اسلوبی سے بھگتا دیتا۔ اور ہر ایک خوش ہو کر جاتا۔ جب گاہک اکا دُکا آتے تو وہ اپنے گدام کے باہر منہ میں چرٹ دبائے ایک کرسی پر جا ڈٹتا۔ اور دنیا جہان کے معاملات طے کرنے لگتا۔

ایک دن دوپہر کے وقت جب میں کالج میں پڑھنے گیا ہوا تھا۔ میرا باپ گدام میں کھڑے کھڑے گر کر مر گیا۔ اس کے بعد میں نے بہی کھاتوں کی پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ اگر میرے باپ کے تمام قرضدار قرضہ ادا کر دیں تو میری ماں کے پاس ایک سو پچاس ہزار ڈالر جمع ہو

جائیں گے۔ لیکن مرحوم کا دل اور حوصلہ اس کے دماغ اور رفوتِ فیصلہ سے بہت زیادہ فراخ تھا۔ اس نے زندگی بھر میں اپنے قرضداروں سے کبھی مطالبہ نہیں کیا۔ غریب اور نادار لوگ اس کی زندگی میں ہمیشہ اس کے دان پُن کا گُن گاتے رہتے۔ مگر اس کی تجہیز و تکفین میں شامل ہونے کے بعد اس کی ساری بخششوں کو طاقِ نسیاں پر رکھ کر بھول گئے۔ والدہ کی خوش قسمتی سے میرے دونوں بڑے بھائی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ ایک تو کامیاب ڈاکٹر تھا۔ دوسرا معدنیات کا انجنیئر۔ اس لئے میری ماں کو دال روٹی کی تکلیف نہیں ہوئی۔

میرے خیال میں اگر کوئی سوانح نگار ایک کامیاب امریکن خاتون اور ایک ماں کے واقعات زندگی قلمبند کرنا ہے تو اس کو میری ماں کی زندگی سے زیادہ موزوں عورت ملنی مشکل ہے۔ جب میرے باپ نے دوکان کھولی تو میری ماں ایک چھوٹے سے گاؤں میں معلمہ تھی۔ وہ بڑی زندہ دل۔ کفایت شعار اور محنتی تھی اس کے دم سے ہمارا مکان جنت بنا رہتا۔ میرا باپ جب کبھی غمگین ہوتا۔ وہ ہمیشہ اس کی شریک غم ہوا کرتی۔ اور اسطرح میرے باپ کو مسرت کی تلاش میں گھر سے باہر جانا نہیں پڑتا تھا۔ وہ گھر کے کام بڑی سرگرمی سے انجام دیتی مگر میں نے اپنی یاد میں کبھی تھکتے یا بیمار پڑتے نہیں دیکھا۔ وہ جبتک زندہ رہی اپنی زندگی کو زندوں کی طرح گذارا۔ اور تراسی سال کی پختہ عمر میں انتقال کیا۔

ہمارے باپ نے ایکبار ہم سب بھائیوں کو مخاطب کر کے وقت کہا تھا کہ بچو! میں تمہارے لئے کوئی بڑی دولت چھوڑ کر نہیں مرونگا۔ ہاں اگر میرے عادات و خصائل کی پیروی کرو گے اور اپنی نوجوانی ہی میں اپنی خوش قسمتی سے اپنی ماں جیسی عورت سے شادی کر لو گے تو یقیناً تمہاری زندگی بھی کامیاب ہو جائیگی۔ (بے شک یہ پیرِ دانا کی ایک دانشمندانہ پند تھی)

والد کے انتقال کے بعد میں سڑکوں کے کنارے خوانچہ بیچکر پیٹ پالا کرتا تھا۔ والد کی سی خوش خلقی۔ چرب زبانی۔ شیریں کلامی مجھ میں بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مگر اُن جیسی کوشش اور کاوش نہ تھی۔ چند سال میں نے یونہی کھیل کود میں گذار دئے۔ خوانچہ فروشی سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ ہوٹل کے قیام و طعام کا خرچ پورا ہو جاتا کبھی کبھار ناچ کی سیر بھی کر آتا۔ نہ اُسوقت مجھے کوئی دُکھ درد تھا اور نہ آئندہ کی فکر۔

ایک دن میں اوہیو کے گاؤں میں ایک بڑے دکاندار کو کچھ آرڈر دے رہا تھا کہ اتنے میں ایک نوجوان لڑکی دوکان کے اندر گھس آئی۔ اور مالکانہ حیثیت سے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالکر سیدھے دوکاندار کے پاس گئی اور اپنے بازو اس کے گلے میں حمائل کر دئے۔ اس کو بوسہ دیا۔ میں نے سمجھا کہ ہو نہ ہو یہ اس کی بیٹی ہے۔ جب اس نے دوکاندار سے پچیس ڈالر کی فوری ضرورت ظاہر کی تو میرا شک یقین سے بدل گیا۔ پھر اس لڑکی سے میرا تعارف کرایا گیا اور پانچ منٹ کے اندر ہی میرے دل میں ایک عجیب کیفیت محسوس ہونے لگی۔ سچ ہے کہ جوانی دیوانی ہونے کے باوجود اپنا راستہ خود ہی ڈھونڈھ لیتی ہے۔

میں نے خوانچہ فروشی چھوڑ دی اور سارا وقت اسی کی گلی میں چکر کاٹنے میں صرف ہونے لگا۔ شکر ہے کہ میری ہیرا پھیری رائگاں نہیں گئی۔ اور چھ ماہ کے بعد اس سے میری شادی ہو گئی۔

اہیفل اپنے باپ ماں کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے باپ نے ہماری خاطر ایک مکان بنوا دینے کا وعدہ کیا بشرطیکہ ہم اسی گاؤں میں رہیں۔ مجھے تجارت میں شریک ہونے کی دعوت بھی دی۔ میں اس تجویز سے بہت خوش ہوا۔ کیونکہ میری سہل انگاری کے لئے تجارت سے بہتر اور کوئی مشغلہ نہ تھا۔ لیکن میری بیوی شہری زندگی پر لٹو ہو رہی تھی۔ اسے نہ تجارت کی پروا تھی نہ مکان کی وہ صرف شہر کی خواہشمند تھی خواہ کوئی شہر ہو لیکن جتنا بڑا ہو اتنا ہی بہتر ہے۔

اس کے رشتہ داروں کی تمنا کے خلاف ہم کولمبس شہر کی طرف چلدئے اور شہر کے کنارے ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے سہنے لگے۔ وہاں میں ایک کمپنی میں چھوٹی چھوٹی صندوقچیاں بنانے پر نوکر ہو گیا۔ اور اسی کی آمدنی سے مزے میں دن گذرنے لگے۔ اس وقت اگر تمنا تھی تو صرف یہ کہ قدرت ہمیں ایک کھلونا (بچہ) عطا کرے۔

آدمی کے اخراجات جب بڑھ جاتے ہیں تو آمدنی کے لئے اس کی جدوجہد بھی بڑھجاتی ہے۔ میں نے محنت سے کبھی اتنا کام نہیں کیا تھا جتنا اس عیالداری کے چند ابتدائی سال میں کرتا رہا۔ میں نے تمام علاقے میں آگ سی لگادی۔ اور مانگ اتنی بڑھادی کہ کمپنی کو میری تنخواہ میں لگاتار اضافہ کرنا پڑا کہ کوئی دوسری کمپنی کہیں مجھے اس سے بھی زیادہ مشاہرہ دیکر نہ پھانس لے۔

میں کولمبس میں بڑے اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اور کچھ روپیہ بھی جمع کر لیا تھا۔ مگر میری بیوی ایتھل کے جی میں نیویارک بسا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے برابر کہا کرتی کہ وہاں دوکانداری خوب چلتی ہے۔ آمدنی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہاں سوداگروں کی جماعت بہت بڑی ہے۔ مجھے ترغیب دیتی کہ وہاں چلکر تجارت کرو تو جلد ہی تم بھی ان کی انجمن کے ممبر بنجاؤ گے۔ اس کے خیال میں میں بیدار مغز اور بڑا چست و چالاک تھا۔ اور وہ میری اسقدر تعریف کیا کرتی کہ میں اپنے کو واقعی "ہیچمن دیگرے نیست" سمجھنے لگا۔ اور بہت سا قیمتی وقت اس سوچ بچار اور خیالی پلاؤ پکانے میں ضائع کرنے کے بعد آخر میں نے نیویارک جانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

کولمبس میں رہتے ہوئے میں نے غیر محسوس طور پر کاروباری صداقت حاصل کر لی تھی۔ جس چیز کو تم حاصل کرنا چاہتے ہو اس کو چند دنوں کے لئے بھول جاؤ تو تم یقیناً اُسے پالو گے۔ یہ اصول بظاہر احمقانہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کاروباری دنیا کے جو لوگ میرے ناظرین میں شامل ہیں وہ اس حقیقت سے خوب واقف ہیں۔

تم نے[1] اکثر اپنے مدعا کو حاصل کرنے کے لئے جان توڑ کوشش کی ہوگی مگر پھر بھی تمہاری تمنا اُس وقت نہیں پوری ہوئی ہوگی لیکن غور کرو تو تم حیرت میں پڑ جاؤ گے۔ کہ تمہارا وہی مدعا کسی دوسرے مقصد کے جدوجہد کے سلسلے میں ضمنی طور پر حاصل ہو گیا۔ میرے ساتھ بھی ہو بہو ایسا ہی ہوا۔

جو خطوط میں نے نیویارک روانہ کئے تھے وہ سب بیکار گئے ہاں وہاں کے ایک تجارتی اخبار میں میں نے جو اشتہار دیا تھا اس کے جواب میں پانچ چھٹیاں آئیں۔ ان میں سے ایک چھٹی کلولینڈ کے ایک سوداگر کے چچیرے بھائی کی تھی۔ یہ سوداگر مجھ سے واقف تھا اور اسی نے اپنے بھائی کو مجھے تجارت میں شریک کرنے پر تیار کیا تھا۔ میں نیویارک اس کے دفتر میں پہنچ گیا۔ اور اس کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو گیا۔ میں نے دیانتداری سے بڑی محنت سے کام کیا اور چند ہی دنوں میں کافی دولت پیدا کر لی۔ اور ایک کمپنی کے بہت سے حصے خرید لئے۔

اس وقت میری عمر چالیس سال کی تھی۔ میرا قد چھ فٹ لمبا تھا ہاتھ پاؤں کا کسیلا اور گٹھیلا تھا۔ صحت بظاہر بہت اچھی تھی۔ تین شہری اور دو گاف کلبوں کا ممبر تھا۔ ایتھل جیسی قبول صورت اور تندرست عورت میری شریک زندگی تھی۔ دو بچوں ـــــ ایک لڑکا ایک لڑکی ـــــ کا باپ بھی ہو چکا تھا۔ خدمت کے لئے اندر باہر نوکر چاکر ہر وقت کمربستہ رہتے تھے۔ بچے پرائیویٹ سکول میں داخل تھے۔ اس لئے ہم کو پارٹیوں میں شرکت اور سیر و تفریح کیلئے کافی وقت مل جایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ آدمی کو اور چاہئیے ہی کیا۔ یقیناً خدا کسی کے ساتھ اس سے زیادہ مہربانی نہیں کرتا۔

پانچ سال تک ہم نیویارک کی دل آویز اور ولولہ انگیز زندگی بسر کرتے رہے۔ اس دوران میں میں نے کئی تاجروں سے دوستی پیدا کر لی۔ میری بیوی نے بہت اونچے گھرانے کی عورتوں کو سہیلی بنالیا۔ میں تاجروں کی انجمن کا ممبر بھی بنا دیا گیا۔ اگرچہ ذمہ دار اور کوئی ممتاز ممبر نہیں تھا مگر انجمن کے بڑے بڑے تاجروں کی نظریں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔ کیونکہ اب عنقریب نیویارک کے معیار کے مطابق کامیاب تاجر بننے والا تھا۔ ہمارا حلقۂ احباب بھی بہت وسیع ہو چکا تھا۔

اگر میں کبھی سُست ہو جاتا اور کاروبار میں کاہلی برتنے لگتا تو میری بیوی فوراً مجھے خبردار کر دیتی کہ "ایسا بیوقوف کیا کرتے ہیں۔ تم تو سمجھدار ہو اور روز بروز بام ترقی کے قریب ہوتے جا رہے ہو مگر ترقی تو بڑی چیز ہے بغیر کوشش کے دنیا کی کوئی معمولی سی چیز بھی نہیں حاصل کیجا سکتی۔ تمہیں ہر چیز کی قیمت ادا کرنی چاہئیے۔ کاروبار میں محنت کرنی چاہئیے۔ حلقۂ احباب کو قائم رکھنے کی کوشش کرنی چاہئیے۔ جب تم دوسروں کو نہیں کھلاؤ پلاؤ گے تو دوسرے تمہیں کب پوچھیں گے۔ امریکہ کے ان چوٹی کے لوگوں سے تمہارا میل جول انہی پارٹیوں اور صحبتہائے شبینہ کا رہین منت ہے جس سے تم گھبراتے ہو۔"

بات سچی تھی اور کہنے والی کا منہ چوم لینے کے قابل۔ ایتھل کی ایسی ہی باتوں نے مجھے ایک خوانچہ فروش سے کامیاب سوداگر بنا دیا تھا۔ مگر اب اس کی ہمت افزائیوں کے باوجود میں ایک قسم کے اندرونی خلجان میں مبتلا رہتا تھا۔

۴۰ سے ۴۵ سال کی عمر کے درمیان میرا کاروبار روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور حالات بظاہر میرے موافق معلوم ہوتے تھے مگر

[1] اکتوبر کے "ادبی دنیا" کا مضمون "غور و فکر کا فن" ملاحظہ فرمایئے۔ (صدیق طیب)

میرا روحانی اطمینان مفقود تھا اور بجائے خوش خوش اور بے فکر رہنے کے میں ہمیشہ اُدھیڑ بُن میں لگا رہتا تھا۔ مجھے ابّا جان کا زمانہ یاد آتا کہ میں اپنے چھوٹے سے کاروبار پر کتنا حاوی تھا اور میرے دن کیسی بے فکری سے کٹتے تھے۔

ایک دن میں دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ یکبارگی میری طبیعت میں اپنی تجارت سے نفرت پیدا ہو گئی اور میں نے اس پیشے کو صلواتیں سنانی شروع کر دیں۔ اپنی ٹوپی اٹھائی اور اپنے سیکرٹری کو ہدایت کر دی کہ آج کا سارا پروگرام منسوخ کر دو۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ اور ایک نہایت اہم کانفرنس کی شرکت کے متعلق یاد دلایا جو شام کو ہونیوالی تھی۔ میں نے کہا کہ کوئی پوچھے تو کہدینا کہ وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔ اور مجھے کوئی علم نہیں کہ کب آئینگے۔

اس کے بعد میں چند گھنٹے ادھر اُدھر پھرتا رہا مگر مجھ پر کچھ ایسی بیخودی سی طاری تھی کہ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میں کہاں کہاں مارا پھرا۔ دو بجے کے قریب شہر کے مضافات میں ایک ہوٹل میں جا نکلا اور وہاں دودھ بسکٹ سے پیٹ کی آگ بجھائی۔

(بے شک اب میں دودھ بسکٹ کھانے والوں میں ہو گیا ہوں)۔

ہوٹل کے پار سامنے ایک مختصر سا باغیچہ تھا۔ وہاں جا کر میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ بنچ کے دوسرے سرے پر ایک ادھیڑ عمر گندم گوں خوش وضع النسان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے استفسار کیا کہ کیا میں کبھی کسی رقص گاہ میں گیا ہوں؟ میں نے جواب دیا "افسوس اتنا وقت کہاں"۔

اس پر اس اجنبی نے کہا "خوب وقت! کیا وقت نہیں ملتا ہو معمولی بساط کا آدمی وقت نکال سکتا ہے۔ آپ اتنا بھی نہیں کر سکتے۔ میری عمر پا کر آپ مر جائیں گے۔ کیا نہیں مرینگے؟ اگر آپ رقص پسند کرتے ہیں تو کسی ناچ گھر میں کیوں نہیں جاتے؟ مسرت کی خاطر جو دل میں آئے کیجئے"۔

اس کی تمام باتیں سن کر میں مبہوت ہو گیا۔ میں حیران تھا کہ کیا کہوں اور کیا کروں۔ وہ بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ اخبار بھی پڑھتا جاتا تھا۔ میرا ہم عمر معلوم ہوتا تھا۔ اور اس کی آمدنی میری آمدنی سے کچھ بہت زیادہ نہ تھی۔ لیکن اس کے پاس دھوپ میں بیٹھنے کے لئے وقت تھا۔ اخبار خوانی کر سکتا تھا لیکن آہ! یہ سب کچھ میرے نصیب میں کہاں! -

دیر تک میں بحرِ تفکر میں غوطہ زن رہا۔ یہ کامیابی تھی جس کے تجسس میں میں نکلا تھا۔ یہی چیز تھی جسے میری بیوی نے میرے لئے حاصل کرنے کی سعی کی۔ اور جو ہمیں حاصل ہوئی۔ بھلا اس کا مجھے کیا فائدہ؟

میں نے اپنی جیب سے چند کاغذ نکالے اور کچھ نوٹ کرنا شروع کیا۔ پھر ان اشاروں کو تفصیلاً لکھا تاکہ اچھی طرح پڑھے جا سکیں۔ وہ کچھ ایسے تھے:-

جب میری آمدنی دس ہزار ڈالر سالانہ تھی تو میں چھ ہزار بچاتا تھا جب پندرہ ہزار سالانہ ہوئی تو میں نو ہزار بچاتا تھا۔ اس طرح میں نے اپنی مالی آزادی حاصل کی۔ ہائے آزادی کیسا پیارا لفظ ہے۔ دیکھو تو میں کسقدر آزادی کا مدعی ہوں؟ ہاں جب ہماری آمدنی کم تھی ہم زیادہ خوش تھے۔ ہم بہت مالدار تھے۔ ہم تندرست تھے۔ میری عورت بچوں کی پرورش کی خود ذمہ دار تھی۔ میرے پاس کافی وقت تھا کہ ان کے ساتھ ہفتہ اور اتوار کو کھیلوں اور دل بہلاؤں۔ ہمیں قلبی تسلی تھی کہ ہم دنیا میں اچھے کام کر رہے ہیں۔ اور جو لوگ غربت میں ہیں ان کی اعانت کر رہے ہیں۔

اب میری موجودہ حالت کیا ہے؟ اب میری آمدنی بیرے خیال اور حصر سے بھی زیادہ ہے۔ میں نے بہت بھاری رقم کے عوض میں اپنی زندگی بیمہ کرائی ہوئی ہے۔ میں کچھ بھی نہیں بچاتا۔ برخلاف اس کے میں مقروض ہوں۔ ہم کو قصاب، نانبائی وغیرہ کا قرضہ دینا ہے میں ادارہ کا قرضہ ادا کر دیا کرتا ہوں۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو میرا نام قرضہ دینے والوں کی فہرست میں مشتہر ہو جائیگا۔ اور تجارتی دنیا مجھے دیوالیہ تصور کریگی۔ اس طرح سے میرا وقار معرضِ خطر میں پڑ جائیگا۔ اور میں دو کوڑی کا نہ رہونگا۔ اب ہماری حالت اس قدر ناگفتہ بہ ہے کہ ہم گرجوں میں کچھ چندہ نہیں دیتے۔ زکوٰۃ نہیں دیتے غریب برادری کی امداد نہیں کرتے۔ پیسہ کبھی ہاتھ میں آتا نہیں تو اسے ٹھکانے لگانے کی کئی صورتیں پیش آ جاتی ہیں۔ اس کا جواب کیا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ ہم دس ہزار ڈالر سے تو اسقدر امیر تھے اور اس سے کئی گنا رقم کے ہوتے ہوئے نادار ہیں؟

ع ایں فتنہ کہ بینی ہمہ از خود بینی

عمرانی زندگی

جب ہم گرینج میں مقیم تھے اور چند آدمیوں کو جانتے تھے تو ہم کبھی

باہر سیر کے لئے چلے جاتے تھے۔ شب شنبہ ہماری عیش و نشاط کی رات ہوا کرتی تھی۔ کبھی ہم تیاتر دیکھنے چلے جاتے اور کبھی سرود خانہ میں جا کر چبوترے پر بیٹھ جاتے تھے اور کبھی گھر ہی میں بیٹھ کر گھر لوٹ آیا کرتے تھے۔ ہم خوش، تندرست اور جز درس تھے۔

اب ہم بہت سے بڑے بڑے آدمیوں کو جانتے ہیں۔ وہ ہمارے ہاں کھانا تناول کرنے آتے ہیں۔ اور کبھی ہم ان کے ہاں جاتے ہیں گزشتہ سرما میں ان ضیافتوں کی تقریب پر ہم ناولوں، طلاقوں، یورپ کی سیر، منڈی کی اشیاء وغیرہ پر بحث و تمحیص کیا کرتے تھے۔ ہم شراب نوشی کیا کرتے اور سگریٹ بھی پیا کرتے تھے۔ ہم نے ایک ایک ڈرامہ کو تین تین چار چار بار دیکھا۔ اور رات کو دیر کر کے سونے کے باعث بستر پر کروٹیں بدلا کرتے تھے۔

یہ ہے سوشیل زندگی۔ یہ ہے بڑے بڑے آدمیوں سے تعارف پیدا کرنے کا نتیجہ۔ نہ دن کو آرام ہے نہ رات کو چین نصیب ہے۔

دیہاتی ادارے

ہم دو دیہاتی کلبوں کے رکن ہیں۔ وہ ہزار ڈالر سے زائد چندہ ہمیں ادا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے بچے گرجے میں نہیں جاتے۔ بجائے اس کے وہ ہمارے ساتھ کسی کلب میں جا نکلتے ہیں کیونکہ وہ اتوار کی صبح کو گاف کھیلنے کے مجاز نہیں ہوتے گاف صرف خستہ اور درماندہ تاجروں کے لئے مخصوص ہے۔ اس لئے بچے صرف کلب کے چوک میں گھومتے رہتے ہیں۔

وہ ہم سے زیادہ مالدار اور مقتدر اصحاب کے بچوں سے شناسائی اور آشنائی پیدا کر لیتے ہیں۔ خیر سے یہی ایک بڑا فائدہ ہے۔

مجھے اس قسم کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں اپنے باپ کے کارخانہ میں کام کیا کرتا تھا۔ میری عورت ان ایام کو بنظر استعجاب دیکھتی ہے۔ کہ میں کس صبر و استقلال سے اس ترغیب کا مقابلہ کیا کرتا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ وہ بہت بے مزہ زندگی ہوتی ہوگی۔ برخلاف اس کے وہ بہت ہی پُر لطف اور عجیب زندگی تھی۔

اس قسم کے اشارے میں نے قلمبند کئے۔ کچھ دیر بعد اندھیرا ہونے لگا۔ اور میں نے بھی حرکت کی۔ ایک گاڑی بلائی اور سیدھا گھر کا راستہ لیا۔ میرا کھانے کا کوٹ باہر پڑا ہوا تھا اور میری بیوی ابھی لوٹ کر گھر میں نہ آئی تھی۔ اس نے ٹیلیفون پر مجھے کہا کہ کھیل کی وجہ سے دیر ہوگئی ہے۔ حاضری کے موقعہ پر آ جاؤنگی۔ ہمیں بلنگ سٹونسز جانا تھا۔

ہم بلنگ سٹونسز کو چلد یئے۔ لیکن میں نے اپنے رفقا سے نہ تو یہ کہا کہ میں تھکا ہوا ہوں اور نہ یہی کہا کہ میں بیمار ہوں۔ میں نے اپنی بیوی سے ذرا جلدی لوٹنے کو کہا۔ گھر پہنچ کر میں نے اس سے کہا کہ گاؤن پہن کر کتب خانہ میں چلی آئے۔ ہم وہاں تمام رات تبادلۂ خیالات میں محو رہے۔

میں وہ گفتگو تمام و کمال بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ وہ بہت بے تکلفانہ اور چاؤ پیار کی باتیں تھیں۔ اکثر اوقات تکلم کے درمیان کامل خاموشی اور سکوت کے لمحے طاری ہو جایا کرتے تھے۔ اور میری محبوبہ ایتھل کبھی کبھی آنکھوں کے چشموں سے پانی برسانے لگتی تھی۔ ابتداً وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ مجھے کیوں اطمینان نہیں۔ دنیا کی بیش بہا نعمتیں ہم نے حاصل کر لی ہیں۔ مثلاً معاشرتی مرتبہ۔ امیر دوست، بہترین گھرانوں کی دعوتیں۔ اپنے بچوں کے لئے فوائد۔ بڑے تحمل اور صبر سے میں نے اس پر واضح کر دیا کہ یہ تمام باتیں حالی خولی اور نقش بر آب ہیں۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہے کہ میں ہر روز زیادہ خستگی اور تھکن محسوس کر رہا ہوں۔ اور ہم پہلے سے کم پس انداز کر رہے ہیں۔ میں اپنے کاروبار میں کم ترقی دیکھ رہا ہوں۔ کیونکہ میری تمام تر قوت بیہودہ تحریکات میں تلف ہوگئی ہے۔

لیکن میری بیوی نے کہا "یقیناً کام ہی ہمارا نصب العین نہیں"۔ میں نے جواب دیا۔ کام ہی زندگی ہے۔ آدمی دنیا میں اس لئے بھیجا گیا ہے کہ کوئی کام کرے۔ نہ اس لئے کہ کسی کا ہم نوالہ اور ہم کاسہ بنے۔ اب اس عمر میں مجھے بہت با اثر ہونا چاہئیے اور میں ہر روز کم اثر اور نااہل ثابت ہو رہا ہوں۔ کیونکہ میں اس نکمے کام میں اپنی قوت کھو چکا ہوں جس میں ہم نے اپنے آپ کو مبتلا کر رکھا ہے

تو اپنے بچوں کے موہومی فائدے کا ذکر کر کے خوشیاں مناتی ہے لیکن مجھے ان کو کسمپرسی کی حالت میں دیکھ کر رونا آتا ہے میرے خیال میں بہترین فائدہ جو کسی بچے کے لئے ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر فائدہ بخش کام کرنے کی خواہش بلکہ قومی جذبہ پیدا ہو۔ ہمارا لڑکا شام کی حاضری کے وقت صرف چند منٹ کے لئے اپنے باپ کو دیکھتا ہے۔

وہ میری باتوں کو کچھ کچھ تسلیم کرنے لگی۔ اگرچہ اس کے خیال میں اس کی خوشی ملیامیٹ ہو رہی تھی۔ آخرکار میری باتوں سے تنگ آکر وہ چلا اٹھی اور کہنے لگی تم کیا کرنا چاہتے ہو؟

میں نے کہا میں دیہات میں کھیت لیکر کام کرونگا۔ اور تمہیں اور تمام بال بچوں کو وہاں رکھونگا تاکہ تم جتنی ممکن خوشی اور آرام ہو سکتا ہے حاصل کرو۔ یہاں کے مقابلہ میں وہاں ہم نصف خرچ پر گذارہ کر سکتے ہیں۔ میں بال بچوں سمیت تمہارے ساتھ رہونگا۔ اور ہفتہ میں تین دن وہاں قیام کرونگا۔ اور باقی چار دن اپنے دفتر میں گزارہ کرونگا۔ ہر ہفتہ کے روز تم شہر میں آسکتی ہو۔ اور اپنی سگھڑ سہیلیوں سے ملاقات کر سکتی ہو۔ کبھی کبھی ہم تھیئٹر میں بھی جایا کریں گے۔ اور رقص خانہ میں بھی کبھی لیکچر بھی سُن لیا کرینگے لیکن تمہارا اصلی سروکار بچوں کے ساتھ ہوگا۔ چند سال تم ان کی نگرانی اور نگہداشت میں لگی رہو گی۔ حتیٰ کہ وہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں۔ میں بھی عملاً تمہارا شریک کار رہونگا۔ میں اپنی زندگی کا مخصوص حصّہ اپنے لڑکے اور لڑکی کی دیکھ بھال میں صرف کرونگا۔ میں انہیں ابتدائی مدارس سے اٹھوا کر سرکاری سکول میں داخل کرونگا۔ میں اس بات کا بھی خیال رکھونگا کہ وہ کھیت پر باقاعدہ کام کرتے رہیں۔

ہم کچھ نہ کچھ پڑھتے بھی رہا کرینگے۔ اور دن کے وقت چند گھنٹے کھلے ہوا میدان میں گزارا کرینگے۔ تاکہ ہماری رُوح مردہ نہ ہو جائے۔ اور اس میں تر و تازگی پیدا ہوتی رہے۔

یہ تھا ہماری شب بھر کی طویل گفتگو کا آخری نتیجہ اور فیصلہ۔ دوسرے دن ہی ہم نے اپنی تجاویز کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ ہمارے حلقۂ احباب میں بہت لوگ گپیں ہانک رہے تھے کہ ہم نے بہت روپیہ پیسہ ضائع کیا ہے۔ اور اب کفایت شعاری پر اُتر آئے ہیں۔ ہم نے کسی کی باتوں پر کان نہ دھرا۔ اور اپنے کام میں ہمہ تن مصروف رہے۔ گزشتہ پانچ برس سے ہم نئی تدابیر پر عمل پیرا ہیں۔

بہتر ہے۔ ہم آرام سے رہتے ہیں۔ اور ہمارے پاس خیرات کرنے کے لئے بہت سا روپیہ جمع رہتا ہے۔ خیرات نے ہمیں ایک حیاتِ جدید عطا کی ہے۔ ہم نے اپنے خاندان کے نادار افراد کی مالی اعانت کی ہے۔ ہم نے اپنی قوم کے بیسیوں لڑکے اور لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے میں مدد کی ہے۔ ہم نے گاؤں میں ہر نیک کام میں حصّہ لیا ہے۔ ہمارے بچوں کا زاویۂ نگاہ بالکل بدل گیا ہے۔ وہ عقلمندوں کی دوستی اور مصاحبت کو پسند کرتے ہیں۔ میری تجارت جو زحمت اور فضول چیز تھی ایک دلچسپ اور پُر منفعت شے بن گئی ہے۔ کیونکہ میں خود تازہ ہو گیا ہوں اور ہر کام میں دلچسپی لیتا ہوں۔

ہمارے مطلبی احباب اور ارباب غرض نے ہمیں چھوڑ دیا ہے۔ جیساکہ وہ ہمیشہ اس دوست کو جو نمائش اور روپیہ وغیرہ خرچ کرنا ترک کر دے چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے جانی دوستوں نے ہماری عزت و توقیر بیش از پیش کرنا شروع کر دی ہے۔

میرے تجارب نے مجھے مندرجہ ذیل چھ اسباق سکھائے:۔

(۱) اگر کسی شخص کی بیوی معاشرتی امنگوں اور تمناؤں سے بھری ہوئی ہو تو اس شخص کی زندگی اس پر وبال جان ہو جایا کرتی ہے۔ صحیح معنوں میں عورت، مرد کی اس وقت زیادہ معین و ممد خیال کی جا سکتی ہے جب وہ اپنے خاوند کا ہاتھ بٹائے۔ گھر بار کا خیال رکھے، بچوں کو پالے پوسے، اور ان کو خوش و خرم رکھے۔ اپنے مرد کو مضبوط اور جوشیلا بنا دے۔ جب عورت خاوند کے دنیاوی جاہ و ترقی کے لئے تجاویز سوچنا شروع کر دے تو وہ اسے برباد کر دیگی۔ ایک اچھی عورت اپنے خاوند کو بغیر جدوجہد کے کامیاب بنا سکتی ہے۔ جتنا وہ دانستہ اس کی بہبود و سود کے لئے کوشاں ہوتا ہی وہ اس کے راستہ میں زیادہ کانٹے بوتی ہے۔

(۲) آجکل موجودہ زندگی میں اسقدر سرعت سے تغیرات رونما ہو رہے ہیں کہ بہت سے آدمیوں نے اپنے آپ کو ان کے موافق نہیں بنایا۔ ہم کسانوں اور دہقانوں کے بال بچے ہیں جو کھیتوں میں رہتے تھے جو تازہ ہوا میں سانس لیتے تھے۔ پُرسکون راتوں میں آرام کرتے تھے۔ ان کے پاس پڑھنے لکھنے، آرام کرنے اور غور و خوض کرنے کے لئے کافی وقت ہوا کرتا تھا۔ اب ہم گنجان آبادی میں تنگ و تاریک مکانات میں رہتے ہیں جن میں نہ سورج کی کرنیں آتی ہیں اور نہ تازہ ہوا کا دخل ہے۔ نہ کچھ ہمارے پاس وقت ہے کہ ہم دریافت کریں کہ ہم کدھر جا رہے ہیں اور یہ سب کچھ کس لئے ہو رہا ہے۔

(۳) میں اپنے وقت کا نصف حصّہ شہر میں و نصف دیہات میں

گذارتا ہوں - دفتر میں بجائے چھ دن کے چار دن کام کرتا ہوں لیکن کام نسبتاً بہت زیادہ کرتا ہوں۔

(۴) جو بات آجکل لوگوں کے نزدیک سب سے زیادہ قابل نفعت ہے وہ "بچوں کا مفاد" ہے - میں سادہ زندگی کو پسند کرتا ہوں میں چاہتا ہوں کہ اپنے بچوں کو بھی اس کی تلقین کروں - یعنی ان پر محنت اور سادگی کے فوائد روشن کروں - اور ان لوگوں سے محبت کرنا سکھاؤں جو دنیا میں محنت سے شہرت اور عزت حاصل کرتے ہیں - شکر ہے کہ ہم اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

(۵) میرا ایمان ہے کہ ہمیں لڑکیوں کی موجودہ تربیت، نصاب تعلیم اور تعلیمی معیار کو بالکل بدل ڈالنا چاہئے - میری نظروں میں ان کی حالت بد سے بدتر ہو رہی ہے اور قابل رحم ہے - انہیں کیا ہو گیا ہے؟ ان کا اصلی کام ان سے چھن گیا ہے - انہیں بغیر کسی ذمہ داری کے پرورش کیا جاتا ہے - انہیں ایسی تعلیم دی جا رہی ہے جیسے ان کے مستقبل سے کوئی واسطہ نہیں - اور اگر خوش قسمتی سے کوئی اچھی جگہ بیاہی جائے تو وہ خاوند کے مقبوضات میں ایک بے کار و بے مصرف سامان آرائش تصور ہوتی ہے۔

لڑکیوں کی تربیت کے بارے میں میں دقیانوسی خیال کا آدمی ہوں - میں پرانی تربیت کو جدید تربیت پر ترجیح دیتا ہوں - میرے خیال میں کالج کا نصب العین ایسا ہونا چاہئے کہ جب لڑکیاں بی اے پاس کر لیں تو انہیں اس بات کا پورا پورا احساس ہو کہ عورت اور ماں کا اصلی مفہوم کیا ہے، مرد سے اتحاد و محبت قائم رکھنا کس قدر مشکل ہے۔ اور بچوں کو کامیاب انسان بنانا کتنا مشکل ہے۔

میں عورتوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ انہیں مردوں کے معاملات میں کافی غور اور تدبر کے بعد دخل اور شرکت کرنی چاہئے - سب سے مقدم اور اہم بات جو ان کو احتیاط سے کرنی چاہئے وہ کتب، فنون اور خصوصاً دوسرے اشخاص میاں بیوی کو مناسب حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے - اپنی ترقی کی رفتار کا خیال رکھنا چاہئے - اور دونوں کو اس بات کا یقین ہونا چاہئے کہ ان کی حیاتِ مشترکہ ایک ہی منزلِ مقصود کی طرف چلی جا رہی ہے۔

فیروز حسن ایم - اے - ایم - او - ایل

جلوہ آرائی نظر

جوہر نگاہ کے — ہیں تمام شعبدے

کوہسار، آبشار، جوئبار، لالہ زار — کائناتِ حسن کے جلوہ ہائے سحر کار

ان میں دیکھتا ہوں حسن — دیکھتا رہا ہوں حسن

میں نہ ہوں تو کچھ نہیں میں نہ تھا تو کچھ نہ تھا — میں ہوں حسن آفریں

ہیں تمام شعبدے — جوہرِ نگاہ کے

آفتاب، ماہتاب، اور نجوم بے حساب — حسن کی کتاب کے پارہ ہائے برق تاب

ان میں دیکھتا ہوں حسن — دیکھتا رہا ہوں حسن

میں ہوں حسن آفریں، میں نہ تھا تو کچھ نہ تھا — میں نہ ہوں تو کچھ نہیں

حامد علیخاں

(منتخب)

محبّت

(از ملک رومانیہ)

محبت جیسے لطیف اور موثر جذبہ کو جو دُنیا پر چھایا ہوا ہے الفاظ میں بیان کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ میں صرف اس محبت کے متعلق اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کروں گی جو مرد اور عورت میں پائی جاتی ہے جو بحرِ زندگی میں تلاطم غم و مسترت پیدا کر دیتی ہے اور جس پر موجودہ زمانے کے ہر ایک افسانے کی بُنیاد رکھی گئی ہے۔

مذکورۂ بالا "محبت" سے زیادہ اہم اور قابل قدر وہ محبت ہے جس کا درس ہمیں مقدس کتاب دیتی ہے۔ "محبت بے لوث۔ رشک و حسد سے بے نیاز۔ لاف و گزاف اور بُرائی سے مبرّا۔ اُمید افزا، صبر و تحمل کا مخزن ہے۔" ایسی محبت کی تعریف و توصیف نہیں ہو سکتی۔ لیکن بجائے اس کے میں ایسی ہنگامہ خیز اور محیر العقول محبت کا ذکر کروں گی جس کی سحر کاری سے ہر فرد بشر خواہ وہ کتنا ہی عقلمند کیوں نہ ہو مغلوب ہو جاتا ہے۔

ماں کے لئے وہ لمحۂ حیات نہایت المناک ہوتا ہے جب وہ اپنی اولاد کو آتشِ محبت میں سوزاں دیکھتی ہے۔ اس ثمر ممنوع کی جاذبیت اور زندگی کے راز سربستہ کے انکشاف کی جستجو نوجوانوں کے رگ و پے میں موجزن ہوتی ہے۔

محبت مرد اور عورت میں مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ مرد صرف ہوس پرستی کا دلدادہ ہوتا ہے۔ لیکن برخلاف اس کے عورت اپنے محبوب کو اپنا سرتاج، اپنا معبود تصور کرتی ہے۔

عورت کی زندگی کا سب سے بڑا عنصر محبت ہے اور قدرت نے اس بارِ گراں کے تحمل کے لئے عورت کو منتخب کیا ہے۔ قانون، تہذیب، تمدن اس معمہ کو حل نہیں کر سکا۔ عورت کے لئے ازل سے سلاسلِ محبت میں اسیر ہونا لکھا ہے۔ قُدرت نے اُسے ایک دل دیا ہے اور دل میں ایک تحریک جو اُس کو خود غرضی سے بچاتی ہے۔ وہ اپنے مونسِ حیات کے لئے ہمدردی اور ایثار کے خزانے دل میں پنہاں لئے ہوئے ہے۔ اور کوئی شے بجز محبت کی ڈھال بنکر اس کو بچا نہیں سکتی۔ وہ خود غرضی سے متنفر ہے۔

وہ مغرور و سرکش عورت جو اس بات کی مُدعی ہے کہ اس نے ہمدردی اور ایثار کو اپنے دل سے نکال دیا ہے، یا طوقِ محبت کو اپنی گردن سے اُتار دیا ہے۔ وہ ایک نہ ایک دن ضرور اپنے آپ کو بے دست و پا پائیگی۔ کسی مرد کی آغوشِ محبت کی جستجو میں سرگرداں ہو گی۔ قدرت نے مردوں کا دل دُخترانِ حوا کے لئے اور صنفِ نازک کے افراد کا دل فرزندانِ آدم کے لئے بنایا ہے۔ اس قانون کو کوئی توڑ نہیں سکتا۔ اگر توڑے تو دل بھی ساتھ ہی چکنا چور ہو جاتا ہے۔

ازمنۂ ماضیہ میں جب جہالت و بربریت کا دور دورہ تھا تو عورت کی ہستی ایک لونڈی بلکہ اس سے بھی بدتر تھی۔ موجودہ دورِ تمدن نے اس کی حالت میں تغیر پیدا کیا۔ بعض ممالک میں خصوصاً انگلستان اور امریکہ میں عورت کی قدر و قیمت بے انتہا ہے۔ وہ اب حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی۔ اس کے حقوق اور آزادی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی عورت محبت کی جنگ میں ہمیشہ شکست خوردہ ہی رہیگی۔ وہ اپنے مونسِ حیات کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ قدرت نے زندگی کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ نصف حصہ مرد کو دیا ہے اور نصف عورت کو۔ جب تک یہ دونوں حصے آپس میں نہ ملیں زندگی مکمل نہیں ہو سکتی۔

قدرت نے عورت کے دل میں مرد کی طرح بیوفائی کا مادہ پیدا نہیں کیا وہ بیوفائی کو ایک کمینہ فعل تصور کرتی ہے۔

اگرچہ قرونِ اولیٰ میں عورت پر بے جا اور ناقابل برداشت جور و ستم روا رکھے جاتے تھے لیکن اگر آج پھر اس کو اُسی تحت الثریٰ میں دھکیل دیں تو دُنیا کا تمام حُسن کُچلا جائیگا۔

محبت ہمارے حُسنِ انجام کا ذریعہ اور روح کی بالیدگی کا منبع ہے۔ لیکن اس کو ذلیل جذبات سے ملوّث نہ کرو۔

محبت کائنات کے ذرہ ذرہ میں پنہاں ہے۔ سکوتِ شب میں۔ نورِ سحر، بادِ صبا، پانی کی روانی میں، آبادی و ویرانی میں، دشت و کوہسار میں، طلوع و غروبِ آفتاب میں، رنگ و بو میں۔ غرضیکہ ہر کہ و مہ میں محبت ہی محبت ہے۔

محبت خوف و ہراس کو دور کرتی ہے۔ بُزدل سے بُزدل انسان کو شیر صفت بنا دیتی ہے۔ محبت کا ایک ذرّہ گناہگار کو تائب بنانے کے لئے کافی ہے حسرت و مایوسی کو دور کر کے اُمید و کامرانی کے دُرِ بے بہا سے مالامال کرتی ہے۔

علاؤ الدین

مرزا کا خواب

خود اپنی زبانی

ترجمہ

آج چاند کی پانچویں ہے۔ میں اپنے آبا و اجداد کے قدیم طرز و طریق کے موافق نہا کر صاف ستھرے کپڑے زیب تن کر کے نماز فجر سے فارغ ہوا۔ اور بغداد کی اُس چھوٹی پہاڑی کی طرف جو شہر سے قریب ایک سنسان مقام پر واقع ہے جانے لگا۔ اور یہ ارادہ کیا کہ باقی دن اُس پہاڑی پر نماز و یاد خدا میں گزاروں۔ تھوڑی دیر میں تیز تیز چلنے کے بعد وہاں پہنچ گیا اور ذرا سی محنت نے مجھے اس پہاڑی کے ایک پتھر کے سایہ میں بٹھا دیا۔

طلوع سحر کی معرفت خیز تنویر۔ سطح زمین کا عارفانہ سکون اور سرسبز درختوں کی وجدانی کیفیت سے فضائے عالم ایک نورانی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی چڑیاں گانے لگی تھیں۔ تارے جھلملا رہے تھے۔ اور دنیا خواب سحری کے مزے لے رہی تھی۔ اُس وقت میرے دماغ میں انسان کی زندگی اور انجام ہستی کے ہوش رُبا تفکرات آنے لگے۔ میں نے یہ خیال کیا کہ جس طرح بہار کو خزاں، نور کو ظلمت سے واسطہ ہے اسی طرح خوشی کو جانگسل غم سے واسطہ ہے جس طرح شبنم کی حسین بوندوں کو آفتاب کی بے رحم شعاعیں جذب کر لیتی ہیں اسی طرح عنقا صفت خوشی تاراج غم ہو جاتی ہے۔ اگر ہماری زندگی ایک لمحہ عیش و مسرت میں بسر ہوتی ہے تو گھنٹوں سوز و گداز۔ درد و کرب۔ پریشانی اور مشکلات میں گذرتی ہے۔ دنیا عالم آفات ہیں۔ کائنات عالم کا ذرہ ذرہ داستان غم کا ایک طولانی دفتر ہے۔ زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب۔ موت کیا ہے۔ انھیں اجزا کا پریشان ہونا۔ یہ زندگی کیا ہے۔ ایک خواب پریشان ہے ایک سایۂ موہوم ہے۔ ایک موج سراب ہے۔ ایک چشمک برق ہے ایک تبسم شرار ہے۔ غم اور مسرت محض اعتباری چیزیں ہیں۔ اور ان تمام کیفیات و حالات کے علاوہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ اور اس کے بعد کیسی زندگی ہمیں ملے گی۔ آخر کار میں انسانی زندگی اور انجام ہستی پر غائر نظر ڈالنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ "انسان ایک سایہ کی طرح ہے اور زندگی ایک خواب ہے"

جب میں ان خیالات میں مستغرق تھا تو میرا دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا۔ اور قریب تھا کہ میں بیہوش ہو جاؤں، لیکن ایک بانسری کی آواز نے میری اس ناپائدار زندگی کے خیالات کی زنجیر کو توڑ دیا اور اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ میرے پاس اتنے الفاظ نہیں جو میں اُس سریلی آواز کی تعریف کر سکوں مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اس میں عجیب مقناطیسی قوت تھی جو میرے آہنی دل کو اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہو گئی اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں اس وقت جنت میں پہنچ گیا ہوں اور حوریں بانسری سے میرا استقبال کر رہی ہیں۔

اس آواز کے سنتے ہی میرے مضطرب دل نے بانسری بجانیوالے کو ڈھونڈنا شروع کیا اور میری متجسس اور بیباک آنکھوں نے یہ دیکھا کہ ایک شخص مقابل پہاڑی پر بانسری بجانے میں مشغول ہے۔ اب یہ آرزو دل میں پیدا ہوئی کہ اس کے قریب جاؤں۔ چند منٹ کے بعد اُس شخص کے ہاتھ کی حرکت نے میرے اس خیالی پیرایہ کو عملی جامہ پہنا دیا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے قریب گیا۔ اور دل پر ہاتھ رکھکر ادب سے جھک گیا۔ اُس شخص کی نازک انگلیوں نے کچھ اشارہ کیا اور میں بلا قصد اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں آئینہ تھا وہ تصویر۔ دونوں ساکت تھے۔

زبانیں بند تھیں۔ لبوں پر قفل تھے۔ میں اپنی ہستی کا ایک موہوم عکس تھا وہ جوہر حیات۔ ہم دونوں گوہر و آب گوہر کی طرح ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ میری آنکھیں چپکے چپکے اُس کے سراپا کی سیر کر رہی تھیں۔

آخر کار تھوڑی دیر بعد وہ مسکرایا اور میرے دل میں امید و مسرت کی لہر دوڑ گئی اور وہ خوف و ہراس جو میرے دل پر قبضہ کئے ہوئے تھا

جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس شخص نے مجھ سے بغلگیر ہو کر کہا۔

شخص:۔ "مرزا میں نے تمہیں اس پہاڑی پر اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور تمہارے چہرہ پر غم کے آثار پاتا ہوں۔ اچھا تم میرے پیچھے آؤ۔"

پھر وہ مجھے اس پہاڑی کی چوٹی پر لے گیا۔ اور ہم دونوں میں حسب ذیل مکالمہ شروع ہوا۔

شخص:۔ "مرزا تم مشرقی جانب غور سے دیکھو اور جو کچھ دیکھو گے مجھ سے بیان کرو۔"

میں نے اُس کے حکم کے موافق اپنی آنکھیں شرقی جانب پھیر لیں۔ اور دیکھا کہ ایک گہرا درّہ میرے سامنے ہے۔ اس درہ میں زور و شور سے ایک خوفناک نہر بہہ رہی ہے۔ لیکن وہ نہر اپنے ابتدا و انتہا پر ایک گہرے اور سیاہ ابر میں چھپی ہوئی تھی اور یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ نہر کہاں سے نکلی ہے اور کہاں جا کر ختم ہو گی۔ علاوہ ازیں میں یہ دیکھکر متعجب ہوا کہ اس نہر پر درمیانی حصے میں ایک پل بھی بنا ہوا ہے اور بہت سے لوگ اُس پل پر سے گذر رہے ہیں۔

جب میں یہ خلاف امید منظر اپنے روبرو دیکھا تو عالم سکوت میں بت بنکر رہ گیا لیکن جرأت سے کام لیکر اُس شخص سے اس کے متعلق استفسار کیا۔

شخص:۔ "مرزا وہ درہ جو تم اپنے سامنے دیکھ رہے ہو آفات و مشکلات عالم کا درہ ہے۔ اور وہ نہر جو بہنے میں مصروف ہے ازل کے بڑے سمندر کی ایک شاخ ہے۔ اور ہمیں یہ نہیں معلوم کہ ازل کہاں سے اور کب شروع ہوا اور اَبد کب آئے گا۔ اسلئے وہ نہر اپنے ابتدا اور انتہا میں چھپی ہوئی ہے اور وہ پل جو تمہیں نظر آ رہا ہے انسانی زندگی ہے۔"

میں نے بہ طریق سابق پھر دیکھنا شروع کیا اور یہ معلوم کیا کہ اُس پل کے سو کمانیں تھیں اور آخیر کی تیس کمانیں ٹوٹی ہوئی اور ابتر حالت میں تھیں لیکن ابتدائی ستر کمانیں اچھی حالت میں مستحکم نظر آ رہی تھیں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد میں نے یہ دیکھا کہ بہت سے لوگ جو اُس پل پر سے گذر رہے تھے دفعتاً خلاف امید اُس نہر میں جو زیر پل بہہ رہی تھی گر رہے ہیں میں نے اور غور سے دیکھنے کے بعد یہ معلوم کیا کہ بہت سے دروازے اُس پل پر ہیں جو چوہوں کے پنجروں کے دروازوں کی طرح کسی کا پاؤں پڑنے سے کھل جاتے اور پھر بند ہو جاتے ہیں۔ اور وہ شخص جو اُن دروازوں پر بلا علم پاؤں رکھنے کی وجہ سے گر جاتا ہے فوراً پانی کی خوفناک موجوں میں غائب ہو جاتا ہے وہ دروازے ابتدائے پل میں زیادہ مقدار میں اور انتہائے پل کی طرف کم تھے اس لیئے لوگ پل کے ابتدائی حصہ میں زیادہ نذر نہر ہو رہے تھے اور جو خوش قسمتی سے بچکر آگے نکل جاتے تو بہت جلد غرقاب نہر نہ ہوتے لیکن میں یہ دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوا کہ لوگ اچھی طرح نہیں چل سکتے تھے۔ اور اُن بوسیدہ آخری تیس کمانوں پر نہایت تکلیف اور مصیبت سے اپنا سفر ختم کرتے ہوئے چند کمان طے کرنے کے بعد نہر میں گر جاتے اور غائب ہو جاتے۔

میں نے اس منظر کو دیکھنے کے لئے اپنا تھوڑا سا وقت صرف کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ انسان کی اوسط زندگی سو برس سے زائد نہیں ہے اور بھی مشکلات دنیا سے لبریز ہے اور ہر وقت موت کا ڈر لگا ہوا ہے خصوصاً انسان کے آخری تیس برس نہایت تکلیف سے بسر ہوتے ہیں۔ انسان ابتدائی عمر میں زیادہ موت کا شکار ہوتا جاتا ہے۔ الحاصل میں انسان کی زندگی اور انجام ہستی کے سین کو دیکھکر بہت غمگین ہوا اور چاہا کہ اپنی جان بھی اُن لوگوں کے ساتھ دیدوں لیکن اُس شخص نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور کہا۔

شخص:۔ "مرزا تم متفکر نہ ہو اور بیان کرو کہ اور کیا دیکھ رہے ہو۔"

میں نے پھر دیکھنا شروع کیا اور حیران ہوا کہ چند لوگ بلبلوں اور چمکدار چیزوں کے پکڑنے میں مشغول ہیں جو اُن کے سامنے چمکتے اور انہیں اپنا گرویدہ بنا رہے ہیں لیکن افسوس کہ وہ لوگ اُنکے پکڑنے میں ناکام رہتے۔ اور دفعتاً نہر میں گر کر غائب ہو جاتے تھے علاوہ ازیں میں نے دیکھا کہ قسم قسم کے پرندے اُس پل پر اُڑ رہے ہیں اور وہ پل کے درمیانی حصہ میں زیادہ ہیں۔ میں اس منظر کا مطلب نہیں سمجھ سکا اور اپنے صبر کو شکستہ قوت کو مضمحل اور علم کو قاصر پاکر اس شخص سے دریافت کیا۔

شخص:۔ "مرزا یہ بلبلے اور چمکدار چیزیں دنیا کی دولت۔ عزت۔ نیکنامی اور اعلیٰ خیالات ہیں جس کو ہر شخص حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ چیزیں کسی سے وفا نہیں کرتیں اور ہر شخص انکو حاصل کرنے سے پہلے موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ پرندے محبت۔ حسد۔ ناامیدی اور بے وفائی بھی جو انسان کی زندگی تلخ بنانے میں کافی مہارت رکھتے ہیں اور یہ خیالات عموماً عالم شباب میں زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔"

میں نے یہ حالات دیکھکر اور اُن کے نتائج دیدۂ تحقیق سے مشاہدہ کر کے ایک آہ سرد کھینچی اور خیال کیا انسان کی زندگی کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ غم و آفت کے ملک میں پیدا ہوا اور موت کے دریا

میں ڈوب مرے۔"

اس شخص نے مجھے متفکر اور غمگین دیکھکر کہا۔

شخص:۔ "مرزا تم اس جانب اب نہ دیکھو اور اپنا رخ بدل کر یہ دیکھو کہ وہ نہر اُن مردہ لوگوں کو کہاں لیجا رہی ہے۔" میں نے فوراً اپنا رخ بدل دیا اور دیکھا کہ وہ نہر اُن مردہ لوگوں کو ایک خوشنما ملک میں لیجا رہی ہے اور اسی نہر کی ایک شاخ چند لوگوں کو دوسرے ملک میں لیجا رہی ہے جو گھرے اور سیاہ ابر میں چھپا ہوا ہے۔ میں دوسری جگہ کی حالت بیان کرنے میں مجبور ہوں کیونکہ میں خود بادل کی سیاہی کی وجہ نہیں دیکھ سکا لیکن وہ ملک جو مجھے نظر آ رہا تھا نہایت خوبصورت اور ہر طرح سے آراستہ تھا۔ غالباً ایسی آرام دہ اور خوشنما جگہ کسی انسانی تخیل میں بھی نہیں آئی ہوگی۔

میری آنکھیں اس جلوۂ بے حجاب کی طرف اٹھ کر پھر واپس نہ لوٹ سکیں اور نگاہیں حیرت اور استعجاب کے عالم میں یکبارگی اُس عالم فریب نظارہ میں جم گئیں۔ اس مقام میں خوبصورت اور بڑی بڑی شاندار عمارتیں بنی ہوئی تھیں جنپر ہیرے اور دوسرے قیمتی پتھر جڑے گئے تھے۔ اور دودھ اور شہد کی نہریں چو طرف بہہ رہی تھیں وہ لوگ جو اس ملک میں داخل ہوئے تھے نہایت امن و چین کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور کسی کو کسی کی فکر نہ تھی۔ الغرض میں ان خوش انسانوں کی ہر نقل و حرکت کو بتیابانہ دیکھنے لگا اور میری نگاہوں میں اُس وقت قدرت کی اُس دل لبھانے والی مخلوق کو حیرت اور ترور کے احساسات کے ساتھ دیکھنے کے سوا اور کوئی جذبہ مطلق نہ تھا میں اُس پرندے کی طرح مسحور ہو رہا تھا جو سانپ کی جلد کی رنگ آفرینیوں پر مست ہو کر خود بخود اُس کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ اور اُس کے دہنِ گرسنہ کا تر نوالہ بن جاتا ہے۔ الحاصل میں نے اس شخص سے کیفیت دلی کا اظہار کیا۔

شخص۔ "مرزا اگر تم اُس جگہ جانا چاہتے ہو تو اس کا راستہ وہی پل کے دروازے ہیں جو تم پہلے دیکھ چکے ہو۔ خیر اس کی فکر چھوڑ دو۔ مرزا یہ مقام جو تمہارے سامنے اسقدر سرسبز اور شاداب اور فرحت افزا نظر آ رہا ہے اُن لوگوں کا مسکن ہے جنہوں نے دنیا میں اپنی زندگی نیک بنائی اور پاکیزہ و مبارک زندگی اللہ کے سامنے پیش کی ہے دنیا والے اس کو جنت کے نام سے یاد کیا کرتے ہیں۔ مرزا اگرچہ ہماری زندگی تکلیف دہ اور ناقابل برداشت معلوم ہوتی ہے اور ہم طرح طرح کی مشکلات اپنی زندگی میں دیکھتے ہیں لیکن اس کا بہتر بدلہ اور اچھا نتیجہ نکلتا ہے۔ اگر انسان اپنی زندگیٔ فانی کو رنگین اور نیک عمل سے منور بنا دے تو اس کا حاصل بھی نیک اور دلپسند ہوگا۔ زندگی کی بتی اگر مفاد منفعت چاشنی اور لذت کے دلآویز جام سے عریاں ہوتی تو آج عالم کے اٹھتے ہوئے شباب میں ارتقاء تمدن کے دور میں اصحاب فکر کے دلوں میں گدگدی نہ پیدا کرتی۔ مرزا تم آئندہ یہ خیال نہ کرو کہ "انسان ایک سایہ کی طرح ہے اور زندگی ایک خواب ہے۔"

میں اس کی دلچسپ اور سبق آموز نصیحت سنکر بہت خوش ہوا۔ آخر ایک لمحہ کے بعد اس شخص سے دریافت کیا کہ کیا آپ مجھے یہ بتلائیں گے کہ اس دلفریب مقام کے نصف حصہ کا سین جو سیاہ ابر میں چھپا ہوا ہے کیا ہے اور وہاں لوگ کیسی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لیکن عین اس لمحہ میں جبکہ یہ مشاہدات عینی جوش مسرت سے میرے خون میں سیمابی کیفیت پیدا کر رہے تھے دفعتاً گردش تقدیر کا ایک سرد جھونکا آیا۔ کیونکہ جواب نہ ملنے پر جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو اُس شخص کو [illegible] غائب پایا بہاں پہلے انسان کی زندگی اور انجام ہستی کے متعلق غور کر رہا تھا۔

میرا دل غیر معمولی طور پر بھرا ہوا تھا۔ اور آنسو تھے کہ بے قابو ہو کر آنکھوں میں بھرے چلے آتے تھے۔ سکوت اور خاموشی کا یہ عالم تھا کہ مجھے اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں اپنے کانوں سے دل کی حرکت معلوم کرنے والا ڈاکٹری آلہ لگائے خود اپنے دل کی جنبش پیہم کو جو معمول سے زیادہ تیز تھی سن رہا ہوں مگر دفعتاً میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ آخر اس کھیل کا انجام کیا ہوگا۔ لیکن میں خود ہی اس کا جواب دے دیکر خاموش ہو گیا کہ یہ ایک خواب تھا جو مجھے اپنی زندگی بیکار نہ سمجھنے اور اس کو نیک عمل سے مزین کرنے کیلئے سبق دے گیا۔

(ترجمہ) از ایڈیسن — احمد عبدالعزیز

کوئی شہر

بہارِ ناز کی محفل وہیں ہے فروغِ حسن کی منزل وہیں ہے
اگرچہ میں یہاں ہوں دل وہیں ہے

وہ دنیا ہے محبت خیز دنیا وفا کے نور سے لبریز دنیا
ہوس افسانۂ باطل وہیں ہے

وہاں ایسے بھی ہیں کچھ ماہ پارے کہ شرما جائیں جن سے چاند تارے
زمیں میں آسماں شامل وہیں ہے

وہاں پھولوں میں لرزاں ہے تمنّا وہاں ذرّوں میں رقصاں ہے تمنّا
سکونِ جان و دل مشکل وہیں ہے

وہاں ہے اک نگارِ حور پیکر نگارِ حور پیکر نور پیکر
نیاز عشق کا حاصل وہیں ہے

جنونِ عشق کو رسوا کرونگا جیا تو میں وہاں جا کر مرونگا
کہ میری ناؤ کا ساحل وہیں ہے

(غیر مطبوعہ)

عابد

حسنِ قرطبہ

VICTORIA PRESS

قرطبہ

بہارِ خلد سے رنگیں تھا گلستاں تیرا — غلام احمدِ مرسل تھا باغباں تیرا
جلالِ ملّتِ بیضا تھی بارگاہ تری! — سجود گاہِ ملائک تھا آستاں تیرا!
فرشتے وادیٔ انوار تجھکو کہتے تھے! — ہر ایک ذرّہ تھا خورشید آسماں تیرا
وہ صبحِ گلکدۂ وادیٔ الکبیر کہاں؟ — کہ جس کے عکس میں منظر تھا زرفشاں تیرا

شرابِ نور تری خاک سے اُبلتی تھی
بہارِ خلد تری گود میں مچلتی تھی

(۲)

وہ گلستانِ رصافہ حدیقۂ اُمَوی — کہ جس کو خلد میں کہتے تھے جنّتِ ارضی
وہ جس کا جلوۂ محبوب زینتِ فردوس — وہ جس کا منظرِ معصوم خلدِ رنگینی
وہ آبشار وہ فوّارۂ گہر افشاں — وہ اُن کے عکس میں شمس و قمر کی جلوہ گری
وہ بلبلانِ خوش الحان وہ نغمہ ریز طیور — زباں پہ جن کی درودِ محمدِ عربی

نسیمِ قدس کے جھونکے جدھر کو بڑھتے تھے
چٹک کے غنچے دعائے خلیل پڑھتے تھے!

(۳)

وہ جلوہ گاہِ خلافت مدینۃ الزہرا — کہ جس میں شمعِ محبت تھی انجمن آرا!
وہ در کہ جس کی بھکاری تھی عظمتِ مغرب — وہ قصر مطلعِ انوارِ مشرقِ عظمےٰ!
حریفِ عرش ہے اس بارگاہ کی عظمت — غلامِ احمدِ مختار ہو مکیں جس کا!
فرشتے اُس کی زیارت کو مائلِ تنزیل — بہشت اس کے مناظر کے سامنے دھندلا!

جلالِ ناصرِ اعظم کا جلوہ رنگیں
ربابِ الفتِ زہرا کا نغمۂ رنگیں

(۴)

وہ بارگاہِ خداوند جامع اعظم
جبینِ عظمتِ کونین جس کے در پر خم

وہ جس کے ذرّوں میں نقشِ سجود لا دخل
خضوع قراءتِ منصور جس میں ہے مدغم

وہ درسگاہِ مقدس وہ چشمۂ عرفان
اُٹھایا جس نے نقابِ رموز کیف و کم

الہیات کی تبلیغ جس نے دہر میں کی
علومِ قُدس سے معمور کر دیا عالم

وہ جس کی خاک وقارِ جبینِ ابن رشد
وہ جس کا بوریۂ خشک تاج ابن حزم

فرانس اٹلی و جرمن تھے خوشہ چیں جسکے
سلوسٹر بھی ہوا جس کا گوشہ گیر کرم

رہی نہ ظلمتِ تثلیث شرک گاہوں میں
جلائی شمعِ حرم اس نے خانقاہوں میں

(۵)

اگرچہ آج وہ اقبال و احتشام نہیں
وہ نورِ صبح نہیں وہ سوادِ شام نہیں

تھی جس کے در پہ فتادہ سیاستِ مغرب
اگرچہ آج وہ اسلام کا نظام نہیں!

دیارِ قدس ہے اُن وحشیوں کے زیرِ قدم
کہ جن کے دل میں خدا کا بھی احترام نہیں

نہ کیوں ہو مادرِ تثلیث خندہ زن تجھ پر
کہ لا الہ کی شمشیر بے نیام نہیں!

مگر ملال نہ کر اے مدینۃ الاسلام
کہ ظلم کو کبھی حاصل ہوا قیام نہیں

بلند نعرۂ تکبیر ہونے والا ہے
بعید ابِ کرمِ خالق انام نہیں

درِ خدا اسے ہیں بامراد ہونا ہے
بالآخر شش تجھے اُمّ البلاد ہونا ہے

(غیر مطبوعہ)

روشؔ صدیقی

رباعی

ایسا نہ ہو عشق دل کو رنجور کرے
برباد مجھے شعلۂ مستور کرے!

دے جام شرابِ آتشیں اے ساقی
ممکن ہے کہ زہر زہر کو دور کرے!

انتقاد

دنیا کے بہترین افسانے

مؤلفہ و مترجم۔ منصور احمد ایڈیٹر ہمایوں

مقام اشاعت۔ اسلامک لٹریچر کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۳۱ لاہور۔
طباعت وکتابت دیدہ زیب اور دلفریب۔
ضخامت ۲۰۳ صفحہ قیمت بلا جلد ۲/۸ روپیہ۔ مجلد دو روپے بارہ آنے

معزز معاصر اردو نے ادب اردو کے دور حاضرہ کو بالکل بجا طور پر دورِ تراجم کا لقب دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو اہل ذوق دوسری زبانوں کے شاہکاروں کو اردو میں منتقل کر رہے ہیں ان کی سعی رائیگاں نہ جائیگی۔

تراجم صحیح ذوق ادبی کے لئے مناسب فضا پیدا کرتے ہیں اور دوسری زبانوں کے مستند مصنفین کے انداز تحریر و رنگ تخیل کے امتزاج سے زبان میں جو وسعت اور لطافت پیدا ہوتی ہے وہ اس کے علاوہ ہے

مسٹر منصور احمد عرصے سے دوسری زبان کے افسانوں کو اردو کا جامہ پہنا رہے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ انکی کوششیں بہت بڑی حد تک مشکور ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے بہترین افسانوں کا انتخاب کوئی آسان کام نہیں۔ ادب میں انفرادی ذوق کو ایک اہم درجہ حاصل ہے۔ اور عام طور پر انتخاب "بہترین" ہونے کے بجائے مصنف کے احساسات و خیالات کا آئینہ دار ہوتا ہے اور بس۔

تاہم فاضل مولف نے کوشش کی ہے کہ افسانوں کا معیاری مرتبہ قائم رہے، اور صرف انہیں افسانوں کا انتخاب کیا ہے جنہیں کوئی امتیازی خصوصیت پائی جاتی ہے۔

ترجمہ شستہ اور صاف ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ترجمے میں وہی شان تخیل اور طرز بیان باقی رہے جو اصل افسانے میں موجود ہے۔ یوں تو انکی یہ کامیاب کوشش ہر افسانے کے الفاظ سے جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے مگر بعض افسانوں میں تو ان کی کامیابی اسقدر روشن اور نمایاں ہے کہ اسکی تعریف نہیں ہوسکتی۔

"ذرات مضطرب" میں طوفان کا جوش دیکھئے۔

تاریک جنگل اور ندی کا تاریک پانی ہولناک امید و بیم میں ساکن پڑا تھا۔ یکایک زمین، پانی اور آسمان کانپ گیا۔ اور ایک تیز و تند طوفانی جھونکا دور بے راہ جنگلوں میں سے شور مچاتا ہوا اور اپنے برق پاش دانت نکالتا ہو پہنچا۔ محل کے خالی دروازے درد و کرب میں کراہنے لگے"۔
نظامی گنجوی کی ہیبتناک اور شاندار تشبیہات یاد آجاتی ہیں"۔

تمام کتاب میں ۳۲ افسانے ہیں جنہیں ایران اور عرب کے افسانے شامل نہ ہوتے تو بہتر تھا۔

یوں تو تمام افسانے اچھے ہیں۔ مگر "جھوٹ" "ذرات مضطرب" "بھول" "ایک خط اور ایک پارہ" "چھلاوہ" "خزاں کی ایک رات" "دولت یا محبت" مجھے بہت پسند آئے۔

جھوٹ ایک چنگاری تھی جس نے میرے جذبات و احساسات میں ایک آگ سی لگادی۔

دو نامراد روحوں نے عشق کے رشک اور حسن کی سرد مہری پر ایک قصر محبت تعمیر کرنا چاہا تھا مگر جھوٹ کے ناگ نے تمام فضا کو زہریلا کر دیا۔

عشق نے حقیقت کی تلاش میں حسن کے فریب کو بھی ہاتھ سے کھویا اور حسن اظہار محبت کے باوجود عشق کو رام کرنے میں ناکام رہا۔

اس افسانے پر دحشت و ہیبت کا ایک جانگزا اثر چھایا ہوا ہے مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کا ہر لفظ ایک زہریلا بچھو ہے۔ جو پڑھنے والے کے دل و دماغ میں ڈنک مار رہا ہے۔

مخزن کے دور جدید میں (حضرت بیدل کی ادارت میں) پطرس کے قلم سے ایک افسانہ "عشق کی خودکشی"، کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کا پلاٹ اور انداز تحریر "جھوٹ" سے ملتا جلتا تھا۔ مگر ایشیائی ماحول نے اس افسانے کو بہت دلفریب بنا دیا تھا۔ جن حضرات کو میری طرح اس قسم کے افسانے پڑھنے کا شوق ہے وہ "عشق کی خودکشی" ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

"ذرات مضطرب"، ایک خواب تخیل ہے جو ٹیگور نے شباب کی

بہار آفرین رات میں دیکھا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس افسانے میں مصنف خود اپنے تخیل کی فریب کاری پر ہنس رہا ہے یا پڑھنے والوں پر!

"خزاں کی ایک رات" اور "پھول" بیحد دلکش افسانے ہیں "پھول" تو اس قسم کی چیز ہے کہ انسان کئی بار پڑھنے کے بعد بھی سیر نہ ہو۔ طرز بیان میں حسن و جمال کے پہلو دیکھئے۔ محبوبہ نے کچھ گلابی اور کاسنی پھول بھیجے ہیں۔ ان کے متعلق مصنف لکھتا ہے۔

مجھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میری ذرا سی بے احتیاطی بھی انہیں زخمی کردے گی۔ جیسے ابھی انکی روحیں ہلکی ہلکی سسکیاں بھرنے لگینگی۔ بے حاصل آرزو کا ایک بادل سا درد بیکران پر سے اٹھتا ہے اور مجھ پر چھا جاتا ہے۔"

الفاظ اور تخیل کے درمیان کسقدر نغمہ آفرین رابطہ ہے۔ الفاظ صرف دردناک طور پر سریلے ہی نہیں۔ بلکہ ان میں باہم ایک خاص تناسب اور تطابق ہے۔

میں پہلے اشارہ کرچکا ہوں کہ عرب اور ایران کے افسانے "خالد اور حمیدہ" "موتیوں کا سوداگر" ہرگز اس قابل نہ تھے کہ اس مجموعے میں جگہ پاتے۔ ان کے علاوہ "اویڈا" اور "ولیم لے کیو" کے افسانوں کو "دنیا کے بہترین افسانوں" میں شامل کرنا میری نظر میں ایک گناہ عظیم سے کم نہیں ہے۔ لے گیوان افسانوں کے لکھنے میں ید طولیٰ رکھتا ہے جن کو عرف میں "سنسنی خیز" کہا جاتا ہے اور وہ بھی بہت ادنیٰ درجے کے افسانے "لالۂ صحرا" میں بھی وہ میلوڈراما کا سا پہلو شامل ہے۔ جو اس کے ہر ایک ناول میں پایا جاتا ہے میلوڈراما کے عناصر افسانے کے اجزائے ترکیبی سے متضاد نہیں ہیں۔ لیکن لے گیوان سے وہ کام نہیں لے سکتا جو کانن ڈائل لے سکتا ہے۔

بہر نوع اس کتاب میں اتنی دلچسپیاں موجود ہیں کہ تمام اردو داں حضرات کو اس کا ایک نسخہ خریدنا چاہیئے۔

اگر دو روپے صرف کرکے کچھ عرصے کے لئے آدمی ہجوم افکار سے نجات پا سکے تو سمجھنا چاہیئے کہ اس نے اپنا روپیہ بیجا صرف نہیں کیا۔ اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب کے بعض حصے ناظرین کو کچھ عرصے کے لئے دنیا کے تمام تفکرات سے رہائی دلا دیں گے۔

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے
"حافظ"

عابد

دنیائے ادب

آرٹ اور ڈراما

آرٹ کی تعریف

قبل اس کے کہ ہم ڈراما کی ماہیت سے بحث کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آرٹ کی مختصر سی تعریف کر دی جائے۔ آرٹ کا لفظ اب اردو زبان میں کثرت سے استعمال ہونے لگا ہے لیکن اس کا کوئی واضح مفہوم ہم لوگوں کے ذہن میں نہیں ہے۔ اصل میں یہ دو مختلف معانی پر حاوی ہے۔

(۱) وہ تخلیقی قوت جس کے ذریعے سے انسان مادی اشیاء اور ذہنی تصورات کی تشکیل اس طرح کرتا ہے کہ وہ حسین بن جاتی ہیں۔ یعنی ان میں ایک خاص ترتیب، تناسب یا توازن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ مشاہدہ جمال کے ذوق کو جو ہماری طبیعت کا فطری خاصہ ہے تسکین دیتی ہیں۔ مثلاً مصوری یعنی وہ قوت جس کے ذریعے سے سطح کاغذ پر دلکش اور خوشنما نقوش بنائے جاتے ہیں۔

(۲) حسین چیزیں جو اس وقت قوت تخلیق کے محسوس مظاہر ہیں تصویر، نغمہ، شعر وغیرہ

دوسرے الفاظ میں آرٹ صناع کے کمال کو بھی کہتے ہیں اور ان مصنوعات کو بھی جن میں یہ کمال ظاہر ہوتا ہو۔

غرض آرٹ ایک طرح کی صنعت ہے۔ لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا اصل مقصد افادی یا اقتصادی نہیں ہوتا۔ بلکہ جمالیاتی ہوتا ہے یعنی وہی ذوق جمال کو تسکین دینا۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ موضوع صنعت خود حسین ہو بلکہ حسن طرز ادا کی خوبی اور دلکشی سے پیدا ہوتا ہے۔ البتہ یہ شرط ہے کہ موضوع میں تناسب اور ہم آہنگی کے ساتھ تشکیل پانے کی صلاحیت موجود ہو۔ اب چاہے صناع اس کی عکسی تصویر پیش کر دے یا اس میں اپنے تخیل سے رنگ آمیزی کرے۔

آرٹ زندگی کی دوسری قدروں یعنی مذہب اخلاق یا علم و حکمت وغیرہ کے مقابلے میں اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے لیکن ان سے بے تعلق نہیں ہوتا۔ مثال کے لئے شعر کو لیجئے۔ اُس کے ناقص یا کامل ہونے کا معیار مذہب اخلاق اور علم سے بالکل الگ ہوتا ہے شعر میں ہم جو چیز ڈھونڈتے ہیں اور جس سے شاعری کی جان سمجھتے ہیں وہ روحانی معرفت یا اخلاقی بصیرت یا علمی حقیقت نہیں بلکہ خیالات اور الفاظ کی خوشنما ترتیب، ہم آہنگی، روانی اور دلکشی ہے۔ جس کے ذریعے سے شاعر کا تخلیق حسن کا شوق اور شعر فہم کا مشاہدۂ جمال کا ذوق پورا ہوتا ہے یہ سچ ہے کہ شعر کا موضوع انسانی زندگی اور عالم فطرت کا ہر جلوہ ہے اس لئے اس میں کبھی کبھی مذہبی عقیدت کا اظہار یا نیکی کی تلقین یا علمی حقائق کی تعلیم بھی ہوتی ہے لیکن مخصوص شاعرانہ رنگ میں جس میں خیالات کا وزن اتنا نہیں ہونے پاتا کہ طرز ادا کی سبک روی میں خلل پڑے۔

آرٹ سب سے زیادہ موثر اس وقت ہوتا ہے جب اس کا موضوع انسان کی زندگی اُس کے جذبات، اُس کے خیالات، اُس کی آرزوئیں اور اس کے کام ہوتے ہیں۔ بعض فنون لطیفہ مثلاً موسیقی، نقاشی، سنگتراشی وغیرہ میں ہمیں انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو کی جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن ادب کے بعض شعبوں مثلاً شعر ناول، ڈراما وغیرہ میں کبھی کبھی زندگی کا مجموعی مرقع نظر آتا ہے۔ جو ہمارے لئے نہایت دلچسپ ہے اور جس کا اثر ہمارے دل پر بہت گہرا اور بہت دیرپا ہوتا ہے۔ یہ مرقع بظاہر ایک شخص یا چند اشخاص کی زندگی کا ہوتا ہے۔ لیکن اس میں کچھ ایسی قوت محرکہ نہاں ہوتی ہے کہ انسان کا تصور ساری نوع انسانی کی زندگی پر پھیل کر اس میں یوں جذب ہو جاتا ہے

جیسے سمندر میں کنکری پھینکنے سے لہروں کا ایک دائرہ بنے اور بڑھتے بڑھتے اس کی بے پایاں وسعت میں محو ہو جائے۔ یہ قطرے میں دریا اور جزو میں کل نظر آنا آرٹ کے اکثر شعبوں میں پایا جاتا ہے لیکن اس کا اظہار پوری طرح ڈراما میں ہوتا ہے۔

ڈراما بہ حیثیت آرٹ کے ایک شعبے کے

ڈراما یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں کر کے دکھانا۔ یہ ادب کی اس صنعت کا نام ہے جس کے ذریعے سے انسانی زندگی کے واقعات محض بیان کئے جانے کے بجائے کر کے دکھائے جاسکیں۔ ڈراما میں شاعر کو جو قصہ بیان کرنا ہوتا ہے اسے چند اشخاص کی گفتگو کے پیرائے میں بیان کرتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ان اشخاص کا بھیس بدل کر ان کی گفتگو اور اُن کے کاموں کو دہرائیں۔ تاکہ دیکھنے والوں کو سارا ماجرا آنکھوں کے سامنے گزرتا نظر آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ بہت دلپذیر اور موثر ہے اور ادب کے کسی اور شعبے کو یہ بات نصیب نہیں ہو سکتی۔

پہلے ڈراما شاعری کا ایک جز سمجھا جاتا تھا اور ہمیشہ نظم میں لکھا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس نے ایک مستقل ادبی صنعت کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اب اس کے لئے نظم کی شرط نہیں ہے بلکہ نظم میں ڈراما لکھنے کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔

ڈراما اور ناول میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں انسانی زندگی کے مختلف جلوے دکھاتے ہیں۔ لیکن ناول کا اثر صرف تخیلی مشاہدے پر پڑتا ہے اور ڈراما کا حسی مشاہدے پر بھی۔ ناول میں مصنف دوسروں کی سرگزشت بیان کرتا ہے مگر ڈراما میں وہ خود اشخاص کو گفتگو کرنے دیتا ہے اور اسی گفتگو میں ان کی جذبات، ان کے خیالات، ان کی سیرت ان کا عمل غرض اُنکی ساری زندگی دکھاتا ہے۔ ناول لکھنے والا آزاد ہے کہ اپنی کہانی کو سو صفحے میں لکھے یا ہزار صفحے میں کیونکہ ناول پڑھنے والے کے لئے وقت کی کوئی پابندی نہیں مگر ڈراما لکھنے والے کو یہ اندازہ کرنا پڑتا ہے کہ قصہ ٹھیک اتنا بڑا ہو کہ تین یا ساڑھے تین گھنٹے میں دکھایا جا سکے۔ اس سے زیادہ یا اس سے کم نہ ہو۔ ناول میں واقعات چاہے جتنے زمانے پر پھیلا دئے جائیں اس کے اثر میں کوئی خلل نہیں پڑتا کیونکہ وقت کے طول کو صرف تخیل کے سامنے پیش کرتا ہے مگر ڈراما میں قصے کا زمانۂ وقوع کم سے کم رکھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہاں وقت کے طول کا مشاہدہ کرانا ہے۔ ناول میں ایک شخص کے پیدا ہونے سے لے کر اس کے مرنے تک کے حالات تفصیل سے بیان کئے جا سکتے ہیں مگر ڈراما میں چند دنوں یا چند ساعتوں کے واقعات میں اس کی زندگی کی مکمل تصویر دکھانا پڑتی ہے۔ غرض بمقابلہ ناول کے ڈراما میں کہیں زیادہ پابندیاں اور دشواریاں ہیں۔ یہاں بہت محدود ذرائع سے کام لیکر بہت گہرا اثر پیدا کرنا ہے اس لئے نہایت واضح مشاہدے، صحیح قوتِ انتخاب اور موثر طرز ادا کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کوئی شخص اکبر اعظم پر ایک ڈراما لکھتا ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اکبر کے سوانح حیات پر اتنا عبور رکھتا ہو اور اس کا تصور اتنا واضح ہو کہ قصہ لکھتے وقت اس بادشاہ کی ساری زندگی متحرک تصویروں کی طرح اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گذر جائے۔ اب اس کی قوت انتخاب کا کام ہے کہ ان میں سے چند تصویریں چھانٹ لے جو اتنی موثر اور اتنی معنی خیز ہوں کہ دیکھنے والا ان کے بیچ کے خلو کو آسانی سے پُر کر سکے اور اسے پورا سلسلہ نظر آجائے۔ ظاہر ہے کہ ان تصویروں کو دکھانے کیلئے اس کے پاس صرف دو ذریعے ہیں گفتگو اور عمل انہیں دونوں چیزوں کے ذریعے سے اُسے اکبر اور اس کے زمانے کے لوگوں کی سیرت، اُن کے جذبات و خیالات، اُن کے اغراض و مقاصد، اُنکے آپس کے تعلقات، اُن کی باہمی کشمکش انکی کامیابی اور ناکامی کا نقشہ کھینچنا ہے۔ اس لئے وہ ایسے الفاظ اور ایسے اعمال اختیار کرے گا جو چشم و گوش کو فوراً متوجہ کرلیں، ادراک میں سما جائیں دل میں بیٹھ جائیں، وہ اس کا بھی خیال رکھے گا کہ گفتگو اور عمل میں صحیح تناسب قائم رہے۔ جہانتک اسٹیج کے ذرائع اور اثر آفرینی کے اصول اجازت دیتے ہیں وہ واقعات کو عمل کے ذریعے سے دکھائے گا لیکن جب ان کا دکھانا ناممکن یا نامناسب ہو تو اُن کا ذکر گفتگو میں لے آنے پر اکتفا کرے گا غرض اس کی کوشش یہ ہوگی کہ اس کے ناٹک کا پڑھنے والا دو گھنٹے کے مطالعے میں اور اس کا تماشا دیکھنے والا تین چار گھنٹے کے مشاہدے میں اکبر اور اس کے عہد کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر دیکھ لے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ ڈراما کو آرٹ کے معیار پر پہنچانے کیلئے ابھی ایک شرط باقی ہے جو سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ قطرے میں دریا اور جزو میں کل دکھانا یعنی انفرادیت میں عمومیت پیدا کرنا ڈراما کا اہم ترین مقصد ہے

جامعہ

عربی

جرأت

پیٹھ دکھانے سے تو پابہ زنجیر ہوجانا ہی بہتر ہے۔ مگر یہ قید و بند سے بھی بہتر ہے۔ کہ انسان جان دیدے۔ کیوں؟ ــــــ اس لئے کہ میرے نزدیک وہ زندگی بہت ہی ڈراؤنی ہے جو ذلت، اور رسوائی تک پہنچادے۔

میں نے زمین سے پوچھا۔ "تو دنیا بھر کی سجدہ گاہ، اور ناپاک کی ستھرائی کیوں کر بنی؟"

اس نے کہا ــــــ "اس لئے کہ میرے سینے میں لوگوں کے جگر پارے براج رہے ہیں۔"

جس طرح تم ہر شخص کو اپنا دوست نہیں بنانا چاہتے۔ ہر شخص سے دشمنی بھی نہ برتو۔ اس کی سخت ضرورت ہے۔ کہ دوستوں کی طرح، دشمن بھی منتخب کئے جائیں۔ کیوں؟ ــــــ اس لئے کہ دراصل دشمن بھی دوست ہے۔ صرف طریقہ، اور روش بدلی ہوئی ہے۔

اگر مجھ سے کہا جائے۔ "زمانہ کے حوادث سے امن و امان تلاش کرلے" تو میں صرف عزیزوں سے کنارہ کرلونگا۔

بڑھاپے کے باعث رنجیدہ اور ملول ہونا کیسا؟ یہ ہستی سے منہ موڑنا ہے۔ ــــــ اگر دنیا میں وفاداری کا پاس ضروری ہے تو نادان! بڑھاپا جوانی سے زائد وفادار ہے۔

مجھے اس سے محبت ہے۔ جسکو چودھویں رات کا چاند بھی سجدے کرتا ہے۔ آہ۔ اس کی روشن پیشانی پر، خاک کا نشان صاف نظر آرہا ہے۔

تم اور تمہارے اسلاف

دوست کی طبیعت میں نقصان اور قصور پاکر روٹھ جانا مناسب نہیں۔ عیب سے پاک، اور ہمہ تن مکمل تو چودھویں کا چاند بھی نہیں ہے۔

جب کسی کو ذلت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ دوسرے کو شرافت اور بزرگی نصیب ہوتی ہے۔ آفتاب کا ہبوط کیواں کا شرف ہے۔

جو شخص معاصرین کو تو ہیچ اور نااہل سمجھتا ہو۔ مگر پچھلوں کا گیت گاتا ہو۔ اس سے کہدو کہ قدیم بھی، کبھی نیا شمار ہوتا تھا۔ اور تھوڑے عرصے کے بعد، یہ جدید بھی، قدماء کی صف میں جگہ پالے گا۔

(ابن رشیق)

خانزادہ امتیاز عرشی

سنسکرت

قدرت کی ستم ظریفیاں

انسان سے اس کی محبوب چیزیں چھین لی جاتی ہیں۔ غم کے بعد مسرت، مسرت کے بعد غم۔ دُنیا کا اٹل قانون ہے۔ طبیب بھی بیمار ہوتے ہیں۔ ان کی دانشمندی انسانی کمزوریوں سے بالاتر نہیں ہے۔

غریبوں کے گھر اولاد نرینہ پیدا ہوتی ہے۔ اور امیر اس نعمت کے لئے ترستے ہیں۔ قسمت کے کھیل نرالے ہیں۔

امیر نوجوانی میں وفات پاجاتا ہے۔ غریب دُکھ اور درد برداشت کرنے کے باوجود بھی سو سال کی عمر تک زندہ رہتا ہے۔ فطرت کے بحر ناپیدا کنار میں انسان ایک دوسرے سے اسی طرح ملتے ہیں جس طرح لکڑی کے شہتیر

بیوی بچے، دوست و احباب تمام راہ گیر ہیں۔ ہم ان سے صرف اس لئے ملتے ہیں کہ ان کی جُدائی کے دُکھ سہیں۔

گجراتی

ایک زمانہ تھا کہ گلستانِ حیات بارونق تھا۔ مملکت حیات پر خوشی و خرمی کا راج تھا۔ دوستوں کے قہقہے تھے۔ یاروں کی محفل آرائیاں تھیں۔ دن عید اور راتیں شب برات تھیں دوست کیا تھے بھائی تھے۔ ہر ایک دوسرے سے زیادہ جاں نثار تھا۔ ہر طرف میری شہرت تھی۔ دنیا میں میرا ہی طوطی بولتا تھا۔ میرے ارد گرد کی کلیاں بھی سنہری معلوم ہوتی تھیں۔ مگر آہ! وہ زمانہ محض ایک خواب و خیال ہوکر رہ گیا اب میں ہوں اور زمانے کے مصائب۔ کتاب ہستی کے زرنگار صفحے کا محض مدہم سا ایک نقش ہوں۔ تکالیف بڑی حد تک میرا ناس کرچکی ہیں۔ میری شان و شوکت محض ایک افسانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ میری عزت کا خون ہوچکا ہے۔ میری آرزوئیں برباد ہوچکی ہیں۔ اور اب میں بجز اس کے کچھ نہیں رہ گیا ہوں کہ بحر ہستی میں خس و خاشاک کی طرح بہا چلا جارہا ہوں۔

لیکن کوئی میری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔

میری جیب خالی ہوچکی ہے۔ میرا سرمایۂ حیات دوستوں کی نذر ہوچکا ہے۔ اس بدحالی سے تنگ آکر اُس پچھلے دور کو جب یاد کرتا ہوں۔ تو دل دھڑکنے لگتا ہے۔ سینے پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ حیف! وہ خلوص و محبت کے دعوے دار محض خون چوس کر الگ ہو جانے والے ثابت ہوئے۔

فلاکت نے دنیا ایسی تاریک کردی ہے۔ کہ سورج کی کرنیں بھی ہمیں مدہم معلوم ہوتی ہیں۔ اب کوئی مجھ سے پوچھے کہ دنیا کیا ہے۔ دنیا صرف اور صرف خود غرضوں کی ایک جولاں گاہ ہے۔ اور بس۔

. . . .

. . . .

بنگالی

شام نشاط

مجھے وہ شام اب تک یاد ہے۔

نیلے نیلے آکاش پر تارے روشن تھے۔ جس طرح مندر میں چراغ جل رہے ہوں۔

میرا دل بھی چراغ کی طرح فروزاں تھا۔ غم کی ہواؤں کے جھونکے اُس شمع کو کس طرح بجھاتے جو تیرے عشق نے روشن کی تھی۔

تیرے گلے میں موتیوں کا ایک ہار تاروں کی درخشانی سے چشمک زنی کررہا تھا۔ میں سمجھتا تھا یہ موتی ہیں۔ کسی ستم رسیدہ کے آنسو جم کر رہ گئے ہیں۔ تو نے پیاری! ان موتیوں کو چھو کر ان میں آب و تاب پیدا کردی تھی!

چینی

وطن کی طرف

میں وطن کی طرف جارہا ہوں! میرے کھیت۔ میرے باغ برباد ہوگئے ہیں۔ کیا میں واپس ہو جاؤں وطن کا خیال بُھلا دوں؟

نہیں! میں ماضی کو بھول جاؤں گا۔ اور اپنی نظر میں صرف مستقبل پر رکھوں گا۔

میری کشتی ہوا کے نرم جھونکوں کے ساتھ رواں ہے۔ سبک باوقار میرے کپڑے پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ مجھے غصہ آرہا ہے۔ کیوں سورج طلوع

نہیں ہوتا؟ کیوں روشنی دنیا کو منور نہیں کرتی؟
اب مجھے اپنا گھر نظر آرہا ہے۔
میرا دل مسرت کے وفور سے پھٹ جائیگا۔
ویون

ہندی

موت

کہتے ہیں نیند موت کی بہن ہے۔
مجھ سے دونوں بہنیں روٹھ گئی ہیں۔
جس دن سے میرا محبوب مجھ سے جدا ہوا ہے اُس دن سے نیند نے آنے کی قسم کھالی ہے۔
نیند ہی نہیں مجھے موت بھی نہیں آتی۔
کبھی کبھی رات کو تاریکی میں مجھے کسی کی ہنسی کی آواز سنائی دیتی ہے۔
میں جانتی ہوں یہ ہنسی کیسی ہے۔
نیند اور موت میری پریشانی پر میرے اضطراب پر ہنس رہی ہیں!

مرہٹی

اے بچے!

اے بچے! تیری معصومیت پر مجھے رشک آتا ہے۔ تو مسکراتا ہے تو میرے دل میں ایک نشتر سا پیوست ہو جاتا ہے۔ تیری نظر کے سامنے اپنی گناہ آلود زندگی کے تمام منظر آجاتے ہیں۔ اے بچے!

جاپانی

خوبصورت اور بدصورت گھر

ایک وہ گھر ہے جس کی تعمیر پر بے انتہا روپیہ صرف ہوا ہے۔
جس میں قیمتی سامان آرائش موجود ہے۔ صناع اور معمار نے اپنی چابکدستی کا کمال دکھا دیا ہے۔ باغ کے درختوں کو چھانٹ چھانٹ کے ان میں مصنوعی حسن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس قسم کے گھر میں نہ حسن ہے نہ دلفریبی۔ نہ سکون ہے نہ اطمینان!
ایک اور قسم کا گھر بھی ہے۔
اس گھر کی تعمیر میں فیشن کا کوئی حصہ نہیں۔ سامان آرائش سادہ مگر نفیس ہے۔ ہر شے کی ترتیب سے ذوقِ سلیم کی لطافت کا اظہار ہوتا ہے۔ خودرو سبزہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ درخت اپنی فطرتی دلکشی سے مزین ہیں۔ چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی اور فضا ہے۔
یہاں سکون ہے اطمینان ہے۔ اس جگہ روح دنیا کی کشاکشوں سے نجات حاصل کر لیتی ہے۔

فرانسیسی

خدا کی قدرت

انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی ارد گرد کی چیزوں کی طرف زیادہ توجہ نہ دے۔ اگر وہ خدا کی قدرت کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے تو ذرا فطرت کے مناظر کی طرف دیکھے۔ ذرا اس خیرہ کُن ٹکیا پر غور کرے جو تمام دُنیا کو روشن کر دیتی ہے۔ وہ چراغ فروزاں وہ آفتاب درخشاں جو نیلے رنگ کے آسمان سے لٹکا ہوا ہے۔

دُنیا میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ روح فطرت کا ایک ذرہ بھی نہیں۔

ہم فطرت کی مہابت و عظمت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہماری زمین باقی کُروں کے مقابلہ میں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔ کائنات ایک عظیم الشان دائرہ ہے جس کا مرکز ہر ایک جگہ پایا جاتا ہے اور جس کے محیط کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ ان چیزوں کا خیال کرتے ہوئے ہمارا تخیل کھو سا جاتا ہے۔

بلیز پاسکل

اطالوی

قسمت

میں جانتا ہوں کہ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ دُنیا کے کام انسان کی تدبیروں پر منحصر ہیں۔ ہر واقعہ اندھی قسمت کا نتیجہ ہے۔ ایسے لوگوں کے خیال میں سعی لاحاصل ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ بیکار بیٹھے رہیں۔ اور دُنیا کے کاموں کو تقدیر پر چھوڑ دیں قسمت کی ہمہ گیری اور اس کے اٹل قوانین کی تائید ان انقلابات سے بھی ہوتی ہے جو اکثر واقع ہوتے رہتے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ قسمت ہماری نصف زندگی پر حاوی ہے۔ باقی نصف زندگی کے اعمال تمام تر ہمارے اختیار میں ہیں۔

قسمت ایک سیلاب پرور دریا کی طرح ہے۔ جب اس دریا میں طوفان برپا ہو جاتا ہے اس وقت کوئی چیز اس بے پناہ قوت کی روانی کو نہیں روک سکتی۔ مگر سکون کی حالت میں اس دریا کے کنارے بند باندھے جا سکتے ہیں۔ تاکہ سیلاب کے وقت اس کا پانی کسی خاص سمت بہ جائے اور جان و مال کو نقصان نہ پہنچائے۔

نکولو

ہسپانوی

ذوق سلیم

ذہن کی طرح ذوق سلیم بھی ارتقا پاتا ہے۔ صحیح علم آرزو کو جلد دیتا ہے اور لطف میں اضافہ کرتا ہے۔ لوگ اپنے ذوق سلیم کے ذریعے پہچانے جاتے ہیں۔ جس کا ارتقا یافتہ ہوگا اس کی آرزوئیں بھی لطیف و نفیس ہونگیں۔ ایسے شخص کے سامنے دلیر سے دلیر آدمی کانپ جاتا ہے۔ اس کا فیصلہ ناطق ہے۔ وہ جس چیز کو پسند کرتا ہے وہ درحقیقت دلکش اور دلفریب ہوتی ہے۔

آنامونو

انگریزی

غیر مرئی معاون

جب مادر گیتی کے پیارے بچے...... غم رسیدہ انسان ..... بے بسی کے عالم میں دُنیائے غیر معلوم کی سرحد پر ......

عالم یاس میں کھڑے ہو جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔
تو غیر مرئی معاون ۔ وہی غیر مرئی معاون ... وہی قدسی
جو خلد کی پاکیزہ فضاؤں میں
ذات باری کے قرب سے مشرف ہیں
آتے ہیں
اور کانپتے ہوئے دلوں کو تسکین اور حوصلہ عطا کرتے ہیں
ایک کُرّہ سے دوسرے کُرّہ تک فضائے بسیط میں تیرتے ہوئے،
جب ان ہستیوں .... ان غیر مرئی معاونوں کو
کوئی بھٹکی ہوئی ..... حاجتمند۔ امداد کی مستحق روح نظر پڑتی ہے۔
تو وہ قریب تر ہو کر،
اُسے اپنی آغوش میں لے لیتے ہیں۔

یہ کسی دُنیائے تخیل میں اُڑانے والے ہیولا کا خواب نہیں
گو ہم اُنھیں دیکھ نہیں سکتے۔
لیکن وہ ..... وہ غیر مرئی معاون ... .
زندہ ہیں۔
اور فضا کے رنگا رنگ غیر مرئی پردوں میں ملفوف۔

یوگوسلیویا

صبح روشنی ۔ امید اور محبت کا سرچشمہ ہے ۔ صبح کے وقت فطرت خواب ناز سے بیدار ہو کر انگڑائی لیتی ہے ۔ اور رات صبح کے راستے پر شبنم کے موتی برساتی ہے ۔ صبح کے وقت پھول کھلتے ہیں ۔ تاکہ سورج اپنی چشم جہاں بیں سے عروسِ فطرت کو نکھارا ہوا پائے ۔ رات کی گونگی خاموشی کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے ۔ کیف آفریں نغمے فضا میں منتشر ہو جاتے ہیں ۔ پرندے چہچہانا شروع کرتے ہیں ۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں درختوں سے سرگوشیاں کرتی ہیں ۔ اور عشرت کی روح نشیب و فراز پر رقص کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ۔ صبا ساکن سمندر کے بوسے لیتی ہے سرویا کی ماؤں اپنے بچوں کو اٹھاؤ ۔ کہ عروسِ فطرت کے صبح نظارہ سے لطف اندوز ہوں ۔

(الجریوٹ ولیسیوک)

جرمنی

دُنیائے دوں

"اے میرے بچّو! دُنیا دروغ سے پُر ہے ۔ اور بغض سے ۔ ہر شخص محض اپنے آپ کو عزیز سمجھتا ہے ۔ ناپائیدار خوشی کی مرتبہ تمام قیود خلوص غیر مستحکم ہیں .... جو وہم کے ذریعے ملی ہوئی ہیں ۔ وہم ہی ان قیود کو توڑ دیگا ۔ صرف قدرت راست باز و بے ریا ہے ۔ وہ ایک مستقل لنگر کے ساتھ قائم ہے ۔ باقی سب اشیا طوفانی موجوں کے تحت فرمان تیرتی ہیں... میلان طبع دوست پیدا کرتی ہے ۔ اور غرض ساتھی ۔ خوش قسمت وہ ہے ۔ جسے پیدائش نے ایک بھائی دیا ہو .... جنگ اور دغا بازی کی دُنیا کے خلاف وہ مقابلے کے لئے دو اکٹھے ہو جاتے ہیں ۔

شِلّر

رومانیہ

رافیل سے پہلے کے مصور

عورتوں میں روز ملی جمال کی تکمیل وتجسم دیکھتا تھا۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ اس نے عورتوں کو مختلف پہلوؤں اور شکلوں سے اپنے موقلم کے ذریعے غیر فانی بنا دیا ہے۔ اس کی تمام تصویروں کا انداز ایک سا ہے۔ خوش نما راج ہنس کی گردن۔ بیضاوی چہرہ۔ دل فریب و دلربا منہ۔ ہونٹ ذرا خم دار۔ اور آنکھیں شاید دنیا کے کسی مصور نے روز ملی کی سی آنکھیں تخلیق نہیں کیں۔ گہری۔ دلربا۔ دور رس۔ اندوہ افزا غم انگیز آنکھیں ✦

"مارکو بیزا"

ڈنمارک

زندگی

کچھ لوگوں کے لئے زندگی میں کسب عشرت کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔ اقتدار۔ طاقت۔ قوت۔ دولت۔ یہ تمام بے حقیقت چیزیں انہیں دعوت عمل دیتی ہیں۔ یہ لوگ طاقت ور ہیں۔ مضبوط ارادے کے ہیں۔ مگر میں سچ کہتا ہوں۔ کہ ان میں سے زندگی کی مسرت کسی کے لئے بھی نہیں

"جارج برنڈیز"

یُونانی

حسن

اس حسن کے علاوہ جو ان نوجوانوں کے متناسب اعضا میں بستا ہے۔ ایک اور قسم کا حسن بھی ہے۔ حواس سے گھری ہوئی دنیا میں ہم اس حسن کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ مگر روح جو حواس خمسہ کی مرہون منت نہیں اس حسن کے نظارے سے لطف اندوز ہو سکتی ہے۔ اس حسن کے کیف سے متاثر ہونا ہو تو جسم کی پابندیوں سے آزاد ہو کر دیکھو۔

جس طرح اندھے اس دنیا کے حسین وجمیل مناظر سے کوئی لطف نہیں اٹھا سکتے۔ اسی طرح وہ لوگ جن کی روح اندھی ہوتی ہے۔ اس حسن سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ جو جسمانی حسن سے کہیں زیادہ خوب صورت ہے۔

جب دیکھنے والے اس حسن عالم آرا کو دیکھیں گے۔ تو وہ مسحور ہو جائیں گے۔ اور ان کے دلوں کو فتنہ اپنی مٹھی میں لے لے گا۔ وہ ایسی مصیبت سے دوچار ہوں گے جو دنیا کی تمام مصیبتوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ وہ اس وقت راستی کے راستے پر چل رہے ہوں گے۔ یہ مصیبت بھی کس قدر شیریں ہے۔ شیریں اور لذیذ۔

حسن ہمیشہ اضطراب کا احساس پیدا کرتا ہے۔ میٹھا میٹھا سا اضطراب۔ کچھ تحیر۔ آرزو محبت اور ایک لرزش۔ ایک ایسی لرزش جو تمام تر مسرت اور عشرت ہے۔

پھر اس حسن کا اثر کیا ہوگا۔ جو تمام حسین اشیاء سے زیادہ دلکش ہے؟

عین اسی طرح جس طرح بعض لوگ جسمانی حسن پر مرتے ہیں۔ تو عاشق کہلاتے ہیں۔ وہ لوگ جو اس روحانی حسن پر فدا ہو جائیں گے۔ عاشق کہلائیں گے۔

ہندوستانی لڑکوں اور لڑکیوں کا باتصویر ہفتہ وار اخبار

پریم

علامہ تاجور اور پروفیسر برج موہن دتاتریہ کیفی؟

علامہ تاجور اور پروفیسر برج نجیو لعل ایم۔ اے دہلوی کی ایڈیٹری میں شائع ہوتا ہے۔ اس اخبار کی امتیازی خصوصیات جن پر اب تک یہ کاربند رہا ہے حسب ذیل ہیں

(۱) نہایت سادہ سلیس اور ایسی عام فہم زبان استعمال کی جاتی ہے کہ جو چھوٹے چھوٹے بچوں کی سمجھ میں آ سکے (۲) بچوں کی زبان میں بچوں کے لئے ایسی کہانیوں کا سلسلہ جن کے ذریعے شہری زندگی کے ہر شعبے کے متعلق ہر قسم کی معلومات کا ذخیرہ غیر محسوس طور پر ان کے دماغ میں منتقل کیا جا سکے (۳) پریم سبھا کے عنوان کے تحت میں ہم جماعتوں کی پرمذاق باہمی گفتگو کے ذریعے بچوں کو مضمون نویسی، خط و کتابت نویسی، اردو کی تذکیر و تانیث، اردو الفاظ کی املائی درستی، ضروری گرامر، ادب و اخلاق، تاریخ و جغرافیہ، سائنس، بڑے چھوٹے اور برابر والوں سے گفتگو کے آداب کی ایسے دلچسپ طریقے سے تعلیم دینا کہ بچے محسوس بھی نہ کریں کہ ہم کوئی سبق پڑھ رہے ہیں (۴) موجودہ کورسوں نے بچوں کے جذبۂ ظرافت (ہیومرس نیچر) کو سُلا دیا ہے۔ اس جذبہ کو ایسی نتیجہ خیز اور پُرمذاق کہانیوں کے ذریعے بچوں میں پیدا کرنا جو شریفانہ مذاق کی حد سے باہر نہ ہوں (۵) ایسے پُرمعلومات اور دل لبھانے والے مضامین شائع کرنا جو بچوں میں اردو ادب کے لئے پیاس پیدا کر دیں (۶) آسان وزنوں اور ایسی رس بھری زبان میں چھوٹی چھوٹی نظمیں چھاپنا جو بچوں کے لئے سبق آموز ہونے کے علاوہ دماغی تفریح کا باعث ہوں (۷) اخبار جس محنت اور غور کے ساتھ ترتیب دیا جاتا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکیگا کہ ہر فقرے کو بہت سے فقروں میں سے انتخاب کر کے جانچ تول کر مضمون میں درج کیا جاتا ہے ایڈیٹر کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اخبار کے تمام مضامین کے ہر ہر فقرے کے متعلق یہ بتا سکتا ہے کہ یہ فقرہ کیوں درج کیا گیا۔ اور اس کے بجائے کوئی دوسرا فقرہ کیوں نہ استعمال کیا گیا۔ (۸) اس اخبار کو جس نوعیت سے ترتیب دیا جاتا ہے اس کے متعلق ہماری رائے ہے کہ متوسط ذہانت کا ایک بچہ سال بھر اس اخبار کو بغور پڑھ کر اردو معلومات میں انٹرنس کے طالب علم کی برابری کر سکے گا۔

ذیل میں اس کے متعلق بہت سی رایوں میں سے چند رایوں کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

اخبار ٹریبیون لاہور:۔ "پریم" لڑکوں اور لڑکیوں کا ہفتہ وار باتصویر رسالہ ہے جو مشہور اردو شاعر مولانا تاجور نجیب آبادی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ سٹاف میں مولانا موصوف کے علاوہ لالہ برج نجیو لال ایم۔ اے دہلوی آنریری ایڈیٹر کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب، طرز ادا صاف، زبان سادہ، جسے ہر اردو خواں بآسانی سمجھ سکتا ہے مضامین آسان دلچسپ اور بچوں کے لئے ہر طرح سے موزوں و سبق آموز ہیں رسالہ کی قابل ذکر امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ہر قسم کے فرقہ وارانہ مضامین سے پاک ہے۔ اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ بچوں میں اخوت و ہمدردی کے پاکیزہ ترین جذبات پیدا کئے جائیں۔　　　ٹریبیون ۲۴ جنوری ۱۹۲۶ء

جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی:۔ بچوں کا یہ ہفتہ وار باتصویر رسالہ مولانا تاجور نجیب آبادی کے زیر ادارت شائع ہوتا ہے۔ اس کے جاری کرنے سے فاضل ایڈیٹر کا مقصد یہ ہے کہ ہندو اور مسلم بچوں کے دلوں میں ابتداء عمر سے باہمی اتحاد اور الفت کا بیج بو یا جائے کسی کو یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ یہ مقصد نہایت قابل عزت ہے۔ مولانا تاجور زبان اردو کے مشہور ادیب اور ناقد ہیں اور مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کی نگرانی میں جو مضامین چھاپے جائینگے وہ ضرور بلحاظ لفظی اور معنوی خوبیوں کے اعلیٰ معیار کے ہوں گے۔

خان بہادر میر ناصر علی خاں صاحب ایڈیٹر صلائے عام دہلی:۔ رسالہ پریم ظاہر اً بچوں کے لئے سمجھا جاتا ہے۔ میں بوڑھا بھی اسے جی لگا کر پڑھتا ہوں شاید اس وجہ سے کہ مزاج میں بوڑھا اور بچہ ایک سمجھا جاتا ہے۔ رسالہ پریم کے اہتمام چھپائی اور کاغذ کی تعریف تو بیکار ہے کہ ان خوبیوں میں اس کا جواب مشکل ہے مگر اس کے مضامین کی خوبی بھی لاجواب ہے۔ جن کو پڑھکر بچے تو بچے بوڑھے اور جوان بھی بہت خوش ہوتے ہیں۔

حضرت خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے سے:۔ بچے اور عورتیں اس کو نہایت شوق سے پڑھتے ہیں اور اس کے آنے کی راہ دیکھا کرتے ہیں۔ بہت خوبصورت اور رنگین باتصویر رسالہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ایڈیٹر طبع انسانی کے فلسفہ کو خوب سمجھتے ہیں۔

خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس ڈویژنل انسپکٹر مدارس لاہور ڈویژن:۔ میری رائے میں رسالہ پریم ہندوستانی بچوں کے لئے بہت مفید دلچسپ اور کار آمد ہے خصوصاً اس کا یہ پہلو کہ مختلف قوموں کے بچوں کو رواداری اور محبت کی تعلیم دیتا ہے۔

بچوّں کا کتب خانہ

تمام کتابیں جدید اصول تعلیم کو مدنظر رکھکر لکھی گئی ہیں۔ اور ہر کتاب کے اخیر میں مشکل الفاظ کا فرہنگ دیا گیا ہے۔

پیشوایان مذاہب (مجلد مع تصاویر)

پروفیسر تاجور ایڈیٹر ادبی دنیا و نیرنگ خیال نے دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے مذہبی پیشواؤں کی پاکیزہ زندگی پر بچوں کے لئے آسان زبان میں کتابوں کا ایک سٹ تیار کیا ہے۔ بچوں کو اگر یہ حقیقت ذہن نشین کرا دی جائے کہ سب مذہبوں میں سچائی اور نیکی کی تعلیم ہے اور سب مذہبی پیشواؤں نے بنی نوع انسان کی خدمت کا حکم دیا ہے۔ اس لئے ہمیں ہر مذہب اور ہر مذہبی پیشوا کی عزت کرنی چاہئے۔ اور ہر مذہب کے پیرؤوں کو اپنا بھائی سمجھکر اس سے محبت اور نیکی کا برتاؤ کرنا چاہئے۔ تو اس معصوم عمر کے اعتقادات ان کی تمام زندگی پر اثر انداز ہوں گے۔ اور ان کی ساری زندگی رواداری اور اخوت باہمی کا نمونہ بن جائے گی۔ اس سیٹ کی ہر کتاب میں یہی حقیقت بچوں کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان اتحاد آموز کتابوں کو پڑھکر ہندوستانی بچوں میں ایک مشترکہ قومیت کا جذبہ پیدا ہوگا۔ وہ ایک دوسرے کو بلا امتیاز مذہب و ملت بھائی بھائی تصور کریں گے اس سلسلے کی مندرجہ ذیل سوانح عمریاں شائع ہو چکی ہیں۔

حضرت محمد صلعم ۔۔ مہاتما بدھ ۔۔ حضرت مسیح ۔۔ شری رامچندر جی ۔۔ باباگورونانک

حضرت زرتشت ۔۔ حکیم کنفیوشس ۔۔ راجہ رام موہن رائے ۔۔ پورا سٹ یعنی کل

آٹھوں کتابوں کی قیمت ۱۲/ علاوہ محصول ڈاک

حاجی بابا اصفہانی

ایک ایرانی ظریف حاجی بابا اصفہانی اپنی کہانی اپنی ہی زبانی سناتا ہے اور ایسے مزے لے لے کر سناتا ہے کہ خود بھی ہنستا ہے اور سننے والوں کو بھی ہنسا ہنسا کے لٹا دیتا ہے۔ یہ کہانی بہت لمبی ہونے کے باوجود بے حد دلچسپ اور بشاشت آفرین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ اور ایشیا کی کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی نے اس کو انٹرمیڈیٹ کے فارسی کورس میں اور اس کا انگریزی ترجمہ اس کلاس کے انگریزی کورس میں داخل کر رکھا ہے۔

بچوں کا فطری جذبۂ ظرافت (ہیومر سنیچر) جسے خشک اور بشاشت سوز کورسوں نے تباہ کر دیا ہے اس قسم کی کہانیوں سے بیدار ہو جاتا ہے۔ اس کہانی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ظرافت مہذب حدود سے آگے نہیں بڑھتی۔ چھ سو صفحات کی تمام کتاب شروع سے اخیر تک ظرافت سے لبریز ہے مگر پھکڑپن حیا سوز عریانیوں سے یکسر خالی ہے اور ادائے بیان میں تصنیفی اردو نہیں بلکہ گھریلو بولی استعمال کی گئی ہے۔ کہانی کو زیادہ مفید اور تعلیمی بنانے کے لئے اثنائے بیان میں بات سے بات پیدا کر کے موجودہ ہندوستانی طرز حکومت۔ میونسپلٹی ڈسٹرکٹ بورڈ۔ صوبہ کونسلیں۔ حکومت ہند۔ سکاؤٹ۔ امداد باہمی، زراعت، صنعت و حرفت دیہات۔ تعلیمی اور ادبی معلومات۔ غرضیکہ یہ کہانی جہاں ایران کے جغرافیہ ایرانیوں کے رسم و رواج ان کے تہذیب و تمدن۔ طرز و طریقہ معاشرت پر روشنی ڈالتی ہے وہیں اس سے بچے ہندوستانی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں سے بھی واقف ہو جاتے ہیں۔ کتاب کیا ہے۔ کہانی کی کہانی اور تعلیم کی تعلیم۔ کل دس حصوں میں شائع ہوئی ہے اور سب کی مجموعی قیمت علاوہ محصول ڈاک دو روپے آٹھ آنے ہے

پھول باغ (مجلد مع تصاویر)

بچے کہانیاں سننے اور پڑھنے کے مشتاق ہوا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں عام طور پر ان پڑھ بوڑھی عورتیں انکو بہلانے کے لئے ایسی لغو اور بیہودہ کہانیاں سنایا کرتی ہیں جن کے ضرر رساں اثرات سے بغیر محسوس طور پر بچوں کی ذہنیت خراب ہو جاتی ہے۔ ان کے دماغ جنوں بھوتوں اور پریوں کے وحشت کدے بن جاتے ہیں۔

مہذب ملکوں میں بچوں کو کہانی ہی کہانی میں علمی۔ اخلاقی۔ تاریخی غرضیکہ ہر قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ کہانیاں نتیجہ خیز اور سبق آموز ہوتی ہیں ان سے بچوں کے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور ان کے قوائے ذہنی کی نشوونما بھی ہوتی ہے۔ لایعنی توہمات اور بے بنیاد خطرات انہیں زندگی بھر کے لئے بزدل اور پست حوصلہ نہیں بنا دیتے۔ بلکہ وہ انہیں سُنکر اور پڑھکر اولوالعزم اور بلند ہمت ہو جاتے ہیں۔

پروفیسر تاجور کی ہدایت کے ماتحت یورپین لٹریچر میں سے اسی قسم کی ہمت افروز اخلاق آموز کہانیاں جو ماہرین فن تعلیم نے بچوں کے لئے لکھی ہیں اصلی اور گھریلو اردو کے سانچے میں ڈھال دی گئی ہیں۔ ان میں سے اس وقت تک ۱۲ کہانیاں پھول باغ کے تین حصوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ تینوں حصوں کی قیمت ۹/ اور الگ الگ ہر حصے کی قیمت ۳/ ہے

انتخاب میر و مرزا سودا

ابتدائی جماعتوں میں بچوں کو چونکہ اپنے ادبی ذوق کے نشوونما کا موقعہ نہیں ملتا اور ان کے اردو اُستاد عام طور پر بس کورس رٹا کر امتحان میں پاس کرانے کو اپنی کارکردگی تصور کرتے ہیں اس لئے بچے اس ذوق سے اخیر عمر تک بے بہرہ رہتے ہیں۔ پھر کالج میں آکر جب انہیں اردو کلاس میں بیٹھنے کا موقع ملتا ہے اور غالب کے اشعار سے واسطہ پڑتا ہے تو انہیں پتہ چلتا ہے کہ "عنقا را بلند است آشیانہ" نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کالج کے دو سال میں اردو کا پیریڈ ان کے لئے ریاضی اور ڈرل سے زیادہ خشک اور غیر دلچسپ بنجاتا ہے۔

پروفیسر تاجور نے اپنے اسکول اور کالج کے اسی تجربے کی روشنی میں مستند شعرا کے کلام کے انتخابات مرتب کرائے ہیں جنمیں سے انتخاب میر اور انتخاب مرزا سودا دو حصوں میں شائع ہو چکا ہے اور اس ایجنسی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

المشتہر

منیجر علمی بک ایجنسی پوسٹ بکس نمبر ۱۹۷ لاہور

مولوی احمد عبداللہ خاں صاحب ارشد نے مرکنٹائل پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ادبی دنیا واقع کشمیر بلڈنگ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا۔

اردو کا علمی و ادبی ماہوار
رسالہ
ادبی دنیا
نقشۂ عالم کے
کے ساتھ اردو زبان پہنچ چکی ہے
مشرق و مغرب کے جدید و قدیم ادبیات کا مرقع
اپریل ۱۹۳۰ء
ڈائرکٹر۔ آنریبل جسٹس سر عبدالقادر
ایڈیٹر۔ تاجور نجیب آبادی
الانہ چندہ چار روپے بارہ آنہ مع محصول ڈاک

جو پرفیسر **تاجور** کی ایڈیٹری میں ہفتہ وار شائع ہوتا تھا یکم فروری سے روزانہ کر دیا گیا ہے۔ یوں تو اُسکی پالیسی ہندوستان کے تمام فرقوں کی تمدنی تعلیمی اور اقتصادی اصلاح پر مشتمل ہوگی۔ لیکن جس خالص مقصد کو لیکر یہ روزنامہ عالم وجود میں آیا ہے وہ تعلیمی اداروں اور ان کے اراکین کے حقوق کی حفاظت ہے۔

یہ حقیقت محتاج دلیل نہیں کہ مدرس علوم و فنون کا سرچشمہ ہے۔ اور تہذیب و تمدن کے وہ تمام شاندار نتائج جن سے دنیا بہرہ ور ہوتی ہے۔ صحیح تعلیم و تعلم ہی کا ثمرہ ہوتے ہیں۔ مگر ملک میں ابتک اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ اس وقت جبکہ ہندوستان اپنی زندگی کے نہایت اہم اور خطرناک منازل میں سے گزر رہا ہے ایک تعلیمی پرچے کی شدت سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ "**اتحاد**" اپنا فرض سمجھتا ہے کہ ملک کے تعلیمی خادموں کی رفاہ و ترقی میں کوشاں رہے۔ ان کی شکایات حکومت تک پہونچائے۔ اور وہ تمام کوششیں بروئے کار لائے۔ جن سے ایسے وسائل و ذرائع پیدا ہو سکیں۔ جو تعلیم کو صحیح اقتصادی اور تمدنی بنیادوں پر قایم کریں۔ "**اتحاد**" کوشش کرتا ہے کہ ایک طرف پڑھنے اور پڑھانے والوں کے درمیان محبت اور مودت رابطہ قایم کرے۔ اور دوسری طرف مدرسین اور عمال حکومت کے درمیان صحیح تعاون کی اسپرٹ پیدا کرے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ملک کا تعلیمی معیار بلند ہو اگر آپ کی خواہش ہے کہ تہذیب و تمدن کے حقیقی بانی۔ معلموں۔ اور مدرسوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔ اور اُنھیں ملک و قوم کے لئے اور بھی زیادہ مفید بننے کے طریقوں کی رہنمائی کی جائے۔ اگر آپ کی تمنا ہے کہ ہندوستانی دیہات کی اصلاح ہو۔ اور معاشرتی اور اقتصادی حالت بلند کی جائے تو روزنامہ "اتحاد" کی اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹائیے۔ یہ انہی ضرورتوں کو مدنظر رکھکر جاری کیا گیا ہے۔ اور اگر ملک کے اہل علم اور تعلیمی اداروں نے ہمت افزائی کی تو ان مقاصد کے حصول میں اپنی ساری طاقت صرف کر دے گا۔

چندہ

سالانہ	ششماہی	سہ ماہی	نمونہ
۵ر عہ	۳ر	للعہ	مفت

مینیجر روزنامہ "اتحاد" لاہور

نیرنگِ خیال | لاہور

جلد ۲ | بابت ماہِ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء | نمبر ۴

فہرستِ مضامین

تصاویر: (۱) نینوا (سہ رنگی) (۲) ایلورا کے تاریکی غار (۳ و ۴) مشرق ومغرب (۵) فرعون کی موت (۶) فرعون کی لاش (۷) رہوار موت۔ (۸) رقصِ گدایانہ

حال وقال

ادبی دنیا کے اس نمبر پر اُس کی زندگی کا ایک سال ختم ہو جاتا ہے ۔ پہلا نمبر مئی ۲۹ء میں شائع ہوا تھا اور یہ مہینہ اپریل ۳۰ء کا ہے اُس مئی سے اس اپریل تک بارہ ماہ کی صبر آزما مسافت حائل تھی جو خدائے برتر کی توفیق و امداد سے مشکلات و مصائب کے ایک بیکراں خارزار میں سے گزر کر ہم نے طے کرلی ۔

ادبی دنیا کا پہلا نمبر شائع ہوا تو اردو ادب کی آباد فضاؤں میں جوتشیوں رمالوں اور نجومیوں کے غول کے غول پیدا ہو گئے ۔ ادبی جماعتوں کی تمام خواہشوں، افواہوں، اندیشوں اور پیشگوئیوں کی تعبیر ان دو فقروں میں بیان کی جاسکتی ہے ۔ کہ

" ادبی دنیا بند ہو جائے گا ۔"

" ادبی دنیا بند ہو رہا ہے ۔"

یہ دلدوز تیر تھے جو ہمارے دل وجگر کے لئے ادبی کمانداروں کے ترکشوں کی زینت بنے رہتے ۔ یہ حوصلہ شکن فقرے تھے جو اپنے پرائے سب کی زبانوں پر مدتوں جاری رہے ۔ چھ سات ماہ تک لاہور کے ہر ادیب کا تکیہ کلام

"ادبی دنیا بند ہو جائیگا ۔"

بنا رہا ۔ لیکن خدائے تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ہمیشہ کی طرح "ادبی دنیا" کے معاملے میں بھی تمام رمال جفار جوتشی اور نجومی رسوائی کی حد تک بے اعتبار ٹھہرے اور اُسی کا فضل ہے کہ آج محفلِ ادب میں ایک سرخرو انسان کی بشاشت کے ساتھ ہم یہ کہنے کی جراٗت کر رہے ہیں کہ

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

ہمارے معاصرین

معاصرین میں انگریزی اور اردو کے روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات اور اُن ماہوار پرچوں نے جو ہندی، گورمکھی اور سندھی وغیرہ میں شائع ہوتے ہیں ۔ جی کھول کر ہمیں داد دی ۔ سب نے ادبی دنیا کو "اردو ادب کے انقلابی دور کا آغاز کرنے والا رسالہ" بتایا ۔ غالباً کسی ادبی پرچے پر پریس نے اتنی توجہ نہیں کی ہوگی جتنی ادبی دنیا کی گئی ۔

باقی ہمارے اصلی حریف اردو ادب کے ماہوار رسالے ۔ اُن کا رویہ اپنی حیثیتوں کے مطابق مختلف رہا ۔

معاصر ہمایوں نے اس پر حوصلہ افزا الفاظ میں ریویو کیا ۔ ہمایوں کے سوا اکثر خاموش ہی رہے ۔ اور اس خاموشی پر ہم ان کے شکرگزار ہیں کہ اخلاقی انحطاط کے اس دور میں سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ کسی کو نقصان نہ پہنچایا جائے ۔ اور وہ تو ایک پیغمبر کا عہد تھا ۔ جب نیکی کرنا دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا نام پڑ گیا تھا ۔

کچھ معاصرین نے دیانتدارانہ مگر ذرا تلخ تنقیدیں کیں اُن کے ہم اس لئے ممنون ہیں کہ ان کی تنقیدوں سے ہم نے اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کی ۔ بعض معاصرین نے ادبی دنیا پر بلند الفاظ میں اظہار رائے کیا مگر ہمارے نام نجی خطوط میں اپنے صفحات تک اپنی اس رائے کی اشاعت اپنی تجارتی مصلحت کے خلاف سمجھی ۔ ہم ان کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان کی مستند رائے نے ہمارے ناظرین کو صحیح رائے قائم کرنے میں مدد دی ۔

بعض معاصرین جن کی غیر طبعی زندگی کا دارومدار آنکھوں میں خاک جھونکنے والے پروپیگنڈے اور پبلک کی اس کمزوری پر ہے کہ وہ دعوے کو دلیل اور نقل کو اصل سمجھتی ہے ۔

ادبی دنیا کے انجام کی بابت یقین کی ابتدا سے امید کے تذبذب اور اس تذبذب سے تمناؤں کی ناکامی اور آرزوؤں کے انفعال تک تمام سال اسی تگ ودو میں لگے رہے کہ کسی طرح ادبی دنیا بند ہو جائے ۔ اور اگر یہ مسرت نصیب میں نہیں تو اتنا ہی ہو جائے کہ پبلک کو یہ مغالطہ دیا جاسکے کہ ادبی دنیا بند ہو رہا ہے ۔ اور یہ بھی نہ ہو تو یہ تو ضرور ہو کہ ادبی دنیا کے متعلق رائے عامہ کو جھٹلا دیا جائے

یہ حضرات مئی سے دسمبر تک مہینے کے پندرہ دن تو ان افواہوں کے تراشنے اور پھیلانے میں گزارتے رہے کہ "ادبی دنیا بند ہو رہا ہے" اور جب قضائے مبرم کی طرح اس مہینے کا پرچہ شائع ہو جاتا تو باقی پندرہ دن اس پر نکتہ چینیوں میں بسر کر دیتے تھے ۔ مگر ستم ظریف قدرت نے پہلے پندرہ دن کی مصروفیت ان سے چھین لی ہے کیونکہ

ان کی پیشگوئیاں متواتر غلط ثابت ہو ہو کر اب مضحکہ انگیز حد تک بے اعتبار بن چکی ہیں۔ وہ اپنے علم نجوم کی مدد سے ہر دوست دشمن کو آخری طور پر یہ یقین دلا چکے تھے کہ ادبی دنیا بند ہو رہا ہے اور جو مہینہ اس کے لئے تجویز ہوا تھا اُس مہینے ادبی دنیا کی اشاعت پر ساڑھے اکتیس من کاغذ صرف ہوا اور پانچ ہزار ایک سو کی تعداد میں اُس کی اشاعت ہوئی۔ جو ہندوستان میں اردو ادب کے کسی ماہوار پرچے کی سب سے بڑی اشاعت ہے۔ اُسی مہینے سے ادبی دنیا ہی کے دفتر سے ایک روزانہ اخبار جاری کیا گیا ہے۔ اور اُسی ماہ سے اسی دفتر سے متعلق محکمۂ تصنیف و تالیف قائم ہو چکا ہے۔ اور اب ادبی دنیا۔ پریم۔ روزنامۂ اتحاد۔ شعبۂ تصنیف و تالیف میں اتنے مصنف، اتنے ایڈیٹر، اتنے مینجر، کلرک اور چپراسی کام کر رہے ہیں کہ ٹائمز آف انڈیا کے دفتر میں بھی اس سے زیادہ نہ ہوں گے۔ یہ قلق انگیز اور حوصلہ فرسا منظر دیکھ کر اب ہر ایسی زبان پر جو کسی کو نیکی سے یاد کرنے کی عادی نہیں۔ یہ سوال آ رہا ہے کہ روپیہ کہاں سے آتا ہے؟ اب سال بھر یہ لوگ اسی تحقیقات میں لگے رہیں گے اور خدا نے چاہا تو اپریل ۱۹۴۱ء کے ادبی دنیا میں ایک سال بعد ہم اپنے ناظرین کو ان حضرات کی تحقیقات کے نتیجے سے مطلع کر سکیں گے۔

اہلِ قلم

اردو زبان کے مشہور اہلِ قلم نے ادبی دنیا کی قلمی اعانت بہت کم کی اور اس کی وجوہات حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) ادبی دنیا آسان لکھے ہوئے مضامین چھاپتا ہے اور ان میں سے اکثر حضرات کو حجازی اردو میں مضمون نگاری کی مشق ہے۔ یہ لوگ ملک کی لسانی ضرورت سے بے خبر ہیں اور اپنی زبان کو آسمانی الہام کی طرح ترمیم و تسہیل سے بے نیاز سمجھتے ہیں۔

(۲) ان سے مضمون نہ طلب کرو تو اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں اور طلب کیجئے تو مسلسل نثری قصیدے اور مخلصانہ سجدے طلب کرتے ہیں۔ قصیدہ نظم میں ہو یا نثر میں اس صنعت سے ہم ابتدا ہی سے عاجز اور اس کمال سے فطرۃً محروم واقع ہوئے ہیں۔ رہے سجدے تو خدا نے ہماری پیشانی میں اپنے لئے بھی برائے نام ہی سجدے رکھے ہیں پھر ان مٹی کی شکستہ مورتیوں کی پوجا ہم سے تو نہ ہوئی ہے نہ ہوگی۔

ذرا غور فرمائیے اس کس مپرسی کے دور میں جب کوئی رسالہ مضامین کا معاوضہ دینے کی ہمت نہیں رکھتا۔ ہم اپنی حیثیت سے زیادہ مضمون کا معاوضہ ادا کریں پھر درباری شاعروں کی طرح منت کر کے مضمون حاصل کریں پھر اسے شائع کرتے ہوئے ڈکشنری کے تمام مدحیہ الفاظ ایک قصیدے کی تشبیب میں استعمال کر کے مضمون کا تعارف کرائیں جل و علیٰ یہ ہی ایڈیٹری ہے تو بھر پائے اس ایڈیٹری سے۔

این کار از ما نمی آید

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم مشاہیر اہلِ قلم سے فرعونیت برتتے رہے ہیں۔ نہیں، بالکل نہیں۔ مضمون حاصل کرنے کے جو جائز اور شریفانہ طریقے ہیں اُنہیں برتا گیا۔ رسالہ اُن کے نام بھیجنا۔ درخواست نما خط لکھنا۔ مضمون کی استدعا۔ معاصرانہ خوشامد۔ معقول معاوضے کی ترغیب یہ سب کچھ کیا گیا۔ یہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔ مگر ان حضرات کو بندگی چھوڑ کر خدائی کرو فر سکھاتے ہیں۔ اُن رسالہ بازوں نے جو خود کم سواد بلکہ بے سواد واقع ہوئے ہیں۔ جو مضمون لکھنے کی زحمت سے مستقل طور پر آزاد ہیں کہ

"وہ دامن ہی نہیں رکھتے کہ اُلجھے پاؤں دامن میں"

جن کی ایڈیٹری کا صرف ایک ہی پہلو ہے اور وہ یہ کہ ایک مضمون جو پانچ روپے میں مل سکتا ہے اس کے حاصل کرنے کی قیمت پانچ وقت کی نمازوں کے سجدے بے شمار پرستارانہ التجائیں اور ایسے قصیدے جو صرف خدا کی شان میں کہے جا سکتے ہیں۔ پستیوں اور عبودیت کے یہ انبار پیش کر کے اُس مضمون کو حاصل کرتے ہیں۔ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ پستی کو دیکھ کر بلند ہو جایا کرتی ہے۔ اردو کے اہلِ قلم نے بھی انہیں مناظرِ عجز و نیاز سے متاثر ہو کر زمین پر چلنا چھوڑ دیا ہے۔ اور "رہبانِ اعمدہ" کی طرح فضائے بلند میں "قضائے معلق" کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اب ہماری خاطر وہ زمین پر اُترنا کسرِ شان سمجھتے ہیں اور اُن تک پہنچنے کے لئے انسانیت چھوڑ کر چیل کوؤں کی پوزیشن ہمیں منظور نہیں۔

یہ وجوہات ہیں جن کے سبب مشہور اہلِ قلم کی امداد ہم حاصل نہیں کر سکے اور یہی ننگِ پرستاری تھی جس سے بچنے کے لئے ہم نے مخزن۔ ہمایوں اور ادبی دنیا کے ذریعہ چودہ سال کی محنت و ترہیت کے بعد ملک کے نوجوانوں میں سے نادرہ روزگار ادیب اور سحر طراز شاعر اتنی تعداد میں اردو ادب کے لئے پیدا کئے کہ اُن کے ہجوم میں اردو دنیا کے یہ تاریخی کھنڈر نظر بھی نہیں آتے اور کسی رسالے میں ان کی غیر موجودگی اب محسوس ہی نہیں ہوتی۔

محکمہائے تعلیم اہل تعلیم و طلبہ

ادبی دنیا کا مالک علم و ادب کا خدمت گزار اور اُس کی معاشی زندگی تعلیمی محکمے سے متعلق ہے

ہندوستان اور شاید دوسرے ملکوں میں بھی ہر طبقے کے آدمی ایک دوسرے کی امداد کی بجائے اُسے سنبھلنے کے موقعوں سے محروم کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں اور اسی کشمکش حیات کو دیکھ کر "تنازع للبقا" (زندگی کے لئے جنگ) کا نظریہ قائم کیا گیا ہے۔ لیکن ادبی دنیا کے مالک کو اپنے ادبی اور صحافتی حلقوں سے تو "تنازع للبقا" کے اصول پر جنگ کر کے اپنے جنگجو حریفوں کو پچھاڑنے اور انہیں اُن کی شامتِ اعمال کے سپرد کرنے کی ضرورت پڑی مگر اُسکی تعلیمی برادری نے جو گراں قدر اور مسلسل امداد اُسے دی سچ یہ ہے کہ اس ہمت افزا امداد کے بغیر وہ اس جنگِ زندگی میں شریک ہونے کے قابل بھی نہ تھا۔ پھر اس میدان میں ایک فاتح کی حیثیت حاصل کرنا تو دور کی بات ہے۔ ہاں ہمیں اعتراف ہے اور ایک شکر گزار کا اعتراف کہ اہلِ تعلیم نے جن میں صوبوں کے محکمہائے تعلیم قابل عزت افسرانِ تعلیم کالجوں کے پرنسپل، اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر اور عام اساتذہ بلکہ طلبہ نے بھی ہمیں اپنی اپنی حیثیت کے مطابق امداد دی اور مسلسل امداد دے رہے ہیں۔

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے ادبی دنیا کی اشاعت کے ایک ماہ بعد دو سو کی تعداد میں اُسے خریدا۔ پنجاب کے تمام ڈویژنل انسپکٹران مدارس نے اپنے اپنے تعلیمی ڈویژنوں میں ادبی دنیا کے متعلق سرکلر جاری کئے۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹران مدارس نے مسلسل توجہات سے ہمیں نوازا غرضیکہ تعلیمی حضرات اور تعلیمی اداروں نے اس شان سے اس کا خیر مقدم کیا گویا وہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ پنجاب کے علاوہ صوبہ بنگال، بہار اڑیسہ۔ سرحد کے محکمہائے تعلیم نے اس کے متعلق سرکلر جاری کئے۔ بمبئی اور ناگپور کے سررشتہائے تعلیم کے متعلق بھی اطلاعیں آچکی ہیں۔ غرضیکہ دس گیارہ مہینے کی قلیل مدت میں ادبی دنیا نونہالانِ ملک کے ہاتھوں تک پہنچ گیا۔ کہ وہی اس کی اشاعت کا اصلی باعث تھے۔

ہمارے طلبہ اور نوجوان

ہم نے پہلے نمبر میں اس کی صراحت کر دی تھی کہ ادبی دنیا ہندوستان کے طالبعلموں اور نوجوانوں کے لئے جاری کیا جاتا ہے۔ اس کے ہر نمبر میں اُنہیں کی ادبی و تعلیمی ضروریات کا لحاظ کیا جائیگا۔ یہ پرچہ ملک کے ادیبوں اور انشا پردازوں کے لئے نہیں ہے۔ اسی لئے اہل ادب کے ناک بھوں چڑھانے کی ہم نے قطعاً پروا نہ کی اور آسان زبان میں خود بھی مضامین لکھے اور اپنے قلمی معاونین کو بھی آسان نویسی کی ترغیب دلائی۔ ہر نمبر کے مشکل الفاظ ایک فرہنگ کی صورت میں درج کئے جاتے رہے۔ اِس فرہنگ نویسی پر ہمیں اپنے بیگانوں کے طعنے سننے پڑے۔ ہم پر پھبتیاں کسی گئیں۔ مگر ہم نے اپنے عزیز طالبعلموں کی ادبی ضروریات کو کبھی نظر انداز نہ کیا۔ برہنہ خیالات کی نظمیں اور عریاں افسانے مخربِ اخلاق مضامین سے ادبی دنیا کے صفحات کو ہمیشہ پاک رکھا اور اِس اشتہاری دور میں جبکہ کسی اخبار یا رسالے کی زندگی کا دارومدار خریداروں سے زیادہ اشتہارات کی آمدنی پر سمجھا جاتا ہے ہم نے نہ صرف یہی کہ شرمناک بیماریوں۔ جوتشیوں۔ عاملوں اور سگرٹوں کے اشتہار نہیں شائع کئے (حالانکہ آجکل سب سے زیادہ اجرتیں اسی قسم کے اشتہاروں سے وصول ہوتی ہیں) بلکہ ایسے اشتہارات چھاپنے سے بھی پرہیز کیا جن کی بابت ہمیں صحیح علم نہ تھا کہ جن چیزوں کی قیمت اشتہار میں درج کی گئی ہے۔ وہ چیزیں اتنی قیمت کی ہیں بھی یا نہیں۔ اور اس بارے میں اس قدر احتیاط برتی جاتی ہے کہ مستقل طور پر مالی نقصان اٹھا رہے ہیں۔ مگر ایسے اشتہارات واپس کر دیتے ہیں۔ جن کے متعلق ہمیں شک ہوتا ہے کہ ناظرین رسالہ فریب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اشتہارات کی بابت اسقدر احتیاط مہاتما گاندھی کے "ینگ انڈیا" کے بعد ادبی دنیا کے سوا اور کسی پرچے میں نہیں برتی جاتی۔

نادار خریدار اور غریب طلبہ

ادبی دنیا کی روزانہ ڈاک میں بہت سے دردناک خطوط ایسے طلبہ یا نادار اہل ذوق کے ہوتے ہیں جو ادبی دنیا کو پڑھنے کا بے انتہا شوق ظاہر کرتے ہوئے اس کا پورا چندہ ادا کرنے سے عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور خدا کے واسطے دے دیکر چندے میں اپنے لئے رعایت چاہتے ہیں۔ ان خطوط کو پڑھ کر ہمیں اپنی طالبعلمی کی بے بسی و بے زری یاد آجاتی ہے اور ہم پہروں بے چین رہتے ہیں۔

ان حضرات کے ادبی ذوق کا احترام کرتے ہوئے ہم عرض

کرتے ہیں کہ ہم نے ادبی دنیا کسی تجارتی مقصد کے لئے جاری نہیں کیا۔ ہم اس کے لئے بالکل تیار ہیں کہ کوئی دیوانۂ علم و ادب میدان میں آئے اور ادبی دنیا کو چلانے کا ذمہ لے۔ ہم نہ صرف یہی کریں گے کہ ادبی دنیا کو فوراً اُس کے سپرد کر دیں گے۔ بلکہ اس اقرار کو بھی نباہیں گے کہ ادبی دنیا پر ہمارا نام بھی نہ ہو۔ اور ساتھ ہی ڈھائی سو روپیہ ماہوار اُسے اپنے پاس سے دئے جائیں گے۔

حالت یہ ہے کہ اس ایک سال میں نو ہزار روپے سے اوپر اوپر ادبی دنیا میں گھاٹا آچکا ہے۔ اور اس بارے میں ہماری بات پر اعتبار کرنے سے پہلے کسی ایسے شخص سے پوچھ لیجئے جو کاغذ لکھائی چھپائی وغیرہ میں تجربہ رکھتا ہو۔ ادبی دنیا کی ایک کاپی پر دفتری اخراجات لگا کر ایک روپے کے لگ بھگ خرچ آجاتا ہے۔ اس سے ایک خریدار کی سال بھر کی بارہ کاپیوں کے آمد و صرف سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہم سے محکمہ تعلیم کے کئی افسران فرما چکے ہیں کہ طلبہ میں ادبی ذوق رکھنے والے طالب علم عموماً غریب ہوا کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ادبی دنیا کے چندے میں رعایت کر دینی چاہئے۔ ادھر ملک کے نادار اہلِ ذوق (رعایت طلب) خطوط کی بھرمار کر کے ہمیں نادم کرتے رہتے ہیں۔ رعایت کی گنجائش ہو یا نہ ہو ان حضرات کے خطوط کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس لئے ہم خدا کا نام لے کر یہ اعلان کرتے ہیں کہ نادار اہلِ ذوق سے تین روپے بارہ آنے اور غریب طلبہ سے (بشرطِ تصدیق) تین روپے سالانہ چندہ لیا جائیگا۔ یہ رعایت حسبِ ذیل شرطوں کے ساتھ ہوگی۔

(۱) ہر شخص ناداری اور تنگدستی کا مدعی بن کر یہ رعایت حاصل نہ کرے۔ بلکہ جو صاحب ادبی ذوق رکھنے کے ساتھ واقعی طور پر ادبی دنیا کا پورا چندہ ادا نہ کر سکیں وہی اس رعایت سے فائدہ اٹھائیں۔

ہم دور بیٹھے ہوئے ایسے نادار خریداروں کے خطوط پر اعتماد کرنے کے سوا اور کیا تحقیق کر سکتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ صرف وہی حضرات رعایت سے فائدہ اٹھائیں گے جو دراصل ادبی دنیا کا پورا چندہ نہیں دے سکتے۔

(۲) غریب طلبہ کو اپنے اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کی تصدیق بھیجنی چاہئے۔ تب رعایت دی جائے گی۔ امیر یا متوسط والدین کے لڑکے اپنے آپ کو غریب ظاہر کر کے اس رعایت کو حاصل کرنا گناہ سمجھیں وہ ایسا کریں گے تو اپنے غریب ہم جماعتوں کا حق چھینیں گے۔

(۳) وی پی کے ذریعہ رعایتی چندے پر رسالہ منگوانیوالوں کی کسی درخواست پر غور نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ رعایت طلب کرنے والے خریداروں کو منی آرڈر کے ذریعہ چندہ بھیجنا چاہئے۔ انہیں وی پی نہیں بھیجا جا سکتا۔

معاصرین پر ادبی دنیا کا اثر

معاصرین نے ادبی دنیا کا استقبال خندہ پیشانی سے کیا یا سرگرانی سے اسے محبت کی نظروں سے دیکھا یا عتاب کی۔ بہرحال اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ادبی دنیا سب کی نگاہوں کا مرکز بنا رہا۔ اور کوئی معاصر بھی اسے نظر انداز نہ کر سکا۔ ہر ایک نے اپنی زندگی کی مصلحت کو پیشِ نظر رکھ کر ادبی دنیا کے سبب اپنی سطح سے بلند ہونے کی کوشش کی۔ اس کے ثبوت میں مئی ۱۹۲۹ء سے پہلے ادبی پرچوں کو دیکھ کر مئی سے بعد کی ان کی رفتار پر نظر ڈالئے آپ کو محسوس طور پر معلوم ہو جائیگا کہ ادبی رسالے ادبی دنیا کی اشاعت سے پہلے جس حال میں تھے۔ ادبی دنیا کی اشاعت کے بعد انہوں نے رنگ روپ بدل لیا ہے۔ اور بدلتے جا رہے ہیں۔ اور نئے جاری ہونے والے پرچوں کے سامنے تو ایک معیار ہے اور وہ "ادبی دنیا" ہے۔ ادبی دنیا کے مضامین کی بلندی۔ دلچسپی اور تنوع کا اثر بھی معاصرین پر پڑ رہا ہے۔ اور ظاہری شان و شکوہ میں بھی ادبی دنیا کی پیروی ضروری سمجھی جانے لگی ہے۔ ہر مضمون کے لئے معاوضہ ادا کرنے کی رسم بھی اردو ادب میں ادبی دنیا ہی نے جاری کی ہے اس رسم پر اگرچہ ابھی تک صرف ادبی دنیا ہی قائم ہے۔ لیکن اس کے اس قدر شناس طرزِ عمل سے اہلِ قلم نے اپنی مفت بخشیوں کے رویّے پر غور کرنا شروع کر دیا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ خوشگوار تبدیلی بھی اردو ادب کے لئے باعثِ قدر ہے کہ بیگار کی بے کار مضمون نگاری کم ہوتی جا رہی ہے۔ جو معاوضہ دیتا ہے وہ کام کے مضمون چاہتا ہے اور جو معاوضہ لیتا ہے وہ اپنے آپ کو بیگاری نہیں سمجھتا اس لئے محنت اور دماغ سوزی سے مضمون لکھتا ہے۔ داد و ستد کا یہ مفید سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو پست نگاری یک قلم مٹ جائیگی۔ اور مضمون کی خامی پستی اور غیر دلچسپی پر پردہ ڈالنے کے لئے مضمون نگار کی شان میں قصیدے لکھنے کی ضرورت نہیں پڑا کرے گی۔

"دنیائے ادب" دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے بلند مضامین سے بہترین حصوں کا ترجمہ کر کے ادبی دنیا میں ماہ بماہ اس لئے شائع کیا جا رہا ہے تاکہ اردو خواں پبلک دنیا بھر کے لٹریچر کی رفتار سے آگاہ رہے اور دنیا کے

آئینۂ عالم

سائنس کی حیرت انگیز ترقیاں

دنیا ئے سائنس میں ہر روز کوئی نہ کوئی جدید انکشاف ہو رہا ہے حال ہی میں دو جرمن ماہرین کیمیا لکڑی کے برادے سے شکر حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

ایک فرانسیسی سائنس دان کوئلوں کو یاقوت کی شکل میں تبدیل کر رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ وہ دن نہایت تیزی سے قریب آ رہا ہے۔ جب ہمارے لئے قدرتی پیداوار پر انحصار ضروری نہ ہوگا۔ اور سائنس کے ذریعہ ہماری تمام ضروریات مہیا ہو سکینگی

پچھلے دنوں ایک جرمن ماہر کیمیا نے گیارہ پونڈ ایک کیمیاوی مرکب کو ۲۴ گھنٹے میں گیارہ پونڈ کوئلے کی شکل میں تبدیل کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زمانہ حاضر کا سائنس داں وہ چیز گھنٹوں میں تیار کر رہا ہے جو قدرت صدیوں میں پیدا کرتی ہے۔

کوئلے میں جو اجزا شامل ہیں وہ یہ ہیں۔ پیٹرول۔ صابون۔ ربڑ۔ تیل۔ امونیا اور الکحل۔ یہ اجزا سبزیوں میں بھی موجود ہیں اور سائنس دانوں نے سبزیوں سے کوئلہ تیار کرنے میں پوری کامیابی حاصل کر لی ہے۔

گھونگوں کو مصنوعی ریشم بنانے کا راز پہلے ہی معلوم کیا جا چکا ہے اور اب ان سے بہت بڑی مقدار میں ریشم تیار کیا جا رہا ہے۔

جراثیم کی کثرت

پروفیسر رئشیبر نے اندازہ کیا ہے کہ پیرس کی فضا میں ایک مکعب میٹر میں ۶۰۰۰ خوردبینی جراثیم پائے جاتے ہیں اور کوئی شخص سانس لینے کے دوران میں اپنے پھیپھڑے میں۔ میٹر ہوا داخل کرتا ہے تو ہر سانس میں مختلف انواع کے ۲۰۰۰ جراثیم اس کے جسم میں داخل ہو جاتے ہیں۔

اس اندازے کی بنا پر پروفیسر موصوف اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بیماریوں سے محفوظ رہنے کے لئے جراثیم کو فنا کر دینا انسان کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ ان کی ضرر رسانی سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اپنے جسم کو طاقتور بنانے کی طرف توجہ کی جائے تاکہ جسم کسی وقت ان کی مدافعت میں ناکام نہ رہے۔

حکومت ایران کی تعلیمی سرگرمیاں

حکومت ایران نے اہل ملک کی تعلیم کے لئے جو عظیم الشان کام انجام دیا ہے اس کی تفصیل وہاں کے ڈائرکٹر تعلیمات مرزا عیسٰے خاں نے تعلیم بالغان کی کانفرنس منعقدہ کیمبرج میں یوں بیان فرمائی ہے کہ "سابقہ دیہاتی مدرسے اور مذہبی درسگاہیں بدستور قائم ہیں ان کے علاوہ لڑکوں اور لڑکیوں کے ۱۱۳۳ اسکول مغربی درسگاہوں کے اصول پر جاری کئے گئے ہیں۔ ایران سے ہر سال تقریباً دو سو طلبہ یورپین یونیورسٹیوں میں داخل ہو رہے ہیں جن میں اکثر طلبہ کو سرکاری وظائف دئے جاتے ہیں۔

ترقی یافتہ مغربی نظام تعلیم کو رائج کرنے کے لئے حکومت ایران نے شبینہ مدارس اور نائٹ اسکولوں کا بھی انتظام کیا ہے۔ جن میں ہزاروں بالغ اشخاص کو مختلف علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔

لوزان کا نیا کتبخانہ

لوزان کی مشہور کیتھولک یونیورسٹی نے اپنے نئے کتبخانے کی تنظیم و تکمیل کے لئے مختلف ممالک سے امداد طلب کی تھی اس کے جواب میں یورپ اور امریکہ نے اسے لاکھوں کتابیں عطا کی ہیں اور اب یہ کتبخانہ دنیا کا ایک بہترین کتبخانہ سمجھا جا رہا ہے۔ اس علمی ذخیرے میں جرمنی نے ۳ لاکھ کتابیں مہیا کی ہیں جن میں پندرھویں اور سولھویں صدی کی لکھی ہوئی ۲۰۰ قلمی کتابیں بھی شامل ہیں۔ انگلستان کی عطا کردہ کتابوں کی تعداد ۵۵ ہزار اور فرانس سے آئی ہوئی کتابوں کی تعداد ۲۲ ہزار ہے۔ ان کے علاوہ جاپان نے ۲۰ ہزار اور دوسری سلطنتوں نے بھی ہزاروں کتابیں اس کتبخانے کو بھیجی ہیں۔

یہ مغرب کی علم دوستی کا ادنیٰ کارنامہ اور اہل مغرب کی ثقافت (کلچر)

کا معمولی سا مظہر ہے۔ اس حیرت انگیز اعداد و شمار کے مقابلے میں مشرق پر نظر کیجاتی ہے تو ہر طرف سناٹا دکھائی پڑتا ہے۔

گونگوں کے معالجہ کا طریقہ

امریکی فوج کے ایک افسر کا ہشت سالہ لڑکا پیدائشی گونگا اور بہرا تھا۔ اس کے علاج میں تمام امکانی کوششیں صرف کردیگئیں لیکن بڑے بڑے نامور ڈاکٹر اس کے معالجے میں ناکام رہے۔

اخیر میں ایک ماہر طبیب نے گونگے لڑکے کی قوت شعوری کو متحرک کرکے اس کا علاج کرنے کی تدبیر سوچی چنانچہ اسے ایک طیارہ میں سوار کرکے اتنی بلندی پر لیگئے کہ اس پر بے انتہا خوف و دہشت کی کیفیت طاری ہوگئی۔ طیارہ فضاء آسمانی میں دیر تک پرواز کرنے کے بعد جیسے ہی زمین پر اترا۔ لڑکے نے اپنے والد کو دیکھا اور اسی اضطرابی حالت میں ان سے بے اختیار ایک مظلومانہ انداز کے ساتھ "بابا" کا لفظ ادا کیا۔ اس لفظ کے ادا ہونے سے اس کی زبان اور قوت گویائی کے درمیان جو پردہ حائل تھا وہ ہٹ گیا اور رفتہ رفتہ اسے کامل قوت گویائی حاصل ہوگئی۔

جدید طرز کی آبادیاں

موٹروں کا استعمال دنیا میں روز بروز ترقی پذیر ہے لیکن راستوں پر موٹروں کی اس کثرت آمد و رفت نے پیدل چلنے والوں کے لئے بیشمار خطرات پیدا کردئیے ہیں۔ ان خطرات کو دور کرنے کے لئے نئے طرز کے شہر آباد کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ چنانچہ اس کی مثال نیوجرسی میں شہر "رڈبارن ہے" جسے موٹروں کا شہر بھی کہتے ہیں۔ اسے اس طریقہ پر آباد کیا گیا ہے کہ سڑکوں سے گذرنے کی تمام مشکلات اور خطرات کا ازالہ ہوگیا ہے۔ اس شہر میں ایک بچے کے لئے بالکل آسان ہے کہ وہ سلامتی کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ انسان کسی شارع کو قطع کئے بغیر جہاں چاہے پہنچ سکتا ہے۔ کیونکہ رڈبارن کے ہر مکان میں دو دروازے ہوتے ہیں۔ ایک موٹروں کی سڑک کی طرف اور دوسرا اس باغ کی طرف جو مکان سے ملحق تمام شہر میں بلا انقطاع پھیلا ہوا ہے۔ اور ایک شخص ان باغوں میں سے ہوتا (پشت پر) ہوا۔ شہر کے ہر مقام اور حصہ میں پہنچ سکتا ہے۔ ان باغوں میں صرف پیدل چلنے والے ہی چل سکتے ہیں۔

یورپ میں تعلیم کے جدید وسائل

موجودہ دور ترقی میں جبکہ تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کو بہت زیادہ محسوس کیا جارہا ہے۔ آئے دن تعلیم کے ایسے جدید طریقے رائج ہوتے رہتے ہیں۔ جن سے طلبہ خود بخود تحصیل علم کی طرف راغب ہوں۔ اور تعلیم کو ایک دلچسپ مشغلہ سمجھکر ذوق و شوق کے ساتھ اس کی طرف مائل ہوں۔

چنانچہ یورپ میں اور خصوصاً جرمنی میں آجکل اس قسم کے جدید مدارس قائم کئے جارہے ہیں جن سے طلبہ اور طالبات کو خاص انس اور محبت ہوتی ہے۔ اور وہ گھروں میں رہنے کی بجائے ان مدارس میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر برلن کے اس زنانہ کالج کو لے لیجئے جو ابھی حال کوننگ اسٹریٹ میں تیار ہوا ہے۔ اس کالج میں طالبات کے لئے معامل کیمیا و طبیعیہ صنعت و حرفت اور ریاضت کے الگ الگ شعبے ہیں۔ نہانے اور تیرنے کے لئے حوض ہے۔ دوڑنے کے لئے میدان ہے۔ دار المطالعہ ہے۔ رقص اور موسیقی کی تعلیم کا نہایت معقول انتظام ہے۔ غرض اس قسم کے بہت سے دلچسپی کے مشاغل ہیں جنکی وجہ سے لڑکیاں یہ سمجھتی ہیں کہ وہ گویا اپنے گھروں میں ہیں۔ اور اس بہانہ سے نہایت آسانی کے ساتھ تعلیم حاصل کرلیتی ہیں۔

اس کالج کی عمارت پر ۱۸ لاکھ مارک صرف ہوئے ہیں۔

فن تعمیر اپنے معراج کمال پر

امریکہ میں ایک کمپنی اسی منزلوں کا مکان بنائے گی جو سوا نو سو فٹ بلند ہوگا۔ اسی طرح ایک اور کمپنی نے اعلان کیا ہے کہ وہ ایک سو پانچ منزل کا مکان بنائے گی۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز اعلان اس کمپنی کا ہے جس نے ڈیڑھ سو منزل کا مکان تعمیر کرنے کا اعلان کیا ہے۔ جس کی بلندی سولہ سو فٹ ہوگی۔ اس عجوبۂ روزگار مکان کی بالائی چھت کا رقبہ ایک ایکڑ ہوگا۔ اور یہ رقبہ ہوائی جہازوں کی فرودگاہ کے طور پر بھی استعمال کیا جائے گا۔

تاجور

نینوا

نینوا اسیریا قدیم کا مشہور و معروف شہر تھا جو اپنی وسعت اور عظمت کے لئے اسوقت سے لیکر آج تک ضرب المثل ہے۔ یہ شہر دجلے کے مشرقی ساحل پر واقع تھا۔

اسیریا کا ہر ایک باشندہ ایک خونخوار و خوفناک سپاہی تھا۔ اس کی فوجوں کی مہابت و عظمت کی یہ کیفیت تھی کہ دور دور کے ملکوں کے بادشاہ اپنے محلوں میں بیٹھے ہوئے لرزتے تھے۔

اسیریا کی تقریباً تمام عمارتیں ان جنگی قیدیوں کی تعمیر کردہ ہیں جو مفتوح ممالک میں سے غلام بنا کر لائے جاتے تھے ان کی حالت قابل رحم تھی۔ گرمی ہو یا سردی وہ ہر وقت کام میں مصروف رہتے تھے۔ نگہبانوں کے خوفناک تازیانے ان کے بدن کی کھال ادھیڑ دیتے تھے۔ اور آخر کار موت ان کو اس زندگی کی کاہشوں سے نجات دیتی تھی۔

نینوا کے جن مندروں اور محلوں کی تصویر شائع کی جا رہی ہے۔ وہ بھی اسی طرح ان مظلوموں کی محنت کا نتیجہ ہیں۔

بائیں طرف جو بلند عمارت نظر آرہی ہے وہ اشور بانی پال کا مقبرہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی مندر ہے۔ اور مندر سے ملحقہ اشور بانی پال کا عالیشان محل ہے۔ برٹش میوزیم میں جو چیزیں پہنچی ہیں وہ اس محل کے کھنڈروں میں سے دستیاب ہوئیں تھیں۔ ایڈیٹر۔

نینوا! اے صنعت انساں کی معراجِ کمال
تیری رعنائی تری رسوائی کا ساماں نہ ہو

جو عمارت تیری نظروں میں ہے پتھر کی چٹان
اس کی بنیادوں میں اک سیلاب سالِ زاں نہ ہو

جوئباروں میں نہ ہو پوشیدہ تیرے سیلِ موت
سبزہ زاروں میں ترے دیوِ جنوں رقصاں نہ ہو

پھول جنکو تو سمجھتا ہے نہ ہوں کانٹے کہیں
جسکو تو یاقوت کہتا ہے کہیں مرجاں نہ ہو

تیرے ساغر میں نہ ہو آمیزشِ زہرابِ موت
شعلہ ہائے حسن میں برقِ فنا پنہاں نہ ہو

تیرے باغوں میں رواں ہے ایک جوئے نرم رُو
وہ کہیں تیرے لئے سرمایۂ طوفاں نہ ہو

فکرِ انساں نے بنائی تھی یہ منزل گاہِ عیش
میٹ دینا جس کا فطرت کیلئے آساں نہ ہو

گونجتا ہے رُوح کے کانوں میں پیغامِ سروش
غرّہ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو

اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایکدن

عابد

ہندوستان کے باغ

ہندوستان کے باغات کے تین بنیادی اصول ہیں۔ پہلے تو یہ کہ باغ چاردیواری میں محصور ہو۔ دوسرے یہ کہ رنگ و بو کے امتزاج لطیف سے آراستہ ہو۔ تیسرے یہ کہ باغ کو پانی دینے کا انتظام نہروں کے ذریعے کیا جائے جو باغ میں رواں ہوں۔ باغ کو دیکھ کر ناظر کی طبیعت فوراً اس صنعتی تضاد سے متاثر ہوتی ہے جو باہر کی فضا اور باغ کی فضا میں پایا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد تو دیکھنے والا اس فردوس حسن و رنگ میں گویا کھو سا جاتا ہے جو چاند کی دھیمی دھیمی روشنی پیدا کرتی ہے۔

ہندوستان کا فن باغبانی باقی تمام فنون کی طرح ملک کی تاریخ سے ایک گہرا تعلق رکھتا ہے۔ ملک کی صنعتی روایات۔ اور مذہبی معتقدات نے اس فن کے اصولوں پر اپنے گہرے نقش چھوڑے ہیں۔

اکثر لوگوں نے عہد مغلیہ کے ویران باغوں کی رعنائی دیکھی ہے۔ وہ رعنائی جو شکستہ و ریختہ عمارات میں سے بھی جھلک اٹھتی ہے۔ بہت سے آدمی اس وقار و ہیبت سے متاثر ہوئے ہیں جو شاہان مغلیہ کی تعمیر کردہ عمارتوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ وقار و ہیبت جو ایام ماضی اور امتداد وقت کی تاخت و تاراج کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ لیکن یہ نکتہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہو کہ ان تمام عمارات و باغات میں باہم ایک شیریں تناسب پایا جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ کلی حیثیت سے یہ باغ اور عمارتیں ایک عضو و ذہنی کی حیثیت رکھتی تھیں بلکہ باغ کا ایک پھول۔ اور پتھر کا ہر ایک نقش توازن مجموعی کا آئینہ دار تھا۔ اور یہ توازن و تناسب ہندوستان کے رسم و رواج اور ہندوستانیوں کی زندگی کا ایک کامل مظہر تھا۔

مشرقی صنعت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ صناع کے ان معانی کو زیر نظر رکھا جائے جو اس کی صنعت کے خطوط و نقوش کے بین السطور میں پائے جاتے ہیں۔ مغل بادشاہ اور ہندو راجہ صنعت و حرفت میں دلچسپی لیتے تھے۔ حسن و جمال کی پرستش کرتے تھے اس لئے نہیں کہ حسن محض ان کے لئے کوئی دلکش شے تھی۔ بلکہ اس لئے کہ وہ حسین و جمیل نقوش و الوان کے ذریعے کئی مذہبی احساسات و جذبات کے حسن کو ادا کرنا چاہتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو موجودہ مغربی صنعت کے ماہر ہیں۔ ان پر اکثر مشرقی صنعت کے رموز و اسرار منکشف نہیں ہوتے۔ آجکل کا مغربی آرٹ صناع کی شخصیت کا اظہار ہے۔ اور بس۔ اور اسی ناسمجھی کا نتیجہ ہے کہ اکثر مشرقی علوم و فنون ناقدری کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔

"آرٹ محض آرٹ کی خاطر" مشرقی صناعوں کے لئے ایک مہمل فقرہ ہے۔ پچھلے دنوں چین اور جاپان کے آرٹ کے متعلق اس فقرے کا بہت استعمال ہوا تھا۔ اور یہ بات صاف ظاہر کر رہی ہے کہ اہل مغرب نے پہلے پہل چین اور جاپان کے آرٹ کو محض آرائش تصور کیا ہے۔ اور وہ ان کے لطیف و نازک خیال سے ناآشنا رہے ہیں۔ چین کے آرٹ کی ظاہری پیچیدگی اور نقوش والوان کی دلربائی معانی کی پاکیزگی کو چھپا لیتی ہے۔ اور تخلیق حسن کے اسباب نقاد کی نظر سے پوشیدہ رہ جاتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ ابتدا ہی سے پھولوں کے والہ و شیدا رہے ہیں۔ پرانے سنسکرت اور بودھی ادب میں کئی حوالے ایسے ملتے ہیں جن میں پھولوں اور باغوں کی تعریف کی گئی ہے۔ بدھ کی خانقاہوں کے اردگرد جو اشجار نصب کئے جاتے تھے۔ شاید ہندوستان کے فن باغبانی کی ابجد کہلائینگے۔ اور یہی اشجار ہیں جو چین اور جاپان میں حسن و جمال کی ایک ناقابل بیان صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ تاہم اس پرانی شہادت کے باوجود ہم کہہ سکتے ہیں کہ دراصل فن باغبانی کا شوق ہندوستان میں وسط ایشیا اور ایران سے آیا ہے۔ بتدریج مسلمان فاتحین کے زیر سایہ پرورش پاتا رہا ہے۔ رفتہ رفتہ اس فن میں خود ہندوستانیوں نے بہت سی دل آویز ترمیمیں کیں تاآنکہ یہ فن خود ان کی ایجاد کہلانے لگا۔ ہندوستانی فن باغبانی کا کمال کشمیر کے ان باغات میں پایا جاتا ہے جو جہانگیر اور نور جہاں کے ذوق سلیم کا نتیجہ ہیں۔

افغان اور پٹھان مہیب و عظیم عمارات بنانے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اور اب تک ان عمارات کے آثار ان کی عظمت و مہابت کے گواہ ہیں۔ ہندوستان کی عظیم ترین عمارات اسی عہد سے تعلق رکھتی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ملحقہ باغات وقت کے ہاتھوں بالکل فنا ہو چکے ہیں۔

یہ عہد فتنہ و آشوب کا عہد تھا۔ بادشاہوں کے آفتاب اقبال طلوع ہوتے تھے۔ اور غروب ہو جاتے تھے۔ راجاؤں کی قسمت کے ستارے ایک لمحے کے لئے افق نشاط و عشرت پر چمکتے تھے اور پھر گہری تاریکی میں غائب ہو جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اندنوں

فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

کی مطابقت میں آرٹ کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جا سکی۔ بادشاہ تو یوں مصروف تھے۔ رعایا بھی لڑائی کے تواتر و تسلسل کے باعث خوشحال نہ تھی۔ فساد کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اور رنج و غم کی فوجیں برابر چلی آتی تھیں۔ ان سے بھی توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس پر آشوب عہد میں باغبانی کی طرف توجہ کر سکیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود فیروز شاہ تغلق کا زمانہ (۱۳۵۱ - ۱۳۸۸) نسبتاً با امن ثابت ہوا۔ اور عام روایت مشہور ہے۔ کہ اس نے دہلی بلکہ فیض آباد (کیونکہ ان دنوں دہلی اس نام سے مشہور تھی) کے گرد سو باغ لگوائے تھے۔ ان تمام باغات میں سے آج ایک کا نشان بھی نہیں ملتا۔ وہ تمام خوبصورت اور دل افروز بارہ دریاں حسین و جمیل حوض صاف اور شفاف پانی کی نہریں ان کھنڈروں میں غائب ہو چکی ہیں جو پرانی دہلی کی یادگار ہیں۔ اس عہد کے دو سال بعد ۱۵۶۲ میں بابر نے شمالی ہندوستان کو مغلوب کیا۔ اور آگرہ کو مستقر خلافت قرار دیکر جمنا کے کنارے رام باغ کی تعمیر شروع کی۔ میرا خیال ہے کہ یہ عہد مغلیہ کا قدیم ترین باغ ہے۔

اس عہد میں ایران کا فن باغبانی اپنے عروج پر تھا۔ ایرانیوں کے باغوں میں اکثر پانی دینے کے مصنوعی ذرائع موجود ہوتے تھے۔ ایرانی شعرا کے اشعار گلہائے معطر و دلکش کے ترانوں سے لبریز ہیں اور اہل مغرب بھی ان اشعار سے مختلف تراجم و اقتباسات کے ذریعے آشنا ہو چکے ہیں۔

ایران کو فطرت نے اپنے بے انتہا خزائن سے مالا مال کیا ہے۔ اور وہاں کی مینو سواد زمین کے دامن پر اسقدر پھول کھلتے ہیں کہ شاید دنیا کے کسی ملک میں نہ کھلتے ہونگے۔ سعدی کی کتاب "گلستاں" زبان حال سے گلاب کے پھولوں کی کثرت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

وہ تمہید میں رقمطراز ہیں۔ کہ کتاب کی ترتیب کے متعلق غور و خوض کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس لطیف باغ کو اور اس دلکش خیاباں کو بہشت بریں کی طرح آٹھ حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ تاکہ پڑھنے والوں کو مطالعے میں تکان نہ محسوس ہو۔

بہشت کے تتبع میں عام طور پر باغات کے آٹھ ہی حصے بنائے جاتے تھے۔ حافظ کا کلام بھی شیراز کے گل و گلزار کے وجد آفریں اثرات سے پُر ہے۔ عمر خیام کی زندگی میں تو پھول اور خوشبو کی لطافت و نزہت ہمیشہ ایک عنصر غالب کی طرح رہی ہے۔ تاآنکہ انہوں نے اپنی قبر کے متعلق پیشگوئی کرتے ہوئے اپنے شاگرد رشید نظامی عروضی سمرقندی سے کہا تھا "کہ میری قبر پر سال میں دو بار باد نسیم و شمال امرود اور آلو کے پھول برسایا کریگی" (چہار مقالہ۔ گب میموریل سیریز)

ایران کے خلد منظر باغ اور ان باغوں کے لطیف و رعنا پھول مشہور عام ہیں۔ ان باغوں اور پھولوں کے متعلق جو نکتہ پیرائیاں ہوئی ہیں ان سے بھی عام لوگ واقف ہیں۔ مگر کون یہ کہہ سکتا ہے کہ میں اس فطرتی ذوق رنگ و بو کو پہچانتا ہوں۔ جس نے اشعار کو گلاب و ریحاں کی شگفتگی سے مزین کیا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ میں نے اس محبت کا راز پا لیا ہے جو ایرانیوں کو ہنستے ہوئے چشموں اور کھلتے ہوئے پھولوں سے ہے اور جس نے حافظ کی زبان سے یہ شعر کہلوا دیا تھا۔

...... کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را

دنیا میں کوئی ایسا مقام نہیں جو ایران کی بہار کا مقابلہ کر سکے۔ کسی جگہ آب و ہوا کے ایسے دلکش تضاد و اختلاف نہیں جیسے ایران میں موجود ہیں۔ گرمی کی تابش اور سردی کی منجمد افسردگی کائنات کی حسین و جمیل اشیا کو مردہ کر دیتی ہے مگر بہار کے شعلے پھر دنیا کے ذرّے ذرّے میں ایک نئی زندگی پھونک دیتے ہیں۔ بہار کے ان دو تین ہفتوں میں دنیا بھر کی نکہتیں اور رعنائیاں سما جاتی ہیں۔ بہار کی اس روا روی کی طرف نظیری نے کس حسرتناک انداز میں اشارہ کیا ہے۔

روزے سہ چار ماندہ در طلبے سہ چار خوش

جب ایران میں برف پگھلتی ہے تو اس کی دودھیا سفیدی کے مقابلے میں کچے پھلوں کی کلیاں اسقدر حسین معلوم ہوتی ہیں کہ یہ احساس حسن احاطہ تحریر میں نہیں آسکتا۔ سفید سفید غنچے اور سفید سفید برف سرو کے گہرے سبز درختوں کے سامنے اختلاف و تضاد کے ایک حیرت افروز اثر سے دل کو مسحور کر لیتی ہے۔ سرو کے درختوں کے نیچے گلہائے رنگا رنگ ایک فرش رنگ و بو بچھا دیتے ہیں۔ آہ غالب۔

در بزم رنگ و بو نمطے دیگر افگنم

ایک مختصر سے وقفے میں حسن رنگ و بو کا یہ اجتماع ایرانی طبیعت کو بہت متاثر کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی تمام صنعتوں میں پھولوں کی محبت جلوہ گر نظر آتی ہے۔

قرآن مجید کی تعلیمات کا ایرانی آرٹ پر بھی اثر پڑا ہے۔ کیونکہ مذہبی صناع لازماً صرف بیجان چیزوں کی تصویر کھینچتے تھے۔ اسی بات کا نتیجہ ہے کہ پھولوں کے حسین حسین مرقعے ایران میں ملتے ہیں اور کسی سرزمین میں نہیں پائے جاتے۔

مغربی باغوں کی "روح" "یاجان" جو کچھ بھی کہئے پھولوں اور غنچوں کے رنگ و نور میں جلوہ گر ہوتی ہے مگر مشرقی باغ بہتے ہوئے صاف شفاف پانی سے زندہ ہے۔ جس کے بغیر حسن و جمال کو دوام بخشنا ممکن ہی نہیں۔ پانی کے تصور نے ان باغوں کی ترتیب و تنظیم کو متاثر کیا ہے۔ اور اسی ایک خصوصیت کی بنا پر مشرق کے باغ ان باغوں سے ممیز کئے جا سکتے ہیں۔ جو بہت بڑی حد تک مشرقی باغات سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔

مغل بادشاہوں کے باغ۔ وسط ایشیا اور ایران کے پہلے باغوں کے تتبع میں مربع یا مستطیل ہوتے ہیں۔ اور کئی مساوی حصوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ باغ کے اردگرد ایک بلند چار دیواری تعمیر کی جاتی ہے۔ باغ کے درختوں میں سے پانی کبھی آبشار کی شکل میں اور کبھی چادر کی شکل میں گزر کر ایک وسیع حوض میں جا گرتا ہے۔ سب سے بڑی اور اہم بارہ دری عام طور پر باغ کے وسط میں تعمیر کیجاتی ہے۔ یا ایسی جگہ جہاں آبشار کا لطف زیادہ ہو اور پانی خوب سرعت و شدت سے گزرتا ہو۔ ان بارہ دریوں کی تعمیر سے غالباً یہ مقصد تھا کہ گرمیوں کے دنوں میں شہزادے اور شہزادیاں پانی کے خوشگوار شور کی لوریوں میں محو خواب ہو جائیں۔

درخت اس طرح نصب کئے جاتے تھے کہ من حیث المجموع باغ کے نقشے کو ظاہر کریں۔ مربع حصے جن کے اردگرد نہریں بہتی تھیں۔ ثمردار درختوں سے لبریز ہوتے تھے۔ بابر نے کابل کے گرد و نواح میں کئی باغ نصب کرائے تھے۔ جن میں سے وہ چند کا ذکر تزک بابری میں بھی کرتا ہے۔ ان میں سے "باغ وفا" خصوصیت سے متعارف ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"ادنیاپور کے قلعے کے سامنے جنوبی طرف۔ میں نے ۱۵۰۸ میں چار باغ کی بنیاد رکھی جس سال میں نے بہار خاں کو شکست دیکر لاہور فتح کیا ہے۔ اسی سال اس باغ کے لئے میں نے بہت سے پودے منگوائے۔ جو وقت گزرنے پر خود سرسبز ہو گئے۔ اس سے ایک سال پہلے میں اس باغ میں گنے کے پودے نصب کروا چکا تھا۔ کچھ بیج میں نے بدخشاں اور بخارا بھیج دئے۔ یہ باغ ایک بلند جگہ پر واقع ہے اور نہروں کے ذریعے سیراب ہوتا ہے۔ سردیوں کے دنوں میں بھی یہاں کی آب و ہوا معتدل اور خوشگوار رہتی ہے۔"

بابر نے اپنی تزک ترکی زبان میں قلمبند کی تھی۔ اس کے پوتے اکبر نے اس کا فارسی میں ترجمہ کروایا۔ اور اس عہد کے مشاہیر مصوروں نے اپنے کمال سے متن کو مزین کیا۔

باغ کی تعمیر کے پندرہ سال بعد بابر پھر اس لطیف گلزار کی بہار دیکھنے کے لئے آیا۔ کہتا ہے:-

"باغ اپنے نشو و نما کے نصف النہار پر تھا۔ اور ہجوم سبزہ و گل سے نگاہ شاداب ہوئی جاتی تھی۔ انار کے درختوں کا رنگ زرد تھا۔ اور پکے ہوئے سرخ سرخ انار بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ سنگترے کے درختوں کی سبزی دلفریب تھی اور پھل تو اسقدر تھے کہ دیکھکر تعجب ہوتا تھا۔ انار میٹھے تھے مگر میرے وطن کے اناروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

حقیقت یہ ہے کہ ان باغوں کے نصب کرائے جانے کا مقصد یہ تھا کہ ملک کی وسعت کے باعث بادشاہ کو جو سفر اختیار کرنے پڑتے تھے ان کے دوران میں سکون و اطمینان کا سامان حاصل رہے۔

بابر کے عہد حکومت سے ہندوستان میں فن باغبانی کا صحیح معنوں میں آغاز ہوتا ہے۔ تزک شاہد ہے کہ بابر کو باغ اسقدر پیارے تھے کہ وہ معرکہ آرائی کے میان بھی "باغ وفا" کی بہار دیکھنے کے لئے کابل چلا جایا کرتا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ بابر کا ذوق مشاہدہ اسقدر ارتقا یافتہ تھا کہ وہ ہر نئے پھول اور جانور کو دلچسپی سے دیکھتا تھا اور تزک میں اس کا ذکر کرتا تھا۔ افغانستان کے پہاڑی علاقوں میں سے گزرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"تمام زمین لالہ کے پھولوں سے پٹی پڑی ہے۔ ایکبار میں نے لالہ کی قسمیں شمار کروائیں تو ۳۴ سے زیادہ نکلیں۔ ایک قسم کا لالہ خوشبو کے اعتبار سے گلاب سے ملتا جلتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کا نام "لالہ گل بوئے" رکھا۔ یہ قسم صرف "میدان شیخ" میں پائی جاتی ہے۔ اس گرد و نواح میں لالہ صدبرگ پایا جاتا ہے۔ جو اور کسی جگہ نہیں ملتا۔"

جب بابر نے شمالی ہندوستان کو مسخر کر لیا تو پہلے پہل اسے آگرے میں "چار باغ" بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ مگر اس جگہ کی ہموار زمین واقعتہً اچھے باغ کے لئے موزوں نہ تھی۔

اس عہد کے اہل ہنود میں سے صنعت و حرفت کا ذوق تعمیری نابود ہو چکا تھا۔ اور وہ مہارت جو بدھوں کی خانقاہوں سے نمایاں ہے بالکل فنا ہو چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے تالابوں کے اردگرد درخت نصب کرائے تھے۔ مگر ان کے باغوں میں پانی کی نایابی سے ہمیشہ خزاں کا عمل رہا۔ بابر کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہی پانی کا مسئلہ تھا۔ کیونکہ افغانستان اور ایران کے باغ (جن کا ذکر کیا جا چکا ہے) اس اعتبار سے بہت کامیاب تھے۔ وہ لکھتا ہے۔

"میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی (صنعت) میں سب سے بڑا عیب پانی کا نہ ہونا ہے۔ جس جگہ بھی میں گیا ہوں مجھے خود مصنوعی ذرائع سے کام لیکر پانی کا انتظام کرنا پڑا ہے۔ آگرہ پہنچ کر میں نے جمنا کو اس نظر سے دیکھا کہ آیا کسی باغ کی تعمیر میں اس جگہ کا پانی ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ میرا مقصد یہ بھی تھا کہ یہ دیکھوں کہ باغ کے نصب کرنے کے لئے کونسی جگہ مناسب ہوگی مگر آگرے کا منظر اسقدر ناخوشگوار اور مکروہ تھا کہ میری طبیعت افسردہ ہو گئی۔ حسن کی کمی اور جگہ کی بدصورتی کے باعث میں نے چار باغ تعمیر کرانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ مگر بعد ازاں مجبوراً اس کام کا بیڑا اٹھانا پڑا۔

پہلے تو میں نے اس کنوئیں کے کھودنے کا حکم دیا جس سے حمام کو پانی دیا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد باغ کی تعمیر کا کام باقاعدہ شروع کر دیا گیا۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ مغل بادشاہ جگہ کے انتخاب کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ موجودہ عہد کے معماروں اور صناعوں کے خلاف بابر خوب سمجھتا تھا کہ اچھی جگہ اور اچھے موقع کے بغیر کوئی اچھا باغ مکمل نہیں ہو سکتا۔

شمس الہدیٰ

اشعار

جفائے دوست بنی رہنمائے منزل دوست　　وہ کھو رہے ہیں مجھے انکو پا رہا ہوں میں

ہے میری خاک کے ذروں میں کیوں نمود حیات　　کہیں انہیں تو نہیں یاد آ رہا ہوں میں

مرا افسانۂ غم دل نے بھی کبھی نہ سنا　　قتیل شیوہ دردآشنا رہا ہوں میں

محبت آہ محبت کی زندگی مت پوچھ　　بڑی مصیبتوں میں مبتلا رہا ہوں میں

متاع زیست ہوئی نذر بے نیازئ دوست　　نیاز وعدۂ صبر آزما رہا ہوں میں

ہے کائنات کا ہر ذرہ ہم نوا میرا
کچھ ایسا محفل ہستی پہ چھا رہا ہوں میں

تاجور

آدھ گھنٹہ

افراد

جمشید ۔	بمبئی کا ایک مشہور و معروف تاجر ۔
فیروزہ ۔	جمشید کی بیوی ۔
سہراب ۔	ایک کامیاب ڈاکٹر ۔
کیکاؤس ۔	۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
خسرو ۔	جمشید کا دوست ۔
شیریں ۔	خسرو کی بیوی ۔

پردہ اٹھتا ہے

جمشید اور فیروزہ اپنے عظیم الشان مکان میں موجود ہیں ۔ مگر عام لوگوں کو اس وقت ان سے ملنے کی اجازت نہیں ہے ۔ شام کے آٹھ بجے ہیں ۔ گذشتہ نصف گھنٹے سے ان میں تو تو میں میں ہو رہی ہے ۔ اور ہم ناظرین کرام کو یقین دلاتے ہیں کہ اس وقت انہوں نے تہذیب و تمدن کے جامہ ہائے مستعار اتار دیئے ہیں ۔ ان دونوں کو آئندہ نصف گھنٹے میں بہت کچھ کرنا ہے ۔ جس کے لئے ہم ناظرین کو مزید زحمت انتظار دینا نہیں چاہتے ۔

فیروزہ ۔ (ایک گال سہلاتے ہوئے) جمشید مجھے مارو ۔ نہیں تم ! کیا تم بھول گئے ہو کہ میں صرف ایک عورت ہوں ۔ اور ایسی جگہ ہوں کہ اپنی چیخ پکار سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی ۔

جمشید ۔ عورت ! کون کہتا ہے تم عورت ہو ! عورت جیسی جنس لطیف کا نام لے کر تم تمام جنس کی توہین کر رہی ہو ۔ تمہاری زبان پر عورت کا لفظ آ کر آلودہ گناہ ہو جاتا ہے ۔

فیروزہ کو دھکا دیکر گرا دیتا ہے ۔

فیروزہ ۔ (جو زخموں پر مرچیں چھڑکنے میں کمال رکھتی ہے) کتنی طاقت ہے تم میں جمشید ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے تم سے عشق ہے ! بھلا جمشید یہ تو بتاؤ کہ تم مجھے کیوں پیار کرتے ہو ؟ ۔

جمشید غصے اور حقارت سے پیچ و تاب کھا رہا ہے ۔

پیارے شوہر ! تم نے میری ساڑھی میں شکن ڈال دی ہے کتنی بری بات ہے ! میری ساڑھی کا رنگ سبز ہے ! شاید تمہیں سبز رنگ مرغوب ہے ؟ کیا تم پسند کرتے ہو کہ جب مجھے مار کر دو تو میں سبز رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے ہوں ؟

جمشید ۔ (مٹھیاں بھینچے ہوئے) اپنی زبان سنبھالو ۔ میں ڈرتا ہوں کہ طنز کے تیر تمہارے ہی نازک دل کو زخمی نہ کر دیں ! ۔

فیروزہ ۔ (اسی بے پناہ طنز کے انداز میں ۔ نرمی اور لطافت انداز سے ۔) جمشید تم نے مجھے کتنے روپے کے عوض خریدا تھا ؟

جمشید ۔ بیس ہزار روپے کے عوض ۔ تمہارا غریب باپ اور ذلیل باپ (اس شیطان کو خدا غارت کرے) اس سے کم پر راضی نہ ہوتا تھا ۔ وہ جانتا تھا حسن کمیاب ہے ۔

فیروزہ ۔ اُفوہ ۔ بیس ہزار روپیہ ! مجھے اپنے حسن پر غرور ہو جائیگا ۔

جمشید ۔ اتنے روپے میں تو مجھ سے زیادہ حسین عورتیں مل سکتی تھیں ۔

جمشید ۔ ہاں لیکن میں چاہتا تھا کہ کسی ایسے گھرانے میں شادی کروں جو شریف کہلاتا ہو ۔ پھر تمہاری آنکھوں میں نفرت اور حقارت کا جو دریا موجزن تھا ۔ اس کو دیکھ دیکھ کر میرا دل بے اختیار

تمہاری طرف کھنچا جاتا تھا۔ میں اس بغاوت کو فرو کرنا چاہتا تھا جو تمہارے انداز سے پیدا تھی!

فیروزہ۔ آہ!

جمشید۔ اگر تم سمجھتی تھیں ہماری شادی کا انجام بربادی ہوگا تو تم اس شادی پر کیوں رضامند ہوئیں؟

فیروزہ۔ روپے کی خاطر۔

جمشید۔ آہ!

فیروزہ۔ پیارے شوہر (زہر بھرے انداز میں سکراتی ہے) کیا تمہیں خوف نہیں آتا! کیا تم اس دن سے نہیں ڈرتے جب میں اس زندگی سے تھک کر فسق کی زندگی اختیار کر لونگی۔

جمشید۔ ہرگز نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم عشرت کی کنیز ہو۔ تم روپے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں۔

فیروزہ! بہتر! شاید تم بھول گئے ہو کہ آج ساڑھے آٹھ بجے تم نے خسرو اور شیریں کو کھانے پر مدعو کیا ہے۔

جمشید۔ مجھے یاد ہے۔

چلا جاتا ہے۔

اس کے جانے کے بعد فیروزہ کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکے دل میں کوئی نیا اور خوفناک ارادہ پیدا ہو رہا ہے۔ وہ ایک مختصر خط لکھتی ہے اور اپنی شادی کی انگوٹھی کو خط میں لپیٹ کر قریب کی میز کی ایک دراز میں رکھدیتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے تمام زیور اتار کر اسی دراز میں ڈال دیتی ہے۔ سامنے کے آئینے میں اپنے چہرے کی طرف دیکھکر وہ ایک عجیب انداز میں سکراتی ہے اور گھر سے باہر نکل جاتی ہے۔ ناظرین کو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا ارادہ دعوت میں شامل ہونے کا نہیں ہے۔

اس کے مکان سے دو سو گز کے فاصلے پر چوپاٹی کے کنارے ایک بلند اور عظیم الشان مکان واقع ہے اس مکان کے ایک کمرے میں کیکاؤس اپنا سامان باندھ رہا ہے۔ وہ شادان و فرحاں معلوم ہوتا ہے گنگنا رہا ہے۔

فیروزہ داخل ہوتی ہے۔

کیکاؤس۔ (حیران ہوکر) فیروزہ!

فیروزہ۔ کیکاؤس۔ میری بات سنو۔ میں نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ اور اب میں تمہارے ساتھ مصر جانے کے لئے تیار ہوں۔ اس وقت سچ بتاؤ کیا تم میرے لئے اپنی زندگی اور نیکنامی کو برباد کر سکتے ہو؟

کیکاؤس۔ کیا کہہ رہی ہو پیاری!

فیروزہ۔ نہیں کیکاؤس۔ اس وقت شاعرانہ گفتگو کا موقع نہیں۔ بولو کیا تم ایک دوسرے شخص کی بیوی کو ساتھ لیکر مصر جانے کے لئے تیار ہو۔

کیکاؤس۔ تمہاری باتوں نے میرے دل کو داغدار کر دیا ہے۔ پیاری! کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہارے بغیر مصر میں کوئی دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے۔ میرے لئے دنیا دوزخ تھی۔ اور اب جنت بنگئی ہے۔

فیروزہ۔ کیا میرے آنے سے پہلے تم مجھے چھوڑ کر چلے جانے کے خیال سے مغموم تھے؟

کیکاؤس (نادم ہوکر) مغموم سا مغموم! میرا جی گھبرا رہا تھا! میں چاہتا تھا کہ اشتیاق کے پر لگا کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔

فیروزہ۔ میرا شوہر مجھے عورت بھی نہیں سمجھتا۔

کیکاؤس۔ پیاری! میرے لئے تم دنیا کی لطافتوں اور رنگینیوں کا مجموعہ ہو۔

فیروزہ کے رخسارے جوش مسرت سے تمتمانے لگتے ہیں۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔

فیروزہ۔ خدا تیرا شکر ہے! میں اپنی شادی کی انگوٹھی اور ایک خط میز کی دراز میں رکھ آئی ہوں۔ اب میں واپس نہیں جا سکتی میری زندگی اب تم سے وابستہ ہے۔

کیکاؤس۔ کسقدر حیرت انگیز کتنا مسرت خیز دن ہے! میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ تم ایکدن اس طرح میرے پاس آجاؤ گی۔

فیروزہ! اور مجھے ابھی یاد آیا ہے کہ گاڑی کا وقت قریب ہے۔ ہم پہلے کراچی جائیں گے۔ میں ٹکٹ لینے جاتا ہوں۔

چلا جاتا ہے

پانچ منٹ گذر جاتے ہیں

ڈاکٹر سہراب جی داخل ہوتا ہے۔

سامنے کا دروازہ کھلتا ہے۔ کچھ آدمی کیکاؤس کو لئے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ دوسرے کمرے میں داخل ہوکر اسے چارپائی پر لٹا دیتے ہیں۔

فیروزہ - (گھبرا کر) کیا ہوا!

ڈاکٹر سہراب جی - افسوس ہے مسٹر کیکاؤس ایک فٹن کے نیچے آگئے ہیں - ان کے زخم خطرناک ہیں -

فیروزہ - آہ! مجھے دھوکے میں نہ رکھئے - سچ کہئے وہ زندہ ہے -

سہراب جی - نہیں - موت نے اسے ہر ایک تکلیف سے آزاد کر دیا ہے -

فیروزہ - (دیوانگی کے عالم میں) نہیں نہیں - وہ نہیں مرا - میری مسرت ابھی دنیا میں باقی ہے - وہ زندہ ہے -

سہراب جی - میں ایک ڈاکٹر ہوں - میں اتفاق سے اس طرف سے گزر رہا تھا - مرتے وقت اس کی زبان پر صرف ایک لفظ تھا -

فیروزہ - آہ - میرا نام -

سہراب جی - نہیں وہ لفظ مصر تھا -

فیروزہ - نہیں - یہ بات غلط ہے - وہ مصر روانہ ہونے کی تیاری کر رہا تھا - وہ فٹن لینے گیا تھا! وہ نہیں مرا وہ زندہ ہے -

سہراب جی - افسوس! یہ خبر بالکل صحیح ہے! مسز کیکاؤس مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے - اگر آپ مسٹر کیکاؤس کے رشتہ داروں کا پتہ دیں تو میں ان کو اطلاع دیدونگا -

فیروزہ - (چونک کر) ایسا نہ کیجئے، وہ یہاں آجائیں گے -

سہراب جی - (حیرانی کے عالم میں) یہاں آجائیں گے - معاف کیجئے - مسز کیکاؤس! . . . . . . کیا آپ درحقیقت مسٹر کیکاؤس کی بیوی ہیں؟

فیروزہ اس کی طرف مسترحمانہ نگاہوں سے دیکھتی ہے -

سہراب جی - یقین فرمائیے - میں مداخلت نہیں کرنا چاہتا - آخرکار رشتہ داروں کو اطلاع تو دینی ہی پڑیگی - اور یقینی ہے کہ پولیس اس معاملے کی تفتیش بھی کریگی -

فیروزہ - آپ کا مطلب ہے کہ مجھے یہاں ٹھہرنے کا کوئی حق نہیں!

سہراب جی - میں نہیں جانتا - اپنے حالات سے آپ خود بہتر واقف ہونگی - معاف کیجئے گا - میں جاتا ہوں -

فیروزہ - آہ! ڈاکٹر صاحب میں کہیں نہیں جا سکتی - دنیا نے مجھے رد کر دیا ہے! آسمان سے مجھ پر لعنت برس رہی ہے -

سہراب جی - اگر آپ چلی جائیں تو آپ کے حق میں بھی مفید ہوگا -

فیروزہ - کہاں جاؤں - کہاں جاؤں میں! میرے لئے دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے -

سہراب جی - آپ مجھے اپنا رازدار نہ بنائیے -

فیروزہ - میں وہ نہیں جو آپ مجھے سمجھ رہے ہیں!

سہراب جی - درست! آپ اپنی بیگناہی اس طرح ثابت کر سکتی ہیں کہ فوراً چلی جائیں -

فیروزہ - مجھ پر کیا گذریگی! میں نے اس کے لئے سب کچھ چھوڑ دیا - اور اب موت اُسے چھین کر لے گئی ہے - میں نے جوا کھیلا تھا میں ہار گئی -

سہراب جی - جو لوگ جوا کھیلتے ہیں ان کو ہارنے کی توقع بھی رکھنی چاہیئے -

فیروزہ - میں اس کے ساتھ مصر جا رہی تھی -

سہراب جی - اب بھی آپ اس کی ہمسفر ہو سکتی ہیں!

فیروزہ اس کی طرف وحشتناک نظروں سے دیکھتی ہے -

لرزہ براندام ہو جاتی ہے

آیئے ذرا جمشید کے مکان کی طرف چلیں - ان پندرہ منٹوں میں وہاں کیا ہوتا رہا ہے -

جمشید میز کے قریب بیٹھا ایک خط لکھ رہا ہے - تھوڑے عرصے کے بعد جاذب نکالنے کے لئے دراز باہر کھینچتا ہے - اس کی نظر زیوروں پر جا پڑتی ہے - زیور نکال لیتا ہے -

خسرو اور شیریں داخل ہوتے ہیں -

خسرو - کیوں ہنس رہے ہو جمشید -

جمشید - اب میری سمجھ میں آیا کہ میری بیوی ابھی تک نیچے کیوں نہیں اتری - وہ اپنے زیور تلاش کر رہی ہے - اور زیور اس دراز میں رکھے تھے؟

ہنستا ہے - زیور جیب میں ڈال لیتا ہے -

ڈاکٹر سہراب جی داخل ہوتا ہے -

جمشید - آیئے ڈاکٹر صاحب - آپ سے ملکر بہت مسرت ہوئی - شاید میری شادی کے بعد آپ پہلی بار یہاں تشریف لائے ہیں -

سہراب جی - جی! بدقسمتی سے ابتک مسٹر جمشید سے تعارف کا شرف بھی حاصل نہیں ہوا -

شیریں کی طرف دیکھتا ہے

مسٹر جمشید اداب عرض ہے ؟

جمشید - نہیں! ڈاکٹر صاحب یہ مسٹر خسرو ہیں - ! ناموں کا یہ شاعرانہ اجتماع کسقدر پُر لطف ہے - اس کا نام شیریں ہے اور ان کے قابل شوہر کا نام خسرو -

سہراب جی - کیا بات ہے - درحقیقت مسز خسرو نے شیریں کی روایتی خوبصورتی کی یاد تازہ کر دی ہے -

شیریں - (مسکراتے ہوئے) شکریہ!

سہراب جی! ابھی تک مسز جمشید نہیں اتریں - میرا تو خیال تھا کہ مجھے دیر ہو گئی ہے -

جمشید - کیوں؟ کاروباری سلسلے ہیں!

سہراب جی - ہاں وہی

جمشید - اس کی شادی ہو چکی ہے ؟

سہراب جی - نہیں - (ٹھنڈی سانس بھرتا ہے) بیچارہ کیکاؤس!

جمشید - ڈاکٹر صاحب ان حالات میں اس کا مجرد ہونا بہتر نہ ہوا ؟

سہراب جی - قطعاً

شیریں - ڈاکٹر صاحب آپ نے "بیچارہ کیکاؤس" کیوں کہا ؟

سہراب جی - کیا میں نے ان الفاظ کا استعمال کیا تھا ؟ میں ایک اور بات کے متعلق سوچ رہا تھا!

شیریں - آپ "عورت" کے متعلق سوچ رہے ہونگے!

سہراب جی (کبیدہ خاطر ہو کر) کیا میں نے کہا تھا کہ اس معاملے سے کسی عورت کا بھی تعلق ہے ؟

شیریں (چالاکی سے) نہیں - لیکن اب جو آپ کہہ رہے ہیں!

خسرو! بگڑے گئے دوست!

سہراب جی - جی! (موضوعِ سخن کو بدل دینا چاہتا ہے) جمشید کتنا بُرا موسم ہے!

جمشید - ہاں - پرسوں سے ہلکا ہلکا مینہ برس رہا ہے - جی اکتا گیا ہے -

شیریں - رات تاریک ہے! مینہ برس رہا ہے - روح کسی نامعلوم اندوہ سے ٹھٹھری جا رہی ہے - اور ایک غریب عورت اس وقت آوارہ پھر کر اپنے بار کرب کو کم کرنے کی کوشش کر رہی ہے -

سہراب جی - ہاں - غریب عورت - خدا جانے وہ اس وقت کہاں ہو گی ؟

ناظرین کو علم ہونا چاہئیے کہ ڈاکٹر صاحب کا خیال غلط ہے - فیروزہ اس وقت تاریک بارانی رات میں اپنے کرب واندوہ کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی کوشش میں مصروف نہیں، اس کے برخلاف وہ ایک باوقار شاہزادی کیطرح ایک ریشمیں ساری میں ملبوس سیڑھیوں سے اتر رہی ہے -

جمشید - فیروزہ تم بہت دیر سے نیچے اتریں -

فیروزہ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ابھی تک اس کا راز افشا نہیں ہوا جمشید نے اس کا خط نہیں پڑھا - وہ اپنے حواس قائم رکھتی ہے -

فیروزہ - پیاری شیریں مجھے واقعی شرم محسوس ہو رہی ہے - مسٹر خسرو مجھے معاف فرمائیے -

یکایک اس کی نظر ڈاکٹر سہراب جی کی طرف جا پڑتی ہے - دونوں ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں -

جمشید - فیروزہ - ڈاکٹر سہراب جی!

فیروزہ - بہت مسرت ہوئی آپ سے ملکر ڈاکٹر صاحب!

سہراب جی - شکریہ!

شیریں - ڈاکٹر صاحب نے ابھی ابھی ہمیں ایک دردناک افسانہ سنایا ہے -

خسرو - میری طبیعت تو بہت متاثر ہوئی ہے -

شیریں - ایک آدمی فٹن کے نیچے آ کر مر گیا! ڈاکٹر صاحب فیروزہ کو یہ قصہ سنائیے نا!

سہراب جی! میرا خیال ہے کہ انہیں اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہ ہو گی -

جمشید - نہیں ڈاکٹر صاحب یہ بات نہیں - فیروزہ مرحوم سے متعارف تھی -

فیروزہ - اچھا وہ کون شخص تھا -

جمشید - کیکاؤس

فیروزہ - جو بیرسٹر تھا ؟

جمشید - نہیں - انجنیئر تھا -

فیروزہ - گندمی رنگ کا تھا نا ؟

سہراب جی - نہیں مسز جمشید - اسکا رنگ گورا تھا - آپ اس سے ملی تو

ضرور تھیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اُسے بھول گئی ہیں۔

اس کا لہجہ قدرتی ہے۔ مگر فیروزہ بین السطور میں نفرت
کا ایک زہر بھرا نشتر چھپا ہوا محسوس کرتی ہے۔

فیروزہ ۔ شاید ۔

شیریں ۔ کسی عورت کا بھی تو اس معاملے سے تعلق تھا ۔ ڈاکٹر صاحب وہ حصہ بھی سنا دیجئے نا فیروزہ کو ۔

سہراب جی ۔ بہت اچھا ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں مسز جمشید کہ میرا خیال تھا کہ وہ عورت کیکاؤس کی بیوی ہے ۔ اس وقت میرے دل میں اس کے لئے گہری ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے تھے ۔ مجھے اس پر رحم آرہا تھا ۔ لیکن جب بعد میں اس کی باتوں سے یہ معلوم ہوا کہ وہ اس کی بیوی نہیں تو مجھے اس پر اور زیادہ رحم آیا ۔

جمشید ۔ اچھا ۔ اس طرح کی عورت تھی !

فیروزہ ۔ کس قسم کی عورت جمشید !

جمشید ۔ جانے دو فیروزہ ۔

سہراب جی ۔ وہ رو رہی تھی ! اور کیا کر سکتی تھی !

جمشید ۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کیا کر سکتی ہے ۔

فیروزہ ۔ وہ کیا کر سکتی تھی جمشید !

جمشید ۔ فیروزہ ایسی عورتوں کے تمام عاشق ایکبار ہی ٹرینوں کے نیچے آکر نہیں مر جاتے ۔

سہراب جی ۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی ملازمت کر لیگی ۔ (دیکھا جاتا ہے کہ عورتیں آجکل اکثر ملازمتیں اختیار کر لیتی ہیں) اور مرحوم کی محبت میں غرق رہ کر زندگی کے دن بسر کر دیگی ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ واقعہ اس کا امتحان تھا !

فیروزہ ۔ میں بھی سمجھتی ہوں کہ ایسا ہی تھا !

جمشید ۔ ڈاکٹر صاحب میرا خیال ہے کہ وہ شادی شدہ تھی اور اب اپنے بیوقوف اعتبار کرنے والے خاوند کے پاس چلی گئی ہے ۔

خسرو ۔ خدایا !

سہراب جی ۔ جب وہ میرے کہنے پر کیکاؤس کے مکان سے چلی گئی تھی ۔ اس وقت میں اس کے متعلق ایسا نفرت خیز شبہ ہرگز نہ کر سکتا تھا ۔

خسرو ۔ اور تو اور خاوند خوب بیوقوف بنا !

جمشید ۔ یہ درست ہے ۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اس واقعے میں سامان تفریح بھی کافی موجود ہے ۔ کیوں ڈاکٹر صاحب آپ کو اس واقعے کے ظریفانہ پہلو کا احساس نہیں ہوتا !

سہراب جی ۔ ہاں جمشید ۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ اس عورت کی روح پر بے پناہ اداسی طاری ہوگی ۔

فیروزہ ۔ ڈاکٹر صاحب کیا آپ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ ممکن ہے وہ ابھی تک اداس اور مایوس ہو ۔

سہراب جی ۔ مسز جمشید ۔ آپ کے شوہر کی باتیں سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں ۔ کہ میں نے اپنی ہمدردی ضائع کر دی ۔ وہ عورت دراصل کسی رحم کی مستحق نہ تھی ۔

جمشید ۔ یہ باتیں چھوڑیئے ۔ کیوں فیروزہ تمہارے زیور کہاں ہیں ؟ پرسوں میں تمہارے لئے خرید کر لایا تھا ۔

فیروزہ ۔ (دلیری سے) میں انہیں اس میز کی دراز میں رکھ گئی تھی ۔

میز کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔

جمشید ۔ تو نکال لاؤ ذرا ۔

فیروزہ کے دل میں اضطراب اور کشمکش کا ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے ۔ کیا اس کے شوہر کو سب حالات کا علم ہو چکا ہے ؟ کیا اس نے دراز کھول کر خط نکال لیا ہے ؟

وہ میز کے پاس جاکر دراز کھولتی ہے ۔

فیروزہ (مڑکر اور انتہائی خوف کے عالم میں) زیور تو نہیں ہیں یہاں

جمشید (دیوانہ وار) نہیں ہیں ۔

فیروزہ ۔ ہائے میری مالا ۔ جمشید اب کیا کرنا چاہیئے ۔

جمشید ۔ مالا ۔ پولیس ۔

فیروزہ ۔ ہاں پولیس کو اطلاع دینی چاہیئے ۔

شیریں ۔ مذاق ختم کیجئے ۔ مسز جمشید اب دیکھتے نہیں کہ فیروزہ پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی ہے ۔

جمشید ۔ کوئی بات نہیں فیروزہ ۔ میں مذاق کر رہا تھا ۔ زیور تو میں نے خود نکال لئے تھے ۔ بہر نوع اب تمہیں ایک سبق مل گیا ہے کہ ایسی جگہ زیور کبھی نہیں رکھنے چاہیئے ۔

جیب سے زیور نکال کر دیتا ہے

سب کھانے کے کمرے کی طرف جاتے ہیں ۔

فیروزہ ایک خط آگ میں ڈالدیتی ہے اور جب خط جلکر راکھ ہو جاتا ہے تو اپنی شادی کی انگشتری جو خط میں لپٹی ہوئی تھی ۔ اپنی انگلی میں ڈال لیتی ہے ۔ جب وہ جمشید کے کہنے پر دراز سے زیور نکالنے گئی تھی اس نے حوصلہ کر کے دونوں چیزیں (خط اور انگوٹھی) نکال

"فٹزجیرلڈ"

ادارہ کو فاضل مضمون نگار کے اس نظریے سے کلیتہً اتفاق نہیں ہے کہ عمر خیام کی کچھ رباعیوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ جزا اور سزا کا قائل تھا اور نیک کام کرنے اور برائیوں سے بچنے کی تلقین کرتا تھا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس قسم کی رباعیاں الحاقی ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ جو رباعیاں اس کے مخصوص فلسفۂ حیات کی تردید کرتی ہیں ان کو عمر خیام سے منسوب کرنا ایک اصولی غلطی ہے۔

(ایڈیٹر)

اہلِ ذوق (خصوصاً عمر خیام کے دلدادہ) فٹزجیرلڈ کے نام سے ناواقف نہ ہونگے۔ لیکن ان میں سے بہت کم ایسے ہونگے۔ جو اس انگریزی ادیب یا زیادہ موزوں لفظوں میں "مترجم" کی زندگی کے حالات سے واقف ہوں ایک ایسے شخص کی زندگی، جسے ایک مشرقی زبان سے خاص دلچسپی رہی ہو اور جو مغرب میں مشرقی ادیب کی شہرت افروزی کا باعث ہوا ہو۔ ہمارے لئے خاص طور پر باعث دلچسپی ہونی چاہیئے۔ اگر ہمیں مغربی ادیبوں کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف کے مطالعہ کی کوئی ضرورت ہے۔ تو فٹزجیرلڈ ایسے مستشرق کی زندگی سے واقف ہونے کی زیادہ تر ضرورت ہے۔

سوانح حیات ایڈورڈ فٹزجیرلڈ ۳۱ رمارچ ۱۸۰۹ء کو ووڈبرج کے قریب سفوک میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے والدین کا ساتواں بچہ تھا۔ اس کا والد جان پرسل ایک دولتمند آئرش ڈاکٹر کا بیٹا تھا۔ اور ان کے خاندان کا بانی انگلستان کا مشہور محافظ "آلیور کرامویل" تھا۔ جس کی ایک تلوار اور ایک گھڑی ان کے گھر میں یادگار کے طور پر چلی آتی تھی۔ فٹزجیرلڈ کی والدہ میری فرانسس فٹزجیرلڈ نواب کیلڈیئر کے خاندان سے تھی اور اس کا والد بہت دولتمند آدمی تھا جس کی جائداد آئرلینڈ، نارتھمپٹن، سفوک اور کئی دوسری جگہوں میں تھی۔ اس کے مرنے پر اس کی بیٹی میری فٹزجیرلڈ تمام جائداد کی واحد مالک ہوئی۔ اس لئے جان پرسل نے بھی اپنا نام "جان پرسل فٹزجیرالڈ" کر لیا۔ جان پرسل کو سیر و شکار اور گھوڑے کی سواری کا بہت شوق تھا۔ وہ سیفورڈ کے حلقہ کی طرف سے پارلیمنٹ کا ممبر بھی تھا۔

فٹزجیرلڈ نے ابتدائی تعلیم "بری سینٹ ایڈمنڈز سکول" میں حاصل کی۔ اس کے پڑوس میں ایک اینگلو انڈین رہتا تھا۔ جس کا نام میجر مور تھا۔ اسے ہندوستانی دیوتاؤں کے بت اور تصویریں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اپنی ابتدائی تعلیم کے دنوں میں صبح اور شام کے وقت فٹزجیرلڈ اس کے ساتھ سیر کو جایا کرتا تھا۔ راستے میں میجر اسے مزیدار دیہاتی محاورے اور اپنے مشرق کے سفر کے حالات سنایا کرتا تھا۔ اسی لئے فٹزجیرلڈ کی پہلی تصانیف میں جابجا مقامی الفاظ اور محاورے نظر آتے ہیں۔ میجر مور کی باتیں سن سن کر ہی اس کے دل میں مشرقی ادبیات کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ جس نے بعد میں اسے دنیا میں مشہور کر دیا۔

اکتوبر ۱۸۲۶ء میں سترہ سال کی عمر میں وہ ٹرنٹی کالج کیمبرج میں داخل ہوا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اس نے ۱۸۵۶ء میں اپنے ایک اور ہمراہی کی لڑکی مس بارٹن سے شادی کی مس بارٹن کا والد برنارڈ بارٹن تھا، جو تاریخ ادب میں کوئیکر پوئٹ کے نام سے مشہور ہے۔

گہرے دوستوں میں سے اس زمانہ کے نامور ادیب اس کے حلقہ احباب میں شامل تھے جن میں سے ٹینی سن، اس کا بھائی فریڈرک ٹینی سن، جیمز سپیڈنگ، رسالہ "بیکن" کا ایڈیٹر تھامس کارلائل اور تھیکرے خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ ان سے اس کی بے تکلفانہ خط و کتابت رہتی تھی۔ لیکن ان کے علاوہ اور کئی ممتاز اہلِ قلم سے بھی وہ اتنا ہی بے تکلف تھا۔ مثلاً برنارڈ بارٹن (کوئیکر شاعر[1]) ڈبلیو۔ الیف پولک، ڈبلیو۔ ایچ۔ تھامپسن (جو کئی سال تک ماسٹر آف ٹرنٹی رہا)، کوویل (ایک مشہور مستشرق)، ایلڈس رائٹ (جس نے فٹزجیرلڈ کی تصانیف کی اشاعت کی)، مشہور امریکن ادیب لوویل اور چارلس نارٹن۔

اس کی اپنی جائداد کافی تھی جس سے وہ امیرانہ زندگی بسر

---

[1] سترھویں صدی عیسوی کے درمیانی حصہ میں جارج فاکس نے ایک مذہبی فرقہ کی بنا ڈالی جس کا نام "انجمن احباب" رکھا۔ اس کے مخالف اس انجمن کے عام ممبر کو کوئیکر (گندم نما جو فروش) کہتے تھے۔

کرسکتا تھا لیکن اس نے اپنی عمر کا بہت سا حصہ سفوک کے ایک دور دراز حصے میں ایک مختصر سے مکان میں گزار دیا۔ کئی سال تک اس کا یہ معمول رہا۔ کہ وہ گرمیوں کے دن ایک چھوٹی سی تفریحی کشتی میں گزارتا تھا۔ جس میں وہ رود بار انگلستان تک سیر کے لئے چلا جاتا تھا۔ اور کبھی کبھی کارنیوال تک نکل جایا کرتا تھا۔ اس کا مرغوب ترین مشغلہ مطالعہ تھا۔ اور اس کے پاس عمدہ کتابوں کا کافی ذخیرہ تھا۔ فٹز جیرلڈ کو تصویریں جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ اور اس نے وینس، اٹلی انگلستان وغیرہ کے مشہور مصوروں کے فن کے نادر نمونے مہیا کر رکھے تھے۔

فٹز جیرلڈ کا مزاج عجیب قسم کا واقع ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ یہی چاہتا تھا۔ کہ کوئی ایسا شخص اس کے پاس رہے جو اس کی باتوں کو بلا تامل مان لیا کرے۔ اس کے ساتھ بے تکلف باتیں کرے اور اس کی اپنی طبیعت کے مطابق اس کی خوشی اور غم میں شریک ہو ۱۸۸۲ء میں اس نے ایلن کو لکھا۔

"میں ان اعلےٰ درجہ کے انسانوں میں سے ہوں۔ جو اپنی تصنیفات دوسرے آدمیوں کو پڑھتے ہوئے سنکر ہی خوش رہ سکتے ہیں۔ مگر میں تمہیں اور اپنے آپ کو اسقدر چاہتا ہوں کہ ہفتے میں کم سے کم ایک بار جذبات کا اسقدر ہجوم ہو جاتا ہے۔ کہ مجبوراً انہیں ظاہر کرنے کے لئے تمہیں خط لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ لیکن، اگر میں ایک دفعہ تمہاری زبان سے سُن لوں کہ اس طرح جب تک تم جواب نہیں لکھ لیتے۔ تمہیں بھی بے چینی رہتی ہے، تو میں اسے بالکل چھوڑ دونگا۔ میں قسمیہ کہتا ہوں۔ مجھے پھر اس کی کچھ بھی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں خط لکھنے کا اتنا شوق نہیں ہے تم اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ شوق کیسا ہوتا ہے۔ لیکن میں افسوس سے کہتا ہوں کہ مجھے بالکل ایک دوشیزہ کی طرح ان لوگوں کو خط لکھنے میں لطف آتا ہے جنہیں میں چاہتا ہوں ——"

وہ جب کسی کتاب کا مطالعہ کرتا تو فوراً اس کے متعلق ایک رائے قائم کر لیتا۔ جسے وہ ایک خاص شوخی اور تیزی سے ظاہر کیا کرتا تھا۔ اس کے دوست اس ایک وصف کی تعریف ضرور کرتے تھے۔

فٹز جیرلڈ لارڈ ٹینی سن اور اس کی تصانیف کو بہت قابل قدر سمجھتا تھا۔ چنانچہ وہ ٹینی سن اور براؤننگ کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"الفریڈ نے انگریزی زبان میں ایسے نوادر کا اضافہ کیا ہے
جو رہتی دنیا تک محو نہیں ہو سکتے۔"

وہ براؤننگ کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ چارلس ڈکنس کی تو وہ گویا پرستش کرتا تھا۔ ستر سال کی عمر میں لکھتا ہے کہ:-

"مجھے ڈکنس کے ناولوں میں ہر لحظہ نیا لطف آتا ہے۔"

اپنے دلی دوست تھیکرے کے متعلق بھی اس کی رائے مستقل نہ تھی۔ کبھی وہ اُس کی بیحد تعریف کرتا تھا اور کبھی اس کی مشہور مذاقیہ تصنیف "پنیڈ نس" کو "ایک اداس اور بے مزہ کتاب" کہنے سے بھی نہ چوکتا تھا۔ عمر کے آخری حصے میں اس نے جارج بارو کی علمی فضیلت سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اور ہمارے خیال میں وہ حق بجانب تھا۔

ایک عرصہ تک فٹز جیرلڈ کے دوست اسی خیال میں رہے کہ اس کا ادبی ذوق پختہ اور سکیم ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس نے وہ کام جو اس کی شہرت کا باعث ہوا۔ پچاس سال کی عمر میں شروع کیا تھا۔ غالباً یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ جس کتاب سے اُسے عالمگیر شہرت نصیب ہوئی وہ رباعیات عمر خیام کا انگریزی ترجمہ ہے۔

احسان ناشناسی ہوگی اگر ہم یہاں کوویل کا ذکر نہ کریں۔ وہ فٹز جیرلڈ کا ہم مکتب تھا۔ اُسی نے جیرلڈ کو فارسی زبان سکھائی۔ اور خیام کے مطالعہ کی ترغیب دی تھی۔ کوویل ہندوستان میں بھی آیا تھا اور کلکتہ سے فٹز جیرلڈ کو خط لکھتا رہا۔ وہ کیمبرج میں سنسکرت کا پروفیسر بھی رہا ہے۔ مشرقی زبانوں، عربی۔ فارسی۔ سنسکرت سے اُسے خاص اُنس تھا۔

تھیکرے اور ٹینی سن اس کے دلی دوست تھے ۱۸۵۲ء میں تھیکرے نے امریکہ سے روانہ ہوتے وقت فٹز جیرلڈ کو نہایت محبت بھرے الفاظ میں ایک خط لکھا۔ "ممکن ہے کہ میرے دوران سفر میں کوئی ناگوار اور ناموافق واقعہ پیش آجائے۔ تم میرے بعد بھی اپنی ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھنا مجھے تمہاری بچپن کی پیار اور الفت کی باتیں یاد آتی ہیں تو دل کو گونہ راحت ہوتی ہے۔ اس وقت بھی جبکہ میں تمہیں الوداع کہہ رہا ہوں۔ میرے دل میں اسی پیار اور الفت کے دریا امڈے چلے آرہے ہیں!"

ٹینی سن نے اپنی نظم "ٹائرسیاز" خلوص دل سے "اولڈ فٹز" کے نام معنون کی تھی۔ لیکن جب اس کا دوست کتاب شائع ہونے سے پہلے ہی ۱۸۸۳ء میں مرگیا تو اس کی اچانک موت پر چند شعر کہہ کر تبرکاً کتاب میں شائع کر دئے۔ ان سطور کا ترجمہ یہ ہے:-

"میری دعا ہے کہ جب میں اس دنیا سے جاؤں اور عدم
میں اس سے ملوں تو میرے دنیا کے تجربے اسی قدر پُر امن

ثابت ہوں جسقدر اس کے اپنے تجربے ثابت ہوئے"۔

تصانیف فٹزجیرلڈ ۱۸۳۰ء میں پیرس گیا اور وہاں سب سے پہلی نظم "دی میڈ وزان سپرنگ" لکھی۔ دوسری نظم "یوفرنر" ۱۸۵۱ء میں لکھی جو شباب پر ایک دلچسپ مکالمہ ہے۔ ادبی حلقوں میں اسے کسی قدر پسند کیا گیا۔

۱۸۵۲ء میں "پولونی اس" اور دوسرے سال کیلڈرن کے چھ ہسپانوی ڈراموں کے انگریزی ترجمے شائع کئے۔ جن سے اس کی شہرت میں قدرے اضافہ ہوا۔ ۱۸۵۳ء میں اس نے کوویل سے فارسی پڑھنی شروع کی۔ اور ۱۸۵۶ء میں مولانا جامی علیہ الرحمۃ کی کتاب "سلمان والسال" کا ترجمہ شائع کیا۔ اسی سال اُس نے خواجہ فریدالدین عطار کی کتاب "منطق الطیر" پڑھی اور ساتھ ساتھ رباعیات عمر خیام کا مطالعہ بھی کرتا رہا۔ مولانا جامی کی "سلمان والسال" ایک استعارہ ہے۔ اور فٹزجیرلڈ نے اس پر بہت وقت اور توجہ صرف کی ہے۔ جب ہم خیام سے اس کا موازنہ کرتے ہیں تو ہمیں اسقدر محنت اور وقت خرچ کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ شروع شروع میں اس کی فارسی استعداد اسقدر نہ تھی جس قدر عمر خیام کا ترجمہ کرتے وقت۔ نظم کے ترجمہ کی ابتدا میں اس نے کوویل کے نام ایک دلچسپ لیکن مبہم خط بطور دیباچہ لکھا ہے۔ جس میں جامی جیسے شاعر سے معاملہ پڑنے کی دقتیں بیان کی ہیں۔ وہ یہ بھی مانتا ہے کہ "میں نے مشرقی تخیل کا ایک حد تک خون کر دیا ہے"۔ اس خط میں مولانا جامی کی اصل فارسی نظم پر بھی ایک مختصر سا نوٹ ہے۔ اور مولانا کے کچھ حالاتِ زندگی بھی لکھے ہیں۔ نظم کے متعلق فٹزجیرلڈ لکھتا ہے :۔

> "یہ ایک استعارہ ہے جس میں شاعر نے ایک مستتر یا ایک مخفی مذہب کے رموز کی وضاحت کی ہے۔ اس سے زیادہ واضح طور پر ظاہر کرنے کی اس نے جرأت نہیں کی۔ اور مجھے یقین ہے کہ ان رموز کو اس سے زیادہ وضاحت سے ظاہر بھی نہیں کیا جاسکتا۔"

اس نے خیام میں جو بات دیکھی وہ یہی تھی کہ خیام دوسرے مشرقی شاعروں سے جن سے فٹزجیرلڈ واقف تھا، بالکل جداگانہ رنگ رکھتا تھا۔ مشرقی شاعری عموماً مبہم تخیلات اور تصورات تک ہی محدود رہتی ہے۔ لیکن فٹزجیرلڈ کی رائے میں خیام کے کلام کی یکسوئی اور ایک مخصوص رنگِ تخیل بہت قابلِ قدر ہے۔

چنانچہ وہ کوویل کو لکھتا ہے :۔

"اگرچہ میں اب فارسی ادب کا مطالعہ بہت کم کرتا ہوں۔ مگر تم نے جن قطعوں کا حوالہ دیا ہے۔ میں انہیں خود خیام اور حافظ کے کلام میں تلاش کرونگا۔ .... میرا خیال ہے کہ تم رباعیات کے ترجمہ اور تالیف کو ایک خطرناک کام سمجھتے ہو۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر تم سے زیادہ موزوں اور کون ہوگا؟ نہیں! نہیں! اس کام کو نباہنے کے لئے تم سے زیادہ قابل اور کوئی نہیں۔ اور خیام کا ترجمہ اس قابل ہے کہ اسے اعلےٰ پیمانہ پر پھر شائع کیا جائے۔ میں اسے شروع سے ہی سب فارسی شاعروں سے فائق سمجھتا ہوں...... اور تم ہمیشہ اس کے کلام میں ایسے معقول اور منطقی تخیل کے وجود کا ثبوت پیش کرتے رہے ہو جس کا مجھے وہم تک نہیں"۔ "لیکن میں یہ ضرور کہونگا کہ یہ منطق تھے اس کے کلام کا بہترین نمونہ نہیں کہے جاسکتے۔ یہ ایک ایسی ذہنی قوت کا ثبوت ضرور ہیں۔ جو میرے خیال میں فارسی شعراء میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ کاؤلے۔ ڈاسنے وغیرہ کے متعلق جنہیں جانسن فلسفہ عقلیہ کے (خیالی) شاعر کہتا ہے، میرا خیال ہمیشہ یہی رہا کہ ان کے تخیل سے بھی ایک منطقی قوت کا اظہار ہوتا ہے۔ جوان کو بآسانی اسقدر لبعید اور دور رس تمثیلوں اور تشبیہوں تک پہنچا دیتی ہے۔ یہی حال کیلڈرن کے تخیل کا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ خیام کا ترجمہ کرتے وقت میں نے صرف ایک ہی پہلو مدِنظر رکھا ہے۔ .... لیکن میں جو کچھ کرتا ہوں وہ ایک بلبلے کی طرح سطح پر آتا ہے اور ٹوٹ جاتا ہے۔ برعکس اس کے تم اپنے کمالِ علمیت کے اعتبار سے ایسے بے مثال شاعر کے کلام کا ترجمہ کرتے، اپنے بعد یقیناً صفحۂ عالم پر ایک غیر فانی نقش چھوڑ جاتے ...."

۱۸۵۹ء میں رباعیات کا ترجمہ شائع ہوگیا۔ پہلے پہل تو اس کی کچھ قدر نہ ہوئی۔ لیکن آہستہ آہستہ لوگ اسے پسند کرنے لگے۔ عمر خیام کے ترجمے کو ہر دل عزیز بنانے میں کرسٹینا رسٹی (ایک مشہور شاعرہ) نے بہت حصہ لیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی ادبی ذوق رکھنے والوں نے ترجمہ کے شعروں کی خوبی اور خوش نوائی کی بہت تعریف کی۔

سر اے۔ سی بینسن لکھتے ہیں کہ "رباعیات کا ترجمہ ایسے وقت میں شائع ہوا جب تمام دنیا میں بدشگونی (التقدیر السوء)[1] کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔ اور تشاؤم بھی اس زمانے کا جبِ علیش و

[1] تشاؤم یا التقدیر السوء ایک ایسا اصول ہے جس کے ماننے والے (متشائم یا مقدر السوء) دنیا کی ہر ایک چیز کے تاریک پہلو پر ہی نظر رکھتے ہیں۔ اور جن کا خیال ہے کہ زمانہ کی موجودہ حالت ہمیں برائیوں کی طرف لے جارہی ہے۔ (حبیب)

آرام کے بغیر زندگی بسر کرنا معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ اور سادگی کو کاہلی اور حماقت کا ہم معنی سمجھا جاتا تھا۔ اور جس زمانے میں لوگوں پر نہ صرف ان کی خواہشوں کا عذاب نازل تھا بلکہ ان خواہشوں کا پورا ہونا بجائے خود ایک مصیبت تھی۔ لوگوں پر اپنے باپ دادا کی عقل کا ضرورت سے زیادہ اثر تھا۔ اگرچہ وہ انہیں حقیر سمجھتے تھے لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ وہ انہیں کی اولاد تھے؟

۱۸۶۵ء میں فٹز جیرلڈ نے کیلڈرن کے دو ڈراموں ——— "پر زور ساحر" اور "اسباب خواب" ——— کے ترجمے شائع کئے۔

۱۸۶۸ء میں خیام کا دوسرا ایڈیشن چھپا۔ اور ۱۸۷۰ء میں "سلماں والبسال" بھی دوبارہ شائع ہوئی۔ ۱۸۷۲ء میں خیام کا تیسرا ایڈیشن چھپا۔ اور ۱۸۷۹ء میں چوتھا۔ ۱۸۸۱ء میں "ایڈیپس" کے دونوں حصے شائع ہوئے اور "یوفرینر" بھی نظر ثانی کے بعد چھاپی گئی۔

فٹز جیرلڈ کی وفات کے بعد مسٹر ایلڈس رائٹ نے اس کے مکتوب جمع کئے جو کئی جلدوں میں چھپے۔ "عمر خیام کے بعد دوسرے درجہ پر فٹز جیرلڈ کی شہرت کا باعث اس کے مکتوبات ہیں۔ ان میں خاص جاذبیت اور خوبی یہ ہے کہ وہ اس کی ایسی زندگی کی، بالکل ظاہر، اصلی، اور فطری تصویر پیش کر دیتے ہیں۔

رباعیاتِ خیام کا ترجمہ

عمر خیام مغرب میں اس قدر ہر دل عزیز ہو چکا ہے کہ یورپ اور امریکہ میں اسوقت بہت سی "عمر خیام سوسائٹیاں" قائم ہو چکی ہیں۔ اور فٹز جیرلڈ کے انگریزی ترجمے کے متعدد مصور ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلے گلبرٹ جیمز اور اس کے بعد ہوپ ولیمس نے مصور ایڈیشن شائع کئے۔

فٹز جیرلڈ کے ترجمہ سے پہلے یورپ میں عمر خیام کی رباعیوں کے اور ترجمے بھی شائع ہو چکے تھے۔ مثلاً جرمنی میں باڈن سٹیڈ فرانس میں نکولس اور ڈی ہربرٹ، اور خاص انگلستان میں ہی میکارتھی۔ گارنر، وین فیلڈ اور ہیرن ایلن کے چار ترجمے لکھے جا چکے تھے۔ مگر ان سب سے فٹز جیرلڈ کا ترجمہ زیادہ مشہور و مقبول ہوا۔

فٹز جیرلڈ کو رباعیوں کے ترجمے میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ اُس وقت فارسی رباعیات چھپی ہوئی کسی جگہ نہ ملتی تھیں۔ اور قلمی نسخے ایک دوسرے سے مختلف، نامکمل، اور بہت غلط ہوتے تھے۔ فٹز جیرلڈ کے ترجمہ کے پہلے اور دوسرے ایڈیشنوں میں مطابقت نہیں ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے۔ یہ اختلاف اتنا زیادہ ہے کہ مسٹر ایلڈس رائٹ کو "رباعیات" کا پانچواں ایڈیشن چھپواتے وقت پہلے اور چوتھے ایڈیشن کو بجنسہ یکجا لکھنا پڑا۔

فٹز جیرلڈ نے جن قلمی نسخوں سے رباعیاں لے کر ترجمہ کیا۔ اُن میں سے ایک تو اُسے لنڈن ہی سے مل گیا تھا۔ جو ۸۶۵ھ ہجری میں شیراز میں لکھا گیا تھا۔ دوسرا نسخہ اُسے کوویل نے دیا تھا جو اس نے اپنے ہندوستان کے سفر میں کلکتہ کے سرکاری کتبخانہ سے نقل کیا تھا۔ پہلے نسخہ میں ایک سو اٹھاون رباعیاں تھیں۔ اور دوسرے میں پانسو سولہ اور یہ نسخہ نامکمل تھا۔ تیسرا نسخہ وان ہیمر سے ملا جس میں دوسو رباعیاں تھیں چوتھا نسخہ ڈاکٹر سپرنگر نے لکھنؤ سے حاصل کیا جس میں چار سو رباعیاں تھیں۔ فٹز جیرلڈ نے ان سب نسخوں کو ایک دوسرے سے مطابق کیا اور ایک مجموعہ خود مرتب کر کے اس کا ترجمہ کیا۔

اس نے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا تھا کہ اُس کے ترجمہ میں وہی خوبی ہے جو اصل فارسی میں ہے۔ ۱۸۵۹ء میں جب پہلا ایڈیشن چھپا تو اس نے کوویل کو لکھا کہ "میرے ترجمہ میں بہت سی غلطیاں ہیں۔" ترجمے کے پانچویں ایڈیشن میں مسٹر ایلڈس رائٹ نے ایک اضافی نوٹ میں لکھا لکھا ہے۔ "فٹز جیرلڈ نے خیام کے ترجمہ کرنے میں بڑی آزادی سے کام لیا ہے۔ سب سے پہلی رباعی کا ترجمہ اس کے اپنے ہی دماغ کی کاوش ہے۔ اور چوتھے ایڈیشن میں تینتیسویں رباعی کا ترجمہ آدھا عمر خیام کا اور آدھا عطار کا ہے۔" لیکن فٹز جیرلڈ کا تو یہ معمول ہی تھا۔ اس نے ہسپانوی اور یونانی سے جتنے ترجمے کئے اُن کا بھی یہی حال ہے۔

ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ جہاں تک ہو سکا، فٹز جیرلڈ نے ترجمے میں اصل فارسی شاعری اور مشرقی تخیل کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور ایک حد تک وہ کامیاب بھی ہوا ہے۔ اس کے ہمعصر اور بعد کے ادیبوں کی رائے ہے۔ کہ فٹز جیرلڈ کے ترجمہ سے خیام کا عرفان و علم اور ادب و انشا صحیح رنگ میں مغربی دنیا کے سامنے آگیا۔

عمر خیام کے متعلق اس کی رائے ہے:۔

"وہ ایک ایسا فلسفی ہے جسے یقین ہے کہ انسان بہت سی گتھیاں سلجھا سکتا ہے۔ لیکن انسانی تقدیر (موت و حیات) کا عقیدہ

ایسا ہے جسے وہ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اُسے صرف ایک بات ہی یقینی معلوم ہوتی ہے۔ یعنی موت۔ اس لئے انسان کا کام یہی ہونا چاہیئے کہ وہ صرف "حال" کیلئے جیے۔ "نقد" تو لے لے۔ "ادھار" چھوڑ دے۔ اور جہاں تک ہوسکے حسن کی رعنائیوں اور دنیا کے راحت و آرام سے لطف اٹھاتے۔"

یورپ ہیں عموماً اور فٹز جیرلڈ کے وقت میں انگلستان میں خصوصاً اس بات پر بہت بحث ہوتی رہی ہے کہ خیام نے "مے" اور "جام" کن معنوں میں استعمال کئے ہیں۔ کیا ان سے نفسانی خوشی اور دنیا کے عیش و عشرت مراد ہیں یا ان سے خیام کا مطلب "مے حقیقی" اور "جام معرفت" ہے جیسا کہ تصوف والوں کا یقین ہے؟ فٹز جیرلڈ نے اس معاملہ میں صاف طور پر کچھ نہیں لکھا۔ ہم اس کی ذاتی رائے کے متعلق شبہ میں ہی رہ جاتے۔ لیکن جب ۱۸۶۷ء میں مسٹر نکولس فرانسیسی قنصل نے ریشت سے رباعیات کا فرانسیسی ترجمہ شائع کیا۔ اور دیباچہ میں لکھا کہ عمر خیام پورا صوفی تھا۔ تو فٹز جیرلڈ نے اس پر بہت اعتراض کئے۔ اور لکھا "معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر نکولس نے طہران میں کسی صوفی سے فارسی پڑھی ہے۔ اس نے ہی رباعیات کا ترجمہ پڑھایا اور انہیں بھی اپنے ہی رنگ میں رنگ دیا"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ خیام کو صوفی نہیں مانتا تھا بلکہ پکا رند مشرب مغربی عیش پسند طبیعتوں کا انداز کرتے ہوئے، جن کا اصول یہی ہے کہ کھاؤ، پیو اور خوش رہو، یہ بات چھپی نہیں رہتی کہ فٹز جیرلڈ کا ترجمہ اور عمر خیام یورپ میں کیوں اسقدر پسند کئے جاتے ہیں۔

مولانا شبلی رح لکھتے ہیں :-

"یہ عجیب بات ہے کہ خیام کی قدر دانی ایشیا سے زیادہ یورپ نے کی۔ اور کرنی چاہیئے تھی۔ خیام کے خیالات یورپ سے اسقدر ملتے جلتے ہیں کہ آج اگر موجود ہوتا تو شاید یورپین بنجاتا۔"

اس سوال پر کہ خیام صوفی ہے یا رند مسٹر ٹی۔ ایچ۔ وارڈ لکھتے ہیں۔ "فٹز جیرلڈ نے خود کبھی اس کا جواب نہیں دیا۔ اور جب وہ ذرا رُک کر اور دبی زبان سے کچھ کہتا ہے۔ ہمیں اس پر یقین نہیں آتا"۔ آخیر میں وہ لکھتے ہیں "ہمیں بھی عمر (خیام) کی مثال کی پیروی کرنی چاہیئے۔ اور جو نفیس تخیل اور پُر سکون شعر وہ پیش کرتا ہے۔ اس سے لطف اٹھانا چاہیئے۔ اس کا کلام مذہبی ادیبوں کے لئے بہت افسوسناک اور اندوہ فزا ہے۔ لیکن عام سننے والوں کے لئے اس کا نغمہ شیریں اور پُر سوز ہے۔"

خیام کا فلسفہ حیات دیکھنے میں مشہور یونانی فلسفی اپیکیورس کی آواز بازگشت ہے۔ جس کا اصول یہ تھا کہ دنیا میں اگر کوئی نعمت ہے تو عیش و آرام اور لعنت ہے تو رنج و فکر۔ اس لئے ماضی اور مستقبل کا خیال بھی ہمارے دل میں نہیں آنا چاہیئے۔ جو کچھ ہے "حال" ہے اس میں کھاؤ، پیو اور خوش رہو۔

یہ فلسفہ خطرناک ہے کہ انسان نیکی اور بدی کا خیال تک نہ کرے۔ جو جی میں آئے کرے، اور "مزے اڑائے" اور خیام سے ایسے خطرناک فلسفے کی تلقین کی امید نہیں ہوسکتی۔ اس کی بہت سی رباعیاں ایسی ہیں جن میں اس نے آخرت اور جزا و سزا کا اقرار کیا ہے۔ اور نیک کام کرنے اور برائیوں سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔

امیر حبیب اللہ خاں نظامی

رباعی

تدبیر نہ منحصر نہ اوقات پہ ہے — انجام عمل خدا ہی کی ذات پہ ہے
یہ کوشش نامراد کہتی ہے رواںؔ — تقدیر کی راہ اتفاقات پہ ہے

رواںؔ

"آوارہ"

بپن کشور ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اسے ہمیشہ سونے کے چمچے سے دودھ پلایا گیا۔ مگر اس نے روپیہ سے ہولی کھیلی۔ کمایا خاک نہیں۔ نتیجہ اور کیا ہونا تھا۔ پیدائشی مکان بھی چھوڑنا پڑا۔ تھا نہایت خوبصورت خوش رو جوان۔ موسیقی میں ماہر لیکن بیوپار میں اناڑی اور عملی زندگی کے نشیب و فراز سے بے بہرہ۔ زندگی کی شاہراہ پر بیل گاڑی کی طرح آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اور زیادہ عرصہ تک اپنی شان و شوکت کو برقرار نہیں رکھ سکا۔ خوش قسمتی سے راجہ چترنجن جنہیں حال ہی میں کورٹ آف وارڈس سے اپنی جایداد ملی تھی۔ ایک عطائی تھیٹر کمپنی قائم کرنا چاہتے تھے۔

بپن کشور کی ساحرانہ نگاہوں اور اس کے گانے سے متاثر ہو کر انہوں نے اس کو اپنی کمپنی میں داخل کر لیا۔ چترنجن بی۔ اے پاس تھے۔ اُن کو کھل کھیلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اگرچہ وہ ایک امیر کے لڑکے تھے تاہم مقررہ اوقات اور مخصوص مقامات پر کھانے اور سونے کے عادی تھے۔ وہ بپن پر ایسے فریفتہ ہوئے جیسے کوئی شراب سے مدہوش ہو جاتا ہے۔ اکثر کھانا رکھے رکھے ٹھنڈا ہو جاتا۔ رات کا بیشتر حصہ ختم ہو جاتا۔ مگر وہ بیٹھے بپن کو داد موسیقی دیا کرتے۔ دیوان جی کہا کرتے تھے "ہمارے راجہ جی کے دیوتا ہونے میں شک نہیں۔ اگر کوئی عیب ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ بپن کشور پر بے طرح فریفتہ ہیں۔"

رانی بسنت کماری راجہ جی سے روٹھ گئیں اور کہنے لگیں کہ وہ اپنے کو ناحق اس تباہ کن لنگور کی خاطر برباد کر رہے ہیں۔ جب تک اس کو نکلوا نہ دوں گی مجھے چین نہیں پڑیگا۔

راجہ کو اپنی نوعمر بیوی کے حسد سے دل ہی دل میں ایک گونہ خوشی حاصل ہوتی۔ وہ مسکراتے اور خیال کرتے کہ عورتیں روئے زمین پر صرف ایک مرد کو جانتی ہیں۔ یعنے اس کو جس سے وہ محبت کرتی ہیں۔ ان کو کبھی دوسروں کی مصیبت کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ بات کہ ایسے لوگ بھی ہیں جن کی قدر اُن کے ہنر سے ہوتی ہے۔ عورتوں کی سمجھ سے باہر ہے۔ عورت ذات کے نزدیک اچھا آدمی اور ان کی مہربانی کا مستحق وہ ہے جس نے ان کے کان میں اندواجی منتر پھونک دیا ہے۔ مقررہ وقت سے اگر ایک لمحہ کی بھی دیر شوہر کو کھانے میں ہو جاتی تو بسنت کماری بیقرار ہو جاتی۔ لیکن اُسے ذرہ برابر پروا نہیں تھی۔ کہ شوہر کے مصاحبوں کو ایک لقمہ بھی نصیب ہوا یا نہیں۔

صنف نازک کی یہ ادنےٰ جذبہ داری ممکن ہے نکتہ چینی کے قابل ہو۔ مگر چترنجن کو یہ قطعی ناپسندیدہ نہ تھی۔ وہ اکثر اپنی بیوی کے سامنے بپن کی مبالغہ آمیز تعریف کے پل باندھ دیتا جس سے اس کا منشا صرف اپنی بیوی کو مشتعل کرنا ہوتا تاکہ وہ اس کی خوشگوار ملامت سے لطف اٹھا سکے۔

لیکن جو کچھ شاہی جوڑے کا کھیل تھا اس میں غریب بپن کی موت تھی۔ گھر کے نوکروں نے حسب عادت رانی جی کی بے توجہی اور دانستہ تغافل سے فائدہ اٹھایا اور اس بیچارے کم نصیب کی طرف سے اور زیادہ غافل اور بے پرواہ ہو گئے۔ جب کبھی شکایت کا موقع آتا تو کہتے "بھیا ہمیں خیال نہیں رہا" اس طور پر بپن کی پریشانی اور مصیبت میں ناگفتہ بہ اضافہ ہو گیا۔

ایک مرتبہ رانی جی پُتّے کہار پر خفا ہوئیں اور بولیں "تو اب کام سے بہت جی چرانے لگا ہے۔ دن بھر کیا کرتا رہتا ہے" اس نے ہکلا کر جواب دیا۔ "رانی جی۔ تمام دن بپن بابو کے کام میں لگا رہتا ہوں۔ مہاراج کا حکم ہے۔" رانی نے بگڑ کر کہا "او ہو۔ تمہارے بپن بابو جیسے کوئی بڑے نواب ہیں۔" پُتّے کو اتنا اشارہ کافی تھا۔ دوسرے ہی دن اس نے بپن کے جھوٹے برتن صاف نہیں کئے۔ بسا اوقات وہ بپن کے لئے کھانا رکھنا بھول جاتا۔ خلاف عادت بپن خود اپنے برتن صاف کرتا اور اکثر فاقہ کرتا۔ لیکن یہ اس کی عادت نہ تھی کہ ان باتوں کی شکایت راجہ صاحب سے کرتا اور نہ وہ کمینوں کے منہ لگ کر اپنی اوقات ذلیل کرنا پسند کرتا تھا۔ اس نے اسکی بالکل پروا نہ کی اور ہر تکلیف کو برداشت کرتا رہا۔

اسی طور پر ایک طرف راجہ صاحب کی مہربانی بڑھتی رہی اور دوسری طرف رانی صاحبہ کی ناخوشی میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ حتےٰ کہ اس کی کوئی انتہا نہ رہی۔

بالآخر پے در پے مشق کے بعد "شبھدرا ہرن" کا تماشہ مرتب ہوگیا - محل کے صحن میں کھیل کا انتظام ہوا - راجہ جی نے خود کرشن کا پارٹ اختیار کیا - اور بپن نے ارجن کا - اُفوہ - اس کی آواز کیسی سریلی اور شیریں تھی اور وہ کیسا حسین معلوم ہوتا تھا - ناظرین بیخود ہو گئے اور اپنی خوبیت میں چیرز کا تار باندھ دیا -

خیر تماشہ ختم ہوا - راجہ صاحب رنواس میں تشریف لے گئے - اور رانی صاحبہ نے جواب دیا "بپن نے ارجن کا پارٹ لاجواب کیا - کسی بڑے خاندان کا لڑکا معلوم ہوتا ہے - اس کی آواز بے مثل ہے"

راجہ نے خوش طبعی سے دریافت کیا "اور میں کیسا معلوم ہوتا تھا کیا میں خوبصورت نہیں ہوں - کیا میری آواز سریلی نہیں ہے"

رانی نے کہا "تمہاری اور بات ہے" اور پھر بپن کشور کی بحیثیت ایکٹر کے تعریفیں شروع ہوگئیں -

اب پانسہ پلٹ گیا - جو پہلے تعریف کیا کرتے تھے اب انہوں نے مخالفت شروع کردی - راجہ چتر بجن قبل ازیں بپن کی مدح سرائی میں اپنی رانی کے روبرو بھی دن رات رطب اللسان رہا کرتے تھے اور اس پُرلطف مشغلہ سے کبھی اُن کی سیری نہیں ہوتی تھی یا اب یہ حال تھا کہ بپن کے نام سے نفرت ہوگئی - کوئی کچھ کہتا تو فرماتے "عقل کے دشمنوں نے بپن کی معمولی باتوں کو حد سے زائد قابل تعریف بنا رکھا ہے - اس کی شکل یا آواز میں بھلا کیا انوکھی بات ہے" کچھ عرصہ پہلے خود ان عقل کے دشمنوں میں سے ایک فرد تھے - لیکن یکایک کسی غیبی ذریعہ سے ان میں عقل کی قدردانی کے آثار نظر آنے لگے -

راجہ صاحب کو تو بپن سے کد پیدا ہوگئی مگر اس کو اب کھانا اچھا ملنے لگا - رانی بسنت کماری نے راجہ صاحب سے کہا "یہ بہت بُری بات ہے کہ بپن بابو ملازموں کے ساتھ کچہری میں پڑے رہیں - اب کچھ ہو جائیں کبھی تو انہوں نے بھی اچھے دن دیکھے ہیں -"

راجہ نے "ہوگا" کہکر ٹال دیا اور بات کا رُخ بدل دیا - رانی صاحبہ نے ایک مرتبہ خواہش ظاہر کی کہ راجکمار کے دودھ بڑھانے کی خوشی میں پھر تماشہ ہو - مگر راجہ صاحب نے سُنا اَن سُنا کر دیا -

ایکبار راجہ صاحب نے پُتّے خدمتگار کو کپڑے سنبھال کر نہ رکھنے پر بہت پھٹکارا - اس نے جواب دیا "میں کیا کروں - دن بھر بپن بابو کی ٹہل سے فرصت نہیں ملتی - رانی جی کا حکم ہے -"

راجہ صاحب کا تھرمامیٹر سو درجہ پر پہنچ گیا - بگڑ کر بولے "کیا بکتا ہے - بپن بابو کہاں کے نواب ہیں - وہ اپنا کام خود نہیں کر سکتے -"

نوکر کو پھر شہ ملی اور بپن مردود کر دئے گئے - رانی کو بپن کا گانا مرغوب تھا - درحقیقت اس کا گانا تھا ہی دلکش - جب شام کو راجہ صاحب گانا سنتے رانی بھی برابر کے کمرے میں پس پردہ بیٹھ جاتیں اور سنا کرتیں بہت جلد یہ صحبت متروک ہوگئی - راجہ صاحب مقررہ اوقات پر کھانا کھانے اور سونے لگے - بپن کی شام کے وقت ضرورت باقی نہ رہی - اور موسیقی جلسہ بند ہوگیا -

دوپہر کو راجہ صاحب زمینداری کا کام کرتے تھے - ایک روز خلاف معلوم زنان خانہ میں چلے گئے - دیکھا تو اُن کی رفیقہ حیات کچھ مطالعہ کر رہی ہیں - دریافت کیا "کیا ہے" گھبراہٹ کا جواب ملا "کچھ نہیں ذرا یوں ہی بیٹھی بپن بابو کے گیت دیکھ رہی تھی - جب سے آپ نے شام کی نشست کو خیرباد کہدیا گانا سننے کو ترس گئے"

اس بیچاری کو اس وقت یہ خیال نہ رہا کہ اس نے خود اس عادت کی ابتداءً کسقدر مخالفت کی تھی - اور اپنے شوہر کو موسیقی سے متنفر کرانے کی کتنی کوششیں کی تھیں -

دوسرے روز راجہ چتر بجن نے بپن کو برخاست کر دیا - یہ خیال بھی نہ کیا کہ غریب کو کیسے اور کہاں ایک نوالہ کا سہارا بھی میسّر آئیگا -

بپن کو محض معاش کی مصیبت نہ تھی - بلکہ اس کو راجہ سے ایک طرح کا عشق ہوگیا تھا - اور اس کی خدمت میں دلچسپی معیشت سے کہیں زائد خالص محبت پر مبنی تھی - تنخواہ کی تو اس کو پرواہ بھی نہ تھی - راجہ صاحب کی بے اعتنائی کا راز باوصف ہزار کوشش اور تلاش کے بپن کو معلوم نہ ہوسکا - اس لے دل میں کہا "یہ سب قسمت کا کرشمہ ہے اور بس" اس کے بعد نہایت دلیرانہ انداز سے مگر سب کی نظر بچا کر اس نے گہری سانس لی - اپنا پرانا ستار اٹھایا - اس پر غلاف چڑھایا جیب میں صرف دو روپیہ بچے تھے - وہ پُتّے خدمتگار کو بخش دئے - اور اس بے پایاں دنیا میں کسی طرف کو چلدیا جہاں ایک متنفس بھی البسانہ تھا جس کو وہ اپنا دوست کہہ سکتا -

(ٹیگور) شمشیر صمدی

موت

(ایک جرمن مصنف کے تخیلات)

ایک نامعلوم سے وقت میں جو نہ صبح سے تعلق رکھتا تھا نہ شام سے میری آنکھ کھلی اور مجھے صاف طور پر احساس ہوگیا کہ میں مرچکا ہوں۔ موت کے بعد فنا ہونے والے حواس ایک نیم خواب کی سی کیفیت میں مبتلا ہوجاتے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں یہ وہم رہتا ہے کہ ہماری زندگی منقطع نہیں ہوئی جسم کی ایک بار بار آنے والی یاد قائم رہتی ہے۔ جسم اپنی فنا کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ روح رخصت ہوجاتی ہے اور دل کی باطل امیدوں کے طفیل سپاہی حیثیت سے زندگی کا ایک دھندلا سا ایک عکس باقی رہ جاتا ہے۔ میرے تمام تجربات اسی حالت سے متعلق ہیں۔

ستر ہم ستاروں کے درمیان حرکت کرتے ہوئے میں غم انگیز طنزیت سے مسکرا رہا تھا۔ مجھے اس امر کی مسرت تھی کہ خودی کا احساس اور شعور کا رنگ کسی حد تک باقی ہے کیونکہ ان باتوں کی وجہ سے مجھے یہ علم تو یقینی طور پر حاصل تھا کہ میں مرچکا ہوں ...

مجھے اس امر کا احساس ہو رہا تھا کہ پچھلے دنوں جو کچھ مجھ پر گذرا ہے وہ ایک دھندلے نقش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ پچھلے دنوں کے تاثرات کبود سے آئینوں میں سے نکل کر کبود تر آئینوں میں غائب ہوجاتے تھے۔ . . . .

مجھے اپنے نوکر پانیا کا چہرہ سایہ مثال بادلوں کی طرح تاریک اور مہیب نظر آتا تھا۔ بار بار اس چہرے کا تصور مجھے کائنات کی درخشاں پہنائیوں میں سفر کرنے سے روک دیتا تھا۔

اب میرا ذہن بالکل صاف تھا!

ظاہر تھا کہ وہ تشنگی جو میرے جسم کو راکھ کررہی تھی میری روح کی تشنگی علم تھی۔ میں اپنے آپ کو خوش نصیب تصور کرتا تھا کہ مجھے اس تکلیف کے سوا اور کوئی اندوہ کرب نہیں

کسی شے نے کسی شخص نے مجھے مخاطب کیا!

کچھ عرصہ تک قصداً میں نے سنی ان سنی ایک کردی۔ کیونکہ میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ کسی شخص کو مردہ آدمیوں سے بات چیت کرنے کی اجازت نہیں۔ کیا وہ شخص جو مجھ سے مخاطب تھا یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ مردہ لوگوں کو گفتگو کے علاوہ کئی اور اہم تر کام بھی ہیں اس سرزمین کے رہنے والے اپنے آپ کو کیا سمجھتے تھے؟

یہ حقیر ذرہ ناچیز۔ یہ سرزمین جو سورج کے گرد مضحک انداز میں رقص کرتی ہے: آخر لا محالہ امن و سکون حاصل رہنے کے لئے میں نے خاموشی کا حکم دیا! لیکن اب مجھے خیال آیا کہ میرے پاس میرا ہمزاد بھی بیٹھا ہوا ہے۔ میرے ہمزاد نے میرا لباس میرے کپڑے میرے جوتے اپنے قبضے میں کرلئے تھے۔ تا آنکہ وہ میری انگوٹھی بھی اپنے ہاتھ میں پہنے تھا۔ میری نادر و رنگین انگوٹھی۔ جو پانچ نازک حصول میں منقسم تھی جس کی طلائی بانہیاں سانپ کی طرح خمدار تھیں۔

میرا ہمزاد میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اب مجھے دقت پیش آئی۔ ظاہر ہے کہ اس شخص سے معمولی انداز میں گفتگو کرنا ذرا دشوار ہے جسے آپ نے اپنی زندگی میں اکثر دھوکا دیا ہو۔ مجھے اپنے ہمزاد کے تبسم پر غصہ سا آگیا۔ میں اس زہریلے تبسم کا رازداں تھا میں نے حقارت سے کہا

"از راہ کرم فلسفہ نہ چھانٹیے گا۔"

میرے ہمزاد نے جواب دیا "میرا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں۔ علاوہ ازیں جسم اور روح کا تعلق منقطع ہوجانے کے بعد آپ کو عدم و ابد کے جھگڑوں سے کیا واسطہ؟"

میں خاموش ہوگیا۔ کچھ عرصے کے بعد میں نے کہا۔

"انگوٹھی تو مجھے عنایت فرما دیجئے۔"

میرے ہمزاد نے انگوٹھی اتاری۔ عین اسی طرح جس طرح میں کسی کو دکھانے کے وقت اتارا کرتا تھا۔ میں نے انگشتری لیکر پہننا چاہی مگر اس کوشش میں میری انگلی ٹوٹ گئی۔ میری انگلی کے دو حصے ہوگئے۔

میں نے غصے میں کہا "اچھا تو اب میری یہ حالت ہوگئی ہے؟"

میرے ہمزاد نے میری انگلی کے ٹکڑے جیب میں ڈال لئے۔

اس کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

"آپ کو بہت زیادہ توقعات نہیں قائم کرنی چاہئیں پانیا نے آپ کو جنگل میں دفن کردیا ہے۔ اور جنگل کے خودرو پھول آپ کی آنکھوں پر شگفتہ ہیں"

ہمزاد میری نظروں سے غائب ہوگیا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی قبر میں لیٹا ہوا ہوں۔ کچھ عرصہ تو میں اپنے خیالات میں غلطاں پیچاں رہا۔ مگر بعد ازاں مجھ پر ایک کامل سکون و اطمینان چھا گیا۔ الفاظ اس سکون کو بیان نہیں کرسکتے۔ میں نے آج تک ایسا اطمینان کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میں آسمانی نغموں کو سن سن کر مدہوش و مخمور سا ہوا جارہا ہوں۔ مجھ پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی

میرے ہاتھ میری چھاتی پر رکھے ہوئے تھے! میں سیدھا لیٹا ہوا تھا زمین کا بوجھ بھی میرے لئے مسرت افروز تھا۔ ماں کے ہاتھوں نے بھی شاید اس محبت سے میرے بچپن کے رنگین رخساروں کو نہ چھوا ہوگا جس طرح زمین میرے جسم کو چھو رہی تھی! میں ایک طاقتور حرکت کا احساس کررہا تھا جو زمانہ مجھ سے پوشیدہ تھا۔

میں دنیا کے واقعات کو اپنے ذہن میں دہرا رہا تھا!

شاید دائماً یونہی سردی سے منجمد یہاں اسی طرح اطمینان اور سکون سے محوِ خواب رہتا
ہوں گا۔ اس کی میٹھی نیند والی نسیم و صبا اور سنہری دھوپ سے رنگین خواب میں مل
جاتے ہوں گے۔ روشنی و تاریکی، بارش، ہوا کے سناٹے قبر تک مجھے بیک سکے۔
اس خاموشی کا وار۔ اس میٹھی نیند کے دوران میں زندگی کا ایک [illegible] پایا جاتا ہے
موسموں کی دھوپ کے باعث یا دن اور رات کی گردش کی وجہ سے ایسا شاید ہو ہو
سکے تغیر سے!

موت زندگی سے بدل جاتی ہے۔

ایک خوفناک خوف کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میرے اردگرد اور میرے اندر تاریکی چھا رہی ہے۔ تاریکی بڑھ رہی ہے جیسے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی دنیا پہ پھیلتی جا رہی ہے لیکن جب خزاں کے گرائے ہوئے پتے میری قبر پہ بکھرے پڑے ہوں یکایک یہ دنیا نے سورج کے گرد گردش کرنا بند کر دیا ہو۔ اور کسی عظیم الشان ستارے کے گرد پھرنے لگی ہو۔ ایسا ستارہ جس کے قوانین ہماری دنیا کے قوانین سے بالکل مختلف ہوں۔ اب میری تمام طاقتیں ایک روشن و رنگین نقطے پر مرکوز ہو گئی تھیں جو اسی طرح درخشاں تھا جس طرح امید آدمیوں کے دلوں میں درخشاں ہوتی ہے۔

آہستہ آہستہ مجھے معلوم ہوا کہ لامحدود فضا میں ایک دھیمی سی روشنی بڑھ رہی تھی۔ اور میرے قریب آ رہی تھی۔ اس روشنی کا رنگ سفید تھا اور اس کی شعاعوں کے متوازن خطوط بے انتہا دلفریب تھے۔ آخرکار یہ روشنی میرے دل میں داخل ہو گئی پھر مجھے محسوس ہوا کہ یہ روشنی ایک پودے کی سی ہے۔ جس کی جڑ میرے دل میں ہے اور جو تیزی سے بہشت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ پودے کی جڑ نمو کے اصل قوانین کے ماتحت میرے دل میں جذب ہو رہی تھی اور میں فطرت کے دل کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر مسرت کے طوفان میں غرق ہوتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں جڑ نے میرے دل کی گہرائیوں میں گھر کر لیا اور ایک مترنم نوا کے ساتھ میری ہستی رنگ اور نور کے ایک سیلاب کی طرح دل کے راستے پھوٹ پڑی اور باہر آ گئی۔

میری لحد کے اوپر ایک حسین غنچہ شگفتہ ہو رہا تھا اور اپنی نازک پنکھڑیوں کو سورج کی شعاعوں کے لئے ایک آغوشِ شوق بنا رہا تھا۔

یکایک میں نے کسی کے نازک قدموں کی چاپ سنی۔ اور ایک لڑکی جس کی عمر ۱۲، ۱۳ سال کی ہو گی آہستہ آہستہ دبے پاؤں میری قبر کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے بالوں میں ارغوانی رنگ کے پھول تھے۔ اور وہ بغور میری لحد کے غنچہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ صندل کی دلنواز خوشبو تمام جان کو معطر کر رہی تھی۔

یہ خوشبو اس نازنین کے گرد اس طرح ہالہ کئے ہوئے تھی جس طرح حسن کے گرد نوجوانی کے غیر مرئی [illegible]۔ اس کے پاؤں میں پازیب تھی۔ نقرئی پازیب جو شبنم کے گوہر آبدار کے درمیان چمک رہی تھی۔ جب اس نے میری قبر کے غنچے نوشگفتہ پھول کی طرف دیکھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا آسمانی نور دنیوی آلائش کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اندوہ کے آثار تھے۔ مگر اس کے چہرے پر ایک عجیب دل آویز تبسم تھا۔

وہ ایک غزال رعنا کی طرح رم کرتی ہوئی ادھر ادھر دیکھتی ہوئی بڑھی اور پھر اپنے نازک ہاتھوں کی ایک جنبش سے اس نے میری لحد کا پھول توڑ دیا۔ ....

میرا بدن تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ کو ہلانے کی کوشش کی اور میری رگوں میں سوئیاں سی چبھ گئیں ....

کہیں سے پانیا میرا نوکر سامنے آ گیا اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"آقا بولئے۔ کچھ منہ سے کہئے۔"

اس کی آواز میں خوف اور امید کی ایک دنیا لرز رہی تھی میں نے لرزتی آواز میں پوچھا "پانیا میں کہاں ہوں"

وفادار پانیا کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ اس نے کہا۔

"شکر ہے خدایا تیرا شکر ہے! اب آپ زندہ رہیں گے۔ ڈاکٹر کہتا تھا کہ اگر آپ نے آج بھی آنکھیں نہ کھولیں تو زندگی کی کوئی امید نہیں ہے"

میں نے پوچھا "کتنا عرصہ بیہوش رہا ہوں"؟

"چودہ دن"

"اُفوہ"

پانیا نے کہا آپکو یکایک بخار ہو گیا اور بخار بھی شدید تیز۔ [illegible] میں نے کہا چپ رہو پانیا۔ اس قسم کے بخار پر [illegible]

جواد حیدر

رباعی

عشرت سے ہے شام ارغوانی میری ہنستی ہے بہار کامرانی میری
آغوشِ خیال میں ہیں گلہائے جمال گلزار بدامن ہے جوانی میری

فرعون کی موت

ماتم

فرعون کی لاش

محیرالعقول انسانوں کے مجسمے

"وطن"

ان دنوں جب ملک میں امن و راحت کی فراوانی تھی۔ اور آنے والی جنگ دُور کہیں مستقبل کے پردوں میں چھپی پڑی تھی۔ موسم بہار کی ایک روشن صبح کو بیوہ خاتون اپنے دس سال کے بچے کو اینٹوں اور پتھروں کے اُن ڈھیروں میں لے گئی جہاں دولت اور امارت کی سرکشیاں۔ جاہ و اقتدار کی ہمہ گیریاں شجاعت اور جرأت کی کارگذاریاں۔ عسرت اور افلاس کی پژمردگیاں۔ حسن و عشق کی بےنیازیاں اپنے آخری مسکنوں میں بےحس و حرکت پڑی تھیں۔ بچے کو انگلی سے تھامے ہوئے شریف خاتون موت کی بستی کی سنسانیوں میں سے گذرتی ہوئی سنگ مرمر کے ایک بلند مینار کے سامنے میں کھڑی ہوگئی۔ جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

"فدائیانِ وطن کی آخری آرام گاہ"

مینار کے اردگرد قبروں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جنہیں قوم اور حکومت کی قدر افزائیوں نے طرح طرح کے کتبوں سے آراستہ کر رکھا تھا۔ خاموشیوں کی سنسان اقلیم زبانِ حال سے ان کارناموں کی مدح سرائی میں مصروف تھی جنہوں نے مرنے والوں کو بقائے دوام کی دولتوں سے ممتاز کر دیا تھا۔ اور زندوں کو یہی افسردگی کی پیہم آہوں سے یاد دلا رہی تھی۔ کہ غیور اور باحمیت مخلوق کس طرح وطن عزیز کی خاطر جان پر کھیل جاتی ہے۔

"یہ رستم کا مزار ہے"۔ خاتون ایک قبر کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ "بڑا بہادر آدمی تھا۔ لڑتے لڑتے مر گیا۔ مگر اپنی تلوار دشمن کے حوالے نہ کی" وہ چند قدم اور آگے بڑھی۔ ایک قبر تھی۔ جس کا تعویذ پتھر کا تھا۔ وہ ذرا آگے کو جھکی۔ اور کتبے کی عبارت بلند آواز سے پڑھی۔ لکھا تھا۔

صفدر

عزت کے میدان میں مارا گیا

معصوم بچہ عدم آباد کی ویرانیوں سے سہما ہوا چپ چاپ اپنی ماں کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ کہ بیوہ خاتون چلتے چلتے ایک مزار کے سرہانے کھڑی ہوگئی شگفتہ پھولوں کا ہار رکھدیا۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "بیٹا۔ یہ تیرے جانباز باپ کی قبر ہے" ننھے ننھے ہاتھ بے اختیار دعا کو اُٹھے۔ اور معصوم آنکھیں پُرنم سے آنسوؤں سے تر ہوگئیں۔ غمگین ماں کہنے لگی "لڑائی دن بھر ہوتی رہی۔ ہم تھوڑے تھے۔ اور دشمن بہت۔ ایک ایک کر کے تمہارے باپ کے ساتھی ہلاک ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ اکیلا رہ گیا۔ اس کا تمام جسم زخموں سے چھلنی ہو رہا تھا۔ مگر وہ برابر لڑے جا رہا تھا۔ سورج ڈوبنے کو تھا۔ جب دشمنوں نے اُسے گھیر لیا۔ وہ ضعف سے گرا۔ اور دشمن اس پر پل پڑے۔ مگر بہادر افسر نے ایک آخری کوشش کی۔ اس کا نعرہ ہوا میں گونجا۔ اس کی آبدار تلوار ڈوبنے والے سورج کی آخری شعاعوں میں چمکی۔ اور دشمنوں کے افسر کا سر زمین پر آ رہا۔ پھر کیا تھا۔ آہ سفاک لٹیرے یکدم ٹوٹ پڑے۔ اور چشم زدن میں تمہارے بہادر باپ کا خاتمہ ہو گیا"۔ خاتون خاموش ہوگئی۔ بچے نے ایک سرد آہ بھری۔ بڑھا۔ اور قبر سے لپٹ کر کہنے لگا "اماں۔ میں بھی بڑا ہوں گا۔ تو سپاہی بنوں گا" ماں نے آمین کہا۔ اور دونوں ماں بیٹے واپس مڑے۔

کئی سال کے بعد دشمنوں نے وطنِ عزیز کی سرزمین کو پھر ایک بار اپنے سرکش گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کر دیا۔ اور گذشتہ شکستوں کا انتقام لینے کے لئے آہن پوش انسان زمین کی زرخیز اور آباد وسعتوں پر چھا گئے۔ آدم کے بیٹے دیرینہ عداوتوں کے جوش میں درندوں کی طرح ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اور دنیا کی فضا دردمندوں کی چیخوں سے معمور ہوگئی۔ فرزندانِ وطن آرام اور آسائش کو ترک کر کے جان بکف میدان میں نکل پڑے۔ اور اپنی جانبازیوں سے دشمنوں کی غاصبانہ یورشوں کو ناکام کر کے چھوڑا۔ جنگ برسوں جاری رہی۔ اور جب ختم ہوئی۔ تو قبرستان میں لاتعداد قبروں کا اضافہ ہو چکا تھا

موسم بہار کی ایک روشن صبح کو وہی خاتون تن تنہا پھر ایک بار فدائیانِ وطن کی آخری آرام گاہ کے پاس کھڑی تھی۔ مگر ملول اور افسردہ۔ غم کی زردیوں نے اسکے چہرہ کی رنگینیوں کو پامال کر دیا تھا۔ اور اسکی چمکدار آنکھوں کی نور افشانیاں پیہم اشک فشانیوں سے ماند پڑ چکی تھیں۔ آج شگفتہ اور شاداب پھولوں کے دو ہار اسکے ہاتھ میں تھے۔ وہ آہستہ آہستہ بڑھی۔ اور دو قبروں کے درمیان جا کر کھڑی ہوگئی۔ ایک قبر پرانی تھی۔ اور دوسری نئی۔ ہار نذر چڑھا کر وہ بے اختیار نئی قبر سے لپٹ کر زار زار رونے لگی۔ قبر پر لکھا تھا۔ قاسم "بہادر باپ کا بہادر بیٹا"

(ماسٹر امیر حسن ناز بی۔ اے سیالکوٹ)

خیالات و احساسات

(اناطول فرانس کے شاہکار ایپیکورس کے باغ کے بعض حصوں کا ترجمہ)

(جُوا)

میں اسی طرح جس طرح عاشق محبت کرتے ہیں۔ اور متوالے شراب پیتے ہیں۔ جوا کھیلنے والے جوا کھیلتے ہیں۔ اندھے ہوکر۔ مجبور ہوکر ایک نہ رکنے والی طاقت کے زیر اثر۔ یہ وہ لوگ ہیں جو جوئے کے لئے وقف ہوچکے ہیں۔ ان لوگوں کی طرح جنہوں نے اپنی زندگی کو محبت کے لئے وقف کردیا ہے

سچ تو یہ ہے کہ جوئے میں کچھ ایسی بات ہے جو باہمت والے لوگوں کے دلوں میں اضطراب پیدا کردیتی ہے۔ انہیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔

کیا قسمت آزمانا کوئی معمولی حسرت ہے؟

کیا یہ حسرت انتہائے کیف کی آئینہ دار نہیں۔ جس کے ذریعہ ہم ایک لمحے میں خوف اور امید کی ایک عمر گذار دیتے ہیں۔

جُوا کیا ہے؟

میں سمجھتا ہوں کہ ان تغیرات اور انقلابات کو جو قسمت سے عمر کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے ہیں ان احساسات اور جذبات کو جو تقدیر نے زندگی کے پہلوؤں میں پوشیدہ کر رکھے ہیں۔ ایک ہی لمحے میں سمیٹ لینا۔ جُوا ہے۔

جوا تقدیر کے ساتھ جنگ کرنے کا نام ہے۔ آمنے سامنے یہ ڈاکٹر فاسٹس اور شیطان کا مقابلہ ہے۔

امکان یہ ہے کہ پانسے کا ایک داؤ کھیلنے والے کو دلکشا باغات رنگین و ریشمین ملبوسات اور بے انتہا دولت کا مالک بنا دے گا۔ صرف یہی چیز نہیں بلکہ انسانی روحیں بھی اس کی تابع فرماں ہوں گی۔ روپے سے کیا نہیں خریدا جاسکتا

جو کچھ انسان نے تخیل کے خوابہائے رنگین میں زندگی کا انتہائی مقصد تصور کیا تھا وہ حاصل ہو جائے گا۔

میں جانتا ہوں اگر جوئے کے ساتھ صرف نہ ختم ہونے والی امیدیں وابستہ ہوتیں تو اس کی طاقت کم ہوجاتی مٹ جاتی۔ مگر یہ چیز ظالم بھی ہے۔ بے رحم انسان کش ظالم! اس کے ناخن پتھر کے ہیں اور یہ ہیبتناک شے غربت اور ننگ و ناموس کی بربادی کی ضامن بھی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے متوالے جان و دل سے اس پر عاشق ہیں۔ تمام عظیم جذبات کی تہ میں خوف و خطر کی کشش چھپی ہوئی ہے۔ خوفناک چٹان نزدیک ہو تو مسرت مکمل ہوکر نظر آتی ہے۔ اس کے بغیر عشرت میں لطف ہی نہیں۔ خوف اور حسرت کا امتزاج دل و دماغ کو نشے میں غرق کردیتا ہے۔

جوئے سے زیادہ کیا شے ہیبتناک ہے؟ ایک ہاتھ سے زر و جواہر۔ دوسرے ہاتھ سے موت۔ اس کا منطق ہمارے منطق کے اصولوں کا پابند نہیں۔ یہ اندھا ہے۔ گونگا ہے۔ بہرا ہے۔ ہمہ گیر ہے ہمہ رس ہے۔ یہ بھی ایک دیوتا ہے۔

اس دیوتا کے بھی پجاری ہیں۔ بھگت ہیں۔ یہ لوگ اس دیوتا کی پوجا کرتے ہیں اور جب یہ فرماں نہیں مارتا ہے تو وہ اس کے آگے سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ یہ دیوتا بے رحمی سے ان کا خون تک نچوڑ لیتا ہے اور یہ پجاری اپنے آپ کو الزام دیتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں: "میں ٹھیک طریق سے نہیں کھیلا"۔

وہ اپنے آپ میں نقص دیکھتے ہیں۔ اپنے دیوتا کو بُرا بھلا نہیں کہتے۔

مہتاب رائے

رباعی

خواہش بادۂ طہور نہیں ہے — میکدہ میرے گھر سے دور نہیں

ہے تمہارا جمال جنت عشق — حور ہو تم اگرچہ حور نہیں

عابد

مُڑی ہُوئی ناک والا آدمی

(مائیکل ارلن کی مشہور عالم کتاب "دلفریب شخصیتیں" سے ماخوذ)

بہار کے دن تھے۔ عجائب گھر میں مصوری کے شاہکاروں کی نمائش ہو رہی تھی۔ نعیم اور میں اپنے ذوقِ سلیم کا امتحان لینے کے لئے نمائش دیکھنے چلے۔

ہم نے اِدھر اُدھر پھر کر تصویروں پر وہ نظر ڈالی جو فطرت کی گہرائیوں تک پہنچ کر صنعت کا راز دریافت کر لیتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ان سرخ و سپید نقوش میں شعلۂ حیات کی ایک بھی چنگاری نہ تھی۔ ہماری محنت اکارت گئی۔

ہم واپس لوٹ رہے تھے کہ دروازے سے اِدھر ہمیں ایک بلند قامت شخص ملا۔

اس نے نعیم سے مخاطب ہو کر کہا "جناب اگر آپ مجھے یہ بتا سکیں کہ مسٹر سمیع الرحمٰن کی تصویریں کہاں آویزاں ہیں تو میں آپ کا ممنون ہونگا"۔

نعیم نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا "آپ کو یقین ہے کہ آپ کی مراد سمیع الرحمان ہی سے ہے؟ آپ کہیں مسٹر کلیم الرحمٰن کی تصویریں تو نہیں دیکھنا چاہتے؟"

میں نے اپنے دل میں نعیم کو ہزار ہزار صلواتیں سنائیں جھوٹا کہیں کا۔ سمیع الرحمٰن۔ کلیم الرحمٰن۔ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نہیں جانتا۔ اب اپنی لاعلمی کو فریب سے چھپانا چاہتا ہے۔ خدا جانے کلیم الرحمٰن کوئی مصور ہے بھی یا نہیں۔

بلند قامت اجنبی نے کہا "سمیع الرحمٰن"

اور اس کے لہجے سے مترشح تھا کہ وہ مسٹر سمیع الرحمٰن کے علاوہ اور کسی مصور کی تصویریں نہیں دیکھنا چاہتا۔ اشتہاری زبان میں اس نے زوردار الفاظ میں نقلی مال خریدنے سے انکار کر دیا تھا۔

نعیم نے مسکرا کر کہا "تو آپ خوش نصیب ہیں۔ ہمیں سمیع الرحمٰن سے عشق ہے۔ اس طرف آیئے"

یہ کہتے ہوئے نعیم ایک طرف چل پڑا۔ بلند قامت اجنبی خاموشی سے ہمارے ساتھ ساتھ آرہا تھا۔ اس کی عمر ۲۵ اور ۳۰ کے درمیان ہوگی اس کی ناک ایک طرف کو مڑی ہوئی نہ ہوتی تو اسے خوبصورت کہا جا سکتا تھا۔ اور اگرچہ اس کی صورت شکل شریف آدمیوں کی سی تھی مگر اس کے انداز سے ایسے عزمِ آہنی کا اظہار ہوتا تھا کہ اس سے گفتگو کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں ظریفانہ جولانی کا ایک دریا لہریں لے رہا تھا۔ اس نے اپنی نرم ٹوپی بانکوں کی طرح کجکلاہی کے سے انداز میں پہنی تھی۔

آخر الامر ہم ایک بڑی نیلی تصویر کے سامنے جا پہنچے۔ اب اُس تصویر کا بیان کون کریگا جو تمام نیلی ہی نیلی تھی۔ سپاہیوں کے پاؤں کے نیچے روندا ہوا گھاس نیلا تھا۔ سپاہیوں کا چہرہ نیلا تھا۔ ان کی بندوقیں نیلی تھیں۔ ایک نیلے درخت کے ساتھ سہارا لگائے ہوئے ایک نیلا آدمی کھڑا تھا۔ اس کا رنگ یاس خیز نیلا تھا۔ سپاہی بندوقوں سے شست باندھے ہوئے کھڑے تھے۔ کوئی شبہ نہ تھا کہ وہ اس تنہا نیلے شخص کو گولی سے اڑا کر کسی جرم کی سزا دینا چاہتے ہیں۔

نعیم نے کہا "سمیع الرحمٰن"

"جھوٹا" میں نے اپنے دل میں کہا۔

بلند قامت اجنبی محو تھا۔ اس نے اپنی ٹوپی اور کج کر لی۔

میں نے نعیم سے کہا: "آؤ چلیں" مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ہم اس کی محویت میں ناجائز دخل دے رہے ہیں۔ بلند قامت اجنبی نے سنجیدگی سے کہا "بات یہ ہے جناب کہ میں جنگ اور ہلاکت کے متعلق بہت کچھ جانتا ہوں۔ میں نے کئی آدمی مارے ہیں۔"

نعیم نے پوچھا "آپ فوج میں ہیں؟"

اجنبی نے تنک کر جواب دیا۔ "نہیں جناب۔ میں فوج ووج میں نہیں ہوں۔ میں ایک بیتونلی ہوں۔"

اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی شے سلگتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

میں نے عجز سے کہا "بندہ پروری سے نام لیجئے "بیتون" کیا ہے۔

"بنیون آرمینیا میں ایک قلعہ ہے۔ پچھلے ۵۰۰ سال سے بنیوں نے لڑائی جاری رکھی۔ مگر اس وقت بنیوں جلے ہوئے شہروں اور سلگتے ہوئے پتھروں کا ایک ڈھیر ہے۔

بنیون آرمینیا کے پہاڑی لوگ ہیں۔ میں ایک آرمینوی ہوں۔ اور میں نے رومی ٹوپی جو پہن رکھی ہے۔ اس میں ایک راز ہے اور آپ کی زبان جو سمجھتا ہوں اس میں بھی ایک راز ہے۔"

نعیم نے کہا "آہ! مجھے افسوس ہے"

"کیوں" اجنبی نے برافروختہ ہو کر پوچھا

"اس لئے کہ آپ سے بہت برا سلوک ہو رہا ہے۔ یہ قتل و غارت کی داستانیں جو........"

اجنبی نے نعیم کی طرف دیکھا۔ اور پھر ہنس پڑا۔

"سنو" اس نے کہا "ترکوں نے ہزاروں آرمینوی مار ڈالے ہیں۔ مگر آرمینوں نے بھی ہزاروں ترک قتل کئے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ پچھلے ۵۰۰ سال کے عرصے میں آرمینوں کا پلہ بھاری ہی رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے آرمینوی ہونے پر فخر ہے۔ جناب۔ میں بے انتہا ممنون ہونگا۔ اگر آپ اپنے اخبار و رسائل کے ذریعے انگلستان کو یہ پیام پہنچا دیں کہ آرمینیا کو بندوقوں کی ضرورت ہے۔ پتلونوں اور آٹے کی نہیں۔ خدا حافظ۔ جناب! خدا نے چاہا تو آپ سے پھر ملاقات ہوگی۔ میں ایک سرکاری کام کو سرانجام دینے کے لئے آیا ہوں"۔

اجنبی رخصت ہو گیا۔

میں نے کہا "میں نہ جانتا تھا کہ آرمینوی ایسے ہوتے ہیں۔ یہ شخص تو بہت خوب اردو بولتا ہے"۔

(۲)

ہم سینما سے واپس آرہے تھے۔ منٹگمری روڈ کی موٹریں تیز رفتار رتاباں و درخشاں پریوں کی طرح اڑی چلی جا رہی تھیں۔ وہ موت کی سی خاموشی کا طلسم جو آدھی رات کے وقت طاری ہو جاتا ہے۔ ٹوٹ گیا تھا۔ مگر موٹروں کے گزر جانے کے بعد ان موٹروں کے گزر جانے کے بعد جن میں حسین و جمیل نازنینیں نیلم اور زمرد میں غرق ضیا افروز تھیں۔ سڑک پھر سنسان ہو جائیگی۔

بہر نوع اس وقت کسی شخص کو ایک تیز رفتار کے موٹر کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھنا ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ یہ شخص ہمارے پاس سے موج برق کی طرح گزر گیا۔ ایک ہلکے نیلے رنگ کی موٹر کے تعاقب میں۔ ہم ذرا فاصلے پر تھے۔ اس لئے جو شخص اس موٹر میں سے نکل کر منٹگمری روڈ کی ایک کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ اسے نہ پہچان سکتے تھے۔ مگر میرا اندازہ تھا کہ وہ ایک موٹا پست قد آدمی ہے۔ یکایک تعاقب کرنے والا نوجوان غائب ہو گیا.....

نعیم نے کہا "تم کیا سمجھتے ہو وہ کیوں اس موٹر کا تعاقب کر رہا تھا؟"

میں نے جواب دیا "یونہی"۔

نعیم نے کہا "اب کہاں غائب ہو گیا۔ شائد کسی حمام میں نہانے گیا ہے۔ موٹر کاروں کا تعاقب کرنا آسان کام نہیں ہے۔ دانتوں پسینہ آجاتا ہوگا"۔

ہم اس مکان کی طرف چل پڑے جس کے آگے موٹر کھڑی ہوئی تھی۔ باقی مکانوں کی طرح یہ مکان بھی تاریکی اور خاموشی میں گھرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہم واپس لوٹنے کو تھے کہ ایک نوجوان مجھ سے ٹکرا گیا۔

"آہ" نعیم نے کہا۔

"معاف کیجئے گا"۔ اجنبی نے کہا۔ واقعی اس کا چہرہ پسینے سے تربتر تھا۔

آرمینوی نوجوان نے متکلف تہذیب سے کہا "شب بخیر۔ جناب معاف کیجئے گا۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ اور مجھے ایک ضروری کام کی تکمیل کے لئے جانا ہے"۔

وہ قریب سے گزرنا چاہتا تھا کہ نعیم نے کہا "ہم نے محسوس کیا ہے کہ آپ کو بہت جلدی ہے بات تو یہ ہے کہ ہم نے اس کے سوا اور کچھ محسوس ہی نہیں کیا"۔

آرمینوی نوجوان نے تلخ لہجے میں پوچھا "تو آپ حضرات نے مجھے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا؟"

دائیں طرف سے پولیس کا ایک سپاہی آرہا تھا۔

میں نے کہا "آپکو بھاگتے ہوئے صرف ہم ہی نے نہیں دیکھا۔ بلکہ قانون کے اس نمایندے نے بھی دیکھا ہے۔ جو اس وقت اپنی پوری مہابت و عظمت سے اس طرف خراماں خراماں چلا آرہا ہے"۔

نعیم نے کہا "اگر آپ فضول سوالات سے بچنا چاہتے ہیں تو چپ چاپ ہمارے ساتھ چلے آئیے"۔

اجنبی نے کہا۔ "میں یہاں سے ایک انچ نہیں ہلونگا۔ آخر کار

نے اسے ڈھونڈ نکالا ہے ۔ میں یہاں سے ہرگز حرکت نہیں کروں گا۔"
میں نے کہا "مگر وہ بھی جیسے آپ نے ڈھونڈ نکالا ہے حرکت
کریگا ۔ دیکھئے نا ۔ وہ اپنے مکان میں داخل ہوگیا ہے اور رات
بارہ بجے کا عمل ہے ۔"
آرمینوی نے کہا۔ "آہ ۔ جناب پاشا بہت چالاک ہیں۔"
نعیم نے کہا۔ "یہ جناب پاشا کون ہیں؟"
میں نے کہا۔ "دیکھئے آرمینوی صاحب یا تو کوئی سازش ہے ۔
یا سازش نہیں ۔ دونوں صورتوں میں آپ احمق بنینگے ۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔"
نعیم نے میری بات پوری کی۔ "اس لئے مناسب ہے کہ آپ
ہمیں اپنا ہمراز بنا لیجئے ۔ ہم ہندوستانی ہیں اور خود ایک محکوم قوم
ہونے کے باعث تمام محکوم قوموں سے ہمدردی رکھتے ہیں ۔"
نوجوان آرمینوی نے خوفناک لہجے میں کہا "میں نے یہ بات محسوس
کی ہے"
ظاہر تھا کہ وہ ایک پڑھا لکھا نوجوان ہے ۔
ہم اسے درمیان میں لئے ہوئے ٹہل رہے تھے ۔
نعیم نے پوچھا "آپ کے پاس کے بم ہیں؟"
آرمینوی نے تنک کر کہا "جناب"
نعیم نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا "جناب تم ہو گے"
آرمینوی نے نرمی سے کہا "میں صرف اسقدر کہنا چاہتا تھا
کہ آپ احمق معلوم ہوتے ہیں ۔ کیا میں ایسا شخص نظر آتا ہوں ۔
جو بم لئے لئے پھرے ۔ مجھے ریوالور پسند ہیں"۔
میں نے کہا "اچھا! آپ کو ریوالور پسند ہیں۔"
قارئین کرام کو علم ہونا چاہئے کہ میں نے مندرجہ بالا الفاظ طنزاً
استعمال کئے تھے ۔ "اور" آرمینوی نے سلسلہ کلام کو گویا جاری
رکھتے ہوئے کہا "ایک گولی کافی ثابت ہوتی ہے ۔"
میں خاموش ہوگیا ۔
نعیم نے پوچھا "اور جناب پاشا سے آپ کو کیا کام ہے؟"
"کچھ نہیں" آرمینوی نے جواب دیا "کچھ نہیں ۔ آج رات کے
بعد جناب پاشا کو کوئی کام نہ رہیگا۔"
آج جناب پاشا مر جائیں گے"۔
آرمینوی چلتے چلتے رک گیا پھر نعیم کی طرف مخاطب ہوکر بولا
(مجھے تو وہ تخاطب کا سزاوار نہ سمجھتا تھا) "آپ نے میرے معاملات
میں دخل در معقولات دیا ہے اور میں نے کچھ نہیں کہا ۔ میں نے آپ

پر اعتبار کیا ہے ۔ کیونکہ میں فطرتاً ایک امید افزا ذہنیت کا مالک
ہوں ۔ میں آپ کی شرافت کو مدنظر رکھکر یہ فرض کئے لیتا ہوں ۔
کہ آپ میرے کام کی تکمیل میں حارج نہ ہونگے ۔ اگر میں آپ کی خدمت
میں یہ عرض کروں کہ اس معاملے میں ایک کمسن لڑکی کی عزت اور
آبرو کا تعلق ہے تو آپ میرے عزم آہنیں کی قوت کا کچھ اندازہ
قائم کر سکیں گے ۔ خدا حافظ ۔ حضرات ۔ مجھے ایک بہت اہم کام کرنا
ہے ۔"
نعیم نے کہا۔ "ٹھہرئیے ۔ آپ اس موٹر کا تعاقب کیوں کر رہے تھے ۔
اور جناب پاشا کون ہیں؟"
آرمینوی نے مخمل کی طرح نرم لہجے میں جواب دیا۔ "احمد عزت پاشا
انجمن اتحاد و ترقی کا رکن۔"
"آہ!" نعیم نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "اب میں سمجھ
گیا ۔ انور پاشا ۔ جمال پاشا ۔ طلعت پاشا ۔ احمد عزت پاشا ۔ اراکین انجمن
اتحاد و ترقی ۔ اب میں سمجھ گیا ۔ انور پاشا تو مر چکے ہیں۔"
آرمینوی نے سنجیدگی سے کہا۔ "چار نوجوان آرمینیا سے نکل کر
دنیا میں پھیل گئے ۔ ہر ایک کو انتقام لینا تھا ۔ ایک نے برلن میں
طلعت پاشا کو قتل کردیا ۔ پچھلے دنوں سیریا میں جمال پاشا بھی مارا
گیا ۔ انور پاشا بخارا بھاگ گیا ہے ۔ مگر وہ ہماری آتش انتقام کے
شعلوں سے محفوظ نہ رہ سکیگا ۔ میں نے احمد عزت پاشا کو ڈھونڈ نکالا
ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ میں اس کا تعاقب کر رہا ہوں ۔ گذشتہ دو سال
سے وہ ہندوستان میں پھر رہا ہے ۔ اب مجھے موقع مل گیا ہے ۔
میں جانتا ہوں کہ اسے ہمیشہ کے لئے خوف کی لعنت سے آزاد
کرکے میٹھی نیند سلا دوں"۔
یہ کہکر وہ اپنے آپ کو چھڑا کر دوڑ جانا چاہتا تھا ۔ کہ نعیم نے
اسے پھر مضبوطی سے تھام لیا ۔ "ٹھہرئیے جناب ۔ آپ کو شاید علم
نہیں کہ ایک پاشا کو قتل کرنے کے بعد صاف بچکر نکل جانا دشوار ہے ۔
بلکہ محال ہے ۔"
آرمینوی نے کہا۔ "صاحب من! میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس
مکان میں ایک لڑکی مقید ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کو چھڑاؤں ۔
ازراہ کرم اب آپ حضرات اپنے کاموں کی طرف توجہ دیجئے ۔ مجھے
میرے حال پر چھوڑ دیجئے ۔"
میں نے پوچھا۔ "تو اس مکان میں آپ کی محبوبہ مقید ہے ۔"
آرمینوی نے جھکتے ہوئے انداز سے کہا "احمق ۔ وہاں میری ہمشیرہ

مقید ہے۔"

نعیم نے حکم دیا۔ "پکڑ لو اسے۔" میں نے آرمینوی کی دونوں باہیں پکڑ لیں۔ اور نعیم نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دئے۔ یوں تھامے ہوئے ہم اسے سڑک کے ایک طرف لے آئے۔ نعیم نے کہا "اب ارشاد فرمائیے۔ آپ کی ہمشیرہ کا کیا قصہ ہے۔"

آرمینوی نے بے صبری سے چیختے ہوئے جواب دیا "آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ کیا میں آپ کو اپنی بے آبروئی کی تمام تفصیلات سے مطلع کروں؟ کیا میں اس تاریک رات کا حال بیان کروں جس کے پردہ پوش اندھیرے میں یہ ملعون بہ خبیث میری ہمشیرہ کو گھوڑے پر سوار کر کے لے آیا تھا۔ کیا میں آپ کو قتل و غارت کی خونفشاں داستانیں سناؤں۔ کیا میں آپ کو سناؤں کہ ترکوں نے کس طرح میری آنکھوں کے سامنے میرے والدین کو سنگینوں سے ہلاک کر دیا۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ میں اپنی ہمشیرہ کو عزت پاشا کے قبضے سے نکال کر دم لونگا۔ اور اپنے دل کی پیاس کو اس کے خون سے بجھاؤنگا۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ جہاں بھی وہ جاتا ہے۔ میری ہمشیرہ کو اپنے پاس کے کمرے میں بند کر دیتا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ وہ آج بھی اس کے پاس والے کمرہ میں بند ہوگی۔ حضرات۔ پاشا کی نیند بہت ہلکی ہے۔ اور رات گذرتی جا رہی ہے۔ اجازت دیجئے۔"

نعیم نے کہا "سنئے جناب آرمینوی! پاشا کو قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ اپنی ہمشیرہ کو چھڑا لیجئے۔ اور بس۔ اگر پاشا کو قتل کرنے کے بعد آپ پھانسی چڑھ گئے (اور ایسا ہونا یقینی ہے) تو آپ کی ہمشیرہ کی غور پرداخت کون کریگا؟ یہ بھی سوچا ہے آپ نے؟"

آرمینوی نے کہا "ناممکن! جس وقت میں مکان میں داخل ہونگا وہ جاگ پڑیگا۔ وہ میری راہ میں مزاحم ہوگا اور میں۔۔۔۔۔۔"

نعیم نے کہا "میں اور میرا دوست آپ کی مدد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اگر آپ وعدہ کریں کہ۔۔۔۔" "میں کوئی وعدہ نہیں کرتا۔"

نعیم بولا۔ ہم دونوں جناب پاشا کو پکڑے رہیں گے۔ اور تم اپنی ہمشیرہ کو لے آنا۔ جب تم اشارہ کروگے ہم جناب پاشا کو چھوڑ دیں گے۔ مگر شرط یہ ہے کہ تم جناب پاشا کو کوئی نقصان نہ پہنچاؤ۔ اور یہ قتل وغیرہ کا احمقانہ خیال چھوڑ دو۔ ہوا وعدہ؟"

آرمینوی نے جواب دیا "نہیں"

"ہوا وعدہ" نعیم نے پھر کہا۔

"ہوا" آرمینوی نے ہم دونوں کی طرف غور سے دیکھا۔

میں نے پوچھا۔ "مگر مکان میں داخل کس طرح ہونگے ہم"

آرمینوی نے کہا "بہت آسانی سے۔"

اس نے جیب سے ایک چمکتی ہوئی چیز نکالی۔ چھوٹے سے خنجر کی طرح۔

"یہ شے لکڑی کو اس طرح کاٹتی ہے جس طرح تیز چاقو کاغذ کاٹ ڈالتا ہے۔"

نعیم نے کہا "معاملہ بہت صاف ہے۔ ہم موٹر پر سوار ہو کر جائیں گے۔ جس مکان کے آگے موٹر کھڑی رہے۔ پولیس کے سپاہی سمجھتے ہیں وہاں کوئی جرم ہو ہی نہیں سکتا۔"

مکان کے پاس پہنچکر آرمینوی نے کہا "پہلے ہم دائیں طرف کے کمرے دیکھتے ہیں۔ یاد رکھئے جونہی آپ پاشا کی خوابگاہ میں پہنچے۔ اس کا منہ بند کر لیجئے گا۔ ورنہ اپنی چیخوں سے وہ آسمان سر پر اٹھا لیگا۔ میں اپنی ہمشیرہ کو لیکر آپ کی موٹر میں بیٹھ جاؤنگا۔ جب میں دوبارہ موٹر کا ہورن بجاؤں آپ سمجھ لیجئے کہ میری ہمشیرہ محفوظ ہے۔ اس وقت آپ بھی بھاگتے ہوئے آجائیے۔ پھر ہم تمام موٹر پر بیٹھ کر فرار ہو جائیں گے۔"

ہماری تقدیر اچھی تھی۔ پہلے ہی کمرے میں جناب پاشا محو خواب تھے۔ ہم نے تیزی سے انہیں پکڑ لیا۔ انہوں نے ایک چیخ ماری۔ مگر اس کے بعد انہیں کوئی موقع نہیں دیا گیا۔ ایک تولیہ ان کے منہ میں ٹھونس کر ہم نے انہیں بستر کے نیچے دبا دیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد ہم نے انہیں باہر نکال کر اس کے منہ پر ایک مفلر باندھ دیا اور انہیں پلنگ سے مضبوط کس دیا۔ اب پہلی بار ہم نے ان کی صورت دیکھی۔ ان کی آنکھیں شعلہ بار تھیں۔ گنجان ابرو۔ چوڑا چکلا ماتھا۔ ایک منٹ کے لئے انہوں نے رہائی کی کوشش ترک نہیں کی۔

نعیم نے کہا۔ جناب پاشا۔ آپ بہت ظالم ہیں۔"

پاشا نے اس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔ یکایک ساتھ کے کمرے میں سے دراز بند کرنے کی آواز آئی۔ اس آواز کو سنکر پاشا بیتاب ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں دیوانگی اور اضطراب کا ایک ناقابل بیان اثر پیدا ہوگیا۔ اس نے پوری قوت سے اس تھوڑے

عرصے کے بعد موٹر کا ہارن بجنے کی آواز آئی۔

ہم نے جناب پاشا کو کھول دیا۔

اب وہ بالکل خاموش تھے۔ شاید انہیں اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اب شور مچانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ مگر اپنے حواس درست کرنے کے بعد انہوں نے فصیح و بلیغ اردو میں (جو کسی پاشا کو نصیب نہیں ہو سکتی) ہمیں وہ وہ صلواتیں سنائیں کہ خدا کی پناہ۔ اردو زبان کی لغت میں جسقدر تضحیک طنز اور استحقار کے لفظ ہو سکتے تھے انہوں نے تمام ہماری شان میں صرف فرمائے۔ پھر وہ دوڑتے ہوئے پاس کے کمرے میں گئے۔ ہم بھی پیچھے پیچھے تھے۔ اس کمرے میں سوائے ایک لوہے کی مختصر سی الماری کے اور کچھ نہیں تھا۔ جو بالکل خالی تھی۔

واپس اپنے کمرے میں آ کر وہ غصے سے پھر چلانے لگے۔

میں نے عجز و الحاح کے لہجے میں کہا "کیا آپ احمد عزت پاشا نہیں ہیں؟"

اس نے کمزور آواز میں کہا "میرا نام محمد حسین ہے۔ میں دکاندار ہوں۔ اور میرے پاس مغلیہ عہد کی دستی تصاویر کا بہترین مجموعہ تھا۔ جو اب میرے بیٹے کے پاس ہے۔ آپ حضرات کی حماقت کی طفیل میرا بیٹا اس وقت ہزاروں روپے کا مالک ہے۔"

نعیم کو کچھ خیال آیا۔ مجھے بھی وہی خیال آیا۔ ہم دونوں کھڑکی کی طرف گئے۔ موٹر موجود نہ تھی۔ نعیم نے محمد حسین کی طرف مسترحمانہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر کہا "مجھے افسوس ہے۔"

میں نے کہا "مجھے افسوس ہے۔"

مسٹر محمد حسین نے گویا کچھ سنا ہی نہیں وہ گویا اپنے آپ سے کہہ رہے تھے۔

"دو سال ہوئے جب میں نے اسے عاق کیا تھا تو اس نے کہا تھا آبا جان یاد رکھئے میں ایکدن آپکی زندگی کے سرمایہ کو چرا لیجاؤنگا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ اپنی دھمکی کو پورا کریگا۔ وہ شیطان مجسم ہے۔ اپنے آپ کو گلیوں کا بانکا کہتا ہے۔ کہتا ہے "احمق امیرزادے فوراً میرے فریب میں آجاتے ہیں۔" وہ ان سے جو چاہتا ہے کام لیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ ذرا احمق امیرزادے ہیں۔ ایسے لوگوں کی اسے تلاش رہا کرتی ہے۔

اب میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ حضرات اس نقصان کے عوض جو آپکے مجرمانہ افعال نے مجھے پہنچایا ہے ۰۰۰۰ ا روپیہ ادا کریں۔ ورنہ میں پولیس کو اطلاع دیدونگا۔"

نعیم لکھ پتی ہے۔ ۰۰۰۰ ا روپیہ کی اسے کوئی پرواہ نہیں۔ مگر موٹر اسے لاکھوں سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ اس نے کہا "دیدونگا۔ مگر میری موٹر کا کیا ہوگا۔"

محمد حسین نے کہا "کیسی موٹر"

جسمیں آپ کا فرزند بلند اقبال بیٹھ کر چمپت ہو گیا ہے۔ وہ میری ہی موٹر تو تھی۔"

مسٹر محمد حسین مسکرائے۔

پھر فرمانے لگے "اس کے متعلق آپ بہتر جانتے ہیں۔"

عابد

رباعیات

ہے گرم ہر ایک سمت بازارِ فنا
ہے دارِ حیات سر بسر دارِ فنا
لیکن کیونکر جہاں کو فانی سمجھوں
ذرّہ کو بھی جب نہیں ہے اقرارِ فنا

رواں

یہ ہستی جزو کُل نہیں ہونے کی
مستی پابندِ مُل نہیں ہونے کی
محفل بدلے، لگن بدل جائے مگر
یہ شمعِ حیات گُل نہیں ہونے کی

رواں

انگریزی ناول نگاری کی مختصر تاریخ

ناول حقیقت میں انسانی زندگی کے مختلف تغیرات کی ایک دلکش اور سچی تصویر ہوتی ہے۔ لفظ ناول لاطینی زبان کے لفظ ناویس سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں۔ جدید بانئی، اطالوی زبان میں اسی کے مشابہ لفظ ناولا ہے۔

ناول میں تمام کردار حالات اور محبت کے رازونیاز، "خیالی" اور فرضی ہوتے ہیں۔ اور اس لئے ناظر کے لئے بالکل نئے ہوتے ہیں۔ لیکن عموماً ناولوں کے خاکہ کی بنا واقعات زمانہ پر رکھی جاتی ہے۔ یا ایسے واقعات پر جن کے پیش آنے کا امکان ہو۔

ناول ایک طول طویل "افسانہ" ہے اور اب لٹریچر (ادب) کی ایک قابلقدر شاخ تصور ہوتا ہے۔

ناول کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ متواتر مناظر فطرت پیش کر کے تفریح طبع کا سامان بہم پہنچائے، اور واقعات میں ایک دلفروز اور دلچسپ تسلسل پیدا کر دے۔

اس امر کی ضرورت نہیں کہ ناول میں "محبت" کا جزو شامل ہو، بلکہ وہ خود نوشتہ سوانح حیات خطوط کا مجموعہ، داستان، زمانہ کے رسوم ورواج اور طرز تمدن کا آئینہ دار نصیحت بھی ہو سکتا ہے۔

یہ عام بات ہے کہ ناول نگاری میں، بہ نسبت ادب کی دوسری شاخوں کے، دماغ پر بہت کم بار پڑتا ہے۔ مگر اس سے اس واقعہ کی تردید نہیں ہوتی۔ کہ بعض دنیا کے نہایت ممتاز اور اعلیٰ پایہ کے ناول نگار جن کی تعداد عموماً بہت محدود ہوتی ہے۔ ایسے مضامین لکھتے ہیں، جو اپنے فن کے لحاظ سے بہترین نظموں کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

ناول کا حقیقی اصول ڈرامے کی مانند یہ ہے کہ وہ مسلسل واقعات کے ارتقا کو، مخالف کرداروں کے تنازعات، اور غیر معمولی واقعات کے اثرات کے ساتھ ساتھ بیان کرے۔

ناول وہی مصنف بہت خوبی سے لکھ سکتا ہے، جسے زندگی کے نشیب وفراز، زندگی کے شیریں، اور تلخ واقعات کا تجربہ حاصل ہو۔ اور جوانی کے غیر محدود تخیلات کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ اس کے دماغ میں موجود ہو۔

ناول کے اجزائے ترکیبی۔ ناول، خاکہ، اتفاقات، مکالمہ، خیالات، ظرافت، مسرت وعشرت اور رنج وغم کے بیان پر مشتمل ہوتا ہے جس ناول میں یہ تمام باتیں موجود ہوں، وہ انسانی زندگی کی تصویر کہلانے کا مستحق ہے۔

تاریخی ناول۔ تاریخی ناول کسی خاص تاریخی زمانہ کے حالات اور انقلابات کو ایک لطیف پیرائے میں بیان کرتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ تاریخی ناول کا افسانہ اتنا ہی خیالی ہوتا ہے، جتنا کسی اور سادہ ناول کا۔ لیکن فرق یہ ہے کہ تاریخی فسانہ، اس خاص زمانہ کی فضا، سوسائٹی اور طرز معاشرت کو، جس کے متعلق بیان کرنا منظور ہے۔ بالکل سچے حالات میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح سر والٹر اسکاٹ کے "ویورلی ناول" جو انگلینڈ میں "تاریخی ناول نگاری کے نقوش اولیں تصور ہوتے ہیں۔ انگلینڈ کے ازمنۂ وسطےٰ کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں۔ اسکاٹ کے زمانہ کے بعد انگریزی میں تاریخی ناول لکھے گئے ہیں۔

تاریخی ناول کے اصول حسب ذیل ہیں۔

(۱) عہد ماضی کو زندہ کرنا، اور ماضی کی زندگی کے حقائق کا اعادہ کرنا۔

(۲) اپنے آپ کو اسی زمانہ میں تصور کرنا، جس کا حال بیان کرنا مقصود ہے۔

(۳) اپنے آپ میں اس دور کے خاص جذبہ کو موجود سمجھنا جو اس زمانہ میں پایا جاتا تھا اور انہیں پیچیدہ واقعات اور خیالی کرداروں کے زندہ لباس میں پیش کرنا۔

(۴) عہد گذشتہ کے واقعات میں اپنی طرف سے جابجا دلچسپ باتیں شریک کرنا۔

مختلف تاریخی ناول نگار، اپنے اپنے خیالات اور طبائع کے مطابق اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے مختلف تاریخی دور منتخب کرتے ہیں۔ اسکاٹ کے لئے ازمنۂ وسطےٰ میں ایک خاص کشش مستور تھی۔

اور ٹھیکرے کو کوئین اینی کے زمانہ سے جید دلچسپی تھی۔ چنانچہ اسی کے عہد کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے اپنے نہایت مشہور تاریخی ناول ہنری اسمانڈ کا پلاٹ تیار کیا۔

تاریخی ناول کا نصب العین؟ تاریخی ناول کا صرف یہی نصب العین نہیں ہوتا کہ وہ کسی خاص زمانہ سے منسوب کر دیا جائے۔ بلکہ اسے چاہیئے کہ وہ اجتماعی طور پر انسانی زندگی کے حالات کی چھان بین کر کے انہیں حقیقت کی روشنی میں پیش کرے۔

نارمنوں کے حملہ کے بعد اور پندرھویں صدی تک معمولی درجہ کے منظوم رومانی افسانے ہی انگلینڈ میں اس ضرورت کو پورا کرتے رہے جس کی جگہ بعد میں نثر فسانے، نے لی ہے۔ ان رومانوں میں تاریخی حقیقت اور سچائی کا بہت ہی خفیف سا عنصر شامل ہوتا تھا۔ یہ فسانے ملکی تمدن و معاشرت اور مناسب حالات پیش کرنے کی بجائے عموماً دلیری اور غیر معمولی طاقت و ہیئت کی داستانیں بیان کرتے تھے۔ اور اس لئے ابتک ناول کا وجود نہ تھا۔ اطالوی فسانوں کی زیادہ قدر کی جاتی تھی۔ اور انہیں کے تراجم اکثر انگریزی میں رائج تھے۔ اطالوی فسانوں سے متاثر ہو کر لی نے ۱۵۷۹ء میں ایک کتاب "ایوفیوز" تصنیف کی، یہ نہایت دلچسپ تصنیف تھی اور ادبی نقطۂ نظر سے نہایت بلند پایہ کی کتاب تھی اور اسے انگریزی کا سب سے پہلا ناول تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کانگریو نے ۱۶۹۲ء میں ایک کتاب انکاگ نیٹا تصنیف کی۔ اٹھارھویں صدی کے اوائل میں مختصر فسانے انگریزی میں ترجمہ کئے جاتے تھے۔ لیکن وہ ناول نہ ہوتے تھے۔ انگریزی ناول نگاری کی بنیاد دراصل نشاط جدیدہ کے وقت پڑی، لیکن اس کے بعد بھی جو ناول لکھے گئے، ان سے قوت تخلیق و اختراع کا اظہار ہوتا تھا۔ بلکہ وہ بھی اطالوی ناولوں کے ترجمے اور خیالات ہوتے تھے۔ لاٹب اور اس کے ساتھ کے دوسرے مضمون نگاروں نے ایک قدم آگے بھی بڑھایا۔ لیکن ان کی شکل نثر کسی کو پسند نہ آئی۔ لیکن رجعت یعنی عود شاہی کے بعد لوگ فرانسیسی، تہوارنہ رومانوں کے ترجموں سے اپنی تفریح طبع کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔

بنیان کی تصنیف "پلگرمس پروگریس" آئندہ ناول نگاری کی رہنمائی میں بہت ممد و معاون سمجھی گئی۔ اس کتاب میں ناول نگاری کا ایک دھندلا سا خاکہ نظر آتا ہے۔ کوئین اینی کے عہد حکومت میں (جو ڈاکٹر جانسن کا زمانہ کہلاتا ہے) رسالہ ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر نے جو جوزف ایڈیسن اور رچرڈ اسٹیل کی ادارت میں شائع ہوتے تھے، اپنی کردار نگاری اور عہد موجودہ کے رسوم و رواج اور طرز معاشرت کے متعلق مضامین لکھ کر جدید افسانوں کی بنا ڈالی۔ ڈیفو نے اپنے طویل بیانات، مقررانہ موزونیت، اور سلیس عبارت سے، فسانہ نگاری کو ٹھیک اور صحیح "خیالی فسانہ نگاری کے راستہ تک پہنچایا۔ ان تمام تصانیف میں کم و بیش عموماً ناول نگاری کی دو ضروری خصوصیات یعنی

(۱) نفسیاتی تجربہ (۲) تعمیر موضوع کی قلت ہوتی تھی۔

اٹھارہویں صدی کے درمیانی حصے میں یعنی ۱۷۴۰ء میں جب ڈرامانگاری زوال کی طرف جارہی تھی۔ حقیقی سیموئل رچرڈسن نے انگریزی ناول کو صحیح معنی میں ناول بنادیا۔ وہ ایک قابل کتب فروش تھا۔ اور صحیح معنوں میں انگریزی ناول نگاری کی رہنمائی کا سہرا اسی کے سر ہے۔ اس نے سوچا کہ اخلاق کا سبق دینے اور ناتجربہ کار نوجوانوں کو بُری عادتوں سے بچانے کے لئے خیالی کرداروں کے نبادلہ خطوط کا سلسلہ بہت مفید ہو سکتا ہے اور اس خیال سے اس نے "پامیلا" تحریر کی جس کا دوسرا نام "ورچو ریوارڈیڈ" ہے اور یہ ناول نگاری کے فن کے اعتبار سے ایک مکمل تصنیف ہے۔ اس کی دوسری تصنیف "کلاریسا ہارلو" ہے۔ جس نے اس کی شہرت کو بہت وسیع اور مستحکم کر دیا۔ لیکن رچرڈسن کا طرز نگارش صرف خطوط نگاری ہے۔

رچرڈسن سے زیادہ قابل ستائش فیلڈنگ ہے جس نے اپنی کتاب ٹام جونس (۱۷۴۹ء) میں عہد موجودہ کی زندگی اور معاشرت کی ایک بے نظیر تصویر پیش کی ہے۔

ان کے علاوہ تیسرا مصنف جو ان کے بعد آتا ہے اسمالٹ ہے اس کی ایک تصنیف راڈرک ریمڈس جو رچرڈسن اور فیلڈنگ کی کتابوں سے بالکل مختلف نوعیت کی ہے۔ اس کے بعد پھر آسٹرن۔ ڈاکٹر جانسن اور گولڈسمتھ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں موخرالذکر سب سے اچھا ناول نگار تھا۔ اس کی تمام تصانیف نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ لیکن (ناول) ویکار آف ویکفیلڈ انگریزی ادب کی بلند پایہ تصانیف اور شاہکاروں میں شمار کیجاتی ہے۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں تین خواتین فسانہ نگاری میں ممتاز حیثیت رکھتی تھیں۔

(۱) مس فرانسیس برنی یہ ایک معمولی درجہ کی فسانہ نگار تھی۔

(۲) مس ایج ورتھ نہایت بلند پایہ فسانہ نگار ہے۔ اسکاٹ نے اس کے ناولوں سے متاثر ہو کر بعض ناول لکھے ہیں۔

(۳) جین آسٹن "خانگی طنز نگاری" میں کوئی ثانی نہ رکھتی تھی۔

سروالٹر اسکاٹ نے انگریزی ادب میں تاریخی رومان کا ایک بیش بہا ذخیرہ بہم پہنچایا ہے۔ وہ انسانی زندگی کو نہایت گہری نظر سے دیکھتا تھا۔ اور اس کی شخصیت بھی شیکسپیر کی طرح ہمہ گیر ذہنیت رکھنے والی تھی۔

لارڈ لٹن ڈزریلے درخشاں اور لطیف ڈرامی رنگ کے ماہر ہیں۔ ان کے بعد ڈکنس اور تھیکرے ہیں جنہوں نے وکٹوریا کے اوائل عہد اور جارجوں کے زمانہ کی انگریزی زندگی کی چھان بین کی۔

تھیکرے کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ ہم دیوان خانہ میں ہیں۔ ڈکنس ہم کو لندن کی گلی اور کوچوں کی سیر کراتا ہے۔ اور اسکاٹ کے ساتھ ہم ماضی کی دلچسپ فضا میں پہنچ جاتے ہیں۔ مسز برونٹ جذبات کو ابھارنے والی داستانیں پیش کرتی ہے۔ اور چارلس ریڈ کی تحریریں اسقدر لطیف ہوتی ہیں کہ اسکو اسکاٹ کے مساوی خیال کر سکتے ہیں۔

بعد کے ناول نگار کنگز لے ٹرولوپ۔ جارج ایلیٹ۔ میریڈتھ اور سب سے آخر میں ٹامس ہارڈی ہیں۔ ان تمام وکٹورین ناول نگاروں میں ہم سوسائٹی کی اصلاحِ اطوار کا بہت بڑا شائبہ پاتے ہیں۔ اور اس کو درجۂ تکمیل تک پہنچانے کا کام موجودہ صدی کے مصنفوں کے ذمہ ہے۔

محشر عابدی

رباعیات

خاکی ہے مگر خاک سے بالاتر ہے ۔۔۔ تو عقل میں افلاک سے بالاتر ہے
تحقیق میں اسکی ہے عبث سرگرداں ۔۔۔ وہ راز جو ادراک سے بالاتر ہے

(۲)

تھم جائینگے اشک خود ہی بہتے بہتے ۔۔۔ ہو جائینگے چپ غموں کو سہتے سہتے
یہ رات کٹیگی نہ کسی طرح عزیز ۔۔۔ سو جائینگے ہم فسانہ کہتے کہتے

(۳)

ساقی وہی صہبائے مقطر نکلے ۔۔۔ مینا سے وہی بادہ احمر نکلے
رنداں مے آشام سے پردہ کب تک ۔۔۔ خاتون خم میکدہ باہر نکلے

(۴)

باقی نہیں اب کوئی لقا کی صورت ۔۔۔ ظاہر ہوئی اعضا سے فنا کی صورت
پیری کرتی ہے نیستی کو ثابت ۔۔۔ ہے قد خمیدہ حرف لا کی صورت

(غیر مطبوعہ)

عزیز لکھنوی

سدا سکھ

(شہرۂ آفاق فرانسیسی فسانہ نگار موپاساں کا ایک ماسٹر پیس)

بحرِ سفید کے کنارے ایک مکان میں چائے کی میز پر بے تکلف احباب جمع تھے۔ سورج، دور افق میں چھپ چکا تھا۔ آسمان اس کی آخری کرنوں سے گلابی ہو رہا تھا۔ صحبت پُرلطف تھی۔ محبت کے معاملے پر گفتگو ہو رہی تھی۔

"محبت" یہ وہ سب سے زیادہ پرانا، سب سے زیادہ موہوم، مگر کبھی کوئی بھی اُس کی حقیقت سمجھ نہیں سکا۔ بادشاہ سے لے کر فقیر تک، عالم اور فلسفی سے لیکر جاہل اور گنوار تک: کون ہے جو اس شرابِ طہور کا مزہ چکھ نہیں چکا؟ لیکن پھر بھی یہ اب تک ایک چھپا ہوا راز ہے۔ ہر دل اسے جانتا ہے۔ مگر کوئی زبان بھی اس کا بھید کھول نہیں سکتی۔

اس وقت دوستوں میں ابھی ابدی اور قسمیہ موضوع پر بحث ہو رہی تھی۔ شفق کا وقت بھی عجیب ہوتا ہے۔ دل میں ایک خاص نرمی، سوز، اور سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی گفتگو بھی نرم اور سست تھی۔

"محبت"۔ "محبت" یہ طلسمی لفظ، بار بار زبانوں پر آتا تھا۔ کبھی مردوں کی زبانوں پر، کبھی عورتوں کی زبانوں پر، اور کمرے میں اس طرح گونج جاتا تھا جیسے کوئی چہچہاتی ہوئی بلبل یا مست روح، وجد کر رہی ہے۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی، زندگی بھر اپنی محبت میں سچا اور پکا رہے؟"

بعض نے کہا، ہاں اور بعضوں نے کہا، نہیں۔ ابھی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک شخص نے جس کی نگاہیں سمندر کی خاموش نیلی سطح پر پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"دیکھو، وہ کیا ہے؟"

پانی کی سطح پر دور افق کے کنارے کوئی نیلا نیلا بڑا سا تودہ دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ عورتیں بڑے تعجب اور خوف سے اس چیز کو دیکھنے لگیں جسے انہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

محبت سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلہ ہے جس پر انسان ہمیشہ سے غور کر رہا ہے۔

ایک دوست نے کہا:۔

"یہ جزیرۂ کارسیکا ہے۔ جہاں شہنشاہ نپولین پیدا ہوا تھا۔ آب و ہوا کی تبدیلیوں کی وجہ سے یہ سال میں صرف دو مرتبہ اسی طرح دکھائی دیتا ہے"۔

جزیرے کے پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی دکھائی دے رہی تھی جس پر برف کی سفید براق چادر پھیلی ہوئی تھی۔ سب تعجب کر رہے تھے کہ سمندر میں سے یکایک یہ کیا نئی دنیا نکل آئی ہے۔ ضرور کولمبس وغیرہ دریائی سیاحوں نے اس طرح کے بہت سے عجیب منظر دیکھے ہونگے۔

"سنو!" مجمع میں سے ایک شخص نے جو اب تک بالکل چپ تھا کہا "اس جزیرے نے ظاہر ہو کر مجھے ایک عجیب واقعہ یاد دلا دیا۔ یہ واقعہ خود میں نے اپنی آنکھوں سے اسی جزیرے میں دیکھا تھا"

"تم نے کیا دیکھا تھا؟" ایک خاتون نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"میں نے وہاں ایک آباد، پائیدار، اور سدا سکھ محبت دیکھی تھی!" یہ کہکر اس نے زانو بدلا اور اس طرح قصہ سنایا:۔

پانچ برس ہوتے ہیں کہ میں کارسیکا کی سیر کو گیا تھا۔ جزیرے میں میدان نہیں ہیں۔ تمام زمین، دشوار گزار پہاڑوں سے بھری پڑی ہے۔ آبادی بھی اَن پڑھ۔ گنوار۔ اکھڑ۔ لڑاکا۔ اور جنگلی ہے۔ مگر ساتھ ہی مہمان نواز اور صاف دل بھی ہے۔ ہر مسافر کے لئے دروازہ کھلا رہتا ہے۔ اور ہر مہمان کے لئے محبت کا دسترخوان چنا رہتا ہے۔ وہاں نہ ہوٹل ہیں نہ چائے خانے، نہ سرائیں ہیں۔ نہ مسافر خانے۔ مگر کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ پردیسی، کسی بھی جھونپڑے پر پہنچ جائے کھانے کو پہاڑوں کا دال دلیا اور سونے کو کشادہ جگہ ہر وقت حاضر ملیگی۔

ایک دن ایسا ہوا کہ میں دس گھنٹے چلنے کے بعد تھکا ماندہ ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے پہنچا۔ دروازے پر ایک عورت نے میری آؤ بھگت کی۔ اس کی عمر تو زیادہ تھی۔ مگر صورت کی اچھی اور سفید

پوش تھی۔ اس کے قریب ایک بوڑھا آدمی اسی کے گدے پر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھکر وہ بھی آداب بجا لایا اور بے کچھ کہے سنے بیٹھ گیا۔

"انہیں معاف کیجئے" عورت کہنے لگی، "یہ بہرے ہیں۔ اسّی کے اوپر عمر پہنچ چکی ہے"۔

عورت کی بولی، صاف بتا رہی تھی کہ وہ فرانسیسی ہے۔

"تم اس ملک کی تو نہیں معلوم ہوتیں" میں نے اختیار کہہ اٹھا۔

"نہیں" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا "ہم فرانس کے ہیں مگر یہاں پچاس برس سے زیادہ گزر چکے ہیں"۔

میں نے ڈرا اور اچنبھے سے عورت کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور سوچنے لگا فرانس کے یہ لاڈلے شہری، اور اس وحشی جزیرے میں پچاس برس!

ابھی میرے حواس درست نہ ہوئے تھے کہ ایک بوڑھا چرواہا آ گیا۔ ہم سب کھانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دسترخوان پر جو کی بھوسی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہم جلد فارغ ہو گئے۔ میں اٹھ کر دروازے پر آ بیٹھا۔ اور گرد کے اجاڑ پہاڑوں کو رنج و افسوس کی نظر سے دیکھنے لگا۔ عورت بھی فوراً آ گئی اور جیسا کہ ایسے ویرانوں میں بسنے والوں کی عادت ہے۔ میرے حالات کی ٹوہ لینا چاہی۔

"ہاں، تو کیا تم فرانس سے آ رہے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں میں دل بہلانے کے لئے سیر و سیاحت کر رہا ہوں"

"شاید خاص پیرس کے رہنے والے ہو؟"

"نہیں، شہر نانسی میں میرا گھر ہے"۔

اُس وقت مجھے محسوس ہوا کہ نانسی کا نام سن کر عورت کا رنگ بدل گیا۔ وہ ذرا ہکلا کر کہنے لگی:۔

"تم نانسی کے ہو!"

اس اثنا میں اس کا بوڑھا شوہر بھی آ گیا۔ اس کا چہرہ تمام بڑوں کی طرح ایسا تھا جیسے بند کتاب۔ کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کس قسم کا آدمی ہے اور کیا سوچ رہا ہے۔

"کوئی حرج نہیں۔ یہ سنتے نہیں" عورت نے جلدی سے کہا۔ پھر ایک لحظہ رک کر کہنے لگی:۔

"تو تم نانسی کے کچھ لوگوں کو جانتے بھی ہو گے؟"

"ہاں میں سب کو جانتا ہوں"

"خاندان سینٹ اولیر کو بھی؟"

"ہاں اچھی طرح۔ اس گھر کے کئی آدمی میرے باپ کے دوست تھے"

"تمہارا کیا نام ہے؟"

میں نے نام بتایا۔ وہ دیر تک ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر بے حد اداس اور دھیمی آواز میں کہنے لگی:۔

"ہاں، ہاں، مجھے اب تک یاد ہے۔ اچھا تو برزمر کے خاندان پر کیا گزری؟"

"تباہ ہو گیا"

"اور سیرمون کے خاندان کو بھی جانتے ہو؟"

"خوب جانتا ہوں۔ اس خاندان کا آخری آدمی، فوج کا سپہ سالار تھا"۔

یہ سننا تھا کہ ایک عجیب گھبراہٹ اس پر ظاہر ہوئی۔ سناٹے میں آ گئی۔ اس کی حالت کچھ ایسی ہو گئی کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ لیکن وہ کوئی ایسا ہی طاقتور جذبہ تھا۔ مقدس جذبہ، جس نے اس کی مدتوں کی بند زبان اچانک کھول دی۔

"ہاں، ہنری دی سیرمون" اس نے جوش سے چلا کر کہا۔

"میں بھی اسے جانتی ہوں۔ کیوں نہیں؟ وہ میرا باپ تھا!"

میں نے بڑی حیرت اور بے چینی سے عورت کو غور سے دیکھا۔ مجھے فوراً یاد آ گیا کہ مدت ہوئی نانسی کے شرفا میں اس واقعہ سے تہلکہ پڑ گیا تھا۔ کہ ایک کم سن، خوبصورت، اور مالدار دوشیزہ سوزان دی سیرمون، اپنے باپ کی فوج کے ایک سپاہی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ یہ سپاہی ایک کسان کا لڑکا تھا۔ مگر خوبصورت اور بانکا جوان تھا۔ اس نے اپنے سپہ سالار کی لڑکی سے محبت کی۔ دونوں میں ساز باز ہوا، اور وہ چل دئے۔ لیکن یہ بات کیونکر ہو سکی؟ دونوں کو کہاں جمع ہونے کا موقعہ ملا؟ کس طرح معاملہ طے پایا؟ یہ ایک راز اور معمہ تھا اور اس وقت سے برابر سربستہ چلا آ رہا تھا۔ ایک دن صبح لوگوں نے صرف اس قدر سنا کہ رات کو دونوں بھاگ گئے۔ اس سے زیادہ کسی کو کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اور نہ ان کا کہیں سراغ ہی مل سکا۔

"مجھے یاد آ گیا" میں نے کہا "تو کیا تمہارا ہی نام مس سوزان ہے؟"

عورت نے سر ہلا کر اقرار کیا۔ پھر اس کی آنکھوں سے مرجھائے ہوئے گالوں پر آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہو گئیں۔ دیر تک چپ اور جوش سے جھومتی رہی۔ پھر اپنی کانپتی ہوئی انگلی سے بوڑھے خرانٹ کی طرف، جو گم صم اپنی جگہ پر بیٹھا تھا۔ اشارہ کر کے کہنے لگی:۔

"یہی وہ ہے!"

اس نے کچھ اس طرح اشارہ کیا اور ایک ایسے انداز میں یہ لفظ کہا کہ مجھے یقین ہو گیا وہ اب تک محبت کے نشے سے چور ہے۔ لیکن میں خود اس کی زبان سے صاف صاف اقرار سننا چاہتا تھا:۔

"بیگم! تمہیں اپنی زندگی میں کبھی خوشی بھی نصیب ہوئی؟"

اس کے دل کی گہرائی سے ایک آواز نکلی اور میرے دل کے پار ہو گئی۔

"ہاں!" اس نے بڑے اطمینان اور نمایاں شکرگزاری کے ساتھ جواب دیا۔

"میں ہمیشہ خوش رہی ہوں۔ ان کی بدولت!" یہ کہتے ہوئے اس نے پھر بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ مگر اس دفعہ اس کی انگلی میں کپکپی نہ تھی۔

میں نے محبت کی اس زندہ دیوی پر ایک حسرت بھری نظر ڈالی پھر تعظیم سے اپنا سر جھکا دیا۔ اس وقت میرے دل نے کہا۔

یہ محلوں میں پلی ہوئی لڑکی اس دہقانی کے ساتھ ہو کر خود بھی دہقانی بن گئی۔ اس نے اپنے لئے ایک ایسی زندگی پسند کی جس میں نہ کوئی شان ہے نہ کوئی آسائش، بلکہ دیہاتی سادگی اور غربت اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ لیکن اس پر بھی وہ خوش ہے اور محبت کی شراب سے مست ہو رہی ہے!

ایک سورما اور عزت والے سپہ سالار کی یہ لڑکی، موٹا جھوٹا پہنتی ہے۔ دال دلیا، خاک کے دسترخوان پر بیٹھ کے کھاتی ہے۔ لکڑی کی بھدی کرسی پر آرام کرتی ہے۔ رات کو زمین کے بچھونے پر اپنے دل کے مالک سے مل کر دراز ہو جاتی ہے۔ نہ کوئی تکلیف اس کے جوش کو کم کر سکی۔ نہ کوئی مصیبت اس کی محبت کو سرد کر سکی!

خاندان سیر مون کی اس دُلاری کو کبھی کسی بات کا بھی غم نہیں ہوا۔ نہ اپنے سنگھار کا خیال آیا۔ نہ ہیرے موتی کے گہنے یاد آئے۔ وہ عالی شان محل، وہ مخمل اور زربفت کے بچھونے، وہ قسم قسم کے کھانے، سب یکلخت بھول گئی، اسے کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ جب تک یہ بوڑھا گنوار اس کی آنکھوں کے سامنے موجود ہے، وہ ساری دنیا سے بے نیاز ہے! اللہ اکبر، محبت! تیرا نشہ کتنا سخت اور پائیدار ہوتا ہے۔

اس نے اٹھتی ہوئی جوانی میں اپنی مسکراتی ہوئی شہری زندگی سے منہ موڑ لیا۔ ماں باپ کو چھوڑ دیا۔ اور اس معمولی سپاہی کے ساتھ اس ویرانے میں آ پڑی۔ صرف یہی غریب سپاہی اس کے لئے سب کچھ ہوا۔ وہی اس کا بادشاہ ہے۔ وہی اس کی دنیا ہے۔ اس کی آنکھ کا نور، اور دل کا سرور ہے۔ اگر کسی اپنے جیسے امیر کے گھر میں ہوتی تو شاید یہ خوشی نصیب نہ ہوتی!

میں انہی خیالات میں رات بھر جاگتا اور بوڑھے سپاہی کے خراٹے سنتا رہا جو سپہ سالار کی لڑکی کے پہلو میں پاؤں پھیلائے بےخبر پڑا سو رہا تھا۔ اس کے مطمئن خراٹے زبان حال سے کہہ رہے تھے۔ کہ بوڑھا خوش نصیب ہے۔ کیونکہ ایک وفادار عورت کی محبتوں کا مرکز بنا ہوا ہے! صبح تک میں اس معمولی اور سادہ واقعہ پر اور اس بے حساب خوشی پر غور کرتا رہا جو اس قدر آسانی سے دو آدمیوں کو حاصل ہو گئی تھی۔

سویرے میں نے دونوں عاشقوں کو سلام کیا اور مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔

یہ کہہ کر قصہ کہنے والا چپ ہو گیا۔ مجمع پر ایک خاموشی چھا گئی۔

"ممکن ہے ایسا ہوا ہو۔" دیر کے بعد ایک خاتون کی آواز سنائی دی" اس لڑکی کی ہمت بہت پست تھی۔ اس کی زندگی کا مقصد بہت ہی معمولی تھا۔ اس کی امیدیں، وحشی انسانوں کی طرح گنتی کی چند تھیں۔ میں تو اُسے ایک بے وقوف اور الھڑ لڑکی خیال کرتی ہوں!"

"آہ!" ایک اور دھیمی آواز سنائی دی جو ایک دوسری خاتون کے منہ سے نہیں۔ ٹوٹے ہوئے دل سے نکل رہی تھی "آہ! اس سے کیا ہوتا ہے؟ اس نے زندگی تو سُکھ میں بسر کی!"

اب جزیرے کی پہاڑیاں، رات کے اندھیرے میں چھپتی جاتی تھیں۔ شاید وہ اسی لئے ظاہر ہوئی تھیں کہ ان بوڑھے بچے عاشقوں کی داستان ہمیں سنائیں جو ان کے دامنوں میں مسرت و راحت کے مزے لوٹ رہے تھے۔

(ترجمہ) عبدالرزاق ملیح آبادی

چاندنی رات میں سمندر کی سیر

رات خاموش، فضا سرد، ہوائیں خوشبو! ــ آسماں صاف، لئے چاند کا روشن پہلو
لہریں ساکن ہیں، سمندر پہ سکوں ہے طاری ــ سطحِ افلاک پہ اک نور کا چشمہ جاری!
آسماں پر شبِ مہتاب کے جلوے عریاں ــ سینۂ آب پہ ہیں چاند کی کرنیں رقصاں
مطربِ خلد کا اک نغمۂ زریں ہے فضا ــ یا کسی حور کا اک دامنِ رنگیں ہے فضا

آج ہنگامۂ دنیا سے بہت دور ہوں میں ــ ایک عالم ہے کہ تنہائی میں مسرور ہوں میں
سینۂ بحر پہ کشتی ہے خراماں میری ــ حسنِ رنگیں سے نظر کیف بداماں میری

سطحِ دریا پہ ہے کرنوں کا تبسم جادو ــ چاندنی رات میں لہروں کا ترنم جادو
حسنِ مخمور کرن! موجِ جمالِ مدہوش ــ دو حسین سطحِ سمندر پہ ہوئے ہم آغوش
سطحِ دریا نہیں یہ مخزنِ انوار ہے ایک ــ محملِ شب کے لئے دامنِ زرتار ہے ایک

جذب ہو کر مجھے اس حسن میں رہ جانے دے ــ چاندنی گاتی ہے۔ اے وقت مجھے گانے دے

صبح ہوتے ہی بدل جائیں نہ یہ طور کہیں
کاش میں لوٹ کے اب جا نہ سکوں اور کہیں

(غیر مطبوعہ)

وقار انبالوی

یورپ کے شاعروں کی بپتا

میرے خیال میں ہر ملک کے شاعر کا مزاج ایک ہی قسم کا ہوتا ہے ——— یعنی شاعر ہمیشہ حاضر کی دلبستگیوں میں محو اور مستقبل کے افکار سے بے پروا رہتے ہیں۔ ان کی گفتگو سے عقلمندی، نکتہ سنجی اور حرکات سے حماقت کا اظہار ہونا مستقل مزاجی۔ بے پروائی اتنی کہ شدید ترین زلزلہ سے بھی متاثر نہ ہونا اور نزاکت و لطافت اسقدر کہ ایک پیالے کے ٹوٹنے کا بھی سخت رنج ہونا ——— یہ ہے ایک شاعر کا مزاج جو ہر پہلو سے دولت اور ناموری حاصل کرنے کے ذرائع کا سخت دشمن ہے۔

شعرائے مغرب جسقدر اپنے علم و فضل کے لئے مشہور ہیں اسی قدر اپنی غربت اور بے کسی کے لئے بھی مشہور ہیں پھر بھی ان لاتعداد خیرات خانوں میں، جو غربا کی مشکلات رفع کرنے کے خیال سے قائم کئے گئے ہیں۔ مجھے صرف ایک ایسا خیرات خانہ ملا جو فلاکت زدہ مصنفین کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اس کی بنیاد پوپ اربن ہشتم نے ڈالی تھی۔ اور اس کا نام "لاعلاج بیماروں کی آرامگاہ" اس خیال سے رکھا گیا تھا کہ جس طرح غربت زدہ لوگوں کا آسودہ ہونا ناممکن ہے۔ بعینہٖ شعرا کے لئے دولت و ثروت کا منہ دیکھنا بھی ایک امر محال ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر (یہ ایک ایسے خط کا ترجمہ ہے جو انگلستان سے باہر بھیجا جا رہا ہے)۔ میں تمہیں قدیم یا موجودہ زمانہ کے شعرا کا حال لکھنے بیٹھوں تو تم سمجھو گے کہ میں نے دنیا کی بدبخت ترین ہستیوں کی سوانحعمری لکھنی شروع کر دی ہے!۔

قدیم شعرا میں ہومر سب سے پہلا قابل توجہ شاعر اور بھکاری ہے۔ وہ نابینا تھا اور اپنے اشعار گلیوں میں گاتا پھرتا تھا۔ مگر مشہور ہے کہ اس کا منہ روٹیوں کے ٹکڑوں کی بجائے اشعار سے زیادہ بھرا رہتا تھا! بذلہ سنج پلاٹس کی حالت ہومر سے بہتر تھی۔ اسے دو کام آتے تھے یعنی ایک تو شاعری دوسرے پیٹ پالنے کے لئے چکی چلانا! ٹیرنس نے تمام عمر غلامی میں گذار دی اور بونیتھس نے جیل خانہ میں وفات پائی۔

اطالوی شعرا میں پالو بورگیس، جو کسی صورت میں ٹاسو سے گھٹ کر نہ تھا۔ چودہ مختلف پیشوں میں ماہر تھا مگر اس کی موت حد درجہ غربت کی حالت میں واقع ہوئی۔ کیونکہ اسے کہیں بھی کوئی کام نہ مل سکا! خود ٹاسو کو اپنے احباب سے اکثر ایک پونڈ اس لئے قرض لینا پڑا کہ وہ ایک مہینہ تک اس دنیا میں زندہ رہ سکے۔ اس نے اپنی ایک نظم میں اپنی بلی سے نہایت عاجزی سے اس کی آنکھوں کی روشنی میں کام کرنے کی اجازت طلب کی ہے کیونکہ اس کے پاس کوئی موم بتی تک موجود نہ تھی! مگر آہ بیچارے بونیٹو گلیبو کی حالت پر خاص طور پر افسوس ہوتا ہے۔ اس کی بذلہ سنجی اور ظریفانہ تصانیف نے اطالوی زبان کو ہمیشہ کے لئے زندگی بخشدی۔ اس نے خیراتی کاموں اور خیرات خانوں کے بنانے میں بہت بڑی دولت صرف کی مگر جب آخر عمر میں اسے بھی پیسہ پیسہ کے لئے محتاج ہونا پڑا تو اسے اس کے اپنے قائم کردہ خیرات خانوں میں بھی جگہ نہ مل سکی۔

اسپین میں مشہور ہے کہ کر یوانٹس کی موت فاقوں سے واقع ہوئی اور اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ مشہور عالم کاموئس کے آخری ایام ایک خیراتی ہسپتال میں ختم ہوئے۔

اگر فرانس کی طرف دیکھا جائے تو وہاں اس سے کہیں زیادہ تعداد میں ایسے واقعات ملیں گے۔ جو شعرا کے مصائب اور پبلک کی ناقدردانی کو ظاہر کرتے ہیں۔ واگلاس، جو اپنے عہد کا بہترین اور حد درجہ نیک نیت شاعر تھا۔ الو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ دن بھر اپنے قرضخواہوں کے ڈر سے گھر کے اندر چھپا رہتا تھا اور صرف رات کو اندھیرے میں باہر نکلنے کی جرأت کرتا تھا۔ اس کے وصیت نامہ کے آخری الفاظ یہ ہیں:۔

"مگر شائد میرے تمام اثاثہ کو فروخت کرنے کے بعد بھی میرا قرض پورا نہ ہو سکے اس لئے میری استدعا ہے کہ میرے مردہ جسم کو اطبا کے حوالہ کر دیا جائے اور اس کی معقول قیمت لیکر قرضخواہوں کو دیدی جائے تاکہ اگر زندگی میں نہیں تو مرنے کے بعد ہی میرا یہ ناچیز جسم کچھ کارآمد ثابت ہو۔

کیسنڈر گو اپنے عہد کے قابل ترین شعرا میں سے تھا - لیکن اس کی تمام قابلیت اسے شکم پری کے وسایل دریافت کرنے میں کوئی امداد نہ دے سکی - رفتہ رفتہ اس کے دل میں خلق خدا کی طرف سے، جو اس کی قدر نہ کرتی تھی اور جس کے دل میں وہ رحم کا نام نشان تک نہ پاتا تھا نفرت پیدا ہو گئی - یہاں تک کہ اخیر میں وہ خدا پر بھی بے رحمی کا الزام لگانے لگا - جب جان کنی کے وقت پادری اسے آخری مذہبی تلقین دینے کے لئے آیا اور اس سے خدا کی رحمت پر بھروسہ رکھنے کی نصیحت کی تو اس نے جواب دیا کہ جب خدا نے مجھے اس دنیا میں ہی کچھ نہ دیا تو آئندہ کے لئے اس سے کیا امید ہو سکتی ہے ؟" پادری نے کہا "انصاف کا دیر میں ہونا اور نزول رحمت میں کسی مصلحت سے تاخیر ہونا یہ ظاہر نہیں کرتا کہ خدا رحیم ہی نہیں - تمہیں خدا سے، جو تمہارا باپ ہے - تمہارا مالک ہے - تمہارا پیدا کرنے والا اور تمہارا دوست ہے، رحم کی امید رکھنی چاہئے - شکستہ دل بدنصیب شاعر نے گردن ہلا کر کہا "ہرگز نہیں جس حالت میں اس نے مجھے دنیا میں رکھا تم اس سے واقف ہو اور (اپنے گھاس پھوس کے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) جس حالت میں وہ مجھے مار رہا ہے وہ بھی تم دیکھ رہے ہو ......"

لیکن دوسرے ممالک کے شعرا کی تکالیف کا مقابلہ انگلستان کے شعرا کے مصائب سے کریں تو ان کی کچھ بھی حقیقت نہیں رہتی - یہاں کے ہر ادیب کو سخت ترین مصائب برداشت کرنے پڑے - ان کا شمار دنیا کی بدنصیب ہستیوں میں ہوتا ہے - سپنسر کی موت حد درجہ مفلسی میں واقع ہوئی - مشہور ڈرامسٹ طامس اٹوے کے بارے میں مشہور ہے کہ بھیک کی سخت روٹی کے گلے میں پھنس جانے کی وجہ سے مر گیا - بٹلر کے بارے میں اس کے حاسد معاصرین تک نے لکھا ہے کہ بہت بری حالت میں اپنے دن گزارتا تھا - ڈرائیڈن کے متعلق حیات ڈرائیڈن میں جانسن نے لکھا ہے کہ "یا تو لوگوں کی بے توجہی سے یا شاید اس کی اپنی غلطی سے اس کی عمر کا بڑا حصہ نہایت قابل افسوس حالت میں گزرا" پوپ جیسے نابغ شاعر کے ساتھ عمر بھر لوگوں نے بہت برا سلوک کیا - سر والٹر سکاٹ جیسے زبردست رئیس کو شعر و شاعری کے طفیل سخت مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ ان تفکرات نے اس کی جان لیکر چھوڑی - مشہور ناولسٹ چارلس ڈکنس کی عمر کا بیشتر حصہ بڑی مصیبت اور قابل رحم حالت میں گزرا - گولڈ سمتھ کو پیٹ پالنے کے لئے بانسری بجا بجا کر بھیک مانگنی پڑی یہاں تک کہ ایک بار جیل خانہ کا بھی منہ دیکھنا پڑ گیا - غرضیکہ انگلستان کے شعرا کی حالت بھی بہت بری رہی -

یہ زیادہ تر آج سے صدہا سال کے پہلے کے بہترین شعرا میں سے چند کے حالات لکھے گئے ہیں - اگر تمام ایسے شاعروں کا تذکرہ کیا جائے جو باوجود اعلیٰ ترین دل و دماغ کے مالک ہونے کے بڑی مصیبت کی زندگی گزارتے تھے تو ایک دفتر کا دفتر سیاہ ہو جائے -

موجودہ زمانہ میں انگلستان کے شعرا اپنی روزی کے لئے امرا کے محتاج نہیں رہے - اب کوئی خاص ہستی ان کی سرپرست نہیں ہے - بلکہ پبلک ان کی قدردانی اور سرپرستی کرتی ہے اور یہ بحیثیت مجموعی امرا سے بہتر اور زیادہ فراخدل قدردان ثابت ہوئی ہے - کوئی شک نہیں کہ اکثر اصلی قابلیت کے بارے میں غلط فہمی ہوتی ہے مگر یہ دھوکا بہت عرصہ تک قائم نہیں رہتا - گو کوئی کم حیثیت تصنیف کچھ عرصہ کے لئے شہرت حاصل کر لے مگر جلد ہی اس کی اصلیت ظاہر ہو جاتی ہے - اور صرف اعلےٰ قسم کی تصانیف پبلک کی نگاہوں میں وقعت حاصل کرتی ہیں - آجکل کے ادیب جن کی تصانیف واقعی قابل قدر ہیں - اپنی تصنیف کی قدر و قیمت سے بخوبی واقف ہوتے ہیں - ہر شخص جو ان کی تصنیف کو خریدتا ہے - دراصل ان کی سرپرستی اور ہمت افزائی کرتا ہے - اگر موجودہ زمانے کا مصنف اپنی قابلیت محض روپیہ کمانے کے لئے صرف کرے تو بآسانی دولتمند ہو سکتا ہے - اور وہ لوگ جو حقیقت میں کسی قابل نہیں ہیں - ان کے لئے گمنامی ہی میں پڑا رہنا بہت مناسب ہے - فی زمانہ ایک شاعر کسی دعوت کو بغیر اس خطرہ کے رد کر سکتا ہے کہ اس کا سرپرست ناراض ہو جائیگا - یا گھر پر رہنے سے فاقہ کرنا پڑیگا - اب شعرا بھی ایسے کپڑے پہن سکتے ہیں جو عام طور پر پہنے جاتے ہیں اور شہزادوں سے اپنی فضیلت اور برتری کے احساس کے ساتھ گفتگو کر سکتے ہیں - گو وہ امیر نہوں مگر تاہم ایک خود مختار زندگی گزارنے پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں -

(ترجمہ بالتصرف) ملا توفیق حسن مسقطی

ؔ۱ یہ آج سے تقریباً ۲۰۰ سال قبل کا تذکرہ ہے - اب تو یورپ کے ادیبوں کی جو قدردانی ہے اظہر من الشمس ہے لیکن بدنصیب ہندوستان کی آجکل کی حالت یورپ کے ایک سو ستر سال پہلے کی حالت سے بھی کہیں گری ہوئی ہے -

(ملا توفیق حسن مسقطی)

برطانوی وزارت

فاضل مضمون نگار نے وزارت کے متعلق کئی دلچسپ باتوں کا انکشاف نہیں کیا۔ ایک تو یہ کہ انگلستان کا وزیراعظم وزیراعظم کی حیثیت سے کوئی تنخواہ نہیں پاتا۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس جلیل القدر عہدے کے تمام فرائض اعزازی طریق پر سرانجام دیتا ہے۔ اس لئے عام طور پر وزارت خارجہ یا وزارت مال کا قلمدان بھی اسی کے سپرد ہوتا ہے۔ کیونکہ ان منصبوں پر فائز ہونے والے وزرا تنخواہ پاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ خطاب ہمیشہ وزارت کی سفارش پر عطا ہوتے ہیں۔

ایک جگہ فاضل مضمون نگار رقمطراز ہیں کہ اگر پارلیمنٹ کی اکثریت وزارت کی موید نہ ہو تو پارلیمنٹ کی روایات کے مطابق وزارت کو مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ لیکن یہ صرف ایک رواج پڑ گیا ہے۔ ورنہ کسی قانون کے ماتحت اس کی پابندی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے گویا فاضل مضمون نگار اس رواج کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وزارت اس رواج کی پابندی نہ کرے تو اس کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ کم از کم قانونی طور پر ان کے خلاف کوئی کاروائی نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ رواج قانون سے زیادہ مہیب اور عظیم ہے۔ اس رواج کو توڑنے کے بعد وزرا کبھی حکومت نہیں کر سکتے۔ پارلیمنٹ کی اکثریت ان ہنگامی قوانین کو نافذ کرنے سے انکار کر سکتی ہے۔ جن کے ذریعے اکثر ٹیکس وصول کئے جاتے ہیں اور اس انکار کے بعد ملک کی جو حالت ہوگی اس کا بیان ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ ناظرین کرام پر واضح ہو گیا ہوگا کہ اس رواج کی پابندی کسقدر لازمی ہے۔ اگر اس رواج کی پابندی نہ ہو تو ملک میں بدامنی اور بے انتظامی کا ایک طوفان برپا ہو جائے۔

ایڈیٹر

تاریخ کا مطالعہ کرنے والے حضرات کو انگریزی نظم سیاست کے نشو و نما میں کافی دلچسپی کا سامان ملسکتا ہے۔ آج جس نظام کو موجودہ حکومتوں کی روح رواں سمجھا جا رہا ہے۔ اس کا بیشتر حصہ انگلستان میں بتدریج فطری طور پر نشو و نما پا چکا ہے مسلسل لیکن آہستہ آہستہ اس کی تشکیل ہوتی گئی اور اسے امتیاز حاصل ہوتا گیا یہاں تک کہ اسے موجودہ ہیئت ترکیبی حاصل ہو گئی۔ اس لئے اس کے نظامات ثبات و استحکام میں دوسرے نظامات پر فائق و برتر سمجھے جاتے ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ انگریزی نظم سیاسی بھی اسی انداز پر قائم ہوا ہے جس انداز پر یورپ کی تمام طاقتیں اپنی ترقی کے مختلف دوروں میں چلتی رہی ہیں۔

عام نظم سیاسی کے علاوہ خاص طور پر وزارت کی تشکیل و تنظیم بھی بہت سے انقلابات کی آماجگاہ بنی رہی ہے۔ کبھی اسے خاص اہمیت حاصل ہو جاتی اور کبھی حیات سیاسی میں اس کا وجود بالکل غیر موثر ہو کے رہ جاتا۔ اسی طرح وزراء کی تعداد، ان کے اثر اور ان کے اختیارات میں بھی اختلاف رہا ہے جیسا کہ اس مضمون کے ناظرین مطالعہ فرمائیں گے۔

وزارت کی بنیاد

انگلستان میں وزارت کی بنیاد شاہی حکومت قائم ہونے کے بالکل ابتدائی دور میں پڑ چکی تھی۔ بادشاہ ہمیشہ احتیاطاً چند اہل الرائے اشخاص سے تبادلہ خیالات کر کے انتظام امور مملکت میں ان کے مشوروں سے امداد حاصل کرتا۔ شروع شروع میں "شاہی مجلس شوریٰ" چند امراء اور اعلیٰ عہدہ داران پر مشتمل ہوتی جنہیں بادشاہ وقتاً فوقتاً مشورہ کے لئے طلب کرتا رہتا۔ نارمنڈی عہد حکومت میں یہ مشیر "مجلس شاہی" کے ارکان کہلاتے تھے۔ بعدہٗ ہنری ششم (۱۴۲۱ء تا ۱۴۷۱ء) کے عہد میں "مجلس خاص" کے ارکان کہلانے لگے۔ اسی بادشاہ کے عہد حکومت میں مجلس خاص کے بعض ارکان کی ایک کمیٹی معرض وجود میں آئی جس کا اثر و نفوذ دن بدن ترقی کرتا گیا۔ اسے "کابینہ" کہنے لگے موجودہ وزارت کی بنیاد اسی کابینہ سے پڑتی ہے۔ لیکن اس نے ۱۶۸۹ء کے انقلاب سے پہلے کوئی مستقل حیثیت اختیار نہیں کی۔

جب ۱۶۸۸ء کا انقلاب مکمل ہو گیا، اور دارالعوام (پارلیمنٹ) کا اقتدار وسیع ہو کر بیشتر اختیارات اس کے ہاتھ میں آ گئے تو وزارت کی اہمیت اور ضرورت میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا اور مجلس خاص (پریوی کونسل)

کے اختیارات کا زیادہ حصہ سلب کیا گیا۔ کابینہ یا وزارت کے سپرد کر دیا گیا۔ وزرا تحریکات و تجاویز کو حکومت کی جانب سے منظور کرتے، حکومت کی پالیسی کا اعلان کرتے، اور اگر حکومت کی پالیسی پر کوئی اعتراض کیا جاتا تو اس کا جواب دیتے۔ اب اس بات کی بھی ضرورت محسوس کی گئی کہ انہیں دونوں ایوانوں (دارالامراء و دارالعوام) میں شرکت کا حق دیا جائے۔ لیکن بایں ہمہ مزید ایک صدی تک نظام وزارت پوری طور پر مکمل نہیں ہو سکا۔ مثلاً یہ کہ اس حالت میں بھی وزراء کا مستعفی ہونا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا جبکہ پارلیمنٹ ان کی تائید نہ کرے۔ بلکہ وہ بدستور اپنے عہدوں پر قائم رہتے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے نصف اول تک "وزارتی اتحاد" کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ یعنی وزارت اس طریقہ پر مقرر یا مستعفی نہیں ہوتی تھی۔ گویا وہ جسم واحد ہے۔ سب سے پہلی وزارت جس میں پابندی (گارنٹی) یا وحدت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ لارڈ رکھنم (۱۷۶۵ء) کی وزارت ہے۔ تاہم اٹھارھویں صدی کے آخر تک وزراء ایک متفقہ پالیسی کے پابند نہیں تھے۔ متفقہ پالیسی کا نظام انیسویں صدی کے شروع میں جارج چہارم کے عہد میں شروع ہوا جب اس کے وزراء نے سیاست خارجہ میں اس کی تائید سے انکار کر دیا تھا۔

انیسویں صدی کے شروع میں وزارت کے اختیارات وسیع ہو گئے۔ لیکن اس کی مطلق العنانی محدود کر دی گئی۔ چنانچہ جب سے اب تک سلطنت برطانیہ کا بنیادی اصول یہی رہا ہے کہ "وزارت پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہے" اور اسی کو "پارلیمنٹری نظام حکومت" سے تعبیر کرتے ہیں۔

انگلستان میں وزراء کی تعداد ہمیشہ غیر محدود رہی ہے لیکن عموماً ۱۶ اور ۲۰ کے مابین ارکان وزارت پر فائز رہے ہیں۔ ان میں بعض بڑے بڑے ذمہ دار عہدوں کے فرائض ادا کرتے ہیں۔ بعض برائے نام عہدہ دار ہیں۔ اور بعض بغیر کسی عہدے کے بھی وزیر بنا دئے جاتے ہیں۔ تمام وزراء بالاتفاق ایک معینہ پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور اپنی مسئولیت (جوابدہی) کے معاملہ میں مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔

ترتیب وزارت

ترتیب وزارت کا یہ دستور ہے کہ بادشاہ وزیر اعظم کو نامزد کرتا ہے۔ اور بقیہ وزراء کا انتخاب وزیر اعظم کی رائے پر مبنی ہوتا ہے۔ جنہیں وزیر اعظم دارالعوام میں اکثریت رکھنے والی جماعت میں سے مقرر کرتا ہے۔ کیونکہ اگر ایوان کی اکثریت وزارت کی موید نہ ہو تو پارلیمنٹ کی روایات کے مطابق تمام ارکان وزارت کا بیک وقت مستعفی ہونا لازمی ہے۔ لیکن یہ صرف ایک رواج پڑ گیا ہے۔ ورنہ کسی قانون کے تحت میں اس کی پابندی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

ہر ایک وزیر کے لئے دارالعوام یا دارالامراء میں سے کسی ایک کا رکن کا ہونا ضروری ہے۔ ہر ایوان کی جداگانہ نمائندگی کرنے والے وزراء کی تعداد مختلف رہی ہے۔ مسٹر پٹ (۱۷۸۳ء) کی وزارت ۔ ارکان پر مشتمل تھی جس میں پٹ کے سوا ——— جو دارالعوام میں وزارت کی نمائندگی کرتا تھا ——— بقیہ تمام ارکان لارڈ تھے لیکن بلاشک و شبہ یہ تقسیم غیر منصفانہ تھی اور مسٹر پٹ کی وزارت کے بعد اس قسم کی غیر جمہوری وزارت کبھی مرتب نہیں ہوئی۔ گلیڈسٹون (۱۸۶۸ء) کی وزارت میں آٹھ ارکان (پھر ۹ ہو گئے تھے) دارالعوام سے اور ۶ دارالامراء سے لئے گئے تھے۔

وزارت ہمیشہ خصوصیت کے ساتھ دارالعوام میں اپنا اقتدار مستحکم کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ گزشتہ صدی میں ایک نیا سوال اٹھایا گیا جس کا مفاد یہ تھا کہ "وزارت مدافعت" کے عہدیدار ——— یعنی وزیر جنگ اور وزیر بحری ——— مستقلاً دارالعوام کی رائے پر چھوڑ دئے جائیں لیکن ملک معظم نے اسے قبول نہیں کیا۔

رواجاً ایک وزارت کی مدت قیام قریب قریب ۵ سال ہوتی ہے۔ مگر انگریزی تاریخ میں ایسی وزارتوں کی مثالیں بھی ملتی ہیں جو اس سے زیادہ مدت تک قائم رہیں۔ رابرٹ والپول کی وزارت ۱۷۲۱ء سے ۱۷۴۲ء تک یعنی ۲۱ سال قائم رہی اور مسٹر پٹ کی مشہور وزارت ۱۷۸۳ء سے ۱۸۰۱ء تک یعنی ۱۸ سال قائم رہی۔ اس کے برخلاف ایسی بھی مثالیں موجود ہیں جن میں وزارتوں کی عمر چند مہینہ سے متجاوز نہیں ہو سکی۔

وزارت کا نظام عمل

برطانوی وزارت عادتاً یا تو وزیر خزانہ (فنانس ممبر) کے دفتر واقع ڈاؤننگ اسٹریٹ لنڈن میں جمع ہوتی ہے یا وزارت خارجہ کے دفتر میں۔ لیکن ان کے علاوہ کسی دوسرے مقام پر بھی اجتماع ممکن ہے۔ کسی نامہ نگار یا کسی سکریٹری کو کابینہ وزارت کے اجلاسوں میں شرکت کی اجازت نہیں ہوتی نہ باضابطہ کارروائی جلسہ کی روداد

مرتب کی جاتی ہے۔ لیکن بعض استثنائی صورتوں میں وزراء جلسہ کی کارروائی ایک یادداشت کی طور پر قلمبند کر کے اہم معاملات میں اپنی رائے ظاہر کرنے کے لئے باضابطہ بادشاہ کی خدمت میں ارسال کر دیتے ہیں۔ عام طور پر وزیراعظم بادشاہ کی روبکاری میں اپنے رفقاء کی نمائندگی کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔

بادشاہ کبھی کابینہ وزرا کے جلسوں میں شرکت نہیں کرتا۔ کیونکہ برطانوی دستور کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ بادشاہ کی موجودگی میں مشیرانِ مملکت کے مابین کوئی مباحثہ نہیں ہو سکتا۔ یہ رسم ایک عجیب طریقہ سے رواج پذیر ہوئی۔ ابتدا میں حکمران عورتیں اور مرد بنفس نفیس کابینۂ وزراء کے اجلاسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ لیکن جب تختِ سلطنت خاندان ہنوویرین کی جانب منتقل ہوا تو اس خاندان کے ابتدائی فرمانروا، خصوصاً جارج اول اور جارج ثانی (اٹھارھویں صدی کے نصف اول میں) انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف نہیں تھے۔ اور اسی لئے کابینۂ وزارت کے جلسوں میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ جب جارج سوم تخت نشیں ہوا تو یہ طریقہ مروج ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس نے بھی اسی کے مطابق عملدرآمد کیا اور اس کے جانشینوں نے بھی اس کی پیروی کی۔

وزیراعظم

برطانوی دستور میں ۱۹۰۵ء سے پہلے وزیراعظم کو کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں تھا۔ بلکہ مذکورہ سنہ سے پہلے قانون میں اس عہدہ کا تذکرہ بھی نہیں ہے۔ سب سے پہلے معاہدہ برلن ۱۸۷۸ء میں لارڈ بیکنسفیلڈ کو "وزیراعظم انگلستان" کے خطاب سے یاد کیا گیا ہے۔

۱۹۰۵ء میں فرمان شاہی کے ذریعہ "وزیراعظم" کا درجہ اپنے عہدے کے لحاظ سے بشپ آف یارک کے علاوہ دوسرے تمام امرائے مملکت اور عہدہ داران سلطنت سے برتر قرار دیا گیا۔ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں وزیراعظم، بادشاہ اور وزراء کے مابین بطور واسطہ کے کام کرتا ہے۔ اور اس کا فرض ہے کہ مصالح ملکی میں وزرا کے جو مشورے ہوں انہیں بادشاہ کے گوش گزار کر دے۔ وزیراعظم ہی پر تمام کابینۂ وزارت کی موت و حیات منحصر ہوتی ہے۔ اس لئے اگر وہ دست بردار ہو جائے تو پوری وزارت شکست ہو جاتی ہے۔ گو اس کے تمام ارکان آئندہ وزارت میں دوبارہ منتخب ہو جائیں۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ وزارتیں وزیراعظم کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ "لائڈ جارج کی وزارت" یا "بالڈون کی وزارت" یا "میکڈانلڈ کی وزارت" وغیرہ وغیرہ۔

اس کے برخلاف ۱۹۰۵ء تک وزیراعظم کو ——— اگرچہ صرف ظاہری طور پر سہی اور واقعیت کے خلاف سہی ——— دوسرے وزرا کے مقابلے میں دستوری حیثیت سے ذرا سی بھی ترجیح حاصل نہیں تھی جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ نہ وزیراعظم کو موجودہ وسعت اختیارات کے ساتھ یہ مرتبہ حاصل تھا۔ البتہ وہ اپنے رتبہ کی حیثیت سے دوسرے مناصب پر مامور کیا جاتا تھا۔

غالباً انگلستان کی تاریخ میں سب سے پہلا وزیراعظم جو اس نام کے ساتھ یاد کئے جانے کا مستحق ہے وہ سر رابرٹ ویلپول (۱۷۲۱ء–۱۷۴۲ء) ہے۔ وہ سب سے پہلا شخص ہے جس نے وزارت کو ایک مرکز پر لا کر جمع کر دیا اس کے ارکان کو ایک طے شدہ حکمت عملی پر کاربند ہونے کے لئے مجبور کر دیا۔ اور دوسرے وزراء پر کامل اقتدار کے ساتھ حاوی ہو گیا اس کی وزارت کے بعد سے اب تک ۵۴ وزارتیں مرتب ہو چکی ہیں۔

منظور سروش

(بھوپالی)

فلسفہ اور اس کے متعلقہ مسائل

"یہ سچ ہے کہ انسان رازِ حیات یا معمائے کائنات کو دریافت نہیں کر سکتا لیکن اسے اس معاملہ میں کوشش ضرور کرنی چاہئیے۔ تاکہ وہ ناقابلِ فہم خدائی قانون کا مناسب طور پر احترام کر سکے"

گوئٹے[1]

"اس میں شک نہیں کہ کائنات میں ایک خاص مقصد پایا جاتا ہے جس کا اظہار ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے اور جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے انسان کے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے۔"

ٹینی سن[2]

فلسفے کی تعریف فلسفہ ایک یونانی لفظ ہے اور دو لفظوں سے مرکب ہے ( ) فائلاس یعنی دوست اور ( ) سوفیا یعنی عقل یا حکمت۔ یعنی حکمت کو دوست رکھنا۔ عام طور پر فلسفہ کے معنے عقل و حکمت کو محبوب رکھنے کے آتے ہیں اور فلاسفر یا فیلسوف وہ شخص ہے جو عقل و حکمت کو محبوب رکھے اور ہر دم اس کی جستجو میں لگا رہے جس طرح طالب اپنے مطلوب کی تلاش میں رہتا ہے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کو سب سے پہلے فیثا غورث[3] نے استعمال کیا۔ لیکن اس وقت "محبوبیت" کا مفہوم اس لفظ میں داخل نہ ہوا تھا۔ بلکہ محض تلاش و جستجو مقصود تھی یعنی پہلے زمانے میں فلاسفر "جویائے حکمت" کو کہتے تھے۔ اب "عاشق حکمت" کو کہتے ہیں۔ سقراط[4] کا قول ہے کہ فلاسفر وہ جو عقل کو دوست رکھے اور اس کی طرف رغبت ظاہر کرے۔ افلاطون[5] کی نظر میں فلاسفر وہ شخص ہے جسے حقائق کائنات کا علم حاصل ہو۔ کیونکہ یونانی فلاسفر عموماً اسی مسئلہ پر غور و فکر کیا کرتے تھے کہ اس تبدیلی اور تغیر کی تہ میں، جو کائنات میں ہر وقت محسوس و مشہود ہوتی رہتی ہے۔ کونسی غیر متغیر حقیقت، کارفرما ہے؟

موجودہ زمانے میں بھی بعض حکما نے فلسفہ کی تعریف کی ہے۔ مثلاً ہیگل[6] کے نزدیک فلسفہ، کائنات میں غور و فکر کا نام ہے۔ نیز وہ کہتا ہے کہ فلسفہ ہر چیز کی تعریف کرتا ہے لیکن خود اپنی تعریف نہیں کر سکتا فلاسفر وہ ہے جو اپنے تخیل کائنات میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش کرے، اور اس حقیقت کا پتہ لگائے جو عامۃ الناس کے مفروضات کی بنیاد ہے۔ اور حواس ظاہری کی بناء پر جو کثرت مظاہر، مشہود ہوتی ہے اسکو ایک سلک میں منسلک کرے۔

ہیوم[7] کی رائے میں فلسفہ، اُس صداقت کی تلاش کا نام ہے جو ہر عقلمند انسان کا مقصود حیات ہے۔ اور ونڈل بینڈ[8] کا قول ہے کہ ہمارے زمانے میں فلسفے سے مراد یہ ہے کہ کائنات اور حیات انسانی سے متعلق مسائل عامہ میں سائنٹیفک طریق پر غور و فکر کی جائے۔

الغرض، فلسفہ اس غور و فکر کا نام ہے جو فطرت کے جملہ شعبوں پر حاوی ہو جس کی بدولت اشیائے کائنات کی تشریح، انداز عمومی میں کی جا سکے۔ فلسفہ جملہ علوم کا خلاصہ بھی ہے اور ان کی تکمیل بھی کرتا ہے۔ سائنس بھی ہے اور اصطلاحی سائنس سے جدا بھی ہے۔ نیز مذہب اور شاعری کی طرح دماغ انسانی کے مظاہر کا ایک خاص شعبہ ہے۔

سائنس سے تعلق اور اختلاف کی نوعیت سائنس اور اس کے مختلف شعبے، واقعات خارجی سے بحث کرتے ہیں اور ان واقعات اور مظاہر کائنات کے علل و اسباب دریافت کرتے ہیں، نیز ان کے وقوع کے متعلق قوانین اور اصول منضبط کرتے ہیں لیکن فلسفے میں مخصوص واقعات سے بحث نہیں ہوتی بلکہ کائنات کے

---

[1] گوئٹے مشہور جرمن مصنف [2] ٹینی سن مشہور انگریزی شاعر جو ملک الشعرا اور لارڈ کے خطاب سے سرفراز ہوا [3] فیثا غورث ۵۸۰ ق م یونان میں پیدا ہوا، اطالیہ میں زندگی بسر کی، ریاضی میں ید طولیٰ رکھتا تھا، ایک خاص فلسفے کا بانی ہوا ہے۔ [4] سقراط ۴۶۹-۳۹۹ ق م، افلاطون کا اُستاد جس نے صداقت کی خاطر جان دی۔ [5] افلاطون مشہور فلاسفر جسکا ذکر آئندہ ہوگا [6] ہیگل مشہور جرمن فلاسفر جس کا ذکر آئندہ اوراق میں ہوگا [7] ہیوم، مشہور اسکاچ فلاسفر جس کا ذکر آئندہ اوراق میں ہوگا [8] ونڈل بینڈ، جرمن مصنف جسکی "تاریخ فلسفہ" نہایت مستند سمجھی جاتی ہے۔

تشریح، بحیثیت مجموعی، کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، یا تمام مظاہر کائنات کے اصلی اور حقیقی سبب کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، فلسفہ اس بات کے جواب دینے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ کائنات کیا ہے، کیوں ہے؟ اور موجودہ حیثیت میں کیوں ہے؟

یعنی اگرچہ فلسفہ بھی انہی اشیاء سے بحث کرتا ہے جن سے سائنس اور اس کے متعلقات۔ لیکن فرق یہ ہے کہ سائنس مظاہر کائنات کو، وہ جو کچھ ہوں یا جیسے بھی ہوں قبول کرلیتا ہے، اور ان کے اسباب پر غور کرتا ہے اور ان مظاہر کا مطالعہ کرکے اُن کے متعلق قوانین بناتا ہے، لیکن فلسفہ کائنات کی آخری علت اور اصلی سبب کو معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور حادثات وواقعات عالم کے عظیم الشان انبار میں سے ایک اصول عمومی دریافت کرتا ہے یا یوں سمجھئے کہ سائنس کے مختلف شعبے مثلاً طبعیات۔ کیمیا، علم الحیات وغیرہ وغیرہ اپنے مخصوص دائرہ یا میدان عمل میں تحقیقات کرتے ہیں، لیکن فلسفہ جو تمام علوم کا منبع ہے، تمام علوم کو زیر بحث لے آتا ہے اور جن باتوں کو سائنس نے بطور اصول موضوعہ اور علوم متعارفہ تسلیم کرلیا ہے ان باتوں کی اصل وحقیقت سے بحث کرتا ہے۔

اگرچہ فلسفہ کا موضوع، مخصوص ہے اور اس کا دائرہ عمل بھی جداگانہ ہے تاہم فلسفہ اور سائنس دونوں میں شدید رابطہ اور اتحاد پایا جاتا ہے، اگر سائنس اپنا تعلق فلسفہ سے قطع کرلے تو یقیناً اُسے نقصان پہنچیگا فلسفے میں جو طرز استدلال مستعمل ہے وہ تمام نفسیات اور مختلف علوم سائنس سے ہی ماخوذ ہے، جس طرح فلسفہ کے بغیر سائنس ایک ایسا مجموعہ بنجاتا ہے جسمیں وحدت نہو، اسی طرح سائنس کے بغیر، فلسفہ ایک روح بے جسد ہے، اور اس میں اور شاعری میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا۔ سائنس درحقیقت فلسفے کی بنیاد ہے کیونکہ بقول ارسطو سائنس فلسفہ بالقوۃ ہے۔ اور فلسفہ دراصل سائنس کی تکمیل یافتہ صورت کا دوسرا نام ہے۔ نیز فلسفہ ایک عالم (اسکالر) کی زندگی کا بلندترین مقصد ہے، اور سائنٹیفک تحقیق کے جذبے اور میلان کی تشفی کا بہترین ذریعہ ہے،

سائنس اور فلسفہ، نہ صرف اپنی ماہیت اور دلچسپیوں میں ایک دوسرے سے متحد ہیں بلکہ اپنے اصول و مقاصد میں بھی۔ انسانی دماغ جبلی طور پر اشیاء کی علتوں کو معلوم کرنا اور اُن سب کو ایک علت العلل سے وابستہ کرنا چاہتا ہے، پس جس وقت انسان، علم طبعیات، علم ریاضی، یا علم اخلاق میں بعض ابتدائی صداقتیں دریافت کرلیتا ہے تو طبعاً اُنکو باہم ترکیب وترتیب دینے اور عمومی نظریے یا آفاقی نظام کی شکل میں تبدیل کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے، اسی خواہش کا نام فلسفہ ہے، اور جہاں اس کی عقل کام نہیں دے سکتی وہاں وہ اپنی قوت متخیلہ سے یا اس جبلی طاقت سے کام لیتا ہے جو ایک حیرت انگیز طریق پر حقائق اشیا کا پتہ لگالیتی ہے۔ اگرچہ وہ طریق سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی معاملہ میں کسی نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں مگر کوئی دلیل نہیں دے سکتے۔ قدماء کے فلسفے میں جو عقلی تصوری اور خیالی رنگ پایا جاتا ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ قدیم زمانہ میں معلومات انسانی محدود تھیں، زیادہ تر قیاس آرائیوں پر دارو مدار تھا، افلاطون کا فلسفہ سراپا تصوریت ہی پر مبنی ہے۔ لیکن موجودہ زمانہ میں، علمی تحقیقات اور سائنٹیفک انکشافات کی بدولت، فلسفہ شاعری سے ممتاز ہوگیا ہے اور اس میں بڑی حد تک سنجیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ اس کا طریق عمل مسلم اور مدلل ہوگیا ہے، اور اس کے مسائل میں گہرائی پیدا ہوگئی ہے، جس طرح ہر نئی سائنٹیفک تحریک سے ایک نئی فلسفیانہ تحریک پیدا ہوتی ہے، اسی طرح ہر نئے فلسفیانہ نظریئے سے سائنس کو تقویت پہنچتی ہے۔ اگرچہ بعض کوتاہ بین اور ناعاقبت اندیش لوگوں کی وجہ سے زمانۂ وسطیٰ میں فلسفے اور سائنس کے درمیان اختلاف پیدا ہوگیا تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ سچے سائنس اور سچے فلسفے میں کبھی تصادم یا اختلاف نہیں ہوسکتا اور آج بیسویں صدی میں تو ان دونوں کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار ہیں اور یقین ہے کہ آئندہ بھی ایسے ہی رہیںگے۔

فلسفے کے فوائد اور مقاصد فلسفے کے مطالعہ کی ضرورت اور اس کے فوائد پر کچھ طویل بحث کرنے کی حاجت نہیں ہے کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ فلسفہ انسانی فہم وادراک کی لازمی جولانگاہ ہے۔ قوت غور وفکر ہی وہ جوہر ہے جو انسان کو باقیماندہ حیوانات سے ممتاز کرتی ہے اور تخیل انسانی محض اس لئے کہ وہ تخیل ہے ساکن اور جامد نہیں رہ سکتا، حرکت اور عمل اُس کی ذات میں داخل ہے۔ فکر کا خاصہ ہی یہ ہے کہ وہ انسان کو سوچنے کی طرف مائل کرتی ہے یہ بات ناممکن ہے کہ ایک شخص میں غور وفکر کی قوت موجود ہو اور وہ اس سے کام نہ لے۔ یہ قوت ہمیشہ سرگرم عمل نظر آتی ہے۔ اسی لئے ارسطو کہتا ہے کہ "فلسفے کی بنیاد، انسانی فکر اور حیرت پر قائم ہے" افلاطون کہتا ہے "فلسفہ حیرت ہی سے شروع ہوتا ہے اور حیرت ہی پر ختم ہوتا ہے"، یعنی جب ایک صاحب عقل وشعور انسان، اپنے

چاروں طرف نظر ڈالتا ہے تو لازمی طور پر اس کے دل میں سوالات کا ہجوم پیدا ہوتا ہے، مثلاً ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ ہماری منزل مقصود کیا ہے؟ یہ کائنات کیا ہے؟ کیسے ظہور میں آئی؟ اس کا بنانے والا کون ہے؟ اُسے ہم سے کیا تعلق ہے؟ وغیرہ وغیرہ، انہی سوالات کے متعلق غور و فکر کرنا فلسفہ کہلاتا ہے، لیکن انسان کی عقل و ادراک اور اس کے ذرائع محدود ہیں۔ ان سوالات کا حل، پورے طور پر اس سے ممکن نہیں، وہ سوچتا ہے، سوچتا ہے لیکن ایک نقطہ پر پہنچ کر اس کی عقل بیکار ہو جاتی ہے، اور وہ حیرت کے دریا میں غوطے کھانے لگتا ہے، گویا "حیرت" سے شروع ہو کر "حیرت" ہی پر اس کی عقلی جولانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

فلسفے کا لائحہ عمل :۔ چونکہ انہی سوالات سے فلسفہ میں بحث کیجاتی ہے، زمانہ کا جو اَید بنا یا ان کو صحیح اور کامل طور سے حل کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے اس لئے فلسفے میں کوئی ایسا مقام نہیں آ سکتا جسے منتہائے خیال کہا جا سکے۔ علاوہ بریں انہی سوالوں میں آئے دن نئی نئی شاخیں نکلتی رہتی ہیں اس لئے انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ دریافت کئے جانے کے قابل ہے وہ سب دریافت ہو گیا یا معمائے حیات اور رازِ کائنات حل ہو گیا۔ فلسفہ انسانی ترقیوں کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہتا ہے اور جبتک دنیا میں انسان کا وجود ہے اس وقت تک فلسفہ بھی اپنی جولانیاں دکھاتا رہے گا اور انسان اُس کے مسائل میں موشگافیاں کرتا رہے گا، ایک رنگ میں، ہر فلاسفر از سر نو، ان مسائل میں غور و فکر کرتا ہے اور دوسرے معنی میں ہر فلسفی، اگلوں کے خیالات پر اپنے فلسفے کی بنیاد قائم کرتا ہے یعنی جب وہ غور و فکر کرتا ہے تو اس کا راستہ سب سے جدا ہوتا ہے ورنہ اس کے خیالات اور اگلوں کے خیالات میں امتیاز اور فرق کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ اگلوں کے خیالات سے فائدہ ضرور اٹھاتا ہے اور جو باتیں اُسے مفید مطلب معلوم ہوتی ہیں انہیں اختیار کر لیتا ہے اور اپنے انداز میں پیش کرتا ہے جس طرح مطلق سائنس، جو مشاہدے اور تجربے پر مبنی ہے مکمل یا کامل رنگ میں موجود نہیں اسی طرح مطلق فلسفے کا بھی وجود نہیں ہے۔

تاریخ فلسفہ کا مقصد :۔ تاریخ فلسفہ کا مقصد اُن مختلف کوششوں کو مسلسل انداز میں بیان کرتا ہے جو مسئلہ حیات کو حل کرنے یا اس دنیائے رنگ و بو کو عام فہم بنانے کیلئے مختلف لوگوں نے مختلف زمانوں میں کی ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ ابتدا سے لیکر آج تک انسانی غور و فکر کی تدریجی نشوونما کی داستان ہے جس میں نہ صرف فلسفیانہ مسائل کی تشریح اور تاریخ وار ترتیب بیان کی جاتی ہے، بلکہ اس ماحول کا ذکر بھی ہوتا ہے جس میں وہ مسائل پیدا ہوتے ہیں، اور ان لوگوں کے سوانح حیات بھی بیان کئے جاتے ہیں جنہوں نے اُن مسائل میں موشگافیاں کی ہوتی ہیں اگر ایک طرف ہر فلسفہ، کم و بیش اُس تمدن پر مبنی ہوتا ہے جس میں وہ مدون کیا جاتا ہے نیز وہ فلسفہ، ماقبل اور مدون کرنے والے کی شخصیت سے بھی متاثر ہوتا ہے تو دوسری طرف آئندہ نسلوں کے خیالات اور رجحانِ طبائع پر قرار واقعی اثر ڈالتا ہے، پس تاریخ فلسفہ میں اس بات کی کوشش ضروری ہے کہ ہر نظریے کو اس کی مناسب جگہ پر بیان کیا جائے اور اس کو سمجھنے کے لئے تمام گزشتہ فلسفے کو پیش نظر رکھا جائے اور اس کو ماضی حال اور آئندہ کے ذہنی، سیاسی، اخلاقی، تمدنی اور مذہبی خیالات سے وابستہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ انسانی خیالات میں تدریجی ترقیوں کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے نیز یہ دکھانا چاہئے کہ فلاں نظریہ کس طرح ظہور میں آیا، اور اس نظریے اور اس کے متعلق بحث و فکر سے اور کون کون سے مسائل پیدا ہوئے، اور منزل مقصود تک پہونچنے میں ان خیالات نے انسانوں کی رہنمائی کہاں تک کی، الغرض تاریخ فلسفہ سے مراد یہ ہے کہ مختلف زمانوں میں مختلف مسائل کے متعلق جو کچھ غور و فکر کی گئی ہو اُسے ترتیب کے ساتھ بیان کیا جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ فلسفہ کی تاریخ دنیا کی تاریخ کی طرح ابتدا سے شروع ہو کر بالترتیب آخر تک پہونچے فلسفے کی تاریخ میں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ درمیان میں پہنچکر بجائے آگے بڑھنے کے پیچھے کی طرف چلے جاتے ہیں تاکہ کسی درمیانی خیال کا رشتہ، ابتدائی خیال سے وابستہ کیا جا سکے لیکن بحیثیت مجموعی، فلسفہ بھی زندگی کی طرح ارتقائی شان دکھاتا ہے اور تاریخ فلسفہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اس کی تدریجی ترقیوں کو واضح طور پر بیان کرے۔

مورخ کا فرض :۔ مورخ کے لئے ضروری ہے کہ غیر جانبدار رہے اور اس کا رجحانِ طبع مطالب عمانہ ہونا چاہئے یعنی اس کی خواہش یہ ہونی چاہئے کہ وہ ہر فلاسفر کے مطلب کو اس کے الفاظ اور اسی کی تصریحات کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرے نہ کہ خود اپنے دل سے کوئی بات بنا کر اُن سے منسوب کر دے یا اپنے خیالات اُن کے پیش کردہ خیالات میں مخلوط کر دے۔

یہ سچ ہے کہ مورخ کا زاویۂ نگاہ ضرور کہیں نہ کہیں ظاہر ہو جاتا ہے اور اس کی صورتیں کئی ہو سکتی ہیں مثلاً وہ اُس × کو زیادہ زور، وضاحت، اور شان کے ساتھ پیش کرے گا جو خود اُسے

مد یعنی تخیل انسانی کی آخری حد ملہ جہکاؤ یا میلان مہ۳ تشریحات

پسند ہے، اور جو فلسفہ اُسے پسند نہیں، غالباً اس پر زیادہ توجہ نہ دے گا چند سطروں میں اس کا تذکرہ کر کے آگے بڑھ جائے گا۔ لیکن یہ وہ باتیں ہیں جن کا وقوع ناگزیر ہے، اور بسا اوقات کہنے والے کی طاقت سے باہر ہیں، تاہم وہ یہ ضرور کرسکتا ہے اور اس پر اسے کاربند ہونا چاہئے کہ پہلے ہر فلسفی کا زاویۂ خیال دیانت، صحت اور صفائی کے ساتھ پیش کردے پھر اگر وہ اس سے متفق نہ ہو تو آخر میں اس پر تنقید کردے تاکہ فلسفی کا نظریہ، اور اس کی تنقید دونوں علیحدہ علیحدہ کتاب کے پڑھنے والوں کے سامنے آجائیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم کسی قدیم فلسفے پر جدید تحقیقات کی روشنی میں اعتراض نہ کریں۔ ظاہر ہے کہ موجودہ زمانے میں ہر علم میں بہت سی ایسی باتیں دریافت ہوگئی ہیں جن سے افلاطون اور ارسطو دونوں ناواقف تھے، پس اس بنا پر کہ انہوں نے جدید معلومات کے خلاف لکھا ہے، ان کو موردِ عذاب بنانا مناسب نہیں۔ اور نہ یہ بات، ان کی قدر و منزلت کو کم کرسکتی ہے کہ انہوں نے بعض مقامات میں غلطیاں کی ہیں۔ یقیناً ایک زمانہ وہ آئے گا کہ جب آئندہ نسلیں ہماری باتوں پر اُسی طرح اعتراض کریں گی جس طرح ہم اگلوں پر کرتے ہیں۔ بلکہ غور طلب بات یہ ہے کہ جس زمانے میں افلاطون اور ارسطو تھے اس وقت لوگوں کی علمی اور ذہنی حالت کیا تھی۔ اُن کا مبلغ علم[1] کیا تھا معلومات کا دائرہ کس قدر وسیع تھا؟ اور اس زمانے میں لوگ کس حد تک متمدن تھے۔! ان باتوں کا جائزہ لینا ضروری ہے اور انہی امور کی روشنی میں اُن کے فلسفے پر اعتراض یا اس کی تنقیص[2] کرلی جانی چاہئے۔ واضح ہو کہ یہ دونوں حکیم اپنی اپنی جگہ نہایت قابل عزت ہیں کیونکہ انہوں نے اس وقت ان مسائل پر قلم اٹھایا جبکہ دنیا کے اکثر لوگ علوم و فنون سے آشنا نہ تھے۔ بلکہ عام طور سے تمام لوگ جہالت کی تاریکی میں مبتلا تھے۔ پس ہر مورخ کا فرض یہ ہے کہ وہ فلسفے کے ہر نظام کو اس کی ذاتی خوبیوں یا برائیوں کے لحاظ سے دیکھے۔ اور پھر سابق اور لاحق سلسلۂ خیال سے اس کا موازنہ نہ کرے۔

تاریخ فلسفہ ایک مستقل فن ہے ہیگل سے پہلے، تاریخ فلسفہ، کوئی مستقل فن نہ تھا، بعض اوقات خصوصاً کسی وقتی ضرورت کے لئے، لوگ مختلف فلاسفروں کے خیالات ایک جگہ جمع کردیا کرتے تھے۔ اس مجموعے میں کوئی ترتیب مدنظر نہیں رکھی جاتی تھی اور نہ مختلف الخیال فلاسفہ کو مختلف طبقات میں منقسم کیا جاتا تھا۔ لیکن ہیگل نے تاریخ فلسفہ کو ایک مستقل فن قرار دیا۔ چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ تاریخ فلسفہ سے یہ مراد نہیں کہ بہت سے فلاسفروں کے خیالات کو ایک کتاب میں جمع کردیا جائے بلکہ یہ وہ لازمی اور منطقی طریق کار ہے جس میں معقولات عقلی، پے در پے ایک مستقل حیثیت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اور تصورات ذہنی کی صورت میں منتقل ہو جاتے ہیں۔" ہیگل کے مجمل اور مبہم قول کا مطلب یہ ہے کہ فلسفے کی تاریخ سے یہ مراد ہے کہ انسانی عقل کی پرواز کا نقشہ اس انداز سے دکھایا جائے کہ اس کا مستقل اثر ہمارے ذہن میں قایم ہو اور رفتہ رفتہ اُن مستقل تاثرات کی بدولت ہم بذاتِ خود، اپنے ذہن میں اس پرواز کا کوئی مستقل تصور پیدا کرسکیں اور اس بات کا اندازہ لگا سکیں کہ فلاں مسئلہ میں، فلاں فلاں اشخاص نے فلاں فلاں خیالات ظاہر کئے اور آگے چلکر اُن پر فلاں فلاں خیالات کا اضافہ ہوا۔ اور آج اس مسئلے کے متعلق مستند اصحاب کا خیال یہ ہے، اور فلاں فلاں معترضین نے اس پر یہ یہ اعتراضات وارد کئے ہیں۔ پس اندریں حالات اس نظریے یا مسئلے کی ہئیت اور نوعیت یہ ہے۔ گویا ہمارے ذہن میں اُس مسئلے کے متعلق ایک مستقل اور واضح تصور پیدا ہو جائے۔

چنانچہ ہیگل نے اسی مقصد عظمیٰ کے حصول کی خاطر تاریخی ترتیب کی کچھ پرواہ نہ کی۔ کیونکہ تاریخ فلسفہ، جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کسی ملک کی سیاسی تاریخ نہیں ہے جس میں سنہ اور مہینے کی قید ضروری ہو۔ ایک بڑے مصنف کا قول ہے "تاریخ فلسفہ، صرف بنی نوع آدم کے خیالات کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کا انحصار، زیادہ تر فلاسفروں کے خیالات دماغی اور قلبی ضروریات باطنی وجدانیات اور معقولی پیشگوئیوں پر ہوتا ہے جو آگے چلکر پوری ہوتی ہیں"۔ واضح ہو کہ یہ پیشگوئیاں کسی مخفی طاقت یا اعجازی قوت کا نتیجہ نہیں ہوتیں بلکہ فلاسفروں کی فراست اور دوربینی پر مبنی ہوتی ہیں پس تاریخ فلسفہ، میں تین امور ایسے اہم ہیں جن کا لحاظ رکھنا ازبس ضروری ہے۔

(۱) پہلا امر لازمی یا منطقی امر کہلاتا ہے، جس کی رو سے مسائل کا ادعا اور اثبات کیا جاتا ہے، اہم اور اصولی مسائل ہر عہد میں تازہ ہوتے رہتے ہیں۔ اور ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے موافق ان کا حل تجویز کرتا ہے۔ اور یہ وہ مسائل ہیں جن پر غور کرنے سے کسی فلاسفر کو نہیں ہو سکتا۔ اور جو منطقی ضرورت کی بناء پر ایک دوسرے سے ارتقا حاصل کرتے رہتے ہیں۔ یعنی پہلی بات

---

[1] یعنی کس قدر علم حاصل تھا۔ [2] نقص نکالنا۔ [3] گزشتہ اور آئندہ۔

جس کا ایک مورخ کو خیال رکھنا چاہئے۔ یہ ہے کہ فلسفے میں جو سوالات مسائل یا نظریات اہم ہیں ان کا جواب چونکہ حد بشری سے خارج ہے اس لئے وہ ابتدا سے جوں کے توں چلے آرہے ہیں۔ مثلاً یہ کائنات کیا ہے، اسے کس نے بنایا؟ کیا وہ خود بخود بن گئی؟ خدا ہے تو کیا ہے اس کی صفات کیا ہیں؟ انسان کیا ہے۔ کیوں پیدا ہوا؟ اس کی حیات کا مقصد کیا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو ارسطو کے زمانے سے لیکر آجتک اسی طرح اٹل چلے آتے ہیں۔ ہر زمانے میں ہر فلاسفر نے ان کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اور جب تک انسان کی دماغی قوتوں میں اضافہ نہو اُس وقت تک یہ سوالات اسی طرح قائم رہیں گے۔ پس ان کا لحاظ کرنا پہلی شرط ہے۔ ان کو ایک خاص منطقی انداز، اور دلنشیں پیرایہ میں پیش کرنا چاہئے۔

دوسرا امر جس کی طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے، یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کا بھی فلسفے پر اثر پڑتا ہے، بلکہ بعضوں کا تو یہ خیال ہے کہ "فلسفیانہ مسائل" اور ان کے جوابات یا تشریحات اُس ماحول کا نتیجہ ہوتے ہیں جس میں اُن مسائل پر غور کرنے والے بود و باش رکھتے ہیں۔ اور وہ مسائل زیادہ تر سوسائٹی کی ضروریات اور خیالات پر مبنی ہوتے ہیں مثلاً اگر عیش و عشرت کا دور ہو، لوگوں کی طبائع تفریح اور عیاشی کی طرف مائل ہوں تو یقینی بات ہے کہ وہ مسائل پیدا نہیں ہو سکتے جنکا تعلق خالصتاً اخلاقِ حسنہ یا سنجیدہ مباحث سے ہے۔ یورپ میں جبکہ مذہبی پیشواؤں نے علم و حکمت ناپاک قرار دیدیا تھا، صدیوں تک کوئی حکیمانہ مسئلہ لوگوں کے دماغوں میں پیدا ہی نہوا۔ اسلام سے پہلے جبکہ توحید الٰہی کا نقش اچھی طرح لوگوں کے دلوں میں قائم نہ ہوا تھا۔ توحید الٰہی کے متعلق کوئی بحث پیدا ہی نہ ہوئی۔ اگر ہوئی تو یہ کہ مختلف اوتاروں یا دیوتاؤں کو کس طرح راضی رکھا جائے؟

اس کے علاوہ فلسفیانہ مسائل کو، علمی انکشافات، سائنٹفک تحقیقات، مذہبی تحریکات، آرٹ کی وجدانیات، تمدنی اور سیاسی زندگی کے انقلابات، اور اقتصادی تاثرات سے بھی، تقویت و تحریک اور حرکت و ہیجان حاصل ہوتا ہے، اور یہ وہ سانچے ہیں جن میں فلسفیانہ رجحانات ڈھلتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ کبھی کوئی فلسفہ برسر عروج آجاتا ہے کبھی کوئی۔ مثلاً مذہبی سرگرمی کے دنوں میں عموماً لوگ یہی سوالات دل میں سوچتے ہیں کہ خدا کا بندوں کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ سیاسی انقلاب کی حالت میں انسان کا خیال عموماً اسی طرف جاتا ہے کہ انسان کو پُرامن زندگی بسر کرنے کے لئے کن کن اخلاقی اصولوں کی ضرورت ہے وغیرہ وغیرہ۔

تیسری بات جس کا اثر تاریخ فلسفہ پر پڑتا ہے مختلف مقتدر ہستیوں کی شخصیت ہے فلسفہ کو اگر کشتی سے تشبیہہ دیجائے تو یہ عظیم الشان ہستیاں گویا "ملاح" ہیں۔ جو اپنے دماغوں کی "پتوار" سے اس کشتی کو جس طرف چاہتے ہیں لیجاتے ہیں۔ اور ان کی زندگی اور خیالات سے وہ امور ظہور پذیر ہوئے جن کی بدولت معلومات عامہ میں اضافہ ہوا۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ یہ ہستیاں اپنے ماحول اور زمانے کی پیداوار ہوتی ہیں۔ یعنی اگر شاہجہاں نہ ہوتا تو اُن معماروں کو بھی دنیا میں کوئی نہ جانتا جنہوں نے "تاج" تعمیر کیا تھا۔ گویا ان کا وجود، شاہجہاں کی فیاضی پر مبنی ہے۔ لیکن بعض دفعہ یہ ہستیاں ایسا انقلاب برپا کردیتی ہیں کہ خود نئے دور کی بانی قرار پاتی ہیں مثلاً کینٹ[1] نے علمی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اور یہ بات سب لوگوں کے نزدیک مسلّم ہے کہ اس نے اپنے خیالات سے "زمانے" کو ایک نئی اور لائق قدر عقلی حقیقت عطا کی جس نے آئندہ نسلوں کے خیالات کو اس کے تیار کردہ سانچے میں ڈھال دیا۔ دنیا کی تاریخ میں ہینی بال، سکندر، نپولین وغیرہ اسی ٹائپ کی ہستیاں گزری ہیں۔

خارجی اثرات غالباً اس سلسلہ میں اُن خارجی حالات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جن کے ماتحت فلسفے کی نشو و نما ہوتی رہی ہے۔ یونانیوں کے زمانے میں فلسفے کی تعلیم بند کمروں میں اور بہت پابندیوں یعنی رازداری کے ساتھ دی جایا کرتی تھی۔ اور فلسفے کے مدارس کے ضوابط کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پہل فلسفے کی تحصیل مذہبی خیالات پر مبنی تھی۔ یعنی لوگ فلسفے کو بھی ایک مقدس علم سمجھتے تھے۔ رومیوں کے زمانے میں فلسفے کا پیوند مذہب سے علیحدہ ہوگیا۔ چنانچہ سیسرو، سینکا اور مارکس آریلیس ان تمام رومی حکماء نے فلسفے کی تحصیل بطور خود کی تھی، یہ لوگ کسی مدرسے میں یا کسی استاد کے پاس باقاعدہ طور پر فلسفے کا سبق لینے نہیں گئے۔ لیکن زمانۂ وسطیٰ میں فلسفہ دوبارہ مذہب کے زیر سایہ آگیا۔ یعنی اس کی تعلیم پادریوں کے ہاتھ میں آگئی۔ اور چونکہ یہ لوگ عموماً خانقاہوں میں رہتے تھے اس لئے فلسفہ بھی خانقاہوں ہی سے متعلق ہوگیا۔ اور زیادہ تر مذہبی خیالات کے لوگ ہی اس فن کو حاصل کرتے تھے۔ (باقی)

محمد یوسف سلیم

[1] مشہور جرمن فلاسفر، جس کا ذکر آئندہ اوراق میں ہوگا۔

معذور

نہ چھپیں گی پردۂ شب میں بھی — ترے گیسوؤں کی تجلیاں
نہ سما سکیں گی نگاہ میں — وہ شباب و حسن کی وادیاں
نہ شکستِ نغمۂ شوق ہوں — تری بے نیاز خموشیاں
جو کوئی فضائے نہاں ملے!
جو کوئی خموش جہاں ملے!
جو کوئی حسین مکاں ملے!
نہ کسی کو حسن کا نشاں ملے!
تو بلاؤں خلوتِ ناز سے — تجھے اپنی بزمِ نیاز میں

(۲)

نہ خروشِ صبح کو ہو خبر — نہ سکوتِ شام ہو رازداں
نہ شعاعِ مہر کو دخل ہو — نہ ضیائے ماہ یہ ہو عیاں
نہ تو ظلمتوں کا ورود ہو — نہ تجلیات ہوں زرفشاں
کوئی غیر ہو نہ حبیب ہو!
کوئی درد ہو نہ طبیب ہو!
کوئی ایسا گوشہ نصیب ہو!
نہ بعید ہو نہ قریب ہو!
تو بلاؤں خلوتِ ناز سے — تجھے اپنی بزمِ نیاز میں

(۳)

نہ سرورِ نغمۂ موج ہو — نہ خرامِ مستئ آبِ جو
نہ حجابِ نور و ظہور ہو — نہ نقابِ عارضِ رنگ و بو
ترے روبرو مرا عشق ہو — ترا حسن ہو مرے روبرو
ترے گیسوؤں کا فسوں بھی ہو!
دلِ مضطرب کو سکوں بھی ہو!
مگر امتیازِ جنوں بھی ہو!
کبھی اتفاق سے یوں بھی ہو!
تو بلاؤں خلوتِ ناز سے — تجھے اپنی بزمِ نیاز میں

روش صدیقی

(غیر مطبوعہ)

مشرق و مغرب

مشرق

مشرقی تہذیب کی تصویر۔ اے جانِ بہار　　(نیچر) بھولی صورت سے ہے تیری حسن فطرت آشکار
اے نشاطِ عصمت و پاکیزگی سے بہرہ ور　　تیرے اس انداز پر بے ساختہ آتا ہے پیار
دے نہیں سکتی تجھے تیری جوانی بھی فریب　　اضطرابِ عشق سے بیگانہ ہے تیرا وقار
زندہ دارِ آبروئے عصمتِ مریم ہے تو　　کس قدر معصوم ہیں ظالم ترے لیل و نہار
سادگی نے کر دیا قائم تری معیارِ حسن　　آج بھی ہے سجدہ گاہِ عشق ! لیلی کا مزار

تیری نسبت یہ نگاہِ شوق کا اندازہ ہے
تو عناصر کے حسین اجزا کا اک شیرازہ ہے

مغرب

اے فریبِ حسنِ مغرب ! اے نگارِ ہوشیار　　(آرٹ) تری صورت سے عیاں ہے فرقِ جبر و اختیار
تو گلستانِ جوانی کا وہ رنگین پھول ہے　　ہے دماغِ حسن پر بوئے محبت جسکے بار
تیرے اس انداز سے سب کھل گیا تیرا بھرم　　مختلف عنوان ہیں دو جاذبیت اور سنگار
بے تعلق گرچہ ہے ظاہر ہیں تو ماحول سے　　دے رہی ہے اپنے دل کو یوں فریبِ انتظار
تیرے اس انداز پر پڑتی ہے جب میری نظر　　شعر یہ غالب کا پڑھ اٹھتا ہوں میں بے اختیار

پوچھ مت رسوائی اندازِ استغنائے حسن
دست مرہونِ حنا۔ رخسار رہنِ غازہ ہے

وقار انبالوی

مشرق و مغرب

عرب کی ایک بدوی عورت

نیچر اور آرٹ

یورپ کی ایک شہزادی

رقص گدایانہ

عکس خانہ بدوش

رہوار موت

اِمتحان

آپ اس مسئلہ کو بھی ہر ایک نفسیاتی مسئلہ کی طرح مختلف حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یہ ہی دقیق ترین مسائل کے حل کا واحد طریقہ ہے پھر اس کے پانچ حصے ہوئے۔

(۱) امتحان کی تعریف
(۲) امتحان کی تیاری
(۳) امتحان کا کمرہ یا امتحان خانہ
(۴) نتیجہ اور (۵) جھوٹ کے فوائد

"**تعریف**"——— امتحان ان امراض میں سے جو موجودہ تہذیب نے پیدا کئے ہیں سب سے زیادہ دلآزار متعدی مرض ہے گذشتہ زمانوں میں یہ مصیبت صرف خدا کے نیک بندوں پر نازل ہوتی تھی۔

مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس مصیبت سے بچنے کے لئے انجیل کا یہ نسخہ استعمال فرمایا تھا کہ "اے خدا مجھے امتحان میں نہ ڈال"

یہ مصیبت ایکدفعہ حضرت یعقوب علیہ السلام پر بھی نازل ہوئی تھی اور "حضرت" بیٹے کے فراق میں روتے روتے اندھے ہو گئے تھے لیکن کیا کرتے اللہ تعالےٰ کو امتحان منظور تھا۔

خیر وہ تو پرانا زمانہ تھا جب تو یہ عزت صرف بڑے بڑے آدمیوں کو ہی نصیب ہوتی تھی لیکن آجکل تو یہ مرض بچہ کی پیدائش کے چوتھے برس عموماً اور پانچویں میں یقیناً پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ مرض عام طور پر لاعلاج سمجھا جاتا ہے اور ہندوستان میں بہ نسبت مسلمانوں کے ہمارے ہندو بھائیوں پر زیادہ ہاتھ صاف کرتا ہے۔ لیکن مزے کی بات تو یہ ہے کہ مسلمان اس مرض سے بہ نسبت ہندؤں کے زیادہ خائف رہتے ہیں۔ اس سے بچنے کا بااثر ٹیکہ فوراً مسلمان ہو جانا قرار دیا گیا ہے بطور حفظ ماتقدم یہ بھی ضروری ہے کہ اس مرض سے ڈرنے والے لوگ پنجاب سے کہیں باہر عالم وجود میں آئیں۔ کیونکہ جب سے پنجاب میں پرائمری تعلیم جبراً قرار دی گئی ہے اس وقت سے اس صوبہ میں تو ہر پانچ برس کا لڑکا اس مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ البتہ بیٹیوں میں یہ مرض بہت کم پایا جاتا ہے اور مسلمان بیٹیوں میں بیاری بچیوں میں تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بالکل مفقود ہے۔

یا الہ العالمین تو اس مرض میں ہر ماں کے بچے کو یکساں طور پر مبتلا کر تاکہ ہندو ماؤں کو یہ شکایت نہ ہو کہ ان کے بچے تو اس مرض میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں اور مسلمان بچے محفوظ رہتے ہیں۔ الٰہی آمین!

ہمارا ایمان ہے (اور ہر عالم باعمل کا یہ ایمان ہونا چاہیئے) کہ "تجربہ انسان کا سب سے بڑا معلم ہے" ایک حضرت ٹکیٹ خریدنے کے بغیر ریل پر سوار ہو گئے جب پکڑے گئے تو اپنے کرم کے ساتھیوں کی تشفی کے لئے اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے یوں فرمایا کہ انہوں نے تو صرف یہ علوم کرنے کے لئے اس طرح سفر اختیار کیا تھا کہ جو لوگ بغیر ٹکیٹ کے ریل کا سفر کرتے ہیں ان کے قلب کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اور آپ نے فوراً ایک دس روپیہ کا نوٹ ٹی۔ٹی کے سامنے ڈال دیا۔ خیر ان کو اس مسئلہ کے حل کرنے میں کامیابی ہوئی ہوگی مگر یہ مسئلہ اچھی طرح تو جب حل ہوتا کہ ان حضرت کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ ہوتی۔ پھر ان حضرت کو معلوم ہوتا کہ جب کوئی ٹکٹ کے بغیر سفر کرنے والا شخص سردی کے دنوں میں نیلے رنگ کے کوٹ اور پتلون کو دیکھ پاتا ہے تو اس کے حواس اس کے کاسۂ سر میں کس طرح تتلیوں کا تماشا کرتے ہیں

چنانچہ ہم جب کسی مسئلہ کو حل کرنے کے درپے ہوتے ہیں تو اس کو حل کر کے دم لیتے ہیں گذشتہ چند سال میں ہم نے نفسیات کا خوب ہی مطالعہ کیا ہے لیکن ہمکو یہ کوئی نہ بتا سکا کہ لڑکے امتحان میں فیل کس طرح ہو جاتے ہیں۔ اور پھر فیل ہو جانے پر ان کی حالت کیا ہوتی ہے اور پھر جب ان کا اپنے فوجی خاندان کے چشم و چراغ یعنی عم بزرگوار سے سامنا ہوتا ہے تو اُن پر کیا گذرتی ہے بہر حال اس بات کی تہ تک ہمیں کوئی نہ پہنچا سکا۔

چنانچہ ایک روز ہمنے ٹھان لی کہ ہم اس دقیق مسئلہ کو حل کریں گے ہم فیل ہو کر بتائیں گے۔ پھر دیکھیں تو یہ مسئلہ کیسے حل نہیں ہوتا اور ہمارا دعویٰ ہے کہ اگر ایسے ایسے نفس کش نمار قوم میں پیدا ہونے لگیں تو کوئی وجہ نہیں کہ قوم مینڈک کی طرح چھلانگیں مارتی ہوئی ترقی کے زینہ پر نہ چڑھ جائے۔

اچھا تو سنیئے۔ امتحان دینے والوں کی بھی کئی قسمیں ہیں۔
مثلاً "کچھوے" یہ وہ لڑکے ہیں جو سارا سال چھت کے ساتھ لٹک کر روتے رہتے ہیں اور آخر میں معمولی نمبر لیکر پاس ہو جاتے ہیں لیکن پاس ضرور ہوتے ہیں امتحان کے بعد کچھوے کی طرح ان کی چربی نکال لو۔ ان کے پاس سب سے کارآمد چیز یہی ہے دنیا کو ان کی ذات سے کچھوے سے زیادہ فائدہ نہیں۔

اس کے بعد "خرگوش" ہیں یہ وہ طالبعلم ہیں جو سارا سال تھیٹر اور سینما کے پردوں پر سبز سبز گھاس چرتے پھرتے ہیں۔ دنیا کا لطف اٹھاتے ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں، گاتے ہیں، بانسری بجاتے ہیں، کیلا کھاتے ہیں، آئس کریم کھاتے ہیں اور جب امتحان میں ایک مہینہ باقی رہ جاتا ہے تو لٹ ہیں اکھٹا کر "بخاری" بن جاتے ہیں پھر صفحات کو دنوں پر تقسیم کر کے روزانہ ۲۵ صفحے جواب نکالکر ان کی طرف دیکھنے لگ جاتے ہیں ان کا دارو مدار دعاؤں کی قبولیت پر ہے۔

اس کے بعد "لدو جانور" ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو ذہین بھی ہیں اور محنتی بھی۔ آپ کہیں گے کہ لدو جانور پھر کیسے ہوئے لدو جانور یعنی وہ جس کے سر پر سینگ نہیں ہوتے، ذہین نہیں ہوتا۔ خیر لدو جانور ذہین نہ ہوتا ہوگا لیکن ہمیں ایسے زیادہ موزوں لفظ ان کی شان کے قابل نہیں ملتا معنوی لحاظ سے یہ لفظ اُن پر صادق نہ آتا ہو تاہم مطلب ادا کر جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے جماعت میں ہم سب سے زیادہ ڈرتے ہیں اور جن سے ہر شریف آدمی کو ڈرنا چاہیئے، یہ وہ لوگ ہیں جو ہمسکو بدنام کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو ہم کو بار بار فیل کراتے ہیں اور ممتحنین کا دماغ بگاڑ دیتے ہیں۔ خدا کرے کہ یہ لوگ پیدا ہونے بند ہو جائیں یا ان تمام کے لئے اسٹریلیا میں ایک علیحدہ کالونی قائم کر دی جائے کہ وہاں بیٹھے آپس ہیں دماغی دولتیاں چلایا کریں اور ہمارے جیسے بھلے آدمیوں کے دماغوں کو خواہ مخواہ تکلیف نہ ہوا کرے ورنہ ان کی بے طرح دماغی دولتیاں ہر دم اپنا تو بھیجا نکالے ڈالتی ہیں۔

غور تو کرو بھائی کہ اگر خدا نے تمہارا دماغ اچھا بنا دیا ہے تو پھر اتنی محنت کی ضرورت کیا ہے اور اگر دماغ خراب ہے تو پھر پڑھنا گیا بھاڑ میں، جاؤ کرسیاں بناؤ، کپڑے سیا کرو، یا کسی فسٹ گریڈ کالج کے پرنسپل ہو جاؤ۔

غرضیکہ یہی وہ لوگ ہیں جنکے نتیجہ کو دیکھ دیکھ کر ہماری والدین ہم کو کوستے ہیں۔ ان ہی لوگوں کے پرچے دیکھکر اگزامینر امتحان کا معیار بلند کر دیتے ہیں۔ اور پھر غریب خرگوش، مسکین خرگوش، بے کس خرگوش، فیل ہو جاتے ہیں۔ ہمیں ان سے بغض ملتی ہے اسی لئے جب ہم کسی کو تھرڈ ڈویژن سے بڑھتے ہوئے پاتے ہیں تو اس کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں کہ ایسا نہ ہو اچھا بھلا انسان، بے ضرر "خرگوش" اگلے امتحان میں بے انتہا لدو جانور بن جائے۔

سب سے آخر میں عارفین یا متوکلین کا طبقہ ہے یہ وہ لوگ ہیں جو بغیر کسی فکر کے سارا سال سوتے ہیں اور جب امتحان آتا ہے تو اللہ کا نام لیکر بیٹھ جاتے ہیں اور اس روز اپنی ساری قابلیت ختم کر دیتے ہیں

امتحان کا کمرہ

آج جیسے فضا ہی بدل گئی ہے، لوگ اپنی عادتیں بھی بھول گئے ہیں، ضروری سامان سے لیس ایک طرف سے چند لدو جانور نہایت شان کیساتھ چلے آرہے ہیں جیسے امتحان کی بالکل پرواہ ہی نہیں ہوتی، دوسری طرف چند کچھوے ہاتھوں میں کتابیں کھولے نہایت سرعت سے ورق گردانی کرتے جاتے ہیں، وہی عینک چہرے پر، اسی خوف کے آثار جو ان کی فطرت میں داخل ہو چکے ہیں۔
ایک طرف خرگوش ہیں کہ کبھی لدو جانوروں کے گروہ میں جا کھڑے ہوتے ہیں جو زبانی ایک دوسرے کو سنا رہے ہیں پھر گھبراہٹ میں وہاں سے نکلتے ہیں اور کچھووں میں جا داخل ہوتے ہیں۔
لیکن واہ رے ہمارے عارفین، دنیا سے بے نیاز، آخرت سے بے پرواہ، نہ کسی سے کچھ پوچھتے ہیں نہ کچھ بتاتے ہیں، نہ بے اثر دعاؤں ہی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں سب سے الگ بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ گڑ گڑ گڑ گڑ۔ گڑ گڑ۔ گڑ گڑ گڑ۔ گڑ گڑ گڑ۔ گڑ گڑ۔
اتنے میں گھنٹہ بجا۔ ہر طرف سے تمام اقسام کے جانور سمٹ سمٹا کر جیسے ایک دریائے ذخار کا پانی ایکبارگی کسی پہاڑ کی سرنگ میں داخل ہو کر نظروں سے غائب ہو جاتا ہے ہر طرف

سے آتے تھے اور ایک ہی راستہ سے داخل ہو کر نہ معلوم کہاں چلے جاتے تھے۔

مزید واقفیت کے لئے اتنا عرض کر دینا ضروری ہوگا کہ دیگر اصطبلوں کی طرح کمرۂ امتحان میں جانوروں کی جگہ علیحدہ علیحدہ نہیں ہوتی۔ یعنی گھوڑوں۔ لدو جانوروں۔ خرگوشوں اور عارفین سب کو اکٹھا ہی بند کر دیا جاتا ہے۔ ہر ایک کے لئے چاہے وہ کچھ ہو چاہے اور جانور بھی بالکل ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔ یونہی میرے ارد گرد تمام قسم کے جانور بیٹھے تھے۔

ابھی پرچہ بٹنے میں کچھ منٹ باقی تھے کہ ایک عارف میرے آگے سے ایک لدو جانور سے ہمکلام ہوئے۔ اب میں نے محسوس کیا کہ عارف صاحب کمرہ میں داخل ہوتے ہی گویا بالکل تبدیل ہو چکے ہیں۔ وہی عارف صاحب جو اس سے چند منٹ پیشتر آرام اور اطمینان کا مجسمہ تھے۔ اب پھرتی اور چستی کے حیرت انگیز علم بردار تھے۔ اور ایک بات جو خاص طور پر قابل غور تھی وہ یہ تھی کہ وہ سوائے لدو جانوروں کے اور کسی سے بات چیت کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ غالباً اس لئے تھا کہ امتحان کے دن لدو جانوروں سے زیادہ کارآمد جانور ان کو ہال میں تو دکھائی دیتا نہیں تھا۔

عارف (ایک لدو جانور کا ہاتھ تھام کے) اے میاں کچھ ہم پر بھی مہربانی کرو گے۔ نہیں؟

لدو جانور (از راہ عجز) اے بھائی میں خود کیا جانتا ہوں جو تمہیں بتلاؤں گا۔

عارف خیر میں یہ نہیں جانتا اور نہ مجھے اس بات کی پروا ہے کہ آپ کچھ جانتے ہیں یا نہیں۔ لیکن مجھے ضرور بتائیے گا۔ (آج حضرت عارف کا رنگ سخن ملاحظہ ہو۔)

لدو جانور بھائی اگر میری کچھ سمجھ میں آیا تو ضرور بتاؤں گا۔

ادھر سے اطمینان حاصل کر کے میاں عارف دائیں ہاتھ مڑے۔

عارف۔ (ایک لدو جانور سے) اے دوست۔ کچھ نہیں مدد کرو گے؟ وقت پر کام آنا یار۔ لکھ دینا دوست

لدو جانور بھائی بتانے میں تو مجھے عذر نہیں البتہ ڈرتا ہوں۔ لکھ کر دینے کی تو مجھ میں جرأت نہیں۔

اتنی دیر میں سٹیج پر سے آواز آتی ہے بسٹاپ ٹاکنگ۔

عارف۔ (دوسرے لدو جانور کو) پھر کہنی کے ساتھ ہلا کر۔ دوست لو ایک آسان ترکیب تمہیں بتاؤں۔ پرچہ حل کرتے وقت کبھی کبھی میری طرف دیکھتے رہنا۔ یعنی انگلیاں میں اٹھاؤں اتنے نمبر کا سوال سمجھ کر اگر جواب ہاں میں ہو تو ناک کو کھجلا دینا۔ اور اگر جواب نہیں میں ہو تو کان کو۔ یوں پرچہ کا ایک حصہ حل ہو سکتا ہے۔

پھر آواز آتی ہے "سٹاپ ٹاکنگ"

پرچہ بٹنے لگا۔

عارف۔ (تیسرے لدو جانور سے مخاطب ہو کر) دیکھو یار ہر ایک سوال کے متعلق چھوٹے چھوٹے نوٹ میری طرف پھینکتے رہنا۔ تاکہ میں بھی پرچہ حل کر سکوں۔

تیسرا جانور۔ نا بھائی نا۔ مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔

سٹاپ ٹاکنگ۔ یو ٹو۔

لدو جانور۔ اور عارف خراٹ سے غوطہ لگاتے ہیں۔ لدو جانور تمام پرچہ پڑھے بغیر حل کرنا شروع کر دیتا ہے۔ گویا اس کو خوب معلوم ہے کہ کوئی ایسا سوال ہو ہی نہیں سکتا جسکو بحیثیت آسان ہونے کے دوسرے پر ترجیح دے سکے۔ لیکن برخلاف اس کے عارف بیچارا سارے کا سارا پرچہ پڑھ جاتا ہے۔ پھر پڑھتا ہے۔ اور بہت ہی پڑھتا ہے۔ چنانچہ ایک آدھ سوال کا جواب تو دماغ کے کسی کونے میں اٹکا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ باقی نام اللہ کا۔ اس سوال کو نہایت خوبصورتی سے حل کرتا ہے۔ پھر پرچہ پڑھتا ہے۔ جب کچھ یاد آنے کا یقین ہو جاتا ہے تو سر اٹھا کر سامنے امتحان کے نگراں کی میز کی طرف دیکھتا ہے اور پھر ادھر سے فراغت پا کر دائیں طرف نظر ڈالتا ہے تو لدو جانور گویا سارے سال کا کھایا ہوا علم نکال نکال کر کاغذوں پر جگالی کر رہے ہیں۔ ان کے قلم ہیں کہ تیر سے چلے جاتے ہیں۔

دوسری طرف خرگوش کبھی جگالی کرنے لگ جاتے ہیں یعنی لکھتے ہیں اور کبھی پھر سر اٹھا لیتے ہیں۔ البتہ جب کوئی بھولا بھٹکا نگراں ان کی طرف آنکلتا ہے تو ان کی حرکات دیکھنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ آخر تو نیا ورق الٹ دیتے ہیں تاکہ وہ ان کی قابلیت کا اندازہ لگانے سے قاصر رہے یا فوراً اسے جاذب لینے کے لئے بھیج دیتے ہیں۔

امتحان میں خرگوش کو شناخت کرنا ہو تو ہال میں آئیس کریم سوڈا کے گلاس گن لو۔ بس ہر خرگوش کے سامنے ایک گلاس رنگدار بوتل کا ہوگا یہ لوگ عین امتحان کے وقت کبھی کبھی کیلا منگا کر بھی کھاتے ہیں۔

عارف ایک سوال حل کر لینے کے بعد جب حافظ پر بیحد زور دینے کے باوجود کچھ نہیں کر سکتا تو اب دماغ کو چھوڑ کر ہاتھوں۔ کانوں اور آنکھوں سے مدد لینی شروع کرتا ہے۔ پہلے جیبیں ٹٹولتا ہے۔ ایک، دو، تین۔ چار پانچ۔ یونہی بیسیوں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مختلف جیبوں میں سے نکالتا ہے۔ لیکن یہ عام طور پر بہت کم کام آتے ہیں۔ اگر ان پر کچھ کام کی بات کبھی ہوتی بھی ہے تو بھی کچھ گھبراہٹ میں۔ کچھ جلدی میں۔ کام نہیں آتی اب جھنجلاتا ہے۔ اب خیال آتا ہے کہ سارا سال تو عیش میں گذارا۔ گرم

گرم لحاف اوڑھے۔ مزے کی نیندیں لیں۔ لیکن اگر آج ہاتھ پیر نہ ہلائے تو خیر نہیں اب حواس درست کرتا ہے۔ دیکھتا ہے یہ لدو جانور کے کان کھینچتا ہے۔

عارف۔ ہوں میں نے کہا۔

لدو جانور۔ تیزی سے قلم کا غذ پر تیرتا چلا جا رہا ہے۔ اور وہی مست جانور انسان نما وحشی جواب سے کوئی گھنٹہ بھر پیشتر سستی کا دیوتا تھا اب چستی کی صورت دکھائی دیتا ہے۔ لکھ رہا ہے۔

عارف۔ مسٹر میں نے کہا۔

لدو جانور (تیزی سے لکھ رہا ہے) "یا تو مجبور کر دی گئی۔ یا ان کی اقبالمندی پر فریفتہ ہو گئی۔ پالیٹیشین ایک واحد اور ان دیکھے خدا کے اپنے سیدھے سادے خیال سے نہایت حیران تھے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے عزورنے ایک ہم عصر فانی وضع قوانین کے احکام کی زنجیروں کو حقیر جاننا ان کے ایمان"

عارف۔ میں نے کہا مسٹر۔ ارے بھائی۔

لدو جانور۔ ان کے ایمان۔ اعتقاد۔ ابھی کامل نہیں تھے خون اور . . ."

عارف۔ بھائی۔ بھائی۔

لدو جانور۔ لکھتے ہوئے "آبائی جھگڑے ابھی تک باقی تھے لیکن . . ."

عارف۔ لدو جانور۔ سنتا ہے یا نہیں۔

اب تو لدو جانور بھی چونکا اور بولا "کیا کہتے ہو"۔

عارف۔ بھائی صاحب آپ مدد دیتے ہیں یا نہیں۔ اگر جواب نفی میں ہے تو میں شور مچاتا ہوں۔ اور اگر اس پر بھی کچھ نہ ہوا تو کاغذ پر لکھکر کچھ تمہاری طرف پھینکتا ہوں۔ پھر جو نتیجہ ہوگا وہ تم پر ظاہر ہی ہے۔ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تمکو بھی لے ڈوبیں گے۔ کہو دوست کیا رائے ہے۔

لدو جانور۔ ارے یار کہیں ایسا غضب بھی نہ کر دینا۔ میں تباہ ہو جاؤں گا میری ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔

عارف۔ ہوں۔ تو کیا آپ کا سال میرے سال سے زیادہ طویل تھا۔ جیسا سال بھر میں نے کالج میں گذارا ویسا تم نے۔ تو پھر نکلیں گے تو اکھٹے۔ ورنہ دوست اگلے سال ڈٹ کر ہم اکٹھے ہی امتحان دیں گے۔ لدو جانور نے عارف کو مدد دینی شروع کی۔

سٹاپ رائیٹنگ۔

پرچے لے لئے گئے۔

اب حضرت خرگوش یعنی دل میں کہتے ہیں۔ چچا ہیں فوجی اور پھر پنشنر۔ تم ہزار کہو بیمار ہو گیا لیکن وہ کہیں گے بہتر تھا کہ مورچہ ہاتھ سے دینے کے بجائے مورچہ پر مر جاتے۔ یہی فوجی قانون ہے۔ اگر کوئی کام تمہارے سپرد کیا گیا ہے تو یا وہ کام باقی نہ رہے اور یا تم باقی نہ رہو۔ تم بیمار ہی لیکن زندہ تو تھے۔ پھر فیل ہو جانے کے کیا معنی۔ تم کہو پرچہ بہت ہیڈ ہیب تھا۔ بہت لوگ فیل ہو گئے۔ لیکن وہ کہیں گے تم خود بھی ہیڈ ہیب کیوں نہ بن گئے۔ اور اگر کلاس میں سے ایک آدمی بھی پاس ہوا تو وہ تم ہی کیوں نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر چچا سول کے ملازم ہوتے تو کچھ اُمید ہو سکتی تھی۔ اور اگر چچا وکیل یا بیرسٹر ہوتے تو فوراً دلائل سے قائل کر دیتے۔ لیکن یہاں تو ہیں چچا فوجی اور پنشنر فوجی جنکا پہلا اصول ہے کہ حکم کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ اور جو دلیل دیگا اس کا کورٹ مارشل کر دیا جائیگا۔ دن میں بھی یہی سوچ۔ رات کو بھی یہی فکر۔ نہ کھانے میں آرام۔ نہ سونے میں چین دل میں کہتے ہیں کہ ہم سے تو وہ لدو جانور ہی اچھے تھے۔

ہمیں تو جھوٹ بولکر والدین کو خوش کرنا پڑیگا۔

(سجاد حیدر)

اشعار

تمہارے نہ ملنے سے کیا ہو گیا گذر ہی رہے ہیں گذرنے کے دن

صفیؔ اب زمانہ ہے نازک بہت یہ ہیں اپنے سایہ سے ڈرنے کے دن

غلام شوق کے بندے ہوئے تمنا کے وہی مثل کہ رہے دین کے نہ دنیا کے

صفیؔ ہے اور پھر اسکی گلی ہے لے توبہ سنبھل سکا نہ یہ سو بار ٹھوکریں کھا کے

صفیؔ

کلام رشک

مشاعرے میں کسی کے نہ جانے اے رشک
زبان غیر سے اپنی زباں بگڑتی ہے

سوانح عمری والاجاہ میر علی اوسط رشک سید سلمان کے بیٹے تھے جن کو لالہ سری رام نے اپنے تذکرہ میں سید سلیمان اور گارسن دتاسی نے سید المان لکھدیا ہے۔ خود رشک فرماتے ہیں [۱]

والد امجد سید سلمانِ فقیہ — عزم فردوس نمود ند جو از شوق کمال

میر سلمان فیض آباد کے رہنے والے تھے۔ جب دلی بگڑی تو فیض آباد ہی اول اول آباد ہوا تھا۔ پھر یہ آبادی لکھنؤ کی طرف منتقل ہوگئی۔ میر علی اوسط رشک ۱۲۱۴ھ میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے لیکن تعلیم و تربیت لکھنؤ میں حاصل کی تھی۔

چونکہ سید سلمان کی وفات ۱۲۱۹ھ میں واقع ہوئی تھی۔ اغلب ہے کہ میر رشک ۵-۶ سال ہی کی عمر میں لکھنؤ گئے ہوں گے۔ جہاں انہوں نے عربی۔ فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کی۔ اردو زبان کے تو وہ ایک مستند محقق تسلیم کئے جاتے ہیں چنانچہ کلب حسین خاں صاحب نادر تلخیص معلی میں ارشاد فرماتے ہیں کہ "سید علی اوسط صاحب سلمہ تعالیٰ بڑے صاحب تدقیق و اہل استعداد با تحقیق ہیں۔ کہ مثل و نظیر اپنا نہیں رکھتے۔ چند قواعد اور اصول اور قیود اختراع کئے۔ کہ اکثر قابل قبول و پسند اہل سخن ہیں۔"

تذکرہ آب حیات میں اسی نوٹ کی بنا پر مولانا محمد حسین صاحب آزاد مرحوم و مغفور تحریر کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے اور ان کے بعض ہمعصروں نے زبان کے بارے میں اکثر قیدیں واجب سمجھیں کہ دہلی کے مستند لوگوں نے بھی ان میں سے بعض بعض باتوں کی رعایت اختیار کی اور بعض میں اختلاف کرتے تھے۔ مگر اصل واضع ان قوانین کے میر علی اوسط رشک تھے

تعلیم و تربیت :۔ تذکرہ گل رعنا میں لکھا ہے کہ سید علی اوسط رشک کے والد علوم و فنون میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ یہ اپنے والد اور دیگر علمائی فیض صحبت سے استعداد علمی حاصل کر کے شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد ہوئے۔

لیکن ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ میر رشک مرحوم کے والد انکو صرف پانچ برس کی عمر میں چھوڑ کر رحلت کر گئے تھے۔ لہذا یہ اپنے والد سے کس قدر تعلیم و تربیت حاصل کر سکتے تھے؟ دراصل رشک شیخ ناسخ کی طرح ایک خود ساز (سیلف میڈ) آدمی تھے۔ شعر و شاعری کے ساتھ تحقیق زبان کا بھی شوق تھا۔ انہوں نے دہلی کی پرانی بول چال کی اصلاح کر کے جو زبان لکھنؤ میں مروج کئے جانے میں جبھڈ رسدی مدد دی وہ قابل تعریف ہے۔ افسوس ہے کہ میر علی اوسط رشک کے اور ان کے خاندان کے حالات کچھ زیادہ معلوم نہیں ہیں۔ فقط اتنا کھاتا ہے کہ ان کے باپ ایک لائق فقیہ تھے۔ جن کے دو بیٹوں میں ایک رشک تھے۔ پھر آخر الذکر کے ایک بیٹا ہوا جس کا نام سید میر مامن علی تخلص بہ شوق ہے۔

انقلاب حالات میر رشک نے فیض آباد اور لکھنؤ میں شہروں میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کیا تھا۔ اور ان کا حلقہ احباب بھی کچھ فیض آبادی اور زیادہ تر لکھنوی اصحاب پر مشتمل تھا۔ لیکن یہ عموماً شیخ ناسخ کے ہمراہ رہتے تھے اور انہی کے ساتھ انقلاب زمانہ کی مصیبتیں برداشت کرتے کرتے آخر کربلائے معلی کی طرف چلے گئے تھے۔

میر رشک کا اصل کارنامہ میر صاحب موصوف کی نسبت ہر ایک تذکرے میں ان کے محقق زبان ہونے کا اعتراف کیا گیا ہے حقیقت میں دلی بگڑ کر فیض آباد آباد ہوا تھا۔ تو اس میں کچھ پورب کے کچھ بنگالے کے اور عموماً لکھنؤ کے ایسے شرفا آکر بسنے لگے تھے

[۱] تذکرہ خمخانہ جاوید قسط سوم صفحہ ۲۱۰ [۲] تلخیص معلی میں شیخ ناسخ اور ان کے متعدد شاگردوں کے نام گنوا کر یہ واضح کیا گیا ہے کہ کن کن لوگوں نے دلی کی قدیم زبان کی اصلاح کی تھی۔ اسی لئے آزاد نے ان لوگوں کو مصلح زبان قرار دیا ہے۔

کہ ان کے باہمی اختلاط نے زبان اردو کو بالکل گڈمڈ کر دیا تھا۔ تاہم ان سب لوگوں کو دلی ہی کی قدیم بول چال بہت بھاتی تھی۔ اس لئے اول فیض آباد ہی میں اصلاح زبان کا ایک دفتر قائم کیا گیا جس سے عوام کو بھی تحقیق السنہ کا شوق دامنگیر ہوا۔ اور یہی شوق اپنی شاعری کے شوق کے ساتھ لیکر میر علی اوسط رشک لکھنؤ میں وارد ہوئے۔ اور فن میں خاص دستگاہ حاصل کی۔

اس زمانے میں شیخ ناسخ۔ حضرت رشک خواجہ وزیر اور رضا برق و بحر وغیرہ نے سخنوران دہلی سے اختلاف کر کے جو رنگ لکھنؤ ایجاد کیا تھا اور زبان اردو کو وسعت دلائی تھی۔ چونکہ اس کا ایک مفصل بیان سید کلب حسین خاں صاحب نادر کی ایک تالیف تلخیص معلیٰ میں موجود ہے ہم اس مضمون ہی کو یہاں نظر انداز کرتے ہیں۔

تصنیفات:۔ گارسن دتیاسی لکھتا ہے کہ میر رشک کے دو دیوان ہیں جو بڑی شہرت پا چکے ہیں۔ ایک لغتیہ قصائد میں ہے جس کا نام نظم مبارک کے مطابق ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء دوسرا فخریہ دیوان ہے مسمیٰ نظم گرامی کے مطابق ۱۲۹۱ھ / ۱۸۴۵ء ان میں سے پہلا دیوان متن میں اور آخر الذکر اسی کے حاشیے پر چھپا تھا۔ اب کمیاب ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میر رشک مرحوم نے ایک تیسرا اردو دیوان بھی تصنیف کیا تھا۔ جو زمانۂ غدر میں غائب ہو گیا تھا۔ اور تمام تذکرے اس کے متعلق شہادت دیتے ہیں کہ حضرت رشک کا یہی آخری دیوان تھا۔ کہ سابقہ دو دواوین[۱] سے بہتر اور ان کے کلام کے متعلق جتنے اعتراضات کئے گئے ہیں وہ ان تمام عیوب سے بالکل مبرا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ وہ اب کہیں بھی دستیاب نہیں ہوتا۔

(۱) **دیوان رشک** یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ رشک کا یہ خاص قلمی دیوان جو اب تک غیر مطبوعہ تھا۔ اور ایام غدر میں لکھنؤ میں گم ہو گیا تھا۔ اب ہم کو پنجاب میں صحیح و سالم مل گیا ہے۔ اس لئے سطور ذیل میں ہم اس کے متعلق کچھ عرض کیا چاہتے ہیں۔

۱۔ یہ ایک متوسط حجم کا قلمی دیوان غالباً میر رشک ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

۲۔ اس میں تمام ردیفوں کی غزلیں ہیں بہ استثناء لام اور میم کی ردیفوں کے جو بلا شک کہی ہی نہیں گئیں۔

۳۔ اس دیوان میں تمامتر غزلیں فقط تین عدد ترجیع بند اور کچھ تاریخیں اسی قلمی دیوان کی تصنیف کے متعلق درج ہیں۔

۴۔ یہ دیوان میر موصوف کا بہترین کلام ہے۔ جس کے مطالعہ سے میر رشک کے کلام پر جو گوناگوں اعتراضات کئے گئے ہیں وہ سب رفع ہو جاتے ہیں۔ (۵) یہ دیوان ۱۲۶۷ھ ہجری میں قلمبند کیا گیا۔

(۲) ترجمہ حدیث رجعت

تذکرۂ آبحیات میں لکھا ہے کہ شیخ ناسخ کی ایک مثنوی ہے جو حدیث مفضل کا ترجمہ ہے۔ میر علی اوسط رشک نے اسے ترتیب دیا۔ اور اس کا تاریخی نام نظم سراج رکھا ہے۔ لیکن گارسن دتیاسی اس مثنوی کو سید رشک ہی کی تصنیف بتاتا ہے جو ۱۲۹۳ھ ہجری میں مکمل ہوئی تھی۔ اس کا حجم کل ۲۶ صفحے ہے۔ اور ہر صفحے میں ۲۵ اشعار

(۳) **نفس اللغۃ**۔ اردو الفاظ کے معنی فارسی میں لکھ کر رشک نے یہ لغت ۱۲۵۶ھ ہجری میں تالیف کی تھی۔ یہ قابل تعریف لغات اردو ہے۔

انداز کلام:۔ میر علی اوسط رشک کی شاعری کی نسبت سب تذکروں میں یہ شکایت کی گئی ہے کہ ان کے کلام میں رعایت لفظی۔ ضلع جگت غرابت بیان اور دور از کار تشبیہات و استعارات اسقدر موجود ہیں کہ ان کی غزلیں بد مذاقی اور سراسر خشک کلامی کا ایک نمونہ معلوم ہوتی ہیں۔ اور مولانا آزاد تو آبحیات میں لکھتے ہیں کہ تاریخ گوئی کا رشک[۲] نے گویا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ یہ اعتراضات اگر صحیح بھی ہوں تو ان سے ایک میر رشک ہی کیوں بدنام ہوں؟ جبکہ رعایت لفظی کا عیب شیخ ناسخ تک کے اشعار میں پایا جاتا ہے۔ اور جب دہلی کی شاعری لکھنؤ میں پہنچی۔ تو ضلع جگت کی عادت اکثر شعرا میں جیسے وہاں موجود تھی یہاں بھی سرایت کر گئی اور غرابت کلام تو اس لئے اہل لکھنؤ میں پیدا ہوئی کہ متاخرین کے لئے یہی چارہ کار تھا۔ کہ وہ نئی نئی باتیں اپنی غزلوں میں درج کر کے حسن کلام کو چمکائیں۔ لہذا نئی نئی زمینوں میں شعر کہنا پڑا۔ اور جب نئے نئے قوافی خواہ مخواہ غزلوں میں کھپائے گئے تو غرابت خیال کے نقص کو کیونکر روکا جا سکتا تھا۔ اسی غرابت خیال کی بدولت جدید استعارات و تشبیہات سے بھی شعرائے لکھنؤ کو واسطہ پڑا۔ لہذا وہ اس امر میں مجبور تھے۔ پھر ایک اکیلے رشک ہی پر اتنے اعتراضات کا بوجھ کیوں ڈالا جاتا ہے۔ اس وقت یہی انداز تھا۔ میر موصوف نے بھی اس کی پیروی کی۔

تاریخ گوئی:۔ مولانا آزاد نے ایک طنز کے ساتھ یہ لکھ دیا ہے کہ میر رشک نے گویا تاریخ گوئی کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ رشک کے پہلے دو دیوانوں میں بیشک ان کی تاریخ گوئی کی کثرت ثابت ہوتی ہے لیکن ان کے تیسرے دیوان میں تاریخ گوئی کا تو کہیں نام و نشان

[۱] ملاحظہ ہو دیباچہ نفس اللغت [۲] سید رشک مرحوم کے بیٹے سید علی ضامن شوق کا تو یہ عالم تھا کہ اُن کی ہر غزل کا مقطع تاریخی ہوتا تھا۔

بھی پایا نہیں جاتا۔ پھر اس میں عیب ہی کی کونسی بات ہے جبکہ بعض اساتذۂ دہلی و لکھنؤ بات بات پر تاریخیں کہا کرتے تھے۔ چنانچہ دہلی میں مومن کا دیوان اور لکھنؤ میں دیوان ناسخ ان تاریخی مادوں سے بھرا پڑا ہے۔

خاتمہ: طوالت مضمون کی وجہ سے اب ہم رشک کے حالات سے قطع نظر کر کے ان کے دیوان سوئم میں سے ان کا کچھ کلام ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے درج ذیل کرتے ہیں۔

مطلع دیوان

عرش ہے پایۂ بام حیدر کا　　فوق عالم ہے بام حیدر کا

چونکہ میر علی اوسط رشک تشیعی مذہب رکھتے تھے۔ اسی لئے اپنے اس تیسرے دیوان کو ایک ایسے مطلع کے ساتھ شروع کیا ہے اسی غزل کے دو ایک اور شعر یہ ہیں ؎

جان سے ہوں غلام حیدر کا　　دل سے جپتا ہوں نام حیدر کا
نہ رہے بے لوازم طاعت　　یہ رہا التزام حیدر کا
جس نے جس کام کو لیا وہ ہوا　　اسم اعظم ہے نام حیدر کا

صرف احکام دین زبان رہی
تھا یہ دنیا میں کام حیدر کا

میر رشک مرحوم شیخ ناسخ کے نہ صرف ایک باوفا شاگرد تھے۔ بلکہ اُن کے ایک ایسے گرویدہ دوست بھی تھے کہ ان سے کبھی جدا ہونے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ موصوف کی اپنی غزلوں میں جابجا تعریف کی ہے مثلاً ؎

بجا ہے رشک کو فخر تلمذ ناسخ　　نہ تھا کہیں کوئی اس شخص نامور کی طرح
بس ہے تقلید کو اے رشک کلام ناسخ　　قول استاد بھی استاد ہے استاد کے بعد

دوسرا ایسا ہو تو لکھتا ہوں خط بندگی　　شعر میں اے رشک جیسے شیخ صاحب ہو گئے
لذتیں دیتی ہے اے رشک کلام ناسخ　　سخن شاعر کامل سے مزا ملتا ہے

سید رشک مرحوم باوجودیکہ ایک محقق اردو اور واضع قوانین زبان تھے۔ لیکن فارسی اور ہندی الفاظ کے درمیان اضافت کا استعمال جائز قرار دیتے تھے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔ ؎

ولہ

باغ میں تم جو ہنسو گے نظر آئے گی بہار
گل خنداں ابھی ہر غنچۂ کونپل ہوگا

میر انشا نے ایک مدحیہ قصیدہ میں چند انگریزی الفاظ مثلاً ٹین۔ لندن بگل وغیرہ وغیرہ استعمال کئے تھے۔ غالب نے اپنے سہرے میں سہرا لکھا اور ذوق نے ایک جگہ گبھی تحریر کیا۔ اسی طرح سید رشک نے تصویر کے فریم کو یوں اردو نظم میں کھپایا ہے ؎

فریم اپنا دل روشن ہے تصویر تصور کا　　چراغ چشم میں روغن ہے تصویر تصور کا

اگرچہ میر رشک ایک مشرقی شاعر ہیں جو آجکل کے پولیٹیکل خیالات سے کچھ تعلق یا واسطہ نہیں رکھتے پھر بھی فرماتے ہیں ؎

زنجیر علائق سے ہم آزاد نہ ہوں گے　　جبتک قدم اپنا سوئے زنداں اُٹھیگا

ایک درد انگیز غزل چھوٹی بحر میں لکھی ہے ؎

توسن صرصر فنا کی طرح　　دور عہد شباب کا گذرا
روؤں بحر فنا میں کس کس کو　　کہ جو گذرا وہ آشنا گذرا
آتش عشق جائے پوچھے ہیں　　جل گیا بھن گیا۔ گیا گذرا
قصۂ الفت بتاں کب تک　　ان بکھیڑوں سے اے خدا گذرا

اس سے زیادہ سلاست اور صفائی بیان اور کیا ہوگی؟ ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ عام تذکرہ نویس میر رشک کے کلام کو بھر فصاحت اور خوش اسلوبی سے معرا کیونکر لکھتے ہیں؟

ایک اور چھوٹی بحر کی غزل یوں حوالہ قلم کی ہے ؎

محبت میں غافل کو ہشیار دیکھا　　یہاں بیخبر کو خبردار دیکھا
نہ چھٹتی ہے ہڈی نہ بچتا ہے تسمہ　　ترا کاٹ لے غم کی تلوار دیکھا

تذکیر و تانیث: میر رشک مرحوم بلبل کو مونث ہی باندھتے ہیں چنانچہ ایک شعر کا یہ دوسرا مصرعہ ہے۔

کانٹے کی طرح بلبل شیدا نکل گئی

ایک شعر میں اپنے آبائی وطن فیض آباد کی بربادی کی طرف اشارہ کر کے لکھا ہے ؎

کیا خرابی ہوگی اس ویرانۂ خاطر کی اور　　کہتے ہیں سب شکل فیض آباد ایسی ہو گئی

ایک اور غزل کا یہ مطلع ہے ؎

ہمارے دور میں سامان انقلاب رہا　　ملی شراب کسی کو کوئی کباب رہا

اسی غزل میں لکھنؤ کے پے در پے تبدیل حالات کے متعلق فرماتے ہیں ؎

مطہرات سے ہیں لکھنؤ میں دو نہریں　　اک انتقال رہا ایک انقلاب رہا

سید رشک مرحوم ایک پابند مذہب آدمی تھے۔ اس لئے آخری عمر میں زیارت کربلا کے لئے خراسان چلے گئے تھے۔ مگر ایسے گئے کہ سنہ ۱۲۸۴ ہجری میں وہیں آپکی وفات واقع ہوئی۔ وہ جب ہندوستان میں موجود تھے تو اپنے عہد کے قابل ترین شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے بیسیوں شاگرد تھے مثلاً سید محسن علی متخلص بہ محسن صاحب تذکرہ سراپا سخن شیخ الٰہی بخش عشقی۔ کاظم علی قیس۔ مرزا اکبر علی ساحل حکیم سید علی ضامن شوق م

عدالت

مجلس عسکری ایک بھوڑے سے کمرے میں منعقد ہوئی اور ایک نوجوان آدمی کو اس جرم میں پیش کیا گیا کہ اس نے ایک مجروح سپاہی کا کام تمام کیا ہے۔ اس کا رنگ خوف سے زرد اور پسینے سے تر بتر اور کپڑے میلے پھٹے اور اس کے لبوں سے، جو بندوق کی ضرب سے زخمی تھا خون بہہ رہا تھا جس سے اس نے اپنے خون آلودہ ہاتھوں سے اپنا تمام چہرہ رنگ لیا۔ وہ نہایت بدشکل اور بدبختوں کی طرح کانپ رہا تھا اس کی ظاہری شکل و صورت اس قدر ناگفتہ بہ تھی کہ کوئی شخص اس کو انسانیت کے زمرے میں شمار نہیں کرسکتا تھا۔

میر مجلس نے اس پر متعدد سوال کئے مگر وہ بالکل خاموش و ساکت رہا، اس نے اپنا نام تک بھی نہ بتایا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے اپنے گرد و پیش ایک خوفناک اور حقارت آمیز نگاہ دوڑائی جس سے سپاہی چراغ پا ہو گئے اور اس کے خلاف پر کینہ اور پرجوش شہادتیں بہم پہنچائیں۔ معاملہ بالکل صاف تھا۔ اس نے ایک مجروح سپاہی کو ہلاک کرکے اس کی کلائی کی گھڑی اتاری تھی اور موقع واردات پر گرفتار ہو گیا۔

میر مجلس نے اپنا ہاتھ میز پر مارا اور حضار مجلس خاموش ہو گئے۔ پھر اس نے کہا، "میں مجرم کے لئے فوجی قوانین کے رو سے موت کی سزا تجویز کرتا ہوں۔" ملزم ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا اور بغیر رد و کد کے سپاہی کے ساتھ ہو لیا۔ مقدمہ ختم ہو گیا اور مجلس عسکری برخاست ہو گئی۔

میر مجلس نے اپنی جائے سکونت پر آکر تلوار کی پیٹی کھولی اور شام کے بعد ہواخوری کے لئے ریلوے سٹیشن کی طرف گامزن ہوا۔ چاندنی رات تھی، غضب کا نکھار تھا، کائنات کا ذرہ ذرہ سنگ مرمر کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ سڑک سفید، درخت سفید، سبزہ زار پر جہاں تک نظر جاتی تھی نور فشاں چاندنی بچھی ہوئی تھی، نظر کی حدود سے باہر ایک عمیق تاریکی تھی، ایک سکون طاری تھا، سنسان خاموشی تھی، آسمان پر ایک تارہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ کوئی شے اس خاموشی و اداسی کے طلسم کو توڑتی نہ تھی، غرض چاندنی ہی چاندنی تھی اور کچھ بھی نہ تھا،

اس نے اپنا سر جھکا دیا۔ ریلوے سٹیشن کے دار انتظار سے خفتہ سپاہیوں کے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی، چاند کی تابش سے تاریکی صحت در خراٹوں میں پناہ گزیں تھی۔ درحقیقت وہ اپنی ہی بھیانک سے ہراساں و نوحہ زن تھی، لیکن ریل کی سڑک کے پار ایک چھوٹے سے جھونپڑے میں ملزم محبوس تھا جہاں ہر طرف تاریکی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی، صرف ایک شگاف سے روشنی چھن چھن کر آتی تھی۔

اس سکون منجمد و بھیانک سے میر مجلس کی رگوں کا خون سرد ہو گیا، اس کو یاد آ گیا کہ اس نے کبھی پیشانی سے اوپر نظر نہیں اٹھائی، دفعتہً پسینہ کا ایک قطرہ گرا اور پیشانی پر بہنے لگا۔ یہاں تک کہ تمام پسینہ سے تر ہو گئی۔

آہ۔ کیا اس سرد چاندنی کی وجہ سے تمام اشیاء بے جان ہو گئی ہیں کیا تمام چرند و پرند اور حیوان مر گئے۔ کیا یہاں بھوت پریت کا تو سایہ نہیں یا کیا یہ سب میرے وہم کی تخلیق ہے۔

تنہائی کا عالم اور غضب کا سناٹا، دفعتاً ایک بھاری اور کرخت آواز آئی جیسے کہ چاند بول اٹھا، "دنیا میں کوئی قانون نہیں"

وہ کانپ گیا۔ یہ کس کی آواز ہے، کس کو یہ الفاظ کہنے کی جرأت ہوئی، کہ دنیا میں کوئی قانون نہیں!

ہم تمام اس دنیا میں قانون کے ماتحت ہیں، جس طرح افق ایک دائرہ کے اندر محیط ہے اسی طرح ہم ایک قانون کے اندر ہیں، میں تین سپاہیوں پر کس طرح قابو پا سکتا ہوں، اگر کوئی قانون نہ ہو۔ میرے تمام راستے مسدود ہو جائیں۔ دنیا میں انصاف کالعدم ہو جائے۔ خود انسان قانون کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اور نہ ہی دنیا کا نظام قانون کے بغیر قائم رہ سکتا ہے، بلکہ دنیا نیست و نابود ہی ہو جائے۔

ساکن آواز نے جواب دیا "دنیا میں کوئی انصاف نہیں"۔

"کیا"، میر مجلس نے آپے سے باہر ہو کر کہا "تم بالکل غلط کہتے ہو۔ میں نے اس کو اس لئے گردن زدنی کے قابل ٹھہرایا کہ اس نے ایک مجروح سپاہی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے، میں نے انصاف کیا، لیکن اگر قانون کا وجود نہ ہوتا تو میں اپنے ضمیر کی آواز پر عمل پیرا ہونے کے لئے تیار ہو جاتا اور اس کو موقع واردات میں ہی اپنی بندوق کی ضرب سے ہلاک کر دیتا جس سے میرا ضمیر صاف ہو جاتا۔

پھر غیر محدود آواز نے کہا، "دنیا میں ضمیر کالعدم ہے"

میر مجلس اس ہولناک اور جانگداز آواز کا مقابلہ کرنے کے لئے

تن کر کھڑا ہو گیا۔ اور نہایت درشتی سے جواب دیا " اس پلیٹ فارم کی طرف دیکھو جہاں تین سپاہی مردہ پڑے ہیں۔ تین نوجوان آدمی جو صبح زندہ تھے آج صبح وہ ہنستے اور اپنی ناہموار اور پر مسرت گفتگو سے لذت اندوز تھے۔ رنج والم اور غیض و غضب کی وجہ تم پر جنون و دیوانگی طاری ہو جائیگی۔ اور اس جنوں کی حالت میں سچائی اور ایمان کی خاطر تم انصاف کر دو گے اور اگر تم خدا ہو تو اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے جو ایک انسان نے کیا ہے۔

وہ آواز جو چاندنی سے نکلتی تھی خاموش تھی۔ یکہ و تنہا حاکم نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا۔ ایک وسیع سفید گنبد جس سے سر رد روشنی زمین پر عکس ریز تھی ایک صدا آئی۔

"کوئی خدا ہی نہیں" حاکم لرز اٹھا اور خوف سے لرزہ براندام ہو گیا۔ یقیناً گھاس کی ایک ننھی پتی، سڑک کی گرد۔ سفید پتھر کے ذرّے مجرم کے خونی قطرے خشک ہو کر فوراً آسمان کی طرف اڑ کر خدائے لم یزل کی درگاہ میں گریہ و فریاد کریں گے۔ وہ قادر مطلق کے بڑے بہادر و جری اور سچے شاہد ہوں گے۔ کم از کم کوئی آواز پیدا ہوگی۔

خاموشی، سنسان خاموشی، ہر طرف خاموشی برس رہی تھی، صرف ایک سپاہی نیند میں بڑبڑا رہا تھا۔ ہر شے ساکن تھی۔ لامحدود کرۂ ارضی اس خاموشی سے متاثر تھا۔

"لیکن مجھے کیا ہو گیا" خوف زدہ حاکم نے دل میں کہا، میرے اعضا کیوں شل ہو گئے۔ میرا دل خدا کی خدائی کا شاہد کیوں نہیں۔ میں خدا کو سچے دل سے مانتا ہوں۔ کوئی شے میری مددگار نہیں۔

ایک سپاہی آہستہ آہستہ بولا۔ اور کوئی آدمی جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آدھی رات کا پہرا بدلا۔ اس کی کھانسی اور فاحش الفاظ کی آواز آنے لگی۔ حاکم نے واپسی کے لئے قدم اٹھایا لمپ کی مدھم اور گرم روشنی نے برآمدے میں اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ اسکی رہنمائی کے لئے منت پذیر ہوا اس کو اٹھایا اور پلیٹ فارم کا رخ کیا۔

وہاں تین لاشیں کس میرسی کی حالت میں پڑی تھیں۔ تین مقتول سپاہیوں کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ چاندنی نے انہیں اپنے پُرسحر سرد نقاب میں لپیٹا ہوا تھا۔

ملزم کے جھونپڑے کے باہر ایک سپاہی گشت کر رہا تھا۔ پلیٹ فارم کی درخشاں ریت اور مربع جھونپڑے کی سفید گلکاری تمام چاند کی نورانیت سے منور تھی۔

حاکم عدالت کے کمرے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھا اور اپنے آپ کو ایک صوفے پر گرا دیا۔ لمپ کو صوفے کے قریب ایک میز پر رکھ دیا۔ لمپ کی بتی کی شعاع میں ایک ارتعاش تھا۔ اور صوفے پر گرے ہوئے آدمی نے اس طرف ٹکٹکی لگا دی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ گیا اور شدت رنج والم میں نیند نے اس پر غلبہ حاصل کر لیا۔

(ترجمہ)

علاؤالدین

رباعیات ہُنر

جو کچھ تمہیں مانگنا ہے رب سے مانگو — زاری سے تضرع سے ادب سے مانگو
پھر دیکھو کہ کیا کچھ نہیں ملتا ہے ہُنر — ہے شرط کہ مانگنے کے ڈھب سے مانگو

دنیا کی ہر ایک چیز پہ قادر تو ہے — ہر شان میں ہر رنگ میں حاضر تو ہے
جب تیرے غضب پر ترا حاوی ہے کرم — مجھ سے پھر کیوں کشیدہ خاطر تو ہے

باب محبت

(۱)

کنارہ کش زمانہ جہاں سے اگر خفا ہو تو!
جو کائنات سے بیزار ہو گیا ہو تو!
اگر تجلیٔ عصمت کو ڈھونڈتا ہے تو!

تو — آ کہ، باب محبت کھلا ہوا ہے ابھی

(۲)

جو تلخیٔ مے آلام نے ستایا ہو
جو دورِ گردشِ ایام نے ستایا ہو
اگر، تجھے غمِ انجام نے ستایا ہے

تو، آ! — کہ باب محبت کھلا ہوا ہے ابھی

(۳)

جو، تیری روح ابھی تک ہے غرقِ تاریکی
نہیں ہے دل میں، جو تنویرِ شمعِ ربانی!
ملی نہیں جو تجھے شاہراہِ معصومی

تو، آ! — کہ باب محبت کھلا ہوا ہے ابھی

(۴)

جو داغدارِ خزاں ہو تری بہارِ حیات!
جو ہے مکدرِ آلام سے آبشارِ حیات!
زمانہ گر تجھے کہتا ہو سوگوارِ حیات!

تو، آ! — کہ باب محبت کھلا ہوا ہے ابھی

(۵)

جو تیری صبحِ تمنا نہیں، قریبِ ظہور
جو، عزم ہیں ترے، کاشانۂ مراد سے دور
جو زندگی ہو تری، شرحِ ہستیٔ مجبور

تو، آ! — کہ باب محبت کھلا ہوا ہے ابھی

(۶)

جو، تجھ کو شمعِ کلیسا میں، روشنی نہ ملی
صنم کدوں میں اگر شانِ زندگی نہ ملی
جو سجدوں میں تجھے عظمتِ خودی نہ ملی

تو، آ! — کہ باب محبت کھلا ہوا ہے ابھی

(۷)

جو، قلب راحتِ جاوید کو ترستا ہو
جو، تجھ کو جنتِ تسکین کی تمنا ہے
اگر حضورِ خداوند میں پہنچنا ہے

تو آ! — کہ باب محبت کھلا ہوا ہے ابھی

غیر مطبوعہ

روش صدیقی

ایک قابلِ قدر ایجاد

غیر مرئی تحریروں کا مطالعہ

(از ظفر قریشی دہلوی)

قدیم زمانہ میں اسباب کتابت کی قلت و گرانی اور کاغذ کی عدم موجودگی کے باعث عبارتیں "پارچہ جات" (
پر لکھی جاتی تھیں۔ یہ پارچے بالعموم پپیرس کتان جھلی یا اسی قسم کی دیگر چیزوں کے ہوا کرتے تھے۔ ہزارہا سال گزر گئے۔ کاتبوں نے جو تحریریں ان پارچوں پر چھوڑی تھیں۔ امتداد و قت کے باعث مٹ مٹا گئیں۔ اور خالی اوراق رہ گئے۔ قدیم مقبروں، مندروں اور شہروں کی کھدائیوں سے اس قسم کے پارچوں کی کتابیں کی کتابیں دستیاب ہوئی ہیں۔ جو تمام تر پارچوں پر ہی مشتمل ہیں۔ مگر ان اوراق پر کچھ لکھا ہوا نہیں ہے۔ سادہ ہیں۔ اگر ہے بھی تو اس قدر مٹا ہوا ہے۔ کہ اس کا پڑھنا اور سمجھنا محال ہے۔

آثار قدیم کے مورخین اور محققین بہت سی باتوں، بیسیوں مسائل اور سیکڑوں واقعات سے بے خبر تھے۔ اور یہ پارچے قدیم تاریخ پر کچھ روشنی نہ ڈال سکتے تھے۔ حالانکہ لکھے اسی غرض سے گئے تھے۔ کہ تاریخ کے رموز کو بے نقاب کردیں۔ موسموں کی تبدیلی، آب و ہوا کے اثر اور حرارتِ آفتاب کے باعث ان کی تحریریں بالکل مٹ گئیں۔

کوششیں جاری تھیں۔ کہ ان مکتوبات قدیمہ کی مٹی ہوئی عبارتوں کو ابھارا جائے۔ اور انہیں پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ اس باب میں متعدد تجربات کئے گئے۔ جن میں سے زیادہ کامیاب تجربہ کیمیادی عرقوں کے استعمال کا تجربہ تھا۔ یہ عرق پارچے پر پھیلا دیئے جاتے تھے۔ جس سے مٹی ہوئی عبارتیں اصل ہئیت اختیار کرنے لگ جاتی تھیں۔ مگر اکثر اوقات ایسا ہوتا تھا۔ کہ یہ کیمیادی عرق خود پارچے پر مضر اثر ڈالتے تھے۔ اور سطے مٹی ہوئی۔ نظر نہ آنے والی

تھوڑی دیر بعد یہ پارچے، جو پہلے ہی سے ضعیف و نزار ہوتے تھے۔ ان تیزابی مادوں کے اثر سے گل جاتے تھے۔ اور پھر ان کو ہاتھ لگانا بھی محال ہو جاتا تھا۔

بہرحال یہ دقتیں تھیں۔ جو مورخین و محققین کے سامنے موجود تھیں مگر ہمت نہ ہارنے والی طبیعتیں اور زود اس دماغ برابر کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ کہ کسی بے ضرر طریقہ سے ان مکتوبات کی مٹی یا نیم خفی عبارتوں کو پڑھنے کا طریقہ معلوم ہو جائے۔ چنانچہ لگاتار کوششوں اور مسلسل دماغ سوزیوں کا یہ نتیجہ نکلا۔ کہ ایک شعاع (بنفشی) ( )
ایسی دریافت کی گئی۔ جن کے ذریعہ سے ان مٹی تحریروں کا تجربہ اور امتحان کیا جانے لگا جن کی حرارت کی وجہ سے یہ نیم خفی تحریریں پھر ابھر آئیں۔ اور بالکل ظاہر ہو کر اس قابل ہو گئیں۔ کہ ان کی عکسی تصاویر لے کر دائمی طور پر انہیں محفوظ کر لیا جاتا ہے۔

گلوسٹر (انگلستان) کے مشہور علمی و تاریخی جریدے (قدامت) میں مسٹر لیونرڈ، وی، ڈوڈ نے ایک مضمون کے دوران میں بالوضاحت اس طریقے کا ذکر کیا ہے۔ عالمگیر استعمال قدیم تاریخ اور ادب کے بیش بہا خزانے جن سے ہم محروم ہو چکے تھے۔ اب پھر ہاتھ آ جائیں گے۔ تاریخ کے بہت سے واقعات و حقائق جو ہماری نظروں سے پوشیدہ تھے۔ یا اخلاقی مسائل کی حیثیت رکھتے تھے اب بالکل نیصل و عیاں ہو جائیں گے۔

صاحب مذکور مضمون کے دوران میں لکھتے ہیں۔ کہ امتداد زمانہ کے باعث جو قدیم پارچے بیکار ہو جاتے تھے۔ انہیں اس وجہ سے ضائع نہ

کیا جاتا تھا۔ کہ ان کے تیار کرنے میں بہت محنت و صرف ہوا کرتا تھا۔ اور ان کا ضائع کرنا نقصان دہ تھا۔ بلکہ مدعا یہ تھا۔ کہ ان پارچوں کو یعنی (   ) (ترکیب) سے بہت احتیاط سے صاف کر کے دوبارہ (بلکہ سہ بارہ بھی) ریکارڈ جمع کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ قیاس ہے لکھی ہوئی عبارتیں جو بعد میں ان پارچوں پر ثبت کی جاتی تھیں۔ اگرچہ اکثر اوقات کسی حد تک کارآمد ہوتی تھیں۔ مگر اصل مٹی ہوئی عبارتوں کے ظاہر نہ ہونے کے باعث یہ ظن و قیاس کی تحریریں ہمیشہ مشتبہ رہتی تھیں۔ چنانچہ اب یہ سنکر تعجب ہوگا۔ کہ ان قدیم تحریروں کو ابھار کر پڑھنے کا طریقہ معلوم کر لیا گیا ہے۔

یہ طریقہ دیانا کے پروفیسر جی۔ آر۔ کوگل کی تحقیقات سے اخذ کیا گیا ہے۔ اب یہ ممکن ہے۔ کہ سینکڑوں سال کی مٹی عبارتوں کو اس طرح ابھار کر ان کی تحریر سے الگ کیا جائے۔ کہ وہ صاف دکھائی دینے لگیں۔ اور جب پڑھی جا سکیں۔ تو بیش بہا علمی تاریخی خزانوں کے دروازے کھول دیں۔ ہزارہا سال کی اہم قیمتی معلومات اب انسان کے قدموں میں ہوں گی۔ اور ان سے جو فوائد حاصل ہوں گے۔ ان کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

کیمرہ تیار کرنا بنفشی شعاعیں ایک ایسے لیمپ کے ذریعے سے تیار کی جاتی ہیں۔ جو پارہ کے بخارات سے بنا ہوا ہوتا ہے ایک چقماقی آلہ میں (جس میں گیس تیار کی جاتی ہے۔ گلایا ہوا پارہ بھرا جاتا ہے۔ اور اس پارہ کے بخارات میں سے برقی رو گزاری جاتی ہے۔ اس طریقہ سے برقی رو سے (   ) یعنی بنفشی شعاعوں کی شکل میں عکس ریزی (   ) میں تحویل کر دئے جاتے ہیں۔

اس قسم کے مخصوص تیار شدہ لیمپ کا گلا (یعنی وہ حصہ جہاں سے شعلہ اٹھتا ہے) ایک بکس کی شکل والی جگہ میں لگایا جاتا ہے۔ اس بکس کو اس طرح تیار کیا جاتا ہے۔ کہ اس میں دیکھنے اور کیمرہ کے لینس لگانے کی جگہ نظر آتی ہے۔ اس لیمپ سے جو شعاعیں نکلتی ہیں۔ انہیں ایک فلٹر کے ذریعے سے چھانا جاتا ہے۔ اور جس پارچہ پر ڈالنا مقصود ہوتا ہے۔ اس پر صرف بنفشی شعاع ہی پھینکی جاتی ہے۔ باقی شعاعیں فلٹر میں محبوس کر لی جاتی ہیں۔ اس شعاع کے پڑنے سے شعاع بنفشی کی ایک نہ دکھائی دینے والی کرن اس پارچہ کے حروف کو منور کر دیتی ہے۔

جب ان شعاعوں کے تحت میں مٹی ہوئی تحریروں کا امتحان کیا جاتا ہے۔ تو کتابت کے تمام مادے اور رنگ متنور و تابناک ہو کر اپنی امتیازی رنگیلی خصوصیات کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ جب یہ نہ دکھائی دینے والی بنفشی شعاعیں ان مادوں پر پڑتی ہیں۔ تو ان میں ایک ایسا نور پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ حروف چمکدار ستاروں کی طرح تاباں ہو جاتے ہیں۔ اور صاف پڑھے جاتے ہیں۔

جب یہ شعاعیں اپنا اثر پارچہ پر نافذ کرتی ہیں۔ تو ان کے مخصوص رنگ جو در تحریر موجود تھے۔ اس طرح نمایاں ہو جاتے ہیں۔ کہ پارچہ پر لکھی ہوئی بعد کی تحریر سے ممیز کئے جا سکتے ہیں۔ جب اس طرح الفاظ و حروف متنور ہو جاتے ہیں۔ تو ان کا فوٹو لے لیا جاتا ہے۔ اس طرح عکسی تصویر کے "پرنٹ" پر عبارتوں کے دونوں متن (   ) نظر آتے ہیں۔ ظاہر میں دکھائی دینے والے حروف کا خاکہ سیاہ و سفید ہوتا ہے۔ مگر قدیم کتابت اپنے بھورے رنگ کے باعث علیحدہ دکھائی دیتی ہے۔ اور جب ان تصویروں کی پلیٹیں دھوئی جاتی ہیں۔ تو بالعموم کوئی خاص دقت پیش نہیں آتی اور قدیم تحریر پڑھ لینے میں کوئی مغالطہ نہیں ہوتا۔

بہر حال مذکورہ بالا فن تحقیقات سے ہر شخص نے اندازہ لگا لیا ہوگا۔ کہ کتنی حجاب نقشانی اور دزدوسری کے بعد قدیم تحریریں منظر عام پر لائی جاتی ہیں۔ گو بنفشی شعاع سے عکس ریز کرنے میں بہت خرچ اور محنت کا صرف ہوتا ہے۔ مگر علمی پیاس رکھنے والے جو ہر چیز کی بال کی کھال نکالتے رہتے ہیں۔ کبھی ان تکلیفوں سے نہیں گھبراتے۔

سائنس کی حیرت انگیز ایجاد اور بنفشی شعاعوں کی اس عکس ریزی قوت کی دریافت نے علمی تاریخی حلقوں میں ایک عام بیداری پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ اکثر مقامات پر ایسی انسٹیٹیوٹ قائم ہو رہی ہیں۔ جہاں ان شعاعوں کو پیدا کرنے اور فوٹو لینے کے لئے مستقل انتظامات کئے جا رہے ہیں اس طرح امید ہے۔ کہ اسلاف کے کارنامے اور تاریخی اثبات و اسناد ایسی شکل میں نمودار ہونگے۔ کہ عقل حیران ہو جائیگی اور قرنوں کے مٹے ہوئے نشانات نقش فی الحجر کی طرح عیاں نظر آنے لگیں گے۔

(ظفر قریشی دہلوی)

زراعتی اخبار کا ایڈیٹر

شہرۂ آفاق امریکن ظرافت نگار مارک ٹوین کا ایک پُرلطف افسانہ

ظفر قریشی دہلوی

(۱)

میری مالی حالت بہت خراب تھی۔ اس لئے میں نے یہی بہتر سمجھا۔ کہ میں زراعتی اخبار کی ادارت قبول کرلوں۔ اس وقت میری حالت اس شخص کی سی تھی۔ جس نے کبھی سمندر نہ دیکھا ہو۔ بلکہ ایک جہاز کا کپتان بنا دیا جائے۔ لیکن آپ جانتے ہیں مرتا کیا نہ کرتا۔ اور پھر معقول تنخواہ۔ میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر ادارت قبول کر لی۔ چونکہ اخبار کا اصل ایڈیٹر چھٹی پر جا رہا تھا۔ اس وجہ سے اس نے جو تنخواہ بھی پیش کی میں نے قبول کرکے ادارت کے فرائض انجام دینے شروع کر دیئے۔

مدت کی بے کاری کے بعد جو ایک مشغلہ ہاتھ آیا۔ تو میں نے بھی اپنا کام بہت مسرت، تن دہی، اور جوش کے ساتھ کرنا شروع کیا۔ اخبار چھپنے کے لئے پریس میں بھیج دیا گیا۔ اور اب میں انتظار کرنے لگا۔ کہ دیکھئے میری تحریر نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کی ہے یا نہیں۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میں شام کو دفتر سے رخصت ہوکر نیچے اترا تو زینہ کے نیچے چند آدمیوں اور لڑکوں کا مجمع کھڑا دیکھا۔ ان لوگوں نے مجھے آتا دیکھ کر رستہ دیدیا۔ ان میں سے کسی نے یہ کہا، "یہی ہیں نہ وہ!"

فطرتاً مجھے اس واقعہ سے بہت مسرت ہوئی۔ اور میں پھولا نہ سمایا۔ کہ لوگ مجھے دیکھ دیکھ کر عش عش کرتے ہیں۔ دوسرے دن بھی مجھے اسی طرح لوگوں کا ایک مجمع نظر آیا۔ چند آدمی ادھر ادھر، دونوں سڑکوں پر کھڑے دکھائی دیئے۔ جو میری طرف بہت دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ میرے آتے ہی لوگ منتشر ہو گئے۔ اور ایک نے کہا، "ذرا اُن کی صورت دیکھو!" لیکن میں نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ اور غرور و بے اعتنائی سے اکڑ کر چلتا ہوا سیڑھیوں پر چڑھتا چلا گیا۔ گویا میں نے ان لوگوں کی دلچسپی کو کوئی قابل وقعت چیز سمجھا ہی نہ تھا۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ کہ آج ضرور بیوی جان کو اپنی شاندار کامیابی اور بڑھتی ہوئی شہرت کا حال تحریر کروں گا۔ میں بالائی منزل پر پہنچا۔ تو نیچے سے قہقہوں کی آوازیں آئیں۔ لیکن میں اس کا کچھ مطلب نہ سمجھا۔ جونہی دفتر کا دروازہ کھولا۔ دو آدمی جن کی صورت سے دہقانیت ٹپک رہی تھی۔ میری طرف مُنہ بناتے ہوئے جھٹ سے نکل گئے۔ لیکن میں اس کا بھی مطلب نہ سمجھ سکا۔

کوئی آدھ گھنٹہ بعد میرے دفتر میں ایک بوڑھا شخص داخل ہوا۔ جس کے چہرے سے سختی ٹپکتی تھی گھنی داڑھی تھی۔ اور تیز تیز نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ میرے کہنے پر وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن ہمت نہ پڑتی تھی۔ کہ اتنے بڑے ایڈیٹر کے سامنے کچھ کہہ سکے۔ بہرحال اس نے اپنی ٹوپی فرش پر رکھ دی۔ اور ایک سرخ ریشمی رومال نکال کر پیشانی کا پسینہ پونچھا۔ پھر ہمارے اخبار کی ایک کاپی نکالی اور اسے اپنی رانوں پر پھیلا کر عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا، "آپ ہی نئے ایڈیٹر صاحب ہیں؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

"کیا آپ نے اس سے پہلے بھی کسی زراعتی اخبار کی ادارت کے فرائض سرانجام دیئے ہیں؟"

"جی نہیں یہ میری پہلی کوشش ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا، لیکن آپ کو زراعتی معاملات کا عملی تجربہ تو ضرور ہوگا؟"

"جی نہیں!"

بوڑھے نے میری طرف گھورتے ہوئے کہا۔ میں تو پہلے ہی سمجھے ہوئے تھا، یہ کہہ کر اس نے اخبار کو حسب پسند تہ کرکے مجھ سے کہا، جو چیز میں آپ کے سامنے پڑھنا چاہتا ہوں یعنی آپ کا لکھا ہوا مقالۂ افتتاحیہ (ایڈیٹوریل) اس کے مطالعے نے مجھ پر یہ بات روشن کر دی تھی۔ کہ آپ کو زراعت سے کتنا کچھ لگاؤ ہے۔ ذرا سُنئے۔ اور بتایئے کہ یہ آپ ہی کی قلم نے گہرباری کی ہے؟"

اس نے جو مضمون پڑھا یہ تھا:۔

"گاجروں کو ان کی شاخیں پکڑ کر اکھاڑنا نہیں چاہیئے۔ کیونکہ یہ نقصان دہ طریقہ ہے۔ بلکہ کسی لڑکے کو درخت پر چڑھا کر درخت ہلانا چاہیئے۔ تاکہ گاجریں نیچے گر پڑیں!"

"کیا آپ ہی نے یہ تحریر لکھی ہے؟"

"ہاں! کیوں؟ نرالی بات ہے ـــ آپ کو اس پر کیا اعتراض ہے"

چونکہ میرے ہی ... یہ مضمون لکھا تھا۔ آپ کو معلوم ہے۔ کہ اس شہر میں ... محض اس وجہ سے ضائع ہو جاتی ہیں۔ کہ ان کی شاخیں ... جاتا ہے۔ اگر ہم کسی لڑکے کو درخت پر چڑھا دیا کریں۔ اور شاخیں ہلوایا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اپنا سر ہلوا لو۔ بیوقوف! یہ بھی خبر ہے کہ گاجریں درختوں میں نہیں لگتیں پھر شاخیں کیسی!"

"واہ! بالکل ٹھیک بات ہے۔ کون احمق کہتا ہے گاجریں درختوں میں لگتی ہیں۔ یہ تو محض عبارت آرائی تھی۔ آپ زبان سے ناواقف ہیں استعارہ و کنایہ زبان کا زیور ہوتے ہیں جس شخص کے دماغ میں ذرہ برابر عقل ہوگی سمجھ جائے گا۔ میری مراد یہ ہے کہ لڑکا آہستہ سے جڑ ہلا ہلا کر گاجر نکال لے!"

(۲)

بڈھا اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اخبار پھاڑ کر پرزہ پرزہ کر کے غصہ میں خوب پیر سے روندا۔ لکڑی سے کئی چیزوں کو توڑ پھوڑ کر منہ میں کچھ کچھ بکتا جھپٹ نکل کر سیدھا ہولیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ کسی بات پر مجھ سے ناراض تھا معلوم نہیں کیا خاص بات تھی۔ باوجود سوچنے کے مجھے تو کوئی قابل اعتراض وجہ اخفگی کا سبب معلوم ہوا نہیں۔ میں بیچارے کی ناراضگی کا کیا علاج کر سکتا تھا۔

ابھی ... سے چھٹکارا پایا تھا۔ کہ دوسری آفت نازل ہوئی۔ ایک اور لمبا سا آدمی جس کا جسم سوائے ہڈیوں کے ڈھانچ کے اور کچھ نہ تھا کمرہ میں داخل ہوئے۔ عجیب بدہیئت آدمی تھا۔ بال الجھے ہوئے منہ پر ہوائیاں اڑتی ہوئی گویا ہفتہ بھر کے فاقے سے تھا۔

اس نے لبوں پہ انگلی رکھ کر کمر خم کر کے کچھ اس انداز سے میری طرف گھورا گویا کوئی بات سن رہا تھا۔ کچھ دیر تک مجھ سے فاصلہ پر وہ یونہی کھڑا رہا پھر چند قدم آگے بڑھ کر میری طرف اور غور سے دیکھا۔ دفعتاً لمبے لمبے قدم مارتا ہوا قریب آ پہنچا۔ اور اندر کی جیب میں سے ہمارے اخبار کی ایک کاپی نکالتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا، "کیا یہ مضمون جناب ہی نے تحریر فرمایا ہے، ذرا پڑھ کر سنا دیجئے، جلدی کیجئے، میرا دماغی توازن قائم نہیں ہے۔ بری حالت ہے۔"

میں نے حسب ذیل عبارت پڑھی۔ لیکن یہ دیکھ رہا تھا۔ کہ ہر فقرہ پر اس شخص کی تسلی ہو رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا۔ کہ اس کی بےچینی کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ جوں جوں میں مضمون پڑھتا تھا۔ اس کے چہرہ مسرت و اطمینان کا نور اس طرح چمکنے لگا جیسے سنسان بیابان میں چاند چمک اٹھے۔

مضمون حسب ذیل تھا:-

"**گوانو**[۱] ایک بہت عمدہ پرندہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کی پرورش میں بہت احتیاط کرنا پڑتی ہے۔ چنانچہ انہیں گرم مکانوں میں رکھنا چاہئے۔ تاکہ وہ اپنے بچے اچھی طرح سینہ سکیں۔

"کدو کا درخت:- کدو کا درخت نیو انگلینڈ کے اندرونی باشندوں کا مرغوب ترین کھاجا ہے۔ یہ لوگ میوہ دار روغنی روٹیوں میں بھرنے کے لئے اسے شہوت پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی گایوں کو رس بھریوں کی بجائے یہی کھلاتے ہیں۔ کیونکہ اس سے دودھ بہت عمدہ اور گاڑھا پیدا ہوتا ہے۔ نارنگی کی قسم کے پھلوں میں سے صرف کدو ہی ایک ایسا "میوہ" ہے۔ جو شمالی حصہ ملک میں پیدا ہوتا ہے۔ یا میٹھا کھیا و آڑو کی مختلف قسمیں ہیں۔ لیکن عرصہ دراز سے جو صحن مکان میں بیری کے ساتھ اس کا درخت لگانے کا رواج چلا آتا تھا۔ اب متروک ہو رہا ہے۔ لوگوں نے یہ عادت اس وجہ سے چھوڑ دی ہے۔ کہ کدو کے درخت سے بہت زیادہ سایہ حاصل نہیں ہوتا۔

"اب موسم گرما قریب ہے۔ نر راج ہنس[۲] اب انڈے دینے لگ جائیں گے ——————"

* * * *

* * * *

* * * *

وہ شخص جو اس وقت تک سنتا رہا تھا۔ اب بے بس ہو کر کھڑا ہو گیا۔ مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا، "بس بس رہنے دیجئے۔ —— میں نے بھی اس مضمون کو اسی طرح پڑھا تھا۔ جس طرح آپ نے۔ پڑھنے میں مجھے کوئی مغالطہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن جب میں نے صبح اسے پڑھا تھا۔ تو ہرگز ہرگز یہ یقین نہ کرتا تھا۔ کہ یہ مضمون کسی زراعتی اخبار کے ایڈیٹر کی قلم سے نکلا ہو گا۔ بلکہ میں تو یہ سمجھا۔ کہ میں ہی پاگل ہو گیا ہوں۔ کہ لکھا کچھ ہے پڑھتا کچھ ہوں۔ چند دوستوں کو اس کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے۔ وہ بھی عش عش کرنے لگے۔ کہ کیا عمدہ

---

[۱] گوانو (Guano) اصل میں ان سمندری پرندوں کی بیٹ ہوتی ہے۔ جو جنوبی امریکہ اور افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔ یہ بیٹ بطور کھاد امریکہ میں بکثرت استعمال ہوتی ہے۔ مارک ٹوین نے اپنے مخصوص انداز میں اس جگہ ایڈیٹر کی معلومات کا خوب مضحکہ اڑایا ہے۔ [۲] نر راج ہنس انڈے نہیں دیتے۔ (مترجم)

معلومات کا ذخیرہ کاغذ پر منتقل ہوگیا ہے۔ میں اس شخص کو دیکھنے کے لئے جس نے یہ تاریخی مضمون لکھا تھا۔ دوڑا ہوا آیا۔ راستہ میں بے تحاشہ دوڑنے سے دو آدمیوں سے ٹکرایا۔ کئی آدمیوں سے دھینگا مشتی ہوئی وہ تو یوں کہو کہ خدا کا شکر ہے۔ میں نے کسی بھلے مانس کو قتل نہیں کر دیا۔ خدا خدا کر کے جناب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور آپ کی زبان مبارک سے ان الفاظ کو سُن کر مجھے کامل یقین ہوگیا کہ اگر میں نہیں تو آپ ضرور پاگل ہیں" اچھا خدا حافظ!

(۳)

جب یہ شخص رخصت ہوگیا۔ تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے سر سے کوئی بوجھ اُتر گیا۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ اس وقت یہ آفت ٹلی اور مجھے دیر تک اس احمق اور کم فہم شخص کی بکواس سننے کا موقع نہ ملا۔ لیکن ابھی میں انہیں خیالات میں غلطاں پیچاں تھا۔ کہ دفعۃً اخبار کا اپنا ایڈیٹر کمرہ میں خلاف توقع آموجود ہوا۔ (میں سمجھ گیا کہ وہ چھٹیوں پر جو مصر جا رہا تھا۔ اس ارادہ کو ملتوی کر کے اخبار کا حال دیکھنے آیا ہے)

ایڈیٹر نے میری طرف غصّے سے دیکھا۔ اس کے چہرے سے اداسی اور بدحواسی کے آثار نمایاں تھے۔

ایڈیٹر نے اس نقصان کو دیکھ کر جو ابھی ابھی دو آدمی غصّہ میں کبھر کر کر گئے تھے مجھ سے کہا، "تم نے ستیاناس کر دیا! گونددانی ٹوٹی پڑی ہے، دو شیشے توڑ دیئے، اگالدان اور شمعدان توڑ دیئے بھلے آدمی کبھی کسی دفتر میں گیا بھی تھا۔ آداب و تمیز سے کچھ واقف ہی نہیں۔ - - - - - - - تیرا بیڑا بھی جانے دو میرے اخبار کا ستیاناس کر دیا۔ تم کو کس احمق نے مجبور کیا تھا۔ کہ ایک ایسے اخبار کی ایڈیٹری منظور کرو۔ جس کے فن کی الف، بے سے بھی واقف نہیں ہو۔ سڑک پر اور بنگلے کے پاس لوگ جوق در جوق آ کھڑے ہوئے ہیں۔ اور آپ کی زیارت کرنا چاہتے ہیں۔ کہ وہ ایڈیٹر کون بزرگ ہیں جو اپنے اخبار میں یہ تحریر فرماتے ہیں۔ کہ کدو نارنگی کی قسم کا ایک میوہ ہے۔ جب تمہیں زراعت سے اس قدر بھی واقفیت نہ تھی کہ گیہوں کب بوئے جاتے ہیں۔ اور گئے کب تو تم ایڈیٹری کرنے کس برتے پر آتے تھے۔ آپ ہی تو فرماتے ہیں۔ کہ ہل اور پھاوڑا ... تقریباً، ایک ہی چیز ہیں۔" آپ ہی نے تو لکھا تھا کہ مرغیاں جگالی کرتی ہیں۔ اور ایک موسم میں بال جھاڑتی ہیں۔ کیا آپ نے نہیں لکھا تھا۔ کہ ولایتی بگیوں کو موسیقی کا بہت شوق ہوتا ہے۔ آپ کی قوت مشاہدہ کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ کہ آپ کے نزدیک روئی کی تجارت کی جگہ ریشم کی تجارت کو فروغ ہو رہا ہے۔ جناب نے لکھا تھا کہ ارنڈ کا درخت اگر گملوں میں لگایا جائے اور باغیچہ کی روشوں پر رکھ دیا جائے۔ تو بہت بھینی بھینی خوشبو دے گا۔ کیا آپ نے ہی لکھا تھا۔ کہ شہتوت ہر کی شراب بنتی ہے! واہ! واہ! میں نہیں چاہتا کہ آپ کی شکل دیکھوں۔ نکل جاؤ۔ تم نے مجھ سے پہلے ہی کیوں نہیں کہہ دیا۔ کہ تمہاری معلومات اس قدر وسیع ہیں۔ اور زراعت کا اتنا قیمتی تجربہ رکھتے ہو۔ یہ صحیح ہے۔ کہ اس عرصہ میں اخبار کی اشاعت دوگنی سے بھی زائد ہوگئی ہے، کئی کئی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل جاتے ہیں۔ اور مانگ پوری نہیں کر سکتے۔ لیکن میں دیوانگی سے روپیہ پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ اپنے اخبار کی شہرت کو پامال ہوتا دیکھ کر اور اپنے عملہ کی جگ ہنسائی ہوتے دیکھ کر میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ افسوس! میرا اخبار تباہ ہوگیا! "

(۴)

میں نے بھی برافروختہ ہو کر کہا"

اے بیگن کے بھائی سنے اخروٹ کے ماموں! تجھے کس نے ایڈیٹر بنا دیا تھا۔ یہ پہلی دفعہ ہے۔ کہ میں اپنی شان میں کس گستاخانہ تقریر کو سُن کر چپکا ہو رہا ہوں۔ تمہیں پتہ نہیں مجھے ادارتی کاموں کا چودہ سال کا تجربہ ہے۔ لیکن آج تک یہ بات نہ سُنی تھی۔ کہ ایڈیٹر بننے کے لئے کسی علمیت اور تجربہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ تو جانتا ہے کہ اخبارات و رسائل میں ڈراموں پر تنقیدیں اور تبصرے کون لکھتا ہے۔ وہ موچی جنہیں جب اور کوئی کام نہیں ملتا۔ تو چند دن سٹیج پر ناچ کر نقاد فن بن جاتے ہیں کتابوں پر نکتہ چینی وہی لوگ کرتے ہیں۔ جنہیں کبھی تصنیف کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ اقتصادی معاملات پر کون لوگ خامہ فرسائی کرتے ہیں؟ وہی لوگ جو کاروباری طبیعت نہ رکھنے کے باعث اور مالی معاملات سے مطلق بے بہرہ ہونے کے سبب سے دیوالیہ ہو جاتے ہیں! افواج ہند کے مسئلہ پر لمبے لمبے مضامین کون سپرد قلم کرتا ہے شیخ چلی یا تیس مار خاں — انسداد شراب نوشی پر وہی لوگ لکھتے ہیں۔ جن کے لبوں سے کبھی جام و صبو نہیں چھٹتے۔

زراعتی اخبار کی ایڈیٹری بھی وہی کرتے ہیں جنہیں ہر فن میں کامل دستگاہ ہو۔ جو شاعری، ناول نویسی، ڈرامہ نویسی اور شہری اخباروں کی ایڈیٹری میں بالکل ناکامیاب رہے ہوں۔ جو لوگ کسی طرح بسر اوقات نہیں کر سکتے۔ افلاس کی لعنت سے بچنے کے لئے زراعتی اخبار کی ایڈیٹری کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ آپ مجھے اخبار کی ادارت کرنی سکھاتے ہیں؛

ماشاء اللہ! کل کا بچہ اور ہمیں سبق دے رہا ہے!

حضرات! سمجھ لیجئے کہ میں نے صحافت کا الف سے لے کر یے تک مطالعہ کیا ہے۔ یقین کر کے جانو وہی ایڈیٹر بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ہیں۔ اور پبلک کی واہ واہ کا مرکز بنتے ہیں۔ جنہیں الف کے نام بے نہیں

آتا اور نام "محمد فاضل" رکھ کر لوگوں کو خوب اُلو بناتے ہیں۔ جو لوگ جاہل مطلق اور کندۂ ناتراش ہوتے ہیں انہیں لوگ خوب بناتے ہیں! خدا کی قسم اگر میں عالم و فاضل ایڈیٹر نہ ہوتا اور بالکل جاہل مطلق ہوتا۔ تو دنیا میں نام پیدا کر کے دکھا دیتا۔ مگر بدقسمتی سے خدا نے مجھے فاضل بنا دیا ہے۔

...... آپ نے میری توہین کی ہے۔ میرے [illegible] لمانہ مقالات کی تعریف کرنے کی بجائے مجھے سخت و سست کہا ہے۔ اس وجہ سے استعفیٰ دیتا ہوں۔ بھاڑ میں پڑے ایسا اخبار جس سے اپنی شہرت پہ بھی دھبہ لگے۔ میں تو تمہارے اخبار کو چند دن میں کچھ کا کچھ کر دیتا اگر اشاعت تیس ہزار تک نہ پہنچا دیتا۔ تو اپنے آپ کو ایڈیٹروں کا ننگ کہنا چھوڑ دیتا۔ میں نے اس قلیل [illegible] ادارت میں آپ کے اخبار کے قارئین کی وہ جما[illegible]ع کی ہے۔ جو ان گنواروں کی طرح اُجڈ نہیں ہے۔ جنہیں تربوز کے پوٹے اور آلوؤں کی بیل میں تمیز نہ ہو سکتی ہو۔ بلکہ وہ لوگ ہیں جو کبھی زراعتی اخبار نہ پڑھتے تھے۔ مگر صرف میرے مضامین کی خاطر اخبار پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ خیر اس سے کچھ تمہارا ہی نقصان ہوگا۔ میرا [illegible] بگڑا"۔

یہ کہہ کر میں دفتر سے رخصت ہو گیا۔

"ظفر قریشی دہلوی"

نقوشِ مانی

سرنگوں چار طرف گنبدِ مینائی ہے
واہ! کیا حسن تقاضائے جبیں سائی ہے

میری حیرانیوں کی حوصلہ افزائی ہے
سامنے میں ہوں وہ مصروف خود آرائی ہے

ناشکیبا ترے جلووں کا تماشائی ہے
کہ نظر دشمنِ دعوائے شکیبائی ہے

دل ہے پابندِ ادب ورنہ کوئی بات نہ تھی
ایک ہی سانس تو حدِ شبِ تنہائی ہے

کب تھی اور کس کی نگاہوں میں تھی یہ شانِ جمال
اے کہ بیگانۂ الفت تری رعنائی ہے

ہاں! یہ سچ ہے کوئی مجبور ہے، کوئی مختار
ورنہ محبوب کا طالب ہی جو شیدائی ہے

آتی ہے تیری ہی آواز جدھر جاتا ہوں
تو نے کی بات تو ہر ذرّہ میں گویائی ہے

حیرتِ دل ہو کہ وارفتگیِ ہوش کہ موت
کچھ نہیں ولولۂ دادِ تماشائی ہے

میں ہوں دیوانۂ اسرارِ بہاراں ای مانی
یہ تو سب دیکھ رہے ہیں، چمن آرائی ہے

(غیر مطبوعہ)

مانی جائسی

آسمانی سوار

یہ ۱۸۶۲ء کی موسم خزاں کی ایک سہ پہر کا واقعہ ہے، ایک سپاہی مغربی ورجینیہ کے علاقے میں زیتون کے ایک جھنڈ میں جو ایک پگڈنڈی کے پہلو میں واقع تھا، سو رہا تھا، وہ سینے کے بل زمین پر اس طرح لیٹا ہوا تھا کہ اس کا بازو کہنی پر اور پاؤں انگلیوں کے سہارے بر موجودہ حالت میں قائم تھے، دائیں ہاتھ میں جس کی گرفت اب سست پڑ چکی تھی، ایک بندوق تھی، اگر اس کے اعضا ایک خاص ترتیب میں نہ ہوتے، یا کمر پیٹی میں کارتوسوں کے بکس کی خفیف لیکن باقاعدہ حرکات اس کی زندگی کی شہادت نہ دیتیں تو شاید اسے مردہ تصور کر لیا جاتا، وہ پہرے کی چوکی پر سو رہا تھا، کوئی افسر اسے اس حالت میں دیکھ پاتا، تو یہ امر یقینی تھا کہ وہ تھوڑی دیر کے بعد زندہ گولی کا نشانہ بنا دیا جاتا، کیونکہ اس جرم کی ٹھیک ٹھیک قانونی سزا یہی تھی۔

زیتون کا جھنڈ جس میں مجرم پہریدار سو رہا تھا، پگڈنڈی کے ایک موڑ پر واقع تھا، یہ پگڈنڈی جنوب کی جانب چوٹی کے گرداگرد تقریباً ایک سو گز تک بلند ہوتی ہوئی دفعتہ مغرب کی جانب مڑ گئی تھی، جہاں سے یہ پھر جنوبی سمت میں چلی آئی تھی، اور نیچے کی طرف بل کھاتی ہوئی جنگل میں نظروں سے پوشیدہ ہو گئی تھی، دوسرے موڑ کے سرے پر ایک عظیم الجثہ چٹان سلسلہ کوہ سے شمال کی طرف باہر کو نکلی ہوئی تھی، اس چٹان پر سے عمیق وادی کا تمام منظر بے نقاب تھا، یہ چٹان ایک بلند ٹیلے کے سرے پر واقع تھی، اگر ایک کنکر اس بلندی سے نیچے کی طرف چھوڑ دیا جاتا، تو یقیناً وہ ایک ہزار فٹ کی گہرائی کو طے کرتا ہوا صنوبر کے ان درختوں کی چوٹیوں پر گرتا جو وادی کی تہ میں اُگے ہوئے تھے، وہ موڑ جہاں سپاہی سو رہا تھا، اسی ٹیلے کی ایک شاخ پر واقع تھا، اگر وہ اس وقت بیدار ہوتا، تو نہ صرف سڑک کا مختصر سا پہلو اور باہر نکلی ہوئی چٹان کا منظر ہی اس کے پیش نظر ہوتا، بلکہ اُسے ٹیلے کا تمام رخ صاف صاف دکھائی دیتا، شاید وادی کا عمق دیکھ کر اُسے چکر آ جاتا۔

وادی کی تہ کے شمالی حصے میں ایک چھوٹی سی قدرتی چراگاہ تھی جس میں ایک ندی جو وادی کے کنارے سے بمشکل نظر آتی تھی بہ رہی تھی، باقی تمام علاقہ جنگلات سے پٹا پڑا تھا، یہ صاف جگہ بظاہر ایک معمولی صحن سے زیادہ جسامت کی دکھائی نہ دیتی تھی مگر حقیقت میں اس کا رقبہ کئی ایکڑ ہو گا، اس کا سبز رنگ ارد گرد کے اشجار کے سیاہ رنگ کے مقابلے میں زیادہ شوخ اور تابان تھا، قریب ہی کچھ فاصلے پر دیو پیکر ٹیلوں کی ایک اور قطار تھی، جو ان ٹیلوں کے بالکل مشابہ تھی، جن پر ہم اس وقت کھڑے اس قدرتی منظر کا جائزہ لے رہے ہیں، اس میں سے بھی ایک پگڈنڈی بل کھاتی ہوئی چوٹی کی طرف چلی گئی تھی، وادی سے قدرتی خط و خال کچھ اس قسم کے واقع ہوئے تھے، کہ اگر اسے ایک خاص زاویے سے مشاہدہ کیا جاتا تو یہ بالکل بند معلوم ہوتی تھی، اور جب مشاہدہ کرنے والا اس امر پر غور کرتا کہ یہ پگڈنڈی جو باہر کو جا رہی ہے، اس کے اندر کس طرح داخل ہوئی ہو گی، اور ندی کا پانی جو دو ہزار فٹ نیچے کی چراگاہ کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے کہاں غائب ہو جاتا ہے، تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہتی۔

کوئی علاقہ کتنا ہی جنگلی اور دشوار گذار کیوں نہ ہو مگر انسان اسے جنگ کی آماجگاہ بنا لیتا ہے، اس فوجی کمین گاہ جنگلات میں جہاں اگر سو آدمی پگڈنڈیوں کے بیرونی سروں پر قابض ہو جائیں، تو ایک پوری فوج کو بھوکا رکھ کر تباہ کر سکتے ہیں، فیڈرل کی پانچ پیادہ رجمنٹیں چھپی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اس سے پہلے کا تمام دن اور تمام رات سفر میں گزارا تھا اور اس وقت حالت آرام میں تھیں، ان کا ارادہ تھا کہ رات ہوتے ہی پگڈنڈی پر ہو لیں اور اس جگہ پر جہاں ان کا ایک فرض ناشناس سپاہی سو رہا تھا پہنچ کر ٹیلے کی دوسری ڈھلان سے اتر کر نصف شب کے قریب غنیم کے کیمپ پر شبخون ماریں۔ اس فعل سے غنیم کی افواج کو حیران کرنا مقصود تھا، کیونکہ پگڈنڈی ان کے کیمپ کے عقب میں سے ہو کر گذرتی تھی۔ ناکامی کی صورت میں ان کی اپنی حالت حد درجہ کی خطرناک ہو جاتی تھی، اور ناکامی کا امکان بہت زیادہ تھا، کیونکہ معمولی حادثہ یا معمولی سا پہرہ غنیم کو ان کی حالت سے آگاہ کرنے کے لئے کافی تھا۔

زیتون کے جھنڈ میں سونے والا پہرے دار کارٹر ڈروس نامی جنینیا کا ایک نوجوان سپاہی تھا، یہ متمول والدین کا اکلوتا بیٹا تھا، اس لئے ان تمام آسائشوں، اعلیٰ تربیت اور امیرانہ زندگی سے آشنا رہ چکا تھا جو والدین کی کثیر دولت اور نفاست طبع مغربی ورجینیا کے پہاڑی علاقے میں اسے بہم پہنچا سکتی تھی، اس [illegible] اس جگہ سے جہاں وہ اس وقت پڑا تھا صرف چند میل کے فاصلے پر تھا، ایک دن صبح کے ناشتے سے فارغ ہوتے ہی اس نے نہایت سنجیدہ متانت سے

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ باپ سے کہا کہ ابا جان! ایک یونین رجمنٹ گرافٹن میں پہنچی ہے میں اس میں شریک ہونے کے لئے جا رہا ہوں

مغموم باپ نے سر اوپر اٹھایا ایک منٹ تک خموشی کے عالم میں بیٹے کے چہرے کو دیکھا اور جواب دیا، اچھا کارٹر! جاؤ مگر میں ایک نصیحت کرتا ہوں وہ یہ کہ تمہارا طرزِ عمل ہر حالت میں فرض کے تابع رہے۔

یاد رکھو کہ ورجینیا جس کے ساتھ تم غدارانہ سلوک کر رہے ہو۔ تمہارے بغیر بھی اسی طرح شاد آباد رہے گی۔ اگر ہم دونوں جنگ کے اختتام تک زندہ رہے۔ تو اس معاملہ پر مزید گفتگو کر سکیں گے جیسا کہ معالج نے بتایا ہے، تمہاری والدہ کی حالت بہت نازک ہے وہ زیادہ سے زیادہ اور چند ہفتے کی مہمان ہے۔ اور یہ وقت بھی قیمتی ہے۔ بہتر ہے تم جاتے وقت اسے کوئی تکلیف نہ دو۔

چنانچہ کارٹر ڈروس باپ کے روبرو ادب سے خم ہوگیا۔ باپ نے اگرچہ اس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ بیٹے کے سلام کا نہایت خوش خلقی سے جواب دیا۔ اور بیٹے نے سپاہی بننے کی حرص میں اپنے بچپنے کے گھر کو الوداع کہی۔ خوش اخلاقی سے بہادری سے وفاداری سے اور جان جوکھوں کے کام سرانجام دینے سے ڈروس نے جلد ہی ہم پیشہ سپاہیوں اور افسروں میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کرلی موجودہ خطرناک مقام پر اس کی تعیناتی کی ایک وجہ اس کے سابقہ کارہائے نمایاں اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اس علاقے کے نشیب و فراز سے کما حقہ واقف تھا۔ مگر تھکن اس کے ارادوں پر غالب آگئی اور وہ پہرے کی حالت میں ہی سوگیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس مجرمانہ حالت سے بیدار کرنے کے لئے اس کے خواب میں کون سا نیکی کا فرشتہ یا شیطانی روح حاضر ہوئی ہوگی۔ تاہم کسی غیبی قاصد تقدیر نے بغیر کسی آہٹ کے چپ چاپ دبے پاؤں بعد دوپہر کی عمیق خاموشی اور سستی کے درمیان اس کے احساسات کی آنکھوں کو چھوا اس کی روح کے کان میں وہ بیدار کردینے والا طلسمی لفظ پھونکا۔ جو آج تک کسی انسانی لب کا شرمندۂ احسان نہیں ہوا۔ جسے اب تک کسی انسانی حافظے نے یاد نہیں کیا۔ پہریدار نے آہستہ آہستہ ماتھے کو بازو پر سے اٹھایا۔ اور کسی فطری جذبہ کے زیر اثر دائیں مٹھی میں بندوق کے کندے کو مضبوط پکڑتے ہوئے زیتون کی شاخوں کی اوٹ میں سے باہر کو دیکھا۔

اس کا اولیں احساس ایک عمیق جذبۂ مسرت تھا۔ یہ سامنے کے ساکن ٹیلے کے (جس کے کنارے فضائے آسمانی میں بالکل صاف و واضح تھے) سرے پر ایک سوار کے وقیع مجسمہ کو دیکھنے سے پیدا ہوگیا تھا۔ ایک انسانی شکل ایک گھوڑے کی شکل پر سیدھی تنی بیٹھی تھی۔ جیسے کوئی یونانی دیوتا مرمریں مجسمہ میں حالت آرام میں دکھایا گیا ہو۔ سوار کی بھوری وردی اس بلندی کے عین مطابق تھی۔ گھوڑے کی جھول اور سوار کے ساز و سامان کے رنگ کو سایہ کی موجودگی نے نرم اور پھیکا کر دیا تھا۔ جانور کا جسم بھی اُن نشانات سے خالی تھا جو تیز روشنی کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایک قرابین زین کے قاش کے ساتھ آویزاں تھی، جو دائیں ہاتھ کی گرفت کی وجہ سے اپنے اصلی مقام پر قائم تھی۔ بایاں ہاتھ جس میں لگام تھی۔ نظر سے اوجھل تھا۔ سوار کا چہرہ خفیف سا بائیں جانب مڑا ہوا تھا۔ اور صرف کن پٹی اور داڑھی کا بیرونی حصہ نظر آتا تھا۔ نگاہیں نیچے کی طرف وادی کی تہ کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔ کچھ مقام کی بلندی جہاں سوار اس وقت موجود تھا۔ اور کچھ پہریدار کے اس احساس کے باعث جو غنیم کی کثیر فوج کے قریب کے احتمالات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ گروپ ایک بہت ہی بڑی جسامت کا نظر آتا تھا۔

ایک لمحہ کے لئے ڈروس کے دل میں یہ عجیب اور مبہم خیال پیدا ہوا کہ وہ جنگ کے اختتام تک سویا رہا ہے۔ اور اس وقت ایک ایسے صنعتی شاہکار کے روبرو ہے جسے شاندار ماضی کے کارہائے نمایاں کی یادگار رکھنے کو بلندی پر نصب کیا گیا ہے۔ وہ ماضی جس کا وہ خود ایک غیر معروف حصہ رہ چکا ہے۔ مگر گروپ کی خفیف سی حرکت نے اس احساس کو زائل کر دیا۔ گھوڑے نے ٹانگوں کو جنبش دیئے بغیر اپنے جسم کو کنارے سے تھوڑا سا پیچھے کو ہٹایا۔ سوار پہلے کی طرح ساکن اور غیر متحرک تھا۔ ڈروس اب پوری طرح بیدار ہوچکا تھا۔ اور صورت حالات کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہوگیا تھا۔ چنانچہ بندوق کو نہایت احتیاط سے جھاڑیوں میں سے آگے سرکاتے ہوئے اس کی پشت کو اپنے گال کے مقابل لایا۔ اور بندوق کی مکھی میں سے باہر کو دیکھتے ہوئے سوار کی چھاتی کے ایک نازک مقام کا نشانہ باندھا۔ اب لبلبی کو ذرا سا دبانے کی دیر تھی۔ اور سارا کام نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام پا جاتا کہ اس موقع پر سوار نے اپنا سر پھیرا۔ اور چھپے ہوئے دشمن کی سمت میں دیکھا ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ اس کے چہرے کو آنکھوں کو اور اس کے بہادر رحیم دل کی عمیق گہرائیوں کو دیکھ رہا ہے۔

تو کیا غنیم کو مار دینا واقعی خطرناک کام ہے۔ ایسے غنیم کو جس نے

سوئے اتفاق سے ایک ایسا راز معلوم کر لیا ہے جو پہریدار اور اس کے ساتھیوں کی حیات و ممات سے متعلق ہے۔ غنیم جس کی ساری فوج اتنی خطرناک نہیں جتنا کہ خود اس کا وجود۔ کیونکہ یہ ایک خطرناک راز سے واقف ہو چکا ہے۔ کارڈ ڈروس کا چہرہ موت کی طرح زرد ہو گیا۔ جوڑ جوڑ کانپنے لگا۔ اور اسے غش سا آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ مقابل کا گروپ سیاہ شکلوں پر مشتمل ہے جو بار بار بلند ہو ہو کر گرتی ہیں اور آسمان کی آتشیں فضا میں قوس کی شکل میں چکر لگا رہی ہیں۔ اس کا ہاتھ بندوق سے علیحدہ ہو گیا۔ سر آہستہ آہستہ جھک گیا حتیٰ کہ گال ان پتوں سے مس ہونے لگے۔ جن پر وہ لیٹا ہوا تھا۔ ایک بہادر شخص اور جفاکش سپاہی پر غلبۂ جذبات سے مدہوشی کی سی حالت طاری ہو گئی۔

یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی دوسرے ہی لمحے میں اس کا چہرہ زمین سے بلند ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ انگلیاں رائفل کے سابقہ مقامات پر پہنچ گئیں۔ درمیانی انگلی لبلبی کی تلاش کرنے لگی۔ اب دل و دماغ صاف تھے۔ اور ضمیر و عقل درست حالت میں۔ غنیم کو زندہ گرفتار کر لینے کی بھی توقع نہ تھی۔ اگر اسے محض خائف کر دیا جاتا۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ ایک خوفناک خبر لے کر سیدھا اپنے کیمپ کی طرف بھاگ جاتا اس موقع پر ایک سپاہی کا فرض کیا ہے یہ بالکل عیاں تھا کہ غنیم کو کمین گاہ میں سے بغیر کسی انتباہ کے ایک لمحہ کی بھی روحانی عاجزی کے بغیر جو موت سے پہلے ضروری ہے۔ بلکہ اسے دل میں بھی کوئی دعا مانگنے کی اجازت دیئے بغیر بندوق کے فیر سے جہنم واصل کر دیا جائے۔ دفعتہً ڈروس کو خیال آیا کہ ابھی اسے زندہ چھوڑ دیئے جانے کی ایک صورت باقی ہے۔ ممکن ہے اس نے کوئی بات بھی معلوم نہ کی ہو اور صرف مناظر کے حسن و عظمت کا تماشائی ہو۔ اس صورت میں اگر اسے زندہ رہنے دیا جائے تو وہ سیر و تماشا سے فارغ ہو کر ایک لاابالیانہ انداز میں مڑے گا۔ اور اسی سمت کو واپس چلا جائے گا۔ جہاں سے کہ وہ آ رہا ہے۔ مڑتے وقت اس کے انداز سے اس امر کے اندازہ لگا لینے کا بھی امکان ہے۔ کہ آیا وہ کچھ جانتا ہے یا نہیں اور یقیناً اس کی توجہ اس موقع پر ڈروس نے سر جھکا کر نیچے کی طرف دیکھا کرۂ ہوائی کے عمق میں سے نیچے کی طرف جیسے کوئی بے ترتیب سی سمندر کی شفاف سطح سے تہ کی طرف دیکھے، آدمیوں اور گھوڑوں کی ایک بے ترتیب سی لہراتی ہوئی قطار سبز چراگاہ میں رینگتی دکھائی دی۔ ایک کور مغز کمانڈر بدرقہ کے سپاہیوں کو اس امر کی ہدایات دے رہا تھا کہ وہ مویشیوں کو کھلے میدان میں پانی پلائیں۔ یہ منظر بالکل صاف تھا۔

ڈروس نے آنکھیں وادی کی تہ سے ہٹا کر نہیں دوبارہ آسمان میں سوار اور گھوڑے کے گروپ پر گاڑ دیا۔ مگر اس دفعہ اس نے گھوڑے کا نشانہ باندھا۔ وہ الفاظ جو گھر سے رخصت ہوتے وقت باپ نے اس سے کہے تھے کہ تم اپنا طرز عمل ہر حالت میں فرض کے تابع رکھو۔ الہام کی طرح دماغ میں گونج رہے تھے۔ اب وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ دانت اگرچہ پورے طور پر بند نہ ہوتے تھے۔ پھر بھی جبڑے ایک دوسرے پر مضبوطی سے قائم تھے۔ نس نس سوئے ہوئے شیرخوار بچے کی طرح پرسکون تھی۔ جسم کا کوئی پٹھا عضو حرکت میں نہ تھا تنفس جو نشانہ باندھتے وقت رک گیا تھا۔ دوبارہ آہستہ آہستہ باقاعدہ جاری تھا۔ فرض نے فتح حاصل کر لی۔ روح نے جسم کو خاموشی و امن کی تلقین کی۔ اور بندوق کا فیر کر دیا گیا۔

اس موقع پر فیڈرل افواج کا ایک افسر جس نے محض جوش بہادری سے یا معلومات بہم پہنچانے کی نیت سے وادی کے پوشیدہ مقام کو جہاں فوج پڑاؤ ڈالے پڑی تھی۔ چھوڑ دیا تھا۔ اور جو اتفاقاً ٹیلے کی تہ کے نزدیک ایک مختصر لیکن کشادہ میدان کے نشیبی کنارے کی طرف نکل آیا تھا۔ کھڑا اس امر پر غور کر رہا تھا۔ کہ اگر وہ سلسلہ تلاش جاری رکھے تو اس سے اسے کیا فائدہ پہنچنے کا امکان ہے۔ سامنے ایک چوتھائی میل کے فاصلے پر چٹان کا مہیب چہرہ صنوبر کے درختوں میں سے بلند ہو رہا تھا جس کی بلندی اتنی زیادہ تھی کہ جب اس نے سر اٹھا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اس کا سر آسمان سے کہاں جا کر ملتا ہے تو اسے چکر آ گیا۔ داہنی سمت میں کچھ فاصلے پر نیلگوں فضا میں اس مقام تک جہاں پگڈنڈی نصف کے قریب ختم ہوتی تھی۔ دور کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے بالمقابل جن کا رنگ ترائی میں اگنے والے درختوں سے کم نیلا نہ ہو گا۔ اس چٹان کا عمودی رخ بالکل صاف نظر آتا تھا۔

چوٹی کی سرحد پیدا دینے والی بلندی کو دیکھنے کی غرض سے جب افسر نے نگاہیں اوپر کیں تو عجیب حیرت انگیز نظارہ دیکھا۔ ایک آدمی گھوڑے کی پشت پر سوار کرۂ ہوائی میں سے وادی کی طرف نیچے اتر رہا تھا۔ سوار زین کے اوپر فوجی شان میں سیدھا جما بیٹھا تھا۔ لگام مضبوط پکڑ رکھی تھی۔ تا کہ اس پرجوش غوطے میں گھوڑے کی روک تھام کر سکے۔ ننگے سر پر لمبے لمبے بال ہوا میں طرہ کی طرح لہرا رہے تھے۔ دایاں ہاتھ گھوڑے کی ایال کے بادل میں چھپا ہوا تھا۔ جس کا جسم زمین کے بالکل متوازی تھا۔ گویا اس کے سموں کی ہر حرکت زمین کی مدافعت کا مقابلہ کر رہی ہے حرکات ایسی تھیں۔ جیسے سرپٹ دوڑ میں ہو۔ مگر افسر نے دیکھتے دیکھتے

یہ حالت دیکھ کر گھوڑے کی ٹانگوں کا رخ باہر کو ہو گیا۔ جیسے نیچے
کی طرف پہلا قدم اٹھانا ہو۔ یہ بھی ایک قسم کی پرواز تھی۔

آسمان میں اس ہوائی سوار کو تعجب و خوف کی نظروں سے دیکھنے
کے بعد افسر [illegible] یہ شخص غالباً
حیرت سے اتنا خفیف ہو گیا کہ اس کی ٹانگیں چلنے سے رہ گئیں۔ قدم
لڑکھڑانے لگے تھے کہ زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ عین اسی وقت اس
نے درختوں میں کسی چیز کے گرنے کی آواز سنی۔ ایک آواز جو صدا کے
بازگشت سے بھی بے نصیب تھی۔ پھر سکوت طاری ہو گیا۔

افسر کانپتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا۔ مجروح پنڈلی کی تمام حس سے
معطل قوا تازہ ہو گئے۔

چنانچہ اپنے آپ کو سنبھال کر ٹیلے سے ایک طرف کو دیوانہ وار
بھاگا۔ اور نصف میل تک دوڑتا چلا گیا۔ کیونکہ اسے اس طرف کسی
سپاہی کے مل جانے کی توقع تھی۔ مگر قدرتی طور پر وہاں کوئی سپاہی
موجود نہ تھا۔ اس دوران میں اس کا ذہن اس محیر العقول تماشا کی طرز
خوش اسلوبی و نفاست سے اتنا متاثر ہو گیا تھا کہ اسے یہ خیال تک
بھی نہ آیا کہ ہوائی رسالہ کا رخ نیچے کی طرف ہے۔ اور وہ پہاڑ کی ترائی
میں اپنے مقصد [illegible] صرف ترائی میں پہنچنے سے حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ
[illegible] گھنٹہ کی دوڑ دھوپ کے بعد کیمپ کو لوٹا۔

یہ افسر ایک سمجھدار آدمی تھا اور جانتا تھا کہ ایک ایسے سچ کے بیان
کرنے سے جس پر کوئی ایمان لانے کو تیار نہ ہو، اس کا اخفا زیادہ قرین
مصلحت ہے۔ مگر جب کمانڈر نے دریافت کیا کہ اس نے دوران سیر میں
ایسی معلومات بھی حاصل کی ہیں جو ان کے آئندہ حملے میں مفید ثابت
ہوں تو اس نے جواب دیا کہ "ہاں جناب جنوب کی طرف سے کوئی
پگڈنڈی وادی میں نہیں اترتی۔"

کمانڈر جسے اس علاقہ کا نسبتاً زیادہ علم تھا۔ افسر کے اس جواب
پر مسکرایا۔

فائر کرنے کے بعد کارپورل ڈروس نے دوبارہ رائفل [illegible] اور
پہلے کی طرح نگرانی کرنے لگا۔ بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ فیڈرل
افواج کا ایک سارجنٹ ہاتھوں اور ایڑیوں کی مدد سے رینگتا ہوا
اس تک جا پہنچا۔ ڈروس نے نہ تو اپنا سر پھیرا اور نہ ہی اس کی جانب
دیکھا۔ بلکہ شناخت کی کسی علامت کا اظہار کئے بغیر پڑا رہا۔

سارجنٹ نے قریب آکر دبی زبان میں پوچھا۔ "کیا یہ فیر تم نے
کیا تھا؟"

"ہاں"

"کس چیز پر؟"

"ایک گھوڑے پر جو سامنے کی چٹان پر کھڑا تھا۔ اور کچھ فاصلے
پر۔ اب یہ گھوڑا وہاں نظر نہیں آئے گا۔ کیونکہ یہ ٹیلے پر سے وادی
میں گر پڑا تھا۔"

یہ کہتے ہوئے ڈروس کا چہرہ سفید ہو گیا۔ مگر اس نے اندرونی
کیفیت کی کوئی علامت چہرے پر ظاہر نہ ہونے دی۔ جواب دے
کر منہ پھیر لیا۔ اور چپ ہو گیا۔ سارجنٹ کچھ نہ سمجھا اور ایک منٹ
کے بعد پھر گویا ہوا۔

"دیکھو ڈروس! اس واقعہ کو راز بنانے کی ضرورت نہیں ہے
میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اصلی حالات کی رپورٹ پیش کرو۔ کیا
گھوڑے پر کوئی شخص سوار بھی تھا؟"

"ہاں"

"کون"

"میرا باپ"

سارجنٹ "خدایا تیری پناہ" کہہ کر کھڑا ہو گیا۔ اور واپس چلا گیا۔

فاخر ہریانوی

دنیائے ادب

شکاری

سردیوں کی ایک تاریک رات ...... باراتی ......
ہیبت ناک رات تھی - میں اور سعید تھیٹر سے واپس آ رہے تھے مال روڈ پر گزرتے ہوئے سعید نے مجھے افسانہ محبت سنایا .....

بیس سال کا عرصہ ہوتا ہے سعید نے شمیم سے شادی کی تھی بھورے بالوں والی، سیاہ آنکھوں والی شمیم جس کے حسن کو تعلیم کی نفاست نے فتنہ روزگار بنا دیا تھا - اس کے چہرے پر ایک ہلکا ہلکا سا تبسم رہتا تھا - ایک غیر معمولی قسم کا تبسم - اس تبسم کا بیان میرے اختیار سے باہر ہے - اس کی آواز سے نغمے سریلے پن کا سبق سیکھتے تھے! میں نے کبھی اسے اونچی آواز میں بات کرتے ہوئے نہیں سنا - اس کی آواز ایک جوئے نرم رو سے ملتی جلتی تھی - کون کہہ سکتا تھا کہ اس کے نازک دل میں جذبات کا ایک سیلِ بے پناہ پوشیدہ ہے -

سعید حسین - قد آور سعید - ایک شریف خاندان کا چشم و چراغ تھا - اس کی آنکھوں میں شعلوں کی سی چمک تھی - مضطرب، بیقرار آنکھیں جو دنیا کے لوگوں کو جنگلی جانوروں کی طرح گھورتی تھیں - لوگ اس جوڑے کو رشک اور حسد کی نظروں سے دیکھتے تھے! بظاہر وہ مسرور نظر آتے تھے - اور شمیم کا تبسم ہلکا ہلکا تبسم اس کی مروت کا ایک روشن و رنگیں ثبوت معلوم ہوتا تھا -

اور پھر ایک دن شمیم سعید کو بیاہتا زندگی کی ہولناک تنہائیوں اور اداسیوں میں چھوڑ کر چلی گئی .....

سعید فطرتاً شکاری تھا! اس کی بیقرار اور مضطرب طبیعت ہر وقت "عمل" کا تقاضا کرتی تھی - خطرناک اعمال اس کے لئے ایک حیرت انگیز کشش رکھتے تھے - اس کی عادت تھی کہ سال میں ۹ مہینے لاہور سے باہر گزرتے تھے - کبھی جے پور، کبھی بھوپال - کبھی دکن کی طرف جہاں شکار کی توقع ہوتی وہ پہنچ جاتا -

پھر لڑائی شروع ہو گئی - جنگ فرنگ -
مادر گیتی کے بچوں نے خون اور آگ سے کھیلنا شروع کر دیا - اور قوتِ ایجاد کو نئے نئے آلہ ہائے تہذیب و ہلاکت کی اختراع پر صرف کرنے لگے - انسان نے درندے کی صورت اختیار کر لی - توپوں اور بندوقوں نے شعلوں کی زبان سے انسانی گوشت اور خون کو پیغامِ موت دینا شروع کیا -

کس طرح ممکن ہو سکتا تھا کہ جب شکار کے اتنے موقعے میسر ہوں - اس وقت سعید فوج میں بھرتی ہونے سے رہ جائے - اس نے اپنا نام پیش کیا - منظور کر لیا گیا - اور وہ محاذ جنگ کی طرف روانہ ہو گیا -

اس اثنا میں شمیم ایک نازنین لڑکی سے "مکمل عورت" بن گئی -

لڑائی کے ختم ہونے کے بعد سعید مصر چلا گیا اور وہاں سے دو سال کے بعد واپس آیا - گھر پہنچا تو اس کے ملازم نے اسے ایک خط دیا - سعید نے سوادِ تحریر کی طرف دیکھا - اور پھر اپنے ملازم کی طرف -

"میرا تار کس وقت پہنچا تھا"

"کل چھ بجے جناب"

"اور پھر"

"رات کے گیارہ بجے بیگم نے تانگہ منگوایا اور چلی گئیں -"

"بہت خوب - میں اب نہاؤں گا - پانی گرم کرو -"

ملازم چلا گیا -

سعید نہایا - کپڑے بدلے - اور اس کے بعد اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا - وہ بہت عرصہ - کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا - مینہ برس چکا تھا - اور باغ کے درخت شاداب معلوم ہوتے تھے - وہ افسردگی جو سعید کی روح پر طاری تھی - اس منظر کو دیکھ کر اور بھی بڑھ گئی -

یکایک اس نے شمیم کی آواز سنی!
جوئے نرم رو کی طرح لطیف - ہلکی - مترنم - نغمہ آفریں!
ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کی آواز دور کسی بہار خیز وادی سے

گزر کر آ رہی ہے۔ دھیمی دھیمی آواز تو سن لی مگر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ اور اب اسے ان فقروں کا خیال آیا جو وہ اکثر سرگوشی کے سے انداز میں بڑبڑایا کرتی تھی!

"سعید پیارے۔"

"تشکاری۔"

سعید کا بدن کانپنے لگا۔ اسے شمیم کا تبسم۔ وہ تبسم جس کا بیان نہیں ہو سکتا یاد آ رہا تھا۔ اس کی غبار آلود غم افزا۔ دور بین آنکھیں یاد آ رہی تھیں!

اب اس نے چھٹی کھول لی۔ مضمون مختصر تھا۔

"پیارے! تم میرے جانے کی وجہ جانتے ہو۔ خدا حافظ۔"

غصہ اور اضطراب سے سعید دیوانہ سا ہو گیا۔ اسے شمیم کے جانے کی کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی۔ کوئی وجہ معلوم نہ تھی! آخر کمرے کی تنہائی میں اسے محسوس ہوا کہ غصہ۔ ایک ایسا ہتھیار نہیں جس سے اداسی اور مایوسی کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اور اس تشکاری کی عمر میں وہ لمحے سب سے زیادہ اداس اور مایوس کن تھے۔ جب وہ شمیم کے چلے جانے کی وجوہات پر غور کر رہا تھا۔

اس نے اپنے کمرے کی کھڑکیاں کھول دیں۔ اور تاریکی میں ادھر سے اُدھر پھرنے لگا! خدا کی پناہ! آخر اس کے جانے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی! اس کی شادی کو ۲ سال ہو چکے تھے۔ آخر وہ کیا چاہتی تھی! کیا ہر وقت ایک وارفتہ عاشق کی طرح محبت کے جوش سے بھرے ہوئے الفاظ میں اس کے حسن گلوسوز کی تعریف کرتا رہتا۔

آہ! جب وہ دوسرے ملکوں سے واپس آ کر شمیم کو دیکھتا تھا۔ اس کے دل کی دنیا لرز جاتی تھی۔ اس کے لئے زندگی کی تاریک راہوں میں صرف ایک شمع فروزاں تھی وہ شمیم تھی۔ آہ شمیم!

اس نے شمیم سے دوستوں کا سا سلوک کیا تھا۔ عاطفت اور مہر کے تمام پہلو شمیم پر نچھاور کر دئے تھے اور وہ بغیر کسی وجہ کے اُسے چھوڑ کر چلی گئی تھی! خدا کی پناہ!

یہ ٹھیک ہے کہ وہ کبھی شمیم کو خط نہیں لکھتا تھا۔ جب وہ باہر جاتا تھا تو وہ اپنے پتے سے اپنی بیوی کو باخبر نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے!

تاریک کمرے میں وہ پھرتا رہا۔ یہاں تک کہ چاند کی اصلی روشنی کھڑکیوں میں سے داخل ہو کر کمرے کو منور کرنے لگی۔ اسے روشنی پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ اس طرح معلوم ہوتا تھا جس طرح چاند طنز اور حقارت سے ہنس رہا ہے۔

اپنی زندگی میں پہلی بار سعید نے رونا شروع کیا۔

وہ اپنے کمرے میں تنہا اداس بیٹھا تھا! اور کھلی ہوئی کھڑکیوں میں سے اپنے باغ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گلہائے رنگارنگ سے فضا رنگین معلوم ہوتی تھی۔ ہوا کا ایک جھونکا خوشبو کا ایک سیل لے کر آیا اور سعید کی روح میں اضطراب کے شعلے بھڑکا گیا۔ باغ کی تمام چیزوں پر ہیبت اور خوف کا ایک اثر چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اسے پھول سانپوں کے پھن کی طرح ہوا میں رقصاں دکھائی دیتے تھے۔ ایک تاریکی اور افسردگی۔۔۔ چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

سعید نے سوچا شاید فطرت شمع ہاتھ میں لیکر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ شاید خود فطرت بھی اس تاریکی میں نہیں دیکھ سکی۔ اشجار کے مرے مرے ہوئے سائے، نامعلوم پھولوں کے عکس۔ عشق پیچاں کی بل کھائی ہوئی بیل۔ آسمان پر سفر کرنے والا چاند۔ تمام حیرت انگیز طور پر اداس سے معلوم ہوتے تھے۔

یکایک بلند سایوں میں ایک بلند تر سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ مگر سعید بیٹھا رہا۔ خاموش اور اداس۔ وہ غور سے متحرک سایہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر متحرک سایہ ایک جگہ گویا تھم سا گیا۔ شاید سایہ پھولوں اور درختوں کے اجتماع میں کھو سا گیا تھا۔ ڈر سا گیا تھا۔ سعید دیکھتا رہا۔ سائے میں پھر حرکت پیدا ہوئی۔ اب سایہ کھڑکی کے قریب تھا! سعید خاموش بیٹھا رہا۔ پھر سعید کو اپنی آواز سنائی دی۔

"یہ کیا تماشا ہے۔ ایک عورت بزدل چور کی طرح جاتی ہے۔ اور سایہ کی طرح واپس آتی ہے"

شمیم کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ ایک شعاع نور کی طرح ایک موج رنگ کی طرح۔ ایک سیل حسن کی طرح۔ اور کمرہ حسن و رنگ و نور میں نہا گیا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "آہ! میں تھک گئی ہوں۔"

سعید کا دل فرط مسرت سے پھٹ جانے کے قریب تھا اس کے ہاتھ پاؤں نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی شمیم نے سعید کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس کے چہرے پر تبسم نمودار ہوا۔ وہ تبسم جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔

"غریب سعید۔ بیچارہ سعید۔"

سعید نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ "سنو شمیم جب مجھے معلوم ہوا

کہ تم چلی گئی ہو۔ تو میری زندگی چینی کے ایک پیالے کی طرح ٹوٹ گئی۔" سعید خاموش ہوگیا۔ اس نے کبھی اس طرح کی بات نہیں کی تھی۔" اور اب اس نے کہا۔" تم نے میرے قلب شکستہ کو پھر جوڑ دیا۔" وہ پھر خاموش ہوگیا۔

شمیم نے کہا۔" یہ بات ہے سعید! کبھی تم نے میری زندگی کا خیال کیا ہے۔"

"لیکن تمہاری زندگی تو میری زندگی ہے شمیم۔"

ہاں! سعید درست کہتے ہو تم۔ تو سعید تمہیں میرے جانے کی وجہ اب تک نہیں معلوم ہوئی۔"

سعید نے درد سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔" میں نے یہ سمجھا تھا کہ تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔"

نہیں پیارے سعید! میرا دماغ بالکل صحیح ہے۔ صرف میں ذرا تھک گئی ہوں! تم شکاری ہو۔ ٹھیک ہے نا سعید! اور تم مجھے ایک درندہ سمجھتے ہو! میں نے کتنی راتیں تمہارے بغیر انہیں خیالات میں غلطاں و پیچاں گذاری ہیں۔ کہ تم مجھے انسان نہیں سمجھتے! کیوں سعید جب تم شکار کرنے جاتے تھے تو تم نے کبھی سوچا تھا کہ میں تنہائی میں بیابان زندگی کی ہولناک اور مصیبت خیز تنہائی میں کیا کیا کرونگی؟ تم نے کبھی سوچا تھا کہ تعلیم نے میری توقعات کو بڑھا دیا ہے۔ میرے دل کو حساس کر دیا ہے۔ تم نے کبھی سوچا تھا کہ میں درندہ نہیں جسے بندوق سے شکار کیا جا سکے۔ میرے دل میں جذبات ہیں۔ میری بھی ایک روح ہے جو محبت کے لئے تشنہ ہے۔ جو تنہائی میں محبوب کے خط کے لئے بیقرار ہوتی ہے۔ جو اس مہیب خاموشی کو نہیں برداشت کر سکتی۔ جو تم شکار کے لئے جانے کے بعد اختیار کر لیتے تھے!

میں چاہتی تھی۔ کہ بہار کی دلکش راتوں میں خزاں کے اداس دنوں میں گرمیوں کے تاباں و درخشاں لمحوں میں تم میرے پاس ہو۔ میرا دل بیقرار و مضطرب تھا۔ کہ اپنے سیل محبت کو تمہارے قدموں میں ڈال دے اور تم تم کیا کرتے تھے سعید تم شکار کے لئے چلے جاتے تھے۔ تم سمجھتے تھے کہ مجھے صرف جانوروں کی سی سمجھ ہے۔ اور بس۔

آہ! مرد عورت کے احساسات کو کب سمجھیں گے!

تم شکاری تھے اور بس۔ تم نے مجھے بھی ایک شکار تصور کیا تھا۔ جب اپنے مردانہ حسن کی طاقتوں سے تم مجھے مجروح کر چکے تو تم نے مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ شاید میں مر جاتی سعید! کبھی تم نے یہ بھی سوچا تھا کہ مجروح درندہ مر بھی جاتا ہے۔

میں تمہاری تنہائی پر رحم کھا کر واپس آگئی ہوں۔ میں جو کہیں تنہائی کے کسی اداس گوشے میں چھپ گئی تھی۔ میں جو تنہائی کی عادی ہو چلی تھی!"

وہ خاموش ہوگئی۔

کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد بولی:۔

"میں ذرا باغ میں جا رہی ہوں سعید۔ میں ذرا چاند تک جاؤنگی۔ اور پھر واپس آجاؤنگی۔"

سعید نے عاجزی سے کہا۔" میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

"نہیں سعید! میں اکیلی ہی جاؤنگی۔

چاند ایک ارغوانی رنگ کے بادل کے نقاب میں پوشیدہ تھا! شمیم باغ کی طرف چلی گئی۔ خاموش سایوں میں ایک سایہ بن کر مل گئی۔ غائب ہو گئی۔

وہ آج تک واپس نہیں آئی۔

سعید نے اپنا فسانہ سنانے کے بعد کہا:۔

مردوں سے کہدو کہ عورتوں کو درندہ نہ سمجھا کریں مجھے یہ بات زندگی برباد کر کے معلوم ہوئی ہے۔ مگر تم میری زندگی سے سبق لو۔

"جی درست ہے" میں نے جواب دیا۔ اور میں کیا کہہ سکتا تھا!

(رسالہ چمن) عابد علی

ہندی

خوابوں کی دنیا

کہا جاتا ہے کہ خوابوں کی دنیا بے اصل ہے۔ سراب ہے۔ بے حاصل ہے۔ اس میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ لیکن میرے لئے تو یہ دنیا بیداری سے زیادہ رنگین ہے۔ بیداری سے زیادہ دلفریب ہے۔ جس محبوب سے ملنے کی مجھے اُمید نہیں ہو سکتی وہ خواب میں ایک عجیب انداز حسن سے مسکراتا ہوا میرے دل کے ذرے ذرے میں سما جاتا ہے اور روح کی کائنات جگمگا اٹھتی ہے۔ میرے لئے تو بیداری سے خواب اچھا ہے۔

رات کو کیا دیکھتی ہوں کہ آسمان پر چاند کی اجلی اجلی روشنی میں ایک سنہری رتھ پرواز کر رہا ہے اور میرا محبوب طلائی تاج پہنے بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا۔

"پران ناتھ کہاں جا رہے ہو"

تو وہ مسکرایا۔ اور اس کے تبسم سے ایک ایسی روشنی نمودار ہوئی کہ دنیا ایک بقعۂ نور ہو کر رہ گئی میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ اور آنکھ کھل گئی۔ . . .

میرے لئے تو بیداری سے خواب اچھا ہے۔

عربی

اشعار کا ترجمہ

۱۔ زیادہ باتیں بنانا ایسا ہے جیسے عمل نہ کرنا۔ قول اور عمل برابر ہونے چاہئیں عمل کی زیادتی۔ اور باتوں کی کمی تو اچھی ہے مگر اس کے برعکس بہت بُری ہے۔

۲۔ بدترین کام وہ ہے جس کے لئے تمہیں کوئی معین اور راہ سمجھانے والا نہ ملے۔ انسان کو اس کی عقل کبھی مشورہ سے بے پرواہ نہیں کرتی خواہ وہ کتنا ہی عقلمند ہو جس طرح باعصمت نازنین کی پاکدامنی اس کو مرد سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔

۳۔ حقیر آدمی کی بات کو حقیر نہ سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ شہد کی مکھی گو مکھی ہے مگر شہد جیسی چیز پیدا کرنے والا پرندہ بھی تو ہے۔

۴۔ کہیں ضرورتمند کی دوستی پر ریجھ نہ جانا جبتک اُسے ضرورت نکل جانے پر نہ آزمائے۔ کیونکہ دشمن کو اُس کی ضرورتیں دوستی گانٹھنے پر مجبور کرتی ہیں۔

۵۔ انسان کو مصیبت کے وقت تسلی دلانے کیلئے اٹل تقدیر کا وجود ایک نعمت ہے، دنیا کے مذاہب نے تقدیر کا عقیدہ صرف اس لئے رکھا ہے کہ انسان مصیبت کو تقدیر آسمانی سمجھکر کچھ نہ کچھ تسلی حاصل کر لیتا ہے ورنہ جزع فزع سے ہلاک بھی ہو جاتا۔

۶۔ بدترین روش جس سے ڈرنا چاہئے یہ ہے کہ تیری آزادی چھن جائے یا پسندیدہ کام تیرے ہاتھ سے نکل جائے۔

۷۔ اپنے ہمجنسوں کی لغزشوں پر بغلیں نہ بجا اور نہ کسی کا تمسخر اُڑا۔ اور زمانہ کی گردشوں کی جھپیٹ سے ڈرتا رہ

۸۔ انسان جس ہنر کا ماہر ہو وہی اُس کی قسمت ہے۔ اس لئے تم اپنے لئے وہ ہنر ڈھونڈو جس سے تم بلند مرتبہ بنجاؤ اور پھر اُسی کے ہو رہو۔

۹۔ تو ڈھونڈے جا کہ تجھے کامیابی کی لذت ملے۔ یا مایوسی پر گو نہ تسلی ہی ہو جائے۔ مگر کسی نکھٹو۔ پست ہمت کی بات نہ سن جو دوسرے کے سہارے زندگی تیر کرنے کا عادی ہو چکا ہو۔

۱۰۔ ہر بیماری کا علاج ہے۔ مگر جب تنگدستی کے ساتھ کاہلی بھی ملجائے تو پھر کچھ بنائے نہیں بنتا۔

فارسی

گفتگو کے اداب

باتیں زیادہ نہ کرو۔ دوسرے کی بات نہ کاٹو اور جو کوئی شخص ایسی بات بیان کر رہا ہو جو تمہیں معلوم ہو تو خاموش سنتے رہو اور اس پر یہ ظاہر نہ کرو کہ ہم واقف ہیں۔ سوال کسی دوسرے سے کیا جائے تو اس کا جواب تم نہ دو۔ جب ایک جماعت سے سوال کیا جائے جس میں تم بھی شامل ہو تو دوسروں پر جواب میں سبقت نہ کرو۔

انگریزی

"شعر"

اگر یکایک ہم سے پوچھا جائے کہ شعر کیا ہے تو اکثر حضرات ولی آئنسٹائن کی طرح صحیح جواب دینے سے گریز کریں گے۔ انہوں نے اس قسم کے ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا۔

اگر آپ مجھے اس بات کے متعلق کچھ نہ پوچھیں تو میں شعر کے متعلق سب کچھ جانتا ہوں۔ لیکن آپ پوچھ بیٹھیں تو کچھ بھی نہیں جانتا"

ہم تمام اپنے دل کی گہرائیوں میں شعر کی دلکشی کو محسوس کرتے ہیں لیکن اس احساس کو الفاظ کا جامہ پہنانا بہت مشکل ہے۔ میرا دعوی ہے کہ ان تمام تعریفات سے بھی کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا جو اہل ذوق اور اہل علم نے وضع کی ہیں۔ اس شعلے کو مٹھی میں بند نہیں کیا جا سکتا۔

چند ایک مثالیں سنئے۔

جانسن کا قول ہے۔ شاعری وہ فن لطیف ہے جس کے ذریعے ہم عقل کو تخیل کی مدد سے اس قابل بنا دیتے ہیں کہ مسرت اور صداقت کو جمع کر سکے۔ اس فن کا جوہر اختراع و تخلیق ہے"

مل کہتا ہے "شاعری کیا ہے؟ ایسے الفاظ اور خیالات جن میں جذبہ خود بخود ایک فطرتی طریق سے سما گیا ہے"

لکھتا ہے "شاعری سے مراد یہ ہے کہ الفاظ کو اس طریقے سے برتا جائے جس طرح مصور رنگوں کو برتتا ہے۔ کارلائل کے خیال میں شاعری "مترنم خیال" کا نام ہے۔ شیلے مشہور انگریزی شاعر شاعری کو تخیل کا مظہر تصور کرتا ہے۔ ہیزلٹ شاعری کو تخیل اور جذبات کی زبان سمجھتا ہے

بینٹ کا مقولہ بہت دلفریب ہے۔ وہ کہتا ہے۔ شاعری حسن صداقت اور عظمت کی محبت کے اظہار کا نام ہے۔ شاعر اپنے تصورات کو تخیل کے ذریعے واضح کرتا ہے اور اپنی زبان کو "وحدت میں تنوع" کے اصول کی مطابقت میں ڈھالتا ہے۔ کالرج شاعری کو سائنس کی ضد تصور کرتا ہے۔ اس کے خیال میں شعر کا مقصد مسرت ہے اظہار صداقت نہیں۔ ورڈزورتھ شاعری کو "تمام علم کی وسعت" کا لقب دیتا ہے۔ آرنلڈ کی تعریف تو مشہور ہے" زندگی کی تنقید صداقت شعری کے اصولوں کے ماتحت"

ایڈگر ایلن پو لکھتا ہے "شاعری حسن کی مترنم تخلیق ہے"

مندرجہ بالا تعریفات سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ جن لوگوں نے شعر جیسی شے کو منطقی اصولوں میں پابند کرنا چاہا ہے انکو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام تعریفات سلسلہ جنبان خیال ہیں۔

فرانیسی

محبت

میں اس نازک اور لطیف احساس کو کس نام سے پکاروں جو آج صبح میرے دل پر درد کا ایک بادل سا بنکر چھا گیا۔ یہ احساس کسی محبوب جلوے کی یاد سے عبارت تھا۔ دلفروز۔ دلفریب۔ مگر بے نام مبہم۔ بے رنگ عین اسی طرح جس طرح کبھی کوئی بیمار شخص بخار کی عجیب و غریب بیہوشی کے دوران میں اپنے تاریک کمرے کے سایوں پر سے کسی حسین و جمیل نازنین کے عکس رنگین کو گذرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح میں نے ایک جلوۂ دلربا کی شگفتگی کو محسوس کیا۔!

مجھے ایک ایسی مسرت افروز نازنین کے حسن نے مسحور کر لیا ہے جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا جو کچھ دنوں کے لئے میرے واسطے ایک شعلہ جمال بنکر نمودار ہوئی تھی اور پھر ایام ماضی کے خاکستر میں بجھ کر رہ گئی تھی حسن کے جلووں کا احساس تو تھا مگر اس حسن کے ظہور کے مقام اور وقت کا تعین نہ ہو سکتا تھا۔ نہ تو مجھے چہرہ صاف طور پر نظر آتا تھا نہ جسم۔

میرے دل میں جو احساس حسن موجزن تھا وہ ایک رنگین و باریک دلرزاں نقاب کی طرح تھا جس کی تہوں میں مسرت کا معمہ۔ مسرت کا راز پوشیدہ تھا۔ اور پھر میں جاگ رہا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میں جاگ رہا ہوں کہ یہ قصہ خواب نہیں ہے۔

اس قسم کے تاثرات ان دردناک چیزوں کی یاد دلاتے ہیں

جو فنا ہو رہی ہیں۔ فنا ہوا چاہتی ہیں۔ ایسی چیزوں کی جو نظر سے غائب ہوتی جا رہی ہیں۔ بالکل غائب ہوا چاہتی ہیں۔

یہ تاثرات ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعوں کی طرح ہیں۔ ایسی شعاعوں کی طرح جو مبہم۔ بے رنگ خاکوں پر جلوہ ریز ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بے رنگ مبہم خاکے مسرت کی یادگار ہیں یا غم کی۔

یہ تاثرات ایسی کرنوں کی مانند ہیں جو سنگ مرمر کے لوح مزار پر ضیا افگن ہوں۔

ایسے تاثرات کو ماضی کی گمشدہ مسرت کا ایک عکس۔ مردہ جذبات کی لاش کہنا چاہئے۔

ایک مشہور مصنف کا قول ہے کہ محبت کا ہر ایک جذبہ غیرارادی طور پر انسان کی ایک ایسی قوت کو بیدار کر دیتا ہے جو محبت کی تخیل میں اپنی تکمیل دیکھتی ہے۔ وہ انسان کو کشاں کشاں عشق کی انتہا تک لے جاتی ہے۔ محبوب سے ہمیشہ کے لئے جدا ہونے کے بعد یہ قوت زندہ رہتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے انسان فانی بے بس انسان اپنی روح میں ایسے بے رنگ مبہم احساسات لرزاں محسوس کرتا ہے جن کی کوئی شکل نہیں۔ جن کا کوئی مقام نہیں۔ ممکن ہے کہ اس کا قول حقیقت پر مبنی ہو۔ یا ممکن ہے کہ کبھی کبھی احساسات جنہوں نے ہماری روح کو اپنا مرکز بنا لیا ہے محبوب کی صورت میں جلوہ گر ہو کر ہماری یاس کو رشک ماہتاب بنا دیا کرتے ہوں۔

انسان ان دردناک خیالات کی رو میں بہا جاتا ہے اور زندگی کا ہر منظر اسے تاریک و اندوہ افزا نظر آتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تاریک رات میں ایک جہاز غرق ہو رہا ہے۔ ہزاروں حسین عورتیں دردناک انداز میں چیخ رہی ہیں اور ایک بلند قہرمان لہر فطرت کے غضب کا نمونہ بنکر انسان کی نام نہاد عظمت وجاہت کا ماتم کر رہی ہے۔ ہر ایک آواز کو خاموش کر رہی ہے موت کے اندھیرے میں ابھی ہم نے الوداعی الفاظ بھی منہ سے نہیں نکالے کہ نہنگ اجل نے تمام چیزوں کو نگل لیا۔

اس نقطۂ نظر سے تقدیر ظالم۔ سخت گیر۔ جابر۔ بے پروا وحشی نظر آتی ہے۔ اور زندگی کی ٹریجڈی روزمرہ کے معمولی واقعات کے گدلے پانی میں پتھر کی چٹان کی طرح بلند ہو کر نظر آتی ہے۔

حالات سطحی طور پر شاید معمولی معلوم ہوں مگر گہرائیوں میں خوف اور ہیبت چھپی ہوئی ہے جب کبھی ہم ازل اور ابد۔ صداقت و فرض۔ تقدیر و رحم جیسی چیزوں کا تصور کرتے ہیں تو ہم پر غم کا ایک بادل سا چھا جاتا ہے۔

محبت بھی اپنے نقطۂ عروج اپنے معراج کمال تک پہنچکر ایک گہرے غار کی طرف رہبری کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت براہ راست الوہیت اور ازلیت کی باتیں کرتی ہے۔

جب انسان کے اردگرد ہر شے بدل رہی ہو۔ فنا ہوتی جا رہی ہو ہر چیز تاریک ہو گئی ہو۔ اندوہ فزا ہو گئی ہو۔ غیر معلوم اور تاریک مستقبل مہیب بن گیا ہو۔ دنیا پریوں کی ایک کہانی ہو کر رہ گئی ہو۔ زندگی ناول کی طرح جھوٹے واقعات کا مجموعہ معلوم ہوتی ہو جب خیالات کا بلند محل دھواں بن کر اڑ گیا ہو۔ اور حقیقتیں جھوٹ ہو گئی ہوں۔ اس وقت صرف ایک تاباں اور درخشاں ستارہ انسان کے دل میں مسرت کا نور پیدا کرتا ہے۔

اور وہ ستارہ "عورت کی محبت" ہے۔

عورت کی محبت یقین و ایمان کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر دیگی اور انسان کو ایک بہشت ارضی میں پہنچا دیگی۔

محبت ایک عقیدہ ہے، ایک مذہب ہے، اور خدا سے ملنے کا سب سے اچھا ذریعہ۔ یہ مذہب نور۔ مسرت اور امن کے اجزا سے مرکب ہے۔ اس مذہب پر ایمان لانیکے بعد انسان کا شمار زندوں میں ہونے لگتا ہے۔

ہنری فریڈرک ایمیل

اطالوی

بلند نظری

بلند نظری کوئی بری شے نہیں۔ وہ شخص ملامت کا سزاوار نہیں جو اپنی طاقت اور اقتدار میں توسیع کرنے کا خواہاں ہو۔ دنیا میں صرف انہیں اشخاص نے کچھ کر کے دکھایا ہے جن کو شہرت اور ترقی کی آرزو کشاں کشاں ساحل مقصود کی طرف لے جا رہی تھی۔

جس شخص کے دل میں بقائے دوام حاصل کرنے کا جذبہ نہیں ہے وہ لکڑی کے بت کی طرح ایک بیجان شے ہے۔ لیکن وہ بلند نظری جو خودغرضی کے سوا اور کچھ نہیں جانتی۔ جو اپنے مقاصد پر یتیموں کی آہوں اور بیواؤں کی دردناک چیخوں کو قربان کر دیتی ہے جو انسانی

جذبات کو کھلونا سمجھکر ان سے کھیلتی ہے۔ جو دوسروں کے خاکستہ پر ایک محل تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ واقعی ملامت کے قابل ہے۔

فرانسکو گا یکارڈینی

ہسپانوی

تنہائی

میں جو شہر سے بھاگتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے دل میں شہر کے رہنے والوں کی محبت موجزن ہے۔ میں اُن سے بھاگتا ہوں انہیں کو ڈھونڈتا ہوں، مجھے انسانوں سے نفرت کرنے والا نہ کہو، جو لوگ انسانوں سے نفرت کرتے ہیں وہ تو انسانوں سے ملتے بھی ہیں۔ تا کہ ان کی بداعمالیوں کو دیکھکر اپنے دل کے جذباتِ غضب کو بھڑکاتے رہیں۔

محبت امیدوں اور خوابوں پر زندہ رہتی ہے۔ نفرت کی زندگی تازہ واقعات پر منحصر ہے۔ مجھے جانے دو۔ اس شہر سے جانے دو کہ میں کسی گاؤں کی حسین تنہائی میں جا کر سکون قلب حاصل کروں۔

جب تنہائیوں میں انسان ایک دوسرے کی آواز سنتے ہیں تو ان کے دل میں محبت کے جذبات پیدا ہوجاتے ہیں ہمسایوں کی وہ دلدوز ہلکی سی چیخیں جو تنہائی میں سنائی دیتی ہیں ایک دفتر غم والم سے زیادہ موثر ہوتی ہیں۔

ناروے

فرانسیسیوں کی طرح غیر مہذب، کسی دن ضرب المثل کا درجہ حاصل کرے گا۔ تم ذرا غور سے دیکھو۔ یہ لوگ کبھی تمہارے سامنے سے نہیں ہٹیں گے۔ کبھی تمہیں صحیح راستہ نہ بتائیں گے یہ لوگ صرف خوبصورت عورتوں اور سرکردہ شخصیتوں کے ساتھ مہذبانہ سلوک کرتے ہیں۔ یا پھر ان لوگوں کے ساتھ جن سے ان کو فائدے کی توقع ہو۔

اس کے خلاف اطالوی اس قدر مہذب اور شستہ ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ وہ اجنبی کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لئے ان کا اور ان کے وطن کا مداح ہوجاتا ہے صحیح حب الوطنی یہی ہے کہ انسان اجنبی کو بھی اپنے وطن کے ستائش کرنے پر مجبور کردے

جاپانی

جاپان کی قدیم شاعری

پرانے زمانوں میں جاپان کے فرماں روا خود بہار کے شگفتہ دنوں میں اور خزاں کی چاندنی راتوں میں اپنے درباریوں کو جمع کر کے ایک مشاعرہ ترتیب دیتے تھے۔

اس زمانے کے شاعر حوصلوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو فتح کی چوٹیوں سے اور محبت کے شراروں کو فتح کے ازلی شعلوں سے تشبیہ دیتے تھے، پھلوں کے موسم میں زمین کو شاہ دانوں کے برف رنگ پھولوں سے پٹا ہوا دیکھکر۔ خزاں کی راتوں میں پتوں کے گرنے کی آواز سنکر۔ اپنے میں سال بہ سال وقت کے بناہ کن اثرات کو سفید بالوں اور مکروہ جھریوں کی صورت میں دیکھکر۔ وہ لوگ شعر کہتے تھے۔ گھاس کی لرزاں پتیوں پر شبنم کے موتی دیکھکر ان کا دل کانپ کانپ جاتا تھا۔ سطح دریا کے فانی بلبلے انہیں اپنی زندگی کی ناپائیداری کا یقین دلاتے تھے ان کے اشعار کے موضوع مختلف تھے۔

تیز رو دریا جن کے کنارے گنجان جنگل، تاریک اور ہیبتناک نظر آتے ہیں۔ منہ بند کلیاں جن کی دلکشی "حسنِ معصوم" کا منظر پیش کرتی ہے۔ بانس کے درخت۔ ہوا کی سرسراہٹ، طیور کی نغمہ ریزی۔ یہ تمام چیزیں ان کے لئے الہام شعری کی محرک ہوتی تھیں،

کی نوسرایوکی

جرمن

لارڈ بایرن

مندرجہ ذیل سطور سے قارئین کرام پر واضح ہو جائے گا کہ تہذیب و تمدن کے اس ترقی یافتہ زمانے میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو آسکر وائلڈ اور بایرن کو ان کی تحریروں کے باعث ملعون و مقہور تصور کرتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ انگلستان سے جو مجموعہ "دنیا کے بہترین مضامین" کے نام سے شائع ہوا ہے اس میں یہ مضمون شامل ہے جسکا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے "سالومی" نامی جس کتاب کی طرف مندرجہ ذیل سطور میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے۔ قارئین کرام اس کا مطالعہ کرنے کے بعد خود اندازہ قایم کر سکتے ہیں آسکر وائلڈ اس کتاب کی تصنیف کے باعث ابدی عذاب کا مستحق ہے یا نہیں۔ کسی اور اشاعت میں پورے مضمون کا ترجمہ پیش کیا جائے گا۔

ایڈیٹر

ماہ دسمبر ۱۹۰۰ء کی یکم تاریخ کو سب سے پہلی مقہور و ملعون روح جو صبح صبح دردوزخ پر پہونچی آسکر وائلڈ کی تھی۔ اس نے اپنے کاغذات پیش کئے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ سالومی کا مصنف ہے چنانچہ اُسے فوراً داخل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ نہ صرف یہ بلکہ اُسے ایک خاص کمرہ بھی مرحمت کیا گیا۔ اس نے فوراً اس شیطان سے جو اس کی سرکوبی کے لئے مقرر کیا گیا تھا ملاقات کا وقت دریافت کیا۔ اور اسے یہ سنکر مسرت ہوئی کہ دوزخ میں بھی روئے زمین کی طرح ملاقات کے اوقات ایک بجے دن سے دو بجے تک اور سہ پہر کو چار بجے سے پانچ بجے تک ہیں۔ شاعر شکریہ کے طور پر مسکرایا اور لارڈ بایرن سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا اسے معلوم ہوا کہ لارڈ بایرن بھی اس کے کمرے کے قریب ہی اقامت پذیر ہے۔

روسی

روس کے مصنف اور روسی زندگی

روسی مصنف زندگی کے تاریک ترین پہلوؤں کی تصویر کھینچتے ہیں۔ اگر آپ ان سے سوال کریں

"آپ اس طرح کی زندگی کس طرح بسر کرتے ہیں۔ آپ نے اس قسم کی زندگی کو کس طرح قبول کر لیا ہے" تو وہ جواب دیں گے ہم نے اس قسم کی زندگی ہرگز قبول نہیں کی۔ ہم اس قسم کی زندگی سے مطمئن نہیں ہیں"

آپ کہیں گے کہ یہ جواب غیر معقول ہے مگر میں عرض کروں گا کہ ان کی مراد یہ ہے کہ وہ اس بات پر یقین کامل رکھتے ہیں کہ کسی دن "حق باطل پر" "عشرت غم" پر غالب آ جائیں گے۔ اس یقین سے مسلح ہو کر روسی اپنے دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے مردانہ وار میدان میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

لیو ٹسٹو

بنگالی

شراب کئی قسم کی ہے۔ جوانی کی شراب۔ محبت کی شراب ہوس کی شراب۔ دولت کی شراب۔ لیکن جس نے ایکبار محبت کی شراب کا مزا چکھ لیا اسے کسی اور شراب سے محبت نہیں رہتی۔ کسی اور شراب کی خواہش نہیں رہتی،

اس شراب نے کائنات کے ذرے ذرے کو ایک والہانہ رقص میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ہوائیں ناچتی ہیں۔ فضائیں ناچتی ناچتی ہیں۔ زمین ناچتی ہے۔ آسمان ناچتا ہے۔ اور اس جنون رقص کے درمیان ایک ذرہ بے مقدار یعنی انسان بھی ناچ رہا ہے۔

یہ رقص ایسا مبارک رقص ہے کہ آسمان پر فرشتے بھی اپنے سنہری پر پھیلائے ہوئے سطح فلک پر ناچ رہے ہیں۔

ہندوستانی لڑکوں اور لڑکیوں کا باتصویر ہفتہ وار اخبار

"پریم"

علامہ تاجور اور پروفیسر برج موہن دتاتریہ کیفی ... ایم اے دہلوی کی ایڈیٹری میں شائع ہوتا ہے۔ اس اخبار کی امتیازی خصوصیات جن پر اب تک کاربند رہا ہے حسب ذیل ہیں

(۱) نہایت سادہ سلیس اور ایسی عام فہم زبان استعمال کی جاتی ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کی سمجھ میں آسکے (۲) بچوں کی زبان میں بچوں کے لئے ایسی کہانیوں کا سلسلہ جن کے ذریعہ شہری زندگی کے ہر شعبے کے متعلق ہر قسم کی معلومات کا ذخیرہ غیر محسوس طور پر ان کے دماغ میں منتقل کیا جا سکے۔ (۳) پریم سبھا کے عنوان کے تحت میں ہم جماعتوں کی پرمذاق باہمی گفتگو کے ذریعے بچوں کو مضمون نویسی، خط نویسی، اردو کی تذکیر و تانیث، اردو الفاظ کی املا درستی۔ ضروری گرامر۔ ادب، اخلاق۔ تاریخ و جغرافیہ، سائنس۔ بڑے چھوٹے اور برابر والوں سے گفتگو کے آداب کی ایسے دلچسپ طریقے سے تعلیم دینا کہ بچے محسوس بھی نہ کریں کہ ہم کوئی سبق پڑھ رہے ہیں۔ (۴) موجودہ کورسوں نے بچوں کے جذبۂ ظرافت (ہیومرس نیچر) کو مٹا دیا ہے۔ اس جذبہ کو ایسی نتیجہ خیز اور پرمذاق کہانیوں کے ذریعے بچوں میں پیدا کرنا جو شریفانہ مذاق کی حد سے باہر نہ ہوں (۵) ایسے پرمعلومات اور دل لبھانے والے مضامین شائع کرنا جو بچوں میں اردو ادب کیلئے پیاس پیدا کریں (۶) آسان وزنوں اور ایسی رس بھری زبان میں چھوٹی چھوٹی نظمیں چھاپنا جو بچوں کیلئے سبق آموز ہونے کے علاوہ دماغی تفریح کا باعث ہوں۔ (۷) بچوں میں مذہبی رواداری۔ مذہب اور مذہبی پیشواؤں کی عزت کے پاکیزہ جذبات پیدا کرنا۔ (۸) اخبار جس محنت اور غور کے ساتھ ترتیب دیا جاتا ہے اس کا اندازہ اس سے ہوسکیگا کہ ہر فقرے کو بہت سے فقروں سے انتخاب کرکے جانچ تول کر مضمون میں درج کیا جاتا ہے۔ ایڈیٹر کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اخبار کے تمام مضامین کے ہر فقرے کے متعلق یہ بتا سکتا ہے کہ یہ فقرہ کیوں درج کیا گیا۔ اور اس کے بجائے کوئی دوسرا فقرہ کیوں نہ استعمال کیا گیا۔ (۹) اس اخبار کو جس نوعیت سے ترتیب دیا جاتا ہے اس کے متعلق ہماری رائے ہے کہ متوسط ذہانت کا ایک بچہ سال بھر اس اخبار کو بغور پڑھکر اردو معلومات میں انٹرنیس کے طالب علم کی برابری کر سکیگا۔

ذیل میں اس کے متعلق بہت سی رایوں میں چند رایوں کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے

اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور "پریم" لڑکوں اور لڑکیوں کا ہفتہ وار باتصویر رسالہ ہے۔ جو مشہور اردو شاعر مولانا تاجور نجیب آبادی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ سٹاف میں مولانا موصوف کے علاوہ لالہ برج موہن ایم اے دہلوی آنریری ایڈیٹر کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب، طرز ادا صاف، زبان سادہ جسے ہر اردو خواں بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ مضامین آسان دلچسپ اور بچوں کیلئے ہر طرح سے موزوں و سبق آموز ہیں رسالہ کی قابل ذکر امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ہر قسم کے فرقہ وارانہ مضامین سے پاک ہے۔ اسکا واحد مقصد یہ ہے کہ بچوں میں اخوت و ہمدردی کے پاکیزہ ترین جذبات پیدا کئے جائیں۔ (سول ۲۲ جنوری ۱۹۲۶ء)

جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی بچوں کا یہ ہفتہ وار باتصویر رسالہ مولانا تاجور نجیب آبادی کے زیر ادارت شائع ہوتا ہے۔ اس کے جاری کرنے سے فاضل ایڈیٹر کا مقصد یہ ہے کہ ہندو اور مسلم بچوں کے دلوں میں ابتدا عمر سے ہی باہمی اتحاد و الفت کا بیج بویا جائے کسی کو یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ یہ مقصد نہایت قابل عزت ہے۔ مولانا تاجور زبان اردو کے مشہور ادیب اور ناقد ہیں اور مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کی نگرانی میں جو مضامین چھاپے جائینگے وہ ضرور بلحاظ لفظی اور معنوی خوبیوں کے اعلیٰ معیار کے ہوں گے۔

خان بہادر میر ناصر علی خان صاحب ایڈیٹر صلائے عام دہلی یہ رسالہ پریم ظاہرا گو بچوں کیلئے سمجھا جاتا ہے۔ میں بوڑھا بھی اسے جی لگا کر پڑھتا ہوں۔ شاید اس وجہ سے کہ مزاج میں بوڑھا اور بچہ ایک سمجھا جاتا ہے۔ رسالہ پریم کے اہتمام چھپائی اور کاغذ کی تعریف تو بیکار ہے۔ کہ ان خوبیوں میں اس کا جواب مشکل ہے۔ مگر اس کے مضامین کی خوبی بھی لاجواب ہے۔ جن کو پڑھکر بچے تو بچے بوڑھے اور جوان بھی بہت خوش ہوتے ہیں۔

حضرت خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے سے:۔ بچے اور عورتیں اس کو نہایت شوق سے پڑھتے ہیں اور اس کے آنے کی راہ دیکھا کرتے ہیں۔ بہت ہی خوبصورت اور رنگین باتصویر رسالہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ایڈیٹر طبع انسانی کے فلسفہ کو خوب سمجھتے ہیں۔

خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب ایم اے، آئی، ای، ایس، ڈویژنل انسپکٹر مدارس لاہور ڈویژن میری رائے میں رسالہ پریم ہندوستانی بچوں کے لئے بہت مفید دلچسپ اور کارآمد ہے۔ خصوصاً اس کا یہ پہلو کہ مختلف قوموں کے بچوں کو رواداری اور محبت کی تعلیم دیتا ہے۔

بچوّں کا کتب خانہ

تمام کتابیں جدید اصول تعلیم کو مدِّ نظر رکھکر لکھی گئی ہیں اور ہر کتاب کے اخیر میں مشکل الفاظ کا فرہنگ دیا گیا ہے

سلسلہ پیشوایانِ مذاہب ٹیکسٹ بک کمیٹی

پروفیسر تاجور صاحب نیازی نے دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے مذہبی پیشواؤں کی پاکیزہ زندگی پر بچوں کے لئے آسان زبان میں کتابوں کا یہ سٹ تیار کیا ہے۔ بچوں کو اگر یہ حقیقت ذہن نشین کرا دی جائے کہ سب مذہبوں میں سچائی اور نیکی کی تعلیم ہے۔ اور سب مذہبی پیشواؤں نے بنی نوع انسان کی خدمت کا حکم دیا ہے۔ اس لئے ہمیں ہر مذہب اور ہر مذہبی پیشوا کی عزت کرنی چاہئے اور ہر مذہب کے پیروؤں کو اپنا بھائی سمجھکر اس سے محبت اور نیکی کا برتاؤ کرنا چاہئے۔ تو اس معصوم عمر کے اعتقادات ان کی تمام [illegible] پر اثر انداز ہوں گے۔ اور ان کی ساری زندگی رواداری اور اخوت باہمی کا نمونہ بن جائے گی [illegible] سٹ کی ہر کتاب میں یہی حقیقت بچوں کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان [illegible] کتابوں کو پڑھکر ہندوستانی بچوں میں ایک مشترکہ قومیت کا جذبہ پیدا ہوگا۔ وہ ایک دوسرے کو بلا امتیاز مذہب و ملت بھائی بھائی تصور کریں گے۔ اس سلسلے کی مندرجہ ذیل سوانحعمریاں شائع ہو چکی ہیں۔

حضرت محمد صلعم — مہاتما بدھ — حضرت مسیح — شری رامچندر جی — بابا گرو نانک

۱۲/ — ۳۰/ — ۳۰/ — ۱۲/ — ۱۲/

حضرت زرتشت — حکیم کنفیوشس — راجہ رام موہن رائے — پربے سٹ یعنی کل آٹھوں کتابوں کی نست ۲ / علاوہ محصول

۱۲/ — ۳/ — ۱۲/

حاجی بابا اصفہانی

ایک ایرانی ظریف حاجی بابا اصفہانی اپنی کہانی اپنی ہی زبانی سناتا ہے اور ایسے مزے سے لیکر سناتا ہے کہ خود بھی ہنستا ہے اور سننے والوں کو بھی ہنسا ہنسا کے لٹا دیتا ہے۔ یہ کہانی بہت لمبی ہونے کے باوجود بے حد دلچسپ اور بشاشت آفریں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ اور ایشیا کی کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی نے اس کو انٹرمیڈیٹ کے فارسی کورس میں اور اس کا انگریزی ترجمہ اسی کلاس کے انگریزی کورس میں داخل کر رکھا ہے۔

بچوں کا فطری جذبہ ظرافت ہمیشہ مرتجر اچھے خشک اور بشاشت سوز کورسوں نے تباہ کر دیا ہے اس قسم کی کہانیوں سے بیدار ہو جاتا ہے۔ اس کہانی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ظرافت مہذب حدود سے آگے نہیں بڑھتی۔ چھ سو صفحات کی تمام کتاب شروع سے اخیر تک ظرافت کر لبریز ہے۔ مگر پھکڑپن اور سوز عریانیوں سے یکسر خالی ہے۔ اور ادائے بیان میں تصنیفی اردو نہیں بلکہ گھریلو بولی استعمال کی گئی ہے۔ کہانی کو زیادہ مفید اور تعلیمی بنانے کے لئے اثنائے بیان میں بات سے بات پیدا کرکے موجودہ ہندوستانی طرز حکومت۔ میونسپلٹی۔ ڈسٹرکٹ بورڈ۔ صوبہ کونسلیں حکومت ہند۔ سکاؤٹ۔ امداد باہمی۔ زراعت۔ صنعت و حرفت۔ دیہات تعلیمی اور ادبی معلومات

پھول باغ ٹیکسٹ بک کمیٹی

غرضیکہ یہ کہانی جہاں ایران کے جغرافیہ ایرانیوں کے رسم و رواج۔ ان کے تہذیب و تمدن۔ طریقہ اور طریق معاشرت پر روشنی ڈالتی ہے وہاں اس سے بچے ہندوستانی زندگی کے تمام پہلوؤں سے بھی واقف ہو جاتے ہیں۔ کتاب کیا ہے۔ کہانی کی کہانی اور تعلیم کی تعلیم۔ کل دس حصوں میں شائع ہوئی ہے۔ اور سب کی مجموعی قیمت علاوہ محصول ڈاک صرف دو روپے آٹھ آنہ ہے۔

بچے کہانیاں سننے اور پڑھنے کے مشتاق ہوا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں عام طور پر ان پڑھ بوڑھی عورتیں ان کو بہلانے کے لئے ایسی لغو اور بیہودہ کہانیاں سنایا کرتی ہیں جن کے مضر ساں اثرات سے غیر محسوس طور پر بچوں کی ذہنیت خراب ہو جاتی ہے۔ ان کے دماغ جنوں۔ بھوتوں اور پریوں کے دہشت کدے بن جاتے ہیں۔

مہذب ملکوں میں بچوں کو کہانی ہی کہانی میں علمی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ غرضیکہ ہر قسم کی تعلیم دیجاتی ہے۔ یہ کہانیاں نتیجہ خیز اور سبق آموز ہوتی ہیں۔ ان سے بچوں کے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور ان کے قوائے ذہنی کی نشوونما بھی ہوتی ہے۔ لایعنی توہمات اور بے بنیاد خطرات انھیں زندگی بھر کے لئے بزدل اور پست حوصلہ نہیں بنا دیتے۔ بلکہ وہ انھیں سنکر اور پڑھکر اولوالعزم اور بلند ہمت ہو جاتے ہیں۔

پروفیسر تاجور کی ہدایت کے ماتحت یورپین لٹریچر میں سے اسی قسم کی ہمت افروز و اخلاق آموز کہانیاں جو ماہرین فن تعلیم نے بچوں کے لئے لکھی ہیں۔ اصلی اور گھریلو اردو کے سانچے میں ڈھال دی گئی ہیں۔ ان میں سے اس وقت تک ۲۱ کہانیاں پھول باغ کے تین حصوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ تینوں حصوں کی قیمت ۹/ اور الگ الگ ہر حصے کی قیمت ۳/ ہے۔

انتخاب میر و مرزا سودا

ابتدائی جماعتوں میں بچوں کو چونکہ اپنے ادبی ذوق کے نشوونما کا موقعہ نہیں ملتا۔ اور ان کے اردو استاد عام طور پر بس کورس رٹا کر امتحان میں پاس کرانے کو اپنی کارکردگی تصور کرتے ہیں۔ اسلئے بچے اس ذوق سے اخیر عمر تک بے بہرہ رہتے ہیں۔ پھر کالج میں آکر جب انھیں اردو کلاس میں بیٹھنے کا موقع ملتا ہے۔ اور غالب کے اشعار سے واسطہ پڑتا ہے تو انھیں پتہ چلتا ہے کہ "عنقا را بلند است آشیانہ" نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کالج کے دو سال میں اردو کا پیریئڈ ان کے لئے ریاضی اور ڈرل سے زیادہ خشک اور غیر دلچسپ بن جاتا ہے۔

پروفیسر تاجور نے اپنے اسکول اور کالج کے اسی تجربے کی روشنی میں مستند شعراء کے کلام کے انتخابات مرتب کرائے ہیں جن میں سے انتخاب میر اور انتخاب مرزا سودا دو حصوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اور اس ایجنسی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

منیجر علمی بک ایجنسی پوسٹ بکس نمبر ۱۹۷ لاہور

(مولوی احمد عبداللہ خاں صاحب ارشد نے مرکنٹائل پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ادبی دنیا واقع کشمیر بلڈنگ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا)

ہندوستان کے محکمہائے تعلیم میں منظور شدہ
اردو کا علمی و ادبی ماہوار
رسالہ
ادبی دنیا
مشرق و مغرب کے جدید و قدیم ادبیات کا مرقع
مئی سنہ ۱۹۳۰ء
ڈائرکٹر۔ آنریبل جسٹس سر عبدالقادر
ایڈیٹر۔ تاجور نجیب آبادی
سالانہ چندہ چار روپے بارہ آنے

جو پروفیسر تاجور کی ایڈیٹری میں ہفتہ وار شائع ہوتا تھا۔ یکم فروری سے روزانہ کر دیا گیا ہے۔ یوں تو اسکی پالیسی ہندوستان کے تمام فرقوں کی تمدنی تعلیمی اور اقتصادی اصلاح پر مشتمل ہوگی لیکن جس خالص مقصد کو لیکر یہ روزنامہ عالم وجود میں آیا ہے وہ تعلیمی اداروں اور ان کے اراکین کے حقوق کی حفاظت ہے۔

یہ حقیقت محتاج دلیل نہیں کہ یہ علوم وفنون کا سرچشمہ ہے۔ اور تہذیب وتمدن کے وہ تمام شاندار نتائج جن سے دنیا بہرہ ور ہوتی ہے۔ صحیح تعلیم وتعلم ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مگر ملک میں ابتک اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ اس وقت جبکہ ہندوستان اپنی زندگی کے نہایت اہم اور خطرناک منازل میں سے گزر رہا ہے۔ ایک تعلیمی پرچے کی شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ اتحاد اپنا فرض سمجھتا ہے کہ ملک کے تعلیمی خادموں کی رفاہ وترقی میں کوشاں ہے۔ ان کی شکایات حکومت تک پہنچائے اور وہ تمام کوششیں بروئے کار لائے۔ جن سے ایسے وسائل و ذرائع پیدا ہوسکیں جو تعلیم کو صحیح اقتصادی اور تمدنی بنیادوں پر قائم کریں۔ "اتحاد" کوشش کرتا ہے کہ ایک طرف پڑھنے اور پڑھانے والوں کے درمیان محبت اور مودت کا رابطہ قائم کرے۔ اور دوسری طرف مدرسین اور عمال حکومت کے درمیان صحیح تعاون کی اسپرٹ پیدا کرے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ملک کا تعلیمی معیار بلند ہو۔ اگر آپ کی خواہش ہے کہ تہذیب وتمدن کے حقیقی بانی یعنی معلموں اور مدرسوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔ اور انھیں ملک وقوم کے لئے اور بھی زیادہ مفید بننے کے طریقوں کی رہنمائی کی جائے۔ اگر آپ کی تمنا ہے کہ ہندوستانی دیہات کی اصلاح ہو۔ اور معاشرتی اور اقتصادی حالت بلند کی جائے تو روزنامہ اتحاد کی اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹائیے۔ یہ انہی ضرورتوں کو مدنظر رکھکر جاری کیا گیا ہے۔ اگر ملک کے اہل علم اور تعلیمی اداروں نے ہمت افزائی کی تو ان مقاصد کے حصول میں اتحاد اپنی ساری طاقت صرف کر دے گا۔

چندہ سالانہ ۱۵عہ، ششماہی ۸ے، سہ ماہی ۴للعہ نمونہ مفت

مینجر روزنامہ "اتحاد" لاہور

رجسٹرڈ ...... ایل نمبر ۲۴۸۲ ......

فہرست مضامین

جلد ۲ | بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۳۰ء | نمبر ۵

تصاویر:- (۱) قیس عامری کا نعرۂ مستانہ (۲ و ۳) ورزش نسوانی (۴) مکہ معظمہ میں ایک شاہی دعوت ۔ (۵) محفل پروانہ (۶) حسن اور موت (۷) زہرا خانم ترکی کی ایک مشہور مصنفہ (۸) حضرت فاخر ہریانوی ۔ بی۔ اے۔

حال و قال

چشم بد دور ادبی دنیا نے دوسرے سال میں قدم رکھا ہے۔ اس کے ایک سال کے بارہ پرچوں نے آسمان شہرت کے بارہ برجوں کو تسخیر کر لیا ہے۔ ہندوستان کے آباد حصوں میں ادبی دنیا کی شہرت آفتاب کی کرنوں کے ساتھ پہنچ چکی ہے۔ نقشۂ عالم کے جن گوشوں میں اردو بولنے والے موجود ہیں ادبی دنیا قاصد وطن کی حیثیت میں اُن کے پاس پہنچ رہا ہے۔ یقیناً اس وقت ادبی دنیا کے پڑھنے والوں کی تعداد اردو زبان کے ہر ماہوار رسالے، ہر ہفتہ وار ہر سہ روزہ ؛ ورہر ایک روزانہ اخبار کے ناظرین سے بڑھی ہوئی ہے۔ اور اسی یقین کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادبی دنیا کے مستقل خریداروں اور پڑھنے والوں کی تعداد اردو ادب کے ہر پرچے کے خریداروں اور ناظرین سے زیادہ ہے۔

ادبی دنیا کا مستقبل

اردو بولنے اور پڑھنے والوں میں جو لوگ دام خرچ کر کے ادبی رسالوں کو پڑھتے ہیں۔ اُن کے ذوقِ ادبی کی تکمیل کے لئے آئندہ ادبی دنیا کی خریداری ناگزیر ہے۔ ہندوستان بھر کا ہر اسکول، ہر کالج۔ ہر لائبریری اور ہر ریڈنگ روم (دار المطالعہ) جہاں اردو پرچے خریدے جاتے ہیں آئندہ ادبی دنیا کو ضرور خریدے گا۔ اِس کے خریدنے پر مجبور ہوگا یقیناً ادبی دنیا کے بغیر اردو کی کوئی لائبریری مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ مستقبل کم از کم پچیس ہزار قدر شناسوں کی ایک جرار فوج سے ادبی دنیا کا استقبال کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

جو کچھ عرض کیا گیا کوئی افسانہ نہیں ؟ شاعرانہ اونچ نہیں۔ بلکہ منطقی طور پر ایسا ہی ہوگا اور ایسا ہی ہونا چاہئے۔ کیونکہ علم و ادب کا سب سے ضخیم رسالہ اتنا ضخیم کہ اُس کے اسّی صفحات میں عام معاصرین کے دو ڈھائی سو صفحات کے برابر مضامین سما جاتے ہیں۔ سب سے خوبصورت اور شاندار اس دعوے کی صداقت کے لئے دلیل بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی دلکش اور جامع خصوصیات میں سب سے ممتاز۔ باتصویر ایسا باتصویر کہ اس کے سال بھر کے بارہ پرچوں میں جسقدر زیادہ اور جتنی بڑی اور جیسی منتخب تصویریں شائع ہو جاتی ہیں ایک سال کے تمام اردو رسالوں کی مجموعی تصویروں کی تعداد بھی اتنی نہیں ہوتی۔ اِس کے ہر نمبر کے مضامین سے، بلند افسانوں دلکش نظموں علمی تنقیدی فلسفیانہ اور ادبی مضامین کی چھوٹی موٹی کئی کتابیں ترتیب دی جا سکتی ہیں۔ اِن خصوصیات کے باوجود قیمت سالانہ اصلی لاگت سے آدھی سے بھی کم رکھی گئی ہے۔ پھر ایسی صورت میں ادبی دنیا کو چھوڑ کر جو شخص کسی دوسرے پرچے کو خریدے گا یا تو اُسے اِس پرچے کے ساتھ کوئی مخصوص ہمدردی یا کوئی مجبوری ہوگی اور یا پھر خریدار امراض دماغی میں مبتلا ہونے کے سبب ایسا کریگا۔ اِن شاذو نادر حالات سے قطع نظر کر لی جائے تو آئندہ اردو زبان کے ادبی رسالوں کو خریدنے والوں میں سے پچانوے فی صدی ادبی دنیا کے حلقے میں آئیں گے یہ بالکل قدرتی توقع ہے اور خدا نے چاہا تو قدرت اس توقع کی تکمیل میں ہمارا ساتھ دیگی۔

ادبی دنیا کی ہر دلعزیزی

ادبی دنیا کے مستقل خریداروں اور پڑھنے والوں کے رجسٹر پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ملک کی ہر قوم ہر طبقے اور ہر سوسائٹی کے ممبر اسے زیر مطالعہ رکھتے ہیں۔ صوبوں کے گورنر وزراء۔ ریاستوں کے حکمراں عدالتوں کے جج، کونسلوں کے ممبر یونیورسٹیوں اور کالجوں کے پروفیسر، اسکولوں کے ٹیچر۔ بوریا نشین علماء۔ قومی لیڈر لڑکے، لڑکیاں، عورتیں، بوڑھے، جوان۔ ملکی، غیر ملکی۔ غرضیکہ ہر طبقے اور ہر سوسائٹی کے افراد۔ ادبی دنیا کو مستقل طور پر پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

ملک کی غریب سوسائٹی میں تو ادبی دنیا عام طور پر ہر دلعزیزی حاصل کر چکا ہے۔ اعلیٰ طبقات میں بھی اِس کی مانگ صحت اور زندگی کی مانگ کا مقابلہ کر رہی ہے۔

(۱) ہز ایکسیلنسی گورنر پنجاب نے ادبی دنیا کو ملاحظہ فرما کر اُس کے ایڈیٹر سے اس کی بابت فرمایا ہے کہ:-

ہم ادبی دنیا کو پسند کرتے ہیں۔ یہ بہت اچھا میگزین ہے اور

بہت سستا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ملک میں اِس کی مانگ بہت ہوگی"۔

(۳) آنریبل چیف جسٹس سر شادی لال قبلہ کا ارشاد ہے کہ:۔

"مجھے ورنیکولر پرچے پڑھنے کی بالکل فرصت نہیں لیکن ادبی دنیا کو پڑھنے کے واسطے کچھ وقت نکالنا پڑتا ہے۔"

(۴) اس ماہ ادبی دنیا کے خریداروں میں ایک قابل فخر اور بین الاقوامی شہرت رکھنے والے جرنل کا اضافہ ہوا ہے۔ یعنی۔ ہز ایکسیلنسی سردار محمود شاہ غازی فاتح کابل و سپہ سالار افواج دولت افغانستان۔

(۴) ملک کے ایک مشہور مذہبی رہنما جن کی روحانی عظمت کا سکہ اُن کے لاکھوں مریدوں، مریدوں نہیں بلکہ امتیوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور جو اپنی مسند خلافت سے احکام الٰہی کی تبلیغ اور مذہبی تلقین ہی کو اپنا منصب خیال فرماتے ہیں۔ ادبی دنیا اُن کی مقدس مصروفیتوں میں بھی خلل انداز ہوئے بغیر نہ رہا۔ اِس نمبر میں "ابن الفارس" کے نام سے جو ملبند و گراں مایہ مضمون شائع ہو رہا ہے انہی کے خامۂ تقدس چکاں کی تراوش ہے۔

(۵) معزز معاصر رسالہ معارف کے ایڈیٹر علامہ سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"ادبی دنیا بیحد مقبول ہو رہا ہے اور یہ اس کے لئے کافی ضمانت ہے"۔

ادبی دنیا کے متعلق ان مشاہیر مذہب و ادب، عدالت و شجاعت حکومت و سیاست کی قدر شناس رائیں اور قدر افزائیاں معلوم کرنے کے بعد خریداروں کی روزانہ ڈاک پڑھ کر صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ ادبی دنیا دنیا کے کس کس حصے کس کس طبقے اور کیسے کیسے قدردان ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے۔

ادبی دنیا کی نیرنگی اور ہمہ رنگی نے سارے ملک کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ رعیت اور حاکم، رہنما اور راہرو، اہلِ قلم اور اہلِ سیف امیر اور غریب ملکی اور غیر ملکی عورت اور مرد بچے اور بوڑھے چھوٹے اور بڑے سب کی نگاہوں سے خراج پذیرائی حاصل کر رہا ہے۔

ادبی دنیا کی ہردلعزیزی کا راز

ادبی دنیا کی اس بے مثال ہردلعزیزی اور قبولیت کے پسِ پردہ کوئی کرامت۔ روحانیت۔ جادو۔ منتر یا نظر بندی نہیں ہے کیونکہ دنیا کے لئے یہ الفاظ بے معنی ہو چکے ہیں۔ بلکہ اس قبولیت عامہ کی تہ میں ایک ہی اصول کارفرما ہے اور وہ یہ ہے کہ

"سب سے اچھا اور سب سے سستا"

لیکن کسی چیز کو آجکل سب سے سستا اور سب سے اچھا بنانے میں نپولین کا حوصلہ اور دیوانگی کی حد تک ایثار کرنا پڑتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہماری ہمت تو نپولین کے حوصلے سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ باقی رہا ایثار وہ بھی اُس دیوانگی کی حدود سے متجاوز تھا جسے امن پسند آبادی برداشت کر لیا کرتی ہے۔ اپنے مجنونانہ ایثار اور نپولیانہ حوصلے کے متعلق ہم ذیل میں اپنے دو حریفانِ کار کی شہادتیں پیش کرتے ہیں۔

(۱) مولانا نیاز فتحپوری ایڈیٹر رسالہ نگار لکھنؤ فرماتے ہیں۔

"بغیر کسی اجتماعی سرمائے کے تنہا کسی کا ایسی جرأت کر بیٹھنا اور اسقدر ایثار سے کام لینا واقعی یہ ہے کہ میری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا مگر ممکن ہے آپ کسی خاص قوت روحانی سے کام لیتے ہوں۔ یقیناً آپ نہایت بے جگری سے کام لے رہے ہیں اور قدرتاً حریفانِ کار کو ادبی دنیا کی گراں مائگی مستقبل سے سراسیمہ ہونا چاہیئے"۔

(۲) ادبی دنیا کی مثال ملنا مشکل ہے۔ واقعی ایک صاحب نے خوب کہا ہے کہ شاید تاجور صاحب ایڈیٹر ادبی دنیا کے قبضے میں کوئی غیر انسانی قوت ہے جسکی مدد سے وہ اسقدر کم قیمت پر ایسا شاندار رسالہ نکال رہے ہیں۔ رسالوں کو دلچسپ بنانے کے لئے تصویروں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ یہی راز ہے جسکی بدولت ادبی دنیا کی نظیر قریب قریب ناممکن ہوگئی ہے۔ (رسالہ مبصر لکھنؤ)

ہماری دیوانگی ایثار اور جنون ہمت کی بابت مذکورہ بالا رایوں کو پڑھکر آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ "سب سے اچھا اور سب سے سستا" کا اصول معجزہ یا کرامت اور یہ نہیں تو پھر دیوانگی قانون شکن دیوانگی چاہتا ہے معجزہ اور کرامت پیغمبروں اور خدا رسیدوں کا حصہ ہے۔ البتہ دیوانہ بننے پر کچھ صرف نہیں ہوتا۔ ہم نے یہ آخری سودا کرنا ہی اپنے لئے موزوں سمجھا اور دیوانگی اختیار کر لی ہے۔ آخر یہ دیوانگی نہیں تو کیا فرزانگی ہے؟ کہ ادبی دنیا کا ایک پرچہ جس پر ایک روپے کے قریب لاگت آتی ہے مستقل خریدار کو پونے سات آنے میں دیا جاتا ہے۔

اس ایک سال میں سلف کا ترکہ اور خلف کا ورثہ سب کچھ ادبی دنیا کے سر صدقے کر دیا ہے۔ نو ہزار روپے کا نقصان کہنے کو ایک فقرہ ہے لیکن کسی پر خدانخواستہ بیک بارگی یہ صدمہ آ پڑے تو دل کی حرکت اپنی رفتار بھول جائے۔ مگر جنون شوق اور فریب امید کا بھلا ہو کہ نقصان کا سلسلہ بھی جاری ہے اور ادبی دنیا بھی بدستور جاری ہے۔ اور خدا کے فضل سے دل کی حرکت بھی کبھی بند نہیں ہوئی۔

نازپرورد تنعم نبرد راہ بدوست ٭ عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد "تاجور"

مجنوں کا نعرۂ مستانہ

محبت کی فسوں کاری سے کلیاں مسکراتی ہیں
فضائیں جگمگاتی ہیں ہوائیں گیت گاتی ہیں

بہارِ زندگی میں جب یہ شعلہ رنگ بھرتا ہے
تو ذرہ ذرہ فرطِ بیخودی سے رقص کرتا ہے

برستی ہے محبت رنگ بن کر لالہ زاروں پر
لرزتی ہے محبت پھول بن کر شاخساروں پر

محبت نغمہ زارِ حسن کی رنگیں کہانی ہے
محبت سے فضائے دل طرب زارِ جوانی ہے

محبت دامنِ کہسار کو گلشن بناتی ہے
محبت پتھروں سے دودھ کے دریا بہاتی ہے

محبت ہاتھ میں شمشیرِ خوں آشام لیتی ہے
محبت قہرمانی طاقتوں سے کام لیتی ہے

محبت اپنی رنگیں رفعتوں پر ناز کرتی ہے
جلالِ کبریا تک یہ پری پرواز کرتی ہے

فضائیں گونجتی ہیں شورِ اعجازِ محبت سے
لرزتے ہیں دو عالم نغمۂ سازِ محبت سے

یہ شعلہ موجزن ہے میرے دل میں آرزو بن کر
رگوں میں دوڑتی پھرتی ہے یہ صہبا لہو بن کر

محبت کی لطافت سے ہے فطرت ہم نوا میری
چٹانیں ریزہ ریزہ ہوگئیں سنکر صدا میری

مری فریاد سے پھول اور غنچے تھرتھراتے ہیں
مری فریاد سے پتھر لرز کر ٹوٹ جاتے ہیں

پہاڑوں کی رگوں میں شعلہ افشاں ہے لہو میرا
گل و نسریں کی رنگینی میں لرزاں ہے لہو میرا

مرے نعرے پیامِ زندگی دیتے ہیں دنیا کو
شرابِ لالہ فامِ زندگی دیتے ہیں دنیا کو

مرے نغمے دلوں میں شمع بن کر جگمگاتے ہیں
حرم سے وہ غزالانِ حرم کو کھینچ لاتے ہیں

چلے آتے ہیں وحشی جانور آرام گاہوں سے
عیاں ہے ایک رنگ بیخودی جنکی نگاہوں سے

پلنگ و شیر و آہو جمع ہیں باغِ محبت میں
محبت کا تصرف دیکھ لو اسرارِ فطرت میں

جہاں میں ہوں وہاں قانونِ فطرت ٹوٹ جاتا ہے
یہاں وحشی درندہ آہوؤں سے خوف کھاتا ہے

یہاں ذروں میں روحِ زندگی بیدار ہوتی ہے
یہاں ہر چیز کیفِ عشق سے سرشار ہوتی ہے

عابد

ہندوستانی اور مغربی موسیقی

مسٹر لوپلے اپنی کتاب میوزک آف انڈیا میں رقمطراز ہیں کہ ان کے ایک ہندوستانی دوست نے مغربی موسیقی پر اظہار رائے کرتے ہوئے نہایت آزادی کے ساتھ کہدیا کہ "مجھے تو انگریزی گانا ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے جنگل میں گیدڑ چلا رہا ہو۔ غیر ممالک کے باشندے ہمارے راگ کو بھی ایسا ہی ناقص اور بے مصرف تصور کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہم میں سے بعض اصحاب انگریزی موسیقی میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ حق وصداقت کے جویا اپنی رائے کے اظہار میں اسقدر تعجیل سے کام نہیں لیتے اور سمجھتے ہیں کہ رائے زنی سے پیشتر اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ کہ جو گانا ہمارے کانوں کو برا معلوم ہوتا ہے یا جسے ہم محض چیخ پکار سے تعبیر کرتے ہیں وہی ہمارے مغربی بھائیوں کے لئے باعث تفریح وراحت ہے۔ اسی طرح سے بعض اہل فرنگ اسی خیال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہندوستانی موسیقی کو سمجھنے اور اس سے حظ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں ایک حد تک کامیاب ہوتے ہیں۔

کیپٹن ڈے جو ان چند اشخاص میں سے ہیں جنہوں نے ہندی راگ سے لطف اٹھانے کی کامیاب کوشش کی ہے اپنی کتاب موسومہ

میں لکھتے ہیں :-

تقریباً ہر مغربی سیاح جو ہندوستان سے واپس جاتا ہے یہ غلط خیال اپنے ساتھ لے جاتا ہے کہ اس ملک کا راگ محض شوروغل ہے جس کے لئے نہایت وحشیانہ قسم کے اشارات اور حرکات مثلاً منہ چڑاتا یا سر ہلانا بھی لازم ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اکثر صورتوں میں ان لوگوں کے تجربات رقص وموسیقی اناڑی پیشہ ور لوگوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ اور اس لئے یہ سیاح ایک ایسا غلط اندازہ قائم کر لیتے ہیں۔ جو تمام عمر ان کو ہندوستانی موسیقی سے لطف نہیں اٹھانے دیتا۔ یہ حد درجہ کی بے انصافی ہے کہ ایک ایسے فن لطیف کی نسبت جس کے سمجھنے والے خود ہندوستان میں بھی کم ہیں۔ ادنیٰ معیار کے گانے والوں کو سنکر ایسی رائے قائم کر لی جائے اور اسے ردّی یا ناقص کہکر مسترد کر دیا جائے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندوستانی گانا نہ صرف ایک فن لطیف ہے بلکہ ایک نہایت پیچیدہ اور مشکل فن ہے۔ اس کو پورے طور سے سمجھنے کے لئے ہمیں مغربی میوزک کا خیال دل سے بالکل دور کر دینا چاہیئے۔ اور پھر اس کا مطالعہ ہندوستانی نقطہ خیال سے کرنا چاہیئے۔ اور اس کی خوبیوں کا اندازہ گویئے کی لیاقت۔ گانے کے لے اور تال۔ گانے والے کی قوت حافظہ۔ سروں کے اتار چڑھاؤ اور مختلف قسم کی تانیں لگانے کی قابلیت سے کرنا چاہیئے۔ جب ہم ہندوستان کے قدیمی گیت اور بھجن (ایسے گیت جو سیکڑوں سال گزرے تصنیف ہوئے تھے) اسی طرز اور طریقہ سے۔ اسی مست کن شیرینی سے۔ اسی تال اور جھنکار سے۔ ادا ہوتے ہوئے سنتے ہیں۔ جس طرح کبھی قدیم زمانے میں گائے جاتے تھے۔ تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ گانا مشرقی کانوں کے لئے اتنا ہی خوش آئند ہوگا جتنا بلند اور گونجنے والی آوازوں کا گانا مغربی کانوں کے لئے۔ اس طرح سے ہماری حقارت تعجب اور محبت سے بدل جائیگی۔ کیونکہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مغربی موسیقی ہر روز جس قدر انسانوں کی تفریح کا موجب ہوتی ہے اس سے کئی گنا زیادہ اشخاص کی فرحت اور مسرت کا باعث ہندی راگ ہوتا ہے۔"

یہی خیال مدِ نظر رکھکر مغربی موسیقی کی طاقت کا اندازہ لگانا چاہیئے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ان "راگداری" کی چیزوں کو سمجھنا جو معمولی غزلوں اور ٹپوں سے زیادہ اعلیٰ پایہ کی موسیقی کا اظہار کرتی ہیں۔ اور ان سے لطف اٹھانا ان ہندوستانیوں کے لئے مشکل ہو جو راگ کے نشیب و فراز سے واقف نہ ہوں لیکن اگر ان کے مذاق کو سدھارا جائے۔ اور ان کو باکمال راگیوں کے سننے کا موقعہ اگر ملتا رہے تو وہ ان راگوں کو سمجھنے لگتے ہیں۔ اسی طرح سے غیر ممالک کا گانا سننے اور اس سے لطف اٹھانے کی کوشش کرنے سے انسان میں یہ قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ وہ غیر ملکی گانے سے بھی اسی قدر متاثر ہو سکے جتنا اپنے دیس کے گانے سے ہوتا ہے یہ میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں میں نے ہندوستانی اور مغربی موسیقی کا مطالعہ بہت مدت تک اور نہایت غور سے کیا

ہے اور اگرچہ مجھے انگریزی موسیقی سننے کا حسب دلخواہ موقع نہیں ملا۔ تاہم میں اس سے بہت کچھ لطف اندوز ہو لیتا ہوں۔ خاص کر یورپ کا انسٹرومنٹل میوزک (ہمارے خیال میں اس کا ترجمہ سازی موسیقی ہو سکتا ہے۔ ایڈیٹر) تو مجھے بیحد پسند ہے۔

سب سے بین فرق جو ہندوستانی اور انگریزی میوزک میں ہے۔ یہ ہے کہ مقدم الذکر میں صرف میلوڈی[1] ہوتی ہے اور موخر الذکر میں اس کے ساتھ ہارمنی بھی شامل ہوتی ہے۔ اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہارمنی کے متعلق مفصل بحث کی جا سکے۔ اس کے لئے ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے۔ تاہم مختصر طور پر میلوڈی اور ہارمنی کی تعریف نہایت ضروری ہے ورنہ انگریزی میوزک کا اہم اصول سمجھ میں نہیں آ سکیگا۔ مختصراً میلوڈی سے مراد ہے مفرد آوازوں کا سلسلہ اور ہارمنی سے مراد ہے۔ مختلف مرکب آوازوں کا ایک ہی وقت (مترنم صورت میں) پیدا ہونا۔ ہمارے تمام گانوں اور سازکی گتوں میں صرف میلوڈی ہی ہوتی ہے۔ یعنی ایک وقت میں صرف ایک سُر گایا یا بجایا جاتا ہے۔ اور اگرچہ کورس میں بہت سے اشخاص مل کر گاتے ہیں۔ مگر ان کی آوازیں بھی ایک وقت میں صرف ایک سُر نکالتی ہیں۔ برخلاف اس کے مغربی میوزک میں ایک ہی وقت میں دو تین یا زائد سُر جن کو انگریزی اصطلاح میں کورڈ کہتے ہیں۔ بجائے جاتے ہیں۔ موسیقی میں سات ابتدائی سُر مانے گئے ہیں یعنی سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔ ہمارے گانے بجانے میں ان سروں میں سے ایک وقت میں صرف ایک سُر نکالا جاتا ہے۔ اور ان سات سروں میں سے دو یا تین کو ملا کر کبھی نہیں بجایا جاتا مغربی موسیقی میں باجہ بجانے والا ایک ہی وقت میں تین یا زیادہ سُر اکٹھے بجاتا ہے۔ مثلاً باجے پر سا۔ گا۔ پا کے پردوں کو ایک ہی وقت میں دبا تا ہے۔ اسی طرح سے تمام گیت میں مرکب سُر استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ تشریح ہارمنی کا مطلب سمجھنے کے لئے کافی ہوگی۔ مگر در اصل یہ بالکل ادھوری ہے۔ کیونکہ ہارمنی کے اصول خاصے پیچیدہ ہیں۔

ہماری موسیقی کی تمام ترقی میلوڈی یا اصل گیت کی طرز کو خولصبورت بنانے کی غرض سے ہوئی ہے اور مغربی موسیقی کی زیادہ تر ترقی ہارمنی کے متعلق ہوئی ہے اور تال۔ لے۔ راگوں کی ترتیب وغیرہ کی طرف اہل یورپ نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ ہارمنی کی نسبت حکما کی مختلف رائیں ہیں۔ مثلاً روسو جو ایک مشہور فرانسیسی فلاسفر گزرا ہے کہتا ہے کہ "ہارمنی سے میلوڈی کی خولصبورتی نہیں بڑھتی۔ ڈاکٹر برنی یقین سے کہہ نہیں سکتا کہ ان دونوں میں سے کس کو ترجیح دیجائے۔ ٹارٹینی کہتا ہے کہ میوزک ہارمنی سے پیدا ہوتا ہے ایس۔ ایم۔ ٹیگور نے بھی کہا ہے کہ "ہارمنی میلوڈی کو مزین کر دیتی ہے" میرا اپنا تجربہ اور رائے یہ ہے کہ ہارمنی واقعی میلوڈی کو زیادہ خولصبورت بنا دیتی ہے مگر اس کے واسطے مذاق کو سدھانا پڑتا ہے۔ بعینہ اس طرح جس طرح دو یا تین مختلف سالنوں کو ملا کر کھانے اور اس سے لطف حاصل کرنے کے لئے عادت ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے راگ کے لئے ہارمنی اس حد تک موزوں نہیں ہے جتنی کہ مغربی راگ کے لئے۔ اور ہمارے وہ گانے جن میں گلے بازی زیادہ کی جاتی ہے۔ ہارمنی کے لئے بالکل ناموزوں ہیں۔ مگر دھرپد۔ خیال۔ بھجن غرضیکہ جو گانے وزن دار ہوتے ہیں ان کے ساتھ ہارمنی عمدہ طور سے شامل ہو سکتی ہے۔

یہاں اتنا جتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ ہارمنی سے گانے والے کے لئے کوئی وقت پیدا نہیں ہوتی لیکن باجہ بجانے والے کو بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کے بجانے کی رفتار بھی اسقدر تیز نہیں رہ سکتی۔ پیانو اور آرگن کے استادوں کو بدیں وجہ ہارمنی کی طرف زیادہ توجہ دینی پڑی جس کا اثر یہ ہوا کہ انہوں نے ساری دماغی طاقت ہارمنی کو ترقی دینے میں صرف کر دی اور اصل چیز یعنی میلوڈی کی آرائش و زیبائش کا خیال فراموش کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پیانو وغیرہ کا بجانا بہت پیچیدہ ہو گیا ہے لیکن گانا نسبتاً بالکل سادہ رہ گیا ہے۔ برخلاف اس کے ہمارا گانا بجانا بالکل یکساں ہے اور ہارمنی کی پیچیدگیوں میں نہ پڑنے سے ہمارا راگ زمزمہ۔ تان پلٹہ اور گمک کے دیگر اقسام سے بہت مزین ہو گیا ہے۔ اہل مغرب کے لئے تان پلٹا نکالنا مشکل ہے۔ اور اگر وہ کوشش کریں بھی تو بے سود ہے کیونکہ باجہ والے ان کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ وہ ہارمنی کے پھندوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔

ہندوستانی موسیقی میں راگوں کی جو با اصول اور باقاعدہ تقسیم

---

[1] ہماری نظر میں میلوڈی کے لئے ترنم اور ہارمنی کے لئے "متطابق مترنم" کے الفاظ کا استعمال جائز ہے۔ ایڈیٹر

ہے خواہ وہ پرانے نظام کے مطابق ہو۔ خواہ نئے کے موافق۔ وہ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ہندوستان کے ماہرینِ موسیقی کو کوشش یہی رہی ہے کہ اس فن کو ایک سائنس کی طرح مرتب کردیں۔ برخلاف اس کے مغربی میوزک میں راگوں کی باقاعدہ تقسیم نہیں ہے۔ بلکہ لفظ راگ کا مترادف کوئی لفظ اس میں ہے ہی نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ان کے تال نہایت سیدھے اور آسان ہوتے ہیں اور مغرب میں موسیقی کی یہ شاخ بالکل عالمِ طفلی میں ہے۔ تاہم اس سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ مغربی میوزک میں تاثیر نہیں۔

ہندوستانی موسیقی میں گمک کو بہت جگہ دیجاتی ہے۔ مغرب میں اس کے صرف دو تین اقسام مروج ہیں۔ اور وہ بھی زیادہ تر تار والے سازوں مثلاً وایولن میں۔ پیانو میں کہیں کہیں زمزمہ لگاتے ہیں مگر شاذ۔ اور میںڈ جو ہمارے گانے میں بہت عام ہے۔ اور جس سے سروں کی سرتیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ مغربی موسیقی میں بہت کم ہے۔ مغربی موسیقی میں آواز کی نزاکت۔ لوچ۔ شیرینی کی بہت قدر کی جاتی ہے۔

ہندوستان میں بھی اس کی قدر ضرور ہوتی ہے لیکن محض آواز کی خوبصورتی، گانے والے کی لیاقت کا سرٹیفکٹ نہیں سمجھی جاتی۔ جیسا کہ یورپ میں ہے۔ بلکہ اگر ایک باکمال گویا راگ۔ تال۔ سُر سے خوب واقف ہو۔ لے کاری جانتا ہو۔ تو۔ گو اس کی آواز چنداں رسیلی نہ بھی ہو اس کو استاد مانا جاتا ہے۔ یورپ میں ایسے شخص کی قدر نہیں ہوسکتی۔

سر رابندرا ناتھ ٹیگور نے انگریزی اور ہندی موسیقی کا مقابلہ اس طرح کیا ہے وہ کہتے ہیں:۔

جب مجھے اول اول انگریزی گانا سننے کا اتفاق ہوا تو یہ میرے کانوں کو بہت برا معلوم ہوا۔ میڈم ایلبینی کا گانا سنا تھا جس میں وہ بلبل کی آواز کی نقل اتارنے کی یہ ایک طفلانہ کوشش تھی۔ اور میں اس سے محظوظ نہیں ہوا۔ مجھ سے سوال کیا گیا کہ بلبل کے ترانہ سے ایک ہندوستانی آرٹسٹ موسیقی کا کیا سبق حاصل کریگا۔ میں نے جواب دیا وہ ظاہریات سے گزر کر اس میں روح کا مشاہدہ کریگا۔ وہ اس سے متاثر ہو کر اسی طرح ترنم ریز ہوگا جس طرح کیٹس شاعر جس نے بلبل کو سن کر اپنی مشہور نظم (اوڈ) لکھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی موسیقی زندگی کے روزانہ واقعات کی نسبت مذہب سے زیادہ تعلق رکھتی ہے۔ ہمارے لئے موسیقی عالم بالا کا ایک منظر ہے۔ یہ فن انسان کی توجہ دنیاوی کاروبار سے ہٹا کر روحانیت کی طرف مائل کردیتا ہے۔ اس کے ذریعے سے انسان ان تعلقات سے جو روح کو آئندہ زندگی کے ساتھ ہیں آشنا ہوجاتا ہے۔ مغربی موسیقی روز روشن کی طرح ہے جس میں مختلف قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں بعض ایک دوسرے سے باہمی کے تعلق سے وابستہ ہوتی ہیں۔ بعض شور و غل کا باعث ہوتی ہیں۔ ہمارا راگ رات کی طرح ہے۔ دونوں ہم کو متاثر کرتے ہیں لیکن ان کی حقیقت ایک دوسرے سے متضاد ہے۔ قدرت اصل میں دو حصوں میں منقسم ہے۔ دن اور رات۔ کثرت اور وحدت۔ محدود اور غیر محدود۔ ہم اہل ہند رات کے عالم میں رہتے ہیں۔ ہم پر وحدت کا غلبہ ہوتا ہے۔ ہمارا راگ سامع کو فانی دنیاوی خوشیوں اور کاوشوں سے آزاد کر کے روحانی دنیا کی سیر کراتا ہے۔ مغربی راگ انسانی رنج و راحت کے انتہائی نشیب و فراز کی طرف رہبری کرتا ہے۔

مسز رین لکھتی ہیں:۔ مغربی میوزک خدا کی مخلوقات کے عجائبات دکھاتا ہے۔ مشرقی میوزک بتاتا ہے کہ خدا انسان اور مخلوقات میں پوشیدہ ہے۔

ایک اور شخص بہت عمدہ مثال سے مشرقی اور مغربی میوزک کا فرق سمجھاتا ہے:۔

"ہندوستانی دسترخوان جس میں انواع اقسام کے کھانے مختلف رنگ اور مزہ کے چُنے ہوتے ہیں۔ یورپین مذاق کے لوگوں کو گھبراہٹ میں مبتلا کردیتا ہے جو ایک وقت میں صرف ایک چیز کو کھانا پسند کرتے ہیں۔ اسی طرح مغربی میوزک میں مختلف سروں کا اکٹھا بجنا ہندوستانی کانوں کے لئے باعث پریشانی ہوتا ہے۔ جو گیت کے اصلی سروں (یعنی میلوڈی) کو سننے اور انہیں کو مختلف طریقوں سے مزین کرنے کے عادی ہیں۔"

لیکن اس سوال سے قطع نظر کر کے ہمیں کوشش کرنی چاہئے۔ کہ اپنے مذاق کی اس طرح تربیت کریں کہ مغربی راگ سے بھی لطف اٹھا سکیں اور اس کی خوبیوں کو سمجھ سکیں۔ اس سے ہماری خوشی کے ذرائع بڑھ جائیں گے۔ ہم کو خوشی حاصل کرنے کے لئے صرف ہندوستانی راگ ہی تلاش نہیں کرنا پڑیگا بلکہ جہاں انگریزی گانا ہو رہا ہوگا وہاں بھی ہماری فرحت کا سامان مہیا ہوگا۔ شاید اس کے لئے کچھ محنت درکار ہوگی۔ لیکن اس محنت اور کوشش کا جو نتیجہ فرحت و انبساط کی شکل میں ہمیں حاصل ہوگا وہ اس کا پورا معاوضہ ہوگا۔

ان مغربی نقادوں کے اعتراض کے جواب میں جو ہندوستانی

موسیقی سے واقفیت نہ رکھنے کے باعث یہ کہتے ہیں کہ ہندوستانی
راگ نے ابھی ترقی کے زینہ پر قدم نہیں رکھا کیونکہ (۱) اس میں محض
میلوڈی ہی ہے اور ہارمنی بالکل مفقود ہے۔ (۲) اس میں ہر شخص کے
گانے کا طریق جدا گانہ ہے اور کسی گانے کی کوئی خاص طرز مقرر نہیں
ہے۔ میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان باتوں سے ہندوستانی گانے
کی خوبی پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ بلکہ یہ اس فن کی وسعت کا اعتراف
ہے جو استاد انیس قسم کی گمک کا استعمال کرسکتے تھے حالانکہ
مغربی میوزک میں اس کے مقابلے میں صرف دو یا تین قسمیں گمک کی
ہیں۔ جو باکمال اہل فن سو سے زیادہ تانیں استعمال کرسکتے تھے حالانکہ
یورپ میں صرف پانچ چھ سادہ تانیں مستعمل ہیں۔ جو لوگ راگ کو ایسے
سائنٹیفک اصولوں پر ترتیب دے سکتے تھے اور ایسا باقاعدہ نظام
مقرر کرسکتے تھے۔ جس کی مثال مغربی میوزک میں نہیں ملتی۔ جو لوگ
وادی سموادی۔ انوادی سروں کی ماہیت کما حقہ پہچانتے تھے۔ کیا
ان کے لئے یہ مشکل تھا کہ ہارمنی بھی اپنے گانے میں شامل کرتے
ہرگز نہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے گانے کو ان قیود کی پابندی سے
آزاد رکھنا مناسب سمجھا تاکہ گانے والا اپنی شخصیت کا اظہار بآسانی
کرسکے۔ اور گانا بجائے محض ایک میکینیکل (مشین کی طرح کا) آرٹ ہونے
کے جیسا کہ وہ یورپ میں ہے گانے والے کے جذبات اور
احساسات کے اظہار کا ذریعہ بن سکے۔ یورپ میں پیانولا اور آٹو پیانو
وغیرہ کے ذریعے سے کاغذ کے ایک رول کی مدد سے لائق سے
لائق استادوں کا میوزک صحیح طور پر خود بخود بج سکتا ہے جس سے
ظاہر ہوتا ہے کہ ایک باکمال استاد کے بجانے اور ایک لکڑی اور
لوہے کی مشین کے ذریعے ادا کرنے میں کچھ فرق نہیں۔ دماغ
کا وجود اور عدم وجود مغربی میوزک کو صحیح طور پر ادا کرنے میں یکساں ہے
کیا ہندوستانی راگ بھی اس مشین کے ذریعے سے ادا ہوسکتا ہے؟
ناممکن ہے۔

مگر جہاں ہمارا فن غنا ایک لحاظ سے معراج کمال پر پہنچ چکا ہے۔
بعض لحاظ سے اس میں کچھ خامیاں بھی ہیں جن کی اصلاح ہمارے لئے
بہت ضروری ہے۔ ہمارے میوزک میں جس چیز کی کمی سب سے
زیادہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ انسٹرومنٹل میوزک (ساز کی موسیقی)
ہے۔ ہم اس شے کے مبادیات سے ناواقف ہیں۔ یہ ایک مسلمہ امر
ہے۔ اول تو سوائے نغمہ یا گت یا سرگم کے اور کوئی چیز غالباً ایسی ہی
نہیں جس میں صرف باجہ بغیر گانے کے بجایا جاتا ہو۔ اور اگر کوئی شخص
باجے وغیرہ میں گت یا نغمہ بجائے بھی تو عموماً سننے والوں کا مذاق اس
قدر ناقص ہوتا ہے کہ انہیں اس میں لطف ہی نہیں آتا۔ یہ کہکر کہ "جناب
اس کے ساتھ کچھ زبان سے بھی فرمائیے"۔ وہ ظاہر کرتے ہیں کہ موسیقی
سے انہیں چنداں انس نہیں ہے اور جس چیز سے وہ لطف حاصل کرنا
چاہتے ہیں وہ صرف شاعری ہے۔ برعکس اس کے یورپ میں مارچ
ڈانس۔ والز۔ وغیرہ بیشمار ایسی چیزیں ہیں جن میں محض ساز ہی بجائے
جاتے ہیں۔ اور گانا نہیں ہوتا۔ اور اس قسم کے میوزک سے وہاں
کے لوگ بیحد متاثر ہوتے ہیں۔ انسٹرومنٹل میوزک میں ہم لوگ اہل
یورپ سے بہت پیچھے ہیں۔ اور فخریہ خیالات کو ایک طرف رکھ کر
ہماری یہ کوشش ہونی چاہئے کہ فن موسیقی کے اس شعبہ میں بھی
ترقی کریں۔ جو لوگ موسیقی کا لطف اٹھانے کے لئے
الفاظ کے محتاج ہیں وہ گویا الفاظ کا لطف اٹھاتے ہیں موسیقی کا ہونا
نہ ہونا ان کے لئے برابر ہے۔

بسا اوقات ایسا اتفاق ہوا ہے کہ میرے بعض انگریز دوستوں
نے ہندوستانی سازوں کے گراموفون ریکرڈ خریدنے کی خواہش
ظاہر کی اور مجھ سے دریافت کیا کہ کون کون سے ریکرڈ اچھے ہیں مجھے
خوب معلوم تھا کہ اس لحاظ سے ہمارا ملک بہت غریب ہے اور اس
بات کے احساس نے مجھے بہت شرمندہ کیا۔ گراموفون ریکرڈس
کی فہرست دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ سوائے چند شہنائی کے دو چار
ہارمونیم اور چند ایک ستار کے ریکرڈس کے اور کوئی انسٹرومنٹل میوزک
کا ریکرڈ ملتی نہیں ہے۔ برخلاف اس کے انگریزی انسٹرومنٹل ریکرڈس
کی فہرست ملاحظہ فرمائیے کس قدر شاندار ہے۔ یورپ پیڈریوسکی کو
صرف چند گھنٹے خالی پیانو بجانے کے لئے پانچ پانچ سو پونڈ فی
شب دے سکتا ہے۔ کرائسلر اور کیوبلک، کو وائولن پر ایک گت
سنانے کے عوض ڈیڑھ ڈیڑھ سو پونڈ مل سکتا ہے۔ مگر ہندوستان میں
کونسا ہارمونیم ماسٹر یا ستار نواز ہے جو خالی باجہ یا ستار سنا کر پچاس روپیہ
فی شب بھی حاصل کرسکے۔

خیر انسٹرومنٹل میوزک کو جانے دیجئے۔ ذرا اپنے گیتوں کی طرف
توجہ فرمائیے۔ ان کی نسبت تو ہم نہایت فخریہ انداز سے یہ کہنے کے عادی
ہیں کہ ہمارے گیتوں کی دلکشی کی برابری دنیا کی کسی قسم کے گیت نہیں
کرسکتے۔ یاد رہے کہ یہی الفاظ اہل چین اپنی "آسمانی موسیقی" کی نسبت
اور اہل حبش اپنے گانوں کے متعلق استعمال کرتے ہیں مگر کہنے اور
ثابت کرنے میں فرق ہے۔ ذرا غور سے دیکھئے کہ ہمارے گیت

کس لحاظ سے انگریزی گیتوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ گیت کی طرز یا دُھن سے قطع نظر کہ وہ ہر ملک میں جدا ہے، اور ہر ایک کو اپنی طرز پسند ہے۔ گیتوں کے مضامین۔ بناوٹ۔ شعریت پر غور کیجئے۔ اردو میں سوائے عشقیہ غزلیات۔ حسن و عشق کی کیفیات۔ زلف و رخ کی تشبیہات کے اور کیا رکھا ہے۔ ٹھیٹر کی طرف جائیے تو اکثر تھیٹریکل گانے ردیف قافیہ سے معرا۔ وزن بحر سے خالی۔ مضمون کی لطافت سے محروم۔ صرف چند طرزیں جو حشر یا احسن یا طالب بنارسی یا بیتاب کی تصنیف کردہ ہیں۔ ان عیوب سے پاک ہوں تو ہوں ورنہ باقی طرزیں محض خس و خاشاک اور دوسری قوموں کی نگاہوں سے چھپا دینے کے لائق ہیں۔

مانا کہ اردو شاعری ابھی عالم طفلی میں ہے۔ اچھا ہندی کو لیجئے۔ یہ تو نسبتاً پرانی زبان ہے اور گیتوں کے لئے موزوں بھی ہے۔ اس میں تو اعلیٰ مضامین۔ عمدہ خیالات ہونے چاہئے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ وہاں حالت اور بھی بدتر ہے۔ اردو غزلیات میں کم از کم وزن یا بحر یا قافیہ ٹھیک ہوتا ہے۔ ٹھمریوں میں اکثر اوقات یہ باتیں بھی مفقود ہوتی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے مصنف عموماً علم ادب سے ناآشنا۔ قواعد عروض سے بے بہرہ۔ صرف راگ کے ماہر تھے۔ اپنے خیالات کو صحیح الفاظ میں ادا کرنے سے قاصر تھے۔ بھونڈے الفاظ میں بلا وزن بحر دو چار تک ملا کر ان کو کھینچ تان کر تال میں پورا کر دیا۔ اور بس جب ہم اپنی ٹھمریوں کے پٹے پٹائے افتادہ مضامین۔ کاہن اور گوپیوں یا ساس نند کے پرانے قصوں اور اپنی غزلیات کے عشقیہ مضامین کو انگریزی نظموں کی دلچسپ رنگا رنگی ان کے خیالات کی جدت اور وسعت۔ ان کے قومی ترانوں اور گیتوں کے پر جوش مضامین۔ ان کی نیچرل شاعری۔ اور ان کے شستہ مذاق کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں تو ماننا پڑتا ہے کہ اس میدان میں بھی ہم لوگ بہت پیچھے ہیں۔

پس ہماری موسیقی میں بہت سی اصلاحوں کی ضرورت ہے۔

پہلی اصلاح جو ضروری ہے یہ ہے:۔

راگ کو تعلیم یافتہ سوسائٹی میں رواج دیا جائے تاکہ اچھے دماغ والے اصحاب اس کی ترقی میں حصہ لیں۔ اور اس کو اس گری ہوئی حالت سے جس میں وہ آجکل ہے نکال کر معراج کمال پر پہنچا دیں۔ ہمارا فخر محض لفاظی نہ رہے بلکہ اس کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ اور غیر ممالک پر ثابت کیا جائے کہ ہندوستانی موسیقی غیر مہذب اور وحشیانہ نہیں ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کو فضول بندشوں سے آزاد کیا جائے۔ دقیانوسی خیالات کو خیرباد کہا جائے اور اس میں جدت کی روح پھونکی جائے۔

دوسری اصلاح جو اس مقصد کے لئے ضروری ہے بلند پایہ نظموں کی آفرینش ہے۔ پرانے زمانے میں عموماً گانے والا خود ہی شاعر بھی بننے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک ہی شخص کے لئے دو فنوں میں صاحب کمال ہونا مشکل ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ گانے شعریت کے لحاظ سے ناقص رہ گئے۔ ماہرین فن جانتے ہیں کہ گانے کے لحاظ سے غزل نہایت ناموزوں چیز ہے کیونکہ اس میں اہل فن کو اپنا کمال دکھانے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ شاعروں کو چاہئے کہ غزل گوئی چھوڑ کر دھرپدوں۔ ٹھمریوں کی طرز پر ایسے گیت بنائیں جو علم عروض اور مضامین دونو کے لحاظ سے قابلقدر ہوں۔ شاعروں اور راگیوں کو مل کر ہمارے فن موسیقی کو ترقی دینے کی کوشش کرنا چاہئے۔

تیسری اصلاح جو نہایت ضروری ہے وہ نوٹیشن[1] کا رواج دینا ہے۔ نوٹیشن کے ذریعے سے گانا بجانا سکھانا اور تمام عمدہ گیتوں اور طرزوں کو نوٹیشن میں تحریر کر کے شائع کرنا۔ یہ بات ہمارے موسیقی کی بقا کے لئے اشد ضروری ہے۔ اس کے نہ ہونے کی وجہ سے ہزاروں قابلقدر گیت معدوم ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ کل جو طرزیں اور گانے زبان زد خاص و عام تھے۔ آج وہ کہاں ہیں آج جو طرزیں مشہور و مروج ہیں کل ان کا پتہ بھی نہیں رہیگا۔ یہی ایک بڑی وجہ ہمارے گیتوں کی قلت کی ہے۔ اور یہ ہمارے راگیوں کی تنگدلی اور بخل کا کرشمہ ہے۔ نوٹیشن کے نہ ہونے سے نہ صرف گانے زمانے سے مفقود ہو رہے ہیں بلکہ طالبان فن کو بہت مشکل ہوتی ہے اور بہت وقت ضائع کرنا پڑتا ہے۔ جو گانا نوٹیشن کے ذریعے سے ایک گھنٹے میں یاد ہو سکتا ہے وہ زبانی سکھانے سے ایک دن میں بھی درست طور پر نہیں آسکتا۔ پس ضرورت ہے ہر بڑے شہر میں ایک ایسی ایسوسی ایشن قائم کرنے کی جو مندرجہ بالا مقاصد کو مدنظر رکھ کر رفاہ عام کے لئے کام کرے۔ اور ذاتی اغراض سے احتراز کر کے قومی مفاد اور بہتری کے لئے کوشش کرے۔

چوتھی اصلاح طبلہ کے استعمال کے متعلق ہے۔ طبلہ بجانے والے عموماً اپنے ساز کو تمام دیگر سازوں حتیٰ کہ خود گانے والے

---

[1] گیت کے الفاظ کے نیچے سرگم کی سروں کے نام لکھنا

کی آواز سے بھی زیادہ اہم سمجھنے لگتے ہیں اور اس زور سے ہاتھ مارتے ہیں کہ دوسرے سازوں کی اور گویّے کی آواز طبلہ کی آواز میں دب جاتی ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ طبلہ صرف تال اور لے کو قائم رکھنے کی غرض سے بنایا گیا ہے۔ یہ آلۂ موسیقی ہے۔ آلۂ حرب نہیں کہ جس سے سامعین پر گولہ باری شروع کر دی جائے۔ اور ان کے کانوں کی دیواروں کو شکستہ کیا جائے۔ اگر ہم موسیقی کو واقعی ترقی دینا چاہتے ہیں تو اس غلطی کو بہت جلد رفع کرنا چاہئے۔ نہ صرف اس لئے کہ یورپ اور امریکہ کی شائستہ اقوام جن کا مذاق تمام فنون لطیفہ کے متعلق نہایت سلجھا ہوا واقع ہوا ہے۔ اسی غلطی کی وجہ سے ہمارے موسیقی کو سرے سے وحشیانہ خیال کرنے لگتے ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ خود ہمارے ملک میں ذوق سلیم رکھنے والے اصحاب اس بات کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

کتاب پیپلز آف آل نیشنز کی جلد سوئم میں مسٹر ولیمنسٹن کا رل نے ہندوستانی موسیقی کی نسبت جو الفاظ لکھے ہیں وہ قابل ملاحظہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

موسیقی کے متعلق ہندوستانی مذاق نہایت عجیب سا واقع ہوا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جو توجہ اس کو سمجھنے میں دیگر ممالک کے لوگوں نے دی ہے یہ اس سے زیادہ توجہ کے لائق ہے۔ بڑے بڑے اور بھیانک شکل کے ساز نہایت ناقص مصالحہ سے تیار کئے جاتے ہیں۔ ان آلات میں زیادہ تر ڈھول استعمال ہوتے ہیں۔ سازندے نہایت متانت سے اپنے ساز شروع کرتے ہیں۔ اور ان سے بلند آواز نکالنے کی ان تھک کوشش کرتے ہیں۔

کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ ہمارا ڈھول اور سخت لکڑی کے ڈنکے انگریزی ڈرم اور بانات سے منڈھے ہوئے ڈنکوں کے مقابلہ میں نہ صرف شکل و صورت میں بلکہ آواز میں بھی ایک وحشیانہ نظارہ پیش کرتے ہیں۔ جبھی تو کہتے ہیں کہ دور کے ڈھول سہاونے۔ گویا ہم خود مانتے ہیں کہ ہمارے ڈھولوں کی آواز ناخوشگوار ہے۔ اسی طرح سے ہمارے شوخ اور کرخت آواز والے صندوقچی نما ہارمونیم جو ہمارے میوزک میں موجودہ زمانے میں اہم حصہ لیتے ہیں۔ اور جن کی آواز کو اکثر تعلیم یافتہ اصحاب بھی ناواقفیت کی وجہ سے پسند کرتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے شیریں آواز آرگنوں کے سامنے محض ایک مضحکہ خیز کھلونا ہیں۔ یہ تو خیر یورپین ساز کی نقل ہے۔ ہمارے اپنے دیسی ساز ابھی تک اُسی ابتدائی شکل میں ہیں جس میں آج سے دو ہزار برس قبل موجد نے انہیں ڈھالا تھا۔ مغربی سازوں میں ہر روز نئی نئی اختراعیں ہوتی رہتی ہیں۔ اور دن بدن ان کو شیریں زیادہ دلکش بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ غرض کہ موسیقی کے ہر شعبہ میں ہم اہل مغرب کی فوقیت کے معترف ہونے پر مجبور ہیں۔ علاوہ ازیں پیچیدہ اور آڑی تالوں کا استعمال اور حد سے زیادہ لے کاری کا شوق کم کر دینا چاہئے۔ تال کا پیچیدہ ہونا راگ اور دھن کو کسی طرح سے بھی خوبصورت نہیں بناتا۔ یہ طبلہ کی جمناسٹک ہے اور گو جمناسٹک ناظرین کے لئے ایک قسم کے لطف کا باعث ہو سکتی ہے۔ لیکن جمناسٹک انسانی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری نہیں ہے معمولی ورزش اس غرض کے لئے بہتر اور زیادہ مفید ہے۔ اسی طرح سے موسیقی کی صحت اور خوبصورتی کے لئے معمولی سادہ تالوں کی ورزش پیچیدہ تالوں اور لے کاری کی جمناسٹک سے زیادہ مناسب اور ضروری ہے۔

اور سب سے آخری اصلاح ہارمنی کے متعلق ہے۔ ہمارے موجودہ گیتوں کو ہارمنی کی چنداں ضرورت نہیں۔ لیکن جب ہمارے ذخیرہ میں قومی ترانے موجود ہو جائیں۔ جب مارچ اور ڈانس ہمارے موسیقی میں حصہ لینے لگیں تو ہارمنی کی ضرورت ہم کو محسوس ہوگی۔ ایک مجمع کے خیالات کو۔ ایک فوج کے مارچ کو۔ ایک بال روم کے ڈانس کو۔ ایک بھجن منڈلی کی مناجات کو جس عمدگی کے ساتھ ہارمنی ظاہر کر سکتی ہے خالی میلوڈی میں اتنی طاقت نہیں۔

پس ہمیں چاہیئے کہ تعصب اور بیجا فخر کو بالائے طاق رکھ کر اپنے نقائص پر غور کریں اور اوروں کی خوبیوں کو دیکھیں اور اگر کسی میں کوئی چیز قابل تقلید ہو تو باقی باتوں کو چھوڑ کر اس سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

محمد افضل خاں

بی۔ سی۔ ایس

ڈارون کے جدِ امجد اور ایک انسان کی گفتگو

(ایک تخیلی مکالمہ)

میں نے کہا "ہیو - میرے مستعار بندر! جب تنہائی میں انسان شراب لالہ فام کے کیف رنگیں سے متاثر ہوتا ہے تو اس کے دل میں ایک ہی طرح کے جذبات و احساسات پیدا ہوتے ہیں - جذبات کی شدت میں شاید کوئی فرق ہو ورنہ نوعیت میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہم ایسا محسوس کرتے ہیں کہ روزمرہ کی تمام تکالیف دبے پاؤں ہٹ گئی ہیں - خاموشی سے ہمیں چھوڑ کر کسی تنہا گوشے میں پوشیدہ ہو گئی ہیں - اور ہم مسرور و حیران ہو کر دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کیا شے ہے جس نے تکالیف کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے -

دکھ بھری دنیا کے میدان جنگ ہیں - اس میدان جنگ میں جو از سر نو سبزہ زار بنگیا ہے - امید کا کرم گستر فرشتہ اپنے سنہری پر پھیلائے ہوئے نمودار ہوتا ہے - یہ فرشتہ ہمیں اندھا کئے بغیر مستقبل کے حسین و رنگیں امکانات کو یقین کا رتبہ بخشتا ہے - اور پھر غیر محسوس طور پر ہم اپنے آپ کو اپنی آرزوں کی آخری منزل کے قریب پاتے ہیں - لیکن ہیو - عین اسوقت جب منزل اپنی تمام درخشانی کے ساتھ نظر افروز ہوتی ہے - یکایک کرب و اندوہ کا احساس ہمارے دل پر درد و غم کا ایک بادل بن کر چھا جاتا ہے - اور منزل جادہ منزل ثابت ہوتی ہے - ہمارے دل میں مستقل طور پر . . . . "

ہیو نے دخل در معقولات دیتے ہوئے کہا "تو آپ یہ نہیں چاہتے کہ اس منزل تک پہنچ جائیں؟"

میں نے تلخی سے کہا "خاموش! دخل در معقولات دینا بہت بری عادت ہے - اور تمہیں حتی الامکان اس سے پرہیز کرنا چاہئے - اچھا تو ہیو - اب ہمارا فرض ہے کہ اس لطیف و نازک راز کو دریافت کریں جو شراب کے اثر سے متعلق ہے - آخر کچھ معلوم تو ہو کہ وہ کیف جو دل کو ایک مسرت میں غرق کر دیتا ہے کس شے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے!"

ہیو! یہ کیف ہمارے جام کی تہ میں نکلتا ہے اور ایک ایسی حسین و جمیل نازنین کی صورت اختیار کر لیتا ہے - جس کا حسن دل افروز جام کے سنہرے آئینے میں عکس افگن ہے -

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

ہیو نے کہا "ازراہ نوازش شعر نہ پڑھئے -"

میں نے جواب دیا "مجھے افسوس ہے - ہیو کہ میں نے تمہارا دل دکھایا ہے - اشعار کا یوں ہی خیال آجاتا ہے - بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہوتے ہیں کہ کائنات کے حقائق صرف شعر ہی کے ذریعے ادا کئے جا سکتے ہیں -

اچھا تو ہیو - اس نازنین کا حسن جو سنہری جام کی تہ میں سے ایک موج برق کی طرح نمودار ہوتی ہے - بے مثال ہوتا ہے - اب کہ اسے کسی دوسری عورت کے حسن سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی - اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے دل کو سکون و اطمینان - سے لبریز کر دیتی ہے - اس کی آنکھوں میں امٹ زندگی کے شعلے چمکتے ہیں اور اس کی نگاہیں فانی انسانوں کو پیغام خواب دیتی ہیں - عین اس طرح جس طرح بہار کی شگفتہ راتوں میں یاسمن کی خوشبو کا ایک طوفان لالہ زاروں میں رقص کرتا ہے - مدبھری نیند میں رنگیں و حسین نقابوں کا ایک سیلاب رواں ہو جاتا ہے - یہ رنگیں نقاب ہماری آنکھوں کو ڈھانک لیتے ہیں - اور ہم گہری اور میٹھی نیند میں محو ہو جاتے ہیں -

بندر نے ہونٹ چاٹتے ہوئے کہا "ایک ساغر مجھے بھی عنایت فرمائیے -"

میں نے اسے ایک جام بھر کر دیا وہ شوق کی نظروں سے ساغر کی طرف دیکھتا رہا اور پھر ایکبارگی غٹاغٹ چڑھا گیا -

کچھ عرصے کے لئے خاموشی طاری ہو گئی - ت کی مدھم آوازیں

زمین کی گردش کی پُراسرار اور لطیف سرگوشی خاموشی کے اس طلسم حیرت میں بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔

ہیبو نے اپنا ہاتھ اپنی چھاتی پر رکھ لیا۔ پھر بولا:۔

"مجھے دق کا عارضہ ہے۔ اور میری زندگی کے دن گنے ہوئے ہیں۔ اجازت دیجئے کہ میں آپ کو جنگل کے متعلق کچھ سناؤں میں اختصار سے کام لونگا کیونکہ جنگل اسقدر خوبصورت ہیں کہ الفاظ ان کی خوبصورتی کی تعریف نہیں کر سکتے۔ آپ یہ نہ سمجھئے کہ مجھے اپنی بیماری سے کوئی تکلیف ہوتی ہے۔ صرف وہ لوگ جسمانی تکلیفوں سے گھبراتے ہیں۔ جن کے دل کمزور ہیں۔ جن کے حوصلے پست ہیں جسمانی کمزوری اور تکلیف کا مقابلہ تبسم کرنا چاہیئے۔

میں نے کہا "ہیبو۔ تمہاری دانشمندی کی گفتگو نے مجھے متحیر کر دیا ہے۔"

ہیبو نے جواب دیا "تو آپ بہت مغرور اور خودستا ہونگے کہ آپکو میری زبانی یہ باتیں سنکر اسقدر تعجب ہوا۔ تم لوگوں نے۔ انسانوں نے یہ بات فراموش کر دی ہے کہ خالق کائنات اپنی تخلیقات میں پوشیدہ ہے۔ تم لوگ اپنے آپ کو اسقدر عظیم تصور کرتے ہو کہ کسی دوسری مخلوق کی عظمت تمہارے ذہن میں سما ہی نہیں سکتی۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم تمام ایک ہی منزل کے مسافر ہیں۔ ہمارا راستہ بھی ایک ہی ہے۔ اگر ہم میں اتنی سمجھ ہوتی کہ ہم وقت کو سمجھ سکیں: ماضی اور مستقبل کی گتھیوں کو سلجھائیں تو یقیناً ہم زیادہ باادب، متقی اور منکسر المزاج ہوتے۔ ایک جام اور عنایت فرمائیے!

میں نے اسے ایک ساغر اور دیا۔ دفور مسرت سے آنکھیں بند کر کے وہ دوسرا جام بھی چڑھا گیا۔

اس کے بعد اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ تمام نیک بندے جانوروں کے طرزِ عمل کا مطالعہ کرنا پسند کرتے ہیں۔ اس مطالعے کی وجہ سے ان کے دل میں نسل انسانی کی تکمیل کا یقین پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ کسی دن انسان اپنے تمام ارتقائی مدارج طے کر لینے کے بعد مکمل ہو جائیگا۔ تم لوگوں میں سے کچھ حضرات اپنے علم و ذوق کے اعتبار سے ذرا ترقی یافتہ ہیں چنانچہ انہوں نے پودوں کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے اور ان کی خصوصیات کے مداح ہو گئے ہیں۔ لیکن وہ دن کب آئیگا جب تم لوگ پتھروں کی زندگی کا مطالعہ شروع کروگے؟ انسانوں میں صبر و ضبط کا مادہ بالکل نہیں رہا۔ میں تم لوگوں کے مکانوں اور کوٹھیوں سے خوب واقف ہوں۔ میں نے ان جہازوں میں بیٹھکر ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کیا ہے۔ جن کے عرشے سے کنارے کے گنجان جنگل نیلے بادلوں کی طرح نظر آتے تھے۔ میں نے کئی بار گاڑی کا سفر کیا ہے میں ان تمام چیزوں سے واقف ہوں جن پر انسان کو غرور ہے۔ انہیں انسانوں سے مجھے دق کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے۔ ان لوگوں نے مجھے دھوپ میں۔ مینہ میں اکیلا چھوڑ دیا۔ آپ میرے آخری آقا ہیں۔ ایک جام اور عنایت فرمائیے۔

میں نے دو جام بھرے۔ ایک اپنے لئے۔ ایک ہیبو کے لئے۔ وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور اس کی متفکر آنکھیں کسی احساس سے غم آلود معلوم ہوتی تھیں۔

میں نے کہا "ہیبو جنگل کے متعلق کچھ باتیں کرو"

ہیبو نے جواب دیا "اکثر میرے دل میں یہ خیال آتا ہے۔ کہ میں صرف اسی دن سے جنگل کو پہچانتا ہوں جبدن سے مجھے مجبوراً جنگل سے جدا ہونا پڑا۔ کیونکہ اس دن سے جنگل کا تصور میری زندگی کا ایک جزو لازم رہا ہے۔ رات کو خواب بھی اکثر جنگل ہی کے آتے رہتے ہیں۔ اس تجربے نے مجھے یہ بات سکھائی ہے کہ جس شے کو ہم پیار کرتے ہیں وہ ہمیں صرف اسی وقت اپنی زندگی کا جزو معلوم ہوتی ہے جب ہم اسے کھو بیٹھتے ہیں۔

میرے ذہن میں جنگل آزادی کی ایک رنگین تصویر سے عبارت ہے۔ ایک رنگین و دلکش تصویر پتوں کے ہرے ہرے شامیانوں پر نور ماہ کا سفید درخشاں حسن۔ سبز سبز تازہ شاخوں میں سورج کی کرنوں کا بیتابانہ رقص۔ پھولوں کی لطیف و نفیس خوشبو۔ اسقدر متنوع کہ تخیل کی پرواز ان حدود تک ناممکن ہے۔ آپ میرے مرنے کے بعد زندہ رہیں گے۔ اور میں آپ کے دل میں جنگل کی محبت ورثے کے طور پر چھوڑ جاؤنگا۔ بہار کی ایک سہانی صبح تھی۔ مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ میرا وطن منگلور کے جنگلوں میں ہے۔ وہیں انسانی ہاتھوں نے مجھ سے میری آزادی چھین لی۔ دوسرے دن جب اپنی قید کی جھونپڑی میں میری آنکھ کھلی تو مجھے سورج کی روشنی میں کیلے کے پتے چمکتے ہوئے نظر آئے اور مجھے اپنے احباب کا خیال آیا۔۔۔۔۔۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور جنگل کا تمام نقشہ میرے آگے آ گیا۔ میں پانی کی سرگوشی اور ہوا کی سرسراہٹ کو سن سکتا تھا۔ فاختاؤں کے محبت بھرے نغمے میرے کانوں میں گونج

چیتا گھنی شاخوں میں کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا۔ جب وہ حرکت کر رہا تھا۔ جب وہ سائے اور دھوپ میں سے گزرتا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا گویا سورج اور ہوا دھوپ اور سایے سے کھیل رہے ہیں اور اس کی آمد کا پتہ کسی کو بھی نہ ملتا اگر اس کے سانس سے خون کی بو نہ آتی۔

بلندی سے شاہین کی آواز آئی۔ جنگلوں کے سبز بحر کے اوپر ٹھنڈی فضاؤں میں فضاؤں کا بادشاہ محو پرواز تھا۔

میں اپنے احباب کے ساتھ تھا اور پودوں کی اس مسلسل حرکت، زندگی کا مشاہدہ کر سکتا تھا جس کی وجہ سے وہ متواتر بڑھ رہے تھے۔ اگر آپ اس وقت میرے پاس ہوتے تو آپ کو بھی علم ہو جاتا کہ پھولوں کی شگفتگی سے کیسی مترنم آواز پیدا ہوتی ہے کس طرح فطرت کے یہ حسین فرزند محبت کی گرمی سے مجبور ہو کر دلدوز آہیں نکالتے ہیں۔ آپ کو بھی معلوم ہو جاتا کہ منہ بند کلی کی لطیف خوشبو اور شگفتہ پھول کی تیز و تند خوشبو میں کیا فرق ہے!

لیکن افسوس ہے انسان ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ ان کے لئے بندروں کی کوئی حیثیت نہیں۔ ان کی نظر میں ہم اپنی زندگی بے مصرف گزار دیتے ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ رات کے وقت چاند کے طوفان نور میں آزادی، وحیات افروز آزادی کا لطف اٹھانا کیا شے ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ فطرت کی بے انتہا تخلیقات کی بے عیب زندگیوں سے ہمارے کتنے گہرے راستے قائم ہیں۔ کیا تمہیں احساس نہیں ہوتا کہ........

میں متحیر ہو گیا۔ لیکن پھر کچھ خیال آیا اور میں نے کہا "آخر تم ایک بندر ہی تو ہو"

ہیو نے سادگی سے پوچھا "آپ نے اب تک شراب کے کتنے ساغر پئے ہیں؟"

میں شرمندہ ہو گیا۔ واقعی مجھے کیا حق حاصل تھا کہ میں ہیو کو بندر سمجھ کر بے وقعتی کی نظر سے دیکھوں۔

ہیو نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "تم مدہوش ہو گئے ہو۔ لیکن ابھی تک تم میں اتنی سمجھ ہے کہ اپنی بدتمیزی پر ندامت کا اظہار کر سکو۔

آپ لوگ ہماری آزادی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کاش آپ کو معلوم ہو جاتا کہ آزادی کے بغیر ہم کوئی شے نہیں۔ آزادی احساس خودی کے لئے ضروری ہے۔ اور فطرت کی ہر عظیم شے احساس خودی سے پیدا ہوئی ہے۔

میں نے پوچھا "بندروں نے احساس خودی کے بعد کون سے عظیم الشان کام کئے ہیں؟"

ہیو کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس طرح محسوس ہوتا تھا گویا اس کی عمر ہزار سال سے بھی زیادہ ہے۔

آخر اس نے جواب دیا "صرف انسان اس قسم کا سوال کر سکتا ہے! آپ لوگ ہمیشہ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ فطرت کو اصلاح دینے کے اہل ہیں۔ آپ لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ اختراع کے بغیر آپ زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہماری زندگی تمہاری تخلیقات پر منحصر نہیں۔ اور اگر تم سمجھتے ہو کہ "نجات" "کوشش و نزاع" میں پوشیدہ ہو تو سمجھنا چاہئے کہ تم کو نجات کے معانی بھی نہیں معلوم۔ وہ عظمت جو احساس خودی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس محبت سے عبارت ہے جو ہر ذرے کے دل میں فطرت کی تمام تخلیقات کی طرف سے موجود ہونی چاہئے۔"

میں نے پوچھا "بندر! تجھے خدا کے متعلق کیا علم ہو سکتا ہے؟"

ہیو نے بے ساختہ جواب دیا "بس مجھے کی ضرورت ہے وہ تو یہ ہے کہ خدا کو میرے متعلق علم ہو۔ اور یہ موجود ہے۔ وہ لوگ بدنصیب ہیں جن کو خدائے مطلق نے فراموش کر دیا ہے......"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک ہے۔ ہیو۔ میری ناانصافی تھی کہ میں تم سے........"

یکایک ہیو نے اپنا منہ کھولا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا گویا اس کے دانت چمک رہے ہیں۔ اور اس کے انداز میں کوئی خوفناک اور مہیب سی بات پوشیدہ ہے۔

میرے دل میں غصے اور حقارت کا طوفان اٹھا۔ اور اس طوفان کا باعث یہ تھا کہ بندر مجھے حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ بلکہ یہ کہ اس نے "فطرت کی محبت" کی داستان سنا کر میرے "تصور الوہیت" کی بلند اور عالی شان عمارت کو مسمار کر دیا تھا۔

میں نے ایک بوتل اٹھائی۔ اور اپنی پوری قوت سے ہیو کے منہ پر کھینچ ماری........ چاروں طرف بوتل کے ٹکڑے بکھر گئے.......

میں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو سورج کی ایک تیز کرن چھپتی ہوئی معلوم ہوئی اور ایک تاریک سی شکل برق مثال تیزی کے ساتھ سایہ بنکر غائب ہو گئی۔

سورج کی روشنی دنیا کو ایک عالمِ نور بنا رہی تھی۔
معلوم ہوا کہ میں میز پر اپنی کہنیوں پر سر رکھے ہوئے سو گیا تھا۔
میرے اعضا میں درد سا ہو رہا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا شیشہ ٹوٹنے کی آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔
ایک طرف ایک گلاس کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے :

نیم وا کھڑکی میں سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اپنے دوش پر طوطوں کی آواز لا رہی تھی مجھے خوف تھا کہ ہیو مر گیا ہوگا۔ اٹھ کر میں برآمدے کی طرف گیا۔ بندر ایک درخت پہ بیٹھا تھا۔
اس کی آنکھیں بند تھیں .... شراب ......

عابد

اشعار

لطفِ ستم ضرور نہیں اعتنا کے بعد
زندہ رہیگا کون ہجومِ ادا کے بعد

ماتھے پہ ان کے بل ہی تبسم لبوں پہ ہے
تسکین دل ہے مدِّ نظر اب سزا کے بعد

منزل پہ ہم پہنچ کے چلے دشت کی طرف
پھر ابتدائے کار ہوئی انتہا کے بعد

بیباکیٔ نگاہ - الٰہی تیری پناہ
یہ کیا ہے سحر کاریٔ رنگِ حیا کے بعد

اے چارہ گر فراق میں کیا زندگی کا لطف
مانا شفا بھی ہو گئی لیکن شفا کے بعد

جاتا رہا وہ عشق کے عرفان کا گداز
یعنی تسلیاں نہیں ہوتیں دعا کے بعد

ہو جائے عمر صرفِ غمِ یار اے خدا
بجھ جائے آزمائشِ جور و جفا کے بعد

اسکی زباں سے قصۂ اہلِ رضا سُنا
ہم خود بھی شرمسار ہوئے التجا کے بعد

یہ اضطراب یہ نفسِ شعلہ زا ہے کیا
کوئی بتائے دلکو ہمارے ہوا ہے کیا

اظہارِ مدعا کے لئے ضد نہ کیجئے
مجھکو خبر بھی ہو کہ مرا مدعا ہے کیا

عابد

کلامِ فطرت

خواہش یہ ہے کہ مایۂ تسکیں خرید لوں
بک جاؤں ان کا جلوۂ رنگیں خرید لوں

غمخانۂ حیات میں آئی ہے پھر بہار
کیا توبہ دے کے بادۂ رنگیں خرید لوں

لینا ہے انتقام جفائے بہار کا
جی میں یہ ہے کہ ہمتِ گلچیں خرید لوں

امکاں میں ہو تو جام مئے ناب کے عوض
واعظ سے اس کا جذبۂ تلقیں خرید لوں

بیچوں کہاں میں دولتِ تمکین و ہوش کو
آخر کہاں سے بادۂ نوشیں خرید لوں

میرے بھی دل میں داغ ہیں لیکن کہاں وہ نور
کیوں چاند سے نہ جلوۂ زریں خرید لوں

امید گر یہ ہو کہ کرینگے قبول وہ
میں بہرِ نذر خوشۂ پرویں خرید لوں

دیکھے جو ہر جگہ ترے جلووں کو بےنقاب
کس سے وہ اک نگاہِ جہاں بیں خرید لوں

فطرت کمالِ عشق ہے اسلام کی بنا
کیوں کائنات دے کے نہ یہ دیں خرید لوں

آنکھ ہے جامِ زرنگارِ حیات
اشک ہے بادۂ بہارِ حیات

زخمۂ غم کی سعی ہے مشکور
نغمہ زن ہو رہا ہے تارِ حیات

کہدیا تھا "بلیٰ" خطا یہ ہوئی
اس خطا کی سزا ہے دارِ حیات

نزع کے وقت اشکبار ہوں میں
یاد آنے لگی بہارِ حیات

(برجستہ) زیست سے کسقدر ہے عشق ہمیں
جان کردی گئی نثارِ حیات

فطرت

شعر

حالی کی تنقید نگاری کے عنوان سے ایک مضمون ادبی دنیا کے مارچ نمبر میں شائع ہوا ہے۔ مضمون نگار پروفیسر جیوپال سنگھ صاحب ایم۔ اے سینئر پروفیسر انگلش دیال سنگھ کالج ہیں۔ ایک پروفیسر اور پھر انگریزی زبان کے پروفیسر کی قلم سے اردو علم ادب کی ایک شاخ کے متعلق مضمون کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اس مضمون کو نہایت شوق سے دیکھا اس مضمون کے مطالعے کے دوران میں تو سنِ خیال کہیں کا کہیں چلا گیا۔ تا اینکہ میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہو گئی کہ میں شعر کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں۔

میں خود بھی سمجھ نہیں سکا کہ مجھے اس مضمون سے کیا خاص لگاؤ ہے۔ لیکن جس طرح ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوسرے کے خیال کو اگر صحیح نہ سمجھے تو رد کر دے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ لکھنے والے کو بھی یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے خیالات کو دوسروں کے سامنے بے تکلفانہ پیش کر دے۔

جہاں تک میرا مطالعہ ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شعر کے متعلق جسقدر بحثیں ہیں ان میں ایک قاعدہ کلیہ کو جو تمام عالم مخلوقات دنیا میں موجود ہے یا جسقدر معانی اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان سب کا ایک جسم ہوتا ہے اور ایک روح ایک چھلکا ہوتا ہے اور ایک مغز ایک ظاہر ہوتا ہے۔ اور ایک باطن۔ شعر بھی اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں۔ ہم ایک خاص پھل کو سنگترہ کہتے ہیں اگر کوئی شخص اس کی تعریف ہم سے دریافت کرے تو ہم کچھ تو اس کی شکل بتا دیں گے۔ اور کچھ اس کے خواص خواہ ظاہری جیسے مزہ خواہ باطنی جیسے تاثیر۔ ممکن ہے بعض لوگ تعریف کی اس تعریف پر معترض ہوں لیکن میں ان سے یہ کہونگا کہ آپ اسوقت ذرہ خاموش رہیں (میں اور لوگوں سے مخاطب ہوں) اور واقع میں بھی سنگترہ ایک پھل ہی کا نام ہے جو ایک خاص مزے کی چیز ہے لیکن باوجود اس کے یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک سنگترہ ہمارے سامنے ایسا پیش کیا جائے جس کا مغز خراب ہو چکا ہو نہ اس کی تاثیر سنگترہ کی رہی اور نہ مزا۔ پھر بھی ہم اسے ظاہر کی مشابہت کی وجہ سے سنگترہ ہی کہینگے۔ اسی طرح جب سنگترہ کو پھاڑ کر اس کی قاشیں الگ کر دی جائیں بلکہ ان کے بھی ٹکڑے کر دئے جائیں پھر بھی وہ عرف عام میں سنگترہ ہی کہلاتا ہے منطقی اصطلاح کی رو سے انسان کی تعریف یہ ہے کہ وہ حیوان ناطق ہے۔ مگر باوجود اس کے کہ کسی انسان کی حیوانیت میں فرق آجائے یعنی کوئی انسان مرجائے تب بھی دنیا اسے انسان ہی کہتی ہے اور اگر کسی کے دماغ میں نقص ہو جائے یا دماغ شروع سے ناقص ہی ہو تب بھی لوگ اسے انسان ہی کہتے ہیں۔ پس حق یہی ہے کہ جب ہم کسی چیز کی تعریف کرتے ہیں تو درحقیقت وہ تعریف اس کے مکمل وجود کی ہوتی ہے اور دوسرے ناقص وجود محض اس وجہ سے کہ کامل تعریف ان پر صادق نہیں آتی اس نام سے باہر نہیں نکل جاتے۔ باہر وہ تبھی سمجھے جاتے ہیں جبکہ کھینچا تانی سے بھی ہم انہیں اس نوع میں شامل نہ کر سکیں جس کے لئے انہیں پیدا کیا گیا تھا یا جس نوع میں انہیں شامل کرنے کے لئے ہم بعض مشابہتوں کی وجہ سے کوشش کر رہے تھے۔ کسی شخص کا بعض امثلہ سے یہ ثابت کر دینا کہ ہماری تعریف کے مطابق بعض افراد جن کو ہم اس نوع میں سمجھتے ہیں اس نوع سے باہر نکل جاتے ہیں۔ یہ نہیں ثابت کرتا کہ ہماری تعریف غلط تھی یا یہ کہ وہ افراد اس نوع میں شامل نہیں چونکہ ان افراد کی پیدائش اسی مقصد سے ہوئی تھی جس مقصد کے لئے وہ نوع خاص کی گئی۔ یا یہ کہ ان کی پیدائش اسی رنگ میں ہوئی ہے جس رنگ میں اس نوع کے دوسرے افراد کی اس لئے ہم مجبور ہیں کہ ضرورت کے ماتحت ان افراد کو بھی اسی نوع کا ایک فرد خیال کریں۔ خالص فلسفیانہ تشریحات نہ اور کسی چیز کے متعلق قائم رہی ہیں۔ اور نہ شعر کے متعلق قائم رہ سکتی ہیں۔ انسان کسی چیز کی بھی مکمل تعریف کرنے میں آجتک کامیاب نہیں ہو سکا سوائے اس کے کہ وہ چیز مخاطب کے ہاتھ میں دیدے۔ پھر شعر کو اس قاعدہ سے کیوں مستثنیٰ سمجھا جائے۔

مذکورہ بالا حقیقت کے نظر انداز کر دینے کی وجہ سے شعر کی وہ بہت سی تعریفیں جو اپنے اپنے دائرہ میں اچھی تعریفیں تھیں بحث میں آکر گر جاتی ہیں۔ لیکن میرے نزدیک وہ مرتی نہیں اور نہ مر سکتی ہیں۔ کیونکہ وہ ہمہ وقت پر مبنی ہوتی ہیں اور دوسرے ہی دن کسی دوسری مجلس میں کسی شخص کی زبان سے یا دوسرے رسالہ میں کسی دوسرے شخص کی قلم سے وہ پھر اپنی زندگی کا ثبوت دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان تعریفوں کی مثال بالکل اس نظریہ کی سی ہے کہ بادشاہ مر گیا ہے خدا بادشاہ کو زندہ رکھے۔

شعر کی تعریف میں اختلاف کا بڑا سبب وہی ہے جیسے میں اوپر لکھ چکا ہوں یعنی شعر کا بھی ایک جسم ہے اور ایک روح موجودہ دور کے مغربی علما میں سے اکثر اس کے جسم ہی سے تعریف کو مکمل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ قدیم زمانہ وسطی کے ادیب اپنی تعریف شعر کی روح سے خاص کر دیتے تھے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ جو کچھ کہتے ہیں درست کہتے ہیں۔ مگر سچائی کے زیادہ قریب ہونے کے لئے ہمیں ان دونوں تعریفوں کو ملا لینا چاہئے۔ مغربی شعرا میں سے ورڈس ورتھ کا یہ خیال ہے کہ شعر نام ہے ان جذبات کا جن کی یاد سکون کے وقت میں پھر تازہ کی جاتی ہے یا یہ کہ شعر ان جذبات کو جو ہم محسوس کرتے ہیں۔ تمثیل کے ذریعہ سے بیرونی دنیا تک پہنچانیکا نام ہے۔ میتھیو آرنلڈ کا نظریہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ جس کا یہ خیال ہے کہ شعر حیات کی تنقید کا نام ہے مگر مشہور جرمن فلاسفر ہیگل کے نزدیک صرف وزن ہی وہ پہلی اور آخری چیز ہے۔ جس کا شعر میں پایا جانا ضروری ہے۔ عمدہ تشبیہات۔ طرفہ خیالات۔ اعلےٰ افکار۔ اچھے اور بُرے شعر میں فرق کرتے ہیں تو مدد دے سکتے ہیں لیکن وہ شعر کو شعر نہیں بناتے۔ میں یہ کہونگا کہ ورڈس ورتھ نے ہیگل سے اختلاف نہیں کیا نہ ہیگل نے ورڈس ورتھ سے صرف اتنا ہوا ہے کہ ایک استاد الفاظ نے شعر کا فلسفہ بیان کر دیا ہے اور ایک فلاسفر نے اس کی لفظی صورت سے بحث کر لی ہے۔

میرے نزدیک علمی زبانوں میں کسی چیز کا نام بھی اس کی تعریف کرنے میں بہت کچھ ممد ہوا کرتا ہے چنانچہ انگریز محققین نے بھی اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اور پوئم۔ پوئٹری اور پوئٹ کے اشتقاق پر بحث کر کے اس کی تعریف معلوم کرنی چاہی ہے۔ ایسے نیو انگلش ڈکشنری (معروف بہ آکسفورڈ ڈکشنری) کی جلد سات کے صفحہ ۱۰۴۲ پر اس لفظ کے مختلف مشتقات سے بحث کر کے بتایا ہے۔ کہ یہ لفظ یونانی اور لاطینی زبان سے آیا ہے اور ابتدا میں پوئٹری پوئیسی کہلاتی تھی اور یونانی لفظ جو شاعر کے لئے استعمال ہوتا تھا اگر انگریزی حروف میں لکھا جائے تو پوئٹا بولا جائیگا۔ اس کے معنی ایک صناع اور مخترع کے ہیں اور پوئم کے معنی صنعت جدیدہ کے ہیں جہاں تک میں سمجھتا ہوں کسی انسان نے دانستہ ایسے کلام میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جو بالکل جدید تھے اسوقت کے لوگوں نے اسے ایک نیا طریق اظہار خیال کر کے اس کو اس نام سے پکارنا شروع کر دیا جس طرح کہ سٹوری (حکایت) کے بعد ایک نئے طریق کی کہانی کو ناول (جدید) کے نام سے یاد کیا جانے لگا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے تصنع کی طرف بھی اشارہ ہو میں دانستہ اس لئے کہتا ہوں کہ موزوں کلام ایک طبعی جذبہ ہے اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ سب سے پہلے انسان کا کلام بھی موزونیت سے کلیتہً عاری ہو۔ یہاں تک کہ ایک دن کسی انسان نے اس صنعت کو شناخت کر کے سب سے پہلے دانستہ طور پر اس کا استعمال شروع کیا اور میں یقین رکھتا ہوں کہ جب اسی شخص کا خیال اس طرف متوجہ ہوا ہوگا تو اس کی اسی دریافت نے اپنے زمانہ میں واٹ اور مارکونی کی ایجادات سے کم ہیجان نہ پیدا کیا ہوگا۔

مغربی زبانوں کے مشتقات کی رو سے اس فن پر جو روشنی پڑتی ہے وہ کافی نہیں اور ابتدائی انسان کی جرأت کے اظہار سے زیادہ اس سے کچھ پتہ نہیں چلتا لیکن میرے نزدیک عربی زبان جو نہایت ہی مکمل زبان ہے اور اشتقاق کبیر بلکہ اکبر کی مدعی ہے اس کے مقرر کردہ نام سے ہمیں اس فن کی حقیقت کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ عربی زبان میں کلام منظوم کو شعر کہتے ہیں۔ اور شعر کے معنی پہچاننے کے ہیں تاج العروس جلد ۳ میں شعر کے معنی لکھے ہیں علم بہ و فطن لہ اور لحیانی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ شعر لکذا فطن لہ اور لسان العرب کے حوالہ سے شعر بہ کے معنی عقلہ کے لکھے ہیں۔ گویا شعور کے اصل معنی اندرونی قوتوں کے ذریعہ سے کسی چیز کو جان لینے کے ہیں۔ فطن کا لفظ جو شعر کے معنوں کے بیان کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے اس کے معنی تاج العروس میں یہ لکھے ہیں الفطنۃ الحذق و ضد الغباوۃ وقیل الفطنۃ الفہم والذکاء سرعنہ وقیل الفہم بطریق الفیض بدون اکتساب (جلد ۹) یعنی فطنۃ کے معنی فہم کی قوتوں کی تیزی کے ہیں اور یہ کم فہمی کے مخالف معنی دیتا ہے اور ذکاوۃ اسی قوت کی زیادتی کا نام ہے اور بعضوں نے کہا ہے کہ فطنۃ اس فہم کا نام ہے جو اندرونی قوتوں کے ذریعہ سے حاصل ہو نہ کہ کوشش اور محنت اور بیرونی حواس سے۔ اور حق یہ ہے کہ یہ آخری معنی ہی حقیقی معنی ہیں شعر کے مختلف مشتقات باطنی کیفیات پر دلالت کرتے ہیں چنانچہ بالوں کو بھی شعر کہتے ہیں جو اندر سے باہر آتے ہیں۔ اور اس لباس کو جو دوسرے کپڑوں کے نیچے ہو اور جسم کے ساتھ لگا ہوا ہو اسے شعار کہتے ہیں اسی طرح گھوڑے کے پالان کو بھی جو جسم سے پیوست اور زین کے نیچے ہوتا ہے شعار کہتے ہیں۔ شعار علامت کو بھی کہتے ہیں کہ وہ حقیقت پر دلالت کرتی ہے دوستوں اور گہرا تعلق رکھنے والوں کو بھی شعار کہتے ہیں۔ حدیث میں انصار کے متعلق آتا ہے کہ انتم الشعار و الناس الدثار تم گہرا تعلق رکھنے والے ہو اور دوسرے

حسن اور موت

موت۔ ہائے موت! ظالم روح فرسائے حیات!
حسن۔ یارب حسن! ہاں وہ عشرت افزائے حیات

موت کی سفاکیوں سے لرزہ براندام زیست
حسن کی دلجوئیاں ہیں جلوہ پیرائے حیات

موت کی بربادیوں سے فق ہے رنگ زندگی
حسن کی رنگینیوں سے شوخ مینائے حیات

موت پیغام خزاں۔ رنگ بہار عمر کو
حسن کے فیضان سے شاداب گلہائے حیات

موت کی خوں ریزیاں ہیں وحشت افزائے نظر
حسن کے جلوؤں سے نوریں چشم بینائے حیات

کتنا ہیبتناک ہے یارب تصوّر موت کا
حسنِ رنگیں کس قدر ہے روح افزائے حیات

موت وجہ انتشارِ خاک و باد و آب و گل
حسن ہے شیرازہ بند و کشور آرائے حیات

موت ہے ہرچند وجہ اختتام زندگی
پر نہیں مفتوح اسکی پھر بھی دنیائے حیات

موت یعنی زندگی کی فاتح اصلی نہیں
حسن کے زیر نگیں ہیں سلسلہ ہائے حیات

موت کی نزدیکیاں ہرچند خوف انگیز ہیں
حسن بے پروا ہے لیکن کارفرمائے حیات

حسن کی تابش فروغِ لالہ زار زندگی
حسن کی تابش سے روشن نقش رعنائے حیات

موت اس کی زندگی پر فتح پا سکتی نہیں
حسن کی مینا سے پی لی جس نے صہبائے حیات

موت کے چہرے پہ ہیں وحشت کی ہیبتناکیاں
حسن کی آنکھوں سے پیدا رنگ ایمائے حیات

وقار انبالوی

حسن اور موت

ٹرکی کی ایک مشہور مصنفہ زہرا خانم

مکہ معظمہ میں ایک شاہی دعوت

محفلِ پرواز

بلاک بنانے والے مستہ ہاف ٹون کمپنی انارکلی لاہور

نیشنل آرٹ پریس انارکلی لاہور میں چھپا

قربانی

پتیرا کا ایک مندر

مہارانی گوناوتی داخل ہوتی ہے

گوناوتی - (دیوی سے مخاطب ہوکر) ماتا! تو کیوں مجھ سے خفا ہے - مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے - تو نے ان بھیک مانگنے والی عورتوں کو بچے بخشے ہیں - جو ان کو بیچ کر اپنا پیٹ پالتی ہیں - تو نے ان گنہگار عورتوں پر رحم کیا ہے جو بدنامی کے خوف سے اپنے گوشت اور خون سے بنے ہوئے بچوں کا گلا گھونٹ دیتی ہیں - اور میں ہوں کہ ملک کی مہارانی ہونے کے باوجود - اولاد کے لئے تڑپ رہی ہوں - میں نے کیا گناہ کیا ہے ماتا! کہ مجھے اولاد کی بہار سے محروم رکھا جارہا ہے -

رگھوپتی مندر کا پجاری داخل ہوتا ہے

گروجی! میں نے کیا کیا ہے کہ دیوی مجھ پر رحم نہیں کرتی؟ میں کیوں دیوی کی کرپا سے محروم ہوں؟ کیا میرے بھی دیوتاؤں کی طرح پاک وصاف نہیں ہیں؟

رگھوپتی - مہارانی - دیوی جی کسی اصول کی پابند نہیں - ہمارے دکھ اور سکھ - اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے - مگر صبر کرو - آج دیوی کے لئے خاص قربانی دی جارہی ہے - شائد تمہاری آرزو پوری ہو -

گوناوتی - گروجی - میں نے قربانی کی چیزیں محل سے روانہ کردی ہیں - پہنچنے والی ہونگی -

دونوں چلے جاتے ہیں -

مہاراج گووندا - مندر کا پجاری جے سنگھ اور اپارنا ایک نوجوان بھکارن داخل ہوتے ہیں -

جے سنگھ - مہاراج آپ کی کیا اچھیا ہے -

گووندا - کیا یہ سچ ہے کہ اس بھکارن کی پالتو بکری بھینٹ چڑھادی گئی ہے؟ اور وہ بھی جبراً - کیا دیوی اس قسم کی قربانی سے خوش ہوگی -

جے سنگھ - مہاراج - ہمیں کسطرح معلوم ہوسکتا ہے کہ مندر کے ملازم قربانی کہاں سے لاتے ہیں - بچی - تو کیوں رو رہی ہے؟ ماتا نے تیری بکری کی قربانی کو منظور کرلیا ہے تو کیوں روتی ہے -

اپارنا - ماتا! میں اس کی ماتا تھی - اگر کبھی مجھے اپنی جھونپڑی تک پہنچنے میں دیر ہوجاتی - تو وہ گھاس کھانا چھوڑ دیتی تھی - اور چشم براہ - منتظر کھڑی ہوجاتی تھی - میں اسے اپنی گود میں لیکر گھاس کھلاتی تھی - اُسے میرے سوا اور کسی ماتا کا علم نہیں ہے -

جے سنگھ - مہاراج اگر میری موت اپارنا کی بکری کو زندہ کرسکے تو مجھے مرنے سے کوئی خوف نہیں - میری ہزار جانیں آپکی اچھیا پر قربان ہوں - مگر میں مردے کو زندہ نہیں کرسکتا جو چیز ماتا نے لے لی ہے وہ واپس نہیں آسکتی -

اپارنا - دیوی ماتا! ماتا! کیا تو ایک بھکارن کی محبت کو برباد کرکے خوش ہوتی ہے - تو میں تیری فریاد لے کر کہاں جاؤں - مہاراج مجھے بتلائیے میں اپنی فریاد لے کر کہاں جاؤں - مہاراج مجھے بتائیے میں اپنی فریاد لیکر کہاں جاؤں -

گووندا - بچی میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے -

اپارنا - یہ خون جو سیڑھیوں پر بہہ رہا ہے - کیا یہ اسی کا ہے - آہ! میری غریب بکری - جب تو موت کی تکلیف میں چلاتی ہوگی اس وقت دنیا کے بہرے لوگوں نے تیری آواز نہ سُنی!

جے سنگھ - (دیوی کی مورتی سے) دیوی اکالی! میں نے بچپن سے تیری پوجا کی ہے مگر ابھی تک میں تیری باتوں کو سمجھ نہ سکا - کیا رحم صرف غریب کمزور انسانوں کا حصہ ہے - کیا دیوتا اس چیز سے ناواقف ہیں - آ - بچی میرے ساتھ آ - جب دیوتا مدد کرنے سے انکار کریں اس وقت انسانوں کی مدد لیتے ہیں - کوئی شرم نہیں ہونی چاہئے -

جے سنگھ اور اپارنا چلے جاتے ہیں

رگھوپتی - مہاراج کا بھائی نکشارتا - اور درباری داخل ہوتے ہیں -

(تمام ملکر) مہاراج کی جے۔
گووندا۔ تم سب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں آج سے اس مندر میں خون بہانا منع کرتا ہوں۔
وزیر۔ آپ دیوی پر قربانی چڑھانے سے منع کرتے ہیں؟
نیان رائے۔ قربانی منع کرتے ہیں؟
نکشارتنا۔ کسقدر خوفناک بات ہے۔ قربانی کی ممانعت؟
رگھوپتی۔ کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔
گووندا۔ نہیں گروجی۔ آپ خواب نہیں دیکھ رہے۔ یہ بیداری ہے۔ دیوی نے میرے لئے بھکارن کا روپ دھارا۔ اور مجھے حکم دیا کہ میں خون بہانے سے تمام لوگوں کو منع کردوں
رگھوپتی۔ لیکن شروع سے دیوی خون پیتی رہی ہے۔
گووندا۔ نہیں۔ دیوی نے کبھی خون نہیں پیا۔ وہ ہمیشہ منہ موڑ لیا کرتی تھی۔
رگھوپتی۔ مہاراج۔ سوچئے۔ آپ کو کوئی اختیار نہیں کہ آپ قربانی کی ممانعت کردیں۔
گووندا۔ خدا کے قانون انسان کے قانون سے بلند تر ہیں۔
رگھوپتی۔ اپنی بے وقوفی کے ساتھ اپنے غرور کو نہ ملاؤ۔ کیا آپ کو یہ بات کہنے کی جرأت ہوئی کہ صرف آپ نے دیوی کا حکم سنا ہے اور میں نے نہیں۔
نکشارتنا۔ کیا عجیب بات ہے کہ مندر کے پجاری تو دیوی کے حکم سے ناآشنا ہیں اور مہاراج کو اس حکم کا پتہ چل جائے۔
گووندا۔ پرماتما کے احکام دنیا میں گونج رہے ہیں۔ جو لوگ نہیں سنتے وہ خود ان کا اپنا قصور ہے۔
رگھوپتی۔ ناستک۔
گووندا۔ جاؤ۔ گروجی! پجاریوں سے کہدو کہ آج سے جو کوئی مندر پر خون کی قربانی چڑھائیگا۔ اسے بن باس دیا جائیگا۔
رگھوپتی۔ یہ آپ کا آخری حکم ہے۔
گووندا۔ ہاں۔
رگھوپتی۔ تو میں تم پر لعنت کرتا ہوں۔ کیا تم اپنے غرور میں یہ خیال کرتے ہو کہ دیوی تمہارے قانون کی پابند ہے۔ کیا تم اُسے اپنے احکام کے ذریعے گدی سے اتارنا چاہتے ہو۔ تم کبھی ایسا نہ کرسکوگے۔ میں کہتا ہوں۔ میں جو دیوی کا پجاری ہوں۔
نیان رائے۔ معاف کیجئے مہاراج۔ کیا آپ کو ایسا اختیار حاصل ہے۔
وزیر۔ مہاراج کیا آپ اپنا حکم بدل نہیں سکتے۔
گووندا۔ ہم گناہ کی جڑ اکھیڑنے میں تامل نہیں کرسکتے۔
وزیر۔ گناہ کبھی اتنے عرصے پنپ نہیں سکتا

مہاراج خاموش ہیں۔

نکشارتنا۔ ہاں ٹھیک ہے۔
وزیر۔ ہمارے باپ دادا خون کی قربانی دیتے آتے ہیں۔

مہاراج خاموش ہیں

نیان رائے۔ کیا آپ ہمارے باپ دادا کی رسموں کو مٹا دینا چاہتے ہیں؟
گووندا۔ خاموش! جاؤ۔ میرے حکم کو مشتہر کردو۔
وزیر۔ مگر مہاراج۔ ملکہ نے جو قربانی دیوی کے لئے بھیجی ہے وہ مندر کے قریب آپہنچی ہے۔
گووندا۔ واپس کردو۔

چلا جاتا ہے۔

وزیر۔ یہ کیا بات ہے۔
نکشارتنا۔ کیا اب ہم بودھ مذہب کے پیروں کی طرح جانوروں سے ایسا سلوک کرینگے گویا وہ زندگی کے مستحق ہیں۔

تمام چلے جاتے ہیں۔

رگھوپتی داخل ہوتا ہے۔ جے سنگھ اس کے عقب میں پانی کا ایک برتن اٹھائے ہوئے داخل ہوتا ہے۔

جے سنگھ۔ گروجی!
رگھوپتی۔ جاؤ۔
جے سنگھ۔ جل لیجئے۔
رگھوپتی۔ کوئی ضرورت نہیں۔
جے سنگھ۔ آپ کے کپڑے۔
رگھوپتی۔ لے جاؤ۔
جے سنگھ۔ میں نے کیا گناہ کیا ہے۔
رگھوپتی۔ جاؤ۔ گناہ کے سایے گہرے ہو رہے ہیں۔ مہاراج کا تخت مندر سے بلند ہونا چاہتا ہے۔ جا۔ بیٹا۔ میرا دل اداس ہے۔ میرا دماغ پریشان ہے۔
جے سنگھ۔ کیا ہوا ہے گروجی!
رگھوپتی۔ میرے پاس لفظ نہیں کہ میں تجھے جواب دے سکوں

دیوی سے پوچھ۔ جس کی بے عزتی ہوئی ہے۔

جے سنگھ۔ بے عزتی کس نے کی ہے۔

رگھوپتی۔ گووندا نے کی ہے۔

جے سنگھ۔ گووندا نے دیوی کی بے عزتی کی ہے۔

رگھوپتی۔ ہاں۔ صرف دیوی ہی کی نہیں۔ بلکہ اس نے تمہاری، میری۔ مندر کی۔ ویدوں کی۔ تمام کی بے عزتی کی ہے۔

جے سنگھ۔ مہاراج گووندا!

رگھوپتی۔ ہاں۔ مہاراج گووندا۔ ٹھیک ہے بیٹا۔ میں نے تمہیں پال پوس کر اتنا کیا ہے۔ اور پھر بھی تو مہاراج گووندا کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔

جے سنگھ۔ بچہ باپ کی گود میں بیٹھ کر چاند کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ آپ میرے باپ ہیں۔ اور مہاراج گووندا چاند۔ تو یہ جو میں لوگوں سے سن رہا ہوں کہ مہاراج نے قربانی کی ممانعت کر دی ہے۔ سچ ہے۔

رگھوپتی۔ ہاں۔ اور جو کوئی یہ حکم نہ مانے اسے بن باس دیا جائیگا۔

جے سنگھ۔ جس ملک میں دیوی کی توہین ہو۔ وہاں سے نکل جانا کوئی مصیبت کی بات نہیں ہے۔ نہیں۔ جب تک میں جیتا ہوں مندر کے تمام رسوم ورواج پورے ہونگے۔

دونوں چلے جاتے ہیں

گوناوتی اور ملازم داخل ہوتے ہیں۔

گوناوتی۔ کیا کہہ رہے ہو تم۔ مہارانی کی قربانی واپس کر دی گئی۔ کیا اس ملک میں کوئی ہے جو ایسی بات کرنے کا ارادہ کرے کون ہے وہ بدنصیب شخص۔

ملازم۔ مجھے اس کا نام لیتے ہوئے خوف آتا ہے۔

گوناوتی۔ خوف آتا ہے۔ کیسا خوف۔ کیا مجھ سے زیادہ خوفناک شخص بھی اس ملک میں موجود ہے۔

ملازم۔ مہارانی مجھے معاف کیجئے۔

گوناوتی۔ ابھی کل کی بات ہے کہ دربار کے شاعروں نے میری تعریف میں کبت پڑھے تھے۔ برہمنوں نے مجھے اشیرباد دی تھی۔ اور ملازموں نے بیچوں وچرا میرے احکام کی تعمیل کی۔ کل سے لیکر آج تک کیا واقع ہوا ہے کہ ملک کا تمام انتظام بدل گیا ہے۔ دیوی پر قربانی چڑھانے کی اجازت نہیں رہی۔ اور مہارانی کے احکام بے معنی ہو گئے ہیں۔ جاؤ۔ مندر کے پجاری کو میرا سلام کہو۔ اور انہیں یہاں بلا لاؤ۔

ملازم چلا جاتا ہے۔

گووندا داخل ہوتا ہے۔

گوناوتی۔ مہاراج آپ نے کچھ سنا۔ میں نے جو چیزیں دیوی کی بھینٹ چڑھانے کے لئے بھیجی تھیں وہ دیوی کے مندر سے واپس بھیج دی گئی ہیں۔

گووندا۔ ہاں مجھے معلوم ہے۔

گوناوتی۔ آپ کو معلوم ہے۔ اور آپ اس توہین کو خاموشی سے برداشت کر لینگے۔

گووندا۔ میں گنہگار کی طرف سے تم سے معافی کا خواستگار ہوں۔

گوناوتی۔ میں جانتی ہوں مہاراج کہ آپ بہت رحمدل ہیں۔ لیکن یہ رحم کا موقع نہیں۔ اس موقع پر رحم کا اظہار کمزوری کے برابر ہوگا۔ اگر آپ کا رحم مجرم اور اس کی سزا کے درمیان حائل ہوتا ہے۔ تو مجھے اجازت دیجئے کہ میں مجرم کو سزا دیدوں۔ کم از کم مجھے یہ تو بتائیے کہ وہ کون ہے؟

گووندا۔ میں خود رانی! میرا گناہ صرف اسقدر ہے کہ میں نے تمہارے دل کو دکھ پہنچایا۔

گوناوتی۔ میں کچھ نہیں سمجھی مہاراج۔

گووندا۔ آج سے مندر میں خون بہانا ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

گوناوتی۔ کس نے یہ حکم دیا ہے؟

گووندا۔ دیوی۔ ماتا نے

گوناوتی۔ اس کے احکام کس نے سنے ہیں۔

گووندا۔ میں نے۔

گوناوتی۔ مجھے ہنسی آتی ہے مہاراج۔ تمام سنسار کی مہارانی اپنی درخواست لے کر پتیرا کے پاس آئی ہے کتنی پرلطف بات ہے۔

گووندا۔ اپنی درخواست لیکر نہیں۔ اپنا دکھڑا لیکر۔ اپنا غم لیکر۔

گوناوتی۔ مہاراج آپ کا اختیار مندر کی حدود سے باہر باہر ہے آپ اپنے احکام ایسی جگہ کے لئے جاری کیجئے جہاں اُن کی اطاعت گستاخی کہلائے

گووندا۔ میں نے حکم نہیں دیا۔ خود دیوی کا یہی فرمان ہے۔

گوناوتی۔ اچھا اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کا حکم ٹھیک ہے۔ تو

میرے راستے سے ہٹ جائیے مجھے اپنے دھرم کی رسوم کو پورا کرنے کی اجازت دیجئے۔

گووندا۔ میں نے دیوی سے وعدہ کیا تھا کہ میں مندر میں خون نہ بہنے دونگا۔ اور مجھ پر اس وعدے کی پابندی لازمی ہے۔

گوناوتی۔ میں نے بھی منت مانی تھی کہ میں دیوی پر ۱۰۰۰ بکروں کی بھینٹ چڑھاؤنگی۔ اور مجھ پر اس منت کا پورا کرنا فرض ہے۔ آپ تشریف لیجائیں۔

گووندا۔ بہت اچھا۔

چلا جاتا ہے۔

رگھوپتی داخل ہوتا ہے۔

گوناوتی۔ گروجی۔ میری قربانی کی چیزیں واپس بھیج دی گئیں۔

رگھوپتی۔ مہارانی! غریب کنگال اور امیر راجہ رانی دیوی کی نظر میں برابر ہیں۔ مگر بدقسمتی سے دیوی سے قربانیاں چھین لی گئی ہیں۔ بدقسمتی سے مہاراج کا غرور دیوتاؤں کو وحشی جانوروں کی طرح نگل جانا چاہتا ہے۔ مہاراج کے غرور نے بھوکے شیر کی طرح پجاریوں پر اپنی آگ برسانے والی آنکھیں گاڑ رکھی ہیں۔

گوناوتی۔ اب کیا ہوگا گروجی!

رگھوپتی۔ بیٹی۔ اس بات کا علم صرف اسی کو ہے جو سپنوں میں سنسار کے کاروبار کا انتظام کرتی ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ عنقریب وہ تخت جو اپنا سایہ دیوی کے مقدس مندر پر ڈال رہا ہے۔ بلبلے کی طرح ٹوٹ جائیگا۔

گوناوتی۔ رحم کیجئے۔ گروجی۔ ہمیں بچا لیجئے۔

رگھوپتی۔ میں! میں کون ہوں۔ مہارانی۔ آپ مہاراج کی استری ہیں اور مہاراج تو دیوتاؤں سے بھی اونچے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ آپ کو کیا خوف ہوسکتا ہے۔ آہ! کیا زمانہ آگیا ہے کہ برہمن کا سراپ خود اسی کو زہریلے سانپ کی طرح ڈس لیتا ہے۔ اپنا جنیو توڑ دینا چاہتا ہے۔

گوناوتی۔ (رو کتے ہوئے) رحم کیجئے۔ گروجی۔ رحم کیجئے۔

رگھوپتی۔ تو برہمنوں کا حق واپس دلائیے۔

گوناوتی۔ ایسا ہی ہوگا۔ جائیے گروجی۔ آپ اپنا کام کیجئے۔ کسی میں یہ طاقت نہیں کہ آپ کو روک سکے۔

رگھوپتی۔ آپ کی مہربانیوں کا شکریہ ادا نہیں ہوسکتا۔ آپ کی ایک کرپا کی نظر سے دیوی کی عزت بچ گئی ہے۔

چلا جاتا ہے۔

مہاراجہ گووندا داخل ہوتا ہے۔

گووندا۔ مہارانی! تمہاری قہر بھری نظروں کے اندھیرے نے میرے لئے دنیا کو تاریک کر دیا ہے۔

گوناوتی۔ جاؤ۔ اس گھر پر برہمنوں کا سراپ نہ لاؤ۔

گووندا۔ عورت کی مسکراہٹ تمام سزاؤں کو ملیامیٹ کر دیتی ہے۔ محبت خدا کا رحم ہے۔

گوناوتی۔ جاؤ۔ چلے جاؤ۔ میں تمہارا منہ نہیں دیکھنا چاہتی۔

گووندا۔ مہارانی۔ اب میں اس وقت واپس آؤنگا جب تم مجھے یاد کروگی۔

گوناوتی راجہ کے قدموں سے لپٹ جاتی ہے۔

گوناوتی۔ معاف کیجئے۔ مہاراج۔ معاف کیجئے۔ کیا آپ اسقدر جابر ہوگئے ہیں کہ عورت کے غرور کی کبھی کوئی عزت نہیں کرنا چاہتے۔ میری جان کے مالک۔ کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ دھتکاری ہوئی محبت غصے میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

گووندا۔ جس دن میں نے تم پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا۔ اسدن میری میری موت یقینی ہے۔ پیاری میں جانتا ہوں کہ بادل چند لمحوں کے لئے ہیں۔ اور سورج کی روشنی ہمیشہ کے لئے۔

گوناوتی۔ ہاں۔ بادل چھنٹ جائیں گے۔ دیوتاؤں کی بجلی واپس لوٹ جائیگی۔ میرے راجہ۔ حکم دو کہ لوگوں کو بھینٹ چڑھانے کی اجازت ہے۔

گووندا۔ برہمنوں کو خدائی قانون توڑنے کا کوئی حق نہیں ہے جانداروں کا خون دیوی کے لئے کبھی قربانی نہیں بن سکتا۔ راجہ کو حق ہے کہ سچائی کی حفاظت کے لئے اپنی جان تک لڑا دے۔

گوناوتی۔ میں آپ کے چرنوں کو چھوتی ہوں۔ مہاراج۔ میں زمین پر گر کر آپ سے التجا کرتی ہوں۔ کہ اپنا حکم منسوخ کر دیجئے۔ رواج پر راجہ کو کوئی حق نہیں۔ ٹھنڈی ہوا کی طرح دھرم تمام لوگوں کے لئے عام ہے آہ! آپ پر کوئی اثر نہیں ہوتا!

اٹھ کھڑی ہوتی ہے

گوناوتی۔ جابر مہاراجہ! تجھ پر التجاؤں کا۔ میری درخواستوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تو محبت کو چھوڑ کر فرض کا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔ دیکھ دیوی کے غصے سے ڈر!

دونوں چلے جاتے ہیں۔

رگھوپتی۔ جے سنگھ اور نین رائے داخل ہوتے ہیں

رگھوپتی۔ بیٹا نین رائے۔ تو فوج کا سردار ہے۔ اور دیوی سے تیری عقیدت کہاوت کی طرح مشہور ہے۔

نین رائے۔ ٹھیک ہے گروجی۔ میں نے دیوی کی محبت ورثے میں پائی ہے۔

رگھوپتی۔ تو اپنے دل کو دیوی کی محبت سے مضبوط کر۔ اپنی تلوار کو دیوتاؤں کی قہری بجلی سے زیادہ خوفناک بنا لے۔ میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ اپنی فوج لیکر دیوی کے دشمن کو خاک میں ملا دے۔

نین رائے۔ وہ دشمن کون ہے۔ گروجی!

رگھوپتی۔ گووندا۔

نین رائے۔ مہاراج۔

رگھوپتی۔ ہاں مہاراج۔ اپنی پوری قوت سے اس پر حملہ کردو۔

نین رائے۔ گروجی۔ کیا آپ میرا امتحان لے رہے ہیں؟

رگھوپتی۔ ہاں نین رائے۔ میں تیرا امتحان لے رہا ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تو دیوی کا بھگت ہے یا نہیں۔ تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ دیوی کی محبت کے آگے دنیا کے تمام رشتے ہیچ ہیں

نین رائے۔ میرے دل میں کوئی شک نہیں گروجی!

رگھوپتی۔ شاباش۔

نین رائے۔ میں دیوی کے کس قسم کے بھگتوں میں سے ہوں کہ دیوی مجھے اپنے مالک سے دغا کرنے کا حکم دیتی ہے۔ دیوی پر لوگوں کا ایمان ہے۔ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ وہ میرے ایمان کو برباد کرنے کی خواہشمند ہو۔

جے سنگھ۔ کتنے شاندار لفظ ہیں۔

رگھوپتی۔ نین رائے۔ مہاراج نے دیوی سے منہ موڑ لیا ہے۔ اب اسے تم پر کوئی حق نہیں رہا۔

نین رائے۔ میں بحث نہیں کرنا چاہتا مہاراج۔ میں دیوی کا غلام ہوں۔ اور میرے لئے صرف ایک راستہ ہے۔ سچائی اور ایمان کا راستہ۔ دیوی کا یہ بیوقوف غلام کبھی عزت کے راستے سے نہ ڈگمگائیگا۔

چلا جاتا ہے۔

جے سنگھ۔ گروجی۔ فوج کی مدد کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیں دیوی نے بے انتہا طاقتیں بخشی ہیں۔ آئیے۔ مندر کے دروازے کھول دیں۔ اور لوگوں کو بلائیں۔

نقارہ بجاتا ہے۔ لوگ جوق درجوق داخل ہوتے ہیں۔

گووندا داخل ہوتا ہے۔

گووندا۔ خاموش۔ رگھوپتی۔ تم میرے احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔

رگھوپتی۔ ہاں۔

گووندا۔ تو پھر تم میرے ملک میں نہیں رہ سکتے۔

رگھوپتی۔ میرا وطن وہ ہے جہاں مہاراج کا تاج زیر پا پڑیگا لاؤ۔ جے سنگھ۔ دیوی کے لئے بھینٹ لاؤ۔

گووندا۔ خاموش! میری فوج کے سردار کو بلاؤ۔ رگھوپتی۔ تم مجھے مجبور کرتے ہو کہ میں خدا کے قانون کے لئے دنیا کی مدد طلب کر دں۔ مجھے شرم آتی ہے۔ کیونکہ ہتھیار کی طاقت انسان کی کمزوری کو ظاہر کرتی ہے۔

رگھوپتی۔ ناستک۔ کیا تجھے یقین ہے کہ برہمن کے سراپ کی آگ کے شعلے بجھ گئے ہیں۔ نہیں نہیں میرے سراپ کے شعلے میرے دل سے نکلکر تیرے تخت کو بھسم کر دیں گے

فوج کا سردار نین رائے اور نائب سردار چندپال داخل ہوتے ہیں۔

گووندا۔ اپنی فوج لیکر مندر میں کھڑے ہو جاؤ کہ یہاں جانداروں کی قربانی نہ ہونے پائے۔

نین رائے۔ مہاراج۔ آپکا غلام مندر میں بے بس ہے۔

گووندا۔ نین رائے۔ تمہیں میرے احکام پر نکتہ چینی کا کوئی حق نہیں۔ تم میرے احکام کو بجا لاؤ۔ میں ذمہ دار ہوں۔

نین رائے۔ مہاراج۔ میں آپ کا غلام ہوں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ میں انسان بھی نہیں۔ میرا دھرم ہے ایمان ہے۔

گووندا۔ یہ بات ہے۔ تم چندپال کو اپنی تلوار دیدو۔

نین رائے۔ کیوں؟ یہ تلوار میرے باپ دادا کو آپ کے بزرگوں نے دی تھی۔ اگر آپ یہ تلوار لینا چاہتے ہیں تو میں آپ ہی کو واپس دے سکتا ہوں۔

تلوار دے دیتا ہے۔

چلا جاتا ہے۔

رگھوپتی۔ برہمن کے سراپ کے شعلے بھڑکنے لگے۔

جے سنگھ داخل ہوتا ہے

جے سنگھ۔ جانور قربانی کے لئے تیار ہیں۔

گوونما ۔ قربانی؟

جے سنگھ ۔ مہاراج میں التجا کرتا ہوں آپ دیوی کو قربانی سے محروم نہ کیجئے۔

مہاراج کے قدموں پر گر پڑتا ہے۔

رگھوپتی ۔ اٹھو جے سنگھ ۔ شرم کرو ۔ میں تمہارا آقا ہوں ۔ آؤ چلیں۔

چلے جاتے ہیں۔

اپارنا داخل ہوتی ہے۔

اپارنا ۔ جے سنگھ کہاں ہے؟ کہیں نہیں ۔ (دیوی سے مخاطب ہو کر) تو یہاں کیا کر رہی ہے ۔ تو جسے غریبوں کی آہیں اور مظلوموں کی چیخ پکار ذرا بھی متاثر نہیں کرتی! ہم غریب تمام عمر محبت کے لئے ترس ترس کر جان دیدیتے ہیں ۔ اور تیری محبت کیلئے لوگ جانیں دینے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں ۔ تو اس محبت کو کنجوس کی طرح قبر میں چھپا رکھتی ہے ۔ آہ! جے سنگھ مجھے اس پتھر کے بت سے کیا ملتا ہے؟ کہ تو اس کو پیار کرتا ہے!

رگھوپتی داخل ہوتا ہے۔

رگھوپتی ۔ تو کون ہے!

اپارنا ۔ میں [illegible] ہوں ۔ جے سنگھ کہاں ہے؟

رگھوپتی ۔ چلی جا! یہاں سے ۔ میں جانتا ہوں تو جے سنگھ کے دل کو دیوی سے چھیننا چاہتی ہے ۔

اپارنا ۔ کیا دیوی کو مجھ سے خوف آتا ہے؟

چلی جاتی ہے ۔

جے سنگھ اور نکشارتا داخل ہوتے ہیں ۔

نکشارتا ۔ آپ نے مجھے بلایا تھا ۔ گرو جی!

رگھوپتی ۔ ہاں بیٹا ۔ کل دیوی نے مجھے خواب میں کہا کہ "نکشارتا ساٹ دنوں میں مہاراجہ بن جائیگا"

نکشارتا ۔ واہ! واہ!

رگھوپتی ۔ ہاں ۔ ہاں ۔ تم پتیرا کے راجہ کہلاؤ گے ۔

نکشارتا ۔ مجھے یقین نہیں آتا ۔

رگھوپتی ۔ نہیں میرے الفاظ پر یقین نہیں آتا ۔

نکشارتا ۔ نہیں ۔ مگر میرا دل کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہوگا ۔

رگھوپتی ۔ ایسا ضرور ہوگا؟

نکشارتا ۔ کیسے؟

رگھوپتی ۔ دیوی مہاراج گووندا کے خون کی پیاسی ہے ۔

نکشارتا ۔ مہاراج کے خون کی؟

رگھوپتی ۔ اگر تم مہاراج بننا چاہتے ہو تو دیوی کو گووندا کا خون پلاؤ ۔

نکشارتا ۔ میں نہیں جانتا کہ یہ خون کہاں سے آئیگا ۔

رگھوپتی ۔ مار دو ۔ چپکے سے گووندا کو مار دو ۔ خاموش رہو جے سنگھ لیکن یہ ضرور ہے کہ ـــــ جے سنگھ اگر تم خاموش نہیں رہ سکتے تو چلے جاؤ ۔

نکشارتا ۔ لیکن گرو جی ۔ گووندا میرا بھائی ہے ۔ میرا خون ہے ۔

رگھوپتی ۔ اسی لئے تو تمہاری قربانی اور بھی زیادہ قیمتی ہوگی ۔

نکشارتا ۔ گرو جی! میں مہاراجہ بننا نہیں چاہتا ۔

رگھوپتی ۔ نکشارتا ۔ دیوی کی اچھیا ہے کہ تم پتیرا کے راجہ بنو ۔ دیوی شاہی خون کی پیاسی ہے ۔ اگر گووندا بچ گیا تو تم مارے جاؤ گے ۔

نکشارتا ۔ رحم کیجئے ۔ گرو جی!

رگھوپتی ۔ جب تک تم دیوی کی پیاس نہ بجھاؤ گے ۔ اس وقت تک تمہیں چین نہیں آسکتا ۔

نکشارتا ۔ تو میں کیا کروں گرو جی ۔ مجھے مشورہ دیجئے ۔

رگھوپتی ۔ انتظار کرو ۔ وقت آنے پر میں تمہیں بتاؤنگا ۔

نکشارتا چلا جاتا ہے ۔

جے سنگھ ۔ یہ میں نے کیا سنا ہے گرو جی! دیوی جی! ماتا! کیا یہ آپ کا حکم ہے ۔

رگھوپتی ۔ چپ رہ جے سنگھ!

جے سنگھ ۔ دیوی جی! کیا آپ گناہ کے خنجر سے کٹے ہوئے گلے کا خون پی کر خوش ہونگی ۔

رگھوپتی ۔ تو کیا جانتا ہے ۔ جے سنگھ ۔ چپ رہ ۔ تجھے گناہ کی کیا خبر ۔

جے سنگھ ۔ گرو جی ۔ میں نے آپ سے گناہ کے متعلق جو کچھ سیکھا اور پڑھا ہے کیا وہ سب غلط تھا؟

رگھوپتی ۔ ادھر آ ۔ میں تجھے پھر سبق دیتا ہوں ۔ سن جے سنگھ ۔ گناہ دراصل کوئی شے نہیں ۔ کسی کو قتل کر دینا لیکو قتل کر دینا ہے اس میں کوئی پاپ کا سوال پیدا نہیں ہوتا ۔ کیا تو نہیں جانتا کہ مٹی ہزاروں بے گناہوں کے خون میں لتھڑی ہوئی ہے ۔ وقت ہمیشہ خون کے حرفوں میں انسان کی تاریخ لکھتا رہتا ہے ۔ صحرا میں ۔ جنگل میں ۔ آبادی میں ۔ شہر میں ۔ گاؤں میں ۔

ہمیشہ خون کے دریا بہتے رہتے ہیں۔ دنیا ایک دوسرے کو قتل کرنے کی فکر میں رہتی ہے۔ اور دیکھ۔ کالی دیبی۔ اپنی زبان باہر نکالے ہوئے خون خون پکار رہی ہے۔ اور اس کے پیالے میں سے دنیا کا خون اس طرح بہہ رہا ہے جس طرح بجڑے ہوئے انگوروں سے رس بہہ رہا ہو۔

جے سنگھ۔ ٹھہریے گروجی! تو کیا محبت جھوٹ ہے۔ اور ہم صرف مذاق کو کہتے ہیں۔ کیا شروع سے لیکر آج تک صرف قتل و غارت ہی کا نام سچائی رہا ہے؟ گروجی۔ آپ میرے دل سے کھیل رہے ہیں۔ دیکھیئے۔ دیوی میری طرف دیکھکر طنز سے مسکرا رہی ہے۔ ماں اگر تجھے خون ہی پینا ہے تو میرا پی لے۔ میں اپنی چھاتی میں خنجر گھونپ کر تیری پیاس کو بجھا دونگا۔ اگر میری رگوں میں بہنے والا خون تجھے پسند ہے تو اپنی رگ رگ کو چیر کر پھینکدونگا۔ لیکن۔ گووندا کا خون! دیوی! رحم کر۔

رگھوپتی۔ تو پھر مندر میں قربانی بند ہو جائے۔

جے سنگھ۔ ہاں ...... نہیں گروجی۔ آپ بہتر جانتے ہیں۔ دل کے قانون ویدوں کے قانون نہیں ہیں۔ معاف کیجئے گروجی! کیا یہ سچ ہے کہ دیوی جی مہاراج کے خون کی پیاسی ہیں؟

رگھوپتی! بیٹا کیا تجھے مجھ پر یقین نہیں رہا؟

جے سنگھ۔ گروجی! اگر دیوی جی ضرور گووندا کا خون پینا چاہتی ہیں تو مجھے اجازت دیجیئے کہ میں اس کا خون لے آؤں۔ یہ تو بہت ناانصافی ہے کہ بھائی کے ہاتھ سے بھائی کا خون ہو۔ نکشاترا کو معاف کیجئے اور یہ فرض میرے سپرد کیجئے۔

رگھوپتی۔ میں سوچونگا۔

چلا جاتا ہے۔

جے سنگھ۔ خیالات اور شبہات کے دور میں پڑے رہنے سے کام کرنا اچھا ہے۔ چاہے وہ برا ہی کیوں نہ ہو۔ آہ۔ دنیا کسقدر خوبصورت ہے۔ یہ لوگ کسقدر اطمینان سے گزرتے جا رہے ہیں۔ انکو کوئی فکر نہیں ہے۔ میں بھی انہیں کے ساتھ ہو لیتا ہوں۔

چلا جاتا ہے۔

رگھوپتی داخل ہوتا ہے۔

رگھوپتی۔ جے سنگھ

جے سنگھ! میں تمہیں نہیں جانتا۔ تم کیوں مجھے روکتے ہو۔ اپنی راہ لو۔

رگھوپتی۔ جے سنگھ!

جے سنگھ! میرے سامنے سیدھا راستہ ہے۔ ایک ہاتھ میں بھیک کا پیالہ۔ اور دوسرے میں بھکارن اپارنا کو تھامے ہوئے میں۔ فقیر بنا رہونگا۔ کون کہتا ہے کہ دنیا کے راستے مشکل ہیں۔ آخر کار ہم منزل تک آ پہنچتے ہیں۔ وہ منزل جہاں کوئی قانون نہیں۔ جہاں زندگی کی غلطیاں اور تکلیفیں فراموش ہو جاتی ہیں۔ جہاں ابدی راحت اور سرور ہے۔ ویدوں اور گرو کی کیا ضرورت ہے! آہ گروجی۔ میں کیا کہہ رہا تھا؟ وہ سامنے مندر ہے۔ اور دیوی کا قانون اٹل ہے۔ آپ نے میرے ذمے کیا خدمت سپرد کی تھی گروجی!

خنجر نکال کر دکھاتا ہے۔

میں آپکے لفظ اپنے دل میں دہرا رہا ہوں تاکہ وہ بھی اس خنجر کی دھار کی طرح تیز ہو جائیں۔ گروجی اور کیا حکم ہے۔

رگھوپتی۔ کچھ نہیں بیٹا۔ میں تجھے کس طرح بتاؤں کہ میرے دل میں تیری کتنی عزت ہے۔ کتنی محبت ہے۔

جے سنگھ۔ میرے سامنے محبت کا نام نہ لیجئے۔ گروجی! صرف فرض کا نام لیجئے۔ محبت سبز سبز گھاس کی طرح ظاہر ہوتی ہے۔ اور فنا ہو جاتی ہے۔ لیکن فرض بھاری پتھر کی طرح ہے جو اٹھائے نہیں اٹھتا۔

گووندا اور چندپال داخل ہوتے ہیں۔

چندپال۔ مہاراج آپ ہوشیار رہیئے۔

گووندا۔ کیا بات ہے چندپال۔ کس سے ہوشیار رہوں۔

چندپال۔ میں نے چند آدمیوں کو آپ کے تخت و تاج کے خلاف سازش کرتے ہوئے سنا ہے۔ وہ لوگ آپ کے خون کے پیاسے ہیں

گووندا۔ کون میرے خون کا پیاسا ہے۔

چندپال۔ میں ڈرتا ہوں کہ اس شخص کے نام کی اطلاع آپ کے لئے خنجر کے زخم سے زیادہ دکھ دینے والی ہوگی۔ وہ شخص نکشاترا تھا۔

گووندا۔ نکشاترا؟

چندپال۔ ہاں۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ دیوی کو آپ کا خون پلائیگا

گووندا۔ دیوی کو؟ تو پھر مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ جاؤ۔

مجھے تنہا چھوڑ دو۔

چندپال چلا جاتا ہے

گووندا دیوی پر پھول نچھاور کرتا ہے۔

گووندا۔ دیوی پھولوں کا نذرانہ قبول کر۔ او اگر تیری اچھیا ہے کہ میں اپنے بھائی کے ہاتھوں مارا جاؤں تو تیری اچھیا پوری ہو۔ میں جانتا ہوں کہ گناہ اسی وقت فنا ہوتا ہے جب پورے زور میں ہوتا ہے۔

جے سنگھ داخل ہوتا ہے۔

جے سنگھ۔ دیوی! کیا تو گووندا کا خون پینا چاہتی ہے۔

ایک آواز۔ ہاں۔ میں گووندا کا خون چاہتی ہوں۔

جے سنگھ۔ مہاراج۔ آپ کی موت کا وقت آگیا۔

مہاراج گووندا۔ کیوں جے سنگھ۔

جے سنگھ۔ کیا آپ نے دیوی کا حکم نہیں سنا۔

گووندا۔ نہیں۔ البتہ میں نے رگھوپتی کی آواز ضرور سنی ہے۔

جے سنگھ۔ رگھوپتی کی آواز! آہ! میں پاگل ہو جاؤنگا! ایک ہی بات ہے۔ آواز رگھوپتی کی ہو۔ یا دیوی کی۔

اپنا خنجر نکالتا ہے۔ پھر پھینک دیتا ہے۔

جے سنگھ۔ دیوی۔ اپنے بچوں کی آواز سن۔ صرف پھولوں کو۔ حسین وجمیل پھولوں کو اپنے بدن سے چھونے دے۔ اب خون نہ بہے۔ دیکھ۔ یہ پھول بھی خون کی طرح سرخ ہیں۔ گہرے سرخ۔ یہ پھول بھی دھرتی ماتا کے کلیجے سے آتے ہیں۔ اپنے ننھے ننھے بچوں کے مرجانے پر دکھ ہوتا ہوگا۔ ان پھولوں کو قبول کر۔ اب تجھے خون نہ ملیگا۔ میں کہتا ہوں۔ اگر تجھ میں کوئی طاقت ہے تو مجھے فنا کردے۔ مہاراج آپ مندر سے چلے جائیں۔

گووندا چلا جاتا ہے۔

جے سنگھ۔ آہ! میں نے ایک لمحے میں دیوی اور مہاراج دونوں کو کھو دیا۔

رگھوپتی داخل ہوتا ہے

رگھوپتی۔ میں نے سب کچھ سنا ہے۔ دغاباز تو نے اپنے مالک سے دغا کی۔

جے سنگھ۔ مجھے سزا دیجئے گروجی!

رگھوپتی۔ کیا سزا ہو تیری۔

جے سنگھ۔ میری جان کو میرے گناہوں کا کفارہ خیال کیجئے۔

رگھوپتی۔ نہیں۔ کافی نہیں۔ دیوی کے چرنوں کو چھو کر قسم کھا جے سنگھ۔

جے سنگھ۔ میں دیوی کے چرنوں کو چھوتا ہوں۔

رگھوپتی۔ کہہ "میں آج آدھی رات سے پہلے دیوی کو شاہی خون پلاؤنگا"۔

جے سنگھ۔ "میں آج آدھی رات سے پہلے دیوی کو شاہی خون پلاؤنگا"۔

چلے جاتے ہیں۔

گوناوتی داخل ہوتی ہے۔

گوناوتی۔ میں ہار گئی۔ میں سمجھتی تھی کہ اگر کچھ دنوں میں اس سے کھنچی کھنچی رہوں۔ تو وہ خود بخود میرے قدموں میں آگریگا۔ مگر میری سب امیدیں اکارت گئیں میں نے اپنے غصے کا اظہار کرکے اس کے دل کو نرم کرنا چاہا۔ مگر میرا غصہ بھی بے سود ثابت ہوا۔ عورت کا غصہ ہیرے کی چمک کی طرح ہے۔ صرف چمکنے کے قابل ہے۔ جلانے کے قابل نہیں۔ کاش میرا غصہ دیوتاؤں کے قہر کی بجلی کی طرح ہوتا جو اسے میٹھی نیند سے جگا کر تازیانے کی طرح اس کے غرور کو مجروح کر دیتا۔

دروا ایک کم عمر لڑکا داخل ہوتا ہے۔

گوناوتی۔ کہاں جارہا ہے تو۔

دروا۔ مجھے مہاراج نے یاد کیا ہے۔

گوناوتی۔ جارہا ہے۔ مہاراج کا پیارا۔ ان کی آنکھوں کا تارا۔ اس نے میرے پیدا ہونے والے بچوں کی محبت کا حق چھین لیا ہے۔ دیوی ایتری کرپا چاہیئے۔ مجھے بھی اولاد دے۔ نرم گداز جسم والا بچہ جس سے میری تڑپتی ہوئی روح کو سکون حاصل ہو۔

نکشارتنا داخل ہوتا ہے۔

کیوں نکشارتنا۔ واپس کیوں جارہے ہو۔

نکشارتنا۔ مجھے نہ بلاؤ۔

گوناوتی۔ کیوں۔

نکشارتنا۔ میں راجہ بننا نہیں چاہتا۔

گوناوتی۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔

نکشارتنا۔ خدا مہاراج کو زندہ رکھے۔

گوناوتی۔ کچھ تمہیں خبر بھی ہے۔ ایک ننھا سا چور تمہارا تاج چرا کر لئے

جا رہا ہے۔

نکشارتنا۔ کون؟

گوناوتی۔ وردا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ مہاراج کو کتنا پیارا ہے۔ وہ بڑھ رہا ہے۔ دن بدن بڑھ رہا ہے۔ اور عنقریب وہ دن آنے والا ہے جب وہ مہاراج کے تاج تک پہنچ جائیگا۔

نکشارتنا۔ ہاں۔ میں نے اکثر اپنے بھائی کو ہنسی ہنسی میں اس کے سر پر تاج رکھتے ہوئے دیکھا ہے۔

گوناوتی۔ تاج سے کھیلنا ایک خطرناک کھیل ہے۔

نکشارتنا۔ ٹھیک کہتی ہو۔

گوناوتی۔ لڑکے کا خون دیوی کو بلا دو۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ دیوی خون کے لئے تڑپ رہی ہے۔

نکشارتنا۔ لیکن دیوی تو شاہی خون چاہتی ہے۔

گوناوتی۔ یہ تم سے کس نے کہا۔

نکشارتنا۔ اس نے۔ جس کو دیوی خواب میں ملتی ہے۔

گوناوتی۔ تو پھر اس لڑکے کی قربانی مہاراج کو بچانے کے لئے بہت ضروری ہے۔

نکشارتنا۔ میں سمجھتا ہوں۔

گوناوتی۔ تو جاؤ۔ وہ ابھی

جے سنگھ داخل ہوتا ہے۔

جے سنگھ (دیوی سے مخاطب ہوکر) دیوی! اگر شام کے تاروں میں تیری روشنی کا ایک شرارہ بھی موجود ہے تو بول! اپنے خادم کے دل کو تسلی دے۔ ہلکی آواز میں کہہ دے "میں یہاں ہوں بیٹا"! کوئی نہیں ــــ دیوی کہیں نہیں۔ صرف فریب ہے۔ دھوکا ہے۔ کیا تو اسقدر بیجان ہے کہ میری محبت کا شعلہ بھی اس ٹھنڈے پتھر میں زندگی کی گرمی پیدا نہیں کر سکتا۔ بیوقوف جے سنگھ تو نے کس کے لئے اپنی زندگی کے ساغر کو اوندھا کر دیا ہے؟ اس پتھر کے بت کے لئے۔ حیف ہے تجھ پر۔ اس بت کے لئے جس میں نہ جان ہے۔ نہ محبت۔ نہ رحم۔

اپارنا داخل ہوتی ہے۔

اپارنا۔ ! یہ لوگ تجھے مندر سے نکال دیتے ہیں۔ مگر تو پھر واپس لوٹ آتی ہے۔ ہاں ٹھیک ہے۔ تو سچائی ہے اور سچائی کو جلاوطن نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اس مندر میں جھوٹ کی پوجا کرتے ہیں۔ پیاری۔ تو اسقدر اداس کیوں ہے۔ کیا تیرا بھی کوئی دیوتا کھو گیا ہے۔ لیکن اس دنیا میں دیوتاؤں کی کیا ضرورت ہے۔ نہیں۔ میری پیاری۔ دنیا میں کوئی دیوی دیوتا نہیں ہے۔ تم سے زیادہ اس سزا کا صدمہ میرے دل کو ہوگا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ میں۔ تمہاری تکلیف میں شریک نہیں ہو سکتا۔ تمہاری جدائی میرے دل کو دکھاتی رہیگی۔

تمام چلے جاتے ہیں۔

رگھوپتی اور جے سنگھ داخل ہوتے ہیں۔

رگھوپتی۔ میرا غرور کیچڑ میں لتھڑ گیا ہے۔ میں نے اپنی ذات کو ذلیل کر دیا ہے۔ بیٹا اب میں تیرا گرو نہیں۔ کل تک مجھے اختیار تھا کہ تجھ پر حکم چلاؤں۔ آج میں صرف درخواست کر سکتا ہوں۔ وہ روشنی جس کی وجہ سے میں مہاراج کا مقابلہ کر سکتا تھا میرے سینے میں بجھ گئی ہے۔ مٹی کا دیا دوبارہ روشن ہو سکتا ہے۔ لیکن ستارہ ایکبار تاریک ہو کر پھر کبھی نہیں چمکتا۔ انسان کی عمر کے دن بے بقا ہیں۔ کم مایہ ہیں۔ مگر میں نے مہاراج سے ایک دن کی مہلت طلب کی۔ اب یہ دن ضائع نہ جاتے۔ اس دن کے تاریک ماتھے پر مہاراج کے خون کا ٹیکہ لگے۔ کیوں خاموش ہو بیٹا۔ کیا مجھے تجھ پر کوئی حق نہیں۔ آہ۔ کسقدر بدنصیب ہے وہ جسے محبت کی بھیک مانگنی پڑے۔ تم کیوں چپ ہو بیٹا۔ اچھا لو دیکھو میں تمہارے سامنے جھک جاتا ہوں۔

جے سنگھ۔ پتاجی! اس دل کو اور نہ دکھائیے جو پہلے ہی مجروح ہو چکا ہے۔ اگر دیوی شاہی خون کی پیاسی ہے تو میں آج شام کو اس کی پیاس بجھا دونگا۔ میں اپنے تمام قرضے اتار دونگا۔ میری واپسی کے لئے تیار رہئے۔

چلا جاتا ہے

باہر شور اٹھتا ہے۔

رگھوپتی۔ آخر کار دیوی۔ خوفناک دیوی نے آنکھیں کھول لیں۔ اور اس کا سراپ گلیوں میں چیختا ہوا پھر رہا ہے۔ بھوکی طاقتیں دنیا کے درخت کی شاخوں کو ہلا رہی ہیں۔ تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑیں گے۔

اپارنا داخل ہوتی ہے۔

اپارنا۔ جے سنگھ کہاں ہے۔

رگھوپتی۔ جا! کالے بھاگوں کی نشانی جا۔

اپارنا چلی جاتی ہے۔

رگھوپتی - اگر جے سنگھ یہ بالک ہوگا۔ نہیں جے سنگھ اپنے ... سے کو پورا کریگا۔

جے سنگھ بھاگتا ہوا داخل ہوتا ہے۔

رگھوپتی - جے سنگھ۔ کہاں ہے خون!

جے سنگھ - میرے پاس ہے۔ ہٹ جاؤ۔ گروجی۔ میں یہ خون خود اپنے ہاتھوں سے دیوی کی بھینٹ چڑھاؤنگا۔ (دیوی سے) دیوی! تجھے شاہی خون درکار ہے۔ ہے نا؟ - میں خود کھتری ہوں۔ شاہی خاندان سے ہوں۔ میرے باپ دادا تخت قناج کے مالک تھے۔ اور میری ماں کی رگوں میں راجپوتی خون دوڑتا تھا۔ میری رگوں میں شاہی خون ہے۔ اسے قبول کر اور اپنی پیاس بجھالے۔

اپنے آپ کو خنجر مار کے گر پڑتا ہے۔

رگھوپتی - جے سنگھ۔ آہ۔ ظالم۔ تو نے کیا کردیا۔ تو نے اپنے پتا کی چھاتی میں خنجر بھونک دیا۔

اپارنا داخل ہوتی ہے۔

اپارنا - میں پاگل ہوجاؤنگی۔ جے سنگھ کہاں ہے وہ؟

رگھوپتی - اپارنا - آ بیٹی۔ محبت بھرے الفاظ میں جے سنگھ کو بلا۔ اسے زندہ کرلے۔ اسے لیجا۔ میرے پاس سے لیجا۔ مگر اسے زندہ کردے

اپارنا مندر میں داخل ہوکر غش کر جاتی ہے۔

رگھوپتی - مجھے دیدو۔ دیدو۔ جے سنگھ کو مجھے دیدو۔ (دیوی سے مخاطب ہوکر) دیکھنا اس اندھی دیوی کو۔ اس احمق پتھر کی مورت کو۔ بہری۔ اندھی۔ گونگی۔ دکھوں سے بھری ہوئی دنیا اس کے چرنوں میں رو رہی ہے۔ دل اس کے پتھر کے پاؤں پر نثار ہو رہے ہیں۔ میرا جے سنگھ مجھے دیدے۔ آہ! یہ سب بے سود ہے۔ ہماری چیخیں درد سے بھری ہوئی خلا میں آوارہ پھرتی ہیں۔ اس خلا میں جس کو ہم پتھر کے بتوں سے بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ نہیں۔ سب ہیچ ہے۔

دیوی کے بت کو پھینک دیتا ہے۔

اور صحن میں نکل آتا ہے۔

گونا وتی داخل ہوتی ہے۔

گونا وتی - دیوی کی جے۔ مگر دیوی کہاں ہے؟

رگھوپتی - دیوی کوئی نہیں۔

گونا وتی - اسے واپس لائیے۔ گروجی۔ میں قربانی لائی ہوں میں اپنے دل کے خون سے اس کی پیاس بجھاؤنگی۔

رگھوپتی - دیوی کہیں نہیں۔

گونا وتی - گروجی۔ کیا دیوی مندر میں نہیں تھی۔

رگھوپتی - بیٹی۔ اگر کوئی دیوی موجود ہوتی تو کیا وہ اس بات کی اجازت دیتی کہ یہ پتھر کا بت اس کی جگہ لیلے۔

گونا وتی - سچ بتائیے گروجی کیا دیوی کوئی نہیں۔

رگھوپتی - نہیں۔ دیوی کوئی نہیں۔

گونا وتی - پھر یہاں کیا ہوا کرتا تھا۔

رگھوپتی - کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔

اپارنا مندر سے باہر آتی ہے۔

اپارنا - پتاجی!

رگھوپتی - بیٹی۔ کیا کہا تو نے! "پتاجی" کیا تو مجھے اس لفظ سے مخاطب کرکے شرمندہ کرنا چاہتی ہے۔ میرے مرحوم لڑکے نے جسے میں نے اپنے ہاتھ سے مار ڈالا ہے۔ تیری میٹھی راہی اپنی یادگار چھوڑی ہے۔

اپارنا - تو پھر مندر چھوڑ دو اور میرے ساتھ چلو۔

جے سنگھ - یہ مندر چھوڑ دوں۔ ہاں۔ ٹھیک کہتی ہے تو۔ مندر چھوڑ دونگا میں۔ لیکن اپنا فرض ادا کرکے۔ مندر کا احسان اتار کے۔ ادھر آ۔ پیاری۔ مجھ سے اس قسم کی باتیں کر کہ دنیا تمام ایک میٹھی لوری کی طرح خوشگوار معلوم ہونے لگے۔ اور موت بھی ایک دفعہ اس موسیقی کے اثر سے مسحور ہوکر سو جائے۔

اپارنا - میرے دل میں اتنی محبت ہے کہ الفاظ میں سے نہیں نکلے۔

جے سنگھ - تو اپنا سر میری چھاتی پر رکھدے۔ دو انلی چیزوں کی خاموشی کو ایک دوسرے سے ملنے دے۔ موت اور زندگی کو ہم آغوش ہونے دے . . . . . بس۔ اب مجھے جانا چاہیئے۔

اپارنا - جے سنگھ میں مرجاؤنگی۔ اسقدر ظلم نہ کرو۔

جے سنگھ - میں ظالم ہوں؟ اسی بت کی طرح جو کونے میں کھڑا ہوا مسکرا رہا ہے۔ اپارنا۔ اگر تو دیوی ہوتی تو تجھے معلوم ہوتا کہ میرے دل میں کونسا شعلہ بھڑک رہا ہے۔

بھاگ کر نکل جاتا ہے۔

اپارنا۔ میرا دل ٹوٹ جائیگا۔

چلی جاتی ہے

رگھوپتی اور نکشارتنا داخل ہوتے ہیں۔

رگھوپتی۔ لڑکے کو کہاں چھپا رکھا ہے تم نے۔

نکشارتنا۔ جہاں قربانی کے برتن رکھے جاتے ہیں۔ وہ روتے روتے سو گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کا رونا مجھ سے برداشت نہ ہوگا۔

رگھوپتی۔ جب سے سنگھ میرے پاس آیا ہے۔ اس کی بھی یہی عمر تھی۔ اور مجھے یاد ہے کہ وہ روتے روتے دیوی کے پاؤں کے پاس سو گیا تھا۔ مندر کا چراغ اس کے اشک آلود چہرے پر دھیمی دھیمی روشنی کی کرنیں ڈال رہا تھا۔ وہ رات بھی آج کی رات کی طرح ہوا کے جھکڑوں میں غرق تھی۔

نکشارتنا۔ گروجی! اب دیر نہ کیجئے۔ اس کے رونے کی آواز میرے دل کو تیز دھار والے خنجر کی طرح زخمی کر دیتی ہے۔ میں اسے نیند۔ گہری نیند میں ....

رگھوپتی۔ اگر وہ جاگ پڑا تو میں اسے پھر بیہوش کر دونگا۔

نکشارتنا۔ اگر آپ نے جلدی نہ کی تو مہاراج کو معلوم ہو جائیگا۔ کیونکہ آج شام وہ سلطنت کا کاروبار اس لڑکے کے حوالے کرنے والے ہیں۔

رگھوپتی۔ دیوی پر ایمان رکھو۔ اب لڑکا دیوی کے پنجے میں ہے۔ وہ بچ کر نہیں جا سکتا۔

نکشارتنا۔ مگر چند پال بہت ہوشیار ہے۔

رگھوپتی۔ دیوی سے زیادہ نہیں۔

نکشارتنا۔ ایسا معلوم ہوا ہے۔ گویا کوئی سایہ میرے پاس سے گذر گیا۔

رگھوپتی۔ خوف کا سایہ۔

نکشارتنا۔ گروجی آپ کس کے چیخ کی آواز سن رہے ہیں۔

رگھوپتی۔ تمہارے دل۔ ڈرے ہوئے دل کی دھڑکنے کی آواز ہے۔

نکشارتنا۔ گروجی۔ یہ کام کل پر نہ چھوڑ دیں۔

رگھوپتی۔ نہیں۔ آج کی رات کل رات سے بہتر ہے۔

نکشارتنا۔ سنئے۔ قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔

رگھوپتی۔ مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا۔

نکشارتنا۔ وہ دیکھئے۔ روشنی نظر آتی ہے۔

رگھوپتی۔ گووندا آ رہا ہے۔ نکشارتنا تو نے دیر کر دی۔

مہاراج ملازموں کے ہمراہ داخل ہوتے ہیں

گووندا۔ گرفتار کر لو (رگھوپتی سے) تجھے کچھ کہنا ہے۔

رگھوپتی۔ کچھ نہیں۔

گووندا۔ تجھے اپنے جرم کا اعتراف ہے۔

رگھوپتی۔ جرم۔ میرا جرم یہی ہے کہ میں نے اپنی کمزوری کے باعث دیوی کی خدمت میں کوتاہی کی۔ یہ سزا دیوی کی طرف سے ہے۔ تم صرف اس کے آلہ کار ہو۔

گووندا۔ رگھوپتی۔ تجھے میرے سپاہی جلاوطن کر دینگے۔ اور تجھے آٹھ سال تک وطن سے دور رہنا ہوگا۔

رگھوپتی۔ مہاراج میں نے آجتک کسی انسان کے آگے سر نہیں جھکایا۔ میں برہمن ہوں۔ میری ذات آپ سے اونچی ہے۔ میں آپ سے صرف ایکدن کی مہلت مانگتا ہوں۔

گووندا۔ منظور ہے۔

رگھوپتی۔ (طنز سے) آپ مہاراجوں کے مہاراج ہیں۔ آپ کی شوکت اور آپ کا رحم لا انتہا ہے۔

چلا جاتا ہے۔

گووندا۔ نکشارتنا اپنے جرم کا اعتراف کرلو۔

نکشارتنا۔ میں گنہگار ہوں۔ مہاراج۔ اور معافی مانگنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

گووندا۔ میں جانتا ہوں کہ تم دل کے نرم ہو۔ تمہیں کسنے بہکایا تھا نکشارتنا؟

نکشارتنا۔ میں کسی کا نام نہیں لونگا۔ مہاراج۔ میرا گناہ مجھی سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ نے اس سے پہلے اپنے بھائی کو معاف کیا ہے۔ اور اسدفعہ بھی میں آپ سے اسی سلوک کی التجا کرتا ہوں۔

گووندا۔ اٹھو نکشارتنا۔ میرے قدم چھوڑ دو۔ مجرم سے زیادہ منصف قانون کی زنجیروں سے بندھا ہوا ہے۔

ملازم۔ مہاراج۔ اپنے بھائی کو معاف کر دیجئے۔

گووندا۔ ٹھہرو۔ مجھے اس بات کو یاد رکھنے دو کہ میں راجہ ہوں۔ نکشارتنا آٹھ سال تک اس مکان میں نظر بند رہیگا جو تیرا کی

حدود کے باہر مقدس دریا کے کنارے واقع ہے۔

(انکسار تانو اٹھا کر)

اپارنا - پتا جی - یہ مندر چھوڑ دیجئے - آیئے یہاں سے چلیں مہاراج داخل ہوتے ہیں -

گووندا - دیوی کہاں ہے -

رگھوپتی - دیوی کہیں نہیں -

گووندا - مگر یہ کس کا خون بہہ رہا ہے -

رگھوپتی - مہاراج - جے سنگھ نے اپنے آپ کو مار ڈالا ہے - اسے آپ سے بیحد محبت تھی -

گووندا - کیوں؟

رگھوپتی - تاکہ اس جھوٹ کا پردہ فاش کر دے جو انسانوں کا خون چوس رہا ہے -

گووندا - جے سنگھ کی جے - اس نے موت پر فتح پالی ہے - میرے پھول اسی کے لئے ہیں -

گوناوتی - میرے راجہ -

گووندا - میری پیاری!

گوناوتی - دیوی نہیں رہی -

گووندا - ہاں اس نے پتھر کا قید خانہ توڑ کے اب عورت کے دل میں گھر کیا ہے -

اپارنا - آیئے پتا جی!

رگھوپتی - چل بیٹی - میں نے دیوی کو پالیا ہے - یہی جے سنگھ کا آخری تحفہ تھا -

عابد

غزل

مقسوم دل کروں خلشِ نیشتر کو میں　　اب کے تری نظر سے لڑا دوں نظر کو میں

میرا مذاقِ عشق زمانے پہ کھل گیا　　اب کیا کہوں چھپا نہ سکا چشمِ تر کو میں

خاموشیٔ جمود میں پھونکوں گا صورِ حشر　　تیری خبر سنا کے دلِ بے خبر کو میں

یا آرزو نے عمرِ محبت سنوار دی　　یا دستِ آرزو سے گیا عمر بھر کو میں

کتنی گداز بخش ہے صبحِ تجلیات　　پاتا ہوں ہر نفس میں نسیمِ سحر کو میں

گریہ نشاطِ چشم ہے اسے بیخودی مگر　　کس دھوپ میں سکھاؤں گا دامانِ تر کو میں

ساغر یہ ہے شباب میں معیارِ مے کشی
آنکھوں سے کھینچتا ہوں شرابِ نظر کو میں

ساغر

خیالات واحساسات

(اناطول فرانس کی تصنیف لطیف اپیکورس کے باغ کے بعض حصوں کا ترجمہ)

مآلِ حیات

انسانی نسل ایک غیر معین وقت تک ترقی نہیں کر سکتی۔ اپنے ارتقا کیلئے ہماری زمین کو چند خاص طبعی اور کیمیاوی حالتوں کا پابند رہنا پڑتا ہے۔ اور یہ خاصیتیں دائمی نہیں ہیں (طبعی ہیں)۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب زمین رہنے کے ناقابل تھی۔ اس کی سطح بہت گرم اور تر تھی۔ ایک وقت ایسا آئے گا جب یہ زمین رہنے کے ناقابل ہو جائے گی۔ اس کی سطح بہت خشک اور سرد ہو جائے گی۔

جب سورج بجھیگا (ایک حادثہ جس کا وقوع یقینی ہے) اس وقت انسانی نسل فنا ہو چکی ہوگی۔ اس سرزمین کے آخری باشندے اولین باشندوں کی طرح بے وقوف احمق اور جاہل ہوں گے۔ وہ تمام فنون وصنائع فراموش کر چکے ہوں گے۔

یہ لوگ مصیبت اور پریشانی کے عالم میں غاروں میں جمع ہو کر بیٹھ رہیں گے ان غاروں میں جو کوہ ہائے یخ کے قریب واقع ہوں گے برف کے شفاف تودے ان برباد شہروں پر حرکت کریں گے۔ جہاں آج انسان محنت کرتا ہے دکھ جھیلتا ہے۔ اُمیدیں باندھتا ہے۔

تمام درخت سردی کی کثرت سے فنا ہو جائیں گے۔ صرف صنوبر منجمد دنیا کے واحد مالک رہ جائیں گے۔ نسل انسانی کے آخری نمونے جان سے تنگ ہوں گے انھیں ہمارے متعلق کچھ علم نہ ہوگا۔ ہماری محبت۔ ہمارے دکھ۔ ہماری صلاحیت وقابلیت سے وہ بالکل بے خبر ہوں گے۔ حالانکہ ان کی رگوں میں بھی ہمارا ہی خون موجزن ہوگا۔

مہابت وعلمیت کے دنوں کی یادگار، ایک شعاع قابلیت ان کے فرسودہ دماغوں میں فروزاں ہوگی جس کا نام لیکر وہ اپنے آپ کو ان ریچھوں کے گروہ سے محفوظ رکھ سکیں گے جو ان کے اردگرد زیر زمین غاروں میں گھوم رہے ہوں گے۔ تمام قومیں۔ تمام نسلیں برف کے نیچے دب گئی ہوں گی۔ شہر۔ قصبے۔ موضعے۔ سڑکیں باغ غرض کہ پرانی دنیا کی ہر ایک چیز فنا ہو چکی ہوگی۔

عورتیں۔ بچے۔ بوڑھے۔ انھیں شور انگیز غاروں میں جمع ہو کر سوراخوں میں سے دھندلا اور مدہم سورج کو بلند ہوتا ہوا دیکھیں گے۔ دھندلی پیلی سی شعاعیں سورج کی سطح پر نمودار ہوں گی۔ عین اسی طرح جس طرح شعلے بجھ جانے والی انگیٹھی کے گرد رقص کرتے ہیں۔ ستاروں کی درخشاں برف تمام دن سرد ہوا میں تاریک آسمان پر چمکتی رہے گی۔ وہ لوگ یہ منظر دیکھیں گے۔ مگر اپنے دل کی اُداسی اور تاریکی کے باعث ان کو کسی بات کا احساس نہ ہوگا۔ آخر ایک دن نسل انسانی کی آخری یادگار ایک کمزور احمق انسان محبت اور نفرت سے بے پروا اپنا آخری سانس لیگا۔ اور یہ کرہ اسی طرح بڑھتے ہوئے سیلاب کی طرح۔ اپنے ساتھ سکان کی خاموش فضاؤں میں نسل انسانی کی راکھ۔ ہومر کی شاعری اور یونانی سنگ تراشی کے شاہکار۔ برف کی طرح ساتھ لئے ہوئے گردش کرتا رہے گا۔

اس مردہ دنیا کے قلب سے اس کے بعد کوئی خیال ابد ولا انتہا کی طرف صعود نہ کرے گا۔ اس مردہ دنیا سے جہاں انسان نے اس قدر دلیری سے کام لیا ہے۔ اور یہ کچھ کر دکھایا ہے۔ کم از کم انسان کا کوئی خیال باقی نہ رہے گا کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی اور خیال اپنے وجود کا احساس نہ کرنے لگ جائے گا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ موجودہ نسل انسانی کی قبر کسی اور نسل کا گہوارہ نہ بنے گی۔ نئی روح کس کی ہوگی۔ میں نہیں کہہ سکتا شاید کیڑے کوڑوں کی انسان کے ساتھ شہد کی مکھیوں اور چیونٹیوں نے تجزیے کر کے دکھائے ہیں سچ ہے کہ یہ چیزیں ہماری طرح نور اور حرارت کی محتاج نہیں۔ مگر بعض ایسے جانور بھی ہیں جو سردی سے بے پروا ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔

ماضی کے صناع

ہم صحیح طور پر ماضی کے مناظر ومظاہر کی تصویر نہیں کھینچ سکتے۔ جسے عام طور پر "مقامی رنگ" کہا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت خواب سے زیادہ نہیں ہے۔ ہم نے انتہا کاوش سے کام لیکر پرانے زمانے کے رسم ورواج کی نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن پرانے زمانے کے صناع اس قسم کی لاحاصل کاوشوں میں کبھی وقت ضائع نہ کرتے تھے۔ ماضی کے صناع پرانے زمانے کے لوگوں کو اپنے زمانے کے لباس میں پیش کرتے تھے۔ وہ لوگ ہمارے لئے اپنے زمانے کی معاشرت کے تمام پہلوؤں کو واضح کر گئے ہیں۔ کیا کوئی صناع اس سے زیادہ کچھ کر سکتا ہے؟

ان کے تمام تخلیقات زندگی کے شعلوں سے لبریز ہیں اور ان کا اثا بھی

تک کم نہیں ہوا۔

جہالت

میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ جہالت نہ صرف مسرت بلکہ زندگی کا ایک جز لازمی ہے۔ اگر ہمیں ہر شے کے متعلق علم ہو جائے تو ہم ایک لمحے کے لئے زندگی بسر نہ کر سکیں۔ جو جذبات زندگی کو شیریں بنا دیتے ہیں وہ جھوٹ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور فریب و وہم پر پرورش پاتے ہیں۔ اگر کسی انسان کو خدا کی طرح ہر شے کا علم ہو جائے اور وہ اس علم کو پھیلا دے تو کائنات اسی وقت فنا ہو جائے گی۔ اور زندگی سایے کی طرح غائب ہو جائے گی۔ صداقت دنیا کو تباہ کر ڈالے گی۔

صداقت آرٹ کا مقصد نہیں ہے۔ ادب کا مقصد صرف حسن اور آفرینش حسن۔

پچھلے دنوں میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا جس میں شاعر اور فلسفی مصنف نے ایک ایسی دنیا کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے جس میں رہنے والے انسان غم و مسرت اور اشتیاق و تعجب کے جذبات سے بالکل مبرا ہیں۔ اس خیالی بہشت کی سیر کرنے کے بعد جب میں اپنی دنیا میں واپس آیا اور انسانوں کے دکھ سکھ دیکھے تو میرا دل ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔

اسی ہمدردی میں حقیقی مروت کا راز پوشیدہ ہے۔ جن لوگوں نے اپنے جذبات کو مار دیا ہے انھوں نے ساتھ ہی مسرت اندوہ نیکی۔ بدی۔ اور حسن کو بھی فنا کر دیا ہے۔ یہ لوگ دانا ہیں۔ مگر ان کی کوئی قیمت نہیں۔ کوئی قدر نہیں۔ ان کی زندگی طویل ہو تو اس کا کیا فائدہ ہے۔ ان کی زندگی ایک خلا سے عبارت ہے

اس کتاب کے مطالعے نے میرے دل میں گہری ہمدردی کے جذبات پیدا کر دیئے۔ اور ثابت کر دیا کہ وہم اور تخیل کی بسائی ہوئی دنیا کسی طرح اس دنیا کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہم لوگ کبھی اس تخیلی بہشت کے باشندے بننا پسند نہ کریں گے۔

مہتاب رائے

شب ماہتاب

زورق مہتاب ہے اور سطح بحر آسماں — چشم ظاہر بیں سے پوشیدہ ہے قعر آسماں

دور میں تارے فلک پر لرزہ بر اندام ہیں — ننھے ننھے دل گرفتار غم انجام ہیں

چرخ کا روشن لبادہ ہے مزین نور سے — منتشر جلوے اٹھا لایا ہے کوئی طور سے

چاندنی کا سیل عالمگیر اور پھیلا ہوا — بارش سرچشمۂ تنویر اور پھیلا ہوا

نور میں بھیگی ہوئی خاموش اجلی کائنات — دامن غفلت میں ہے روپوش اجلی کائنات

محفل شب ہے کہ اک بیخانۂ حسن و جمال — منظر شب ہے کہ اک افسانۂ حسن و جمال

رزمگاہ دہر پر طاری ہے افسون سکوت — شورش ہنگامۂ عالم ہے مرہون سکوت

اُف یہ گہری خامشی کتنی تاثر خیز ہے — توسن تخئیل کی رفتار کتنی تیز ہے

شیشۂ دل میں ضیا افگن ہیں انوار حیات

کھل رہے ہیں رفتہ رفتہ مجھ پہ اسرار حیات

عدم تلونڈوی

کیا خواب تھا؟

(فرانسیسی فسانہ نگار مارسل بریفو کے قلم سے)

میں نے اُس سے جنون کی حد تک محبت کی۔ انسان کیوں محبت کرتا ہے؟ محبت سے اُسے کیا ہاتھ آتا ہے؟ اُس آدمی کی حالت کیسی عجیب ہو جاتی ہے۔ جو صرف ایک ہی عورت کو دیکھنا چاہتا ہے۔ ایک ہی خیال میں ڈوبا رہنا چاہتا ہے۔ ایک ہی آرزو کے پیچھے دوڑنا چاہتا ہے۔ ایک ہی نام کو جپنا چاہتا ہے۔ جو اُبلتے ہوئے چشمے کی طرح ہر وقت اُس کے سینے سے نکلتا اور بے نشان فضا میں چکر لگا کر پھر اُسی سینے میں لوٹ جاتا ہے۔

دوستو! میں تمھیں اپنی کہانی سناتا ہوں۔ یہ آپ بیتی ہی نہیں جگ بیتی بھی ہے۔ محبت کا نقشہ ہر جگہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اُس کی چال بھی سدا ایک ہی قسم کی ہوتی ہے۔ جو کچھ مجھ پر گذر چکا ہے۔ تمام عاشقوں پر وہی گزرا ہوگا "اُس" سے آنکھیں چار ہوئیں۔ نگاہیں گلے ملیں۔ دل بغلگیر ہوئے اور محبت کی خوبصورت اَن دیکھی زنجیر نے دو روحوں کو ایک ساتھ جکڑ دیا۔ پورے بارہ مہینے شمع و پروانہ کا معاملہ رہا۔ پیاسا، ٹھنڈے چشمے پر جا رہا۔ حسن تھا۔ ناز تھا۔ محبت تھی۔ راحت تھی۔ میں تھا اور میری مسرتیں تھیں۔ پھیلی ہوئی باہیں تھیں۔ بکھری ہوئی کلیاں تھیں۔ مست نگاہیں تھیں۔ شیریں لب تھے۔ گرم پہلو تھا۔۔۔۔ اپنی عشرتوں کا کیا حال بیان کروں؟ محبوبے تاب کے لئے وہ کون چیز تھی جو اُس دیوی کے پاس بے طلب حاضر نہ تھی؟ میں نے پورا ایک برس اس طرح گزار دیا کہ نہ دن کی خبر تھی نہ رات کی۔ نہ زندگی کی نہ موت کی۔۔۔

پھر وہ مر گئی! لیکن ہائے کیسے؟ مجھے نہیں معلوم۔ کچھ یاد نہیں۔ مینہ برس رہا تھا۔ رات اندھیری تھی۔ وہ بھیگی ہوئی باہر سے آئی۔ صبح کھانسی شروع ہوئی۔ ایک اٹھوارے میں پلنگ کی ہو گئی۔ مجھے نہیں معلوم اس بیچ میں کیا ہوا؟ صرف اتنا یاد ہے کہ ڈاکٹر آتا تھا۔ نسخہ لکھتا تھا۔ اور چلا جاتا تھا گھر کی ماما۔ دوا لاتی تھی۔ اور پلا دیتی تھی۔

ہاں یہ بھی خیال ہے کہ اُس کے ہاتھ گرم تھے۔ ماتھا دہک رہا تھا۔ آنکھیں۔ ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ میں اُس سے کچھ کہتا تھا۔ اور وہ جواب دیتی تھی مگر کیا کہتی تھی؟ ہائے اب کوئی بات بھی یاد نہیں۔ کچھ یاد نہیں۔ کچھ یاد نہیں مر گئی لیکن مجھے اُس کا ہچکیاں لینا اور رو رو کر ٹھنڈی آواز میں کچھ کہنا خوب یاد ہے۔ ماما نے چلا کر کہا "بس نہ رو۔ میں سب سمجھ گئی ہوں"!

مگر وہیں، ترآہ! میں خاک بھی کچھ نہ سمجھ سکا مجھے ہوش ہی کہاں تھا کہ سمجھتا؟ پھر میں نے پادری کو اپنی طرف مڑتے اور یہ کہتے سنا "تیری محبوبہ"۔ مجھے گمان ہوا کہ پادری اُس کی توہین کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ مر چکی ہے۔ اور اب میرا اُس کا معاملہ کسی پر ظاہر نہ ہونا چاہئے۔ میں نے اُسی وقت پادری کو ڈانٹ بتائی۔ اور ہاتھ پکڑ کے باہر نکال دیا۔

ایک اور شخص بھی آیا۔ بڑی ہمدردی سے پیش آیا۔ اور مرنے والی کے غم میں آنسو بہانے لگا۔

جنازے کے بارے میں مجھ سے پوچھا گیا۔ یاد نہیں کیا باتیں ہوئیں؟ البتہ تابوت کی شکل پھاوڑے کی آواز۔ اور قبر کا کھدنا یاد ہے۔ الٰہی تیری پناہ۔ توبہ خدایا!

دفن کر دیا؟ ہاں دفن کر دیا!۔۔۔ وہ قبر میں سلا دی گئی۔ اُس کی سہیلیاں گھر میں پرسے کو آئیں۔ میں بھاگ گیا۔ گلی گلی مارا مارا پھرتا رہا۔ پھر صبح کو میں دنیا کی سیاحت پر روانہ ہو گیا۔۔۔۔۔

کل لوٹ کر پیرس پہونچا ہوں۔ میری نظر اپنے پرانے کمرے پر۔ پلنگ پر۔ سارے سامان پر پڑی۔ ہر چیز اپنی پہلی جگہ پر رکھی تھی۔ مجھے تعجب ہوا کہ انسانی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ مگر اُس کا ٹھاٹھ بعد میں بھی باقی رہتا ہے۔ میں نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ جو کچھ ہو چکا تھا سب آنکھوں میں پھر گیا۔ رنج و غم کا ایسا ہجوم ہوا کہ قریب تھا کہ کھڑکی کھول کے پھاند پڑوں۔

جب میں کسی طرح بھی اُس چھت کے نیچے ٹھہر نہ سکا۔ جس نے اپنے سایہ میں مجھے اور اُسے سال بھر رکھا تھا۔ تو میں نے اپنی ٹوپی اُٹھائی۔ اور باہر جانے لگا۔ ڈیوڑھی میں نگاہ اُس آئینہ پر پڑ گئی۔ جسے اُس نے وہاں ٹانگا تھا کہ آتے جاتے اپنی صورت دیکھا کرے۔ میں آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور ایسا معلوم ہوا گویا اُس کی صورت اُس پر چھپی ہوئی موجود ہے۔

میں کھڑا تھرتھرا رہا تھا۔ نگاہیں اُس شفاف۔ کھری۔ بلوری سطح پر گڑی ہوئی تھیں جو کبھی اُس کے عکس سے منور ہو جایا کرتی تھی۔ مجھے محسوس ہوا گویا خود اس آئینے سے محبت کر رہا ہوں۔ میں نے اپنی انگلیوں سے

اُسے چھوا، وہ ٹھنڈا تھا۔ ... اس یاد سے دل پھٹتا ہے۔ لے اُداس۔ خاموش بھیانک۔ چمکیلے آئینے! تو نے مجھے کیوں اس عذاب میں مبتلا کر دیا؟ خوش نصیب ہے وہ جو آئینے کی تمام داستان بھول جائے۔ اُسے بھی بھول جائے جو اُس میں مسکراتا نظر آتا تھا! آئینے میں محبوبہ کے سوا مجھے اور کون دکھائی دیتا تھا؟ ایک دفعہ وہ چہرہ آنکھوں میں پھر گئی۔ آہ کیسی مصیبت ہے!

میں گھر سے نکل بھاگا۔ نہیں معلوم کدھر کو چل پڑا؟ مگر برابر چلتا رہا۔ یہاں تک کہ اپنے آپ کو قبرستان میں پایا۔ نظر کے سامنے اس کی قبر تھی۔ اور قبر کے تعویز پر لکھا تھا "محبت کی اور مر گئی"۔

یہی اُس کی قبر ہے! وہ اسی میں سو رہی ہے! لیکن اُس کا جسم ...؟ آہ وہ پھول سا بدن خاک ہو گیا! میں رو دیا۔ پھوٹ پھوٹ کے رویا۔ سر قبر پہ جھکا دیا بہت دیر ہو گئی۔ اب شام ہو گئی۔ یکایک دل میں ایک جوش پیدا ہوا۔ عجیب و غریب جوش۔ مایوس عاشق کا دیوانہ جوش ... میں نے رات بھر قبر پر آنسو بہانے کی ٹھان لی۔ مگر اس خیال سے ڈر گیا کہ کوئی دیکھ لے اور باہر نکال دے۔ خدایا کیا کروں؟

قبر سے دور ہٹ گیا۔ اس شہر خموشاں میں چلتا رہا۔ اللہ اکبر۔ کتنا چھوٹا شہر اور کتنی بڑی آبادی ہے! ہم رہتے کو محل۔ چلنے کو شاہراہیں۔ پینے کو ٹھنڈا پانی۔ کھانے کو زمین کی تمام نعمتیں چاہئیں لیکن اس شہر کے بسنے والوں کو کچھ نہیں چاہئے۔ وہ خود اپنی زمین کی غذا اور اُس کا فضلہ ہیں۔

قبرستان کے سرے پر چند ٹوٹی پھوٹی پرانی قبریں دکھائی دیں۔ اُن پر گھنے درخت کھڑے تھے۔ مگر تر و تازہ ہونے پر بھی حسرت و غم کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ کیونکہ مردوں کا گوشت پوست کھا کے بڑے پلے تھے وہاں کوئی نہ تھا میں ایک ڈال پکڑ کے چڑھ گیا۔ اور پتوں کی آڑ میں چھپ رہا۔

جب خوب اندھیرا ہو گیا۔ اور رات بھیگ چکی تو میں نکلا۔ دبے پاؤں چلنے لگا کہ کوئی چاپ پا نہ جائے۔ حالانکہ اُس آبادی میں میرے اور گڑے ہوئے مردوں کے سوا کوئی تیسرا نہ تھا۔ برابر چلتا رہا۔ مگر اُس کی قبر نہیں ملی۔ میں نے ہاتھ بڑھا دیئے۔ اور ہر قبر کو چھونے اور ٹٹولنے لگا۔ مگر وہ کسی طرح بھی نہیں ملی۔ میں اندھوں کی چال چل رہا تھا۔ ہر قدم پر ٹھوکر لگتی تھی۔ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ مگر میری دل کی آنکھیں ہر قبر کے تعویذ پر مردے کا نام پڑھتی جاتی تھیں۔ عجیب رات تھی۔ بڑی ڈراؤنی رات تھی۔ پہروں پھرتا رہا۔ مگر اُس کی قبر نہ ملنا تھی نہ ملی۔

آسمان بھی اندھیرے گھپ میں تھا۔ نہ چاند تھا نہ کوئی ستارہ۔ میں ان ہیبت ناک راستوں میں چلنے سے کانپ رہا تھا۔ ہر طرف قبریں ہی قبریں تھیں آگے پیچھے۔ دائیں۔ بائیں قبروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اب میں تھک کر ایک قبر پر بیٹھ گیا۔ بالکل سناٹا تھا۔ سینے میں میرا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا۔ اُس کی ہر چوٹ مجھے صاف سنائی دیتی تھی۔

"ہائیں! یہ آواز کیسی"؟ بے اختیار میں چلا اُٹھا۔ "یہ میری دماغی تھکن کا اثر ہے یا ہڈیوں سے بھری ہوئی قبروں کے اندر کچھ ہو رہا ہے"؟

میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ میں سہما ہوا تھا۔ خوف و دہشت سے میرا تمام بدن برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ قریب تھا کہ چیخیں مارنے لگوں۔ بلکہ موت کے منہ میں کود پڑوں۔

اچانک اُس قبر کا سنگی تعویز ہلا جس پر میں بیٹھا تھا۔ میں اُچھل کے دوسری قبر پر جا گرا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ قبر پھٹ پڑی اور اندر سے مردہ باہر نکل آیا! ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ۔ گوشت پوست نام کو نہیں۔ دراصل یہی مردہ باہر نکلنے کے لئے قبر کو ہلا رہا تھا!

اب میرے ہوش واپس آ گئے تھے۔ میں نے قبر کے کتبے پر نظر ڈالی تو لکھا تھا "یہاں جاک اولیونٹ دفن ہے۔ ۵۱ سال کی عمر میں مرا۔ اپنے خاندان پر مہربان رحمدل۔ اور شریف تھا"۔

مردے نے بھی اونچی آواز سے اپنی تربت کی یہ تحریر پڑھی۔ پھر پتھر کا ایک ٹکڑا اُٹھا کے "سے مٹا ڈالا۔ اور اپنی آنکھوں کے خالی سوراخوں سے بغور دیکھ کر اپنی بے گوشت کی انگلی سے لکھنا شروع کیا "یہاں جاک اولیونٹ دفن ہے۔ جو ۵۱ برس کی عمر میں مرا۔ اُس نے دولت کے لالچ میں اپنے باپ کی جان لی۔ اپنی بیوی سے بدسلوکی کی۔ اولاد کو تکلیف دی۔ پڑوسیوں کو دھوکا دیا۔ جہاں تک بھی چوری کر سکتا تھا۔ چراتا رہا۔ پھر بد قسمت مر گیا"۔

تحریر ختم کر کے مردہ چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ میں نے نگاہ اُٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں سب مردے اپنی قبروں سے نکلے ہوئے کھڑے ہیں۔ سب نے اپنے اپنے جھوٹے کتبے مٹا ڈالے۔ اور سچی سچی باتیں لکھ دیں۔ میں نے دیکھا کہ اکثر نے اپنے آپ کو پرلے درجے کا لالچی۔ دغاباز۔ حاسد۔ شریر۔ بدمعاش لکھا۔ حالانکہ ان کے کتبوں میں بڑی بڑی تعریفیں لکھی تھیں۔

مجھے خیال آیا۔ "اُس" نے بھی اپنی قبر پر ضرور کچھ لکھا ہو گا۔ میں نڈر ہو کر مردوں کی طرح اس بھیڑ میں دوڑنے اور اُسے ڈھونڈنے لگا ... وہ مل گئی۔ سب مردوں کی طرح وہ بھی کھڑی تھی۔ میں نے پہچان لیا۔ مگر اُس کا منہ دکھائی نہ دیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ اپنی قبر پر جھک پڑی۔ اور تعویذ کے اس کتبے کو کہ "محبت کی اور مر گئی" مٹا ڈالا۔ اور یہ لفظ لکھ دیئے۔

"ایک رات گھر سے نکلی کہ اپنے عاشق سے بے وفائی کرے۔ سردی لگ گئی۔ بیمار پڑی۔ اور بے وفا مر گئی"۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ دوسرے دن لوگوں نے مجھے اُس کی قبر کے پاس بیہوش پڑا پایا۔

عبدالرزاق

نفسیات تفریح

عیدوں اور تہواروں پر بچوں کے کھلونوں سے دوکانیں پٹی پڑی رہتی ہیں اور غالباً کوئی ایسا بچوں والا گھر نہ ہوگا جو مختلف قسم کے کھلونوں سے بالکل خالی پایا جائے۔ کوئی بچہ جھنجھنا بجا رہا ہے۔ کوئی گیند سے دل بہلا رہا ہے۔ کہیں آراستہ پیراستہ گڑیوں کی شادی رچی ہوئی ہے۔ کہیں لکڑی کے گھوڑے سے کھیلا جا رہا ہے۔

اسی طرح جب آپ کسی شہر میں داخل ہوں گے تو یقیناً وہاں متعدد ہوٹل کلب۔ اور شراب خانے ایسے ملیں گے جہاں بے فکرے تفریحاً تاش شطرنج چوپڑ اور بلیرڈ وغیرہ کھیلنے میں مصروف پائے جائیں یا "دختِ رز" سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔

کوئی ایسا متمدن ملک پیش نہیں کیا جا سکتا جہاں سواحل دریا یا پہاڑوں کی چوٹیوں پر تفریح گاہیں مخصوص نہ ہوں۔ جن میں ہر سال خوش باش اصحاب کی ایک کافی تعداد چند ہفتے کے لئے منتقل ہو کر سکونت پذیر نہ ہو جاتی ہو۔ بلکہ ایسی کوئی قوم نہیں پائی جاتی جو اپنے مذاق و پسند کے موافق مخصوص مشاغل تفریحی میں کافی حصہ نہ لے ــــ چینی افیون استعمال کرتے ہیں۔ "مغربی رسیلے" شراب کے شوقین ہیں۔ عرب قہوہ نوشی کے عادی ہیں۔ اور قریب قریب تمام اقوام مشترکہ طور پر تمباکو اور چائے کی دلدادہ ہیں۔

ان سب کا مقصد کچھ دیر کے لئے ذہن کو افکار و مصائب کے ہجوم سے نجات دینا اور تفریح ہے ــــ سیکش شراب صرف اس لئے پیتا ہے کہ اپنے تخیل کو چند لمحے کے لئے سکون اندوز کر سکے۔ اسی طرح شطرنج اور تاش کھیلنے والوں۔ حقہ اور سگریٹ پینے والوں یا سبزہ زاروں میں گلگشت کرنے والوں کا منشا بھی قریب قریب یہی ہوتا ہے۔

اکثر علماء نفسیات نے کمسن اور سن رسیدہ اشخاص کے مشاغل تفریحی کی علت موجبہ سے بحث کی ہے۔ **اسپنسر** نے کہا ہے کہ "بچے نشاط اور قوت نمو کی فراوانی کے سبب سے کھیلوں میں زیادہ مصروف پائے جاتے ہیں"۔ لیکن یہ نظریہ جوان اور سن رسیدہ اشخاص پر منطبق نہیں ہوتا۔ ہم ایک شخص کو دیکھتے ہیں کہ جب کثرت مشاغل سے اس کے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں۔ تو وہ شطرنج اور تاش کھیل کر دل بہلاتا ہے۔ یہاں یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ فراوانی قویٰ کی وجہ سے ان مشاغل میں مصروف ہوا۔ بلکہ اسپنسر کا نظریہ تو بچوں کے مشاغل تفریحی کی بھی پوری پوری تشریح نہیں کرتا۔ کیونکہ اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ کھیل کو کیوں پسند کرتے ہیں؟ اور کام کو کیوں پسند نہیں کرتے؟ ہم اپنے نوجوانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ سائیکل پر سوار ہو کر مارے مارے گھومتے پھرتے ہیں۔ یہاں تک کہ پسینہ میں شرابور ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ اس محنت شاقہ کو نہ صرف بخوشی برداشت ہی کر لیتے ہیں۔ بلکہ اس سے محظوظ بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان سے کسی کام کے لئے کہیں جانے کو کہا جائے گو انھیں اپنی "تفریح" کے برابر مشقت نہ اٹھانی پڑے۔ تاہم یقیناً یہ آمد و رفت ان پر سخت گراں گزرے گی۔ وہ اسے ایک مصیبت خیال کریں گے

جرمن ماہر نفسیات **جروس** نے کہا ہے کہ "تفریح مشاغل کی مشق تدریجی کو کہتے ہیں"۔ اس کے خیال میں فطرت ہیں ــــ نیز دوسرے بلند طبقے کے حیوانات کو ــــ مختلف کھیلوں کے ذریعہ آئندہ زندگی کے لئے تیار کرتی ہے۔ ننھی بلی گیند سے کھیلتی ہے۔ تاکہ جب وہ بڑی ہو تو اس میں کشمکش حیات سے مقابلہ کی استعداد پیدا ہو جائے۔ اور وہ چوہے وغیرہ شکار کر کے شکم پری کر سکے۔ شیر کے بچہ کا شیرنی کی دم سے کھیلنا بھی اسی مصلحت کے تحت ہوتا ہے۔ یہی حال انسان کے بچوں کا ہے ــــ وہ گیند اس لئے کھیلتے ہیں کہ نشانہ بازی میں مہارت حاصل ہو۔ لکڑی کا گھوڑا بنا کر اس پر سوار ہونا مشق شہسواری کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ لڑکیاں گڑیاں کھیلتی ہیں تاکہ امورِ خانہ داری سے واقفیت پیدا کریں۔

لیکن یہ نظریہ بعض ایسی تفریحات پر منطبق نہیں ہوتا جن کا مستقبل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نیز اس سے بھی سن رسیدہ اشخاص کی تفریحات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ البتہ اس نظریہ کا ظاہری پہلو بچوں کے مشاغل مخصوصہ پر ضرور صادق آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تفریحات آئندہ پیکار زندگی کے لئے استعداد مہیا کرنے پر مبنی نہیں ہوتیں۔ نہ ان سے مشاغل مستقبل کی مشق مقصود ہوتی ہے بلکہ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ اشغال حیات میں معروفیت انسان کی ان قوتوں میں داخل ہے۔ جو کافی عرصے کے بعد ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اور وہ انسان میں اس وقت ظاہر نہیں ہوتی جب تک وہ سن طفولیت کے مراحل طے نہ کرے۔ بچے کے قوائے عقلیہ ہمارے قدیم ترین "وحشی" اسلاف کے قویٰ سے متجاوز نہیں ہوتے۔ بچہ ماں کے پیٹ میں اس عہد عتیق کی یاد تازہ کرتا ہے جو "انسان" پر انسان بننے کے دوران میں گزر چکا ہے۔ اس کے بعد عہد طفلی میں نشوونمائے عقلی کے اعتبار سے ہمارے "اسلاف اولین" کے خصائل و

عادات کا عکس نظر آتا ہے۔ اس سے آج بچوں کا لہو و لعب حقیقتاً ہمارے اسلاف کی ایک قدیمی یادگار ہے۔

پس۔ بچہ اس لئے نہیں کھیلتا کہ وہ کام کرنا نہیں چاہتا بلکہ دراصل وہ یہ نہیں جانتا کہ اسے کیا کرنا چاہئے؟ جو شخص بچوں کو کام نہ کرنے پر ملامت کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی انھیں اس بات پر ملامت کرے کہ ان کے ریش و بروت نہیں ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "کام" کی کیا تعریف ہے؟ اور اس میں اور "کھیل" میں کیا فرق ہے؟ **کام** ایک موجودہ غیر دلچسپ معروفیت ہے۔ جس سے آئندہ کسی مفید نتیجہ کی توقع ہو۔ اور "**کھیل**" ایک موجودہ دلچسپ معروفیت ہے۔ جو بنفسہٖ دلچسپ ہو لیکن اس سے مستقبل میں کوئی مفید نتیجہ مرتب ہونے کی اُمید نہ ہو۔

کام ایک جدید ترین انسانی قوت پر مبنی ہے جو ہمارے اسلاف متوحش کی قوتوں سے مختلف ہے۔ اور ہم اسے **قوت بصیرت** کہتے ہیں۔

ہمارے اسلاف اولین زراعت کرکے چھ مہینے تک غلہ کا انتظار نہیں کرتے تھے۔ نہ کرایہ پر دینے کے لئے مکان بناکر فوائد بعیدہ کے منتظر رہتے تھے۔ وہ اپنے اہل و عیال کے لئے مستقل وجہ معاش حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ بلکہ روزانہ اتنی غذا مہیا کر لینا کافی سمجھتے تھے جو اس دن کے لئے سامان شکم پری فراہم کردے۔ یہ غذا کبھی زمین کھود کر نکالی جاتی کبھی درختوں کے تنوں سے حاصل کی جاتی۔ کبھی پرندے مچھلیاں یا دوسرے حیوانات شکار کرکے مہیا کی جاتی۔ بعض مرتبہ جنگلی درختوں کے پھلوں اور پتوں سے کاربراری ہوتی۔ اس کی مثال میں امریکہ، افریقہ اور ایشیا کے بعض وحشی قبائل کو پیش کر سکتے ہیں جن کی طرز معاشرت یہی ہے۔ یا بندروں کی بعض اقسام کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جو اسی طرح زندگی بسر کرتی ہیں۔

پس۔ بصیرت انسان کی ایک جدید قوت ہے۔ اور اسی لئے وہ تمام قویٰ میں سب سے کم ثبات پذیر ہے۔ نیز یہی وجہ ہے کہ انسان میں اس کا ظہور جملہ قوتوں کے بعد پایا جاتا ہے۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ بچہ کے کام نہ کرنے کا اصلی سبب یہ ہے کہ وہ صاحب بصیرت نہیں ہوتا۔ اور وہ کھیلتا اس لئے ہے کہ کھیل ہمارے قدیم اسلاف کا مشغلہ ہے۔

بچہ ایسی حالت میں پیدا ہوتا ہے کہ وہ قدیمی قویٰ کا سرمایہ دار ہوتا ہے لیکن اس میں جدید قوت نہیں ہوتی — یعنی "**قوت بصیرت**" یہ قوت اس کے اندر بعد میں نمودار ہوتی ہے۔ جس طرح نوع انسانی کے درمیان سب کے بعد ظہور پذیر ہوئی۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ "بصیرت" جدید ترین قوت انسانیہ ہے۔ اور اسی لئے اس کا ثبات و قرار بھی سب سے کم ہے۔ چنانچہ بوڑھے آدمیوں میں سب سے پہلے اسی قوت پر آثار پیری نمایاں ہوتے ہیں۔ انسان جب بہت زیادہ عمر رسیدہ ہو جاتا ہے تو اس کی قوت بصیرت مفقود ہو جاتی ہے۔ بوڑھا آدمی بدستور چلتا پھرتا اور کھاتا پیتا ہے۔ اپنے اعزا و احباب سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن اپنی دولت اچھے مصرف میں صرف نہیں کرتا۔ مخمور آدمی سب سے پہلے اسی قوت کو کھوتا ہے۔ یہی حال مریض کا ہے۔ جب مخمور، مریض یا بوڑھے پر علامات ضعف طاری ہوتی ہیں۔ تو وہ عموماً انھیں کام سے عاجز کر دینے کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔

اب ہم بچوں اور معمر آدمیوں کے کھیل کی علت نمائی بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ بچہ گیند کھیلتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہمارے اسلاف اسی قسم کے مشاغل میں مصروف رہتے تھے! وہ اُچھل کود اور دوڑ دھوپ پسند کرتا ہے۔ وہ آنکھ مچولی اور شکار ہی کھیل کھیلتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہمارے قدیم آباؤ اجداد کے یہی انہماکات تھے!! لڑکیاں گڑیوں سے کھیلتی ہیں۔ اس لئے نہیں کہ امور خانہ داری میں مشق و مہارت پیدا کریں۔ بلکہ اس لئے کہ عورت قدیم الایام سے تربیت اولاد میں مصروف ہے۔ لہٰذا جب لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اس میں فطرتاً یہ قوت موجود ہوتی ہے۔

معمر لوگوں کے کھیل اور اُن کی ورزشیں بھی ہمارے اسلاف قدیمہ کے اشغال کا پرتو ہیں۔ ان میں اور بچوں کے کھیلوں میں صرف یہ فرق ہوتا ہے کہ بچہ ہنوز کام کی قوت و استعداد پیدا نہ ہونے کی وجہ سے کھیلتا ہے لیکن معمر آدمی کام کی قوت کو خوابیدہ کرکے یا اس پر پردہ ڈال کر یا اسے کسی دوسری صورت سے ساکن کرکے اور قوائے قدیمہ کو بیدار و برانگیختہ کرکے کھیل میں مصروف ہوتے ہیں۔

ہم نے انسان میں قوت شغل کے تیزی سے معطل ہو جانے کا سبب واضح کر دیا۔ اب ہمارے لئے یہ بہت آسان ہے۔ کہ ہم اکثر اقوام میں افیون و شراب وغیرہ مسکرات و منشیات کے رواج و انتشار کا راز دریافت کر سکیں۔

یہ ثابت ہو گیا ہے کہ انسان نے کام کرنا بہت بعد کے زمانے میں سیکھا ہے۔ اس لئے وہ بیداری۔ سرگرمی اور مستقبل کے لئے جدوجہد سے بہت جلد مضمحل و پژمردہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ قوت ایک جدید قوت ہے جس

کی بنیادیں ابھی تک اعصاب انسانی میں مستحکم نہیں ہوئی ہیں۔ نہ اُس کی شاخیں دماغ کے گوشوں میں پوری پوری نشوونما حاصل کرسکی ہیں۔ اسی لئے یہ قوت اس پر گراں گزرتی ہے۔ اور وہ اس کے تعطل و تنویم کی غرض سے شراب وغیرہ مسکرات کا استعمال کرتا ہے۔

شراب سب سے پہلے انسانی قوت عمل کو معطل کرتی ہے۔ مخمور پر جب کیف طاری ہوتا ہے تو وہ نہ کوئی کام کرتا ہے نہ اس میں کام کی استطاعت ہوتی ہے۔ اور جب قوت عمل پر پردہ پڑ جاتا ہے تو قدیم وحشیانہ قوتیں بیدار ہوجاتی ہیں۔ یعنی وہ بدمست ہوجاتا ہے (حالت بدمستی میں وہ حقیقتاً "وحشی" ہوتا ہے)۔ اور اسی لئے وہ اپنے نفس کو قولاً وعملاً قیود تمدن سے آزاد کرلیتا ہے۔

گویا سکر بھی ایک قسم کا "کھیل" ہے جس میں قوائے قدیمہ بیدار اور قوت جدیدہ یعنی قوت عمل معطل ہوجاتی ہے۔ بعینہ جس طرح آدمی ایک ہاتھ سے کوئی کام کرکے دوسرے ہاتھ کی تکلیف بھلا دینا چاہتا ہے۔

لیکن کبھی کبھی بغیر سکر کے بھی انسان کھیل اور تفریح میں حصہ لیتا ہے اس وقت اس کے کھیل کی کیا توجیہہ کی جائے گی؟

جو شخص معمر لوگوں کے کھیلوں اور ان کی ورزشوں پر غور کرے گا۔ وہ انھیں فی الحقیقت بچوں کے کھیلوں کی طرح ہمارے اسلاف وحشیہ کے مشاغل سے حرف بحرف مطابق پائے گا۔ ہم تفریح کی غرض سے کھیتوں میں گھومتے ہیں۔ ندیوں کے کنارے شکار کھیلتے ہیں۔ چھوٹی کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں پہاڑوں پر جاکر سیر کرتے ہیں۔ اور جنگلوں میں دن دن بھر مارے پھرتے ہیں۔ لیکن اس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ کیا یہ سب کچھ قدیم وحشیانہ قویٰ کی بیداری و برانگیختگی کے لئے نہیں ہوتا؟ تاکہ ہماری قوت جدیدہ —— سرگرمی جد وجہد اور بصیرت کی قوت —— یعنی کام کی قوت سکون پذیر ہو آسودہ ہوسکے۔ کیا تاش۔ شطرنج وغیرہ سن رسیدہ لوگوں کے کھیل بچوں کی "آنکھ مچولی" سے ماہیتاً مختلف ہیں؟ کیا ان کھیلوں میں ہر ایک کھلاڑی یہ نہیں چاہتا کہ اپنا مقصد پوشیدہ رکھے۔ اور حریف کا نقطۂ خیال معلوم کرکے اسے شکست دیدے؟

ہمارے اسلاف متوحش زمانہ قدیم میں یونہی زندگی بسر کرتے تھے انھیں اکثر ایسا اتفاق ہوتا کہ دشمن انھیں تاک لیتا اور وہ اس سے پوشیدہ ہوکر اس کی غرض معلوم کرنے کے لئے کوشاں رہتے۔ ان کی فراست تیز اور ذکاوت صحیح تھی۔ اور اسی وجہ سے وہ دشمنوں سے محفوظ رہتے تھے۔ چونکہ ہم بھی انہی کی نسل سے ہیں۔ اس لئے ان کے خصائل وعادات وقتاً فوقتاً ہمارے اندر ابھرتے رہتے ہیں۔ کبھی ہم خود دانستہ انھیں بیدار کرلیتے ہیں۔ اور ہمیں اس میں لطف آتا ہے۔

ابتدائے تخلیق میں "انسان" ایک منجمد مادہ کی صورت میں زمین سے چپکا ہوا تھا۔ اس وقت اس میں "کشش ارض" کے مقابلہ کی طاقت نہ تھی بعد ازیں اس مادۂ منجمد میں زندگی کی رو پیدا ہوئی۔ اور وہ ایک خلیہ[1] کی صورت میں تبدیل ہوگیا۔ جس میں کشش ارض سے مقاومت اور حرکت کی قوت موجود تھی۔ یہ خلیہ پانی میں تیرتا رہا۔ اور اس میں قوت حیات ترقی پذیر اور طاقتور ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ پانی سے نکل کر خشکی پر آگیا۔ اور اس نے رینگنا شروع کیا۔ اس کے بعد اس نے چاروں ہاتھ پاؤں سے چلنا سیکھا اور اب وہ بتدریج اس قابل ہوگیا کہ اپنے پاؤں پر سیدھا کھڑا ہوسکے۔ لیکن چونکہ اس نے پیروں کے بل کھڑا ہونا بہت بعد میں سیکھا ہے اس لئے ہمیں کھڑے رہنے میں بہت زیادہ احساس تعب ہوتا ہے۔ بیٹھنے میں اس سے کم تکلیف ہوتی ہے۔ اور واقعی راحت وآرام صرف اس وقت نصیب ہوتا ہے۔ جب ہم خلی بالطبع ہوکر فرش پر "مچھلی" کی طرح دراز ہو جائیں۔

ابتداءً جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو کئی مہینے تک وہ بیٹھنا نہیں جانتا اور لیٹا رہتا ہے۔ پھر بیٹھتا ہے۔ پھر گھٹنوں چلتا ہے۔ اور سب سے آخر میں بمشکل پاؤں چلتا ہے۔ یہی حال ہمارے قوائے عقلیہ کا ہے۔ پس ان میں جو قوت نشوونما کے اعتبار سے جس قدر بعد میں رونما ہوتی ہے۔ اسی قدر زیادہ تکلیف دہ اور حوادث برداشت کرنے کے ناقابل ہوتی ہے۔ نیز افراد میں اس کا ظہور سب کے بعد ہوتا ہے۔

کیا انسان کا پیٹ کے بل گھسٹنا یا چاروں ہاتھ پاؤں پر چلنا جنون کی علامات ابتدائی سے نہیں ہے؟ لیکن کیوں؟ —— جدید قوائے عقلیہ کے تعطل اور قدیم قوتوں کے ابھر آنے کے سوا اس کی کیا تاویل کی جاسکتی ہے؟!

نوع انسانی کے کسی فرد کی عمر اس مختصر زمانے میں محدود نہیں ہوتی۔ جو اس کی ولادت سے شروع ہوتا ہے —— بلکہ ہم کرۂ زمین پر اس دن سے ابتک "زندہ" کہے جانے کے مستحق ہیں جب سے ابتداءً **حیات** خلیہ اولی کی شکل میں نمودار ہوئی۔ ہم پر کئی "ارتقائی دور" گزر چکے ہیں اس لئے ہمارے اندر جدید قویٰ پیدا ہوگئے ہیں۔ اور ہم قدیم خصائل وعادات کو رفتہ رفتہ ترک کرتے جاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہماری جدید قوتیں ہنوز غیر مستقل۔ ناپائیدار اور معلق ہیں۔ اور جسم انسانی کی بنا میں استحکام کے ساتھ جاگزیں ہوکر "فطرت ثانیہ" نہیں بن سکی ہیں!!!

منظور سرورش بھوپالی

---

[1] علمائے تشریح الابدان کہتے ہیں کہ جاندار اجسام بہت سے چھوٹے چھوٹے خانوں پر مشتمل ہیں جن میں سے ہر ایک کو "خلیہ" (سل) کہتے ہیں۔ (سرورش)

انکارِ محبّت پر

(اپنے "پریتم" سے)

زندگی سے مجھے بیزار نہ کر دینا تھا! حسرت مرگ کو بیدار نہ کر دینا تھا!
یوں مرے عشق کا انکار نہ کر دینا تھا

رشتۂ ضبط الم چھوٹ چلا ہی پیارے! آنکھ سے چشمۂ غم پھوٹ چلا ہی پیارے!
دلِ مایوس بس اب ٹوٹ چلا ہی پیارے

یہی امید تھی اب تک تپش افروزِ حیات کہ اثر گیر محبت ہیں مرے احساسات
کیا خبر تھی، کہ بجھے گی مری شمعِ جذبات

عشق بلبل سے، گُلِ تر کبھی منکر نہ ہوا! جذبِ پروانہ بھی، کب شمع سے ظاہر نہ ہوا؟
مذہبِ عشق میں ایسا کوئی "کافر" نہ ہوا

شاہدِ الفتِ شبنم ہے شعاعِ خورشید "کبک" کے عشق کی کرتا ہے قمر بھی تائید
"لیلیٰ شب" کے لئے منظرِ انجم ہے "عید"

مگر اِک تم نے کیا، عشق و وفا کا انکار یعنی خورشیدِ محبت کی ضیا کا انکار
آہ! انکارِ محبت ہے خدا کا انکار

مَیں نے مانا! کہ مرے دل کی حقیقت باطل! مری دنیا، مری ہستی، مری فطرت، باطل!
پر یہ کس طرح سے مانوں کہ محبت "باطل"

تم نمک پاش بھی ہوتے، دلِ شوریدہ پر! برق گرتی، تو مری حسرتِ خوابیدہ پر!
رحم کھانا تھا مگر الفتِ غمدیدہ پر

تم مجھے قیدیٔ زنداں مصیبت کرتے! اور دل کو مرے آوارۂ ذلت کرتے!
کاش! اس طرح نہ انکارِ محبت کرتے

تلخئ ہستئ ناشاد گوارا تھی مجھے خلش حسرتِ برباد گوارا تھی مجھے
بیکسی میں بھی، ہر افتاد گوارا تھی مجھے
مگر، اب یہ غمِ جانسوز نہ ہوگا برداشت اور، یہ زخم جگر دوز نہ ہوگا برداشت
آہ! یہ داغِ غم افروز نہ ہوگا برداشت
تم بھلاتے تو ہو بدبخت تمنائی کو! اپنی زلفوں سے تو پوچھو مری رسوائی کو
یہ بھی کیا بھول گئی ہیں؟ کسی سودائی کو
جیسے وابستۂ زنجیرِ وفا کرتے ہیں! اسے اس طرح فراموش کیا کرتے ہیں؟
کیا مسلنے کے لئے پھول چُنا کرتے ہیں!
دلِ مضطر سے نہ اب صبر کیا جائے گا! مجھ سے اب چاک گریباں نہ سیا جائیگا!
نامرادوں کی طرح کس سے جیا جائیگا
رُوح، اب غمکدۂ دہر سے گھبرائیگی! نامرادی مجھے اب قبر میں لیجائے گی!
دوست! بس اب وہیں آرام کی نیند آئیگی
(غیر مطبوعہ) نوشؔ صدیقی

غزل

ساغر چڑھائے پھول کے ہر شاخسار نے دریا بہا دئے خم ابر بہار نے
روشن کئے چراغ لحد لالہ زار نے اس مرتبہ تو آگ لگا دی بہار نے
اودی گھٹائیں چھائی ہیں اے میکشو چلو پریوں کے تخت روک لئے سبزہ زار نے
اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں ایک آہ کی بے آس ہو کے اس دل امیدوار نے
سینہ تک آئے سوتے میں کب میرے دست شوق دھوکہ دیا تجھے ترے پھولوں کے ہار نے
صبح شب وصال مجھے منفعل کیا تو نے تو کیا تری نگہ شرمسار نے
بے شغل جام و بادہ جواں ہو گئے ریاضؔ ڈالا اثر یہ آمدِ فصلِ بہار نے

افسانہ

(۱)

ڈاکٹر وحید ایک عرصہ تک افریقہ میں مقیم رہے تھے۔ اور وہاں کے حبشیوں کے عادات واطوار۔ ان کے توہمات اور مقامی روایتوں سے بخوبی واقف تھے۔ چونکہ عرصہ تک حبشی قبائل میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اور جنگلوں میں مارے مارے پھرتے رہے۔ اس وجہ سے جب ہندوستان واپس آئے تو وہاں کی بہت سی عجیب وغریب چیزیں اپنے ہمراہ لائے۔ وہم پرست حبشی عورتوں کے تعویذ۔ طرح طرح کے چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں کی لکڑی کی مورتیں اور گڑیاں۔ مردوں کے ہتھیار۔ اور کوڑیاں۔ قسم قسم کے زہر آلود تیر شترمرغ کے پر۔ اور سینکڑوں ایسی ایسی عجیب اور انوکھی چیزیں جو بیش قیمت تو نہ تھیں مگر حد درجہ دلچسپ۔

ایک دن اتفاق سے میں بھی ان کے گھر گیا۔ انھوں نے اپنے قیام افریقہ کے بہت سے قصے سنائے۔ جنوں۔ بھوتوں اور مقامی توہم پرستی کی داستانیں۔ عجیب وغریب واقعات کا ذکر مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوا اور میں بہت دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا۔

ڈاکٹر وحید کی سوغاتوں میں سب سے زیادہ قیمتی اور باوقعت چیز ایک بہت بڑا عمدہ لعل تھا۔ جو انھیں افریقہ کے ایک حبشی قبیلہ کے سردار کی لڑکی کا علاج کرنے کے معاوضے میں حاصل ہوا تھا۔ ڈاکٹر وحید نے اس قیمتی لعل کے متعلق بہت سی عجیب عجیب روایتیں سنائیں۔ منجملہ اس کے یہ بھی تھی کہ یہ لعل اس قبیلہ میں سینکڑوں برس سے چلا آتا تھا۔ اور ہر سردار اس کی جان و دل سے حفاظت کرتا تھا۔ یہ لعل ایک چرمی بٹوہ میں ایک سیاہ مرمریں مرتبان میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس مرتبان کو بھی دیکھا عجیب بے ڈھنگا کالے پتھر کا مرتبان تھا۔ جس پر عجیب وغریب تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

روایت مشہور تھی کہ لعل کسی دیوتا کا تھا۔ اس نے کسی بات پر خوش ہو کر اس قبیلہ کے کسی سردار کو عطا کر دیا تھا۔ اس میں یہ تاثیر تھی کہ چوری نہ جاتا تھا۔ جہاں تک ڈاکٹر صاحب کی زبانی معلوم ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسے چرانے کی متعدد بار کوشش کی گئی مگر یہ پھر اس مرتبان میں واپس آگیا۔ یہ بات مجھے کسی قدر انوکھی معلوم ہوئی۔ اور ڈاکٹر صاحب سے اس کی مزید توضیح چاہی۔ انھوں نے اپنے چشم دید واقعات سنا کر مجھے اور بھی حیران کر دیا کہ کوئی بار چوری گیا مگر کسی نہ کسی طرح چور کا پتہ لگ گیا اور پھر اس مرتبان میں واپس آگیا۔ اگر وہ اس قبیلہ کے سردار کی لڑکی کو تندرست نہ کر دیتے تو انھیں ایسی نایاب شے ہرگز دستیاب نہ ہوتی۔ یہ لڑکی طاعون میں مبتلا تھی۔ اور بستر مرگ پر پڑی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے فوری انجکشن سے مرض زائل ہو گیا۔ اور اس خدمت کے عوض انھیں یہ لعل دیدیا گیا۔ جو ان کا موروثی تبرک تھا۔ ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ انھیں قبیلہ کا محسن سمجھ کر وہ منتر بھی بتا دیا گیا تھا۔ جس کے ذریعہ اس لعل کے چرانے والے کا پتہ چل جاتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب قیام افریقہ میں تھوڑا بہت جادو بھی سیکھ گئے تھے اور وہاں رہنے سہنے کی وجہ سے تھوڑا بہت دماغ میں وہم بھی پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ لعل کی گمشدگی کے بعد دوبارہ واپس آجانے کی روایت پر پورا یقین رکھتے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ بتایا ہوا منتر حرف بحرف صحیح ہے۔ کبھی خطا نہیں کرتا

میں نے اس لعل کو دیکھا۔ کافی بڑا تھا۔ ایک اخروٹ کی طرح اور کافی چمکدار مقامی حبشی اسے اپنی زبان میں "جوشوچیاں" کہتے تھے۔ جس کا ڈاکٹر صاحب نے اردو میں "چشم خونیں" ترجمہ کیا تھا۔ واقعی اس کی شکل آنکھ سے مشابہ تھی اور اس قدر سرخ تھا جیسے خون کبوتر یا انار کا دانہ۔

میں اس کی روایتیں سنکر اپنے گھر واپس آیا اور پھر دوستوں میں اس کا تذکرہ کیا۔

(۲)

تھوڑے ہی عرصہ میں اس عجیب وغریب اور ساتھ ہی ساتھ قیمتی لعل کی افواہیں شہر بھر میں مشہور ہو گئیں۔ ڈاکٹر وحید کے دو دوست تھے مسٹر سلیم اور احمد علی انھوں نے بھی لعل کو دیکھا۔ اور اس کے متعلق روایتوں کو سنا تھا۔ مگر ایک دن دل میں بدی آگئی۔ اور اس لعل کو اڑانے کے لئے سازش کرنے لگے۔ وہ کہتے تھے کہ لعل کے واپس آنے کے متعلق جتنی

روایتیں مشہور کر رکھی تھیں۔ وہ محض چوروں کو ڈرانے اور دھوکہ دینے کا ایک طریقہ تھا۔

ایک دن سلیم نے احمد علی سے کہا: "وحید کا لعل اڑاؤ"۔

"مگر اس کے متعلق تو سنا ہے کہ دوبارہ مرتبان میں ......"

"تم بھی بڑے توہم پرست ہو۔ عقل نہیں ہے۔ بھلا ایسا ممکن ہو سکتا ہے!"

"پھر تو کیا اسکیم سوچی ہے؟"

"پرسوں ان کے گھر دعوت ہے۔ ہم دونوں کو بھی بلایا گیا ہے۔ دونوں رات کو چلیں گے۔ اور دعوت کے دوران میں لعل اڑا دیں گے"۔

"کیونکر؟"

سنو اس طرح۔ انھیں آج کل لعل اور افریقی عجائبات کے حالات سنانے کا شوق چرایا ہے۔ پس اغلب ہے کہ پرسوں بھی دعوت میں اس کا ضمناً ذکر آجائے گا۔ تم تجویز کر دینا کہ اسے سب حاضرین محفل کے سامنے دکھایا جائے۔ وہ یقیناً مہمانوں کی خاطر سے مرتبان لے آئیں گے۔ اور لعل نکال کر دکھانا شروع کریں گے۔ جب لعل سب مہمانوں میں یکے بعد دیگرے دور کر رہا ہو تم چپکے سے میز پر سے اٹھ کر کمرہ کے اس حصہ میں پہونچ جانا جہاں بجلی کا سوئچ (بٹن) لگا ہوا ہو۔ جب میں مقررہ اشارہ کر دوں تم فوراً روشنی گل کر دینا۔ میں اس عرصہ میں لعل اڑا لوں گا۔ پھر دیکھوں افریقہ کا جادو اسے کیونکر مرتبان میں واپس لا سکتا ہے۔ اگر ایک دفعہ لعل میرے ہاتھ آگیا تو پھر اس کا ملنا محال ہے۔ اور اگر پھر بھی مرتبان میں واپس چلا گیا تو ہم پھر یقین کر لیں گے کہ ڈاکٹر کی وہم پرستی درست ہے۔ اور واقعی یہ لعل آسیب زدہ ہے۔ اور اس پر کچھ اسرار ہے۔ اور اس کے متعلق جتنی افواہیں مشہور ہیں وہ سب سچ ہیں"۔

"تم کیا اشارہ کرو گے؟"

"دیکھو! اچھی طرح سمجھ لو اس میں مطلق دیر نہ ہو۔ جب لعل دورہ کرتا ہوا میرے پاس بیٹھنے والے مہمان کے قریب پہنچ جائے گا تو میں میوہ کی تھالی میں سے ایک اخروٹ اٹھا کر اپنے لبوں سے لگاؤں گا۔ اس وقت تم روشنی گل کر دینا۔ میں اندھیرے میں چپکے سے لعل اڑا دوں گا۔ تم بھی اپنی جگہ آبیٹھنا۔ سمجھ گئے۔ کتنا عمدہ پلاٹ ہے کہ کوئی وجہ نہیں کہ خطا کر جائے۔ اگر لعل ہاتھ آگیا تو پانچ ساڑھے پانچ لاکھ سے کم نہ ہوگا"۔

دونوں نے خوب اچھی طرح انتظامات کر لئے بلکہ ایک دفعہ فرضی لعل چرانے کی مشق بھی کر لی۔ اور دعوت کے دن کا انتظار کرنے لگے۔

(۳)

شام کو دعوت کا وقت آگیا۔ میں بھی مدعو تھا۔ وقت مقررہ پر ڈاکٹر کی مشہور کوٹھی پر پہونچ گیا۔

دعوت کا کمرہ خوب سجا ہوا تھا۔ بیچ میں قرینہ سے لمبی لمبی میزیں بچھی ہوئی تھیں جن کے گرد مہمان آآ کر بیٹھتے جاتے تھے۔ چہار طرف بجلی کے قمقمے روشن اور تمام کمرہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ میں بھی ایک کونہ میں جا بیٹھا۔

مسٹر سلیم اور احمد علی صاحبان ممتاز مہمانوں میں سے تھے۔ لیکن تعجب تھا کہ دونوں دوست آج علیحدہ علیحدہ بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر وحید آئے۔ بہت خوش خلق اور ہنس مکھ میزبان تھے۔ آٹھ بجے نوکروں نے کھانا چننا شروع کیا۔ میزبان سمیت دعوت میں کل تیرہ آدمی تھے۔ کھانا شروع ہوا۔ اور پیالوں کی دلنواز صدا کمرہ میں گونجنے لگی۔

دوران طعام میں مختلف موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ ابھی مہمان آئس کریم ختم کر کے مٹھائی کھا رہے تھے کہ کسی مہمان نے افریقہ کے متعلق سلسلۂ جنبانی شروع کر دی۔ ڈاکٹر صاحب نے موقعہ غنیمت سمجھ کر لکچر دینا شروع کر دیا جب تمام پر لطف واقعات یکے بعد دیگرے سنائے جا چکے تو مشہور لعل "چشم خونیں" کی باری آئی۔ دو ایک لوگوں نے جنھوں نے اس روایتی لعل کے متعلق بہت کچھ سنا۔ مگر کبھی آنکھ سے نہ دیکھا تھا۔ اسے دیکھنے کے لئے بہت اصرار کر رہے تھے۔ میں نے بھی تجویز کر دی کہ میزبان صاحب اس لعل کو سب حاضرین محفل کو دکھائیں۔

ڈاکٹر وحید نے سب حاضرین کی طرف دیکھا اور میز پر سے اٹھ کر اپنے کمرہ میں گئے۔ اور ایک سیاہ مرتبان اٹھا لائے۔ اسے میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

(۴)

مرتبان میز پر رکھا گیا۔ سب لوگوں کی پرشوق نظریں اس عجیب الہیئت افریقی نادر لعل کی زیارت کرنے کے لئے بیتاب نظر آتی تھیں۔

احمد علی کو شاید سخت گرمی لگ رہی تھی کہ کمرہ میں ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔

ڈاکٹر وحید نے مرتبان میں سے ایک چرمی بٹوہ نکالا۔ اور اسے کھولا۔ اندر سے ایک جگمگاتا ہوا اخروٹ کے برابر لعل نکلا جس کی تراش بالکل آنکھ کی مانند تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا: "اس لعل کا نام "چشم خونیں" ہے۔ یہ مجھے افریقہ کی سیر و سیاحت کے زمانہ میں ایک خدمت کے عوض ہاتھ لگا تھا۔ اس میں قیمتی ہونے کے علاوہ ایک صفت یہ بھی ہے کہ اگر اسے چرا لیا

جائے تو یہ پھر اسی مرتبان میں واپس آجاتا ہے۔ شاید آپ اس پر یقین نہ کریں۔ مگر مجھے اس کا اتنا ہی یقین ہے جتنا آپ لوگوں کی اس کمرہ میں موجودگی کا۔

حضرات! اسے چرانے کی کئی بار کوشش کی گئی مگر مجھے افریقہ کی جادوگرنیوں نے ایک ایسا لاجواب منتر بتا دیا ہے کہ فوراً چور کا پتہ لگ جاتا ہے اور لعل پھر اس مرتبان میں آکر مقید ہو جاتا ہے۔ میں اس کا بارہا تجربہ کرچکا ہوں۔ آپ چاہیں اس پر یقین کریں یا نہ کریں۔ لعل بہت قیمتی ہے کم از کم چھ لاکھ کا ہوگا۔ ۲۲۸ قیراط وزن ہے۔ اتنا فقید العصر لعل شاید دنیا کے کسی ذخیرہ میں نہ مل سکیگا۔ آپ اس تاریخی لعل کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہر شخص دیکھکر اپنے برابر والے مہمان کو دیتا جائے۔

یہ کہکر ڈاکٹر صاحب نے "چشم خونیں" اپنے برابر والے آدمی کو دیا۔ یہ ایک بوڑھے بیرسٹر صاحب تھے۔ اُنھوں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے روشنی میں دیکھکر اپنے قریب کے مہمانوں کو دے دیا۔ حکیم امجد علی صاحب نے ہتیلی پر رکھکر وزن کا اندازہ کیا۔ اور مسکرا کر کہا "خدا مبارک کرے"۔

یکے بعد دیگرے لعل دورکرتا ہوا آٹھویں آدمی کے پاس پہنچا۔ اتفاق سے دہلی کے مشہور چودھری لالہ ہیرالال تھے۔ اُنھوں نے اسے فنی نگاہ سے جانچا۔ اور کہا "میں نے اتنا وزنی اتنا چمکدار اور صاف لعل کہیں نہیں دیکھا"۔

گیارہویں نمبر پر ایک کالج کے پروفیسر بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے بھی اس لعل کو ہاتھ میں لیکر جانچا۔ خوب فلسفیانہ تعریف کی۔ اور چاہتے تھے کہ اپنے برابر کے مہمان مسٹر سلیم کو دیدیں کہ یکایک کمرہ میں تاریکی ہو گئی۔ جس کے ہوتے ہی لوگوں نے چیخیں مارنی شروع کیں۔ ہلڑ مچ گیا۔ اور اس تمام بدنظمی میں نہ معلوم کیا کیا ہو گیا۔

(سلیم نے اخروٹ لبوں سے لگا کر احمد علی کو خبردار کر دیا تھا)

لوگ حیرت سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ مگر دکھائی کچھ نہ دیتا تھا۔ اندھیرا گھپ اور مہمانوں کی بے ہنگم آوازیں ہر شخص پریشان تھا۔ کہ دفعتاً روشنی کیوں بجھ گئی۔

ڈاکٹر وحید بھی حیران کھڑے تھے کہ دن ہی کو تمام بجلی کے تار ٹھیک کرائے گئے تھے۔ دفعتاً برقی سلسلہ میں نقص پیدا ہو جانا کیا معنی رکھتا تھا۔

اس بے انتظامی میں سلیم نے پروفیسر کے ہاتھ سے لعل چھین کر اپنے اس بٹوہ میں رکھا۔ جو اس نے ابھی اپنی جیب سے نکالا تھا۔ اس بٹوہ کو فوراً کھلی ہوئی کھڑکی میں سے باہر پائیں باغ میں پھینک دیا گیا۔

سلیم نے سوچا تھا کہ رات کو باغ میں کون جائے گا۔ جب وہ یہاں سے فارغ ہو کر نکلیگا تو چلتے وقت بٹوہ اُٹھا لیگا۔ اور گھر کا راستہ لیگا۔ کمرہ میں اس پر کوئی شبہ نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ لعل پروفیسر تک پہنچا تھا۔ اس نے تو ہاتھ بھی نہ لگایا تھا۔ نیز وہ خود موجود تھا۔ اس کی جامہ تلاشی لی جا سکتی تھی!

احمد علی اپنی کرسی پر آبیٹھا تھا۔

ڈاکٹر وحید نے فوراً نوکر کو آواز دی۔ وہ دوڑا ہوا آیا۔ اور جلدی سے بجلی کا بٹن دبایا۔ روشنی ہوئی تو لوگوں کی جان میں جان آئی۔

پروفیسر نے گھبرا کر جلدی سے کہا "حضرت! ــــ غائب ہو گیا!"

"کیا غائب ہو گیا؟" ڈاکٹر وحید نے پوچھا۔

"چشم خو . . . . !"

"اچھا؟"

سب مہمان ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ یہ کس ذات شریف کا کام تھا۔ کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ کہ لعل کس نے اُٹھا لیا . . .

پروفیسر بیچارا بہت کھسیانا ہو رہا تھا۔ کیونکہ لعل اس کے ہاتھوں میں پہنچکر غائب ہوا تھا۔ مگر اسے بھی معلوم نہ تھا۔ کہ روشنی گل ہو جانے پر جو بدنظمی پھیلی تھی۔ اس وقت کس نے اس کے ہاتھ سے جھپٹا مار کر لعل چھینا تھا!

(۵)

ڈاکٹر وحید نے مسکراتے ہوئے حاضرین کو مخاطب کیا۔ "بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آج کی دعوت میں کوئی شاطر چور بھی تشریف لے آئے تھے۔ غالباً وہ لعل چرانے سے زیادہ اس روایت کی تصدیق کرنا چاہتے تھے کہ مسروقہ لعل مرتبان میں دوبارہ واپس آتا ہے یا نہیں ــــ خیر! کیا مضائقہ ہے۔ مجھے بھی منتر یاد ہے۔ ابھی معلوم کئے لیتا ہوں کہ یہ کس کا کام ہے۔ کوئی صاحب اپنی جگہ سے نہ اُٹھیں۔ اشرف (ملازم) تم کمرہ کے دروازے بند کردو۔ اس کھڑکی کو کیوں کھولا تھا۔ اسے بھی بند کردو"۔

"حضور! چند لوگوں کو گرمی لگ رہی تھی اس وجہ سے میں نے مناسب سمجھا کہ تازہ ہوا آنے کے لئے کھڑکی کھول دوں"

"اچھا جاؤ"

حضرات آپ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہیں میں ابھی چور کا پتہ چلا لیتا ہوں۔ ذرا منتر کے لئے ضروری انتظامات مکمل کر لوں"۔

یہ کہکر اُنھوں نے میز پر سے مرتبان اُٹھایا۔ اور کمرہ سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد عجیب چہ میگوئیاں ہوئیں۔ دوستوں نے ایک دوسرے

کو چوری کا ذمہ دار ٹھیرایا۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب پھر واپس آ گئے۔ اس وقت ان کے پاس مرتبان نہ تھا۔

"حضرات آپ لوگ قطار باندھکر بلیرڈ روم میں چلئے۔ دیکھو اشرف کوئی شخص پیچھے نہ رہ جائے۔"

سب لوگ قطار باندھکر بلیرڈ روم کی جانب روانہ ہوئے۔ سلیم اور احمد علی بھی برابر چل رہے تھے۔

بلیرڈ روم میں ایک لمبی میز بلیرڈ کھیلنے کی رکھی ہوئی تھی۔ اس کے دوسری طرف ایک چھوٹی سی میز کمرہ کی دیوار سے لگی ہوئی رکھی تھی جسپر وہی سیاہ مرتبان رکھا ہوا تھا۔

آپ لوگ اس بلیرڈ ٹیبل کے اس جانب قطار باندھ کر کھڑے ہو جائیں اور نمبروار ایک ایک کر کے میز کے اس طرف ہوتے ہوئے چکر کھا کر اس سامنے والی میز کے قریب سے گزریئے۔ جس پر وہ مرتبان رکھا ہوا نظر آ رہا ہے جب آپ اس کے سامنے سے گزریں تو اپنا سیدھا ہاتھ اس کے اوپر چھوتے ہوئے گزر جائیں۔ اور چکر کاٹ کر اس دیوار کے ساتھ ساتھ کھڑے ہوتے چلے جائیں۔ یہ عمل ہر شخص کو کرنا ہوگا۔ جو چور ہوگا (جو یقیناً اس ہی مختصر مجمع میں ہے) جب اس مرتبان پر ہاتھ لگائیگا یہ فوراً جادو کے زور سے بتادے گا کہ یہ چور ہے۔ جو لوگ معصوم و بے گناہ ہیں بے ضرر چھو کر گزر جائیں گے۔ مگر چور جونہی اسے ہاتھ لگائے گا یہ فوراً بتادے گا کہ یہی شخص لعل کا چور ہے۔ اس مرتبان میں یہ خوبی لاکھ روپیہ کی ہے بلکہ لعل کو محفوظ رکھنے میں مرتبان معجزہ کا کام دیتا ہے۔"

"منطقی پروفیسر کی رگ استدلال پھڑک اٹھی اور وہ بیتاب ہو کر بولے کیا بیوقوفی کی باتیں کرتے ہو۔ حبشیوں میں رہکر تمھاری عقل بھی ماری گئی۔ بھلا یہ بیجان مرتبان بول سکتا ہے۔ ارے میاں! دیوانے کیوں ہو گئے ہو ابھی تو کچھ نہیں گیا۔ اپنے اس شعبدہ کو بس یہاں تک ہی محدود رکھو۔ جلد پولیس کو مطلع کرو۔ وہ تحقیقات شروع کر دے گی۔ اس جادو وادو سے کیا ہوگا۔ جلد کام کرو۔ عجیب لاپروا آدمی ہو!"

پروفیسر صاحب آپ ذرا صبر کیجئے۔ پولیس کو کیوں خبر کروں۔ جب یہ جادو کا مرتبان خود بتادے گا کہ چور فلاں شخص ہے۔ مجھے اس قسم کے بیسیوں تجربے ہو چکے ہیں۔ اس مرتبان نے کبھی خطا نہیں کی۔ اس پر افریقی دیوتا کا سایہ ہے!"

ہر شخص نے دیکھا کہ ڈاکٹر وحید اس وقت بہت سنجیدگی سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے الفاظ اور چہرے کی ساخت سے متانت ٹپکتی تھی۔ اور یہ معلوم ہوتا [illegible] اطمینان تھا کہ لعل کہیں نہیں جا سکتا۔ اس کا واپس آنا بالکل یقینی تھا۔ اب ہر شخص کو پورا یقین نہیں تو کسی قدر تذبذب ضرور ہونے لگا تھا کہ یہ مرتبان اور لعل واقعی آسیب زدہ تھے۔ اور افریقہ کے جن اس کی حفاظت کر رہے تھے۔

یکے بعد دیگرے سب لوگوں نے گزرنا شروع کیا۔ اور ہر ایک مرتبان کو ہاتھ لگا کر بلیرڈ روم کی دوسری دیوار کے ساتھ ساتھ کھڑا ہونے لگا۔ سلیم اور احمد علی قطار کے آخر میں کھڑے ہوئے تھے۔ سلیم کی پیشانی پر پسینہ آ رہا تھا۔ اور اضطراب کی وجہ سے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

جب آخری آدمی اور خود ڈاکٹر صاحب نے مرتبان کو ہاتھ لگا لیا تو دفعتاً اس کمرے کی روشنی بھی گل ہو گئی۔

(۴)

سب لوگ اندھیرے میں دیوار کے قریب کھڑے تھے کہ ایک منٹ بعد پھر روشنی ہو گئی۔ اور ڈاکٹر صاحب نے بآواز بلند حکم دیتے ہوئے کہا "اب ہر شخص اپنا اپنا سیدھا ہاتھ روشنی میں کر کے دیکھے۔ ہر شخص کے سیدھے ہاتھ کی ہتیلی اور انگلیاں سیاہ ہیں۔ سوائے مسٹر سلیم کے۔"

ہر ایک ہکا بکا ہو کر سلیم کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے بھی روشنی میں دیکھا تو سب لوگوں کی انگلیاں اور ہتیلیاں کالی تھیں۔ لیکن اس کی انگلی پر کوئی دھبہ نہ تھا۔ بالکل سفید پڑی تھی۔

ڈاکٹر وحید نے مسکراتے ہوئے کہا "میں آپ لوگوں کو زیادہ دیر تک حیران رکھنا نہیں چاہتا۔ حقیقتاً یہ مرتبان "پراسرار" نہیں ہے بلکہ چوروں کو دھوکہ دینے کی غرض سے میں نے یہ افواہ مشہور کر رکھی تھی۔ مجھے مسروقہ لعل کے واپس بلانے کا کوئی جادو وادو بھی نہیں آتا۔ یہ بھی ایک پرلطف چال تھی۔ لیکن اتنی موثر کہ ہر وقت چور کا پتہ چلایا جا سکتا تھا۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ پروفیسر صاحب کے ہاتھ سے لعل چوری ہو گیا تو میں نے بظاہر ان پر شبہ کرنے کے ان کے قریبی مہمان پر شبہ کیا۔ کیونکہ مسٹر سلیم ایک عرصہ سے اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے مرتبان اٹھایا۔ اور باورچی خانہ میں پہنچا۔ وہاں اسے مٹی کے تیل کے لیمپ پر رکھکر اس پر کاجل اُپاڑ لیا۔ جس سے اس کی بیرونی سطح پر کلونس جم گئی۔ لیکن سیاہ ہونے کی وجہ سے وہ ممیز نہ ہو سکی۔

پھر اس مرتبان کو بلیرڈ روم میں لیجا کر رکھا۔ اور اسے چھونے کے لئے آپ سے کہا۔ غالباً آپ نے مثل سنی ہوئی کہ "چور کی ڈاڑھی میں تنکا" ہوتا ہے۔ وہ مثل آج اصل ہو گئی۔ سب نے اس مرتبان کو چھوا۔ کیونکہ وہ معصوم تھے۔ لیکن جس شخص کا ضمیر گندا تھا۔ مجرم تھا۔ جس کا دل تذبذب کی حالت میں تھا اس چکر میں آ گیا۔ اور اس نے مرتبان کو ہاتھ نہیں لگایا کہ مبادا یہ مرتبان

چغلی کھا دے اور اس کا نام ملشت ازبام ہو جائے۔ مسٹر سلیم کو اندیشہ تھا کہ فی الحقیقت اس میں کوئی پراسرار قوت پوشیدہ ہے۔ جو نام بتا دیتی ہے۔ یا کوئی علامت ظاہر ہو جاتی ہے۔ جس سے میں سمجھ لیتا ہوں کہ فلاں شخص مجرم ہے۔ بہرحال واقعہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو مسٹر سلیم نے مرتبان کو نہ چھوا۔ اب ان کے ہاتھ برف کی طرح بالکل سفید ہیں اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ انھوں نے مرتبان کو نہیں چھوا۔ کیوں؟ مرتبان نہ چھونے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ ـــــ مجرم ضمیر!

ابھی یہ جملہ پورا نہ ہونے پایا تھا کہ ایک نوکر دوڑتا ہوا آیا اور کہا "حضور لعل مل گیا؟"

"کہاں ہے؟"

نوکر نے لعل ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "یہ رہا!"

ڈاکٹر صاحب نے لعل ہاتھ میں لیکر سب حاضرین کو دکھایا۔ اور فخریہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "کیوں حضرات یہی وہ لعل ہے جو چند منٹ پہلے چوری ہوا تھا۔ اور جو اب مرتبان میں روایت کے بموجب واپس آتا ہے" ڈاکٹر وحید نے سیاہ مرتبان میں لعل کو پھر مقید کر دیا۔

سلیم عجیب کشمکش دماغی میں مبتلا تھا۔ اسے یہ حیرانی ہو رہی تھی کہ یہ لعل نوکر کو کہاں سے ملا۔ اگر اسے باغ میں سے ملا تو بٹوہ ضرور ملا ہوگا۔ کیونکہ اس نے بٹوہ میں رکھکر اسے کھڑکی کے باہر پھینکا تھا۔ پھر جب لعل ملا تھا تو نوکر نے بٹوے کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ اس کا بٹوہ کہاں چلا گیا۔

ڈاکٹر وحید نے نوکر سے پوچھا "یہ کہاں ملا تھا؟"

"حضور کھانے کے کمرہ میں میز کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ اگر تلاش کی جاتی تو وہیں ملجاتا۔"

سلیم حیران تھا کہ اس نے تو لعل کھڑکی میں سے باہر پھینکدیا تھا۔ پھر وہ میز کے نیچے کیونکر آ گیا۔ لیکن اسے زیادہ دیر تک پریشان ہونا نہ پڑا۔ کیونکہ ایک دوسرا ملازم دوڑتا ہوا آیا۔ اور ایک بٹوہ دیتے ہوئے کہا "حضور میں باغ میں سے گزر رہا تھا کہ قریب ہی اس بٹوہ کو پڑا پایا۔ میں فوراً اسے لیکر آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ اسے کھولکر دیکھئے۔ شاید کسی مہمان کا گر پڑا ہوگا۔"

یہ بٹوہ وہی تھا جو سلیم نے کھڑکی کے باہر پھینکا تھا۔ ڈاکٹر وحید نے اسے کھولا تو اندر سے ایک موٹا سا **اخروٹ** نکلا!

ڈاکٹر وحید مسکرائے۔ اور معاملہ کی تہ تک فوراً پہونچ گئے۔ اور مخاطب کر کے کہا۔

"حضرات! واقعہ یہ ہوا ہوگا کہ سلیم نے جلدی اور گھبراہٹ میں بجائے لعل کے اخروٹ اپنے بٹوہ میں رکھکر کھڑکی کے باہر پھینکدیا تھا۔ اندھیرے گھپ میں لعل جسے سلیم اخروٹ سمجھ چکا تھا۔ میز کے نیچے گر پڑا۔ جس کا اس نے مطلق دھیان نہیں کیا۔ لیکن لعل کے متعلق یہ افواہ مشہور ہے کہ وہ ضرور مرتبان میں واپس آجاتا ہے۔ اس لئے وہ پھر اس "توہم پرستی" کی یادگار قایم رکھنے کے لئے مرتبان کی چاردیواری میں آپہنچا۔ شاید اب سلیم صاحب کو بھی کسی مزید تصدیق کی ضرورت نہ ہوگی۔ کیوں سلیم صاحب؟"

سلیم صاحب شرمگیں نگاہوں سے فرش کی طرف دیکھ رہے تھے!

ظفر قریشی دھلوی

پوچھونگا راہِ عشق میں کیوں راہ بر کو میں
اتنا بھی کیا گراؤ نگا ذوقِ نظر کو میں

ہر ایک نقشِ پا پہ جھکاؤں گا سر کو میں
سجدے کیا کرونگا تری رہگذر کو میں

اُمید و یاس لاکھ دورا ہے پہ مجھکو لائے
میں جانتا ہوں خوب کہ جاؤں کدھر کو میں

دردِ جگر کی ختم ہوئیں آزمائشیں
اب آزماؤں گا تری ترچھی نظر کو میں

ذوقِ طلب نے کردیا آوارۂ جنوں
منزل پہ آکے بھول گیا اپنے گھر کو میں

لوں جام ماہتاب سے ساقی پلا مجھے
دیکھوں نہ آنکھ بھر کے طلسمِ سحر کو میں

(غیر مطبوعہ) وقار

بہار بن کے چلی آ کہ جا رہی ہے بہار

فروغِ ماہ سے کیا جگمگا رہی ہے بہار　　گلوں میں نور کی شمعیں جلا رہی ہے بہار
زمینِ باغ کو جنّت بنا رہی ہے بہار　　شرابِ حسن کے ساغر پلا رہی ہے بہار

بہار بن کے چلی آ کہ جا رہی ہے بہار

چمن بہشت ہے موجِ شراب زمزمِ کیف　　برس رہی ہے گلِ مدعا پہ شبنمِ کیف
یہی نشاط کے دن ہیں یہی ہے عالمِ کیف　　کہ ذرّہ ذرّہ ہے بزمِ جہاں کا محرمِ کیف

بہار بن کے چلی آ کہ جا رہی ہے بہار

فروغِ رنگ سے گلزار شعلہ زار بھی ہیں　　فضائیں حسن کی نکہت سے مشکبار بھی ہیں
دلوں میں درد کے انداز بیقرار بھی ہیں　　مسرتوں کے یہ دن جانِ روزگار بھی ہیں

بہار بن کے چلی آ کہ جا رہی ہے بہار

ربابِ عشق میں لرزاں ہے اک ترانۂ ناز　　جمی ہوئی ہے ابھی محفلِ شبانۂ ناز
ابھی زبانِ محبّت پہ ہے فسانۂ ناز　　یہ تجھ سے کون کہے اے نگار خانۂ ناز

بہار بن کے چلی آ کہ جا رہی ہے بہار

گئی بہار زبانوں پہ نام باقی ہے　　خیال کی تپشِ ناتمام باقی ہے
مئے نشاط کا بس ایک جام باقی ہے　　فروغِ ماہ کی بس ایک شام باقی ہے

بہار بن کے چلی آ کہ جا رہی ہے بہار

عابد

فلسفہ اور اس کے متعلقہ مسائل

لیکن زمانۂ اصلاحات ( ) کے بعد فلسفے کی تعلیم پھر عام ہو گئی۔ اور ہر طبقے کے لوگ اس میں دلچسپی لینے لگے۔ اٹھارہویں صدی سے فلسفہ یونیورسٹی کی تعلیم کا جزو ہو گیا۔ اور سب سے پہلا ملک جس نے فلسفے کو اپنے یہاں کی یونیورسٹیوں میں داخل کیا جرمنی ہے۔ اس کے بعد انگلستان، فرانس، اٹلی اور دیگر ممالک نے اس کی تقلید کی۔

فلسفے کی نشوونما میں مختلف اقوام کا حصہ

جن اقوام نے فلسفے کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیا، ان کا سرسری تذکرہ بھی فائدہ سے خالی نہ ہو گا۔ جس طرح یورپین تمدن کی ابتدا یونان سے ہوئی اسی طرح فلسفے کی ابتدا کرنے کا سہرا بھی یونانیوں ہی کے سر ہے۔ فلسفے کے جو مسائل آج کے دن تک اس کی روح رواں اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے معرکۃ الآرا بنے ہوئے ہیں، ان سب کی داغ بیل یونانیوں ہی کے اثر آفریں اور تخلیقی دماغوں کی کاوش نے ڈالی ہے۔ رومی لوگ زیادہ تر عملی تھے، اس لئے انہوں نے بطور خود کوئی نئی بات فلسفے میں نہیں پیدا کی۔ ایک مصنف نے کیا خوب لکھا ہے کہ اگرچہ رومیوں نے تلوار کے زور سے یونان کو فتح کر لیا، لیکن یونان نے تھوڑے ہی عرصے کے بعد عقل کے زور سے فاتح کو اپنا مفتوح بنا لیا۔ نہ صرف رومیوں ہی نے یونانیوں کی تقلید کی بلکہ رومی مسیحی کلیسا نے بھی اپنی الٰہیات تمام تر یونانی فلسفے پر ہی مبنی کی اور مسیحی متکلمین میں جو مسائل صدیوں تک زیر بحث رہے وہ سب افلاطون اور ارسطو کے فلسفے سے ماخوذ تھے۔ چنانچہ ہم آئندہ اوراق میں اس طرف اشارہ کر دیں گے۔ رومیوں کو فلسفے کی طرف توجہ کرنے کا موقع اس وجہ سے بھی نہ مل سکا کہ وہ ایک عظیم الشان سلطنت کے مالک تھے اور ان کا زیادہ تر وقت، مہمات ملکی اور انتظام سلطنت میں صرف ہوتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ادب اور فلسفے کی جگہ سیاسیات اور معاشیات میں وہ عظیم الشان کام انجام دیا جس کا نتیجہ آج بھی دنیا میں جلوہ فرما ہے۔ یعنی انہوں نے ضابطۂ تعزیرات کی تدوین کی جو آج رومن لاء ( ) کے نام سے دنیا میں مشہور ہے اور یورپ کا نظام ملکی و قانونی اسی نظام پر مبنی ہے۔ زمانۂ وسطیٰ میں پادریوں نے فلسفے کا چراغ تقریباً گل ہی کر دیا تھا۔ اور اگر مسلمان حکماء کی تصانیف یورپ کے عقلاء کی رہنمائی نہ کرتیں تو نہ دورِ اصلاح شروع ہوتا نہ فلسفۂ جدید کی بنیاد پڑتی۔ بقول ڈاکٹر ڈریپر و ڈاکٹر لیکی سترھویں صدی عیسوی تک مسلمان حکماء مثلاً ابن رشد، ابن سینا، الفارابی، الکندی، ابوبکر رازی، غزالیؒ، ابن ماجہ اور بہت سے حکماء کی کتابیں یورپ کی درسگاہوں میں داخل نصاب تھیں۔ سترھویں صدی کے بعد جرمنی نے فلسفۂ جدید کی بنیاد ڈالی اور اس کے بعد انگلستان، فرانس اور دیگر ممالک مثلاً اسکاٹلینڈ، امریکہ وغیرہ نے اس کی تقلید کی۔ لاک، ہیوم، کینٹ، اور ہیگل کی موشگافیوں نے فلسفے کو ایک حیات تازہ بخشی۔ اُن کے بعد فلسفے کی تعلیم ہر مذہب و ملک میں عام ہو گئی۔

تاریخ فلسفہ کے مطالعہ کا فائدہ

ایک ظاہر بات ہے جس سے کسی سلیم الطبع انسان کو انکار کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ تمام اربابِ فکر اور سمجھدار لوگ کائنات اور انسان کی ہست و بود کے مسائل اور اُن کے متعلق تشریحات میں جو تہذیب و تمدن کے مختلف زمانوں میں لوگوں نے پیش کی ہیں، دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ تاریخ فلسفہ کے مطالعے سے انسان اپنے زمانہ کو بھی سمجھ سکتا ہے اور گزشتہ زمانوں سے بھی واقف ہو سکتا ہے۔ فلسفے کی تاریخ، گزشتہ اور موجودہ زمانوں کے اخلاقی، مذہبی، تمدنی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی خیالات پر بھی روشنی ڈالتی ہے اور ان اصولوں کو واضح کرتی ہے جن پر وہ خیالات مبنی ہوتے ہیں۔ نیز فلسفیانہ غور و فکر کے لئے انسانی دماغ کو تیار کرتی ہے۔ تخیل کی سادہ اور آسان راہوں سے گزار کر مشکل اور پیچیدہ مسائل تک پہنچاتی ہے۔ یہ نسل انسانی کے فلسفیانہ تجربوں پر تنقیدی نظر ڈالتی ہے۔ اور طالب علم کو افکار مجردہ میں مدد دیتی ہے۔ اس کی مدد سے ہم کائنات اور حیات کے متعلق اپنے نظریئے قائم کرتے ہیں۔ کیونکہ جو شخص گزشتہ حکماء کے خیالات کا مطالعہ کئے بغیر فلسفے کے میدان میں اترتا ہے اُسے بہت دشواریاں پیش آتی ہیں اور کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ وہ اپنے خیالات کے لحاظ سے مبتدی کی حیثیت سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

فلسفے کی اصل و بنیاد

فلسفہ اور سائنس دونوں کی اصل و بنیاد

---

[1] وہ لوگ جو مذہب کے مسائل کو معقولی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ [2] پوپ آف روم کی سختیوں سے تنگ آ کر اور مسیحی کیتھولک مذہب کی خرابیوں کو دور کرنے کے، بعض مذہبی خیال کے لوگ اپنے مذہب کی اصلاح پر کمربستہ ہو گئے۔ جن میں سے لوتھر اور کالون یہ دو شخص بہت نامور ہوئے۔ اور اصلاح یافتہ مسیحیت کا نام "پراٹسٹنٹ کلیسا" قرار پایا۔

مذہب ہے بلکہ ابتدائی مذہب (الہامی مذاہب کے علاوہ) فلسفہ اور سائنس تینوں ایک ہی تھے۔ ان میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ کائنات کو سمجھنے کی پہلی کوشش کا نام علم الاصنام[1] ہے۔ آج علم الاصنام اُن باتوں کو کہتے ہیں جو فلسفہ اور سائنس دونوں ہی کے انکشافات کے خلاف ہوں یعنی عقل و مشاہدہ کے خلاف ہوں۔ لیکن قدیم زمانے میں جبکہ انسانی عقل بچوں کی عقل سے بھی کمتر تھی انہی باتوں کو حقائق اور معارف سمجھا جاتا تھا چنانچہ انسان نے جب مظاہر کائنات مثلاً بادل، ہوا، آگ، پانی، طوفان وغیرہ کو دیکھا تو اپنے اوپر قیاس کرکے ان چیزوں کو بھی زندہ اور صاحب قدرت سمجھا، اور اپنی جنس سے بالاتر جنس یقین کرلیا۔ بلکہ انہیں دیوتا سمجھکر پوجنا شروع کردیا۔ لیکن رفتہ رفتہ آسے ان کی حقیقت کا علم حاصل ہوگیا، اور یہیں سے فلسفے کی بنیاد پڑی۔ کیونکہ اس علم کے حاصل ہونے کے بعد انسان نے ان کے متعلق غور و فکر کرنا شروع کیا اور اسی کا نام فلسفہ ہے۔

فلسفہ اور زندگی

فلسفے کا مطالعہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نہایت اعلیٰ درجے کی دماغی تفریح ہے اور اس کے پیچیدہ مسائل میں بھی ایک خاص قسم کی کشش پائی جاتی ہے، طالب علمی کے زمانے میں ہر شخص کو اس بات کا تجربہ کم و بیش ہوا ہوگا۔ لیکن جب معاشرتی مجبوریاں انسان کو دنیا اور اس کی مختلف راہوں میں الجھا دیتی ہیں تو انسان ملازمت، معاش، عیال و اطفال، اقتصادی اور معاشرتی معاملات میں اس طرح پھنس جاتا ہے کہ اس فن شریف کی طرف کیا معنی کسی کتاب کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ اور ایسے لوگ تو بہت کم ہوتے ہیں جو "مطالعے" کے لئے اپنی زندگی وقف کردیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ طالب علمی کا زمانہ جو انسان کی دنیاوی زندگی کا بہترین حصہ ہے عموماً ہر شخص کی نظر میں محبوب ہوتا ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جبکہ فلسفے کا مطالعہ بقول افلاطون "محبوب مسرت" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور اس وقت کسی صداقت کا دریافت کرنا، یا کسی پیچیدہ مسئلے کا حل معلوم کرنا انسان کو اسقدر روحانی سرور بخشتا ہے کہ اس کا بیان نہیں ہوسکتا بلکہ دنیاوی نعمتوں، لذتوں، راحتوں اور نفسانی خواہشات کی تکمیل سے وہ کیف اور سرور حاصل نہیں ہوسکتا جو فلسفیانہ مضامین کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ اگرچہ آئندہ زندگی میں انسان کو فرصت مطالعہ نہیں ملتی لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے طالب علمی کے زمانے اور اس کی دلچسپیوں کو نہایت احترام اور محبت کے ساتھ یاد کیا کرتا ہے۔ براوننگ[2] لکھتا ہے کہ "انسانی زندگی بیکار یا لغو[3] چیز نہیں ہے۔ اس میں ایک خاص مقصد پایا جاتا ہے اور اس مقصد کو معلوم کرنے کی کوشش کرنا میری خوراک ہے۔" بات بھی یہی ہے۔

اگرچہ ہم لوگ دنیاوی معاملات میں مشغول رہتے ہیں، اور بعض اوقات ہمیں اپنی زندگی مہمل اور بے معنی سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس بات کا برابر یقین ہوتا ہے کہ اگر ہمیں قدرت، فرصت اور لیاقت حاصل ہوجائے تو زندگی کا مطلب یعنی "مقصد حیات" کا علم حاصل ہوسکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ سمجھنا یا سمجھنے کی کوشش کرنا فطرت انسانی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ افکار[4] و آلام دنیوی میں پھنسکر یہ فطرت مضمحل ہوجائے یا ہم اس کی طرف سے غافل ہوجائیں لیکن مٹ نہیں سکتی۔ حتیٰ کہ جو لوگ تعلیم یافتہ نہیں ہیں وہ بھی اس بات کو سمجھنا چاہتے ہیں کہ مقصد حیات کیا ہے؟ نیٹشا[5] کہتا ہے "زندگی سے مراد یہ ہے کہ ہم ہر وقت اپنی ہستی کو اور اُن چیزوں کو جن سے دوچار ہوں، روشنی اور طاقت میں تبدیل کرتے رہیں، انسان کو حقیقی خوشی دولت سے نصیب نہیں ہوسکتی بلکہ اطمینان قلب سے"

ہماری طبعی خواہش اور میلان فطری یہ ہے کہ جو چیزیں ہمارے سامنے آئیں ان کی قدر و قیمت، منفعت اور مضرت سے آگاہ ہوں ہم ہر شے کی اضافی اور حقیقی کیفیت سمجھنا چاہتے ہیں اور انکو اس لحاظ سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جو تعریف آج اُن پر صادق آسکتی ہے وہی تعریف ہزار برس کے بعد بھی ان پر صادق آسکے مثلاً انسان کی تعریف یہ ہے کہ وہ حیوان ناطق[6] ہے۔ یہ تعریف ارسطو کے وقت میں بھی صحیح تھی آج بھی صحیح ہے اور آئندہ بھی صحیح رہے گی۔ نیز ہم وہ حالت پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ موت کے سامنے بھی خوش و خرم نظر آئیں۔ اور ہر مصیبت کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنی خواہشات اور جذبات پہ تنقیدی نگاہ ڈالیں اُن میں یکرنگی پیدا کریں۔ تاکہ ہماری قوتوں میں تناسب پیدا ہوجائے۔ کیونکہ اخلاق، سیاست، منطق اور فلسفے کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہماری مختلف قوتوں میں تناسب اور ہم آہنگی

---

[1] دیوی دیوتاؤں کے قصے جن کی بنیاد روایات پر ہو۔ [2] براوننگ انیسویں صدی میں انگلستان کا مشہور شاعر گزرا ہے جسکی فلسفیانہ نظمیں بہت عمدہ ہیں۔

[3] ربنا ما خلقت ھذا باطلاً "یعنی اے خدا تو نے یہ دنیا لغو اور بیکار نہیں پیدا کی ہے" (قرآن مجید)۔ [4] پریشانی اور تکلیف۔

[5] فریڈرک نیٹشا مشہور جرمن فلاسفر گزرا ہے جس کا ذکر آئندہ اوراق میں آئے گا۔ [6] وہ جاندار جو گفتگو کرسکے۔

پیدا ہو جائے۔

تھورو[1] کہتا ہے کہ "محض دشوار پسندی یا مشکل مسائل میں غور و فکر کرنے سے یا کسی فلسفیانہ نظریئے کے پیش کرنے سے یا فلسفے میں کسی مذہب کے قائم کرنے سے ایک شخص فلاسفر نہیں ہو سکتا، جب تک وہ حکمت[2] کو اس قدر محبوب نہ رکھے کہ اپنی کل زندگی حکمت و فلسفے کی تعلیمات و ہدایات کے بموجب سادگی آزادیٔ ضمیر، علوِ ہمت اور اعتماد علی النفس (اپنے اوپر بھروسہ کرنا) کے ساتھ بسر نہ کرے" یعنی چند کتابیں تصنیف کرنے، بہت سی کتابوں کا مطالعہ کرنے، بعض فلسفیانہ خیالات کی اشاعت کرنے یا فلسفی مزاج اختیار کرنے سے کوئی شخص فلاسفر نہیں بن سکتا۔

حقیقی معنی میں فلاسفر وہ ہے جو فلسفے کی ہدایت کو اپنا دستور العمل بنائے اور جس طرح ایک طالب اپنے مطلوب کی مرضی کا پابند ہوتا ہے اُسی طرح فلاسفر کو لازم ہے کہ فلسفے کا پابند ہو، جو کہے اُس پر عمل بھی کرے اور جس طرح عاشق کی صورت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی کا گرویدہ ہے اسی طرح فلاسفر کی زندگی سے یہ بات ظاہر ہو کہ فلسفے کا شیدائی ہے یعنی اس کے مزاج میں سادگی ہو، اس کا ضمیر آزاد ہو اور اس میں عالی حوصلگی اور شرافتِ نفس پائی جاتی ہو، اس تعریف کی رو سے بہت کم فلاسفر اس معزز لقب کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ بعض بیشک انہی معنوں میں فلاسفر گذرے ہیں ان کا ذکر آئندہ اوراق میں ہدیۂ ناظرین ہو گا۔ مثلاً افلاطون اسپنوزا وغیرہ

اور ہمیں اس بات کا یقین رکھنا چاہئے کہ اگر ہمیں حکمت حاصل ہو جائے گی تو دنیا کی ساری نعمتیں مل جائیں گی۔ چنانچہ بیکن[3] لکھتا ہے کہ پہلے دماغی خوبیاں جمع کرو۔ اس کے حصول پر باقی خوبیاں یا تو خود بخود حاصل ہو جائیں گی یا تمہارے اندر اس قدر رفعتِ خیال پیدا ہو جائے گی کہ ان کی عدم موجودگی محسوس بھی نہ ہو گی۔

سقراط نے کیا خوب کہا ہے کہ "حصول صداقت سے ہم دولتمند تو نہیں ہو سکتے مگر ہاں آزادی جیسی بیش بہا دولت اور نعمت ضرور حاصل ہو جائے گی۔"

ایک شبہ کا ازالہ

بعض لوگ اس جگہ یہ اعتراض کریں گے کہ فلسفہ تو شطرنج کی طرح محض بیکار ہے اور جہالت یا لاعلمی کی طرح خود بھی مبہم[4] اور تاریک ہے اور قناعت کی طرح ساکن اور جامد[5] ہے۔ چنانچہ سپنسر[6] لکھتا ہے کہ "جیسی لغو اور مہمل باتیں بعض اوقات فلسفے کی کتابوں میں ملتی ہیں ویسی اور کہیں نظر نہ آئیں گی"

اس میں شک نہیں کہ بعض فلاسفروں نے بعض باتیں ایسی بھی لکھدی ہیں جن کو پڑھکر ہمیں ہنسی آتی ہے۔ اور بعض خیالات محض سطحی اور معمولی بھی ان کی تصانیف میں ملتے ہیں۔ لیکن ہمکو کیا ضرورت ہے کہ ان لوگوں کی تصانیف کا مطالعہ کریں؟ اس کے علاوہ بعض فلاسفر ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی محض لفظی اُلٹ پھیر میں بسر کر دی اور دنیا کو کسی مفید حقیقت کا علم نہیں دیا۔ دنیا میں فائدہ رساں کتابوں کی کمی نہیں اور اس کتاب میں ہم انہیں لوگوں کا ذکر کریں گے جنہوں نے اپنے خیالات کی دولت سے علم کے خزانے میں معتد بہ[7] اضافہ کیا ہے۔ لیکن یہ خیال کہ فلسفہ جامد اور ساکن ہے صحیح نہیں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ جہاں تھا، وہیں ہے اور سائنس ترقی کر رہی ہے اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ سائنس نت نئے انکشافات میں مشغول ہے، روز نئی نئی باتیں دریافت ہوتی رہتی ہیں اور فلسفے کے مسائل وہی ہیں جو افلاطون کے وقت میں زیر بحث تھے۔ مثلاً افلاطون نے خدا کے متعلق بحث کی ہے اور اس کے زمانے میں یہ سوال نہایت اہم تھا کہ خدا کے متعلق انسان کچھ علم حاصل کر سکتا ہے یا نہیں دو ہزار سال گزرنے کے بعد بھی یہ سوال موجود ہے۔

لیکن حقیقی جواب یہ ہے کہ فلسفے کا موضوع وہ مسائل ہیں جو سائنس کے مسائل سے بہت زیادہ دشوار اور دقت طلب ہیں بلکہ وہ مسائل ایسے ہیں کہ سائنٹفک طریق یا اصول سے ان پر کوئی بحث نہیں ہو سکتی اور نہ وہ سائنس کی حدود میں آتے ہیں۔ مثلاً مسئلہ خیر و شر[8] حسن و قبح[9]، جبر و اختیار[10]، حیات و ممات[11]، نفس ناطقہ، ضمیر، اخلاق، خدا روح، آزادی، علم اور تفکر و تخیل وغیرہ وغیرہ

ظاہر ہے کہ سائنس کو خیر و شر یا جبر و اختیار سے کوئی علاقہ اور تعلق نہیں ہے نہ ہو سکتا ہے۔ تو یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ سائنس کے اصول اور طریق ان مسائل میں نہ چل سکتے ہیں اور نہ مفید ہو سکتے ہیں۔ علاوہ بریں، کائنات میں غور و فکر کرنے سے، جو واقعی اور حقیقی معنی میں فلسفے کا کام ہے، جب

---

[1] ایک مشہور یورپین مصنف [2] "مَن یُؤتَ الحِکمَۃَ فَقَد اُوتِیَ خَیراً کَثِیراً"، یعنی جسے حکمت عطا ہو گئی گویا اُسے خیر کثیر مل گئی۔ (قرآن مجید)
[3] بیکن مشہور انگریز فلاسفر جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔ [4] جو بات صاف نہ ہو [5] جو حرکت نہ کرے [6] سپنسر ایک مشہور یورپین مصنف اور فلاسفر گزرا ہے سنہ ۱۸۲۰ء میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۹۰۳ء میں وفات پائی۔ [7] کافی اور بہت۔ [8] نیکی اور بدی [9] اچھائی اور برائی۔ [10] پابندی اور آزادی [11] زندگی اور موت۔

اس قسم کی معلومات حاصل ہوتی ہیں جن کو نہایت صحت کے ساتھ مدوّن اور منضبط کیا جا سکتا ہے۔ تو ان کا نام سائنس ہو جاتا ہے۔ مثلاً سائنس کے بہت سے حقائق دراصل فلسفیانہ غور و فکر کے نتائج ہیں، گویا فلسفہ اپنی آمدنی یا پیداوار، سائنس کے نام منتقل کرتا رہتا ہے۔ اس لئے بظاہر مفلس اور قلاش نظر آتا ہے۔ رسل نے کیا خوب کہا ہے "تمام سائنس فلسفے کی شکل میں شروع ہوتا ہے اور "آرٹ" (فن) کی شکل میں ختم ہوتا ہے"۔ اس کی ابتدا مفروضات اور قیاسات سے ہوتی ہے۔ بعد ازاں رنگ تکمیل حاصل کر لیتا ہے اور اس لحاظ سے سائنس نہایت خوش قسمت ہے

فلسفے اور سائنس میں امتیاز

فلسفہ غیر معلوم باتوں یا نیم معلوم باتوں (امور) کے قیاسی اور مفروضہ اصولوں پر تشریح کا نام ہے۔ غیر معلوم باتوں سے مراد، خدا، نفس وغیرہ اور نیم معلوم باتوں سے مراد اخلاقی و سیاسی مسائل ہو سکتے ہیں۔ گویا "صداقت" کے قلعے کو فتح کرنے کے لئے جو خندق سب سے آگے کھودی جائیگی اس کا نام فلسفہ ہوگا۔ جب فلسفہ اس قلعے کو فتح کرے گا تو اس کا نام سائنس ہو جائے گا۔ گویا سائنس اس صداقت کا نام ہے جس کی صحت فلسفے کی رو سے ثابت ہو چکی ہو۔ بہرحال اس مفتوحہ ملک کے اس طرف وہ محفوظ مقامات ہیں جن میں "علم اور فن" دونوں ملکر ہماری ناقص لیکن حیرت انگیز دنیا کی تعمیر کرتے ہیں۔

چونکہ فلسفہ اپنے فتوحات کو سائنس کے حوالے کر کے، غیر معلوم اور غیر مفتوح علاقوں کے زیر کرنے کیلئے آگے بڑھ جاتا ہے اس لئے بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساکن اور جامد ہے، حالانکہ وہ تو ہر وقت فتح و ظفر میں مصروف رہتا ہے۔ مگر ہر فتح کے بعد نئی غیر مفتوحہ زمین اس کے سامنے آجاتی ہے۔ پس جو لوگ دور کھڑے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فلسفہ جہاں تھا وہیں ہے۔ ان باتوں کے علاوہ فلسفے نے اگرچہ حقائق اشیاء کو پورے طور سے بے نقاب نہیں کیا ہے مثلاً آجتک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ خدا کی ماہیت کیا ہے؟ لیکن ان مسائل میں فلسفہ جامد اور خاموش تو نہیں ہے۔ اگر پورے طور پر حل پیش نہیں کر سکتا تو نئی نئی راہیں ضرور پیدا کرتا رہتا ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو سوال افلاطون کے زمانے میں رائج تھا وہی آج بھی رائج ہے۔ اس لئے فلسفے نے کچھ ترقی نہیں کی حالانکہ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ جس سوال کے حل کرنے کا فلسفے نے بیڑا اٹھایا ہے وہ ایسا ہے کہ انسانی قوت سے باہر ہے۔ بایں ہمہ فلسفہ خاموش یا ساکن نہیں رہا، اس سوال کے متعلق ہر زمانے میں عقلاء نے غور و فکر کی ہے اور اپنے نتائج و افکار سے دنیا کو مستفید کیا ہے اور "علم" کے خزانے میں اضافہ کیا ہے۔ اور یہ بات کہ فلسفے نے ایسا مسئلہ کیوں اختیار کیا جس پر اسے دسترس نہیں۔ ظاہر میں تو معقول اعتراض معلوم ہوتا ہے مگر غور سے دیکھئے تو اعتراض نہیں، عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔ یہ بات تو انسان کی عالی حوصلگی پر دلالت کرتی ہے کہ اس نے اپنا مطمح نظر اور نصب العین اسقدر رفیع الشان مسئلے کو بنایا ہے۔ اور انسان ایسا کرنے پر مجبور ہے، کیونکہ یہ بات کہ وہ اپنی اصل و بنیاد معلوم کرے یا کائنات پر نظر ڈالکر اس کے صانع اور خالق کو دریافت کرے نہ صرف اس کی فطرت کا میلان ہے بلکہ یہ بات اس کے خیالات میں قوت متخیلہ کے اصولوں کا جس پر وہ کاربند ہے لازمی نتیجہ ہے اور یہ بات خدا نے اس میں اس لئے رکھی ہے کہ اس کی بدولت انسان ہمیشہ بلندی پر پرواز کرنے کی کوشش کرے اور اس کوشش میں ان حقائق کو ضمنی طور پر حاصل کر سکے جو اس کے بغیر حاصل نہ ہو سکتے تھے۔ اگر انسان میں غور و فکر کا مادہ اور جستجو کی خواہش نہ ہوتی تو وہ آج دوسرے حیوانات کی طرح ہوتا۔ اور تہذیب و تمدن، علوم فنون اور انکشافات و اکتشافات کا نام بھی نہ ہوتا

آمدم برسر مطلب، سائنس اس بیان اور تشریح کا نام ہے جو کائنات کے مختلف عناصر کا تجزیہ کرنے پر مبنی ہے فلسفہ اس اخوال اور تفسیر کا نام ہے جو کائنات کے مختلف عناصر کو باہم ترکیب دینے پر منحصر ہے یعنی سائنس تجزیے کا نام ہے فلسفہ ترکیب کا۔ سائنس "کل" کو "اجزا" میں تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ نظام کو اعضاء میں اور مجہول معلوم میں منتقل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اشیاء کی قیمت و قدر و امکانات یا ان کی مجموعی حیثیت یا آخری اور انتہائی خصوصیت سے تعرض نہیں کرتا۔ بلکہ ان کی موجودہ حالت اور کیفیت کے اظہار پر قناعت کرتا ہے۔ اور اپنی نگاہ کو ان اشیاء کے خواص اور طریق عمل تک محدود رکھتا ہے۔ "سائنس داں" ایک غیر جانب دار محقق ہوتا ہے

۱؎ آنریبل برٹرنڈ رسل مشہور انگریز فلاسفر ہے جس کی تصانیف آجکل فلسفیانہ حلقوں میں نہایت معتبر سمجھی جاتی ہیں ۲؎ بظاہر۔ ۳؎ سوچ بچار ۴؎ فائدہ پہنچانا۔ ۵؎ غور و فکر کرنا۔ ۶؎ دونوں لفظوں کے معنی ہیں وہ چیز جسے انسان اپنا مقصود بنائے اور جس کے حاصل کرنے کی کوشش میں لگ جائے۔ ۷؎ کسی شے کے حصے کر دینا۔ ۸؎ جو بات معلوم نہ ہو ۹؎ بحث کرنا یا اعتراض کرنا۔

چودودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کا آرزومند ہوتا ہے۔ اور کائنات کی ادنیٰ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ چیز اس کے لئے یکساں اہمیت رکھتی ہے۔ وہ مکھی یا مکوڑے کی ٹانگ کو اُسی قدر اہمیت دیتا ہے جسقدر کسی بڑے سے بڑے مظہر قدرت یا کسی عظیم الشان انسان کو اور صرف واقعات کے بیان کر دینے پر اکتفا کرتا ہے۔ لیکن ایک فیلسوف محض واقعات بیان کر دینے پر اکتفا نہیں کرتا۔ وہ ان واقعات کا انسانی تجربے سے تعلق معلوم کرنا چاہتا ہے کیونکہ واقعات کی اہمیت اور قدر و قیمت اُسی وقت معلوم ہو سکتی ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ ان کا تعلق تجربۂ انسانی سے کیا ہے؟ یعنی وہ اُس گھڑی کے پرزوں کو جوڑنا چاہتا ہے جنکو سائنس داں نے علیحدہ علیحدہ کر دیا ہے، سائنس ہم کو مارنے اور جلانے کا طریقہ بتاتا ہے، فلسفہ یہ بتاتا ہے کہ کب مارنا چاہئے۔ اور کب جلانا چاہئے۔ طریقے اور ذرائع معلوم کرنا سائنس کا کام ہے۔ تنقید کرنا اور اغراض و مقاصد میں مناسب تعلق پیدا کرنا فلسفے کا کام ہے سائنس ہمیں علم عطا کرتا ہے، فلسفہ ہمیں حکمت عطا کرتا ہے، یاد رہے کہ سائنس بغیر فلسفہ و حکمت کے انسان کو تباہی سے نہیں بچا سکتا چنانچہ گزشتہ "جنگ عظیم" اس بات پر کافی روشنی ڈال سکتی ہے۔

فلسفہ کی تقسیم فلسفہ میں پانچ فنون شامل ہیں، منطق، جمالیات، اخلاقیات، سیاسیات اور مابعد الطبیعت۔ منطق، انسانی قوتِ غور و فکر کے صحیح طریق کار کے علم حاصل کرنے کا نام ہے یعنی مشاہدہ، مطالعۂ باطن، استمزاج، استقرا، قیاس، اختیار، تجربے اور ترکیب کے طریق کا مطالعہ کرنا، یہ فن اگرچہ نہایت غیر دلچسپ اور دشوار ہے لیکن کوئی شخص بغیر ان اصولوں کا صحیح علم حاصل کئے فلسفے میں ترقی نہیں کر سکتا۔

جمالیات، حُسن یا صورت کے مطالعے کا نام ہے اور اس کو "آرٹ" کا فلسفہ بھی کہتے ہیں۔

اخلاقیات میں انسانی طرز عمل، اور افعال کی اچھائی یا بُرائی سے یعنی مسئلہ خیر و شر سے بحث کی جاتی ہے۔ چنانچہ سقراط کا قول ہے کہ خیر و شر کا علم تمام علوم پر فوقیت رکھتا ہے۔

سیاسیات میں نظام تمدن و معاشرت مثلاً ملوکیت، ریاست جمہوریت، اشتراکیت اور خصوصیت سے بحث کی جاتی ہے۔

مابعد الطبیعت میں اشیاء کی حقیقت، مادہ کی حقیقت و ماہیت اور نفس ناطقہ کی کیفیت اور نوعیت سے بحث کی جاتی ہے۔

فلسفہ اور فلاسفہ: فلسفے کے مطالعے میں فلاسفہ کے سوانح حیات سے بھی بہت کچھ مدد ملتی ہے۔ کیونکہ خیالات، جذبات، اور طریق غور و فکر ایک حد تک ماحول اور طرز زندگی پر بھی منحصر ہوتا ہے۔ زمانۂ وسطیٰ میں جبکہ یورپ بقول ڈریپر اور لیکی پوپ آف روم کے آہنی پنجہ میں گرفتار تھا نہ ضمیر کی آزادی تھی نہ علم کی آزادی، بلکہ نفس کی آزادی کا بھی پتہ نہ تھا اگر کسی نے جغرافیہ، سائنس، ہیئت یا طبیعیات میں کسی قسم کی تحقیق و تلاش کی یا کوئی نئی بات، ذہن رسا کی بدولت پیدا کی تو پوپ آف روم کے کارپردازوں یعنی پادریوں نے فوراً اس پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا اور اگر اس پر بھی وہ شخص اپنے "کفر" سے باز نہ آیا تو محکمہ احتساب نے اُسے واجب القتل اور گردن زدنی قرار دیکر جلاد کے حوالے کر دیا۔ ان حالات، لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ مذہب کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فرانس، انگلستان اور دیگر ممالک میں اکثر حکماء "مذہب" کو سفر سمجھکر مادہ پرستی کی طرف مائل ہو گئے۔ غرض سولہویں صدی میں مادیت کی جو تحریک پیدا ہوئی وہ دراصل عیسائی پادریوں کے طرز عمل کا نتیجہ تھی،

اسی لئے ہم اس کتاب میں مشاہیر فلاسفہ کے سوانح حیات بھی قدرے فصاحت کے ساتھ لکھیں گے۔ اور ان کی زندگی کے مشہور اور دلچسپ واقعات پر روشنی ڈالیں گے تاکہ ہماری کتاب بالکل "خشک" ہو کر نہ رہ جائے اور فلسفے کا مطالعہ طبیعت پر گراں نہ گزرے۔ ان فلاسفہ کے واقعات اور سوانح حیات بجائے خود اپنے اندر ہمارے لئے بہت کچھ سبق رکھتے ہیں۔ ایمرسن کہتا ہے "تم جانتے ہو صحیح معنوں میں طالب علم کون کہلا سکتا ہے؟ یاد رکھو میں ہر شخص سے کچھ نہ کچھ سیکھ سکتا ہوں اور اسی بات کے لئے اس کا شاگرد ہوں"۔ پس ہم بھی ان لوگوں کے خیالات کا مطالعہ اسی نظر سے کریں گے کہ ان سے فائدہ حاصل ہو اور بقول لیونارڈو "بہترین یعنی مسرت روحانی حاصل ہو"۔ ان فلاسفہ کے بعض خیالات تو ہماری طبائع سے اس درجہ مطابقت رکھتے ہیں کہ انہیں پڑھکر ہم اپنے دل میں کہنے لگتے ہیں۔ "یقیناً، یہی میں سوچتا تھا" یا "بیشک یہی میرا خیال تھا"،

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اگرچہ ان فلاسفہ کی تصانیف کے اوراق ہر شخص کے مطالعے کے لئے کھلے ہوئے ہیں، لیکن ہم اسی حد تک اُن سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جس حد تک ہمارے اندر سمجھنے کی طاقت یا صلاحیت ہے

۱؎ جو باتیں روزمرہ دنیا میں ظہور پذیر ہوتی ہیں انہیں "مظاہر کائنات" کہتے ہیں ۲؎ یعنی وہ شے جو مادہ یا جسم سے برتر ہو یعنی خدا، روح وغیرہ ۳؎ وہ حالات جن میں کوئی انسان زندگی گزارے ۴؎ زمانۂ وسطیٰ سے عموماً چھٹی صدی عیسوی سے لیکر پندرھویں یا سولہویں صدی عیسوی کا درمیانی عرصہ مراد لیا جاتا ہے۔ ۵؎ ڈاکٹر ولیم ڈریپر ایل ایل ڈی گزشتہ صدی میں ایک نامور امریکن مصنف گزرا ہے ۶؎ لیکی یعنی ڈاکٹر ارٹ پول لیکی بھی گزشتہ صدی ایک مشہور انگریز مصنف ہو لیے ۷؎ پوپ، رومن کیتھولک عیسائیوں کا مذہبی پیشوا جسے وہ لوگ حضرت مسیح کا جانشین سمجھتے ہیں ۸؎ پوپ کا قائم کردہ محکمہ جس کے ارکان، لوگوں سے مذہبی خیالات کا جائزہ لیا کرتے تھے اور جو علماء کو پوپ کی لغت کے خلاف جاتے اُسے واجب القتل قرار دیتے تھے۔ ۹؎ ایمرسن ایک مشہور امریکن ادیب، نقاد اور انشاپرداز گزرا ہے۔ ۱۰؎ لیونارڈو ایک نامور اطالوی مصنف اور انشاپرداز ہوا ہے۔

بس ہمیں لازم ہے کہ ان پر اعتراض کرنے میں جلدی نہ کریں اور ان کے خیالات کو بار بار پڑھیں تاکہ حقیقی مفہوم ہمارے سامنے آسکے۔ سقراط کہتا ہے "اس کی پرواہ مت کرو کہ "فلسفے" کے سکھانے والوں کو تم پسند کرتے ہو یا نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ وہ جو کہتے ہیں، وہ صحیح ہے یا غلط؟" حضرت علیؓ کا قول بھی یہی ہے "انظر الی ما قال و لا تنظر الی من قال"، یعنی دیکھو کہ اس نے، کیا کہا، یہ مت دیکھو کہ کس نے کہا۔

آمد بہار

(۱)

اس موسم میں جب گل بھی ہے ——— آب جو ہے
قمری بھی ہے بلبل بھی ہے ——— رنگ و بو ہے
——— میں ہوں تو ہے
اس موسم میں!

(۲)

ان کی آنکھوں سے بزم دل کو ——— میخانہ کر
چشم زدن میں اس محفل کو ——— دیوانہ کر
——— مستانہ کر
اس موسم میں

(۳)

کس کا شکوہ کیسی شکایت ——— خاموشی ہے
گردش میں ہے جام الفت ——— مے نوشی ہے
——— بے ہوشی ہے
اس موسم میں

(۴)

مطرب! اٹھ اور چنگ اٹھا کر ——— حشر بپا کر
فتنے اٹھا دے ساز بجا کر ——— نغمے گا کر
——— عہد وفا کر
اس موسم میں

اثر

زبان کا صحیح استعمال

کسی صرف یا نحو کی کتاب کو اٹھا کر دیکھیے آپ ہر جگہ محققین کو زبان کے بارے میں یہ لکھتے ہوئے پائیں گے کہ

"خدا نے ہمیں زبان جیسی نعمت اس لئے عطا فرمائی ہے کہ ہم اس کے ذریعے سے اپنی خواہشات اور ضروریات کا اظہار کریں۔ جن آرزوؤں کی تکمیل مقصود ہو اُسے الفاظ کا جامہ پہنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

لہٰذا زبان کا صحیح استعمال اور فائدہ یہی ہے کہ اس کے ذریعہ اظہار آرزو کے بعد تکمیل آرزو کرلیں"

لیکن جو لوگ دنیا کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ ہو چکے ہیں اس کلیے سے اختلاف رکھتے ہیں اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ وہ لوگ محققین صرف و نحو سے اختلاف کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں۔ ان کا قول ہے کہ وہی لوگ اپنی آرزوؤں کی تکمیل حاصل کرسکتے ہیں جو انہیں پوشیدہ رکھ سکیں۔ خواہشات کے اظہار سے حاجت روائی ہونا ناممکن ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہی لوگ کسی شے کو زیادہ مقدار میں حاصل کرتے ہیں جن کو اس کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی غریب کسی رئیس کو تحفہ دے گا تو بہرصورت اسے اس کی شان کے مطابق دینا پڑے گا یعنی اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کوئی قیمتی شے نذر کرنی پڑے گی۔ برخلاف اس کے امیر آدمی غریب شخص کو اس کی حیثیت کے موافق کوئی معمولی سی چیز پیش کر دے گا۔ روپیہ، روپے کو کھینچتا ہے۔ کسی غریب شخص کو ایک رئیس کو قیمتی تحفہ دے کر (یعنی اپنے چھوٹے ڈھیر میں سے بڑے ڈھیر میں کچھ ڈالکر) اسی قدر خوشی ہوتی ہے جتنی رئیس کو اس تحفے کے حصول سے! غربا جو حقیقت میں حاجتمند ہوتے ہیں کچھ بھی نہیں پاتے۔

ہر شخص نے اس امر کا تجربہ کیا ہوگا کہ بہت کچھ حاصل کرنے کیلئے بہت کچھ موجود بھی ہونا چاہئے۔ کسی ادیب نے غریب شخص کو ایک بہتے ہوئے شہتیر سے تشبیہ دی ہے کہ جتنا پانی میں ڈوبا ہوا ہوگا اتنا ہی زیادہ اس پر وزن بھی ہوگا۔ جب کسی شخص کو قرض لینے کی ضرورت نہیں ہوتی تو ہر شخص اُسے قرض دینے پر آمادہ ہوتا ہے لیکن جب اسے حقیقتاً قرض کی ضرورت ہوتی ہے تو کوئی بھی نہیں دیتا۔ اگر کوئی شخص کسی سے ایک ہزار روپیہ قرض مانگے تو کوئی تعجب نہیں کہ رقم کی زیادہ ہونے کی وجہ سے اسے مطلوبہ روپیہ مل جائے لیکن اگر وہی شخص اسی مہاجن سے دس روپیہ ادھار مانگے تو اُسے ایک پیسہ بھی نہ ملیگا۔ ایک شخص جب کبھی کپڑے ادھار سلوانا چاہتا تھا تو ہمیشہ اعلیٰ قسم کا لباس پہن کر درزی کی دوکان پر جاتا اور سلوانے کے لئے نہایت بیش قیمت کپڑوں کا انتخاب کرتا۔ کیونکہ بوڑھے درزی نے غربا کو ادھار دینے کی قسم کھا رکھی تھی۔ ایسے لوگوں کو وہ ہمیشہ نہایت مودب طریق پر کہدیا کرتا تھا کہ "جناب میرا اسٹیل ماسٹر بیمار ہے اور غالباً اگلے ہفتہ تک کام پورا نہ ہو سکیگا"

خواہشوں کا اظہار اسی لئے کیا جاتا ہے کہ دوسروں کے دلوں میں احساس اور رحم پیدا کرکے اپنی ضرورت پوری کرلیں۔ لیکن ہر سائل کو سوال کرنے سے پہلے اس امر کا فیصلہ کرلینا چاہئے کہ اگر مسئول کے دل میں اس کی عزت گھٹ جائے گی تو کوئی مضائقہ تو نہ ہوگا؟ یا رحم کے بدلے دوستی کے کم ہوجانے سے اُسے کوئی نقصان تو نہ پہنچیگا؟ رحم اور دوستی دو متضاد چیزیں ہیں اور ان کا بیک وقت کسی کے دل میں موجود رہنا ناممکن ہے۔ کیونکہ دوستی مرکب ہے عزت اور انبساط و فرحت سے۔ اور رحم پیدا ہوتا ہے رنج اور نفرت سے۔ یہ احساس کچھ عرصے کے لئے دماغ میں رہیں تو کوئی تعجب نہیں لیکن ان کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یکجا رہنا بالکل غیر ممکن ہے۔ اس سے یہ مطلب نہ اخذ کیا جائے کہ انسان میں رحم کا مادہ ایک سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جن میں رحم بالکل ہی نہیں ہو۔ لیکن یہ احساس ہے جو بہت تھوڑی دیر کے لئے قائم رہتا ہے اور شاذ و نادر ہی حاجتمندوں کی پوری پوری حاجت روائی کرتا ہے۔

بعض اشخاص میں رحم کا مادہ صرف اتنی دیر تک قائم رہتا ہے جبتک کہ وہ اپنا ہاتھ جیب تک لے جائیں۔ بعض لوگوں کے دلوں میں ٹھیک اس سے دوگنے وقت تک قائم رہتا ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جو نصف گھنٹہ تک رحمدل رہتے ہیں۔ بہرحال چاہے یہ مادہ ہم میں نصف منٹ کے لئے پیدا ہو چاہے نصف گھنٹے کے لئے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جتنی بار ہم کسی شخص پر رحم کھاتے ہیں ہر بار اس کی وقعت ہماری نگاہوں میں کمتر ہوتی جاتی ہے اور بتدریج رحم حقارت سے بدل جاتا ہے۔ کسی شخص کی پیہم امداد کرنے کے بعد بھی اگر آپ اسے فلاکت زدہ پائیں گے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس بدبخت کی حالت بہت خستہ ہے اور وہ آپ کے مزید رحم اور سخاوت کا مستحق ہے مگر بلا استثنا کوئی شخص ایسا نہیں جو ایسی حالت

میں اس مصیبت زدہ پر زیادہ رحم کھائے ایسی صورت میں اس کے ذہن سے رحم کا احساس جاتا رہتا ہے اور وہ اس بدنصیب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔

حضرت انسان ہمیشہ الٹی حرکتیں کرتے ہیں جس پر زیادہ رحم کھانا چاہئے اس سے رحمدلی کے بجائے حقارت کا سلوک کیا جاتا ہے۔ جس کے پاس قارون کا خزانہ ہوتا ہے اس کی دولت میں اضافہ کیا جاتا ہے اور حاجتمندوں کی طرف نظر تک نہیں اٹھائی جاتی۔ جسے قرض لینے کی ضرورت نہیں ہوتی لوگ اسے قرض دینے کے لئے دوڑے پھرتے ہیں اور جو حقیقتاً غرض مند ہوتے ہیں انہیں کوئی بھی نہیں پوچھتا ... . وقس علی ھذا

ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کون ہے جو محققین صرف نحو کی رائے سے اختلاف کرے گا۔ میری اپنے دوستوں کو یہی نصیحت ہے کہ عزیزو! اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو خدارا اپنی حرکات یا گفتار سے ظاہر نہ ہونے دو۔ ورنہ یقین رکھو کہ تمہاری حاجت روائی قیامت تک نہ ہو سکے گی۔ خواہشات کا چھپانا ہی ان کا حاصل کرنا ہے۔ اگر تم فلاکت زدہ ہو تو دنیا پر یہ ظاہر کرو کہ تمہیں لفظ غربت کے معنی ہی نہیں آتے! اگر کوئی تمہیں چٹنی روٹی کھاتے ہوئے دیکھ پائے تو اُسے یہ ہرگز نہ کہو کہ آج تمہیں دال نصیب نہ ہو سکی۔ بلکہ یہ کہو کہ چٹنی سے زیادہ کوئی شے تمہیں لذیذ نہیں معلوم ہوتی۔ یا یوں کہو کہ حکیم حریف الشفا صاحب نے اس چٹنی کو خاص طور پر میرے لئے تیار کیا ہے۔ یا یہ کہدو کہ ہمارا حضرت "کال الاکل" سے دور کا بھی رشتہ نہیں اور "مسٹر پیٹو خاں" سے علیک سلیک تک نہیں ہوتی، اگر تمہارے لباس کی تراش آج جیسے پچاس سال پہلے کی ہے تو یہ ہرگز نہ ظاہر کرو کہ اپنے جد امجد علیہ الرحمہ کا کوٹ پہنے ہوئے ہو یا جس زمانے میں وہ دولتمند تھے یہ کوٹ سلوایا تھا بلکہ فوراً موجودہ فیشن کی ہجو شروع کردو

اگر تمہارا کپڑا اس طرح پھٹ گیا ہو کہ پیوند صاف نظر آتا ہو تو بلا تکلف سنت رسول کے عامل بن جاؤ۔ یا کہدو کہ حضور فرما رہے ہیں ... پیوندی کپڑا برکت حاصل کرنے کے لئے پہنتے ہیں۔ اگر تمہارے جسم پہ کپڑے ضرورت سے کم ہوں تو بھی یہ نہ کہو کہ

کچھ خریدا نہیں ہے اب کی سال ۔۔۔ کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

بلکہ کہدو کہ میں گاندھی آشرم میں رہ آیا ہوں اور مہاتما جی کے فیض صحبت کا پرتو سب سے پہلے لباس پر پڑا ہے۔ اگر تمہارا خط ضرورت سے زیادہ بڑھ گیا ہو تو یہ کبھی نہ کہو کہ شہر کے حجام نقد دام لے کر حجامت بناتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو فلاسفر مشہور کردو۔ غرضیکہ کبھی اپنی اصلی حالت کو ظاہر نہ ہونے دو۔ غرور ایک ایسی شے ہے کہ اگر امرا میں پائی جائے تو صد درجہ قابل نفرت ہوتی ہے۔ عقلمندوں میں غرور کا ہونا ایک تعجب خیز امر ہے۔ اس صورت میں اسے حماقت کہہ سکتے ہیں۔ لیکن غریبوں میں غرور ایک ایسی بُری شے ہے جسے میں قابل معافی سمجھتا ہوں۔

دوستو یاد رکھو کہ زبان کا صحیح استعمال اپنی ضروریات کو اور باطنی حالات کو چھپانا ہے کیونکہ صرف اسی صورت میں اس کا فائدہ (یعنی حاجت روائی) حاصل ہوتا ہے۔

(ترجمہ) توفیق حسن مسقطی

رباعی

رنگینیٔ شامہائے عشرت فانی ۔۔۔ شادابیٔ تنویر مسرت فانی
دنیا میں حسین صورتیں لاکھوں ہیں ۔۔۔ آجاؤ کبھی کہ ہے محبت فانی

عابد

شاہان مغلیہ کے وہ باغ جو میدانوں میں واقع ہیں پھولوں کی قدت سے افسردہ معلوم ہوتے ہیں۔ ڈل کے حسین ڈھیل باغ اپنی اصلی شان وشوکت کھو چکے ہیں کشمیر کے جنت منظر باغ اپنی پہلی لطافت و نزہت کا ایک سایہ ہیں مگر فدائی خاں کا بنایا ہوا پنجور جو پنچپورہ کے مقدس چشمے کے کنارے واقع ہے۔ ابتک اپنی پہلی لطافت و پاکیزگی کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔

دوسرے متبرک چشموں کی طرح پنجور پر بہت سے مذاہب کے اثرات ہیں۔ یہاں قدیم سنسکرت کے کتبے پائے جاتے ہیں۔ اور ابوریحان البیرونی (۱۰۳۰ء) اس کی موجودگی کا ذکر کرتا ہے۔ اس کا پرانا نام پنچپورہ پانڈووں سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ افسانوں کی زبان یہی ہے کہ مہابھارت کا آخری منظر اسی جگہ کے قریب واقع ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وقت بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ اور حقیقی سکون کا ایک غائب ہوتا ہوا سایہ کبھی کبھی نظر آجاتا ہے۔ اسی جگہ عظیم الشان آبشاروں سے بلند پنجور کا محل واقع ہے جہاں کبھی کبھی دور سے آنے والی برق رفتار ریل گاڑی کی آواز کی صدائے بازگشت صدیاں گذر جانے کی شہادت دیتی ہے۔

مہابھارت میں وہ افسانہ خون آلود درج ہے جس کا نتیجہ پانڈوں اور کوروں کی لڑائی میں ظاہر ہوا تھا۔ اور اس لئے اس جگہ اس واقعے کا ذکر مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ مگر اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ جب پانڈو دولت دنیا کی بے ثباتی کا احساس کرنے کے بعد ہمالیہ کی طرف آئے ہیں توسوائے پانڈر کے باقی تمام بھائی آگے جانے کی بجائے وہیں رہ گئے تھے۔

پنجور محل کا بانی فدائی خاں تھا۔ جس کے زیر اہتمام لاہور کی شاہی مسجد تعمیر ہوئی تھی۔ قارئین کرام کو علم ہوگا کہ وہ اورنگ زیب کا رضاعی بھائی تھا۔ اور اس کا منظور نظر۔

اورنگ زیب نے فدائی خاں کو اس ضلع کا حاکم مقرر کیا تھا۔ جو اندنوں بھی سیر و شکار کے لئے موزوں خیال کیا جاتا تھا۔ اس جگہ آکر حاکم نے چشمے کو دیکھکر سوچا ہوگا کہ یہ جگہ باغ کی تعمیر کے لئے کس قدر موزوں ہے۔

فدائی خاں نے انتہائے ذوق سے کام لیکر ایک ایسا باغ تعمیر کرایا جس کے برآمدے گنجان۔ پہاڑوں اور وسیع میدانوں کے مناظر پر حاوی تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ صرف میدانوں کی جانفرسا تپش و خلش آب مصفیٰ و شیریں کی خوشگواری کا احساس کرسکتی ہے۔ ہندوستان میں تو پانی ہر فرقے اور گروہ کے لئے متبرک ہے۔

میاں فدائی خاں کی ملکیت میں پانی موجود تھا۔ اور وہ میلا۔ گدلا پانی نہیں جو پنجاب کے وسیع دریاؤں میں پایا جاتا ہے۔ وہ کائی بھی ہوئی کثافت نہیں جو گاؤں کے تالابوں میں ملتی ہے۔ بلکہ صاف شفاف۔ ٹھنڈا۔ چشموں میں سے ابلتا ہوا پانی۔ جس کے ساتھ بتدریج اترتی ہوئی گھاٹیاں اور معتدل آب و ہوا۔ دل کو فرحت و سرور سے لبریز کر دیتی تھی۔

فدائی خاں نے بہت جلد اپنا کام شروع کر دیا۔ مگر اردگرد کے راجہ اس کی حرکات سے خائف تھے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ عمارتوں کی بنا مغل بادشاہوں کی آمد کا پیش خیمہ ہے۔ اور علاوہ ازیں وہ محسوس کرتے تھے کہ وہ بہت جلد اس چشمے پانی سے محروم ہوجائیں گے۔ جس سے قرب و جوار کے کھیت سیراب ہوتے تھے۔

اب تک یہ افسانہ مشہور ہے کہ جب پہلے پہل فدائی خاں باغ میں داخل ہوا۔ تو راجاؤں نے سازش کر کے باغ میں ایسے ملازم جمع کر دیئے تھے جن کو خنازیر کا مہلک اور مکروہ مرض تھا۔ قلی۔ مالی۔ مہتر۔ عورتیں۔ بچے بوڑھے تمام اس مرض میں مبتلا نظر آتے تھے۔ فدائی خاں کے دریافت کرنے پر اُسے بتایا گیا کہ پنجور کے پانی میں یہ تاثیر ہے کہ جو کوئی پی لے وہ لازماً خنازیر کا شکار ہوجاتا ہے۔ فدائی خاں سے زیادہ اُس کے حرم محترم کی پردہ نشین عورتیں گھبرائیں اور اس نے اپنے رہنے کے لئے کسی اور جگہ کا انتخاب کرلیا۔

اٹھارہویں صدی میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد گورکھوں نے پنجور کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا۔ آخر کار راجاؤں نے برطانوی حکومت سے مدد طلب کی۔ مگر ازبسکہ راجہ فوج اور توپوں کے معاملے میں کچھ دینے کی اہلیت نہ رکھتے تھے۔ اور حکومت برطانیہ کو دوسرے اہم معاملات کی گتھیوں کو سلجھانا تھا۔ اس درخواست کا کچھ نتیجہ نہ ہوا۔

آخر کار ۱۷۶۹ء میں سکھوں نے پنجور کو فتح کرلیا۔ اور اس وقت یہ جگہ مہاراجہ پٹیالہ کے حیطہ اقتدار میں ہے۔ فدائی خاں کا باغ اس سڑک کے کنارے واقع ہے۔ جو انبالے سے کسولے کی برفانی چوٹیوں کی طرف جاتی ہے ریلوں کے آنے سے پہلے وائسرائے عام طور پر یہاں کے خوشگوار و نظر فروز

مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے یہاں ٹھہر جایا کرتے تھے۔ لیکن اب وقت بدل چلے ہیں۔ اور گاڑی سیدھی کالکا پہنچکر دم لیتی ہے۔ تمام مسافر شملے کے خوابوں میں محو ہوتے ہیں۔ اور کوئی بھی اس قدیم تفرج گاہ کا خیال نہیں کرتا۔ جو قریب ہی آم کے درختوں کے جھنڈ میں چھپی ہوئی ہے۔

میرے لئے پنجور ہمیشہ تیتریوں کا باغ رہے گا۔ میں نے پہلے پہل اس باغ کو اکتوبر کے آخری دنوں میں دیکھا تھا۔ رنگین و لطیف تیتریوں کا ایک گہرا بادل پھولوں کے جھنڈ پر چھایا ہوا تھا۔ مجھے قریب آتے ہوئے دیکھکر وہ ایک نشاط انگیز آواز کے ساتھ بکھریں۔ اور میرے پاس سے اس طرح اڑتی ہوئی گذریں گویا سنہری روشنی کی ایک موج تیرتی ہوئی جارہی ہے۔ عام طور پر ان کے رنگ سنہرے یا بھورے تھے۔ مگر کچھ ایسی بھی تھیں جن کے سفید بدن پر سیاہ دھاریاں تھیں۔ اور جن کے بازوؤں پر زرد اور سرخ نقطے چمک رہے تھے۔ کچھ آگ کے تیز شعلوں کی طرح اس قدر جلدی پرواز کر رہی تھیں کہ ان کے رنگ پہچاننا بہت مشکل تھا۔ لیکن مجھے تو سب سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوئیں ان کا رنگ ہلکا نیلا تھا۔ اور ان کے بازوں پر سیاہ دھاریاں تھیں۔

کالکا سے باغ کی طرف جاتے ہوئے پنجور گاؤں میں سے گذرنا پڑتا ہے اور وہاں کے عظیم کھنڈر بتاتے ہیں کہ کبھی یہ گاؤں شہر کا رتبہ رکھتا ہوگا۔ ان چشموں کے اردگرد جو کثیر تعداد میں یہاں موجود ہیں۔ تالاب بنائے گئے ہیں جن کی سیڑھیاں لاتعداد زائرین کے قدموں سے گھس گئی ہیں۔ کئی پرانے مندروں کے آثار اب تک باقی ہیں۔ اور نئی عمارتوں میں ایک سکھوں کا گردوارہ اور ایک مسجد بھی پائی جاتی ہے۔ گاؤں سے سو گز کے فاصلے پر سڑک ایک چھوٹے سے پل پر سے گذرتی ہے۔ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ پنجور کے باغات کا داخلہ کشمیر کے باغات کی طرح شاندار اور دلکش نہیں ہے۔

چار دیواری کے باہر بھی سبزہ اور پھول موجود ہیں۔ اور ان چیزوں سے حیرت کا وہ اثر کم ہوجاتا ہے جو باہر کی خالی زمین کو دیکھنے کے بعد اندر کے لہلہاتے سبز و معطر کو دیکھکر پیدا ہونا چاہئے

میرا دل بیٹھ گیا۔ اور میں نے اپنے آپ کو مایوسی اور افسردگی کے لئے تیار کرلیا مگر چار دیواری کی دھانی بیلوں کے اودے پھول دیکھکر کچھ تسلی سی ہوئی۔ اندر کی روش ایک سنگین چبوترے کی طرف جاتی ہے۔ جو باغ کی سطح سے پانچ قدم اونچا ہے۔ اور جس پر بیٹھنے کے لئے جگہ بنی ہوئی ہے۔ اس جگہ آم کے درختوں کے گنجان پتوں کا سایہ گرمی کی تپش کو بہت بڑی حد تک کم کرتا ہے۔ اور یہیں سے چاروں طرف کونوں کے میناروں کی طرف راستے جاتے ہیں۔ اس چبوترے کے نیچے سے چشمہ ابل کر نہر کو سیراب کرنے کے لئے بیتابانہ سفر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس جگہ بیٹھکر آم کے درختوں کے سایے کے نیچے یہ چشمہ طلسمی پانی کا آئینہ بن جاتا ہے۔ جس کی گہری سبز گہرائیوں میں دنیا کے مختلف واقعات و مناظر رقص کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

فدائی خاں خنازیر کے خوف سے پردہ نشین عورتیں چالاک راجہ گورکھے جو زر و دولت کی تمنا میں یہاں آکر ایک ویران باغ کو دیکھکر یقیناً ناخوش ہوتے ہوں گے۔ سکھ بہادر پھر انگریزوں کے سرخ و سپید چہرے۔ تھکے ہوئے پژمردہ مگر باغ کو دیکھ کر گل شاداب کی طرح کھل اٹھنے والے۔

یکایک پانی کی سطح مکدر ہوجاتی ہے۔ اور ایک سیاہ سبزی شے بلند ہوکر پھر پانی میں غایب ہوجاتی ہے۔

یہ کیا تھا؟ شاید گھاس۔ پھونس! نہیں یہ سانپ تھا۔ زندہ جاوید سانپ دیوتا۔

یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔

وسط میں ایک بارہ دری نظر آتی ہے جس کے اردگرد لوہے کے جنگلے سے تمام خوبصورتی ضائع ہوگئی ہے

پرانے سرو کے درختوں میں سے صرف کچھ درخت رہ گئے ہیں۔ مگر پانی کے قریب گلاب۔ یاسمن۔ نارنج۔ اور کھجور کے پودے فردوس نظارہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح محسوس ہرتا ہے گویا پانی کے کنارے مادر گیتی کے حسین ترین بچوں کی تصویریں کھینچدی گئی ہیں۔ شمس الہدیٰ

مختصر افسانے

(۱)

برائے فروخت

مکانوں کے ایجنٹ نے کہا گویا "آپ ایک مکان لینا چاہتے ہیں"؟

میں نے جواب دیا: شاید آپ جانتے ہیں۔ اس مکان (اگر اسے مکان کہا جا سکے) کا مالک جس میں میں اب ہوں۔ اسے فروخت کرنا چاہتا ہے۔ اور میں اس مکان کے خریدار کو دبشرطیکہ وہ مکان میں رہنا پسند کرے) اس کے انتخاب پر مبارکباد دیتا ہوں"۔

کیا وہ آپ کی مرضی کے موافق نہیں ہے؟ ایجنٹ نے پوچھا۔

میں نے کہا "نہیں"۔

غسلخانہ بہترین ہے۔ اگر آپ سر کو کھڑکی کے اور پاؤں کو دروازے کے باہر کر کے نہا سکیں۔ اور چھت جسے بناتے وقت غالباً دھوپ اور بارش سے سایہ دینے کے خیال سے بنایا گیا ہوگا۔ اب چھلنی کا کام دے رہی، خانہ باغ کی کیفیت یہ ہے کہ ان گھاس کی چند پتیوں کے سوا جو کچھ پراگی ہوئی ہیں۔ کوئی اور چیز سبز رنگ کی نہیں۔ دو پرانے کھوکھلے درختوں کے تنے البتہ کھڑے ہیں جو شاید ایک ہزار سال قبل سرسبز و شاداب ہوں۔ اور شہر سے فاصلہ پورے دو میل۔

ایجنٹ مسکرایا۔

آپ غالباً یہ سنکر خوش ہوں گے کہ ہمارے رجسٹر میں اس وضع کا کوئی "مکان برائے فروخت" درج نہیں کیا گیا۔ یہ اس نے ایک کاغذ کا ایک تختہ اٹھاتے ہوئے کہا"۔ ایک مکان قابل فروخت ہمارے پاس ہے۔ جو میری ناچیز رائے میں بالکل آپ کے لئے موزوں ہے"۔

اس نے عینک کو جو ڈھلک کر ناک پر آگئی تھی ٹھیک بٹھایا۔

یہ دل پسند جائے سکونت ایک ایسے باغ کے درمیان واقع ہے جو دس سال قبل اپنے میووں کے لئے نہایت مشہور تھا۔ مکان کے ساتھ باغ ٹینس کا میدان۔ سرد خانہ۔ انگور کا منڈوا۔ سیب کے درخت وغیرہ اور ایک نہر فریب منظر بھی شامل ہے۔

"بہت خوب"

محل وقوع بہترین ہے۔ دوکانیں۔ ڈاک خانہ۔ اسٹیشن قریب آب و ہوا پاک صاف۔ چار کمرے سونے کے۔ دو ملاقات کے۔ اور ایک چھوٹا سا خوشنما غسلخانہ۔ غرض ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ مکان کے بنانے میں بہ نسبت ظاہری شان و شوکت کے آسائش و آرام کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ کمرے اتنے بڑے نہیں جن میں سر طوب ہوا رات دن ستاتی ہو۔ چھوٹے ہیں مگر خوبصورت اور آرام دہ۔ اور یہی مکان کی سب سے بڑی خوبی ہے"۔

"یہی تو میں بھی چاہتا ہوں"۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔

میں صاف گوئی کو پسند کرتا ہوں۔ جناب! پھر پھسلکر نیچے آتی ہوئی عینک ٹھیک کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"موجودہ کرایہ دار اسے چھوڑنے کے لئے سخت ناراض ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اتنے کرایہ میں اس سے بہتر مکان ملنا ناممکن ہے"

مگر وہ معتبرانہ نظروں سے میری طرف دیکھکر مسکرایا۔" آپ جب ارشاد فرمائیں میں ان سے تخلیہ کرانے کا ذمہ دار ہوں۔

میں نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ شکریہ۔ ہزار بار شکریہ" میں چلایا "مگر یہ تو فرمائیے کہ اس کا پتہ کیا ہے"؟

پتہ! ایجنٹ نے کہا" عشرت منزل۔ انار کلی"

میں دفعتاً چونک پڑا۔

"شکریہ"۔ میں نے سنبھلکر کہا "مگر ــــ مگر میں آپ کو زیادہ تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ واقعہ یہ ہے کہ "عشرت منزل" فی الحال میری ہی عشرت گاہ بنی ہوئی ہے"۔

گھڑی

(۲)

لیاقت ان لوگوں میں سے تھا جو ہر چیز کی ماہیت سے بظاہر واقفیت کلی رکھتے ہیں۔ وہ بتا سکتا ہے کہ رات کے کھانے اور سونے کے

اور سونے کے درمیان ٹھیک کتنے گھنٹے۔ کتنے منٹ اور کتنے سکنڈ گذرنے چاہئیں اگر سردی سے سینہ میں درد ہو۔ اور ڈاکٹر نے تر پن تیل کی مالش کا مشورہ دیا ہو۔ تو وہ بتا سکتا ہے کہ آیوڈین پر تر پن تیل کو کیوں ترجیح دی گئی۔ اس کے خواص کیا ہیں؟ یہ کیسے بنتا ہے۔ کہاں بنتا ہے؟ وغیرہ۔ لیاقت جتنے اخبار درسائل شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کا خریدار ہے۔ مگر اس کی اخبار بینی۔ معلومات زندگی اور خانگی ضروریات کے فنسٹر کالموں تک محدود رہتی ہے

سال بھر میں ایک بار — کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر میری اس سے ضرور ملاقات ہوتی ہے۔ اجلاس دو دن تک رہتا اور اس درمیانی رات کو جو وہاں گذارنی پڑتی۔ مجھے عموماً لیاقت کی بے پناہ مغز خراش بکواس کا شکار بننا پڑتا تھا۔ اس مرتبہ اس نے گھڑیوں سے — گھڑیوں کو کوکنے۔ زیادہ صحیح ہوگا۔ کا عنوان پسند کیا تھا۔ رات کے دس بجے عین اُس وقت جب میں سونے جا رہا تھا۔ لیاقت نے اپنا لکچر شروع کر دیا۔ شام سے میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ کسی قدر افسردہ و خاموش ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے خیال ہوا کہ شاید آج مجھے چین کی نیند سونا نصیب ہو۔ مگر ایسا ہونا تھا نہ ہوا۔ فی الحقیقت یہ خود میری غلطی تھی۔ مجھے ہوٹل کے گھڑیال کے دس بجانے پر وقت کی صحت کا اطمینان اور ہوٹل کی گھڑیال پر بھروسہ کر لینا چاہئے تھا۔ مگر ایسے وقت جبکہ قرائن سے ظاہر ہو رہا تھا کہ لیاقت کسی مناسب عنوان کا متلاشی ہے۔ میں نے جیب سے گھڑی نکالی۔ وقت دیکھا اور پھر کوکنے لگا۔ لیاقت نے بھی اپنی گھڑی نکالی۔ اور اس سے کھیلتے ہوئے چابی دینے لگا۔

"تم اپنی گھڑی کب کو کتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"بارہ بجے دن کے وقت۔"

"کیوں دن کو کیوں"؟

"میں نہیں جانتا غالباً عادتاً"

"یہ غلط طریقہ ہے۔ بالکل غلط۔"

اب چھٹکارا ملنا ناممکن تھا۔ میں اُٹھتے اُٹھتے پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ یقیناً لیاقت کے پاس گھڑی کوکنے کے وقت پر لکچر دینے کا کچھ زیادہ مواد نہیں ہو سکتا۔

"اکثر لوگ" لیاقت نے لکچر دینے کے مقررہ اصولوں کی باقاعدگی سے پابندی کرتے ہوئے کہا: "یہ خیال کرتے ہیں کہ چابی دن کے وقت دینی چاہئے۔"

"مگر بعض رات کے آٹھ بجے بھی تو کوکتے ہیں"۔ میں نے بات کاٹ کر کہا۔

"بالکل درست۔ حالانکہ وہ اسے اچھا سمجھ کر نہیں بلکہ محض سستی اور لاپروائی کی وجہ سے کرتے ہیں۔ مگر دراصل وہی صحیح راستہ پر لگے ہوئے ہیں۔"

اس نے کوکنا بند کیا۔ اور مطمئن انداز سے گھڑی جیب میں رکھ لی۔

"یہ لوگ" اس نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا: "بزعم خود دن کے وقت چابی دینے پر زبردست دلائل رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رات کے وقت سردی کی وجہ سے کمانی سکڑ جاتی ہے۔ اور اگر اس وقت چابی دی جائے تو اس کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔"

"ان کا خیال تو صحیح معلوم ہوتا ہے۔" میں نے اعتراض کیا۔

"نہیں غلط ہے۔ بالکل غلط۔ وہ کمانی کے سکڑ جانے کی حد تک تو صحیح کہتے ہیں۔ مگر کوئی ان سے پوچھے کہ بھلے آدمیو! کیا چابی کا پورا پورا بھر دینا ضروری ہے۔؟ اچھا۔ اور اگر . . . ."

بوائے نے یہ کہتے ہوئے کہ مجھے ٹیلیفون پر طلب کیا گیا ہے۔ لیاقت کی بحث کو ناتمام رکھ دیا۔ میں ایسے غیر مترقبہ موقعہ کو ہاتھ سے کیوں جانے دیتا؟ حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس وقت مجھے ٹیلیفون پر بلانے والا کوئی نہیں ہو سکتا۔ صرف نمبر کی غلطی ہوگی۔ مگر — میں نے لیاقت کو شب بخیر کہا۔ اور ٹیلیفون پر یہ معلوم کرنے کے بعد کہ واقعی نمبر کی غلطی ہے۔ میں اپنے کمرہ میں گیا اور سو گیا۔

بدقسمتی سے مجھے صبح میں سگریٹ کی ضرورت ہوئی۔ دیاسلائی میرے پاس نہ تھی۔ میں لیاقت کے کمرہ میں گیا۔ "مجھے آنکھ کھلتے ہی سگریٹ پینے کی عادت ہے۔ اور میرے پاس دیاسلائی نہیں"۔ یہ اور اسی قسم کے چند معذرت آمیز جملے کہتے ہوئے لیاقت کے خوابیدہ آواز میں اندر بلانے پر میں داخل ہوا۔

"ہائیں"۔ میں نے سگریٹ سلگانے کے بعد وقت دیکھکر کہا۔ "تمہاری گھڑی تو رک گئی ہے!"

"کیا؟"

میں نے میز پر سے گھڑی اُٹھائی۔ اسے کھولکر ہلایا۔ کوئی چیز سرسراہٹ کے ساتھ تیزی سے اس میں سے اچھل کر نکلی۔ اور زمین پر گر پڑی۔

"تمہاری کمانی ٹوٹ گئی ہے"۔ میں نے کہا۔

محمد محی الدین
تنویر قریشی

ہمخیال احباب

مسٹر جان نے ایک نیم مجنوں کرنل کی مشین بکوا کر چھ ہزار پونڈ حاصل کر لئے۔ اب کیا تھا دن عید اور رات شب برات۔ لنڈن کے بہترین ہوٹل میں سکونت اختیار کر لی۔ اور اس دریا دلی سے روپیہ صرف کرنے لگے کہ ہوٹل کے ملازموں کے دل میں چال چلن کے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا ہو گئے۔ ایک نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ حلال کی کمائی کو کوئی شخص اس طرح فضول خرچی میں برباد نہیں کر سکتا۔"

ابھی مسٹر جان کو ہوٹل میں قیام کئے ہوئے ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ ایک روز صبح ہی صبح ملازم نے کسی شخص کی آمد کی اطلاع دی۔ نوکر نے کوئی کارڈ پیش نہیں کیا تھا اس لئے مسٹر جان سمجھ گئے کہ نو وارد کوئی غریب آدمی ہے۔ با دل ناخواستہ اسے اندر بلایا۔ ان کے شبہات کو ملاقاتی کے لباس نے یقین میں تبدیل کر دیا۔ مسٹر جان نے سرد مہری سے اس کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اس کے لباس کا جائزہ لینا شروع کیا۔ سوٹ کی تراش بہت بھدی تھی، کپڑا بھی بہت معمولی اور بوسیدہ تھا۔ چہرے سے نقاہت برستی تھی مسٹر جان غریب آدمیوں کی ملاقات سے ہمیشہ حذر کرتے رہے۔

مسٹر جان نے کہا "میرا نام جان ہے، جناب کا اسم شریف؟"

"مجھے فلپ کہتے ہیں" اجنبی نے نہایت کمزور آواز میں کہا۔

"اس عزت افزائی کا باعث؟" مسٹر جان نے اختصار کے ساتھ پوچھا۔

"مسٹر جان! فلپ نے کہنا شروع کیا "آپ اس پاگل کی مشین بکوا کر بہت دولتمند ہو گئے ہیں۔ آپ نے دولت کے ساتھ شہرت بھی حاصل کی ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ لنڈن کی چند عظیم الشان ہستیاں آپ سے روشناس ہو گئی ہیں۔ ۔ ۔"

"جی ہاں" مسٹر جان نے چیں بجبیں ہو کر کہا "مجھے سب معلوم ہے۔ مگر میں آپ کی تشریف آوری کا مقصد معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا آپ آج شام کو میرے ہمراہ ایک مقام پر چل سکتے ہیں؟" اجنبی نے لاپروائی سے پوچھا۔

مسٹر جان سمجھ گئے کہ یہ شخص یا تو کسی غریب انجمن کا سکرٹری ہے جو انہیں انجمن کا دفتر وغیرہ دکھلا کر چندہ طلب کرے گا یا یہ خود اپنے گھر کی خستہ حالت یا گھر میں کسی بیمار کو دکھا کر امداد کا طالب ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے ذرا ترش روئی سے کہنا شروع کیا "جناب من میں ہر طرح آپ کی امداد کرنے کے لئے آمادہ ہوں لیکن کوئی ایسا وعدہ کرنے سے مجبور ہوں جو ۔ ۔ ۔"

اجنبی نے نہایت سخت لہجہ میں کہا "کیا آپ مجھے بھک منگا سمجھتے ہیں" کیا دنیا میں لوگ ایک دوسرے سے محض روپیہ حاصل کرنے کے لئے ملتے ہیں۔؟ کیا تم مجھے روپوں کا بھوکا سمجھتے ہو۔؟ لو یہ اپنے پاس رکھو" یہ کہکر اجنبی نے اپنی جیب سے کاغذوں کا ایک پلندا نکالکر ہوا میں اچھالا۔ تمام کمرے میں چھوٹے چھوٹے کاغذ بکھر گئے۔ اجنبی مارے غصے کے سرخ ہو رہا تھا۔ اور اس کے منہ میں کف بھر آیا تھا۔ مسٹر جان قدرے شرمندہ ہوئے اور کاغذوں کو جمع کرتے ہوئے کہنے لگے "جناب آپ تو خواہ مخواہ ۔ ۔ ۔" یکایک ان کی نظر ان بکھرے ہوئے پرچوں میں سے ایک پر جا پڑی۔

مسٹر جان بت بنے ہوئے رہ گئے۔ نوٹ کی اصلیت میں کوئی شک نہ تھا۔ تمام کمرہ بنک آف انگلینڈ کے سو سو روپے کے نوٹوں سے بھرا پڑا تھا! اجنبی کو روانہ ہوتے دیکھکر مسٹر جان نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا۔ اور کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا "خدا کے لئے اپنے ان نوٹوں کو لیتے جاؤ مجھے ان کی ضرورت نہیں"

اجنبی مسکرایا اور کہنے لگا "نہیں پھر سوچ لو۔ شاید تمہیں اس کی ضرورت ہو۔ تم خوشی سے انہیں اپنی پونجی میں شامل کر سکتے ہو!"

مسٹر جان نے نوٹ جمع کر کے اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "لیجئے مجھے ان کی ضرورت نہیں"

اجنبی نے لاپروائی سے نوٹوں کو اپنی جیب میں رکھ لیا "گن لو"

مسٹر جان نے کہا، "شاید ایک آدھا نوٹ ادھر ادھر پڑا رہ گیا ہو"

"چلو اچھا ہی ہو گا" فلپ نے بے پروائی سے کہا "میرے سر سے کچھ بوجھ ہلکا ہی ہو گا۔ جیسے وہ نوٹ اٹھائے وہی اسے رکھ لے ۔ ۔ ۔ تم روپوں کو بہت اہمیت دیتے ہو مگر میرے نزدیک روپیہ کوئی چیز نہیں۔ میرا دل روپے سے بھر گیا ہے۔ میں پھر تم سے کہتا ہوں کہ تم ان نوٹوں کو شوق سے لے سکتے ہو۔ اپنے دوستوں کو کہدینا کہ ہمخیال احباب

والے فلپ نے تحفہ دئے تھے...... تمہارے ہر پونڈ کے مقابلہ میں میرے پاس تین سو پونڈ ہیں۔ گویا میں لکھ پتیوں سے بھی کہیں زیادہ دولتمند ہوں لیکن یا ایں ہمہ ہمخیال احباب، میں ہیں سب سے زیادہ غریب ہوں...."

مسٹر جان کسی زمانہ میں ایک اخبار کے نامہ نگار رہ چکے تھے ہمخیال احباب، میرے ہر پونڈ کے مقابلے میں تین سو پونڈ یعنی کم از کم اٹھارہ لاکھ پونڈ بالمساوی کم قیمت، دولت سے نفرت، ان تمام باتوں کو سنکر ان کے دماغ میں ایک سچے نامہ نگار کی طرح ایک اچھا خاصہ افسانہ تیار ہوگیا۔

اب وہ اجنبی کی باتوں میں کچھ کچھ دلچسپی لینے لگے اور مزید معلومات بہم پہنچانے کے خیال سے فلپ سے کہا" اگر آپ صاف صاف مجھے اس ملاقات کا سبب بتلا دینگے تو میں آپ کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوجاؤنگا۔

"واقعی" اجنبی نے بڑی مسرت کے ساتھ کہا" مجھے آپ سے بہت ضروری کام ہے۔ میں آپکو ہمخیال احباب سے ملاؤنگا۔ وہیں چلکر آپ کو سب کچھ بتا دیا جائے گا.... مسٹر جان آپ شاید مجھے نیم مجنوں سمجھتے ہیں انکار کی ضرورت نہیں۔ میرا بھی دماغ جو آپ کی نظروں میں بیکار ہے لوگوں کے دلوں کے خیالات پڑھ لیتا ہے۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں آج شب کی ملاقات کے بعد آپ کو سب کچھ معلوم ہوجائے گا، کھڑے ہوتے ہوتے۔ امید ہے کہ آپ ٹھیک آٹھ بجے نیشنل لائبریری کی سیڑھیوں پر پہنچ جائینگے۔ اس وقت آپ کی نئی گھڑی میں ٹھیک نو بجکر تیئیس منٹ ہوئے ہیں...."

مسٹر جان یک لخت چونکتے ہوئے اور اپنی گھڑی نکال کر دیکھی، تو ٹھیک ۹ بجکر تیئیس منٹ ہوئے۔ انہیں سخت حیرت ہوئی کہ جب انہوں نے اجنبی سے گفتگو کرتے ہوئے گھڑی کو نکالا ہی نہ تھا تو اُسے کیوں کر معلوم ہوگیا کہ ان کی گھڑی نئی ہے۔ کوئی زنجیر بھی نہیں کہ جسے دیکھکر وہ اندازہ لگا سکتا۔ اس امر پر بھی سخت حیرت تھی کہ اس نے بالکل ٹھیک وقت بتادیا ......

فلپ نے مسٹر جان کے خیالات کو تاڑ لیا اور کہا" یہ تو بالکل سہل بات تھی۔ جن نوجوانوں کو یک لخت روپیہ مل جاتا ہے وہ سب سے پہلے نئی گھڑی ضرور خریدتے ہیں اور نئی گھڑیاں ٹھیک وقت دیتی ہیں۔ میں نے گھڑیال کی آواز سنی تھی۔ اس وقت سوا آٹھ بجے تھے۔ اس وقت سے لیکر ابتک میں نے چار سو اسی دفعہ گنا گویا ۴۸۰ سیکنڈ یعنی آٹھ منٹ گزر گئے۔ اسی لئے میں نے کہدیا کہ اس وقت ۹ بجکر ۱۵+۸ یعنی ۲۳ منٹ ہوگئے ہیں۔ میں آپ سے باتیں بھی کرتا رہا اور سیکنڈ بھی گنتا رہا۔ میرا یہی بیکار دماغ دن بھر گنتی کرتا رہتا ہے لہٰذا مجھے کسی گھڑی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اب آپ کی گھڑی میں نو بجکر ستائیس منٹ ہوئے ہیں۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ ٹھیک آٹھ بجے نیشنل لائبریری پر پہنچ جائے گا۔ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ اگر آپ اپنے ساتھ کوئی پستول لیتے آئے گا تو مجھے ہرگز برا نہ معلوم ہوگا۔"

مسٹر جان کو یہ دن پہاڑ کی طرح معلوم ہونے لگا۔ ہر پانچ منٹ کے بعد گھڑی کی طرف دیکھتے تھے۔ کہ کب آٹھ بجتے ہیں۔ تمام دن ان کے پریشان دماغ میں ہمخیال احباب کا خیال رہا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایسے زبردست دولتمند آدمیوں کو اُن سے کیا کام ہوسکتا ہے۔ اسی فکر و تردد میں ان سے کھانا بھی اچھی طرح نہ کھایا گیا اور وقت سے گھنٹہ بھر پہلے ہی ہوٹل سے نکل پڑے۔ اِدھر اُدھر چہل قدمی کرنے کے بعد ٹھیک آٹھ بجے نیشنل لائبریری کی سیڑھیوں پر جا کھڑے ہوئے ابھی لائبریری کا گھنٹہ آٹھ بجا ہی رہا تھا کہ سامنے کی طرف سے ایک نہایت نفیس موٹر آکر سیڑھیوں کے قریب رک گئی۔ دروازہ کھلا اور کار میں سے ایک شخص اترا جو لباس سے کوئی بہت بڑا رئیس معلوم ہوتا تھا۔

مسٹر جان نے بمشکل فلپ کو پہچانا۔ اپنے لباس کی کم مائیگی کیوجہ سے انہیں سخت الجھن ہوئی۔

فلپ نے سلام کے بعد کہنا شروع کیا" میں ایک منٹ دیر سے آیا ہوں، چلئے آپ کا انتظار کیا جارہا ہے۔

مسٹر جان نے ذرا ہچکچاتے ہوئے کہنا شروع کیا" مجھے افسوس ہے کہ میں جلدی میں کپڑے بدل نہ سکا امید ہے کہ۔"

ارے میاں چلو بھی، فلپ نے مسکراتے ہوئے کہا" ولیم کو لشا لباس کے بارے میں احتیاط برتتا ہے۔"

دونوں کار میں ایک دوسرے کے قریب بیٹھ گئے اور موٹر نہایت خاموشی سے روانہ ہوگئی۔ مسٹر جان نے محسوس کیا کہ اب فلپ کی باتوں سے وحشت نہ ٹپکتی تھی۔ بلکہ وہ نہایت سنجیدگی اور متانت سے دنیا بھر کے اہم معاملات پر بحث کر رہا تھا۔ دوران گفتگو میں اس نے کہا کہ موجودہ حکومت کا رجحان سوشیلزم کی طرف ہے۔ ایسی حکومت جائداد وغیرہ کے حق میں مضر ثابت ہوتی ہے۔ مگر مجھے چنداں پروا نہیں ہے۔ میری جائداد نقد روپیہ سے میں تھوڑا تھوڑا روپیہ قرض دیتا ہوں کیونکہ تھوڑا روپیہ بہت جلد منافع دلاتا ہے۔ میں یہ بھی نہ کرتا اگر اکیو لیس کے مجبور کرنے پر یہ بھی کرنا ہی پڑا... وہ بیکاری کا سخت دشمن ہے اور اس کا خیال ہے کہ بیکار پڑا ہوا روپیہ بیکار آدمی سے زیادہ خطرناک ہے۔ عجیب دماغ ہے اس شخص کا...."

فلپ تو اکیو لیس کے دماغ کی تعریف میں لگ گیا اور مسٹر جان اپنے

خیالات میں گم ہو گئے۔

کافی وقفے کے بعد فلپ نے یکایک مہر خاموشی توڑی اور کہا مسٹر جان آپ اُن دونوں کے سامنے بیشک گفتگو کر سکتے ہیں لیکن خدارا سیاسیات ہند کا ذکر ہرگز نہ کیجئے۔ نہ معلوم کیوں ولیم کا عدیم المثال دماغ اس موقعہ پر بالکل بیکار ہو جاتا ہے" مسٹر جان نے اظہار تعجب کے بعد وعدہ کر لیا کہ وہ سیاسیات ہند کا قطعاً ذکر نہ کریں گے۔

موٹر بہت بڑی مسافت طے کرنے کے بعد ایک عالیشان مگر تاریک مکان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ فلپ اور مسٹر جان اتر گئے اور فلپ نے دروازے کے قریب پہنچکر ایک بٹن دبایا۔ دور سے گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ مسٹر جان سخت حیران تھے کہ اتنے بڑے مکان میں روشنی کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا، وہ ابھی سوال کرنے ہی کو تھے کہ دروازہ کھل گیا اور ایک ملازم ہاتھ میں موم بتی لئے ہوئے باہر نکل آیا۔ یہ تھا تو ملازم لیکن اس کا شاندار لباس کسی شہنشاہ کے خاص الخاص ملازموں سے گھٹ کے نہ تھا۔ اس کے بھڑکیلے لباس پر جگہ جگہ سنہری کام کیا ہوا تھا۔ اس نے جھک کر دونوں کو سلام کیا اور کہا "مسٹر اینکٹیوپیس اور مسٹر ولیم مسٹر فلپ اور مسٹر جان کا انتظار کر رہے ہیں" یہ کہکر دونوں کو راستہ بتاتے ہوئے ملازم آگے آگے روانہ ہو گیا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے مسٹر جان اخبار نویس تھے اور اصلی اخبار نویس، ظاہری کروفر سے کبھی متاثر نہیں ہوتے۔ مسٹر جان اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے لیکن اس ملازم کی شان، شوکت اور اس عظیم الشان مکان کی ویرانی ان پر اثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ گو سنہری دستے والی شمع کی روشنی بالکل مدہم تھی۔ لیکن مسٹر جان نے دیکھ لیا تھا کہ ہال میں کوئی فرنیچر یا آرائشی سامان نہ تھا یہ تینوں ہال میں سے گزر کر ایک دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے اور ملازم نے اس پر آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے ایک کرخت آواز آئی "آجاؤ" ملازم نے دروازہ کھول کر نہایت ادب سے کہا۔

"مسٹر جان اور مسٹر فلپ" یہ دونوں کمرے میں داخل ہو گئے۔

گو یہ کمرہ بھی آرائش سے بری تھا مگر اس میں کرسیاں۔ کوچ وغیرہ تھے جن پر سفید چادریں ظاہر کر رہی تھیں کہ کرایہ کا سامان ہے۔ کمرے کے درمیان ایک بہت بڑی میز لگی ہوئی تھی۔ میز کے بیچوں بیچ سنہری شمع دان میں سات موم بتیاں جل رہی تھیں۔ میز کے دو سروں پر ایک دوسرے کے بالمقابل دو شخص بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک تنومند تھا دوسرا بیحد لاغر۔ اس کی آنکھوں سے فکر اور کثرت مطالعہ کے تاثرات نمایاں تھے لباس بھی بہت بھدا تھا۔ یہ شخص برابر موم بتیوں کو تک رہا تھا۔ تنومند شخص کا لباس بھی بالکل معمولی تھا لیکن بہت چست تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر مسٹر جان سے ہاتھ ملایا اور خندہ پیشانی سے کرخت آواز میں کہا۔

"مسٹر جان میں آپ کی تشریف آوری کا بیحد ممنون ہوں......

یہ میرے دوست مسٹر اکٹیوپیس ہیں" اکٹیوپیس نے بیٹھے ہی بیٹھے سر ہلا کر سلام کر لیا اور پھر بتیوں کو تکنے لگا۔

مسٹر جان ولیم کے قریب بیٹھ گئے۔ فلپ ان کے مقابل والی نشست پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی

آخر ولیم کی کرخت آواز نے مہر سکوت توڑی "مسٹر جان" اس نے کہا شاید آپ سوچتے ہیں کہ آپ کو یہاں تک تشریف لانے کی تکلیف کیوں دی گئی؟" مسٹر جان نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔ ولیم نے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ یہ کسی اخبار کا ایک کالم تھا۔ ولیم نے پڑھنا شروع کیا۔

"ہمارے شہر کے تجارتی حلقوں میں یہ خبر خاص مسرت کے ساتھ سنی جائیگی کہ مشہور جرنلسٹ مسٹر جان نے ایک کرنل کی ایجاد کردہ مشین کو جو تقریباً بیکار ثابت ہو چکی تھی، بکوا کر اپنی اعلیٰ دماغی قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ اب تک مسٹر جان ایک جرنلسٹ کی حیثیت سے مشہور تھے لیکن اس واقعے کے بعد انھوں نے ایک اعلیٰ تجارتی دل و دماغ کے مالک ہونے کا ثبوت دیا ہے.......اس کاروبار میں مسٹر جان کو بیس ہزار پونڈ منافع ہوا"

ولیم نے کاغذ کو تہ کر کے جیب میں رکھ لیا اور مسٹر جان نے سر ہلا کر اس خبر کی تصدیق کر دی۔

مسٹر ولیم نے کہا یہ دلچسپ خبر "ولسیٹرن کلچر" میں شائع ہوئی تھی۔ اور مجھے کامل یقین ہے کہ نامہ نگار آپ خود ہی تھے"

مسٹر جان نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا "مجھے بخوبی معلوم ہے"، ولیم نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ آپ کو بیس ہزار پونڈ نہیں ملے۔ یہ مبالغہ ہے۔ آپ کو صرف چھ ہزار پونڈ منافع ہوا

مسٹر جان شرم کے مارے پانی پانی ہو رہے تھے۔ اور کوئی جواب سوچ ہی رہے تھے کہ اکٹیوپیس بول اٹھا "کیا ہمیں سات موم بتیوں کی ضرورت ہے"؟

ولیم نے ملامت سے کہا "ہاں میرے خیال میں ساتوں کی ضرورت ہے"

"سات بتیاں ایک ہی وقت میں جل رہی ہیں" اکٹیوپیس نے کہا"

"مگر یہ کمرہ بھی تو بہت بڑا ہے" فلپ نے نرمی سے جواب دیا۔

اکٹیوپیس نے مسرت بھری آواز میں کہا "یہ بتیاں دو پنس کی ایک کے حساب سے ملتی ہیں...چودہ پنس فی شب...اگر میں ایک

بتی بجھا دوں تو کوئی ہرج ہے"؟ "جی نہیں"

ولیم نے ذرا سختی سے کہا "جی نہیں ہمیں ساتوں بتیوں کی ضرورت ہے" اس پر اکیٹولیس منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر چپ ہو گیا"

اس اثناء میں مسٹر جان کو جواب سوچنے کا موقع مل گیا۔ اور انہوں نے کہنا شروع کیا" میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس خبر کی صداقت سے "مجھے کیا تعلق ہے؟ ولیم نے ہنستے ہوئے کہا۔کیوں کیا آپ بھی پوچھنا چاہتے تھے"! پھر ذرا سنجیدگی سے کہا" جی ہاں مجھے بلکہ یوں کہئے کہ بخیال احباب کو اس خبر کے ساتھ بہت دلچسپی ہے۔ مسٹر جان! اگر ہم آپ کو ڈیڑھ لاکھ پونڈ دیں تو کیا آپ ہماری جانب سے ایک روز نامہ جاری کر سکیں گے"؟

اگر کہا جائے کہ اس بات کے سنتے ہی مسٹر جان مبہت بنکر رہ گئے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔کون ایسا نامہ نگار ہے جو ہمیشہ ایک خود مختار ایڈیٹر نہ بننا چاہتا ہو؟ ایک لاکھ پونڈ سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ایک ایسا روز نامہ جاری ہو سکتا ہے جو دیوتاؤں کو بھی متاثر کر دے۔ دنیا کے بہترین انشا پرداز اس کے نامہ نگار بنائے جا سکتے ہیں۔ دنیا کی مشہور ترین تجارتی فرمیں اپنے اشتہارات ایسے اخبار میں بڑی سے بڑی رقم صرف کر کے شائع کر سکتی ہیں۔

مسٹر جان بمشکل یہ کہنے کے قابل ہوئے" ہاں میں اس کام کی ذمہ داری لے سکتا ہوں"!

اکیٹولیس نے اپنی نظروں کو شمعدان پر جمائے ہوئے کہا" اور بھلا یہ اس مسئلے پر بھی پر زور مضامین بہم پہنچانے کی ذمہ داری لے سکتے ہیں؟

فلپ یہ سنکر مسکرایا اور کہا"رکھو تو میں مسٹر جان سے پوچھوں!

اکیٹولیس نے مسکراتے ہوئے سر ہلا کر اجازت دیدی۔

فلپ مسٹر جان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا" مسٹر جان! کیا آپ سیاسیات ہند کے بارے میں بھی کچھ....."

ولیم جو اب تک حیران بیٹھا تھا یہ سنکر کھڑا ہو گیا۔اس کا چہرہ مارے غصے کے سُرخ ہو رہا تھا۔اس نے زور سے میز پر ہاتھ مارا اور چلا کر کہا" ہرگز نہیں۔ہرگز نہیں۔ہمارے پرچے میں ان بیہودگیوں کا قطعاً ذکر نہ ہوگا" پھر ذرا ٹھنڈا ہو کر بیٹھ گیا اور بمنت اکیٹولیس سے کہا" اکیٹولیس تمہیں معلوم ہے کہ میں اس تذکرہ سے گھبراتا ہوں"۔ اکیٹولیس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر معافی مانگ لی۔

پانچ منٹ تک کمرے میں خاموشی رہی۔ ولیم اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے بیٹھا تھا۔ اکیٹولیس شمعدان کو تک رہا تھا۔فلپ نیچی نگاہیں کئے بیٹھا رہا؟ اور مسٹر جان ان تینوں کی طرف دیکھتے رہے۔

آخر فلپ نے مہر سکوت توڑی اور کہا" مسٹر جان! ہم آپ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر آپ کے حوالے ڈیڑھ لاکھ پونڈ کی ایسی جائداد کر دی جائے جس کا روپیہ آپ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر حاصل کر سکتے ہوں تو کیا آپ ایک روز نامہ جاری کر سکیں گے؟ اور یہ روزنامہ آج سے تین مہینے کے اندر اندر پبلک کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا؟"

مسٹر جان نے بلا پس و پیش اقرار کر لیا۔

اکیٹولیس نے جھنجلا کر کہا" سات موم بتیاں ضرورت سے زیادہ ہیں خدا کے لئے مجھے ایک بتی بجھا لینے دو" یہ کہکر وہ موم بتی بجھانے کے لئے اٹھا لیکن پھر کچھ سوچ کر بیٹھ گیا اور کہا" اور ہاں کیا اس جائداد کو بلا ضمانت حوالے کر دیا جائے گا"؟

"اکیٹولیس! ولیم نے بڑے افسوسناک اور حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

اکیٹولیس نے متاثر ہوئے بغیر کہا" یہ تو ایک طرح کی احتیاط ہے جو بالکل ضروری اور لابدی ہے۔شاید یہ ایک دولتمند آدمی ہیں اور یہ بھی بعید نہیں کہ بالکل غریب ہوں۔ ڈیڑ لاکھ پونڈ ایک رقم ہے"!

جی نہیں، ولیم نے سختی سے کہا، میں آپ سے اختلاف کرتا ہوں"

مسٹر جان جو اب کچھ کچھ اس معاملے کو سمجھ چلے تھے کہنے لگے" مسٹر اکیٹولیس کا خیال بالکل بجا ہے۔میں چھ ہزار پونڈ بطور ضمانت پیش کر سکتا ہوں، اس سے زیادہ میرے پاس کچھ نہیں"

"یہ ضرورت سے زیادہ ہے، ولیم نے کہا، غیر ضروری۔ بالکل غیر ضروری کیوں فلپ تم مجھ سے اتفاق کرتے ہو؟"

"اگر مجھے معلوم ہوتا" فلپ نے سخت نفرت سے کہا۔ کہ اکیٹولیس ایسی بات کہیں گے تو میں مسٹر جان کو ہرگز نہ بلاتا"

اکیٹولیس کو اس کے دونوں دوست نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے لیکن اس پر ان تمام باتوں کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ وہ برابر شمعدان کو تکتا رہا کچھ وقفے کے بعد کہنے لگا"انہیں کل چھ ہزار پونڈ لانے دو میں اسی وقت اپنا حصہ ان کے حوالے کر دوں گا۔ تم لوگ اپنی اپنی مرضی کے مالک ہو"

اس کے بعد سب لوگ خاموش ہو گئے۔مسٹر جان مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کل شب کو میں چھ ہزار پونڈ لے کر حاضر ہو جاؤں گا"

فلپ نے چلا کر کہا" اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ اکیٹولیس

تم نے مجھے سخت شرمندہ کیا ہے"

مسٹر جان دروازے کی طرف چلدیے۔ فلپ بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ دروازے کے باہر ہی ملازم ہاتھ میں شمع لئے کھڑا ہوا تھا۔ ذرا سننئے گا، فلپ نے جان سے کہا: "اگر آپ کو روپیہ حاصل کرنے میں کسی قسم کی دقت ہو تو اسے بھنا لیجئے"۔ یہ کہکر اس نے بنک آف انگلینڈ کے نام ایک خالی چک مسٹر جان کی جیب میں ڈالدی۔

"آپ اس کے ذریعے پچاس ہزار پونڈ تک حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن خدا کے لئے اکیٹولیس کو اس کی خبر نہ ہونے دیجئے"۔

مسٹر جان نے مسکرا کر چک واپس کر دیا اور کہا: "آپ جانتے ہیں کہ میں چھ ہزار پونڈ آسانی سے حاصل کر سکتا ہوں"۔ مگر فلپ نے اصرار کر کے مسٹر جان کو اس چک کے لینے پر مجبور کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد مسٹر جان تنہا اسی کار میں جس میں وہ یہاں آئے تھے واپس جا رہے تھے۔

ان کے دماغ کی اس وقت عجیب حالت ہو رہی تھی۔ جس زمانے میں وہ "میگافون" کے نامہ نگار تھے اکثر ایک پرچہ جاری کرنے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ لیکن سرمایہ کی کمی بلکہ غیر موجودگی کی وجہ سے کچھ نہ کر سکتے تھے اب ان کا خواب پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے گھر پہنچنے سے پہلے ہی طے کر لیا تھا۔ کہ اخبار کا نام "مانیٹر" ہوگا۔ اور لندن کے فلاں فلاں مشہور مضمون نگاروں کو ملازم رکھا جائے گا۔

رات کو تین بجے کے بعد انہیں نیند آئی۔ اور صبح دن چڑھے آنکھ کھلی بستر پر ہی صبح کا ناشتہ کیا۔ ناشتے کے دوران میں ملازم نے انہیں کسی شخص کی آمد کی اطلاع دی۔ مسٹر جان سمجھے کہ فلپ ہوگا۔ انہوں نے فوراً اسے اندر بلوا لیا۔ مگر نو آمد کوئی اجنبی تھا۔ اس نے اپنا کارڈ پیش کیا۔ اس پر ٹی۔ بی اسمتھ لکھا ہوا تھا۔

کہئے مسٹر اسمتھ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ مسٹر جان نے سرد مہری سے کہا۔

اسمتھ نے مسکراتے ہوئے کہا: "مسٹر جان! میں نے سنا ہے کہ آپ کوئی بہت بڑا انجنیرنگ کا کارخانہ کھولنے والے ہیں؟ مسٹر جان سخت حیران ہوئے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔

"یا شاید آپ کوئی پرچہ جاری کرنے والے ہیں"، اسمتھ نے ذرا ہچکچاتے ہوئے کہا۔

مسٹر جان نے گردن ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔ پھر انہوں نے کہا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا..... اور انجنیرنگ کی طرف آپ کا خیال کیسے گیا۔

اجنبی مسکرایا اور کہا: "جناب آپ کا تعلق اخباروں اور مشینوں سے رہا ہے کہ نہیں؟۔ خیر میں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کو کسی مینجر کی ضرورت ہے؟

مسٹر جان نے ذرا ہچکچاتے ہوئے کہا "مجھے افسوس ہے کہ ابھی میں آپ سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا"۔

اسمتھ نے کہا۔ جناب میں نے بہت بڑی فرموں کا کام سنبھالا ہے پچاس پچاس ہزار پونڈ کی مالیت کی فرمیں میرے ہاتھ میں رہی ہیں۔

مسٹر جان نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا: "عزیز من تم سمجھتے ہو کہ پچاس ہزار ایک بہت بڑی رقم ہے۔ یہ تو میں اس مہینے کے اندر اندر خرچ کرنے والا ہوں"۔

اسمتھ مغموم ہو کر کھڑا ہو گیا اور کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے کام کا نہیں۔ لیکن شاید آپ کو کسی اسسٹنٹ کی ضرورت پڑے کیوں کہ ابھی آپ نوجوان ہیں"۔

مسٹر جان کو اگر کسی بات سے چڑ تھی تو وہ یہی تھی کہ کوئی شخص ایک خاص لہجے میں اُن سے کہے کہ ابھی آپ نوجوان ہیں۔ وہ خاص لہجہ یہی تھا جس میں اسمتھ نے کہا تھا۔

انہوں نے غصے میں کہا: "مجھے روپیہ خرچ کرنے کا کافی تجربہ ہے اور میں بچہ نہیں ہوں"۔

اسمتھ نے دروازے کی طرف چلتے ہوئے کہا: "افسوس ہے کہ میرے لئے کوئی موقعہ نہیں... شاید جب معاملات ایک ہفتہ بھر کے بعد طے ہو جائیں..."

جناب معاملات آج ہی شب طے ہو جائیں گے"۔ مسٹر جان نے سختی سے کہا: "اور جہاں تک آپ کا تعلق ہے سمجھ لیجئے کہ اسی وقت طے ہو گئے۔

اس کے بعد اجنبی روانہ ہو گیا اور مسٹر جان حیران ہوئے کہ آخر یہ تھا کون۔؟ اور اسے یہ سب کچھ کہاں سے معلوم ہو گیا! لیکن انہیں بہت کچھ کام کرنا تھا اس لئے اس معاملے پر زیادہ غور نہ کر سکے۔

انہوں نے بنک سے اپنے حساب میں سے کافی رقم نکلوائی اور دن کا بیشتر حصہ اِدھر اُدھر پھر کر آفس وغیرہ قائم کرنے کے لئے جگہ ڈھونڈنے اور نقشہ وغیرہ بنانے میں گزرا۔

رات کو ۹ بجے موٹر آئی اور اس دفعہ فلپ کے بجائے ولیم مسٹر جان کو لینے کیلئے آیا۔ اس تبدیلی کی وجہ ولیم نے یہ بتائی کہ اسے مسٹر جان سے اکیٹولیس کی حرکات کی معافی مانگنی تھی۔ فلپ نے مجھے بتا دیا تھا کہ اس نے

آپ کو ایک چیک دیا ہے۔ ولیم نے موٹر میں بیٹھنے کے بعد کہا "مجھے امید ہے کہ آپ نے اسے سمجھا لیا ہوگا"۔

جی نہیں، مسٹر جان نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے اس کی چنداں ضرورت نہ تھی"۔

"او ہو آپ نے اسے سمجھایا نہیں" ولیم نے کہا "مجھے افسوس ہے میں واقعی میں اکیٹولیس کی بعض حرکتوں کی وجہ سے سخت نالاں ہوں، کوئی انجان اس کی یہ حرکتیں دیکھے تو اسے کمینہ سمجھے"۔

مسٹر جان نے کچھ جواب نہ دیا صرف مسکرا کر خاموش بیٹھے رہے تھوڑی دیر کے بعد موٹر منزل مقصود پر پہنچ گئی۔ اسی ملازم نے دروازہ کھولا۔ آج اس کا لباس کل سے بھی زیادہ قیمتی تھا۔ کمرے میں گھستے ہی ولیم نے مسٹر جان کے کان میں کہا "آپ نے اکیٹولیس کی یہ حرکت دیکھی؟ چارلس ملازم کے ہر روز لباس تبدیل کرنے پر زور دیتا ہے گویا اس میں کچھ خرچ ہی نہیں ہوتا۔ اور سات موم بتیوں کے جلنے میں بہت صرف ہوتا ہے"۔

یہ دونوں اسی کمرے میں پہنچے جس میں گزشتہ شب باتیں ہوئی تھیں۔ فلپ نے مسٹر جان کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا۔ لیکن اکیٹولیس کل سے بھی زیادہ سرد مہری سے ملا۔ آج اسے خاص طور پر اس وجہ سے اور بھی غصہ آیا ہوا تھا کہ سات کی جگہ چودہ شمعیں جل رہی تھیں۔ آج شمعیں دو نہایت نفیس شمعدانوں میں کارنس پر رکھی ہوئی تھیں جو دروازے کے قریب ہی تھی۔

مسٹر جان نے بیٹھتے ہی معاملے کی گفتگو شروع کر دی اور اپنے نقشے اور پروگرام بتائے۔ فلپ نے اس بات پر بہت زور دیا کہ قسطنطنیہ میں ایک نامہ نگار رکھا جائے۔ ولیم کا خیال تھا کہ ایسا نامہ نگار بہت مہنگا ثابت ہوگا۔ مسٹر جان نے کہا "ہاں مہنگا ضرور رہیگا۔ لیکن فائدہ بھی بہت ہوگا۔ ہمارے پاس ایسے نامہ نگاروں کے لئے کافی گنجائش ہے ڈیڑھ لاکھ روپیہ ....."

"حماقت!" اکیٹولیس نے نحیف مگر درشت آواز میں کہا۔

ولیم نے آہستہ سے کہا "آپ اس کی باتوں پر دھیان نہ دیجئے"

لیکن مسٹر جان نے جیب سے کاغذوں کا ایک پلندا نکال کر اکیٹولیس کی طرف پھینک دیا۔ اس نے کاغذوں کو کھولا اور نوٹ گننے شروع کئے۔

چھ ہزار.... خوب.... اس نے ایک نوٹ روشنی کی طرف کرتے ہوئے کہا "اچھا میں ذرا ان کا امتحان کر لوں" یہ کہکر وہ تمام نوٹ اٹھائے اور کارنس کی طرف بڑھا۔

مسٹر جان، ولیم اور فلپ کی بے اختیار ہنسی نکل گئی۔

اکیٹولیس دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ دروازہ خود بخود کھل گیا اور ایک شخص داخل ہوا۔

مسٹر جان نے پہچان لیا کہ آنے والے وہی اسمتھ تھا جس نے صبح انہیں غصہ دلایا تھا۔

"آداب عرض ہے حضرات" اجنبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اکیٹولیس چلتے چلتے رک گیا۔ کسی نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا۔

اس نے پھر کہا "آداب عرض ہے قبلہ اکیوں ٹامی! مجھے پہچانا نہیں؟"

اکیٹولیس نے مسکرا کر کہا "جی مسٹر اسمتھ پہچان لیا۔ یہ تیسری ملاقات ہے" "ہاں تیسری ملاقات"

سکاٹ لینڈ یارڈ کے مشہور انسپکٹر مسٹر اسمتھ نے کہا "یہ اور بہت دل خوش کن ملاقات۔ میں تم تینوں کے لئے آیا ہوں تمہارے خوش پوش ساتھی کو میرے آدمیوں نے گرفتار کر لیا ہے۔ تمہارے پاس ان صاحب کا کچھ روپیہ ہے ... شکریہ ..."

اکیٹولیس (جسکا اصلی نام ٹامی تھا) نے نوٹ انسپکٹر کے حوالے کر دئے اور لائق جاسوس نے تینوں کو ہتھکڑی پہنا دی۔

کیوں ٹامی! انسپکٹر اسمتھ نے کہا "یہ دونوں تمہارے شاگرد ہیں؟ تمام مجرموں میں تمہیں ایک رہ گئے تھے جس کی مجھے خاص فکر تھی۔ اب ذرا اپنی ہی موٹر میں بیٹھ کر سکاٹ لینڈ یارڈ کی سیر کو چلو"

انسپکٹر نے موٹر میں بیٹھکر کہا "بات یہ ہے مسٹر جان کہ یہ لوگ مشہور جرائم پیشہ ہیں۔ میں صبح ہی آپ کو آگاہ کر دیتا لیکن ذرا لطف دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ لوگ چھ ہزار حاصل کرنیکے لئے ایک ہزار صرف بھی کر دیتے ہیں"

مسٹر جان نے نہایت مایوسی اور غصے سے کہا "کوئی شک نہیں کہ میں اول درجہ کا احمق ہوں"

مسٹر اسمتھ نے کہا "جناب آپ ابھی نوجوان ہیں" اور مسٹر جان دانت پیس کر خاموش ہو رہے۔

اس واقعہ کی ابتدا میں مسٹر جان کے دل میں ایک سچے نامہ نگار ہونیکی حیثیت سے قصے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ لیکن درمیان میں آکر معاملہ کچھ کا کچھ ہو گیا آخر میں پھر ایک ایسی بات ہو گئی کہ واقعی ایک خاصہ دلچسپ افسانہ بن گیا نہ معلوم مسٹر جان نے کیوں ابتک اس قصے کی اشاعت نہیں کی۔ لیکن (جیسا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے) مضمون نگار تو ایسے سنہری موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے مسٹر جان کے دماغ میں جب افسانے کا خیال آیا تو یہ باتیں مدنظر تھیں۔ ؎؎

؎؎ "ہمخیال احباب" ہیرے ہر پونڈ کے مقابلے میں تین سو پونڈ۔ دولت سے نفرت، بوسیدہ لباس، ہم اس میں دو باتوں کا اضافہ نہ کرتے ہیں یعنی، مانیٹر، اور "ابھی آپ نوجوان ہیں"۔

رباعیات

صہبائے سرورِ سرمدی رکھتا ہوں ۔۔۔ یعنی کہ محبت نبی رکھتا ہوں
ہرچند کہ بینوا ہوں لیکن اکبر ۔۔۔ سامان نشاطِ زندگی رکھتا ہوں

ہرچند سمجھتا ہے اسے دل آساں ۔۔۔ مشکل سے مگر ہو گی یہ مشکل آساں
منزل پہ پہنچتے ہی پہنچتا ہے بشر ۔۔۔ منزل مشکل ہے فکرِ منزل آساں

غزل

سیماب بھر دیا ہے دلِ بیقرار میں ۔۔۔ کیا سحر ہے تری نگہِ فتنہ کار میں
وہ رشکِ صد بہار ہے میرے کنار میں ۔۔۔ اللہ کیا بہار ہے اب کی بہار میں
اللہ بچائے دل کو بلاؤں سے عشق کی ۔۔۔ دامن اُلجھ گیا ہے مرا خارزار میں
دل بے نیازِ گردشِ لیل و نہار ہو ۔۔۔ یا فرق آئے گردشِ لیل و نہار میں
مانا کہ صبر چارۂ اندوہِ عشق ہے ۔۔۔ لیکن نہیں ہے صبر مرے اختیار میں
اللہ رے شوق آئے نہ وعدہ پہ وہ کبھی ۔۔۔ آیا مگر نہ فرق مرے اعتبار میں
دیوانہ کر دیا ہے ترے انتظار نے ۔۔۔ دیوانہ ہو گیا ہوں ترے انتظار میں
ذرّے چمک اُٹھے ہیں تری رہگذار کے ۔۔۔ جلوے ہیں بیقرار تری رہگذار میں

اکبرؔ دل آج تک ہے مرا وقفِ اضطراب
کیا جانے کیا تھا اُس نگہِ شرمسار میں

جلال الدین اکبرؔ

ماں کی ممتا

(مشہور روسی افسانہ نگار چیکوف کے قلم سے)

موت کے فرشتہ نے ایک چھوٹے سے بچے کے گہوارے پر اپنے بازو پھیلا دیئے۔ یہ کوئی معمولی بچہ نہ تھا۔ اُس گھر کا اُجالا تھا۔ خاندان بھر کا دلارا تھا۔ سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ بہار اور خزاں کے تین ہی زمانے دیکھنے پایا تھا کہ بیمار پڑ گیا۔

اس قدر جلد عدم آباد کو لوٹ جانے والے معصوم مسافر کے کمرے پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف ایک ماں تھی جو نیم جان لاشے سے گود بھرے بیٹھی تھی۔ ماتا کے آنسو بہا رہی تھی۔ سر۔ ہاتھ پر لٹکا ہوا تھا۔ نگاہیں۔ زمین پر گڑی تھیں۔

باپ۔ سویرے سے دوکان بند کر کے لوٹ آیا۔ ماں سے بولنے کی ہمت نہ پڑی کہ چڑچڑا نہ جائے۔ کمرے میں بھی آیا نہ گیا کہ کہیں بچہ جاگ نہ پڑے۔ دور کھڑے ہو کر اُداس نظریں ڈالیں۔ کیا دیکھتا ہے کہ موت کا فرشتہ کمرے میں سمایا ہوا ہے۔ اور بچے پر منڈلا رہا ہے اُف۔ کیسا ہولناک منظر ہے! ملک الموت آیا ہے تاکہ آسمان والے کی امانت۔ زمین والوں سے چھین لے جائے!

"موت! رحم! رحم!!" باپ نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں بند کر کے اور دانت بھینچ کے مناجات شروع کی۔ "اس بچے پر رحم کر! اس ماں کے درد بھرے دل پر رحم کر! نیک فرشتے! اگر تو اکیلا واپس جانا نہیں چاہتا تو مجھے میرے چہیتے کے بدلے لے چل۔ خدارا! اسے اس کی دکھیاری ماں کے لئے چھوڑ دے۔ اگر تو بچے کی جان لے لے گا تو ماں بھی مر جائیگی جو کہ بھی تو مردوں سے بدتر۔ مجھے بدلے میں قبول کر لے۔ میں تیری منت کرتا ہوں"۔

موت کے فرشتے نے آہستہ سے حرکت کی اور باپ کو اشارے سے کہا: "میرے پیچھے چل"!

"ہاں۔ ہاں۔ مہربان فرشتے! میں تیرے پیچھے چلتا ہوں"۔ باپ نے جوش سے کہا: "قسم خدا کی دنیا کے آخری سرے تک ساتھ چلوں گا موت کی بھیانک وادی میں بھی تو مجھے اپنے پیچھے پائیگا۔ میں خوش ہوں کیونکہ اپنی جان دے کر اپنے لخت جگر کو بچا رہا ہوں۔ ہاں موت! جلدی کر۔ چل کہ میں تیرے ساتھ جانے کے لئے بےچین ہوں"!

فرشتہ بجلی کی سی تیزی سے روانہ ہو گیا۔ غمگین باپ نے اُس کے پیچھے ہوا پر دوڑنا شروع کیا۔ دم کے دم میں شہر کے خوشنما باغ سے گذر ہوا۔ ہرے بھرے درخت۔ پھولوں سے لدے ہوئے جھوم رہے تھے۔ پھر خود شہر میں پہنچا۔ خاص اپنی دوکان نظر آئی۔ دوست احباب دکھائی دیئے۔ اُن کی آوازیں اور باتیں سنائی دیں۔ بازار میں گھسا۔ ہر طرف لین دین۔ ہر طرف کھنا کھن۔

انسانی جذبات باہم ملتے ہیں کہ یک رنگی پیدا کریں۔ مگر فوراً ہی تصادم بھی شروع ہو جاتا ہے۔ کشمکش ہونے لگتی ہے۔ حرص و طمع۔ انسانی عقل کا مذاق اڑاتی ہے۔ کچے دھاگے سے اُسے دنیا سے باندھ دیتی ہے۔ لیکن دنیا ہے کہ سرد ہے۔ خاموش ہے۔ بے مہر ہے۔ زندگی کے لمحوں کو برابر نگلتی جاتی ہے۔ اور پوری بے پروائی سے عدم کی ظلمت میں اگلتی جاتی ہے۔

فرشتہ۔ باپ کو لئے شہر پناہ کے پھاٹک پر پہونچ گیا۔ اور اب اُدھر کو جانے لگا جہاں موت رہتی ہے۔ اور جس کا کوئی نام نہیں ہے۔ فصیل کے برجوں اور میناروں پر سورج کی گنگا جمنی شعاعیں ناچ رہی تھیں۔ اور انسان کے دل میں اس فانی دنیا کی محبت جگا رہی تھیں باپ کے گھٹنے ٹھنڈے ہو کر کانپنے لگے۔ اُس نے گردن موڑی کہ دنیا پر آخری نظریں ڈال لے۔ اور خدا حافظ کہکر رخصت ہو جائے۔ مگر اُس کے پاؤں۔ لڑکھڑا گئے۔ منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔

"موت! رحم" وہ بڑی بےکسی سے چلایا۔ "میں کسی طرح بھی مر نہیں سکتا۔ میرا دل زندگی چاہتا ہے۔ ابھی جوانی کا عالم ہے۔ دنیا کی رعنائیاں مسرتیں۔ عیش و نشاط۔ ہر چیز اشارے کر رہی ہے۔ یہاں کا چپہ چپہ زندہ رہنے کی فرمائش کر رہا۔ اور خوشی دینے کے وعدے دے رہا ہے میں اپنی جان نہیں دوں گا۔ مجھے زندہ رہنا چاہئے۔ جا اور جس کسی کی روح بھی جی چاہے۔ قبض کر لے۔ میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گا"۔

فرشتہ اپنے پر پھیلائے بچے کے سر پر پھر لوٹ آیا۔

بیمار کا نوجوان بھائی [illegible] اس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔ آتے ہی ماں کو آواز دی۔ مگر وہ بدستور غم کی تصویر بنی زمین پر نظریں [illegible] بی۔ نوجوان نے منہ اٹھایا تو ملک الموت [illegible] پھر اپنے جان بلب بھائی کا منہ دیکھا تو مردے کی طرح پیلا پڑ گیا۔

"موت!" لڑکے نے فرشتے سے کہا۔ "شہر میں بہت بچے ہیں تو انہیں شکار کیوں نہیں کرتی؟ آخر اس بچے نے کیا خطا کی ہے کہ اس کی جان لینے پر تل گئی ہے؟ اتنا بھی نہیں سوچتی کہ ہم سب اس سے کتنی محبت کرتے ہیں؟ اس کا مرنا۔ ہم سب کا مرنا ہے۔ اگر ہمارے ہی گھر کو تو نے تاک لیا ہے تو یہاں بھی کئی آدمی موجود ہیں۔ کسی اور کو لے۔ دیکھ! ایک میں ہی تیرے سامنے کھڑا ہوں۔ میرے بھائی کے بدلے مجھے لے جا!"

بھائی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ موت کے فرشتے کو جنبش ہوئی۔ اس نے اشارے سے چلنے کو کہا۔ دونوں روانہ ہو گئے۔

شہر کی سڑکوں پر چلتے رہے۔ نوجوان کے ساتھی مدرسے سے لوٹ رہے تھے۔ کھیلتے کودتے۔ ہنستے۔ بولتے چلے جا رہے تھے۔ پڑوسی کا لڑکا دکھائی دیا۔ اس جوان سے اس کی دانت کاٹی روٹی تھی۔ اس وقت وہ وہی گیت گا رہا تھا جو یہ اکثر گایا کرتا تھا۔ اب وہ گھر ملا جس میں اس کی چھوٹی سی خوبصورت محبوبہ رہتی تھی۔ پھولوں کی وہ کیاریاں دکھائی دیں جو اس نے اس لڑکی کے ساتھ مل کر لگائی تھیں۔ وہ خود بھی باغ میں فوارے کے کنارے پاؤں پھیلائے بیٹھی نظر آئی۔ پھر سینما کی طرف گزر ہوا۔ بھیڑ لگی تھی۔ کوئی اچھا تماشہ ہو رہا تھا۔ ایک طرف سے اس کا وہ پرانا دوست بھی آتا دکھائی دیا۔ جو ایک لمبے سفر سے برسوں کے بعد لوٹا تھا۔ نوجوان فوراً مصافحے کے لئے لپکا۔ مگر چشم زدن میں وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ کیونکہ فرشتہ بجلی کی تیزی سے لامتناہی فضا میں اسے اڑائے لئے جا رہا تھا۔

آخر نوجوان ڈر کر اور تھک کر بیہوش ہو گیا۔ اور زمین پر آ گرا۔

"اٹھ!" فرشتے نے اپنی کرخت آواز میں ڈانٹا۔

"نہیں! موت! رحم!" لڑکا ہاتھ جوڑ کے گڑگڑانے لگا۔ "کسی اور کا گلا گھونٹ۔ مجھے چھوڑ دے۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ دوسرے کے بدلے میں اپنی جان کیوں دوں؟"

فرشتہ لوٹ آیا۔ اور بچے کے بچھونے پر پھر منڈلانے لگا۔

بہن مدرسے سے لوٹی۔ موہنی صورت حسن کی ننھی سی دیوی۔ وہ آئی اور ماں کے پاس بیٹھنے لگی۔ اچانک موت کا فرشتہ بھائی پر منڈلاتا نظر آیا۔ ننھی سی جان ڈر سے لرز اٹھی۔

"ڈراؤنی صورت کیا چاہتی ہے"۔ وہ دل میں چلائی "کس کی جان لینے آئی ہے۔ کیا میرے ننھے کے دشمنوں کی؟ موت! تجھے اس معصوم پر ترس کھانا چاہئے۔ میرا بھائی! آہ میرا بھائی۔ میدان کے پھول کی طرح پاک اور صبح کی شبنم کی طرح صاف ہے! ہاں میرا بھائی! میری جان! موت! مجھے اس کے بدلے میں لے لے!"

ملک الموت نے اپنی انگلی ہلا کر کہا "چلی آ!"

فرشتہ روانہ ہوا۔ لڑکی بھی پیچھے ہو لی۔

باغ پہنچے۔ چشمے پر سے گزرے جو اسی طرح ابل رہا تھا جس طرح تازگی خود لڑکی کے گالوں سے۔ بنفشہ کے وہ پودے بھی دکھائی دیئے جو اس نے آج ہی صبح بوئے تھے۔ سڑک پر آئے۔ سہیلیاں کھیلتی کودتی نظر آئیں۔ شہر کے ان تمام حصوں سے گزرے جنہیں لڑکی پہچانتی تھی۔ آخر مدرسے کے دروازے پر رکے کہ لڑکی اسے الوداع کہہ دے۔ لیکن وہیں اس کی ہمت نے جواب دے دیا۔ اس نے گردن گھمائی اور لوٹنے لگی۔

"نہیں اے فرشتے! میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی" لڑکی نے اپنے آپ کو کھینچتے ہوئے کہا۔ "میں مرنا نہیں چاہتی۔ جسے جی چاہے مار ڈال۔ مجھے جینا ہے۔ موت کڑوی اور ڈراؤنی ہے۔ زندگی میٹھی اور پیاری ہے۔"

فرشتہ لوٹ آیا۔ اور بدستور بیمار کے بچھونے پر منڈلانے لگا۔

اب بچے کی نبض رک رہی تھی۔ سانس اکھڑ چکی تھی۔ ہچکی شروع ہو گئی تھی۔ ہاتھ پاؤں بھی اینٹھنے لگے تھے۔ غمزدہ ماں نے سر اٹھایا کہ اپنے پیارے کا آخری دیدار کر لے۔ ایک دفعہ اور چھاتی سے لگا لے۔ اس نے منہ جھکایا کہ اپنے ہونٹ اس کے سفید ہونٹوں پر رکھ دے۔ مگر ڈری کہ کہیں پیار۔ زندگی کا رہا سہا رس بھی نہ چوس لے۔

اس نے منہ ہٹا لیا۔ آنکھ اٹھی تو ملک الموت کو سامنے پایا۔ وہ تنہا کھڑا تھا۔ اور دکھیاری ماں کی بیٹے سے رخصتی کا انتظار کر رہا تھا۔ ماں فوراً بچے کی چارپائی کے سامنے دعا کے لئے جھک پڑی۔ کانپتے ہوئے ہاتھ پھیلا دیئے۔ اور ٹوٹے ہوئے دل سے کہنا شروع کیا۔

"موت! رحم! اگر تو اس معصوم پر رحم کھا نہیں سکتا تو بدنصیب ماں

ماں ہی پر ترس کھا۔ موت! یہ بچہ میرا خون ہے۔ گوشت ہے۔ دل کا ٹکڑا ہے زندگی کی بہار ہے۔ خدارا ایسا نہ کر کہ بدبخت ماں اپنے لخت جگر کی تربت پر کھڑی ہو۔ مہربان بن۔ احسان کر اور بچے کو اس لئے چھوڑ دے کہ اپنی ماں کی قبر کے ساتھ کھڑا ہو سکے۔ اچھے فرشتے! کیا تو ماں کی جان اُس کے بچے کے بدلے قبول کر سکتا ہے؟

موت نے اشارہ کیا اور ماں ساتھ ہولی کہ اپنے بچے پر قربان ہو جائے

فرشتہ باغ میں لے گیا۔ اُس کی کیاریاں۔ اُس کے چمن۔ اُس کی نہریں جو خود اُس نے بنائی تھیں دکھائیں۔ پھر شہر بھر میں پھرایا۔ اور ایک ایک کر کے وہ سب دکھایا جو دل کو بھانے والا اور زندگی کی چاہ آدمی میں پیدا کرنے والا ہے۔ زنانہ کلب میں لے گیا جس کی وہ سرگرم ممبر تھی۔ اُس محل کے پھاٹک پر کھڑا کیا۔ جہاں جشن منایا جا رہا تھا۔ ایسا جس میں وہ خود بھی مدعو تھی

یہاں ماں نے ٹھنڈی سانس لی۔ اور آنکھ سے گرم آنسوؤں کی دو پتلی لکیریں اُس کے جوش سے بھڑکے ہوئے رخساروں پر دوڑتی نظر آئیں

فرشتہ رک گیا۔

"کیا ماں بھی اپنی محبت میں کچی اور جھوٹی ثابت ہو گی"؟

وہ سوچنے لگا۔ کیا ماں بھی اپنی جان کو بچے سے زیادہ عزیز رکھے گی؟

جب ماں کی محبت بھی جھوٹی ہو جائے تو پھر اس دنیا کو سلام! انا للہ و انا الیہ راجعون!

پھر فرشتہ عورت کو اُس کی چہیتی بہن کے گھر لے گیا۔ جو اپنے بچوں کو خوشی خوشی کھلا پلا رہی تھی۔ پھر اُس کی پیاری سہیلی کے کمرے میں گھسا جو بیٹھی پیانو بجا رہی تھی۔ لیکن ماں مضبوط قدموں سے برابر ساتھ چلی آ رہی تھی۔ سر جھکا ہوا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

ملک الموت ٹھہر گیا۔ بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔

"موت! چل" بے تاب ماں چلائی "جلد چل کہ میرے بچے کی جان نکل جائے رُک کیوں گیا؟ آگے بڑھ اور ماں کو اُس کے بچے کے بدلے لے جا۔ جلدی کر ایسا نہ ہو کوئی دوسرا فرشتہ آ کر اُس کی روح قبض کر لے جائے"۔

موت مسکرائی۔ کیا موت کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آ تی ہے؟

اس غیر فانی محبت کے سامنے آخر کار موت کو بھی پسپا ہونا پڑا۔ بجلی کی طرح چمک کر نظروں سے غائب ہو گئی۔ ماں ہکا بکا رہ گئی۔ پھر کہیں فرشتے نے دغا دی کہیں بچے کو جا کر نہ مار ڈالا ہو۔ بے تحاشا دوڑ پڑی۔ گھر میں اُس نے کیا دیکھا؟ وہ دیکھا کہ قریب تھا کہ شادی مرگ ہو جائے۔ بچہ بالکل اچھا ہو چکا تھا اور "اماں! اماں!" کر ہاتھ ماں کو دیکھ کر ہمک کے لپکا۔ اور اُس کی مامتا بھری چھاتی سے چمٹ گیا۔

اس کے بعد پھر کبھی فرشتے نے اُس گھر میں منہ نہیں دکھایا جہاں ایسی لازوال محبت بستی تھی

غزل

کیسی بے ربط تری انجمن آرائی ہے　　دل ہے مجروح نظر۔ روح تماشائی ہے

قلبِ انساں کو کہاں تاب شکیبائی ہے　　جادۂ عشق میں ہر گام پہ رسوائی ہے

آنکھ نیرنگیٔ فطرت کی تماشائی ہے　　تو کسی پردہ سے جھانکے تری رسوائی ہے

خامشی غنچوں کی۔ حیرانی نرگس کیا خوب!　　ہر تماشے میں اِک اندازِ تماشائی ہے

محفلِ عرش میں خلوت نہیں ممکن نہ سہی　　دل میں آ جاؤ کہ یہ گوشۂ تنہائی ہے

یا تو ہے آئینۂ دل ہی مکدر حامد

یا غلط حسن کا ہر دعویٔ یکتائی ہے

حامد شاہجہانپوری

فنا اور بقا کا دور

ہزاروں تارے فلک سے گر کر فضا میں معدوم ہو چکے ہیں
مگر نگاہیں یہ دیکھتی ہیں کہ محفل آسماں وہی ہے

عروس شب کی جبیں مزین ہے اب بھی خوش آب موتیوں سے
وہی ثریا کا آئنہ خانہ ہے جوئے کہکشاں وہی ہے

ہے سرزمین چمن ہزاروں گلوں کا مدفن مگر ابھی تک
چمن کی شاداب سرزمیں میں سرور آبِ رواں وہی ہے

حیات کے سرمدی نشے میں کلی کلی مسکرا رہی ہے
وہی ہے رنگینیٔ فضا دل فریبیٔ گلستاں وہی ہے

ہوئی ہیں جم جم کے اس خرابے میں سینکڑوں محفلیں پریشاں
مگر وہی رنگ بزم ہستی ہے محفل دوستاں وہی ہے

جو پہلی نسلوں نے آکے دیکھے سنے میں وہی سین دیکھتا ہوں
مکیں اگرچہ بدل چکے ہیں مگر یہ کہنہ مکان وہی ہے

وہی ہے ساون وہی گھٹائیں وہی ہے موسم وہی ہوائیں
وہی حیات آفریں فضائیں ہر ایک دلکش سماں وہی ہے

ہوائیں بھر بھر کے لا رہی ہیں سیاہ شبگیر سے بادلوں کے
تو دوش ترک فلک پہ قوس قزح کی رنگیں کماں وہی ہے

یہاں بہت انقلاب آئے مگر نہ دنیا کی شان بدلی
کہ سال ہا سال کے گزرنے پر اب بھی یہ خاکداں وہی ہے

وہی ہے شام و سحر کی حالت وہی ہر اک رہگزر کی حالت
وہی ہے ابتک بشر کی حالت طلسم سود و زیاں وہی ہے

فنا کا قانون ازل کے دن سے ہی کارفرما جہاں میں لیکن
نوائے مرغ حیات ہے آج بھی سرِ شاخسار پیدا

بہار کے عارضِ حسین پر خزاں کی زردی جھلک رہی ہے
خزاں کے چہرے سے ہو رہا ہے شبابِ حسنِ بہار پیدا

ہوئے ہیں دشت حیات کی وسعتوں میں گم قافلے ہزاروں
ہوئے ہیں گردِ عدم کے پردے سے سیکڑوں شہسوار پیدا

اِدھر فضا شب کی تیرگی میں حسین تاروں کو کھا رہی ہے
اُدھر فلک کر رہا ہے انجم کے گوہر تابدار پیدا

وہ خاک ننگ وجود تھی جو غریب مزدور کے بدن پر
زمانہ کرتا ہے آج اُسی خاک سے سرِ تاجدار پیدا

ہزاروں صدیاں گزر گئی ہیں مگر ہے جاری یہ کارخانہ
کہ جیب گردوں سے آجتک ہو رہے ہیں لیل و نہار پیدا

اِسے بگاڑا اُسے سنوارا اِسے مٹا کر اُسے ابھارا
ہے اس روش پر خزاں مسلط تو اُس روش سے بہار پیدا

اسی سے قائم ہے رنگ دنیا جہان کی یہ قدیم خو ہے
کہ سیکڑوں بار مٹ چکا ہے ہوا ہے لاکھوں ہی بار پیدا

اگرچہ ظاہر میں رنگ دنیا کا اور سے اور ہو رہا ہے
فنا کا بھی دور ہو رہا ہے بقا کا بھی دور ہو رہا ہے

[illegible]

حضرت فاخر ہریانوی بی۔اے

مہتہ ہاف ٹون کمپنی انارکلی لاہور نے بلاک بنایا

نیشنل آرٹ پرنٹنگ پریس انارکلی لاہور میں چھپا

مغرب میں نسوانی ترقی

ورزش نسوانی

دُنیائے ادب

آسکر وائلڈ کی نگاہ میں ناقد کے صفات

آسکر وائلڈ کی ایک مشہور تصنیف "ارادے"[1] کے ایک مضمون کے کچھ حصّے ناظرین نیرنگ خیال کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ مضمون "ناقد بحیثیت آرٹسٹ" کے عنوان سے ہے اور ۱۲۲ صفحوں پر مشتمل ہے۔ پورا مضمون ایک مکالمہ کی صورت میں لکھا گیا ہے گفتگو کرنے والے دو شخص ہیں۔ ایک کا نام ارنسٹ ہے اور دوسرے کا گلبرٹ۔ ارنسٹ: وسط درجے کی ذہنیت کا ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی ہے گلبرٹ خود آسکر وائلڈ ہے اس لئے وہ فلسفی بھی ہے ناقد بھی، آرٹسٹ بھی۔ پورا مضمون جدّت نگارش، فلسفۂ نقد، معیار نقد اور صفات نقد سے مملو ہے۔ میں اس مضمون کا وہ حصّہ پیش کرنا چاہتا ہوں جو صفات ناقد سے متعلق ہے۔

علی عباس حسینی

گلبرٹ کے سوال پر ارنسٹ نے ناقد کے لئے تین صفتیں ضروری بتائی ہیں (۱) ناقد منصف و غیر جانبدار ہو (۲) معقولیت پسند ہو (۳) با خلوص ہو لیکن آسکر وائلڈ کی جدت آفرینی اس کی مقتضی نہیں کہ وہ عام طور سے مانے ہوئے اصول و نظریات تسلیم کرے۔ اس لئے گلبرٹ ان امور کی مخالفت کرتا ہے۔

(۱) ناقد غیر جانبدار ہو۔

گلبرٹ:- جی نہیں۔ ناقد انصاف کے عام معنوں میں منصف یا غیر جانبدار نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص صرف انھیں معاملات میں غیر جانبدارانہ رائے دے سکتا ہے جن میں اُسے دلچسپی نہ ہو۔ اور بلا شبہ یہی وجہ ہے کہ غیر جانبدارانہ رائے بالکل بیکار ہوتی ہے۔ ایک ایسا شخص جو کسی مسئلے کے دونوں پہلوؤں پر نظر کرتا ہے کچھ بھی نہیں دیکھتا۔ آرٹ ایک جذبہ ہے اور آرٹ کے معاملات میں خیال ہمیشہ جذبہ سے رنگا ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ مستقل ہونے کی جگہ سیال ہوتا ہے۔ اور نفیس لمحات و لطیف انداز پر مبنی ہونے کی وجہ سے اس میں سائنس کے قواعد اور مذہب کے ضوابط کی سی سختی نہیں آسکتی۔ آرٹ کا براہ راست تخاطب روح سے ہوتا ہے اور روح دماغ کی اسی طرح مقید ہو سکتی ہے جس طرح کہ وہ جسم کی ہوتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ناقد کو کسی سے کد نہ ہونا چاہئے لیکن جیسا کہ ایک جلیل القدر فرانسیسی آج سے سو برس پہلے کہہ گیا ہے ایسے معاملات میں ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ ترجیح ضرور دے۔ اور جہاں کہیں کسی نے ترجیح دی پھر انصاف کہاں؟ نیلام کرنے والا ہی بالکل غیر جانبداری کے ساتھ یکساں طور پر آرٹ کے ہر طرز کی تعریف کر سکتا ہے۔

نہیں صاحب حقیقی ناقد میں انصاف کی صفت لازمی نہیں بلکہ انصاف تو نقد کی بھی شرط نہیں۔ ہر اس طرز کا آرٹ جو ہمارے پیش نظر ہوتا ہے ہمیں اپنا محکوم بنا لیتا ہے اور دوسروں کو بھلا دیتا ہے۔ ہمیں اگر پیش نظر شے کا راز معلوم کرنا ہے تو ہمیں چاہئے کہ ہم اس میں بالکل محو ہو جائیں۔ اس وقت تو ہمیں کسی دوسرے امر کا خیال ہی نہ آنا چاہئے اور نہ آ سکتا ہے۔

(۲) ناقد کو کم از کم معقولیت پسند ہونا چاہئے یا یہ بھی نہیں؟

گلبرٹ: معقولیت پسند؟ آرٹ سے نفرت کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو اس سے نفرت کرنا ہے اور دوسرا اُسے عقلی حد تک پسند کرنا ہے۔ اس لئے کہ آرٹ جیسا کہ افلاطون نے بڑی افسردگی کے ساتھ مانا ہے اپنے دیکھنے یا سُننے والوں میں ایک طرح کی مقدس مجذوبیت پیدا کر دیتا ہے۔ وہ خود الہام کے ذریعے معرض وجود میں نہیں آتا لیکن وہ دوسروں کو الہامات کا القا کرتا ہے۔ عقل سے وہ تخاطب نہیں کرتا۔ اگر کسی کو آرٹ سے محبت ہے تو وہ اُسے دُنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ عزیز رکھے گا۔ اور اگر عقل کی اس معاملہ میں سُنی جائے تو وہ سخت مخالفت کرے۔ حُسن کی پرستش میں کہیں بھی صحیح الدماغی نہیں ہے۔ وہ اس سے کہیں بالاتر ہے۔ ایسے لوگ جن کی زندگی پر یہ پرستش غالب آ گئی ہے وہ دُنیا کی نگاہوں میں ہمیشہ محض خیال پرست معلوم ہوں گے۔

(۳) اچھّا تو کم از کم وہ با خلوص تو ہو گا۔

گلبرٹ:- تھوڑا سا خلوص خطرناک ہوتا ہے، اور بہت سا خلوص تو مطلقاً مہلک ہے۔ حقیقی ناقد اصول حُسن کی پرستش میں یقینی طور پر ہمیشہ مخلص

---

[1] آسکر وائلڈ کا طرز لفظی ترجمہ کا متحمل نہیں۔ اس لئے روانی اور سلاست قائم رکھنے کے لئے کہیں کہیں اس کے مطالب اپنے الفاظ میں ادا کر دئے گئے ہیں۔ پھر بھی ترجمہ ہونے کی حیثیت سے جملوں کی ساخت اُردو کے لئے گراں ضرور ہے۔ حسینی

ہوگا۔ لیکن وہ ہر زمانے میں اور ہر طرز میں حسن کی تلاش کرے گا اور اپنے کو کسی مقررہ حرز خیال یا معینہ مطمح نظر تک محدود نہ کردیگا۔ وہ اپنے جذبہ کا احساس بہت سی صورتوں میں اور ہزاروں مختلف طریقوں سے کریگا اور ہر وقت نئے احساسات اور نئے نظریوں کا جویا رہے گا۔ مسلسل تغیرات اور صرف مسلسل تغیرات ہی میں وہ اپنی حقیقی انفرادیت پائے گا۔ وہ اپنی رائے کا غلام بننے کے لئے راضی نہ ہوگا۔ اس لئے کہ دماغ ذہنی دُنیا کی حرکت مسلسل کے علاوہ اور کیا ہے؟ زندگی کی طرح خیال کا بھی جوہر نو ہی ہے۔ ارنسٹ تمھیں الفاظ سے خوف زدہ نہ ہونا چاہئے جسے کہ لوگ عدم خلوص کہتے ہیں وہ صرف ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم اپنی شخصیتوں میں اضافہ کرسکتے ہیں۔

تم نے جو تین صفتیں بیان کی ہیں اُن میں سے دو اگر بالکل خلافی نہیں ہیں تو کم از کم اخلاقیات کی سرحد پر ضرور ہیں اور نقد کی پہلی شرط یہ ہے کہ ناقد یہ سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو کہ آرٹ کی دُنیا اور علم الاخلاق کی دُنیا دو مختلف اور علیحدہ چیزیں ہیں۔ جب ان کو ملا دیا جاتا ہے تو انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ آج کل انگلستان میں اکثر و بیشتر یہی ہو رہا ہے۔ باوجودیکہ آج کل کے پیورٹن (تقدس مآب لوگ) کسی حسین چیز کو برباد نہیں کرسکتے لیکن پھر بھی اپنے جذبات کی غیر معمولی دنائت کی وجہ سے ایک لمحہ کے لئے حسن کو بھی کچھ نہ کچھ گندہ کرسکتے ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ اس طرح کے لوگ اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ اخبارات کو بناتے ہیں۔ مجھے افسوس اس لئے ہے کہ موجودہ صحافت میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ غیر تعلیم یافتہ طبقہ کی رائے ہم تک پہونچا کر صحافت ہمیں قوم کی جہالت سے باخبر رکھتی ہے۔ موجودہ زندگی کے روزمرہ واقعات کو احتیاط سے بیان کرکے وہ ہم پر یہ ظاہر کردیتی ہے کہ حقیقۃً یہ واقعات کتنے غیر اہم ہیں۔ غیر ضروری اشیا پر ہمیشہ مباحثہ کرکے وہ ہمیں یہ سمجھا دیتی ہے کہ شائستگی کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے اور کن چیزوں کی ضرورت نہیں۔ ان کے مضامین سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ وہ دُنیا جس پر علم الاخلاق اور اخلاقی قیود حکومت کے مدعی ہیں وہ کتنی محدود ہے۔ سائنس تک اخلاقیات کی رسائی نہیں ہوتی اس لئے کہ سائنس کی نگاہیں ابدی حقیقتوں پر جمی ہوئی ہیں۔ آرٹ بھی اخلاقیات کی حدوں سے باہر ہے۔ اس لئے کہ اس کی نگاہیں اُن چیزوں پر جمی ہیں جو حسین ہیں، غیر فانی ہیں اور ہمیشہ تغیر پذیر ہیں۔ اخلاقیت کی دُنیا ان سے پست اور کم درجے کی دماغی دُنیا ہے۔ بہرحال ان ناک بھوں سکوڑنے والے پیورٹنوں (تقدس مآب گروہ) کو جانے ہی دو۔ ان پر ہنسنے کے لئے کافی مصالحہ موجود ہے۔ بھلا اُس وقت کون شخص ہنسی ضبط کرسکتا ہے جبکہ ایک معمولی اخبار نویس بڑی متانت سے یہ تجویز کرتا ہے کہ اُن مضامین کو محدود کردیا جائے جنھیں آرٹسٹ استعمال کرتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ بہت جلد ہمارے اخبارات اور اخبار نویسوں کی قدرے حدبندی کردی جائے گی۔ اس لئے کہ وہ زندگی کے بے مزہ، روکھے پھیکے اور قابل نفرت واقعات کو بیان کرتے ہیں وہ نہایت ذلیل طور پر بڑے شوق سے درجۂ دوم کی خلقت کے گناہوں کا ذکر کرتے ہیں اور جہلا کی سی ضمیر پروری سے کام لے کر ہمیں خشک اور صحیح صحیح تفصیلات ایسے لوگوں کے فعال کی سُناتے ہیں جو قطعی کسی دلچسپی کے مستحق نہیں ہیں لیکن اس آرٹسٹ کی کون حدبندی کرسکتا ہے جو زندگی کی حقیقتوں کو مان کر انھیں حسین صورتوں میں منتقل کردیتا ہے اور انھیں ہمدردی و خوف کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ اور اُن کی آب و تاب ان کا انوکھا پن اور ان کا واقعی اخلاقی اثر ظاہر کردیتا ہے، اور پھر اُن سے ایک ایسی دُنیا تعمیر کردیتا ہے جو حقیقت سے زیادہ حقیقی ہے اور اس سے کہیں زیادہ رفیع اور پاکیزہ ہے۔ یہ حدبندی اُس نئی صحافت کے علمبرداروں کا تو کام نہیں ہے جو کہ خود بُرائی غیر شائستگی کا ایک بیّن مظاہرہ ہے۔ اور نہ اس جدید تقدس مآبیت کا کام ہے جو ان مکاروں کا تصرف ہے اور جس کی تقریر و تحریر دونوں میں غلطیاں ہوتی ہیں۔ ایسی تجویز ہی مہمل ہے۔ ان بدمعاشوں کو تو چھوڑو اور اس بحث کو جاری رکھو کہ وہ کون سی صفتیں ہیں جو حقیقی ناقد میں ہونی چاہئیں۔

ارنسٹ:۔ آخر وہ کیا ہیں مجھیں بیان کرو۔

گلبرٹ:۔ ناقد کے لئے سب سے پہلی ضروری چیز انداز طبیعت ہے اور ایسا مزاج جو حسن کے مختلف تاثرات کا لطیف احساس رکھتا ہو۔ ہم اس امر سے اس وقت بحث نہ کریں گے کہ یہ انداز طبیعت یا مزاج قوم و فرد میں کیونکر پیدا ہوتا ہے۔ صرف اتنا جاننا کافی ہے کہ اس میں انداز کا وجود ہے، اور یہ کہ ہم میں دوسری حسیات سے علیحدہ اور بالاتر عقل سے جُدا اور پاکیزہ تر، روح سے مختلف اور اتنی ہی اہم ایک اور حس حُسن ہوتی ہے جو بعض کو تخلیق کی جانب اور میرے نقطۂ نظر سے زیادہ پاکیزہ نفوس کو مراقبہ کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اس حسن کو پاکیزہ اور مکمل کرنے کے لئے نہایت ہی لطیف ماحول کی ضرورت ہے۔ بغیر ایسے ماحول کے وہ کمزور پڑجاتی ہے۔ اور سُست ہوجاتی ہے تمھیں وہ نفیس مقام یاد ہے جہاں افلاطون یہ بیان کرتا ہے کہ ایک نوجوان یونانی کو کیونکر تعلیم دینا چاہئے؟ وہ اس امر پر کتنا زور دیتا ہے کہ اہم ترین شے ماحول ہے۔ اور یہ کہتا ہے کہ لڑکوں کی تربیت ایسی فضا میں ہونی چاہئے جہاں اچھے مناظر ہوں اور سُریلے نغمے۔ تاکہ مادی چیزوں کا حُسن اُن کی روح کو اس حُسن کے حصول کے لئے تیار کردے جو روحانی ہے۔ لڑکے میں غیر محسوس طور پر بغیر اس کی وجہ جانے ہوئے وہ حقیقی محبتِ حُسن پیدا ہونا چاہئے۔ جسے افلاطون بار بار واقعی غرض تعلیم بتاتا ہے۔ اس میں رفتہ رفتہ وہ کیفیت و انداز پیدا ہوجانا چاہئے کہ بغیر کسی دقت کے اور بالکل جبلّی طور پر اچھائی کو بُرائی کے مقابلے

میں ترجیح دے اور غیر شائستہ و غیر مہذب باتوں کو ترک کر دے اور اُس لطیف جبلّی ذوق کی پیروی کرے جس میں نزاکت و نظافت و خوبصورتی ہے۔ کچھ دنوں بعد انجام کار اس ذوق میں احساس خودی اور نقد کا مادّہ پیدا ہو جائے گا۔ لیکن ابتدا میں یہ ذوق محض ایک حاصل کردہ جبلّت کے طور پر ہو گا۔ ایسا شخص جس نے اس طرح کی روحانی تربیت پائی ہو اپنی جوانی ہی کے زمانے میں جبکہ وہ اپنے افعال کی توجیہ سے بھی واقف نہ ہو گا۔ آرٹ اور فطرت کے متروکات اور اغلاط کا آسانی مشاہدہ کرے گا اور اس طرح کے ذوق سے جو غلطی کر ہی نہیں سکتا۔ اُن چیزوں کی تعریف کے ساتھ ساتھ جو کہ اچھی ہیں (جن سے وہ مسرت حاصل کرے گا اور جنھیں وہ اپنی روح کا جزو بنا کر خود نیک اور شریف بن جائیگا) وہ بُری چیزوں سے پرہیز و نفرت بھی کرے گا۔ اور اس لئے جب بعد میں احساس خودی اور نقد کا مادّہ اُس میں پیدا ہو جائیگا تو وہ اس مادّہ کو پہچانے گا اور اس سے اُس دوست کی طرح ملے گا جس سے کہ اس کی تعلیم نے بہت دنوں قبل سے اس کی شناسائی کرا دی تھی!

ارنسٹ! مجھے یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ ہم لوگ انگلستان میں اس نظریہ سے کتنے دُور ہیں۔ اگر کوئی ہمت کر کے کسی تقدس مآب سے یہ عرض کرے کہ تعلیم کی اصل غرض حُسن کی محبت ہے اور جس طرح یہ تعلیم ہو سکتی ہے وہ انداز طبیعت کی پرورش، ذوق کی تربیت اور قوت نقد کی تکوین ہے تو میں اس مُسکراہٹ کا تصور کر سکتا ہوں جو ان حضرت کے چمکتے ہوئے چہرے کو روشن کر دے گی۔

ممکن ہے کہ بعض حضرات کو یہ خیال ہوا ہو کہ آسکر وائلڈ ناقد کی صفت بیان کرتے کرتے آرٹسٹ کی صفت بیان کرنے لگا تو انھیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وائلڈ کے نزدیک آرٹسٹ اور ناقد دو علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے نزدیک بغیر قوت نقد کے فنون لطیفہ میں کسی ایسے شے کی تخلیق جو واقعی کسی قابل ہو ناممکن ہے۔ اس لئے وہی تعلیم جو ایک شخص کو آرٹسٹ بنا سکتی ہے تھوڑی سی اور جلا کے بعد ناقد بنا دیگی رہی غیر جانبداری و خلوص و معقولیت پسندی کی شرط تو یہ سب اُن لوگوں کی عائد کردہ ہیں جو آرٹ کی "مقدس مجذوبیت" سے بے بہرہ ہیں اس لئے نہ ان شرائط کے ماننے کی ضرورت اور نہ اس طرح کے لوگوں کی بات سماعت کے قابل!

علی عباس حسینی

آج کریں مجھے نہ تنگ

موسم خوشگوار ہے، ابر ہے، سبزہ زار ہے — رونق نو بہار ہے۔ زمزمۂ ہزار ہے
دل میں ہے اک نئی اُمنگ
آج کریں مجھے نہ تنگ — مذہب و عقل و نام و ننگ

جوش سحاب دیکھکر، بادۂ ناب دیکھکر — چنگ و رباب دیکھکر، حُسن شباب دیکھکر
نفس سے ہو رہی ہے جنگ
آج کریں مجھے نہ تنگ — مذہب و عقل و نام و ننگ

دیکھ کے دل کے طور آج، عزم ہوا ہے اور آج — ہو گا نہ جبر و جور آج، تو بہ ہے زیر غور آج
دل کے بدل چلے ہیں رنگ
آج کریں مجھے نہ تنگ — مذہب و عقل و نام و ننگ

خضر راہ

بنگالی

شب ماہ

چاندنی نے زمین کے ذروں کو چاندی کا پھول بنا دیا۔ ایک سفید سا غبار اٹھا اور سطح فلک پر چھا گیا۔ میرے دل پہ

غبار دھوئے گئے۔ تیری تصویر آنکھوں کے آئینوں میں جلوہ گر ہو گئی۔ دور کہیں اُفق کے قریب کسی کُٹیا میں چراغ کی روشنی نظر آ رہی ہے۔ اسی طرح میرے دل کی گہرائیوں میں تیری محبت کا چراغ روشن ہو رہا ہے۔

چاند مسکرا رہا ہے۔ چاندنی مسکرا رہی ہے۔ زمین مسکرا رہی ہے۔ میری ہستی کا ذرہ ذرہ مسکرا رہا ہے۔ ایک طوفان مسرت میں غرق ہے۔

فراق میرے تصور کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ تم مجھ سے قریب ہو گویا میرے دل میں بیٹھے ہو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ روشنی جو دُنیا کو منور کر رہی ہے۔ میرے دل ہی میں سے نکل رہی ہے کہ تم میرے دل میں بیٹھے ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چاند کی کرنیں میرے ہی مسرور جذبات کی لہریں ہیں۔ کیونکہ تم میرے دل میں بیٹھے ہو۔

ہندی

ہے پربھو!

ہے پربھو! سنسار کی ہر شے تیری بڑائی اور سچائی کے گیت گاتی ہے۔ انسان کے دل کی کمزوری ہے کہ بلند پہاڑوں اور گہرے دریاؤں میں تیری قدرت نہیں دیکھتا۔ تو دُنیا میں اس طرح رچ گیا ہے کہ دُنیا اور تو کوئی علیحدہ شے نہیں رہی۔ تو دُنیا ہے۔ دُنیا تو ہے۔

رشی کہتے ہیں کہ دُنیا ایک نقاب ہے جس نے تیرے چہرے کو چھپا رکھا ہے۔ لیکن کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ دُنیا ایک آئینہ ہے جس میں تیرا حسن نظر آتا ہے۔

ہاں اس حُسن کے دیکھنے کے لئے آنکھوں کی ضرورت ہوتی ہے بینا آنکھوں کی جو تیرے حُسن کو چمکتا ہوا دیکھ لیں۔

میری آنکھیں بینا نہیں۔ لیکن میرا دل روشن ہے۔ اندھا ہوں۔ مگر تجھے دیکھتا ہوں، لوگ آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ میں دل سے دیکھتا ہوں۔

ہے پربھو! تو خود بتا دے لوگوں کا دیکھنا اچھا ہے کہ میرا؟

روسی

ادب

ادب زندگی کی روح ہے۔ کائنات کا دل ہے۔ غم اور مسرت کے پر پیدا کر کے یہ طائر آسمان پیما خدا جانے کن بلندیوں تک پہونچا ہے۔ انسان کے تمام خواب، انسان کی تمام آرزوئیں اس آئینے میں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ انسان فطرت کی عظمت و حسن کے آگے سربسجود ہو جاتا ہے اور اس کے مہیب و عجیب اسرار کے سامنے خوف سے لرزہ براندام ہو جاتا ہے اور یہ تمام جذبات ادب کے صفحات پر شعلہ ریز نظر آتے ہیں۔

انسان کا دل علم کے لئے دھڑکتا ہے۔ علم کے لئے بیتاب رہتا ہے، اور یہ اضطراب و احساس بھی ادب کی تخلیقات میں نمودار ہوتا ہے۔

ادب دُنیا کی چشم جہاں بیں ہے۔ ادب جام جمشید ہے۔ اس کی ایک نگاہ فطرت کی ازلی گہرائیوں تک پہونچ جاتی ہے۔

ادبی تصنیفات عجائبات عالم میں شمار ہونی چاہئیں۔ کسی شخص نے ہزاروں میل کے فاصلہ سے چند حروف کو جمع کر کے کچھ ایسی چیز پیدا کر دی ہے، جس کو صرف جادو سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ وہ لوگ جو مصنف سے بالکل ناواقف ہیں ان حروف کے مجموعے کے مطالعہ کے بعد اس کی شخصیت کے متعلق صحیح اندازہ قائم کر سکتے ہیں۔ کیا جادو ہے؟

جاپانی

جاپانی شاعری کے نمونے

میری دلہن نے صبح کے وقت گلاب کا ایک پھول توڑا جس سے خوشبوئے صبح آتی تھی۔ پھر وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اور پھول اپنے بالوں میں لگالیا۔ کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد وہ بولی۔

پیارے۔ میں زیادہ خوبصورت ہوں یا گلاب کا پھول"
اور میں نے اُسے چھیڑنے کے لئے کہا۔
"گلاب کا پھول"
تو وہ خفا ہوگئی۔ اس نے پھول کی پتیاں نوچ ڈالیں۔ اور بولی "لو اپنا پھول۔ اب اسی کو اپنا محبوب بنالو"

میں راستہ بھول گیا۔ کشادہ اور وسیع کھیتوں میں ایک نازنیں بنفشہ کے پھول توڑ رہی تھی۔ میں نے اس سے راستہ پوچھا تو وہ سورج کی کرنوں کی طرح مسکرائی اور پھولوں میں سے ایک طرف اشارہ کیا جہاں دو رنگین اور شریر تیتریاں نیلے نیلے آسمان کی طرف پرواز کر رہی تھیں۔

اے حسین جگنو!
تو نے بے سود جھیلوں اور آبشاروں کے ترنم میں سکون کی تلاش کی۔ پانی کے گیت تیرے بیقرار دل کو تسکین نہ دے سکتے تھے۔

اب تو لطیف اور نازک گھاس پر محوِ خواب ہے۔
اس سنسان تاریک گوشے میں۔ جہاں آسمان کے شبنمی آنسو جذبات کو سکون کا پیغام دیتے ہیں۔

آہ! شگفتہ کنول کے پھول کا دل افروز نظارہ!
ہم اس کے پاس سے خاموشی سے گزر جاتے تھے۔ اور پھر ایک دن کا یک اس پھول سے ایک طلسمی خوشبو کا سیل رواں ہوگیا اور کائنات کی روح معطر ہوگئی۔

یوگوسلیویا

وقت

میری ماں کہا کرتی تھی وقت "ازلیت" ہے۔ اور جو لوگ وقت ضائع کرتے ہیں وہ گویا "ازلیت" کو ضائع کر رہے ہیں۔ دنیا میں بھلائی نہیں ہے۔ نیکی نہیں ہے۔ وقت کا صحیح استعمال نیکی ہے:

وقت! آخر اس لفظ کا کیا مطلب ہے۔
ہم پیدا ہوتے ہیں۔ مرجاتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ "وقت" ہی ہوتا ہے۔ وقت ایک بے کنار سمندر ہے، ایک وسیع فضا ہے جس میں کئی دنیائیں رقص کر رہی ہیں۔ جس میں موت اور زندگی کے راز پوشیدہ ہیں۔
جو کچھ ہم کر چکے ہیں اسکا نام ماضی ہے۔
جو کچھ ہو رہا ہے وہ "حال" کہلاتا ہے۔
جو کچھ ہم کرینگے یا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مستقبل سے موسوم ہے!
لیکن یہ سب کچھ خود ہماری ذات میں موجود ہے۔ ہم سے باہر نہیں۔ ماضی ہمارے حافظے میں محفوظ ہے۔ "حال" ہماری توجہات کا مرکز ہے۔ مستقبل کے آئینے میں ہماری آرزوئیں اور تمنائیں منعکس ہیں۔
ہماری زندگی "توقعات" کے تسلسل سے عبارت ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ زندگی "توقع" اور "امید" ہی کا دوسرا نام ہے۔
بعض اوقات آرزوؤں کی تکمیل وقت پر منحصر معلوم ہوتی ہے بعض وقت خود "وقت" ہماری آرزوؤں اور تمناؤں پر منحصر معلوم ہوتا ہے۔ ہم وقت کو دنوں مہینوں، سالوں، صدیوں، عہدوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اور اس بے معنی ترتیب پر خوش ہوتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے "وقت" کو ناپ لیا ہے۔ حالانکہ یہ خیال غلط ہے۔
یہ وقت کچھ نہیں۔ دراصل کوئی شے نہیں۔ وقت ایک خیال ہے۔ ایک تصویر ہے۔

انگریزی

شریر دمدار ستارہ

عرصہ گذرا کہکشاں کی سفید وادی کے قریب ایک حسین خورد سال دمدار ستارہ رہتا تھا جسے ہمیشہ رات کی رنگین خاموش فضاؤں میں سیر کی تمنا رہتی تھی۔

وہ اُچھلتا کودتا اور کھیلتا پھرتا۔ اس کی شریف ماں ایک خوبصورت بڑے ستارے میں رہتی تھی اور بچے کی نازیبا حرکات پر اُسے ہمیشہ تنبیہ کرتی رہتی تھی۔

وہ اُسے ستارہ خوار خورشید سے ہمیشہ خوف دلاتی رہتی جس کی محبوب ترین غذا ستارے تھے اور جس کے لئے دمدار ستاروں کو خاموشی سے نگل جانے سے بہتر کوئی مشغلہ نہ تھا۔

مگر مناسب ڈر کیوں؟ اور احتیاط کیسی؟ شریر ستارہ کھیلتا، کھیلتا اپنی روشن طویل دُم کی آخری لمبی کرن کو دیو خورشید کے نار آفریں مُنہ کے پاس لیجاتا، بالکل اُس کی خونخوار نگاہوں کے سامنے، اور نہایت بیباکی سے محترم مریخ کے دامن میں پھُدکتا اور تھرکتا پھرتا۔

وہ ہمیشہ مُسکرا مُسکرا کر خاموش ستاروں کی مُردہ دلی اور افسردگی پر آواز کستا رہتا۔ اس کے نزدیک زندگی اس کی مانند نازیبا حرکات ہی پر مشتمل تھی۔

زمین کے فلک بینوں کی خاموش، اور قہر آلود نگاہوں کا نشانہ بننے کی نسبت وہ آسمان کے ستاروں کی حسرت زدہ نظروں میں پھُدکتے پھرنے کو زیادہ سرور انگیز سمجھتا تھا۔

اُسے حیرت ہوتی تھی کہ کس طرح شب و روز اتنے بے شمار حسین ستارے پژمُردہ ہوتے جاتے ہیں اور زرد رو ماہتاب تمام تعریف اور محبت کی دولت سے مالامال ہوا جاتا ہے۔

اور جوں جوں یہ شوخ ستارہ اپنی طویل شریر دُم کو ادھر اُدھر ہلاتا بائیں بناتا اور سر ہلا ہلا کر نئی نئی وضعیں اختیار کرتا، اس کی سن رسیدہ ماں زیادہ غمگیں ہوتی جاتی اور روز بروز افسردہ تر۔

وہ آسمانوں کی فضا میں ہزار ہا سال سے رہتی تھی۔ اور کئی ایسے دمدار ستاروں کو، ان رنگین اور شوخ نورانی ذرّوں کو یونہی شرارتیں کرتا اور شوخیاں بگھارتا دیکھ چکی تھی۔

یونہی رفتہ رفتہ ایک دن اس ستارے کی شرارتوں کے خاتمہ کا وقت بھی آ گیا۔ وہ اپنی حد سے ذرا تجاوز کر گیا۔ اور خورشید نے اُسے دُم پکڑ کر اپنی مملکت میں گھسیٹ لیا۔

شریر ستارہ تو اب اپنی لمبی چمکدار اور شریر دُم کو ادھر اُدھر دُنیا کے سامنے ہلاتا نہیں پھرتا لیکن وہ خاموش ستارے جن کا مضحکہ اُڑانا اس کا محبوب مشغلہ تھا اب تک ہمیشہ کی طرح رات رات بھر دیکھتے رہتے ہیں۔

فطرت

فرانسیسی

پینترا

بہار کا موسم تھا اور شام کی رنگینی قلوب کو مسخر کر رہی تھی۔ ٹوٹان وہ شہر سفید حیرت افروز نظارہ تھا۔ خاموشی، مکمل خاموشی کا طلسم طاری تھا۔ عمارتوں پر چونے کی سفید چادریں پھیلی ہوئی تھیں۔ برآمدے، چبوترے تمام چیزیں ان سفید چادروں میں لپٹی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ لوگ گذر رہے تھے۔ ان کے لباس عجیب و غریب دلکش رنگوں کے تھے۔ ان کا انداز خواب آلود سا تھا۔ ان کی بھنوی سیاہ آنکھیں اس دُنیا

کو مشاہدہ کرنے سے قاصر معلوم ہوتی تھیں۔

سُنہری شفق ہر شے کو گلابی رنگ میں رنگ رہی تھی اور تاریک و تار مکانوں کے انتہائی گوشوں میں بھی چونے کا رنگ کچھ نیلا سا ہو گیا تھا جس طرح برف سایہ دار مقامات پر کچھ کبود سا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اِدھر اُدھر لوگ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ لباسوں کے رنگ کی تعریف نہیں ہو سکتی سُنہرا زرد۔ ہلکا سبز۔ زردی مائل سبز۔ گلابی۔ گہرا نیلا۔ پھر کچھ اور رنگ تھے جن کے لئے نام موجود نہیں ہیں۔

کہیں کہیں بہار کے مخصوص پھول اپنی پوری رعنائی میں جلوہ گر تھے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ایک سفید سی مارا سا لکیر۔ چونے کی سفید لکیر مُردہ خوفناک.. تمام مناظر پر چھائی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس لکیر سے روشنی نکل رہی ہے۔ اس لکیر میں روشنی منعکس ہو رہی ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگا گویا نور کا ایک نرم سا سیلاب اس چونے کی لکیر سے نکل کر آسمان کی طرف سنہرے آسمان کی طرف رواں تھا۔ اس سنہرے آسمان کی طرح جو اب شفق کے تیز رنگ سے شعلوں کی طرح سُرخ معلوم ہوتا تھا۔

گہرے اور نمایاں سائے، صوفیانہ رنگ غائب ہو چکے تھے۔ چلنے پھرنے والے لوگوں کی حرکات سے صاف اور تیز رنگ پیدا ہوتے تھے ایسے ہی مقدس اور لطیف رنگ آسمانی نغموں اور روحانی جلووں سے پیدا ہوتے ہیں۔

اِس عالمگیر سفیدی پر ایک ابر رنگ چھایا ہوا تھا۔ ہر شے پگھل کر شفق کے رنگ میں شامل ہو گئی تھی۔ صرف لوگوں کی پُر اسرار خواب آلود بڑی بڑی آنکھیں سیاہ تھیں۔ باقی ہر شے اپنا رنگ کھو بیٹھی تھی۔

دُور سے بانسری کی نازک اور غم افزا شُر سُنائی دیئے۔ اور پھر سپنیروں کے دفوں کی مدھم آواز آئی۔ یکایک وہ تمام لوگ جو بیکار اِدھر اُدھر پھر رہے تھے موسیقی کے کیف سے متاثر ہو کر بانسری بجانے والے کی طرف چل پڑے سپنیرے چوک میں جمع تھے۔

نیلے نیلے سانپوں میں سفید لکیروں کا ایک سلسلہ نظر آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا برف کے گالے اُڑتے پھر رہے ہیں۔

لمبی لمبی عبائیں پہنے ہوئے لوگ جوق در جوق سپنیروں کے گرد جمع ہو گئے۔ سانولے رنگ کے سپنیرے گا رہے تھے۔ ناچ رہے تھے۔ اپنے سانپوں کی طرح لطافت اور نزاکت سے ناچ رہے تھے۔ بانسری کے سروں کے ساتھ ساتھ ان کے جسم مناسب طور پر حرکت کرتے تھے۔ رقص میں ان کے گھنگریالے بال متحرک ہو کر عجیب لطف پیدا کرتے تھے۔

یہ منظر تمام تر حسین و جمیل تھا۔ آسمان کی بلندیوں سے لیکر اس ساریاں لڑکے تک جو آنکھیں پھاڑے ہوئے بانسری بجانے والوں کی طرف دیکھ رہا تھا ہر شے حسن و جمال سے لبریز تھی۔

اور ایک طرف میں تھا جس کے لئے زمان و مکان کی ہر قید بے معنی ہو گئی تھی۔

مجھ پر بھی موسیقی کا نشہ چھا گیا تھا میں بھی اُن خاموش سننے والوں کے درمیان کھڑا ہوا۔ ایک معمولی تماشائی کی طرح سے۔ گذرتے ہوئے وقت سے بے پرواہ اپنی روح کو کیف و تاثر کے سمندر میں غوطے دے رہا تھا۔ بانسری کے اندوہ افزا اثر نے میرے دل کو مسحور کر لیا۔ اور قدیم زمانوں کے وحشی انسانوں کی طرح میں اپنے دل میں جذبات کا ایک طوفان اُمنڈتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

یہ زمین میرے لئے عالمگیر موسیقی کے سروں میں موت کے نغمے گاتی ہے۔

جہنمی لندن

میں نے دُنیا کی سب سے زیادہ عجیب چیز دیکھی ہے۔ فطرت انسان کے لئے جو شے سب سے زیادہ پریشان کُن ہو سکتی ہے وہ سب نے مشاہدہ کی ہے۔ اب تک میرے دل پر اُس شہر کے نقوش ثبت ہیں جو عمارتوں کے پتھریلے جنگلوں سے عبارت ہے۔ اور جس کے بازاروں میں انسان محبت، نفرت، حقارت اور بھوک کے جذبات کے نیچے دبے ہوئے کی طرح چلتے پھرتے ہیں۔

میری مُراد لندن سے ہے۔

کسی فلسفی کو لندن میں جانے دو لیکن شاعر کو وہاں نہ جانے دو۔ فلسفی

شہر کے ایک کونے پر کھڑا ہوا بہت کچھ لکھ جائے گا۔ جسے وہ باتیں معلوم ہونگی جو شیکسپئر کی کتابوں میں نہیں۔ اور جوں جوں انسانیت کی لہریں اس کے ارد گرد زیادہ متلاطم ہوتی جائیں گی اس کے سامنے نئے خیالات واحساسات کا ایک بحر بیکراں پیدا ہوجائے گا۔ وہ قدیم ازلی روح جو انسانوں میں قائم ہے اس کے قریب سائنس لیکی معاشرتی نظام کے پیچیدہ ترین اسرار حل ہوجائیں گے۔ وہ دنیا کی نبض کو حرکت کرتا ہوا محسوس کرے گا۔

اگر لندن دُنیا کا دایاں ہاتھ ہے بمنزلہ کام کرنے والا دایاں ہاتھ تو یقیناً وہ بازار جو ایکسچینج کی طرف سے ڈوننگ سٹریٹ کی طرف جاتا ہے اس ہاتھ کی سب سے بڑی انگلی ہے۔

شاعر کو لندن میں نہ جانا چاہئے۔ ہر شے کی حیرت انگیز سنجیدگی۔ ایک عظیم تسلسل مشین نما حرکتیں مسرت وعشرت کا ابتذال۔ اور مبالغہ متخیلہ کو ایک ایک بوجھ کے نیچے دبادیتی ہے۔ اور دل کو پھاڑے دیتی ہے۔

جرمن شاعر کو لندن نہیں جانا چاہئے۔

وہ تو ہر شے کے سامنے کھڑا ہوجائے گا۔ بھیک مانگنے والی عورت، ہویا چمکتے ہوئے جواہر کی دوکان اُسے ہر شے میں عبرت اور زندگی کے لئے اشتر نوشیدہ نظر آئیں گے ✣

عربی

مرثیہ بغداد

عربی اشعار کا ترجمہ

(۱)

میں نے چاہا تھا کہ اپنی پلکوں میں آنسوؤں کو روکوں۔ مگر جب ان کی طغیانی ہوئی تو بہہ ہی پڑے اور نہ رُکے

(۲)

کاش بغداد کی تباہی کے بعد اس کی نسیم کا جھونکا — میری قبر پر گذرتا۔ اور میں اس سانحہ عظیم کو نہ دیکھتا

(۳)

طبیب نے میرے علاج کے لئے جب میری نبض پر ہاتھ رکھا — تو میں نے ہنسکر اُس کو جھڑک دیا کہ جا مجھ کو ایسے مرض کی شکایت نہیں جس کا علاج ہوسکے

(۴)

میں نے احباب کی جُدائی میں ہمیشہ صبر سے کام لیا — مگر یہ ایسی جُدائی ہے جس کا علاج صبر سے نہیں ہوسکتا

(۵)

میں عبادان شہر میں ٹھہرا اور میں نے دجلہ کے پانی کو دیکھا۔ کہ صاف اور ستھرے خون کی طرح سمندر کی طرف بہتا جاتا تھا

شہر واسط کی مصیبت میں جو میرے آنسو جاری ہوئے (۶) تو انھوں نے خلیج فارس کے مدوجزر کو اور بڑھا دیا

(۷)

فرض کرلیا جائے کہ دارالخلافہ پھر آباد ہوگا — ذلّت کے غبار سے علماء کے چہرے پاک ہونگے

(۸)

لیکن بنی عباس، جن پر ایک عالم کو فخر تھا اور جن کے اخلاق پسندیدہ سے پیشانیاں نورانی تھیں پھر کہاں سے نظر آئینگے

(۹)

ان کا ذکر اب دُنیا میں فسانہ ہوگیا اور یہ ایسا فسانہ ہے جو کانوں کو برچھیوں کی نوک کی طرح خون آلود کردیتا ہے

کیا ممبروں پر پھر خطبے پڑھے جائیں گے اور ان (۱۰) میں معتصم باللہ کا ذکر نہ ہوگا ؟

بچّوں کا کتب خانہ

تمام کتابیں جدید اصول تعلیم کو مدِنظر رکھکر لکھی گئی ہیں۔ اور ہر کتاب کے اخیر میں مشکل الفاظ کا فرہنگ دیا گیا ہے

پیشوایانِ مذاہب

(مصنفہ پروفیسر ... تاجور) (ٹیکسٹ بک کمیٹی)

پروفیسر تاجور ایڈیٹر "ادبی دنیا" و "پریم" نے دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے مذہبی پیشواؤں کی پاکیزہ زندگی پر بچوں کیلئے آسان زبان میں کتابوں کا ایک سٹ تیار کیا ہے۔ بچوں کو اگر یہ حقیقت ذہن نشین کرادی جائے کہ سب مذہبوں میں سچائی اور نیکی کی تعلیم ہے اور سب مذہبی پیشواؤں نے بنی نوع انسان کی خدمت کا حکم دیا ہے۔ ہمیں ہر مذہب کے ہر مذہبی پیشوا کی عزت کرنی چاہیئے اور ہر مذہب کے پیروؤں کو اپنا بھائی سمجھکر اس سے محبت اور نیکی کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ تو اس معصوم عمر کے اعتقادات ان کی تمام زندگی پر اثر انداز ہوں گے اور ان کی ساری زندگی رواداری اور اخوت باہمی کا نمونہ بن جائے گی۔ اس سٹ کی ہر کتاب میں یہی حقیقت بچوں کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان اتحاد آموز کتابوں کو پڑھکر ہندوستانی بچوں میں ایک مشترکہ قومیت کا جذبہ پیدا ہوگا۔ وہ ایک دوسرے کو بلا امتیاز مذہب و ملت بھائی بھائی تصور کریں گے۔ اس سلسلے کی مندرجہ ذیل سوانحعمریاں شائع ہو چکی ہیں۔

حضرت محمد صلعم	مہاتما بدھ	حضرت مسیح	شری رام چندر جی	باباگورو نانک
۴؍	۳؍	۳؍	۳؍	۴؍

حضرت زرتشت	حکیم کنفیوشس	راجہ رام موہن رائے
۴؍	۳؍	۳؍

پورے سٹ یعنی کل آٹھوں کتابوں کی قیمت ایک روپیہ گیارہ آنہ علاوہ محصول

حاجی بابا اصفہانی

ایک ایرانی ظریف حاجی بابا اصفہانی اپنی کہانی اپنی ہی زبانی سناتا ہے اور ایسے مزے لیکر سناتا ہے کہ خود بھی ہنستا ہے اور سننے والوں کو بھی ہنسا ہنسا کے لٹا دیتا ہے۔ یہ کہانی بہت لمبی ہونے کے باوجود بیحد دلچسپ اور بشاشت آفرین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ اور ایشیا کی کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی نے اس کو انٹرمیڈیٹ کے فارسی کورس میں اور اس کا انگریزی ترجمہ اس کلاس کے انگریزی کورس میں داخل کر رکھا ہے۔

بچوں کا فطری جذبۂ ظرافت دہیومر نیچر جسے خشک اور بشاشت سوز کورسوں نے تباہ کر دیا ہے اس قسم کی کہانیوں سے بیدار ہو جاتا ہے۔ اس کہانی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ظرافت مہذب حدود سے آگے نہیں بڑھتی۔ چھ سو صفحات کی تمام کتاب شروع سے آخر تک ظرافت سے لبریز ہے۔ مگر پھکڑپن حیاسوز عریانیوں سے یکسر خالی ہے اور اداے بیان میں تصنیفی اردو نہیں بلکہ گھر یلو بولی استعمال کی گئی ہے۔ کہانی کو زیادہ مفید اور تعلیمی بنانے کے لئے انشائیہ بیان میں بات سے بات پیدا کر کے موجودہ طرز حکومت۔ میونسپلٹی۔ ڈسٹرکٹ بورڈ صوبہ کونسلیں۔ حکومت ہند۔ سکاؤٹ۔ امداد باہمی۔ زراعت۔ صنعت و حرفت۔ [illegible] تعلیمی و ادبی معلومات غرضیکہ یہ کہانی بہاں ایران کے جغرافیہ ایرانیوں کے رسم و رواج ان کے تمدن۔ اور طرز معاشرت پر روشنی ڈالتی ہے۔ وہیں اس سے بچے ہندوستانی زندگی کے تمام پہلوؤں سے بھی واقف ہو جاتے ہیں۔ کتاب کیا ہے۔ کہانی کی کہانی اور تعلیم کی تعلیم کل تین حصوں میں شائع ہوئی ہے اور سب کی مجموعی قیمت علاوہ محصول ڈاک صرف دو روپے آٹھ آنہ ہے۔

پھول باغ

(منظور شدہ) (ٹیکسٹ بک کمیٹی)

بچے کہانیاں سننے اور پڑھنے کے مشتاق ہوا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں عام طور پر ان پڑھ بوڑھی عورتیں ان کو بہلانے کیلئے ایسی لغو اور بیہودہ کہانیاں سنایا کرتی ہیں جن کے ضرر رساں اثرات سے غیر محسوس طور پر بچوں کی ذہنیت خراب ہو جاتی ہے۔ ان کے دماغ جنوں۔ بھوتوں اور پریوں کے وحشت کدے بن جاتے ہیں۔

مہذب ملکوں میں بچوں کو کہانی ہی کہانی میں علمی۔ اخلاقی غرضیکہ ہر قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ کہانیاں نتیجہ خیز اور سبق آموز ہوتی ہیں۔ ان سے بچوں کے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور ان کے قوائے ذہنی کی نشوونما بھی ہوتی ہے۔ لایعنی توہمات اور بے بنیاد خطرات انھیں زندگی بھر کے لئے بزدل اور پست حوصلہ نہیں بنا دیتے بلکہ وہ انھیں سنکر اور پڑھکر اولوالعزم اور بلند ہمت ہو جاتے ہیں۔

پروفیسر تاجور کی ہدایت کے ماتحت یورپین لٹریچر میں سے اسی قسم کی بہت اخذ و اخلاق آموز کہانیاں جو ماہرین فن تعلیم نے بچوں کیلئے لکھی ہیں اصل انگریزی سے اردو کے سانچے میں ڈھال دی گئی ہیں ان میں سے اس وقت تک ۴۲ کہانیاں پھول باغ کے تین حصوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ تینوں حصوں کی قیمت ۹؍ اور الگ الگ ہر حصے کی قیمت ۳؍ ہے

انتخاب میر و مرزا سودا

ابتدائی جماعتوں میں بچوں کو چونکہ اپنے ادبی ذوق کے نشوونما کا موقع نہیں ملتا۔ اور ان کے اردو استاد عام طور پر بس کورس رٹا کر امتحان میں پاس کرا دینے کو اپنی کارگزاری تصور کرتے ہیں۔ اسلئے بچے اس ذوق سے اخیر عمر تک بے بہرہ رہتے ہیں۔ پھر کالج میں آکر جب انہیں اردو کلام میں بیٹھنے کا موقع ملتا ہے۔ اور غالب کے اشعار سے واسطہ پڑتا ہے تو انہیں پتہ چلتا ہے کہ عنقا را بلند است آشیانہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کالج کے دو سال میں اردو کا پیریڈ ان کیلئے ریاضی اور دوسرا سے زیادہ خشک اور غیر دلچسپ بن جاتا ہے۔ پروفیسر تاجور نے اپنے اسکول اور کالج کے اسی تجربے کی روشنی میں مستند شعراء کے کلام کے انتخابات مرتب کرائے ہیں۔ جن میں سے انتخاب میر اور انتخاب مرزا سودا دو حصوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اور اس ایجنسی سے دستیاب ہو سکتا ہے

مشتہر

منیجر علمی بک ایجنسی پوسٹ بکس ۱۹۷ لاہور

ہندوستانی لڑکوں اور لڑکیوں کا باتصویر ہفتہ وار اخبار

پریم

علامہ تاجور اور پروفیسر جگموہن لعل ایم۔ اے دہلوی کی ایڈیٹری میں شائع ہوتا ہے۔ اس اخبار کی امتیازی خصوصیات جن پر اس کا دارومدار ہے حسب ذیل ہیں

(۱) نہایت سادہ سلیس اور ایسی عام فہم زبان استعمال کی جاتی ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کی سمجھ میں آسکے (۲) بچوں کی زبان میں بچوں کیلئے ایسی کہانیوں کا سلسلہ جن کے ذریعہ شہری زندگی کے ہر شعبے کے متعلق ہر قسم کی معلومات کا ذخیرہ غیر محسوس طور پر اُن کے دماغ میں منتقل کیا جاسکے۔ (۳) پریم سبھا کے عنوان کے تحت میں ہم جماعتوں کی پرمذاق باہمی گفتگو کے ذریعے بچوں کو مضمون نویسی، خطوط نویسی، اردو کی تذکیر و تانیث، اُردو الفاظ کی املا کی درستی، ضروری گرامر، ادب، اخلاق، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، بڑے چھوٹے اور برابر والوں سے گفتگو کے آداب کی ایسے دلچسپ طریقے سے تعلیم دینا کہ بچے محسوس بھی نہ کریں کہ ہم کوئی سبق پڑھ رہے ہیں (۴) موجودہ کورسوں نے بچوں کے جذبہ ظرافت (ہیومر سنس) کو مٹا دیا ہے۔ اس جذبہ کو ایسی نتیجہ خیز اور پرمذاق کہانیوں کے ذریعے بچوں میں پیدا کرنا جو شریفانہ مذاق کی حد سے باہر نہ ہوں (۵) ایسے پر معلومات اور دل لبھانیوالے مضامین شائع کرنا جو بچوں میں اُردو ادب کیلئے پیاس پیدا کریں (۶) آسان وزنوں اور ایسی رس بھری زبان میں چھوٹی چھوٹی نظمیں چھاپنا جو بچوں کیلئے سبق آموز ہونے کے علاوہ دماغی تفریح کا باعث ہوں (۷) بچوں میں مذہبی رواداری، مذہب و مذہبی پیشواؤں کی عزت کے پاکیزہ جذبات پیدا کرنا (۸) اخبار بہت محنت اور غور کے ساتھ ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکیگا کہ ہر فقرے کو بہت سے فقروں سے انتخاب کرکے جانچ تول کر مضمون میں درج کیا جاتا ہے۔ ایڈیٹر کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اخبار کے تمام مضامین کے ہر فقرے کے متعلق یہ بتا سکتا ہے کہ یہ فقرہ کیوں درج کیا گیا۔ اور اس کے بجائے کوئی دوسرا فقرہ کیوں نہ استعمال کیا گیا (۹) اس اخبار کو جس نوعیت سے ترتیب دیا جاتا ہے اس کے متعلق ہماری رائے ہے کہ متوسط ذہانت کا ایک بچہ سال بھر اس اخبار کو بغور پڑھکر اُردو معلومات میں انٹرنس کے طالبعلم کی برابری کر سکیگا۔

ذیل میں اس کے متعلق بہت سی رایوں میں سے چند رایوں کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے

اخبار ٹریبون لاہور ۔ پریم لڑکوں اور لڑکیوں کا ہفتہ وار باتصویر رسالہ ہے جو مشہور اردو شاعر مولانا تاجور نجیب آبادی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ سٹاف میں مولانا موصوف کے علاوہ لالہ جگموہن لال ایم۔ اے دہلوی آنریری ایڈیٹر کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ طرز ادا صاف۔ زبان سادہ جسے ہر اُردو خواں آسانی سمجھ سکتا ہے۔ مضامین آسان اور بچوں کیلئے ہر طرح سے موزوں و سبق آموز ہیں۔ رسالہ کی قابل ذکر امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ہر قسم کے فرقہ وارانہ مضامین سے پاک ہے۔ اسکا واحد مقصد یہ ہے کہ بچوں میں اخوت و ہمدردی کے پاکیزہ ترین جذبات پیدا کیے جائیں۔ ٹریبون ۲۴ جنوری ۱۹۲۶ء

جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم۔ اے پی ایچ ڈی ۔ بچوں کا یہ ہفتہ وار باتصویر رسالہ مولانا تاجور نجیب آبادی کے زیر ادارت شائع ہوتا ہے اس کے جاری کرنیکے فاضل ایڈیٹر کا مقصد یہ ہے کہ ہندو مسلم بچوں کے دلوں میں ابتدا عمر سے ہی باہمی اتحاد اور اُلفت کا بیج بویا جائے کسی کو یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ یہ مقصد نہایت قابل عزت ہے مولانا تاجور زبان اُردو کے مشہور ادیب اور ناقد ہیں اور مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ انکی نگرانی میں جو مضامین چھاپے جائیں گے وہ ضرور بلحاظ لفظی اور معنوی خوبیوں کے اعلیٰ معیار کے ہوں گے

خانبہادر میر ناصر علی خانصاحب ایڈیٹر صلائے عام دہلی ۔ یہ رسالہ بظاہر تو بچوں کیلئے سمجھا جاتا ہے میں بڑھا بھی اسے جی لگا کر پڑھتا ہوں۔ شاید اس وجہ سے کہ مزاج میں بوڑھا اور بچہ ایک سمجھا جاتا ہے۔ رسالہ پریم کے اہتمام چھپائی اور کاغذ کی تعریف تو بیکار ہے۔ ان خوبیوں کا جواب مشکل ہے مگر اسکے مضامین کی خوبی بھی لاجواب ہے جنکو پڑھکر بچے تو بچے بڈھے اور جوان بھی بہت خوش ہوتے ہیں

حضرت خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے سے ۔ بچے اور عورتیں اس کو نہایت شوق سے پڑھتے ہیں اور اس کے آنے کی راہ دیکھا کرتے ہیں۔ بہت ہی خوبصورت اور رنگین باتصویر رسالہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ایڈیٹر طبع انسانی کے فلسفہ کو خوب سمجھتے ہیں

خانبہادر شیخ نور الٰہی صاحب ایم۔ اے آئی ای ایس ڈویژنل انسپکٹر مدارس لاہور ڈویژن :- میری رائے میں رسالہ پریم ہندوستانی بچوں کے لئے بہت مفید دلچسپ و کارآمد ہے۔ خصوصاً اسکا یہ پہلو کہ مختلف قوموں کے بچوں کو رواداری اور محبت کی تعلیم دیتا ہے۔

محمد عبداللہ خاں صاحب آرشد نے مرکنٹائل پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ادبی دنیا واقع کشمیر بلڈنگ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا

ہندوستان کے محکمائے تعلیم میں منظور شدہ
اُردو کا علمی و ادبی ماہوار
رسالہ
ادبی دنیا
نقشۂ عالم کے مندرجہ ممالک تک ہندوستانیوں کے ساتھ اُردو زبان پہنچ چکی ہے
مشرق و مغرب کے جدید و قدیم ادبیات کا مُرقع
جون ۱۹۳۰ء
ڈائرکٹر:- آنریبل جسٹس سر عبدالقادر
ایڈیٹر:- تاجور نجیب آبادی
سالانہ چندہ چار روپے بارہ آنے محصول وی پی ۴ر

TO LET

Apply to

THE ADVERTISING MANAGER,

THE "ADABI DUNYA"

LAHORE.

رجسٹرڈ ..... ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد ۲ | بابت ماہ جون ۱۹۳۰ء | نمبر ۶

تصاویر:- (۱) کیکشی اور منتقلا معدنگی - یک رنگی - (۲) معصوموں کی دنیا (۳) دنیا کا حسین ترین منظر (۴) خواب ناز (۵) شعلۂ جوالہ (۶) موت اور سرمایہ دار - (۷) ندامت

حال و قال

ادبی دنیا کی پہلی جلد کا پہلا نمبر ہمارے سفر کی پہلی کٹھن منزل تھی اور یہ نمبر اس کی دوسری جلد کا آخری نمبر ہے۔ چودہ منزلیں طے کرنے کے بعد اب ہم اس مقام پر آ پہونچے ہیں جہاں آغاز کار میں ہماری امیدیں بھی نہ پہنچ سکی تھیں۔ خدائے برتر نے مشکلات سفر کو آسان کر کے ہمیں آج ان بلندیوں پر سرفراز کر دیا ہے جہاں سے ہماری نگاہیں مستقبل کی دامن دراز وسعتوں میں کامیابیوں کا ایک جلوہ زار دیکھ رہی ہیں۔

داغ مرحوم نے راہ محبت کے خطرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے راہرو کو متنبہ کیا تھا کہ دیکھنا!

"اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں۔"

لیکن ادبی دنیا نے ہمیں جس راستے پر ڈالدیا وہ راستہ داغ کی "راہ محبت" سے بہت زیادہ پُرخطر تھا اُس کے نشیب و فراز قدم قدم پر ہمارے لئے زنجیر پا بن رہے تھے، ناممکن تھا، قطعاً ناممکن کہ ہم اس سفر کی ناقابل تسخیر مشکلات کو فتح کر سکتے مگر خدائے تعالے کا فضل ہر ہر قدم پر ہماری دستگیری کرتا رہا اور صرف اسی کے سہارے ہم اس ہفتخوان کو طے کر سکے۔

آغاز سفر میں حریفوں کا اک ہجوم اپنے ضروری کام چھوڑ کر ہمارے ساتھ ہولیا تھا کہ کسی کٹھن منزل پر ہمارے دم توڑنے کا تماشا دیکھے۔ خطرناک سازشیں گمراہ کن پیشگوئیاں، اور غلط افواہیں ایک طویل و عریض خارزار کی صورت میں سد سکندری کے فرائض انجام دے رہی تھیں حال مستقبل کو نگاہوں سے اوجھل کر کے اپنے ساتھ ہمیں بھی ماضی میں تبدیل کرنے پر مصر نظر آتا تھا۔ مگر تقدیر الٰہی ہمیں دنیا کے سامنے سرخرو کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی اس لئے پیغمبر اسلام علیہ السلام کے زرّیں ارشاد کے مطابق

"وَکُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہٗ"

جیسے جس منزل پر پہنچنا ہے اُس کے لئے راستے کی مشکلات آسان کر دی جاتی ہیں۔ منزل مراد کے جلووں نے ہماری نگاہوں کو دعوت نظارہ دی اور پھر تو سے

آبلہ پا نکل گئے کانٹوں کو روندتے ہوئے
سوجھا پھر آنکھ سے نہ کچھ کوچۂ یار دیکھ کر"

آج چودہ ماہ کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو ماضی کی ویران وسعتوں میں خاک اڑتی نظر آتی ہے۔ وہ ناکام تماشائی جو ہماری مرگ غربت کا جشن منانے کیلئے اس سفر میں ہمارے ساتھ ہوئے تھے۔ ہماری بجائے آپ ہی عذاب سفر کی بھینٹ چڑھ گئے، اور اب اُن کی بے گور و کفن لاشوں پر عبرت بہ آواز کس رہی ہے کہ

"آئے تھے دنیا میں اس دن کے لئے"

جن کے کانوں نے اپنے ضمیر کی آوازوں کو کبھی نہیں سنا تھا اُنہیں موت ناکامی و مرگ نامرادی کا پیغام سننا پڑا۔

ادبی دنیا کی دوسری جلد کے ان چھ نمبروں میں حسب ذیل مضامین شائع ہوئے ہیں۔

(۱) دنیا کے مشہور افسانہ نگاروں کے منتخب ترجمہ افسانے ۴۲

(۲) ڈرامے۔	۵	(۷) تنقیدی مضامین	۱۳
(۳) علمی مضامین	۱۶	(۸) دنیا کے مشہور آدمیوں پر	۱۵
(۴) تعلیمی مضامین	۲۶	(۹) ادبی مضامین	۱۷
(۵) تاریخی مضامین	۱۲	(۱۰) نظمیں	۳۹
(۶) اخلاقی مضامین	۲۳	(۱۱) غزلیات	۱۸

(۱۲) ہندوستان اور دنیا کی مشہور ۳۳ زبانوں کی ادبیات کے اقتباسات

(۱۳) آئینہ عالم کے زیر عنوان۔ دنیا کی مشہور تحریکات، علمی ترقیوں ایجادات اور سیاسیات پر اظہار رائے۔

(۱۴) اس جلد کے نمبروں کی ۳۵ تصاویر ہیں جن میں آٹھ سہ رنگی اور چار رنگی بھی ہیں۔

مندرجہ بالا مضامین ادبی دنیا کے ۸۰۰ جہازی صفحات پر حاوی ہیں۔ ادبی دنیا کا ایک صفحہ عام رسالوں کے کم سے کم ڈھائی اور زیادہ سے زیادہ چار صفحات کے برابر ہوتا ہے اس اندازے کے مطابق ادبی دنیا کی ایک ششماہی جلد بعض معاصرین کے پندرہ اور

اکرم کے چوبیس نمبروں کے لگ بھگ بنجاتی ہے۔

(۳) اس کی تصاویر۔ تو اُن کے ششماہی اخراجات کا تخمینہ تین ہزار روپے کی مقدار کو پہنچتا ہے۔ اور یہ ایسی رقم ہے جو کسی عام اردو رسالے کو دو سال تک جاری رکھنے کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔

اس سابق گذارش سے یہ عرض کر دینا مقصود ہے۔ کہ ادبی دنیا کے نام کے ساتھ کسی دوسرے رسالے کا نام ایک سانس میں لینا جائز نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ بقول ڈاکٹر لکشمن سروپ پی۔ ایچ ڈی پروفیسر پنجاب یونیورسٹی اور ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی

"اس آن بان اور ان خصوصیات کا اسقدر سستا رسالہ دنیا کے کسی حصے سے شائع نہیں ہوتا۔

پچھلے نمبر میں حضرت فاخر ہریانوی بی۔ اے کی تصویر ادبی دنیا کے صفحات کی زینت بن چکی ہے۔ حضرت فاخر ملک کے اُن چند در چند شعراء میں سے ہیں جن کی شاعری "شاعری جزویست از پیغمبری" کے مقولے کی تصدیق کرتی ہے۔

عام طور پر آج کل کے نئے اور نوجوان شعراء بدنام "ادب لطیف" کو نظم کر دینا معیارِ کمال سمجھتے ہیں۔ خدا خدا کر کے اردو نثر سے "ادب لطیف" کی لعنت کم ہوئی تھی کہ وہی لسپٹ اب اوزان و بحور پر مسلط کی جا رہی ہے۔

حضرت فاخر ایک نوجوان شاعر ہونے کے باوجود مرگِ انبوہ کے اس جشن میں شریک نہیں ہیں۔ اُن کا کلام استادانہ پختگی۔ متانت۔ بلندی اور ندرتِ بیان کی خصوصیات کے ساتھ پاکیزہ خیالات سے لبریز ہے سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ میں فاخر مزدور صفوں کے آتش بیان خطیب کی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اور دیہاتی مناظر کی تصویر کشی تو اُن کا حصہ ہے۔ ہم نے حضرت فاخر سے اُن کی بیس تازہ اور بے حد دل آویز بلند نظمیں حاصل کی ہیں۔ اِن نظموں کی اشاعت کا سلسلہ گذشتہ نمبر سے شروع کر دیا گیا ہے۔ جب ادبی دنیا میں یہ نظمیں چھپ چکینگی تو فاخر کی اُن تمام نظموں کا ایک مجموعہ ادبی دنیا کے دفتر سے بہت سی سہ رنگی تصاویر کے ساتھ شائع کیا جائے گا۔ اُن کی تمام نظموں کا حق اشاعت ادبی دنیا کے لئے محفوظ کر لیا گیا ہے۔

تذکرۂ "خمخانۂ جاوید" کے مرتب لالہ سری رام ایم۔ اے دہلوی مرحوم کی موت اردو دنیا کے لئے "مرگ بے ہنگام" کی طرح مصیبت ناک ہے۔ اردو زبان کی جو گرانمایہ خدمت انہوں نے انجام دی اُسے اہلِ ملک ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ "خمخانۂ جاوید" جو زندگی میں اُن کا عزیز ترین مشغلہ تھا اُن کے مرنے کے بعد ایک قابل عزت یادگار کی صورت میں۔ بقائے دوام حاصل کریگا۔

ہمیں امید ہے کہ اُن کے ہموطن۔ ہم فن اور ہم مشق دوست پنڈت برجموہن کیفی دہلوی "خمخانۂ جاوید" کو تکمیل تک پہنچا کر اردو دنیا کو شکر گذاری کا موقعہ دیں گے۔

تاجور

دفتری اطلاعات

(۱) صدیق طیب صاحب بہاری کو بعض وجوہات کے سبب دفتر ادبی دنیا سے الگ کر دیا گیا ہے۔

(۲) ادبی دنیا کے تین ملازموں نے باہم سازش کر کے ادبی دنیا کے خریداران کے پتے چرا لئے ہیں اور اب وہ ایک خط کے ذریعہ خریداران ادبی دنیا کو ایک نئے رسالے کی اشاعت کا فریب دیکر اُن سے کچھ پیشگی روپیہ یا خریداری کے آرڈر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اُن میں سے ایک صاحب اُن پتوں پر تپِ دق کے تیر بہدف علاج اور شرمناک امراض کی دواؤں کے اشتہارات بانٹنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ممکن ہے اُن پتوں کو ادبی دنیا کے خلاف پروپیگنڈے کے لئے بھی استعمال کیا جائے۔ محترم خریداروں کو ان جرائم پیشہ حضرات کے فریب آمیز خطوط اور اشتہارات اور پروپیگنڈے سے چوکنا رہنا ضروری ہے۔

(۳) ہمیں اپریل ۱۹۳۰ء کے ۷۵ پرچوں کی ضرورت ہے۔ ادبی دنیا کے جو ناظرین اپنا فائل نہیں رکھتے اگر ہمیں اپنا اپریل کا پرچہ عنایت فرما کر بھیجدیں تو ہم اس کی قیمت (آٹھ آنہ) ادا کرنے کے ساتھ ہی اس توجہ کو امداد سمجھکر اُن کے شکر گذار ہونگے۔

(۴) جن ایجنٹوں نے دفتر کا روپیہ ادا نہیں کیا اُنہیں اُس وقت تک پرچہ بھیجنا بند کر دیا گیا ہے۔ جب تک وہ کل روپیہ ادا نہ کر دیں آئندہ جو ایجنٹ ایجنسی کو جاری رکھنا یا نئی ایجنسی قائم کرنا چاہتے ہیں وہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک پرچوں کی مطلوبہ تعداد سے مطلع کر دیا کریں اور پرچے وصول ہونے کے پندرہ دن بعد تک اس ماہ کا کل حساب بے باق کر دیا کریں۔

مینجر ادبی دنیا لاہور

آئینۂ عالم

ادبیات کے پردے میں ایک شرمناک تجارت

تہذیب مغرب کا بے پناہ سیلاب مشرق کے معتقدات کو بہائے لئے جاتا ہے۔ اور وہ رنگین و دلفریب عمارت جو خالص مشرقی تہذیب کی بنیادوں پر تعمیر کی گئی تھی۔ آہستہ آہستہ برباد کی جارہی ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ جو لوگ اس عمارت کی بنیادیں اکھاڑنے میں مصروف ہیں وہ یہ نہیں بتاتے کہ اس کی جگہ وہ کونسا قصر دلفروز تعمیر کریں گے جو پہلی عمارت سے زیادہ پائیدار اور روشن ہوگا۔

تہذیب مغرب کی آندھی جس خس و خاشاک کو اپنے دوش پر لئے آرہی ہے ان میں ایک کانٹا "صنفی معلومات کی سائنٹفک تعلیم" بھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نوجوانوں کے لئے صنفی معلومات کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک شرط ہے کہ جو لوگ صنفی معلومات پر قلم اٹھانے کے اہل ہیں۔ صرف وہ اس قسم کی کتابیں تصنیف کریں اور اپنے انداز تحریر میں اس سنجیدگی متانت اور وقار کو قائم رکھیں جو خالص سائنٹفک تصانیف کا خاصہ ہے۔ اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے طول و عرض میں ایسی ایسی فحش اور عریاں تصانیف شائع ہو رہی ہیں جن کو "موجودہ زمانے کے کوک شاستر" کہنا بیجا نہیں ہوگا۔ لطف یہ ہے کہ بظاہر تو ان کتابوں کی تصنیف کا مقصد یہ بتایا جاتا ہے۔ کہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو بیاہ کی ذمہ داریوں سے واقف کیا جائے اور انہیں مناسب صنفی معلومات کی تعلیم دی جائے۔ لیکن درحقیقت یہ کتابیں "صحائف عشرت" ہیں جن کے ذریعے نوجوانوں کے جذبات کو بھڑکایا جاتا ہے۔ اور ان کو ایسی کتابوں کے خریدنے کی ترغیب دیجاتی ہے۔ وہ متانت۔ اور سنجیدگی جو ہر اہم تصنیف کا ایک جزو لازمی ہے یہاں قطعاً مفقود نظر آتی ہے۔ استعارات اور تشبیہات کے پردے میں ایسی ایسی باتیں ادا کی جاتی ہیں کہ تہذیب آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ بعض جگہ تو تشبیہ اور استعارے کا پردہ بھی اٹھا دیا جاتا ہے۔

اور تفصیلی طور پر ان تمام لذتوں کی تشریح کیجاتی ہے جو تعلقات زناشوئی سے خاص ہیں۔

ہم نے ان تمام کتابوں کو غور سے پڑھا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان کی اشاعت کا مقصد نوجوان عورتوں اور نوجوان مردوں کو خلاف فطرت افعال سے روشناس کرانا اور ممنوع مسرتوں سے باخبر کرنا ہے اور بس۔ ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں۔ کہ ان کتابوں میں ایسی ایسی "حقیقتیں" درج ہیں۔ کہ پاکباز سے پاکباز مرد اور عورت بھی ان کو پڑھنے کے بعد گناہ کے تصور سے مبرا نہیں رہ سکتے۔ شاید ہندوستان کی آبادی کا ہزارواں حصہ بھی ان خلاف فطرت مسرتوں سے ناآشنا نہ ہوگا۔ جن کے تفصیلی تذکروں پر اس قسم کی اکثر کتابیں مشتمل ہیں۔ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ مغرب میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے مشرق کو آشنا کیا جائے تاکہ پڑھنے والے اس مہیب اور شرمناک موضوع کی دلچسپی سے متاثر ہو کر اس سلسلے کی دوسری کتابیں خریدنے پر مجبور ہو جائیں۔

کئی کتابوں میں خود عورتوں کی زبانی ایسے ایسے شرمناک واقعات کا انکشاف کیا گیا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ اور اگر وہ وقت آ گیا ہے۔ جب ہندوستان کی عورتیں فطرتی طور پر ایسے ایسے انکشافات کر سکتی ہیں تو ظاہر ہے کہ اب ان کو صنفی معلومات کی ضرورت نہیں رہی۔ اور اگر یہ کہانیاں محض مصنف کے دماغ کی اختراع ہیں تو ان واقعات سے ہندوستان کی عورتوں کا بے خبر رہنا ہی بہتر ہوتا۔

اگر اس قسم کی کتابیں طبی سلسلے میں شائع ہوتیں اور اس کا مطمح نظر محض طبی تحقیقات کا نشر ہوتا تو اتنی قابل اعتراض بات نہ تھی ظلم تو یہ ہے کہ ادب کو بدنام کیا جا رہا ہے۔ اور ادب کے پردے میں ایسی ایسی باتیں بیان کی جارہی ہیں جن کو ادب سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ وہ لوگ جو اپنے آپ کو ادیب اور "معلم اخلاق" کہتے ہیں۔ اخلاق و تہذیب کے منافی کتابیں تصنیف کریں اور پھر ان کو ادبی جامہ پہنائیں۔ ان کتابوں کی تصنیف و اشاعت کے ذمہ دار ادبی ادارے ہیں۔ اور ان کے

پروپاگنڈے کی وسعت سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان کتابوں کو ہندوستان کے ہر گوشے میں پہنچا دینا چاہتے ہیں۔

دل گیتی انا المسموم انا المسموم فریاد رس

ہم سمجھتے تھے کہ دہلی اس قسم کی کتابوں کا خاص مرکز ہے لیکن بعض رسالوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب بھی کسی طرح پیچھے نہیں اور دہلی کے نقش قدم پر چل کر ادبی عیاشی کی طرف جا رہا ہے۔

اس امر کی ضرورت ہے کہ اس قسم کی کتابوں کے خلاف مجالس واضع قوانین میں سوال اٹھایا جائے کہ حکومت سے دریافت کیا جائے کہ وہ اس قسم کی فحش اور شرمناک کتابوں کے خلاف کیا کارروائی کرنا چاہتی ہے۔ ان کتابوں کا انداز تحریر اس قسم کا ہے اور موضوع اس قدر شرمناک ہے کہ صریحاً قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اور ہم بہت زور دار الفاظ میں حکومت کی توجہ اس قسم کی کتابوں کی طرف مبذول کراتے ہیں۔

سونا اور فولاد

پروفیسر برمفیلر اس امر کے مدعی ہیں کہ محنت سے خالص سونے کے مرکبات کو فولاد سے زیادہ مضبوط بنایا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مضبوط اور پائیدار سونے کی مانگ روز بروز بڑھ رہی ہے۔ دانتوں کے لئے سونا درکار ہوتا ہے وہ خصوصیت سے اچھا اور پائیدار سونا چاہیئے۔ آجکل جو سونا استعمال کیا جا رہا ہے وہ ایک خاص وقت کے بعد خراب ہو جاتا ہے۔ اس عیب کو دور کرنے کے لئے پروفیسر صاحب موصوف نے سالہا سال کی محنت کے بعد سونے کے تقریباً ۱۰۰ ایسے مرکبات تیار کئے ہیں جو فولاد سے زیادہ پائیدار اور مضبوط ہیں

ایک نیا تجربہ

سمتھ سانین ادارۂ عمل کے ایک کامیاب عامل مسٹر فریڈرک پر نکیب کچھ عرصے سے ایسے پودوں کی کاشت میں مصروف ہیں جو زمین اور سورج کی مدد کے بغیر محض رنگوں کی تابش سے نشوونما پاتے ہیں۔ ایسے پودوں کو ایک خاص طور پر تیار کئے ہوئے کمرے میں رکھ دیا جاتا ہے۔ اور فضا کو مصنوعی وسایل سے گرم کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد چھت میں لیمپ آویزاں کر دئے جاتے ہیں جن سے تیز رنگوں کی شعاعیں نکلتی ہیں۔ اب تک اس تجربے کے مفید اور آخری نتائج برآمد نہیں ہوئے لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ انسان آخر کار پودوں کو بھی سورج اور زمین کی مدد کے بغیر کاشت کر سکیگا۔

پنجاب ٹیچرز ایسوسی ایشن کا قیام

اُستاد۔ جو ہر قوم کے افراد کی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ اور تمام علوم و فنون کا سرچشمہ ہے۔ جس سے کوئی قوم پھلتی پھولتی ہے۔ اس سے ہمارے ملک میں ایسی غفلت برتی جا رہی ہے۔ کہ الامان پرائمری اور مڈل سکولوں کے مدرسوں کی حالت تو ادنیٰ مزدوروں سے بھی گری ہوئی ہے۔ ان کی مشکلات و مصائب بے اندازہ ہیں۔ ان کی کوئی جماعتی تنظیم نہیں۔ کوئی متفقہ آواز نہیں۔ افسوس کس مپرسی کے عالم میں پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن مسرت کا مقام ہے۔ کہ لاہور کے چند ہمدرد استادوں نے پنجاب ٹیچرز ایسوسی ایشن کی بنا ڈالی ہے۔ اس کے مقاصد نہایت مبارک اور عزائم قابل عمل ہیں۔ اس نے مدرسوں کے حقوق کی حفاظت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ اور روز بروز اس کے اراکین کا حلقہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ رکنیت کا چندہ صرف دو آنے ماہوار ہے۔ ہم ملک کے تمام ان حضرات سے جو اس سلسلے میں کام کرتے ہیں۔ سفارش کرتے ہیں کہ جو اس کے رکن نہیں وہ رکن بنیں اور اپنے اثر سے دوسرے لوگوں کو بھی رکن بنائیں اور اس وقت جبکہ انفرادی زندگی کی کوئی حقیقت نہیں اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر میں حصہ لیں۔ ہر صوبہ میں ٹیچرز ایسوسی ایشن قائم کی جائے۔ ہم ایسوسی ایشن کی مجلس منتظمہ کے کارکنوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اور اپنی مخلصانہ خدمات پیش کرتے ہیں۔

لاہور میں لٹریری لیگ کا قیام

پچھلے دنوں لاہور میں ایک لٹریری لیگ قائم ہوئی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ مذہب و ملت کے تعصبات سے قطع نظر ہر زبان کے ادب کی اشاعت کی جائے۔ اور اس طرح مختلف قوموں کو ایک رشتے میں منسلک کر دیا جائے۔ مسٹر چودھری اس انجمن کے سکرٹری ہیں۔ اور ایک محنتی نوجوان معلوم ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ انجمن ہر طرح کامیاب ہوگی۔

تاجور

شیطان

(اپنے آپ سے مخاطب ہوکر)

مری دنیا میں تنویرِ مسرت کا نشاں کیوں ہے؟ فروغِ کہکشاں کیوں ہے بہارِ گلستاں کیوں ہے؟
پرندِ نیلگوں پر گوہرِ انجم درخشاں ہیں بنی سنوری ہوئی آخر عروسِ آسماں کیوں ہے؟
چراغِ مہر طوفانِ فنا میں کیوں نہیں بجھتا نشاطِ زندگی سے اسکا چہرہ ارغواں کیوں ہے؟
گلستاں میں رواں ہیں کاروانِ رنگ و بو کیسے؟ ربابِ دلبری میں نغمۂ عشرت رواں کیوں ہے؟
زمانے بھر میں رسوا ہوگئیں کیوں میری تدبیریں کہولت کیوں بدی پر چھا گئی نیکی جواں کیوں ہے؟
زمیں ہندوستاں کی شعلہ پرور کیوں نہیں ہوتی؟ یہاں کا ذرّہ ذرّہ گلعذار و گلفشاں کیوں ہے؟
یہاں باغوں میں کیسے پھول کھلتے ہیں تمنا کے؟ یہاں کی سرزمینِ دلکشا جنّت نشاں کیوں ہے؟
اُسے دنیا میں دنیا کی طرح رہنا نہیں آتا! تعجّب ہے مجھے دستِ قدرت مہرباں کیوں ہے؟
بہارِ زندگی کیوں ہے محبت رام و سیتا کی میرے فتنوں کا رنگیں باغ پامالِ خزاں کیوں ہے؟

گروں گا خرمنِ امید پر برقِ بلا بنکر
ذرا ہشیار رہنا جا رہا ہوں منتھلا بنکر

عابد

رانی کھکھی اور صندھرا گوای

عمر خیام اور اسکا عہد

گیارہویں صدی عیسوی میں دنیا کی عام حالت وسط ایشیا کے ممالک میں حوادث و انقلابات کا ایک سیل بے پناہ رواں تھا۔ ۱۰۳۰ میں سلطان محمود غزنوی دنیائے فانی کی آرائش کو چھوڑ کر عالم بقا کی طرف روانہ ہوا۔ اور اس کی جگہ سلطان مسعود نے لی۔ چار سال کی قلیل مدت کے بعد آل سلجوق نے طغرل بک کی قیادت میں مہابت غزنویہ کو زیر و زبر کر کے رکھدیا۔ ۱۰۳۷ میں طغرل نے مرو اور ایک سال بعد نیشاپور کو مغلوب کر لیا۔ ۱۰۵۵ میں طغرل اپنی فیروزمند فوج کو لیکر بغداد میں داخل ہوا۔ اور خلیفۂ وقت سے جبراً و قہراً ایران بر پا عراق عرب اور ایشیائے کوچک کا فرمان حکومت حاصل کر لیا غزنوی خاندان کے خلاف سے عہد سے ہو گئے۔ جس کی رو سے بلخ ہرات۔ خراسان اور سیستان کی حکومت بھی اسی کے سپرد کی گئی۔ گویا شان و شوکت کے اس وقار پر ایک مہر لگ گئی۔

* * * * * * * *

۱۰۶۰ میں الپ ارسلان بلاد مشرق کا فرمانروا مقرر ہوا۔ اور تین سال بعد طغرل کی وفات پر تمام ممالک مذکورہ بالا کی زمام اس کے ہاتھ میں آ گئی۔

سنہ میں سلجوقی افواج نے دولت بیزنطائیں کے مہیب و عظیم سپہ سالار روماتس ڈائیلنز کو ایک شکست فاش دیکر ثابت کر دیا کہ ان کی فوج ظفر موج کے سامنے باقی ممالک کی فوجیں خس و خاشاک کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ایک سال بعد آخر الپ ارسلان قتل کر دیا گیا۔ اور عروس دولت ملک شاہ سلجوقی کے قبضۂ اقتدار میں آئی یہ وہی ملک شاہ ہے جس کا وزیر اعظم نظام الملک سلجوقی اپنے نظم و نسق اور عدل و فضل کے اعتبار سے مشاہیر زمانہ میں شمار کیا جاتا ہے اس بیدار مغز وزیر نے علم و فضل کی ترقی۔ دیار و ممالک کی آبادی عوام کی بہبودی اور درسگاہوں کی بنا میں ایک قابل رشک حصہ لیا ہے۔

سنہ میں نظام الملک بھی حسن بن سباح کے فدائیوں کا شکار ہوا۔ اسی سال ملک شاہ نے بھی وفات پائی۔ اس کے بعد کے ۲۰ سال اختلال و بدامنی کا خونریز فسانہ ہیں۔ ادھر ملک میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ ادھر شکست خوردہ بیزنطائن حکومت اپنی تذلیل کا انتقام لینے پر تلی ہوئی تھی اور مسلسل حملے کر رہی تھی۔ اسی عہد میں ۱۰۶۶ء میں ہسٹنگز کی لڑائی ہوئی جس کی وجہ سے انگلستان کے چھوٹے چھوٹے خود مختار امرا کی حکومتیں فرانس کے ساحلی قزاقوں کے ہاتھ آ گئیں۔

یورپ میں جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اور عوام الناس بڑے سے بڑے امراء دو دو سال بدن سے پانی نہ چھوانے پر فخر کرتے تھے۔ جابر و ظالم راہب اور پادری لوگوں کا خون چوس رہے تھے۔ بیرن ایک دوسرے کی موت کے حیلے سوچنے میں مصروف تھا تاکہ استحصال بالجبر اور ارتکاب گناہ کے مزید مواقع میسر آ سکیں۔

بیزنطائن کی رومن حکومت نے پچھلی صدی سے توسیع علوم و فنون میں معمولی سا حصہ لیا تھا اور وہاں کے لوگ کم از کم اپنے ان کوصاف تو کرتے رہتے۔ مگر یورپ کے باقی تمام ممالک میں تہذیب و تمدن کا نشان بھی مفقود تھا۔

خیام کا خاندان

یہ تھی دنیا کی حالت جب غیاث الدین ابوالفتح عمر ابن ابراہیم الخیامی عالم وجود میں آیا۔ اس کا وطن مالوف نیشاپور تھا۔ اور اس نے اپنی عمر کا اکثر حصہ ایک گوشہ عزلت میں بیٹھ کر گزار دیا۔ اس کا یہ طول طویل نام مختصراً عمر خیام بنگیا ہے۔ اور اسی نام سے مستشرقین اور مشرقی عالم اسے پہچانتے ہیں۔ "خیام" کے لفظ سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اس کے والد کا یا اس کا پیشہ خیمہ دوزی تھا۔ مگر مسٹر شیرازی اپنی کتاب عمر خیام میں رقمطراز ہیں کہ:-

"خیامی ایک قسم کا عرف یا لقب ہے جو عمر خیام کے آباواجداد کے ساتھ خاص تھا اُن کے خیال میں عمر کے آباواجداد عربی النسل تھے اور مختلف ضرورتوں سے مجبور ہو کر نیشاپور ہجرت کر آئے تھے۔

خیام نے اپنی رباعیوں میں اس لفظ کو بطور تخلص استعمال کیا ہے۔ اور اس کی ایک رباعی بھی ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے

خیام کہ خیمہ ہائے حکمت مے دوخت

لیکن میرا خیال ہے کہ اس رباعی سے بھی یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا پیشہ خیمہ دوزی تھا مگر مسٹر شیرازی کی توجیہہ کہ "خیامی" ایک عربی لقب یا نسبت ہے صحیح تسلیم کر لی جائے تو مسٹر الڈورتھفیلڈ کے اس نظریئے کو مزید تقویت پہنچیگی کہ "خیام" کو خیمہ دوزی سے اتنا ہی دور کا تعلق ہے جتنا انگریزی زبان کے لفظ "بیکر" کو جو علم ہے) طباخی سے۔

بعض اوقات استدلال کیا جاتا ہے کہ اگر خیام رخیمہ دوز تصور کیا جائے۔ تو اس کی زندگی کے بہت سے واقعات کا امکان باقی نہ رہیگا۔ مثلاً یہ مسلم ہے کہ عمر نے نہایت اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وہ امام موفق کے ارشد تلامذہ میں سے شمار کیا جاتا تھا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کے حلقۂ احباب میں اس زمانے کے مشاہیر شامل تھے۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھکر کہنا پڑتا ہے کہ تعلیم و تعلم کے اس سنہری زمانے میں بھی کسی معمولی خیمہ دوز کا لڑکا اسقدر اچھی تعلیم حاصل کر کے کمال و فوقیت کی بلندیوں پر نہیں پہنچ سکتا۔

اس استدلال کو اس بات سے اور بھی تقویت ہوتی ہے کہ "وصایا" کے مطابق نظام الملک طوسی۔ حسن بن صباح اور خیام ایک ساتھ امام موفق سے تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں۔ بظاہر یہ استدلال وزن دار معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب ہم اس بات کا خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں کبھی کسی خاص پیشے کے ساتھ توہین و تذلیل نفس کو منسوب نہیں کیا گیا۔ تو اس استدلال کی بہت سی وقعت جاتی رہتی ہے۔

یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ خیام کا والد دولت دنیا سے اچھی طرح بہرہ یاب ہو اور بیکاری کو برا سمجھ کر اپنے فرصت کے اوقات خیمہ دوزی میں صرف کرتا ہو۔ اگر ہم یہ فرض کریں کہ خیام کا والد ایک امیر کبیر آدمی تھا اور خیمہ دوزی صرف اس کا مشغلہ تھا وہ تمام اعتراضات جو عمر کی تعلیم کے متعلق وارد ہوتے ہیں۔ بے معنی ہو جاتے ہیں۔

بہرانداز یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے متعلق قطعی طور پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

تین دوستوں کی روایت ہم اوپر اس روایت کی طرف اشارہ کر آئے ہیں۔ جو حسن بن صباح عمر خیام اور نظام الملک کے متعلق عام طور پر تذکروں میں پائی جاتی ہے۔ مسٹر براون نے جو مستشرقین میں ایک نہایت اونچا پایہ رکھتے ہیں۔ اس روایت کی تکذیب کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ارسطو کے اس اصول سے اس روایت کو جانچا ہے کہ

جائز ہے کہ ٹریجیڈی میں ان واقعات کا ذکر کیا جائے
جس کا وقوع ناممکن ہے۔ مگر یہ قطعاً ناجائز ہے کہ کوئی
ایسی بات درج کیجائے جس کا وقوع غیر "اغلب" ہو۔

مراد یہ ہے کہ روایت کے لئے ضروری نہیں کہ وہ زمان و مکان کے قیود کی پابند ہو۔ افسانوں کے لئے یہ لازم نہیں کہ ان کے ہیرو ایک وقت پر صرف ایک ہی مقام پر موجود ہوں۔ افسانہ نویس اور راوی چاہے تو بچے کے منہ سے دانشمندی اور لیاقت کی باتیں کہلوا لے۔ اور چاہے تو دیوانے کے منہ سے عرفان و معرفت کے اسرار حل کروا لے۔ مگر اس کے لئے یہ ناجائز ہے کہ وہ قیصر سے انٹونی کی سی باتیں کرائے یا محمود غزنوی کو لڑائی کے دن بزدل ثابت کرنے کی کوشش کرے۔

مسٹر براون کے خیال میں یہ بات تقریباً تقریباً ناممکن ہے۔ البتہ یہ کہ ہم فرض کریں کہ دو شخص ایک معین وقت میں ۱۰۰ سال سے زیادہ عمر میں فوت ہوئے اور بچپن میں ایک ہی مدرسے میں تعلیم پائیں۔ اس صورت میں طوالت عمر اور اتفاقات حسنہ کا ایک ایسا اجماع فرض کرنا پڑیگا کہ جو لازماً غیر اغلب معلوم ہوگا۔

بہرنوع اس میں کوئی شک نہیں کہ خیام اور نظام الملک آپس میں متعارف تھے۔ کیونکہ ریج ملک شاہی کی تیاری میں خیام نے بھی حصہ لیا ہے۔ اور یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ خیام جیسا وحید العصر جسکی تعریف میں غزالی بھی رطب اللسان نظر آتا ہے۔ نظام الملک جیسے وزیر سے متعارف و آشنا نہ ہو۔ علاوہ ازیں نظام الملک کی تمام زندگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے درسگاہوں کے تعمیر اور علم و فضل کی توسیع کا بیحد شوق تھا۔ اس صورت میں کس طرح ہو سکتا ہے کہ خیام اور نظام الملک آپس میں کبھی نہ ملیں۔ مسٹر اولڈ راتھفیلڈ کے خیال میں اس روایت کے ماخذ قدیمی ہیں اور اسے یقیناً مسترد کر دینا چاہئے۔

مسٹر براون نے اس روایت کو قطعاً مسترد نہیں کیا۔ اور ان کے انداز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں شکوک ہیں جو موجودہ تحقیق سے رفع نہیں ہو سکے۔

• رشید الدین فضل اللہ مولف "جامع التواریخ" نے اس روایت کے حالات بالتفصیل قلمبند کئے ہیں۔ وہ اپنا ماخذ "وصایا" کو قرار نہیں دیتا بلکہ اس نے یہ روایت سرگزشت سیدنا سے اخذ کی ہے

جو ہلاکو کی فتح الموت کے وقت اس ہیبتناک قلعے سے دستیاب ہوئی تھی۔

"سرگزشت سیدنا" حسن بن صباح کی سوانح عمری ہے اور اس کے شاگردوں میں سے کسی کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کتاب کی نسبت گمان نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں کوئی ایسی بات ہوگی جو حقیقت ناممکن ہو یا جس کی صداقت کے متعلق شبہ کرنے کا امکان ہو۔ کیونکہ یقیناً قلعہ الموت کے رہنے والوں کو حسن بن صباح کے حالات کے متعلق تفصیل اور یقینی اطلاع ہوگی۔

اسی کتاب کا ذکر پڑھنے کے بعد غالباً مسٹر براون کے دل میں شبہات زیادہ گہرے ہوگئے ہیں وہ تعجب کرتے ہیں کہ اس روایت کا ذکر "سرگزشت سیدنا" میں بھی پایا جاتا ہے۔ یوں بھی "وصایا" "نظام الملک" کی تصانیف سے خارج کرنے کے متعلق مسٹر براون نے کوئی دلائل پیش نہیں کیں۔ اور ابھی یہ موضوع تشنہ ہے۔

اگر "سرگزشت سیدنا" کو ایک صحیح ماخذ قرار دیا جائے تو میرا خیال ہے کہ "وصایا" کی وقعت بھی بڑھ جائیگی اور جو لوگ اس کتاب کو محض اس وجہ سے جعلی تصور کرتے ہیں کہ اس میں خیام۔ صباح اور نظام الملک والی روایت درج ہے ان کا استدلال ناکارہ ثابت ہوگا۔

عمر خیام اور خاقانی

اسی ضمن میں ایک اور دلچسپ انکشاف بھی قابل ذکر معلوم ہوتا ہے۔ خاقانی کے حالات میں اکثر تذکروں میں یہ بات ملتی ہے کہ اس کی پرورش اس کے چچا نے کی تھی۔ مگر اس کے چچا کا نام نہیں ملتا۔ مسٹر براون نے ایک سیر حاصل مضمون خاقانی کے متعلق قلمبند کیا ہے۔ اس میں خیام کا ذکر بھی آتا ہے۔ مولوی عبدالرزاق کانپوری مصنف "نظام الملک طوسی" اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں:۔

کہ یہ چچا عمر خیام تھا۔ اور اپنے دعوے کی تائید میں خاقانی کی مشہور مثنوی تحفۃ العراقین سے چند اشعار نقل کرتے ہیں جو یوں شروع ہوتے ہیں۔

بگریستہ ام ز دیو خذلاں
در سایہ عمر ابن عثمان

اس انکشاف پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ عمر خیام کے والد کا نام عثمان نہ تھا۔ اور دوسرے یہ کہ خاقانی اور خیام کا زمانہ نہیں ملسکتا۔ جہاں تک پہلے اعتراض کا تعلق ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ عبدالرزاق صاحب نے جو اشعار نقل کئے ہیں۔ ان کا عنوان یہ ہے۔

"در مدح عم خود حکیم عمر الخیام مے گوید"

اگر یہ عمر الخیام مشہور عمر خیام نہیں ہے تو پھر یہ ماننا پڑیگا کہ ایک ہی عہد میں دو عمر خیام تھے اور وہ دونوں حکیم کے لقب سے موصوف تھے۔ دونوں کے نام کے ساتھ "خیام" کا لفظ موجود تھا۔ یہ مفروضے اسقدر مہمل معلوم ہوتے ہیں کہ تقریباً تقریباً ناممکن ہو جاتے ہیں۔

باقی رہا دوسرا اعتراض تو خاقانی یقیناً بارھویں صدی کا شاعر ہے اور عمر خیام بارھویں صدی تک زندہ تھا۔

عمر خیام کی پیدائش اور موت

عمر خیام کی پیدائش کا صحیح سن معلوم نہیں ہوسکا۔ عام طور پر اس کی تاریخ پیدائش سنہ ۱۰۲۰ء یا ۱۰۱۵ء بیان ہوتی ہے تاہم اس کی تاریخ وفات یقینی ہے اور وہ ۱۱۲۳ء ہے۔ اگر اس کی تاریخ پیدائش ۱۰۱۵ء فرض کی جائے۔ تو لازم آئیگا کہ اس کی عمر ۱۰۰ سال سے زائد ہوتی ہو۔ اور اس صورت میں "سرگذست سیدنا" والی روایت کی تائید ہوگی۔ اس میں تو کوئی شک نہیں وہ کافی عمر کے بعد مرا ہے اگر زیج ملکشاہی کی تیاری کی تاریخ سے اس کی عمر کا اندازہ قائم کیا جائے تو کہنا پڑیگا۔ کہ اس کی پیدائش ۱۰۴۰ء کے بعد ہرگز نہ ہوئی ہوگی۔ اس صورت میں بھی موت کے وقت اسکی عمر ۸۰ کے قریب ہوگی۔

خیام کے سفر

اپنی زندگی کے دوران میں خیام نے مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکہ بھی گیا تھا۔ بہت عرصہ آل سلجوق کے دارالخلافہ مرو میں قیام پذیر رہا ہے۔ اس نے بلخ اور بخارا کی سیر بھی کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے بغداد دیکھا ہے۔ جہاں ابھی تک شوکت عثمانیہ کا ایک سایہ عباسیوں کا سیاہ لباس پہنے ہوئے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے عصائے شاہی کو تھامے ہوئے تھا۔ وہ یقیناً اس بات سے متاثر ہوا ہوگا۔ کہ شمشیر دولت آل سلجوق کے ہاتھ میں ہے۔ اور برائے نام نگیں حکومت عباسی انگشتری میں جڑا ہوا ہے۔

خیام کے فلسفہ حیات اور اس کے ملحدانہ جذبات کو دیکھتے ہوئے یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اس نے

مکے کا سفر اختیار کیا ہو۔ ایک مشہور مصنف رقمطراز ہے۔

"شاید خیام نے مکے کا سفر اس لئے اختیار کیا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس مرکزی معبود ذہنی کو دیکھ لے جو ابتک اہل اسلام کے قلوب پر حکمران تھا اور جس کی ہیبت وعظمت خاقان زمانہ کے دلوں پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کا اشتیاق اس طرح کا تھا جس طرح کوئی پروٹسٹنٹ رومن کیتھولک مذہب کے صدر مقام یعنی پوپ کے مستقر کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرے۔"

یہ بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ ان الزامات سے بچنے کے لئے مکے چلا گیا ہو جو اس عہد کے متعصب فضلا و علما اس کے خلاف تیار کر رہے تھے۔ اور فلسفیوں کی تاریخ کے مصنف نے بھی وجہ بیان کی ہے۔

عمر خیام کا وطن

خیام نے اپنی عمر کا اکثر حصہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ نشاپور ہی میں گزارا۔ آجکل نشاپور اپنی پہلی عظمت وشوکت کا ایک سایہ معلوم ہوتا ہے جس میں ۰۰۰۰ ۴۰ ہزار نفوس آباد ہیں۔ اگرچہ خراسان کا تجارتی مرکز بھی یہی شہر ہے۔ لیکن گیارہویں صدی میں یہ شہر ایک عظیم الشان صوبے کا پایہ تخت تھا۔ ابھی تک منگولوں کی تاخت وتاراج نے سلطنت عباسیہ کے پرزے نہ اڑائے تھے۔ فارس میں خراسان "زمین شمس" کے معنی رکھتا ہے۔ مگر خراسان میں سورج کی وہ تابش وتمازت نہیں جس سے جاندار پناہ مانگتے ہیں۔ بلکہ آب وہوا میں ایک خوشگوار اعتدال سا پایا جاتا ہے۔

اس کے میدانوں کی زمین زرخیز ہے اور اس سنہری عہد میں پانی کی بہم رسانی کے مکمل انتظامات کی وجہ سے اس کی زراعت مشہور عالم تھی۔ روئی اور گندم بکثرت پیدا ہوتا تھا اور جب روئی کی فصل تیار ہوتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سبز درختوں پر برف کے گالے پڑے ہوئے ہیں۔ میدانوں کے اردگرد پہاڑوں کی قطاریں کھڑی تھیں جن پر سبزی کا نام ونشان نہ تھا۔ گھروں میں روئی سے طرح طرح کے قیمتی کپڑے تیار ہوتے تھے۔

خراسان کی شالیں اور قالین بہت مشہور تھے۔ ان کے نقوش صنعت کے نقطہ نظر سے اسقدر خوبصورت ہوتے تھے کہ آدمی گھنٹوں دیکھتا رہے۔ فطرت نے اس کو اپنے بے انتہا خزائن سے مالامال کر دیا تھا۔

نشاپور جو خراسان کا دارالخلافہ تھا اسوقت ایران کے بارونق ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ اور اس کے شہروں میں عظمت ورونق کے اعتبار سے چوتھے درجے پر تھا۔ صرف نشاپور میں چھ درسگاہیں فقہ حدیث اور منطق کی تعلیم کے لئے قائم تھیں۔

عمر خیام کی تصنیفات

قارئین کرام تصور کر سکتے ہیں کہ عمر خیام کی زندگی کس قسم کی ہوگی۔ اس عہد علم وفضل میں شاید خیام سب سے بڑا فاضل تھا۔ خیام کے معاصرین تو شاید یہ خیال کرتے ہونگے کہ اس کا فضل وکمال تعلیم کا نتیجہ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ خیام نے تعلیم کے بعد اپنے قطعی ذوق سلیم اور دقت نظر سے کام لیکر اپنے اوپر تحقیق وجستجو کے دروازے کھول لئے تھے۔ تاآنکہ دنیا کا ہر علم اسے دعوت عمل دیتا تھا۔ وہ طبیب تھا۔ فقیہ تھا علم النجوم کا ماہر تھا۔ مصنف تھا۔ اور شاعر تھا۔ اور لطف یہ ہے کہ تمام مختلف انواع علوم میں باکمال ہونے کے ساتھ ساتھ وہ علم الحساب الجبرا اقلیدس وغیرہ کا پورا پورا ماہر تھا۔ علم النجوم میں علم ہندسہ و حساب کے استعمال میں اس کی خاص شہرت تھی۔

اس کے فضل وکمال کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ ملک شاہ نے جنتری کی ترمیم کے لئے جو علمائے دہر طلب کئے تھے انہیں بھی شامل تھا۔

تصنیفات کی فہرست:۔

زیج ملکشاہی۔

مسئلہ کون پر ایک رسالہ۔

وجود کی حقیقت پر ایک رسالہ۔

الجبرے پر ایک رسالہ۔

رباعیات

خیام کو جسقدر شہرت مغرب میں نصیب ہوئی تھی وہ انہیں رباعیات کی بدولت ہے۔ اور ہونا بھی ایسا ہی چاہئے تھا۔ علم وفن کے بھاری بوجھ زندگی کے سمندر میں ڈوب گئے ہیں۔ اور رباعیات کی نرم روکشتی بھنور سے نکل کر شہرت ودوام کے ساحل کے ساتھ آلگی ہے۔ ان رباعیات کے اشعار میں غم والم کے جو لطیف جذبات تھے وہ غرق ہونے کے سزاوار نہ تھے۔

خیام اپنی بہت سی باتوں میں مشہور عالم حکیم بوعلی سینا سے ملتا جلتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس فاضل حکیم کی عمر کا بہت سا حصہ

دنیا کے جھگڑوں میں گز گیا - خیام کی بہت سی رباعیات بوعلی سینا کی طرف منسوب ہیں - اور یہ بات ہی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ان دونوں حکماء کے کردار میں بہت سی باتیں مشترک ہونگی - دونوں عقل کے اثرات کے قائل تھے اور عقل ہی کو چراغِ ہدایت تصور کرتے تھے دونوں کے خیالات اپنے معاصرین کے خیالات سے مختلف تھے البتہ بوعلی سینا کے خیال میں ہر شخص کے دل فطرتاً نیکی کی قدرت ودلیعت کی گئی ہے - کہیں کہیں خیام کے ہاں بھی اس طرح کے اشارات پائے جاتے ہیں - دونوں شراب کو پسند کرتے ہیں - دونوں امرد پرستی سے نفور نظر آتے ہیں - دونوں کا مطمح نظر "عورت کی نزاکت و نزہت ہے - دونوں محبت سے "عورت کی محبت" مراد لیتے ہیں -

رینن افرانس کا مشہور نقاد جو اپنی آرا کے تعصب کے باعث بھی مشہور ہے) خیام کے متعلق لکھتا ہے :-

خیام ایک ایسا شاعر ہے جو بظاہر شراب کے نشے میں سرشار نظر آتا ہے - مگر درحقیقت وہ ایک ریاکار گنہگار ہے جس نے زہد و عرفان کے ساتھ الحاد و کفر کو جمع کر دیا ہے - اور تضحیک و طنز کو ایک خوشگوار جامہ پہنایا ہے "۔

ظاہر ہے کہ رینن کی رائے صایب نہیں -

خیام کے اشعار کو سمجھنے کے لئے اس کے عہد کا ایک اجمالی ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے -

خیام کا عہد

اس عہد کی خصوصیات کیا تھیں جس میں خیام بوعلی سینا جیسے حکیم اپنے کمال سے دنیا کو تسخیر کر رہے تھے؟ اس زمانے کے لوگوں کی ذہنی ترقی کا کیا حال تھا؟ اس عہد کے اساسی جذبات و احساسات کیا تھے؟ اس عہد کے لوگوں کا اخلاقی معیار کن اصولوں پر مبنی تھا؟ وہ کیا طاقتیں تھیں جن کے خلاف انہیں جنگ کرنا پڑتی تھیں؟ ان کے پاس الہام و تائید شعری کے کون سے ذرائع تھے؟ یہ ایسے سوال ہیں جو حقیقت بیں ہر طالب علم کو دعوت عمل دیتے ہیں -

ظاہر ہے کہ کسی عہد کے مشاہیر کے اقوال و آرا اور ان کی شاعری کو نقادانہ نظر سے جانچنے کے لئے اس عہد کے لوگوں کے عام اخلاق و عادات سے بھی باخبر ہونا ضروری ہے -

یہ عہد اس قسم کا تھا کہ ان تمام سوالوں کا جواب دینے کے بعد پھر ایک اور سوال پیدا ہو جائیگا اور وہ یہ کہ اسوقت عالم اسلام کی کیا حالت تھی؟

قارئین کرام کو خیال رکھنا چاہئے کہ ایرانی تمدن و تہذیب نے خالص اسلامی و عربی تمدن پر بہت گہرا اثر کیا ہے - یہ موقع نہیں کہ رسولِ خدا کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے - مگر اموی اور عباسی خاندانوں کا اجمالی ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے -

جب تک دمشق میں اموی خاندان برسرِ اقتدار رہا - ان کے لئے خدا کی وحدانیت اور اس کی جباری و قہاری مذہب کا اصل الاصول تھا - ان کے لئے تاویلات و توجیہات بے معنی اشیا تھیں - ان کے لئے عقل کا استدلال (مذہبی معاملات میں) کفر سے کم نہ تھا - ان کے تدبر کا اصول یہ تھا کہ خالص عربوں کی طاقت کو برقرار رکھا جائے - ایرانیوں کو وہ ایک کمزور قوم خیال کرتے تھے اور انہیں نفرت و حقارت کی نظر سے رکھتے تھے - عرب سردار جو اپنے شجرہ نسب پر مغرور تھے - ان آدمیوں کے حسب و نسب کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیتے تھے اور انہیں مٹی کی ایک چٹکی سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے -

اس ذہنیت کے باوجود اموی خلیفہ سلمان نے ۷۱۵ میں کہا تھا :-

> میں ایرانیوں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں - انہوں نے ہزاروں سال حکومت کی اور کبھی ہم سے مدد طلب نہ کی - ادھر ہم ہیں کہ ۱۰۰ سال کی حکومت میں ایک لمحہ بھی ان کی مدد کے بغیر نہیں گزار سکے "

جب ایرانیوں کی مدد سے اموی خلافت کی قبا پارہ پارہ ہو چکی - اور عباسیوں کا ستارہ عروج پر آیا - اسوقت ایرانیوں کا اثر تمام عالم اسلامی پر چھا گیا - اس میں کوئی شک نہیں کہ دربار کی زبان عربی رہی اور دو صدیوں تک سیاست ملکی کے تمام کام اسی زبان کے ذریعے سرانجام پاتے رہے - یہی وہ زبان تھی جس نے یونانی فلسفے کی بجھی ہوئی راکھ سے ایک انگارہ ڈھونڈ کر نکالا - اور پھر اس سے ایک مشعل ہدایت روشن کر کے تمام دنیا کو منور کر دیا - یہی وہ اہم کام ہے جس کی وجہ سے عرب تمام دنیا میں مشہور ہیں -

ان ترجموں میں بھی لکھنے والا قلم - اور سوچنے والا دماغ ایرانی تھا - عرب مصنف "صاحب الحریری" کی طرح بہت نادر تھے - تاریخ لکھنے کا شوق عربوں میں ایرانیوں ہی کے ذریعے پیدا ہوا

ہے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ ایرانیوں کی طرح کسی نے علوم و فنون کی طرف بکدلی سے توجہ نہیں کی۔

ایرانی ذہنیت اور روح

ماقبل الاسلام ایرانیوں کے مذہب میں ایک بیقرارانہ تشکک ملا ہوا تھا۔ جب کبھی یہ لوگ موقع پاتے تھے۔ قدرت و لامکان کے رموز کو سلجھانے کی کوشش کرتے تھے اور اس رشتے کو دریافت کرنا چاہتے تھے جو فانی انسان اور ازلی خدا میں قائم ہے۔ زرتشت کے مذہب کے فروغ کے دوران میں بھی مانی اور مزدک کی تحریکات جاری رہیں۔ ان لوگوں نے فلسفی تمام دنیا کے مذاہب کے معتقدات سے اچھی باتیں چن کر اپنے مذہب میں داخل کرتے تھے۔ خراسان میں (جو خیام کا مولد ہے) ویدانت اور بدھ فلسفے کے پیرو صدیوں سے رہ رہے تھے۔ مایا کی نہ ختم ہونے والی صورتیں ایک ازلی و ابدی شخصیت کا تصور انہیں لوگوں کے ذریعے ایرانیوں کے دل میں جاگزیں ہو چکا تھا۔

ادھر مغرب سے نیو فلاطونی فلسفے کے اثرات آہستہ آہستہ ایرانی ذہنیت کو من حیث المجموع متاثر کر رہے تھے۔ اور وحدت وجود و مشرب شہود کے لئے میدان تیار ہو رہا تھا۔ اس تفکر و تدبر کے ساتھ ساتھ ایرانی دل و دماغ فطرتاً یاس آشنا بھی تھا۔ اور یہی خصوصیت ہے جو مانی اور فروک کی مذہبی تحریکات میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زرتشت کے مذہب میں امید افزا اور امید پیدا کرنے والے عناصر موجود تھے۔ مگر اوستا کی تعلیمات ایرانی فطرت کو بدلنے سے قاصر تھیں۔ ایرانی لوگ دراصل یاس آشنا تھے۔ اور یاس آشنا ہی ہے

ایک مستبد و جابر حکومت کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہوں یا کسی عدل پرور شہنشاہ کی رعایا۔ ایرانی ہمیشہ قوانین تقدیر کے اٹل ہونے کے قایل رہے ہیں۔ کھلونے جنہیں قسمت اپنا کھیل کھیل کر توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ان کے لئے کسی چیز کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔

چنیں شدیم چہ شد یا چناں شدیم چہ شد
زمیں شدیم چہ شد۔ آسماں شدیم چہ شد

زندگی کا انجام موت تھا اور زندگی محض اس لئے معرض وجود میں آئی تھی کہ موت کے چنگل میں قہر و جبر کا شکار ہو جائے۔

شاید یہی وہ تاثر ہے جو شیلے کی زبان سے اس طرح ادا ہوا ہوا ہے:۔

"اس خاک کا ایک ذرّہ بھی ایسا نہیں جو کبھی کسی انسان کا جزو نہ ہو۔ بادل میں کوئی بھی ایسا قطرہ نہیں جو کبھی کسی انسان کی رگوں میں خون بنکر موجزن نہ ہوا ہو۔"

اسلام کے بعد بھی خراساں میں تناسخ اور وحدت وجود کے اثرات اپنا کام کرتے رہے دوسری صدی ہجری میں بابک خرمی تناسخ کے مسائل کو حل کرنے میں مصروف تھا۔ اور ایران کو ایک نئے مذہب کی دعوت دے رہا تھا۔ اور جب ابومسلم نے اموی خلافت کو تباہ کیا ہے۔ اسوقت ایران میں کئی لوگ ایسے تھے جو ابومسلم کو دیوتا خیال کرتے تھے۔ مقصد ان سطور کی تحریر سے یہ ہے۔ کہ اسلام کے بعد بھی ایران میں اس قسم کے عناصر پائے جاتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اموی خاندان کی بربادی اور عباسی خاندان کا برسر اقتدار آنا صرف ایک سیاسی واقعہ ہی نہیں شمار ہوتا۔ بلکہ اسے ایک مذہبی اور معاشری انقلاب کہنا چاہیئے۔ اب ایک قاید کی جگہ تخت خلافت پر ایک ایسا شہنشاہ متمکن ہوا جو تمام اہل اسلام کا سردار تسلیم کیا جاتا تھا۔ جو خدا کا نائب تصور ہوتا تھا۔ اور جو خدائی احکام کی تائید و توکید کے لئے کوشاں تھا۔

ایرانی دل و دماغ کے لئے وحدت صرف و محض اور قدرت کامل کے تصورات اطمینان بخش ثابت نہ ہو سکتے تھے۔ ادھر شیعیت برسر اقتدار آنا شروع ہوئی۔ امام چاہے پوشیدہ ہو یا ظاہر ایرانیوں کے لئے محبوب و دلچسپ چیز بن گئی مسٹر اتھفیلڈ تو خیال کرتے ہیں کہ اماموں کا عقیدہ بھی نیو فلاطونی فلسفے سے ماخوذ ہے۔ امام خدائے قہار جبار کے احکام کی تشریح و توضیح کرتے تھے۔ حضرت علی کی شخصیت کو اہمیت حاصل ہونی شروع ہوئی تا اینکہ بعض حلقوں میں وہ "خدا" مانے جانے لگے

اس نئے مذہب کے اصول ایران کے سوا اور کہیں کھلم کھلا بیان نہیں کئے جاتے تھے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مذہب عالم اسلام کو عام طور پر متاثر کر رہا تھا۔

آہستہ آہستہ خود خلفائے عباسیہ مذہب کے معاملات میں عقل و تفکر سے کام لینے لگ گئے۔ خلیفہ منصور نے نجوم کی توسیع و اشاعت میں بہت حصہ لیا۔ اور بہت جلد اس کے

گروعلمائے عصر کا ایک گروہ جمع ہو گیا جو ادب قانون طب اور نجوم میں ماہر تھے۔ اس وقت درباری لباس بھی ایرانی ہو گیا۔ مامون اور ہارون کے عہد میں یونان کی اہم کتابوں کا ترجمہ ہو گیا۔

ایرانی تصوف ایک طرف تو یہ اختلافات تھے۔ اور دوسری طرف ایرانی تصوف آہستہ آہستہ ارتقا پا رہا تھا۔ اسلام کے پہلے متصوفین کسی خاص اصول کے پابند نہ تھے۔ بلکہ وجد و حال کی کیفیات سے متاثر ہو کر خدا کا مشاہدہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تاہم ان میں بھی وحدت وجود کا اثر پایا جاتا تھا۔ یہ بھی احساس کرتے تھے کہ کائنات کے مناظر و مظاہر ایک ہی مہر حقیقت کی شعاعیں ہیں۔ جب دسویں صدی میں منصور حلاج کو "انا الحق" کہنے پر پھانسی ہوئی ہے۔ اس وقت تصوف کے اصول تقریباً مکمل ہو چکے تھے۔ گیارہویں صدی میں اسکی حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ اور ایک باضابطہ نظام عمل تیار ہو گیا۔ خدا تک پہنچنے کا راستہ "محبت" تھا۔ اور مبتدی کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس راستے کے چاروں مرحلوں کو طے کرے۔

یہ لوگ جس ازلی و ابدی نور کو دیکھنا چاہتے تھے وہ ایک شمع تھی۔ جس کے شعاعوں سے دنیا کے مختلف اجسام قائم ہیں ان کے نزدیک عقل کو خدائے قدوس کے دامن جلال تک رسائی نہ تھی۔ نہ حواس کو اس کا کوئی احساس ہو سکتا تھا۔ صرف محبت کامل سے اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا تھا۔ تمام ہوا و ہوس کو مٹا کر انسان ذات سرمدی میں فنا ہو جاتا تھا۔ اور اس کے بعد بقائے دوام کا رتبہ آتا تھا۔ انسانی محبت کے ذریعے۔ فسق و فجور کے ذریعے عشق حقیقی حاصل ہو سکتا تھا۔ اور انسان کی خوبصورتی خدائے تعالیٰ کے جمال کا آئینہ تھی۔ یہی تعلیم ہے جو ابوسعید کی رباعیات میں پائی جاتی ہے۔ اور یہ مسلم ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اشعار کے ذریعے تصوف کے تمام نکات کو بھی ادا کر دیا۔ ایرانیوں کے یاس آشنا ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ تصوف میں بھی یاس و حزن کے عناصر مل گئے ہیں صوفی دنیا کی تمام اشیا کو ناکارہ۔ عارضی اور ہیچ تصور کرتے ہیں۔ اور دنیا کی کسی شے سے دلبستگی ہو جانا ایک لعنت سمجھتے ہیں۔

عمر خیام سے بہت پہلے رودکی کے معاصر شہید بلخی کے کلام سے حزن و ملال کے اشارات پائے جاتے ہیں۔

اہلِ ایران کی خوش مزاجی تعجب کی بات ہے کہ اس فطری حزن و ملال کے ساتھ ساتھ اہلِ ایران خوش طبع زندہ دل اور عیش و عشرت کے پرستار بھی واقع ہوئے ہیں۔ شاید یہ عادات اس ردعمل کا نتیجہ ہیں جو موج حیات افسردگی اور انقباض کے خلاف پیدا کرتی ہے۔ شروع سے ایرانی شراب و سرور کے شائق رہے ہیں۔ اور غالب نے شاید انہیں کے متعلق کہا تھا کہ۔

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار
ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم مباشی کہ فریبند
حق را بسجودے و نبی را بدرودے

میرا خیال ہے کہ اہل ایران کی زندگیوں کی تفسیر ہی ایک مصرع ہے کہ "ساقی و مغنی و شرابے و سرودے" ظاہر ہے کہ اسلام کی تعلیمات کے بعد شراب چھپ کر پی جاتی ہوگی۔ مگر اس موضوع پر ایرانی حکما کے خیالات پڑھنے کے قابل ہیں۔

دسویں صدی کا مشہور طبیب ابوجعفر رقمطراز ہے۔

"حزن و ملال کو رفع کرنے کا بہترین ذریعہ شراب نوشی ہے۔ مگر شراب نوشی اس طرح کی ہو کہ حریفان رنگین طبع کا مجمع ہو۔ سبزہ زار ہو۔ آب رواں کی بہار نظارہ فروز ہو۔ مسرت کا سامان پیدا ہو رہا ہو۔ شعر خوانی ہو رہی ہو۔ اور گلرخ نازنیں جام شراب ہاتھ میں لئے ہوئے کھڑی ہوں۔"

کونٹ گوبلینو کا خیال ہے کہ اسی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ وسط ایشیا میں شراب ابتک ہر نفسانی مرض کی دوا تصور کیجاتی ہے۔ یہ ایک نہایت اہم اور عبرتناک واقعہ ہے کہ متصوفین و عارفین کی اکثر اصطلاحیں جو اشعار میں برتی جاتی ہیں۔ شراب اور اس کے لوازمات سے لی گئی ہیں۔

عارف باللہ کے لئے ساقی۔ دل صاف کے لئے جام و ساغر۔ پیر کے لئے پیر مغاں۔ اور سالک۔ عشق حقیقی کے لئے مے خوشگوار اور شراب لعل۔ اسقدر مشہور ہیں کہ کسی تفصیلی بیان کی حاجت محسوس نہیں ہوتی۔

اہلِ ایران کی قومیت سیاسی واقعات کے اقتضا سے ایرانی فلسفہ حیات کو زیادہ فروغ نصیب ہوا ہے۔ خیام کے عہد میں خلافت عباسیہ اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہی تھی۔ ان دنوں ایران میں درحقیقت کوئی

عربی اثر باقی نہیں تھا - جہاں تک واقعات سے اندازہ کرنے کی جرأت کی جا سکتی ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی عام طور پر عربی اقتدار توڑنے کی کوششوں میں مصروف تھے - اہل فارس نے بودیہ شاہزادوں کی زیر قیادت ایک زبردست بغاوت کا اظہار کیا - اور انہیں کے زیر اثر فارس عراق و کرمان رہے - ہمدان اور اصفہان میں منقسم ہو گیا - انہیں شاہزادوں کے زیر اثر ایرانی زبان نے ترقی کی طرف پہلا قدم بڑھایا - پرانی پہلوی زبان عرب حملے کے بعد فنا ہو چکی تھی - مگر ان شہزادوں کے زیر اثر یہی زبان موجودہ فارسی زبان کی صورت میں پھر پیدا ہو گئی - یہی زبان ہے جو خفیف سے تغیرات کے ساتھ (جن سے دوسری زبان کے الفاظ کی آمیزش ایک اہم تغیر ہے) اب تک ایران اور وسط ایشیا کے بازاروں میں سنائی دیتی ہے -

یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے کہ ایران کی شاعری (پہلوی زبان سے قطع نظر) کس عہد میں شروع ہوئی - اور سب سے پہلے کس نے شعر کہے مگر یہ مسلم ہے کہ حقیقی معانی میں فارسی شاعری کا احیا سامانی عہد میں ہوا ہے - بہر نوع محمود غزنوی کے دور تک اس زبان کی شاعری اتنی ارتقا یافتہ ہو چکی تھی کہ فردوسی ایران کے قومی روایات کا ایک دلفروز مرقع تیار کر سکے -

ان اعتبارات سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ عمر خیام کی پیدائش کے وقت ایرانی قومیت کی روح پوری طرح بیدار ہو چکی تھی -

اس میں کوئی شک نہیں کہ خیام کے عہد میں ایران آل سلجوق (جو ایران کے لئے یقیناً اجنبی تھے) کے ماتحت ہونے کے باعث اپنی قومیت و وطنیت کا ایسا اظہار نہ کر سکتا تھا - جیسا خالص ایرانی بادشاہوں کے زیر سایہ - مگر اس بات کے ساتھ اس امر کا خیال رکھنا چاہئے کہ آل سلجوق کے بادشاہ ایرانی تمدن و تہذیب سے متاثر ہو کر خالص ایرانی رسوم و رواج اختیار کر چکے تھے - اور نظام الملک جیسے بیدار مغز ایرانی وزیر کے ہوتے ہوئے انہیں اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ وہ خود بنفس نفیس ایرانیوں کے جذبات کی پاسداری کے ذرائع پیدا کریں -

ادھیڑ عمر تک خیام نے ایک ایسی فضا میں زندگی بسر کی ہے - جو امن و امان اور فروغ فلسفہ و عقل کے اعتبار سے بے فکر تھی - بوعلی سینا " اخوان الصفا " حجت الاسلام امام غزالی تمام اس عہد بابرکت کے روشن ستارے ہیں - مگر گیارہویں صدی کے آخری دنوں میں فضا اس طرح بدل گئی گویا پہلی تمام باتیں افسانہ تھیں؟ یہ دن گیارہویں صدی کے پہلے دنوں سے اسی قدر دور تھے جس قدر جنگ فرنگ کے پہلے کے دن جنگ کے بعد کے دنوں سے ہو سکتے ہیں -

۱۰۹۲ء میں نظام الملک قتل ہوا - اور کچھ عرصہ بعد ملک شاہ بھی فوت ہو گیا - اس کے بعد بدامنی اور فساد کا عہد شروع ہوا - خراسان اور عراق علیحدہ ہو گئے - سیریا اور کرمان سلطنت کے اجزا نہ رہے - ملک شاہ کے بعد متحرک تصاویر کی طرح ایران کے پردے پر بہت سی صورتیں آ آ کر غائب ہو جاتی ہیں - محمود - طغطش محمود ملک شاہ ثانی تمام اپنا اپنا پارٹ کر کے رخصت ہو جاتے ہیں -

مذہبی رد عمل بھی اپنے عروج پر ہے - اسماعیلیوں نے نظام الملک کو قتل کر کے اپنے تاج کمال میں ایک اور پر افتخار لگا لیا ہے فدائیوں کے خنجر کے ہر وار کے بعد ان کے گروہ میں لوگ جوق درجوق داخل ہو رہے ہیں - خیام کی زندگی کے آخری ۳۰ سال اس رد عمل اس اضطراب و فساد کے درمیان گزر رہے ہیں -

وہ اسلامی سلطنت جس کی مٹھی میں خزاین و دفاین کائنات کی کنجیاں موجود تھیں - پارہ پارہ ہو رہی تھی -

چالایا اور سریا کے لاانتہا خزائن اُسے مالا مال کر چکے تھے - یونان کا فلسفہ اس کی قوت عمل و تفکر میں ایک گرانقدر اضافہ کر چکا تھا - روم کی شوکت و عظمت اس کے قدموں کے نیچے پامال ہو چکی تھی اور ان تمام پامالیوں پر اسلامی سلطنت کا جو قصر رفیع تیار ہوا تھا وہ تھوڑے ہی دنوں میں زمین پر آ رہا -

خیام کو کیا معلوم تھا کہ یہ تمام بلائیں ایک ہیبتناک اور مہیب بلا کا پیش خیمہ ہیں جس کے طوفان بے پناہ کے سامنے دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں سرنگوں ہو جائیں گی - اور قہار و جبار بادشاہوں کے دل دور دراز ممالک میں آشوب جہاں کے خوف سے کانپنے لگیں گے اسے کیا احساس ہو سکتا تھا کہ یہ تمام مصیبتیں اس قیامت کبرا کا مقدمہ ہیں جو ایران و بغداد پر شیاطین کے ایک گروہ کو مسلط کر دیگی - حافظ نے وہ قیامت کے نمونے دیکھے ہیں - اور پھر بھی اپنے اشعار کی لطافت و نزاکت میں ایک مٹی ہوئی شوکت و رفعت کے گیت گائے ہیں - مگر خیام اپنے عہد کا آئینہ دار - خیام ان تمام باتوں سے بے خبر تھا - اس کا کلام فاضلانہ تشکک اور تمسخرانہ لطافت سے لبریز ہے -

(باقی آئندہ)

عابد

شمعِ یقین

اگرچہ غنچۂ غم بے نسیم ہو جائے
اگرچہ بادِ الم، تیز گام ہو جائے
اگرچہ، صبحِ تمنّا کی شام ہو جائے
مگر بجھے گی نہ شمعِ یقینِ عشق کبھی!

(۲)

بہار میرے گلستاں میں گلفشار نہ ہو!
سحاب میرے نشیمن پہ سایہ بار نہ ہو!
انہیں بھی میری محبت کا اعتبار نہ ہو!
مگر بجھے گی نہ شمعِ یقینِ عشق کبھی!

(۳)

سیاہی شبِ فرقت کو ہو غرورِ نمود!
وسیع ہوں مری غمناک ساعتوں کی حدود!
طلوعِ صبحِ مسرت کی راہ ہو مسدود!
مگر بجھے گی نہ شمعِ یقینِ عشق کبھی!

غمِ قفس بھی رہے رنجِ آشیاں بھی رہے
عدو زمین بھی رہے دشمن آسماں بھی رہے
وہ بیوفا مری الفت سے بدگماں بھی رہے
مگر بجھے گی نہ شمعِ یقینِ عشق کبھی!

(۵)

ہر آرزو مری، صرف تحسّرات بھی ہو!
ہر التجا مری، محرومِ التفات بھی ہو!
تباہ، میری محبت کی کائنات بھی ہو!
مگر بجھے گی نہ شمعِ یقینِ عشق کبھی!

(۶)

ہلاکِ زہرِ خموشیٔ ہمصفیر رہوں
گروں تو صرفِ غمِ طعنِ دستگیر رہوں
غرض، طلسمِ محالات میں اسیر رہوں
مگر بجھے گی نہ شمعِ یقینِ عشق کبھی!

[illegible]

[illegible]

ناچیز ذرّہ

(فرینک ہیویرا)

ہیڈ ماسٹر اپنے دفتر کی چکدار کرسی پر بیٹھ گیا۔ کہنیاں میز پر ٹیک دیں۔ اور سونی بنچوں کی مسلسل قطار کو دیکھتے ہوئے کسی خیال میں محو ہو گیا۔ ٹرم ابھی ابھی ختم ہوا تھا۔ موسلا دھار بارش کے باوجود گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ ابتک سنائی دے رہی تھی۔ ہیڈ ماسٹر خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے یہ آواز بند ہو گئی۔ اور اب کسی لڑکے کی خالی ڈیسک کے اندر سے ایک چوہے کے کترنے کی دبی ہوئی آواز کے علاوہ مینہ کا لگاتار شور ہر آواز پر حاوی تھا۔

تاریکی بڑھ رہی تھی۔ تیز ہونے والی ہوا کی سرسراہٹ بارش کی بیبب آواز میں اضافہ کر رہی تھی۔ ہیڈ ماسٹر بے چین ہو کر اٹھا۔ اور اس کھڑکی کے نزدیک جا کھڑا ہوا۔ جہاں سے کھیل کے سنسان میدان نظر آ رہے تھے کل ٹرم کے آخری میچ میں سو لڑکوں کے ہنگامے سے۔ اس ہنگامے سے جو کہ صرف پُرجوش۔ کم عمر۔ اور شوخ لڑکوں کا ہی حصہ۔ یہ روندا ہوا میدان تھرا اُٹھا تھا۔ سماعت اور بینائی پر زور ڈالنے سے غالباً کل کا یہ منظر ہیڈ ماسٹر کے پیش نظر ہو گیا۔ ثابت قدم اور تیز رفتار ہاف بیک کا آگے بڑھنا۔ فل بیک کا مین گول کے اندر چھپنا جھپٹی میں پھرتی اور چالاکی کا اظہار اور پھر مسکراتی ہوئی آنکھوں اور کشادہ سینہ والے ایڈسنڈس کی فتح۔ سب باتیں یکے بعد دیگرے اس کی نظروں میں پھر گئیں۔ گرایڈسنڈس سینڈہرسٹ کے داخلہ کا خیال دل میں لئے ہوئے روانہ ہو چکا تھا۔ اور لڑکے بھی رخصت ہو چکے تھے۔ کھیل کے میدانوں میں سناٹا تھا۔ جیت کی خوشی میں لڑکوں کی تالیوں کی آواز بھی بند ہو چکی تھی۔

اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے ہیڈ ماسٹر اپنی جگہ واپس آیا۔ کرسی اس کے بوجھ سے چرچرانے لگی۔

"ایک اور ٹرم ختم ہو گیا" اس نے پرچھائیوں کو مخاطب کر کے دبے الفاظ میں کہا "سب کے سب چلد ئیے۔ اور اپنے مدرسہ کو بھلا دیں گے۔ زندگی کی جنگ میں حصہ لیکر وہ دنیا سے انعام حاصل کریں گے۔ مگر کبھی ان کو اس ضعیف انسان کا بھی خیال آئیگا۔ جو ان سے محبت کرتا ہے؟"

وہ لوگ جو آج نگاہوں سے اوجھل تھے اور اس کی ذرا سی بات پر کانپ اُٹھا کرتے تھے۔ بڈھے ریٹی کے چہرہ کے تغیرات کو دیکھکر متعجب ہوتے۔

"یہاں رہنے سے کیا حاصل؟" اس نے نہایت تاسف کے ساتھ اپنے دل سے سوال کیا۔ "کیا آئندہ آنے والی نسلوں کے واسطے اپنے کو وقف کر دینا کچھ فائدہ مند ہے؟ اسکولی دنیا سے کنارہ کش ہو جانا اور اس اکھاڑے کو چھوڑ کر زندگی کے باقی ایام آرام سے بسر کرنا کیا زیادہ بہتر نہیں ہے؟ ان نوعمر لڑکوں کو بھلا میری کیا پرواہ۔ میں ان کا ہیڈ ماسٹر ہوں اور ان کے نزدیک ان کا دشمن۔ ایسا دشمن کہ جس کی تیوری پر بل پڑنے سے تمام مدرسہ میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ زیادہ وقت یہاں پر صرف کرنا بیکار ہے۔

میں نے ان کے ذہن نشین کر دیا کہ وہ میرے اپنے بچوں کے مثل ہیں امکان بھر ان کو بلند حوصلگی اور اخلاق کی ترغیب دی۔ میں نے ان کو اس مقام پر لا کر کھڑا کرنے کی کوشش کی کہ جس جگہ سے وہ دنیا میں شہرت کی گھوڑ دوڑ میں ہر ممکن طریقہ سے کامیاب رہیں۔ مگر ان کو میری کیا پڑی ہے؟ ان کے والدین اپنا روپیہ اسی واسطے صرف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ بھی "بڈھے ریٹی" کے نصاب کا ایک جزو ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ میری اُلفت روپیہ کی وجہ سے ہے۔ مگر یہ غلط ہے۔ میں اس سے قطعی بَرّا ہوں۔ کیا میرے واسطے یہ کافی نہیں کہ میرے سیکڑوں طلباء ایسے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں کہ دنیا ان پر رشک کرتی ہے"

تاریکی کے باوجود ایک گوشہ میں اس کو ایک ڈیسک نظر پڑی۔ وہ بیقرار ہو کر اس کی طرف بڑھا۔ اور اپنی لاغر لانبی انگلیاں اس پر پھیرنے لگا۔ کچھ کھدے ہوئے الفاظ کو محسوس کر کے اس کے چہرہ پر خفیف سی مسکراہٹ کھیلتی ہوئی نظر آئی۔

"اے۔ ایچ" اس نے آہستہ سے کہا "آرتھر ہارٹن۔ میرا بہترین شاگرد وہ آج ہی مجلسِ شوریٰ کا رکن بنایا گیا ہے۔ میں نے اس لڑکے کیلئے کیا کچھ نہیں کیا۔ میرا ادنیٰ اس کے نزدیک وہی اثر رکھتا ہے جس طرح سے سمندِ تیز رفتار کے لئے ہنٹر کا اشارہ کافی ہوتا ہے۔ اس کی رگ رگ سے علمیت کا اظہار ہوتا تھا۔ اب بھی میں اس کو سرگرمی اور جانفشانی کے ساتھ مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے دیکھ سکتا ہوں۔ آرتھر ہارٹن میرا بہترین شاگرد تھا۔ اور وہ بھی مجھے بھول گیا۔"

ہارٹن غالباً اس کو فراموش کر چکا تھا۔ ڈاکٹر ریٹی کلف ٹرم ختم ہونے

سے ایک ہفتہ قبل لندن گیا تھا۔ اور ویسٹ منسٹر کے مقابل ٹہلتے ہوئے اس نے ایسے نامَدِرو شناس چہروں کو دیکھا تھا۔ یہ سب اس کے شاگرد رہ چکے تھے۔ خدا ان کا بھلا کرے۔ مگر سب کے سب سامنے سے بغیر اسکو پہچانے ہوئے گذرتے چلے جاتے تھے۔ اور جبکہ ہارٹن۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہی جسکی نسبت سنا جاتا ہے کہ آئندہ سالگرہ کے موقع پر لارڈ بنا دیا جائیگا۔ ۔ ۔ ۔ اس کے مقابل سے ایک نہایت معزز شخص سے گفتگو کرتا ہوا گذرا تو ہیڈ ماسٹر بے اختیارانہ اسکی تقریر پر جو ہنوز تمام ملک میں گونج رہی تھی مبارکباد دینے کے واسطے بڑھا۔

مگر ہارٹن اس کی جانب دوبارہ نگاہ ڈالے ہوئے بغیر سامنے سے گذر گیا یہ مدبر آج اس شخص کو فراموش کر چکا تھا جو اگر باپ کی طرح درشت مزاج واقع ہوا تھا تو بڑے بھائی کی طرح دل میں محبت بھی کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُن کے باطن کو قابل رشک، اور تندرستی اور اخلاق میں ان کو فرد بنادے، تاکہ زندگی کی بازیگاہ میں وہ ہر طرح سے کامیاب ثابت ہوسکیں۔

اس کا ہر ایک شاگرد۔ ۔ ۔ نہیں۔ ایک کے علاوہ اور سب کامیاب تھے۔ ہنس مکھ مگر کند ذہن ڈمی گرانٹ اپنی شرارتوں پر ہر ہفتہ مار کھاتا تھا۔

اس کا نام آتے ہی ہیڈ ماسٹر نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کے پاک اوصاف اعمالنامے پر ڈمی گرانٹ ہی ایک بدنما دھبہ تھا۔ وہ داخلہ سینڈہرسٹ کے امتحان میں بری طرح فیل ہوا۔ کوئی بات نہ تھی جو اُٹھا رکھی گئی ہو۔

اس چمن زارِ علمیت کے نگراں نے اس مرجھائے ہوئے پودہ کی رکھوالی غالباً دوسرے پھل لانے والے درختوں سے زیادہ کی تھی۔ مگر بے سود۔

آرتھر ہارٹن اور ڈمی گرانٹ اس کے بہترین اور بدترین شاگرد تھے۔

ان دونوں کے درمیان ہزاروں ہی اور طلبا ہوں گے۔ بڑے بڑے مدبر قابل وکیل بین الاقوامی شہرت رکھنے والے مصنف۔ صناع۔ بہادر سپاہی اور مشہور سیاح۔ غرضیکہ ہر قسم کے لوگ تھے۔ مارکہم نے ایک ناول تصنیف کیا اور اپنی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ مگر وہ بھی اُس چشمہ لگانے والے ضعیف اُستاد کو اپنے دل سے بھلا چکا تھا جس نے پہلی مرتبہ اس کو انگریزی ادب کی گوناگوں باریکیوں سے آشنا کیا۔

کاش مارکہم نے مجھکو اپنی تصنیف کی ایک کاپی۔ ۔ ۔ ایک دستخط شدہ کاپی ہی بھیجدی ہوتی۔ معلوم تو ہو جاتا کہ اس کے دل میں میری یاد ابتک باقی ہے۔ مگر نہیں وہ بھی دوسروں کی طرح مجھکو بھول چکا تھا"۔

ڈاکٹر ڈٹی کلف سرنگوں بیٹھا تھا۔ ٹمیس پر ٹیس اُٹھتی تھی۔ ارد گرد اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس کی کمزور آنکھوں کے سامنے سے مسکراتے ہوئے لڑکے قطار در قطار بینچوں سے اُٹھ اُٹھ کر جو سیاہی کے بدنما دھبوں سے آلودہ تھیں، دنیوی کامیابی کی محراب کے نیچے سے گذر رہے تھے۔ ہر ایک مشکل اور ہر ایک مصیبت ان کی ہمت اور عزم کے سامنے ماند ہو جاتی تھی۔

سامنے کی سڑک پر پیتل کی تختی کے نیچے جو ایک اولڈ بائے کی بہادرموت کی یادگار تھی۔ پرسیول بیٹھا کرتا تھا۔ اور اُس کی نگاہوں سے یہ الفاظ "اس نے انگلستان کے لئے اپنی جان دی" ایک لمحہ کے واسطے بھی اوجھل نہیں ہوتے تھے۔ پرسیول نے کوئینز و کے مقام پر توپوں کو غنیم کے ہاتھ سے محفوظ رکھنے کے غضبناک حملہ میں وکٹوریہ کراس حاصل کیا تھا۔ غریب اس اعزاز کو پانے سے قبل ہی موت سے ہم آغوش ہو چکا تھا۔ مگر اس نے اپنے ہیرو کی طرح برطانیہ کی حمایت میں جان دی۔

اس کی بہادری کے بیج اسی وقت بوئے گئے ہوں گے جبکہ میں سیمر کے کارنامے اس کو سنایا کرتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر نے آہستہ سے کہا "میں نے اس سے کہا تھا کہ برطانیہ کے واسطے اپنی جان دینا ہر شخص کا نصب العین ہونا چاہیئے"۔ ۔ ۔ ۔ مگر کیا اس وقت جبکہ دنیا اس کی بہادری کے کارناموں سے گونج رہی تھی کسی کو اس کا بھی خیال آیا؟

مجھے خوش ہونا چاہیئے۔ ۔ ۔ اور مجھے خوشی ہے کہ یہ سب یوں کامیاب ہوئے۔ کاش اُنہوں نے ایک لفظ اپنی زبان سے نکالدیا ہوتا کہ وہ اپنے محبت کرنے والے ضعیف اُستاد کو نہیں بھولے ہیں۔ مگر کسی نے بھی تو ایسا نہ کیا۔ غالباً اُن کو فرصت نہ ہوگی، یا شاید ان میں لڑکپن کی لاپروائی ابتک موجود ہے۔ ان کو اگر معلوم ہو جائے کہ میں کس دل سے ان کی زندگی کا مطالعہ کرتا ہوں۔ تو وہ مجھے ہمیشہ یاد رکھیں۔

"یہ ضعیفی کا غلبہ ہے کہ اس طرح کے خیالات میرے دماغ میں ہجوم کر رہے ہیں۔ مگر اس سے بچکر بھی نہیں جا سکتا۔ اور یہ میرے دل پر ٹیس لگاتے ہیں۔ میرے بچو! کاش تم کو معلوم ہوتا کہ تمہاری بہبودی اور خود تم میرے واسطے کیا معنی رکھتے ہو"!

جھریاں پڑے ہوئے گالوں پر آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔

"میں اب تھک گیا ہوں"۔ اس نے اپنے دل کو تسکین دیتے ہوئے کہا اب عنان حکومت کسی دوسرے کے ہاتھ میں دیدینی چاہیئے۔ ہاں میں اب دست بردار ہو جاؤں گا۔ سیرز تسکلم میں اپنے مکان کو جا کر آباد کرلیگا۔ اور دوسرے شمشیر بکف نوجوانوں کو میدان کارزار میں لڑتا ہوا چھوڑ دے گا۔ ایکدن آخر یہی ہونا ہے۔

"میں نے اس جد وجہد میں اپنے جگر کو پانی کر دیا۔ اور میں کامیاب رہا۔ دنیا اس کو معلوم کر سکتی ہے۔ مگر فہرست اب تقریباً پُر ہو چکی ہے سپاہی رخصت ہوگئے اور یہ آخری سردار بھی اسی طرح ایک روز اس معرکہ سے اوجھل ہو جائیگا"۔ اس کے

الفاظ زمانۂ وسطیٰ کے استعارات سے ہم آہنگ تھے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک حسرت ناک مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

میں اب بڈھا ہو گیا۔ اور میرے خیالات بھی دقیانوسی ہو گئے۔ یہ اب فیشن سے خارج ہیں۔ ان باتوں کا اتنا اثر قبول کرنا حماقت ہے۔ میری محنت ہی میرا انعام ہے۔ ۔ ۔ ۔ بیس برس قبل میرا یہی خیال تھا۔ مگر اب ۔ ۔ ۔ ۔ کاش ان میں سے کوئی بھی اس قرضہ کے بار کو محسوس کر سکتا!

وہ یقیناً روز بروز ضعیف ہوتا جا رہا تھا۔ اسکول کے اس کمرہ میں خاموشی طاری تھی۔ اب تنہائی نے اس کے دل و دماغ پر غلبہ کرنا شروع کیا وہ اس تنہائی کو اسی وقت سے محسوس کرنے لگا تھا۔ جبکہ اس کی پیاری بیوی اس کی شریک زندگی ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو گئی۔ مگر جو خیالات کہ آج اس کے دماغ میں جاگزیں تھے۔ اور جس طرح وہ اپنی تنہائی کو آج محسوس کر رہا تھا۔ اس سے قبل کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔

کمرہ میں سردی پڑ رہی تھی۔ اور وہ کانپ رہا تھا۔ باہر غلام گردش میں روشنی اور گرمی تھی۔ کچھ دیر بعد تمام اُستاد اپنے بڈھے جرنل سے رخصت ہونے سے قبل ڈنر پر جمع ہوں گے۔

میں خود اُن کے پاس جاتا ہوں۔ موقع اچھا ہے کہ اپنے سبکدوش ہونے کے متعلق ان سے گفتگو کر دوں۔ اُن کو تعجب ضرور ہوگا۔ "بڈھے ریٹی" کے اس قدر جلد مستعفی ہونے کی ان کو اُمید نہیں تھی۔ وہ خوش ہوں گے۔ مگر چہرہ سے اس کا اظہار نہ ہوگا۔ کارن فورتھ میری جگہ مقرر ہوگا۔ اور وہ کامیاب رہے گا۔ مگر اس میں ہمدردی کی کمی ہے۔ کند ذہن لڑکے اس کے ہر وقت جھڑکنے سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ میری ضعیف آنکھوں کی بینائی کم ہو گئی ہے۔ مگر اتنی بھی نہیں کہ اس کے اس طرز عمل کو نہ دیکھ سکوں۔

اگر میں استقلال سے کام نہ لیتا تو خدا معلوم گمرسے، فوربس، اور سنکر اسمتھ کا آج کیا حشر ہوتا۔ تینوں کند ذہن تھے۔ ایک بھیڑ کے بچہ کے مانند کہ جس کے ارد گرد بھیڑیوں کا مجمع ہو۔ مگر اب ان کو دیکھو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان میں سے ہر ایک کامیاب ہے۔ ۔ ۔ ۔ بجز ایک گرانٹ کے مجھکو اسے گمرکتے ہوئے بھی رحم آتا تھا۔ اس کی روح تادیب کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ دوسروں کی طرح سلیم الطبع نہیں واقع ہوا تھا۔ ممکن ہے اگر میں نے اس پر زیادہ وقت صرف کیا ہوتا۔ اگر کچھ اور صبر سے کام لیا ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر کیا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سب ہیچ! ۔ ۔ ۔ وہ بھی آخر کامیابی کے زینے پر چڑھکر مجھے بھول جاتا!"

اس نے اپنے سفید گلے کے درمیان سے اس سیاہ بھیڑ کا خیال دور کرنے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔

غالباً یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ میں نے گرانٹ کے ساتھ استقلال سے کام نہیں لیا۔ غریب لڑکا خدا معلوم اب کہاں ہوگا۔ اور کیا آوارگی کرتا ہوگا۔ جہاز پر جاتے وقت اس کے باپ نے اس کو ناخلف کر دیا تھا۔ بڈھا گرانٹ، اگرچہ میں اس کے دل کو نرم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ حد درجہ سخت گیر تھا۔ اور اسی طرح اس کا لڑکا بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ غریب گرانٹ!!

بڈھے ہیڈ ماسٹر کی انگلیاں اُٹھتے وقت پھر انھیں کندہ الفاظ پر پڑیں۔ اور اس کا دل اپنے بہترین شاگرد کے خیالات سے پُر ہو گیا۔

" کاش! صرف ہارٹن ہی نے مجھکو یاد کر لیا ہوتا۔ میں تو سمجھا تھا کہ وہ مجھے ہرگز نہ بھولیگا۔"

اسکی انگلیاں ان بھونڈی طرح سے کھدے ہوئے الفاظ پر چکر لگا رہی تھیں اور اسکی آنکھیں تاریکی میں اس طرح دیکھ رہی تھیں گویا خوب دن چڑھا ہوا۔

"گرانٹ کی ڈسک اُس جگہ پر تھی۔ اچھا ہوا میں نے اس کو برباد نہ ہونے دیا۔" اس نے جیب میں دیاسلائی کی ڈبیہ تلاش کرتے ہوئے کہا۔ دیاسلائی سُلگی اس کے جلنے سے کمرہ کے تاریک گوشے روشن ہو گئے۔ ہیڈ ماسٹر نہایت اطمینان سے اس طرف بڑھا۔ جہاں ایک ٹوٹی ہوئی تین پایہ کی میز کھڑی ہوئی تھی۔ لکڑی پر ہر طرف سیاہی کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ اور آدھے سے زائد ڈھکنا بھی "جی" سے بھرا ہوا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ ڈاکٹر ریٹی کلف کی تصویر کارٹون کی شکل میں ناک پر انگلی رکھے ہوئے کھدی ہوئی تھی۔

"اسے جلا دینا مناسب ہے۔ یہ دوسرے لڑکوں کے ادب اور اخلاق کے منافی ہے۔"

دیاسلائی سے اس کا ہاتھ جل رہا تھا۔ اس نے ایک آہ کے ساتھ اسکو گرا دیا۔

"میں اپنے کمرہ میں خاموشی کے ساتھ اور دن کا انتظار کروں گا۔ تاکہ اپنے خیالات کو اس اعلان کے واسطے مجتمع کر سکوں، ۴۵ برس کے بعد آج اس کام کو ترک کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ کاش ان تمام کامیاب طلبا میں سے ایک صرف ہارٹن ہی اپنی زبان سے شکریہ کا ایک حرف ادا کر دیتا! مگر یہ کیوں ہونے لگا تھا۔" اس نے ایک اور دیاسلائی جلائی۔ اور اپنی کمزور آنکھوں سے کمرہ کے چاروں طرف غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ پریشانی کی تصویر تھا۔ اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے اپنا داہنا ہاتھ ایک شانِ استغنا کے ساتھ اوپر اُٹھا کر کہا۔ "اچھا خدا حافظ!" اور سر کو بلند کئے ہوئے کمرہ سے باہر نکل گیا۔

آسیب آلود اسکول کے کمرہ سے اپنے گرم اور آرام دہ حجرہ میں آن کر اس نے ایک عجیب تغیر محسوس کیا۔ ایک گدے دار کرسی پر بیٹھتے ہی اس پر تکان کا غلبہ ہوا۔ آتشدان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اپنے خیالات

کو بے عنان چھوڑ دیا۔ مگر وہ صرف ایک مرکز کی جانب رجوع ہوتے تھے۔ اور وہ یہ کہ اس کے مستعفی ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ اب اس کو مدرسہ کی دنیا کو چھوڑ دینا چاہئے اور ایسے مقام پر رہنا چاہئے جہاں کسی لڑکے کی آواز بھی ان تلخ تجربوں کی یاد نہ دلا سکے۔ اب سے کچھ ہی قبل وہ اسکا متمنی تھا کہ زمانہ ملازمت ہی میں اسکی موت واقع ہو۔ مگر آج ہر چیز میں تغیر تھا۔ اسکی تسکین کو ایک حرف کی ضرورت تھی۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے اپنی الوداعی تقریر کی تیاری شروع کر دی۔

دوسرے جملہ ہی پر پہنچا تھا کہ گھنٹی کی آواز نے طیار ہو جانیکی اطلاع دی وہ اٹھا مگر پھر بیٹھ گیا

"اُف! یہ سخت دشوار ہے۔ اس نے با آواز بلند کہا۔ مگر میں رو بھی تو نہیں سکتا۔ مجھ میں اتنی قوت نہیں ہے ایک ٹرم بھی یہاں رہا تو ہر لڑکے کو ناشکر گذار سمجھکر اس سے لاپروائی اور سختی کا برتاؤ شروع کر دوں گا۔ اور یہ لڑکوں ہی کے واسطے نہیں میرے حق میں بھی برا ہوگا۔ سب کچھ ختم ہو چکا۔ اب عزت کے ساتھ رخصت ہونا بہتر ہے"

کسی نے دروازے پر دستک دی۔ مدرسہ کا پرانا چوکیدار پیٹر اندر داخل ہوا۔ اور ٹوپی اُتار کر کھڑا ہو گیا: "میں لڑکوں کو رخصت کر کے آ رہا ہوں۔ شہر سے گذر رہا تھا اور آج رات ڈاک تقسیم نہ ہوگی۔ اس لئے ڈاکخانہ سے ڈاک بھی لیتا آیا ہوں"۔ یہ کہکر اس نے ایک معمولی سا لفافہ آگے بڑھایا اور ہیڈ ماسٹر کے ہاتھ میں دیدیا۔

اس نے لفافہ چوکیدار کے ہاتھ سے لیکر میز پر ڈالدیا۔ مگر ایک لمحہ بعد وہ پھر اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں بھی کس قدر وہمی ہوں جو یہ خیال کر رہا ہوں کہ اس خط میں وہی ہوگا۔ جسکی میرے قلب کو ضرورت ہے۔ ممکن ہے کچھ ہو۔ بہر حال دیکھنا چاہئے"۔

اس نے شروع کے الفاظ لاپروائی سے پڑھے اور پھر اپنے چشمہ کو تلاش کرنے لگا۔ ان پر کہر جما ہوا تھا اطمینان سے شیشوں کو صاف کیا مگر پھر بھی حروف صاف نظر نہیں آ رہے تھے

"جناب عالی آپ مجھکو بھول چکے ہوں گے۔ مگر میرے دل میں آپکی یاد اب تک باقی ہے ایک عرصہ ہوا جبکہ میں اور آپ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر خوش ہوئے تھے۔ میں اسکول چھوڑنے پر مسرور تھا۔ اور آپ مجھکو اپنی نگاہوں سے دور کر کے خوش ہوتے ہوں گے۔ مگر جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا تھا مجھے آپ کے اُمید بندھا دینے والے الفاظ اور آپ کا گھنٹوں بیٹھکر مجھکو نصیحت کرنا یاد آتا تھا۔ اور مجھکو محسوس ہوتا تھا کہ میں نے کیا کچھ نہیں کھو دیا۔

جس وقت یہ خیالات میرے دماغ میں پیدا ہونے شروع ہوئے میں قریب قریب تباہ ہو چکا تھا۔ والد مجھکو گھر سے نکال چکے تھے میرے بہترین دوستوں کو میرا نام تک یاد نہ رہا تھا۔ دنیا میں میرے یار و مددگار باقی نہ رہے تھے۔ مگر آخر کار آپ کی باتیں مجھکو یاد آئیں۔ اور مجھکو ہوش آیا۔

لوگ کہتے ہیں کہ مجھ کو شہرت حاصل ہے۔ ایک نامعلوم حصۂ ملک کے اندرونی حالات دریافت کرنے کے واسطے ایک پارٹی روانہ ہونے والی تھی۔ میں نے بھی اپنا نام دیدیا۔ شروع شروع میں ہر شخص نے مجھکو بھیجنے سے انکار کیا۔ مگر سینٹ بورولین کا نام ظاہر کرنا ایک طلسم تھا کہ ہر ایک میری جانب دیکھنے لگا۔ اور آپ کے متعلق سوال کرنے شروع کئے۔

یہ سینٹ بورولین کے طالب علم ہونے کا ہی نتیجہ تھا کہ میں اس پارٹی کا سرگروہ بنایا گیا۔ تین برس تک ہم قدیمی جنگلوں اور تپتے ہوئے ریگستانوں میں خاک چھانتے رہے۔ میرے ہمراہی میری آنکھوں کے سامنے جان دے رہے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ یہ کام مجھسے ہونے کا نہیں۔ مگر ایسے وقت میں آپکا خیال تقویت پہنچاتا تھا کہ آپ کس طرح ہر مصیبت اور ہر مشکل کا اولوالعزمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ مقابلہ کرتے تھے۔ ہم کو غصہ سے بھرے ہوئے حبشیوں سے سابقہ پڑا۔ آپکی نرم مزاجی کا خیال کرتے ہوئے میں نے ان سے محبت سے کام لیا اور اُن کو رام کر لیا جب میرے ساتھی ہمت توڑ دیتے تھے تو میں اُن کو آپ کے الفاظ میں ہمت کی تلقین دیتا تھا۔ اور وہ ایک مرتبہ پھر کوشش کر کے چل کھڑے ہوتے تھے۔ وہ میری تعریف کرتے ہیں اور مجھکو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مگر یہ میری تعریف نہیں آپکی ہے۔ عزت میری نہیں آپ کی ہونی چاہئے۔ جو کچھ بھی میں نے کیا اور اس زندگی میں جس قدر کامیابی کی وہ سب انھیں نصائح کی بدولت ہے جکو آپ صدق دل سے میرے قلب میں پیوست کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ میں اپنے نزدیک حد درجہ ناکارہ طالب علم تھا۔ مگر آپکی نگاہوں میں نہیں۔

صنف نازک میں سے ایک پیاری شخصیت نے مجھ جیسے شخص کے ساتھ رشتہ کرنے میں دریغ نہیں کیا۔ وہ بھی میری اس درخواست میں میرے ساتھ ہیں کہ آپ کچھ عرصہ کے لئے ہمکو اپنی مہمانی کا شرف عطا کریں ہم میں اپنے قرضہ کا بار اُتارنے کی طاقت نہیں، مگر ہاں یہ آپ کو بتا سکتے ہیں کہ ہم کس قدر آپ کے احسان مند ہیں"۔

نام پر نظر ڈالنے کی حاجت نہ تھی۔ ہیڈ ماسٹر کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اور وہ اس کو پڑھنے سے مجبور تھا۔

نہایت پختہ خط میں لکھا ہوا تھا "ٹامس گرانٹ"۔

اسکول کا بدترین طالب علم . . . . اور اس کے دل میں میری یاد ہنوز باقی ہے"۔ ہیڈ ماسٹر نے کہا "میں اب سبکدوش نہیں ہوں گا۔ میں کام کروں گا۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے"۔

جس وقت وہ کھانے کی میز پر بیٹھا تھا اس کا چہرہ مسرت سے بریز تھا آنکھوں سے چشمہ لگانے کے باوجود دھندلا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے کوئی الوداعی تقریر نہیں کی . . . . اس کو اپنی محنت کا ثمرہ مل چکا تھا۔

حفیظ الرحمن

اسرارِ حیات

ہر چیز دُھندھلکے میں ہے نہاں، پُرہول گرج ہے طوفاں کی
ہر سمت دہول سا چھایا ہے تاریک ہے دنیا انساں کی
خوابیدہ ہے روحِ دشت و جبل خاک اُڑتی ہے گلزاروں میں
دم توڑ رہا ہے، اوجِ بشر پستی کے اندھیرے غاروں میں
دھندلا ہے جمالِ شادابی، مجروح جبینِ شادی ہے
ہستی کی فضا آباد نہیں ہے، محرومِ آبادی ہے
ہر زاویۂ انوار میں ہے، سو رنگ کی زحمت ناداں کو
ملتی ہے بدی کی، گہری تاریکی میں راحت انساں کو
ہر کام میں لغزش ہوتی ہے، ہر گام پہ ٹھوکر کھاتا ہے
یہ خاک کا پتلا! فطرت کی امید کو یوں بر لاتا ہے
یہ سلسلۂ آغازِ مصائب، مرحلۂ انجام نہیں
انساں کی بہشتِ آسائش! کچھ اور بجز ادہام نہیں۔
ناداں نہ جانے، کیا کیا غم سہتا ہے، شبِ عشرت کیلئے
ہر چند کہ یہ اجزا ہیں سحر کی روح شکن عبرت کے لئے
سائے میں اُسی کے، بیخبری کی نیند میں دنیا سوتی ہے
جس تلخ و گریزاں ہستی کی بنیاد فنا پر ہوتی ہے
اربابِ زمانہ، جنگ و جدل میں روح کی تسکیں پاتے ہیں
دنیا میں نہالستانِ مسرت خون سے سینچے جاتے ہیں۔
وہ امن کا حامل ہے!! جسکی محفل ہے، فضا بیکار و نکی
نغموں کی لطافت پاتا ہے۔ جھنکار میں جو تلوار و نکی
سینے کے نہفتہ گوشوں میں الحاد کا شعلہ لرزاں ہے
دنیا میں خدا کی عظمت کا اقرار، ثبوتِ عصیاں ہے
بیتاب ہے، موجِ خندۂ گل اجزائے خزاں چمکانے کو
بیدار ہے روحِ علم و عمل، دنیا پہ تباہی لانے کو
انسان ہے یا فطرت کی ظرافت، دنیا ہے یا دہو کا ہے
اِک گونج ہے یہ خاموشی کی، یا عکسِ حبابِ دریا ہے

(۲)

لرزش سی ہے پیدا، رقص میں ہیں امواج جحیمِ عصیاں کی
ہر سمت فضا میں گونج رہی ہیں تلخ صدائیں شیطاں کی۔
ماتھے پہ شکن پڑ جاتی ہے۔ غم کھاتا ہے، سر دھنتا ہے
دعووں کو جب اُس کے نیکی کا "معصوم فرشتہ" سنتا ہے
دنیا کی طرف ہوتی ہے نظر، اسرارِ حقیقت پائے ہوئے
بر روئے ہوا تھراتا ہے، اس طرح سے پر پھیلائے ہوئے
دیتا ہے صدا، دعوے ہیں جو تیرے آپ تجھی پر مائینگے
آ، دیکھ! جو پنہاں جلوے ہیں، وہ تجھکو نظر اب آئینگے
شیطاں کے تخیّل میں لیکن، یہ امر خلافِ امکاں ہے
آنکھوں میں حقارت کی لہریں، ہونٹوں پہ تبسم عریاں ہے

وہ اس کو نظر آتا ہے مگر، جب محوِ تماشا ہوتا ہے
خود اپنی نگاہوں پر جس سے تلبیس کا دھوکا ہوتا ہے

(۳)

اک سمت بدی کی طاقت ہے، آتشکدہ اک سلگائے ہوئے
اک جانب نیکی کی دیوی، بازوئے حسیں پھیلائے ہوئے

پہلے تو فضا میں ہر جانب، تاریکی سی چھا جاتی ہے
چھٹتا ہے دھواں، جیسے جیسے، اک سطح ابھرتی آتی ہے

ہنگامۂ نفرت گرم کیے اشرار کی فوجیں بڑھتی ہیں
ظلمت کا تموج ساتھ لئے، الحاد کی نہریں چڑھتی ہیں

امواج یہ لیکن آپس میں ٹکرا کے فنا ہو جاتی ہیں
تھمتی ہے جب آندھی، تند ہوائیں موجِ صبا ہو جاتی ہیں

شیطان! زمیں کا ہر گوشہ فردوسِ مسرت پاتا ہے
اجزائے خس و خاشاک میں بھی، انوارِ لطافت پاتا ہے

اب اس کو نظر آتا ہے کہ ہر اک چیزِ حیاتِ دوراں بھی
کچھ سطح میں پائے جاتے ہیں کچھ راز ہیں تہ میں پنہاں بھی

ظاہر میں زمیں کھودی جاتی ہے نخل گرائے جاتے ہیں
در پردہ، مگر ترتیبِ چمن کے ساز ملائے جاتے ہیں

ظلمت کی شب آرا باطن میں اک نور کی لو تھرّاتی ہے
مرجھاتا ہے کوئی پھول اگر، اک تازہ کلی کھل جاتی ہے

بربادیاں ماتم کرتی ہیں جن اجڑے ہوئے ایوانوں میں
ملتا ہے حیاتِ نو کا سبق، انسان کو ان ویرانوں میں

خاموش بھی ہے، ہستی کی فضا محشر کدہ پیغام بھی ہے
آغاز یہاں آغاز نہیں آغاز میں خود انجام بھی ہے

جھنکار ہے، اذنِ بیداری، دنیا کے لئے تلواروں کی
فردوسِ طرب بنجاتی ہے خوں ریز فضا پیکاروں کی

ایثار و عطا کے انساں کو اطوار سکھائے جاتے ہیں
اک درسِ کرم ملتا ہے یہاں جب خون بہائے جاتے ہیں

اسرارِ طرب کی حامل ہے، لبریزِ الم، جانکاہی بھی
منزل کا پتہ دینے کے لئے ہوتی ہے یہاں گمراہی بھی

عالم کی فضا، کچھ عقل و بصیرت ہی کی تجلی زار نہیں
سرشارِ گدائے، میکدہ بھی دنیا کے لئے بیکار نہیں

(۴)

شیطان جب اپنی آنکھوں سے یہ منظرِ عالم دیکھ چکا
اک عمر کی گہری تدبیریں، یوں درہم و برہم دیکھ چکا

سینے سے دھواں سا اٹھنے لگا، اس صبر شکن ناکامی پر
دی اس نے یہ ہیبتناک صدا جھنجھلا کے پھر اپنی خامی پر

کچھ بھید ہے، اس میں، مجھکو ابھی نظارے کی مہلت اور ملے
تحقیق کی خواہش رکھتا ہوں، تحقیق کی فرصت اور ملے

معصوم فرشتہ ہنس کے پکارا تجھکو ابد تک مہلت ہے
جا دیکھ، کہ تیری ہستی بھی اک پنہاں رازِ فطرت ہے

(غیر مطبوعہ)

اختر

دنیا کا باشندہ

ہوٹل روشنی سے جگمگا رہا تھا!

میرے پاس کی ایک کرسی خالی تھی۔ ایک بھاری بھرکم۔ بارعب صاحب تشریف لائے اور گویا دھم سے کرسی پر گر پڑے۔ آپ "دنیا کے باشندے" تھے۔ انہیں دیکھ کر میرا جی خوش ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ ہمارے جدِ امجد حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کے بعد صحیح معنی میں کوئی شخص "دنیا کا باشندہ" کہلانے کا مستحق بن رہا تھا۔ یہ سب لوگ دنیا کے کسی خاص حصے کے باشندے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم اکثر "دنیا کے باشندوں" کا حال سنتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ دنیا کے مسافر ہوتے ہیں متوطن نہیں!

ازراہ کرم اپنے تخیل سے کام لیجئے!

رات کا وقت ہے۔ بہار کا موسم ہے۔ سنگ مرمر کی میزوں پر لذیذ کھانوں کا انبار لگا ہوا ہے۔ ایک طرف "شاعروں" اور ادیبوں کا ایک گروہ "آرٹ" "سائنس" "خدا" کے متعلق بحث میں مصروف ہے۔ دوسری طرف کامیاب سرمایہ دار "شرح تبادلہ" "نرخ طلاء" کے مسائل میں غرق ہیں!

تیز رو۔ خاموش پا۔ خادم ادھر سے اُدھر۔ اُدھر سے ادھر پھر رہے ہیں۔

ایک گوشے میں تاڑ کے بلند پودے لطیف و تاباں روشنی کے لیمپوں کو نیم نہاں کئے ہوئے ہیں۔

یہ حضرت اپنے آپ کو "ہادی حسن" کہتے تھے۔ اور ان کی گفتگو طول بلد اور عرض بلد کے خطوط کو احاطہ کئے ہوئی تھی۔ انہوں نے دنیا کو ایک گیند کی طرح ہاتھ میں تھام لیا تھا۔ حقارت سے۔ طنز سے! اور یہ گیند بادام کی گری سے بھی مختصر معلوم ہوتا تھا! وہ بے پروائی سے خط استوا کا ذکر کرتے تھے۔ ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک ایک فقرے میں سفر کر جاتے تھے۔ منطقیں ان کی نظر میں ہیچ تھے۔ وہ اپنے دامن میں ہفت اقلیم کو سمیٹے ہوئے تھے۔ سمندر بحر خاک ان کے پاؤں کو چھو رہا تھا۔

اپنے ہاتھ کی ایک لاابالیانہ جنبش کے ساتھ وہ حیدرآباد کے ایک بازار کا ذکر کر رہے ہیں۔ پھر! سوئٹزرلینڈ کے پہاڑی مقامات کی سیر میں مصروف ہیں۔ وَف! اس وقت آپ امریکہ کے مشہور آبشاروں کے شور میں غرق ہیں! آہا! اور اب آپ ان کے ساتھ ساتھ برطانیہ کے دارالسلطنت لندن میں موجود ہیں!

ان کی باتیں ایسی تھیں کہ آپ کو یقین ہو جاتا کہ اگر آپ ان کو مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھیں تو انہیں ضرور ملجائے۔

مکرمی "ہادی حسن" صاحب

دنیا

نظام شمسی

کائنات

میں آنکھیں پھاڑے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آج مجھے واقعی ایک دنیا کے باشندے سے سابقہ پڑا ہے۔ اس سے پہلے جن آدمیوں سے میں ملا تھا وہ "مسافر" تھے۔ مجھے عبدالغفور مصنف "تحر دریا" کے اس فقرے پر ہنسی آ رہی تھی۔ "کوئی شخص دنیا کا باشندہ نہیں ہو سکتا۔ انسان ایک شہر کے دامن کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ وہ کہیں چلا جائے اس شہر کی محبت اس کے دل میں موجزن رہیگی۔ وہ ہمیشہ اپنے شہر کی چیزوں کو دوسرے شہر کی چیزوں پر فوقیت دیگا۔"

میں نے ان سے پوچھا۔ "کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ آپ کا وطن کہاں.........."

مسٹر ہادی حسن نے قطع کلام کرتے ہوئے زوردار آواز میں کہا "معاف کیجئے گا" "مجھے یہ سوال بہت ناپسند ہے۔ اس بات سے کیا ہو جاتا ہے کہ کوئی انسان امریکہ کا نہیں بلکہ ہندوستان کا رہنے والا ہے۔ کیا کسی شخص کے متعلق کوئی اندازہ قائم کرنے کے لئے اس کے ڈاکخانے کے پتے سے واقف ہونا ضروری ہے؟ میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ ان جبلی امتیازات کا زمانہ گزر گیا ہے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ اس مختصر سی دنیا میں لوگ اپنی زندگی کو اور بھی مختصر اور بے مصرف بنا لیتے ہیں۔ کیا حماقت ہے!" میں لاہور میں پیدا ہوا تھا اس لئے لاہور اچھا شہر ہے۔ سب شہروں سے اچھا

ہے" میں لکھنو میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے لکھنو کو تمام دنیا پر فوقیت حاصل ہے۔ کیا حماقت ہے! میں نے تعریفی لہجے میں کہا "آپ دراصل دنیا کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ حب الوطنی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔"

ہادی حسن صاحب نے مسکرا کر جواب دیا "حب الوطنی" عہد حجر کی ایک نشانی ہے۔ ہم تمام بھائی بھائی ہیں۔ ایکدن ایسا طلوع ہوگا جب یہ تمام امتیازات مٹا کر رکھ دیے جائیں گے اور دنیا کے تمام باشندے "دنیا کے باشندے" کہلائیں گے۔ ان کا وطن "دنیا" ہوگا"۔

میں نے پوچھا "یہ تو ارشاد فرمائیے کہ دوسرے ممالک کی سیر کرتے ہوئے کیا آپ کے دل میں کبھی کسی شہر کی یاد نہیں آتی۔ کیا آپ کو کسی محبوب۔ مسرت افروز۔ شہر۔ ۔ ۔ ۔"

انھوں نے پھر قطع کلام کرتے ہوئے کہا "ہرگز نہیں۔ دنیا میرا وطن ہے۔"

مکرمی ہادی حسن اٹھکر چلے گئے۔

میں مبہوت سا بیٹھا رہا۔

میں تفکرات میں غرق تھا۔

یکایک شور و غل ہونے لگا۔ میرے تفکر و تدبر کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں نے اٹھکر دیکھا۔ مکرمی ہادی حسن اور ایک دبلا پتلا شخص گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ میزیں الٹ رہی تھیں۔ گلاس ٹوٹ رہے تھے۔ آدمی چلا رہے تھے۔ مکرمی ہادی حسن اپنے وطن "دنیا" کی عزت کے لئے مصروف کارزار تھے۔ ان پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ میں نے ہوٹل کے مالک کو بلا کر پوچھا۔ "یہ کیا بات ہے؟ ان دونوں کو کیا ہوگیا؟"

ہوٹل کے مالک نے ہنستے ہوئے جواب دیا "کچھ نہیں۔ اس دبلے پتلے آدمی نے لاہور کے بازاروں کی تنگی کے متعلق طنزیہ فقرے برسائے تھے۔ دوسرے سے (دوسرے سے مراد مکرمی ہادی حسن صاحب "دنیا کا باشندہ" تھی) برداشت نہ ہو سکا۔ اٹھ کر گتھم گتھا ہو گئے؟

میں نے پوچھا "یہ کیوں"؟

جواب ملا۔ "ان کا وطن لاہور تھا اور وہ اپنے وطن کے خلاف کوئی بات سننے کے لئے تیار نہ تھے۔"

دنیا کا باشندہ! کیا بات ہے!

عابد

رباعیات فرخ

دنیا سرمستیوں کا میخانہ ہے
ہر چیز میں کیفِ دورِ پیمانہ ہے
لب ریز نشاط ہے فضائے عالم
ذرہ ذرہ میں رقص مستانہ ہے

ذوق مستی کا کچھ اثر رہنے دے
مینا و سبو پیشِ نظر رہنے دے
غرقِ مئے ناب کر کے مجھ کو ساقی
کفر و ایماں سے بیخبر رہنے دے

فرخ

کیا ساری دُنیا کی زبان ایک ہو جائیگی؟

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ دنیا کچھ اوپر تین صدی سے اس کوشش میں مصروف تھی کہ کوئی سہل زبان ایجاد کیجائے جو بین الاقوامی زبان بن سکے اور دنیا کی مختلف قوموں اور فرقوں کے درمیان سمجھنے سمجھانے کا بہترین ذریعہ ثابت ہو۔ بڑے بڑے علماء اس گتھی کو سلجھانے میں مصروف رہے۔ حتیٰ کہ کامیابی نے ان کے قدم چومے اور یہ عقیدۂ لاینحل بہترین طور پر حل ہو گیا۔

اس چیز کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج دنیا میں سیکڑوں زبانیں رائج ہیں اور پھر ہر زبان مختلف لہجوں کے ساتھ بولی جا رہی ہے۔ زبانوں کی یہ بہتات مختلف قوموں کے درمیان اگر غلط فہمیاں پھیلانے کا باعث نہیں بنی رہی تو بیگانگی اور اجنبیت کا پردہ ضرور ڈال رہی ہے اور وہ بھی ہمارے اس سنہری زمانہ میں جسے بجا طور پر دور علم و ارتقاء کہا جا سکتا ہے۔

مثلاً آج اگر مصنف اپنے خیالات انگریزی الفاظ کے ڈھانچے میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے تو اس سے سوائے ان لوگوں کی محدود تعداد کے جن کی مادری زبان انگریزی ہے یا جنہوں نے اس میں کمال حاصل کر لیا ہے دوسرے لوگ متمتع نہیں ہو سکتے اور اس طرح مصنف کا مقصود اصلی یعنی نشر علم فنا ہو کر رہ جاتا ہے۔ ترجمہ سے بھی وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا اس لئے کہ اگر ترجمہ کیا جائے تو اول تو اس میں مصنف کے خیالات کے اصلی خد و خال ظاہر ہونے مشکل ہیں اور پھر روپیہ اور وقت کافی خرچ ہو جاتا ہے اور پھر ترجمہ کس کس زبان میں کیا جائے؟ اس لئے کہ اس وقت دنیا کی علمی زبانوں کی تعداد بھی بیس سے کم نہیں۔

اسی طرح اگر کوئی تاجر یہ ارادہ کرتا ہے کہ اس کی تجارت کی شہرت دنیا کے ہر ہر گوشہ میں پھیل جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسے لکھنے والوں سے مدد لے جو کم از کم چار پانچ اہم زبانیں جانتے ہوں۔ لیکن پھر بھی اس کا مقصد پوری طرح حاصل نہیں ہو سکتا باوجودیکہ اسے روپیہ پانی کی طرح بہانا پڑے گا اور اگر ایسا نہ کرے تو اس کی تجارت کامیاب نہیں ہو سکتی۔

لیکن اگر کوئی بین الاقوامی زبان ہو تو پھر یہ دقتیں پیش نہیں آتیں۔ زیادہ سے زیادہ اس چیز کی ضرورت ہوگی کہ ہر شخص وہ بین الاقوامی زبان سیکھ لے۔ اس زبان سے واقف ہو جانے کے بعد دنیا کے تمام ملکوں کے دروازے اس کے لئے کھلے ہونگے۔

سیاسی نقطۂ نظر سے بھی ایک بین الاقوامی زبان کا وجود ضروری ہے زبانوں کی یہ کثرت بسا اوقات مختلف حکومتوں کی مجالس صلح کی کامیابی کی شاہراہ کا روڑا بنجاتی ہے۔ اکثر یہ منظر دیکھا گیا ہے۔ کہ جب کبھی کوئی مقرر اسٹیج پر کھڑا ہوا اور اس کی ملکی زبان کی گونج ہال میں سنائی دی تو بہت سے نمائندے ہوا کھانے کے لئے برآمدوں میں چلے جاتے ہیں۔

بعض اوقات زبانوں کی یہ کثرت مختلف حکومتوں میں سیاسی معاملات کے متعلق غلط فہمیاں بھی پیدا کر دیتی ہے۔ اور دنیا کے مختلف شہروں کے درمیان سلسلۂ نامہ و پیام میں تاخیر اور تعلقات میں تعویق تو اس کا ادنیٰ نتیجہ ہے۔

جب کہ حالات یہ ہوں تو کیا دنیا کو ایک ایسی زبان کی ضرورت نہ تھی جو مختلف قوموں کے درمیان سمجھنے سمجھانے کا ذریعہ ہو، مختلف حکومتوں کے درمیان امن و صلح کی پیغامبر ہو اور عمرانی دنیا میں تجارتی و ادبی تعلقات کے کمال کی راز دار ہو؟

ایک اعتراض اور اسکا جواب

ایک اعتراض کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ کیوں صاحب ہمیں ایک نئی زبان ہی ایجاد کرنے کی کیا ضرورت ہے! ہم موجودہ زندہ زبانوں میں سے ہی کسی ایک زبان کو انتخاب کر کے اسے بین الاقوامی زبان کا درجہ کیوں نہ دیدیں؟ لیکن دو اہم وجوہ سے یہ اعتراض غلط ہوگا۔

اول یہ کہ اگر ہم کسی ایک حکومت کی زبان کو یہ درجہ دیدیں تو یہ دنیا کی دوسری حکومتوں کی زبانوں کی کھلی ہوئی توہین ہو گی اور ان کی قبولیتِ عامہ کی صلاحیت پر زبردست حملہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس طرح اس زبان کو جسے ہم نے بین الاقوامی زبان بنایا ہے۔ دوسری زبانوں کے دائرہ حکومت میں اقتدار حاصل ہو جائیگا اور کون نہیں جانتا کہ بین الاقوامی

زبان والی حکومت اس اقتدار سے کیسے کیسے بہترین سیاسی و ادبی نتائج حاصل کریگی؟

تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ ہم نے فرانسیسی زبان کو بین الاقوامی زبان کا درجہ دیدیا تو کیا یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ انگلستان یا کوئی اور حکومت اسے منظور کریگی کہ وہ فرانس کے اس ادبی استعماری رسیوں میں اپنی گردن کو جکڑوائے جس کے سیاسی نتائج نہایت مہلک ہونگے؟ اور یہ کہ فرانسیسی زبان تو دنیا بھر میں اپنے جھنڈے گاڑ دے - اور اس کی اپنی زبان اپنے ملک میں بھی اپنا اقتدار کھو بیٹھے؟ نہیں، فطری طور پر یہ بات ناممکن ہے اسی طرح بالعکس سمجھ لیجئے۔

دوم یہ کہ دنیا میں آج کوئی ایسی زبان نہیں پائی جاتی جس کے قواعد آسان ہوں اور جس کا حاصل کرنا سہل ہو - بلکہ تمام زبانیں مشکل ہیں، ان کے قواعد کئی کئی جلدوں میں پھیلے ہوئے ہیں - اور وہ بھی کلیہ نہیں - ان کے ثقیل کلمات کانوں پہ گراں گزرتے ہیں اور ان کی گردانیں طویل اور غیر لازمی ہیں۔

ان وجوہات کو دیکھتے ہوئے دنیا کو سخت ضرورت تھی ایک ایسی زبان کی جو کسی مخصوص حکومت کی طرف منسوب نہ ہو تاکہ دنیا کے ہر ہر گوشے میں اسے قبولیت عامہ حاصل ہو سکے - اس کے قواعد آسان ہوں، اس کا حاصل کرنا لوہے کے چنوں کا چبانا نہ ہو تاکہ ایک شخص تھوڑی ہی مدت میں اس میں مہارت نامہ حاصل کرلے۔

دنیا کی بڑی بڑی قومیں اس بات کو تسلیم کر چکی ہیں کہ یہ دونوں شرطیں "اسپرانٹو" میں پائی جاتی ہیں - یہ زبان تعجب انگیز سرعت کے ساتھ دنیا کے ہر ہر گوشہ میں پھیلتی جا رہی ہے - بلکہ آج کل تو اس زبان میں متعدد اخبارات اور ہفتہ وار و ماہوار رسائل بھی نکل رہے ہیں اور علم و ادب کا ایک معقول ذخیرہ ترجمے کی صورت میں منتقل ہو کر اس زبان کا سرمایہ بن چکا ہے۔

اسپرانٹو

اسپرانٹو ایک بین الاقوامی زبان ہے جسے پولینڈ کے ایک نوجوان عالم ڈاکٹر لوئیس زامنہوف نے ۱۸۸۷ء میں ایجاد کیا - اسی نے سب سے پہلے اس زبان کی قواعد مرتب کی، اور اس کا نام ڈاکٹر اسپرانٹو رکھا - ڈاکٹر اسپرانٹو کے معنی اس کی اپنی زبان میں امیدوار فاضل ہیں - اس نے اس زبان کو اتنا آسان بنایا کہ ایک شخص اس کے تمام قواعد پر ذراسی دیر میں عبور حاصل کر سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ تین چار مہینے میں اس زبان کا ماہر ہو سکتا ہے - یہ ایسی وسیع زبان ہے کہ ایک شخص جسقدر آسانی اور جسقدر بے تکلفی کے ساتھ اس کے ذریعے سے اپنے خیالات کی ترجمانی کر سکتا ہے وہ دوسری زبانوں کے ذریعہ سے ممکن نہیں - اس زبان کے اکثر کلمات کا ماخذ لاطینی زبان ہے اور بعض وہ کلمات ہیں جو دنیا کی اکثر زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں۔

اسپرانٹو کی خصوصیات یہ ہیں:-

(۱) تمام قاعدے کلیہ ہیں ان میں مستثنیات نہیں۔

(۲) کلمات کی کتابت ان کے تلفظ کے مطابق ہوتی ہے کسی قسم کی کمی یا زیادتی نہیں ہوتی۔

(۳) کلمات کا تلفظ ان کی کتابت کے مطابق ہوتا ہے۔

(۴) ہر حرف کا تلفظ اس کی اس آواز کے مطابق ہوتا ہے جو اس زبان کے ۲۸ حروف تہجی میں سے ہر ایک کے لئے الگ الگ مقرر ہے۔

(۵) ایک حرف ہمیشہ ایک ہی قسم کی آواز دیتا ہے - اس کا وقوع کہیں کیوں نہ ہو۔

(۶) اصل کلمے پر ایک یا دو حروف کی زیادتی سے مختلف معانی پیدا ہو جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اس زبان کی ڈکشنری میں آپ محض اصل کلمہ سے مخصوص حرفوں کی زیادتی سے اسم، فعل، صفت وغیرہ بنا سکتے ہیں۔

مثلاً آپ کو اسپرانٹو میں اردو زبان کے لفظ "جلدی" کا مرادف ڈھونڈنا ہے، تو آپ کو ڈکشنری میں لفظ Rahid ملیگا - یہ اصل کلمہ ہے - اب اصل کلمہ پر:-

(ا) حرف o کی زیادتی سے اسم بن جائیگا مثلاً جلدی Rahido

(ب) حرف a کی زیادتی سے صفت بن جائیگی مثلاً جلدی کرنے والا Rahida

(ج) حرف e کی زیادتی سے ظرف بن جائیگا مثلاً جلدی سے Rahde

(د) حروف is کی زیادتی سے فعل ماضی بن جائیگا مثلاً جلدی کی Rahidis

(ہ) حروف as کی زیادتی سے فعل مضارع بن جائیگا مثلاً جلدی کرے گا Rahidas

(ذ) حرف u کی زیادتی سے فعل امر بن جائیگا مثلاً جلدی کر Rahidu

یہ قواعد بلا استثنا، اسپرانٹو کے تمام کلمات میں جاری ہوتے ہیں، اور اسی طرح دوسرے قواعد ہیں۔ ان قواعد کی سہولت اور جامعیت زبان اسپرانٹو کے آسان ہونے کی کافی ضمانت ہے۔ اس زبان کی موجودہ مقبولیت کے آئینے میں اس کی کامیابی کا درخشاں مستقبل صاف نظر آرہا ہے۔ اور یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ یہ عنقریب تمام دنیا کی بین الاقوامی زبان بن جائے گی۔

اسپرانٹو کی ترقی کے سلسلہ میں یہ بات خاص طور پر امید افزا ہے کہ یورپ کی اکثر حکومتوں نے اپنے اپنے ہاں کے اسکولوں میں، اختیاری مضمون کی حیثیت سے اس کی تعلیم کا انتظام کر دیا ہے۔ یوگوسلافیا، زیکوسلاویک، روم اور ہنگری کی حکومتوں نے اپنے ہاں کے تمام ابتدائی مدرسوں میں اس کی تعلیم جاری کر دی ہے۔ انگلینڈ میں، مانچسٹر یونیورسٹی نے گذشتہ سال اس کی تعلیم کا انتظام کر دیا تھا اور اس سال بھی اس کے جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ حتیٰ کہ سویڈن کی حکومت نے اپنی پارلیمنٹ کے تمام ممبروں کے لئے اس زبان کا سیکھنا ضروری قرار دیا ہے۔ چنانچہ اب وہ اس کے ابتدائی سبق ازبر کر رہے ہیں۔

علاوہ بریں بہت سی دکانوں، تجارتی کمپنیوں اور کارخانوں نے، اپنے تجارتی اشتہارات اسپرانٹو میں شائع کرنے شروع کر دئے ہیں۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ پیرس کے بعض رسالوں نے مثلاً رسالہ "پاریز" اور رسالہ "پاکس انی السلام" اپنے بعض صفحات زبان اسپرانٹو میں خبریں شائع کرنے کے لئے مخصوص کر دئے ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا اس زبان کی بیسویں کانفرنس بلجیم کے شہر انتورپ میں، ہز مجسٹی شاہ بلجیم کی زیر سرپرستی منعقد ہوئی تھی۔ اس عظیم الشان کانفرنس میں دنیا کے ۴۳ ممالک سے پندرہ ہزار نمائندے شریک ہوئے تھے۔ اسی سلسلہ میں وہاں ایک "اسپرانٹو کالج" کا بھی افتتاح کیا گیا۔ ترقی کے میدان میں، اسپرانٹو کا یہ ایک نیا قدم ہے۔ اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ سینما والے بھی اسپرانٹو کی اشاعت میں سرگرمی کے ساتھ مصروف عمل ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ اسے عالم سینما کی جدید زبان بنا دیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بہت جلد دنیا بھر کے میدانوں کو جیت لیگی۔

(فہیم حرفوس المصری)

زین العابدین سجاد میرٹھی

بین الاقوامی۔ مختلف قوموں کی مشترک Inter National

استعمار۔ ظالمانہ اقتدار۔ ناجائز تسلط۔

قواعد کلیہ۔ وہ قاعدے جو تمام جزئیات پر حاوی ہوں۔

مستثنیات۔ وہ جزئیات جو کلیہ قاعدوں کے تحت میں نہ آتے ہوں۔ Exceptions

حروف ہجا۔ وہ حروف جن سے کسی زبان کی ترکیب عمل میں آئے۔ Alphabet

مرادف۔ ہم معنی۔

غزل

بھرے جا بادۂ سرجوش سے ساقی سبو میرا
شرابِ آتشیں دے دے کے گرمائے لہو میرا

ترے جلووں سے رنگیں لالہ زارِ آرزو میرا
شگفتہ ہے تیرے دم سے مذاقِ رنگ و بو میرا

مری خاموشیاں ہیں تاک میں مرگِ معین کی
حیات افزائے سرمستاں ہے شورِ ہاؤ ہو میرا

نہیں گر ناخدا - آسودۂ ساحل رہوں کب تک
مجھے ساحل پہ لے جائیگا ذوقِ جستجو میرا

جوانی کی یہ رنگیں رات شاید ختم ہوتی ہے
وقار اب جھلملاتا ہے چراغِ آرزو میرا

(غیر مطبوعہ)

وقار (انبالوی)

"صبحِ بہار"

ہر ذرے کو یقیں کہ میں آفتاب ہوں
شرمندہ آفتاب کہ میں بھی حجاب ہوں
ہے مدعی سراب کہ میں عینِ آب ہوں
اور منفعل ہے آب کہ میں خود سراب ہوں

بیکار ہے یقیں کی طلب عقلِ خام سے
یاں امتیازِ صبح کا ہوتا ہے شام سے

ہر صبح صبحِ روزِ ازل کا ظہور ہے
ہر اک شعاع حاملِ صد برقِ طور ہے
ایک ایک ذرہ معنیٔ اللہ نور ہے
سمجھیں نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور ہے

پردہ الٹ کے دیکھ لو شب کی نقاب کا
سارا جہاں ظہور ہے اک آفتاب کا

ہے منظرِ بہار پہ چھائی بہارِ صبح
گلشن کا ہر شجر ہے گلِ شاخسارِ صبح
ہر غنچہ ہے حبابِ لبِ جوئبارِ صبح
ہر گل ہے صرفِ پرتوِ آئینہ زارِ صبح

جوشِ جنوں میں دامنِ شب تار تار ہے
شاملِ بہارِ صبح میں صبحِ بہار ہے

جنگل بسا ہوا ہے ہوا عطر بار ہے
سبزہ حریفِ نافۂ مشکِ تتار ہے
پانی کی لہر گیسوئے عنبر فشار ہے
طالع ہوئی سحر کہ طلوعِ بہار ہے

ہوتا ہے حکم جلوۂ حیرت پناہ سے
دیکھے کوئی نگاہ ملا کر نگاہ سے

بیداریٔ فضا میں ہے عالم خمار کا
پیدا ہوا ہیں سے مزہ انتظار کا
آئینہ ہے فلک چمن زر نگار کا
ہر قطرہ آفتاب ہوا جوئبار کا

غنچوں کے چھیڑنے کو دکھاتی ہیں آئنے
موجیں تڑپ تڑپ کے بناتی ہیں آئنے

(غیر مطبوعہ)

میکش
(اکبر آبادی)

شہرت

طوفان میل چار گھنٹہ لیٹ، سخت سردی۔ رات کا وقت۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ مجبوراً ویٹنگ روم میں جا کر ایک آرام کرسی پر دراز ہو گیا سونے کی کوشش کی لیکن دماغ میں کچھ ایسے خیالات آنے شروع ہوئے کہ طبیعت بے چین سی ہو گئی۔ چاہتا تھا کہ کوئی ہمسفر ہو تاکہ تکلیف کے یہ چار گھنٹے باتوں باتوں میں کٹ جائیں۔ مجھے اس پریشانی کے عالم میں بیٹھے کوئی دس ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ ایک صاحب ـــ پچاس ساٹھ برس کی عمر، درمیانہ قد، شکل و صورت سے شریف ـــ کمرہ میں تشریف لائے قلی نے ایک کونے میں اسباب رکھ دیا۔ اور آپ اُس سے کچھ کہکر میرے پاس والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ مجھے دلی خوشی محسوس ہوئی لیکن سوچتا تھا۔ ایک اجنبی سے گفتگو کا آغاز کس طرح کروں۔ آخر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد میں نے کہا: "اُف کس قدر سردی ہے۔"

"جی ہاں واقعی سردی بہت زیادہ ہے۔ بڑے بوڑھوں کا خیال ہے کہ بیس سال سے ایسی سردی دیکھنے میں نہیں آئی۔"

بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟

اجنبی نے جواب دیا: "میں پٹھانکوٹ جاؤں گا۔" اور یہ کہکر وہ کچھ سوچنے لگا۔

میں نے کہا: "معاف کیجئے گا۔ لیکن . . . . آپ کسی گہری سوچ میں ہیں آپ کے چہرہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔"

ہاں میں مدت سے ایک سوچ میں پڑا ہوں۔ ایک معمہ ہے جو حل نہیں ہوتا۔ شاید آپ اسے حل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ سوال یہ ہے کہ شہرت کسے کہتے ہیں، ناموری کیا ہے۔ اس کی صحیح تعریف کیا ہو سکتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ ایک مشہور ادیب کے نزدیک شہرت پھٹے پرانے کپڑے پر مخمل کا پیوند ہے۔ یہ کسی حد تک ٹھیک ہے۔ لیکن ابھی تک شہرت کی کوئی صحیح اور منطقی تعریف نہیں کر سکا ہے۔

"لیکن آپ کو اس کی خاص ضرورت کیا ہے"

مجھے دیکھئے اگر ہم یہ جان لیں کہ شہرت کسے کہتے ہیں تو شاید ہم اس کو حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں۔ میں بچپن سے شہرت حاصل کرنے کے پیچھے پڑا ہوں۔ میں سخت محنت کرتا تھا۔ راتوں کو جاگتا تھا۔ کھیل کود سے نفرت ہو گئی تھی۔ اب میں ایک کامیاب انجنیئر ہوں۔ میں نے ہندوستان میں کئی عمارتیں اور پل بنائے ہیں۔ فن انجنیری پر اچھی اچھی کتابیں لکھی ہیں۔ نقشے بنائے ہیں نئی نئی ایجادات کی ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوں۔ مال و دولت کی فراوانی ہے۔ میں خود اپنے منہ سے میاں مٹھو نہیں بننا چاہتا۔ قصہ مختصر میں بہت سے مشہور لوگوں سے بازی لے گیا ہوں اب میں بوڑھا ہوں۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ لیکن میری حالت بالکل ویسی ہے جیسے کہ ایک گلی کا کتا ہوتا ہے۔

"لیکن آپ یہ کیسے خیال کر سکتے ہیں۔ شاید آپ مشہور ہوں"۔

"آپ نے بجا ارشاد فرمایا۔ لیکن اس کا ابھی ابھی تجربہ ہو سکتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی مسٹر عرفان الحق کا نام سنا ہے"۔

میں نے اپنا سر اُٹھایا اور تھوڑی دیر تک غور کرنے کے بعد بولا۔ میں نے نہیں سنا ہے"۔

"یہ میرا نام ہے۔ آپ تعلیمیافتہ آدمی ہیں۔ آپ کی عمر کافی ہو گئی۔ لیکن پھر بھی آپ نے میرا نام نہیں سنا ہے۔ میری شہرت کا یہ زندہ ثبوت ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ میں نے اس چیز کو حاصل کرنے کے لئے ٹھیک راستہ اختیار نہیں کیا۔

"تو ٹھیک راستہ کون سا ہے" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک راستہ میں نہیں جانتا۔ لوگ کہتے ہیں ذہن۔ لیاقت، استعداد۔ لیکن غلط سب جھوٹ۔ فریب۔ دھوکا۔ بعض لوگ جو مجھ سے کہیں پیچھے تھے اور جنہوں نے کوئی قابل تعریف کام بھی نہیں کیا۔ ان کے اخباروں میں تذکرے ہیں۔ ہر جگہ ان کا چرچا ہے۔ پانچ برس ہوئے میں نے امرتسر میں ایک عجیب پل بنایا۔ یہ اپنی صنعت میں لاجواب تھا۔ وہیں ایک رقاصہ بھی رہتی تھی۔ اس کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ دن بھر بیکار رہتی۔ صبح آٹھ بجے بیدار ہوتی۔ کھانے پینے کے سوا اُسے کوئی کام نہیں تھا۔ جب وہ پل مکمل ہو گیا تو ایک سرکاری افسر نے افتتاح کی رسم ادا کی۔ افتتاح پر تقریریں ہوئیں۔ مبارکباد کے تار اور خطوط پڑھکر سنائے گئے۔ میں بھی ایک کرسی پر اپنا دل تھامے بیٹھا تھا۔ میرا خیال تھا جی بھر کے میری تعریفیں ہوں گی۔ لوگ مجھے مبارکباد دیں گے۔ میں خوشی سے پھولا نہ سماؤں گا۔ کیونکہ یہ نہایت خوبصورت پل تھا۔ اپنی قسم کا ایک ہی۔ لیکن کیا ہوا۔ ایک دو افسروں نے رسمی طور پر میری تعریف کی۔ لیکن کسی نے میرا خیال تک

ہنیں کیا۔ مجمع کا مجمع پل کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسے
بنایا کس نے ہے۔ تھوڑی دیر میں مجمع میں کچھ زندگی کے آثار پیدا ہوئے
لوگ اپنی گردنیں اٹھا کر دیکھنے لگے۔ پہلے خیال ہوا یہ لوگ مجھے دیکھ رہے
ہیں۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ رقاصہ بڑے ناز و ادا سے چلی آ رہی ہے
لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے "کتنی خوبصورت ہے۔ یہ وہی رقاصہ
ہے۔ اس کی آواز سبحان اللہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ تھوڑی دیر کے
بعد میں مجمع کی طرف بڑھا اور ایک آدمی سے پوچھا۔

"تمھیں معلوم ہے یہ پل کس نے بنایا ہے"

"میں نہیں جانتا کسی انجنیر نے بنایا ہوگا"

"اچھا تمھارے شہر میں جو ٹاؤن ہال ہے اسے کس نے بنایا ہے"

"میں نہیں بتا سکتا"

میں نے پوچھا "جانتے ہو یہ رقاصہ کون ہے"

جواب ملا۔ ہاں اس سے کون واقف نہیں۔

تو جناب ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ یہ تھے واقعات جس روز پل کا افتتاح
ہوا۔ اس کے دوسرے دن میں نے آپ کے ملک کا مشہور جریدہ مشرق
خریدا۔ جلد جلد میں نے ورق الٹے۔ ایک جگہ افتتاح کا حال اس طرح لکھا
تھا: "کل ایک بڑے مجمع کی موجودگی میں نئے پل کا افتتاح کیا۔ وغیرہ وغیرہ
اور آخر میں لکھا تھا "ہمارے ملک کی مشہور رقاصہ بھی محفل کی رونق کو دوبالا
کر رہی تھی"۔ مجھے کس قدر غصہ آیا۔ اس کا اندازہ آپ نہیں کر سکتے۔ لیکن
پھر میں نے اپنے آپ کی تسلی اس طرح کر لی کہ شاید شہرت ان شہروں
میں حاصل ہو سکتی ہے جو حکومت کے مراکز ہوں۔ میں نے دہلی کی
نمائش میں اپنے فن کا ایک بہترین نمونہ بھی بھیجا تھا۔ میں دہلی روانہ ہو گیا
اور ایک ہوٹل میں جا ٹھہرا۔ اسی دن نمائش کا نتیجہ نکلا۔ اور میں اول انعام
کا مستحق ٹھہرا۔ دوسرے دن میں نے آٹھ دس اخبار خریدے۔ اور ہوٹل
میں آکر پڑھنے لگا۔ لیکن کسی اخبار میں میرا ذکر نہیں تھا۔ آخر میں نے
دوسری مرتبہ اخباروں کو دیکھا۔ ایک اخبار میں کہیں نیچے یہ لکھا تھا۔
"نمائش میں اول انعام ۔۔۔۔ انجنیر کو ملا"۔ اور لطف یہ کہ عرفان الحق کی جگہ
میرا نام عرفان احمد لکھ دیا تھا۔ کوئی دو سال ہوئے کہ نئی دہلی میں ایک
مہاراجہ نے اپنی کوٹھی بنوانے کے لئے مجھے بلا بھیجا۔ میں گیا اور اسی دوران
میں شہر میں فن انجنیری پر پانچ لیکچر دیئے۔ آپ کو خیال ہوگا کہ ان لیکچروں نے
مجھے بہت مشہور کر دیا ہوگا۔ نہیں جناب نہیں۔ کسی اخبار میں لیکچروں کا ذکر
تک نہیں تھا۔ چوری ڈاکہ کھیل۔ آگ اور اسی قسم کے دوسرے واقعات
سے اخبارات پر ہوتے تھے۔ ایک دن میں ٹرام پر جا رہا تھا کہ میں نے اپنے
ایک ہم سفر سے پوچھا۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ ۔۔۔۔ مہاراجہ صاحب کی کوٹھی بنانے کے
لئے جو انجنیر آیا ہے۔ اس کا کیا نام ہے؟"

"میں نہیں جانتا"۔ اس کا صاف جواب تھا۔

میں نے پھر کہا: "ایک صاحب آج کل دہلی میں لیکچر دے رہے ہیں
سنا ہے بہت پر از معلومات ہیں"۔

"جی مجھے خبر نہیں"۔

میں کچھ اور بھی پوچھنے والا تھا کہ اچانک بہت سے لوگ گردنیں
نکال کر باہر کی طرف دیکھنے لگے۔

میں نے پوچھا کیا ہے؟ میرے اسی ہمراہی نے جواب دیا۔
"دیکھتے نہیں وہ سیاہ کوٹ والا جو گاڑی میں سوار ہو رہا ہے سرکس میں
نہایت اچھا کام کرتا ہے۔ تعریف نہیں ہو سکتی۔ آپ میری باتوں سے
تنگ آ گئے ہوں گے۔ لیکن ذرا صبر کیجئے۔ شاید آپ یہ خیال کریں کہ چونکہ
میں مشہور نہیں ہوں۔ اس لئے یہ رونا رو رہا ہوں۔ لیکن آپ ہی خدارا
فرمائیے کہ ہمارے ملک میں کتنے ادیب، کتنے شاعر۔ کتنے
فلسفی، کتنے ریاضی داں اور کتنے سائنس کے ماہر مشہور ہیں۔ کیا ہمارے
ملک میں ایسے شاعر نہیں ہیں جن کو سر آنکھوں پر بٹھایا جا سکتا ہے۔ کیا
ہمارے ملک میں اچھے ادیب نہیں ہیں؟ کیا ہمارے ملک میں ایسے
شاعر نہیں ہیں جن کو سر آنکھوں پر بٹھایا جا سکتا ہے۔ کیا ہمارے ملک
میں ایسے ہی لوگ نہیں ہیں جن پر دنیا رشک کر سکتی ہے۔ لیکن اس کے
برخلاف دیکھئے دنیا میں کون مشہور ہیں۔ بھانڈ۔ نقال۔ مسخرے۔ میں
اسی قسم کی ہزاروں مثالیں بیان کر سکتا ہوں"۔

پانچ منٹ تک بالکل خاموشی رہی ۔۔۔۔ آخر میں نے کہا "کیا
میں بھی ایک سوال پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں"۔

"شوق سے فرمائیے"۔

"کیا آپ ڈاکٹر مرزا لطیف الزماں ایم اے پی ایچ ڈی کو جانتے ہیں"

"ڈاکٹر مرزا ۔۔۔ لطیف الزماں ۔۔۔۔ نہیں میں نہیں جانتا"۔

"یہ میرا نام ہے۔ آپ مجھے نہیں جانتے۔ میں تیس سال سے ہندستان
کی مشہور درسگاہ میں پروفیسر ہوں۔ ہزاروں انجمنوں کا رکن ہوں اور کئی
ایک کتابیں لکھ چکا ہوں"۔

اجنبی نے زور سے ایک قہقہہ لگایا۔ اور کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ
قلی نے آکر کہا "حضور گاڑی آ گئی ہے"۔

سید نصیر احمد

افلاطون کے سوانح حیات

اور اس کے علمی کارناموں پر ایک سرسری نظر

ابتدائی حالات | افلاطون کا اصلی نام ایرسٹاکلیز تھا۔ افلاطون معرب ہے۔ پلے ٹان کا جس کے معنی یونانی زبان میں چکلے بازو یا موٹے ابرو والے آدمی کے ہیں۔ لہذا یہ لقب ظاہر کرتا ہے کہ اس میں ان دو باتوں میں سے کوئی ایک یا دونوں ضرور پائی جاتی ہیں۔ اس کے باپ کا نام ایرسٹن اور ماں کا پیرک شانی تھا، اور وہ ۴۳۰ ق م میں بمقام ایتھنس دارالخلافہ یونان پیدا ہوا۔ اس کی ننھیال کا سلسلہ یونان کے مشہور مقنن سولن پر ختم ہوتا ہے۔ اس کی ولادت کے متعلق عجیب و غریب روایات قدیم یونانی تاریخوں میں مذکور ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ افلاطون بغیر باپ کے پیدا ہوا تھا۔ جب ایرسٹن کی منگنی پیرک شانی کے ساتھ ہوئی تو اپالو (یونانی دیوتا) نے خواب میں ایرسٹن سے کہا کہ پیرک شانی حاملہ ہے جبتک وضع حمل نہ ہو جائے، تم اُسے اپنے گھر نہ لانا۔

تعلیم و تربیت | افلاطون کے والدین خوشحال تھے اس لئے اس کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی اس زمانہ میں جسمانی ورزش تعلیم کا لازمی جزو تھی، اور جمناسٹک تو کورس میں داخل تھی۔ کیونکہ اس فن کو جسم کے ساتھ وہی تعلق ہے جو منطق کو دماغ کے ساتھ ہے۔ شرفائے یونان کے بچے عموماً پہلے شاعری فصاحت و بلاغت اور موسیقی کی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ افلاطون نے بھی ان علوم کو حاصل کیا اور بہت اچھی طرح۔ ابتدائی عمر میں اُسے شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ چنانچہ اس نے غزلیں، نظمیں، اور ایک رزمیہ مثنوی بھی لکھی تھی لیکن جب اس کا مقابلہ ہومر کی نظم سے کیا تو اپنی نظم نگاہوں میں نہ جچی۔ کچھ سوچ سمجھ کر یہ "دفتر بے معنی" نذر آتش کر دیا۔ اور آئندہ شاعری کرنے سے توبہ کر لی۔ کانپور کے کتب خانۂ الٰہیات مملوکہ ایس۔ پی۔ جی مشن، میں فقیر نے افلاطون کی تصانیف بزبان یونانی کی زیارت کی تھی، ان میں افلاطون کی بعض غزلیں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا ایک شعر مجھے یاد رہ گیا وہی ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں:-

Ἀστέρας εἰσαθρεῖς, ἀστὴρ ἐμός· εἴθε γενοίμην οὐρανός,
ὡς πολλοῖς ὄμμασιν εἰς σὲ βλέπω.

Asteras eisathries, aster emos. eithe genoimen ouranos, hos pollois ommasin es se blepw.

"اے میری جان! تو ستاروں کو (محبت بھری نظروں سے) دیکھ رہا ہے! کاش میں آسمان ہوتا، اور میرے (دو نہیں بلکہ) ہزار آنکھیں ہوتیں، تاکہ میں تجھے دیکھتا"

فلسفہ کی تعلیم | اس کے بعد افلاطون، کریٹی لس کا شاگرد ہوا اور اس شخص سے فلسفہ کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ بیس سال کی عمر میں سقراط کی شاگردی اختیار کی۔ اور دس سال تک شبانہ روز اس کی صحبت میں رہا۔ ۳۹۹ ق م میں جبکہ اس کی عمر تیس سال کی تھی سقراط کو سچی بات کہنے کی پاداش میں زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ اس وقت جسمانی طور پر یہ سلسلہ منقطع ہوا۔

بعد چندے افلاطون، ریاضی سیکھنے کی خاطر، اقلیدس کی خدمت میں حاضر ہوا جو اُس زمانہ میں بمقام میگارا سکونت پذیر تھا۔ بعد ازاں طلب علم اس کو سائرین لے گئی۔ جہاں ایک اور مشہور مہندسی تھیوڈورس رہتا تھا۔ ریاضی میں حاذق ہونے کے بعد افلاطون نے مصر کا رخ کیا جو اُس زمانہ میں علوم و فنون کے علاوہ مرکز تہذیب و تمدن بھی تھا۔ افسوس ہے کہ قدیم مورخوں نے اس بات پر روشنی نہیں ڈالی کہ اس نے مصر میں کن کن لوگوں سے، کون کون سے علوم حاصل کئے۔ اس نے خود ایک جگہ اسقدر لکھا ہے کہ مصر کے لوگ خصوصاً علمائے مذہب، دینی علوم میں، یونانیوں سے بہت آگے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ افلاطون ان سے کسقدر متاثر ہوا۔

سلسلہ درس و تدریس | مصر سے واپس آنے کے بعد افلاطون

نے درس دینا شروع کیا، سقراط کی طرح وہ بھی مفت ہی پڑھاتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ہزاروں طالبانِ علم اس کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے۔

ایتھنس سے چند میل کے فاصلہ پر ایک باغ تھا جسے اکیڈیمیا کہتے تھے۔ یہ جگہ افلاطون کو بیحد پسند تھی جس طرح حافظؔ کو "کنار آب رکن آباد و گلگشت مصلیٰ" اس باغ کی نسبت ہی سے افلاطون کے مدرسہ کا نام اکیڈیمی پڑ گیا۔ اور یہ لفظ آج بھی انگریزی زبان میں مروج ہے۔

صقلیہ کا سفر چالیس سال کی عمر میں افلاطون نے پہلی مرتبہ صقلیہ[1] کا سفر اختیار کیا۔ لیکن چند ماہ کے قیام کے بعد وہاں کے بادشاہ ڈایونی سیئس اول سے بعض سیاسی امور پر اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ چونکہ افلاطون کو یقین کامل تھا کہ میری رائے صحیح ہے۔ اس لئے مضبوطی کے ساتھ اس پر قائم رہا۔ بادشاہ اس بات پر سخت ناراض ہوا، اور اگر اس کا چھوٹا بھائی ڈایون افلاطون کی بروقت مدد نہ کرتا تو شاید ہمارے فلاسفر کی زندگی کا وہیں ۔۔۔ خاتمہ ہو جاتا۔ خیر جان تو بچ گئی لیکن بادشاہ نے اسپارٹا کے سفیر کو، جس کے جہاز میں افلاطون سوار ہوا، کہلا بھیجا کہ اس شخص کو بطور غلام فروخت کر دیا جائے۔ چنانچہ جہاز پر بولی شروع ہوئی۔ خوش قسمتی سے سایرین کا ایک دولتمند شخص، جو افلاطون سے واقف تھا۔ وہاں موجود تھا۔ اس نے بہت زیادہ قیمت دیکر اسے خریدا اور فوراً آزاد کر دیا۔ جب افلاطون، ایتھنس پہنچ گیا تو ڈایونی سیئس نے اسے ایک خط لکھا جس میں اپنی تنگدلی پر اظہار افسوس کیا اور درخواست کی کہ میرے متعلق ایتھنس میں کسی سے کچھ نہ کہا جائے۔ افلاطون نے جواب دیا "آپ اطمینان رکھیں میں آپ کی سرد مہری اور بدسلوکی کے متعلق کسی سے کچھ نہ کہونگا کیونکہ مجھے ان باتوں کی مطلق فرصت نہیں بلکہ آپ کے خیال کی بھی میرے دماغ میں گنجائش نہیں ہے۔"

ڈایونی سیئس کی وفات کے بعد، افلاطون دوبارہ صقلیہ گیا۔ ڈایون نے جو اب ڈایونی سیئس ثانی کے لقب سے اس جزیرہ پر حکمران تھا۔ اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اور وعدہ کیا کہ میں "نو آبادی" کے لئے ضرور ایک سرسبز اور صحت بخش مقام آپ کو دونگا۔ دراصل افلاطون کے صقلیہ آنے کی غرض یہ تھی کہ ایک "نو آبادی" قائم کرے۔ جس میں وہی قوانین رائج ہوں جو خود اس نے بنائے تھے۔ گویا وہ اپنے مجوزہ قوانین کی صحت کا امتحان کرنا چاہتا تھا۔ چند ماہ قیام کرنے کے بعد افلاطون ایتھنس واپس آ گیا۔ اتفاق کی بات ڈائن تھوڑے دنوں بعد بیمار پڑا اور راہی ملک عدم ہوا۔ اور افلاطون سے جو وعدہ کیا تھا پورا نہ کر سکا۔

تیسری مرتبہ پھر افلاطون صقلیہ گیا لیکن جدید حکمران نے کسی قسم کی مدد دینے سے انکار کیا۔ اس لئے ناکام واپس آیا، اور آئندہ صقلیہ جانے سے توبہ کر لی۔

آخری ایام اس کی بقیہ زندگی، نہایت خاموشی اور سکون کے ساتھ گزری۔ صبح کو درس دیا کرتا، باقی وقت تصنیف و تالیف میں گزارتا۔ مکالمات افلاطون جو نہایت مشہور کتاب ہے۔ آخری زمانہ کی لکھی ہوئی ہے۔ تراسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

کیریکٹر افلاطون بالطبع نہایت سنجیدہ اور خاموشی پسند تھا۔ چہرہ پر تفکر اور پریشانی کی علامت ہمیشہ نمایاں رہتی تھیں۔ تمام عمر ہنسی سے آشنا نہ ہوا۔ خندہ و قہقہہ کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ اگر کسی شاگرد نے اس کے بیان کردہ مسئلہ کو خوبی کے ساتھ کسی موقعہ پر بیان کر دیا تو اسے سنکر خفیف سا تبسم نمودار ہو جاتا اور بس۔ چنانچہ یونانی ڈراما نویسوں میں یہ ضرب المثل عام تھی "وہ تو ایسا سنجیدہ ہے جیسے افلاطون" اس کے قدردانوں کا شمار نہ تھا لیکن دوست دو چار سے زیادہ نہ تھے۔ ایک تو وہ خلوت پسند تھا ہی دوسرے فرائض کا احساس بہت شدید رکھتا تھا۔ انہیں حالات دو چار دوست بھی بہت تھے۔ وہ خود کہا کرتا تھا کہ میں اپنے خیالات میں ہی اس درجہ منہمک رہا کرتا ہوں کہ کسی سے بات چیت کرنے کی فرصت نہیں مل سکتی۔ اگرچہ ابتدائی عمر میں کچھ دنوں تک خود شاعری کی تھی، لیکن آخر عمر میں شاعری اور شعراء دونوں سے بیزار ہو گیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ شاعری بُری چیز ہے بلکہ اس لئے کہ شعراء عموماً اس کا غلط استعمال کرتے ہیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اخلاقی شاعری کا مرتے دم تک دلدادہ رہا۔ یعنی سعدیؒ اور حالیؒ اگر اس کے زمانہ میں ہوتے تو دونوں کی قدردانی کرتا۔ کیونکہ ان بزرگوں نے فلسفیانہ اور اخلاقی خیالات ہی زیادہ تر پیش کئے ہیں۔ لیکن افلاطون کے زمانہ میں نہ کوئی سعدی تھا نہ حالی اسی لئے اس نے جمہوری سلطنت (ریپبلک) کا جو ایک خیالی ڈھانچ بنایا تھا۔ اس میں شاعروں کے لئے کوئی جگہ نہیں رکھی تھی۔

[1] اٹلی کے جنوب میں ایک جزیرہ ہے جسے سسلی کہتے ہیں۔

اور مسلسل غور و فکر کرنے ہی سے ایک انسان، اس آخری کُلّی تک پہنچ سکتا ہے۔ جس تک پہنچنا اس کا مقصد اولین اور آخرین ہونا چاہئے۔

علم النفس نفس مُدرک یا نفس ناطقہ کی اصل عالم مثال ہے یعنی وہ کوئی مادی یا دنیاوی چیز نہیں ہے۔ اس کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ نفس ناطقہ بالطبع جمیل و حسین اشیاء کی طرف راغب ہے اور انسانی فطرت کے طبیعی پہلو پر حکمرانی کا خواہشمند ہے۔ افلاطون نفس ناطقہ کو اس کوچوان (کوچمین) سے تشبیہ دیتا ہے، جو اُن دو گھوڑوں کو ہانکتا ہے جن میں سے ایک بالطبع نیک اور دوسرا بالطبع شریر ہو، یعنی انسان میں دو متضاد رجحانات پائے جاتے ہیں، ایک نیکی کی طرف اور دوسرا بدی کی جانب۔ اسی خیال کو اخلاق جلالی میں اس طرح ادا کیا گیا ہے:-

آدمی زادہ طرفہ معجونیست - از فرشتہ سرشتہ واز حیوان۔

نیکی کا عنصر انسان کو آسمان کی طرف لیجانا چاہتا ہے تاکہ انسان فرشتہ سیرت بن جائے اور بدی کا عنصر اُسے پستی میں گرانا چاہتا ہے تاکہ انسان، حیوان سے بھی بدتر ہو جائے۔ نفس ناطقہ بذات خود غیر قابل فنا اور خدائی صفات رکھتا ہے۔ لیکن مادی جسم سے متحد ہونے کی وجہ سے اس پر اکثر پابندیاں وارد ہوگئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں دو شانیں پیدا ہوگئی ہیں، ایک فرشتوں کی دوسری حیوانی۔ اور فاعلیت کے لحاظ سے اس کی تین صورتیں ہیں ذہنی، روحانی اور شہوانی۔ ان میں سے صرف ذہنی صورت، ہی اُس کی حقیقی صورت ہے اور وہی غیر فانی ہے۔

نفس ناطقہ کے غیر فانی ہونے پر افلاطون نے مختلف دلائل قائم کئے ہیں، جن پر فلاسفۂ آئندہ نے حسب لیاقت حاشیہ آرائیاں کی ہیں۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ وہ بسیط ہے مرکب نہیں اس لئے فساد سے محفوظ ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ روح کا خالق نیک اور خیر محض ہے۔ اُس نے اُسے بھی صفت بقا عطا کی ہے تیسری دلیل یہ ہے کہ نفس ناطقہ زندگی اور حیات کا سبب ہے اور وجود حقیقی معدوم نہیں ہو سکتا۔ چوتھی دلیل یہ ہے کہ تمام عقلا نے زمانۂ جسمانی قیود سے آزاد ہو کر عالم مثال سے تعلق پیدا کرنا چاہتے ہیں اور فانی اشیا سے انہیں کوئی لگاؤ پیدا نہیں ہوتا۔ نفس ناطقہ یعنی "روح" اگرچہ جسم میں مقید ہے لیکن اس کا میلان ہمیشہ عالم بالا کی طرف پایا جاتا ہے اور یہ اسوجہ سے کہ مادّی دنیا اس کا وطن نہیں ہے۔ اور اپنی اصلیت کی طرف رجوع کرنا ہر شے کی طبیعت کا فطری تقاضا ہوتا ہے۔ چنانچہ عربی میں مثل ہے "کل شئ یرجع الی اصلہ" یعنی ہر شے اپنی اصلیت کی طرف رجوع کرتی ہے۔ جس طرح نفس ناطقہ یعنی روح، ابدی اور غیر فانی ہے اسی طرح ازلی اور قدیم بھی ہے یعنی جسم انسانی سے وابستہ ہونے سے پہلے بھی موجود ہوتا ہے اور جدا ہو کر بھی قائم رہتا ہے۔ افلاطون بھی فیثا غورث کی طرح تناسخ ارواح کا قائل تھا۔

روح کا مقصد وحید، خالق ارواح یعنی خدا کی معرفت حاصل کرنا ہے اور اس کے بعد بدی پر غالب آنا۔ ان باتوں کے حصول کا طریق یہ ہے کہ انسان رہبانیت اختیار کرے۔ تمام نفسانی خواہشات کو ضبط میں رکھے چونکہ خواہشات، نفس ناطقہ ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور اس کے عناصر ضروری کہلاتی ہیں۔ اس لئے ان کا قلع قمع کرنا تو ٹھیک نہیں لیکن مناسب یہ ہے اُن کو اعلیٰ زندگی میں تبدیل کر دیا جائے۔

الٰہیات خدا واحد حقیقی ہے، افضل بزرگ اور کامل ترین وجود ہے، وہ ازلی اور ابدی ہے، زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے۔ انسان خدا کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا لیکن اسقدر جان سکتا ہے، کہ خدا واحد ہے اس کی منطقی تعریف نہیں ہو سکتی ہاں صفات سلبیہ کے ذریعہ سے ہم اسے جان سکتے ہیں مثلاً ہم یہ تو نہیں جان سکتے کہ خدا بلحاظ ذات کیا ہے لیکن یہ جانتے ہیں کہ وہ جسم نہیں، مقید نہیں۔ مرکب نہیں۔ فانی نہیں، محتاج اور مجبور نہیں وغیرہ وغیرہ۔ خدا کو اس طرح جاننا، جس طرح وہ اپنے آپ کو جانتا ہے۔ طاقت بشری سے باہر ہے۔ خدا کے متعلق جو کچھ علم حاصل ہو سکتا ہے وہ محض اپنی ذات میں غور کرنے سے۔ جب ہم کائنات اور اپنی ذات میں غور کرتے ہیں تو لا محالہ اس نتیجہ پہ پہنچتے ہیں کہ دنیا کی محدود ہستیوں، قوانینِ فطرت، انواع و کلیات اور تمام چیزوں سے بالاتر ایک ہستی ہے جو تمام چیزوں کی علت العلل ہے یعنی آخری علت یا سبب ہے۔ (افلاطون کے نزدیک خدا براہِ راست یعنی بلاواسطہ علت نہیں کیونکہ خدا سے صرف عقل اول سرزد ہوئی اس عقل نے

[1] خواہشات جو ایک دوسرے کی مخالف ہوں۔ [2] فارسی زبان میں فلسفۂ اخلاق پر ایک مشہور کتاب ہے ۱۲۔ [3] طبیعت کا جھکاؤ۔ [4] آواگون
[5] ترکِ دنیا اور ترک لذات دنیوی۔ [6] یہ سب صفات سلبیہ کہلاتی ہیں ۱۲۔

کائنات کو پیدا کیا - خدا علتِ تامہ ہے اور علتِ تامہ وہ ہے جس سے معلول ضرور سرزد ہوگا، پس خدا سے عقلِ اول سرزد ہوئی۔ لیکن خدا واحد ہے اس لئے اس سے صرف ایک معلول سرزد ہو سکتا ہے "الواحد لایصدر عنہ الا الواحد"[1] خدا، کائنات پر حکمراں ہے، منتظم ہے - واجب الوجود[2] ہے - حیّ و قیوم ہے، اور اسی کی بدولت کائنات میں زندگی نظم و نسق، توافق اور ہم آہنگی خوبی اور بھلائی پائی جاتی ہے - خدا بلحاظ صفات، واجب غیر متجسد غیر متغیر، لامتناہی، غیر محدود، کامل، قادر، عالم اور خیر مطلق ہے۔ سرچشمۂ عدل و انصاف ہے اور ہر شے کی ابتدا اور انتہا ہے۔

خدا پر ایمان رکھنے کے متعلق لکھتا ہے " قانون اور اخلاق کی حفاظت صرف خدا پرستی سے ہو سکتی ہے جو شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے وہ بدی کا ارتکاب نہیں کر سکتا اور اگر کرتا ہے تو سمجھو کہ اس کا ایمان ٹھکانے نہیں ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خدا کوئی چیز نہیں یا اخلاق اور نکوکاری، بیکار اور فضول باتیں ہیں اور مادہ ہی اصلِ کائنات ہے یا یہ دنیا خود بخود بن گئی ہے (دیمقراطیسی فلسفہ کی طرف اشارہ ہے) یہ سب باتیں عدم تفکر و تدبر بلکہ جہالت خود رائی اور حماقت کا نتیجہ ہیں - کائنات پر غور کے ساتھ نظر کرنے سے معلوم ہوگا کہ وہ مقررہ اصولوں کے ماتحت چل رہی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ "اصول" خود بخود پیدا نہیں ہو سکتے جب تک کوئی علیم اور حکیم ہستی، اپنے ذہن سے انہیں پیدا نہ کرے - کائنات کا ذرہ ذرہ ایک نظام کے ماتحت کام کر رہا ہے اور نظام بغیر منظم کے پایا نہیں جا سکتا - مادہ تو بے شعور اور بے حس اور بے جان چیز ہے اس میں انتظام کی قابلیت کہاں سے آئی؟ نظامِ عالم میں اگر کوئی بات ہمیں ناقص معلوم ہوتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا کی حکمت پر اعتراض کیا جائے بلکہ ہم خود ناقص اور محدود عقل رکھتے ہیں. بہت ممکن ہے کہ ہمارا ہی خیال غلط ہو - علاوہ بریں، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ایک شے (جسے ہم ناقص یا مذموم سمجھتے ہیں) ایک محدود دائرہ میں ناقص معلوم ہو - لیکن کائنات کو بحیثیتِ مجموعی دیکھنے سے وہ شے ناقص نہ ہو۔"

اور یہ ظاہر ہے کہ ہم کل کائنات کو ایک وقت میں نہیں دیکھ سکتے۔ اس لئے مناسب ہے کہ ہم خدا پر الزام لگانے کی جگہ خود اپنے قصور کا اعتراف کریں - شائد آئندہ چل کر ہمارے خیال کی اصلاح ہو جائے۔ خدا رحیم اور کریم ہے - اس نے دنیا اور انسان، دونوں کو بہترین طریق پر پیدا کیا ہے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کے کمال اور اس کی نیکی دونوں پر حرف آجاتا - اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر خدا، کائنات کو موجودہ حالت سے بہتر بنا سکتا تھا، مگر قصداً بہتر نہ بنایا تو ظاہر ہے اس نے بخل کیا، اور اپنی مخلوقات کو اپنی نعمتوں سے محروم رکھا۔ پس وہ سرچشمۂ کمال[3] تسلیم کرنا پڑیگا کہ یہ کائنات بہترین طریق اور تقویم پر بنائی گئی ہے - خدا نے یہ دنیا کیوں بنائی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا نیکی اور کمال کا سرچشمہ ہے اور رشک و حسد سے پاک ہے - پس اس کی مرضی یہ ہوئی کہ اپنے کمال کا اظہار کرے اور انسان کو پیدا کر کے اسے اپنی نعمتوں اور بخششوں کا وارث بنائے۔ بیشک دنیا میں خیر کے ساتھ شر بھی ہے لیکن شر یعنی بدی اس لئے ہے کہ خیر یعنی نیکی میں تمیز ہو سکے کیونکہ اشیائے کائنات اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں - انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ شر سے پرہیز کرے اور خیر اختیار کرے یعنی انسان خدا کی سی زندگی بسر کرے تاکہ شر سے محفوظ رہے - اسی لئے خدا نے انسان کو دو باتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی قوت عطا کی ہے۔

محبت انسان اور خدا کے درمیان رنگِ اتحاد پیدا کر سکتی ہے یعنی محبت نے خالق اور مخلوق کو وابستہ کر دیا ہے۔ اور "محبت" روحِ انسانی کے حسن اور جمال کی طرف میلان یعنی خواہشِ وصل و اتحاد کا جو دو ہم جنس چیزوں میں باہمدگر پائی جاتی ہے - نام ہے روح کا مبداء[4] الوہیت ہے پس وہ ہمیشہ الوہیت سے وابستہ ہونے کی خواہش کرتی ہے اور جمیل و حسین اشیاء چونکہ بذات خود مظہرِ الوہیت ہوتی ہیں - اس لئے روح کا میلان قدرتی طور پر جمال و حسن کی جانب ہوتا ہے۔

اخلاق

افلاطون کے فلسفۂ اخلاق میں، جذبات کو کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے - کیونکہ ان سے اخلاقی نظام میں خلل واقع ہوتا ہے - یعنی نیکی محض ایک ذہنی امر ہے - اسی

---

[1] یعنی واحد سے واحد ہی صادر ہو سکتا ہے ۱۲ [2] وہ جس کا موجود ہونا عقلی طور پر ضروری ہے ۱۲ [3] پیدا ہونے کی جگہ [4] خدا کی شان کا اظہار کرنے والی۔

وجہ سے اُس کا فلسفۂ اخلاق کسی ایسی دنیا کے لوگوں کے لئے جن میں جذبات نہ ہوں، مفید ہو سکتا ہے لیکن ہمارے لئے کارآمد نہیں ہو سکتا۔ اس کے نزدیک چار نیکیاں سب سے اہم ہیں (۱) قوتِ ادراک کی نیکی کا نام . . . . عقل یا حکمت ہے۔ قوت روحانی کی نیکی کا نام شجاعت ہے۔ قوت شہوانی کی نیکی کا نام اعتدال یا ضبطِ نفس ہے اور مجموعی زندگی کی نیکی کا نام عدل یا انصاف ہے۔ یہ وہ نیکی ہے جو سابق الذکر تین نیکیوں میں باہم اتفاق پیدا کرتی ہے اور سب سے مقدم ہے۔

معاشرت تمدنی لحاظ سے انسان کے لئے ضروری ہے کہ کسی سوسائٹی میں شامل ہو کر رہے کیونکہ وہ بنایا ہی اس طور پر گیا ہے کہ تنہا نہیں رہ سکتا۔ حکام کا فرض یہ ہے کہ قوانین ایسے بنائیں جن کی بنا پر سوسائٹی کا ہر فرد باسائش زندگی بسر کر سکے، اور کوئی اُس پر ظلم نہ کر سکے۔ اور خدا کی ذات و صفات کے متعلق صحیح علم کی اشاعت کریں اور جو لوگ خدا کی ذات سے انسانی نقائص منسوب کرتے ہیں انہیں سزا دیجائے۔ جس طرح انسان میں تین بڑی قوتیں ہیں۔ مدرکہ، روحانی، اور شہوانی، اُسی طرح سوسائٹی میں تین قسم کے لوگ ہونے ضرور ہیں حکام، جنگجو اور کاریگر۔ حکام کی خوبی اس پر منحصر ہے کہ وہ عقلمند ہوں، جنگجو لوگوں (فوج) کی خوبی یہ ہے کہ بہادر ہوں اہل حرفت کی خوبی اس میں ہے کہ اطاعت گزار ہوں۔ اور عدل و انصاف مجموعی طور پر کل سوسائٹی کی خوبی ہے۔ انفرادی[1] مفاد کو (ہمیشہ) اجتماعی مفاد پر قربان کرنا چاہئے۔ انفرادی اموال واملاک جان، مال، تعلیم و حرفت غرضیکہ ہر شے سوسائٹی کے ماتحت ہونی ضرور ہے گویا سوسائٹی (حکمت) کو ایک بڑا خاندان سمجھو جس میں ہر شخص کو یکساں طور پر حقوق حاصل ہوں۔ چونکہ عمدہ اور طاقتور اولاد، سوسائٹی کی تقویت کا باعث ہوگی اس لئے شادی بیاہ، کے معاملات بھی حکومت کے ماتحت ہونے ضرور ہیں۔ نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کرنا، حکومت کا پہلا فرض ہے ہر نوجوان کو صبح کے وقت ریاضی، حکمت اور موسیقی کا سبق لینا چاہئے اور شام کے وقت ورزش کرنی چاہئے۔ عورتوں کی جسمانی غور و پرداخت کی طرف، خاص توجہ لازمی ہے کیونکہ اگر وہ کمزور ہونگی تو اولاد بھی کمزور ہوگی۔ اس کے علاوہ ملک کی حفاظت جس طرح مردوں پر فرض ہے اسی طرح عورتوں پر بھی۔ چونکہ زن، زر اور زمین یہ تین چیزیں ہی فساد کا باعث ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ تینوں کسی کی ملکیت نہ ہونی چاہئیں بلکہ سب کچھ حکومت کے قبضہ میں رہنا چاہئے۔ اور وہ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے موافق ہر چیز اپنے پاس سے دیا کرے۔

تبصرہ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے فلسفہ کے حسن و قبح[2] پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے، کیونکہ افلاطون بنی نوع آدم کے غیر فانی معلمین میں سے ہے۔ اور اس کا مرتبہ اسقدر ارفع اور اعلیٰ ہے کہ ہم کبھی اس کو فراموش نہیں کر سکتے۔

پہلی صداقت جو افلاطون کی بدولت دنیا کو نصیب ہوئی یہ ہے کہ اشیائے کائینات کا علم حاصل کرنے سے پہلے ہمیں اپنی قوت "ادراک" کا علم حاصل . . . . . کرنا چاہئے جو خدا کی عطا کردہ نعمتوں میں سب سے بڑی اور قیمتی ہے۔ علم کا نظریہ، جس شخص نے سب سے پہلے دنیا میں پیش کیا وہ افلاطون ہی ہے۔ سقراط کا مشہور مقولہ ہے "سب سے پہلے اپنے آپ کو پہچانو" یہی قول افلاطون کے لئے مشعل راہ بن گیا اور اس نے اسی کنجی سے کائینات کا مقفل صندوق کھولا۔ سوفسطائیوں کی مادہ پرستی کے مقابلہ میں اس نے اس بات پر زور دیا کہ "عقل" ہی صداقت کا منبع ہے کیونکہ اس عالم متغیر میں عقل ہی ایک ایسی چیز ہے جو فنا سے پاک ہے۔ چنانچہ سقراط کہتا ہے کہ "اگر دنیا کی کل اشیاء ہر دم تبدیل ہوتی رہیں اور کوئی ایسی قوت، جو تغیر سے پاک ہو۔ ہمارے اندر موجود نہ ہو تو ہمیں کسی شے کا علم حاصل نہیں ہو سکتا" لیکن عقل انسانی وہ نعمت الٰہی ہے جسکی بدولت انسان کلیات کا علم حاصل کرتا ہے اور اُن تین زبردست حقائق یعنی صداقت، حسن اور خیر محض، سے آشنا ہوتا ہے جو اُسے خدا تک پہنچا سکتی ہیں کیونکہ یہ تین حقائق دراصل خدا کی تین شانیں ہیں جن کا پرتو اور عکس اس کائنات کی بعض اشیاء میں پایا جاتا ہے اور فلسفہ کا مقصد ہی ان حقائق عالیہ کو دریافت کرنا ہے۔ دوسری زبردست صداقت جس کے لئے ہم افلاطون کے ممنون ہیں۔ یہ ہے کہ ہماری قوت متفکرہ کا کام یہ ہے کہ جزئیات کو دیکھکر، ان سے کلیات مرتب کرے اور ان کلیات ہی کی بدولت اس قوت کے مقاصد تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ یعنی ہم اُسی حالت میں صاحب غور و فکر کہلا سکتے ہیں جبکہ ہمارے اندر کلیات مرتب کرنے کی قابلیت پیدا

---

[1] کسی ایک شخص کا ذاتی فائدہ ۱۲

[2] بھلائی یا برائی ۱۲

ہو جائے اور علم کلیات ہی وہ علم ہے جس کی بدولت غور و فکر کے میدان میں جولانی دکھانا ممکن ہے کیونکہ یہ کلیات ہی ذہنی قوتوں کا مقصود ہیں اور اس عالم متغیر میں، عقل انسانی صرف کلیات ہی کو پائیدار اور غیر متبدل حقیقت کے طور پر تسلیم کرتی ہے اور انہی پر علم کی بنیاد رکھتی ہے۔

اس حقیقت عظمیٰ یعنی نظریۂ کلیات نے آئندہ فلسفے پر زبردست اثر ڈالا۔ لاک[1] نے بھی اس صداقت کی دھندلی سی تصویر دیکھی تھی اور کینٹ[2] کے زمانہ سے تو یہ صداقت ہر علم کا جزو لازمی بنی ہوئی ہے۔

اگرچہ افلاطون کا یہ نظریہ، آئندہ چلکر نفسیات میں بہت مفید ثابت ہوا۔ لیکن اس کی کتابوں میں جس طریق سے بیان ہوا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اسے اپنے تصور کائنات میں اثنینیت کو قائل کرنا لازمی ہوگیا یعنی اس تصور میں ایک طرف وہ "روح" کو جوہر غیر مادی تسلیم کرتا ہے اور علم کلیات کو اسی جوہر سے متعلق کرتا ہے۔ دوسری طرف اسی تصور میں وہ اس کائنات کو رکھتا ہے جس میں ہر آن تغیر اور تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ اس دوگونہ عالم میں، پائیداری اور قیام صرف کلیات کو حاصل ہے۔ جزئیات اور انفرادی اشیاء سب عارضی ہیں صرف کلیات ہی کا وجود حقیقی ہے۔ چونکہ کلیات غیر مادی ہیں اور جزئیات مادی ہیں اس لئے علم کلیات حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ کلیات کو مادی علائق سے پاک کیا جائے اور بذریعہ تجرید[3] و تفرید، عالم رنگ و بو سے بالاتر مقام پر قرار حاصل کیا جائے جہاں صرف تخیل ہی تخیل ہو۔ یعنی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ روح جسم کی قیود سے آزاد ہو جائے۔

ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون کے فلسفہ کا رجحان عالم مادی کے تحقیر کرنے کی طرف ہے اور وہ دنیاوی زندگی کو روحانی ترقی میں حائل سمجھتا ہے۔ اثنینیت یعنی عالم کلیات (مجرد عن[4] المادہ) اور عالم احساسات (مادی) نے آگے چلکر فلاسفہ کے لئے طویل بحثوں کا دروازہ کھولدیا۔ یعنی لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ ہم ان دونوں میں تطابق اور توافق کس طرح قائم کریں؟ افلاطون نے اس سوال کا جواب یوں دیا ہے کہ حوادث[5] (احساسات عارضی) کو کلیات (تعلقات حقیقی)

میں غرق کر دیا جائے۔ یعنی عالم جسمانی، کو عالم روحانی میں فنا کر دیا جائے لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات سوال کا جواب نہیں ہے بلکہ گریز کا ایک پہلو ہے۔ وحدت تو حاصل ہوگئی مگر دونوں کو ایک کرنے سے نہیں بلکہ دو میں سے ایک کو حذف کر دینے سے۔ اس جگہ یہ اعتراض بھی کیا جاسکتا ہے کہ اگر جذبات اور خواہشات محض "روح" کے لئے بطور قید و بند ہیں اور ہماری ترقی میں حارج ہیں تو پھر خدا نے انہیں پیدا ہی کیوں کیا؟ اور عالم مادی کے پیدا کرنے میں خدا کی حکمت و مصلحت ہی کیا ہوتی اگر مقصود صرف یہی ہے کہ اس عالم کو فنا کر دیا جائے؟ حقیقت یہ ہے کہ افلاطون فلاسفر ہونے کے ساتھ ساتھ صوفی منش بھی تھا۔ اس لئے اس نے وہی حل پیش کیا جس کی ایک تارک الدنیا[6] سے توقع ہو سکتی تھی۔

فلسفہ مابعد پر اثرات

بہرحال "نظریۂ کلیات" ایسی بیش بہا نعمت اور دولت ہے جس پر افلاطون بجا طور سے فخر کرسکتا ہے۔ اس نظریہ پر صرف اسی کے فلسفہ کا دار و مدار نہیں ہے۔ بلکہ جسقدر آئیڈیل[7] فلاسفہ، بعد میں پیدا ہوئے سب نے اپنے فلسفہ کی بنیاد اسی اصول پر رکھی۔ خواہ ہم اس کے مسائل پر کتنی ہی شدید نکتہ چینی کیوں نہ کریں اور عقلیات میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کریں لیکن ان باتوں سے افلاطون کی عظمت میں کمی نہیں ہوسکتی۔ وہ ایسی فوق العادت[8] عقل و دانش کا مالک گزرا ہے۔ کہ دنیا کے لوگ ہمیشہ اسے اپنا استاد تسلیم کرتے رہیں گے۔ کیونکہ گزشتہ دو ہزار سال میں، جو کچھ مفید اور لائق تحسین انکشافات فلسفہ کے میدان میں ہوئے ہیں۔ ان سب کا منبع، افلاطون ہی کا فلسفہ ہے۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے "ادراک" کی قوت اور خوبیوں کو عالم آشکار کیا اور آج اس کا اثر نہ صرف منطق، اخلاق۔ سیاسیات اور مابعد الطبیعت ہی پر نمایاں ہے بلکہ فنون لطیفہ اور طبیعیات اور الٰہیات پر بھی۔ اس نے طبیعیات کی بنیاد ریاضی پر قائم کی اور علمی تحقیق کا وہ طریق ایجاد کیا جو آجتک دنیا میں مستعمل ہے۔ مذہب کے میدان میں جو خدمات اس نے انجام دیں، ان سے کسی سمجھدار آدمی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ وہ کوئی نبی یا رسول، نہ تھا لیکن خدا کے متعلق جو تعلیم اس نے دی وہ

---

[1] انگلستان کا مشہور فلاسفر جس کا ذکر آئندہ اوراق میں کیا جائیگا ۱۲ [2] جرمنی کا مشہور فلاسفر جس نے دنیائے فلسفہ میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ۱۲
[6] دنیاوی چیزوں سے کنارہ کرنا اور سب سے الگ تھلگ رہنا ۱۲ [4] مادہ سے پاک۔ [5] واقعات [7] وہ فلاسفہ جنہوں نے کلیات پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھی ۱۲ [8] خلاف معمول۔

اُس زمانہ کے لحاظ سے تو واقعی بے نظیر تھی ہی لیکن بذات خود بھی، لائق تحسین ہے۔ اور مادہ پرست حکماء نے جو بیدینی اور الحاد[1] کی بنیاد قائم کی تھی، افلاطون نے اپنی تعلیمات سے اُس کو اچھی طرح ہلا دیا۔ اُس کے "مکالمات" نہ صرف انشاپردازی کا بہترین نمونہ ہیں۔ بلکہ اُن میں خداپرستی اور تقدس کا وہ رنگ پایا جاتا ہے کہ اُن کا مطالعہ کرنے سے انسان کے خیالات میں خوشگوار اور پاکیزہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے رافیل (مشہور اطالی مصور) نے افلاطون کی تصویر میں دکھایا ہے کہ وہ کوئی روحانی عالم ہے جو عالم بالا کی طرف لیجانا چاہتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اُس کا فلسفہ، خشک علمی مباحث ہی کا مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں "مذہبیت" کا عنصر اور رنگ ہر قدم پر موجود ہے۔ گوئٹے (مشہور جرمن مصنف) کہتا ہے کہ افلاطون کا دماغ ہمیشہ ازلی حقایق کی دریافت میں مشغول رہتا تھا اور جس طرح وہ خود تمام عمر صداقت، جمال اور خیر کا متلاشی رہا اسی طرح اُس کی تصانیف کے مطالعہ . . . . . . سے ہمارے اندر ان حقائق کے دریافت کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

جامعیت کے لحاظ سے، اس کے فلسفہ میں، شروع سے لے کر اُس کے زمانہ تک کا سارا فلسفہ پوشیدہ ہے۔ چنانچہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ وہ اہل سفسطہ سے اس بات میں متفق ہے کہ مظاہر کائنات کا علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ سقراط سے اس بات میں متفق ہے کہ حقیقی علم، صرف کلیات ہی کا ہے۔ ہرقلیطوس سے اس امر میں متفق ہے کہ دنیائے محسوس (مادی) ہر لحظہ متغیر ہے۔ پارمینڈیز سے اس امر میں متفق ہے کہ دنیائے کلیات غیر متغیر ہے۔ دیمقراطیس سے اس امر میں متفق ہے کہ نفس ناطقہ مادہ اور جسم سے جداگانہ ہے۔

اُس کے فلسفے نے فلسفۂ مابعد اور مسیحی الٰہیات پر کافی اثر ڈالا۔ بلکہ الٰہیات کے علاوہ مسیحی عقاید، دینیات۔ اخلاق۔ فلسفہ، اور طرز معاشرت سب باتوں پر اس کے فلسفہ کا اثر نمایاں ہے۔ جسطن[2]، اُریجن اور آغسطن کی تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسیحی حکماء سب کے سب اس کے فلسفہ سے متاثر ہوئے ہیں۔ اور انہوں نے اپنے مذہب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں افلاطون کی اصلاحات اور خیالات دونوں استعمال کئے ہیں۔ بہرحال یہ ایک مستقل اور جداگانہ بحث ہے۔ اس لئے مزید تفصیل کی ضرورت نہیں۔

چونکہ اس کے فلسفہ میں رُہبانیت اور ترک دنیا کی تعلیم مخفی ہے۔ اس لئے آگے چلکر جو رہبانیت کا رنگ دنیا میں پیدا ہوا وہ افلاطون کے فلسفہ ہی کا نتیجہ ہے۔ سکندریہ میں جو فلسفۂ اشراق کی بنیاد پڑی اس کا ماخذ بھی افلاطون ہی کا فلسفہ ہے۔ یورپ میں آج بھی اس کے فلسفہ کا اثر (ڈھائی ہزار سال کے بعد) اسی طرح نمایاں ہے جس طرح زمانۂ وسطیٰ میں یا اس سے بھی پہلے، فلسفۂ اشراق میں نمایاں تھا۔

بارکلے اور ہیگل کا فلسفہ دراصل افلاطون ہی کے لگائے ہوئے پودے کا ثمر نورس ہے، اور یہ بات دنیا میں افلاطون کے سوائے کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ جگلت[3] استاد گزرا ہے۔

---

[1] خدا کی ہستی کا انکار کرنا۔ ۱۲

[2] یہ تینوں مشہور مسیحی حکماء اور فضلا ہیں جو دوسری تیسری اور پانچویں صدی عیسوی میں ہوئے ہیں۔ ۱۲

[3] آئندہ اس پر وضاحت کے ساتھ لکھا جائیگا۔

پروفیسر محمد یوسف سلیم

خوابِ ناز

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

موت اور سرمایہ دار

ندامت

اٹلی کے دارالسلطنت وینس کا نظارہ

دنیا کا حسین ترین منظر

مہتہ ہاف ٹون کمپنی انارکلی لاہور نے بلاک بنایا

نیشنل آرٹ پرنٹنگ پریس انارکلی لاہور میں چھپا

جرعہ

گناہ لذت آشنا، ترانۂ رباب ہے — ابھی فضا میں کیف ہے، ابھی ترا شباب ہے
نہ داغ قلب دردزا رہے نہ آفتاب ہے — کسی کے بحرِ حسن کا یہ مشتعل حباب ہے
تجلّیوں کی شوخیاں سمٹ کے حسن بن گئیں — ہزار سادگی سہی شباب پھر شباب ہے
وہی حیاتِ مضطرب وہی وفورِ بیخودی! — مجھے نشاط جلوہ کی نہ تاب تھی نہ تاب ہے
لبوں کے شوخ رنگ سی نظر کے دور حسن میں — شراب میں سرور ہے، سرور میں شراب ہے
سکون و ہوش نام ہے فریبِ اصطلاح کا — جسے جنوں سے عار ہو وہ "کافرِ شباب" ہے
نہیں نہیں! یہ توبہ کیا؟ فضا تو دیکھ ناصحا! — کہ ساغرِ بہار میں شراب ہی شراب ہے
سکون سے ضد نہیں مگر دلِ حزیں کو کیا کروں — جسے نگاہِ لطف بھی پیامِ اضطراب ہے
کمالِ ہوش ہے یہی کہ ہو نثارِ بیخودی — نہیں ضرورتِ حجاب، جلوہ خود حجاب ہے

سروش کی تباہیاں لطافتوں میں کھو گئیں
شباب پر بہار ہے بہار پر شباب ہے

(غیر مطبوعہ) — سروش (بھوپال)

وہ قامتِ بلند نہیں در قبائے ناز — اک سروِ ناز ہے جو بنا ہو برائے ناز
اُس نازنیں پہ ختم ہیں سب شیوہائے ناز — جس کو بنا کے خود بھی ہیں نازاں خدائے ناز
کیا کیا نہ آرزو کے بڑھیں دل میں حوصلے — رکھ دیں کبھی جو فرقِ ہوس پر وہ پائے ناز
اربابِ اشتیاق ہیں اور انتہائے شوق — حالانکہ حسنِ یار ہے اور ابتدائے ناز
کچھ یونہیں اپنے حسن پر مغرور تھا وہ شوخ — کچھ لے اڑی ہے اور بھی اسکو ہوائے ناز

حسرت موہانی

صداقتِ قلب

رات تاریک تھی اور سرد — تاریک سرد اور بھیانک۔ دو انسانی شکلیں چوک پر اتریں۔ برف کے ذرے — سوئی جیسے باریک اور تیز تیروں کے گچھے کی طرح ان کے جسم میں چبھنے لگے۔

بغیر زخم کھائے مگر ہراساں۔ انتہائی ہمت سے کام لیکر انھوں نے اپنی جد و جہد جاری رکھی۔ عورت — نزاکت کا مجسمہ کوٹ کے کالر کو معمولی سے زیادہ مضبوطی سے اپنے گلے کے گرد لپیٹے ہوئے دیو قامت مرد کے بازو کا سہارا لیکر چل رہی تھی۔

اسی گلی میں ان کا گھر تھا۔ اپنے قدیم آرام دہ مکان کو پھر ایک مرتبہ دیکھنے کی خواہش انہیں بیتاب کرنے لگی۔ وہی پرانے دل پسند کمرے جن میں وہ شب و روز رہا کرتے تھے۔ وہی در و دیوار۔ وہی ساز و سامان ان کی آنکھیں مختلف مناظر کی سیر سے اکتا چکی تھیں۔ مصر ہند چین۔ جاپان۔ ایران۔ عرب غرض ایک گردش پیہم۔ دست بدست۔ نبرد زندگی اور... موت میں بھی دونوں کے ہاتھ ملے رہے۔ اب گھر — پیارے قدیم گھر کو دیکھنے دیکھنے کی تمنا ان کے دلوں میں ہیجان برپا کر رہی تھی۔

مرد نے پتلون کی جیب سے کنجی نکالی۔ قفل کھولا۔ پھر دروازہ کھولا اور تعظیماً پیچھے ہٹا — تاکہ عورت پہلے داخل ہو۔

وہ کمرۂ طعام میں آئے۔ مرد نے بڑا لیمپ روشن کیا۔ اس کے زبردست ہاتھ میں دیا سلائی — ایک حقیر بے حقیقت سی شئے چمکی۔ بغیر ایک لفظ کہے دونوں نے کوٹ اور ٹوپیاں اتاریں۔ مرد نے ان پر جمی ہوئی برف جھٹکی۔ ہر چیز اسی ترتیب سے رکھی ہوئی تھی۔ جیسے کہ وہ چھوڑ گئے تھے۔ عورت نے کوکو کا ٹن اٹھایا۔ اس کی سوالیہ نظر کا جواب مرد کے اثبات میں سر ہلانے سے مل گیا۔ اس نے اسٹو پر پانی چڑھا دیا۔ مرد کھڑا رہا۔

وہ بھاپ نکلتی ہوئی پیالی ایک گھونٹ میں چڑھا گیا۔ عورت نے بھی اپنی پیالی اٹھائی۔

مرد نے ایک شمع اٹھائی۔ اسے روشن کیا اور بڑا لیمپ بجھا دیا۔

انھوں نے بالاخانہ کی سیڑھیاں دست بدست طے کیں۔ ہال میں سے گذر کر وہ سونے کے کمرے کے دروازے پر پہونچے۔ دروازہ کھولا۔ مرد پھر تعظیماً پیچھے ہٹا۔ عورت پہلے داخل ہوئی۔ پھر مرد۔ اور عورت دونوں سو گئے۔ اس دوران میں کسی کی زبان سے بھی ایک لفظ تک نہ نکلا۔ یہ بھی عجیب بات ؟

تاہم ہر ہفتہ میں ایک بار ضرور ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب یہ میاں بیوی سینما دیکھ کر گھر واپس آتے ہیں۔

محمد محی الدین تنویر قریشی
متعلم جامعہ عثمانیہ

تمہاری یاد کو سینے سے ہوں لگائے ہوئے — ضیائے حسن سے یہ گھر ہوں جگمگائے ہوئے

فسانہ ہائے غمِ عشق باغ میں نہ کہو — یہ نغمے بلبل شوریدہ کے ہیں گائے ہوئے

گلوں کے ذوقِ نمو کا نہ پوچھیے احوال — ہیں فرطِ جوش سے چہرے بھی تمتمائے ہوئے

جہانِ حسن میں دیوانہ وار پھرتا ہوں — متاعِ ہوش و خرد ہاتھ میں اٹھائے ہوئے

سجی ہوئی ہے بساطِ فلک تمام و کمال — ہر ایک سمت ستارے ہیں جگمگائے ہوئے

کسی کی یاد سے بہلا رہا ہوں دلِ فطرت — نگاہ روئے قمر پہ ہوں میں جمائے ہوئے

"نعش کا چہرہ"

میں ایک روز صبح کے وقت کلب میں بیٹھا تھا۔ ایک ہفتے کامل پیش نظر تھا۔ اتنے میں میرا پرانا رفیق پیگٹ بن مانس کی طرح اچھلتا کودتا میرے پاس آپہونچا۔

پیگٹ:۔ "مسٹر فش تم کو دوسروں کے معاملات سے بہت دلچسپی ہے نا"۔

"جب کوئی معاملہ زیادہ دلچسپ ہو تو میں ضرور دلچسپی لیتا ہوں"۔

بہت اچھا تمہاری طبیعت کے مطابق ایک راز کا سراغ لگایا ہے۔ کل میں نے اپنے مختار سے اپنے مکان کے خریدار کا تذکرہ کیا تھا سالیسٹر نے تحقیقات کے بعد ٹیلیفون پر جواب دینے کا وعدہ کیا تھا گھر پہونچتے ہی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فوراً کان لگایا۔ آواز آئی میں نے تحقیقات کر لی۔ میں سمجھا سالیسٹر صاحب بات کر رہے ہیں میں نے جواب دیا۔ بہت بہت شکریہ۔ کیا معلوم ہوا۔ مسٹر فش میں کیا عرض کروں۔ اس کے بعد جو قطعاً غیر مانوس آواز آئی۔ اور جواب بالکل ہی خلاف توقع تھا۔ جواب یہ تھا۔ نعش کا چہرہ کچھ سرخی مائل ہو گیا ہے۔ سرخی ایسی ہے جیسی زندہ آدمی کے چہرہ پر ہوتی ہے۔

میں نے کہا "معاملہ تو بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ تم نے بات کو نبھا کر مزید حالات معلوم کئے ہوں گے"۔

نہیں میں ایسا نہیں کر سکا۔ اسی کا تو افسوس ہے۔ میں بالکل بوکھلا گیا۔ میں نے کہا "یہ کیا کہہ رہے ہو۔ میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ دوسری جانب سے ٹیلیفون پر بولنے والے نے دریافت کیا آپ کون صاحب ہیں۔ جب میں نے اپنا پتہ بتایا تو اُن سے کہا معاف کیجئے۔ نمبر غلط ہو گیا۔ بس ٹیلیفون بند کر دیا۔

"خیر پھر تم نے مرکز سے دریافت کیا کہ تم سے کس نے بات کی تھی"؟

پیگٹ صاحب بہت تجربہ کار بنتے تھے۔ مگر اُس وقت میرے سوال سے گھبرا گئے اور بولے "اس کا تو مجھ کو خیال نہیں رہا" پھر یوں بات بنائی۔ "شاید مرکز سے بھی پتہ نہ چلتا۔ ممکن ہے بولنے والے نے پبلک ٹیلیفون سے بات کی ہو۔ بہرحال میرے سالیسٹر کا یہ نام ہرگز نہ تھا"۔

"کوئی اور ذریعہ تمہارے علم میں ہے جس سے کچھ سراغ چلے"۔

"کوئی نہیں۔ میرے علم میں کچھ نہیں ہے۔ تم غور کرو۔ آخر تم بھی پریشان ہو کر رہ جاؤ گے۔ اور حاصل کچھ نہ ہو گا۔ مسٹر فش سیکڑوں باتیں روز ہوا کرتی ہیں تم ایک کا بھی اصل حال نہیں بتا سکتے۔ زیادہ سے زیادہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ کسی جگہ کوئی واقعہ ہو گیا ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

یہ کہا اور پیگٹ صاحب نہایت متانت کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے تشریف لے گئے۔

میں واقعات کو گھڑنے والا سراغ رساں نہیں ہوں۔ اسی وجہ سے میری کارروائی قریب قریب بچوں کی سی آسان اور عام فہم ہوتی ہے۔ جب میں کسی بات کے متعلق نہیں جانتا ہوں۔ دوسروں سے دریافت کر لیتا ہوں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو کوئی سراغ رساں کبھی نہیں کرے گا۔ چنانچہ اس موقع پر بھی میں نے اپنے کسی اُستاد کی طرف متوجہ ہونا چاہا۔ ڈاکٹر براؤن کمرے کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے "ٹائمس" اخبار پڑھ رہے تھے۔

ان کا قد چھوٹا ہے۔ عینک لگاتے ہیں۔ میرے مذاق کے مطابق وہ اس کام کے لئے بہترین شخص معلوم ہوئے۔ میں ان کے پاس گیا اور اپنے سوال کے عجیب اور بے محل ہونے کی معافی مانگتے ہوئے دریافت کیا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے تعجب کی بات ہے نعش کا چہرہ سرخی مائل کیسے ہو گیا۔

"ہرگز نہیں ہوا۔ ہو سکتا ہی نہیں۔ ڈاکٹری اصول سے قطعی ناممکن ہے۔ چہرہ کا رنگ جسم کے مختلف حصوں میں خون تقسیم ہو جانے سے کچھ متغیر ضرور ہو سکتا ہے۔ لیکن سرخی مائل کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ مسٹر فش کسی نے آپ کے ساتھ تمسخر کیا ہے۔

مجھے پیگٹ کی فطرت سے خوب واقفیت تھی۔ وہ بالکل خشک مزاج شخص ہے۔ معمولی ریلوے ٹائم ٹیبل بھی پیگٹ کی رفاقت سے زیادہ دلچسپ ہو سکتا ہے۔ اس کو ایسا مذاق خواب میں بھی نہ سوجھتا

البتہ یہ ممکن تھا کسی دوسرے نے اُس کو بنانے کے لئے ایسا کیا ہو۔ یہ خیال بھی بے بنیاد نظر آیا۔ اب کوئی حل عقل میں نہ آنے سے خفقانی کیفیت پیدا ہو گئی۔ طبیعت کو دوسری طرف رجوع کرنے کی غرض سے اخبار میں جو سب سے پہلا اشتہاری معمہ نظر آیا اُسکو حل کرنے لگا۔ اور پیگیٹ والا معاملہ طاقِ نسیاں پر رکھدیا۔

اخبارات کے اشتہاری کالم میں جو مضامین معموں کی شکل میں شائع ہوتے ہیں ذراسی مشق والا بھی اُن کو آسانی سے حل کر سکتا ہے کوئی دقیق چیستاں عموماً نہیں ہوا کرتی۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ کوئی کامل ماہر فن تو اس مشورہ میں شریک ہوتا نہیں ہے۔ ہر اشتہار دینے والا حسب ضرورت بغیر کسی اصول کے طبع آزمائی کر لیتا ہے۔ اور خیال کرتا ہے کوئی غیر آشنا نہ سمجھے گا۔ مگر سمجھنے والے سمجھ لیتے ہیں۔ بیشتر اس قسم کے اشتہارات عشقیہ مضامین اور مقاصد کے ہوا کرتے ہیں سنجیدہ مزاج اس خرافات سے کچھ محظوظ نہیں ہوتے۔ دس منٹ میں اشتہاری معمہ میں نے حل کر لیا۔ وَھُوَ ھٰذَا

ایچ۔ ایل سے ایک ہزار مل گئے۔ اب گلچھرے ہیں۔ ایک مہینہ کا نوٹس دے کر غیر مستحق کے پاس پہونچو۔ بمقام مارڈیل بوائز (لڑکے) ایسے ہی بائیسکل پر پھر چڑھیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اعلان کرنے والے کو ایک ہزار پونڈ ملے ہیں۔ اور وہ چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا اپنی نوکری چھوڑ دے۔ نوٹس کی مدت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قسم کی ادنیٰ ملازمت ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ نوکری چھوڑ کر مارڈیل کے غیر مستحق کے پاس آ جائے۔ جو غالباً اعلان کنندہ ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ "بوائز (لڑکے) ایسے ہی بائیسکل پر چڑھیں"۔ اس سے کیا مراد ہے۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اور میں نے مکرر اپنے دوست پیگیٹ کی داستان پر غور کرنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر میں مجھے اُمید کی کچھ موہوم جھلک نظر آئی۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ پیگیٹ سے ٹیلیفون پر کس نے بات کی تھی۔ لیکن اتنی اُمید ضرور نظر آئی کہ میں اس آدمی کو دریافت کر سکوں گا۔ جس کے دھوکے میں پیگیٹ سے ٹیلیفون ملایا گیا تھا۔

پیگیٹ کے ٹیلیفون کا نمبر ۱۴۰۹ ہے۔ انگریزی میں نو اور پانچ قریب المخرج ہیں ممکن ہے ایکسچینج (مرکز) کی غلطی سے ۱۴۰۵ کے بجائے ۱۴۰۹ کو ملا دیا گیا ہو میں نے اس انکشاف سے فائدہ اُٹھانا چاہا اور ۱۴۰۵ نمبر کو ٹیلیفون کیا اور ایک کاروباری آدمی بنکر باتیں شروع کیں۔

"آپ نے جو چیزیں طلب فرمائی تھیں آج صبح سب روانہ کر دی گئیں پہونچی ہوں گی۔"

ایک مست آواز نے دریافت کیا۔ "کون بول رہا ہے"۔

میں نے جلدی سے پہلی دکان جو ذہن میں آئی اُس کا نام لیکر کہا "لیسنگ کمپنی وکٹوریا اسٹریٹ"

جواب ملا۔ "ہمیں تو کوئی ایسا آرڈر دینا یاد نہیں"۔

"درست مجھے کس سے کلام کرنے کا فخر حاصل ہوا"۔

"مسٹر ہومز لاریوال مرحوم کا میں سکرٹری ہوں"۔

"ہاں؟ معاف کیجئے غالباً نمبر غلط ہو گیا۔ آپ کو بیکار تکلیف ہوئی"۔

ٹیلیفون کو میں نے رکھدیا۔ ٹیلیفون کی کتاب سے پتہ چلا کہ یہ نمبر ہومز لاریوال کے مکان مسکونہ کا ہے۔ دفتر کا نمبر یہ نہیں ہے۔

مجھ کو اس شخص کا حال معلوم تھا۔ تین دن قبل اس کا انتقال ہوا تھا۔ اخبار میں وفات شائع ہوئی تھی۔ ایک کروڑپتی آدمی تھا۔ آسٹریلیا کا باشندہ تھا۔ اس ملک میں تقریباً بیس سال سے مقیم تھا۔ اعلان وفات میں یہ فقرہ بھی تھا۔ "خانگی معاملات میں بہت نرم دل تھا۔ مگر کاروباری زندگی میں بہت سخت" یہ فقرہ خاص طور پر قابل توجہ تھا۔ ہومز لاریوال اپنے گھر پر مرا تھا۔ چہرہ کے رنگ کا پیام اس کے گھر سے دیا جا سکتا تھا۔ نہ کہ برعکس اس کے گھر کو یہ خبر پہونچائی گئی اس گتھی نے مجھے سخت پریشان کیا۔ گویا ایک مشکل سے نکل کر دوسری مشکل میں جا پھنسا۔ جب ہومز لاریوال کے نام پر غور کیا تو خیال ہوا کہ اشتہاری معمہ بھی اسی سے متعلق نہ ہو۔ کیونکہ اشتہار میں ایچ۔ ایل دو حرف موجود تھے۔ جو ہومز لاریوال کے انی شیل (   ) ہو سکتے تھے۔ ہزار اشرفی (پونڈ) کی وصیت ہو گی۔ لیکن وصیت کرنے والے کی موت کے بعد معاً دوسرے ہی روز کوئی وصیت شائع نہیں کی جاتی۔ غیر مستحق (   ) کا ترجمہ ہے اور یہ انگریزی لفظ آسٹریلیا میں مخصوص طور پر مستعمل ہے۔ شاید وصیت پانے والا اعلان کنندہ آسٹریلیا کا باشندہ ہو۔ اور مرحوم کا دوست۔ میں نے نقشہ اُٹھا کر دیکھا۔ "مارڈیل" کسی شہر کا نام نہ تھا۔ البتہ لندن سے بیس میل پر "مارڈیل بوائز" ایک قصبہ ملا۔ اب تو سراغ چل نکلا۔ معمہ میں نے صحیح حل نہیں کیا تھا۔ بمقام "مارڈیل" نہیں بلکہ بمقام "مارڈیل بوائز" بلایا تھا۔ اب دوسرا فقرہ "ایسے ہی بائیسکل پر پھر چڑھیں۔ لڑکوں سے متعلق نہ رہا بلکہ بجائے خود حل طلب ہو گیا۔

میں نے مارڈیل بوائز جانے کا تہیہ کر لیا۔ تاکہ مزید تحقیقات

کر سکوں۔ فوراً کھانا کھا کر روانہ ہو گیا۔ اور سہ پہر کو تین بجے کے قریب مارڈیل بوائز پہونچ گیا۔ میں وہاں کے مکانوں کے دلال سے ملا۔ کیونکہ ان لوگوں کے پاس طرح طرح کی خبریں ہمیشہ رہا کرتی ہیں اور وہ ان خبروں کی اشاعت کو بھی پسند کرتے ہیں۔ خصوصاً جب کوئی گاہک ملجائے تو پھر بہت خوشی سے وہ ہر بات بتلانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ میں نے دلال کو اپنا نام سی۔ این۔ ایم بگلے بتلایا۔ اور یہ کہا کہ مجھے مکان خریدنے کی خواہش ہے۔ ایک خوبصورت چھوٹا سا بنگلہ مع پائیں باغ کے ہونا چاہئے۔ جس کے دام بارہ ہزار سے زیادہ نہ ہوں۔ یہ صرف ایک بہانہ تھا۔ اور اس میں اگر کچھ بھی سچ بات تھی تو وہ یہ تھی کہ میں بارہ ہزار سے زیادہ نہیں دے سکتا تھا۔

اس معاملہ کے متعلق میں نے بہت مفصل گفتگو کی۔ مجھے دوسرے معاملات کے بارہ میں بھی دریافت کرنا تھا۔

میں نے کہا "کہئے گرجے میں عبادت بہت زیادہ مذہبی دستور العمل کے موافق تو نہیں ہوتی؟ یہاں کے لوگ سوشل نقطۂ نظر سے کیسے ہیں میں نے ایک آسٹریلین کا ذکر سنا ہے۔ جو حال ہی میں یہاں آکر قیام پزیر ہوا ہے۔ کیا نام ہے اُس کا۔ اس وقت ذہن میں نہیں آتا۔۔۔"

دلال نے بہت غور کرنے کے بعد کہا "کسی آسٹریلین کے ورود کا تو مجھے علم نہیں ہے"۔ گرچہ یہ جواب یاس آمیز تھا مگر اس نے فوراً ہی کہا "یہاں کئی شخص مالدار ہیں۔ جن کے پاس موٹریں وغیرہ بھی ہیں"۔

میں نے ذرا سنبھلکر پھر پوچھا "یہاں کا ڈاکٹر تو قابل اطمینان ہے"۔

ایجنٹ نے کہا "جی ہاں ڈاکٹر کاج ڈیل کی لیاقت میں کوئی شک نہیں اُنھوں نے عرصہ تک میرا اور میرے خاندان کا علاج کیا ہے"۔

میں نے کہا "اگر کوئی دوسرا ڈاکٹر یہاں پریکٹس کرے تو اس کا کام کچھ چلتا ہوا رہے گا یا نہیں"۔

ایجنٹ "میں کہنا بھول گیا تھا۔ یہاں ایک اور ڈاکٹر بھی ہیں جو غیر مستحق کے طور پر کام کرتے ہیں۔ بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ مگر کام کچھ اچھا نہیں چلتا"۔

"غیر مستحق" کے لفظ پر میں چونک پڑا (میرے کان کھڑے ہوئے) میں نے کہا "غیر مستحق کے کیا معنی"؟

جناب یہ لفظ میں نے ڈاکٹر کاج ڈیل سے سنا ہے۔ یہ ایک ڈاکٹری اصطلاح ہے۔ غیر مستحق اس کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے ڈاکٹر کی پریکٹس کا جائز وارث نہ ہو۔ اور بغیر استحقاق کے کسی ڈاکٹر کے پریکٹس خریدے ہوئے بغیر کسی مقام پر کام شروع کر دے۔

میں نے کہا "اچھا یہ بات ہے"

اب دلال سے زیادہ بات چیت بیکار تھی۔ مجھکو سیدھا راستہ مل گیا تھا۔ مارڈیل بوائز کے غیر مستحق ڈاکٹر آربرٹ تھے۔ لہذا مجھکو اُن سے ملنا چاہئے۔

وہ ایک چھوٹے سے نئے بنے ہوئے مکان میں رہتے تھے۔ مکان خوب صاف ستھرا تھا۔ لیکن سامان آرائش کچھ بہت امیرانہ نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب بہت خوش اخلاق معلوم ہوتے تھے۔ عمر تخمیناً ۳۰ سال ہوگی۔ ان کے اپنے پیشے کا کوئی خاص وقار چہرے سے ظاہر نہیں ہوتا تھا۔

میں نے اپنا نام اُن کو بھی سی۔ این۔ ایم بگلے بتلایا۔ اور اپنے آنے کی غایت یہ ظاہر کی کہ چونکہ وہ اس قرب وجوار میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے لہذا اُن سے وہاں کی سینٹری حالت دریافت کرنا منظور تھا۔ جس کے متعلق ایک ڈاکٹر کا بیان بہ نسبت دلال کے زیادہ معتبر ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "میں نہایت خوشی سے کل حالات عرض کروں گا"۔ پانی اور نالیوں کی صفائی کا حال بہت تفصیل وار بیان کرتے رہے۔ میں بھی بغور تمام سنتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ اصرار کے بعد گنی قبول فرمائی جو میں نے نذر کی تھی۔ یہ بھی فرمایا کہ کسی معاوضے کے لالچ سے وہ متوجہ نہیں ہوئے تھے۔

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب اگر آپ ایسا ہی کریں گے تو کبھی اپنے مرحوم دوست ہومز لاریوال کے مثل کر وڑپتی نہ ہو سکیں گے"۔

نوجوان ڈاکٹر نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ اور کہا "ہومز لاریوال اور میرا دوست؟ میں تو اس کو اپنا دشمن خیال کرتا تھا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے آپ نے اس کا علاج ضرور کیا ہے"۔

"ہاں بیشک ڈاکٹری حیثیت سے میں ایک بار اس کے پاس ضرور گیا۔ مگر اس وقت جبکہ وہ مر چکا تھا"۔

اس مرتبہ میں نے تعجب سے دیکھا اور کہا "جناب یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی"۔

"جی ہاں۔ یہ بات ذرا تعجب انگیز ضرور ہے۔ لیکن واقعہ یہی ہے۔ کل میں نے بحیثیت ڈاکٹر ہومز لاریوال کو دیکھا۔ اور وہ ایک روز قبل مر چکا تھا"۔

جب ڈاکٹر نے مزید روشنی اس معاملہ پر ڈالنے سے گریز کیا تو میں نے سلسلۂ کلام کو بڑھا کر کہا "اگرچہ میں اجنبی ہوں۔ تاہم میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اپنے مردہ مریض سے آپ کو ایک ہزار کی رقم وصیتاً خوب ملی"۔

ڈاکٹر نے کہا "آپ کا شکریہ" مگر چہرہ سے کچھ تکدر کے آثار نمودار ہوئے اور اپنے کلام کو اس طور پر ختم کیا: "غالباً آپ نے میرے اور ہومز لاریوال کے تعلقات کا بازار کی گپ سے اندازہ کیا ہوگا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ کو مرکز کا حال کس طرح معلوم ہوا۔ ہومز لاریوال کے وکیل نے ضرور مجھکو باضابطہ اطلاع دی۔ لیکن میں نے کسی سے اس کا اب تک تذکرہ نہیں کیا۔"

میں نے کہا: "معاف کیجئے۔ صبح کے اخبار میں آپ کا اشتہار شائع ہوا ہے۔"

"لیکن وہ اعلان معمہ کی صورت میں ہے۔ اور واقعہ کار کے علاوہ میرا خیال تھا کوئی اس کو نہیں سمجھ سکتا۔"

میں نے کہا: "جس کسی نے اعلانی معموں کو حل کرنے کی ذرا سی بھی مہارت پیدا کی ہوگی اس کے سامنے آپ کا اعلان بچوں کے معموں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔"

ڈاکٹر نے کہا "خیر کچھ بھی ہو۔ آپ کا اس سے کوئی سروکار نہیں ہے میں نے اپنی بیوی کو پرائیویٹ پیغام بھیجا ہے۔"

میں نے کہا: "حضرت یہ سچ ہے۔ مجھکو اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ اور در اصل میرا کچھ تعلق نہیں ہے۔ لیکن اگر اپنی بیوی کو پرائیویٹ پیغام ہی بھیجنا منظور تھا تو ڈاک کے ذریعہ سے آسان تر، ارزاں ہوتا اور راز کا اعلان بھی نہ ہوتا۔"

ڈاکٹر "ارے صاحب میری کوئی مصلحت ہوگی۔ آپ کو اس تفتیش سے کیا غرض۔ آپ کو تو سب کچھ معلوم ہی ہے۔ اب تکرار کی کیا ضرورت ہے۔"

"مجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم ہے۔ مثلاً ایسے ہی بائیسکل پر پھر چڑھیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟"

ڈاکٹر نے بگڑ کر کہا: "اور میں آپ کو بتاؤں گا بھی نہیں۔"

میں نے کہا: "مجھکو یہ بھی نہیں معلوم کہ نعش کا چہرہ سرخی مائل کیوں ہو گیا۔"

ڈاکٹر۔ "یہ تو میرے اعلان میں نہیں تھا۔ آپ کو ہر بات کس طرح معلوم ہو گئی۔ خیر اب اس کا یقین رکھئے۔ مجھ سے آپ مزید حالات معلوم نہیں کر سکتے۔ کیا میں عرض کر سکتا ہوں کہ آپ کو ریل سے واپس جانا ہے۔ اور وقت قریب ہے۔"

یہ ڈاکٹر کی انتہائی کج اخلاقی تھی۔ میں نے ایک اور تدبیر سوچی۔ اور کہا: "خیر ڈاکٹر صاحب خدا حافظ۔ میں آپ کے پاس اپنی چھوٹی کتاب ضرور بھیجوں گا۔ جو میں نے اخبارات کے معموں پر لکھی ہے۔ ابھی وہ زیر طبع ہے۔ اس کو آپ اپنے معمہ کے صلہ میں نذر سمجھئے گا۔"

یہ فقرہ کارگر ہوا۔ واپسی سے قبل مجھے وعدہ کرنا پڑا کہ ڈاکٹر کا معمہ میری کتاب میں شائع نہ ہوگا۔ اگرچہ ایسی کتاب لکھنے کا میرا قطعی قصد نہ تھا اور ڈاکٹر از براہ نے مجھ کو ہر بات مفصل طور پر بتلا دی۔ تمام حال معلوم ہونے پر میں اپنے آپ کو اس وجہ سے نفریں کرنے لگا کہ معاملہ نہایت صاف تھا۔ اور اس کا حل بالکل آسان ہونے کے باوجود مجھے ادھر اُدھر پوچھتے پھرنا پڑا۔

چھ بجے میں لندن پہنچا۔ کپڑے بدلکر کھانے کے وقت کلب جا پہنچا۔ تجربہ کار پیگیٹ ڈاکٹر بوڈن سے سلطنت کی آئندہ حالت پر بحث کر رہا تھا۔ اس کے خیال میں حالات کچھ زیادہ اُمید افزا نہ تھے۔

مجھے دیکھکر پیگیٹ نے کہا: "ہم دونوں یہاں کھائیں گے۔ تم بھی شریک ہو جاؤ۔" میں نے کہا: "ضرور۔ اس سے اچھا موقع اور کیا ہوگا۔" کھانے کے درمیان پیگیٹ نے صبح کے واقعہ کا تذکرہ کیا۔ اور بوڈن کو مخاطب کر کے کہا: "فرش کو دنیا بھر کے معاملات میں خواہ مخواہ دلچسپی لینے کا مرض ہے لیکن آج صبح میں نے ان کی ساری شیخی کر کری کر دی۔ واقعہ بھی عجیب تھا۔ فرش کو بھی ماننا پڑا کہ تحقیقات ناممکن ہے۔"

اس کے بعد پیگیٹ نے بوڈن کو سارا حال سنا دیا۔ میں نے کہا: "ارے میاں وہ تو ذرا سا ہی غور کرنے پر بالکل کھل گیا۔ میں نے پوری تحقیقات کر لی ہے۔ مگر بوڈن نے غلط راستہ پر لگانا چاہا تھا۔"

بوڈن نے جلدی سے عینک لگائی اور بولے۔

"یہ کیسے؟"

"آپ نے کہا تھا نعش کا چہرہ سرخی مائل نہیں کیا جا سکتا۔"

بوڈن۔ "میں نے تو یہ نہیں کہا تھا۔ میں نے کہا تھا نعش کا چہرہ خود بخود سرخی مائل نہیں ہو سکتا۔ اور یہی تم نے اس وقت دریافت کیا تھا۔ اب تم بالکل دوسری بات کہتے ہو۔ اُس وقت قدرتی اصول کا تذکرہ تھا اور اب مصنوعی ترکیب کا بیان کر رہے ہو۔ میں اب بھی کہتا ہوں چہرہ خود بخود ہرگز سرخی مائل نہیں ہو سکتا۔ لیکن رنگا کیوں نہیں جا سکتا۔ اس سے انکار کیسے ہو سکتا ہے۔ خود مجھ سے نعش کا چہرہ رنگنے کی فرمائش ہو چکی ہے۔ میں نے یہ کام منظور نہیں کیا۔"

پیگیٹ نے کہا: "بہت اچھا۔ بہت اچھا۔ بہت اچھا۔ برہم ہونے کی کیا بات ہے۔ پہلے سب حال تو سن لو۔ ہاں فرش تو پھر کیا معلوم ہوا۔"

میں نے کہا: "کوئی من گھڑت قصہ نہیں ہے۔ ایک سیدھا سادہ واقعہ ہے۔ ممکن ہے سننے کے بعد سب دلچسپی ختم ہو جائے۔ سنئے۔

ڈیڑھ سال ہوا ڈاکٹر آر برایٹ جو مارڈیل بوائز میں ایک نئے ڈاکٹر کی حیثیت سے آکر بسے ہیں وہ صبح کے وقت سائیکل پر جا رہے تھے۔ ایک موڑ پر ایک دوسرا سائیکل سوار جو غلط ہاتھ پر سائیکل چلا رہا تھا ڈاکٹر سے بھڑ گیا۔ ڈاکٹر کا ہاتھ زخمی ہوا۔ اور سائیکل بری طرح ٹوٹ گئی۔ دوسرا سائیکل سوار جو اتفاق سے آسٹریلیا کا کروڑپتی ہومزلاریوال تھا وہ بچ گیا۔

"ڈاکٹر نے ہرجہ طلب کیا۔ ہومزلاریوال نے صاف جواب دیدیا کہ میں کچھ نہیں دوں گا۔ میں غلط ہاتھ پر ضرور تھا۔ لیکن ڈاکٹر کا بھی قصور ہے۔ ڈاکٹر نے گھنٹی نہیں بجائی۔ اگر مقدمہ چلاؤ گے تو میں بھی جوابدہی کروں گا۔ اور تم بیکار زیر بار ہوگے۔ ملیگا کچھ نہیں"۔

ڈاکٹر غریب آدمی ہے۔ ابھی چند روز سے مارڈیل بوائز میں مطب کرتا ہے۔ چند روز ہوئے شادی بھی کرلی ہے۔ کروڑپتی کے مقابلہ میں مقدمہ بازی کی ہمت نہ ہوئی۔ بائسکل کو رو بیٹھا۔ دعویٰ نہیں کیا۔ درحقیقت بیچارہ مجبور تھا۔ دوسری سائیکل خریدنے کی مقدرت بھی نہ تھی۔ حالت یہ ہے کہ اس کی بیوی تک کو نوکری کی وجہ سے ادھر اُدھر مارا مارا پھرنا پڑتا ہے تین دن ہوئے ہومزلاریوال کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے بعد ہومز کا وکیل فوراً مارڈیل بوائز گیا۔ ڈاکٹر آر برایٹ سے ملا اور کہا "ہومزلاریوال اپنے وطن (آسٹریلیا) میں دفن کیا جائے گا۔ لہذا اس کی نعش کو مصالحہ لگا کر محفوظ کرنے کی ضرورت ہے۔ اور مرحوم نے وصیت کی ہے کہ ڈاکٹر آر برایٹ سے درخواست کی جائے کہ وہ یہ کام کردیں۔ اور وصیت نامہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ وصیت کنندہ کو توقع ہے کہ ڈاکٹر آر برایٹ اس کے جسم کو اب محفوظ کردینے میں اتنی ہی محنت کریں گے جس قدر ایک بار اس کو بدنما کردینے کی کرچکے ہیں۔

پہلے تو ڈاکٹر کا ارادہ ہوا کہ انکار کردے۔ پھر خیال کیا کہ ڈاکٹری ویسے ہی نہیں چلتی۔ اگر ہر کام سے انکار کیا جائے گا تو کام کیسے چلے گا۔ اور معقول معاوضے کی اُمید بھی تھی۔ لہذا منظور کرلیا۔ اب سنئے معقول معاوضے کا حال۔ ہومزلاریوال ایک ہزار اشرفی کا ترکہ ڈاکٹر آر برایٹ کے نام وصیت میں بمعاوضہ تحفظ نعشی لکھ گیا تھا۔ مگر شرط یہ تھی کہ ترکے کا مال ڈاکٹر کو قبل اس کے جواب کے نہ بتایا جائے۔ جب کام کرنا منظور یا نامنظور کرچکے۔ اس کے بعد بتایا جائے۔ ڈاکٹر نے خوش نصیبی سے منظور کرلیا اور ترکہ پایا ورنہ محروم رہجاتا۔

دوسرے روز علی الصباح ڈاکٹر آر برایٹ لندن پہونچ گیا۔ نعش کو اینبام د[؟] یعنی مصالحہ لگا کر محفوظ کرنے کی غرض سے ایک تجہیز و تکفین کرنے والے کارخانہ میں پہونچا دیا گیا۔ وہاں سب کام سرانجام ہوگیا۔ کیوں بوڈن اب آج کل تو اس کا عام رواج ہوگیا ہے"۔

بوڈن - ہاں - ہاں۔ جسم کی کسی رگ میں پچکاری سے ایک عرق بھر دیتے ہیں۔ عرق رنگین ہوتا ہے۔ جس کا چہرہ پر وہی اثر ہوتا ہے جو تم دریافت کررہے تھے۔

پیگٹ: "میرے خیال میں ابھی عام طور پر رواج نہیں ہوا ہے"۔

بوڈن: "ہوگیا ہے۔ کفن دفن کا انتظام کرنے والے بڑے بڑے کارخانہ دار ایک ایسا ماہر کرنے والا بھی رکھتے ہیں"۔

میں نے کہا: "واقعے کا بقیہ حصہ زیادہ تشریح کا محتاج نہیں ہے۔

ہومزلاریوال کی بیوہ کو تردد تھا کہ نعش کا چہرہ زیادہ متغیر نہ ہوجائے۔ وہ سکریٹری سے استفسار کررہی تھی۔ سکریٹری سالیسٹرز (وکلاء) کے دفتر سے دریافت کررہا تھا۔ دفتر والے ڈاکٹر سے باتیں کررہے تھے۔ محض اتفاق تھا کہ پیگٹ کا ٹیلیفون ڈاکٹر کے ٹیلیفون سے ملا دیا گیا۔ جس کا نمبر ۴۰۹ ہے اور وہ جواب جو ڈاکٹر نے ۴۰۵ نمبر پر سکریٹری کو دینا چاہا تھا۔ پیگٹ نے سنا"۔

میں نے اپنے دوستوں سے ڈاکٹر آر برایٹ کے اشتہاری معمہ کا کچھ تذکرہ نہیں کیا۔ جس کو سنکر وہ میری تفتیش کی تہ کو پہونچتے۔ اور معاملہ کی پیچیدگی بالکل کالعدم ہوجاتی اور اُسی کے ساتھ میری محققانہ قابلیت بھی ڈاکٹر بوڈن بھی یہ نہ سمجھ سکے کہ میں اس معمہ کی جڑ تک کیونکر پہونچا۔ اور یہی میری مزید مسرت کا باعث ہے۔

اب اشتہاری معمہ کا مختصر حال بیان کردینا مناسب ہے۔ ڈاکٹر آر برایٹ کی بیوی ایک لیڈی کی بطور خواص کے ملازمہ تھی۔ وہ لیڈی کچھ عجیب مزاج کی تھی۔ اس کا محل ایک پہاڑی پر تھا۔ جس کے قریب کوئی آبادی چھ میل سے کم فاصلہ پر نہ تھی۔ لیڈی نے ریلوے کے محکمہ اور ایک سائیکل والے لڑکے سے یہ انتظام کرلیا تھا کہ صبح ناشتے سے قبل لندن کی اخباری ڈاک اُن کو روزانہ ملجاتی تھی۔ اور معمولی ڈاک اس کے تین گھنٹے بعد پہونچتی اور وہ بھی دن میں صرف ایک مرتبہ۔ لہذا اخبار کے ذریعہ سے آر برایٹ کی بیوی کو خوشخبری جلد سے جلد مل سکتی تھی یہ وجہ تھی اخباری اشتہاری معمہ کی۔ تار کی خبر بھی پہونچ سکتی تھی۔ لیکن اول تو راز فاش ہوجاتا۔ لیڈی صاحبہ کی عادت تھی تار ضرور پڑھ لیتیں۔ خواہ کسی کے نام ہو اس کی اُجرت بھی جو تار گھر سے محل تک بوجہ فاصلے کے لازم تھی وہ خود ہی دیا کرتی تھیں۔ لیکن بعد کو یہ بار ضرور ناگوار ہوتا۔ اور ڈاکٹر کی بیوی پر غبار جھاڑتیں۔ یہ سب مصلحتیں آر برایٹ کے ذہن میں تھیں کہ بیوی کو جلد سے جلد علم ہوجائے۔ کوئی غیر نہ سمجھ سکے۔ اور لیڈی کی لاعلمی میں وہ نوٹس دیکر مستعفی ہو اور شوہر سے آملے۔ "ہاں ایسے ہی سائیکل پر پھر چڑھیں" اس نقرہ کا لطف ظاہر ہے یعنی پھر خدا کرے کوئی کروڑپتی ٹکر کھائے اور وصیت میں ایک ہزار اشرفی لکھے۔ (شمشیر مہدی)

نفس انسانی کی حقیقت

اور

توجّہ کی ماہیت

نفس انسانی کی حقیقت نہ کوئی آج تک بتا سکا نہ آئندہ اُمید ہے کہ کوئی اس سوال کا یقینی جواب دے سکے۔ البتہ نفس کے افعال کا مطالعہ کرکے کچھ نہ کچھ ہم کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً ہم کسی چیز کا تصور کرتے وقت ان قوتوں سے کام لے سکتے ہیں۔ اِدراک۔ احساس۔ ارادہ۔ یہی چیزیں نفس انسانی کی بمنزلہ اجزاء کے ہیں۔ اور انھیں کا ہر امر میں وجود ہوتا ہے۔ کوئی کام کرتے وقت یہ ضروری نہیں کہ ان اجزاء میں تناسب بھی پایا جائے۔ بلکہ یہ اجزاء مختلف اوقات میں کم وزیادہ ہوتے رہتے ہیں۔

مثلاً

مگر ان تینوں کا وجود ضرور ہوتا ہے۔ اور آپس میں تعلق بھی ضرور رکھتے ہیں۔

کسی علمی تحقیق یا دقیق کتاب کا مطالعہ کرتے وقت ادراک زیادہ صرف ہوتا ہے۔ اور ارادہ و احساس کم۔ طرب افزا یا راحت انگیز واقعہ دیکھکر احساس زیادہ صرف ہوتا ہے۔ اور وہ دونوں کم۔ یہ دائرے متناسب ہوں تو بیکاری ہوتی ہے۔ یعنی بیکاری و فراغت کے وقت یہ تینوں برابر ہوتے ہیں۔ ورنہ مختلف۔

ایک انگریز عالم نے نفس کو دریا سے تشبیہ دی ہے۔ وجوہ تشبیہ یہ ہیں۔

(۱) روانی۔ (۲) کمی وزیادتی۔ (۳) یعنی جزر و مد تسلسل یعنی جس طرح کسی پل پر چڑھکر دریا کے منبع سے مدخل تک کی تمام کیفیت مسلسل اور برابر معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک صحیح الدماغ انسان کی ایک مسلسل کیفیت اور لگاتار حالت دکھائی دیتی ہے۔

(۴) دریا کا پانی ایک جگہ سے چڑھکر پھر وہاں نہیں آتا۔ اسی طرح ایک وقت کی دماغی کیفیت یا رابطہ دوسرے وقت پیدا نہیں ہوتا۔

(۵) دریا پہاڑوں میں پیدا ہوتے وقت ابتداءً بہت کمزور ہوتا ہے اسی طرح نفس انسانی پیدائش کے وقت بہت کمزور ہوتا ہے۔ آئندہ وسعت بڑھ جاتی ہے۔

(۶) دریا کو کوئی روک نہیں سکتا۔ اسی طرح نفس انسانی کے جذبات و خیالات کو بھی روکنے والا نہیں۔

(۷) دریا کی طرح سُرعت و بطوء دماغ میں بھی پایا جاتا ہے۔

(۸) پانی ہمیں سطحی طور پر ایک جیسا نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقۃً اس کے اجزاء ترکیبی بدلتے رہتے ہیں۔ دماغی کیفیات بھی اگرچہ بظاہر اُنھیں تینوں اجزا کا مجموعہ رہتی ہیں۔ لیکن لحمہ بلحمہ بدلتی رہتی ہیں۔

الغرض ہماری شعوری رو کی سطح ہموار نہیں رہتی بلکہ ہر وقت کوئی نہ کوئی موج خیال اس کو مضطرب رکھتی ہے۔ اگر کوئی فکر نہ ہو بلکہ سوتے وقت ہر قسم کے خیالات کو دل سے نکال دیا جائے۔ تب بھی اس کی سطح ہموار نہ ہوگی۔ بلکہ بمنزلہ ہموار ہوگی۔ اسی طرح [سست دماغ] پر اگر کوئی پُر تاثیر جذبہ کام کر رہا ہو تو اُس کی یہ حالت ہو جاتی [چست دماغ] ہے

توجہ ۔ کسی ایک چیز پر ذہنی قوت کا جمع ہو جانا توجہ کہلاتا ہے۔ اگر خیال ہو کہ توجہ کے وقت ایک ہی چیز کا تصور رکھتے ہیں اور دیر تک اُس پر ذہن جمائے رکھتے ہیں تو یہ درست نہیں اُس کے متعلقات کا ضرور خیال آتا ہے۔ مثلاً ایک بادل پر توجہ کرتے ہوئے اُس کا رنگ۔ سائز۔ برسا ہوا یا بے برسا ہوا ضرور ذہن میں ہوتا ہے۔ جب تک ذہن اُس کے متعلقات کو سوچ رہا ہے۔ اُس وقت تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ متوجہ ہے۔

مثلاً [متوجہ] [منتشر] اس طرح

توجہ کا اثر ۔ جس چیز پر اپنی توجہ کو مرتکز کر دیں وہ چیز اچھی طرح ذہن نشین اور واضح ہو جاتی۔ مثلاً دوران جنگ میں اگر کوئی سپاہی گم ہو جائے تو سرچ لائٹ سے اُسے دیکھ لیتے ہیں۔ غنیم کا کیمپ کہاں ہے۔ یہ چیزیں اس آلہ کی مدد سے صاف دکھلائی دے جاتی ہیں اسکو بھی ایک قسم کا سرچ لائٹ سمجھئے جس سے کسی خاص امر کی پوری تفصیل معلوم ہو جاتی ہے۔ جس شخص میں توجہ کی قوت زیادہ ہوگی اُسکا ذہن۔ دماغ بھی زیادہ مضبوط ہوگا۔ دنیا کے غیر معمولی دماغ مسلسل محنت کا نتیجہ ہیں ایسی بہت سی مثالیں صفحۂ عالم میں ملتی ہیں۔ جو پیہم محنت کے طفیل ادنیٰ سے اعلیٰ بن گئے۔

"وکٹر ہیوگو"

از سید تمکین الکاظمی

"وکٹر ہیوگو" ۲۶ فروری ۱۸۰۲ء کو شہر بزانسون میں پیدا ہوا، اسکے باپ کا نام کونٹ جوزف ہیگو اور ماں کا سوفی تربوشہ تھا، وکٹر کے دو بھائی تھے۔ بڑے کا نام آبل۔ اور چھوٹے کا اوژن تھا۔ بڑا ۱۷۹۸ء میں پیدا ہوا تھا اور چھوٹا ۱۸۰۰ء میں۔ مگر وکٹر ہیوگو نے اسقدر شہرت حاصل کی کہ لوگوں نے اس کے ان دونوں بھائیوں کو بھلا دیا،

ہیوگو کا مختصر خاندان ۱۸۱۱ء میں اطالیہ کی مختصر سیاحت اور پارس کے قیام کے بعد اسپین میں منتقل ہوگیا۔ انہیں دنوں جوزف بوناپارٹ حکومت اسپین پر قابض ہوگیا تو کونٹ جوزف ہیوگو بھی جنرل ہوگیا۔

۱۸۱۲ء میں میڈم ہیوگو نے اوژن اور ہیوگو کو ساتھ لیکر پیرس کو مراجعت کی اور دونوں لڑکوں کو دارالاقامہ کردیہ میں داخل کرا دیا۔ تاکہ وہاں تعلیم پاکر دارالفنون (یونیورسٹی) کی شرکت کے قابل ہوجائیں، چونکہ وکٹر ہیوگو کو ادبیات سے بہت دلچسپی تھی اس لیئے اس نے ۱۸۱۸ء میں غزلیات قصائد اور ڈراموں کا ایک دفتر سنبھال کر دارالاقامہ کو خیرباد کہدیا۔

۱۸۲۲ء میں اُس نے اپنے بعض قصائد و ترجیع بند جو بوربونی بادشاہوں کی مدح میں تھے شائع کئے، اور اسی کے صلے میں لوئی ہیجدہم نے سالانہ ایک ہزار فرانک کا وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ اسی طرح وکٹر ہیوگو اس قابل ہوگیا کہ اپنی منسوبہ مادموازیل "آدل" سے شادی کرسکے۔

۱۸۲۱ء کو ۲۷ فروری کی رات میں میڈم ہیوگو نے اس دنیائے فانی کو خیرباد کہا۔ اور ہیوگو کو آتش فرقت میں جلنے کے لئے چھوڑ گئی۔

۱۸۲۳ء میں لوئی ہیجدہم نے سابقہ وظیفے میں ایک ہزار فرانک سالانہ اضافہ منظور کیا۔ اسی سال وکٹر ہیوگو نے اپنا سب سے پہلا ناول "ہان دیسلاند" شائع کیا اور ۱۸۲۴ء میں "قصائد اور ترجیعات" کا بقیہ حصہ بھی شائع کر دیا۔

ہان دیسلاند بالکل جدید اصول پر لکھا گیا تھا اور اس میں رائج اصول و قواعد ادب کی پابندی نہیں کی گئی تھی اس لئے ادیبوں اور انشاپردازوں کے حلقے میں ایک طوفان پیدا ہوگیا۔ اور وہ لوگ برافروختہ ہوگئے۔ ۱۸۲۶ء میں قصائد و ترجیعات کا اور ایک حصہ شائع ہوا اور اس کے دیباچے میں وکٹر ہیوگو نے مروجہ نظم و نثر کے اصول و قواعد پر سخت تنقید بھی کی۔

ہیوگو کا عقیدہ یہ تھا کہ ادبیات کو آزاد ہونا چاہئے۔ قدماء کی تقلید مطلق نہیں کرنی چاہئے۔ اس کے مخالفین چاہتے تھے کہ قدماء کے قدم بقدم چلیں اور ہر چیز میں ان کی تتبع اور تقلید کرتے جائیں۔

اس عقیدے کے لوگ "کلاسیک" کے نام سے مشہور ہوگئے اور اپنے مخالفین کو دیوانے جاہل وغیرہ کہنے لگے۔ اور ان کی امکانی مخالفت شروع کر دی۔ ہیوگو کے خیال کو "رومانٹیسم" اور اس کے پیرووں کو "رومانٹیک" کہنے لگے۔ اور آخرالذکر طبقہ قابل رحم جاہل سمجھا جانے لگا۔ وکٹر ہیوگو سے پہلے بھی رومانٹیسم موجود تھا جرمنی میں گوتھے، شیلر و لی نیک اور انگلستان میں شکسپیر اور بائرن اور فرانس میں خود لامارتین اور شاتوبریان اسی قبیل کے تھے۔ مگر انہوں نے اس کو ترویج دینے کی فکر نہیں کی اور ہیوگو نے کھلے بندوں اسے رائج کرنا چاہا، اور بلا کسی خوف کے اشاعت شروع کر دی اسی لئے مخالفین نے اُسے "رومانٹیسم" کا موجد قرار دیدیا۔

۱۸۲۷ء میں وکٹر ہیوگو نے "کرامول" لکھی اور اس کے مقدمے میں اپنی نگارش کی خوب تعریف کی، ۱۸۲۸ء کے آخر میں "قصائد اور ترجیعات" کا آخری حصہ شائع کیا اور ایک سال کے بعد دیوان "شرقیات" اور "آخرین روز یک محکوم" لکھا۔ آخرالذکر کتاب میں اس نے قانون اور قواعد پر جی کھول کر تنقید کی ہے اور خوب برائیاں بھی کیں ہیں۔

۱۸۳۰ء میں ڈرامہ "ارنانی" اور اس کے ایک سال بعد "ماریون دولرم" لکھکر اسٹیج کرا دیا۔ اسی سال مشہور تصنیف "نتر ڈم ڈو پارس" شروع کیا اور ۱۸۳۳ء میں خزینہ "لوکریس بورڈیا" جو بہترین تصنیف تھی شائع کی۔ اور "ماری تودر" بھی شائع کیا۔ ۱۸۳۵ء میں "آنژلو" اور ۱۸۳۸ء میں "روی بلاس" اور ۱۸۴۳ء میں "بورگراوس" جیسے شاہکار لکھے۔

۱۸۴۱ء میں مخالف آرا کے باوجود "اکاڈمی فرانس" کی رکینیت کے لئے منتخب کیا گیا اور ۱۸۴۸ء میں ساٹھ ہزار آراء کی موافقت سے ممبر پارلیمنٹ مقرر ہوا اور اپنے سیاسی عقائد کی تشہیر

کے لئے روزنامہ "حوادث" جاری کیا۔

۱۸۶۲ء میں داستان سفر "نورن" تصنیف کی مگر اسی سال اس کی لڑکی "لیو پولڈین" اپنے شوہر کے ساتھ غرق دریا ہو کر مزار اور جنازے کی فکر سے آزاد ہو گئی اس صدمے نے اس کی سیاسی اور ادبی زندگی کو ایک سخت صدمہ پہنچایا۔

۱۸۴۸ء میں لوئی نپولین جمہوریت فرانس کے لئے صدر منتخب ہوا، چونکہ ہیوگو اس کا مخالف تھا اس لئے اس کے خلاف تقریریں کیں۔ مگر کچھ اثر نہ ہوا اور نپولین نے ۲ دسمبر ۱۸۵۱ء کو وکٹر ہیوگو کو فرانس سے نکالدیا۔ جسکی تفصیل ہیوگو نے اپنی "ایک جرم کی تاریخ" میں بہ تفصیل لکھی ہے۔

اگرچہ دیس نکالے سے ہیوگو کا مالی نقصان ہوا۔ لیکن اس کے لئے یہ واقعہ ایک محرک ثابت ہوا۔ وہ چند روز "بروکسل" میں ٹھیرا رہا مگر دولت فرانس کے اشارے سے وہاں سے بھی نکالا گیا۔ اور وہ جزیرہ "ژرسی" جا پہنچا جہاں "لی شاتیمان" لکھی اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے روزنامہ "انسانیت" جاری کیا۔ مگر ۲ دسمبر ۱۸۵۵ء کو اس جزیرے سے بھی نکلنا پڑا۔ اور جزیرہ "گرنزی" میں قیام کیا۔

۱۸۶۲ء میں شہور شاہکار "بدنصیب" لکھکر ادبی دنیا میں ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ اس کے بعد "ولیم شکسپیر" اور ۱۸۶۴ء میں "ترانۂ کوہ و بیابان" اور ۱۸۶۵ء میں "کارگران دریا" اور "مینسوڑ" لکھا۔ اور ۱۸۶۹ء میں بہ ترتیب یہ جواہر پارے شائع ہو گئے۔

ہیوگو ۵ ستمبر ۱۸۷۰ء کو فرانس واپس آیا۔ افسانہ قرون کا دوسرا حصہ "پاپ"، "شفقت عالیہ" اور "مذاہب و مذہب" وغیرہ بھی اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

۱۸۸۲ء میں اس کی اسی سالہ جوبلی منائی گئی اور ہزاروں آدمیوں نے اسے مبارکباد دی۔ ہیوگو اپنے خاندان کے ساتھ برآمد ہوا تو سبھوں نے خوشی کے نعرے لگائے۔ بوڑھا شاعر خوشی سے رونے لگا اور لوگوں نے اسے "نجات دہندہ" اور "فرشتۂ انسانیت" کہکر پکارنا شروع کیا۔

بالآخر ۲۲ ماہ مئی ۱۸۸۵ء کو وکٹر ہیوگو نے اپنے مکان میں جو "ایلو" میں واقع تھا (اور اب یہ مقام کوچۂ وکٹر ہیوگو کے نام سے مشہور ہے) طبعی موت سے انتقال کیا جنازہ اس شان سے اٹھایا گیا کہ اس کی نظیر اب تک نہیں ملتی بارہ مشاہیر شعرا نے اس کے تابوت کو اٹھایا۔

انیسویں صدی عیسوی کے اختتام تک بھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ وکٹر ہیوگو مرا نہیں بلکہ زندہ ہے۔ کیونکہ اس کی تصانیف یکے بعد دیگرے طبع ہوتی رہیں۔ "ڈرامہ آزاد" "عاقبت شیطان" "میرے مشاہدات" "خدا" "فرانس اور بلژیک" اور مکاتیب بہ محبوبۂ خود اور دوسری تصانیف اس طرح طبع ہوئیں گویا وکٹر ہیوگو بیٹھا ہوا اشاعت کر رہا ہے۔ گویا موت نے اسے سرد نہیں کیا تھا بلکہ اس کی علمی ادبی حرارت اور بھڑکا دی تھی۔

ہیوگو کی تصانیف میں سے "بدنصیب" کے نام سے اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے اور کسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اس کی مشہور اور درد انگیز نظم کا اردو ترجمہ "بیچارے" کے نام سے ہم نے کیا ہے جو انشاء اللہ آئندہ کسی نمبر میں طبع ہوگا۔

(تمکین الکاظمی)

رباعی

بیتابئ عاشقی ہے باقی ساقی
شعلے سے بھڑک رہے ہیں ساقی ساقی
پہلو میں نگار ہے نہ ساغر میں شراب
جیتا ہوں تو ہے یہ اتفاقی ساقی

"شرط"

باب اوّل

خزاں کی ایک تاریک رات کا ذکر ہے کہ ایک بینکر اپنے کتب خانہ میں ٹہل رہا تھا اس کونہ سے اس کونہ تک جاتا تھا اور سوچتا ہوا پھر واپس آتا تھا۔ اس وقت اس کے خیال میں اس خزاں کی یاد تازہ ہو رہی تھی جب آج سے پندرہ سال قبل اس نے چند دوستوں کو اپنے ہاں مدعو کیا تھا اور اس میں کئی قابل آدمی شریک ہوئے تھے جن کی موجودگی سے بہت سے دلچسپ مباحث پر تبادلۂ خیالات ہوا تھا۔

منجملہ دیگر مباحث کے "سزائے موت" پر بھی ایک بحث چھڑی تھی۔ بہت سے مہمان جن میں سے بعض اخبار نویس تھے۔ سزائے موت کے بہت مخالف تھے۔ اور یہ استدلال کرتے تھے کہ چونکہ سزائے قتل ایک قدیم رسم ہے اسے بہت سی پرانی چیزوں کی مانند بند کر دینا چاہئے۔ علاوہ ازیں ان کے خیال میں موت کی سزا عیسوی اخلاق کے بھی منافی تھی بہرحال کم و بیش ہر شخص اس بات کا حامی تھا کہ قتل کی سزا کی بجائے حبس دوام (عمر قید) زیادہ بہتر ہے۔

اس پر میزبان نے اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا "حضرت! میں آپ کے خیال سے اتفاق نہیں کر سکتا گو میں نے دونوں میں سے کسی سزا کا بھی ذاتی تجربہ نہیں اٹھایا ہے لیکن یہ خوب جانتا ہوں کہ حبس دوام کے مقابلہ پر سزائے موت زیادہ قرین انسانیت ہے۔ موت کی سزا میں مجرم ایک لمحہ میں مر جاتا ہے مگر دوسری صورت میں وہ عمر بھر ایڑیاں رگڑتا رہتا ہے۔ اس کا اندازہ انہی کو ہو سکتا ہے جنہوں نے کبھی قید و بند کی مصیبتیں اٹھائی ہوں۔ آپ ہی انصاف کیجئے پہلا طریق سزا زیادہ انسانی اخلاق پر مبنی ہے یا دوسرا؟"

اس پر مہمانوں میں سے ایک نے کہا تھا "دونوں طریقے برے ہیں کیونکہ مقصد کے لحاظ سے ہر دو یکساں ہیں یعنی دونوں ایک مجرم کی جان لینا چاہتے ہیں۔ کوئی حکومت خدا نہیں ہوتی پس جب وہ کسی کو زندگی بخش نہیں سکتی تو زندگی ختم کرنے کا بھی اسے کوئی حق نہیں ہے۔"

مہمانوں میں ایک ۲۵ سال کا نوجوان وکیل بھی تھا۔ جب اس سے اس کے متعلق رائے دریافت کی گئی تو اس نے جواب دیا "میرے خیال میں دونوں طریقے خلاف انسانیت ہیں۔ لیکن اگر دونوں میں سے ایک کے انتخاب کرنے کا حق دیا جائے تو میں اقل البلیتین کے اصول پر حبس دوام قبول کروں گا۔"

مہاجن جو اس وقت نوجوان اور بہت جوشیلا تھا اس پر بہت تیز ہوا اور میز پر گھونسہ مارتے ہوئے وکیل سے چلا کر کہا۔

"بکواس! ———— میں شرط لگاتا ہوں کہ تم پانچ سال بھی ایک کوٹھڑی میں محبوس نہیں رہ سکتے ———— دو لاکھ روبل (روسی سکہ) کی شرط لگاتا ہوں۔"

وکیل نے اس کا جواب دیا تھا "اگر تم واقعی یہ سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہے ہو تو میں تمہاری شرط قبول کرتا ہوں اور پانچ سال کی جگہ پندرہ سال محبوس ہونے کے لئے تیار ہوں؟"

مہاجن نے جوش میں آ کر کہا "پندرہ برس! ———— پندرہ! حضرات اگر یہ پندرہ برس مقید رہ سکیں تو میں دو لاکھ روبل ہارنے کے لئے تیار ہوں!"

"اگر تم دو لاکھ روبل ہارتے ہو تو میں اپنی جان ہارتا ہوں۔"

چنانچہ یہ انوکھی اور مجنونانہ شرط بندھ گئی۔ مہاجن جو بہت بے پرواہ اور کافی متمول تھا دو لاکھ کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا تھا بلکہ اس شرط پر بہت مسرور تھا۔

کھانے پر اس نے وکیل کو سمجھایا "میرے مہربان بہتر ہے کہ اس احمقانہ کام میں ہاتھ نہ ڈالو ورنہ بعد میں پچھتانا پڑے گا۔ سمجھو! میرے لئے دو لاکھ روبل کوئی حقیقت نہیں رکھتے مگر تم اپنی زندگی کے تین چار بیش قیمت سال ضائع کر دو گے۔ تین چار سال اس وجہ سے کہتا ہوں کہ تم زیادہ عرصہ [illegible] نہیں رہ سکو گے اور شرط توڑ دو گے۔ نیز میرے عزیز یہ بھی یاد رکھو کہ جبریہ حبس کے مقابلہ پر خود اختیاری حبس بھی کچھ کم تکلیف دہ نہیں ہو گا۔ زندگی دق ہو جائے گی اور یہ خیال کہ تم جس وقت چاہو گے قید خانہ سے رہا ہو سکو گے اس

زندگی کو اور بھی سونا روح بنا دیگی اور تم اس کی برداشت نہ کر سکوگے ۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔"

باب دوم

آج پورے پندرہ سال کے بعد مہاجن کو یہ واقعہ یاد آیا اور اس نے اپنے دل میں کہا " آخر اس احمقانہ شرط کا منشا کیا تھا؟ اس کا نتیجہ صرف یہی ہوا ہے کہ وکیل کے بیش قیمت پندرہ سال ضائع ہوگئے اور میں عنقریب دو لاکھ روبل ہارنے والا ہوں لیکن کیا اس سے یہ قضیہ فیصل ہو جاتا ہے کہ سزائے موت کے مقابلہ پر حبس دوام کی سزا زیادہ بہتر ہوتی ہے؟ ہرگز نہیں ۔ معاملہ ولیسا ہی پیچیدہ ہے ۔ میں نے یہ شرط غالباً اس وجہ سے لگائی ہوگی کہ اس دن کھانا زیادہ کھا لیا ہوگا ۔ اور وکیل نے اسے اس وجہ سے قبول کر لیا ہوگا کہ دو لاکھ روبل ایک واقعی اچھی رقم ہے ۔

اس وقت اس کے دماغ میں وہ تمام واقعات سینما کی تصویروں کی سرعت کے ساتھ گزر رہے تھے ۔ جو اس سے پندرہ سال قبل دعوت کی شام کو پیش آئے تھے یا اس کے بعد ہوتے رہے ۔

یہ فیصلہ کیا گیا کہ مہاجن کے پائیں باغ میں ایک قید خانہ تعمیر کیا جائے جس میں وکیل پندرہ سال تک سخت نگرانی میں مقید رکھا جائے ۔ شرائط یہ تھیں کہ وکیل کو اس طویل قید کے دوران میں قید خانہ سے باہر قدم رکھنے ، کسی انسانی شکل کے دیکھنے یا آواز سننے اور اخبارات پڑھنے کی سخت ممانعت ہوگی ۔ ہاں یہ اجازت ہوگی کہ کتابیں پڑھ سکے ، خطوط لکھ سکے ، شراب پئے اور موسیقی کی مشق کرتا رہے ۔ جس کے لئے آلات مہیا کر دئے جائیں گے ۔ یہ تجویز کی گئی تھی کہ بیرونی دنیا کے ساتھ تعلقات قائم رکھنے کے لئے صرف ایک کھڑکی ہوگی جو اس کے زنداں میں لگا دی جائیگی اور وہ اس سے کھانا یا کتابیں وغیرہ لے لیا کریگا ۔ مگر کسی سے بات کرنے کی سخت ممانعت ہوگی ۔ اگر اسے کسی کتاب ، شراب یا کسی اور چیز کی ضرورت ہوگی تو وہ ایک کاغذ کے پرزہ پر لکھ کر دیدیا کریگا ۔ مگر وہ بھی صرف کھڑکی کی راہ سے ۔

بہرحال شرائط نامہ کا مسودہ تیار ہوا اور اس میں ہر ممکن تفصیل درج کر دی گئی ۔ یہ شرط طے پا گئی تھی کہ یہ قید کامل پندرہ برس کے لئے ہوگی جس میں ایک سیکنڈ کی کمی بھی مہاجن کو روپیہ ادا کرنے کے فرض سے بری الذمہ کر دیگی ۔ قید ۱۴ نومبر ۱۸۷۰ء کی دوپہر سے شروع ہوکر ۱۴ نومبر ۱۸۸۵ء کو بارہ بجے دوپہر کو ختم ہوگی ۔ اگر وکیل اس سے ایک منٹ قبل بھی زنداں سے نکل آیا تو مہاجن روپیہ دینے کا ذمہ وار نہ ہوگا ۔

بہرحال وکیل نئے تیار شدہ قید خانہ میں بند کر دیا گیا اور شرط کا کام جاری ہوگیا ۔ سب سے پہلے سال اُسے بہت سخت تکلیف ہوئی جیسا کہ اس کے چھوٹے چھوٹے پیغامات سے ظاہر ہوتا تھا اسے تنہائی بہت ناگوار معلوم ہوتی تھی اور کسی عنوان چین نہ آتا تھا ۔ مگر قید خانہ کی در و دیوار سے دن رات پیانو کی آوازیں نکلتی ہوئی سنائی دیتی تھیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنا دل بہلانے کی کوشش کرتا رہتا تھا ۔

وکیل نے تمباکو اور شراب کا استعمال قطعی ترک کر دیا تھا کیونکہ وہ کہتا تھا کہ یہ چیزیں چونکہ محرک جذبات ہوتی ہیں اور ہیجان جذبات ایک قیدی کے لئے حد درجہ خطرناک دشمن ہوتے ہیں ۔ اس وجہ سے ان کا استعمال قطعی غیر ضروری تھا ۔

سب سے پہلے سال اس نے اس قسم کی کتابیں طلب کیں جن کے پڑھنے میں زیادہ دماغ سوزی سے کام لینا نہیں پڑتا یعنی ناول افسانے ، سراغرسانی کہانیاں ، پیچ در پیچ پلاٹ کے ناول اور خیالی ڈرامے وغیرہ ۔

قید کے دوسرے سال موسیقی کی دلکش آوازیں آنی بند ہو گئیں ۔ اب قیدی سوائے مطالعہ کے کچھ نہ کرتا تھا ۔ وہ زیادہ تر شہرہ آفاق مصنفین کی مستند کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا جو اسے فوراً مہیا کر دی جاتی تھیں مگر پانچویں سال موسیقی پھر شروع ہوگئی اور ایک قیدی نے شراب کا بھی مطالبہ کیا ۔ جن لوگوں نے اسے کھڑکی میں سے دیکھا تھا وہ کہتے تھے کہ اس نے اس سال سوائے گانے ، کھانے اور سونے کے کچھ کام نہیں کیا ۔ چارپائی پر پڑا پڑا جمائیاں لیتا رہتا تھا یا غصہ میں اپنے آپ کو سختی سے مخاطب کرتا تھا یا میز پر لکھنے کے لئے بیٹھ جاتا ، رات رات بھر صفحہ پر صفحہ لکھ لکھ کر ڈھیر لگا دیتا اور صبح انہیں پرزہ پرزہ کر دیتا وہ اکثر روتا ہوا بھی سنا گیا تھا ۔

چھٹے سال کے آخری نصف حصہ میں اس نے زبانوں ، تاریخ اور فلسفہ کا مطالعہ کرنا شروع کیا ۔ وہ اس قدر جلد مطالعہ کر چکتا تھا

کو مہاجن اتنے جلدی کتابیں مہیا کرنے سے قاصر تھا۔ پچھلے چار سال کے عرصہ میں اس نے کم و بیش چھ سو کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ مطالعہ کے جنون ہی کے دوران میں اس نے مہاجن کو یہ خط تحریر کیا تھا:۔

"عزیز جیلر!

یہ خط چھ مختلف زبانوں میں تحریر کر رہا ہوں جو جو انہیں جانتا ہو اس سے پڑھواؤ اگر وہ اس میں کوئی غلطی نہ نکالیں تو خوشی میں ایک بندوق چھوڑ دو تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ میں نے ان زبانوں پر عبور حاصل کر لیا ہے۔ دنیا کے ہر حصہ کے فاضل عالم کئی کئی زبانوں میں گفتگو کرتے ہیں مجھے بھی کئی زبانیں آگئی ہیں اور میں نہیں ظاہر کر سکتا کہ انہیں سیکھ کر مجھے کسقدر مسرت ہوئی ہے!"

قیدی کی خواہش پوری کر دی گئی یعنی ان زبانوں کے جاننے والوں سے خط پڑھوایا گیا اور جب وہ حرف بحرف صحیح نکلا تو باغ میں ایک بندوق داغی گئی جس سے قیدی بہت خوش ہوا۔

دسویں سال کے بعد وہ میز پر سے نہیں ہلا اور سوائے انجیل مقدس کے کچھ نہ پڑھا۔

مہاجن متعجب تھا کہ جس شخص نے چار سال میں چھ سو کتابوں پر عبور حاصل کر لیا ہو وہ پورا سال ایک ایسی کتاب پر صرف کرے جو نہ تو زیادہ لمبی ہے نہ زیادہ مشکل۔ انجیل کی تلاوت کے ساتھ ساتھ اس نے مذاہب عالم اور تاریخ مذہب کا بھی مطالعہ جاری رکھا۔

زمانۂ قید کے آخری دو سالوں میں اس نے بیحد کتابیں پڑھیں۔ مگر غیر مربوط طریقہ پر یعنی اگر کبھی علوم طبعی کا مطالعہ کرتا تھا تو کبھی شیکسپیر اور بائیرن کی تصانیف طلب کرتا تھا۔ وہ لکھ لکھ کر کیمیا ادویات فلسفہ اور دینیات پر درسی کتابیں طلب کرتا اور کبھی ناول ہی پڑھنے پر اکتفا کرتا۔ اس کی حالت بالکل ایسی ہی تھی جیسے کوئی شخص ایک سمندر میں جان بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو جو کبھی ایک تختہ کو پکڑتا ہو اور اسے چھوڑ کر دوسرے کو پکڑ لیتا ہو اور پھر تیسرے کا سہارا لیتا ہو۔

باب سوم

واقعات اور ایام ماضی کہ یہ یاد تھی جو وقت مہاجن کے دل میں پیدا ہو رہی تھی اور وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا:۔

"کل بارہ بجے پندرہ سال پورے ہو جائیں گے۔ اور وکیل آزاد ہو جائیگا اور شرط کے مطابق مجھے ۲ لاکھ روبل ادا کرنے ہونگے ——— مگر اس کے بعد میں تباہ ہو جاؤنگا ——— دیوالیہ!"

آج سے پندرہ سال قبل بیشک اس کے پاس کئی لاکھ روبل تھے مگر اب تو شاید اتنے بھی نہ تھے کہ شرط بھی پوری کر سکتا۔ تجارت کی تباہی اور ایک غیر دانشمندانہ تخمینہ پر روپیہ لگا کر اسے سخت مالی نقصان پہنچا تھا۔ اور وہ اب ایک لکھپتی سوداگر کی بجائے ایک معمولی مہاجن سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا مگر وہ با وضع اور وعدہ کا پورا تھا۔ گو دل میں کہتا تھا "کیا ہی منحوس گھڑی تھی۔ جب یہ احمقانہ شرط اس وکیل کے ساتھ سے لگائی تھی! کمبخت مرا بھی تو نہیں کیسا سخت جان تھا میں تو سمجھا تھا کہ وہ ایک ہی سال میں اس کا کام تمام ہو جائیگا۔ اب وہ آزاد ہوگا اور دو لاکھ روبل لیکر سٹاک ایکس چینج میں لگا کر دولت سے کھیلیگا۔ شادی کریگا اور مزے اڑائیگا۔ مجھے دیوالیہ ہونا پڑیگا۔ اور اس زبون حالت میں وہ مجھے چڑا کر کہیگا "میری تمام مسرتوں اور فارغ البالیوں کا اصل سبب آپ ہی ہیں۔ آپ نے میری بہت مدد کی ہے!" نہیں نہیں! ——— میں یہ سننا نہیں چاہتا میں بے غیرت نہیں ہوں، مجھے تباہ نہیں ہونا میں ان دو لاکھ روبل کو بچانے کے لئے انتہائی کوشش کرونگا۔ جس کی صرف ایک ہی سبیل ہے یعنی اس کی ——— موت!"

ایک گھنٹہ نے تین بجائے۔ مکان میں ہر شخص خواب خرگوش میں سو رہا تھا۔ کہیں کسی قسم کی آواز سنائی نہ دیتی تھی صرف وہ پتے شور مچاتے تھے جو ہوا کے جھونکوں سے ہلنے لگتے تھے۔

اس نے آتشدان پر سے چپکے سے وہ کنجی اٹھائی جسے استعمال ہوئے پندرہ برس کا عرصہ گزر چکا۔ کپڑے پہنے اور مکان سے باہر نکلا۔

باب چہارم

باہر سخت اندھیرا تھا۔ سردی پڑ رہی تھی اور بارش بھی ہو رہی تھی۔ باغ میں ایک نم آلود ہوا چل رہی تھی جس سے درختوں کے پتے مسلسل جنبش میں تھے۔ مہاجن نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں گھورنا شروع کیا مگر نہ تو قیدخانہ کی عمارت دکھائی دی نہ درخت اور زمین۔ اندازہ سے وہ قید خانہ کی جانب بڑھا چلا گیا اور دو دفعہ چوکیدار کو زور سے پکارا مگر اس نے جواب نہیں دیا معلوم ہوتا تھا

کہ اس خراب موسم سے بچکر وہ بھی باورچیخانہ یا کسی اور جگہ جا دبکا ہوگا۔

بوڑھا مہاجن سوچ رہا تھا کہ "اگر میرا مقصد پورا ہو گیا تو شبہ چوکیدار پر ہی ہوگا۔" وہ عمارت کے قریب پہنچ گیا اور سیڑھیوں پر سے چڑھتا ہوا ایک پچھلے کمرہ میں پہنچا جس میں سے ایک راستہ عین اس کمرہ کی طرف جاتا تھا جہاں وکیل قید تھا۔ سخت اندھیرے کے باعث مہاجن نے ایک موم بتی جلا لی۔ اور آگے بڑھا۔ مگر وہاں کوئی متنفس نظر نہ آیا۔

وہ اس کمرہ پر پہنچ گیا جہاں وکیل پندرہ سال سے مقید تھا۔ کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو ایک ہلکی سی روشنی نظر آئی۔

کال کوٹھری کے قفل کی مہریں ثابت تھیں اور قیدی میز کے ایک کونہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت سوائے اس کی کمر، بال اور بازوؤں کے کوئی حصہ جسم نظر نہ آتا تھا۔ دو کرسیوں اور میز پر کھلی ہوئی کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔

پانچ منٹ گزر گئے اور وہ اپنی جگہ سے نہ سرکا۔ پندرہ سال کی قید نے اسے بے حس و حرکت بیٹھے رہنے کا عادی بنا دیا تھا۔ مہاجن نے کھڑکی کے جنگلہ پر کھٹکھٹایا مگر قیدی نے مطلق جنبش نہ کی اور یونہی بیٹھا رہا۔

مہاجن نے دروازہ پر پہنچکر احتیاط سے قفل کی مہریں توڑیں اور کنجی قفل میں لگا ہوا چھوڑ کر زنگ آلود دروازہ کھولا۔ اور اندر داخل ہوا۔ قیدی اب ایک مشت استخواں سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ سوائے ڈھانچے کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ سر کے بال عورتوں کی مانند لمبے لمبے تھے گھنی ڈاڑھی پورے ایک فٹ کی تھی۔

بالوں کا رنگ بھورا پڑ گیا تھا اور جب مہاجن نے اس کا چہرہ دیکھا تو اسے مطلق یقین نہ ہو سکا کہ وہ چالیس سال کا تھا۔

وکیل بے خبر سو رہا تھا........ اس کے سر کے سامنے ایک کاغذ پڑا ہوا تھا جس پر کچھ تحریر تھا۔

مہاجن سوچ رہا تھا کہ "یہ نیند میں دو لاکھ روپیہ کے متعلق خواب دیکھ رہا ہوگا اور شیخ چلی کی مانند طرح طرح کے منصوبے گانٹھ رہا ہوگا۔ بدمعاش! ——— مجھے اس کے مارنے میں کوئی دقت نہ ہوگی کیونکہ یہ تو پہلے ہی سے نیم مردہ ہے۔ اب مجھے سوائے اس کے اور کیا کرنا ہے کہ پلنگ پر لٹا کر حلقوم پر زور سے تکیہ رکھ دوں ——— بڑے بڑے سراغرساں بھی پتہ نہیں چلا سکیں گے کہ موت کیونکر واقع ہوئی ——— مگر مجھے سب سے پہلے یہ پڑھ لینا چاہیئے۔ کہ کیا لکھا ہے؟"

باب پنجم

یہ کہکر مہاجن نے میز پر سے کاغذ اٹھایا اور اُسے پڑھنا شروع کیا۔ اس نے مندرجہ ذیل عبارت پڑھی تھی:۔

"کل بارہ بجے مجھے آزادی نصیب ہو جائیگی اور میں دوسری انسانی شکلوں کو دیکھ سکونگا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں دوبارہ سورج کی کرنوں کو دیکھوں میں یہ چند الفاظ آپ کے لئے لکھ دیتا ہوں۔ میں خدا کے حاضر و ناظر کے سامنے صفائی قلب کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے آزادی زندگی، صحت اور ان تمام چیزوں سے جنہیں آپ کی کتابیں "زندگی کی نعمتیں" کہتی ہیں سخت نفرت کرتا ہوں۔"

"میں پندرہ سال تک اس سرزمین پر زندگی کا مطالعہ کرتا رہا۔ گو میں نے بڑے بڑے شہروں اور ملکوں کے سفر نہیں کئے لیکن ان کتابوں کے ذریعہ سے اچھی سے اچھی شراب کا مزا اٹھایا، عمدہ عمدہ گانے گائے، جنگلی ہرن اور درندوں کا شکار کیا، عورتوں سے محبت کی..... خوبصورت اور حسین عورتیں۔ ایسی شفاف جیسے فضا، ایسی پریاں جیسے بادل۔ میں ان سے ملاقات کر چکا ہوں خواب میں بڑے بڑے عقلا اور فضلا سے ہمکلام ہو چکا ہوں میں نے ان کتابوں کی بدولت ہمالہ اور البرز کی بلند سے بلند چوٹیوں پر پرواز کی ہے جہاں طلوع آفتاب اور غروب کے مناظر دیکھے ہیں جب تھکا ہوا سورج اپنی کرنوں سے چوٹیوں اور سمندر کی سطح پر سنہری شعاعیں ڈال کر ایک طلائی رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ میں نے سر پر بجلیاں چمکتی ہوئی دیکھی ہیں۔ سبز جنگل۔ رواں دریا، ٹھہری ہوئی جھیلیں، غار اور وادیاں غرض ہر قسم کے مناظر دیکھے ہیں۔ میں نے گڈریے اور کرشن کی بانسریاں بھی سنی ہیں۔ میں نے فرشتوں کے مقدس پروں کو بھی چھوا ہے۔ میں نے تمہاری کتابوں میں بڑے بڑے

گرے ہیں ہستیوں کی تہ میں غوطہ زنی کی ہے۔ کرامات دکھائی ہیں۔ قتل و غارتگری کی ہے۔ مکانات اور شہروں کو آگ لگائی ہے بڑی بڑی سلطنتیں برباد کی ہیں ۔۔۔۔۔۔۔

میں تمہاری کتابوں کی بدولت بہت عقلمند ہو چکا ہوں۔ کیونکہ ہزارہا سال سے عقل نے جو جو تجربات آدابیے تھے۔ وہ کتابوں میں منتقل ہو کر اب میرے دماغ میں آچکے ہیں۔ اور اب یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ دیگر لوگوں کی نسبت اب میں بہت عقلمند ہوں۔

مگر میں ان تمام کتابوں کو کیا تمام زندگی کی نعمتوں سے متنفر ہو چکا ہوں مجھے عقل و خرد نہیں چاہیئے یہ بالکل سطحی اور غیر مربوط ہے۔ یہ ایک دھوکا ہے محض سراب! تم بیوقوف اور غلط راستہ پر بھٹک رہے ہو اگر سیب یا نارنگی کے درخت میں پھلوں کی بجائے مینڈک اور چھپکلیاں لگنے لگیں تو تم کسقدر متعجب ہوگے بالکل بالکل اسی طرح میں تمہاری عقلوں پر متحیر ہوں کہ تم نے آسمانی انعام کے مقابلہ پر ارضی مصائب و آلام کو کیوں قبول کر رکھا ہے ۔ ؟"

عملی طور پر زندگی کی نعمتوں سے بیزاری ظاہر کرنے کے لئے میں دو لاکھ روبل پر پانی پھیرتا ہوں۔ انہیں میں ابتدا میں بہشت کی مانند شیریں سمجھتا تھا مگر اب ایلوے کی مانند کڑوا سمجھکر نفرت کرتا ہوں دو لاکھ روبل کے دعوے کو معطل کرنے کی غرض سے میں مقررہ وقت سے پانچ گھنٹے اس جگہ سے رخصت ہونگا اور شرط ہار جاؤنگا "

جب مہاجن یہ کاغذ پڑھ چکا تو اس کا دل بھر آیا اس نے اس غیور اور فسراخ حوصلہ عجیب و غریب انسانی پیکر کی بلند پیشانی پر بوسہ دیا اور آنسو بہاتا ہوا زنداں سے باہر نکل گیا۔

بڑے بڑے مالی نقصانات اٹھانے پر بھی اس کا ضمیر اس پر اتنی ملامت اور تنفر نہ کرتا تھا جتنا اسوقت کر رہا تھا۔ وہ اپنے گھر پہنچا اور پلنگ پر جا پڑا۔ مگر دلی اضطراب نے اسے سونے نہ دیا۔

دوسرے دن چوکیدار حیران و پریشان دوڑتا ہوا آیا اور بیان کیا کہ قیدی کھڑکی توڑ کر نیچے کودا اور باغ میں سے فرار ہو کر کسی جگہ جا چھپا۔

نوکروں کے ہمراہ مہاجن قید خانہ میں پہنچا اور چوکیدار کی بات کی تصدیق کی، باغ میں تلاش کی گئی مگر قیدی نہ ملا کہاں غائب ہو گیا۔

بیجا گفت و شنید سے بچنے کے لئے اس نے میز کی دراز میں سے مذکورہ بالا کاغذ نکالا اور اسے لیجا کر اپنے آہنی صندوق میں چوم کر بند کر دیا۔

(چیخوف)

ظفر قریشی دہلوی

بلبل باغ حسن ہوں نغمے کو ناز کیوں نہ ہو
میری نوائے عشق میں سازِ حجاز کیوں نہ ہو

دل ہے جہانِ عاشقی درد ہی کائناتِ حسن
دل کا ہر ایک اضطراب درد نواز کیوں نہ ہو

آپ جہانِ حسن میں حسن کے بادشاہ بھی ہیں
ناز بجا ہے آپ کا، آپ کو ناز کیوں نہ ہو

سجدۂ مے پرست پر ہوتی ہے بارشِ کرم
ساغرِ میکدہ نشیں۔ محو نماز کیوں نہ ہو

چند دکنی مرثیہ گو

مجھے یہاں اس سے بحث نہیں کہ مرثیہ کی ابتدا دکن سے ہوئی یا شمالی ہند سے ؛ مگر بقول نصیر حسین خاں خیال شمالی ہند میں ہمایوں کے دوبارہ واپس ہند آنے کے پیشتر مجالس عزا اور مرثیہ گوئی کا دستور نہ تھا مگر اس کے کم و بیش نصف صدی پہلے دکن میں ان کا رواج تھا۔ ابتداً تو محتشم کاشی کے بند پڑھے جاتے تھے مگر اس کے بعد بہت جلد دکنی مرثیوں کا آغاز ہوگیا۔

شجاع الدین نوری کا نام پہلے مرثیہ گو کی حیثیت سے پیش ہوگا جن کے کلام کا نمونہ ہم نے اپنی تالیف "دکن میں اردو" میں درج کیا ہے۔ دکنی مرثیہ گوئی پر کبھی تفصیل سے روشنی ڈالی جائیگی۔ یہاں چند مرثیہ گو شعراء کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

دکنی مرثیوں کا ایک مجموعہ اڈنبرہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں دیکھا گیا ہے ایک اور بیاض کنگ کالج کیمبرج میں ہے۔ ہمارے خاندانی کتب خانوں میں بھی متعدد بیاضیں ہیں جن میں سے ایک ہمارے پیش نظر ہے۔

ان بیاضوں میں مرثیے۔ نوحے۔ سلام سب کچھ موجود ہیں ان کے مرثیوں کی تعداد حسب ذیل ہے :-

(۱) بیاض مملوکہ اڈنبرہ یونیورسٹی دیوان حسینی سے موسوم ہے اس میں ہاشم علی برہان پوری کے تقریباً (۲۵۰) مرثیے۔ نوحے اور سلام کے علاوہ قادر کا ایک نامکمل مرثیہ ہے۔

(۲) بیاض اڈنبرہ یونیورسٹی گویا اول الذکر کا تکملہ ہے کیونکہ قادر کا مرثیہ اس میں مکمل × × × ہوا ہے۔ اس میں (۸۰) شعراء کے (۳۰۰) مرثیے، نوحے وغیرہ ہیں۔ ان دونو بیاضوں کے اوراق کی تعداد (۴۴۷) ہے ان کے متعلق مصنف کیٹلاگ کی صراحت حسب ذیل ہے :-

"مراثی حضرت علیؓ۔ آنحضرتؐ۔ اور حسینؓ۔ مصنف ہاشم علی جو اردو کا ایک ابتدائی شاعر تھا۔ یہ ہاشم ولی اور قاسم کے پہلے گزرا ہے یہ جہانگیر کے زمانہ میں بیجاپور میں رہتا تھا ۱۰۳۰ء اور ۱۰۵۶ء میں بھی زندہ تھا۔ ایک اور سنہ (۱۰۴۶ء) جو صفحہ (۳۵) پر درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے یہ تصنیف اسی سنہ میں ہوئی ہے۔ ہاشم شیخ احمد فاروقی کا مرید تھا جن کا انتقال ۱۰۳۴ء میں ہوا ہے۔ ہاشم علی چند دیگر کتابوں کا بھی مصنف ہے۔ ایک فارسی دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ چند اشعار کاظم اللہ قادر کے بھی ان جلدوں میں شامل ہیں۔"

مصنف کی یہ صراحت صحیح نہیں ہے اس کا زمانہ گیارہویں صدی نہیں بلکہ بارہویں صدی ہجری ہے۔ آگے چل کر اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائیگی۔

(۳) بیاض کنگ کالج۔ اس میں (۳۲) شعرا کے تقریباً (۵۰) مرثیے ہیں درمیانی ایک ورق پر تاریخ کتابت حسب ذیل درج ہے:-

"تمت تمام شد بدست افقر العباد غلام نبی ۲۶ ربیع الثانی ۱۱۵۷ھ"

(۴) بیاض کتب خانہ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم اس میں (۴۳) شعرا کے (۱۱۴) مرثیے ہیں۔ تاریخ کتابت درج نہیں۔ مگر یہ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم کو ان کے والد کے ترکہ میں ملی ہے۔ مولوی صاحب کے والد نواب سالار الملک کا انتقال ۱۲۷۵ھ میں ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کی کتابت ۱۲۷۵ء سے پہلے ہوئی ہے۔

اگرچہ ان بیاضوں میں اکثر مشترک اصحاب کے مرثیے ہیں مگر کئی ایک ایسے ہیں جن کے مرثیے دوسری بیاضوں میں نہیں ہیں علی ہذا کسی میں ایک شخص کے مرثیے زیادہ ہیں تو دوسری میں دوسرے شخص کے۔ مثلاً اڈنبرہ والی بیاض میں مرزا کے صرف (۱۶) مرثیے ہیں مگر مولوی صفی الدین مرحوم والی میں اس کے (۴۲) مرثیے ہیں۔ ان میں سب سے نایاب یہی آخر الذکر قرار دیجاسکتی ہے۔ کیونکہ اس میں قطب شاہی عہد کے قدیم ترین شعرا مثلاً وجہی۔ غواصی۔ عبداللہ قطب شاہ لطیف وغیرہ کے مراثی موجود ہیں۔

دکنی مرثیے شمالی ہند کے مرثیوں سے چند امور میں تو قیت رکھتے ہیں۔

(الف) ان مرثیوں سے صاف طور پر مرثیہ پن ظاہر ہوتا ہے ان کا اصلی

مقصد امام حسینؓ اور اہل بیت کا غم کرنا اور آنسو بہانا ہے۔ کوئی مرثیہ اس خصوصیت سے خالی نہیں ہے۔

(ب) فرضی روایات اور افسانوں کو مرثیوں کا جزو اعظم قرار نہیں دیا گیا ہے۔

(ج) مبالغہ اور تصنع نہیں ہے۔

(د) اکثر مرثیوں سے مصنفین کے متعلق تاریخی حالات معلوم ہوتے ہیں شاعروں کے نام اور ان کے وطن اور ان کے ہمعصروں کی صراحت معلوم ہوتی ہے۔

(۱) دکنی مرثیوں کا ذکر تین دور میں کیا جا سکتا ہے یعنی قطب شاہی اور عادل شاہی مرثیہ گو۔ دور مغلیہ کے مرثیہ نویس اور عہد آصفیہ کے مرثیہ گو قطب شاہی عہد کے جن شعرا کے مراثی دستیاب ہوئے ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) سلطان قلی۔ (۲) وجہی (۳) غواصی (۴) عبداللہ قطب شاہ (۵) لطیف (۶) شاہی (۷) کاظم۔ (۸) مرزا

ان کے علاوہ نہیں معلوم اور کتنے مرثیہ گو تھے بہت ممکن ہے کہ خود ان بیاضوں میں ان کا کلام شامل ہو جن کے زمانہ سے ہم واقف نہیں۔

اسی طرح بیجاپوری شعرا سے علی عادل شاہ۔ ہاشمی۔ مرزا۔ قابل ذکر ہیں جن کے مرثیے ہمیں دستیاب ہوئے ہیں۔

(۱) وجہی وہ خوش نصیب شخص ہے جس کی تصنیف سے نظم و نثر دونوں کے نمونے موجود ہیں مثنوی قطب مشتری جس کی تصنیف ۱۰۱۸ھ میں ہوئی ہے انڈیا آفس لنڈن میں موجود ہے۔ ہم کو اس کا ایک مرثیہ ملا ہے جس پر ہم نے علیحدہ تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس لئے یہاں اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

(۲) غواصی۔ اس کی شخصیت اب محتاج تعارف نہیں رہی۔ دکنی ادب کی جو کچھ اس نے خدمت کی ہے وہ فراموش نہیں ہو سکتی۔ افسوس اس کی پوری لائف سے ہم اب بھی واقف نہیں کسی کو نہیں معلوم اس کا نام کیا تھا اور کہاں پیدا ہوا؟ کس خاندان سے تھا؟ ہم کو اس کی نسبت جو کچھ معلومات ہیں ان کا ماحصل یہ ہے:-

غواصی سلطان ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہو عمر میں وجہی سے چھوٹا تھا سلطان محمدؒ کے زمانہ میں اس کی شاعری چمکی مگر سلطان کے دربار تک رسائی نہیں ہوئی حتیٰ کہ اس نے اپنی تصنیف "سیف الملک و بدیع الجمال" مکمل کر دی۔ اس زمانہ میں وہ اگرچہ شاہی ملازم تھا مگر دربار تک باریابی نہیں ہوئی تھی اس کو تمنا تھی کہ سلطان تک رسائی ہو جائے آخر اس کی امیدوں کے موافق وہ حضور سلطانی میں پیش ہوا اور عزت و شوکت حاصل ہوئی۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں اس کا خاص رسوخ تھا۔ سلطان کی توجہات اور عنایات سے ہمیشہ سرفراز ہوا کرتا۔ سفیر شاہی کی حیثیت سے بیجاپور روانہ کیا گیا جہاں خوب آؤ بھگت ہوئی واپسی کے وقت قیمتی تحائف حاصل ہوئے۔

مذہب کے لحاظ سے وہ سنی تھا۔ بلوم ھارٹ نے یہ بالکل غلط لکھا ہے۔ کہ غواصی شیعہ مذہب کا پیرو تھا۔ وہ اپنی تصنیف میں شیخ عبدالقادر جیلانی کی مدح نہایت خلوص اور عقیدت سے کرتا ہے اس نے خود اپنے شیعہ نہ ہونے کی صراحت سیف الملک میں کر دی ہے۔ چنانچہ برٹش میوزیم کے ایک ناقص نسخہ میں لکھتا ہے:-

فدا ہوں ولیوں کے اوپر ؛ سنو رافضی خارجی کاٹ کر

آخر زمانہ میں اس کی حالت بالکل بدل گئی تھی وہ دنیا کو ترک کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اپنے دنیا دار ہونے پر لعنت ملامت کرتا ہے۔

اس کا انتقال کب ہوا یہ بھی معلوم نہیں۔ البتہ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسی سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے زمانہ میں فوت ہوا۔

فی الوقت اس کی دو تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔ ایک تو مثنوی سیف الملک و بدیع الجمال جس کی تصنیف ۱۰۳۵ھ میں مرتب کیا۔ اس کی اور دو تصانیف کا قیاس ہوتا ہے۔

(۱) مثنوی یوسف۔ زلیخا۔

(۲) مثنوی لیلیٰ مجنوں۔ مگر سر دست یقین کے ساتھ اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

اب تک یہ نہیں معلوم تھا کہ غواصی مرثیہ نویس بھی تھا۔ معلوم ہوتا ہے اکثر قطب شاہی شعرا مثنویوں وغیرہ کے ساتھ مرثیہ بھی کہا کرتے تھے۔ ہمیں غواصی کے دو مرثیے دستیاب ہوئے ہیں اگرچہ یہ کوئی طویل مرثیے نہیں ہیں بلکہ (۱۰) اور (۹) شعر کے ہیں۔ ان کے متعلق کسی مزید صراحت کے پہلے ان کو درج کیا جاتا ہے۔

مرثیہ حضرت امام حسینؓ

دستا نین کروں کیا اوبیان کربلا کا ‌ ‌ ‌ پھرتا ہوں زار ہوں میں حیران کربلا کا

* [illegible]

آسمان بیتے خدایا جبرئیل لونڑ کو آیا ۔ رونا ادہر تے لایا فرمان کربلا کا
کہر یاند کربلا میں کر لشکر بر بلائیں؟ کیوں ہے کہ کربلا میں کہ سلطان کربلا کا؟
ہے دکہ ہٹ لوسب کے نیں کس قرابت تے
پکڑیا حسین جب تے میدان کربلا کا
دکہ سر ملک لے ہیں ماتم زدے ہوئے ہیں ۔
رورو دریا کئے ہیں آسمان کربلا کا
چنداہ سک سون سوتا اس دک سوں کم کہتا
تاریاں سون روز روتا فرمان کربلا کا
جلتا ہے سورج تی دنیا کری ہے رو تی
کان تے ہوا ہو کوئی مہمان کربلا کا
منجہ سک نہیں ہے دو کہ بن جہان ہیں ندہال چمن چمن
لاگیا ہے رات ہور دن منجہ دہیان کربلا کا
کرو رو دو کربلا منجہ شاد کرنے ہارا
سو ہے حسین پیارا شہ جان کربلا کا
عنوا صبا معطر عالم کون سب کیا ہے
گویا یو مرثیہ ہے ریحان کربلا کا
(از بیاض کتب خانہ مولوی صفی الدین مرحوم)

دیگر

ماہ محرم سوز سون آیا اہل دل منیر سون
روتا عالم یک ریز سون کیا کام کیتا ہائے ہائے
کیوں حیف نہیں آیا تجھے کن بند سکلایا تجھے
یو کام کیوں بھایا تجھے کیا کام کیتا ہائے ہائے
کر بادشاہی پر منم شاہاں کون دیتا غم پو غم
مظلوم پر کرنے ستم جیعی نہ کھایا ہائے ہائے
دکہ شاہ زادے کون دیا بدنامی اپنے سر لیا
آخر او کافر کیوں کیا اپنا ج بتایا ہائے ہائے
مہاک کفنی بہا گلے جوگی جنگم پرنے چلے
از ادسون دیتا ک تے سب تن جلایا ہائے ہائے
روتے ملک سب عرش لک سورج ستارا اپنا جہلک
مشرق تے تا مغرب تلک اندکار بار یا ہائے ہائے
غم سون پکر بیت الحزن یعقوب نے کہو یا نین
شیریں کے بہانے کو کن آپ چو کنوایا ہائے ہائے
بعض قدامی مرثیہ سن کے دکن کے اولیا ۔ ہر سال کا یو مرثیہ کیا کام کیتا ہائے ہائے

ان کے مطالعہ سے واضح ہو سکتا ہے کہ مرثیہ صرف ماتم کے لئے مخصوص تھا ان کا مقصد یہ تھا کہ حسین پر مصائب کا ماتم کی جائے اور آنسو بہائے جائیں ۔ کوئی فرضی اور جعلی واقعات بیان کر کے مرثیہ کو طویل نہیں دیا ۔ عربی اور فارسی کے الفاظ بہت کم استعمال ہوئے ہیں ۔ مبالغہ اور تصنع حد اعتدال سے زیادہ نہیں ۔ اپنے وطن کا اظہار اور اپنے ہر سال مرثیہ کہنے کا ذکر بھی کر دیا گیا ۔

(۳) سلطان عبد اللہ قطب شاہ ۔ گولکنڈہ (حیدر آباد) کے قطب شاہی سلسلہ کا ساتواں تاج دار ہے ۱۰۳۵ء میں سریر آرائے سلطنت ہوا اور ۱۰۸۳ء تک حکمرانی کر کے فوت ہوا ۔ اپنے باپ دادا کی طرح علم دوست اور علم پرور تھا بڑے بڑے نامی گرامی علماء اور اہل کمال سلطان کے دامن دولت سے وابستہ تھے ۔ جن کے منجملہ چند یہ ہیں :-

علامہ فہامی ۔ میر محمد الدین جو علامہ میر محمد مومن کے فرزند اور فارسی کے زبردست شاعر تھے ۔ سیادت پناہ میر سید محمد اسفرائی ۔ عمدۃ الفضلاء ۔ قاضی احسن ۔ قاضی ظہر الدین محمد الحسنی ۔ حکیم عبد الجبار گیلانی ۔ مرزا محمد جوہر تبریزی ۔ مرزا حمزہ استر آبادی ۔ مرزا فضل اللہ شیرازی ۔ مرزا محمد مشہدی ۔ قاضی عطاء اللہ گیلانی ۔

سلطان کو شعر و سخن سے خاص دلچسپی تھی فارسی کے بلند پایہ شاعر مثلاً مولانا سرلنق ۔ ملا خلقی ۔ نور اللہ ۔ قیصری وغیرہ ہم سلطان کے دربار میں تھے اسی طرح دکنی شعراء کا جمگھٹا تھا ان میں سے بعض یہ ہیں :-

وجہی ۔ غواصی ۔ ابن نشاطی ۔ جنیدی ۔ طبعی ۔ امین لطیف وغیرہ ۔ سلطان کی علمی قدر دانی اور علم پروری کی طویل داستان ہے ۔ سلطان کو شعر و سخن کی دلچسپی کے ساتھ شعر گوئی کا بھی خاصہ ملکہ تھا ضخیم دیوان کا مصنف ہے جس کا ایک نسخہ نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں ہے ۔ چونکہ ہم نے دیوان دیکھا نہیں ہے ۔ اس لئے اس کے متعلق کسی تشریح سے قاصر ہیں ۔

اس زمانہ کے رواج کے بموجب سلطان مثنوی غزل رباعی وغیرہ کے ساتھ مرثیہ بھی کہا کرتا تھا ۔ یقین ہے اس کے دیوان میں متعدد مرثیے ہوں گے مگر چونکہ ہماری بیاض میں صرف ایک مرثیہ ہے اس لئے اسی کو پیش کر دیا جاتا ہے ۔

یہ مرثیہ ۔ مرثیہ حضرت امام حسین [illegible]

شعر ہیں۔

علی ہور فاطمہ کرتے ہیں دونو آج زاری بھی
حسن کا ہور حسین کا دوکہ لے آیا جگ لچاری بھی
حسین جب چلے لڑنے سراں ہیں پر لگے پڑنے
شہیداں ہر طرف جھڑنے لگیا یو دوکہ پیساری بھی
وصیت یوں کئے جاتے تکو روتم آپ بہاتے
نہیں تو پھر کو نہیں انی اجل آئی ہماری بھی
یتیماں کو سنبھالو ہو عزلبی ہیں سکھالو ہو
بہوت مہراں سوں پالو ہو ہیں گے یادگاری بھی
پریگا غم تمن پر جب میرا غم یاد کرنا تب
یو دوکہ یاد آویگا ہر کب کرو نین اشکباری بھی
سوتے یو غم حرم سارا مسلم ہو نزار و نارا
سو ماری کل گلا لغرا ابکر کر بیقراری بھی
شہر بانو بھی اگر کہ اسے سینسار کے سرور
منجے عزبت منے بہاکر سجاد چھور باری بھی
منجے سے جاتے یوں حال تمن بعد از میرا کیا حال
کرو مت غم منے پائمال دیو وس نثاری بھی
علی اکبر کہنے میں جانون سو پیاساں ہیں جو پیاسے لانون
زخم کھاکر آئے پھر اب تھانوں بھی ہے مشک ساری بھی
دیکھو طفلاں منگے پانی نکر ذرہ مہربانی
ستم سوں تیر مارا نے کئے اونا بکاری بھی
حسین پانی پنی اسے یزیداں تیر برسائے
سو پانی پینے نہیں پائے لگے مکہ لہو کی دھاری بھی
بغیر از ظلم بیدادی نہ تھی اس وقت کچھ شادی
ہوئی قاسم کی دامادی دیکھو تقدیر باری بھی
سو دیدیاں نیوت بودند کر جو خوشیاں سات پیوند کر
حرم کون لے چلے بند کر پر باجگ سب اللہ یاری بھی
عروس آکر مکر دامن چلے تو شو ہو جب جھوجن
نشانی کچھ دیو منجکن سو پیارا ستین نماری بھی
حسین کا وقت جب دانیا شمر نے آکلا کاتیا
حرم کا دیک سینا پیا بتا دینا اور ایکاری بھی
ننگے پاواں چلے آئے سو باداں کون چھلے آئے
اگن دیکھن چلے آئے نکتے دو سنداری بھی
گپت کنی سینے پیش آئیا مت کچھ نہ اندیشہ
اپن مارا یا اپنے تیشہ تو پایا گرفتاری بھی
یزید دیکھا حسین کا سر پھرایا بہت سوں ہر ہر
سو دیکھو لعنتی کافر کیا کفر اختیاری بھی
کروا سے دوستاں ماتم ثواب ہے بہت کرنا غم
مدد ہوسنگے امام ہر دم کی ہے المدد داری بھی
حسین کا دوکہ دل میں آن لگا ایک چیٹ سوں دائم دھان
کرے قطب عبداللہ سلطان دوکنو سوں شہریاری بھی

(ایضاً)

(۴) علی عادل شاہ بیجاپور۔ سلاطین قطب شاہی کی طرح بیجاپور کے عادل شاہی سلاطین علم و ہنر ہی کے سرپرست تھے — علی عادل شاہ ثانی اس سلسلہ کا آٹھواں تاجدار ہے جس نے ۱۰۶۷ھ سے ۱۰۸۳ھ تک حکمرانی کی۔

اس کا دور حکومت ترقی علم و فن خاصکر اردو کی ترقی کے لئے مشہور ہے اس کا دربار باکمالوں کا مجمع تھا۔ دور دور سے اہل علم و فضل آکر اس کے دامن دولت سے وابستہ ہو جاتے تھے اس کے زمانہ میں بیجاپور علم و ہنر کی قدر دانی کے لحاظ سے رشک بغداد اور قرطبہ بنا ہوا تھا ہر ایک مورخ نے سلطان کی تعریف کی ہے۔ اس زمانہ کے مشاہیر علماء کی طویل فہرست ہے جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:۔

قاضی نور اللہ جنہوں نے اس کے دور حکومت کی بہترین تاریخ لکھی۔ شاہ کمال الدین۔ علامہ فتح اللہ شیرازی۔ میر ابراہیم ابن علامہ حسین ابوالحسن مکونہ۔ ارسطو زمان۔ ملا احمد۔ میر نعمت اللہ — شاہ میراں جی۔ مصطفیٰ خاں کیانی وغیرہ۔

سلطان کو شعر و سخن سے خاص ذوق تھا۔ اسی ذوق و شوق کا نتیجہ تھا کہ بیجاپور میں گھر گھر شعر و شاعری کے تذکرے ہوتے اور شاعری کی مجلسیں قائم ہوتی تھیں۔ اس زمانہ کے کئی ایک شعرا مشہور ہیں۔ مثلاً ملک الشعراء نصرتی۔ حکیم آتشی۔ عبدالقادر نواسی۔ معتمی دولت۔ امین۔ شاہ ملک۔ ایاغی۔ مرزا۔ ہاشمی وغیرہ۔ ان میں سے کچھ تو صرف فارسی گو تھے اور مابقی اردو اور فارسی دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے ان کے کارنامے آج تک محفوظ ہیں۔

سلطان علی خود بھی اچھا شاعر تھا۔ نصرتی جو ملک الشعرائی کے درجہ پر فائض تھا خود سلطان کا شاگرد تھا۔ افسوس ہے سلطان کا

دیوان یا مثنویاں دستیاب نہیں ہوئیں۔ اس لئے جو کچھ کلام دستیاب ہوتا ہے وہ گویا ایک نایاب خزانہ ہے۔

ہم کو سلطان کا ایک مرثیہ دستیاب ہوا ہے جس کے (۱۲) شعر ہیں۔ زبان کے لحاظ سے اس کو بہت صاف کیا جا سکتا ہے۔

مرثیہ حضرت امام

شہ کے غم سوں دل ہے نالاں ہائے ہائے
جگ برستی جون ابھالاں ہائے ہائے

جگ کے سرور دل کے لہو سوں بھر چلے
پھور کر پلکہاں کے بالاں ہائے ہائے

یک شگفتہ گل نہ اس غم سوں رہیا
ہر خزاں میں لونہالاں ہائے ہائے

دم تنرے کی دل میں وک سوں لیو جمیا
تو پنچتے کہن میں لعلاں ہائے ہائے

اس شدیاں کون کھول انکیاں دیک تون
ہے بر دشہ کے اودھلاں ہائے ہائے

کربلا کی سب زمیں رنگیں ہوئی
لہو بری دلدل کے ماندن ہائے ہائے

تن گگن کا پھو کر مجمر کیا
آہ کے تیران کے بہالاں ہائے ہائے

نین شفق جگ پونچھ کر سے تے ملک
لہو بھری سوا درو مالان ہائے ہائے

آج نہیں دستے زمین کے پیت پر
حیف او صاحب جمالان ہائے ہائے

کر خوشی ہور خرمی کے گر پڑے
آہ کے چینے میں نالان ہائے ہائے

اسد کہون بھر کے انی سب تن منے
نت جلیں انکیاں ہلالان ہائے ہائے

نت کر عادل علی یکدل ستے
شہ کا ماتم ماہ و سالاں ہائے ہائے

(ایضاً)

(۵) لطیف (گولکندہ) غلام علی خاں لطیف قطب شاہی عہد کا قزلباش امیر تھا۔ امامیہ مذہب کا پیرو۔ شاعری یا مرثیہ گوئی اس کا پیشہ نہیں تھا۔ بلکہ بطور تفنن الطبع شاعری کرتا۔ انکو اپنی امارت اور شرافت کا بڑا فخر تھا اس کے متعلق اپنی مثنوی میں جا بجا صراحت کی ہے۔ ان کو اپنے حیدرآبادی ہونے پر بھی ناز ہے۔

لطیف بڑا پرگو شاعر تھا۔ پانچ ہزار پانچ سو شعر کی مثنوی صرف ایک سال کی قلیل مدت میں لکھدی۔ جو ظفر نامہ کے نام سے موسوم ہے اس میں محمد حنفیہ کا ایک فرضی قصہ منظوم کیا گیا ہے اس کی تصنیف ۱۰۹۵ھ میں ہوئی ہے۔ غالباً یہ ان کے آخر زمانہ کی تصنیف ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں یہ موجود تھے۔ اپنے مرثیہ میں انہوں نے صراحت کر دی ہے۔ وہ غواصی کے زمانہ میں موجود تھے۔ غالباً غواصی کے عہد میں یہ نوجوان ہونگے۔

لطیف کا کوئی مرثیہ یورپ میں نہیں ہے ہمارے خاندانی بیاض میں ان کا ایک مرثیہ ہے۔ جس کے (۲۵) شعر ہیں۔ طرز عبارت کے لحاظ سے اس کو بھی صاف کہنا چاہئے۔

مرثیہ حضرت امام حسینؓ

اے اہل درد اشک سوں انکھیاں کون تر کرو
نکلیا ہے پھر یو ماہ ہے محرم نظر کرو۔

نازل زمین پو سر تے ہوا غم حسین کا
ماتم زدیاں کو ایک طرف تے خبر کرو

پھر تن کے عود سوز میں غم کی انگار آج
جیوان کون عود ہور دلان کون اگر کرو

سلطان کربلا کی غریبی کون یاد کر
ٹکرے جگر کون ہور دلان کون خنجر کرو

ہے درد اگر تمن کون قیامت کے دھوپ کا
سایہ کون اہل بیت کے سر کا چھتر کرو

جہاں لگ خوشی دنیا کی ہے سب ناخوشی ہے
ہور اس ناخوشی تے بات میری سن خدا کرو

شیر خدا کی بات میں بکرنگ خاک ہو
آسمان ہور زمیں کے اوپر فخر کرو

سینسار کے گہران کون بقا نہیں فنا ہے بو
تکیہ تم اس گہران پو نکو بون بسر کرو

خلقت میں یو وجود ہے پتلا جو خاک کا
چندا نہ اعتبار تم اس کے اوپر کرو
گر بندا ہے تو دیو دین کوں رواج
یعنی بشر ہو خدمت خیر البشر کرو
منگتا ہے سرخ رو تمیں دوجہاں میں تو
امرت کنکوں ہور زبان کوں شکر کرو
امت کی نیکی ہونہ پلو باند لیو پاپ
دوزخ میں ست ستم نہ آپس پر عذر کرو
خلقِ محمدؐ کرم مرتضیٰ سے علے
انساں ہور علین یو اپنا سپر کرو
دل میں لقا کے گھر کا اگر ہے ہوس
نیکی کے دام خرچ کر جنت میں گھر کرو
بیدرد ہے جکوئی خوش اس تے خدا نہیں
مرد ہو کلمیں درد کے یکدم گذر کرو
ایمان جوں چراغ ہے عاقبت کے دار کا
بارا لگے نہ بیتوں جتن اس دل بہتر کرو
منگتا ہے چو کے سار جو سب کوں عزیز اچھے
امرت کنکوں ہور زبان کوں شکر کرو
بے دین ہو یزید کیا دین میں خلل
لعنت مدام اس کے اوپر سر بسر کرو
گر شہ علی ہے بات میں ثابت قدم یقین
آیات ہور حدیث ہور سمیں اثر کرو
جکوئی تمنکوں جیو دی پیدا کیا اول
ذکر چلو ہنت نہ اپس کوں نذر کرو
دولت اوپر ابد کی نظر ہے تو دل کوں آج
گنجینۂ محبت اثنا عشر کرو
سینے اوپر تے کار ستو بغض کا کلنگ
دن دن کوں صاف دل کوں نیم کا چندر کرو
اڑنے فلک کے بام پو اشتیاق تو
پیدا ہی کے سار سعادت کے پر کرو
آل عبا کے غم سوں جنم آج صرف کر
محشر کے دلیں ذوق خوشیاں سوں اثر کرو
غواص کے زمانکے اچھہ ہے لطیف تو
اے عارفاں ہو یاد تمیں یو اچر کرو

(ایضاً)

(۶) ہاشمی - بیجاپور - علی عادل شاہ ثانی کا ہمعصر ہے - سید میراں نام سید شاہ ہاشم کا مرید تھا - کہا جاتا ہے کہ مادر زاد اندھا تھا - مثنوی - دیوان - مرثیے اس کی یادگار ہیں - مثنوی یوسف زلیخا ۱۰۹۹ھ میں مرتب کی ۱۱۰۹ھ میں اس کا انتقال ہوا - ریختی کا بھی یہی موجد ہے اس کے پہلے اس قسم کی غزلیں کسی نے موزوں نہیں کیں - مگر یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے - اس قسم کی نظم کا کوئی خاص نام اس وقت تھا یا نہیں ؟ میرا خیال ہے چونکہ اس قسم کی یہ ابتدائی کوشش تھی اس لئے اس کا کوئی خاص نام نہیں تھا زمانہ مابعد میں اس کو ریختی سے موسوم کیا گیا ہے۔

مصنف بساتین السلاطین نے تعریف کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا ہے - چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

"ونیز از جملہ ہندی گویان ان زمانہ میاں ہاشمی است کہ بفیض لعاب دہن مبارک حضرت پیر دستگیر شاہ ہاشم قدس سرہ زبان شیریں بیان کشادہ درمیان سخنوران گوی سبقت بودہ - ترجمہ یوسف زلیخا را بجا دہ آن وقت نظم آوردہ و دیوان غزل مشتمل بمضامین سنجیدہ و تلازمات شعریہ ہم داکہ مقبول طباع افتادہ در اشعار طرازی تازہ روش غریب و نور زبدہ است کہ ہیچکس بر آوردن ان سیاقت نزادہ - باوجودے کہ بصیر مادر زاد بود"

(صفحہ ۹۲ ب انڈیا آفس)

غرض کہ ہاشمی کی قابلیت مسلمہ تھی دیگر شعراء کی طرح وہ حسب رواج مرثیہ بھی کہا کرتا - مگر افسوس اب سب ناپید ہیں - ہم کو اس کا ایک مرثیہ اڈنبرہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں دستیاب ہوا - افسوس ہم نے پورا نقل نہیں کیا - جو کچھ نوٹ کیا گیا یہاں پیش کیا جاتا ہے -

دلبند مصطفےٰ کا تابوت لے چلے ہیں -
فرزند مرتضیٰ کا تابوت لے چلے ہیں -
سلطان دوجہاں کا سردار اولیا کا
مظلوم کربلا کا تابوت لے چلے ہیں

حضرت حسین حسن کا شاہ زمین زمن کا
حضرت بنی سنگا تابوت لے چلے ہیں

. . . .

حضرت کے تھے لوا سے حیدر کے تھے خلاصے
ہوئے شہید پیا سے تابوت لے چلے ہیں
اے ہاشمی شہاں کا سلطان دو جہاں کا
مقبول اوس جوان کا تابوت لے چلے ہیں

(از بیاض اڈنبرہ یونیورسٹی)

یہ مرثیے زبان کی صفائی کے لحاظ سے ممکن ہے ہاشمی بیجاپوری کا شمار نہ کیا جائے مگر ہاشمی کے دوسرے کلام کی صفائی کو دیکھا جائے تو پھر اس مرثیہ کو ہاشمی بیجاپوری کا تصور کرنے سے کوئی امر مانع نہیں ہو سکتا۔

گولکنڈے اور بیجاپور کے یہ چند شعراء ہیں جن کے دوسرے کلام کے ساتھ مرثیے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ یعنی ان شاعروں کا دوسرا کلام مثنوی قصائد غزل وغیرہ بھی موجود ہے۔ یہ شعراء مرثیہ گوئی کا پیشہ نہیں رکھتے۔ آئندہ نمبر میں ان شعراء کو پیش کیا جائیگا جن کا پیشہ ہی مرثیہ گوئی تھی جن کے متعدد مرثیے یورپ میں اور یہاں دستیاب ہوئے ہیں۔ اس کے بعد مغلیہ عہد کے دکنی مرثیہ گو پیش کئے جائیں گے۔ امید ہے کہ ناظرین کی ضیافت طبع کا باعث ہوں۔

نصیر الدین ہاشمی

(ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ ایف۔ آر۔ ایس۔ اے (لندن)

افکار آزاد

چمن ہے، بہاریں ہیں گلباریاں ہیں
گھٹا ہے، پھواریں ہیں، میخواریاں ہیں

ستم کوشیاں ہیں جفا کاریاں ہیں
یہ کس کے مٹانے کی تیاریاں ہیں

تمہوا اِتم خدا جانے کیسے خدا ہو
کہ ستاریاں ہیں نہ غفاریاں ہیں

جواب کوئی پرساں نہیں ہے تو کیا غم
غم دوست ہے اور غمخواریاں ہیں

اگر تم خداوند عالم نہیں ہو
تو عالم میں کس کی پرستاریاں ہیں

اب آنکھیں نہیں جاگتی تو نہ جاگیں
کہ اب روح ہے اور بیداریاں ہیں

حکیم آزاد انصاری

محبّت

محبّت کیا ہے؟ لطفِ زندگانی — سرور و سوز و عیشِ جاودانی
محبّت کا گزیں سرمایہ کیا ہے — غمِ جاں کاہ و مرگِ ناگہانی

(۲)

محبّت سے ہے حاصل کامِ ہستی — محبّت ہی سے ہے آرامِ ہستی
محبّت ہی کی خاطر آدمی کو — گوارا ہیں غم و آلامِ ہستی

(۳)

محبّت سے ہوا جب ریش سینا — ٹھکانے لگ گیا انساں کا جینا
زہے قسمت! محبّت کے شرر کو — گئی پہچان میری چشمِ بینا

(۴)

غمِ الفت ہے عیشِ قہر آگیں — غمِ الفت ہے وجہِ اشکِ خونیں
غمِ الفت کے آگے ہیچ ہیں سب — غمِ دنیا، غمِ عقبیٰ، غمِ دیں

(۵)

محبّت باعثِ سوزِ دروں ہے — محبّت زندگانی کا جنوں ہے
رگِ سنگ آشنائے شعلۂ غم — محبّت موجۂ دریائے خوں ہے

(۶)

کہا وقتِ سحر شبنم نے گل سے — مبارک تجھ کو سوز و سازِ ہستی
ترے گوشِ حقیقت آشنا کو — نوائے عندلیب آوازِ ہستی

مشتاق

(غیر مطبوعہ)

رومانیا کی شاعرہ ملکہ "میری"

رومانیا کی اس ادیبہ اور شاعرہ ملکہ کی اس جمہوری حکومت کے متعلق کچھ تحریر کرنے کی بجائے جس کے باشندے اس کی پرستش کرتے ہیں اور اس کے نام کی قسم اسی طرح کھاتے ہیں جس طرح خدا کے نام کی قسم کھاتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معمولات زندگی کا ایک خاص حصہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ ملکہ میری کا ایک مختصر اور سادہ مکان ساحل بحر پر واقع ہے۔ ملکہ ہر نئے سال کا کچھ حصہ اس مکان میں گذارنے کی عادی ہے۔ وہاں اس کے ساتھ اس کی محررۂ خصوصی اور چند خدام کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا۔

جب طیور درختوں کی شاخوں پر نغمہ سرائی میں مصروف ہوتے ہیں اور نسیم سحری کی اٹکھیلیوں سے ایک کیف آگیں صدائے ترنم پیدا ہونے لگتی ہے تو ملکۂ شاعرہ اپنے دارالمطالعے میں اس دریچے کے سامنے آ بیٹھتی ہے۔ جو سمندر کی طرف کھلا ہوا ہے اور دریائے تخیل میں غرق ہو جاتی ہے اور ادب کے ان درخشاں موتیوں کی جھڑی لگ جاتی ہے جس سے وہ بیش بہا ہار تیار ہوتے ہیں جنھوں نے ملکہ میری کو ارباب ادب کی صف میں نہایت ممتاز حیثیت کا مالک بنا دیا ہے۔ بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ گوشۂ تنہائی میں بیٹھی ہوئی اپنے افکار و خیالات کی تشکیل و تدوین میں منہمک ہوتی ہے اور کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو وہ بطیب خاطر سر اٹھاتی ہے اور لطیف و شیریں آواز سے کہتی ہے "اندر آجایئے" ملاقاتی جو رومانیا کا کوئی کسان ہوتا ہے۔ ملکہ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہے۔ تاکہ اپنے دکھ اور درد کو اپنی محبوب ملکہ کے گوش گذار کرے۔ غریب کسان بلا تکلف اس چھوٹے سے مکان میں پہونچ جاتا ہے اور اسے ملکہ کے سامنے پیش ہونے کے لئے نہ کوئی خاص جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ اور نہ کسی سے اجازت لینی ہوتی ہے۔

ملکہ لطف و کرم کے ساتھ مسکراتی ہوئی اس کا استقبال کرتی ہے۔ اور اس کی درخواست کو کامل توجہ کے ساتھ سن کر اسے رخصت کر دیتی ہے اور اپنے محررۂ خصوصی کو طلب کر کے حکم دیتی ہے کہ غریب کسان کی حاجت روائی کا فوراً انتظام کر دیا جائے۔

یہ ہے وہ ملکہ جمہوریہ جس کا ذکر ہم آج کر رہے ہیں۔ ملکہ کا مقولہ ہے اور کتنا پیارا مقولہ ہے کہ

"بچوں اور کم رتبہ لوگوں کے ساتھ محبت کرو۔"

اس جملہ کی قدر و قیمت کا اندازہ دشوار ہو جاتا ہے جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ اس شخص کی زبان سے ادا ہوا ہے جو دنیا میں ارفع اور اعلیٰ مقام پر فائز ہے۔

ملکہ میری کی مؤلفات انگریزی زبان میں ہوتی ہیں۔ کیونکہ اس کا نسلی تعلق انگلستان کے ساتھ ہے۔ لیکن ان کا ترجمہ فرانسیسی، جرمنی، اطالوی، ہسپانوی، یونانی، جاپانی اور اکثر دوسری زبانوں میں شائع ہو جاتا ہے۔

مصر کے مشہور صاحب قلم استاذ حبیب جاماتی ملکۂ موصوفہ کی آخری تالیف کا عربی ترجمہ جریدۂ "البلاغ" قاہرہ میں شائع کرنے والے ہیں۔ یہ آخری تالیف خیالی افسانوں کا ایک مجموعہ ہے جس میں ملکہ نے اپنے بہترین افکار کی تدوین کی ہے۔ اس کی دوسری مؤلفات تیرا دلمن۔ صاعقہ۔ مزمار حیات اور صدائے کوہ ہیں۔

ملکہ کو مقابر کے ساتھ خاص انس ہے۔ چنانچہ رومانیا کے قبرستانوں کے متعلق اس نے ایک حد درجہ دلکش نظم لکھی ہے۔ جس کا ترجمہ ذیل میں نذر قارئین کیا جاتا ہے۔

انسانی نفس میں دیہاتی قبرستانوں کے منظر سے زیادہ اثر انداز کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔

ایک کمتر اور حقیر انسان کا مدفن جو کوہستانی راستوں میں واقع ہے دوسرے مقابر سے زیادہ ہیجان انگیز ہوتا ہے۔

مجھے وہ حزن بہت محبوب ہے جو مقابر کو دیکھکر پیدا ہوتا ہے خواہ وہ معبدوں کے آس پاس ہو یا ان سے دور۔

ہمارے مقابر دوسرے ملکوں کے مقبروں کی طرح منظم اور قطار در قطار نہیں ہیں۔ وہ ادھر ادھر گھنی گھاس اور جھاڑیوں میں منتشر ہیں اور ان سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ لیکن موسم بہار میں اس سوکھی گھاس اور خشک جھاڑیوں کی جگہ خوشنما پھول اور کلیاں نمودار ہو جاتی

ہیں۔ اور قبریں گوناگوں رنگوں کا حلہ زیب بدن کر لیتی ہیں گویا اللہ تعالیٰ نے ارادہ کر لیا تھا کہ انھیں اپنے ہی ہاتھوں سے آراستہ کرے

رومانی کسان ایسے اعمال کو بہت مکروہ خیال کرتا ہے جو بے نتیجہ ہوں۔ اس کے عقیدے میں یہ بات داخل ہے کہ جس امر کا ہونا ضروری ہے وہ عنقریب ہو جائے گی۔ اور جس چیز کا ساقط ہو جانا ضروری ہے وہ بہت جلد ساقط ہو جائے گی۔ جس قبر کو منہدم ہو جانا چاہیئے اس کے لئے ضروری ہے کہ منہدم ہو جائے اور یہ بڑی حماقت ہے کہ اسے بچانے کی کوشش کی جائے۔

ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں اور خوشنما کلیوں والی بیلوں کو اس پر پھیلنے دیتے ہیں کہ وہ اس کا لباس بنجائیں۔

میں ایک دن شہر میں سیر و تفریح کے لئے نکلی۔ جب میں چاروں طرف گھوم چکی تو میرا گذر ایک قبرستان کی طرف ہوا۔ میں چہار دیواری سے گذر کر اندر داخل ہو گئی . . . .

قبروں کے درمیان چلی . . . .

گھاس گھنی تھی اور کلیاں بہت تھیں . . . . .

ایک بوڑھیا سوکھی گھاس کے درمیان مصروف عبادت تھی . . .

میں نے اسے بامعان نظر دیکھا۔ اور اس قبر کے نشان کا تجسس کرنے لگی جس کی زیارت کے لئے ضعیفہ آئی تھی . . . . .

لیکن میں نے وہاں قبر کی کوئی علامت نہ پائی!

میں ضعیفہ کے قریب چلی گئی اور اس سے سوال کیا!

— یہاں کون مدفون ہے؟

اس نے نظریں اٹھائیں مجھے غور سے دیکھا اور مختصر سکوت کے بعد جواب دیا!

— میری بیٹی۔ وہ یہاں آخری اور ابدی نیند سو رہی ہے۔

— لیکن . . . قبر کہاں ہے؟ مجھے اس کا کوئی نشان نہیں معلوم ہوتا!

ضعیفہ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی پیشانی کو پکڑ لیا۔ اور کہنے لگی۔

— قبر منہدم ہو گئی اور اس کے پتھر منتشر ہو گئے۔ میں نے اس سے پھر پوچھا۔

— تو تم نے اسے پھر کیوں نہ بنا لیا؟

— مجھے اس کی کیا ضرورت تھی؟ اور اسے پھر یہاں تعمیر کرنے سے کیا فائدہ تھا؟ مویشی احاطہ سے گذر کر اندر آ جاتے ہیں اور یہاں کی سبزی اور گھاس چرتے ہیں . . . — تو کیا ہے ہم اس جگہ کو مطلق العنان اور آزاد چھوڑ دیں کہ وہ قبروں پر کی سبزی اور گھاس چرتے پھریں؟

— ہاں اے بیگم۔ مویشیوں کا بھی تو حق ہے کہ ہماری ہی طرح آرام و راحت حاصل کریں ہمارے لئے حرام ہے کہ ہم انھیں ان کے چارے سے محروم رکھیں۔ کیا ہمیں یہ زیبا ہے کہ ہم اپنے مویشیوں کو مساکن اموات سے اسباب حیات نہ حاصل کرنے دیں؟ میں نے ضعیفہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور لوٹ آئی اس کی گفتگو کا اثر اب بھی میرے نفس میں باقی ہے! ضعیفہ نے سچ کہا! کیا یہ کوئی معمولی بات ہے کہ حیوان قبرستانوں میں جائیں اور وہاں سے قوت لایموت حاصل کریں؟ کیا مُردوں کیلئے یہی کافی نہیں ہے کہ زمین پر ایسے لوگ موجود ہوں جو ان کے بارے میں غور و فکر کرتے رہیں؟ کیا مویشیوں کے ساتھ یہ ہماری سخاوت نہیں کہ ہم مردوں کی طرف سے بطور صدقہ انھیں قبروں کی گھاس چرنے دیں؟ یہ ہے وہ جو ملکہ رومانیا نے مساکن اموات کے متعلق کہا ہے۔

عبدالوحید صدیقی

رباعیات

ملنا کس کام کا اگر دل نہ ملے
کیا لطف سفر سی ہو جو منزل نہ ملے
وسط دریا میں غرق ہونا اچھا
اس سے کہ قریب آ کے ساحل نہ ملے

رواں

پامال کشاکش فنا ہوتی ہیں
یا داخل مرکز بقا ہوتی ہیں
جو بات معما تھی معما ہے رواں
آخر روحیں تمام کیا ہوتی ہیں

رواں

جُرم قانون دان اور انصاف

ایک طنز

افراد ڈراما

صفدر حسین .... ایک کامیاب وکیل جو ہائی کورٹ کی ججی کا امیدوار ہے۔

ظفر حسین .... اس کا بھائی۔

پہلا منظر ...... صفدر حسین کا ڈرائنگ روم۔

رات کا وقت ہے۔ سردیوں کی بھیانک تاریک۔ خوفناک رات۔ صفدر اپنے کمرے میں اکیلا ہے۔ آتشدان میں آگ جل رہی ہے۔ صفدر کرسی پر بیٹھا آگ تاپ رہا ہے۔

دبے پاؤں ظفر داخل ہوتا ہے۔

صفدر۔ (چونک کر) کون ہے؟

ظفر۔ (مضمحل آواز میں) مَیں ہوں!

صفدر کا منہ آگ کی طرف ہے اس نے ابھی تک ظفر کی طرف مڑ کے نہیں دیکھا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کی طرف غور سے دیکھ لیں۔ خوش قسمتی سے آرٹ کے نقطۂ نظر سے بھی ہم مرقعے کو اس کام کیلئے استعمال کرسکتے ہیں۔ قارئین کرام نے دیکھ لیا ہوگا کہ ظفر ایک دبلا پتلا نوجوان ہے۔ جس کے چہرے سے پریشانی اور وحشت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس کی آنکھیں بیٹھی ہوئی سی ہیں۔ بال بکھرے ہوئے ہیں (خدا جانے کیا بات ہے۔ میں جب کبھی "بال بکھرے ہوئے ہیں" کا فقرہ لکھتا ہوں تو مجھے اس بیہودہ مصرع کا خیال آجاتا ہے۔

"یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ کیوں صورت بنی غم کی") ۔

صفدر مڑ کے ظفر کی طرف دیکھتا ہے۔

صفدر۔ (حیران ہوکر) کیا ہے ظفر! کیا بات ہے! (دو کیلا نہ بے رحمی سے) ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تم نے کسی کو قتل کردیا ہے!

ظفر۔ (آہستہ چپکے سے) ہاں صفدر! یہی بات ہے!

صفدر۔ آج پھر شراب پی لی ہے تم نے ظفر!

ظفر ایک کرسی پر گر پڑتا ہے۔

صفدر اٹھکر اپنے بھائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا ہے۔ وہاں اسے ایک تحیّر کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

صفدر (غصّے سے) کیا کہہ رہے ہو تم! سچ کہو! معاملہ کیا ہے!

کمرے کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔

ہوش میں آؤ۔ ظفر۔ کیا بات ہے!

ظفر (چیختے ہوئے) سچ ہے سچ ہے۔ مَیں نے ایک آدمی کو قتل کردیا ہے۔

صفدر۔ حواس برقرار رکھکر۔ خاموش!

اپنے ہاتھ ملتا ہے۔

لیکن میرے پاس کیوں آئے تم۔

ظفر۔ اور کس کے پاس جاتا؟ مَیں پوچھنے آیا ہوں کہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دوں یا کیا........

اس کی آواز مدھم ہوتے ہوتے گم پڑتی ہے۔

صفدر۔ (چائے کی ایک پیالی بناتے ہوئے) یہ لو چائے پیو۔ اور شروع سے قصہ سناؤ!

ظفر۔ قصہ لمبا چوڑا نہیں! میں ......

رُک جاتا ہے۔

صفدر۔ کیا! جوا کھیل رہے تھے تم

ظفر۔ (چیختے ہوئے) ہاں!

صفدر۔ خاموش!

ظفر۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھے دھوکا دے رہا ہے۔ لمبا تڑنگا جوان تھا وہ احمد حسین! مشہور جواری! قمار خانے سے باہر نکل کر میں نے اُسے پکڑ لیا۔ وہ میری طرف دیکھکر مسکرایا۔ حقارت سے نفرت سے! میں نے کہا میرا روپیہ واپس دیدو! اس نے میرے منہ پر گھونسہ مارا اور کہا "یہ لو روپیہ" میں نے اس کا گلا پکڑ لیا۔ اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

صفدر۔ ہاں پھر کیا ہوا!

ظفر۔ تاریک رات تھی! باہر کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ قمار خانے کے اندر شور برپا تھا۔ میں نے لاش اٹھائی اور راوی کے پل تک لے گیا۔ وہاں چھوڑ آیا ہوں۔

صفدر۔ راہ میں کوئی ملا۔

ظفر۔ کوئی نہیں!

صفدر۔ قمار خانہ سے پل کتنی دور تھا۔

ظفر۔ چار پانچ میل۔

صفدر۔ (برافروختہ ہوکر) میرے پاس کیوں آئے تم؟ تمہیں معلوم نہیں مجھے ہائیکورٹ کی ججی ملنے والی ہے! لوگ کیا کہیں گے۔

ظفر۔ تم جانتے ہو صفدر! میری طبیعت کیسی ہے۔ لیکن اس وقت کچھ ایسا ہو گیا کہ اب تک۔۔۔۔۔۔۔

اس کی آواز مدھم ہوتے ہوتے غائب ہو جاتی ہے۔

صفدر۔ خاموش! تم کہتے ہو کہ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔

ظفر۔ کوئی نہیں۔

صفدر۔ پھر تم کہاں گئے۔

ظفر۔ گھر۔

صفدر۔ کیا کرتے رہے۔

ظفر۔ کپڑے اتار کر ادھر آگیا۔

صفدر۔ کسی نے تم کو احمد حسین کے ساتھ قمار خانے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا!

ظفر۔ نہیں۔ میں اس کے بعد اٹھکر آیا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ پہلے اٹھ گیا تھا۔ مجھے اس کا گھر معلوم تھا! میں اس کے گھر کی طرف جا رہا تھا!

صفدر۔ لوگوں کو معلوم ہے کہ تم اس روز ہار رہے تھے!

ظفر۔ بالکل نہیں! میں اور وہ بالکل علیحدہ بیٹھے تھے۔

صفدر۔ مقتول کا چہرہ قابل شناخت ہے!

ظفر۔ (کانپ کر) بس کرو!

صفدر۔ (بے رحمی سے) مقتول کا چہرہ قابل شناخت ہے!

ظفر۔ (دانت کچکچا کر) ہاں!

صفدر۔ ہوں!

ظفر۔ اب کیا ہوگا!

صفدر۔ کیا ہوگا! اگر تم میرے مشورے پر عمل کرنے کا وعدہ کرو تو میں تمہاری مدد کرونگا!

ظفر۔ میں وعدہ کرتا ہوں!

صفدر۔ گھر جاؤ! اور جب تک میں تم سے نہ ملوں وہاں سے باہر نہ نکلو۔

ظفر۔ اچھا! تم نے شب مجھ سے مہربانی کا سلوک کیا ہے صفدر میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

صفدر۔ خاموش! مجھے تمہارے جذبات کی پرواہ نہیں ہے۔ مجھے اپنا اور اپنے خاندان کا خیال ہے۔ قتل کے بعد تباہی لازمی ہوتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے تمہیں مدد دیکر میں بھی قانون کی رو سے مجرم ہو جاؤنگا! میں سرکاری وکیل! جج کا امیدوار!

(لیکایک برافروختہ ہو جاتا ہے) یہ کیا کیا تم نے! بیوقوف!

ظفر۔ (ایک چھوٹا سا بکس نکالتا ہے) میرا خیال ہے کہ میری موت اس مشکل کا بہترین علاج ہے۔

اس کے لہجے سے عزم مترشح ہے۔ لیکن قارئین کرام مطمئن رہیں۔ موت ابھی دور ہے۔

صفدر۔ (ڈانٹ کر) ادھر لاؤ۔ کیا ہے!

ظفر بکس جیب میں ڈال لیتا ہے۔

ظفر۔ اچھا ابھی نہیں۔ جب کوئی راستہ نہ رہیگا اسوقت۔۔۔۔۔۔

صفدر۔ (متاثر ہوکر) حوصلہ نہ ہارو۔ ظفر۔ راستہ نکالیگا۔ تالوناً شہادت کی رو سے تمہارے خلاف جرم ثابت نہیں۔ کوئی گواہ نہیں۔ کوئی ایسا واقعہ نہیں جس سے تمہارے مجرم ہونے کا

اظہار ہوتا ہو۔ حوصلہ نہ ہارو۔

دوسری شام

ظفر کے مکان کا برآمدہ

ظفر ایک کتاب پڑھ رہا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس کی آنکھیں صفحات سے اٹھ جاتی ہیں۔

صفدر داخل ہوتا ہے۔

ظفر۔ (اپنی جگہ سے اٹھ کر) کیا ہوا؟

صفدر۔ کچھ نہیں! پولیس غلط راستے پر چل رہی ہے۔ لاش کی شناخت ہو گئی ہے۔ پولیس نے ایک آوارہ گرد کو پکڑ لیا ہے۔ جس نے مقتول کی جیب سے نقدی کا بٹوہ نکال لیا تھا۔ اس پر قتل کا شبہ بھی کیا جا رہا ہے!

ظفر۔ (گھبرا کر) خدایا!

صفدر۔ چپ رہو۔ کیا کہتے ہو! میں تم سے کہتا ہوں کہ کوئی خطرہ نہیں۔ اس کے خلاف کوئی شہادت نہیں۔ تم آج ہی کہیں چلے جاؤ۔ اور وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر افریقہ پہنچ جاؤ۔ دارالسلام میں نور احمد اینڈ کمپنی کا مالک میرا دوست ہے۔ اس کے پاس تمہیں ملازمت مل جائیگی۔

نوٹوں کا ایک بنڈل نکالتا ہے اور ظفر کو دیدیتا ہے۔

ظفر۔ نہیں نہیں۔ صفدر۔ اسوقت میں نہیں جا سکتا۔ میرا فرض ہے کہ اس مقدمے کا انجام دیکھ کر جاؤں! خدا جانے اس قیدی کا کیا ہو گا۔

صفدر۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس کے خلاف کوئی شہادت نہیں۔ اسے کبھی پھانسی نہیں ہو سکتی۔ کوئی جج اسے سزا نہ دیگا۔ کوئی اسیسر اسے قصور وار نہ قرار دیگا۔

ظفر۔ (استقلال مزاجی سے) نہیں۔ صفدر! یہ نوٹ واپس لے لو ورنہ میں ان کو جلا دونگا!

صفدر! (نوٹ لے لیتا ہے) اچھا۔ تو میں یہ سمجھوں کہ تمہیں اپنے خاندان کی اپنے بھائی کی عزت کا کوئی خیال نہیں ہے!

ظفر۔ (سر جھکا لیتا ہے) مجھے افسوس ہے صفدر!

صفدر۔ اچھا تو کم از کم یہ وعدہ کرو کہ جبتک میں تم سے نہ ملوں اس وقت تک تم کوئی بیجا حرکت نہ کرو گے۔

ظفر۔ اچھا!

صفدر۔ میں تم پر اعتبار کرتا ہوں۔

ظفر۔ (صفدر کی طرف عجیب نظروں سے دیکھتا ہے) پھر مسکراتا ہے۔

ظفر۔ تمہارا اعتبار جائز ہے صفدر!

تیسرا منظر

چھ ماہ کے بعد

ظفر کے مکان کا برآمدہ

(باہر سے آواز آتی ہے۔)

"احمد حسین کا قتل۔ فیصلہ ہو گیا۔ مقدمے کے تازہ حالات پڑھو۔"

صفدر داخل ہوتا ہے۔ مکان خالی پاکر واپس آتا ہے۔ ظفر سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔

صفدر۔ (جھنجھلا کر) کہاں تھے تم!

ظفر۔ (اطمینان سے) مقدمے کا فیصلہ سننے گیا تھا!

صفدر۔ (غصے میں) گدھے تھے وہ اسیسر اور جج ان سے بھی زیادہ گدھا تھا۔ جس نے اس بیگناہ کو پھانسی کی سزا دیدی

ظفر۔ اب کیا باقی رہ گیا ہے۔

صفدر۔ دیکھو ظفر۔ بیوقوفی کی باتیں نہ کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح اس بیگناہ کو پھانسی سے بچا لونگا۔ وقت۔ وقت کی ضرورت ...."

ظفر۔ (بات کاٹکر) وقت۔ ابھی تک وقت! شاید ابھی تک تم اپنی عزت اور اپنی ججی کے خیال میں غرق ہو!

صفدر۔ ظفر!!

ظفر منہ پھیر لیتا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد

ظفر۔ اے کاش صفدر۔ تم بھی میری طرح اس غریب کی حالت دیکھتے جس پر ایک شخص کے قتل کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت بھڑک رہی تھی۔ اور اس کا چہرہ درد کی لرزشوں سے سکڑ کر رہ گیا تھا! آہ۔ غریب بیچارہ۔ مجھے دنیا سے نفرت ہو گئی ہے۔ کیا دیتا ہے!! صفدر! میں تمہاری عزت آبرو! تمہاری ججی کو ہیچ سمجھتا ہوں!

صفدر کچھ کہے بغیر باہر نکل جاتا ہے۔

ظفر بیٹھ جاتا ہے۔ کاغذ نکال کر کچھ لکھنا شروع کر دیتا ہے۔
پھر کاغذ میز پر رکھدیتا ہے۔
اگر قارئین کرام ذرا سی تکلیف کریں تو وہ بہ آسانی اس کاغذ کو پڑھ سکتے ہیں۔ کاغذ پر صرف یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔
احمد حسین کا قاتل میں ہوں۔ اور اس گناہ کے کفارے میں خود اپنی جان دے رہا ہوں۔
ظفر حسین

کچھ عرصہ ظفر خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ اب شام کے سایے گہرے ہونے لگے ہیں۔ ایک اداسی سی چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کمرہ بالکل تاریک ہے۔ ظفر جیب سے ایک چھوٹا سا بکس نکالتا ہے۔ اور اس میں سے کچھ نکال کر منہ میں ڈال لیتا ہے۔

تھوڑے عرصے کے لئے پردہ گرتا ہے۔ اس سے صرف یہ مقصود ہے کہ قارئین کرام کو بتایا جاتا ہے کہ اس کے بعد کے واقعات تین گھنٹے کے بعد ہونگے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پردہ ایک منٹ کے بعد پھر اٹھتا ہے۔
صفدر داخل ہوتا ہے۔
ظفر ایک کرسی پر دراز ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی ہیں۔
صفدر۔ (ظفر کا شانہ پکڑ کر ہلاتے ہوئے) ظفر! ظفر!

یکایک اس کی نظر ظفر کی بے نوا اشکوں کی طرف جا پڑتی ہے۔ اور وہ چلا اٹھتا ہے۔ خدایا!
پھر اپنے حواس درست کر کے میز پر رکھے ہوئے کاغذ کو اٹھاتا ہے۔ اور پڑھنا شروع کرتا ہے۔
"احمد حسین قاتل......"
کاغذ ہاتھ سے رکھ دیتا ہے۔
(اپنے آپ سے) اگر یہ کاغذ شایع ہو گیا۔ تو میری عزت میری آبرو۔ میرے خاندان کی...... نہیں نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ توبہ! یہ تو تباہی ہوگی!
یکایک اسے کوئی اور خیال آتا ہے:
(اپنے آپ سے) اور اس کا کیا ہوگا! پھانسی ہوجائیگی۔ نہیں! عدالت اپیل یقیناً زیادہ دانشمندی سے کام لیگی۔ اس کاغذ کی اشاعت بہت خطرناک ہے۔
کاغذ اٹھا کر آتشدان میں پھینک دیتا ہے۔
باہر سے مبہم کی آواز آرہی ہیں۔ صفدر کا چہرہ پتھریلا معلوم ہوتا ہے۔ وہ غور سے کاغذ کے ٹکڑے کو خاکستر ہوتا ہوا دیکھ رہا ہے۔
پردہ گرتا ہے۔

عابد

غزل

بنائے دشمنیٔ معلوم فیضِ تنگدستی ہے
زبردستوں کے غصے کی گھٹا ہم پر برستی ہے

بساطِ قطرۂ خونِ شہیداں پوچھنے والے
ہے ارزاں موت جس سے یہ وہ آتش زارِ ہستی ہے

محبت کی شرر انگیزیاں جلنے کا ساماں ہیں
ہے دل زندہ وہی جو آتشیں جذبوں کی بستی ہے

بہارِ حسن سے لبریز ہے ہر گوشۂ عالم
حریمِ محفلِ آفاق جنت زارِ ہستی ہے

تبسم آفریں ہیں شوخیاں اُن کی نگاہوں میں
مری بزمِ تمنا میں عدم جنت برستی ہے

صحرائے عرب

فسونِ شب ہوا باطل، سحر کی روشنی پھیلی
ہوا جنبش میں آئی اور فضا میں زندگی پھیلی

فلک پر مہرِ عالمتاب کا ساغر چھلک اُٹھا
شرابِ نور سے پیمانۂ عالم چمک اُٹھا

عرب کے خشک صحراؤں کا دہشت خیز منظر ہے
بیابانوں کی خاموشی کا وحشت خیز منظر ہے

یہاں کے ذرّے ذرّے سے جہنم تھرتھراتا ہے
وہ گرمی ہے وہ سوزش ہے کہ سورج کانپ جاتا ہے

ذرا اِن پُر سکوں فتنوں کو آتش جذب کرنے دو
ذرا خورشید کو ذرّوں کے سینے میں اُترنے دو

بساطِ خاک سے شعلوں کے چشمے پھوٹ نکلینگے
زمیں سے آتشی موجوں کے چشمے پھوٹ نکلینگے

یہ وہ آتشکدہ ہے جس سے دوزخ لاگ رکھتا ہے
یہ وہ دوزخ ہے جو سَو دوزخوں کی آگ رکھتا ہے

یہاں دنیا کے دریا بہہ کے فوراً گرد ہو جائیں
جہنم کے قیامت خیز شعلے سرد ہو جائیں

غضب ہے کارواں پھر بھی یہاں سے آتے جاتے ہیں
مسافر ہیں کہ اپنی ہمتوں کو آزماتے ہیں

یہ انساں کون ہیں جو آگ میں خود کود پڑتے ہیں
یہ ناداں کون ہیں جو دیو ہائے غم سے لڑتے ہیں

مجھے بھی لے چلو اے قافلے والو اِسی بن میں
مجھے بھی لے چلو الفت کے متوالو اِسی بن میں

مجھے بھی آتشیں دریا کی موجوں میں نہانا ہے
مرے عنصر کو بھی بھٹی میں جل کر رنگ لانا ہے

سیّد عبدالحمید عدم

(غیر مطبوعہ)

تبصرے

جدید مطبوعات

من کی بانسری

مصنف مولوی محمد امیر صاحب بی اے بی ٹی۔ اورنگ آبادی۔

مصنف کی طبعزاد اور مترجم نظموں کا مجموعہ ہے۔ جس پر ڈاکٹر عبداللطیف ایم۔ اے۔ بی۔ ایچ۔ ڈی نے ایک پیش نامہ لکھا ہے۔ فاضل "پیش نامہ نگار" رقمطراز ہیں:۔

"من کی بانسری نظموں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ہے۔ جو جذبات و تخیلات کے میدان میں ایک نوجوان شاعر کی جولانیوں کا پتا دیتا ہے"

میں ڈاکٹر صاحب موصوف سے متفق ہونے کی جرات کرتا ہوں۔ واقعی ان نظموں سے مصنف کی جولانی طبع اور بلندی تخیل کا اندازہ ہوتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔ ؎

خلوت تاک سے اک بار نکلنا ہے مجھے
بادۂ تند کی مانند اچھلنا ہے مجھے
مست ہو جائے جسے پیتے ہی ساری محفل
جام ہستی میں کچھ اس رنگ سے ڈھلنا ہے مجھے

مندرجہ بالا اشعار میں جو ترنم اور خیال آفرینی پائی جاتی ہے وہ مصنف کی تمام نظموں میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔

اسلام اور غلامی

مصنف محمد حفیظ اللہ۔ ملنے کا پتہ:۔ منیجر مسلم ایسوسی ایشن بک ڈپو پھلواری شریف۔ قیمت ۲ر

کردار اور افسانہ

مصنف عبدالقادر سروری۔ ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ بی۔ ناشر مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

فاضل مصنف ہندوستان کے طول و عرض میں ایک نقاد کی حیثیت سے روشناس ہو چکے ہیں۔ اس لئے اس جگہ ان کی پہلی تصنیفات کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ زیر نظر کتاب ان کی مشہور و معروف کتاب "دنیائے افسانہ" کا دوسرا حصہ ہے جو کردار نگاری کے اہم موضوع سے بحث کرتا ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں مشہور افسانوں کے کرداروں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اور میری نظر میں یہی حصہ کتاب کا سب سے قیمتی حصہ ہے۔ اسی جگہ سے "تعمیری اور تفسیری تنقید" اور محض تنقید کا فرق نمایاں ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

اس وقت تک اردو زبان میں اس قسم کی کتابیں بہت کم ہیں۔ اور ضرورت ہے کہ اہل قلم حضرات "ادب لطیف" کی بجائے ایسی مفید کتابوں کی تصنیف میں مصروف ہوں۔

تاریخ الامت حصہ ہفتم۔ آل عثمان

مصنفہ مولینا حافظ محمد اسلم جیراج پوری استاد تاریخ الاسلام جامعہ ملیہ دہلی۔

قیمت عہ

سلسلہ اشاعت: اردو اکاڈمی ۱۶

مطبوعہ محبوب المطابع دہلی۔

مولینا اسلم جیراج پوری نے جو سلسلہ تاریخ اسلام کا شروع کیا تھا۔ اس کی آخری کڑی ہے جس میں آل عثمان کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اخیر میں ترکوں کے اسباب تنزل پر چند صفحات ہیں۔ جو میری نظر میں کتاب کی جان ہیں۔ مولینا کا انداز تحریر پُر زور اور بلیغ ہے۔

جو اصحاب ان کی تحریر سے واقف ہیں۔ ان کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مولینا تاریخ کے خشک واقعات کو بھی دلچسپ بنا سکتے ہیں۔ اس وقت اس کتاب پر تاریخی حیثیت سے مفصل ریویو

نہیں ہو سکتا کیونکہ اس سلسلہ کی تمام کتابیں زیرِ نظر نہیں۔ انشا اللہ کسی اور اشاعت میں پوری کتاب پر تفصیلی تنقید کی جائیگی۔

قاعدہ فارسی | باسلوبِ نو و طریقِ راست

مولف۔ ابوالمحاسن متین۔ قیمت ۶ آنے

تذکرہ ریختی | مصنف تمکین کاظمی مطبوعہ شمس اسلام پریس چھپنہ بازار حیدر آباد دکن۔ قیمت ۸ ؍ اشاعت و کتابت مرغوب و گوارا۔

فاضل مولف نے اردو کی ایک بھولی بسری داستان کو دہرایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شعریت کے اعتبار سے "ریختی" ایک بیکار اور مہمل شے ہے۔ شعریت صداقت احساس و صداقت اظہار کا نام ہے اور ریختی یقیناً "تصنع و تکلف" کی تخلیق ہے۔ لیکن اس اعتبار سے ریختی کی چیزیں بہت وقیع ہیں کہ اردو کے مستند شعرا نے اس صنف ادب میں اردو کے ہزارہا محاورات کا سرمایہ محفوظ کر دیا ہے اور زبان اردو کی لسانی تحقیقات میں جس طرح یہ تصنیفات ممد و معاون ہو سکتی ہیں وہ محتاجِ بیان نہیں۔

مولف نے یہ کتاب بہت کاوش اور محنت سے مرتب کی ہے۔ اور یقیناً اس قابل ہے کہ مولف کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

ہمارے رسول | مصنف خواجہ محمد عبدالحی فاروقی۔ قیمت ۶ ؍ ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ قیمت ۶ ؍

رسول خدا کی مختصر سوانح عمری ہے جو آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔

اسلام اور غیر مسلم | مصنف محمد حفیظ اللہ۔ قیمت ۶ ؍ ناشر مسلم بک ڈپو۔ پھلواری شریف ضلع پٹنہ۔

اسلامی مساوات | مصنف محمد حفیظ اللہ صاحب۔ ناشر مسلم بک ڈپو۔ پھلواری شریف ضلع پٹنہ قیمت ۸ ؍

مندرجہ بالا کتابیں اپنی حقیقت کا اظہار اپنے نام کے ذریعے ہی کر رہی ہیں۔ دونوں کتابیں ۱۵۰ کے قریب صفحات پر محیط ہیں۔ اور آسان زبان میں لکھی گئی ہیں۔

بقائے دوام | مصنف ایم۔ اسلم۔ مقام اشاعت نسیم بک ڈپو۔ بارود خانہ۔ لاہور۔

بڑی بی | مصنف ایم۔ اسلم۔ نسیم بک ڈپو بارود خانہ لاہور

فاضل مصنف مدت سے اس قسم کی کتابیں تصنیف و تالیف کرنے میں مشغول ہیں جن سے بچوں اور بچیوں کی اصلاح ہو۔ یہ مقصد بہت وقیع ہے اور اس مقصد کی تکمیل میں جتنی بھی کوشش کی جائے کم ہے۔ "بڑی بی اور دیگر کہانیاں (اصلاحی کہانیوں)" کا مجموعہ ہے۔ عام اصلاحی کہانیوں کی طرح روکھی پھیکی نہیں۔ بلکہ دلچسپ اور نتیجہ خیز ہیں۔ فاضل مصنف کی نظر میں تہذیب مغرب کا سیلاب موجودہ نسل کو تباہی کے غار کی طرف لے جا رہا ہے۔ اور اسی اساسی خیال کے ماتحت انہوں نے یہ کتاب تصنیف کی ہے۔

بقائے دوام بھی فاضل مصنف کی ہمہ گیر طبیعت کے ایک پہلو کا آئینہ دار ہے۔ اس کتاب میں فاضل مولف نے "روح" کے مسئلے پر بحث کی ہے۔ اور اس ضمن میں علمائے مغرب کے اکثر انکشافات اور کئی حیرت انگیز حقائق کا ذکر کیا ہے۔

ثریا | مصنفہ۔ نذر سجاد حیدر۔ مقام اشاعت۔ اخبار دور جدید۔ قیمت ۱۲ ؍

مجھے یہ ناول پڑھکر غالب کا ایک شعر یاد آگیا

چیست بلبل خندہ از عتاب شکستن
رونق پروین نہ آفتاب شکستن

حقیقت یہ ہے کہ اس صورت میں "آفتاب" نے "رونق پروین" کے لطافت و ضیاباری کو کسی طرح بھی کم نہیں کیا۔ یعنی سید سجاد حیدر صاحب کی لطافت تحریر اور رنگینیٔ انداز کے مقابلے میں نذر سجاد حیدر صاحب کے انداز کی دلکشی کسی طرح بھی کم نہیں معلوم ہوتی۔ ثریا ایک معاشرتی افسانہ ہے۔ اور مقام مسرت ہے کہ ان تمام غیر فطری عناصر سے پاک ہے جو عام طور پر ایسے افسانوں میں نظر آتے ہیں "کردار" ہماری طرح جیتے جاگتے چلتے پھرتے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ موم کی گڑیاں نہیں پلاٹ دلچسپ ہے اور انجام متوقع۔ غرضیکہ ہر طرح یہ افسانہ مطالعہ کے قابل ہے۔

نئے رسالے

"ادب" سید اعظم حسین صاحب کی ادارت میں لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ اب تک جتنے نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدیر صاحب موصوف رسالے کو بہت محنت اور لیاقت سے ترتیب دیتے ہیں۔ علمی تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا عنصر غالب ہے۔ اور فاضل مدیر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ رسالے کو اس مہلک عنصر ادب سے پاک و صاف رکھتے ہیں۔ جس کو "ادب لطیف" کا لقب دیا جاتا ہے۔

مضمون نگاروں میں اچھے اچھے لکھنے والوں کے نام نظر آتے ہیں۔ اور میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ "ادب" "ادب" کے تمام مظاہر کا نہایت اچھا آئینہ دار ثابت ہوگا۔

ساقی:۔ شاہد احمد بی۔ اے (آنرز) کی ادارت میں دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ مقاصد سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مدیر اردو میں "نثر شاعری" کے نمونے پیش کرنا چاہتے ہیں میں ذاتی طور پر اس صنف ادب کا مداح نہیں۔ لیکن میں پبلک کے ذوق کی نمایندگی کا دعویدار بھی نہیں۔ غالباً کیا یقیناً بہت سے اصحاب "نثر شاعری" کو پسند کرتے ہونگے۔ اب تک جسقدر مضامین ساقی میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا اکثر حصہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ مضمون نگاروں میں ناصر نذیر فراق۔ اثر صہبائی۔ قاری سرفراز حسین صاحب کے اسمائے گرامی نظر آتے ہیں۔ رسالے میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں جس کی طرف ناظرین کی توجہ منعطف کرائی جاسکے۔

مغل میگزین:۔

مقام اشاعت مراد آباد!

ایک مختصر سا رسالہ ہے جس کا مقصد مغلوں کی تہذیب ہے۔ اپنے مقاصد کی تکمیل میں مفید اور نتیجہ خیز مضمون شائع کرتا ہے۔ مغل اصحاب کو چاہیئے کہ اپنے ملی رسالے کی سرپرستی فرمائیں۔

رسالہ آواز:۔

ایڈیٹر مبارک حسین۔ مقام اشاعت ملانہ ضلع انبالہ۔ سالانہ چندہ ۱۲/

یہ رسالہ دو سال سے قصبہ ملانہ ضلع انبالہ سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کا مقصد اشاعت ملکی معاشرات کی اصلاح۔ زراعت کی ترقی، اور کوآپریشن کی حمایت ہے۔ اور ان موضوعات پر اچھے مضامین شائع کرتا ہے۔ کتابت و طباعت گوارا ہے۔ سرورق سہ رنگا ہے۔ ایک آدھ تصویر بھی ہوتی ہے۔

جواہر اللغات:۔ مقام اشاعت۔ رام نرائن پبلشر الہ آباد

یہ مختصر سی لغت پاکٹ اڈیشن پر شائع ہوئی ہے اور ۵۰۰ صفحات پر محیط ہے۔ عام طور پر الفاظ کے صحیح معنی دئے گئے ہیں اور وہ تمام لفظ جو عام طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ درج کر دئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی قیمت صرف بارہ آنے ہے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ ان داموں کسی طرح بھی مہنگی نہیں۔ کتابت و طباعت بھی گوارا ہے۔

ع

اب دورِ نو کشیدہ اک انجمن میں ہے ... میری شرابِ کہنہ سبوئے کہن میں ہے

یارب نصیب ہو مری طبع حزیں کو بھی ... جو انبساط خندۂ صبحِ وطن میں ہے

ہونا ہے جسکو خاک وہ دنیا کی کائنات ... دو گز کفن ہے یا اسی دو گز کفن میں ہے

مانے نہ مانے کوئی مگر یہ کہیں گے ہم ... جانِ سخن ریاضؔ جہانِ سخن میں ہے

انجم

معصوموں کی دُنیا

(از قلم جناب فاخر ہریانوی، بی۔ اے)

حُسن کی معصوم تصویریں ہیں یہ کم سن ابھی
بچپنے کی نیند میں کٹتے ہیں اِن کے دن ابھی
کِسقدر بشاش ہیں آزاد ہیں دل شاد ہیں
کچھ فرشتے ہیں کہ باغِ خلد میں آباد ہیں
اِن کے چہرے ہیں منوّر برقِ شمعِ طور سے
صبح کی مانند روشن ہیں جبینیں نور سے
آہ کیا جانیں یہ کیا ہوتے ہیں غم انسان کو؟
دیکھتے ہیں آج کِن نظروں سے ہم انسان کو؟
آہ کیا جانیں یہ کرتی ہے ستم تقدیر کیا؟
ہے ہماری زندگی کے خواب کی تعبیر کیا؟
پل رہے ہیں فطرتِ معصوم کی آغوش میں
جلد لے آئیگی لیکن اِن کو دنیا ہوش میں
میرے بس میں ہو تو میں اِنکو جواں ہونے نہ دوں
پائمالِ انقلابِ آسماں ہونے نہ دوں

فاخر

(غیر مطبوعہ)

معصوموں کی دنیا

نیشنل آرٹ پریس انارکلی لاہور میں چھپا

بلاک بنانے والے مستہ ہاف ٹون کمپنی انارکلی لاہور

دنیائے ادب

بہائی مذہب

اور

اتحاد مذاہب

مذہبی بے اطمینانی نے اہل یورپ کو مشرقی مذاہب کی طرف شدت سے متوجہ کر دیا ہے۔ اور اب وہ ان کے اندر اپنی روحانی طمانیت کا سامان ڈھونڈ رہے ہیں۔ بالخصوص جدید مشرقی مذاہب کے ساتھ اُن کو اور بھی زیادہ دلچسپی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بہائی مذہب کے ساتھ جو مشرقی مذاہب میں ایک جدید مذہب ہے۔ ان کو بہت زیادہ شغف پیدا ہو گیا ہے۔ مصر کے ایک صاحب نظر نے اہل یورپ کی اسی دلچسپی کے سلسلہ میں اپنا ایک نہایت دلچسپ ذاتی واقعہ بیان کیا ہے۔ جس سے بہائی مذہب کے بعض نظریات و معتقدات کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ دس سال سے زیادہ کا زمانہ گذرا کہ میں نے مذہبی تحقیقات و مطالعہ کی ابتداء کی اور رفتہ رفتہ یہ ذوق اس قدر بڑھا کہ دوست و احباب کی ملاقات کا کوئی موقع اس دلچسپ بحث سے خالی نہ جاتا تھا۔ اسی زمانے میں ایک بار میں نے اسکندریہ کا سفر کیا۔ اور وہاں ایک شخص سے میرے دوستانہ تعلقات قایم ہو گئے۔ جو میرا ہم مذاق تھا اور اس حیثیت سے عباس عبدالبہا کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اور قریب انہیں کا ہم عقیدہ ہو گیا تھا۔ اس نے مجھکو بھی ان کی ملاقات کی ترغیب دی اور کہا کہ "تم جس قسم کے مذہبی مباحث کی جستجو کتابوں میں کرنا چاہتے ہو ان کا مشاہدہ خود اپنی آنکھوں سے کر لوگے۔ میں اس وقت تک ایران کے جدید پیغمبر عبدالبہا سے واقف نہ تھا۔ لیکن جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ مجھکو ایک نہایت باوقار بزرگ معلوم ہوئے جن کے چہرہ سے زہد و تقشف سے زیادہ علم و تجربہ کے آثار نمایاں تھے۔ ان کے کمرے میں ایک منشی ایک کرسی پہ الگ بیٹھا ہوا تھا جس سے وہ ایک خط لکھوا رہے تھے۔ اور اس کی نسبت بعد کو معلوم ہوا کہ وہ ترکی وزیر جنگ شوکت پاشا کے نام کا تھا۔ انھوں نے پہلے ہم کو اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ اور جب خط لکھوا کر فارغ ہوئے تو ہمارے لئے ایک نہایت دولتمند ایرانی رئیس چائے لایا اور جب تک ہم چائے پیتے رہے نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ کھڑا رہا۔ اس کے بعد اس نے چائے کی پیالیاں اٹھائیں اور ادب سے اُلٹے پاؤں واپس گیا۔ تاکہ عبدالبہا کی طرف پشت نہ ہونے پائے۔ اس وقت کسی قدر ترشح ہو رہا تھا۔ اس کے بعد نصف گھنٹے تک خوب بارش ہوئی۔ پھر آسمان صاف ہو گیا۔ اس حالت میں ہم لوگ ایک بند کمرے میں بیٹھے ہوئے شیشے کی کھڑکیوں سے گھر کے باغ کا جس کے درختوں کے ساتھ ہوائیں چہل کر رہی تھیں۔ نظارہ کر رہے تھے۔ اور ان کی شادابی و تر و تازگی کو دیکھ رہے تھے۔ عبدالبہا نے بھی ان درختوں کو دیر تک دیکھا۔ پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ اور ہم کو یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک گہری نیند سے بیدار ہو رہے ہیں۔ اور ہم کو ایک گہری نیند سے بیدار کر رہے ہیں۔ پھر انھوں نے فرمایا۔

سبحان اللہ! ہر چیز کو اس کی روزی مل ہی جاتی ہے۔ جہاں درخت ہوتے ہیں وہاں پانی برس ہی جاتا ہے۔ لیکن میں نے کہا

"یا یہ کہ جہاں بارش ہوتی ہے وہاں درخت اُگ ہی جاتے ہیں"

اب انھوں نے میری طرف بغور دیکھ کر فرمایا

"ایسا بھی ہو سکتا ہے"

میں نے کہا تو ان دونوں باتوں میں سے کون سی بات صحیح ہے؟

انھوں نے ایک نہایت باوقار تبسم آمیز لہجے میں فرمایا۔

دونوں باتیں قریب قریب ایک ہی ہیں اور دونوں یکساں طور پر صحیح ہیں۔

اس کے بعد تھوڑی دیر تک خاموش رہے پھر فرمایا۔

ہم صرف اُس نقطۂ اتحاد کو دیکھتے ہیں جہاں دو باتوں میں اتفاق ہوتا ہے۔ اُس نقطہ کو نہیں دیکھتے۔ جہاں سے ان کے اختلافات کی

سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ اس لئے دو باتیں گو وہ کتنی ہی مختلف ہوں ہم کو باہم مربوط نظر آتی ہیں۔

اس کے بعد وہ اسی ترنم رنج میں بار بار اسی بات کو دہراتے رہے پھر فرمایا۔

لوگوں کے درمیان بہت سے اختلافات ہیں جن میں آسانی اتفاق پیدا ہو سکتا ہے۔ کیا تمام مذاہب کا سرچشمہ ایک نہیں ہے؟ کیا تمام قومیں متحد الاصل نہیں ہیں؟ بایں ہمہ لوگوں کے درمیان اختلافات ہیں۔ لیکن کیوں؟ اس لئے کہ اُن کو متفق ہونے کا طریقہ معلوم نہیں۔

میں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر اُن کی خدمت میں اپنی جلد کتاب "خلاصۃ الیومیۃ" پیش کی جو چند ہی ہفتہ پیشتر چھپی تھی۔ اور میں نے اس کے پہلے ہی صفحے میں عام انسانی شیرازہ بندی کے متعلق لکھا تھا کہ

"تمدنی ترقیاں تمام دنیا کے ساتھ انسان کا تعلق پیدا کر رہی ہیں اور وطنی حد بندیاں اب عنقریب ٹوٹ جائینگی اور زمین تمام نوع انسان کا عام وطن ہو جائے گی۔ یہ اقتصادی ہلچل جو جلب منفعت کے لئے دور دراز قوموں میں روابط پیدا کر رہی ہے ایک دن قوموں کے مصالح عامہ میں اتحاد پیدا کرا دے گی اور اس طرح جنگ کا خاتمہ ہو جائے گا اور ہر طرف امن و امان کا پھریرا اُڑنے لگیگا۔

میں نے اُن کے ہاتھ میں کتاب دی تو اس فقرے کی طرف اُن کی توجہ مبذول کرائی۔ اُنھوں نے اس حقیر علمی ہدیہ کو بجوشی قبول فرمایا اور اس فقرے کو بغور پڑھکر بولے۔

انشاء اللہ۔ انشاء اللہ۔ آپ نے خوب لکھا۔ آپنے خوب لکھا۔

لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ اس وقت مجھکو اقتصادیات کے ساتھ خاص دلچسپی ہے۔ تو فرمایا۔

لیکن اس وقت دنیا مادیات کے نشے میں چور ہے۔ حالانکہ امن و امان کا راستہ روح کے اندر سے نکلتا ہے دنیا صرف دو بازوؤں سے اُڑ سکتی ہے۔ ایک مادے کا بازو۔ اور دوسرا روح کا بازو۔ لیکن وہ اس وقت صرف ایک بازو سے اُڑ رہی ہے۔ اور اس کا دوسرا بازو ٹوٹا ہوا ہے۔ اس لئے دنیا دو حصوں میں منقسم ہو گئی ہے۔ لیکن جب تک اس کے مادی اور روحانی مقاصد میں اتفاق نہ ہوگا وہ اپنے ذروہ کمال تک نہیں پہنچ سکتی۔ بلکہ اگر موجودہ روش پر چلتی رہی تو سخت مصیبت کا سامنا ہوگا جس سے خدا ہم دونوں کو محفوظ رکھے۔

معارف

نارڈے

چیونٹیاں

کہا جاتا ہے کہ ایک دانشمند نے اپنے بیٹے کو یہ مشورہ دیا تھا

"جاؤ اور چیونٹیوں سے عقل سیکھو"

میں نے اس مشورہ پر عمل کر کے دیکھا ہے اور میں ناظرین کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ مجھے ان کی حرکات کا مطالعہ کر کے ذرا بھی فائدہ نہیں ہوا۔ اگر آپ بھی ان کے طرز عمل کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی حرکات متضاد اور مہمل ہیں۔

پہلے تو وہ ایک طرف دوڑتی ہے۔ اب آپ اپنے دل میں کہتے ہیں یقیناً اس وقت چیونٹی کسی ایسے کام کو جا رہی ہے جس سے عوام الناس کو بہت فائدہ حاصل ہوگا۔ لیکن یکایک وہ ایک پودے کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا غور کر رہی ہے۔ اور اپنی عقل گرہ کشائی سے پودے کا راز معلوم کرنا چاہتی ہے۔ کچھ عرصہ بعد وہ یا تو واپس ہو جاتی ہے یا کوئی اور نیا راستہ اختیار کر لیتی ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ شاید اسے کوئی اور ضروری کام یاد آیا ہے۔ وہ راہ چلتے آدمیوں کے پاؤں سونگھتی ہے۔ چکر کاٹتی ہے۔ چکر کاٹتی ہی چلی جاتی ہے۔ گویا کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ وہ تعاقب کرنے والوں کو فریب دینا چاہتی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے سوا کوئی اس کی حرکات کا مشاہدہ نہیں کر رہا۔

اب آپ انتظار کرتے ہیں کہ چکر ختم کرنے کے بعد وہ اپنے کام میں سنجیدگی سے مصروف ہو جائے گی۔ لیکن آپ کا اندازہ غلط ہے آپکی اُمید مجروح ہوگی۔ تھوڑا سا راستہ طے کرنے کے بعد وہ ایک درخت پر چڑھنا شروع کر دیتی ہے۔ تین یا چار گز چڑھنے کے بعد وہ پھر واپس اُتر آتی ہے۔ اور ایک نئی سمت اختیار کر لیتی ہے۔ آپ اپنے دل میں سوچتے ہیں کہ کیا عوام الناس

کر اس قسم کی لایعنی حرکات سے کوئی فائدہ پہونچ سکتا ہے؟ پیشتر اس کے کہ آپ اس سوال کا جواب دیں۔ میں جواب دیئے دیتا ہوں ارادہ یہ ہے کہ قطعاً کوئی نہیں۔ وہ مرد دانشمند یقیناً غلطی میں مبتلا تھا جس نے کہا تھا "جا اور چیونٹیوں سے عقل سیکھو"

غزل

نمایاں انتہائے سعیٔ پیہم ہوتی جاتی ہے
طبیعت بے نیازِ ہر دو عالم ہوتی جاتی ہے

کنارا کر رہا ہے روح سے ہیجانِ سرتابی
کہ گردن جستجو کے ذوق میں خم ہوتی جاتی ہے

جنوں کا زندگی پر چھا رہا ہے اک دھندلکا سا
خرد کی روشنی سینے میں مدھم ہوتی جاتی ہے

گرہ یوں کھل رہی ہے ہر نفس دقتِ نظارہ کی
کہ ہر ادنیٰ سی شے اب ایک عالم ہوتی جاتی ہے

عیاں ہے جلوۂ کون و مکاں چشمِ تصور پر
نظر شاید حریفِ ساغرِ جم ہوتی جاتی ہے

دماغ آسودہ ہوتا ہی نہیں قانونِ قدرت سے
عبارت کثرتِ معنیٰ سے مبہم ہوتی جاتی ہے

نہ جانے سینۂ احساس پر یہ ہاتھ ہے کس کا
طبیعت ماورائے شادی و غم ہوتی جاتی ہے

اُٹھی جاتی ہے دل سے ہیبتِ آلامِ روحانی
جراحت بہرِ قلبِ زار مرہم ہوتی جاتی ہے

محل تھا جس کی شورش سے تلاطم جوشِ ہستی کا
وہ کیفیت مرے سینے میں اب کم ہوتی جاتی ہے

حضرت جوش ملیح آبادی

انگریزی

زندگی کا رنگ

کہا جاتا ہے کہ سرخ رنگ زندگی کا رنگ ہے۔ اور اس عظمت و جلالت کے لئے اس رنگ کی تعریف کی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرخ رنگ زندگی کا عین رنگ نہیں ہے۔ سرخ رنگ تشدد اور جبر کا مظہر ہے یا کم از کم رسوا۔ الغرض۔ زندگی کا رنگ ہے۔

یہ ممکن ہے کہ سرخ رنگ کو اس وقت تک زندگی کا رنگ کہا جائے جبتک یہ رنگ پوشیدہ رہے۔ ظہور کے بعد یہ رنگ دغا۔ فریب اور اسراف ناجائز کا نشان بن جاتا ہے۔

یہ رنگ زندگی کا راز ہے۔ زندگی کا مظہر ہے۔

یہ ان چیزوں میں سے ایک چیز ہے جس کی قیمت ان کی پوشیدگی میں مضمر ہے۔

زندگی کا اصل رنگ جسم کا رنگ ہے۔ چھپا ہوا ڈھکا ہوا۔ سرخ رنگ دھڑکتے ہوئے دل اور بے قرار لوگوں کے خون کا چھپا ہوا رنگ۔ اپنی تابانی لطافت۔ نرمی۔ امتزاج کے اعتبار سے یہ رنگ باقی تمام رنگوں پر فوقیت رکھتا ہے۔

اس کا حسن یہ ہے کہ سفید رنگ ہے۔ مگر دودھ سے کم سفید۔ سرخ مگر شفق سے کم۔ سرخ۔ صاف ولطیف مگر سونے سے کم۔ صاف ولطیف۔ اس رنگ میں سونے کے سے رنگ کی جھلک ہے۔ اور سونے کا سا رنگ جو ہر اچھے رنگ میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اس رنگ میں تو یہ عنصر ایسا نازک ہے کہ دام نظارہ میں آتا ہے۔ اور نکل جاتا ہے۔ آتا ہے اور نکل جاتا ہے سسلی کے آسمانوں کے یہ رنگ ہاتھی دانت کے رنگ سے زیادہ گہرا ہے لیکن لندن کے دھندلکے میں یہ رنگ ایسا لطیف اور نفیس ہے گویا گلاب کے گلاب کے پھول تاروں کی چھاؤں میں کھل رہے ہوں۔

ہینے گذر جاتے ہیں اور لندن کے نوئے اس رنگ کی تابانی سے لطف اندوز نہیں ہوسکتے۔

انسان چہرے پر دکھ درد۔ غم اپنی مہریں ثبت کر دیتے ہیں۔ اور گلاب کی شگفتگی سے تازگی کی روح کھینچ لی جاتی ہے۔ لندن کے لوگوں کے چہرے اپنی اصلی حالت پر نہیں رہتے۔ ہاں جب کبھی سورج نمودار ہوتا ہے اور دنیا کو نور کے ایک سیلاب میں غرق کر دیتا ہے تو زندگی کا رنگ پھر شگفتہ ہو جاتا ہے۔

سمندر کے کنارے یہ رنگ اپنی پوری شان سے جلوہ گر ہوتا ہے۔

مجھے ایک اس قسم کا منظر یاد ہے۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور لمحہ لمحہ دم بدم رنگ کی گہرائی اور سرخی بڑھ رہی تھی۔ سمندر کا رنگ نیلا۔ گہرا نیلا۔ بہت گہرا۔ نیلم کی طرح نہیں بلکہ اس طرح کہ اسکو کسی شے سے تشبیہ دی جا سکتی۔ سمندر خود بھی گہرا تھا۔ ہر شے سادہ اور صاف معلوم ہوتی تھی۔ اسرار و رموز سے خالی اس منظر میں سب سے زیادہ روشنی سے چمکنے والی سفید سفید جھاگ تھی جس میں تین تین سونے اور گلاب کے رنگین نقطے اور درخشاں شعاعیں پائی جاتی تھیں۔

جاپانی شاعری کے چند نمونے

بانس اور طوفان

بانس زمیں کے ساتھ لگ گیا ہے! نازک ولطیف بانس۔ برف کے ظالم بوجھ کے نیچے یہ آسمانی پودا زمیں کے ساتھ لگ گیا ہے۔

آہ ظالم۔ سرد مہر۔ برف!

طوفان فرو ہو چکا۔ اور دیکھو بانس کس طرح بلند تنا ہوا۔ مغرور قائم ہے فطرت پھر مسکرا رہی ہے۔ سورج چمک رہا ہے۔ کہاں ہے وہ برف جو بانس کو پیغام موت دینا چاہتی ہے۔

بلبل

میں چاہتی ہوں کہ پردے ہٹا کر بلبل کو دیکھ لوں۔ لیکن ڈرتی ہوں کہ وہ ڈر جائے گی۔ ڈر جائے گی اور اُڑ جائے گی۔ اور اس لئے میں خود ڈرتی ہوں۔ کانپتی ہوئی پردے کے پیچھے کھڑی ہوئی جذبات کے اس سیل کے ساتھ بہی جا رہی ہوں جو اس کے نغموں سے پیدا ہے۔

بہار

آہ لطیف و بیک بہار! ہر زندہ شے ، ناقابل بیان حسن کے سانس نکل رہے ہیں۔ پھول محو پرواز ہیں۔ اور تیتریاں پھولوں کی طرح ہوا کو معطر کر رہی ہیں۔ ان میں سے پھول کون ہے۔ اور تیتری کونسی۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا

ٹوکیگر کے کنارے دو میل تک بیر کے درختوں کی برفشاں بکھر یا وادی کو روشن کر رہی ہیں۔ چینی باغوں کی خوشبو تھی اس رنگ و بو کی مجلس کے سامنے ایک بھولی ہوئی کہانی ہے۔ یہ رنگ و بو کا سمندر ا

کئی دن ہو گئے کہ میں اس باغ سے واپس آگیا ہوں۔ لیکن میری آستینیں ابتک اس خوشبوئے لطیف سے معطر ہیں۔

ریڈیم رسٹ واچ

تیتری

اے نوپرواز تیتری! تو پھولوں میں ایک پھول کی طرح محوپرواز ہے لیکن کسی کو معلوم نہیں۔ کوئی پھول کوئی غنچہ نہیں کہہ سکتا کہ تو اس کو عشق کے رموز سے آشنا کریگی۔ یا اس کو ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہوا چھوڑ کر کہیں اور چلی جائیگی۔ اے محوپرواز تیتری

پشتو

تینوں یکساں ہیں

اس کا چہرہ۔ چاند اور سورج تینوں یکساں ہیں۔ قد معشوق۔ سرو اور صنوبر تینوں یکساں ہیں۔

مجھے شہد اور شکر کی حاجت نہیں۔ اس کے لب۔ شہد اور شکر تینوں یکساں ہیں

اگر اس کے بغیر بستر پر لیٹتا ہوں تو میرے لئے آگ کانٹے۔ اور وہ بستر تینوں یکساں ہیں۔

جب میں اس کے درودیوار پر نظر کرتا ہوں (تو معلوم ہوتا ہے) کہ باغ بوستان۔ اس کا گھر تینوں یکساں ہیں۔

خدا کرے! کوئی ہجر یار کی خبر نہ سنے۔ مُنا۔ مرنا اور یہ خبر تینوں یکساں ہیں۔

اس کے کوچے سے غبار اُٹھتا ہے (اور) مشک اور عنبر اور یہ غبار تینوں یکساں ہیں۔

انسان جب دنیا سے اُٹھے (تو اس کے لئے) راکھ چاندی اور سونا تینوں یکساں ہیں۔

فقیر اگر درحقیقت فقیر ہے (تو) وہ امیر اور بادشاہ تینوں یکساں ہیں

اس سرزمین پر کوئی پھل پھول نہیں سکتا (یہاں) اندھا۔ بہرا۔ بینا تینوں یکساں ہیں۔

(دیوان رحمان) (وقار انبالوی)

جرمنی

شعر

شاعر آئینہ خانہ خیات میں قدم رکھتا ہے۔ تو اسے ہر طرف عالم قدس کے جلوے نظر آتے ہیں۔ وہ حسن کائنات کو بے حجاب دیکھتا ہے۔ اس کی نگاہ ظاہری پردوں سے گذر کر اشیا کی حقیقت تک آتی جاتی ہے۔ اسے ذرہ میں آفتاب دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہر شئے میں شان جمالی کے کرشموں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ سورج کا مشرق سے نمودار ہونا۔ تمام دن کشت جہاں کی نور سے آبیاری کرنا۔ پھر غروب ہو جانا۔ ستاروں کا جگمگانا۔ چاند کا نور برسانا۔ کہستان کی ندی کا بہنا۔ بادلوں کا آسمان پر چھانا۔ بجلی کا چمکنا۔ مینہ کا برسنا۔ آبشاروں کا شور۔ پانیوں کا زور۔ سبزے کی شادابی۔ پھولوں کی رعنائی۔ درختوں کا جھومنا۔ پرندوں کا چہچہانا۔ قوس قزح کی رنگینیاں۔ شفق کی دلفریبیاں یہ اور عالم موجودات کے ہزاروں ایسے خوشنما مناظر کس کے مشاہدے میں آتے ہیں۔ جن کا عکس اسکے آئینۂ دل میں اُتر کر نقش ہو جاتے ہیں آخر یہی نقوش موسیقی بنکر اُس کے لفظوں کے ذریعے باہر نکلتے ہیں۔ اسکا نام شعر ہے

سر محمد اقبال

یونانی

میں کون ہوں؟

دنیا کی تاریک اور بھیانک رات میں میں تمہارے لئے مشعل راہ بنا۔ تمہاری خوشی میں شریک ہوا۔ تمہارے رنج کو محسوس کیا اور جب تم کو

میری جان کی ضرورت تھی تو مرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ بتاؤ کہ میں کون ہوں؟
تمہارے آرام کی خاطر میں نے اپنے آرام کو چھوڑا۔ تمہارے لئے سردی کی شدت اور گرمی کی تپش کو برداشت کیا۔ تمہاری خاطر سنگلاخ پہاڑوں کو پھاندا۔ گنجان وادیاں کو روندا۔ دریاؤں کو عبور کیا۔ ڈراؤنے جنگلوں سے گذرا۔ مصیبتوں کو دیکھا۔ تکالیف کو برداشت کیا۔ یہی نہیں بلکہ صرف تمہارے لئے گھمسان کی لڑائی میں سب سے اگلی صف میں سینہ سپر ہوکر لڑا۔ بتاؤ اے یونان کے باشندو، میں کون ہوں؟

لڑائی ختم ہوچکی ہے۔ دشمن بھاگ چکے ہیں۔ ان کے بھاگنے کی آوازیں ابھی آرہی ہیں۔ چاروں طرف میرے ہموطنوں کی لاشیں پڑی میری قربانی کی یاد رہ رہ کر دلا رہی ہیں۔

آہ! میں نے بھی انہیں مجبور کیا تھا اور ان کی موت کا میں ہی ذمہ دار ہوں۔ مگر نہیں! یہ زندہ ہیں۔ یونانیو! یہ تمہارے شہید ہیں۔ انھوں نے تمہاری خاطر اپنی آرزوؤں۔ اپنی تمناؤں۔ اپنی امیدوں۔ اپنے جذبات اور حیات کو قربان کردیا۔ تم بھی ان کی قدر سمجھو۔ ہاں! ہم فاتح ہیں نہیں یہ زمین پر لیٹنے والے، یہ خاک و خون میں تڑپنے والے فتح کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ ان میں کوئی میرا دوست ہے۔ کوئی عزیز ہے۔ ادھر میرے بچپن کے دوست ہیں۔ اُدھر رشتہ دار ہیں۔ میں نے ان سب کو تمہاری خاطر قربان کردیا۔ بتلاؤ کہ میں کون ہوں؟

میں نے تمہاری خاطر دن کے آرام۔ رات کے چین کو قربان کیا۔ بتلاؤ کہ میں کون ہوں؟ ہم سب جیت چکے ہیں۔ آدھے مرچکے ہیں۔ کچھ زخمی ہیں بعض نڈھال ہیں۔ تھکان سے چور ہیں اور باقی خوشی کے نقارے بجا رہے ہیں مجھے نہ فتح کی خوشی۔ نہ دوستوں۔ رشتہ داروں کی موت کا غم۔ میرا درد حد سے بڑھ چکا ہے۔ صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا ہے۔ مگر اس کے دوسری طرف فتح کی مسرت دل میں چٹکیاں لے رہی ہے۔ کبھی آنسو نکلتے ہیں۔ کبھی ہنسی آتی ہے۔ مگر میں خاموش ہوں۔ مستقبل کی تاریکیاں میری آنکھوں کے سامنے آرہی ہیں۔ نہ ہنسنے کا مقام ہے۔ نہ رنج و غم کا وقت۔ کیونکہ رات ختم ہونے کو ہے۔ ستارے جھلملا رہے ہیں۔ صبح کی روشنی وسعت فلک پر نمودار ہونے کو ہے۔ لو! کوچ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ پھر وہی گھمسان کی لڑائی ہوگی۔ تمام دن کی تگ و دو ہوگی۔ اور ہم ہوں گے۔ پھر وہی سروں کی بازی ہوگی۔ جان کے کھیل ہوں گے۔ نہ ہنسنے کا موقع ملے گا۔ نہ رنج و غم کا وقت۔ آج بچ گیا ہوں۔ خدا جانے شام بھی دیکھنی نصیب ہوگی۔ میں نے تمہاری خاطر سب کچھ کیا۔ بتلاؤ کہ میں کون ہوں؟

بنگالی

بہار گذر چکی ہے۔ اور خزاں کا دور دورہ ہے۔ پھول مرجھا مرجھا کر گر رہے ہیں۔ پتیاں سوکھ سوکھ کر ٹہنیوں کو عریاں کر رہی ہیں۔ گل کی شادابی کلیوں کی مسکراہٹ۔ پتیوں کی دلفریبی اور سبزے کی لہلاہٹ میں ایک انقلاب رونما ہوچکا ہے۔

سورج ہر صبح لاکھوں کے خون تمنا میں نہا کر افق مشرق پر جلوہ فگن ہوتا ہے۔ اور اسی شام ہزاروں کی اُمیدوں۔ آرزوؤں کو ساتھ لیکر افق مغرب میں ڈوب جاتا ہے۔ دن گذر جاتا ہے۔ کسی کو یتیم بنا دیتا ہے۔ کسی کو لاوارث چھوڑ دیتا ہے۔ کسی کو بے دست و پا اس بحر ذخار میں لاکر حوادث و مصائب کی موجوں کے بس میں چھوڑ کر خود دور ابد کی تاریکیوں میں پناہ لیتا ہے۔

آج میرے دل کا آرام۔ میری جان کا سکھ۔ میرا پیارا دوست اس دار فانی سے کوچ کرگیا ہے۔ میں اُداس ہوں۔ حیران ہوں۔ مجبور ہوں اور یاس و حرف کا پتلا ہوں۔ میری دل کی دنیا میں ایک طوفان برپا ہے۔ ایک کشمکش ہے۔ ایک ہنگامہ ہے۔ مگر دنیا سرد ہے۔ باہر کسی کو بھی نہیں۔

کسی کی اُمیدوں کا خاتمہ ہوچکا ہے کسی کی آرزوؤں کا خون ہوچکا ہے مگر دنیا کو خبر تک نہیں۔ وہی رنگینیاں ہیں۔ وہی دلفریبیاں ہیں۔ سورج اسی طرح اپنی ضیا پاش کرنوں سے کشتِ ہستی کو سیراب کررہا ہے۔ چاند بھی دنیا کو اسی طرح منور کرے گا۔ تاروں کی ٹمٹماہٹ اور سبزے کی لہلاہٹ میں بھی کوئی فرق نہ آئیگا۔ ایک کا دل ٹوٹ چکا ہے اور کسی کو خبر تک نہیں۔

صبح کا بیٹھا ہوں۔ اور رات ہوچکی ہے۔ ستارے جھلملا رہے ہیں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے ہیں۔ اور میں ہوں کہ محبوب کی قبر پہ بیٹھا محوِ حیرت ہوں۔

دل یہی چاہتا ہے کہ دنیا آج ہی ختم ہوجائے آسمان پھٹ جائے۔ زمین کے پرخچے اُڑجائیں۔ مگر یہ ایک اُمید موہوم۔ اور خیال خام ہے۔

لاہور ٹرنک ہاؤس انارکلی لاہور سے عمدہ سستے ٹرنک۔ سوٹ کیس۔ آہنی کرسیاں لیٹر بکس و سامان دفتر حسب پسند مل سکتے ہیں

ماہ کنعان اور دی آنا بیوٹی فائر

عورت اور مرد کی جلد کیلئے ایک ہی چیز مفید نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ہم نے مردوں کیلئے "ماہِ کنعان" اور عورتوں کیلئے "دی آنا بیوٹی فائر" کے نام سے دوائیں ایجاد کی ہیں۔ فضول اور ناکارہ ویزلین استعمال نہ کیجئے۔ بلکہ سائنٹفک طریقہ پر تیار شدہ چیزیں استعمال کر کے اپنے حسن کو بڑھائیے۔

قیمت ماہِ کنعان ۸/ قیمت دی آنا ۱۲/ کیوپڈ نمبر ۴۴ بہترین خوشبو ۸/ فی شیشی۔ کیوپڈ موڈ ایم ہیئر آئیل ۸/ فی بوتل۔ محصول ڈاک ہر حالت میں علاوہ۔ ادبی دنیا کا حوالہ ضرور دیجئے۔

ملنے کا پتہ

کیوپڈ پرفیومرز (پنجاب برانچ) ۷۰، اکبری لاہور

ڈرامہ انارکلی

عہد اکبری کا سچا واقعہ۔ محبت کے خون کے آنسو رلانے والی داستان البیلی اور اچھوتی زبان میں۔ نظم و نثر موثر و قابل دید چیز ہے۔ جلد طلب کیجئے۔ ورنہ طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑے گا۔ قیمت صرف ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول ڈاک

ادبی دنیا کا حوالہ ضرور دیجئے۔

ملنے کا پتہ

انڈین بک ڈپو، ۷۰، بازار نوہریاں لاہور

دنیا کے بہترین افسانے

یہ کتاب ملک کے مشہور ادیب مولوی منصور احمد صاحب جائنٹ ایڈیٹر ہمایوں کی تالیف ہے جس میں دنیا کی ہر قوم اور ہر ملک کے شہرۂ آفاق ادبا کے ۴۳ شاہکار جمع کر دیئے گئے ہیں۔ ہر افسانہ اپنی دلچسپی، انداز بیان کی دلکشی اور لطافت اور فن افسانہ نگاری کے اعتبار سے دنیا کا بہترین افسانہ ہے۔ ملک کے تمام اخبارات و رسائل نے اس کے متعلق بہترین آرا کا اظہار کیا ہے۔ حجم ۴۰۰ صفحات قیمت بلا جلد دو روپے۔ مجلد سنہری دو روپے بارہ آنہ (عہ۱۲)

ملنے کا پتہ

اسلامک لٹریچر کمپنی، پوسٹ بکس نمبر ۱۳۱ لاہور

ہفت عجائبات عالم میں ایک کا اضافہ

دنیا میں سب سے چھوٹا قرآن مجید

کلام اللہ کے پورے تیس پارے کتابی صورت میں ایسی حیرت انگیز صنعت سے چھپے گئے ہیں کہ لمبائی چوڑائی ڈاک خانہ کے ٹکٹ سے اور وزن پانچ ماشہ سے زیادہ نہیں بڑھا۔ نہایت منظر چیز ہے۔ ایک منقش سنہری ڈبیہ میں بند ہے، تلاوت کیلئے ڈبیہ میں خوردبین شیشہ لگا دیا ہے۔ آپ اس کا ایک نسخہ خیر و برکت کیلئے ہر وقت اپنے پاس رکھیں۔ بچوں کے گلے میں تعویز بنوا کر ڈالئے ہر قسم کے شر سے محفوظ رہیں گے۔ ہدیہ صرف دو روپے۔ ادبی دنیا کے حوالے سے پیکنگ مفت

ایس احمد اینڈ کمپنی پوسٹ بکس ۴۵ الاہور

عمدہ سستے پائدار بوٹ، شوز حنیف بوٹ ہاؤس انارکلی لاہور سے خریدئیے

ثریا

ملک کی مصنفہ نذر سجاد صاحبہ کا نہایت دلچسپ، مفید، نتیجہ خیز اور لرزا دینے والا ناول جس میں ہندو مسلم اتحاد کے دل افزا نظارے دکھائے گئے ہیں۔ آسان شیریں زبان۔ شیریں۔ انداز بیان [illegible]

صاحبہ کا حصہ ہے۔

پسند نہ آئے تو قیمت واپس۔ قیمت صرف بارہ آنہ ۱۲/

ملنے کا پتہ

دفتر اخبار دور جدید لاہور

فرانسیسی

"فتح ہمیں قبر کے اندر بھی مسرور کر سکتی ہے"

واہ! یہ تو کسی مجذوب کی بڑ ہے۔ ایک خیال خام ہے۔ اگر مسرت کے متلاشی ہو۔ تو آؤ میں تمہیں خوشی۔ مسرت۔ راحت۔ آرام کے ٹھکانے بتاؤں۔ ایک حسین کی چھیڑ چھاڑ۔ چاندنی رات کی سیر۔ شراب ارغوانی کے دور۔ دوستوں کے چہچہے۔ یاروں کے قہقہے۔ عیش و عشرت کی محفلیں۔ دوست و احباب کی مجلسیں تمہیں مسرت کی دیوی کے پاس لے جائیں گی۔ فتح سے کیا بنے گا۔ ہزاروں کا خون ہوگا۔ لاکھوں کی جان جائے گی تم موت کی دنیا میں۔ زخمیوں کی چیخ و پکار میں یتیموں کی آہ و زاری میں مسرت کی دیوی کے متلاشی ہو؟ تم خون کی لہروں میں۔ ہڈیوں کے انبار میں۔ ویرانگی میں۔ اُجاڑ اور غیر آباد بستیوں میں۔ خوشی اور مسرت کی دیوی کو ڈھونڈھتے ہو۔ تم فتح فتح پکارتے ہو۔ اور اسی میں راحت کے طلبگار ہو۔ تم ہوائی گھوڑے چلاتے ہو۔ ایک اُمید موہوم میں دنیا کی تمام راحتوں۔ تمام عیش و عشرت کو قربان کر دیتے ہو۔ بھلا مرنے میں بھی کوئی راحت ہے۔ میں زندہ ہزار مردوں سے اچھا ہوں۔ میں غریب سہی مفلس۔ اپاہج اور قلاش سہی: میں نادار اور نان شبینہ کا محتاج سہی۔ مگر لاکھوں مردہ بادشاہوں سے اچھا ہوں وہ زمین کے نیچے دبکے بیٹھے ہیں۔ اور میں جہاں چاہوں چل پھر سکتا ہوں۔ میں زمین پر اکڑ کر بھی چل سکتا ہوں۔ وہ ہل تک نہیں سکتے۔ میں کھا سکتا ہوں۔ سو سکتا ہوں ہنس سکتا ہوں۔ پیتا ہوں۔ دیکھتا ہوں اور سنتا ہوں۔ وہ اُٹھ کر دیکھ نہیں سکتے۔

آؤ! تم بھی آؤ۔ اور عیش کرو۔ چار دن کی زندگی ہے۔ اسے عیش و عشرت میں بسر کرو۔ آؤ اگر مسرت کے متلاشی ہو تو اسے پہاڑوں کی سر بفلک چوٹیوں۔ سرسبز وادیوں۔ روح افزا مرغزاروں۔ اُبلتے چشموں۔ بہتے دریاؤں۔ خاموش جھیلوں۔ شام و سحر کی شفق۔ نسیم سحر کے جھونکوں موسلا دھار بارشوں۔ اودی اودی گھٹاؤں۔ چاند کی چاندنی اور ستاروں کی جھلملاہٹ میں ڈھونڈو۔ مسرت کو۔ خوشی کو دلی راحت کو سمندر کی وسعت موجوں کی بیتابی۔ ساحل کی آزادی میں ڈھونڈو۔ آؤ۔ یہ وقت پھر کبھی نصیب نہ ہوگا۔

چپ رہو۔ بزدل۔ تیری باتیں حد سے بڑھ گئیں۔ تم زندہ ہو۔ مگر مُردوں سے بدتر ہو۔ اگر زندگی سانس لینے کا نام ہے۔ اگر زندگی سونے۔ اُٹھنے کھانے پینے کا نام ہے تو ایسی زندگی تو کتے بھی بسر کرتے ہیں۔ شراب کے نشے میں تو بندر بھی سرشار رہ سکتے ہیں۔ اگر زندگی دوستوں کے قہقہوں یاروں کے چہچہوں حسن کی شعاعوں اور عیش و عشرت کا نام ہے تو تف ہے ایسی زندگی پر۔ اس سے مر جانا بہتر ہے۔

زندگی زندہ دلی کا نام نہیں۔ بلکہ موت کے خوف سے آزاد ہو جانے کا نام ہے۔ کسی نے کیا ہی اچھا ہے کہ "بزدل دن میں ہزار دفعہ مرتا ہے"! تم ان میں سے ہو جو موت سے بھاگتے ہیں۔ جو موت سے چھپتے ہیں۔ مگر موت ان کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہے۔ زندگی اس فکر سے آزاد ہو جانے کا نام ہے۔ غیور انسان ہر وقت موت کے لئے تیار رہے۔ اور موت اُسے کبھی منہ نہیں دکھاتی۔ زندگی حرکت کا نام ہے۔

دوسروں سے اپنی ہستی کا اعتراف کرانے کا نام زندگی ہے! انصاف حریت۔ آزادی وطن کی خاطر مر جانے کا نام زندگی ہے۔ غریبوں مسکینوں یتیموں کی مدد کرنے کا نام زندگی ہے۔

یاد رکھو ایک وہ ہیں جو مرتے ہیں۔ اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی ایک وہ ہیں جن کی موت قوموں کی قسمت بدل دیتی ہیں۔ ایک وہ ہیں جو مر کر خاک میں مل جاتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو مر کر عرش کی بلندیوں پر جلوہ فگن ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو صبح کو مرتے ہیں اور شام کو بھلا دیئے جاتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو تا قیامت آسمان شہرت پر ماہِ منور بن کر چمکتے ہیں دونوں انسان ہیں۔ دونوں کھاتے ہیں۔ جاگتے ہیں۔ مگر فرق صرف یہ ہے کہ ایک زندہ ہو کر مردہ ہے۔ دوسرا زندہ ہے۔ مگر نشۂ زندگی سے سرشار ہے۔

اُٹھ اور جہاد حریت میں شامل ہو جا۔ اُٹھ اور سر سے کفن باندھ۔ سر کو ہتھیلی پر رکھ کر خلق خدا کی بہتری کے لئے میدان عمل میں آجا۔ عیش و عشرت کو۔ نفسانی خواہشات کو۔ آرام۔ راحت کو ترک کر دے۔ اور نفس امارہ کو جلا کر میدان عمل میں آ کود۔ پھر دیکھ کہ تجھے مسرت نصیب ہوتی ہے کہ نہیں یہ چار دن کی زندگی ہے تو اسے عیش و عشرت میں گذارنا چاہتا ہے۔ تو عیش و عشرت میں سرشار رہ کر موت کے فکر سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ یاد رکھ کہ یہ چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات ہے۔ موت اٹل ہے۔ خواہ پہاڑوں کی سر بفلک چوٹیوں پر ہو گا۔ خواہ سرسبز وادیوں میں موت اپنے وقت پر آئے گی اور ضرور آئے گی۔ پھر بھلا بزدلوں کی طرح مرنے سے کیا فائدہ۔ آ۔ اور مرنے کے

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۴۸۲

جو پروفیسر **تاجور** کی ایڈیٹری میں ہفتہ وار شائع ہوتا تھا **یکم فروری** سے روزانہ کر دیا گیا ہے۔ یوں تو اس کی پالیسی ہندوستان کے تمام فرقوں کی تمدنی تعلیمی اور اقتصادی اصلاح پر مشتمل ہوگی لیکن جس خاص مقصد کو لیکر یہ روزنامہ عالم وجود میں آیا ہے وہ تعلیمی اداروں اور ان کے اراکین کے حقوق کی حفاظت ہے۔

یہ حقیقت محتاج دلیل نہیں کہ مدرس علوم وفنون کا سرچشمہ ہے۔ اور تہذیب وتمدن کے وہ تمام شاندار نتائج جن سے دنیا بہرہ ور ہوتی ہے صحیح تعلیم وتعلم ہی کا ثمرہ ہوتے ہیں۔ مگر ملک میں ابتک اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ اس وقت جبکہ ہندوستان اپنی زندگی کے نہایت اہم اور خطرناک منازل میں سے گزر رہا ہے۔ ایک تعلیمی پرچے کی شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ **اتحاد** اپنا فرض سمجھتا ہے کہ ملک کے تعلیمی خادموں کی رفاہ وترقی میں کوشاں رہے۔ ان کی شکایات حکومت تک پہنچائے۔ اور وہ تمام کوششیں بروئے کار لائے جن سے ایسے وسائل وذرائع پیدا ہوسکیں جو تعلیم کو صحیح اقتصادی اور تمدنی بنیادوں پر قایم کریں۔ **اتحاد** کوشش کرتا ہے کہ ایک طرف پڑھنے اور پڑھانے والوں کے درمیان محبت اور مودت کا رابطہ قایم کرے اور دوسری طرف مدرسین اور عمال حکومت کے درمیان صحیح تعاون کی اسپرٹ پیدا کرے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ملک کا تعلیمی معیار بلند ہو۔ **اگر آپ** کی خواہش ہے کہ تہذیب وتمدن کے حقیقی بانی معلموں اور مدرسوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔ اور انھیں ملک و قوم کے لئے اور بھی زیادہ مفید بننے کے طریقوں کی رہنمائی کی جائے۔ اگر آپ کی تمنا ہے کہ ہندوستانی دیہات کی اصلاح ہو۔ اور معاشرتی اور اقتصادی حالت بلند کی جائے تو روزنامہ **اتحاد** کی اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹایئے یہ انھیں ضرورتوں کو مدنظر رکھکر جاری کیا گیا ہے۔ اگر ملک کے اہل علم اور تعلیمی اداروں نے ہمت افزائی کی تو ان مقاصد کے حصول میں **اتحاد** اپنی ساری طاقت صرف کر دے گا۔

چندہ

سالانہ ...... پندرہ روپے ۱۵
ششماہی ...... آٹھ روپے ۸
سہ ماہی ...... چار روپے آٹھ آنہ ۴/۸
نمونہ مفت

منیجر روزنامہ "اتحاد" لاہور

(مولوی احمد عبداللہ خاں صاحب ارشد نے مرکنٹائل پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ادبی دنیا واقع کشمیر بلڈنگ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا)

هندوستان کے محکمہ ہائے تعلیم میں منظور شدہ

اردو کا علمی و ادبی ماہوار

رسالہ

ادبی دنیا

نقشہ عالم کے مندرجہ ممالک تک مع ہندوستانیوں کے ساتھ اردو زبان پہنچ چکی ہے

مشرق و مغرب کے جدید و قدیم ادبیات کا مرقع

جولائی سنہ ۱۹۳۰

ڈائرکٹر:- آنریبل جسٹس سر عبد القادر

ایڈیٹر:- تاجور نجیب آبادی

سالانہ چندہ چار روپے بارہ آنے محصول وی پی ۴ر

[illegible] خریداروں سے تین روپے بارہ آنے [illegible] فی پرچہ

ہندوستان بھر میں علم و ادب کا سب سے کثیر الاشاعت

ماہوار اردو رسالہ

ادبی دنیا (لاہور)

پانچہزار ایک سو کی تعداد میں شائع ہو رہا ہے

ایک ہزار روپیہ انعام

اس شخص کے لئے جو یہ ثابت کر دے کہ پانچ ہزار ایک سو کی تعداد سے رسالہ ادبی دنیا کم چھپا ہے ۳۳ تینتیس من تیس سیر اس نمبر پر کاغذ صرف ہوا ہے۔

تصدیقیں

ہم تصدیق کرتے ہیں کہ ہماری فرم سے ادبی دنیا کے اس نمبر کے لئے حسب تعداد ذیل کاغذ خریدا گیا:-

۲۰×۲۶ سائز ۱۰۵ رم
۲۲×۲۹ آرٹ پیپر ۱۳ رم } اس کاغذ کا وزن ڈھائی ہزار پونڈ ہوتا ہے۔

دستخط:-
فرم چھنن لال متھرا پرشاد تاجران کاغذ لاہور

ہمارے پریس میں رسالہ ادبی دنیا کے اس نمبر کا سرورق پانچہزار ایکسو کی تعداد میں چھپوایا گیا- ہم اس تعداد کے قانونی طور پر ذمہ وار ہیں۔

دستخط:-
مینیجر وکٹوریہ پریس لاہور

ہم تصدیق کرتے ہیں کہ ہمارے پریس میں ادبی دنیا کے اس نمبر کی ہر تصویر پانچہزار ایکسو کی تعداد میں چھپوائی گئی ہے یہ تعداد ہمارے رجسٹر کارگزاری میں درج ہے اور اس تعداد کے ہم قانوناً ذمہ وار ہیں۔

دستخط
مینیجر نیشنل آرٹ پرنٹنگ پریس لاہور۔

ہمارے پریس میں رسالہ ادبی دنیا کا ہر فرمہ پانچہزار ایکسو کی تعداد میں چھاپا گیا ہے۔ ہمارے رجسٹر چھپائی سے تصدیق کیجا سکتی ہے۔

دستخط:-
مینیجر مرکنٹائل پریس لاہور۔

آئندہ سے ادبی دنیا کا ہر نمبر پانچہزار ایکسو کی تعداد میں چھپا کریگا۔ مقامی اشتہار دینے والوں میں سے ہر شخص مرکنٹائل پریس لاہور میں جاکر ہر نمبر کے چھپے ہوئے فرمے شمار کر سکتا ہے۔

رسالہ ادبی دنیا لاہور۔

308

معرکہ خیز ایجادیں

کوی نود ویدبھوشن پنڈت ٹھاکر دت شرما شمالی ہند کے مشہور و مقبول عام آیورویدک فزیشن سائیڈ یٹر دیش اپکارک و مصنف متعدد طبی کتب نے ذیل کی معرکہ خیز ایجادیں کی ہیں :-

امرت دھارا (رجسٹرڈ)

اکسیر اعظم۔ تقریباً ہر مرض کا یقینی علاج۔ بنی نوع انسان کے لئے نعمت عظمےٰ۔ قیمت فی شیشی دو روپے آٹھ آنے (عہ ۸ر) نصف شیشی (عہ ۴ر) نمونہ (۸ر)

اشوگری

ذیابیطس کمزوری کا فوری و یقینی علاج ہے قیمت چار روپے (للعہ) نمونہ ایک روپیہ (عہ ۱ر)

میٹھا پھل (رجسٹرڈ)

تعجب خیز ایجاد ہے جنکے لڑکیاں ہی ہوتی ہوں صرف ایک خوراک حاملہ کو تیسرے ماہ کے آغاز میں کھلادیں پرماتما کی کرپا سے لڑکا ہوگا۔ لڑکی ہونے کی صورت میں دام واپس۔ قیمت دس روپے (عہ ۱۰ر)

پھولو پھلو (رجسٹرڈ)

جب بچے دانت نکلنے لگیں اور سوکھتا جاتا ہو تو اس دوا کو اسکی پیٹھ پر مالش کریں۔ کچھ کیڑوں کا اخراج ہوگا اور بچہ موٹا ہونے لگیگا قیمت ایک روپیہ ہے (عہ ۱ر)

اکسیر نمبر ۵

بہترین طاقت بخش ٹانک کوئی اور دوا اسکے ہم پلہ نہیں۔ قیمت ۱۵ گولی سات روپے آٹھ آنے (عہ ۷ر) نمونہ چار گولی دو روپے (عہ ۲ر)

برہم پتر رس (رجسٹرڈ)

ٹھاکر کی دوائی جن مستورات کے بچے کسی خاص عمر کو پہنچکر گذر جاتے ہوں ایام حمل میں اس دوا کو کھالیا کریں تو پرماتما کی کرپا سے اولاد بچ جائیگی۔ مکمل خوراکوں کی قیمت دس روپے (عہ ۱۰ر)

مدہت (رجسٹرڈ)

اگر اس دوا کو جانتے یا نہ جانتے ہوئے شراب میں گھولکر دیا جائے تو آہستہ آہستہ پینے والے کو اس سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ پبلک کے فائدے کیلئے قیمت صرف دو روپے (عہ ۲ر)

بلا دور (رجسٹرڈ)

بلا کسی تکلیف کے اسکا استعمال افیون چھڑوا دیتا ہے۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ ۱ر ۸)

خط و کتابت و تار کیلئے پتہ: امرت دھارا لاہور

المشتہر: منیجر امرت دھارا اوشدھالیہ۔ امرت دھارا بھون۔ امرت دھارا روڈ۔ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور

اعلان
ایک روپیہ کی کتابیں تین آنہ میں
جواہرات کا خزانہ
شہنشاہ تجارت
نام کتاب
مشاہیر کی سوانح عمریاں
بجلی گائیڈ
کتب جادو
کتب حکمت

رجسٹرڈ ..... ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد (۲) بابت ماہ جولائی ۱۹۳۰ء نمبر (۷)

تصاویر:۔ (سہ رنگی) (۱) حسن کی فتح ۔ (یک رنگی) (۲) حکیم افلاطون ۔ (۳) ارسطو (۴) چمن زاد (۵) محو خیال (۶) نورانی خواب (۷) بیخودِ محبت

(مولوی احمد سعید اللہ خاں صاحب ادیب مصر نے مرکنٹائل پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ادبی دنیا ایم کنیر بلڈنگ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا)

حال وقال

ادبی دنیا کی تصاویر

یہ عرض کرنا خودستائی نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت ہوگا کہ "ادبی دنیا" نے تصاویر کا جو معیار قائم کیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اس کی تصاویر کے معیار کی رفعتوں تک نہ پہلے کسی حریف کار کا گزر ہوا تھا اور نہ اب تک باوجود ہزاروں کوششوں کے وہاں تک کسی کی رسائی ہوئی ہے۔

جن حضرات کو آرٹ اور صنعت تصاویر سے دلچسپی ہے اور جو اس کے حسن و قبح کو سمجھنے کے اہل ہیں اُنہوں نے "ادبی دنیا" کی تصویروں کے بلند معیار کے نہایت شاندار الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ اور وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستانی زبان کے کسی رسالے کی تصویروں کو آجتک وہ بات نصیب نہیں ہوئی ہے جو ادبی دنیا کو روزِ اول سے حاصل ہے۔

ادبی دنیا کے لئے تصاویر کے انتخاب میں ہمیں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُنہیں ہمیں خوب جانتے ہیں۔ اگر ہمارے پیشِ نظر صرف اتنی ہی بات ہوتی کہ ہر مہینہ چند تصاویر شائع کر دیجایا کریں اور بس۔ تو یہ کچھ بھی مشکل کام نہ تھا۔ تصاویر کی آجکل کوئی کمی نہیں ہے۔ آسانی سے تصویریں ملسکتی ہیں۔ اور انہیں ایک چھوڑ پانچ پانچ اور چھ چھ رنگوں میں چھپوایا بھی جاسکتا ہے لیکن ہمارا مطمع نظر صرف یہی نہیں ہے کہ چند یک رنگی، دو رنگی اور سہ رنگی تصویریں شائع کر دی جایا کریں۔ خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہوں۔ بلکہ ہم تو ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ادبی دنیا کے لئے ایسی تصویریں منتخب کی جائیں جن میں باعتبارِ فن کوئی نقص نہ ہو۔ تصاویر میں عریانی اور سوقیت نہ ہو۔ ایسی تصویریں نہ ہوں جو ذوقِ سلیم پر گراں گزریں۔ وہ جاذبیت اور کشش سے بھی عاری نہ ہوں۔ اور ان سب کو مستزاد یہ کہ ہر تصویر میں آرٹ کا بھی کوئی نہ کوئی پہلو ضروری موجود ہو۔ اگر ان تمام امور پر ناظرین بحیثیت مجموعی نظر ڈالیں تو انہیں بھی ان دشواریوں اور دقتوں کا کسی قدر اندازہ ہوسکتا ہے جو ہمیں انتخاب تصاویر کے معاملہ میں پیش آتی ہیں۔

ان تمام مشکلات کے باوجود ہم نے ادبی دنیا کے معیار تصاویر کو آجتک قائم رکھا ہے۔ اور آئندہ بھی اسے بدستور قایم رکھیں گے۔ بلکہ اس میں مزید ترقی کی کوشش کرتے رہیں گے کیونکہ ہمارے ذہن میں ادبی دنیا کی تصاویر کا جو معیار موجود ہے وہ اس سے کہیں ارفع اور بلند ہے۔ اور وہاں تک پہنچنے کے لئے ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ ہمیں تو یہی امید ہے کہ اگر خدائے قدیر کا فضل ہمارے شاملِ حال رہا اور ادبی دنیا کے قدرشناسوں کی توجہات خصوصی بدستور باقی رہیں تو وہ دن دُور نہیں ہے جب ہم ادبی دنیا میں اُسی معیار کے مطابق تصاویر شایع کرسکیں گے۔ جو ہمارے پیشِ نظر ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں قارئین ادبی دنیا سے بھی چند درخواستیں کرنی ہیں اول یہ کہ جو حضرات آرٹ سے واقفیت رکھتے ہیں اور صنعت تصاویر میں اُنہیں کچھ درک حاصل ہے وہ ازراہِ کرم ادبی دنیا کی تصویروں کے متعلق اپنی رائے اور مشورے سے ہمیں آگاہ فرماتے رہیں۔ تاکہ ہم اُن کے قیمتی مشوروں پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ دوسرے جن صاحب ذوق حضرات کے پاس تصاویر کے البم ہوں وہ اپنے البم سے ہمیں تاریخی تصاویر، مناظر کی تصاویر اور آرٹ سے متعلق تصویریں مستعار عنایت فرماکر ممنون فرمادیں۔ ہم نہایت احتیاط کے ساتھ ان تصویروں کے بلاک بنواکر واپس کردینگے۔ اور ایسے کرمفرماؤں کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کریں گے۔ جن حضرات کے پاس خود تصاویر کا ذخیرہ نہ ہو وہ ہمیں ایسے اصحاب کے پتے عنایت فرمائیں جن کے پاس اُنہوں نے بہتر قسم کی تصویریں دیکھی ہوں یا اُنہیں کے پاس اس قسم کی تصویروں کا علم ہو۔

اگر قارئین ادبی دنیا نے ہماری اس درخواست کی طرف توجہ فرمائی تو وہ دیکھیں گے کہ ہم ادبی دنیا کی تصویروں کا معیار کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔

ادبی دنیا کے مضامین

ادبی دنیا میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ مضامین میں زیادہ سے زیادہ تنوع اور دلچسپی پیدا کیجائے۔ اور انکی ترتیب بھی پسندیدہ ہو۔ تاہم ہم قارئین ادبی دنیا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ مضامین کی نوعیت اور ان کی ترتیب کے متعلق اپنی رائے سے ہمیں مطلع فرمائیں کہ کس قسم کے مضامین زیادہ ہوں کس قسم کے مضامین کم ہوں۔ اور کس قسم کے مضامین نہ ہوں۔ یا اگر وہ مضامین کی موجودہ نوعیت اور ترتیب ہی کو پسند کرتے ہوں تو اس کا بھی اظہار فرمائیں۔ ہم ان آراء کی اشاعت کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً اپنے خیالات بھی پیش کرتے رہیں گے۔ اور اخیر میں کثرت رائے کا جو فیصلہ ہوگا اس پر عمل کرنے کی انتہائی کوشش کرینگے۔ اور ادبی دنیا کو ناظرین ادبی دنیا کی خواہش کے مطابق مرتب کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرینگے۔ کیونکہ ادبی دنیا اسی لئے جاری ہے کہ اس سے اسکے قارئین کے

آئینۂ عالم

پروفیسر آرنلڈ آنجہانی

۱۰ رجون سنہ ۱۹۳۰ء کو مشہور مستشرق سر ٹامس واکر آرنلڈ نے عالم فانی سے خیرباد کہا۔

پروفیسر صاحب موصوف ۱۹ راپریل سنہ ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے تھے آپ نے سٹی آف لنڈن اور میگڈالین کالج کیمبرج میں تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ تک گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے پروفیسر رہے۔ دس برس تک محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کے سٹاف میں شامل رہے۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۱۷ء میں وزیر ہند کے مشیر تعلیم مقرر ہوئے اور سنہ ۱۹۲۰ء تک اپنے فرائض کو غیر معمولی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔

آپ کو مشرق و اہلِ مشرق سے بہت دلچسپی تھی۔ اور جس ذہنی بیدار مغزی اور استقلال سے اپنے اپنے عہدوں کے فرائض کو انجام دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ہندوستان کے تعلیمی معاملات میں دلچسپی ہی نہ تھی بلکہ اس میں گہری ہمدردی کا رنگ تھا۔ تعلیمی اداروں کی ترقی اور طریق تعلیم کے ارتقا کے متعلق ان کی کوششیں ہمیشہ یادگار رہینگی۔

یُوں تو یورپ میں مستشرقین کی کمی نہیں ہے لیکن ایسے فاضل بیدار مغز حضرات بہت کم ہیں جو پروفیسر صاحب موصوف کی طرح کسی غیر ملک کی تعلیمی حالت کو سدھارنے کیلئے اپنی عمر وقف کردیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طلبا کو نور علم سے مستفید کرنے میں ان کو ایک روحانی مسرت حاصل ہوتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ آخر عمر تک وہ لنڈن میں بیٹھے ہوئے بھی ان ہندوستانی طلبا کی رہنمائی کرتے رہے جو تعلیمی سلسلوں میں انگلستان جاتے تھے۔

ایک روشن خیال اور بیدار مغز حکمران خاتون

بھوپال کی علم پرور و علم نواز حکمران ہز ہائی نس سلطان جہان بیگم صاحبہ کی وفات سے دنیائے علم و ادب کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کبھی نہ ہوسکیگی۔ مرحومہ کی علمی فیاضیوں سے سینکڑوں علمی ادارے مستفید ہو رہے ہیں۔ جامعہ اسلامیہ دیوبند مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔ دار العلوم ندوہ اور اس قسم کی ملکی اور بیرونی درسگاہیں چوتھائی صدی سے بھی زیادہ مدت سے بھوپال کی فیاضانہ امداد سے بہرہ یاب ہو رہی ہیں۔

علامہ شبلی کی گراں مایہ تصنیف (جسے بلاخوف تردید دور حاضر کی سب سے زیادہ اہم تصنیف کہا جاسکتا ہے) سیرۃ النبی اس علم دوست بیگم کی مسلسل و بیش بہا امداد سے اردو ادب کو نصیب ہوئی۔ اور شبلی کو یہ کہنے کا موقع ملا۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

مرحومہ خود بھی ایک مقتدر مصنفہ تھیں۔ عورتوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق ان کی جو گراں قدر تصانیف شائع ہوئی ہیں۔ وہ یقیناً بہت جلدی فنا ہو جانے والی نہیں۔

ذوقِ علم کے ساتھ مرحومہ کو فطرت نے حقیقی معنوں میں حکمرانی کا اہل بنایا تھا چنانچہ ان کے طویل اور خوشگوار دورِ عہد حکومت کے واقعات شاہد ہیں کہ سلطانہ رضیہ کو پیدا کرنے کے بعد فطرت ہندوستان کی طرف سے بے پروا نہیں ہوگئی۔

سائمن کمشن کی رپورٹ

سائمن کمشن کی رپورٹ کا پہلا حصہ شایع ہوچکا ہے۔ اس حصے کو سفارشات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور اس مرحلے پر کسی تفصیلی تبصرے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ دوسرے حصے کے شایع ہونے کے بعد ادارت کی طرف سے اس پر ایک جامع تبصرہ شایع ہوگا۔

تاجور

ادبی دنیا ہر ماہ باقاعدہ خریداروں کی خدمت میں بھیجدیا جاتا ہے۔ جن کے پاس رسالہ ۱۰ تاریخ تک نہ پہنچے وہ مقامی ڈاک خانے کی شکایت صاحب پوسٹ ماسٹر جنرل کو کریں۔ منیجر

بادشاہ اور بھکارنی

(حسن کی فتح)

مصور:۔ سر اڈورڈ برن جونز

بعض نقاد اس تصویر کو مصور کا شاہکار تصور کرتے ہیں مصور کی چابکدست انگلیوں نے کینوس پر ایک غیر فانی افسانۂ محبت کے رنگین و روشن تاثرات منتقل کر دئیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ برن جونز کو فطرت کی طرف سے ایسی صلاحیتیں عطا ہوئی تھیں کہ وہ اس کہانی کو تصویری جامہ پہنانے کا بوجہ احسن اہل تھا۔ اس نے تخیل کی ایک دنیا آباد کی تھی۔ اور اس دنیا میں ایسے ایسے افراد تخلیق کئے تھے جو انسان کی پرواز ذہن کا منتہائے مقصود کہلا سکتے ہیں۔ وہ اپنے موضوع کے تمام پہلوؤں کو روشن اور دلفریب بنا سکتا تھا۔ اس کی قوت تخیل واقعتاً یہ محسوس کر سکتی تھی سنے ہوئے نغمے شیریں ہیں لیکن ان سنے گیت شیریں تر ہیں۔ اس اعتبار سے اپنی صدی کے مصوروں میں اسے ایک امتیازی رتبہ حاصل ہے۔ لارڈ ٹینس نے جن الفاظ میں "بھکارنی" کی تعریف کی ہے۔ وہ اس تصور میں "رنگ" کا جامہ پہن کر روشن ہیں۔ ؎

اس کے کہنہ پیرہن میں اسکا جسم زرنگار
اسطرح روشن تھا جیسے بدلیوں میں ماہتاب
کوئی کہتا پاؤں اس کے یاسمن کے پھول ہیں
کوئی کہتا تھا ستم ہے اسکی چشم نیمخواب
بال اُسکے عنبر افشاں۔ رشک شبہائے بہار
حسن اسکا۔ لالہ زارِ دلبری۔ جانِ شباب

مصور نے بھکارنی کے چہرے پر مختلف جذبات کو منعکس دکھایا ہے۔ تحیر۔ اندوہ۔ فرشتہ مثال معصومیت۔ سادگی وہ ایک ناقابل بیان انداز میں تخت شاہی پر جلوہ افروز ہے۔ اس کے حسن کے شیریں جلوے کسی اور دنیا کے جلوے معلوم ہوتے ہیں۔ اسقدر نازک اور لطیف گویا ابھی فضا میں تحلیل ہو جائیں گے۔ فردوس کی طرف پرواز کر جائیں گے۔ وہ ننگے پاؤں ہے۔ اور حسن و جمال کی اس تصویر کے قدموں پر ایک شہنشاہ کی مہابت و عظمت جھکی ہوئی ہے۔

مصور نے صرف موضوع کی رومانیت ہی کو اچھی طرح ادا نہیں کیا بلکہ اس کے کمال فن نے جزئیات کی تکمیل اور رنگوں کے امتزاج میں بھی ایک حیرت انگیز اثر حسن پیدا کر دیا ہے۔ وہ حسن جو ہر صنعت کی جان ہے۔ اس تصویر میں تخیلی قوت اور صناعانہ چابکدستی کو اس طرح ملایا گیا ہے۔ کہ بے مثال شاہکار ہمیشہ کے لئے دیکھنے والوں کے دلوں میں ایک طوفان مسرت پیدا کر دیگا۔

شوخ اور گہرے رنگوں کا استعمال تصویر کے اجزا کا باہمی تناسب اور پھر کلی اثر سے ان اجزا کی مناسبت ایسی چیزیں ہیں جو ذہن کو مرعوب بھی کرتی ہیں اور متحیر بھی۔

بادشاہ کے ہاتھ میں تاج شاہی ہے۔ یہ تاج شاہی گویا شہنشا ہیئت کی تمام عظمت و قوت کا مظہر ہے جو بھکارنی کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

آجکل یہ تصویر ٹیٹ گیلری میں آویزاں ہے۔ اس سے پہلے حسن و رنگ کا یہ شاہکار ارل آف وارنکلف کی ملکیت تھا۔ ان کی وفات کے بعد چند شخصوں نے مل کر یہ تصویر ۶۵۰۰ پونڈ میں خرید لی۔ اور ایثار سے کام لیتے ہوئے عوام الناس کے لئے وقف کر دی۔

اس سے پیشتر بھی "ادبی دنیا" میں برن جونز کی تصاویر شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اس تصویر کا پایہ ان تمام تصاویر سے بہت بلند ہے۔

عابد

حسن کی فتح

بلاک بنانے والے مہتہ ہاف ٹون کمپنی انارکلی لاہور

چھاپنے والے نیشنل آرٹ پریس انارکلی لاہور

ثبوت

مسٹر لطیف احمد اڈیٹر "کلیم" خوش تھے۔ بہت خوش! کلیم کا اپریل نمبر ایک ہفتے میں بک گیا تھا۔ خریداروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ مالک نے ان کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا تھا۔ ایک مقامی اخبار نے ان کی تقریر کی تعریف کی تھی۔ اور انہیں "مجلس واضع قوانین" کی رکنیت کے لئے پیش کیا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے کانوں میں شیریں نغمے گونج رہے تھے۔ آج صبح ان کی بیوی مریم نے ہارمونیم اس طرح بجایا تھا کہ ان کے دل کے تار لرز اٹھے تھے۔

تو مسٹر لطیف احمد خوش تھے!

یکایک کسی نے ان کے کوٹ کی آستین پکڑ کر انہیں اپنی طرف مخاطب کرنا چاہا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ منیر ان کی طرف اپنے مخصوص انداز میں گھور رہا تھا۔

شکستہ حال لیکن باہمت منیر!

مسٹر لطیف احمد کو تعجب اور حیرت کی گہرائیوں میں غرق رہنے دیجئے اور ذرا منیر کے حالات پر ایک "طائرانہ" نظر ڈالئے۔

منیر ایک افسانہ نگار تھا۔ اور اڈیٹر کلیم کے پرانے دوستوں میں سے تھا۔ لطیف احمد کی بیوی مریم اور منیر کی بیوی اختر سہیلیاں تھیں۔ منیر کا عقیدہ تھا کہ ہندوستان میں بھی "افسانہ نگاری" ذریعہ معاش بن سکتی ہے۔ کبھی اس کا افسانہ خرید لیا جاتا تھا۔ اس نے اپنی کئی کہانیاں "کلیم" میں اشاعت کی غرض سے بھیجیں۔ ایک دو شایع ہو گئیں۔ باقی لطیف احمد نے "رسمی افسوس" کا اظہار کرتے ہوئے واپس کر دیں۔ ایک افسانے کے مسودے کے ساتھ لطیف احمد نے ایک مفصل خط بھی لکھا۔ جس میں افسانے کو مسترد کرنے کی وجوہات درج تھیں۔ مسٹر لطیف احمد فن افسانہ نگاری کے متعلق ایک قطعی رائے رکھتے تھے۔ منیر کی بھی ایک قطعی رائے تھی۔ منیر کی بیوی "افسانہ نگاری" کی ناقدری سے نالاں رہتی تھی۔ شاید اس پر ایک آدھ فاقہ بھی گزرتا ہو . . . .

لطیف احمد آج کئی ماہ کے بعد منیر سے ملاقی ہوا تھا۔

"تم ہو منیر! کہو کیا حال ہے؟"

منیر نے کہا۔ "ذرا بیٹھ جاؤ۔ لطیف!"

لطیف ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ سگرٹ کیس نکالا۔

"پیو گے منیر!"

منیر نے سگرٹ گویا چھین لیا۔

لطیف نے کہنا شروع کیا۔ "میرے پاس صرف . . . ."

منیر نے بات کاٹ کر کہا "ہاں ہاں۔ میں جانتا ہوں۔ تمہارا وقت قیمتی ہے اور تم صرف پانچ منٹ دے سکتے ہو۔"

لطیف نے بات ٹال کر پوچھا "افسانوں کا کیا حال ہے"

"میرے کپڑوں سے نمایاں ہے اور از راہ کرم اپنے چہرے سے یہ نہ ظاہر ہونے دیجئے گویا آپ حیران ہو رہے ہیں کہ میں تانگہ کیوں نہیں چلاتا۔ آئس کریم کیوں نہیں بیچتا۔"

اس نے اپنے لہجے کو زوردار کرتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں اچھا افسانہ لکھتا ہوں اور میں تم لوگوں سے منوا کے چھوڑونگا۔ دیکھ لینا ایک دن تم "افسوس ہے" کہ رد کرنے کے بجائے "چیک" لکھ رہے ہو گے۔"

لطیف نے منیر کی طرف ہمدردانہ انداز سے دیکھا۔ وہ ہمدردانہ انداز جس میں کچھ غم کچھ شک کچھ حیرت ملی ہوئی تھی۔

منیر نے پوچھا "تم نے میرا افسانہ "روح کی بیداری" پڑھا؟"

"نہایت غور سے۔ سچ تو یہ ہے منیر کہ افسانے کے متعلق میں دیر تک سوچتا رہا۔ اس میں خوبیاں موجود تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ . . . ."

منیر نے کہا۔ "افسوس کا اظہار رہنے دو۔ اچھا پہلے یہ بتاؤ کہ اس میں خوبیاں کیا تھیں۔"

لطیف نے اطمینان سے کہنا شروع کیا۔ "کہانی کا پلاٹ بالکل نیا ہے۔ کردار نگاری انتہا سے کمال تک پہنچی ہوئی ہے۔ واقعات کی ترتیب وارتقا و تکمیل بہت نفیس ہے۔ افسانہ اچھا ہے۔ صرف . . . . ؟"

منیر نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا "میں اردو لکھ سکتا ہوں یا نہیں؟"

"کوئی شک نہیں۔ میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں۔ کہ تم صاحب طرز ہو۔"

"تو پھر:"

"پھر" ایڈیٹر نے کہا "مشکل یہ ہے کہ تم اپنے افسانے کو ایک اچھے صناع کی طرح اختتام تک لیجاتے ہو۔ اور پھر تم ایک فوٹو گرافر بن جاتے ہو۔ نہیں نہیں۔ یہ تشبیہ درست نہیں۔ کیمرا بھی بعض اوقات "صداقت" کی ایک جھلک دکھا سکتا ہے۔ لیکن تم تو افسانے کے انجام کو اپنے قلم کی چند بے معنی جنبشوں سے بالکل غیر صناعانہ بنا دیتے ہو۔ اگر تم صحیح معنی میں فطرت سے ذرا بلند ہو جاؤ اور اپنی تصویر کو ان شوخ رنگوں سے مزین کرو جو آرٹ کی جان ہیں تو یقیناً ڈاکیہ تمہارے لئے مسودوں کی بجائے چیکیں لائے۔"

منیر نے حقارت سے کہا "ابھی تک تم بچے ہو لطیف"۔

جب "ڈرامے کا ڈاکو" سنہرے بالوں والی۔ نیلے نینوں والی ہیروئن کو بھگا کے لیجاتا ہے۔ تو تمہارے خیال میں اس کی ماں آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کے کہتی ہے۔

"اے آسمان۔ اے تارو۔ گواہ رہنا۔ جبتک میں اس بدمعاش کو کیفر کردار تک نہ پہنچالونگی۔ اس وقت تک دم نہ لونگی"۔

لطیف مسکرایا۔

اس نے کہا "یقیناً زندگی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ماں انہیں الفاظ میں یا تقریباً انہیں الفاظ میں اپنے رنج اور غصے کا اظہار کریگی"۔

منیر نے چلاتے ہوئے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو ماں کہیگی۔ "انجمن آرا کو ڈاکو بھگا کر لے گیا۔ توبہ ہے! جان عذاب میں آگئی ہے۔ مصیبتوں سے چھٹکارا ہی نہیں ہوتا۔ ادھر آؤ احمد کیا کر رہے ہو تم۔ میرے کپڑے نکالو۔ آخر کیا ہوگا۔ پولیس میں اطلاع دیجائیگی یا نہیں؟ میں حیران ہوں کہ ان کے ابا کو کیا ہو گیا تھا۔ لڑکی کا خیال ہی نہیں رکھتے"۔

منیر نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

تو انجمن آرا کی ماں کی باتیں کچھ اس طرح کی ہونگیں۔ مسٹر لطیف احمد میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جذبات کی شدت کے وقت لوگ شعر نہیں پڑھتے۔ شاعرانہ زبان نہیں برتتے بلکہ سادھی زبان میں گھریلو زبان میں اپنے رنج والم کا اظہار کرتے ہیں"۔

"منیر" لطیف نے متانت سے کہا "کبھی تم نے موٹر کار کے نیچے سے کسی بچے کی کچلی ہوئی لاش نکال کر غمزدہ ماں کے سامنے رکھی ہے۔ کیا تم نے غمزدہ ماں کے منہ سے بے ساختہ غم والم کے شعریت بھرے گیت سنے ہیں؟"

منیر نے کہا "نہیں۔ اور تم؟"

لطیف نے کہا۔ "مجھے بھی یہ موقع کبھی پیش نہیں آیا لیکن میں تصور کر سکتا ہوں کہ وہ کیا کہیگی۔"

منیر نے کہا "میں بھی تصور کر سکتا ہوں"۔

لطیف نے گویا سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"منیر! میں خوب سمجھتا ہوں کہ ہر ایک گہرا فوری اور درد انگیز جذبہ روح انسانی کے تاروں سے خود بخود بے ساختہ ایک دکھ بھرا نغمہ پیدا کرتا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس اظہار جذبات میں فطرت کا کتنا حصہ ہے اور آرٹ کو کتنا دخل ہے۔ لیکن یہ مسلم ہے کہ ہر انسان کے دل میں ایک طوفان ہے جو شدید جذبات کے زیر اثر متموج ہو جاتا ہے"۔

منیر نے سلسلہ کلام کو بدل دیا اور کہا "اچھا یہ تو بتاؤ کہ "روح کی بیداری" میں وہ خاص نقص کیا تھا جس کی وجہ سے تم نے اسے مسترد کر دیا"۔

لطیف نے جواب دیا "جب نگہت اپنے منگیتر کا خط کھولتی ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک کمینہ لڑکی کے ساتھ بھاگ گیا ہے تو وہ کہتی ہے "لو اور سنو! دیکھا تماشا!" اور یہ لفظ ہرگز مناسب حال نہیں ہیں۔ ان الفاظ کی وجہ سے کہانی صنعتی نقطۂ نظر سے برباد ہو کر رہ گئی ہے۔

علاوہ ازیں یہ الفاظ غیر فطرتی ہیں۔ زندگی کی صحیح تصویر نہیں پیش کرتے۔ کون شخص جذبات درد کے زیر اثر اس قسم کے الفاظ کا استعمال نہیں کرتا"۔

"اور میں کہتا ہوں" منیر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

جب انسان پر کوئی شدید جذبہ طاری ہوتا ہے تو وہ سیدھے سادے معمولی الفاظ میں اپنے احساسات کا اظہار کرتا ہے شاعرانہ تراکیب سے محترز رہتا ہے۔ خیر! اچھا تو یہ بتاؤ لطیف اگر تمہیں یقین ہو جائے کہ نگہت کے الفاظ صحیح زندگی کی تصویر ہیں تو کیا تم میری کہانی کو اشاعت کی غرض سے قبول کر لوگے۔"

"یقیناً"۔

"اگر میں ثابت کر سکوں کہ میرا نقطۂ نظر درست ہے تو ....."

لطیف نے کہا "بس اب میرے پاس کوئی وقت نہیں

منیر نے لطیف کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں ۔ اور کہا ۔
سنو لطیف ۔ دو سال سے میں اڈیٹروں کا مقابلہ کر رہا ہوں۔
اب اس بات کی ضرورت ہے کہ میں اپنے نقطۂ نظر کی صحت کا ثبوت دوں ۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بات قطعی طور پر ثابت کر دی جائے کہ جب انسان تیز و تند و درد انگیز جذبات کے زیر اثر ہوتا ہے تو اس کے الفاظ سیدھے سادے ہوتے ہیں ۔ پر شکوہ اور متین تراکیب سے خالی ہوتے ہیں ۔ شعریت سے کوسوں دور ہوتے ہیں ۔ بہر نوع میں اپنی بیوی کے ذریعے تم پر ثابت کرونگا کہ میرا نظریہ درست ہے ۔

اس وقت میری بیوی اپنی ایک سہیلی کے گھر ہے ۔ پورے تین بجے آجائیگی ۔ اب تین بجنے میں ۰ ۲ منٹ ہیں ۔ ہم گھر چلتے ہیں ۔ میں ایک خط لکھکر میز پر رکھدونگا جس میں یہ درج ہوگا کہ میں ایک عورت کے ساتھ جا رہا ہوں اور واپس نہیں آؤنگا ۔ ہم دونوں ساتھ کے کمرے میں چھپ رہیں گے ۔ جب میری بیوی خط پڑھ چکیگی تو تمہیں یہ موقع مل جائیگا کہ اس کی حرکات کا مشاہدہ کر سکو اور ان الفاظ کو سن سکو جو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلینگے ۔ پھر تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ میرا نظریہ درست ہے ۔ دیکھ لینا اختر کے منہ سے بے ساختہ فطری طریق پر سیدھے سادے الفاظ نکلیں گے ۔"

"ہرگز نہیں" لطیف نے جواب دیا ۔ میں اختر کے جذبات کو مجروح کرنا گوارا نہیں کر سکتا ۔"

منیر نے کہا ۔ حوصلہ کرو ۔ لطیف ! تم سے زیادہ مجھے اختر کے جذبات کا خیال ہے ۔ لیکن یہ بات اب ضروری ہو گئی ہے ۔"

بالآخر لطیف کو منیر کا کہنا ماننا پڑا ۔

دونوں منیر کے مکان پر پہنچے ۔ میز پر ایک خط پڑا تھا ۔
منیر نے اٹھا لیا اور پڑھنا شروع کیا ۔

پیارے شوہر ۔ پیارے منیر !

میں جا رہی ہوں ۔ فاقے کر کے میں تنگ آگئی ہوں ۔ میں ایک فلم کمپنی میں ملازم ہو گئی ہوں ۔ لطیف اڈیٹر "کلیم" کی بیوی مریم بھی میرے ساتھ جا رہی ہے ۔ وہ کہتی ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے تنگ آگئی ہے جو غیاث اللغات کے الفاظ میں باتیں کرتا ہے ۔

خدا حافظ

اختر

منیر کے ہاتھوں سے خط گر پڑا ۔ اس نے اپنا منہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ڈھانپ لیا ۔ اور گہری لرزتی ہوئی آواز میں کہا ""

"" خدایا ! یہ کیا ہوا ! اس زہر ہلاہل کی تلخی سے لذت اندوز ہونا میری قسمت میں لکھا تھا ۔ اگر اختر بھی وفادار نہیں تو پھر اب چاہے ستارے محو خرام ہوں یا کہکشاں میں چاند روشن ہو تاریک ۔ دنیا فنا کے سیلاب میں غرق ہو جائے یا باقی رہے مجھے کوئی پروا نہیں ہے ۔"

دوسری طرف لطیف کہہ رہا تھا ۔
"" سنا تم نے منیر ۔ یہ خط پڑھا ۔ توبہ ہے ۔ منیر ۔ دیکھا تم نے !"

عابد

شاعر

خاک پر کھینچا گیا نقشِ طلسمِ رنگ و بو بند تھا سینے کی خلوت میں جمالِ آرزو
کیف کے نغموں سے تھا، محرومِ سازِ گفتگو بزم کو تھی اک دلِ رمز آشنا کی جستجو

حسن نے اسرار کے پردوں کو جنبش دی نہ تھی
جلوۂ خوابیدۂ ہستی نے کروٹ لی نہ تھی

پھول کے اوراق تھے نا آشنائے آب و رنگ خندہ اصنام سے تھی بیخبر ترکیبِ سنگ
رہنِ ترکش تھے جگر کو چھیدنے والے خدنگ گم دلوں کی وسعت خاموش میں تھی ہر اُمنگ

انگلیاں مطرب کی پیہم دوڑتی تھیں ساز پر
کچھ، مگر، خود رفتگی سی تھی نوائے راز پر

ناگہاں! امواجِ ناپیدا میں اک جنبش ہوئی کان میں فطرت کے نغموں کی صدا آنے لگی
مسکرا کر، رازِ دل کہنے لگی نورس کلی! پھول کے چہرے کی آب و تاب دونی ہو گئی

برق گزری خرمنِ غفلت سے لہراتی ہوئی
روح کو بیداریوں کا راز سمجھاتی ہوئی

خود بخود اٹھنے لگا روئے حقیقت سے نقاب ہو گئے خلوت سرائے حسن کے باطل حجاب
چھڑ گئے ہر سمت اٹھلاتی ہواؤں کے رباب دل میں گھر کرنے لگا سلمائے گیتی کا شباب

جلوۂ نو سے ہوئی ترتیبِ رنگِ صبح و شام
کر دیا آخر ادا، شاعر نے فطرت کا پیام

کون شاعر! جس نے پہچانا طلسم ہست و بود کون شاعر! جسکے منت کش ہیں اسبابِ نمود
کون شاعر! جس نے کھولے عقدۂ رازِ وجود کون شاعر! شمع بزمِ جلوہ آرائے شہود

جس کا سینہ مشتعل، سوزِ محبت کے لئے
جسکی نظریں مضطرب، اسرارِ فطرت کیلئے

جسکے ہر ذرّے میں ہے خورشیدِ عرفاں کی جھلک — جسکی ارضِ محترم سے جھک کے ملتا ہی فلک
دردِ عالم کا مداوا، جس کے سینے کی کھٹک — انجمن افروز، جس کے شعلۂ غم کی لپک

قصرِ باطن کو تجلّی زار کرنے کے لئے
داغ دل شاعر کے بڑھتے ہیں ابھرنے کیلئے

(غیر مطبوعہ)

تقدیسِ عزائم

میری تجویزِ وفا رکھیگی مجھ کو سُرخ رو — اس کی ترکیبِ جفا کا حوصلہ شرمائیگا
یوں سراپا مدّعائے حسن بنجاؤنگا میں — بارگاہِ عشق میں ہر مُدّعا شرمائیگا
توڑ دیگی میری فطرت رہنمائی کا غرور — میرے ذوقِ جستجو سے رہنما شرمائیگا

زندگی میری ہم آہنگِ بقا ہو جائے گی
یُوں جیُونگا! مجھ سے قانونِ فنا شرمائیگا

(غیر مطبوعہ) — وقار (انبالوی)

رباعیات

(۱)

ذی رُوح کا ہر نفس ہی تائیدِ حیات
فطرت کرتی ہے سبکو تاکیدِ حیات
ہے فکرِ حیات رونقِ بزمِ جہاں
عالم ہے حیات امید خورشیدِ حیات

رواں

(۲)

مایُوس ہوا غمِ نہانی ہم سے
اُٹھتا نہیں بارِ زندگانی ہم سے
کچھ ایسی ہی بات ہی کہ بیزار ہیں اب
ہم اپنی جوانی سے جوانی ہم سے

رواں

انعکاسِ حسّیات

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی سے تنہائی میں بلا قصد ایسی حرکات سرزد ہو جاتی ہیں جو اس کے تخیلات کا آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اگر وہ ایک خوش باش آدمی ہے۔ تو آہستہ آہستہ گنگنانے لگتا ہے یا اگر وہ کوئی قومی آدمی ہے تو اپنی نشست۔ اپنے اشارات اور اپنی نگاہوں میں ایسی کیفیات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے خیال میں زیادہ دلنشیں ہوں، جن سے خاص اثر پڑنے کی امید ہو اور جو جمہور کی نظروں میں اس کی محبت۔ منزلت اور احترام کو بڑھا سکیں۔ اگر اسے کسی بزم نشاط میں موسیقی کے اتار چڑھاؤ یہ کسی پیکرِ حسن کا رقص یاد آ گیا تو اپنے پاؤں سے خیالی نغموں کے زیر و بم کے ساتھ زمین پر تال دینا شروع کر دیتا ہے۔ ہاتھوں کو خاص انداز سے ہلاتا ہے اور کبھی کبھی وفور جذبات سے بیتاب ہو کر چٹکیاں بجانے لگتا ہے۔ یا زمین پر چھڑی سے خطوط کھینچنے شروع کر دیتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر بے ساختہ کرتا ہے اور اس کے عزم و شعور کو مطلق اس میں دخل نہیں ہوتا۔

مجھے ایک آسٹروی مصنف "اسٹرائیکر" کا موقعہ یاد آیا جس کا ماحصل یہ تھا کہ "جب آدمی کسی حرف تہجی کا تصوّر کرتا ہے۔ مثلاً وہ "لام" کی شکل پر غور کرتا ہے تو اس کا تصور ہونٹوں اور منہ کے عضلات کو متحرک کر دیتا ہے جس سے لازمی طور پر آواز پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے حرف "ل" اس وقت ہونٹوں کی حرکت کی ایک تصویر ہے جو آواز بن کر ظاہر ہوئی۔ یہ حرکت ایک حد تک آدمی کے ارادہ کے بغیر ہونٹوں پر رونما ہو جاتی ہے.........." ہم اس پر قیاس کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ جب آدمی کے دل میں "دوڑنے" کا خیال گزرتا ہے تو وہ پاؤں کے عضلات کو ایک خفیف سی حرکت دیتا ہے۔ اور جب وہ "خطابت" کا تصور کرتا ہے تو ہاتھ، چہرے، گردن اور آنکھوں کو خاص انداز سے جنبش دیتا ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر ایک حرکت کا تصور، خواہ وہ کسی حد تک کیوں نہ ہو۔ لازمی طور پر اس قسم کی حرکت پیدا کر دیتا ہے۔ بلکہ اس کا دارو مدار قوت تصور کی کمی بیشی ہے، یا زیادہ صاف لفظوں میں عضلات پر تخیلات کے انعکاس کی قوت پر! کیونکہ ان دونوں میں باہم گہرا علاقہ ہے۔ دوسرے درجہ میں "بالفعل حصول حرکت" کے ارادہ سے مقابلہ کی قوت پر منحصر ہے۔ اس لئے اگر تخیل ضعیف ہو، یا انعکاس مفقود ہو یا قوت مقابلہ غیر معمولی ہو تو عضلات پر تخیل کا کوئی نمایاں اثر محسوس نہیں ہوگا۔ لیکن جب تخیل کا انعکاس قوت کے ساتھ ہو اور وہ نفس پر چھا جائے ساتھ ہی قوت ارادی میں مقابلہ کی طاقت کافی نہ ہو تو عضلات میں نمایاں طور پر حرکت محسوس ہوگی۔

ہر شخص کو بلند آواز سے —— یا کم از کم ایسی آواز سے جو سنی جا سکے —— "سوچنے" کا تجربہ ہوا ہوگا۔ ہر ایک آدمی نے بارہا اپنے دل سے باتیں کی ہونگی کبھی انسان کے چہرے پر اس قسم کی حرکات نمایاں ہو جاتی ہیں جو اس کے تخیلات کی حقیقی ترجمانی کرتی ہیں۔ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو بآواز پڑھتے ہیں لیکن خیال یہی کرتے ہیں کہ وہ "دل میں" پڑھ رہے ہیں۔ دل میں پڑھنے کے ذکر سے میرا ذہن ایک نئے خیال کی جانب منتقل ہو گیا جب ہم "بغیر آواز" کے مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیوں میں سے ایک "آواز" پیدا ہو رہی ہے۔ ہم صاف طور پر اسے سنتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہماری ہی آواز ہے۔ اور ہماری قوت سامعہ ہمیں یقین دلاتی ہے کہ اس میں ہماری آواز کی تمام خصوصیات موجود ہیں —— بلکہ اس وقت جبکہ میں لکھ رہا ہوں جو لفظ میرے قلم سے نکلتا ہے میں اسے اپنی زبان سے —— یا کم از کم اپنے نفس کی آواز سے —— بولتا جاتا ہوں۔ اور اپنی اس "خاموش آواز" کے اتار چڑھاؤ کو صاف طور پر محسوس کر رہا ہوں۔ اگر یہ ممکن ہوتا کہ میں لکھتے وقت آئینہ دیکھ سکتا تو بلاشبہ میں اپنے آپ کو دیکھتا کہ گفتگو کرتے وقت آدمی جن جن حرکات و سکنات کا عادی ہے وہ سب ادا کر رہا ہوں۔ پیش نظر مفہوم کے مطابق نگاہیں بدل جاتی ہیں، پیشانی پر بل پڑ جاتے، سر کو جنبش ہوتی ہے اور

ہونٹ ہلنے لگتے ہیں۔ اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو ہر شخص اپنے اوپر بآسانی اس کا تجربہ کر سکتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم اپنے دوست کے ساتھ بیٹھے ہو۔ دونوں خاموش اپنے اپنے خیالات میں مستغرق ہیں۔ یکایک تمہارا دوست تم سے مخاطب ہو کر پوچھتا ہے "جی! کیا فرمایا؟" تم چونک پڑتے ہو۔ اور ہم نشین کو یقین دلاتے ہو۔ کہ تم نے اس سے کچھ نہیں کہا، شاید اسے شبہ ہو گیا ہے۔ غالباً اس نے کوئی دوسری آواز سنی ہوگی جسے وہ بے خبری میں تمہاری آواز سمجھا۔ حالانکہ تمہارے دوست کو حقیقتہً کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہوتی بلکہ اس کا دعوی بالکل واقعیت پر مبنی ہوتا ہے۔ دراصل تم ہی خطا کار ہوتے ہو اور تمہیں کو مغالطہ ہو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہوتا ہے کہ تم جس معاملہ کے متعلق سوچ رہے تھے یا جو تمہارے تخیل پر چھایا ہوا تھا اس نے تمہاری حسیات کو اپنے اندر جذب کر لیا اور اس کی قوت اس حد تک پہنچ گئی کہ بلا قصد تمہارے منہ سے چند لفظ نکل گئے جن کا تمہیں پتہ بھی نہیں چلا۔ اس حالت میں اگر تم سے حلف لیا جائے تو تم اپنے یقین و وثوق کی بنیاد پر قسم کھانے کے لئے بھی تیار ہو جاؤ گے حالانکہ درحقیقت تمہارے منہ سے وہ الفاظ ضرور نکلے ہونگے۔

اکثر وہی لوگ بآواز بلند اپنے دل سے باتیں کرتے ہیں اور گفتگو کے وقت اشاروں سے زیادہ کام لیتے ہیں جو دنیا اور اہل دنیا کو خاطر میں نہیں لاتے اور ان کی ستائش اور نکتہ چینی کی پروا نہیں کرتے۔ ان کے لئے یہ کافی ہوتا ہے کہ وہ اپنے عمل سے مطمئن ہیں، زندگی، اس کی مسرت اور محبت اور روحانیت کے ماحصل سے مستفید ہو سکتے ہیں، یا وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے رجحانات کو ضبط کرنے، اپنے جذبات پر قابو پانے، اور اپنے نفوس کا توازن قائم رکھنے کے عادی نہیں ہوتے یا ایسی قوم کے افراد ہوتے ہیں جو فطرتاً، یا ماحول سے متاثر ہو کر، یا دوسرے اسباب سے "شبابیت" میں ڈوبی ہوئی ہو۔ مثلاً ایک مسرور اور آزاد منش آدمی کی آواز میں کسی قدر جوش اور ہنگامہ، اور اس کی گفتگو میں اشارات و حرکات کی زیادتی پایا جانا ایک قدرتی امر ہے۔ اس کے برخلاف متین اور سنجیدہ آدمی میں یہ بات نہیں پائی جائیگی بعض لوگ معلم یا سیاسی یا کاروباری ہوتے ہیں اور ان کی مخصوص ضروریات مجبور کرتی ہیں کہ وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھیں اپنی خواہشات کو ضبط کریں، اپنے اعصاب کو کمزوری کے اظہار سے محفوظ رکھیں، اور اس بات کا خیال رکھیں کہ ان کی ظاہری حالت ان کے خلاف چغلی نہ کھائے۔ ناظرین کو مشاہدہ اور تجربہ سے محسوس ہوا ہوگا کہ لاطینی اقوام میں صرف "انگریز" کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ جب وہ کسی مجمع میں تقریر کرنے کھڑا ہوگا تو اس میں انتہا درجہ کا توازن اور وقار پایا جائیگا۔ اور وہ بہت کم اشارات و حرکات سے کام لے گا۔ اس کا یہ سبب نہیں ہے کہ انگریزوں میں احساس کی کمی ہوتی ہے یا دوسری اقوام ان کی بہ نسبت زیادہ آزاد خیال اور ذکی الحس ہیں۔ بلکہ درحقیقت وہ ابتدا ہی سے ضبط نفس کے عادی بنائے جاتے ہیں اور ان کی تربیت ——— وسیع ترین مفہوم اور اعلیٰ ترین معنی کے ساتھ ——— "آزادانہ" ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں آدمی کا اپنے دل سے باتیں کرنا یا اشارات و کنایات کی کثرت اس بات کی کھلی ہوئی علامت ہے کہ وہ ہر ایک تصور کے ساتھ بولتا بھی ضرور ہے اگرچہ اس کو محسوس نہ کیا جائے اور ذہن وہاں تک نہ پہنچے۔ ہمارے دل میں کوئی ایسا لفظ نہیں گزرتا جسے ہم ہونٹوں سے بولتے نہ ہوں اگرچہ ہمیں ان کی جنبش کا احساس نہ ہوتا ہو۔ اسی طرح کوئی حرکت ایسی نہیں ہے جس کا ہم تصور کرتے ہوں اور اس کے مخصوص عضلات اسے عملی جامہ نہ پہناتے ہوں۔ ہم صرف الفاظ اور ان کے ساتھ حرکت کی تصاویر کی مدد سے سوچتے ہیں۔ ہمارا ہر ایک خیال لفظ یا حرکت کی ایک تصویر بنا لیتا ہے۔ ہمارا اس کو محسوس نہ کرنا یہ معنے نہیں رکھتا کہ اس کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے۔ ہم زندگی کی گزرگاہ میں لوگوں کو متاثر کرتے ہیں اور ان سے متاثر ہوتے بھی ہیں۔ لیکن ہم اس کا ادراک نہیں کرتے۔ کیونکہ جس طرح وہ الفاظ جو دل میں گزرتے ہیں اپنی حرکت کے نقوش چھوڑ جاتے ہیں اسی طرح سنے ہوئے الفاظ سننے والے کے ذہن میں اپنی حرکت منتقل کر دیتے ہیں۔ اس نظریہ کا واضح ترین مظہر "بچے" کہے جا سکتے ہیں کیونکہ وہ تکوین کی حالت میں ہوتے ہیں اور ان کے مربی یا معلم گفتگو، اشارات، اور برتاؤ سے ان کی طبیعتوں کو جس سانچے میں ڈھالتے ہیں وہ فوراً اسی سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ "قومی خصوصیات" اور "روح عامہ" بچوں اور صرف بچوں کی بہترین تربیت پر منحصر ہیں۔

"قومی خصوصیات" اور "روح عامہ" ایسے الفاظ ہیں جن کے مفہوم و معنی کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں ہے۔ بہر صورت ان میں کچھ اس قسم کا ابہام اور پوشیدگی ضرور ہے جس کی وجہ سے ان کے معنوں

کا انضباط اور ان کے مفاہیم کی حد بندی دشوار ہوگئی ہے - قومی خصوصیات زمانہ اور سماج کے نفسی تاثرات کی تبدیلی کے ساتھ بدل جایا کرتی ہیں - رائے عامہ کسی وقت ایک حالت پر قائم نہیں رہتی اور اس کے حلقہ اقتدار میں حقیقتہً کبھی عمومیت اور ہمہ گیری پیدا نہیں ہوتی - بلکہ در اصل جو قوتیں اسے متاثر کر سکتی ہیں وہ انہی کے رنگ میں رنگ جاتی ہے - زیادہ صاف لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اس کا دارومدار رہنماؤں کے میلان طبع پر ہے اور ہر قوم کے رجحانات فی الحقیقت اس کے رہنماؤں کے رجحانات کا چربہ ہوتے ہیں - وہ جس طرف چاہتے ہیں رائے عامہ کا رخ پھیر دیتے ہیں - اور پوری قوم کو اپنی ذہنیت کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں - اگر وہ بلند نظری اور ایثار میں ممتاز ہیں تو پوری قوم کی یہی حالت ہو جائیگی اور اگر وہ جنگجو اور تیز مزاج ہیں، تو قوم کی ذہنیت بھی رفتہ رفتہ اسی مرکز پر آجائیگی - کیونکہ قوم رجحانات، جذبات، اور تخیلات اپنے قائدین سے مستعار لیتی ہے جو اسے متاثر کرتے اور اس کی آراء و افکار میں انقلاب پیدا کر دیتے ہیں - دو قوموں میں صرف اسقدر فرق ہوتا ہے کہ ایک زیادہ ذکی الحس اور ذہین ہوتی ہے - اس لئے وہ جو اثر قبول کرتی ہے اس میں شدت اور قوت پائی جاتی ہے، اور دوسری ان اثرات سے خالی ہوتی ہے - یہ فرق کیفیت میں نہیں ہوتا بلکہ صرف کمیت و مقدار میں ہوتا ہے - اس کی وہی نوعیت ہوتی ہے جو موٹر اور تانگہ یا دخانی جہاز اور بادبانی کشتی کے فرق کی ہوتی ہے - سکندر مقدونی اگر وسط افریقہ کے سیاہ فام باشندوں میں پیدا ہوتا تو ان کی بھی اسی طرح رہنمائی کرتا جس طرح اس نے اپنی قوم کی رہنمائی کی - لیکن وہ قدرتی طور پر ان کے ذریعہ سے ایسی فتوحات حاصل نہیں کر سکتا تھا - جیسی اس نے رومیوں کے ذریعہ سے حاصل کیں کیونکہ اہل افریقہ کے نفوس میں جو قوت پنہاں ہے اور جس کا ابھارنا ممکن ہے وہ اتنی مقدار میں نہیں ہے جو اس مقصد عظیم کے لئے کافی ہو رہنما کی ایسی مثال ہے جیسے "مقناطیس" جو لوہے کے برادہ کو کھینچ کر اکھٹا کر لیتا ہے - برادہ بھی "لوہا" ہے اور مقناطیس بھی "لوہا" ہے - فرق صرف یہ ہے کہ اس میں قوت کشش پائی جاتی ہے اور وہ اس سے محروم ہے سونے کے برادے کا ڈھیر لگا دو اور مقناطیس کو اس سے متصل کر دو تو ایک ذرہ بھی اس کی جانب کھنچ کر نہیں جائیگا - اسی طرح رہنما کے لئے یہ امر قابل تعریف نہیں ہو سکتا کہ وہ لوگوں کی عام سطح سے بالاتر ہے - ان کی وضع کے خلاف کسی دوسری قماش کا انسان ہے، یا ان کی فطرت سے جداگانہ کسی فطرت کا مالک ہے خواہ وہ بلند ترین فطرت ہی کیوں نہ ہو - بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان سے نزدیک تر ہو، ان سے کامل مشابہت رکھتا ہو، اور ان کی سطح سے بالکل قریب ہو - ان سے باہمی سمجھوتہ کر سکے اور انہیں یہ سمجھا سکے کہ اس میں اور ان میں کوئی غیریت نہیں ہے - ان سے اتنا بلند تر نہ ہو کہ وہ اس تک رسائی ناممکن سمجھیں اور فیضان کا سلسلہ ضعیف ہو کر فنا ہو جائے -

حسیات و تخیلات کے اظہار کے لئے "الفاظ" سب سے بڑا ذریعہ ہیں - کثرت استعمال سے لوگوں کے ذہنوں میں ہر لفظ کے معنے منقوش ہو گئے ہیں - اور ان سے مخصوص معنے مراد لینے کی عادت سی ہو گئی ہے - اس لئے آدمی اظہار رائے کی غرض سے جو الفاظ چاہتا ہے اگر وہ اپنے مقررہ معانی کو بتاتے ہیں اور مانوس اغراض کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں تو مفہوم کو عام لوگوں کے ذہن فوراً قبول کر لیں گے - کیونکہ لفظوں کے سمجھنے کی عادت ہر قسم کی مغائرت اور مشکلات پر غالب آجاتی ہے - یہی وجہ ہے "روزانہ" اخبارات حسب منشاء رائے عامہ پیدا کرنے کے لئے بہترین ذریعہ سمجھے جاتے ہیں - اس لئے کہ ان کی روزانہ اشاعت کی وجہ سے ارباب تحریر کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ دقیق مباحث، موشگافی؛ اور جدت معانی کے درپے ہوں - لہٰذا ان کے ناظرین بآسانی ان کے خیالات سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں - بغیر دشواری کے مفہوم سمجھ لیتے ہیں - اور بلاتکلف ان سے متاثر ہو جاتے ہیں - کیونکہ ان کا سہولت سے ذہن نشین ہو جانا اور عقل کی گہرائیوں تک پہنچ جانا دماغ پر کوئی بار نہیں پڑنے دیتا اور وہ خیالات میں گھل مل کر اپنا کام کر جاتے ہیں - چونکہ اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اور ذہن میں پہلے سے جو معلومات موجود ہیں ان سے تصادم نہیں ہوتا اس لئے پڑھنے والا غور و فکر کی جانب مائل نہیں ہوتا اور اس کا شعور مقابلہ اور مناقشہ کے جذبات کو متحرک نہیں کرتا جس طرح ہر جدت پر ان میں برانگیختگی اور شورش پیدا ہو جاتی ہے -

جمہور عام طور پر سطحی دل و دماغ رکھتے ہیں - اور طبیعت جیسا کہ معلوم ہے آسان ترین راستہ اختیار کرتی ہے - بارش [illegible] پانی جب پہاڑ سے چلتا ہے تو سیدھا میدانی نرم زمینوں [illegible] کا رخ کرتا ہے - جب تک اسے نرم زمین اور ایسی مٹی میں راستہ مل سکتا ہے جس میں وہ بآسانی اپنی گزرگاہ بنا لے، وہ کبھی بلند چٹانوں اور

اونچے ٹیلوں پر چڑھنا نہیں چاہتا۔ جب اس کے راستہ میں کوئی پتھر حائل ہو جاتا ہے تو وہ بجکر اس کے اوپر ادھر سے نکل جاتا ہے اور نرم زمین راستہ پیدا کرنے کو چٹانوں کے چیرنے یا ان کے اوپر سے گزرنے پر ترجیح دیتا ہے ــــــ اسی طرح انسان تھکا دینے والے امور سے روگردانی کرکے ایسے امور کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے جو تھکا دینے والے نہ ہوں۔ یا زیادہ صحیح لفظوں میں یوں کہئے کہ ان باتوں کو اختیار کرتا ہے جس میں اسے کم کوشش کرنی پڑے جس لکھنے والے کو کافی وقت اور غور وفکر کی فرصت میسر ہوگی وہ زیادہ باریک نکات کی تشریح کریگا، بہت گہرے معنوں سے بحث کرے گا کبھی کبھی الفاظ کو بالکل نئے معنے پہنا دیگا، ان کے مشہور معنوں میں تحدید یا توسیع کر دیگا۔ یا ان میں نئے انداز سے اس طرح امتزاج پیدا کر دیگا جس سے غور کرنے والا ایک "اچھوتے تخیل" تک پہنچ جائے۔ لیکن "غور" تھکا دیتا ہے۔ سوچ بچار مشقت کا دوسرا نام ہے، اور ایسے مباحث سے دوچار ہونا جن کی طرف ذہن فوراً منتقل نہ ہو سکے بہت دشوار کام ہے۔ اس لئے زیادہ سہل طریقہ یہ ہے کہ ناظرین ــــــ سب ناظرین نہیں بلکہ عام ناظرین ــــــ ایسے مصنفین کی جانب متوجہ ہوں جو اپنے الفاظ کو بلا ضرورت نئے نئے معانی سے گرانبار نہ کرتے ہوں، انہیں اسقدر نہ پھیلاتے ہوں کہ طبیعت پر گراں گزریں، اور ذہن کو تدبر واستنباط کی تکلیف نہ دیتے ہوں یہی سبب ہے کہ وقفہ سے شائع ہونیوالی صحافت ــــــ مثلاً ماہوار رسائل ــــــ کی اشاعت زیادہ نہیں ہوتی اور اسی وجہ سے روزانہ اخبارات کے مقابلہ میں اس کی تاثیر کم ہوتی ہے۔ البتہ وہ صحافت اس سے مستثنیٰ ہے جس کے ارباب تحریر مانوس زبان اور عام فہم مفید مباحث کا التزام رکھتے ہیں۔

جمہور سے بعید تر، ان پر سب سے کم اثر ڈالنے والا، اور ان کو سب سے تھوڑا فائدہ پہنچانے والا "ارباب فکر" کا طبقہ ہے۔ کیونکہ وہ عوام کے نفوس اور خیالات سے بہت دور ہوتے ہیں۔ اور اس لئے ان کی سطح سے بلند تر ہو جاتے ہیں۔

پس، عام لوگوں سے ان کی دوری عام لوگوں میں ان کے اثرات کو فنا کر دیتی ہے۔ مقناطیس لوہے کے برادے کو کھینچتا ہے۔ لیکن ایک خاص مسافت تک! جسقدر مسافت میں زیادتی ہوتی جاتی ہے اسی قدر قوت جاذبہ کمزور ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا حلقۂ کشش ختم ہونے پر برادہ منتشر اور بکھرا ہوا پڑا رہتا ہے۔ اس کا ایک ذرہ بھی مقناطیس کی طرف جنبش نہیں کرتا، نہ متوجہ ہوتا، نہ جمع ہوتا ہے۔ ہمیشہ سے سمجھنے سمجھانے کا بہترین ذریعہ "الفاظ" قرار دئے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں میں قدرتاً یہ مادہ ہوتا ہے کہ الفاظ کو عوام کی "مانوسیت" سے زیادہ وزنی کر دیتے ہیں، اور یہی مادہ ان میں اور عوام میں باہمی دوری کو بڑھا دیتا ہے۔ دوسری طرف چند ایسے لوگ ہوتے ہیں جو لوگوں کی توقعات سے زیادہ وزنی الفاظ استعمال نہیں کرتے، اور ان کی یہ عادت نزدیکی، سمجھوتہ، اور تاثیر و تاثر کو آسان بنا دیتی ہے۔

یہ معروضات سب سے زیادہ ان حضرات کی توجہ کی محتاج ہیں جو غیر ملکی زبانوں کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کے مؤید ہیں۔ کم از کم عملاً وہ اس طریقہ تعلیم کی حمایت کرتے ہیں۔ کیونکہ اصولاً تو ہر شخص تقریباً یہی کہیگا کہ ملکی زبان کے ذریعہ سے تعلیم ہونی چاہئے۔ لیکن کیا میں سوال کر سکتا ہوں کہ ان میں کتنے ایسے بزرگ ہیں جنہوں نے عملاً ہندوستان کے اس مہلک طریقۃ التعلیم کی مضرتیں کم کرنے میں کوئی حصہ لیا؟

جن بزرگوں نے ابتدا میں اس طریقہ تعلیم کو رواج دیا بلا شک وشبہ ان کی نیت نیک اور ان کا مطمح نظر پاکیزہ، مقدس، اور بلند تھا۔ ان کے پیش نظر دو عظیم الشان مقاصد تھے:۔

(۱) ہندوستان کی حکمران طاقت کی زبان سے واقفیت، تاکہ اس کے اصول، اس کے قوانین، اس کے آئین حکمرانی، اور سیاسی واقتصادی تغیرات سے قوم باخبر رہے۔ نیز سرکاری ملازمتوں اور اعلیٰ عہدوں میں زیادہ سے زیادہ ہندوستانی داخل ہو سکیں۔

(۲) مغرب نے علمی اور مادی حیثیت سے جو نمایاں ترقی کی ہے اس سے واقفیت اور فائدہ حاصل کرنا نیز مغربی زبانوں سے علوم وفنون کے ذخیرے ترجمہ اور اقتباس کے ذریعہ سے بتدریج دیسی زبانوں میں منتقل کرنا۔

یہ دو مقصد ہیں جو بجائے خود نہایت اہم اور قابل قدر ہیں، اور آج بھی اتنا طویل زمانہ گزر جانے کے باوجود ان پر کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہو سکا۔ مغربی زبانوں کو مستقل طور سے ذریعہ تعلیم قرار دیدینا نہ جب مقصود تھا نہ اب ہو سکتا۔ اور اگر جب بعض ناگزیر

وجوہ اور دیسی زبانوں کی ناداری کی بنا پر بدیشی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیدیا گیا تھا تو اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اب بھی، جبکہ خدا کے فضل سے ہماری اپنی زبانیں اس تشنگی کو بجھا سکتی ہیں - اس قدیم طریقہ کو زیادہ دیر تک قائم رکھا جانا جائز قرار دیا جائے -

بچوں کی حالت پگھلی ہوئی چاندی جیسی ہوتی ہے - انہیں جس سانچے میں ڈھال دیا جائیگا وہ اسی کی صورت قبول کریں گے - اور ایک مرتبہ استحکام کے ساتھ کسی صورت کو قبول کر لینے کے بعد آئندہ کے لئے اس میں تغیر تبدیل کا بہت کم امکان باقی رہتا ہے - اس لئے جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو کر ہمارے نوجوان ایک بالکل "نرالی مخلوق" بن جاتے ہیں جو عموماً اپنے ماحول سے نامانوس اور عوام کی نفسیات سے ایک حد تک بیخبر ہوتے ہیں اور اگر ما خبر بھی ہوں تو ان کو جو تعلیم دی گئی ہے اس کا مقتضا یہ ہے کہ وہ ایک "ما فوق الفطرت" ہستی بن کر رہ جائیں اور عوام کے جذبات کی حقیقی رہنمائی نہ کر سکیں -

بدیشی زبانوں کے ذریعہ سے تعلیم نوجوانوں کے لئے ناقابل برداشت بوجھ ہے جسکی لعنتوں سے جتنی جلد ہو سکے ملک کو پاک کر دینا چاہئے - دیسی زبانوں میں علوم و فنون کا کافی ذخیرہ نہ ہونے کا عذر میری نظر میں اب کوئی معقول اور وقیع عذر نہیں ہے - "جامعہ عثمانیہ" کی زندہ اور کامیاب مثال ہمارے سامنے موجود ہے - اور ان لوگوں کے لئے سرمایہ بصیرت بن سکتی ہے جو اس قسم کے لیچ عذرات کی آڑ میں نوجوان نسل کی دماغی اور عملی قانون کو دانستہ یا نادانستہ پامال کر رہے ہیں - البتہ کوشش اور مستقل مزاجی شرط ہے جس کے بعد کوئی مشکل مشکل نہیں رہتی -

تعلیم کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ قوم کا افلاس کم ہو - لیکن تعلیمی اوسط کی افسوسناک کمی کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جگہ "تعلیمیافتہ بیکاروں" کی ایک فوج موجود ہے تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ موجودہ طرز تعلیم میں کتنا عظیم الشان نقص موجود ہے جو بجائے ذہنی و عملی بیداری پیدا کرنے کے صرف "کلرک" پیدا کر سکتی ہے - اس ذہنی و عملی پژمردگی کا سبب صرف یہ ہے کہ طالب علم اپنی تمام قوتیں نامانوس زبان کے رٹنے میں صرف کر دیتا ہے اور جب وہ فارغ التحصیل ہو کر نکلتا ہے تو بجائے نشاط، جذبہ عمل، اور بلند نظری کے اس پر افسردگی، اضمحلال، بے عملی، مایوسی، اور جمود کے عناصر غالب آچکے ہوتے ہیں -

منظور سروش (بھوپالی)

دامنِ کہسار سے رقصاں چلی اک جوئے آب
جستجوئے منزلِ مقصود میں پا در رکاب

عزمِ راسخ جسکی سیرت سعئ پیہم جس کی خو
بیقراری جسکی طینت جسکی فطرت پیچ و تاب

دید کے قابل جنونِ شوق کی وارفتگی
چند قطروں کی جماعت اور جہانِ اضطراب

جھوم کر منبع سے نکلی ایسی لہرائی ہوئی
پی کے میخانہ سے نکلے جسطرح رندِ خراب

اک دلکش زمزمہ پیدا خرامِ شوق سے
جسکی موسیقی پہ صدقے نغمۂ چنگ و رباب

جیسے پائے شوق میں چھالے پڑیں اور پھول جائیں
ٹوٹتے رہتے ہیں یوں ہی راہ میں کتنے حباب

(معارف) اقبال احمد سہیل

لعنتِ جنگ

آفتاب غروب ہو رہا تھا، پرندے قطار در قطار آبادی سے اپنے آشیانوں کی طرف اڑے جا رہے تھے اور دن بھر کے تھکے ماندے کاشتکار اپنے بیلوں کو ہنکاتے ہوئے کھیتوں سے گاؤں کی طرف واپس آ رہے تھے۔

موسیو جان مورو، اس کی حسین و جمیل، سنہری بالوں والی بیٹی مونا، اس کا جوان رعنا بیٹا اندور بھی دن بھر کی مسلسل محنت کے بعد چور چور ہو گئے تھے اور میٹھی نیند سے اپنی جان توڑ محنت کی تلخی دور کرنے کے لئے اپنی جھونپڑی کی طرف جانے کا ارادہ کر رہے تھے

خاموش فضا گرجا کے گھنٹوں سے گونجنے لگی۔ مونا نے حیرت کے ساتھ کہا:۔

"گاؤں کے گرجا میں یہ بے وقت گھنٹے کیسے بج رہے ہیں۔ یہ تو نماز کا وقت بھی نہیں ہے!"

ایک غیر معلوم کشش تینوں کو اس بڑی سڑک پر کھینچ کر لے گئی جو گاؤں کے پاس سے ہو کر گزرتی تھی۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ ایک چھکڑے پر جس پر دودھ کے پیپے لادے جاتے ہیں ایک بڑا سا نقارہ رکھا ہوا ہے۔ اور گاڑیبان اس پر چوب مار رہا ہے۔

موسیو جان کے سوا ان تینوں میں سے کوئی بھی نقارہ کے پیغام کو نہ سمجھ سکا۔ ہاں موسیو جان فوراً سمجھ گیا کہ یہ اعلان جنگ ہے۔ آج سے چالیس برس پہلے موسیو جان کی یاد میں ایک دفعہ اور بھی زبانِ طبل یہ پیغام سنا چکی تھی۔ لیکن ان بہن بھائیوں نے بھی نقارہ کا راز جلد ہی معلوم کر لیا۔ گاڑی کے پیچھے لڑکوں کی فوج کی فوج چیختی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ "لڑائی! لڑائی!!"

ایک بڑا لڑکا غول میں سے نکل کر اندور کے پاس آیا اور کہا:۔

"اندور، ہم میدانِ جنگ میں پہلی صف میں لڑیں گے۔ اس مرتبہ ہم سور کے بچوں کو دنیا سے مٹا دیں گے۔ ہاں ہاں اس مرتبہ ہم اپنے باپ داداؤں کے خون کا بدلہ لیں گے۔"

مونا نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا:۔

"افسوس اگر آج کو میں بھی مرد ہوتی تو ان وحشیوں کو قتل کر کے ان کے خون سے اپنی پیاس بجھاتی!"

موسیو جان نے گنگنا کر کہا:۔

"مونا تو بڑے سخت دل کی ہے۔"

"ابا جان کیوں؟ کیا آپ کو ان وحشی جرمنوں سے نفرت نہیں ہے؟"

"ہے۔ لیکن ان سے زیادہ مجھے لڑائی سے نفرت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جو شخص لڑائی کے میدان میں جا چکا ہے۔ کچھ وہی اچھی طرح جان سکتا ہے کہ لڑائی میں کیسے کیسے افعال شنیعہ کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔ ہری بھری کھیتیوں کو اجاڑ کر غریب کاشتکاروں کی آرزوؤں کو پامال کیا جاتا ہے۔ نوجوان بچوں کے گلوں پر چھری پھیر کر ان کے ضعیف والدین کی حسرتوں کا خون کیا جاتا ہے۔ کیا یہ انسانیت کی باتیں ہیں؟"

مونا نے چیخ کر کہا:۔ "کچھ ہی سہی مجھے تو ان جرمنوں سے عداوت ہے۔ بلکہ نفرت ہے!"

اندور نے بھی مونا کی تائید کی۔

(۲)

چند روز بعد گاؤں کا نقشہ ہی بدل گیا۔ جہاں کبھی انسانوں کی چہل پہل تھی وہاں آج الّو بول رہا تھا۔ نوجوان سب لڑائی پر چلے گئے تھے۔ اور گاؤں میں سوائے عورتوں اور ضعیف العمر مردوں کے اور کوئی نظر نہ آتا تھا۔ لڑائی شروع ہوئے کئی ہفتے ہو گئے تھے۔ گاؤں میں روزانہ میدان جنگ سے خبریں آتی تھیں لیکن یہ خبریں جنگ کے متعلق کسی صحیح نتیجہ پر پہنچانے والی نہ تھیں۔ اگر ایک دن فرانسیسی جرمنوں کو شکست دیدیتے تھے تو دوسرے دن جرمن فرانسیسیوں سے پورا پورا انتقام لے لیتے تھے۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا لیکن کچھ عرصہ بعد گاؤں کے ہر شخص پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اب جرمنی کا پلہ بھاری ہے اور وہ آہستہ آہستہ فرانس کی حدود میں بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اور اگر اس کی پیش قدمی کی یہی رفتار رہی تو ایک مہینہ کے اندر اندر جنگ کا فیصلہ جرمنی کے حق میں ہو جائے گا۔ اس روح فرسا حقیقت کے انکشاف سے ان کے چہرے زرد پڑ گئے۔ ان کے دل

بیٹھ گئے اور صبر کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اندرو نے میدانِ جنگ سے دو خط اپنے گھر بھیجے۔ لیکن وہ زیادہ تر خانگی امور سے متعلق تھے اور ان میں میدانِ جنگ کا تذکرہ محض اجمالی تھا۔

اسی دوران میں ایک روز موسیو جان کے پاس ایک فوجی سپاہی آیا۔ اس نے کہا کہ حکومت کو جرمن قیدیوں کے واسطے قید خانہ بنانے کے لئے اس کے چند کھیت درکار ہیں چنانچہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے عنقریب اس کی کھیتی کا ایک حصہ کاٹ ڈالا جائیگا۔

مونا کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں اور اس نے چیخ کر کہا: "ہرگز نہیں ہم ان ظالموں کو اپنی زمین میں پناہ نہیں دے سکتے۔ جو ہمارے عزیزوں کے گلوں پر چھری پھیر رہے ہیں۔"

بوڑھے موسیو نے آہستہ سے کہا۔ "بیٹی تو ابھی ناسمجھ ہے۔ دیکھ یہ لڑائی کا معاملہ ہے، ہمیں چاروناچار اس حکم کی تعمیل کرنی پڑے گی۔"

دوسرے ہی دن کھیت کاٹ کر قید خانہ بنا دیا گیا اور اسے چاروں طرف خاردار تار لگا کر محفوظ کر دیا گیا۔ موسیو جان مورو کے اس ایثار کے صلہ میں چار قیدی اس کے سپرد کر دئے گئے تاکہ وہ کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹائیں۔ قیدیوں کو سپرد کرتے وقت انسپکٹر نے مونا کو ان کے نام بتانے چاہے۔ لیکن مونا نے یہ کہکر اسے خاموش کر دیا کہ ہمیں ان کے نام معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم انہیں سب کو سور کے نام سے پکارا کریں گے۔

ایک نوعمر حسین قیدی نے جس کے چہرہ سے رعب و جلال ٹپک رہا تھا مونا سے فصیح فرانسیسی زبان میں کہا: "مس صاحبہ ہم سور نہیں ہیں۔ ہمارے ماں باپ بھی انسان ہیں۔"

انسپکٹر نے بات کاٹ کر کہا: "اس قیدی کا نام اوسکار جانس ہے۔ یہ بہت اچھی فرانسیسی بولتا ہے۔ اس کی وساطت سے آپ دوسرے قیدیوں تک اپنے احکام پہنچا سکتی ہیں۔"

(۳)

ایک دن شام کے وقت مونا اپنے کھیت میں لکڑیاں چگ رہی تھی کہ قید خانہ کا ایک نوجوان سپاہی اس کے پاس آیا۔ یہ سپاہی اس سے پہلے بھی کئی دفعہ کھیت کا چکر لگاتا ہوا دیکھا گیا تھا۔ وہ کئی بار ارادہ کر چکا تھا۔ کہ مونا سے اظہار محبت کی طرح ڈالے جو اس سے طبعاً متنفر تھی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوا تھا۔ آج اس نے ہمت کر کے مونا سے کہا: "حسین لڑکی، تجھے اتنی محنت کرتے دیکھ کر میرا دل کڑھتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ چند اور قیدی تیرے سپرد کر دوں تاکہ تو اس مصیبت سے نجات پائے۔"

"جناب، اس مصیبت میں اور بھی بہت سی عورتیں گرفتار ہیں۔ بعض ان میں سے مجھ سے بھی زیادہ محنت کرتی ہیں اور وہ مجھ سے زیادہ آپ کی توجہ کی مستحق ہیں۔ براہ عنایت پہلے ان کی خبر لیجئے مجھے تو یہی چار قیدی کافی ہیں۔"

"حسین لڑکی، مگر ان میں تجھ جیسی خوبصورت اور نازک بدن تو نہیں ہے۔ میری پیاری کیا میں تیری تکلیفوں کو کچھ کم کر سکتا ہوں؟ خدا کی قسم مجھے اس کا معاوضہ بھی نہیں چاہیے۔ ہاں ایک چیز تیری نظرِ عنایت۔"

مونا نے کڑک کر جواب دیا۔ جناب میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ کہ میں آپ کی فضول تعریفیں سنوں اور اگر وقت ہو بھی تو میں سننا نہیں چاہتی۔ آپ کی خیریت اسی میں ہے کہ آپ فوراً میرے سامنے سے دفع ہو جائیں۔"

"اوہو ایسی تنک مزاجی! آپ کی تعریف جو کر دی تو آپ سر پر ہی چڑھ گئیں۔ میں بھی تو آپ کہیں کی نواب زادی کہ سوائے نوابوں کے کسی سے گفتگو کرنا بھی پسند نہیں فرماتیں۔"

یہ کہہ کر سپاہی اپنے گھوڑے سے کود پڑا۔ اور بداخلاقی سے کام لینا چاہا۔ مونا چیخنے لگی۔ اوسکار قریب ہی کھیت میں کام کر رہا تھا۔ چیخنے کی آواز سن کر وہ فوراً دوڑا ہوا آیا۔ اسے مدد کے لئے آتے دیکھکر سپاہی نے اپنی تلوار کو بے نیام کرنا چاہا مگر اس سے پہلے کہ وہ ایسا کرے اوسکار نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور اسے زمین پر دے مارا۔ مغلوب ہو کر سپاہی نے مدد کے لئے شور مچانا شروع کیا۔ دو سپاہی اس کی آواز سن کر بھاگتے ہوئے آئے۔ اس نے انہیں حکم دیا کہ اس قیدی کو قبضہ میں کر لو۔ اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔

دونوں سپاہی اوسکار کو گرفتار کر کے لے گئے۔ مونا خاموش کھڑی ہوئی سب کچھ دیکھتی رہی مگر اس نے ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہیں نکالا۔ اس لئے کہ اصل حقیقت کو بے نقاب کرنے میں اس کی اپنی بدنامی ہے۔

(۴)

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، ماہتاب مسکرا رہا تھا۔ لیکن مہ جبین مونا

پیکرِ غم بنی ہوئی بستر پر مضطربانہ کروٹیں بدل رہی تھی۔ اوسکار کی وفا شعاری کا جادو اس پر چل گیا تھا۔ بغض و عداوت کے شرارے اب بجھ چکے تھے۔ اور دریائے محبت اس کے دل میں لہریں مار رہا تھا۔ اوسکار کی تصویر اس کی آنکھوں میں پھر رہی تھی اور وہ تصور ہی تصور میں اسے سجدے کر رہی تھی۔ جب مونا اس امر کا تصور کرتی تھی کہ اگر اوسکار اس کی مدد کے لئے موقعہ پر نہ پہنچ جاتا تو کیا ہوتا تو وہ خوف سے کانپ اٹھتی تھی۔ اس کے دل پر اس بات کا بڑا اثر تھا کہ اوسکار نے تین مہینے کی قید سخت منظور کی۔ لیکن اس بات کو گوارا نہ کیا کہ وہ صفائی پیش کرے اور بھری عدالت میں مونا کی رسوائی ہو۔ لیکن اب اسے یہ فکر اس بات کا تھا کہ کہیں اس تین مہینے کی جدائی میں وہ اسے بھول نہ جائے۔ اللہ اللہ انسان بھی محبت کے آگے کسقدر عاجز ہوجاتا ہے۔ جب سے اس نے یہ محسوس کیا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ دل و جان سے محبت کرتی ہے۔ بلکہ اسے پوجتی ہے۔ اسے اسی قسم کے توہمات ہر وقت پریشان کئے رکھتے تھے۔

تین مہینے گزر گئے۔ اوسکار کھیت میں کام کرنے کے لئے پھر آیا۔ دن بھر کام کاج میں مصروف رہنے کے بعد وہ شام کو مونا کے پاس جھونپڑی میں گیا۔ اس کے چاند سے مکھڑے پر رنج و غم کے بادل چھا رہے تھے۔ مونا نے پوچھا "کیوں اوسکار، کیا بات ہے؟"

"میرے پیچھے ایک سپاہی نے میری چھوٹی بہن کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مونا مجھے اس کا بڑا رنج ہے۔ میں اپنا غم غلط کرنے کے لئے تمہارے پاس آیا ہوں۔ کیونکہ یہاں تمہارے سوا اور میرا ہے ہی کون؟"

تھوڑی دیر تک دونوں ایک دوسرے کو خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہے۔ آخر کار اس طلسم سکوت کو مونا کی ایک چیخ نے توڑا۔ "آہ اوسکار!"

مونا نے یہ کہا اور اوسکار کی طرف بڑھی۔ اوسکار نے اس کے قدموں پر اپنا سر رکھدیا۔ دروازہ کھلا اور موسیو جان لاٹھی ٹیکتا ہوا اندر داخل ہوا مگر یہ ایسے مدہوش تھے کہ انہیں خبر بھی نہ ہوئی۔ اس نے کڑک کر کہا "مونا!"

اوسکار کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ مفلوج ہوگیا ہے۔ وہ علیحدہ ہوکر مبہوت کھڑا ہوگیا۔ مونا نے گھبرا کر نظر اٹھائی تو اپنے باپ کو سامنے کھڑا پایا۔ وہ غصہ سے کانپ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آگ کی چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔ مونا! خونخوار جرمنوں کی گولیاں تیرے حقیقی بھائی کے جگر میں پیوست ہوں اور وہ تڑپ تڑپ کر دامنِ لحد کی زینت بن جائے اور تو، ملعون شقی تو، ایک جرمن کے ساتھ یوں باتیں کرے۔ آہ میری بدبختی! اے میرے خدا! میں آج کے دن کو کیوں زندہ رہا۔" یہ کہتے کہتے موسیو جان غش کھا کر گر پڑا۔ مونا اچھل کر اپنے باپ سے لپٹ گئی مگر وہ سرد ہوچکا تھا۔

(۵)

موسیو جان مر گیا اور مونا کو تمام تکلیفیں برداشت کرنے کے لئے تنہا چھوڑ گیا۔ اگرچہ اوسکار کی ہم آغوشی کا راز اس کے ساتھ ہی اس کی قبر میں دفن ہوگیا تھا مگر پھر بھی گاؤں والے مونا کے طرز عمل کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انہیں جرمن سپاہی سے اس کا یہ اختلاط ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔

ایک دن گاؤں کا زمیندار مونا کے پاس آیا اور اسے شادی کا پیغام دیا۔ یہ شخص بدصورت اور بخیل تھا۔ مونا نے اسے کورا جواب دیدیا۔ زمیندار اس ذلت آمیز سلوک سے جل کر خاک ہوگیا۔ اور اس نے سارے گاؤں میں مونا کے خلاف نفرت کی آگ سلگا دی۔

عرصہ دراز تک کشت و خون کا بازار گرم رہنے کے بعد لڑائی ختم ہوگئی۔ قیدی رہا کر دئے گئے۔ اوسکار کا جسم بھی آزاد کر دیا گیا مگر اس کا دل بدستور قید تھا۔ چنانچہ وہ اب بھی بطور مہمان کے مونا کے ہاں مقیم تھا۔

ایک دن اس نے مونا سے کہا "مونا، میں نے دفتر کمشنری پیرس میں نوکری کے لئے درخواست دیدی ہے۔"

مونا نے جواب دیا "تم نے اچھا کیا اوسکار، اگر تمہارا تقرر ہو گیا تو میں تمہارے ساتھ شادی کرلونگی اور تمہارے ساتھ تمہارے ملک کو چلی جاؤنگی۔ ان آئے دن کے جھگڑوں سے تو پیچھا چھوٹیگا۔"

تین روز کے بعد درخواست کا جواب آگیا جواب یہ تھا کہ فرانسیسی حدود سلطنت میں کسی جرمن کا ملازم رکھنا غیر ممکن ہے۔

اوسکار نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا "میں تو سمجھتا تھا کہ جرمنوں اور فرانسیسیوں کی لڑائی ختم ہوگئی ہے۔"

مونا نے کہا، "افسوس! اب تک لڑائیوں سے پیٹ نہیں بھرا۔ اگر آپس کی نفرت و عداوت کا یہی حال ہے تو یہ جذبات نفرت ایک دن پھر کشت و خون کا بازار گرم کرکے رہیں گے۔"

"مگر مونا جرمن ایسے کینہ ور نہیں ہیں۔ اگر تم میرے ساتھ جرمنی

چلی چلو تو تمہیں میرے دعوے کی صحت میں شبہ نہ رہے - میری بوڑھی ماں تمہارے ساتھ اپنی بیٹیوں کی طرح محبت کریگی - مگر تم جانے کیوں لگی ہو؟"

جانے کو تو میں تیار ہوں مگر مجھے اندیشہ ہے کہ وہ کبھی مجھ سے کچھ اچھی طرح پیش نہ آسکیں گی - اوسکار نے کہا" نہیں تم اس کی عادت سے واقف نہیں ہو - وہ بہت خوش اخلاق اور سنجیدہ عورت ہے - لو میں آج اسے ایک خط ہی جوڑا لے دیتا ہوں -"

اوسکار نے اپنی ماں کو خط لکھا جس میں اس نے مفصل واقعات تحریر کئے اور اپنے ساتھ مونا کو لانے کی اجازت طلب کی - چندروز بعد جواب آگیا جس نے ان کی امیدوں کی دنیا کو برباد کر دیا - ماں نے لکھا تھا کہ اگر تو کسی فرانسیسی عورت کو اپنے ساتھ لایا تو میرا بیٹا نہیں ہے - اور میں زندگی بھر تیری صورت بھی دیکھنے کی روادار نہ ہونگی -

اوسکار نے چیخ کر کہا :- "اے میرے خدا، کیا میری ماں یہ لکھ رہی ہے؟ افسوس!"

(۶)

ایک نشاط انگیز شام تھی - روح پرور ہوائیں چل رہی تھیں اور اوسکار اور مونا کے سوا سارا عالم بادہ عشرت سے سرشار نظر آتا تھا - یہ دونوں نہایت غمگین تھے - بالاخانہ پر آمنے سامنے کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے اور اپنے تاریک مستقبل کے متعلق گفتگو کر رہے تھے -

مونا نے کہا" بڑی مشکل ہے اوسکار! ادھر سارے گاؤں میں میرے خلاف نفرت کی آگ بھڑک رہی ہے - اُدھر تمہاری ماں میری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی - اس عام نفرت پر قابو پانا ہماری قوت سے باہر ہے - اوسکار، ہماری محبت کی قربانگاہ پر میرا باپ تو بھینٹ چڑھ چکا اب یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ تمہاری بوڑھی ماں بھی اس صدمہ میں تڑپ تڑپ کر جان دے - اب تم اللہ کا نام لیکر اپنے وطن جانے کے لئے تیار ہو جاؤ اور مجھے میری قسمت کے حوالہ کر دو"

اوسکار کچھ جواب دینا چاہتا تھا کہ یکایک مشرق کی طرف سے شور و غل کی آواز سنائی دی - مونا نے دیکھا کہ ایک عظیم الشان مجمع زمیندار کی قیادت میں، سمندر کی طوفانی موجوں کی طرح بڑھتا چلا آرہا ہے - مجمع بالاخانہ کے نیچے آکر رک گیا اور زمیندار نے چیخ کر کہا "مونا! او وطن فروش اور غدار عورت! تیری بدمعاشیوں پر اب زیادہ صبر نہیں کیا جا سکتا - یا تو تو اس سور جرمن کو اپنے گھر سے نکال دے ورنہ تو بھی اس گاؤں کو اپنے ناپاک وجود سے پاک کر دے -"

اوسکار نے حسرت بھری نظروں سے مونا کو دیکھا اور دلدوز لہجے میں کہا" افسوس مونا!" حالات نے نہایت نازک صورت اختیار کرلی ہے - تیرے اہل وطن میرے دشمن ہیں اور میرے اہل وطن تجھ سے متنفر ہیں - یہ ہے لڑائی کا نتیجہ - اب میں نہیں چاہتا کہ تو میری وجہ سے مزید تکالیف برداشت کرے - لے خدا حافظ - اب میں جاتا ہوں"

اوسکار مونا کو سلام کر کے تیزی کے ساتھ زینہ سے اُتر گیا مگر مونا بھی جھپٹ کر اس کے ساتھ ہولی - اس نے کہا اوسکار میں تمہیں تنہا نہ جانے دونگی - جس گاؤں کے رہنے والے تمہارے ساتھ ایسا ذلت آمیز سلوک کریں میں اسے اس قابل نہیں سمجھتی کہ اپنی زندگی کے بقیہ ایام اس میں گذاروں - جہاں تم جاؤ گے وہیں میں بھی جاؤنگی"

دونوں مجمع کو چیرتے ہوئے شہر کو جانے والی پختہ سڑک کی طرف چلدیئے -

دونوں تھوڑی دور گئے ہونگے کہ مجمع میں سے کسی نے چیخ کر کہا" اندور آگیا -" یہ آواز سنتے ہی مجمع میں ایک شور مچ گیا - آناً فاناً ہر شخص کی زبان پر اندور کا نام تھا - ایک عورت نے چیخ کر کہا" یہ رہا اندور —— اندور مورو -"

دوسری عورت نے جب اسے دیکھا تو چیخ کر بولی" اندور! دیکھ! یہ تیری بہن ہے جس نے تیرے خاندان کے نام کو بٹہ لگا دیا - یہ نامراد ایک کمینہ جرمن پر مرتی ہے -"

تیسری نے کہا" کیا دیکھے غریب وہ تو اندھا ہو گیا ہے -"

اندھے بھائی نے اپنی بہن کو سینے سے لگا لیا - ایک عورت مجمع کو چیرتی ہوئی وہاں آئی جہاں بچھڑے ہوئے بہن بھائی گلے مل رہے تھے - اور اس نے چیخ کر کہا" مونا دیکھ، تیرے محبوب کی قوم نے تیرے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے - انہوں نے اس کی آنکھوں کو لوہے کی سلاخوں سے داغ دیا ہے -"

اندور نے اس طرف رخ کر کے جس طرف سے آواز آرہی تھی کہا "اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک جرمن نے میری آنکھ اپنی گولی کا نشانہ بنا دیا مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ایک جرمن ہی نے مجھے دوبارہ زندگی بخشی ہے - جب میں لڑائی کے میدان میں، عالم بیکسی میں زخمی پڑا ہوا تڑپ رہا تھا تو وہ مجھے اپنے خیمہ میں لے گیا اور نہایت دلسوزی

کے ساتھ میرا علاج معالجہ کیا اور مجھے موت کے پنجہ سے نکالا۔"

پھر اندور نے اپنی بہن کی طرف متوجہ ہوکر کہا" مونا اپنے دوست سے میری ملاقات کراؤ۔"

جب اندور اوسکار کے پاس پہنچا تو نہایت گرمجوشی کے ساتھ اس سے مصافحہ کیا۔

زمیندار نے چیخ کر کہا" اندور تجھے اس جرمن سور سے نفرت نہیں ہے؟"

اندور نے کہا" نہیں، بلکہ مجھے لڑائی سے نفرت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جو شخص لڑائی کے میدان میں جا چکا ہے کچھ وہی اچھی طرح جان سکتا ہے کہ لڑائی میں کیسے کیسے افعال شنیعہ کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔ ہری بھری کھیتیوں کو اجاڑ کر غریب کاشتکاروں کی آرزوؤں کو پامال کیا جاتا ہے۔ نوجوان بچوں کے گلوں پر چھری پھیر کر ان کے ضعیف والدین کی حسرتوں کا خون کیا جاتا ہے۔ کیا یہ انسانیت کی باتیں ہیں؟"

اندور کے کلمات کچھ ایسے تاثیر میں ڈوبے ہوئے تھے کہ ہر شخص کے دل میں اتر گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا مجمع متفرق ہوگیا۔

اندور نے دائیں ہاتھ میں اوسکار کا ہاتھ لیا اور بائیں ہاتھ میں مونا کا اور یہ تینوں نئے سرے سے اپنے گھر میں داخل ہوئے۔

(محمود عبدالحافظ المصری)

زین العابدین سجاد
(میرٹھی)

نوائے قفس

(مسٹر تھامس کیمپبل کی مشہور انگریزی نظم کا ترجمہ)

سینہ کی انتہائی محبت جو زندوں کے لئے فطرت کا ایک بہت بڑا عطیہ ہے، صرف قلب انسانی کے لئے مخصوص نہیں۔

ایک نوعمر طوطا جس نے ابھی ابھی شباب کی منزل میں قدم رکھا تھا جس کے بازو چمکدار تھے۔ ملک اسپین[1] سے جلد ہی پنجرے میں بند کرکے ہمارے سرد ملک ساحل ملا[2] پر لایا گیا۔

اپنے وطن کی ان خوشبودار جھاڑیوں کو جس میں اس نے اپنے رنگین چمکدار بازو حاصل کئے تھے۔ جہاں کو پھلوں سے اس کی نشوونما ہوئی تھی۔ جس آسمان اور جس روشنی میں وہ رہا۔ ایک پرحسرت نگاہ سے اُس نے ان تمام چیزوں کو "الوداع" کہا۔

پیارے وطن کی ان تمام چیزوں کی بجائے اسے تارکول کا دھواں، اجنبی ملک، کہرآلود آسمان ملا اور اب اُس نے اپنی سنہری آنکھیں چٹان اور تیز رو دریا پر ڈالیں، وہ ہمارے سرد ملک میں آیا۔ لیکن وطن کی یاد میں وہ دن کے اکثر حصوں میں چیختا ہی رہا، یہاں تک کہ عمر کے ڈھلنے کے ساتھ ہی ساتھ اس کے سبز اور سنہرے پر زرد پڑ گئے۔

غم سے وہ تقریباً اندھا اور گونگا ہوگیا۔ اور اب وہ نہ چیخا، نہ ہنسا، نہ بولا۔ اتفاقاً ایک اسپینی مسافر وہاں آنکلا۔

طوطے کو دیکھکر اُس نے اپنی اسپینی زبان میں اُسے سلام کیا۔ چڑے نے بھی اپنی اسپینی زبان میں اُس کا جواب دیا۔ ایک مدت کے بعد اپنے ایک ہموطن کو دیکھکر وہ ضبط نہ کرسکا، اور فرط مسرت سے بند پنجرے میں وہ پھڑپھڑایا، تڑپا، گرا اور مرگیا۔

ابراہیم عمادی
(ندوی ہونہار ادب)

---

[*] تھامس کیمپبل دنیائے ادب کا ایک مشہور شاعر گزرا ہے۔
[1] جنوبی امریکہ میں ایک ملک ہے۔ [2] اسکاٹلینڈ میں ایک مقام ہے۔

جوانی کا ملّاح

غمِ الفت کے طوفانی سمندر کا کنارا ہے　　کہ جس کی موج تنہا موت کا خونریز آرا ہے
یہ وہ الفت کدہ ہے جسمیں لاکھوں حشر اٹھتے ہیں　　یہ وہ مقتل ہے جسمیں موت کے چشمے اُبلتے ہیں
اندھیری رات اور طوفانِ ابر و باد کا منظر　　کوئی دیکھے ذرا یہ فطرتِ آزاد کا منظر
گرج ہیں بادلوں کی یا دہاڑیں ہیں یہ شیروں کی　　فنا ہوجائیں جس کے خوف سے روحیں دلیروں کی
یہ خونیں ابتدا کیا انتہا کا پیش خیمہ ہے　　یہ کالی رات کیا روزِ جزا کا پیش خیمہ ہے
یہ نمرودوں کی بستی پر چڑھائی ہونیوالی ہے　　کہ آپس میں خداؤں کی لڑائی ہونیوالی ہے
یہ بیٹھے بیٹھے کیا جوش آگیا ہے دیوتاؤں کو　　دگرگوں کردیا ہے سب سمندر کی فضاؤں کو
سمندر اتنا طوفانی ہے ساحل ٹوٹ جائینگے　　سمندر میں وہ طغیانی ہے ساحل ٹوٹ جائینگے

ارے یہ کون عورت زاد اُٹھی فرشِ ساحل سے　　یہ کیسی حُور پیدا ہوگئی ہے عرشِ ساحل سے
یہ ہیبتناک تاریکی یہ ہیبت زا پریشانی　　سفینہ لے چلی آغوشِ طوفاں میں یہ دیوانی

اری ناداں ٹھہر جانا یہ کشتی ڈوب جائے گی
یہ کشتی ٹوٹ کر پھر اس کنارے تک نہ آئے گی

عدمؔ　　(غیر مطبوعہ)

چمن زاد

بلاک بنانے والے: مہتہ ہاف ٹون کمپنی انارکلی لاہور

چھاپنے والے: نیشنل آرٹ پریس۔ انارکلی لاہور

بلاک بنانے والے مہتہ ہاف ٹون کمپنی انارکلی لاہور
چھاپنے والے نیشنل آرٹ پریس انارکلی لاہور

ارسطو

ابتدائی حالات

عقل و حکمت کا یہ حیرت انگیز مجسمہ سنہ ۳۸۴ ق م میں بمقام اسٹاگرا واقع صوبہ تھریس پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ نکومیکس، ایک مشہور طبیب تھا جس نے تاریخ طبیعی اور طب میں بہت سی مفید کتابیں تصنیف کی تھیں اور اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ارسطو کو ان فنون سے خاندانی دلچسپی تھی۔ علاوہ بریں، اسٹاگرا جہاں، ارسطو کا بچپن اور شباب کا زمانہ بسر ہوا، سمندر کے کنارے واقع تھا، اس لئے قدرتی مناظر اور باغات وغیرہ وہاں بافراط موجود تھے۔ اور یقیناً اس نے ان تمام چیزوں سے فائدہ اٹھایا ہوگا۔

نکومیکس نے چھوٹی سی عمر ہی سے ارسطو کو تعلیم دینی شروع کر دی تھی اور وہ اپنے ہونہار فرزند کو دیکھکر دل ہی دل خوش ہوتا ہوگا۔ لیکن ابھی ارسطو نے اپنی عمر کی دس بارہ منزلیں بمشکل ہی طے کی ہونگی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ مرتے وقت نکومیکس نے، ارسطو کا ہاتھ اپنے دوست پراکسینس کے ہاتھ میں دیا اور ملک عدم کی راہ لی اور دنیا کے سارے بکھیڑوں سے آزاد ہوگیا۔

ارسطو کے کانوں میں، ایتھنز اور اس کی علمی دلچسپیوں کا شہرہ کافی پڑ چکا تھا، اور اس کی خواہش یہی تھی کہ وہیں اس شہر میں جا کر رہوں، جہاں کے در و دیوار سے فلسفہ و حکمت کی آوازیں نکل رہی تھیں جس طرح محمد شاہ رنگیلے اور واجد علی شاہ البیلے کے زمانہ میں دلی اور لکھنؤ کے در و دیوار سے خیال اور ٹھمری کی صدا آتی تھی۔ لیکن، ارسطو کا مربی اس بات کو کب روا رکھ سکتا تھا کہ مرتے ہوئے دوست کی نشانی کو، ایک منٹ کے لئے بھی آنکھ سے اوجھل ہو جانے دے؟ قہر درویش بجان درویش۔ سترہ سال کی عمر تک ارسطو وہیں، تعلیم حاصل کرتا رہا، اور جب سنہ ۳۶۷ ق م میں پراکزینس کا انتقال ہوگیا تو ارسطو نے سیدھی ایتھنز کی راہ لی۔

سوء اتفاق سے ایتھنز پہنچکر، علم و حکمت کے اس متوالے کو یہ معلوم ہوا کہ چند ہی روز ہوئے ہیں کہ افلاطون جس کا نام سنکر، اس کے دل میں محبت و احترام کا طوفانِ عظیم موجزن ہو جایا کرتا تھا۔ اپنے ذاتی کام سے صقلیہ چلا گیا، اور تین سال کے بعد واپس آئیگا۔ بہرکیف اس نے تین سال برابر مطالعہ و مشاہدہ میں صرف کئے۔ غالباً اسی خیال سے کہ جب افلاطون آئے تو مجھے شاگردی میں لینے سے انکار نہ کر سکے۔ علاوہ باپ کے دولت کے، مونہہ بولے چچا کا سرمایہ بھی ارسطو کو ملا۔ اور فلسفہ کے اس شیدائی نے، اس ترکہ کو دل کھولکر، کتابوں کی خریداری پر صرف کیا۔ واضح ہو کہ اس زمانہ میں، کتابیں بمشکل دستیاب ہوتی تھیں اور صرف دولتمند آدمی ہی ان سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ ارسطو کا یہ غیر معمولی شوق دیکھکر، سقراط اور افلاطون کے احباب اور قابل شاگردوں نے مذاکرۂ علمیہ[1] اور مکالمہ عقلیہ کا دروازہ اس کے لئے کھولدیا۔ ایتھنز میں بعض لوگ ایسے بھی موجود تھے جنہوں نے سقراط کی تقریریں سنی تھیں۔ ارسطو تو خدا سے چاہتا تھا کہ ایسے لوگوں سے رسم و راہ پیدا ہو جائے یا اسے ایسے لوگ ملجائیں جو فلسفہ کے ان باوا آدموں کے حالات سنائیں، وہ اس کے روز افزوں شوق کو بھڑکائیں۔ اس نے ان لوگوں کی صحبت سے قرار واقعی فائدہ اٹھایا اور اپنے آپ کو اس تین سال کے عرصہ میں اس قابل بنالیا کہ جب افلاطون نے صقلیہ سے واپس آکر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور جب استاد، شاگرد کے باہمی تعلقات کو چند ماہ گزر گئے تو افلاطون نے اس کے متعلق صاف کہدیا۔ کہ "ارسطو میرے مدرسہ کی روح رواں ہے"۔ اس جگہ یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس زمانہ میں افلاطون کے شاگردوں کی تعداد پانچ سو سے بھی اوپر تھی۔ پس اس انبوہ کثیر میں، چند ہی ماہ کے بعد، ارسطو کا ایسا چمک جانا کہ استاد کی نگاہ انتخاب اس پر پڑ گئی اس کی جودت[2] طبع کی ایک روشن دلیل ہے۔

بیس سال تک، ارسطو، اپنے غیر فانی استاد کی خدمت میں شبانہ روز حاضر رہا، اور ایک انسان، دوسرے انسان سے جس حد تک استفادہ[3] کر سکتا ہے۔ ارسطو نے اس میں کوئی

---

[1] علمی گفتگو۔

[2] دماغی لیاقت۔

[3] فائدہ حاصل کرنا۔

دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ لیکن اس کی طبیعت میں کورانہ تقلید پرستی نہ تھی، وہ تو "صداقت" کا عاشق تھا، اس لئے شخصیت سے مرعوب نہوا یعنی اُس نے اپنے آپ کو "فلسفۂ افلاطونی" کا غلام نہیں بنایا بلکہ "حکمت" کو بنی نوع آدم کی "دولتِ گمشدہ سمجھا" اور "جہاں سے ملی، حاصل کرلی"۔

ارسطو نے زمانۂ طالب العلمی ہی میں خاصہ کتب خانہ جمع کرلیا تھا، جس میں افلاطون کی تصانیف کے علاوہ، تمام یونانی فلاسفروں کی تصانیف قرینہ سے سجی ہوئی تھیں۔ اسی شغف[1] علمی کو دیکھ کر افلاطون نے ارسطو کو "قاری" (The reader) کا خطاب دیدیا تھا۔ کیونکہ وہ ہر وقت پڑھتا ہی رہتا تھا۔ کسی شخص نے اس کو کسی وقت سوائے مطالعہ کے اور کسی دنیاوی کام میں مصروف نہ پایا یہی وجہ ہے کہ وہ فلسفہ کے مختلف مذاہب (Schools) سے، شاگردی ہی کے زمانہ میں واقف ہوگیا تھا اور خود افلاطون اس کی وسعتِ معلومات پر رشک کیا کرتا تھا۔

الغرض جب ۳۴۷ء میں افلاطون نے وفات پائی تو ارسطو اپنے وطن استاگرا کو واپس آیا، شہرت کی لینڈوری اُس سے کئی منزل آگے چل رہی تھی۔ لہذا استاگرا پہنچتے ہی فلپ شاہ مقدونیہ نے اس کو سکندر (اعظم) کا اتالیق بنانا چاہا لیکن ارسطو نے بادشاہ سے عرض کی کہ پہلے مجھ کو چند علمی مصروفیات سے فارغ ہوجانے دیجیے یعنی میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی دولت اور مرتبت سے میری مدد کریں تاکہ میں سائنس ہیئت، فلکیات۔ علم الحیوٰۃ، طبیعیات، تشریح الاعضاء اور ان کے متعلقات پر عبور حاصل کرنے کے ایک لیبارٹری قائم کرلوں اور ان علوم کے متعلق ضروری تجربات سے اپنے معلومات کو پرکھ لوں۔ بادشاہ نے حتی الوسع اس کی امداد کی اور چند ماہ قیام کرنے کے بعد پھر ایتھنز واپس آیا اور عارضی طور پر علم فصاحت و بلاغت کا درس دینا شروع کردیا۔ اور چار سال تک باطمینان کلی، مختلف علمی مشاہدات اور تجربات میں مشغول رہا۔

ارسطو کی علمی شہرت تو اس کے زمانۂ طالب العلمی ہی میں ہوگئی تھی اب جو اس نے درس دینا شروع کیا تو بہت بڑے بڑے آدمی، بصد خوشی اس کی تقریر سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے شریک درس ہونے لگے۔ انہی میں ایک شخص حرمیاض نامی بھی تھا جو علاوہ بیحد دولتمند ہونے کے، بارسوخ بھی تھا، نہایت علمدوست اور علماء کا بڑا قدردان۔ جب ۳۴۴ھ ق م، اٹارنیس کے باشندوں نے اُسے اپنے شہر کا حاکم اعلیٰ منتخب کیا تو، اس جلیل القدر مرتبہ پر فائز ہونے کے بعد اس نے ارسطو کو مال و دولت سے غنی کردیا اور بطور اثباتِ قدردانی، اپنی بہن کی شادی اُس کے ساتھ کردی۔ یہ خاتون بہت شائستہ اور مزاج داں تھی چنانچہ تمام عمر میاں بی بی کے باہمی تعلقات نہایت اچھے رہے۔

بہر کیف ۳۴۳ھ ق م میں فلپ شاہ مقدونیہ نے بصد احترام، ارسطو کو بلا بھیجا اور اپنے ہونہار، جوان بخت، لیکن جوان مرگ بیٹے سکندر کو اُس کی اتالیقی میں دیدیا۔ میں اس بات کو نوادر روزگار سے سمجھتا ہوں سکندر کو ارسطو سا استاد ملا۔ حیران ہوں کہ کسے زیادہ خوش قسمت قرار دوں؟ فلپ کو، جس نے اپنے بیٹے کے لئے ایسا لائق استاد منتخب کیا یا سکندر کو جسے ارسطو اتالیق ملا یا ارسطو کو جسے سکندر سا شاگرد نصیب ہوا؟ دنیا میں کوئی بادشاہ ایسا نہیں گزرا، جسے ارسطو سا استاد ملا ہو اور نہ کوئی فلاسفر ایسا پیدا ہوا، جسے سکندر سا شاگرد نصیب ہوا ہو۔ یہ دونوں نام، تاریخ عالم میں سونے کے نہیں بلکہ جواہرات کے حرفوں سے لکھے ہوئے ہیں۔ اگر لفظ "سکندر" اردو زبان میں خوش قسمت، بلند اقبال۔ فتحمند، نامآور وغیرہ کا مترادف ہے تو لفظ "ارسطو" دانشمند، حکیم، فلاسفر، عاقل دانا اور مدبر کا ہم معنیٰ ہے۔

آمدم بر سر مطلب، جب ارسطو، سکندر کا اتالیق مقرر ہوا تو وہ اک تیرہ سالہ، خودسر اور تندمزاج طفل نوخیز تھا، نہایت مغلوب الغضب عیش پسند۔ مرگی کے مرض کا شکار اور کسی قدر میراقی۔ اگر دنیا میں کسی چیز سے شوق تھا تو جنگلی گھوڑوں کے سدھانے سے۔ اگرچہ ارسطو کو اس تندخو نوجوان کی خصایل و عادات کے تبدیل کرنے میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی تاہم بقول پلوٹارک[2] اس کو ارسطو نے اپنے سے اسدرجہ مانوس کرلیا کہ وہ اسے اپنے باپ کی جگہ سمجھنے لگا۔ چنانچہ سکندر بعض اوقات کہا کرتا تھا کہ "اگرچہ میرے باپ نے مجھے زندگی عطا کی، لیکن زندگی بسر کرنے کا طریقہ ارسطو ہی نے مجھے سکھایا" اور ایک موقعہ پر اس نے ارسطو کو یہ الفاظ کہے تھے، "کیا اچھا ہوتا اگر میں طاقت اور حکومت کی توسیع کے عوض

---

[1] دلچسپی۔

[2] ایک یونانی مصنف جس نے ۴۶ مشہور یونانی اور ۴۶ مشہور آدمی افراد سوانحعمریاں لکھی ہیں۔ یہ کتاب نہایت دلچسپ اور مفید ہے۔

علم وحکمت میں ترقی کرتا۔"

الغرض تین چار سال تک یعنی ۳۴۰ق م تک سکندر، ارسطو کی اتالیقی میں رہا۔ اس کے بعد فلپ نے اُسے اصول حکمرانی اور طریق کامرانی حاصل کرنے کے لئے مختلف صوبوں کی گورنری اور مختلف مہمات کی سپہ سالاری پر مامور کرنا شروع کیا اور ارسطو اپنے علمی تجربات میں مشغول ہوگیا ۳۳۶ ق م میں فلپ نے وفات پائی۔ سکندر تخت نشین ہوا اور جب وہ مشرقی ممالک کی فتوحات کے متعلق تجاویز سوچنے میں مصروف ہوا تو ارسطو اُس سے اجازت لیکر ایتھنز چلا آیا اور ۳۳۵ق م میں سلسلہ درس وتدریس شروع کردیا تھوڑے ہی دنوں میں تمام مدارس کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور ہزار ہا شائقین علم اس کے گرد پروانہ وار جمع ہوگئے۔ ارسطو کا مدرسہ، ایتھنز سے باہر ایک خوبصورت باغ میں واقع تھا۔ اور وہ عموماً چہل قدمی کرتے ہوئے طلبا کو درس دیا کرتا تھا۔ اسی لئے اس کے شاگردوں کا لقب "المشائین" یعنی "چلنے والے" پڑ گیا اور اس کے نظام فلسفہ کو آج بھی "فلسفہ امشائیں" ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس طرز عمل کی مختلف توجیہات کی جاتی ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ چل پھر کر درس دینا اس کی چلبلی اور بیچین طبیعت کا خاصہ تھا، اور بعض لوگ اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ اس کی صحت بہت کمزور ہوگئی تھی اس لئے وہ چہل قدمی کرتے ہوئے، لوگوں کو پڑھایا کرتا تھا۔

اس کے لکچر دو طرح کے ہوتے تھے۔ ایک سلسلہ صبح کے وقت جاری ہوتا تھا جس میں کم سمجھ اور معمولی لیاقت کے لوگ شریک ہوتے تھے اور صبح کی تقریریں عام فہم مسائل پر گفتگو ہوتی تھی لیکن شام کے درس میں خاص خاص لوگ شریک ہوتے تھے اور حکمت کے دریا اسی مخصوص جماعت کے سامنے بہائے جاتے تھے۔

الغرض علم وفن کا یہ چشمہ ۳۲۳ق م تک اسی طرح شبانہ روز اُبلتا رہا لیکن جب سکندر اعظم کا اُسی سال انتقال ہوگیا تو ارسطو کو اپنی جان کی فکر پڑی۔ وجہ یہ ہوئی کہ ارسطو ایک بے باک اور راستگو بلکہ صاف گو انسان تھا۔ طرز حکومت اور حکام وقت میں جو کچھ عیوب اُسے نظر آتے تھے بے کم وکاست بیان کردیتا تھا۔ حد ہے کہ سکندر کے چال چلن پر بھی بعض اوقات علانیہ اعتراضات کردیتا تھا پس اس کی وفات پر ارسطو فوراً ایتھنز کو خیرباد کہکر چالکس چلا گیا اور ایک سال کے بعد یعنی ۳۲۲ق م میں وفات پا گیا۔

کیریکٹر ارسطو، فی الحقیقت علم وحکمت میں اس درجہ غرق تھا کہ اس کے کیریکٹر کو صرف ایک لفظ میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ یعنی "طالب العلم" یا "طالب حکمت"۔ ریڑ نے اپنی مشہور تالیف تاریخ فلسفہ جلد سوم میں، اس کا کیریکٹر بحیثیت فلاسفر بدیں الفاظ بیان کیا ہے:-

"اس کی تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک متین اور سنجیدہ مزاج طالب حق تھا۔ افلاطون کی طرح خیال آرائیوں سے اس کو مطلق سروکار نہ تھا بلکہ وہ ہمیشہ عملی نصب العین اپنے سامنے رکھتا تھا۔ وہ "صداقت" کو ہر پہلو سے جانچتا تھا۔ جو کچھ لکھتا تھا نہایت ناپ تول کر، اور بہت سوچ سمجھکر۔ اور اس کا مقصد یہ تھا کہ اپنے فلسفیانہ خیالات کو، مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی کرے سائینٹفک مشاغل میں انہماک تام، اس کی زندگی کا طغرائے امتیاز تھا چونکہ شاعری عروض، ادب اور تصوف سے اُسے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ اس لئے اس کی تحریریں، وہ دلکشی اور تاثیر نہیں ہے جو افلاطون کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ اس کی تصانیف میں بعض مقامات پر تکرار مضامین بھی پائی جاتی ہے جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ سائینس کے سنجیدہ نتائج کو، اپنے تخیل سے مربوط نہیں کرسکتا تھا اور اسی لئے اس کی طرز تحریر عموماً بے ڈھنگی اور غیر مربوط ہوتی ہے۔ بعض اوقات خیالات میں تسلسل بھی مفقود ہوجاتا ہے۔ عموماً اختصار سے کام لیتا ہے اور کسی تصنیف میں ادبی خوبی نمایاں نہیں ہے گویا ارسطو کے نزدیک "فلسفیانہ" "ادبیات" کا نعم البدل ہے۔"

خصائص ذاتی ارسطو، افلاطون کے برابر تخیئلی قوت کا مالک نہ تھا لیکن اس کی قوت مدرکہ، جودت طبع اور خواہش تحقیق، بیشک افلاطون سے بڑھی ہوئی تھی۔ افلاطون کے مداح آج بھی پائے جاتے ہیں اور ہمیشہ پائے جائیں گے لیکن ارسطو کے سامنے، لوگ ابھی تک زانوئے شاگردی تہ کررہے ہیں اور آج بھی اس کی تصانیف سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ارسطو سے بڑھکر کسی شخص واحد نے بنی نوع آدم کے خیالات کو اسدرجہ متاثر نہیں کیا۔ اس کے علمی کارناموں اور عقلی موشگافیوں کا رنگ آج بھی تمام فلسفہ کے رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے ہے اور یہ وہ بات ہے جس کی نظیر، ڈھونڈے نہیں ملسکتی۔ پروفیسر ایگسیز نے ایک لکچر میں بیان کیا تھا کہ ارسطو کی وسعت معلومات کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ آج سے تئیس سو سال

پہلے، علم الحیوان سے اس درجہ واقف تھا کہ ہم لوگ، باایں ہمہ افزونی وفراوانی ذرائع معلومات اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتے" دنیا میں اگر کسی کو علم کی چاٹ ہوگی تو اسی قدر جتنی ارسطو کو تھی ہشت بانہ روز مطالعہ میں مصروف رہتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اُسے ان تمام علوم وفنون میں دستگاہ کامل حاصل تھی جو اس کے زمانہ میں متداول تھے اگرچہ اس نے طبابت کو ذریعہ معاش یا شغل زندگی نہیں بنایا لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ اس فن کا بھی امام گزرا ہے۔ مشرق اور مغرب دونوں میں افلاطون اور ارسطو یہ دو نام حکمت اور دانش کے ہم معنی ہوکر رہ گئے ہیں جب ہر کسی شخص کی انتہائی تعریف کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ وہ تو اپنے وقت کا ارسطو ہے۔

افلاطون سے اختلاف

ہم لکھ چکے ہیں کہ اگرچہ ارسطو بیس سال تک افلاطون کی شاگردی کرتا رہا لیکن اُس نے اپنے آپ کو افلاطونی فلسفہ کا مقلد نہیں بنایا اور نہ بنا سکتا تھا بلکہ وہ بعض امور میں اپنے لائق استاد سے اختلاف بھی رکھتا تھا۔ جس طرح امام محمدؒ اور ابو یوسف نے امام ابو حنیفہ[1] سے بعض شرعی مسائل میں اختلاف کیا ہے۔

بہرکیف اس اختلاف کی بنا پر عام طور سے یہ مشہور ہے کہ استاد اور شاگرد کے تعلقات چند سال کے بعد خراب ہوگئے اور استاد کے مقابلہ میں ارسطو نے بھی درس دینا شروع کیا وغیرہ وغیرہ جہاں تک تحقیق کی گئی اس قصہ کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ قابل شاگرد اپنے استاد سے اختلاف کیا ہی کرتے ہیں۔ اختلاف معقول تو دلیل ہے۔ لیاقت ذاتی کی لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ افلاطون اور ارسطو میں ایسی ناچاقی اور ذاتی دشمنی پیدا ہوگئی تھی جیسی کہ آج کل مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے علماء میں نظر آتی ہے۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں مل سکتا کہ ارسطو نے کبھی اور کسی طرح اپنے استاد کی توہین یا برائی کی ہو۔ اپنی تصانیف میں اس نے متعدد مقامات پر افلاطون سے اختلاف رائے کیا ہے بلکہ اس کے فلسفہ کی بعض مشہور تعلیمات کی تردید بھی کی ہے لیکن وہ افلاطون کا نام ہمیشہ نہایت عزت کے ساتھ لیتا ہے۔ لیکن اگر عقلی زاویۂ خیال سے کسی مسئلہ میں اختلاف کرنا، کفرانِ نعمت (ناشکرگزاری) یا گستاخی ہے تو انبیاء علیہم السلام کے متعلق کیا کہا جائیگا۔ جنہوں نے عموماً اپنے بزرگوں کے معتقدات کی تردید ہی میں اپنی عمریں صرف کردیں؟ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اس غلامانہ ذہنیت نے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ مختلف ایشیائی اقوام کو "جامد" بناکر رکھدیا اسی کورانہ تقلید اور شخصیت پرستی نے ان میں "روحِ تحقیق" پیدا نہیں ہونے دی اور اگر ہوئی تو اس کا گلا گھونٹ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عرصہ دراز تک مسلمان ارسطو کی گاڑی میں بطور بیلوں کے جُتتے رہے اور اس کے فلسفہ کو "الہام آسمانی" کا مرتبہ دیتے رہے۔ اور آج اگر مسلمان جملہ علوم وفنون علی الخصوص مذہبی تحقیقات میں پیچھے ہیں۔ تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ اپنی رائے سے کام لینا یا بزرگانِ سلف سے اختلاف وانحراف کرنا کفرانِ نعمت نہیں بلکہ "کفر" سمجھتے ہیں۔ اگر یورپین اقوام خصوصاً جرمن لکیر کے فقیر ہوتے یا اختلاف رائے کو "رحمت" نہ سمجھتے تو آج یہ لوگ تمام دنیا میں علم وفضل حکمت اور فلسفہ کے علمبردار نہ ہوتے۔ اگر نیک نیتی کے ساتھ کسی سے اختلاف کیا جائے تو یہ اختلاف تو فی الحقیقت "رحمت" ہوتا ہے۔ موجب برکات ہوتا ہے۔ کاش مشرق کے لوگ اس رمز سے آگاہ ہوجائیں!

ارسطو کی تحقیق وتلاش

ارسطو فی الواقع ایک خوش قسمت انسان تھا اگر خدا تعالیٰ نے اس کو بہترین دل ودماغ عطا کیا تھا تو قدرداں بھی ایسا دیا جس نے علاوہ مختلف نوازشات کے، جن کے شمار نہیں، بیک وقت آٹھ سو ٹیلنٹس کی رقم اپنے استاد کی نذر کردی کہ وہ اپنا شوق جستجو حدکمال کو پہنچا سکے آٹھ سو ٹیلنٹ کے قریباً تیس لاکھ روپے ہوئے۔ اور چونکہ اب روپیہ بیکار ہوگیا ہے لہذا ایک کروڑ بیس لاکھ روپے ہوئے آج بیشک یہ رقم اکثر نگاہوں کو گراں قدر معلوم نہ ہوگی، لیکن آج سے دو ہزار سال پہلے، بہت سے بادشاہوں کے خزانہ میں بھی یہ رقم نہیں نکل سکتی تھی۔ چنانچہ ارسطو نے اگر دنیا کو "تاریخ الحیوان" جیسی بیش بہا اور پُراز معلومات کتاب دی تو وہ سکندر ہی کی فیاضی کی بدولت

ارسطو کی تصانیف

ارسطو نے اپنی عمر کے ترپنویں سال میں مستقل طور پر درس وتدریس کا سلسلہ قائم کیا تھا جسے لائی سی ام کہتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ قطعۂ

---

[1] امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ فقہ حنفی کے بانی گزرے ہیں ہندوستان کے مسلمان زیادہ تر انہی کے فقہ پر چلتے ہیں۔ امام محمدؒ اور امام ابو یوسف دونوں ان کے لائق ترین شاگرد تھے۔ ۱۲

زمین، جہاں مدرسہ واقع تھا۔ لائی سی اس دیوتا کے مندر سے ملحق تھا۔ ایک دو نہیں ہزارہا طلبا اس دارالعلوم میں رہا کرتے تھے، اور طلبا و استاد میں شبانہ روز علمی صحبتیں گرم رہتی تھیں۔ افلاطون کے مدرسہ کا نام اکیڈیمی تھا اور اس میں فلسفہ، سیاسیات۔ اور ریاضی پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ ارسطو کے مدرسہ میں سائنس، علم الحیوۃ اور طبیعیات کا زیادہ چرچا تھا۔ اگر پلینی کی روایت مندرجہ "تاریخ علوم طبیعی" باب ہشتم فصل شانزدہم کو لائق اعتماد سمجھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سکندر نے اپنی قلمرو کے تمام شکاریوں، سیاحوں، صیادوں، باغبانوں، ماہی گیروں اور سرکاروں کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ ارسطو، اپنی لیبارٹری کے متعلق جس چیز کی طلب کرے حتی الوسع بہم پہنچائی جائے۔ بعض قدیم مورخوں نے لکھا ہے کہ عرصہ دراز تک ایک ہزار نفوس، ارسطو کی خدمت میں حاضر رہتے اور وہ ان کو یورپ افریقہ اور ایشیا کے مختلف ممالک میں ہر ملک کی مخصوص پیداوار اور حیوانات و نباتات کے نمونے فراہم کرنے پر تعینات کرتا رہا انہی ذرائع کی بدولت اُس نے دنیا میں سب سے پہلے "باغ وحوش وطیور" قائم کیا۔ اور علم الحیوۃ، علم الحیوان اور علم الطبیعیات میں ایسی قابل قدر تصانیف دنیا کے لئے چھوڑیں

اس کے ساتھ ہی اُن مشکلات۔ اور دشواریوں کا علم بھی اپنے ناظرین اوراق کو دینا نہایت ضروری ہے جو ارسطو کی راہ میں حائل تھیں۔ اس زمانہ میں نہ گھڑی تھی نہ تھرمامیٹر، نہ خوردبین نہ دوربین نہ مقیاس الحرارت نہ مقیاس الہوا، نہ آلات نہ ذرائع اوزان و پیمائش۔ تجزیہ کیمیاوی، درست پیمائش، صحیح اوزان، اور طبیعیات میں ریاضی کا عمل، یہ سب باتیں، ارسطو کے خواب خیال میں بھی نہیں تھیں۔ اسی طرح مادہ کی قوت کشش، قانون جر ثقیل، برق اور برقی تموجات، امتزاج کیمیاوی، ہوا کا دباؤ اور اس کے نتائج، روشنی، اور حرارت کے خواص وغیرہ وغیرہ جملہ جدید انکشافات جیسا کہ سب جانتے ہیں، زمانہ ماضی میں مثل عنقا، ناپید تھے۔

ایں حالات، اگر کوئی شخص آج ارسطو کی تصانیف متعلقہ طبیعیات کا مطالعہ کرے تو اُسے اکثر خامیاں نظر آئینگی، لیکن اُس نے اپنی کتابوں میں، معلومات کا اسقدر عظیم الشان ذخیرہ آئندہ نسلوں کے لئے جمع کر دیا ہے۔ کہ اس کی تصانیف، جملہ تحقیقات مابعد کا سنگ بنیاد بنگئیں اور دو ہزار سال سے درجہ "علم" کی کتب درسیہ یا نصاب تعلیم بنی ہوئی ہیں، اور صرف یہی بات، انسان کی حیرانی کے لئے کافی ہے۔

ارسطو کی تصانیف کی تعداد سینکڑوں تک بتائی جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ اس نے چار سو سے اوپر تصانیف، اپنی یادگار چھوڑی تھیں لیکن آجکل مفصلہ ذیل کتب دستیاب ہوسکتی ہیں۔ اولاً منطقی تصانیف جنکو مجموعی طور پر آرگینان کہا جاتا ہے۔ ثانیاً سائینٹفیک تصانیف یعنی طبیعیات، فلکیات، الکون والفساد کتاب الدثار سماوی، تاریخ موالید، کتاب الروح، کتاب الحیوانات ثالثاً جمالیاتی تصانیف یعنی علم بلاغت و فصاحت، فنون لطیفہ، اور علم المعانی والبیان اور علم عروض، رابعاً فلسفیانہ تصانیف یعنی علم الاخلاق، علم سیاست اور مابعد الطبیعیات۔ ان کتابوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اب بھی جو کچھ کتابیں حوادث روزگار سے بچ رہی ہیں وہ "یونان کی سائکلو پیڈیا" سے کم نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عقلائے روزگار نے ارسطو کو "معلم اول" اور "الفیلسوف" کا لقب دیا ہے۔

ارسطو ایک خشک فلسفی تھا، اس کی تصانیف میں ادبی شان نہیں پائی جاتی بلکہ نری اصطلاحات بھری پڑی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آج مشکل ہی سے ہم کسی سائنس (فن) کے متعلق، ارسطو کی ایجاد کردہ اصطلاحات کو استعمال کئے بغیر گفتگو کر سکتے ہیں مثلاً خاصہ۔ حد اوسط، کبریٰ، مقولہ۔ تاثر۔ فعلیت۔ نیئت۔ غایت مبادیات۔ ہیولیٰ یہ تمام مصطلحات، ارسطو ہی کے معنی آفرین دماغ کا ادنیٰ سا کرشمہ ہیں۔ حکما ہی پر نہیں بلکہ حکمت پر بھی ارسطو کے بیشمار احسانات ہیں۔

(۱) مبادیات منطق

پہلی بات جس کی وجہ سے ارسطو کو جملہ حکمائے عالم پر فوقیت حاصل ہے یہ ہے کہ اس نے، بغیر امداد غیرے، محض اپنی قوت غور و فکر سے، ایک مستقل فن یعنی "علم منطق" ایجاد کرکے مدون کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ارنسٹ رینان[۲]، تاریخ بنی اسرائیل جلد پنجم صفحہ ۳۳۸ پر لکھتا ہے "جس شخص نے فلاسفۂ یونان اور علی الخصوص

---

[۱] اٹلی کا ایک مصنف مورخ اور اپیکورس کے فلسفہ کا حامی اس کی کتاب مندرجہ متن آج بھی بہت عزت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔

[۲] ایک مشہور فرانسیسی مصنف اور فلاسفر جس نے ابن رشد کی لائف لکھی ہے اور اس کی حیات مسیح نے تو مذہبی دنیا میں تہلکہ ڈال دیا تھا۔ ۱۲

افلاطون اور ارسطو کی تصانیف کا مطالعہ نہیں کیا۔ وہ فلسفہ میں نہ کامل ہو سکتا ہے نہ ماہر" اگرچہ ارسطو کی وفات کے بعد یونان میں پھر کوئی شخص ارسطو کا ہم پایہ پیدا نہ ہوا اور چند صدیوں کے بعد یونان میں حکمت و فلسفہ کا چراغ بھی گل ہو گیا لیکن جب یورپ جہالت اور بربریت کی تاریکی سے باہر نکلا، اور لوگوں نے علوم و فنون کی طرف توجہ کی تو ارسطو کی منطق ہی پر یورپین علوم کی بنیاد قائم ہوئی۔ اور اسی کی بدولت ان کے دماغوں میں وہ قابلیت پیدا ہوئی۔ جس کا منظر آج ہمارے سامنے ہے۔

منطق سے مراد ہے۔ صحیح طریق پر غور و فکر کرنا۔ اگرچہ دنیا میں نہ کوئی فن اس کی برابر حوصلہ فرسا ہے نہ غیر دلچسپ، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ بغیر منطق سے واقفیت پیدا کئے، کوئی شخص "عالم" یا "فاضل" ہونے کا مدعی نہیں ہو سکتا۔

منطق میں پہلی بات "تعریف"[1] ہے۔ سقراط کو ابوالفلاسفر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے دنیا میں سب سے پہلے منطق کی داغ بیل ڈالی اور وہ یہی تھی کہ اس نے لوگوں سے کہا کہ جو کچھ منہ سے کہتے ہو یا جن امور کے متعلق بحث مباحثہ کرتے ہو۔ ان کی تعریف کرو۔ مثلاً زید نے کہا "نیکی کرو" سقراط نے جرح کی کہ نیکی کیا ہے؟ کسی نے کہا "صداقت کی پیروی کرو۔" سقراط نے سوال کیا کہ صداقت کسے کہتے ہیں؟ غرضیکہ نیکی بدی جھوٹ سچ، اچھائی برائی، جسقدر بحث طلب باتیں ہیں ان سب کی صحیح تعریف مقدم ہے۔ اور جب تک کسی شے کی حد و بست نہ ہو اس وقت تک قائل کا مفہوم مخاطب کے ذہن میں قائم نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں زیادہ تر جھگڑے محض نزاعات لفظی[2] ہوتی ہیں اور اسی لئے والٹیر[3] نے کہا تھا کہ "اگر تم مجھ سے گفتگو اور مکالمت پسند کرتے ہو تو اپنی اصطلاحات کی تعریف کرنا سیکھو۔" اسی لئے ارسطو نے تعریف پر بڑا زور دیا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ تعریف میں دو باتیں ضروری ہیں، جنس اور فصل یعنی ایک تو یہ کہ چیز کی تعریف مد نظر ہے وہ کس جنس سے تعلق رکھتی ہے دوسرے یہ کہ اس میں امتیازی بات کون سی ہے جو اسے دوسری اشیاء سے جدا کرتی ہے مثلاً "انسان" کی تعریف، منطقی طور پر یوں ہوگی کہ انسان، حیوان ناطق ہے۔ حیوانیت وہ شے ہے جو امر مشترک ہے گھوڑا، بیل، مرغ، بلی، گائے وغیرہ سب حیوان ہیں، انسان بھی حیوان ہے لیکن "نطق" وہ صفت ہے جو سوائے انسان کے اور کسی حیوان میں نہیں پائی جاتی۔ پس اگر ہم انسان کو حیوان ناطق کہیں تو بالکل بجا ہے۔

اس کے بعد "کلیات" کا نمبر آتا ہے جو افلاطون اور ارسطو کے درمیان پہلی بنائے مخاصمت قرار پا سکتی ہیں اور انہی کی بدولت یورپ میں مدتوں تک خارجیت اور اسمیت کے مابین معرکہ آرائیاں رہیں۔ ارسطو کے نزدیک ہر اسم نکرہ ایک کلی ہے مثلاً حیوان، انسان، کتاب، درخت وغیرہ۔ لیکن یہ کلیات محض امور ذہنی ہیں۔ خارج میں ان کا وجود کہیں نہیں پایا جاتا۔ زید۔ بکر۔ خالد وغیرہ کا وجود خارج میں موجود ہے۔ لیکن "انسان کلی" کا وجود سوائے ذہن کے، دنیا میں کہیں موجود نہیں۔

اس کے برخلاف افلاطون کی تعلیم یہ تھی کہ حقیقی وجود صرف کلیات ہی کا ہے یعنی زید فانی ہے مگر انسان باقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ارسطو اور افلاطون کے درمیان اس مسئلہ پر بدیہی اختلاف رونما ہو گیا۔ گویا ایک دوسرے کے بالکل برعکس تعلیم دیتا ہے افلاطون کہتا ہے کہ کلی کا وجود حقیقی ہے، جزئی کا وجود اعتباری ارسطو کہتا ہے کہ کلی کا وجود اعتباری ہے۔ جزئی کا وجود حقیقی، اور اسی سلسلہ میں اس کا یہ قول بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ "اگرچہ میں افلاطون کو بہت عزیز رکھتا ہوں لیکن "صداقت" کو اس سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہوں"

ارسطو ہی وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے منطق میں قیاس یعنی (Syllogism) کو داخل کیا۔ قیاس تین قضایا، صغریٰ کبریٰ اور نتیجہ سے مرکب ہوتا ہے مثلاً ہر انسان حیوان ناطق ہے۔ اور سقراط، انسان ہے لہذا سقراط، حیوان ناطق ہے۔ گویا قیاس منطقی، دراصل علم ہندسہ کے اصول کے موافق ہے کہ اگر دو چیزیں تیسری چیز کے برابر ہوں تو وہ آپس میں بھی برابر ہونگی یعنی اگر الف برابر ہے ب کے اور ج برابر ہے الف کے تو ج برابر ہے ب کے و علیٰ ہذا القیاس۔

(۲) مبادیات سائنس

رینان نے حیات المسیح میں کیا خوب لکھا ہے کہ "دنیا میں

[1] تعریف۔ [2] لفظی جھگڑا۔

[3] والٹیر (۱۶۹۴ء - ۱۷۷۸ء) Voltaire فرانس کا مشہور ادیب، نقاد، فلسفی اور سیاست دان۔

فلسفہ کی بنیاد سقراط نے ڈالی اور سائینس کی بنیاد ارسطو کی بدولت پڑی اور فلسفہ وسائینس کا جو عظیم الشان قصر آج طیار ہوا ہے وہ فی الحقیقت انہی بنیادوں پر ہوا ہے جو سقراط اور ارسطو نے ڈالی تھیں"

دنیا میں سقراط سے پہلے بھی فلسفہ کا وجود تھا اور ارسطو سے پہلے بھی سائینس کا چرچا تھا لیکن ان دونوں سے پہلے فلسفہ اور سائینس تمامتر دینیات[۱] کے رنگ میں رنگیں تھے۔ لوگ جملہ مظاہر فطرت کی تشریح میں اپنے مقامی دیوی دیوتاؤں کا نام لینا کافی سمجھتے تھے۔ گویا جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے وہ سب انہی کی کارفرمائی ہے۔ سب سے پہلے یونانی فیلسوف طالیس (۵۵ - ۴۰ ۶ ق م) نے لوگوں کو یہ بتایا کہ جس سورج کو تم اپنا خدا سمجھتے ہو وہ آگ کا ایک بڑا بھاری گولہ ہے۔ اس کے بعد اینگزیمنڈر۔ اینگزیمنز۔ انگساغورث اور حمرتلسطوس نے ہیئت، نجوم، فلکیات اور طبیعیات میں حتی المقدور انکشافات کئے۔ ایمپیڈاقلیز نے سب سے پہلے یہ حقیقت آشکار کی کہ دنیا میں ہر شے تدریجی ترقی کر رہی ہے گویا مسئلہ ارتقاء کی بنیاد اسی شخص کی ڈالی ہوئی ہے۔ اس کا قول ہے کہ فطرت راتدن، مادہ کے مختلف ذرات میں عمل کرتی رہتی ہے۔ اور حسب ضرورت اشیاء تیار ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے بعد لیسی تپا اور دیمقراطیس دونوں نے، یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ کائینات سراسر سالمات[۲] مادی کے مظاہر مختلفہ کا نتیجہ ہے اور ازلی ابدی ہے۔ جب ایک شے فنا ہو جاتی ہے۔ تو دوسری شے اس کی جگہ آجاتی ہے مادہ فنا نہیں ہوسکتا صرف صورت تبدیل ہوجاتی ہے نتیجہ یہ نکلا کہ روح اور خدا دونوں کا کوئی وجود نہیں۔

یہ ہے خاکہ اس سائینس کا جو ارسطو سے پہلے دنیا میں مروج تھا۔ اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ قدیم الایام میں یونانیوں نے سائینس میں کوئی قابل تعریف کام نہیں کیا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یونانی لوگ آرام طلب تھے اور ان کی توجہ زیادہ تر سیاسیات، اخلاقیات اور اقتصادیات ومعاشیات وغیرہ کی طرف مبذول رہتی تھی۔

ارسطو پہلا شخص ہے جس نے سیاسیات کے ساتھ ساتھ سائینس کی طرف بھی کافی توجہ مبذول کی۔ اور اپنے استاد کے اصولوں سے ایک قدم آگے بڑھا کر اپنا وقت تجربہ ومشاہدہ میں صرف کیا۔

ارسطو اور طبیعیات

ارسطو نے اپنی طبیعات کو مابعد الطبیعیات کے رنگ میں لکھا ہے یعنی اسکی طبیعیات دراصل مادہ، حرکت، مکان، زمان، فضا، علت، معلول، لامتناہیت اور دیگر تصورات پر مبسوط مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس کے بعد دیمقراطیسی خلاء پر اعتراضات کئے گئے ہیں۔ جن میں سے قابل تذکرہ یہ ہے کہ کائینات میں "خلاء" محال ہے کیونکہ "خلاء" میں تمام اجسام یکساں سُرعت کے ساتھ ساقط ہونگے اور یہ ناممکن ہے۔ ارسطو نے دیمقراطیس ہی پر اعتراضات نہیں کئے ہیں بلکہ کوئی فلاسفر اس کے ناوک اعتراض سے محفوظ نہیں رہا۔ بقول بیکن۔ "ترکانِ عثمانی کی طرح، ارسطو بھی یہی سمجھتا تھا کہ جب تک میں اپنے بھائیوں کو تہ تیغ نہیں کرونگا۔ اس وقت تک، تخت حکومت پر قرار نصیب نہ ہوگا (ترقئ علوم، باب سوم فصل چہارم)

ارسطو نے علم ہیئت میں، کوئی معتدبہ اضافہ نہیں کیا۔ فیثاغورثی نظام کے خلاف، ارسطو نے زمین کو، بجائے آفتاب کے، مرکز کائینات قرار دیا ہے۔ لیکن فلکیات اور علم الکائینات والجو میں اس نے نہایت صحیح مشاہدات اور دلچسپ خیالات ظاہر کئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ آفتاب کی کرنیں پانی کو بخار کی شکل میں تبدیل کرتی ہیں اور بخارات کرۂ ہوائی میں جاکر بادلوں کی صورت میں، بدل جاتے ہیں اور جب ان کا بوجھ زیادہ ہوجاتا ہے تو پھر وہ زمین پر، بوندوں کی شکل میں ٹپک پڑتے ہیں۔

ارسطو اور علم الحیوۃ

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ دنیا میں پہلا شخص ارسطو ہے۔ جس نے "باغ وحوش" کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ سالہا سال تک مشاہدہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پہ پہنچا کہ حیات کی مختلف شکلیں (انسان، حیوان، گھوڑا، پرند کیڑا وغیرہ) اس ترتیب کے ساتھ ایک سلک میں منسلک کیجاسکتی ہیں کہ باہم امتیاز کرنا دشوار ہے۔ اسی طرح حیات کے ہر پہلو میں بھی بتدریجی منازل پائے جاتے ہیں، اور فطرت، عالم حیوانات اور نباتات میں ایسا باریک خط امتیازی قایم کرتی ہے جسکا شناخت کرنا بھی دشوار ہے بعض انواع ایسی ہیں جن کا شمار نہ نباتات میں ہے نہ حیوانات میں۔ ادراک اور احساسات، آہستہ آہستہ انہی اجسام میں پیدا ہوتے ہیں جن میں عضوی پیچیدگیاں زیادہ ہوجاتی

---

[۱] Theology [۲] atoms

ہیں۔ اور اسی طرح، رفتہ رفتہ اجسام میں نظام عصبی اور دماغ پیدا ہوا، جس پر نفس ناطقہ حکمرانی کرنے لگا۔ بایں ہمہ تعجب اس بات کا ہے کہ ارسطو نے ان مشاہدات کی بنا پر "نظریۂ ارتقاء" کی بنیاد کیوں نہیں ڈالی۔ ایمپیڈ اقلیز کا خیال تھا کہ اعضائے جسمانی بقائے اصلح کا نتیجہ ہیں اور انکسا غورث کا مقولہ ہے کہ انسان میں، اعضائے جسمانی سے کام لینے ہی کی بدولت عقل و شعور پیدا ہوا لیکن ارسطو کہتا ہے کہ نہ اعضائے جسمانی بقائے اصلح کا نتیجہ ہیں اور نہ ان سے کام لینے کی بدولت شعور پیدا ہوا بلکہ شعور کی بدولت، انسان نے اپنے اعضائے جسمانی سے کام لینا سیکھا۔

چونکہ ارسطو کے وقت میں نعش پر عمل جراحی کرنے کا رواج نہ تھا اس لئے تشریح الاعضا میں، اس نے اکثر مقامات پر غلطیاں ہوئی ہیں۔ وہ اس بات سے واقف نہ تھا کہ جسم انسانی میں "عضلات" بھی ہوتے ہیں۔ شرائین اور معمولی رگوں میں امتیاز نہیں کرتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ دماغ، خون کو ٹھنڈا کرنے کا آلہ ہے اور آدمی کی کھوپڑی میں، عورت کی کھوپڑی سے زیادہ جوڑ ہوتے ہیں، جسم انسانی میں دونوں طرف آٹھ آٹھ پسلیاں ہوتی ہیں، اور آدمی کے دانت عورت کے دانتوں سے تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو کو کبھی عورت کے دانتوں کے شمار کرنے کا موقعہ نہیں ملا!!! لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں۔ کہ اس کے تعلقات، اپنی بی بی کے ساتھ نہایت خوشگوار رہتے تھے!!!

تاہم اس نے علم الحیوٰۃ کو سابقین کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی دی۔ وہ لکھتا ہے کہ پرندے اور رینگنے والے جانور بناوٹ کے لحاظ قریب قریب ہوتے ہیں اور بندر انسان اور حیوانات کی، درمیانی کڑی ہے۔ انسانی بچے کی روح، بلحاظ خواص حیوانات سے مشابہ ہوتی ہے۔ خوراک انسان کے خیالات اور طرز حیات کو بڑی حد تک متاثر کرتی ہے۔ اور ایک حیوان جسقدر زیادہ نشوونما یافتہ ہوگا اُسی قدر کم اس کی اولاد ہوگی۔

علاوہ بریں علم الجنین میں بھی ارسطو ہی نے ابتدائی اصول قائم کئے۔ ہپوقراطیس نے، جو یونانی اطبا میں سب سے زیادہ نامآور اور قابل گزرا ہے۔ مرغی کے انڈوں کو ایک مرغی کے نیچے رکھا اور روزانہ ایک انڈا توڑ کر یہ تجربہ کیا کہ بچہ کس طرح بنتا ہے۔ ارسطو نے بھی اسی اصول پر عمل کیا اور اس میں ایسے ایسے انکشافات کئے کہ آج بھی اس فن کے ماہرین اس کی جودت طبع کا اعتراف کرتے ہیں۔ قانونِ توارث[۱] کے سلسلہ میں بھی ارسطو نے بہت کچھ طبع آزمائی کی ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ ایک یونانی عورت نے ایک حبشی کے ساتھ شادی کی۔ بچے بالکل گورے چٹے پیدا ہوئے لیکن جب ان بچوں کی شادی ہوئی تو ان کی سب اولاد کالی سُرمہ پیدا ہوئی۔ فی الجملہ، تمام کوتاہیوں سے قطع نظر کرکے، ہم یہ بات بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ارسطو نے اس ضمن میں یعنی علم الحیوٰۃ میں جو کچھ تحقیقات کی وہ لائق صد آفریں ہے۔

(۳) مابعد الطبیعیات

ارسطو کی مابعد الطبیعیات، اُس کے علم الحیوٰۃ پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ کائنات میں ہر شے ترقی پذیر ہے اور بلا سبب یا بغیر علت نہیں پائی جا سکتی اور اس کے لئے چار علتوں کی ضرورت ہے۔ مادی، صوری۔ فاعلی اور غائی۔ ہر واقعہ یا مظہر کے لئے یہ چار اسباب ضروری ہیں۔ مثلاً "میز" یا "کرسی" کو بطور مثال لے لیجیے۔ لکڑی جس سے وہ بنی ہے، اس کی علتِ مادی ہے۔ چار ٹانگیں اور اوپر کا تختہ، یہ اس کی علت صوری ہے۔ بڑھئی اور آلات علت فاعلی ہیں۔ میز لکھنے کے لئے اور کرسی بیٹھنے کے لئے بنائی گئی ہے یہ اس کی علت غائی ہے۔

دنیا میں جو نشوونما نظر آتی ہے وہ محض امر اتفاقی نہیں ہے۔ بلکہ، ہر شے میں ایک خاص مقصد، پوشیدہ ہے اور ہر شے کی صورت نوعی، اس شے کو منزل مقصود کی طرف رہنمائی کرتی رہتی ہے۔ مثلاً مرغی کے انڈے سے مرغی ہی کا بچہ برآمد ہوا اور ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ مرغی کے انڈے سے بطخ کا بچہ نکل آئے۔

ایک ایسی ہستی کا اثبات کرنا جو متحرک مؤثر، قائم بالذات، واجب الوجود اور علۃ العلل ہے، ارسطو کی مابعد الطبیعیات کا سب سے زیادہ روشن پہلو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کا طرز استدلال یہ ہے:۔

---

[۱] Law of Heredity

[۲] اس مسئلہ پر، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" میں نہایت وضاحت کے ساتھ بحث کی ہے۔ ۱۲

اگر کائنات میں کوئی شے غیر قابلِ فنا ہے تو پھر کوئی جوہر غیر قابلِ فنا (ایسی بھی) ہونا چاہیے جو اس شے کے لئے بمنزلہ بنیاد قرار دیا جا سکے۔ زمان و مکان ہر دو، غیر قابلِ فنا ہیں۔ پس کوئی غیر قابلِ فنا "جوہر" بھی ضرور موجود ہے۔ علاوہ ازیں، اگر کوئی واجب الوجود[1] محرک نہ ہو، جو بالذات فاعل اور متحرک ہے، تو بہت سے مظاہر کائنات کی تشریح نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اگر وہ محرک، بالذات محرک نہ ہو اور اگر حرکت دینا، اس کا تقاضائے ذاتی نہ ہو تو ممکن ہے کہ کسی وقت وہ حرکت سے باز رہے اور کائنات ساکن اور جامد ہو جائے یہ علت، متحرک ہے۔ یہ علت، واحد ہے کیونکہ صرف وہی بذاتِ خود، تمام مظاہر کی علت قرار پا سکتی ہے اس لئے کسی دوسری "علت" کے تسلیم کرنے کی ضرورت یا حاجت ہی نہیں ہے۔ علاوہ بریں حرکت مستقل یعنی دوامی اور ازلی ہے اور جو شے دوامی ہے وہ منطقی طور پر "الواحد" ہی سے سرزد ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں، محرک ازلی چونکہ قوت نہیں بلکہ فعلیت ہے اس لئے "مادہ" سے پاک ہے اور چونکہ مادہ بنائے کثرت ہے اس لئے جو شے ازلی محرک اور مادہ سے پاک ہے وہ اشیائے متعدد میں منقسم نہیں ہو سکتی یعنی اس میں کثرت نہیں پائی جا سکتی لہٰذا واحد ہی ہوگی۔ یہ علت جمیع عوارض، قیود، اور حدود سے بھی پاک ہے یعنی "ممکن" نہیں، پس "واجب" ہے۔

نوٹ ۱: "ممکن" اس شے کو کہتے ہیں جس کا ہونا اور نہ ہونا دونوں مساوی ہوں اور "واجب" اسے کہتے جس کا نہ ہونا ممکن نہ ہو۔ ۱۲

نیز یہ علت چونکہ غیر مادی ہے اس لئے غیر متغیر، غیر قابل تقسیم غیر قابلِ فنا، غیر متحد، لامحدود، لاتجزّی[2]، اور غیر مشہور ہے۔

اگرچہ، یہ ذاتِ واجب، حواسِ خمسہ ظاہری سے محسوس نہیں ہو سکتی۔ لیکن عقلِ سلیم، اس کے وجود پر استدلال کر سکتی ہے اور نفسِ ناطقہ، اس کی ہستی کا ادراک کر سکتا ہے۔ یہ علت العلل، زبدۂ کائنات، جامع کمالاتِ حسنہ، اور مقصودِ موجودات ہے۔ مدبر الامور ہے اور تدبر اس کا خاصۂ ذاتی ہے۔ فاعل بالذات ہے یعنی اس پر ایک لمحہ کے لئے بھی "تعطل" عارض نہیں ہو سکتا۔ اس کی ذات، عین صفات ہے اور صفات، عین ذات ہیں۔ یہ علت العلل، ذات واجب الوجود، بذاتِ خود علم بھی ہے عالم بھی اور معلوم بھی۔ گویا غالب نے اسی شعر میں، ارسطو ہی کے فلسفہ کو بیان کیا ہے:-

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

اور صوفیائے کرام نے بھی اسی سے ملتا جلتا خیال ظاہر کیا ہے:-

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گِلِ کوزہ
خود بر سرِ آں کوزہ خریدار بر آمد

شوئیگلر لکھتا ہے کہ ارسطو نے اپنی مابعد الطبیعیات میں جو نقشہ خدا تعالیٰ کا بیان کیا ہے وہ ایسا ہے کہ بہترین اور پاکیزہ ترین مذہب بھی بخوشی تمام اس کو اپنی الٰہیات میں شامل کر سکتا ہے۔ پھر ارسطو لکھتا ہے "چونکہ خدا غیر مادی ہے اس لئے نہ اس میں جذبات ہیں نہ احساسات نہ تاثرات نہ خواہشات، خدا ادراک محض ہے۔ چونکہ خدا سے کوئی شے ارفع تر نہیں اور چونکہ اس کی قوت متخیلہ، بہترین شے کا تصور کرتی ہے اس لئے خدا خود ہی عالم ہے اور خود ہی معلوم۔ خدا تمام نقائص اور عیوب سے پاک ہے۔ وہ کرب والم یا راحت و سرور سے متاثر و متکیف نہیں ہو سکتا۔ چونکہ خدا، کائنات کی علت غائی ہے اس لئے وہ ہر شے میں موجود بھی ہے۔ اور ہر شے سے وراء الوراء[3] بھی ہے۔ وہ کائنات کے لئے قانون بھی ہے اور مقنن بھی، انتظام بھی ہے۔ اور منتظم بھی، تدبر بھی ہے اور مدبر بھی۔ اور چونکہ وہ واحد بالذات ہے اس لئے کائنات بھی ایک ہی ہو سکتی ہے اور اس کے بالعکس چونکہ کائنات میں "وحدت" نظر آتی ہے۔ اس لئے اس کا بنانے والا بھی "واحد" ہے۔ اور زمین و آسمان کا نظام اسی "وحدت" پر مبنی ہے۔ خدا کی ہستی پر ارسطو نے حرکت سے استدلال کیا ہے یعنی کائنات میں حرکت کا وجود متحقق ہے۔ حرکت، بغیر متحرک کے پائی نہیں جا سکتی پس اگر ہم "حرکت" کی

---

۱ اس دلیل کو ڈاکٹر سیموئیل کلارک نے اپنی مشہور عالم تصنیف اثبات واجب الوجود میں بصراحت تمام بیان کیا ہے۔ ۱۲

۲ جس کے اجزا نہ ہوں۔

۳ علیحدہ

۴ اس دلیل کو علامہ ابن مسکویہ نے اپنی مشہور تصنیف "الفوز الاصغر" میں بوضاحت تمام بیان کیا ہے۔ ۱۲

علت کے سلسلہ کو ابد تک لیجانا صریحی طور پر خلاف عقل سمجھتے ہیں۔
تو لامحالہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ کوئی متحرک ایسا ہے جو تمام حرکت کا باعث ہے اور خود اسے حرکت نہیں - پس یہ علت العلل ہی خدا ہے۔

ارسطو نے خدا کا جو تصور پیش کیا ہے وہ وراء العقل نہیں کیونکہ اگر ہم خدا تعالیٰ کو بذریعہ عقل شناخت نہیں کر سکتے تو پھر خدا کا عدم اور وجود برابر ہو جائیگا یا ہم محض اک "خیالی خدا" پر اعتقاد رکھنے پر مجبور ہونگے - یہ سچ ہے کہ کوئی انسان خدا کو نہ تو اس طرح جان سکتا ہے جیسا کہ وہ خود اپنے آپ کو جانتا ہے، اور نہ کوئی شخص اس کی ماہیت کو سمجھ سکتا ہے - لیکن اسقدر ضرور معلوم کر سکتا ہے کہ کوئی ہستی، اس کائنات کی منتظم اور مدبر ضرور ہے - رٹر لکھتا ہے "ارسطو، افلاطون کی طرح، شر کو ماہیت اشیاء سے منسوب نہیں کرتا بلکہ مادہ کو ہر طور، خواہ اس سے خیر سرزد ہو یا شر، خدا کے ساتھ ازلی مانتا ہے - خدا مادہ کا خالق نہیں صرف صانع ہے اور مادہ کی مختلف قوتوں کو "فعلیت" میں مبدل کرتا رہتا ہے"۔ (ارسطو نے مسئلہ خیر و شر پر کچھ نہیں لکھا)

(۴) مبادیاتِ علم النفس

اگرچہ ارسطو کی نفسیات بعض مقامات پر مبہم ہے تاہم اس میں بہت سے دلچسپ مقامات بھی ہیں - ارسطو عادت پر بہت زور دیتا ہے - اور اسی نے عادت کو سب سے پہلے "طبیعت ثانیہ" سے تعبیر کیا، اور "تلازمۂ تصورات" کا قانون دریافت کیا - لیکن نفسیات کے دو اہم مسائل یعنی جبر و اختیار اور بقائے روح پر اس نے کوئی قولِ فیصل پیش نہیں کیا - کتاب الاخلاق میں بعض اشارات مثلاً "ہم اپنی حالت کذائی کو تبدیل نہیں کر سکتے" جبر پر دلالت کرتے ہیں اور بعض تصریحات مثلاً "ہم اپنا ماحول، اپنی مرضی سے منتخب کر کے، اپنی آئندہ حالت کو حسب مرضی جس سانچہ میں چاہیں، ڈھال سکتے ہیں، اختیار پر اشارت کرتی ہیں۔

ارسطو کے نزدیک روح، نظام عضوی کے اصول حیات کا نام ہے - پودوں اور درختوں کی روح، صرف ان کی "قوت تغذیہ" ہوتی ہے - حیوانات کی روح، صرف ان کی قوت احساس و حرکت ہی ہوتی ہے - لیکن انسان کی روح علاوہ قوت احساس کے قوت متخیلہ اور مفکرہ سے بھی متصف ہوتی ہے - روح، بغیر جسم کے نہیں پائی جا سکتی اور نہ وہ جسم میں اس طرح داخل ہوتی ہے کہ کوئی شے باہر سے آگئی، اور نہ وہ مادی ہے، اور نہ فنا پذیر - لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ جب ارسطو روح کو ابدی کہتا ہے تو اس کی مراد "نفس ناطقہ" سے ہوتی ہے نہ کہ اس لطیفۂ حیاتی سے جو تمام حیوانات میں مشترک ہے - روح تو جسم کے ساتھ ہی فنا ہو جاتی ہے - صرف معقولیت مُدرکہ ہی غیر فانی ہے۔

(۵) مبادیات اخلاق

ارسطو نے اس امر کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مادی دنیا (طبیعات) کے مسائل سے روحانی عالم (اخلاق) کے مسائل زیادہ وقیع ہیں۔
اگر ایک شخص یہ نہیں جانتا کہ پانی کن اجزاء سے مرکب ہے تو شاید اُسے اور اس کے ہمسایوں کو اسقدر تکلیف نہوگی، جسقدر اس صورت میں، اگر اُسے یہ نہ معلوم ہو کہ چال چلن اور سیرت کس طرح سنواری جا سکتی ہے؟ بہترین زندگی کیا ہوتی ہے؟ حیات انسانی کا اعلیٰ ترین مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ "نیکی" کیا ہے؟ شادمانی کیونکر حاصل ہو سکتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

بقول پروفیسر سنٹایانا* چونکہ ارسطو ایک سائیسدان تھا - اس لئے اس نے "علم اخلاق" میں جو اصول بنائے وہ نہایت معقول اور ممکن الحصول ہیں، اور فطرت انسانی کا نہایت سچا تخیل پیش کیا ہے۔
ارسطو نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ مقصد حیات نیکی نہیں۔ بلکہ "شادمانی" یا "راحت" ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

"ہم دنیا میں جو کچھ کرتے ہیں محض حصول شادمانی کے لئے، اگر ہم دولت، عزت، حکومت، دانش اور تندرستی کے لئے کوشاں ہوتے ہیں تو محض اسی لئے کہ ان چیزوں سے شادمانی حاصل ہوگی۔"

لہذا "شادمانی" کو مقصد حیات انسانی قرار دینا، عین ثواب ہے۔
لیکن ہمیں "شادمانی" کی نوعیت سمجھنا اور اس کے حصول کا طریقہ معلوم کرنا نہایت ضروری ہے، اور یہ بات اس صورت میں معلوم ہو سکتی ہے۔ جب ہم یہ جان لیں کہ انسان دوسرے حیوانات سے کن وجوہ کی بناء پر ممتاز ہوتا ہے - اور یہ ظاہر ہے کہ انہی "وجوہ" کو مدنظر رکھنے اور اور ان کے تقاضوں کو پورا کرنے سے شادمانی حاصل ہو سکتی ہے۔
اب یہ بات ادنیٰ تامل سے معلوم ہو سکتی ہے کہ جو چیز انسان کو جمیع

* زمانہ حال کے مشاہیر فلاسفہ میں سے ہے۔

حیوانات سے ممتاز کرتی ہے وہ قوتِ تخیل اور قوتِ ادراک ہے۔
پس عقل و فہم کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے ہی سے حقیقی شادمانی حاصل ہو سکتی ہے۔ اور "نیکی" یا "خوبی" کے حصول کا ذریعہ یہ ہے کہ انسان صحیح قوتِ تمیز و فیصلہ، ضبط و خودداری، انضباط خواہشات اور حوصلہ مندی سے کام لے اور اپنی قوتوں کو بہترین طریق پر استعمال کرے۔ انسانی سیرت (کیریکٹر) کے خواص یا صفات سہ گانہ طریق پر مرتب ہو سکتی ہیں جن میں سے اول و آخر طریق مذموم ہے اور درمیانی صورت مستحسن مثلاً بزدلی اور تہور کے مابین شجاعت، بخل اور اسراف کے مابین سخاوت گویا "خیر الامور اوسطہا" یعنی درمیانی طریق بہترین طریق ہے۔

ارسطو کے فلسفہ کا اثر

شاید، ارسطو کے علاوہ اور کوئی شخص ایسا نہیں پیدا ہوا، جس کے خیالات نے تمام، دنیا کے لوگوں پر، تمام زمانوں میں، اس درجہ اثر پیدا کیا ہو۔ اور نہ کسی شخص نے ارسطو سے بڑھکر، توسیع علم و حکمت اور اصلاح نفوس و عقول انسانی میں حصہ لیا، ارسطو کے بعد آجتک کوئی فلاسفر ایسا نہیں گزرا جس نے ارسطو سے استفادہ نہ کیا ہو۔ سکندریہ کی تہذیب و شائستگی کی بنیاد، اسی کے فلسفہ پر مبنی تھی۔ اس کی منطق نے زمانۂ وسطیٰ کی وحشی اور غیر مہذب یورپین اقوام کو آدمی بنانے میں کافی امداد کی۔ اس کی ساری تصانیف پہلے تو نسطوری[1] عیسائیوں نے سریانی زبان میں ترجمہ کیں۔ اس کے بعد دسویں صدی عیسوی میں عربوں نے، یونانی اور سریانی دونوں کو سامنے رکھکر عربی میں ترجمہ کیں، ابن رشد اندلسی نے جو ارسطو کے فلسفہ کا بہترین شارح گزرا ہے۔ یورپین اقوام کو عقل و حکمت کی شمع سے منور کیا اور علی الخصوص ایبلارڈ اور ایکو نیاس نے، جو مشہور مسیحی متکلمین گزرے ہیں، ارسطو کے فلسفہ کو عربی سے لاطینی سے ترجمہ کیا۔ اور بیکن اور ڈیکارٹ[2] کے زمانہ تک ارسطو کا فلسفہ مثل بائیبل کے الہام ربانی سمجھا جاتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اب کینٹ اور ہیگل کا دور دورہ ہے لیکن ارسطو کے احسانات سے دنیا نہ سبکدوش ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے کینٹ اور ہیگل بھی بالواسطہ اسی کے دسترخوان علم کے "زلہ ربا"[3] ہیں ۱۲

---

[1] قدیم عیسائیوں کے ایک فرقے کا نام ہے۔
[2] فلسفۂ جدید کا بانی، فرانس کا باشندہ تھا (۱۶۵۰ - ۱۵۹۶)
[3] خوشہ چیں یا ٹکڑا نوالہ اٹھا کر کھانے والا۔

اس کی بربادی میں بھی اک عافیت کا رنگ ہے
عقل اس ویرانہ سازی پر ہماری دنگ ہے
شورشِ موجِ رواں گویا صدائے چنگ ہے
مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

برسات کے مناظر

گلستاں کے مطربوں کو چہچہانا آگیا؛ مرغزاروں کو ہوا میں لہلہانا آگیا

مخملیں روئیدگی سے ڈھک گئے ہیں کوہسار ہر طرف ہے خوشنما دھانی درختوں کی قطار

ننھی ننھی کونپلوں سے لدگئی ہیں ڈالیاں جھومتی ہیں آہ! کس انداز سے ہریالیاں

پٹ گئی ہے نقرئی پھولوں سے باغوں کی زمیں بھینی بھینی نکہتوں سے ہے ہوا بھی عنبریں

موتیا کی تیز لپٹیں اور جُوہی کی مہک مست کرنیوالی بیلے اور چنبیلی کی مہک

وہ طرب زا ننھی چڑیوں کے سحرزا چہچہے؛ یا فضا میں آسمانی دیویوں کے قہقہے

آہ وہ سنسان راتوں میں گھٹاؤں کا ہجوم ہلکی ہلکی آور، متوالی ہواؤں کا ہجوم

اس خمار آگیں سمے میں گاہ جگنو کی چمک بادلوں کی چلمنوں میں گاہ تاروں کی دمک

بادلوں کا رات میں کھل کر برسنا دیکھ لو
دیکھنے والو! پڑیگا پھر ترسنا دیکھ لو

(غیر مطبوعہ)

اختر انصاری
(دہلوی)

آرزو

ذرّوں کو آفتاب کے ساغر کی آرزو اور مجھ کو تیری چشم فسوں گر کی آرزو

دوشِ نسیم صبح پہ اڑتی ہے بوئے گل ہے عشرتِ نمودِ گلِ تر کی آرزو

اہلِ فنا کو عار ہے ہستی سے اسقدر خاکِ مزار کو بھی ہے صرصر کی آرزو

اللہ رے تیرہ کاری نورِ چراغِ حسن ہے داغِ لالہ سے شعلۂ احمر کی آرزو

کم ہے حرارتِ می رنگیں میرے لئے ہے میرے دل کو سوزشِ اخگر کی آرزو

طور کلیم خاکِ مدینہ میرے لئے
ہے مجھ کو خاکِ پائے پیمبر کی آرزو

(غیر مطبوعہ)

عطاءاللہ کلیم

کاچا اور دیویانی

نوجوان اور حسین کاچا خلد بریں سے بقائے دوام کا راز دریافت کرنے کے لئے اس دنیا میں آیا تھا۔ اور دیتوں کے استاد کو یہ راز معلوم تھا۔ اس کی لڑکی کاچا پر عاشق ہوگئی۔ ...... ٹاگور

کاچا۔ دیویانی۔ وقت آگیا ہے کہ میں رخصت ہوجاؤں۔ میں نے تمہارے پتا سے کئی چیزوں کی تعلیم حاصل کی ہے۔ اور آج اس کی تعلیم ختم ہوگئی۔ مجھے اجازت دو کہ میں واپس سورگ لوک چلا جاؤں۔

دیویانی۔ تم نے وہ شے حاصل کرلی ہے جس کی دیوتا خواہش کرتے ہیں۔ لیکن ذرا سوچو کیا اس شے کے سوا تمہیں کبھی اور شے کی خواہش نہیں۔

کاچا۔ نہیں۔

دیویانی۔ کچھ نہیں! کسی شے کی خواہش نہیں! اپنے دل کو ٹٹولو۔ کیا تمہارے دل کی گہرائیوں میں کوئی شرمیلی سی آرزو نہیں لرز رہی۔ جیسے مرجھانے کا جل جانے کا خوف ہو۔

کاچا۔ میرے لئے کامیابی کا سورج چڑھ چکا ہے۔ اور اس کی جوت کے سامنے تاروں کی روشنی ماند پڑ گئی ہے۔ میں نے اس علم پر عبور حاصل کرلیا ہے۔ جو زندگی بخشتا ہے۔

دیویانی۔ تو پھر تم دنیا کے تنہا خوش نصیب اور مسرور آدمی ہو۔ آہ! اب میں محسوس کرتی ہوں کہ اس اجنبی دنیا میں رہنا تمہارے لئے کتنا تکلیف دہ ثابت ہوا ہوگا۔ اگرچہ ہم نے اپنی انتہائی کوششیں صرف کردیں لیکن تمہارے دل کو شگفتہ نہ کرسکے۔

کاچا! یہ تلخ کلامی کیسی مسکراؤ اور مجھے جانے کی اجازت دو۔

دیویانی۔ مسکراؤں! لیکن میرے دوست! یہ دنیا تمہارا سورگ نہیں ہے مسکراہٹیں اس دنیا میں اتنی سستی نہیں ہیں۔ جہاں پیاس پھول کے کیڑے کی طرح دل کو کھا جاتی ہے۔ جہاں ناکام آرزوئیں محبوب کے گرد رقص کرتی ہیں۔ جہاں یاد گمشدہ مسرت کے لئے احمقانہ طور پر ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہے۔

کاچا! دیویانی! مجھے بتاؤ تم مجھ سے کیوں خفا ہو!

دیویانی۔ کاچا۔ کیا اس ہرے بھرے اور گھنے جنگل سے جاتے ہوئے تمہیں کوئی رنج نہیں ہوتا۔ جس کے سائے تم پر اتنا عرصہ چھائے رہے ہیں۔ کیا تم ہوا کو کانپتے ہوئے سایوں میں سے گزرتے ہوئے۔ کراہتے ہوئے نہیں محسوس کرتے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ خشک پتے گمشدہ امیدوں کی روحوں کی طرح ناچ رہے ہیں۔ صرف تمہارے چہرے پر ایک تبسم ہے۔ تم ہم سے جدا ہو کر جا رہے ہو۔

کاچا۔ اس ہرے بھرے جنگل نے مجھ سے ماں کا سا سلوک کیا ہے۔ اسی جگہ گویا میں نے دوبارہ جنم لیا ہے۔

دیویانی۔ جب تم گلے کو چرانے کے لئے لاتے تھے تو وہ گھنا سایہ دار درخت تم پر اپنی شاخیں پھیلا دیتا تھا تاکہ تمہارے تھکے ہوئے اعضا کو آرام حاصل ہوسکے۔

کاچا! اے جنگل کے آقا! میں تجھے پرنام کرتا ہوں۔ جب دوسرے طالب علم تیرے سایے میں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کے ساتھ اپنے سبق دہرائینگے۔ اس وقت مجھے بھی یاد کرلینا۔

دیویانی۔ اور ہماری ندی وینومتی کا بھی خیال رکھنا! جس کا تیز رو پانی مترنم محبت کا آبشار ہے۔

کاچا۔ مجھے یہ ندی ہمیشہ یاد رہیگی۔ بن باس میں اس ندی نے مجھے تھپک تھپک کر کئی بار سلا دیا ہے۔ یہ ندی ایک بے پرواہ دیہاتی لڑکی کی طرح اپنے نہ ختم ہونے والے کاموں پر مسکراتی ہے اور سادہ سا گیت گاتی ہے۔

دیویانی۔ لیکن میرے دوست! میں تمہیں یاد کراتی ہوں کہ ان کے علاوہ تمہارا ایک اور بھی دوست تھا جو تمہاری جلا وطنی کی تکلیف کو کم کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

کاچا - اس محبوب دوست کی یاد میری زندگی کا ایک جزو بنگئی ہے۔

دیوایانی - مجھے وہ دن یاد ہے جب تم پہلے پہل یہاں آئے تھے تم بیٹھے تھے۔ باغ کے جنگلے کے قریب کھڑے ہو کر تم مسکرا رہے تھے۔

کاچا! اور میں نے یہ دیکھا کہ تم پھول چن رہی ہو۔ سفید لباس پہنے ہوئے۔ عین اس طرح جس طرح صبح نور کے لباس میں نہا جاتی ہے۔ اور میں نے کہا تھا "مجھے مدد دینے کی اجازت دیکر سرفراز کرو۔"

دیوایانی - اور میں نے تعجب سے پوچھا تھا "تم کون ہو" اور تم نے عاجزی سے جواب دیا تھا میں دیوتا ... کے ایک رشی کا لڑکا ہوں۔ اور تمہارے باپ سے امرت کا راز سیکھنے آیا ہوں۔ ایسا امرت جو مردوں کو زندہ کر دے۔

کاچا - میں ڈرتا تھا کہ شاید تمہارے پتا مجھے یہ راز بتانے سے انکار کر دیں۔

دیوایانی - لیکن جب میں نے تمہاری سفارش کی تو وہ انکار نہ کر سکے۔ ان کو اپنی بیٹی سے بہت محبت تھی۔

کاچا - تین بار حسد سے جلنے والے ٹیٹنوں نے مجھے مار دیا۔ اور تم نے اپنے پتا کو کہکر پھر مجھے زندہ کر دیا۔ تمہارا احسان اور میرا شکریہ امٹ ہے۔

دیوایانی - شکریہ! سب کچھ بھول جاؤ کاچا! اور مجھے کسی بات کی پرواہ نہ ہوگی۔ مجھے کوئی رنج نہ ہوگا۔ کیا تم صرف فائدوں کو یاد رکھتے ہو۔ احسانوں کا خیال کرتے ہو۔ اگر دن بھر سبق پڑھنے کے بعد شام کی خاموشی میں ایکبار بھی تمہارا دل کسی نامعلوم مسرت سے لرزنے لگا ہو تو اس لرزش کو یاد کرو۔ شکریے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر کسی کے گزرتے ہوئے گیت کا کوئی حصہ تمہارے سبقوں میں ملکر رہ گیا ہو۔ یا کسی سانس کی سرسراہٹ نے تمہارے مطالعے کو مسرت سے لرزا دیا ہو۔ تو سورگ میں فرصت کے وقت اس لرزش کو یاد کرو۔ آہ! صرف احسان۔ صرف فائدے۔ حسن۔ محبت .... کچھ نہیں۔

کاچا - کچھ چیزیں الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتیں۔

دیوایانی - میں جانتی ہوں۔ میری محبت نے تمہارے دل کے انتھاہ سمندر کی گہرائی کو پا لیا ہے۔ اور اس محبت کی وجہ سے مجھے اتنی جرأت ہوئی ہے کہ میں تمہارے سرد مہری کے باوجود تم سے ایسی باتیں کروں۔ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ یہیں رہو۔ شہرت مسرت کا باعث نہیں بن سکتی۔ دوست تم اب نہیں جا سکتے۔ میں نے تمہارا راز پا لیا ہے۔

کاچا! نہیں۔ نہیں۔ دیوایانی!

دیوایانی - نہیں! کیا جھوٹ نہ کہو۔ محبت کی نظر گہری ہے اور آسمانی ہے۔ ہر روز تمہارے سر کی جنبش۔ تمہارے ہاتھ کی حرکت۔ تمہاری آنکھوں کی ایک نگاہ اسی طرح محبت کا پیغام دیتی تھی جس طرح سمندر لہروں کی زبانی باتیں کرتا ہے۔ یکایک میری آواز تمہارے دل کو لرزا دیتی تھی۔ کیا میں نے یہ منظر نہیں دیکھا! میں تمہیں جانتی ہوں۔ اور تم میرے دائمی قیدی ہو۔ دیوتاؤں کا بادشاہ بھی اس رشتے کو نہیں توڑ سکتا۔ اس ضد کو نہیں مٹا سکتا۔

کاچا! دیوایانی۔ کیا اس بات کے لئے میں نے محنت کی ہے! اپنے گھر بار سے جدا ہو کر۔ رشتہ داروں کو چھوڑ کر اتنے سال صرف اس دن کے لئے تکلیفیں اٹھاتا رہا ہوں

دیوایانی - کیوں نہیں۔ کیا صرف علم ہی قیمتی ہے۔ کیا محبت سستی ہے۔ اس لمحے کو جانے نہ دو۔ جرأت کر کے اعتراف کرو کہ ایک عورت کی محبت اس تپسیا سے اچھی ہے جس کے ذریعے علم۔ قوت۔ اور شہرت حاصل ہوتی ہے۔

کاچا! میں نے دیوتاؤں کے سامنے اقرار کیا تھا کہ امرت لیکر واپس آؤنگا۔

دیوایانی - لیکن کیا یہ سچ ہے کہ تمہاری آنکھوں نے مطالعے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا۔ کیا تم نے کبھی مطالعہ چھوڑ چھاڑ کر مجھے پھولوں کے تحفے پیش نہیں کئے۔ کیا تم اس موقع کی تلاش میں نہیں رہے کہ کسی طرح پھولوں کو پانی دینے میں میری مدد کر سکو۔ وہ کیا شے تھی جس نے تمہیں مجبور کیا۔ کہ رات کے وقت جب دریا کے کنارے تاریکی جھکی ہوئی تھی عین اس طرح جس طرح محبت اپنی غمگین خاموشی پر جھک جاتی ہے۔ میرے ساتھ گھاس پر بیٹھ جاؤ۔ اور وہ گیت گاؤ جو تم تاروں کی انجمن سے سیکھ کر آئے تھے۔ کیا یہ تمام چیزیں ایک ظالمانہ سازش کا نتیجہ تھیں۔ جو تم

نے سورگ میں کی تھی۔ کیا یہ تمام چیزیں صرف اس لئے تھیں کہ تم میرے پتا کا دل موہ لو۔ اور کیا اب جاتے وقت تم مایوس اور فریب خوردہ محافظ کو شکریے کے کھوٹے اور بے قیمت سکے پھینک کر خوش کرنا چاہتے ہو۔

کاچا! مغرور عورت! سچائی کی دریافت سے کیا فائدہ ہوگا اگر محبت آمیز خلوص سے تمہاری خدمت کرنا غلطی تھی تو میں اس غلطی کی سزا۔ خوفناک سزا بھگت رہا ہوں۔ یہ وقت نہیں کہ میری محبت کی صداقت کا امتحان لیا جائے۔ میری زندگی کا کام میرے سامنے ہے سورگ میرا انتظار کر رہا ہے۔ اگرچہ آج کے بعد میرے دل میں ایک سرخ شعلہ بھڑکتا رہیگا جو خلا کو نگل جانے کی ناکام کوشش میں مصروف ہوگا لیکن میں رُک نہیں سکتا۔ میں سورگ جاؤنگا۔ لیکن آج کے بعد سورگ میرے لئے سورگ نہ ہوگا۔ میں نے مطالعے سے ایک راز دریافت کیا ہے اور میرا فرض ہے کہ دیوتاؤں تک یہ راز پہنچا دوں۔ مجھے معاف کر دو۔

دیویانی۔ اور سمجھ لو کہ اس غم کی وجہ سے جو بے ارادہ میں تم کو پہنچا رہا ہوں۔ میری تکلیف اور بھی بڑھ گئی ہے۔

دیویانی۔ معافی! تم نے میرے دل میں غصے کا ایک طوفان پیدا کر دیا ہے۔ اور اب میرا دل سخت ہو گیا ہے اور جل رہا ہے بجلی کی طرح۔ تم اپنے فرض اور اپنی شہرت کے لئے سب کچھ کر سکتے ہو۔ واپس جا سکتے ہو۔ لیکن میرے لئے کیا رہ گیا ہے؟ یاد کانٹوں کا ایک بستر ہے۔ اور میری پنہاں شرم میری زندگی کی جڑوں کو کاٹ کاٹ کر کھاتی رہیگی۔ تم ایک مسافر کی طرح آئے۔ دھوپ کی گھڑیوں میں میرے باغ کے سائے میں بیٹھے رہے۔ اور اپنا وقت کاٹنے کے لئے تم نے اس باغ کے تمام پھول چن لئے اور ان پھولوں سے ایک ہار بنا لیا۔ اور اب جاتے ہوئے تم نے اس ہار کو توڑ دیا اور تمام پھول زمین پر گر پڑے ہیں۔ خاک میں مل گئے۔ ملعون ہے وہ علم جو تم نے حاصل کیا ہے۔ ایک ایسا بوجھ ہے کہ لوگ اس کو اٹھانے میں تمہارے ساتھ شریک ہونگے۔ لیکن وہ کم نہ ہوگا۔ خدا کرے اطمینان تمہاری زندگی سے اتنا ہی دور رہے جتنے سرد مہر ٹھنڈے تارے کنواری رات کی بن بیاہی تاریکی سے۔

(ٹاگور)

عابدؔ

غزل

(از سید محمد ابراہیم نجم ندوی، عظیم آبادی)

آئی بہار، کیجئے سامانِ اضطراب　　پائے جنوں ہو اور بیابانِ اضطراب

ہنگامۂ نشاط سے فرصت جو پائیے　　جوہر دکھائے سرمیدانِ اضطراب

صبر و سکوں کا اور ہی ہوتا ہے رنگ ڈھنگ　　ہے میری خامشی میں بھی اک شانِ اضطراب

دل کیا مٹا کہ مٹ گئی وہ شورشِ تپش　　وابستہ اس کے ساتھ تھی کیا جانِ اضطراب

نجمؔ

(غیر مطبوعہ)

غزلیات

(۱)

کرتا ہوں برقِ قہر کا خوگر جگر کو میں
چھپ چھپ کے دیکھتا ہوں کسی کی نظر کو میں

کر دے اگر گداز اسے گرمیٔ سجود
کر لوں جبیں میں جذب ترے سنگِ در کو میں

اُن کو یہ ڈر، نہ آئے کہیں آستاں پہ حرف
مجھ کو یہ ضد کہ رکھ کے اٹھاؤں نہ سر کو میں

اللہ! اپنی نعمتِ عظمیٰ کو پھیر لے
ذوقِ نظر نہیں تو کروں کیا نظر کو میں

پَو پھوٹنے سے پہلے ہی دل جل بجھا مرا
کیا مُنہ دکھاؤں آج نسیمِ سحر کو میں

کٹتی نہیں ہے راہِ مصیبت کسی طرح
خنجر ملے تو ختم کروں اس سفر کو میں

آنکھوں میں کھچ کے آگیا سب حسرتوں کا خون
کہیے تو اب دکھاؤں نظر کے اثر کو میں

لو صحبتِ شبانہ کی لذت بھی مٹ چکی
حسرت سے دیکھتا ہوں چراغِ سحر کو میں

چھوڑے تھے جس کی آس پہ دونوں جہاں رسا
پوچھے وہی نہ بات تو جاؤں کدھر کو میں

(غیر مطبوعہ) رسا

(۲)

یہ عجب بہار ہے جلوہ گر، یہ عجیب فیضِ بہار ہے
کہ کلی کلی کا جگر سنانِ غمِ خزاں سے فگار ہے

ترے دستِ بامِ فروز سے جو مئے نشاط عطا ہوئی
مرا دل ہنوز اُسی کے کیف سے عرش زارِ خمار ہے

یہ چمن میں پریوں کے جمگھٹے ہیں کہ رنگ و نور کی محفلیں
یہ جمال ہوش ربا ہے پیشِ نظر کہ تختِ بہار ہے

رگِ اشتیاق میں اضطراب فگن ہے شعلۂ آرزو
کہ جنونِ عشق نگاہِ حسن کی شوخیوں پہ نثار ہے

یہ بہارِ شام، یہ منظرِ لبِ جوئبار، یہ محویت
کوئی نغمہ مطربِ خوشنوا ترا نغمہ جانِ بہار ہے

شبِ ماہتاب میں فصلِ گل کا نشاط خیز سماں عدم
یہ نگار خانۂ باغ ہے کہ بہشت زارِ بہار ہے

(غیر مطبوعہ) سید عبدالحمید عدم

مقفّل کمرہ

دفتر کی چار دیواری میں پانچ بجے تک دماغی کام کرنے کے بعد مَیں شہر سے باہر سیر کے لئے چلا گیا - اور کئی میل پیدل چلنے کے بعد تقریباً ۸ بجے شام واپس لوٹا - واپسی پر راستے میں سینما ہیں سے گزرتے ہوئے مَیں نے ایک عالیشان مگر غیر آباد مکان دیکھا - جس کے آگے ایک چھوٹا سا پارک تھا - کسی زمانے میں یہاں سیٹھ عبداللہ رہا کرتے تھے - اس مکان کو دیکھ کر مجھے سیٹھ عبداللہ کا خیال آگیا - اور مَیں اس زمانے کو یاد کرنے لگا جبکہ سیٹھ عبداللہ مشہور بینکر یکایک فرار ہوگیا تھا ——— لیکن ایک سانحہ نے میرے خیالات کے سلسلہ کو بالکل بدل دیا - سڑک کی ایک جانب سے ایک چوپہیہ گاڑی آرہی تھی - اور دوسری طرف ایک سائیکل کی زرد روشنی نظر آتی تھی - سائیکل سوار نے گاڑی کے آگے سے سڑک کو عبور کرنا چاہا لیکن بدقسمتی سے گھوڑے کے ساتھ ٹکرا کر گر پڑا - گاڑیبان نے گاڑی ٹھہرائی - مگر جب اسکو معلوم ہوا کہ ابھی تک اس کا نمبر دیکھا نہیں گیا - تو گاڑی دوڑا لے گیا - سائیکل سوار اپنا سائیکل اٹھا کر کھڑا ہوا لیکن سخت تکلیف کی وجہ سے وہ ایک منٹ بھی کھڑا نہ رہ سکا اور کراہتا ہوا پھر گر پڑا -

مَیں دوڑ کر اس کے پاس گیا اور پوچھا -

"کیا آپ کے چوٹ آئی ہے -"

"جی ہاں میرا گھٹنا زخمی ہوگیا ہے ——— کیا آپ میری مدد کریں گے ؟"

وہ سائیکل کی زرد روشنی میں پڑا ہوا تھا اور جب میں اسے اٹھانے کے لئے جھکا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک خوش پوش جوان لیکن کمزور آدمی تھا - اس کے چہرہ پر کرب واندوہ کے نقوش ثبت تھے - اس کی آنکھیں بڑی اور سیاہ تھیں - جب میں نے اسے ہاتھ کا سہارا دیا تو وہ کراہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا - اس نے ایک پاؤں زمین سے اٹھا لیا اور درد بھری آواز سے کہا -

"میرے پاؤں میں سخت تکلیف ہے - میں اسے زمین پر بھی نہیں رکھ سکتا ۔"

"آپ کہاں رہتے ہیں ؟"

"سامنے مکان میں رہتا ہوں میں شکر گزار ہونگا اگر آپ مجھے وہاں تک پہنچا آئیں ۔"

اس نے سیٹھ عبداللہ کے مکان کی طرف اشارہ کیا تھا -

چنانچہ مَیں نے ایک ہاتھ سے اسے سہارا دئے رکھا اور دوسرے سے اسکی سائیکل اٹھائی پھر مَیں ان کے ساتھ سیٹھ مذکور کے مکان کی طرف چل دیا -

ہم تاریک ہال کے دروازہ تک پہنچ گئے اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تالے میں چابی ڈال کر مجھ سے کہا -

"مَیں آپ کا بہت مشکور ہوں اب آپ تشریف لیجا سکتے ہیں ۔"

"نہیں ابھی آپ اس قابل نہیں ہوئے ۔"

اس نے کچھ بہانا کرنا چاہا لیکن آخر وہ بھی جان گیا کہ ابھی اسے میری مدد کی ضرورت تھی - پھر ہم نے دروازہ کھولا اور سائیکل کا لمپ اتار لیا اور وہ میرے بازو کا سہارا لئے ہوئے ہال کی دائیں جانب ایک کمرے میں داخل ہوا - وہاں وہ ایک آرام کرسی پر لیٹ گیا -

اس نے مجھے اپنی جیب سے دیا سلائی نکال کر دی اور کہا کہ مہربانی فرما کر آپ اس کمرے کا لمپ روشن کردیں - چنانچہ مَیں نے میز پر رکھے ہوئے لمپ کو روشن کرکے سائیکل کا لمپ بجھا دیا - اب اس نے ایک اطمینان کا سانس لیکر کہا -

"شکریہ !شکریہ !! اب آپ تشریف لیجا سکتے ہیں . . . . . مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی مہمان نوازی نہ کرسکا - میں معذور ہوں - امید ہے آپ مجھے معاف فرمائیں گے . . . . اچھا خدا حافظ ۔" . . . اور یہ کہتا ہوا وہ بیہوش ہوگیا - مَیں عجیب تذبذب میں پھنسا ہوا تھا - اس کا رنگ زرد ہوگیا تھا اور آنکھیں نصف کھلی اور نصف بند تھیں - وہ مجھ کو دوبار جانے کے لئے کہہ چکا تھا - لیکن ایسی حالت میں اس کو چھوڑ دینا خلاف مصلحت تھا -

——

خر میں نے گھنٹی بجانے کی رسّی کھینچی اور گھنٹی کو کسی دور کے
رے میں بجتے ہوئے سنا - کئی منٹ گزر گئے اور کوئی بھی میرے
س نہ پہنچا - میں نے خیال کیا کہ اتنی بڑی عمارت میں ایک لکھپتی
ا بیٹا اکیلا نہیں رہ سکتا یہاں پر کچھ لوگ اور بھی ہونے چاہئیں
ر وہ گھنٹی کا جواب نہیں دیتے تو میں خود ان کو تلاش کرونگا چنانچہ
ں نے لمپ اٹھایا اور کمرے سے باہر نکلا۔

لمپ کی روشنی میں جو کچھ میں نے دیکھا اس نے مجھے متحیّر
ر دیا - ان کمروں میں نہ فرش تھا نہ فرنیچر مدتوں سے دیواروں پر
نگ نہیں کیا گیا تھا - اور ہر طرف گرد جمی ہوئی تھی چھتوں میں
مکڑیوں نے جالے تنے ہوئے تھے - کمروں میں کبوتروں اور
ابیلوں کے گھونسلے تھے اور ان کی بیٹیں فرش پر جمی ہوئی تھیں
یں نے ہر جگہ تلاش کی لیکن وہاں پر مجھے کوئی شخص نہ ملا - سب کمرے
چھان مارے لیکن سب ہی ویران پائے کمرے میرے بوٹ کی
واز سے گونج رہے تھے - آخر میں نے ایک ایسے کمرے
و دیکھا جس میں ایک تالا پڑا ہوا تھا اور تالے پر ایک بڑی سرخ
ہر تھی! میں ٹھہر گیا اور سوچنے لگا کہ اس کمرے میں کیا ہو سکتا
ہے - ابھی وہاں ٹھہرے ہوئے ایک منٹ گزرا ہوگا کہ میں نے
زخمی جوان کی آواز سنی وہ مجھے بلا رہا تھا اور اپنے آپ کو اندھیرے
یں پاکر پریشان تھا - میں جلدی سے اس کے پاس پہنچا۔

" آپ یہاں سے لمپ کیوں اٹھا لے گئے "

" میں آپ کے کسی رشتہ دار یا خادم کو تلاش کر رہا تھا تا کہ میں
آپ کو اس کے سپرد کر جاؤں۔"

" میں اس جگہ اکیلا رہتا ہوں - اب مجھے کسی کی مدد کی ضرورت
نہیں - ابھی آدھ گھنٹہ میں میرا دوست لطیف میرے پاس آجائیگا۔
میری چوٹ کچھ زیادہ سخت نہیں - میں محض ضعف قلب کی وجہ
سے بیہوش ہوگیا تھا - میری والدہ کی طرح میرا دل بھی بہت کمزور
ہے اور میں جانتا ہوں کہ جو دل کی کمزوری میری والدہ کی موت
کا باعث ہوئی ہے - وہی میری وفات کا سبب بھی ہوگی معمولی
سی تکلیف اور معمولی سا رنج بھی میرے لئے بہت اذیت رساں
ہے ..... کیا آپ ڈاکٹر نہیں ؟"

"نہیں میں ایک بیرسٹر ہوں "

" میرا دوست آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہتا تھا - کیا
آپ ہماری مدد کریں گے "

" جی ہاں بڑی خوشی سے "

یہ سنکر زخمی جوان کسی سوچ میں پڑ گیا۔

اس نے پوچھا " کیا آپ نے اس لمپ کے ساتھ اس
عمارت کا ہر ایک کمرہ دیکھا "

" میں یہی خیال کرتا ہوں "

" ہر ایک کمرہ ! " اس نے دوبارہ کہا " میں پوچھتا ہوں کیا
آپ ہر ایک کمرہ میں داخل ہوئے "

" میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں کسی دوسرے شخص کی تلاش
میں تھا - اور اس لئے میں اس کمرہ کے سوا جس کے تالے پر سرخ
رنگ کی مہر لگی ہوئی ہے اور سب کمروں میں داخل ہوا ۔

زخمی جوان میرا یہ جواب سنکر کانپ گیا -

" اور آپ نے یہ معلوم کرنا چاہا ہوگا کہ مہر والے کمرے کے
اندر کیا ہے ؟ "

" قدرتی طور پر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا "

" کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ ایک ایسا شخص جو اس کمرے
کے راز کو معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہو اس بڑی عمارت میں
کئی برس تک اس کمرے کو کھولے بغیر رہ سکتا ہے "

" تو کیا آپ خود بھی اس کمرے کے اسرار سے واقف نہیں "

" تو آپ اس کمرے کو کھولتے کیوں نہیں "

" مجھے اس کمرے کو کھولنا نہیں چاہیئے "

میں لاجواب ہوگیا اور یہ دیکھکر کہ زخمی جوان اب نسبتاً اچھی
حالت میں ہے - میں جانے کے لئے اٹھا۔

" کیا آپ کو کچھ جلدی ہے "

" نہیں "

" کیا آپ کچھ دیر اور میرے ساتھ گفتگو کرنا پسند فرمائینگے "

" بڑی خوشی سے "

" کیا آپ مجھ مصیبت زدہ کی زندگی کے بعض حالات
سننے کے لئے تیار ہیں "

" بیشک "

میں اکثر تنہا رہتا ہوں اور مجھے لوگوں کے ساتھ گفتگو کرنے
کا بہت کم موقعہ ملتا ہے ...... آپ جانتے ہیں کہ میرا والد
ایک امیر آدمی تھا - میری ایک امیر گھرانے میں پرورش ہوئی -
لیکن آج میں غربت اور تنگدستی کے جنگل میں پھنسا ہوا ہوں -

میں بے روزگار ہوں، بے یار و مددگار اور بدقسمت ہوں ۔ اس پر طرہ یہ کہ مجھے اس بڑے مکان میں تنہا رہنا پڑتا ہے ۔ اور یہ ہی میرے کمزور دل کو پریشان کرنے کے لئے کافی ہے ۔ اس مکان کو اچھی حالت میں رکھنا بھی میرے لئے ناممکن ہے چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ اس کی حالت کسقدر خراب ہے ۔ میرے لئے یہاں رہنا مصیبت ہے ۔

"آپ اسے بیچ کیوں نہیں دیتے ؟"

"میں اسے بیچ نہیں سکتا ۔ فی الحال یہ ناممکن ہے ۔"

"تو اسے کرایہ پر دیدیجئے ۔"

"یہ بھی نہیں ہو سکتا ۔"

"تعجب ہے ۔"

"بیشک یہ بات تعجب انگیز ہے ۔" اس نے کہا ۔ "جناب من یہ راز ہے جو میں آپ کو بتائے دیتا ہوں ۔ جناب یہی وہ معاملہ ہے جس میں ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے ۔"

میں نے مسکرا کر جواب دیا "آپ مجھ پر اعتماد رکھیں" اور مجھ سے ہر قسم کی مدد کی توقع کریں ۔"

"شکریہ! شکریہ!! آپ سمجھ گئے ہونگے کہ میرے والد کا نام سیٹھ عبداللہ ہے ۔ انہوں نے اچانک اپنے وطن کو اپنے عزیزوں کو اپنے رشتہ داروں کو چھوڑ دیا، اور غیر ملکیوں اور اجنبیوں کے درمیان وفات پائی ۔"

"اچھا تو کیا وہ انتقال فرما گئے !؟"

"جی ہاں قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے ۔ میرے والد کے احباب کو ایک ایسے کام میں جو والد کی معرفت ہوا تھا ۔ خسارہ ہوا میرے والد کو اس کا اسقدر صدمہ ہوا کہ انہوں نے روپوش ہوجانے کا فیصلہ کر لیا اور ہم کو چھوڑ کر چلے گئے ۔ دو برس بعد اسی کام میں جملہ حصہ داران کو کثیر نفع ہوا ۔ اب اگر والد زندہ ہوتے تو اس وقت واپس آجاتے چونکہ اب روپوش ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی ۔ مگر وہ اب تک واپس نہیں آئے ۔ گمان غالب ہے وہ انتقال فرما گئے ۔ دوسرے اگر وہ زندہ ہوتے تو کم ازکم اپنی روپوشی کے ابتدائی ایام میں کسی طرح ہم سے خط و کتابت تو کرتے ۔ افسوس دو سال سے نہ تو ان کی کوئی خبر ہی ملی ہے اور نہ ان کی چٹھی ہمیں ملی ۔ ہم سے جدا ہونے کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے ایک چٹھی میری والدہ کے پاس بھیجی تھی اس پر لاہور کی مہر تھی ۔"

اس نے اپنے ڈیسک میں سے ایک چٹھی نکال کر مجھ کو دی اور کہا کہ آپ اسے پڑھ سکتے ہیں ۔

میں نے چٹھی پڑھی ۔

"پیاری بیوی جب سے ڈاکٹروں نے مجھ سے کہا ہے کہ تمہاری بیوی کا دل بہت کمزور ہے ۔ اور معمولی سا صدمہ بھی اس کے لئے بیحد ضرر رساں ثابت ہوگا ۔ اسوقت سے ہی میں نے کاروباری معاملات کا تم سے ذکر نہیں کیا باوجودیکہ کاروبار کی حالت دن بدن خراب ہوتی جاتی تھی ۔ مگر افسوس اب وہ وقت آگیا ہے جب یہ ظاہر کئے بغیر چارہ نہیں کہ میں کاروباری معاملا کی خرابی کے باعث تم سے جدا ہونے پر مجبور ہوگیا ہوں ۔ لیکن خیال رہے کہ یہ جدائی عارضی ہے اور ہم عنقریب ایکدوسرے سے ملیں گے ۔ تم اس بات پر پورا بھروسہ کر سکتی ہو ۔ اور مجھے بھی اس کا پورا یقین ہے ۔ پیاری بیوی میں دوبارہ کہتا ہوں کہ ہماری یہ جدائی عارضی ۔ بالکل عارضی ہے ۔ میں تم کو زیادہ دیر تک مبتلائے غم نہ رکھونگا ۔ اور نہ ہی تم کو زیادہ دیر خراب صحت کی مصیبتیں برداشت کرنی پڑینگی ۔ میں تمہاری خوشی ہمیشہ مقدم رکھتا ہوں ۔ اب تم ایک کام کرو وہ یہ کہ میرے فوٹوگرافی کے کمرے کے تالے پر مہر لگا دو اور اس کو اس کی حالت پر چھوڑ دو ۔ اس میں نہ تم داخل ہو اور نہ رشید کو وہاں جانے دو ۔ البتہ رشید اپنی اکیسویں سالگرہ کے بعد اس کمرے کو کھول سکتا ہے ۔ اس کمرے میں بعض ایسی چیزیں ہیں جن کو میں لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں ۔

تمہارے شکوک کو رفع کرنے کے لئے میں لکھے دیتا ہوں کہ اس کمرے میں کوئی ایسی چیز نہیں جو میری نیکنامی کے دامن پر بمنزلہ ایک داغ کے ہو یا جو مجھے ندامت میں غرق کر دے ۔ تم کو اس مکان کو بیچنے کی اجازت نہیں کیونکہ اگر ایسا کیا گیا تو راز فاش ہو جانے کا اندیشہ ہے ۔

خدا حافظ! پیاری بیوی خدا حافظ!! ہم عنقریب ملیں گے ۔ اگر اس عارضی جدائی کے دوران میں کسی مشورے کی ضرورت ہو تو لطیف سے مدد لے سکتی ہو"

—— میں تم سے ایک دفعہ پھر　　اس عارضی جدائی

کی معافی چاہتا ہوں ۔

تمہارا پیارا شوہر
عبداللہ ۔

میں یہ چٹھی پڑھ چکا تو نوجوان یعنی رشید نے کہا :۔

" جناب من! اس کے بعد میری والدہ کے پاس تقریباً اسی مضمون کی ایک اور چٹھی پہنچی ۔ اس پر بھی لاہور کے ڈاکخانہ کی مہر تھی اور اس میں بھی انہوں نے اپنا پتہ تحریر نہیں کیا تھا ۔ بعد ازاں انہوں نے خاموشی اختیار کر لی ۔ اور آخر میری والدہ ان کی روانگی کے دو سال بعد دل شکستہ ہو کر مرگئی ۔ اور اس کی موت کے بعد میرے پاس والد کی ایک اور چٹھی پہنچی یہ اسقدر پرائیویٹ ہے کہ میں آپ کو دکھا نہیں سکتا ۔ البتہ اس کا وہ حصہ جس میں بند کمرے کا ذکر ہے آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں ۔"

نوجوان نے میز کی دراز سے ایک اور چٹھی نکالی اور مجھے پڑھکر سنائی ۔

" اگرچہ تمہاری والدہ کی موت کے بعد اس کمرے کی اہمیت جس پر تمہاری والدہ نے میرے حکم سے مہر لگا دی تھی اب کم ہو گئی ہے ۔ لیکن اب بھی اس کا کھولنا خلاف مصلحت ہے ۔ پس میں چاہتا ہوں کہ تم اس کمرے کو اپنی اکیسویں سالگرہ سے پہلے نہ کھولو ۔

جب تم اس کمرے کھول چکو تو تم اس مکان کو بیچ سکتے ہو ۔ یا کرایہ پر دے سکتے ہو ۔"

یہاں تک پڑھکر نوجوان نے کہا :۔

" بس یہ ان کی آخری چٹھی تھی ——— اب اسقدر حالات معلوم ہونے کے بعد آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں اس مکان کو نہ تو کرایہ پر دے سکتا ہوں اور نہ فروخت کر سکتا ہوں ——— جناب من بس اب دو ماہ باقی ہیں ۔ دو ماہ بعد میری عمر اکیس برس کی ہو جائیگی ۔ اس وقت میرا پہلا کام اس کمرہ کو کھولنا ہوگا اور دوسرا اس مکان کو فروخت کرنا ۔"

" کیا آپ کا خیال ہے کہ آپ کے والد کے فرار ہونے کا باعث کوئی جرم نہیں ۔"

" بلاشک "

" کیا آپ اس کی وجہ بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے وطن سے جاتے ہوئے اپنی پیاری بیوی کو ساتھ کیوں نہیں لیا ۔"

" مجھے معلوم نہیں ۔"

" انہوں نے تم لوگوں سے جن سے ان کو کسی قسم کے نقصان کی امید نہیں ہو سکتی اپنا پتہ کیوں چھپایا ۔"

" میں نہیں جانتا ۔ جناب میرے بیان پر بہت سے اعتراض ہو سکتے ہیں جس کا میں جواب نہیں دے سکتا ۔"

" مجھی! میرا خیال ہے کہ کسی قانونی جرم کے مرتکب ہونے کے باعث سے آپ کے والد نے اپنے پیارے وطن کو خیرباد کہا ہے ۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری اس صاف گوئی سے ناراض نہ ہونگے ۔"

" جناب من! کاش آپ میرے والد کی عادتوں سے اچھی طرح واقف ہوتے ۔ جس وقت وہ ہم سے جدا ہوئے اسوقت میری عمر چودہ برس کی تھی ۔ اور مجھے دنیا کی باتوں کے متعلق کچھ زیادہ علم نہ تھا ۔ لیکن پھر بھی میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان سا آدمی ہندوستان بھر میں ملنا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے ۔ اگر ان میں نقص تھا تو یہ کہ وہ ضرورت سے زیادہ حساس تھے ۔ معمولی سانحہ اور معمولی سا رنج بھی ان کو سخت تکلیف دیتا تھا ۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی وجہ سے دوسروں کو نقصان پہنچے ۔ اور جب کبھی ایسا ہوتا تو ان کو بیحد صدمہ ہوتا ۔ ان کی سچائی اور دیانتداری ضرب المثل ......"

" مجھی " میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا :۔

" میں نے اپنی رائے صرف صورت حالات کو دیکھ کر قائم کی تھی ۔ ممکن ہے میری رائے غلط ہو ——— اب مجھے کافی دیر ہو چکی ہے اور میں اجازت چاہتا ہوں ۔ مجھے آپ کے ساتھ ہمدردی ہے اور اس معاملہ میں بروقت بلا کسی معاوضہ کے مدد کرنے کے لئے تیار ہونگا ۔"

" شکریہ! میں اپنے دوست لطیف کو آپ کے پاس بھیجونگا ۔"

" بہت اچھا ——— خدا حافظ " یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا ۔ کچھ عرصہ تک مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوا ۔

ایک دن دوپہر کے وقت ایک کارڈ ملا ۔ جس پر محمد لطیف کا نام لکھا ہوا تھا ۔ میں نے اسے بلا لیا ۔ وہ آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا ۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا ۔

" مجھے آپ کے پاس مسٹر رشید نے بھیجا ہے ۔ کسی نامہ

میں میں سیٹھ عبداللہ کا معتمد ملازم تھا؛"

"فرمائیے۔"

"آج مسٹر رشید کی اکیسویں سالگرہ ہے۔"

"تو کیا تم نے وہ کمرہ کھول لیا"

"نہیں صاحب ابھی ہم نے اسے نہیں کھولا، ہم چاہتے ہیں کہ اسے ایک معزز اور قانون دان شخص کی موجودگی میں کھولا جائے۔ کیا آپ اس کے کھولنے کے وقت وہاں موجود رہنا پسند فرمائینگے؟"

"میں بڑی خوشی سے اسوقت آپ کا شریک ہونگا۔"

"ہم اسے آج رات کو ۹ بجے کھولیں گے۔"

"میں وقت مقررہ پر پہنچ جاؤنگا"۔

"شکریہ ہم اس وقت آپ کا انتظار کریں گے۔"

پھر وہ مجھے سلام کر کے چلا گیا۔ وقت مقررہ پر میں رشید کے مکان پر پہنچا۔ رشید نے میرا شکریہ ادا کر کے لطیف سے کہا:۔

مسٹر لطیف اب شاید کمرہ کھولنے میں دیر کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمیں جلدی کرنی چاہیئے"۔ ہم سب چلنے کے لئے تیار ہوئے۔ لطیف نے لمپ اٹھایا اور ہمارے آگے آگے چلا۔ آخر ہم اس دالان سے پر پہنچے۔ رشید کو پریشان اور خوفزدہ دیکھکر مجھے کچھ تعجب نہیں ہوا۔ لیکن متین اور سنجیدہ لطیف کو خوفزدہ اور پریشان دیکھکر میں ضرور حیران ہوا۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ اپنی پریشانی کو چھپانے کی بیحد کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں بمشکل لمپ کو تھامے تھا۔ میں نے اس سے لمپ لے لیا۔

"رشید" اس نے خوفزدہ رشید کو چابیاں دیتے ہوئے کہا۔" لو یہ چابیاں سنبھالو۔ اب تم اس کمرے کو کھول سکتے ہو۔ لیکن تم کو اس کے کھلنے پر کسی فوری صدمے .... کو برداشت کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیے"۔

"ہیں تم مجھے ڈرانا چاہتے ہو"۔

"نہیں۔ نہیں۔ میں تم کو ڈرانا نہیں چاہتا۔ بلکہ میں تمکو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کمرے کے کھلنے پر تم کو اچانک صدمے یا کسی زبردست رنج کے برداشت کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے"۔

اس نے اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرنے کے لئے ان پر زبان پھیر کر کہا" تم اس کمرے کو کھولو۔ لیکن میری ہدایات کو یاد رکھو۔ ہاں کھولو"۔

لطیف کی زبان سے یہ سنکر مجھے پورا یقین ہو گیا کہ وہ کمرے کے اسرار سے واقف ہے۔

رشید نے پریشان نظروں سے لطیف کو دیکھا پھر ایک چاقو کے ساتھ کمرے کی مہر توڑ ڈالی اور تالا کھولکر دروازہ کھول دیا۔ اس نے ایک قدم کمرے کے اندر داخل کیا ہی تھا کہ وہ ایک چیخ ایک خوفناک چیخ کے ساتھ بیہوش ہو کر گر پڑا۔"

لیمپ کی روشنی میں نے کمرے میں جھانکا میں بھی لرز گیا اور لطیف کی اطلاع کا دھیان کر کے میں نے اپنے آپ کو کسی خوفناک انکشاف کے لئے تیار نہ کر لیا ہوتا تو ضرور میرے ہاتھ سے لیمپ چھوٹ جاتا۔

وہ تنگ و تاریک کمرہ کبھی فوٹوگرافی کی لیباریٹری کے طور پر استعمال کیا جاتا ہوگا۔ شیشے کی الماریوں میں شیشیاں پڑی ہوئی تھیں۔ پیمانے رکھے تھے۔ ایک طرف چند کیمرے پڑے ہوئے تھے اور دوسری طرف پانی کا ایک ٹب رکھا تھا۔ اور کمرے کی ہوا کیمیاوی اور حیوانی اشیاء بدبو سے لبریز تھی۔ کمرے کے وسط میں ایک میز پڑی ہوئی تھی۔ جس کے قریب ہی ایک کرسی پر ایک انسان۔ نہیں نہیں ایک انسانی پنجر ہماری طرف رخ کئے رکھا تھا۔ اس نے کپڑے پہنے تھے۔ اس کا گوشت خشک ہو گیا تھا۔ اس کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا۔ اس کی گردن کی موٹائی بمشکل میری کلائی کے برابر ہوگی۔ اس کے ہاتھ میز پر تھے۔ اس کا چہرہ ایک طرف کو جھک گیا تھا، اس کا منہ کھلا ہوا تھا! —— آہ اس کا چہرہ کسقدر خوفناک تھا!! اس کے ہاتھوں کندھوں اور چہرے پر گرد جمی ہوئی تھی!

لطیف چلایا "آہ میرا بدقسمت آقا! آہ میرا بدقسمت آقا!!" اور وہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔ یہ سنکر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

میں چلایا "ہیں! سیٹھ عبداللہ!"

"ہاں جناب میرا بدقسمت آقا عبداللہ پورے سات برس سے اس کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے آہ وزاری کی۔ اس کے آگے رویا، اس کے پاؤں پکڑے، اسے سمجھایا، اسے منایا۔ اس کی منتیں کیں۔ لیکن حیف صد حیف اور افسوس صد افسوس اس نے ایک نہ مانی اور جو کرنا چاہتا تھا سو کیا۔ اس نے مجھے کمرے سے نکال کر اندر سے قفل لگا دیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس میز پر اس قفل

کی چابی پڑی ہوئی ہے۔......آہ اس نے اور بھی کچھ لکھا ہے۔ ہمیں دیکھنا چاہیئے" اور یہ کہتا ہوا وہ میز کی طرف بڑھا میں نے چلا کر کہا" ہاں ہاں اسے اٹھاؤ اور للہ جلدی سے اس جگہ کو چھوڑ دو —— یہاں ہوا زہریلی ہے۔" اس نے میز پر سے ایک کاغذ اٹھالیا اور پھر ہم رشید کو اٹھا کر اس کو اس کے کمرے میں لائے۔ بڑی مشکل سے اسے ہوش آیا۔ لطیف نے رشید کو برانڈی کا گلاس پلایا۔ اور تھوڑے عرصہ میں ہی رشید اٹھ بیٹھا۔ اس میں اب اپنی خاندان کے افسوسناک حالات سننے کی طاقت آ گئی۔

رشید نے کہا" آہ وہ میرا باپ تھا ——— رشید تم اس بات کو پہلے بھی جانتے تھے؟ تم نے مجھے اس صدمہ کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہونے کو کہا تھا؟"

"ہاں میں اس بات کو سات برس سے جانتا ہوں کہ تمہارا والد اس کمرے میں مرا پڑا ہوا ہے۔"

"کمبخت تو جانتا تھا لیکن پھر بھی تو نے ہم کو یہ بات نہیں بتائی۔"

"تم میری مجبوریوں کو نہیں جانتے اس لئے تم نے ایسا درشت لہجہ اختیار کر لیا ہے۔"

"میں بالکل دیوانہ ہو رہا ہوں۔ میں اس معمہ کو سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ کیا میرے پاس اور میری والدہ کے پاس جو چٹھیاں تھیں وہ محض جعلی تھیں۔"

"نہیں تمہارے والد نے وہ چٹھیاں مجھکو لکھکر دیں اور ان کے متعلق مجھے ہدایات کیں جن کی میں نے پیروی کی۔ وہ میرا آقا تھا اور اس کے حکم کی تعمیل میرا فرض۔"

"تم مجھے مفصل حالات بتاؤ۔"

"تم جانتے ہو کہ ایک دفعہ تمہارے والد پر بہت مصیبت کا زمانہ آیا۔ کاروبار خراب ہو گیا، حصہ داروں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا جس نے بہت سے غریبوں کو تباہ کر دیا۔ تمہارے والد میرے آقا ایک حساس دل و دماغ کے مالک تھے چنانچہ اس بات کا ان کو بہت صدمہ ہوا وہ ہر وقت سخت ذہنی تکلیف محسوس خیال کرتے اور یہ خیال ان کے ہمیشہ سوہان روح ثابت ہوتا۔ آخر اس نے اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آہ میں نے ان کو بہتیرا سمجھایا لیکن انہوں نے ایک نہ مانی اور نہایت عاجزی اور انکسار کے ساتھ مجھے خاموش رہنے کے لئے کہا ——— وہ خودکشی کرنے کا پکا ارادہ کر چکے تھے آخر انہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں آرام سے مروں یا سخت درد و کرب کے ساتھ جان دوں۔ میں ان کا مطلب سمجھ گیا اور طوعاً و کرہاً ان کی مرضی پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ان کو ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ ان کی بیوی کا دل بہت کمزور ہے اور ایک معمولی صدمہ بھی اس کی موت کا باعث ہوگا۔ وہ اپنی بیوی کو اپنی موت کے ناقابل برداشت رنج میں مبتلا کر کے ان کی زندگی کو ختم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن انہیں اپنی زندگی ختم کئے بغیر بھی چارہ نہیں تھا۔ وہ اپنی بیوی کو صدمہ پہنچائے بغیر ہی اپنی زندگی کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس کے لئے جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا وہ صاف ظاہر ہے انہوں نے مجھکو وہ چٹھیاں لکھکر دیں جو میں نے تمہاری والدہ کے پاس بھیجیں۔ اور تم لوگوں کو ان کی خودکشی کا گمان بھی نہ ہوا۔ ان چٹھیوں میں جو کچھ لکھا تھا وہ سب سچ تھا۔

جب وہ بہت جلد ملنے کی امید ظاہر کرتے تھے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ عنقریب مر جائیگی اور عالم بالا میں ملاقات ہوگی۔ وہ جانتے تھے کہ اس کی زندگی بہت کم باقی رہگئی ہے اور وہ یا تو خرابی صحت کی وجہ سے۔ یا ان کی جدائی کے غم سے ضرور مر جائیگی۔

اس کی موت کے بعد ایک چٹھی تمہارے پاس بھیجنے کے لئے انہوں نے مجھے دی جس کو میں نے لاہور سے ڈاک میں ڈلوایا۔ اور اس طرح سے تم کو بھی ان کے لاہور میں ہونے کا مزید یقین ہو گیا۔

مرنے سے قبل انہوں نے مجھے سات برس تک ان کی خودکشی کی بابت خاموش رہنے کا حکم دیا تھا اور میں نے ان کے سب احکام پر عمل کیا ہے۔

ان کا خیال تھا کہ سات برس بعد ان کے عزیزوں کو اور ان کے دوستوں کو ان کی موت کی خبر اسقدر رنج نہ دیگی جسقدر کے اسوقت دیتی ——— آپ دیکھتے ہیں کہ مرتے وقت بھی انہوں نے دوسروں کا کسقدر خیال رکھا۔"

لطیف خاموش ہو گیا کمرہ میں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔

پھر رشید بولا:-

"لطیف صاحب! میں اب سب کچھ سمجھ گیا ہوں میں آپ کو الزام نہیں دے سکتا۔ آپ نے اپنی دانائی سے میرے والد کے

احکام کی تعمیل کر کے میری والدہ کو ایک سخت صدمے سے بچا لیا۔ اگر آپ راز فاش کرتے تو ایک طرف والد کی رسوائی ہوتی اور دوسری طرف میری والدہ کو اور مجھ کو ناقابل برداشت صدمہ پہنچتا ——— مگر یہ تمہارے ہاتھ میں کاغذ کیسا ہے۔"

"یہ وہ تحریر ہے جو آپ کے والد نے مرتے وقت اس کمرے میں چھوڑی تھی میں اسے آپ کو پڑھ کر سناؤں ؟"

"ہاں پڑھئے۔"

"میں نے زہر کھایا ہے۔ یہ میری رگوں میں اثر کر چکا ہے۔ اور میں چند لمحوں کے بعد اس فانی دنیا کو چھوڑ چکا ہونگا۔

اگر میری خواہشوں پر عمل کیا گیا ہوگا تو اس تحریر کے پڑھنے کے وقت مجھے مرے ہوئے برسوں گزر چکے ہونگے۔ اور اس یقیناً کوئی شخص بھی ایسا نہ ہوگا جو کہ میری وجہ سے یا میری معرفت اپنا روپیہ ضائع کرنے کے سبب سے میرے ساتھ دشمنی رکھتا ہو۔

رشید! تم میرے بیٹے ہو اور اسقدر دیر کے بعد بھی میری موت کی خبر تم کو رنج پہنچائیگی۔ لیکن میں امید کرتا ہوں کہ تم اپنے مصیبت زدہ والد کو معاف کر دو گے ——— زہر میرے رگ و ریشے میں سرایت کر چکا ہے ——— میری زندگی کے صرف چند لمحے باقی ہیں ——— خدا حافظ! خدا حافظ!!

کاش باری تعالیٰ میری پریشان اور تائب روح کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔"

ہم سب نے کہا "آمین! آمین!!"

(کانن ڈائل)

اختر سبحانی بیتاب پٹیالوی

نغمۂ زندگی

(لانگ فیلو)

اے ہمنشیں! تو اندوہناک سُروں میں، یہ راگ نہ الاپ، کہ زندگی ایک ہستی موہوم ہے، جس کی تعبیر ایک سعی لا حاصل ہے۔ کیونکہ وہ رُوح جو کہ غفلت سے سرشار ہو۔ مُردہ ہے۔ اور اشیاء بے حقیقت ہیں۔

زندگی مظہر حقیقت ہے، اور جیسا کہ تو نے سمجھ رکھا ہے۔ گوشۂ لحد اس کی انتہا نہیں، اس میں شک نہیں، کہ انجیل اور دوسرے مقدس آسمانی صحیفے اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ انسان خاک کا پتلا ہے۔ اور وہ پھر ایک روز خاک ہوجائیگا۔ مگر اس میں روح کا کوئی ذکر نہیں۔

اس محدود، چار روزہ زندگی کا راز نہ ہر دم مسرور رہنے میں اور ہر وقت غم کھانے میں ہے۔ بلکہ مشغول کار رہنے میں پنہاں ہے۔

علم و ہنر، جس کی جستجو اور حصول میں، ہمیں ہر لحظہ کوشاں رہنا چاہئیے۔ ایک بحر بے پایاں ہے اور اس عمر فانی کی چند گھڑیاں جو ہمیں عطا کی گئی ہیں، بہت سرعت سے گزر رہی ہیں۔ اگرچہ ہمارے قلوب مضبوط اور توانا ہیں، تاہم ان کی مثال ایک ماتمی نقارے کی سی ہے۔ جس پر غلاف چڑھا ہو۔ اور جس کے اندر سے گریہ وزاری کی آواز بدستور آرہی ہو۔

دنیائے عمل کے اس وسیع جولانگاہ میں تو جانوروں کی طرح قیام نہ کر۔ اس کشمکش حیات میں سکون پذیر نہ ہو، بلکہ اپنے آپکو متحرک رکھ، اور اس زندگی میں تو اپنے تئیں بہادر ثابت کر۔

مستقبل خواہ وہ کتنا ہی خوشگوار کیوں نہ ہو۔ اُسے ایک فریب آفریں سراب سمجھ۔ عہد گزشتہ کے سوانح کو طاق نسیاں کی نذر کر۔ اس عہد حاضرہ میں ایک ہوشیار مرد کار بن اور جہد و توکل سے کام لے۔

مشاہیر کے دستور عمل اور ضوابط اوقات سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو نہایت کامیاب بنا سکتے ہیں۔ اور اس دار فانی سے علیحدگی اختیار کرتے وقت سطح زہن پر اپنے نقش قدم چھوڑ سکتے ہیں۔ ہاں۔ ایسے نقش قدم۔ جو شاید کسی گم کردہ راہ اور دل شکستہ بھائی کے لئے درس عمل ثابت ہوں۔

لہٰذا اب ہمیں لازم ہے کہ ہم کمر ہمت باندھکر میدان عمل میں ہمیشہ کوشاں ہوں۔ اپنے پائے استقلال کو غیر متزلزل رکھیں تاکہ ہم ہر قسم بلائے آسمانی کا بخندہ پیشانی مقابلہ کر سکیں جس حد تک ممکن ہو محنت اور انتظار سیکھیں۔

اللہ یار خاں۔

جمہوریت

مزدور کو ہوا ہے احساس زندگی کا
بیدار ہو رہا ہے انسان اس صدی کا

افسونِ امتیازِ شاہ و غلام ٹوٹا
سرمایہ داریوں کا کہنہ نظام ٹوٹا

آہی گئی سمجھ میں یہ بات اس جہاں کی
زینت ہے ننھے ننھے تاروں سے آسماں کی

صیاد طائروں کی تنظیم کر رہا ہے
ضیغم حقوقِ آہو تسلیم کر رہا ہے

آزاد زندگی کی تدبیر ہو رہی ہے
دنیا کی از سرِ نو تعمیر ہو رہی ہے

مغرب کی سرزمیں میں قیصر کا ساز چپ ہے
انجامِ غزنوی پر روحِ ایاز چپ ہے

جمہوریت کا چرچا جو عام ہو رہا ہے
شاید جہاں کا مذہب اسلام ہو رہا ہے

فاخر

امام بخش صہبائی

مولانا امام بخش دہلوی اپنے زمانے کے باکمال شاعر اور جید عالم گزرے ہیں۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ایسے یگانۂ عصر کا ذکر کسی صاحب تذکرہ نے نہیں کیا۔ اگر کیا بھی ہے تو نام اور تخلص سے زیادہ کچھ نہیں لکھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اُس دور میں اُردو زبان ترقی کر رہی تھی۔ اور اُردو میں شعر کہنا ہی باعث فخر سمجھا جاتا تھا۔ فارسی کہنے والے تھے مگر کم۔ اس لئے تذکرہ نویسوں نے اس دور کے صرف اُردو شعرا کا حال لکھا ہے۔ اور فارسی شعر کہنے والوں کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

حق تو یہ ہے کہ میں بھی زیادہ تحقیق نہیں کر سکا۔ دہلی سے مولانا مغفور کے حالات ملنے کی اُمید تھی۔ محترمی حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب قبلہ کی خدمت میں بھی لکھا۔ اور حضرت سائل دہلوی کے بزرگوں اور صہبائی مرحوم کے تعلقات کی بنا پر بالواسطہ سائل صاحب سے بھی استفسار کیا۔ لیکن اُنھوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ اور حضرت خواجہ صاحب نے تحریر فرمایا کہ صہبائی صاحب کا تذکرہ مجھے معلوم نہیں ہے۔ میری کتاب (غدر دہلی کے افسانے) میں صرف قتل کا حال ہے۔ اس لئے میں جس قدر تلاش کر سکا ہوں عرض کئے دیتا ہوں۔

مولانا مرحوم غالباً ۱۷۹۲ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً ۶۵ برس کی تھی۔ ان کے بزرگ ایران سے بسبیل تجارت ہندوستان میں آئے تھے۔ اور یہیں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں ؎

چو دیدم غالب وآزردہ را از ہند صہبائی
بخاطر ہیچ یاد از خاک ایرانم نمی آید

اُن کے والد کا نام کسی جگہ سے نہیں ملا۔ آپ نے علوم مروّجہ کی ابتدائی تعلیم مولوی عبداللہ خاں علوی سے حاصل کی۔ جو اپنے زمانے کے ایک اچھے فارسی گو شاعر تھے۔ صہبائی کے دوست بھی تھے۔ اور اُستاد بھی۔ شروع شروع میں مولانا صہبائی اصلاح بھی انھیں سے لیتے رہے۔ اور مولانا کے چند خطوط مولوی علوی کے نام بھی ہیں جن میں سے ایک نقل کرتا ہوں۔ اس سے صہبائی کا نثر لکھنے کا رنگ بھی نظر آ جائے گا۔

"تسلیم نگاری نیاز صہبائی صفوا ایں قرطاس را بے تحریر نقوش عقیدت نگذاشت تا مرتسم صفحاتِ خواطر گردد کہ از سجدہ طرازانِ آں آستان جراٗتِ عرض بے اختیاری ہمیں غبارِ ناتواں دارد و گستاخیٔ پابوس خدام از جیب ہمیں نقشِ پا سر برمی آرد۔ درین روزہا کہ خاکِ مین پوری بر آرزوہا می افشاند۔ اگر سایہ خدام آقائے فیض التزام بال ہمائے بر سر عقیدت سرشت دانی نمود۔ وحشت افزائی ایں سواد بر جاں تقاضائے گریبان چاکے می افزود۔ اگر مصرعے موزوں میتواں کرد ہم لبھائے خود را بصلۂ آں ماموِر گردایندنست و اگر عبارتے بایہ نگاشت ہم گوشِ خود را سامعِ آں بہر سانیدن۔ وگرنہ فقدان سخن فہم آفتے بر سر آوردہ است، و قیامتے برپا کردہ۔ خاک دہلی اگر ہمہ عبارست نفسہا را در پردہ، بش بابشے گل ہم آغوشی پرداختن است و دماغ را با مشک و عنبر دوست و گردن انداختن بہر حال حرمانِ صحبتِ گرامی سخت آفت است و فقدانِ مطالعۂ دیدار دشوار قیامت۔ روشن گر آئینۂ ما و خورشید شبہائے انتظار را بصفائے صبح وصال مبدل گرداند و شدائدِ ایام دوری را بباحت افزائی شب ہائے وصال رساند۔"

جیسا کہ اوپر کے خط سے ظاہر ہوتا ہے مولانا مین پوری میں رہا کرتے تھے۔ اور نواب حید رحسن خاں رئیس شاہجہان آباد کی وساطت سے دربار شاہی تک بھی رسائی تھی۔ اگرچہ بہادر شاہ اُردو شعراء کی بہت قدر کرتے تھے لیکن ان کی یہ قدردانی یہیں تک محدود نہ تھی وہ اپنے وقت کے تمام ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی کرتے تھے۔ مولانا صہبائی کو بھی دربار سے وظیفہ ملتا تھا۔ اور بادشاہ کی مدح میں اُنھوں نے چند قصیدے اور ایک دو رباعیاں بھی لکھی ہیں۔

۱۸۴۲ء میں جب دہلی اورنٹیل کالج قایم ہوا تو مسٹر ٹامسن سکریٹری گورنمنٹ جو بعد میں اضلاع شمال و مغرب کے گورنر مقرر ہوئے معلموں کے امتحان کے لئے دہلی آئے۔ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح سو روپیہ ماہوار پر ایک عربی مدرس کالج میں مقرر ہے اسی طرح ایک

فارسی معلم بھی مقرر کر دیا جائے۔ عمائد شہر نے مرزا غالب حکیم مومن خاں
اور مولانا صہبائی کا ذکر کیا۔ سب سے پہلے مرزا غالب کو بلایا گیا۔ ان
کا قصہ تو مشہور ہے۔ یہ سکریٹری کو ملنے گئے لیکن جب وہ ان کے استقبال
کے لئے کوٹھی سے باہر نہ آئے تو یہ بگڑ کر چلے آئے۔ ان کے بعد حکیم
مومن خاں اور مولانا کی باری آئی۔ مسٹر ٹامسن نے ان سے چند سوال
کئے۔ اور آخر میں مولانا سے کہا کہ آپ اس کام کے لئے موزوں ترین
شخص ہیں۔ صہبائی مرحوم ۱۸۵۷ء تک اورنٹیل کالج کے فارسی پروفیسر
کے فرائض انجام دیتے رہے۔ لیکن جب ہنگامۂ غدر نے سب کام بند
کر دیئے تو بوڑھے صہبائی بھی اپنے مکان میں بند ہو کر بیٹھ رہے۔
اور انہیں دنوں مارے گئے۔

صہبائی مرحوم کا اکلوتا بیٹا عبدالکریم تھا۔ اس کے لئے اور ایک
عزیز شاگرد عبدالعزیز کے لئے ہی آپ نے کافی در علم قوافی لکھی۔ عبدالکریم
اور عبدالعزیز دونوں یکے بعد دیگرے غدر سے پہلے فوت ہو گئے
تھے۔

صہبائی کے دوست

مولانا صہبائی نہایت خوش خلق اور مرنجان مرنج شخص تھے۔ یوں تو
آپ کے اخلاق کے بہت لوگ مداح تھے۔ لیکن آپ کے خاص
دوستوں میں سے میرزا غالب حضرت آزردہ۔ نواب مصطفیٰ خاں
شیفتہ سرسید احمد خاں مرحوم اور نواب سید محمد صدیق حسن خاں خاص
طور پر قابل ذکر ہیں۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ مولوی لطف اللہ کشمیری
کے بیٹے اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کے شاگرد رشید تھے۔ اپنے زمانے
کے علماء و فضلاء میں ممتاز تھے۔ اور دہلی میں عہدہ صدرالصدور پر مامور
تھے۔ نواب ضیاءالدین خاں نیر اور سید غلام علی خاں وحشت بھی
مولانا کے خاص دوستوں میں سے تھے۔

صہبائی کے شاگرد

مولانا فارسی کے شاعر تھے۔ اور عمر بھر آپ نے اردو میں شعر نہیں کہا
لیکن اپنے شاگردوں کی اردو غزلوں کی اصلاح بھی کر دیا کرتے
تھے۔ اُن کے شاگردوں میں سے زیادہ مشہور یہ ہیں۔

لالہ دین دیال:۔ دہلی کے رہنے والے اور منشی ہردیال سنگھ کے
بیٹے تھے۔ شعر بہت کم کہتے تھے۔ البتہ نثر کی طرف خاص میلان تھا۔
صہبائی مرحوم سے ابتدائی فارسی تعلیم حاصل کی اور فارغ التحصیل
ہونے کے بعد بھوپال میں میر منشی مقرر ہوئے۔ اُنھوں نے اپنے
اُستاد کے مرنے کے بعد اُن کا کلام جمع کیا۔ اگرچہ وہ مکمل نہ تھا۔
تاہم ان کی کوششیں لائق ہزار آفریں ہیں۔

مولوی محمد حسین:۔ یہ بھی دہلوی تھے۔ تجر تخلص کرتے تھے۔ بعد میں
عدالت اندور کے ناظم مقرر ہوئے۔

لالہ بلدیو سنگھ۔ نامی تخلص تھا۔ بہت اچھا لکھنے والے تھے۔ میرزا غالب
سے بھی دوستانہ تعلقات تھے۔

شاہزادہ میرزا قیصر بخت۔ شاہی خاندان سے تھے۔ اپنے تخلص
سے فروغ تھے۔ ابتدا میں اپنے والد میرزا قادر بخش صابر سے اصلاح
لیتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد صہبائی کے شاگرد ہوئے۔

سید شبیر حسین النسیم میر التماس حسین کے بیٹے تھے اور قصبہ بھرسر
ریاست بھرتپور کے رہنے والے۔ عربی۔ فارسی کی تعلیم مولوی سید محمد
سونی پتی سے حاصل کی۔ پہلے پہل حکیم مومن خاں کے شاگرد ہوئے
لیکن کچھ عرصہ بعد مولانا صہبائی سے اصلاح لینے لگے۔ مولانا نے شہادت
سے چند ماہ پہلے انہیں مرزا داغ سے اصلاح لینے کی ہدایت کی اور یہ ان
کے شاگرد ہو گئے۔ بھرتپور میں سب انسپکٹر پولیس تھے سنہ ۱۹۱۲ء میں وفات
پائی۔ کلام ملاحظہ ہو۔

تمہاری زلف خود دل مانگ لیگی — یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے
بُرا ہے عشق، یہ میں جانتا ہوں — مگر ناصح سے ضد سی آ پڑی ہے
بہت دیکھا شب غم کو گھٹا کر — تمہاری زلف سے پھر بھی بڑی ہے
لہو پانی کیا ہے ایک اپنا — غضب کی پھوٹ چھالوں میں پڑی ہے

اُن دنوں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ وحسرتی کے مکان پر مشاعرہ
ہوا کرتا تھا۔ اور غالب آزردہ۔ علوی۔ صہبائی۔ مومن۔ نیر۔ اور وحشت وغیرہم
وہیں جمع ہوتے تھے۔ مرزا غالب اور مولانا صہبائی کے چند اشعار لکھتا ہوں
جو ایک ہی زمین میں کہے گئے ہیں۔ اس سے اُن کا مقابلہ مقصود نہیں
صرف اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ پڑھنے والے دیکھ لیں کہ دو اُستاد جب
ایک ہی طرح پر آزمائی کرتے ہیں تو اُن کا اشہب قلم کیا کیا جولانیاں کھاتا
ہے۔

غالب

ہرچہ فلک نخواستہ است ہیچ کس از فلک نخواست
ظرف فقیہہ مے نجست، بادۂ ماگزک نخواست
بحث و جدل بجائے ماں میکدہ جوئے کاندراں
کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

صہبائی

مرد رہ قناعتم دل مزۂ فترک نخواست

گر فلکم سے نواخت، کام طلب گزک نخواست
در خورِ لب جرخ نیست از ہمہ استیا زمن
خود سرہ درعیار خویش نا سرہ مشترک نحوست

غالب

دودِ سودائے تتق بست، آسماں نامیدمش
دیدہ برخواب پریشان زد، جہاں نامیدمش
وہم خاکے ریخت در چشمم، بیاباں دیدمش
قطرۂ بگداخت۔ بحرِ بے کراں نامیدمش
باد دامن زد بر آتش، نوبہاراں خواندمش
داغ گشت آں شعلہ، از ہستی خزاں نامیدمش
غرتم ناسازگار آمد، وطن فہمیدمش
کرد تنگی حلقۂ دام، آشیاں نامیدمش

صہبائی

دودِ آہم سائباں گشت آسماں نامیدمش
گوشۂ دل دم ز وسعت زد جہاں نامیدمش
دودِ سودا جمع شد چنداں کہ تن نامش فتاد
زاں میاں سر زد شرار و ہم، جاں نامیدمش
لخت لخت از سینہ خوں جوشید و گل زد موجِ رنگ
نالۂ موزوں شد و سر و رواں نامیدمش
نارسائی حیلہ میخواست۔ در شغلِ ہوس
آرزو خوں گشت در دل۔ گلستاں نامیدمش

غالب

ہا پری چہرہ غزالان و ز مردم رمِ شان
دلِ مردم بخمِ طرہ خم در خمِ شان
کافرانند جہاں جوئے کہ ہرگز نبود
طرۂ ور دلا ویز تر از پرچمِ شان
آشکار اکشں، بدنام و نکو نامی جو ئی!
آہ ازیں طائفہ و آنکس کہ بود محرمِ شان

صہبائی

یارب آناں کہ تو اے جانِ منی ہمدمِ شان
گر ہمہ نوش دہد لعل تو گردد سمِ شان
زاہداں بیں کہ بگشتند حریفِ مے عشق
وہ چہ قوم اند کہ گفتن نتواں آدمِ شان
جامِ کوثر زن و خاکِ رہ بت مال ملب
آہ از آنکہ وضو نام بر آرد نمِ شان

یہ تو مشاعروں کی غزلیں ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی ہیں مگر یہاں ان سب کی گنجائش نہیں۔ مولانا صہبائی نے عرفی۔ ظہوری اور نظیری کی غزلوں پر بھی غزلیں لکھی ہیں۔ ان شعراء کے دواوین دیکھیے۔ اور صہبائی سے مقابلہ کیجیے۔ یہاں مولانا حالی کی کتاب یادگار غالب سے ایک دو اقتباس پیش کرتا ہوں۔ تاکہ مزید حالات پر روشنی پڑے

"اگرچہ ہندوستان میں فارسی زبان کا چراغ مدت سے ٹمٹما رہا تھا۔ اور فارسی کی عمرِ طبیعی اختتام کے قریب پہونچ گئی تھی۔ مگر حسنِ اتفاق سے اس اخیر دور میں چند صاحبانِ فضل و کمال خاص دارالخلافہ دہلی میں ایسے پیدا ہو گئے تھے۔ جو علم و فضل کے علاوہ شعر و سخن کا مذاق بھی اعلیٰ درجہ کا رکھتے تھے۔ ان چند صاحبوں سے میری مراد مولانا فضل حق خیرآبادی ثم الدہلوی مولانا مفتی محمد صدرالدین خاں متخلص بہ آزردہ مولوی عبداللہ خاں علوی۔ مولوی امام بخش صہبائی۔ حکیم مومن خاں نواب مصطفیٰ خاں حسرتی نواب ضیاء الدین خاں نیر۔ سید غلام علی خاں وحشت وغیرہم ہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کا مرزا (غالب) کے عصر میں موجود ہونا ان کی شاعری کے حق میں بعینہ ایسا تھا۔ جیسا عرفی و نظیری کے حق میں خانخاناں ابوالفتح، فیضی اور ابوالفضل کا اُن کے زمانے میں ہوتا۔"

آگے چل کر مولانا فرماتے ہیں۔

"صہبائی اور علوی بھی چونکہ مرزا بیدل کا تتبع کرتے تھے اور مرزا (غالب) نے اُس طریقے کو بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اس لئے وہ مرزا کو اور مرزا اُن کو کم مانتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ تمام گروہ سخن فہموں اور سخن سنجوں کا تھا۔ اور مشاعروں میں اکثر ایک دوسرے سے مٹ بھیڑ ہوتی رہتی تھی۔ مرزا کو اپنے خیالات کی اصلاح اور اپنے اشعار کی تہذیب و تنقیح میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی۔ اور یہی اُن کی اصل ترقی کی بنیاد تھی۔"

مولانا کی اُوپر کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ صہبائی مرزا غالب کو کم مانتے تھے۔ لیکن مولانا صہبائی نے صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ

نالۂ غالب و آزردہ ز کف برد عناں
سوختم سوختم از آتشِ گرمِ دمِ شاں

علاوہ ازیں ان کے دیوان میں اور کئی جگہ یہ "اعترافِ شکست" موجود ہے۔ اس دور میں مرزا غالب کے بعد فارسی نظم و نثر اور لغت میں کوئی ممتاز ترین ہستی ہے تو مولانا صہبائی کی۔ اُن کی علمیت کا اندازہ مولانا حالی کی اوپر کی تحریر سے بآسانی ہو سکتا ہے۔ مرزا غالب نے بیدل کے تتبع کی کوشش

کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور انھوں نے ماہ کو پر خار دیکھ کر آخر کار اسے بالکل ترک کر دیا۔ یہ بات خصوصاً اُن کے بعض اُردو اشعار میں نمایاں نظر آتی ہے۔ لیکن صہبائی کے کلام میں آپ دیکھیں گے کہ وہ مرزا بیدل کے تتبع میں ایک حد تک کامیاب ہوئے ہیں، بلکہ ایک پہلو سے اُس قدیم روش سے آگے نکل گئے ہیں۔ صہبائی کے مضامین اس قدر "خشک" نہیں ہیں جس قدر مرزا بیدل کے۔ اُن کا تخیل بہت بلند ہے۔ طبیعت میں روانی ہے۔ مضامین تلاش کرنے میں انھیں خاص کاوش نہیں کرنی پڑتی۔ صہبائی اور غالب کا دور نئی نئی ترکیبیں وضع کرنے میں مشہور ہے۔ چنانچہ صہبائی۔ غالب۔ اور مومن کے کلام میں ایسی نادر اور اچھوتی تراکیب پائی جاتی ہیں جو پہلے کسی اُستاد نے استعمال نہیں کیں۔ صہبائی نے اگرچہ مومن اور غالب کی طرح کچھ زیادہ سرگرمی نہیں دکھائی لیکن انھوں نے اس "جدت" میں نمایاں حصہ لیا۔ اُن کے کلام میں ایک جگہ ہندی الفاظ ویسے ہی موزوں ہیں جیسے ملا غنی کے کلام میں بعض کاشمیری الفاظ فنِ معما کے ماہر ہونے کی حیثیت سے صہبائی جس قدر مشکل مضامین کی توقع کی جاتی ہے کم ہے۔ لیکن نہیں اُن کے مضامین مقابلتاً سادہ اور عام فہم ہیں۔ اگر کہیں کوئی ادق مضمون بھی باندھا ہے تو اسی "معانی تخیل" کے طفیل باوجود فنِ معما اور لغت پر کامل عبور ہونے کے علاوہ حتی الوسع آسان لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ آپ کا کلام کسی اُستاد سے کم نہیں ہے۔

مولانا صہبائی کو جملہ علوم فنونِ مروجہ میں پوری دسترس حاصل تھی۔ خصوصاً درس و تدریس میں انھیں خاص ملکہ تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ حکیم مومن خاں کے مقابلے میں انھیں اورنٹیل کالج دہلی کا فارسی معلم مقرر کیا گیا تھا۔ فنِ معما میں ملا کوکبی کا درجہ سب سے بلند مانا جاتا ہے لیکن صہبائی نے اس فن میں اس قدر مہارت حاصل کی اور خود اس قدر نرالے اور اچھوتے نکتے پیدا کئے کہ ملا کوکبی کے معمے ان کے سامنے بالکل سادہ اشعار نظر آتے ہیں۔ فنِ معما میں ان کے لکھے ہوئے چار رسالے مشہور ہیں۔

۱۔ گنجینۂ رموز۔ اعمالِ معما کے نکات حل کرنے کی بہترین درسی کتاب ہے۔ صہبائی نے اس پر بہت محنت کی ہے اور ایک شعر سے تین سو ساٹھ مختلف نام نکالے ہیں وہ شعر یہ ہے۔

چوں آں سرو سہی خود از پردہ بنمود   دل از ما برد و آخر کرد تا بود

۲۔ جواہر منظوم۔ رباعیات معما کا مجموعہ ہے۔ ہر ایک رباعی سے اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں کا ایک نام نکلتا ہے۔ مثلاً

رحیم

لے رہ بدل جہاں ز جورت غم را   وے برہمی از تو خاطر خرم را
آں کو بنود بخندہ دلکش آرد ست   یکسر آشفتہ می کنی عالم را

رسالے کے خاتمہ میں ایک مثنوی لکھی ہے جس میں اپنے تخلص کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں۔

بیا ساقی کہ من در انتظارم
بدہ جام و ببر رنجِ خمارم
بیار آں جام و بنداز شیشہ یکتا
بشو آلودگیہا یم بصہبا
ز بس مشتاق صہبائے تو بودم
تخلص نیز صہبائی نمودم

۳۔ مخزنِ اسرار۔ ملا کوکبی ایک شعر سے صرف سینتیس[۳۷] نام نکال سکا۔ وہ شعر یہ ہے۔

کشتِ امید حاصل از آں ماہِ پر عتاب   نیمے ز آب سرکش و نیمے ہنافت آب

مولانا صہبائی نے اس رسالے میں اسی شعر سے ملا کوکبی کے ناموں کے علاوہ ایک سو پچاس جدا جدا نام نکالے ہیں۔

۴۔ رسالۂ نادرہ یہ بھی مذکورہ رسائل کی طرح صہبائی کے کمال کا گواہ ہے۔

مولانا صہبائی کی اور تصانیف بھی ہیں۔ مثلاً ریزۂ جواہر۔ رسالہ مخفا رسی نتائج الافکار، اعلاء الحق، کافی در علم قوافی۔ عوامضِ سخن اور بیاضِ شوق پیام وغیرہا۔

سراج الدین علی خاں آرزو نے شیخ علی حزین کے کلام رسالہ "تحقیق الحق" میں چند اعتراض کئے تھے۔ جن کا جواب مولانا صہبائی نے "اعلاء الحق" کی صورت میں دیا۔ اور ایک رسالہ قولِ فیصل بطور محاکمہ درمیان شیخ علی حزیں اور خانِ آرزو بھی لکھا۔ ان رسائل کے علاوہ مولانا مرحوم نے ظہیرائے تفرشی مقامات منصیرائے ہمدانی حسن و عشق نعمت خان عالی پنج رقعہ اور سہ نثر ظہوری اور گلزار ابراہیم وغیرہ کی شرحیں بھی لکھیں اور آئین اکبری اور آثار الصنادید مولفہ سر سید مرحوم پر غالب کے پہلو بہ پہلو اُن کی تقریظیں بھی موجود ہیں۔

امیر حبیب اللہ خاں نظامی جالندہری

ے جو شخص "بندہ" نہ ہو وہ حر ہو گا۔ اگر "حر" کو اُلٹ دیں تو "رح" بن جاتا ہے۔ اب چوتھے مصرعے میں اگر "می" کو "آشفتہ" کیا جائے تو "یم" بن جائے گا۔ ان دونوں کو دملہ "م" کو یک جا کیا جائے تو رحیم بن جائے گا۔

امیر حبیب اللہ خاں نظامی

تجرّد کا راز

از

"جرمین باماں"

گوین - ووین - مشی پین نے چلاّ کر کہا "ابھی تک تم ختم نہیں کرچکیں -"

سیڑھیوں کے اوپر سے ، جو پیچ کھاتی ہوئی دوکان سے بالاخانے پر خوابگاہ میں داخل ہوتی تھیں ، کسی نے خوش آئند آواز میں جواب دیا "آبا جان ! ابھی نہیں -"

"کیوں نہیں ؟ تم کو کچھ وقت کی بھی خبر ہے ؟ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں تمہاری کاہلی کی بدولت ایک اعلیٰ درجہ کا سودا ہاتھ سے کھو دوں ! کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ موسیو شیا نٹائے کا سا گاہک مجھے روز روز ملتا ہے ؟"

"آبا ! مجھ سے جسقدر جلدی ہوسکتی ہے ، کر رہی ہوں ."

"تو پھر ذرا اور جلدی کرو ."

یہ تنبیہی کلمات اس کے لڑتے ہوئے دانتوں کی ریخوں سے نکل کر ایک نمایاں خوف کا اظہار کرتے تھے . بڈھا مشی پین استعمالی اشیاء اور قدیم عجائبات کا سوداگر تھا . وہ یہ کہکر اپنی دوکان کے ایک تاریک گوشے میں جا بیٹھا - یہاں سے وہ ہمیشہ ایک مکڑی کی طرح آنے جانے والے سیاحوں پر نظر رکھا کرتا تھا -

اس مرتبہ اس کا معاملہ کسی معمولی سیاح سے نہ تھا ، بلکہ ایک دولتمند نوجوان سے جو ایک خاموش زندگی بسر کرنے کی غرض سے اپنی زمینداری پر آیا ہوا تھا ، تا آنکہ جو "شہرت" اس کو بعض دلچسپ "واردات" کی بدولت حاصل ہوگئی تھی زائل ہوجائے - اس کی گھڑی ایک عرصۂ دراز سے بند پڑی ہوئی تھی - ایک دنیادار نوجوان شخص کے واسطے بجز شکار اور پرانے عجائبات جمع کرنے کے اور کیا شغل ہو سکتا ہے - یہی وجہ تھی کہ موسیو شانٹائے ، بڈھے مشی پین کا مستقل خریدار بنگیا تھا - آج ہی مشی پین ایک پرانی مرمت شدہ الماری کو اس کے ہاتھ فروخت کرنے کی امید کر رہا تھا - موسیو شانٹائے کو قدرے پس و پیش تھا ، کیونکہ اس کی دانست میں نہ تو الماری قدیم عجائبات ہی سے تعلق رکھتی تھی ، اور نہ اسقدر قیمتی ہی تھی جتنا کہ اس کا مالک ظاہر کرتا تھا -

نیچے باپ فرد ختگی کے خیالی پلاؤ پکا رہا تھا - اوپر ووین کے رخسار سرخ تھے ، قلب کی حرکت تیز تھی - اور وہ اپنے عجیب و غریب کام کی تکمیل میں عجلت کر رہی تھی -

اس کی سادہ خوابگاہ میں میز پر کئی ایک زردی مائل ٹکڑے پڑے تھے جن پر نہایت خوبصورت اور دلکش خط میں کچھ لکھا ہوا تھا - ایک دوات پرانی بدرنگ سیاہی سے بھری ہوئی تھی - اور ایک رنگ اڑا ہوا ریشمی فیتہ میز پر رکھا تھا - بجز ایک چیز کے یہی وہ کل سامان تھا جس سے وہ کام کر رہی تھی - وہ چیز اٹھارہویں صدی کی ایک "کتاب الانشاء" تھی اور میز پر بند رکھی تھی - ووین اپنے دل کے جذبات صفحۂ کاغذ پر اتارنے میں اسقدر منہمک تھی کہ اپنے والد کے قدم کی چاپ پشت پر سن کر ایکدم چونک پڑی -

"اب مجھے خود ہی تم کو تلاش کرنے کے واسطے آنا پڑا - کیوں؟" بڈھے نے ناراضگی کے لہجہ میں کہا -

"آبا جان !" لڑکی نے گھبرا کر جواب دیا "میں ختم کر چکی - بس بالکل ختم ہوگیا ." اس نے تحریر شدہ کاغذات کو اٹھا کر کسی سنہرے سفوف سے خشک کیا اور موڑ کر اسی پرانے فیتہ میں لپیٹ کر اپنے والد کے ہاتھ میں دیدیا . یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک خوبصورت بالوں والی نازک اندام معصوم پری کسی قد آور دیو کے مقابل کھڑی ہوئی ہے .

"کیا تم نے وہ تمام محبت آمیز خطوط نقل کر دئے جن کے اوپر میں نے نشان لگا دیا تھا" بڈھے مشی پین نے سوال کیا

"ہاں آبا"

"اور ان پر پانی کے چھینٹے ڈالکر ایسا بنادیا کہ آنسوؤں کے دھبے معلوم ہوں ."

"ہاں آبا"

اس نے بے اعتباری کے ساتھ کچھ دیر اسے دیکھا۔ لڑکی اس خوف سے کانپ گئی کہ مبادا وہ کھولکر ان خطوط کو پڑھے۔ مگر وہ بہت عجلت میں تھا۔ اور خطوط کا پلندہ ہاتھ میں لئے ہوئے نیچے اتر گیا تاکہ ان کو پرانی الماری کی ایک پوشیدہ دراز میں چھپادے۔

تنہا ہوتے ہی ودین خودبخود مسکرائی۔ خطوط کی نقل؟ نقل کی آخر کیا ضرورت تھی۔ کیا خود اس کے دلی جذبات اسقدر کافی نہ تھے۔ کہ ایسے ہزارہا خطوط کو پڑ نہ کردیں۔ دل کے وہ پوشیدہ جذبات، جو موسیو شانٹا سے کی آمد سے برانگیختہ ہوگئے تھے۔ اظہار کے واسطے کسی کتاب الانشا کے حاجت مند ہوسکتے ہیں۔ اور اب وہ در پردہ خوش تھی" وہ میرے خطوط کو پڑھیگا۔" اس نے خیال کیا۔ "وہ تو یہی سمجھے گا کہ اس کی لکھنے والی اس دنیا سے عرصہ ہوا گزر چکی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ انہیں خطوط کو پڑھیگا جو میں نے اسی کے واسطے تحریر کئے۔ اور جنکو میں اس کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں لکھونگی۔"

ایک گھڑی بعد بڈھے مشی پین نے اس کو آواز دی۔ اور وہ نیچے اتر کر دوکان میں داخل ہوئی۔

"لو مبارک ہو۔" بڈھے آدمی نے کہا" وہ قبل از وقت ہی آ پہنچا تھا اور جونہی میں نے اس پوشیدہ دراز کا ذکر کیا اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں نے باتوں باتوں میں الماری کے کھولنے کے متعلق تمام باتیں کہہ ڈالیں۔ اور وہ الماری کو اپنے ہمراہ موٹر میں لے گیا۔ کیوں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

ودین نے کہا "میں خوش ہوں۔"

(۲)

گاؤں والوں میں مشہور تھا کہ موسیو شانٹا ئے چھ ماہ سے زاید گڑھی میں نہ بسر کریگا۔ مگر اس کا قیام زیادہ ہوتا گیا۔ یہانتک کہ بجز ایک آدھ مرتبہ چند روز کے واسطے پیرس جانے کے، اس نے مستقل طور سے وہاں اقامت اختیار کر لی۔ ہر شخص کو حیرت تھی کہ وہ اب تک تجرد کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ جس شخص کی دولت اس کے واسطے ہر قسم کا سامانِ تفریح اور آرام و آسائش مہیا کر سکے، اور وہ اسقدر سادہ زندگی بسر کرے، یقیناً تعجب خیز ہے۔

دن گزرتے چلے گئے۔ بڈھا مشی پین زمانے کی نیرنگی کا شکار ہوگیا۔ دوکان ودین کو ورثہ میں ملی۔ اس کے سنہری بالوں میں سفیدی کی جھلک نمودار ہو چلی تھی۔ اور اس کی نیلی آنکھوں کی پہلی چمک زائل ہوتی جاتی تھی۔ وہ بھی تنہا اور خاموش زندگی بسر کر رہی تھی۔ اپنی خوبصورتی اور باپ کی دولت کے باوجود اس نے شادی نہیں کی۔ کبھی کبھار موسیو شانٹائے ایک آدھ گھنٹہ اس کے ساتھ کونے بچالوں کو ڈھونڈنے اور پرانی کتابوں اور مختلف عجائبات کو تلاش کرنے میں گزارتا تھا۔ یہ رشتۂ مشترک، اور ان کا یہ خیال کہ دونوں کی خلوت گزینی کے اسباب بجنسہٖ ایک تھے۔ ان کو باکثر ملنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

موسیو شانٹائے اپنی عمر کے پچاس سال پورے کر چکا تھا کہ ایک روز کتابوں کے ڈھیر کو ٹٹولتے ہوئے اس کو ایک "کتاب الانشا" دستیاب ہوئی۔ اس نے کتاب کی ورق گردانی شروع کی۔ ودین اس کو ایک عجیب انداز سے دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحہ بعد اس نے کتاب کو میز پر رکھدیا اور کہنے لگا۔

"اس زمانے میں بھی لوگ ادبیات سے واقف تھے تمہیں یاد ہوگا۔ میں نے بیس برس قبل تمہارے والد سے ایک پرانی الماری خرید کی تھی۔ میں نے اس کے اندر ایک پیکٹ چند محبت بھرے خطوط کا پایا۔ ہاں!" اس نے ودین کے چہرہ کے تغیر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "پرانے خطوط محبت کا ایک پیکٹ۔ یہ خطوط ایسے خوبصورت انداز میں لکھے ہوئے ہیں، اور اظہارِ جذبات اس نفیس پیرایہ میں کیا گیا ہے، کہ آج اس کی مثال ملنی ناممکن ہے۔ انہیں خطوط نے میرے نظریۂ زندگی کو تبدیل کر دیا۔ ان کو پڑھکر میں نے یہ محسوس کیا کہ میں کسی عورت سے محبت نہیں کرسکتا۔ کیونکہ فی زمانہ ایسی عورت کا ملنا جو اس خوبصورتی کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کر سکے۔ حد درجہ دشوار ہے۔ میری گزشتہ محبتیں بجز حماقت کے اور کچھ نہ تھیں۔ اور مستقبل مجھ کو کوئی امید نہیں دلاتا تھا۔ میں یہیں رہ پڑا۔ بیس سال تک میں نے اپنی زندگی گویا ایک ہیولے کی معیت میں بسر کی ہے۔ مجھے اس کا یقین ہوتا جاتا ہے کہ یہ خطوط پرانے زمانے میں میرے ہی واسطے تحریر کئے گئے تھے۔

ودین کے سپید چہرے پر ایک ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ لیکن ایک ہی لمحہ بعد اس کے رخسار پھر زرد تھے۔ اس نے آہستہ سے کہا:۔

میں بہت خوش ہوں"

حفیظ الرحمن

عمر خیام اور اسکا عہد

رباعیات کی اہمیت

رباعیات کی ترتیب پیشتر اس کے کہ خیام کی رباعیات پر تنقید کی جائے۔ بعض اور باتوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سے پہلے اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ خیام کی زندگی میں اس کی شہرت کا انحصار تمام تر ان کے علم و فضل اور اس کی مہارت ہندسہ و نجوم پر تھا۔ یہ رباعیات خیام نے اپنے اوقات فرصت میں رقم کی ہیں۔ یہ اشعار محض اپنے دل کے جذبات کے اظہار اور دوستوں کی خوشنودی خاطر کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ اشعار پہلے مجالس میں پڑھے گئے ہوں کہ ذوق عام نے اسے قبولیت کی نظروں سے دیکھا ہو۔ اور بعد ازاں خود شاعر یا شاعر کے کسی دوست کی کاوش سے ایک مجموعے کی صورت میں لکھے گئے ہوں میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ شاعر کا مقصد ان سے یہ ہرگز نہ تھا کہ ان میں خاص فلسفہ حیات کے رموز کو حل کیا جائے۔ اور اس کے تمام جزئیات کو احاطہ کر کے ایک "پیغام" کی صورت میں پیش کیا جائے۔ میری مراد یہ ہے کہ شاعر کے ذہن میں کوئی ایسا قصر تخیل موجود نہ تھا۔ جن کی متناسب تعمیر ان رباعیات کے ذریعے عمل میں آئی ہو۔ رباعیات خود پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ وہ کسی خاص منظم کار کے ماتحت نہیں لکھی گئیں۔ یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ ان رباعیات کی تخلیق کے لئے ایک مسلسل تحریک اختراع کی ضرورت محسوس نہ ہوئی ہو گی بعض ہنگامی تاثرات کے زیر اثر لکھی گئی ہونگی۔ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ ان میں کوئی خاص الہام شعری مشترک نہیں ہے۔ جو من حیث المجموع ایک وسیع اور جمیل۔ صنعتی تخلیق کے لئے کوشاں ہو۔ یہ اشعار ٹکڑے ہیں۔ جو ایکدوسرے سے علیحدہ ہیں ایک ہی صنعتی تخلیق کے اجزا نہیں۔ یہ رباعیات مختصر سی تصاویر ہیں ( )
جن میں آب و رنگ بھر کے ایک فاضل نے اپنے ذہنی اضطراب سے سکون حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ عقل و ذہن کی کارفرمائیوں کے بعد جب خیام کا دماغ استدلال و انبساط سے تھک گیا ہے۔ تو اس کی جذباتی زندگی کی سبیل نے یہ راستہ اختیار کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں کوئی منطقی تسلسل و توازن موجود نہیں ہے۔ ان میں صناع شاعر کے ہنگامی جذبات و تاثرات کی تصویریں نظر آتی ہیں۔

پھر ایک اور حقیقت ہے۔ فارسی دیوانوں میں اشعار ہمیشہ حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دئے جاتے ہیں کسقدر مہمل طریقہ ہے۔ اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ آرٹ کے اصولوں سے کسقدر بے خبر ہونگے۔ اس ترتیب و تنظیم کے باعث مختلف رباعیات جو ایک ہی حرف کے نیچے جمع کی گئی ہیں۔ ان کا ایک دوسرے سے کوئی تناسب نظر نہیں آتا۔ مضامین اور جذبات کے اعتبار سے ان میں خاص تنوع پایا جاتا ہے۔ اور ان رباعیات سے یہ اندازہ لگانا سخت دشوار ہے کہ عمر خیام نے کونسی رباعی کس عمر میں کہی۔

انگریزی مجموعوں سے کم از کم یہ تو پتہ چل سکتا ہے کہ شاعر کے دماغ کی تدریجی ترقی۔ عمر کے منازل کے ساتھ کیا نسبت رکھتی ہے۔ مگر یہاں یہ حالت ہے کہ خیام کے رنگین شباب کی پہلی مدھ بھری آواز بڑھاپے کی افسردہ نغمہ سرائی کے پہلو بہ پہلو رکھدی گئی ہے۔ اور دونوں میں تمیز کرنے کے لئے کوئی معیار مقرر نہیں۔ ادب اور ادبی ارتقا کے لئے کسقدر عظیم الشان نقصان ہے!

پھر یہ بھی مسلم ہے کہ عام طور پر مجموعوں میں جو رباعیات ملتی ہیں۔ وہ انہیں سے تقریباً ۱۰۰ کے قریب دوسرے شعرا کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ فرض کرنے کے لئے کہ یہ عمر خیام کی تصنیف میں بہت وزن دار دلائل موجود ہے۔

رباعیات کا سب سے قدیم نسخہ وہ ہے جو بوڈلیس لائبریری میں ملتا۔ یہ نسخہ شیراز میں ۸۶۵ ہجری میں لکھا گیا تھا۔ اس نسخے میں صرف ۱۵۸ رباعیات ہیں۔ انڈیا آفس کے ایک نسخے میں رباعیات کی تعداد 362 ہے۔ ایک اور نسخے کی تعداد ۲۱۷ ہے۔ اور کلکتہ ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک نسخے میں ۵۱۶ رباعیات۔

درج ہیں۔

مس کیڈل جو ایک نہایت ذہین محقق ہے۔ رقمطراز ہے کہ اُس نے 600 رباعیات ایسی پڑھی ہیں جو عمر کے نام سے منسوب ہیں۔ اس کے خیال میں اصلی رباعیات کی تعداد 250 اور 300 کے درمیان ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی تذکرہ نویسوں اور مورخوں کی کتابوں میں ان رباعیات کا کوئی ذکر نہیں ہوا۔ عام طور پر لوگوں میں یہ رباعیات مقبول ہوئی ہیں۔ خاص طور پر وہ لوگ جو نقل کو اندھا دھند تقلید سے بہتر سمجھتے تھے۔ وہ ان رباعیات کی بیباکی سے بہت متاثر ہوئے۔

ہندوستان میں اکبر اعظم نے ان رباعیات کی اتنی قدر کی کہ اس کا حکم تھا کہ حافظ کی ہر غزل کے بعد خیام کی ایک رباعی لینی چاہئے کیونکہ خیام کے بغیر حافظ کا کلام بے مزہ معلوم ہوتا ہے۔

(دیکھو آئین اکبری)

ظاہر ہے کہ مشرقی ممالک میں جہاں چھاپہ خانے بہت دیر سے آئے ہیں۔ نسخے قلمی ہوتے تھے۔ عام طور پر لوگ ان نسخوں میں جو اور رباعیات انہیں پسند آتی ہونگی وہ بھی درج کر دیتے ہونگے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہوگا کہ صاحب نسخہ حاشیے پر کسی اور شخص کی رباعی لکھ دیتا ہوگا۔ اور پھر کاتب اس رباعی کو بھی دوسری بار نسخے کے نقل کرنے میں متن میں داخل کر دیتا ہوگا۔

شاید مذہبی تعصب بھی کچھ الحاقی رباعیات کو اصل نسخے میں داخل کر دینے کا موجب ہوا ہو۔ آپ پسند کریں یا ناپسند۔ ظاہر ہے کہ رباعیات کا مطلب صاف ہے۔ اس لئے کوئی اس قسم رباعی آئے جس میں معمولی متصوفانہ عرفان و معرفت کے اسرار ہوں یا عشق حقیقی پر خامہ فرسائی کی گئی ہو۔ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ خیام کی رباعی نہیں بشرطیکہ اس رباعی کا انداز باقی اصل رباعیات سے مختلف ہو۔

رباعی کی مختصر تاریخ

مسٹر براؤن کا خیال کہ رباعی خاص اہل فارس کی ایجاد ہے۔ اور واقعات صاف بتا رہے ہیں کہ یہ قیاس درست ہے تا اینکہ تذکرہ دولت شاہی میں فارسی شاعری کی ابتدا کے متعلق جو روایات درج ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا فارسی مصرع غلطاں غلطاں ہی رود تا لب رباعی کے اوزان میں ہی تھا۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے سب سے پہلے ابوسعید ابوالخیر نے رباعی کو ترقی دی۔ انہوں نے تصوف کے تمام مسائل حل کر دئے۔ اور اس طرح پہلی بار رباعی کو ان تمام اصطلاحی الفاظ و تراکیب سے معمور کر دیا جو تصوف کے ساتھ خاص ہیں۔ رباعی کے لئے جیسا کہ قارئین کرام کو معلوم ہوگا ضروری ہے کہ اس کا پہلا اور دوسرا مصرع ہم قافیہ ہو۔ چوتھے مصرعے کو دوسرے کے ساتھ ہم قافیہ ہونا چاہئے مگر بعض اوقات تیسرا اور چوتھا بھی ہم قافیہ ہوتا ہے۔

خیام کا سٹائل

عمر کا سٹائل ترنم سے لبریز ہے۔ وہ الفاظ کے بیجان جسم میں اپنے آرٹ کی ایک نازک سی جنبش سے ایسی روح پھونک دیتا ہے۔ کہ الفاظ نغموں سے گونجنے لگتے ہیں۔ قافیے اس برجستگی اور بے ساختگی سے آتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ قافیے اسی مضمون اور اسی وزن کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ اس کی زبان سادہ اور صاف ہے اور وہ اتنا باکمال صناع ہے کہ اس سادگی اور صفائی سے زور بھی پیدا کرتا ہے مضمون الفاظ اس کے ہاتھ میں شوکت و عظمت اختیار کرتے ہیں۔ اور محض ان کی ترتیب سے وہ پڑھنے والے کے ذہن پر ایک گہرا اثر قائم کر دیتا ہے۔

رباعی کا اختصار اکثر اس امر کا متقضی ہوتا ہے کہ بہت دقیق اور گہرے خیالات ادا نہیں ہو سکتے۔ لیکن خیام انہیں چار سطروں میں جذبات اور احساسات کی آگ بھر دیتا ہے۔ اور اس کے شعر کندن کی طرح دمکنے لگتے ہیں۔

افسوس ہوتا ہے کہ مسٹر براؤن اور سر برجس ... نے خیام کی شاعری کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اور اس کے کلام پر ایک سرسری اور سطحی نظر ڈالی ہے۔ لیکن اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ مسٹر براؤن کو محض صحیح واقعات کو جمع کرنا جانتے تھے۔ تنقید و تحقیق سے انہیں دور کا لگاؤ بھی نہ تھا۔

فضائے تخیل

خیام کی فضائے تخیل خالص مشرقی ہے۔ گہرا سبز آسمان۔ بلبل نغمہ سرا۔ گلاب و نافرمان دشمن دم عیسی۔ شطرنج۔ شاہ شطرنج۔ مہرے۔ نرد باز۔ رخسار یار کے خال۔ محبوب کے معطر و معنبر سیاہ بال۔ خیام ان تمام چیزوں سے تشبیہات و استعارات حاصل کرتا ہے۔ مگر اور شعرا کی طرح یہ چیزیں اس کے کلام میں لائی ہوئی معلوم نہیں ہوتیں۔ بلکہ اس بے ساختگی سے آتی ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ایک بالکل نئی چیز ہے۔ کس شاعر کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے۔

حافظ نے اپنے اشعار میں یہی فرسودہ چیزیں اتنی طلسمی کمال سے اسطرح گوندھی ہیں کہ یک جان ہو کر قالب گوئی ہیں۔ مگر اس کے علاوہ شاید ہی کوئی ایرانی شاعر ہو جس نے اس محدود نے تخیل سے ایسا کام لیا ہو جیسا خیام نے۔

اس کے ہاں ہر چیز روشن ہے۔ دیکھی جا سکتی ہے۔ محسوس کی جا سکتی ہے۔ دوسرے شعرا کی طرح وہ مسلسل اشارات و تشبیہات کے بوجھ سے پڑھنے والے کے ذہن و دماغ کو تھکا نہیں دیتا۔

شکستہ جام۔ کمہار۔ اور اس کے برتن۔ فانوس خیال۔ غرضکہ تمام ذہن میں تازگی اور جدت کا احساس پیدا کرتے ہیں۔

ظرافت

خیام کا یہ وصف حقیقت میں اسے بہت سے شاعروں سے ممتاز کرتا ہے۔ یوں تو ایرانی اپنے خوش طبعی۔ زندہ دلی اور ظرافت کے لئے مشہور ہیں۔ مگر ایرانی اشعار میں ظرافت کا اثر نسبتاً بہت کم نمایاں ہے۔ خیام کے ہاں یہ ظرافت ایک نہایت اہم حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے گویا خیام نے اپنے ظریفانہ اشعار میں اپنی ہنستی ہوئی روح بھر دی ہے۔ یہ ظرافت محض سطحی نہیں۔ جب میں خیام کی ظرافت کا تصور کرتا ہوں تو میری نظر میں وہ رباعیات نہیں ہوتیں جس میں ریاکاری اور زہد کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ اور "فاحشہ عورت" کی بینائی کو زاہد کی ریاکاری پر ترجیح دیگئی ہے۔ بلکہ میں سوچتا ہوں یہ ایک فلسفی کا بے پروایانہ قہقہہ ہے۔ دنیا اپنے ہجوم رنج و غم۔ کرب و بلا کے ساتھ اسے حزن و ملال کے اتھاہ سمندر میں غرق کر دینا چاہتی ہے۔ تکلیف کا جھکڑ اُسے خس و خاشاک کی طرح اڑا کر غم کے اندھیرے کنویں ڈبونا چاہتا ہے۔ اور خیام ان تمام باتوں کے جواب میں صرف ہنستا ہے۔ کھلکھلا کر ہنستا ہے یہ ہنسی امید کی ہنسی نہیں۔ مگر یاس کی بھی نہیں۔ یہ زہرخند نہیں۔ بلکہ ایک حقیقت آشنا شخص کی ہنسی ہے۔ وہ اس لئے ہنستا ہے کہ رونا بے سود ہے۔ کہتا ہے

گویند مرا چو سور با حور خوش است
من مے گویم کہ آب انگور خوش است
ایں نقد بگیر و دست از نسیہ بدار
کآواز دہل برادر از دور خوش است

مندرجہ ذیل رباعی میں ظرافت نے ایک نشتر کی صورت اختیار کر لی ہے۔

امروز کہ موسم جوانیٔ من است
مے نوشم از آنکہ کامرانیٔ من است
عیبم مکنید گرچہ تلخ است خوش است
تلخ است از آنکہ زندگانیٔ من است

پھر کہتا ہے:-

اے چرخ ز گردش تو خرسند نیم
آزادم کن کہ لایق بند نیم
گر میل تو با بے خرد و نااہل است
من نیز چناں اہل و خرد مند نیم

خیام کا فلسفہ

کائنات کی تخلیق سے لیکر آج تک انسان اپنی پیدائش کی غایت دریافت کرنے کی کوشش میں مصروف رہا ہے۔ عمر خیام کے سامنے بھی یہی مسئلہ تھا۔ وہ دیکھتا تھا کہ دنیا کی اشیا اس کی آنکھوں کے سامنے تغیر پذیر ہیں۔ مٹ رہی ہیں فنا ہو رہی ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسی طرح انسان بھی فنا ہو جائیگا جس طرح کائنات کی باقی چیزیں صرف اس لئے پیدا ہوئی ہیں کہ انسان جو تخلیق اکبر ہے ان سے بہرہ اندوز ہے۔ تقدیر بھی انسان کی آرزوؤں اور تمناؤں پر ہنس رہی ہے۔ اسے دنیا کی رنگینیوں میں محو دیکھ دیکھ بہرہ اندوز ہو رہی ہے۔ اور پھر ایکبارگی اس تاش کے گھر۔ مٹی کے گھروندے کو اپنی ایک جنبش سے خاک میں ملادیگی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حیران ہوتا ہے کہ اگر انسان کی غایت محض فنا ہے۔ تو اس کے دل و دماغ میں یہ وسیع صلاحیت کیوں ودیعت کی گئی ہے اسے جمال معنوی اور حسن جسمانی کی لطافتوں سے کیوں آراستہ کیا گیا ہے۔ اس میں انتہائے کمال تک پہنچنے کی آرزو کیوں رکھی گئی ہے؟ کس دردناک انداز سے کہتا ہے:-

ہرچند کہ رنگ و بوئے زیبا است مرا
چو لالہ رخے چو سرو بالا ست مرا
معلوم نشد کہ در طرب خانہ خاک
نقاش من از بہر چہ آراست مرا

اس طوفان اضطراب میں جب وہ مذہب کے علما کی طرف دیکھتا ہے تو وہ جھنجھلا اٹھتا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ازل سے تقدیر خداوندی نے ہر ایک شخص کے اعمال و افعال کا فیصلہ کر دیا ہے۔ وہ اٹل ہے۔ اٹل ہے۔ ہو کر رہیگا۔ اور اس دعوے کے باوجود

پھر یہ بھی کہتے سنے کہ انسان کو اپنے گناہوں کی سزا ملیگی۔ مذہب کے مفسروں کی اس لغویت پر وہ پھبتیاں کستا ہے۔ ہنستا ہے۔ مذاق اڑاتا ہے۔ گناہ۔ اور جبر قدر کے مسائل خیام کے خاص موضوع ہیں۔ گناہ کے متعلق اس نے بہت سی رباعیات لکھی ہیں۔ بعض میں تو وہ گناہ کو فانی انسان کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ انسان جو گنا ہوں کو جبار مطلق کی نہ رکنے والی تقدیر سے منسوب کرتا ہے اور انہیں واقعات و حوادث کا ایک نتیجہ خیال کرتا ہے۔ اور بعض رباعیات میں انسان کے گناہ کو اس طرح دیکھتا ہے کہ گویا انسان اپنے احساس میں مختار ہے۔ فانی نے کیا خوب کہا ہے۔

فانی میرے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی !
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

جبر کو اس نے کئی بار اپنی تضحیک کا نشانہ بنایا ہے۔ نہ اس لئے کہ ازلی تقدیر کوئی شے نہیں بلکہ اس لئے کہ ازلی تقدیر کے بعد گناہ کی سزا مہمل ہو جاتی ہے۔

ایک جگہ کہتا ہے۔

آنکس کہ گناہ نکرد چون زیست بگو
ناکردہ گناہ در جہان کیست بگو
من بدکنم تو بد مکافات دہی
پس فرق میان من و تو چیست بگو

پھر لکھتا ہے۔

سازندہ کار مردہ و زندہ توئی ؛ دارندۂ این چرخ پراگندہ توئی
من گرچہ بدم صاحب این بندہ توئی ؛ کس را چہ گنہ کہ آفرینندہ توئی

(باقی آئندہ)

عابد

غزل

(از قلم جناب تلوک چند صاحب محروم)

کر دیا قیدِ قفس نے وقفِ حیرانی مجھے
اب کہاں اے ہمنوا! ذوقِ پر افشانی مجھے

دے کے ذوقِ نغمۂ مرغِ گلستانی مجھے
کر دیا حیرت نشینِ کنجِ ویرانی مجھے

قائلِ احساں نہ کر اے عالمِ فانی مجھے
تجھ سے کیا حاصل ہوا غیر از پشیمانی مجھے

حلقۂ غم ہو گیا ہر لحظہ میری عمر کا
زندگی اپنی ہوئی زنجیرِ طولانی مجھے

کیوں نہ دوں تیغِ نگاہِ ناز کو دل میں جگہ
کیا نہیں شوقِ جراحت ہائے پنہانی مجھے

تیری زلفوں کی پریشانی سے دل آسودہ ہے
کاش! ایسی ہی کوئی ہوتی پریشانی مجھے

آئینہ سیما نمودِ سیمیا ثابت ہوئی !
پہلی حیرت سے سوا ہے اس پہ حیرانی مجھے

تیرے نظارے بھی ہیں اے شامِ غربت دلفریب
یاد ہے لیکن وطن کی صبحِ نورانی مجھے

محشرِ جذبات ہے غالب کی یہ ساری غزل
گو نہیں محروم دعوائے سخندانی مجھے

خاص کر یہ مصرعۂ دلکش نشاط انگیز ہے
"پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے"

(غیر مطبوعہ)

مخدرۂ عظمیٰ نواب بادشاہ محل عالم

نواب بادشاہ محل کا تذکرہ سب سے پہلے عبدالغفور خاں نساخ نے اپنے تذکرہ "سخن شعراء"[1] میں کیا ہے کہ

"ترتیب تذکرہ کے وقت مٹیا برج میں رہتی تھیں ستار اچھا بجاتی تھیں اور شعر بھی اچھا کہتی تھیں، صاحب دیوان و مثنوی تھیں"۔

اس کو دیکھ کر مؤلف تذکرۃ النساء نادری[2] نے اور صاحب ماہ درخشاں[3] نے مرتب مشاہیر نسواں[4] نے مالک بہارستان ناز[5] نے یہی حالات اور کلام نقل کئے ہیں کسی نے "نواب محل" خطاب لکھ دیا کسی نے خاص محل پر اکتفا کی کسی نے "یکے از نسوانِ شبستانِ واجد علی شاہ" لکھ دیا۔

اشہری مرحوم نے اپنی کتاب "ایشیائی شاعری" میں بادشاہ محل کی زمزمہ سنجیوں کے پس چلمن سے سننے کا تذکرہ کیا ہے کہ

"حضرت جان عالم محمد واجد علی شاہ ارم آرام بادشاہ اودھ کے محلات معلیٰ میں "خاص محل" کا درجہ خاص ہے۔ خاص محل کا دیوان چھپ گیا ہے۔ جب جناب نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ والئ ریاست بھوپال کلکتہ تشریف لے گئیں تو خاص محل صاحبہ نے اپنا دیوان نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کو اور نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ نے اپنا دیوانِ شیریں خاص محل صاحبہ کو دیا۔ مجھ کو بوجہ ملازمت روبکاری جناب نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ جنت آرام پس چلمن سے حضور خاص محل کی زمزمہ سنجیوں کے سننے کا اتفاق ہوا۔ حضور ممدوحہ کی زبان بجائے خود فصاحت کی کان سمجھنا چاہئے۔ اور طبقۂ نسواں کی شاعری میں اُن کی شاعری کو خاص جگہ دینا لازم ہے"۔

(دیکھو ایشیائی شاعری صفحہ ۱۳۸)

جناب آغا حیدر حسن صاحب ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ دہلوی پروفیسر نظام کالج حیدرآباد دکن کے کتب خانہ سے ہمیں "دیوان عالم" کا نسخہ بھی مل گیا۔ اور جناب عبدالحق صاحب منیجر مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن نے ایک پرانا نسخہ "مثنوی عالم" کا بھی فراہم کر دیا۔ ان دونوں کتابوں کے لئے میں اپنے ہر دو احباب کا مشکور ہوں۔ مگر افسوس ہے کہ دیوان اور مثنوی دونوں کا مطالعہ بھی بادشاہ محل صاحبہ کے حالات کے لئے مفید نہیں ہوا۔ مجبوراً "اختر پیا" کی خود نوشتہ سوانح حیات "محل خانۂ شاہی" اور "مثنوی حزنِ اختر" سے استفادہ کرنا پڑا چنانچہ ان دونوں کتابوں سے محل موصوف کے جس قدر حالات معلوم ہو سکے لکھے جاتے ہیں۔

واجد علی شاہ نے لکھا ہے کہ "نواب علی تقی خاں مرحوم ابن شرف الدولہ ابن مدار الدولہ کی لڑکی سے ۱۵ شعبان سنہ ۱۲۵۳ھ کو شادی ہوئی"۔

نواب بادشاہ محل ہی علی تقی خاں کی لڑکی تھیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ زن و شوہر میں زیادہ دنوں تک موافقت نہیں رہی۔ چنانچہ واجد علی شاہ نے خود لکھا ہے کہ

"مجھ میں اور میری زوجہ میں پانچ مہینے تک وہ محبت اور اخلاص جو زن و شوہر میں ہونا چاہئے قایم رہا"۔

انھیں دنوں نواب ثریا جاہ نے واجد علی شاہ کو پانچ سو اور بادشاہ محل کو چار سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی اور واجد علی شاہ نے محل چہرے اڑانے شروع کئے۔ چنانچہ زن و شوہر میں کشمکش رہنے لگی۔

اسی کشمکش کے زمانے میں بادشاہ محل کو (جو اُس وقت اعظم بہو تھیں) لڑکا تولد ہوا۔ اور نوشیروانِ قدر نام رکھا گیا۔ اور واجد علی شاہ کو اُسی مسرت میں ناظم الدولہ فخر الملک محمد واجد علی خاں بہادر صولت جنگ مرزا خورشید حشمت خطاب ملا۔

سنہ ۱۲۵۵ھ میں بادشاہ محل سے دوسرا فرزند مرزا نوشیروان قدر تولد ہوا۔ اُس وقت "اختر پیا" صرف سترہ سال کے تھے۔ اب واجد علی شاہ بادشاہ محل سے خفا رہنے لگے۔ اور انھیں دنوں مرزا کیوان قدر تولد ہوئے جو بعد کو ولیعہد مقرر کئے گئے۔ واجد علی شاہ کی بے اعتنائیوں نے یا تو بادشاہ محل کو بے پرواہ بنا دیا تھا۔ یا وہ دب گئی تھیں۔ بہرحال اب وہ واجد علی سے باز پرس نہیں کرتی تھیں جب واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو بادشاہ محل کو جو خاص محل کے نام سے مشہور تھیں۔ "ملکہ مخدرۂ عظمیٰ نواب بادشاہ محل" خطاب اور پانچ ہزار روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی۔

محل خانۂ شاہی ذی الحجہ سنہ ۱۲۶۵ھ میں ختم ہوا ہے۔ اس کے بعد کے حالات کہیں نہیں ملتے۔ مثنوی حزنِ اختر سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ بادشاہ محل کلکتہ میں ہمراہ تھیں۔ یہ بھی بادشاہ محل کا ایثار تھا۔ کہ اُنھوں نے اپنے نخوط الحواس فرزند نوشیروان قدر کو لکھنؤ میں چھوڑ کر واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ کا سفر کیا۔ واجد علی شاہ نے لکھا ہے کہ

[1] دیکھو تذکرہ سخن شعراء مطبوعہ نولکشور پریس سنہ ۱۲۹۱ھ صفحہ ۵۵۵ [2] دیکھو تذکرۃ النساء نادری صفحہ ۱۲۹ [3] ماہ درخشاں صفحہ ۲ [4] مشاہیر نسواں صفحہ ۳۹ [5] بہارستان ناز صفحہ ۲۱۵، ۲۱۶ (دکن)

پسر تھا بڑا سب سے نوشیرواں کہ وہ لکھنؤ میں رہا تھا وہاں
جو نوشیرواں سے ملے لفظ قدر عیاں نام اس مہ کا ہو مثل بدر
وہ بائیس کا تھا سن و سال میں کلاں تھا پسر میرا ہر حال میں
مگر حکم اللہ جو ہو گیا وہ مجنوں صفت تھا نہیں شک ذرا
تمیز بد و نیک اُس کو نہ تھی وہ گونگا بھی بہرا بھی تھا آدمی
وہ جو کچھ تھا وہ تھا میرا لعل تھا مرض صرع کا بھی تھا بے حال تھا
کروں شرح اب لطف اللہ کی کہ شادی بھی کی میں نے اس ماہ کی
جو زوجہ ہے اُس کی وہ ہے شہریار بھو گر ملے اس میں ہو لطف یار
جنوں میں بھی وہ اس کا لقمان تھا وہ تھا تن کی جاں جان کی جان تھا
وہ تھا لکھنؤ میں سن نے ماہ و عید اسی لکھنؤ میں ہوا وہ شہید

کلکتہ میں بادشاہ محل واجد علی شاہ کو آرام پہنچانے کی کوششیں کرتی رہیں۔ چنانچہ وہ کھانا بھی بھجواتی تھیں۔ واجد علی شاہ نے لکھا ہے۔

محل خاص سے ہے جو مرا نیک نام وہاں سے بھی آتا ہے خوانِ طعام

مگر افسوس ہے کہ مثنوی حزن اختر ۱۲۷۶ھ تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد کا پتہ نہیں چلتا۔ واجد علی شاہ نے ۱۳۰۵ھ میں انتقال کیا ہے۔ اور بیاض عشاق" دیوان عالم ۱۳۱۶ھ ۱۸۹۹ء میں طبع ہوا ہے جس پر

"دیوان فصاحت تو اماں بلقیس دوران مخدرۂ عظمیٰ نواب بادشاہ محل صاحبہ مسمیٰ بہ بیاض عشاق"

لکھا ہے۔ اس سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ طبع دیوان کے وقت بادشاہ محل زندہ تھیں یا وفات پا چکی تھیں۔ البتہ مثنوی عالم کے اوپر

"کتاب فصاحت تو اماں بلقیس دوران مخدرۂ عظمیٰ نواب بادشاہ محل صاحبہ دام اقبالہٗ"

لکھا ہے اس آخری ٹکڑے (دام اقبالہ) سے پتہ چلتا ہے کہ مثنوی کی طباعت کے زمانے میں (۱۳۰۹ھ ۱۸۹۱ء) میں بادشاہ محل زندہ تھیں۔ دیوان عالم میں غزلوں کے اختتام پر

"الحمد اللہ تعالیٰ شانہ کہ دیوان بلاغت من تصنیفات مریم عصر بلقیس دہر ملکہ مخدرۂ عظمیٰ نواب بادشاہ محل صاحبہ مرحومہ"

"باختتام رسید"

لکھا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ طبع دیوان کے وقت بادشاہ محل زندہ نہ تھیں۔ اسی طرح بادشاہ محل کا زمانہ وفات ۱۳۰۹ھ ۱۸۹۱ء سے ۱۳۱۶ھ ۱۸۹۹ء تک سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی آٹھ سالہ عرصہ میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ کم از کم ہم کو صحیح سنہ وفات معلوم نہ ہو سکا۔

دیوان عالم ۱۰×۶½ سائز کے (۱۶۲) صفحات اور (۱۷) سطری سطر پر طبع ہوا ہے۔ جس کا چوتھا اڈیشن مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ اس وقت تک ہمارے پیش نظر ہے۔ اس میں (۹۸) صفحات پر (۱۱۴) غزلیں ہیں اور صفحہ ۹۹ سے مخمس و رباعیات اور منظوم خطوط وغیرہ ہیں۔

واجد علی شاہ کی بے اعتنائیوں نے اور پھر ان کی جدائی اور قید نے عالم کو شاعرہ ضرور بنا دیا تھا۔ اُن کی ہر ایک غزل درد میں ڈوبی ہوئی اور دل پر اثر کرنے والی ہے۔

رات کو دل جو بے قرار ہوا صبح کی میں نے کر دئیں سے کر
ہمدم و ہم سخن و مونس و ہمراز کوئی اور نہ دمساز کوئی
جز غم و درد تیرے کوئی بھی غم خوار نہیں ہاں مگر دیدۂ نم
یاد رخ و گیسو میں سدا ہم نے بسر کی ٭ رو رو کے کبھی شام کی اور گاہ سحر کی

یہ چند شعر نمونتاً نقل کئے گئے ہیں ورنہ ایسے اشعار سے پورا دیوان بھرا پڑا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ باوجود واجد علی شاہ کی بے اعتنائیوں کے بادشاہ محل کو محبت تھی۔ ان اشعار کو پڑھئے۔

مشہور ہے کہ وصل سے تسکین ہوتی ہے ٭ مجھ کو ہوا قرار نہ درد جگر گیا
تھی آرزو نہ قدموں سے تا مرگ ہوں جدا ٭ پر کیا کروں نصیب نے تجھ سے چھڑا دیا
نہ ہوا حکم سے باہر کبھی تا زیست اختر کے ٭ ہمیشہ جادۂ طاعت پہ عالم اپنا سر رکھا
ہائے گن گن کے سحر ہو گئی ہم کو عالم ٭ ہر افلاک نظر آیا جو اختر میرا

مگر باوجود اس کے جب کبھی اپنی وفاداریوں اور واجد علی شاہ کی بیوفائیوں کا خیال آتا تھا تو کہہ بیٹھتی تھیں

زمانے میں نیکی کا بدلہ بدی ہے مرا دل جلانے کے کیا کیجے گا

اب ہم بلا انتخاب چند شعر نقل کرتے ہیں۔

جتا کر مجھے عشق کیا کیجے گا لیا دل تو بیشک وفا کیجے گا
خود ہوئے رسوا مجھے رسوا کیا جس جگہ بیٹھے مرا چرچا کیا
آپ نے کیوں چشم عاشق کو نہ تلووں سے ملا لائق پابوسِ جاناں کیا خاک میں تھا
کیا جو قید سے تو نے مجھے رہا صیاد بتا تو کونسی مجھ سے ہوئی خطا صیاد
عالم یہ بہار اور یہ دن سنیو نہ ہرگز عشاق پہ کرتے ہیں جوانی میں ستم وعظ
گھر سے نکال کر مجھے در در پھرائیگا بے خانماں کریگا مجھے بے دیار عشق
ہو جو بازار محبت کے چلن سے واقف کھوٹے داموں کوئی یوسف کا خریدار نہ ہو
پھر شوق سے حضور سنا لیجے گالیاں ثابت کیا تو ہوتا ہمارے قصور کو

پندرہ رباعیاں بھی کہی ہیں مگر ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ نمونتاً چند نقل کی جاتی ہیں۔

آنکھوں سے یہ اشک سدا بہتے ہیں کس سے کہیں دل پر جو الم سہتے ہیں

کرتے ہیں جلا جلا کے عاشق کو یہ خاک — ثابت کب قول پر حسیں رہتے ہیں
اے دل رہ عشق میں تو رسوا ہوگا! — چھانہیں گیسو کا جو سودا ہو گا!
حاصل نہیں کچھ اور سوا ایذا کے — اچھا نہ ہوگا دیکھنا جو شیدا ہو گا!
گر ہجر تری او بتِ پُرفن ہو جائے! — موقوف ابھی فغاں و شیون ہو جائے!
عالم کو غرض نہیں ہے کچھ عالم سے — تو دوست ہے زمانہ دشمن ہو جائے!

غالباً یہ دیوان ۱۲۸۲ھ میں مکمل اور مدون ہو گیا تھا اس لئے تاریخ بھی کہدی ہے۔

کیونکہ یہ کلام ہو نہ سب کو مرغوب ۔ بندش مضمون تمام ہیں خوش اسلوب
لکھی تاریخ طبع دل نے اس کی — چھاپا گیا۔ کلیاتِ عالم کیا خوب

ممکن ہے کہ اس دیوان کا پہلا اڈیشن ۱۲۸۲ھ ہی میں طبع ہوا ہو۔ کیونکہ زیرِ مطالعہ چوتھا اڈیشن ہے۔

مثنوی عالم، دیوان ہی کی تقطیع پر (۱۱ سطری مسطر کے (۲۰) صفحات پر طبع ہوئی ہے۔ قصہ وہی قدیم طرز کا ہے۔ اور ترتیب ویسی ہی ہے۔ مگر ہمارے نزدیک ایک خاتون کی سب سے پہلی مثنوی ہے۔ اس مثنوی سے پہلے کسی عورت نے کوئی مستقل مثنوی نہیں لکھی تھی۔ حمد۔ نعت۔ منقبت وغیرہ میں سے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

حمد

اس نے پیدا کئے ہیں لوح و قلم — تا خطِ بندگی لکھے عالم
بس خداوند نام ہے اس کا — بندہ ہر خاص و عام ہے اس کا
جانتے ہیں سب اسکو ربِ غفور — ملک و جن و انس و وحش و طیور
اسی یکتا کے خور رہتے ہیں — وحدہٗ لاشریک کہتے ہیں

نعت

مئے عرفاں کا دے مجھے ساغر — ساقیا لکھوں نعت پیغمبر
شان میں خاتمِ رسالت کی — سندی مہر ہے نبوت کی
جسم بے سایہ سے یہ پیدا ہے — اپنے خالق کی طرح یکتا ہے

منقبت

اب چلے دور بادۂ اطہر — میرا ساقی ہے ساقیِ کوثر
ہے یداللہ سے دعا مطلب — مجھے دستِ سبو سے کیا مطلب
کیوں نہ ہو دل سے اعتقادِ علیؑ — کہ مجھے حرزِ جاں ہے نادِ علیؑ

ساقی نامہ

ساقیا لا وہ بادۂ گلرنگ — فکر رنگیں ہو جس کی ایک ترنگ
اپنی مستی نیا اثر دکھلائے — بلبلِ بن کے مرغ مضموں آئے
جب سے کچھ شعر گوئی کی ٹھانی — مدتوں تک رہی غزل خوانی

اب یہ جی میں ہے لکھوں اک قصہ ۔ یا خدا دے مری زباں میں مزا

داستان سرشار شاہ بادشاہ کی پیدائش دخترِ رشک ماہ کی۔ ملکہ جہاں افروز نام رکھ کر بیٹی کرنا۔ اس کو کرامت شاہ فقیر کا اور وزیر کا ملکہ پیدا ہونا دلپذیر دختر سوداگر اور بزم افروز دخترِ وزیر کا ساتھ لکھنا پڑھنا پرورش پانا۔ تینوں سمیں جبینوں کا باہم رابطۂ اخلاص و محبت ہونا ان نازنینوں کا۔"

قصہ یہ ہے کہ سرشار شاہ نامی ایک بادشاہ تھا۔ اس کے ہمیشہ لڑکے ہوتے اور مر جاتے۔ ایک دفعہ محل میں امید سے ہونے کی خوش خبری مصاحب نے سنائی تو اس کو بہت ملال ہوا کہ کاش حمل ساقط ہو جائے ورنہ پھر لڑکا پیدا ہو کر مر جائے گا۔ مصاحبوں میں سے ایک نے ایک باخدا فقیر کرامت شاہ کا تذکرہ کر کے عرض کیا کہ آپ ان سے دعا کی خواہش کیجئے۔ تو پھر کام بن جائے گا۔ چنانچہ بعد مدت حمل لڑکی تولد ہوئی اور شاہ جی کی گود میں دی گئی اور شاہ جی نے اس کو بیٹی بنا کر جہاں افروز نام رکھا۔ شاہزادی جوان ہوئی تو اس نے پریوں کے تخت کی خواہش کی۔ شاہ جی نے فراہم کر دیا۔ اور شہزادی لگی فرانے بھرنے۔ سکندر شاہ کے بیٹے شہزادہ آئینہ طلعت کے بھی مرادوں کے دن تھے۔ وہ بھی ایک دفعہ اپنے باغ میں دادِ عیش و عشرت دے رہا تھا کہ شہزادی جا پہونچی اور گرفتارِ عشق ہو گئی۔ ادھر ایک دیونی شہزادے پر عاشق اسے اٹھا لے گئی۔ اور مطلب حاصل نہ ہونے کی وجہ سے داخل زنداں کر دیا شہزادی نے فراق یار میں اپنی حالت دگرگوں کر لی۔ وزیرزادی جوگن بن کر شہزادے کو ڈھونڈتی چلی۔ برہان شاہ نامی ایک جادوگر بادشاہ اس پر فریفتہ ہو گیا اور اس نے دیونی کو مار کر شہزادے اور وزیرزادے کو رہا کر دیا۔ ادھر راجہ اندر کے بھتیجے چندر سین نے شہزادی کو اڑا لیا۔ وزیرزادی شہزادے کو لے آئی تو شہزادی ندارد تھی۔ اس نے کرامت شاہ کو ڈھونڈھ نکالا۔ اور قصہ سنایا۔ شاہ صاحب فوراً پرستان پہنچ کر راجہ اندر کے یہاں مہمان ہو گئے۔ اور شہزادی کو چھڑا لائے اور جہاں افروز اور سلطان شاہ کی شادی رچائی ادھر برہان شاہ اور دلپذیر کی شادی بھی مقرر ہو گئی۔ اور ہر ایک خوش خوش اپنے والدین کے پاس جا رہا۔

شہزادی کے شباب کی تصویر تو دیکھئے کس بے ساختگی سے کھینچی ہے

بارھویں سال میں قدم آیا — زلفِ مشکیں میں پیچ و خم آیا
آمد آمد ہوئی جوانی کی — غمزہ و نازِ دلستانی کی!
ہوئی دل میں ادھیڑ بن پیدا — ہو گیا چوب تر میں گھن پیدا
خواہشیں جی کو گدگدانے لگیں — فتنۂ خفتہ کو جگانے لگیں
شکلیں بھانے لگیں بناوٹ کی — گھاتیں خود آ گئیں لگاوٹ کی

اسی طرح موسیقی کے متعلق بھی چند شعر لکھے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے

کہ عالم کو اس فن سے بھی مَس تھا اور وہ واقف تھیں۔

گائیں یوں سُر کو تان کر بیٹا مٹ گیا زور و شور شوری کا

دُھن اگر آ گئی ہلاپنے کی کر دیا بجو بادرے کو سڑی

لیتی تھیں ایسی آن بان سے تان کہ پکڑتا تھا تان سین بھی کان

سننے والا ہر ایک روتا تھا جگر سنگ آب ہوتا تھا

روح داؤد کی، ثنا خواں تھی خوش گلوئی پہ ان کے قرباں تھی

گاہ ڈھولک تو گاہ سارنگی جس کی لے آئی خوب خوب بجی

جب لگائی ستار پر مضراب کر دیا ٹکڑے پیار خاں کا رباب

بھولنا پھلنا سارا بھول گئے خوف سے ہاتھ پاؤں بھول گئے

ہر کتھک کو ہرا بتانے لگیں انگلیوں پر انھیں نچانے لگیں

اسی فصل میں باغ کا ذکر آیا ہے تو وہ بہار دکھائی گئی ہے کہ واہ

بوستاں کی نظر جو آئی بہار دل پژمردہ کھل گیا اک بار

پٹریاں تھیں چمن کی سب رنگیں نسترن تھی کہیں کہیں نسریں

زور کیفیتوں پہ تھا لالہ ساغر مے لئے تھا متوالا

ارغواں جیسے لال انگارہ چشم نرگس کی محو نظارہ

برگ سوسن میں تھی مسی کی بہار گل پیادہ کہیں کہیں سوار

راست بازان سرو تھے لب جو فاختہ ان پہ کرتی تھی کو کو

یکطرف غنچے مسکراتے تھے پیرہن میں نہ گل سماتے تھے

روشوں پر تو پھر رہے تھے مور پہلوئے گل میں عندلیب کا شور

لہریں لیتے تھے بوٹیا رچمن شور کرتے تھے آبشار چمن

سبز طوطوں کی سرخ و منقار باغ کی جس سے بڑھ گئی تھی بہار

تاک انگور پر تھا وہ عالم مست تاکا کریں جسے پیہم

خوشے اس لطف سے لٹکتے تھے زاہد خشک جھکو تکتے تھے

زلف سنبل تھی رشک زلف بتاں چشم نرگس تھی چشم حور جناں

نہریں سب آب صاف سے لبریز ان میں فواروں کی وہ جست و خیز

مہندی کی ٹٹیاں قرینے کی جیسے جدول ہو سبز مینے کی

کسی تختے میں رنگترہ کی بہار کہیں کولوں میں چھاتیوں کا اُبھار

آگے چل کر شام کا منظر اس عمدگی سے بیان کیا ہے کہ جی خوش ہو جاتا ہے۔

غنچہ و گل چٹکتے کھلتے ہیں دیکھنا دونوں وقت ملتے ہیں

جلسۂ رقص و سرود کا حال لکھا ہے تو پھر بھی بعض فنی باتیں کہہ گئیں۔

گوری سارنگیوں میں بجنے لگی اک پری دھن اُدھر الاپنے لگی

روپ بان اور گنگری پر تھا سُر کے پلٹوں سے سب کو محو کیا

اس نزاکت سے سُر دکھاتی تھی آتے آتے نظر نہ آتی تھی

دلپذیر . . . . کی تعریف اس طرح کی ہے۔

تھی مگر دلپذیر اک بے باک اُچپلی گرم ڈھیٹھ اور چالاک

ایک جگہ گانے والوں کی اس طرح تعریف کی ہے۔

گانے والوں کے وہ سنے جوبن وہ نکیلی ادا وہ تیکھا پن

ہجراں نصیب لڑکیاں جب شام ہوتے ہی بیقرار ہوتی تھیں تو عالم کو بھی ترس آ جاتا تھا۔ کس حسرت سے لکھا ہے۔

گھر میں جس دم چراغ جلنے لگے ان کے سینے کے داغ جلنے لگے

شہزادے اور شہزادی کی پہلی ملاقات ہوتی ہے اور شہزادہ قریب آنے لگتا ہے تو شہزادی کہتی ہے

اک ذرا ہٹکے پاس سے بیٹھو سنبھلو صاحب حواس سے بیٹھو

مثنوی کے خاتمے پر جان عالم کے لئے دعا کی ہے۔

جو پڑھے جو لکھے سنے جو اسے اس کو عیش و طرب نصیب رہے

ختم قصہ تو ہو گیا عالم رات دن مانگ اب دعا عالم

رہے جب تک کہ مہر و مہ میں نور مہدیٔ دیں کا جب تلک ظہور

نوجواں بادشاہ خوش اقبال والیٔ لکھنؤ خجستہ خصال

جو کہ مشہور جانِ عالم ہے رونق بوستانِ عالم ہے

رہے رونق فزائے خطۂ ہند

فخر ایراں بنائے خطۂ ہند

مضمون بہت طویل ہو گیا جس کی وجہ سے مجبوراً مثنوی کے آخری حصے کو جہاں شادیوں اور رسوم کا ذکر ہے نظر انداز کرنا پڑا یہ حصہ بہت ہی دلچسپ اور شاہانہ رسوم شادی کی یادگار ہے

منقولہ اشعار کے مطالعے سے ظاہر ہو جائیگا کہ عالم کس قدر موزوں طبع اور نفسیات داں خاتون تھیں۔ ان کی طبیعت شاعری کے لئے نہایت مناسب تھی۔ مثنوی ہی میں مختلف غزلیں اور ٹھمریاں آ گئی ہیں۔ غزلیں وہی ہیں جو دیوان میں طبع ہو چکی ہیں۔

جان عالم واجد علی شاہ نے تو "پری خانہ" آباد کر رکھا تھا۔ سیکڑوں مختلف المذاق عورتیں موجود تھیں۔ جن میں سے اکثر شعر کہتی تھیں۔ مگر عالم جیسی شاعرہ کوئی بھی نہ تھی۔ آئندہ کسی فرصت میں جان عالم اور اُن کے "پری خانے" پر ایک مستقل مقالہ سپرد قلم کیا جائیگا۔ جس میں واجد علی شاہ کی اور شاعرہ خواصوں کا کلام بھی ہوگا۔

السید تمکین الکاظمی

مختلف ممالک کے قومی ترانے

شعر جذبات دلی کا بہترین ذریعہ ہے۔ ہر ملک اور ہر قوم کے لوگ اپنے جذبات کا اظہار اکثر شعر ہی سے کرتے ہیں جنگ اور لڑائی کے موقعوں پر اشعار ہی سے فوجوں کے دل بڑھائے جاتے ہیں۔ اسی لئے ہر ملک کا قومی ترانہ یا قومی گیت اشعار ہی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ ترانہ خاص طور سے تصنیف کیا جاتا ہے اور بعض اوقات کسی جنگ یا لڑائی کے موقع پر فوجوں کا دل بڑھانے کے لئے کوئی رزمیہ نظم پڑھی جاتی ہے اور وہ اسقدر مقبول ہوتی ہے کہ وہی نظم قومی ترانہ بنجاتی ہے۔ ذیل میں چند ممالک کے قومی ترانے ہیں۔ میں نے حتی الامکان لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۱) آسٹریا

اس قومی ترانہ کا مصنف آسٹریا کا مشہور شاعر ہیڈن ہے۔ جب اس نے انگلستان کا سفر کیا تھا تو یہ وہاں کے قومی ترانہ سے اسقدر متاثر ہوا کہ واپس آکر اس نے بھی ایک قومی ترانہ تصنیف کیا۔

خدا ہمارے مہربان، نیک اور شہنشاہِ اعظم کو سلامت رکھے۔ وہ طاقتور اور عقلمند شہنشاہ ہے اور ہم اس کی عزت کرتے ہیں۔ خدا اس کے گلے میں ہمیشہ پھولوں کے ہار پہنائے رکھے جو اس کی شاہانہ عظمت کا مظہر ہیں۔

خدا ہمارے مہربان، نیک اور شہنشاہِ اعظم کو سلامت رکھے۔ اس کا شاہی عصا غیر ممالک کی طرف بڑھے۔

اس کے تخت کے سب سے بہترین ستون رحم اور انصاف ہیں۔ اس کی ڈھال پر ستاروں کی طرح کرنیں منوّر ہیں۔

اس کی خواہش ہمیشہ اپنے آپ کو نیکی میں ملبوس کرنے کی رہی ہے۔ صرف اپنی رعایا کی حفاظت کرنے کے لئے اس کی تلوار اونچی ہوا میں اٹھتی ہے۔ اس نے غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر اپنی رعایا کو آزاد کر دیا ہے۔

بہادری، دلیری اور سچائی میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا۔

جب اس کا آخری وقت آ پہنچے تو خدا کرے ملائک اس کے استقبال کو آگے بڑھیں۔

(۲) ہالینڈ

۱۸۱۵ء میں یہ ترانہ ہینڈرک وان ٹالنس نے لکھا تھا۔

وہ جس کی رگوں میں ولندیزی خون جوش مار رہا ہے جو آزاد اور بہادر ہے۔

جس کا دل اپنے وطن اور شہزادہ کی محبت میں روشن ہو رہا ہے۔ آئے اور ہمارے ساتھ گیت میں شامل ہو جائے۔

اسے ہمارے ساتھ اپنی آواز بلند کرنی چاہئے۔

وہ گیت شہزادہ اور آبائی وطن کے لئے ہے۔

جس سے تمام دلوں میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

خدایا ہمارا قدیم ملک محفوظ رکھ جو تو نے ہمارے آبا کو عطا کیا تھا وہ ملک جہاں ہم نے طفولیت کے دن گہوارہ میں گزارے ہیں اور جہاں ہماری آخری قبر بھی بنیگی۔

ہمارے شہزادہ اور آبائی وطن کے لئے ہم تمہاری برکت اور رحم کے بھی ملتجی ہیں۔

ہماری یہی دعا ہے کہ خدایا ہمارے شہزادہ اور اس کے عظیم الشان اور آزاد خاندان کو ہمیشہ سلامت رکھ۔ جو ہالینڈ کو بہت پیارا ہے۔

بچپن سے لیکر بوڑھاپے تک بلکہ اس وقت تک جب ہم موت کے آغوش میں ہونگے۔ ہماری یہی دعا ہوگی

خدایا ہمارے شہزادہ اور آبائی وطن کو سلامت رکھ۔

(۳) فن لینڈ

فن لینڈ کے قومی ترانے کا مصنف رُدن برگ ہے ؎۔

ہمارا ملک ۔ ہمارا ملک ۔ ہمارا آبائی ملک ۔
دنیا میں کسی جگہ بھی ایسے پہاڑوں کی طرح کوئی پہاڑ
اور ایسی وادیوں کی طرح کوئی وادی ہے ؟
اے شمال کے ملک ۔ اے ہمارے آبائی ملک ۔

(۴) سرویا

اس ترانہ کے مصنف کا نام کسی کو بھی معلوم نہیں سنہ ۱۸۴۰ء میں جب سرویا والے ہنگری کے خلاف لڑ رہے تھے تو اس زمانہ میں یہ نظم بیحد مقبول ہوئی تھی ؎۔

بیدار ہو اے اہل سرویا بیدار ہو۔
رات گزر گئی اور سورج طلوع ہو رہا ہے ۔
ملک اور آزادی تمہیں دعوت دے رہی ہے ۔
تمہارا جھنڈا لہرا رہا ہے ۔
کسی ظالم کی زنجیر تمہیں مقید نہیں کر سکتی ۔
مسلح ہو اے اہل سرویا مسلح ہو اور اٹھو ۔
میدان جنگ کی طرف بڑھو ۔
اپنے دشمنوں کو عاجز کر دو
سرویا اپنے فرزندوں کو پکار رہا ہے کہ آگے بڑھو
کیونکہ فتح اس کا انعام ہے ۔
لڑنے کے لئے نکلو خدا تمہاری مدد کرے
مسلح ہو اے اہل سرویا مسلح ہو اور اٹھو ۔

(۵) سویڈن

سویڈن کے قومی ترانہ کا مصنف سٹرینڈ برگ ہے ؎۔

ہم اپنے دلی جذبات کا اظہار ایسے کرتے ہیں کہ
خدا ہمارے بادشاہ اور ملک کو سلامت رکھے ۔
ہماری زندگیاں ہنسی خوشی اور لطف سے کٹتی ہیں ۔
اس لئے ہمیں نہایت عمدہ سروں میں یہ گانا چاہئے ۔
کہ خدا ہمارے وطن اور بادشاہ کو سلامت رکھے ۔

(۶) امریکہ

یہ ترانہ ۱۸۳۲ء میں ایک پادری فرینکس سمتھ نے کہا تھا جو آج تک مشہور ہے ؎۔

اے میرے وطن آزاد وطن ۔
میں تیری تعریفوں کے گیت گاتا ہوں ۔
وہ ملک جہاں میرے آبا و اجداد نے اس ملک کو خیر باد کہا ۔
سیاح جہاں آکر خوش ہوتے ہیں ۔
ہر ایک پہاڑ سے آزادی کی گونج آ رہی ہے ۔
تو میرا وطن ہے آزاد وطن ۔
میں تجھ سے محبت کرتا ہوں
تیرے پہاڑوں، دریاوں اور جنگلوں سے مجھے عشق ہے
ان چیزوں کو دیکھ کر میرا دل اچھلتا ہے ۔
انسانوں کی زبانوں کو بیدار ہونا چاہئے ۔
تمام ملک کو اس میں حصہ لینا چاہئے ۔
چٹانوں تک کو اپنی خموشی توڑ کر یہ گیت گانا چاہئے ۔
اے خدا جس کے ہاتھوں میں آزادی ہے
ہم تجھ سے دعا کرتے ہیں ۔
ہمارا ملک آزادی کی مقدس روشنی سے ابد تک روشن رہے
اپنے جلال سے ہمیں بچا ۔
سب سے بڑے شہنشاہ ہمارے خدا ۔

(۷) بلجیم

یہ نظم اسوقت کی ہے جب بلجیم اور ہالینڈ والوں کی جنگ ہو رہی تھی اور بلجیم آزاد ہو رہا تھا ۔

غلامی کے طویل سال ختم ہونے کو ہیں ۔
بلجیم بے غیرتی کی زندگی سے نکل رہا ہے ۔
اپنی جوانمردی سے آخر کار اپنا جھنڈا، حقوق اور قدیم شہرت واپس لے لی ہے ۔

نصیر احمد

دولت کی قربانگاہ پر

کشتی آہستہ آہستہ زمین سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ خلیج وسیع و کشادہ تھی۔ ساحل کے متوازی مونگے کی چٹانیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سمندر کی لہریں ان چٹانوں پر آ کر ٹوٹ جاتی تھیں اور ان چٹانوں کے دامن کے برابر برابر سفید سفید جھاگ تا حدِ نظر پھیلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس لامتناہی سلسلہ کے درمیان ایک معمولی سا شگاف اس مقام کا پتہ دیتا تھا۔ جہاں ایک چھوٹا سا دریا سمندر میں آ کر گرتا تھا۔ سامنے ایک دور کی پہاڑی کے دامن پر ہری ہری دوب افراط سے پھیلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس مقام پر جنگل کا کنارہ سمندر کے ساحل سے بالکل واصل ہو گیا تھا۔ بہت دور بعید فاصلہ کے باعث ایک سحاب آسا سلسلۂ کوہ مبہم طور سے پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جس کی ناہمواری سے یہ گمان ہوتا تھا کہ اٹھتی ہوئی لہریں دفعتاً منجمد ہو کر رہ گئی ہیں۔ آسمان شدت تپش سے آتشدان بنا ہوا تھا۔ سمندر سوائے ایک غیر محسوس سنسناہٹ کے خاموش اور ساکن تھا۔

جس شخص کے ہاتھ میں منقش پتوار تھا رک گیا: "اسے یہاں کہیں ہونا چاہیئے" اس نے کہا اور یہ کہکر پتوار کو کشتی میں رکھ لیا۔ اور اپنے بازوؤں کو سیدھا اپنے سامنے خشکی کی طرف دراز کر دیا۔
دوسرا آدمی کشتی کے پچھلے حصے میں تھا اور اس کی متجسس نظریں سامنے کی خشکی کا نہایت غور سے جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کے گھٹنے پر پیلے کاغذ کا ایک تختہ پھیلا ہوا تھا۔

"حامد یہاں آؤ اور اسے دیکھو" اس نے کہا۔

دونوں آدمیوں نے نہایت نرم اور آہستہ لہجہ میں گفتگو کی۔ ان کے لب خشک اور سخت تھے۔ حامد کشتی کے کناروں کا سہارا لیتے ہوئے ہوشیاری سے ہمراہی مخاطب کے قریب آیا اور اس کے شانوں پر سے دیکھنے لگا۔ کاغذ پر ایک ناہموار سا خاکہ کھنچا ہوا تھا، بار بار تہ ہونے کے باعث وہ اسقدر بوسیدہ اور شکستہ ہو چکا تھا کہ ذرا سی بے احتیاطی اس کے ٹکڑے کر دینے کے لئے کافی ہوتی۔ پنسل کے نشانات نہایت ہلکے پڑ چکے تھے اور نہایت غور سے دیکھنے پر پتہ چلتا تھا کہ اس پر خلیج کا خاکہ ہے۔

"اس مقام پر" حامد نے کہا "چٹانوں کا سلسلہ ہے اور اس مقام پر شگاف ہے" اس نے اپنے انگوٹھے کے ناخن کو خاکہ پر پھیرا۔ "یہ خمدار اور پیچیدہ سطر دریا کو ظاہر کرتی ہے ...... اور یہ ستارہ اس مقام کا پتہ دیتا ہے۔"

"اس نکتہ دار لکیر کو دیکھو" نقشہ والے آدمی نے کہا "یہ خط مستقیم ہے اور چٹانوں کے سلسلہ کے شگاف سے کھجور کے درختوں کے کنج تک جاتا ہے۔ ستارہ اس مقام پر ہے جہاں کہ یہ خط چشمے کے اوپر سے گزرتا ہے۔ ہمیں اس نکتہ کو جھیل میں داخل ہونے سے قبل اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا" حامد نے چند توقف کے بعد کہا "کہ یہ چھوٹے چھوٹے نشانات کیا معنی رکھتے ہیں؟" "یہ چھوٹی چھوٹی سی لکیریں جو ادھر ادھر اشارہ کر رہی ہیں! اور یہ رسم الخط کس ملک کا ہے؟"
"چین کا" نقشے والے آدمی نے کہا۔
"اچھا! ہاں وہ تو چینی ہی تھا" حامد نے کہا۔
"وہ سب چینی تھے" نقشہ والے آدمی نے کہا۔
وہ دونوں چند منٹ خاموش بیٹھے خشکی کی طرف نظریں جمائے رہے۔ کشتی بتدریج آگے کو بڑھ رہی تھی۔ حامد نے پتوار کی طرف دیکھا۔
"نادر، کشتی کھینے کی اب تمہاری باری ہے" اس نے کہا۔
نادر نے خاموشی سے خاکہ کو تہ کیا اور جیب میں رکھ لیا۔ احتیاط کے ساتھ اپنے ہمراہی کے پاس سے گزر کر پتوار چلانے لگا۔ اس کے بازو نہایت کمزوری سے کشتی کو کھے رہے تھے۔ اس کے حرکات ایک ایسے آدمی سے مشابہت رکھتی تھیں جو بہت مضمحل اور ماندہ ہو۔
حامد کی نیم وا آنکھیں سفید سفید جھاگ کے دیکھنے میں مصروف تھیں۔ گرمی کی شدت کہ الاماں۔ آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ باوجودیکہ وہ مقام مطلوب کے اتنے قریب آ گئے تھے لیکن حامد اس وقت اس بے انتہا مسرت سے آشنا نہ معلوم ہوتا تھا جس کا اس نے بارہا اندازہ لگایا تھا۔ خاکہ کی تحصیل کے لئے سرفروشانہ جدوجہد

نے اور برِ اعظم سے ایک قلیل اور ناکامی رسد والی کشتی میں ثبات روز
دور دراز بحری سفر کے صبر آزما مصائب نے اُسے بالکل مضمحل کر دیا
تھا۔ اس نے خیالات کو خوشگوار بنانے کے لئے اپنے ذہن کو
اس خزانے کی طرف منتقل کر دیا جس کی بابت چینیوں نے گفتگو کی
تھی۔ لیکن یہ روح افزا خیالی دنیا بہت ہی قلیل عرصہ اس کے تخیل
کا مرکز بنی رہی۔ اور بہت جلد دریا کے صاف شفاف پانی کی روانی
نے اُس کی نظروں کو متوجہ کر لیا۔ اسے اب ایک بےچینی کے ساتھ
اپنے حلق اور ہونٹوں کی ناقابل برداشت خشکی محسوس ہونے لگی۔
لہروں کی شکست کی آواز ایک ترنم پیدا کر رہی تھی۔ اُس کے کانوں
کو سمندر کا یہ نغمہ بہت بھلا معلوم ہوا۔ امواج بحر کشتی کے کناروں
کے بوسے لیتی تھیں اور پتوار ہر دفعہ انہیں اس گستاخی کی سزا میں
پیچھے ہٹا دیتا تھا۔

حامد ابھی تک جزیرہ کی موجودگی سے باخبر تھا لیکن اب اُس
کے احساسات کے اندر خواب کی سی کیفیت پیدا ہو چلی تھی۔ اب
اس کی نظروں کے سامنے وہ رات تھی جس رات اُسے اور نادر
کو اتفاقی طور پر چینیوں کا راز معلوم ہو گیا تھا۔ چاندنی کھلی ہوئی تھی۔
درخت چاند کی روشنی میں کیسے بھلے معلوم ہوتے تھے۔ آگ روشن
تھی۔ تین چینی راز کی باتوں میں مصروف تھے۔ ایک طرف اُن کے
جسم پر چاند روشنی ڈال رہا تھا۔ اور دوسری طرف دہکتے ہوئے
شعلوں کی دمک اُن کے جسم کو سُرخ بنا رہی تھی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی
انگریزی میں بات چیت کر رہے تھے۔ نادر نے حامد کو اشارہ
سے سننے کے لئے بلایا تھا۔ گفتگو کا کچھ حصہ سُن نہ سکا اور کچھ حصہ
قابل فہم نہ تھا۔ لیکن پھر بھی اصل راز کھل گیا تھا۔ ایک ہسپانوی
جہاز جزائر فلیپائن سے روانہ ہو کر گردش زمانہ سے ریتیلے کنارہ
پر چڑھ کر برباد ہوا تھا۔ اکثر جہاز والوں کو موت نے ختم کر دیا بس
ماندہ جہاز والے اقتضائے وقت سے ساتھ کی دولت کو واپسی
پر حاصل کرنے کی امید میں دفن کر کے جان بچا کر چلے گئے۔ لیکن
پھر واپس نہ آئے۔ دو سو برس بعد قسمت کی خوبی سے چانگھی کو
اس کا علم ہوا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو چھوڑ دیا اور اس دولت
بیکراں کو بار دیگر نہایت احتیاط سے مدفون کر دیا۔ اس نے یہ کام
تنہا کیا لیکن اُسے دفینہ کی حفاظت کا کامل یقین نہ تھا۔ اس نے
تحفظ کے ذرائع پر کچھ روشنی نہ ڈالی تھی کیونکہ وہ اس کا ایک راز
تھا۔ اب اُسے امداد کی ضرورت تھی تاکہ وہ دفینہ کی دولت کو
وطن لے آئے۔ اس کے بعد چانگھی نے ایک چھوٹا سا خاکہ پھیلایا
تھا اور چینی نہایت ہی آہستگی سے باتیں کرنے لگے تھے۔ ان سب
باتوں کو دو ہندی دیکھ رہے تھے اور سُن رہے تھے!

اب حامد کو وہ منظر دکھائی دیا جبکہ وہ چینی کے خون کا پیاسا سا
تھا۔ چانگھی کی چوٹی اس کی مضبوط گرفت میں تھی۔ چینی کی زندگی
ایک ہندی کی زندگی کی طرح قیمتی نہ تھی۔ اب چانگھی کا چہرہ حامد
کے سامنے تھا۔ اول سانپ کی طرح غضبناک۔ پھر خطرناک۔ مرتے
وقت اس کی صورت کیسی خوفناک ہو گئی تھی۔ دغا باز لیکن قابل رحم
چانگھی کا چہرہ! اس نے دانت کیوں دکھائے تھے؟ یکایک خواب
کے واقعات نے نہایت ناگوار صورت اختیار کر لی۔ حامد نے دیکھا
سونے کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ چانگھی درمیان میں حائل ہے۔
اور اُسے طلائی انبار سے ہاتھ نہیں لگانے دیتا۔ حامد نے پھر چانگھی
کی چوٹی پکڑ لی۔ اس نے پھر ڈراؤنے طریقہ سے دانت دکھائے۔
اب چانگھی لحمہ بہ لحمہ جسمانیت میں بڑھتا جاتا ہے۔ سونے کے انبار
دفعتاً دہکتے ہوئے شعلوں میں تبدیل ہو گئے۔ ایک مہیب دیو نمودار
ہوا، بالکل چانگھی سے مشابہ، اور اس نے حامد کو شعلے کھلانے شروع
کئے جس سے اُس کا منہ بری طرح جل گیا۔ ایک اور دیو اُس کا نام پکار
رہا تھا "حامد! حامد! اسے خوابیدہ احمق!" —— یا یہ نادر کی
آواز تھی۔ وہ جاگ اٹھا۔ اب وہ جھیل کے دہانے میں داخل ہو
چکے تھے۔

"وہ رہے کھجور کے تین درخت۔ مقام مطلوبہ ان جھاڑیوں
سے خط مستقیم میں ہوگا۔" دیکھو اگر ہم ان جھاڑیوں میں گزر کر سیدھے
دوسری جانب روانہ ہوں تو جہاں دریا ملیگا وہ مقام وہاں سے
قریب ہی ہوگا۔"

دریا کا دہانہ اب قریب آ گیا تھا۔ حامد نے اُسے دیکھکر کہا۔
"ارے بھئی جلدی کرو، پیاس کے مارے جان نکلی جاتی ہے۔
کہیں، خدا کرے، سمندر کا پانی نہ پینا پڑے۔" اس نے اپنے
ہاتھ کو کاٹا اور چٹانوں اور ہری ہری گھاس کے درمیان آب رواں
کی سیمیں چادر کو اشتیاق کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ یکایک وہ
تند لہجہ میں نادر سے کہنے لگا "ادھر لاؤ پتوار مجھے دو۔"

وہ دریا کے دہانے میں داخل ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد نادر
نے چلو میں کچھ پانی لیا، چکھا اور تھوک دیا۔ ذرا دور چلکر اُس نے پانی
پھر چکھا "اب غنیمت ہے" اس نے کہا اور دونوں نہایت اشتیاق

سے پانی پینے لگے۔

"اوہنہ" حامد نے یکایک کہا " اس طرح تو بہت دیر ہوگی" اور کشتی کے اگلے حصّہ پر مخدوش طریقہ سے جھک کر اس نے اپنے ہونٹ پانی سے لگا دئیے۔ وہ بہت جلد سیراب ہوگئے۔ دریا کے کنارے میں ایک شگاف کے اندر کشتی کو داخل کر کے گھنے اُگے ہوئے سبزہ پر، جو دریا کے کناروں پر پانی تک پھیلا ہوا تھا۔ اترنے ہی کو تھے کہ حامد نے کہا۔

"نشان دادہ جھاڑیوں تک پہنچنے اور پھر وہاں سے مقام مقصود تک خطِ مستقیم قائم کرنے کے لئے ہمیں بہت چکر لگانا پڑیگا!"

"بہتر ہو کہ دوسری جانب کشتی میں ہی چلیں" نادر نے کہا۔

انہوں نے کشتی کو پھر دریا میں داخل کیا اور سمندر میں واپس آ گئے۔ ساحل کے برابر ہوتے ہوتے ہوئے وہ جزیرہ کے اس جانب پہنچ گئے جہاں چند جھاڑیاں موجود تھیں۔ یہاں وہ اتر پڑے کشتی کو ساحل کے اوپر کھینچ لیا۔ اب انہوں نے جنگل کی طرف پیشقدمی کی اور اس وقت تک چلتے رہے کہ انہیں وہ جھاڑیاں اور چٹانوں کے درمیان کا شگاف ایک لائن میں نظر آنے لگا۔ حامد نے کشتی میں سے ایک اوزار لے لیا تھا جو حرف ل سے بہت مشابہت رکھتا تھا اور جسکے ترچھے سرے پر ایک صیقل شدہ پتھر لگا ہوا تھا۔ نادر کے ہاتھ میں پتوار تھا۔

"وہ جگہ اس طرف ہوگی" اس نے کہا "ہمیں ناک کی سیدھ اس وقت تک چلنا چاہیئے جب تک ہم چشمہ تک نہ پہنچ جائیں اس وقت ہمیں کامیابی کی یقینی امید ہے۔"

ان کا راستہ نہایت صبر آزما تھا۔ گھنے نرکلوں، جھاڑیوں اور کھجور کے افتادہ پتوں میں انہیں گزرنا پڑا۔ زمین پر پھیلے ہوئے چھوٹے لیکن گنجان پودوں نے مشکلات میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ اول اول چلنا دوبھر ہوگیا لیکن بہت جلد بلند و بالا درخت آ گئے۔ اور زمین صاف نظر آنے لگی۔ آفتاب کی ناقابل برداشت حدت بتدریج ٹھنڈے سایہ میں تبدیل ہونے لگی۔ درخت اور زیادہ طویل القامت ہوگئے جن کے بلند سروں پر گنجان اور ہرے ہرے پتے اور شاخیں ایک خوشنما دائرہ میں دلفریب انداز سے دامن پھیلائے ہوئی تھیں۔ شاخوں پر قرمزی رنگ کے پھول آویزاں تھے اور سرخ سرخ حسین بیلیں ایک درخت سے دوسرے درخت پر پھیلی ہوئی تھیں۔ سایہ گہرا ہونے لگا۔ زمین پر سوکھی کگر مُتا پھیلی ہوئی تھی اور سرخ خاکی مائل تھیں جا بجا نظر کو متوجہ کرتی تھیں۔

حامد کو ایک پھُریری آئی" اتنی شدید گرمی برداشت کرنے کے بعد یہاں تو سردی محسوس ہوتی ہے" اس نے کہا۔ "ہم بالکل سیدھے جا رہے ہیں نا؟" نادر نے دریافت کیا۔

یکایک انہوں نے بہت دور، ہلکی سی تاریکی میں ایک شگاف دیکھا۔ جہاں آفتاب کی کرنیں درختوں کے سایہ دار پتوں میں سے چھن چھن کر زمین پر بیل بوٹے بنا رہی تھیں۔ ہری ہری گھاس دلکش طریقہ سے نظروں کو کھینچ رہی تھی، رنگین پھول اس منظر کے حسن پر اضافہ تھے۔

"دریا!" نادر فرطِ مسرت سے چلّا اٹھا "وہ جگہ تو اب بالکل ہی قریب ہوگی۔"

دریا کے کنارے سبزہ کثرت سے اُگ رہا تھا۔ بلند درختوں کی جڑوں کے درمیان بڑے بڑے پودے نشوونما پا رہے تھے جن کو انسان نے ابھی کسی نام سے موسوم نہیں کیا، اپنی گھنی سایہ دار چھتریوں کو لئے ہوئے نہایت فخر و ناز سے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہزارہا خوشنما پھول، صدہا بیلیں جن کی پتیاں چمکدار تھیں۔ درختوں کے تنوں سے آویزاں تھیں۔ اُس تالاب کی وسیع اور ساکن سطح پر، جس کو خزانے کے متوالوں نے نظر انداز کر دیا تھا۔ بڑے بڑے بیضوی شکل کے پتے تھے اور ایک بڑا سا سرخ و سفید پھول جو کنول سے بہت مشابہت رکھتا تھا۔ ایک مستانہ ادا سے بہ رہا تھا۔ آگے چلکر دریا نے موڑ پر یکایک تند و تیز رفتار اختیار کر لی، پانی نہایت زور شور سے بہنے لگا۔

"ہیں!" حامد نے کہا۔

"شاید ہم سیدھے راستہ سے کسی قدر ہٹ آئے ہیں" نادر نے کہا" اور اس کا احتمال بھی تھا۔"

اُس نے گھوم کر پیچھے کے جنگل میں خاموش سر و سایوں کو دیکھا۔

"یہاں ہم اگر چشمہ کے اطراف میں تلاش کریں تو ہمیں کوئی مفید نشان ملیگا" نادر نے کہا "تم نے کہا تھا —— " حامد کہنے لگا۔

"اُس نے، اس نے کہا تھا کہ یہاں کنکروں کا ایک ڈھیر ہے۔" نادر نے بطور اصلاح تردید کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا، پہلے چشمے کے بہاؤ کی طرف چلیں" حامد نے کہا۔

وہ آہستہ آہستہ بڑھے۔ اُن کی متجسس نگاہیں ہر طرف نہایت غور سے مصروف تلاش تھیں۔ معاً حامد رُک گیا۔

"ہائیں! وہ کیا؟" نادر نے اُس کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا۔

"وہ کوئی چیز نیلی نیلی" نادر نے کہا۔ وہ شے حامد کو اتفاقاً اسوقت نظر آ گئی۔

جبکہ وہ ایک فراز کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ اب انہوں نے اُسے پہچاننے کی کوشش کی۔ وہ فوراً تیز قدم ڈالتے ہوئے آگے بڑھے۔ یہاں تک کہ اس بوسیدہ دست و بازو کا متعلقہ حصّہ جسم بھی نظروں کے سامنے آگیا۔ نادر کی گرفت تلوار پر سخت ہوگئی، حامد نے اپنے اوزار کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دیکھا کہ ایک چینی کی لاش ہے جو منہ کے بل پڑی ہوئی ہے۔ اُس کی بے بسی کی موت صورت حال سے ظاہر تھی۔

حامد اور نادر ایک دوسرے کے پاس ہوگئے۔ اور وحشت زدہ آنکھوں سے اس بدشگون مردہ جسم کو خاموشی سے گھورنے لگے۔ لاش درختوں کے درمیان ایک صاف مقام پر افتادہ تھی، قریب ہی ایک چینی پھاوڑا پڑا ہوا تھا، کسی قدر دور پر ایک تازہ کھودے ہوئے سوراخ کے قریب پتھر پھیلے ہوئے تھے۔

"ہم سے بھی پہلے کوئی آن پہنچا" نادر نے اپنی آواز صاف کرتے ہوئے کہا۔ اس پر حامد سے مجنونانہ حرکات سرزد ہوئیں اور اُس نے اپنے پیروں کو زور زور سے زمین پر مارا۔ نادر کا چہرہ سفید پڑ گیا لیکن اس نے کچھ نہ کہا۔ وہ ہچکچیں چینی کی طرف بڑھا۔ لاش کی گردن پھول گئی تھی اور رنگ ارغوانی ہوگیا تھا، اُس کے ہاتھ اور پنڈلیاں سوج گئیں تھیں۔

"سُنا" اس نے کہا اور فوراً پلٹ پڑا۔ اور کھُدے ہوئے سوراخ پر گیا۔ شدت حیرت اور فرط مسرت سے وہ چیخ اٹھا۔ اس نے زور سے حامد کو آواز دی جو کہ کسی قدر فاصلہ سے آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔

"ارے میاں خزانہ موجود ہے! کہیں نہیں گیا!" اس نے گھوم کر مردہ چینی کو دیکھا اور پھر خزانے کی طرف۔ حامد بسرعت سوراخ پر پہنچا۔ بدبخت مردہ کے قریب ہی چند پیلی پیلی سلاخیں پڑی ہوئی تھیں جن کا رنگ مدھم پڑ گیا تھا۔ وہ سوراخ میں جھکا اور برہنہ ہاتھوں سے مٹی کو جلدی سے ہٹا کر ایک وزنی سلاخ باہر نکالی۔ ایسا کرنے میں ایک چھوٹا سا کانٹا اُس کے ہاتھ میں چبھ گیا۔ اُس نے کانٹے کو انگلیوں سے نکالدیا اور وزنی سلاخ کو اوپر اٹھایا۔

"سونا یا رانگ ہی اتنا وزنی ہوسکتا ہے" اس نے سرور آمیز لہجہ میں کہا۔

نادر کی نظریں ابھی تک لاش پر گڑی ہوئی تھیں، وہ بہت متوحش ہو رہا تھا۔

"یہ چینی اپنے ہمراہیوں سے سبقت لیگیا" آخرکار نادر گویا ہوا "اور یہاں تنہا حصول خزینہ کے لئے آیا لیکن زہریلے سانپ نے اس کا خاتمہ کردیا ...... تعجب ہے کہ اُسے یہ مقام کیسے معلوم ہوا!"

حامد جو ہاتھ میں طلائی سلاخ لئے ہوئے کھڑا متفکر تھا کہ مردہ چینی کا یہاں موجود ہونا کیا معنی رکھتا ہے، یکایک چونک کر کہنے لگا۔ "ہمیں یہ دفینہ تھوڑا تھوڑا کر کے لیجانا پڑیگا اور وطن پہنچکر کچھ عرصہ کے لئے مدفون رکھنا پڑیگا .... اسے کشتی تک کیسے لیجائیں؟"

اس نے اپنا جیکٹ آتارا اور زمین پر بچھا دیا اور چند طلائی سلاخیں سوراخ میں سے نکالکر اُس پر ڈالدیں۔ ایک مرتبہ پھر اُسے محسوس ہوا کہ ایک چھوٹے سے کانٹے سے اس کی کھال پر خراش آگیا ہے۔

"ایک مرتبہ میں ہم اتنا منتقل کر سکتے ہیں" اس نے کہا، یکایک عجیب تند لہجہ میں اُس نے نادر کو مخاطب کر کے کہا "تم کیا گھور رہے ہو؟"

نادر نے لاش کی طرف اشارہ کیا "میں اس کی موجودگی کا متحمل نہیں ہوسکتا .... یہ بالکل اُس سے مشابہت ——"

"لاحول ولاقوۃ" حامد نے کہا "ارے میاں سب چینی یکساں ہوتے ہیں۔"

نادر نے اُس کے چہرہ کو دیکھا اور کہا "اس دولت میں ہاتھ لگانے سے قبل میں اسے دفن کرنا چاہتا ہوں۔"

"دیکھو نادر بیوقوف مت بنو۔" حامد نے سختی سے کہا "اس ملعون کو پڑا رہنے دو۔"

نادر نے پس وپیش کیا اور اُس کی آنکھیں متفکرانہ طور سے زمین پر جھک گئیں۔

"مجھے آثار کچھ اچھے نظر نہیں آتے" نادر نے مایوسانہ طرز بیان اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"بات اصل یہ ہے" حامد نے کہا "کہ اس دفینہ کا کیا کیا جائے۔ اسے دوبارہ یہیں کہیں محفوظ طریقہ سے بطور خود دفن کردیں یا آبنائے کو پار کر کے کشتی تک لیجائیں؟"

نادر سوچ میں پڑ گیا۔ اُس کی متوحش نظریں بلند درختوں کے گول سبز چھتریوں پر جن پر آفتاب کی شعاعیں ضیاباری کر رہی تھیں۔ اور طویل القامت درختوں کے تنوں کے درمیان سرگرم سفر تھیں۔ اس کی نظریں پھر چینی کی لاش پر جم گئیں۔ وہ کانپنے لگا۔ اس کی نگاہیں پھر درختوں کے درمیان کی تاریک گہرائیوں میں بھٹکنے لگیں۔ اُس کی

نگاہیں وحشت آلودہ تھیں اور اُسے تمام ماحول پر وحشت چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

"نادر تمہیں ہو کیا گیا ہے۔" حامد نے کہا "کیا تمہارے حواس منتشر ہو گئے ہیں؟"

"ہاں تو اس دفینہ کو کسی طرح باہر نکالنا چاہئے" نادر نے چونک کر کہا۔

اُس نے کوٹ کے کالر کے سروں کو پکڑ لیا اور مقابل کے گوشے حامد کے ہاتھ میں تھے۔ انہوں نے بوجھ کو اٹھایا۔

"کس طرف؟" حامد نے کہا "کشتی کی طرف نا؟"

ابھی چند ہی قدم بڑھے ہوں گے کہ حامد نے کہا "تعجب ہے کہ پتوار چلانے سے میرے بازو ابھی تک درد کرتے ہیں۔۔۔۔ کم بخت بڑی تکلیف دے رہے ہیں۔ ٹھہرو ذرا آرام کر لوں۔"

انہوں نے کوٹ چھوڑ دیا۔ حامد کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ کے چھوٹے چھوٹے قطرے نظر آنے لگے۔

"جنگل کی آب و ہوا کچھ خراب معلوم ہوتی ہے" اس نے کہا اور پھر دفعتاً بلا وجہ غضبناک ہو کر چلایا "اس طرح تضیع اوقات سے کیا فائدہ ہے؟ اٹھو، ہاتھ لگاؤ۔ نادر تم نے جب سے لاش کو دیکھا ہے خاک کام نہیں کیا۔"

نادر نہایت غور سے اپنے ہمراہی کے چہرہ کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے کوٹ کے اٹھانے میں مدد دی۔ اور دونوں خاموشی سے تقریباً سو گز بڑھے چلے گئے۔ حامد گہری سانس لینے لگا۔ "تمہیں چپ کیوں لگ گئی ہے؟" حامد نے کہا۔

"آخر حامد تمہاری حالت کیسی ہوتی جاتی ہے؟" نادر نے سوال کیا۔

حامد نے ٹھوکر کھائی اور فوراً کوٹ پھینک دیا، اور چند لمحہ کے لئے نادر کی طرف گھورتا رہا، یکایک اُس نے ایک نعرہ مارا اور اپنی گردن کو نہایت مضبوط گرفت میں لے لیا۔

"میرے نزدیک نہ آؤ" اُس نے کہا اور ایک درخت کے تنے کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر ہموار آواز میں کہنے لگا "میں ابھی ٹھیک ہوا جاتا ہوں۔"

لیکن اُس کے اعضا بہت جلد ڈھیلے پڑ گئے۔ اُس کے پیر کانپنے لگے۔ درخت پر اس کی گرفت کمزور ہونے لگی۔ اور وہ آہستہ آہستہ درخت کے تنے کے سہارے زمین کی طرف پھسلنے لگا یہاں تک کہ وہ جڑ کے قریب خستہ و کوفتہ گر پڑا۔ اس کے اعضا پر تشنج کی کیفیت طاری تھی۔ ازدیاد کرب اور کثرت تکالیف نے اس کے چہرہ کو بگاڑ دیا تھا۔ نادر لپکا کہ اس کو سنبھالے۔

"مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ حامد نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا "گری ہوئی سونے کی سلاخوں کو کوٹ پر رکھ دو۔"

"کیا میں تمہاری کوئی خدمت نہیں کر سکتا؟" نادر نے پوچھا۔

"طلائی سلاخوں کو کوٹ پر رکھ دو"

جوں ہی کہ نادر نے طلائی سلاخوں کو اٹھا کر کوٹ پر رکھا ایک چھوٹا کانٹا اس کے انگوٹھے کے سرے پر چبھ گیا۔ اُس نے اپنے ہاتھ کو دیکھا، ایک نازک خار، جو شاید دو انچ لانبا ہوا سے نظر آیا۔

حامد نے ایک ناقابل فہم چیخ ماری اور خاموش ہو گیا۔

نادر حواس باختہ ہو گیا۔ اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے کچھ دیر کانٹے کو دیکھا۔ پھر اس نے حامد پر نظر ڈالی جو نزع کے منازل کو طے کر رہا تھا۔ شدت کرب اور تشنج کی سختیوں سے اُس کی پشت دوہری ہو جاتی تھی۔ اور پھر سیدھی ہو جاتی۔ نادر کی نظریں بلند بلند درختوں کے بیچ میں سے ہو کر، درختوں کے تنوں پر چھائی ہوئی بیلوں کے جال در پھیلاؤ سے گزر کر اب اس مقام تک پہنچیں جہاں کہ چینی کی لاش بھدے طور پر ابھی تک نظر آ رہی تھی۔ نادر کی آنکھوں کے سامنے خلیج کا خاکہ پھر گیا۔ اور وہ چھوٹے چھوٹے نشانات، جن کی اہمیت کو وہ نہ معلوم کر سکے تھے، اُس کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے۔ معاً حقیقت اس پر کھل گئی!

"خدا خیر کرے!" اُس نے کہا۔ کیونکہ اُس کی تجربہ کار آنکھوں نے دیکھا کہ وہ کانٹے جو بظاہر اتنے نازک اور معصوم معلوم ہوتے تھے جان لیوا کانٹے تھے اور سم آلود تھے! اب وہ سمجھا کہ خزانہ کی حفاظت کی بابت چانگی کا یقین کامل اور بھید اصرار کیا معنی رکھتا تھا۔ اب وہ چانگی کی مرتے وقت کی دھمکی کا سبب سمجھ رہا تھا۔

"حامد!" وہ چلایا۔

لیکن حامد اب ساکت اور خاموش تھا۔ اس کے ہاتھ پیر اکڑ رہے تھے اور ایک جانفرسا، ڈراؤنی ہیئت پیش کر رہے تھے۔ ایک دل لرزا دینے والا سکون جنگل کے اطراف میں چھایا ہوا تھا۔

نادر ایک غیر متوقعہ تندی و تیزی کے ساتھ اپنے انگوٹھے کے خار خوردہ حصّہ کو چوسنے لگا۔ اپنی عزیز زندگی کے لئے، اپنی پیاری جان کی خاطر۔ لیکن بہت جلد ایک سخت تکلیف وہ درد اس کے

بازوؤں اور کاندھوں میں محسوس ہونے لگا۔ اُس کی انگلیاں سخت پڑ گئیں۔ اب اُسے یقین ہو گیا کہ زہر جو سنا لا حاصل ہے۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔ ایک المناک سکوت اُس پر مستولی تھا۔ اُس کی ٹھوڑی اُسکے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھی۔ کہنیاں گھٹنوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ ایک زندگی کا ٹوٹنے والا تار! رنج و غم کی حسرت زدہ تصویر! حامد اُس کے سامنے تھا۔ اور اس کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا۔ موت کی بھیانک صورت جانکنی کی زندہ دھمکی اُس کی آنکھوں میں منعکس تھی۔ درد اٹھا۔ اور بڑھا، حلق کی طرف رجوع ہوا اور اذیت میں، کرب و بلا میں اضافہ ہونے لگا۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زمین سے صدہا فیٹ کی بلندی پر سرد ہوا کے جھونکے نے درختوں کی گنجان جھڑیوں میں ایک حرکت پیدا کر دی اور ہزار ہا غیر موسوم پھول خلائے بسیط کو طے کرتے ہوئے زمین پر گرنے لگے۔

(ویلز) سید رضی الحسن چشتی

محوِ خیال

کسی کے غم میں اک نوخیز، نازک، مہ لقا عورت
الگ بیٹھی ہے دنیا کے بکھیڑوں سے جدا ہو کر
تمناؤں کے ویرانے کو یوں آباد کرتی ہے
تصور ہی تصور میں وہ دل کو شاد کرتی ہے
تصور لے اُڑا ہے اس کو تخیلی بہشتوں میں
وہ فردوسِ تخیل جو طرب زارِ مسرت ہے؛
وہ رنگ و بو کی دنیا جو مسرت ہی سے بستی ہے
جہاں کے سرمدی نغمے اثر خیز مسرت ہیں،
جہاں پھولوں میں، غنچوں میں مسرت مسکراتی ہے
جھلکتے ہیں جہاں کلیوں کے منہ پر نور کے موتی
جہاں جاری ہیں چپے چپے پر نہریں مسرت کی
جہاں نغمے مسرت کے ہیں بھولی سی زبانوں پر
غم اندوہ سے جس کے مکیں نا آشنا بالکل

کسی کی یاد میں اک مہ جبیں اور دل رُبا عورت
لبوں پر آ رہی ہے جان حرفِ مدعا ہو کر
کسی کا نام لیتی ہے، کسی کو یاد کرتی ہے
تصور میں ہی نقشِ آرزو میں رنگ بھرتی ہے
محبت کے جہاں ونرات چرچے ہیں فرشتوں میں
جہاں کا پتہ پتہ آئینہ دارِ مسرت ہے
جہاں شبنم کے بدلے بھی مسرت ہی برستی ہے
جہاں کے سرمدی جلوے گہر ریز مسرت ہیں؛
جہاں زریں فضاؤں میں مسرت جگمگاتی ہے
ڈھلکتے ہیں جہاں پتوں سے اکثر نور کے موتی
سفینے آرزوؤں کے ہیں اور لہریں مسرت کی؛
جہاں کرتی ہیں حوریں رقصِ الفت کے ترانوں پر
جفائے آسماں سے ہے زمیں نا آشنا بالکل

جہاں مفہوم جینے کا مسرت ہی مسرت ہے
جہاں کا حاصلِ رنگیں محبت ہی محبت ہے

(غیر مطبوعہ) وقار انبالوی

نیشنل آرٹ پریس انارکلی لاہور میں چھپا

نورانی خواب

بلاک بنانے والے، موہتہ ہاف ٹون کمپنی انار کلی لاہور

چھاپنے والے، نیشنل آرٹ پریس انار کلی لاہور

"مرمریں مجسمّہ"

از تنویر قریشی

رشک؟ میں ٹھیک ٹھیک نہیں بتلا سکتا کہ میرے دل میں اس کی بنا کیسے پڑی۔ مشہور مصور وارابؔ سے میرے تعلقات نہ صرف دوستانہ بلکہ برادرانہ تھے۔ میز پر اس کی کرسی میرے اور میری بیوی کے درمیان ہوتی۔ سیر تفریح کے وقت میری بیوی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہوتا اور وہ نرم آواز میں گا گا کر راستے کی تکان کو کم کرتا۔ اس کی خوش الحانی سے متاثر ہو کر میں بھی داد میں اپنی بیوی کے ساتھ برابر کا حصّہ لیتا۔

تصاویر اور اشعار۔ صنف نازک کا دل مسخر کرنے کے دو زبردست ہتھیار ہیں۔ میں جانتا تھا۔ مجھے یہ خیال اسوقت آتا جب وہ اور سروجؔ۔ میری بیوی۔ سبزہ زار پہ دست بدست ٹہلتے ہوتے۔ کبھی کبھی خوشرنگ پرند کے آشیانے کی تلاش میں۔ جو ہمیشہ بڑی دور ہوتا۔ اور کبھی کبھی خودرو پھول کے تعاقب میں جو مل جانے کے بعد کسی جمیل نظم کا بہترین موضوع بن سکتا —— آہ! —— اس کے اشعار کیسی لامحدود مسرت کے ساتھ سنے جاتے۔

علاوہ بریں۔ مکان میں۔ خود میرے کمرے میں کوئی چیز مجھے ہمیشہ رشک کی خطرناک حالات میں مبتلا رکھتی۔ الفاظ سے نہیں بلکہ اپنے نفرت انگیز انداز سے۔ صبح شام۔ جب کبھی سروجؔ رخصتی یا استقبالی بوسہ کے لئے اپنا چہرہ پیش کرتی!

بھلا یہ جنوں نہیں تو اور کیا ہے؟ کہ اس سنگ مرمر کے معمولی سے بت کے غائبانہ اشاروں سے متاثر ہو جاؤں۔ جو سنگار میز پر گستاخانہ انداز سے بیٹھا ہوا طعن آمیز انداز سے مجھے گھور رہا ہے یہ قطعی پاگل پن تھا۔ کہ میں کئی مرتبہ کسی چھوٹے سے عذر پر سروجؔ کو اپنے کمرے سے رخصت کر دوں۔ تاکہ اس نفرت خیز طریقہ پر مسکراتے ہوئے چہرے سے خلوت میں انتہائی بے صبری سے پوچھ سکوں۔

"میں جب یہاں سے غیر حاضر ہوتا ہوں۔ تو یہاں۔ یہاں۔ اس کمرے میں۔ کیا واقعات رونما ہوتے ہیں؟ .... وارابؔ .... کیوں؟ ......"

ایک صبح جب میں باہر جا رہا تھا تو سروجؔ نے مجھے رخصت کرتے ہوئے کہا کہ وہ بھی باہر جانے کا قصد رکھتی ہے۔

میرا تعجب۔ جو اس ارادے کا حال سنکر مجھ پر طاری ہوا سروجؔ کی نظر سے پوشیدہ نہ رہا۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ اور پریشانی کی وجہ پوچھی۔ میں نے اس کا شک دور کرنے کے لئے ایک زور کا قہقہہ مارا۔ اسے بوسہ دیا۔ اور رخصت ہو گیا۔

سڑک پر پہنچنے کے بعد میں نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے ذرائع پر غور کرنا شروع کیا۔ گھڑی دیکھی۔ سات پر تیس منٹ آئے تھے۔ میں دفتر جاؤنگا اور وہاں نو تک ٹھہرا رہونگا۔ ڈیڑھ گھنٹہ اسے خادمہ کو ضروری ہدایت دینے اور باہر نکلنے کی تیاری کرنے کے لئے بالکل کافی تھا۔

ایک گھنٹہ! جب حسد دل کو اس طرح کھا رہا ہو۔ جیسے چوہا آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پہ روئی کو۔ طویل عرصہ بلکہ ایک قیامت ہے۔

آخر کار مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ انتظار کا ایک گھنٹہ ختم ہونے سے بہت پہلے ہی میں نے ٹوپی اٹھائی اور گھر کا راستہ لیا۔

جوں جوں میں قریب ہوتا گیا مجھے اپنی اس حرکت پر پشیمانی ہونے لگی۔ کیا یہ بری بات نہ تھی؟ کیا میں اپنے شبہ کی کوئی معقول وجہ بھی رکھتا تھا۔ کیا سروجؔ کا با محبت سلوک صرف ظاہرداری تھی؟ مگر اب سوچنے کیا حاصل۔ میرا قدم چوکھٹ کے اندر تھا۔

"سروجؔ!" ......

ملازمہ میری غیر متوقع واپسی پر متعجب ہو کر کچھ بڑبڑائی۔ سنگ مرمر کا بت تبسم کر رہا تھا۔ ہمیشہ سے زیادہ طنزیہ انداز سے۔

میں جانتا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔

راستے میں میں نے پھر سوچنا شروع کیا۔ مجھے احتیاط سے

کام لینا چاہئے تاکہ وہ دغاباز عورت اور اس کا شریکِ جرم میرے ہاتھ سے بچ نہ نکلے۔

میں اسٹوڈیو پہنچا۔ دارآب میرے استقبال کے لئے دوڑتا ہوا آیا۔

"کیوں؟ کیوں؟ خیریت تو ہے"؟ اس نے مجھ سے مصافحہ کرکے اسی طرح میرا ہاتھ پکڑے مجھے باہر کے ہال کی ایک کرسی پر بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"خیریت؟ اونہہ! آؤ میں تمہیں خیریت کا حال بتاتا ہوں"

میں نے ہاتھ چھڑا کر بازو کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے جواب دیا۔ جس کی نسبت مجھے اب یقین ہو چکا تھا کہ نگار خانے کے علاوہ ...... کچھ اور بھی کام دیتا ہے۔

پردہ کھنچا ہوا تھا۔ تاہم ایک چیز وہاں ایسی تھی جس کو محسوس کرتے ہی میرا دل سینہ کے اندر دھڑکنے لگا۔ خوشبو! میں جانتا تھا کہ یہ مخصوص خوشبو وہاں کیسے پہنچی۔ یہ اسی عطر کی تھی۔ جو میری بیوی کو بیحد پسند تھا اور جس کا وہ ہمیشہ استعمال کیا کرتی تھی۔ خوشبو! میرے سینے میں داخل ہو کر میری روح کو زہر آلود کر رہی تھی۔ یہ وہی تھی یقیناً وہی۔ اس کے لباس کی۔ اس کے جسم کی۔ خود اس کی۔ سروج کی!

میری آنکھیں خود بخود جھک گئی۔ میں لڑکھڑایا۔ دارآب نے مجھے تھام لیا۔

میری کمزوری ایک منٹ سے بھی کم عرصہ میں غائب ہو گئی۔ میں سنبھلا۔ دفعتہً ہوا کا ایک جھونکا آیا اور پردے کو نیچے سے لے اڑا۔ صرف ایک لمحہ کے لئے۔ اس قالین پر جو کمرے میں بچھا ہوا تھا۔ سروج کا پاؤں —— ننگا صاف نظر آ رہا تھا۔

اوہ۔ فریبی۔ چڑیل۔ ایک چھلانگ کے ساتھ میں پردہ نوچ کر اندر گرا ....

جب دارآب میری مجنونانہ حرکات سے حیران پریشان اندر آیا تو میں شرم کے مارے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپے ہوئے کھڑا تھا ....

خوشبو کا منبع۔ ایک ٹوکری تازہ پھولوں سے بھری ہوئی فرش پر رکھی ہوئی تھی۔ ایک حسین پھول۔ ایک سپید لالہ۔ قالین پر پڑا تھا۔

میں نے سروج سے کوئی وجہ نہ بیان کی کہ کیوں اسی روز جب وہ گھر آئی تو مرمریں بت —— سفید نفرت اور حسد کا دیوتا —— زمین پر کئی ہزار ٹکڑوں کی صورت میں بکھرا ہوا پایا گیا۔

تنویر قریشی

غزل

کوئی دُنیا میں پوچھتا ہی نہیں — جیسے میرا کوئی خدا ہی نہیں

میرا جینا بھی کوئی جینا ہے — جب کوئی دوست آشنا ہی نہیں

مجھ کو دنیا نے یوں مٹا ڈالا — کبھی دنیا میں جیسے تھا ہی نہیں

جس میں تاثیر ہی نہ ہو کوئی — مجھ سے پوچھو تو وہ دعا ہی نہیں

جس میں تیری رضا بھی شامل ہو — وہ خطا تو کوئی خطا ہی نہیں

دونوں عالم ہیں اس میں پوشیدہ — وسعتِ دل کی انتہا ہی نہیں

کس سے اب دل لگائیے جوہر
کوئی دُنیا میں باوفا ہی نہیں

(غیر مطبوعہ) — جوہر عظیم آبادی

یہ نفیس اور خوبصورت جوتیاں جن پر نہایت وضعدار سنہرا کام بنا ہوا ہے نفیس مزاج احباب اور بیگمات کے لئے خاص طور پر تیار کروائی گئی ہیں۔ پہننے میں آرام دہ اور ہلکی دیکھنے میں خوشنما اور دلکش اور داموں کے لحاظ سے گویا مفت ہیں۔ گھروں میں پہنئے۔ سلیپروں کا نعم البدل ثابت ہوں گی۔ کہیں آنے جانے کے وقت پہنئے۔ آپ کی زینت دوبالا کریں گی۔ قیمت زنانہ سائز مخمل یا چمڑے پہ سنہرے کام والی عہ فی جوڑہ۔ مردانہ سائز مخمل یا چمڑا پر سنہرا کام ۶ فی جوڑہ۔ واضح رہے کہ یہ عام بازاری مال نہیں بلکہ خاص طور پر نفیس اور پختہ بنوایا جاتا ہے۔ پاؤں کا خاکہ فرمائش کے ہمراہ آنا چاہئے! ادبی دنیا کا حوالہ ضرور دیجئے۔ پیکنگ کا خرچ نہیں لیا جائیگا۔

ایس احمد اینڈ کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۴۵ لاہور

سفید یہ سرمہ بازاری اشتہاری نہیں ہے۔ بیش بہا اور نہایت قیمتی اجزاء کا مرکب ہے۔ آنکھ کے تمام امراض کیلئے بیحد مفید ہے۔ دوستوں کے اصرار اور پبلک کے فائدہ کیلئے مشتہر کیا جاتا ہے۔
جناب ایڈیٹر صاحب ... تحریر فرماتے ہیں کہ سرمہ سفید استعمال کیا! اب عینک لگانے کی ضرورت نہیں رہی

دنیائے ادب

بے نام ونشان

اٹک کے اس پار دامن کوہسار میں پٹھانوں کی ایک بستی تھی۔ یہ لوگ کھیتی باڑی تو برائے نام کرتے لیکن اکثر مویشیوں کی تجارت میں مشغول رہتے تھے۔ پنجاب کے اضلاع سے مویشی سستے داموں پر خرید لاتے۔ اور سرحدی علاقے میں منافع پر فروخت کر دیتے۔

لعل خاں ایک بوڑھا زمیندار تھا۔ اس کا گھر ایک چھوٹی سی چٹان کے دامن میں گاؤں سے کچھ فاصلے پر ایک ایسے مقام پر واقع تھا جس کے پاس سے دریائے اٹک کی ایک چھوٹی سی شاخ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی بہتی تھی۔ لعل خاں اپنے ڈھور ڈنگر فروخت کر کے آج ہی گھر واپس آیا تھا۔ اس کا گھر کیا تھا پتھروں کی چار دیواری کے اندر ایک معمولی سا مکان تھا۔ اس کی نہ بیوی تھی نہ اور کوئی بچہ۔ دونوں وقت کا کھانا وہ نان بائی کی دکان پر کھا لیا کرتا۔ رات کو گھر آ کر پڑ رہتا۔ بستی میں وہ بہت بخیل مشہور تھا۔

آج لعل خاں کے پاس کچھ کم دو ہزار روپے اس نے چمڑے کی ایک تھیلی میں رکھے ہوئے تھے۔ شام کا وقت تھا اور وہ ابھی ابھی کھانا کھا کر واپس آیا تھا۔ اور اس فکر میں تھا کہ اس دولت کو کہاں ٹھکانے لگائے۔

دور فاصلے پر بے برگ وگیاہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بادل جمع ہو رہے تھے۔ اب گرجتے ہوئے آبادی کی طرف بڑھے۔ ہوا بھی تیز ہو گئی۔ لعل خاں نے چراغ روشن کیا۔ اور چارپائی دیوار کے ساتھ کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت لیور کے قافلے نہایت تیزی کے ساتھ پرواز کرتے ہوئے طوفان برق و باد سے بچنے کے لئے دامن کوہسار کی جانب جا رہے تھے۔ لعل خاں کے گھر کے آس پاس جو درخت تھے ان پر بھی لیور نے ہلڑ مچا رکھا تھا۔

نیلے نیلے بادلوں پر کلنگ کا ایک قافلہ کہیں سے اڑتا چلا آ رہا تھا۔ ان کا سردار آگے آگے تھا۔ اور باقی ماندہ پرندے قینچی کی طرح دو قطاروں میں پیچھے پیچھے اڑے چلے جا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ پردیسی بھی کوئی پناہ کا آسرا ڈھونڈ رہے ہیں۔

لعل خاں گھاٹ پر بیٹھا اپنی گزشتہ زندگی کے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ کاش اس کی جورو نہ مرتی یا کوئی بچہ اپنی یادگار چھوڑ جاتی۔ افسوس اس نے تمام عمر یوں ہی رائیگاں کر دی۔ کیا اچھا ہوتا کہ وہ دوسری شادی کر لیتا اور آج اس کا گھر یوں سونا پڑا نظر نہ آتا۔ . . . پھر اس نے خیال کیا کہ زندگی کے جنجال سے جتنا بھی انسان بچا رہے اتنا ہی غنیمت ہے۔ بال بچے ہوتے تو ہزاروں تفکرات بھی دامنگیر رہتے۔ پھر وہ ایک آہ بھر کر بولا دنیا میں بے نام ونشان رہنا ہی اچھا ہے۔

بارش موسلا دھار ہونے لگی تھی ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا ہوا درختوں کے پتوں میں سائیں سائیں کر رہی تھی۔ بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک سے دل دہل جاتا تھا۔ اس شب طوفان خیز میں ایک گرانڈیل آدمی لال خاں کے دروازے کے پاس ہی دیوار سے چپٹا کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خنجر تھا۔ اور کمر کے ساتھ ایک پستول لٹک رہا تھا۔

کچھ دیر بعد لعل خاں چارپائی سے اٹھا۔ بستر ٹھیک کیا۔ اور پھر کواڑ بند کرنے کے لئے دروازہ کی طرف آیا۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے سر باہر نکال کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ساتھ ہی اجنبی بجلی کی طرح تڑپ کر اپنی کمین گاہ سے نکلا۔ اور جھٹ لعل خاں کے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔ لعل خاں نے ایک چیخ ماری اور دروازہ میں گرا۔ یہ اس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔ قاتل اس کی تڑپتی ہوئی لاش پر سے گزر کر گھر میں داخل ہوا۔ اور وہ تھیلی جس میں روپے رکھے تھے گھاٹ پر سے اٹھا کر اپنی کمر کے ساتھ باندھ لی اور پھر چپکے سے گھر سے نکل کر چار دیواری پھلانگ کر دریا کی شاخ کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں ایک مقام پر اس نے سرکنڈوں میں ایک چھوٹی سی کشتی چھپا کر باندھ رکھی تھی۔ قاتل جلدی سے کشتی میں سوار ہو کر چپو چلانے لگا۔ اور کوشش کرنے لگا کہ کشتی کو دریا کے اس پار لیجائے۔ اور پھر دوسرے کنارے پہ اتر کر سرحدی علاقے میں بھاگ جائے۔

قاتل پوری قوت کے ساتھ چپو چلا رہا تھا۔ اس کی جان کی سلامتی

کے خوف سے اس وقت نہ تو سردی کی فکر تھی اور نہ بارش اور برق و باد کا خیال تھا۔ چپو چلاتے چلاتے وہ تھک چکا تھا۔ اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ دریا تو لعل خاں کے مکان سے بہت دور تھا۔ اور اس وقت تک تو اسے دوسرے کنارے پر کنارے پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ ابھی تک دریا کی چھوٹی چھوٹی شاخوں میں ہی پھر رہا تھا۔ کبھی کبھی چپو کی آواز سے ڈر کر مرغابیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ پر چلی جاتی تھیں۔ کبھی اس کی کشتی سرکنڈوں میں گذرنے لگتی تھی۔ کبھی پانی کا پاٹ بہت کم ہو جاتا تھا۔ گاہے دھار کی تیزی کے باعث اسے بہت قوت سے چپو چلانا پڑتا تھا۔ چونکہ اسے دریا کے بہاؤ کے خلاف جانا تھا۔ اس لئے اسے بہت جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔

قاتل اب تھک کر چور ہو چکا تھا۔ سردی سے ہاتھ پاؤں شل ہونے لگتے تھے۔ اور اس کے تمام بدن میں رعشہ تھا۔ گو طوفان تھم چکا تھا اور آسمان پر کہیں کہیں ستارے بھی چمکنے لگتے تھے۔ لیکن تاہم اندھیرا اس قدر تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ کشتی کدھر جا رہی ہے۔ وہ اس خیال سے بہت بے چین ہو رہا تھا کہ اس وقت تک وہ دریا کے پار کیوں اُتر نہیں گیا۔ تھکاوٹ اور کوفت کے باعث اب وہ آہستہ آہستہ کھینے لگا۔ اچانک چپو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پانی میں گر گیا۔ اور پانی کے بہاؤ کے ساتھ ہی بہ گیا۔

وہ اپنی بے دستی و پائی پر بہت پریشان ہوا۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ اب وہ جان کے خوف سے ہاتھوں سے کشتی کھینے لگا۔ لیکن اب کشتی کو قابو میں رکھنا اس کی طاقت سے باہر تھا۔ وہ اسی کشمکش میں تھا کہ کشتی ایک پایاب مقام پر آ کر رک گئی۔ اور ساتھ ہی اسے اور فاصلہ پر سے مرغ سحر کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز قاتل کے لئے پیغام قضا سے کم نہ تھی۔

اب رات کی ظلمت سیماب پا تھی اور آہستہ آہستہ دور فاصلہ پر کچھ کالے کالے سائے بھی نظر آنے لگے تھے۔ قاتل گرد و پیش کے مناظر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اور اس کا دل ایک نامعلوم خوف سے دھڑکنے لگا۔ آخر وہ مجبور ہو کر کشتی سے اُترا اور جس طرف سائے نظر آ رہے تھے ادھر پانی میں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا چلنے لگا۔ ابھی پانچ سات گز گیا ہوگا کہ اس کے پاؤں دلدل میں دھنسنے لگے۔ اور پھر یہ حالت ہوئی کہ دلدل سے قدم نکالنا دوبھر ہو گیا۔

اب اسے اونچے اونچے شجر صاف صاف نظر آنے لگے تھے۔ اور اس خیال سے کہ کنارہ قریب ہی ہوگا۔ اسے کچھ اطمینان سا پیدا ہو گیا لیکن ساتھ ہی وہ ہر قدم پر دلدل میں نیچے دھنسا چلا جا رہا تھا جس قدر کشمکش سے وہ ایک پاؤں نکالتا۔ دوسرا پاؤں اتنا ہی اور زیادہ نیچے دھنس جاتا۔ اور اس تگ و دو کا آخری نتیجہ یہ تھا کہ وہ گھٹنوں تک دلدل میں دھنس گیا۔ اسے خیال ہوا کہ ہو نہ ہو تھیلی کا بوجھ اس مصیبت کا باعث ہو رہا ہے۔ کنارہ صاف صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ کنارہ سے کچھ دور نہ تھا۔ اس نے کمر سے تھیلی کھولی اور اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اُسے دونوں ہاتھوں سے اُچھال کر کنارے کی طرف پھینکا۔ سخت زمین پر روپے کے گرنے کی جھنکار سے اسے کچھ اطمینان ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ کمر تک دلدل میں پھنس گیا۔ اب اس نے خنجر اور پستول بھی کمر سے کھولا اور اسے بھی کنارے کی طرف پھینک دیا۔ لیکن اب وہ سینہ تک دلدل کے اندر تھا۔

سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ اور ہر درخت کے ڈالی ڈالی پر سے پرندوں کے الاپنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اچانک قاتل کی نظر ایک دیوار پر پڑی یہ پتھروں کی ایک چھوٹی سی دیوار تھی اور اس دیوار سے کچھ فاصلہ پر اسے ایک چھوٹا سا گھر نظر آ رہا تھا۔

یہ گھر لعل خاں کا تھا اور قاتل اس وقت اسی مقام پر کھڑا تھا جہاں وہ بوڑھے کو قتل کرنے کے بعد دیوار پھلانگ کر آ کر کھڑا ہوا تھا۔ وہ رات بھر دریائے اٹک کی چھوٹی چھوٹی شاخوں میں ہی چکر کاٹتا رہا۔ اور صبح ہوتے ہی اجل اسے اسی مقام پر لے آئی۔ جہاں اس نے ایک بے گناہ کا خون بہایا تھا۔

قاتل اس دلدل سے نکل بھاگنے کی دیوانہ وار کوشش کر رہا تھا لیکن اب وہ بے بس تھا۔ اور لحظہ بہ لحظہ دلدل میں نیچے دھنسا چلا جا رہا تھا سورج کی پہلی سنہری کرن کے ساتھ ہی اسے کنارے پر وہ تھیلی نظر آئی۔ جس کے لئے اس نے اپنے ہاتھ ایک بے گناہ کے خون سے رنگے تھے۔ اس کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی اور یہ اس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔ دریائے اٹک کی خوفناک دلدل اس کی قبر بن گئی۔ جس طرح لعل خاں اس جہان سے بے نام و نشان رخصت ہوا۔ وہی حشر اس کے قاتل کا ہوا۔ ع

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

(مکتبہ)

انگریزی

جسم کا جبر

فرسودگیٔ حیات اسقدر جانگزا ہے کہ شاید ہم میں سے اکثر اصحاب اس شخص کے ہم نوا ہو جائیں جس نے یہ کہکر خودکشی کر لی تھی کہ

"میں بٹن کھولتے کھولتے اور بند کرتے کرتے تنگ آگیا ہوں"

ظاہر ہے کہ اس کی شکایت بجا تھی۔ ایک ہی کام میں مصروف رہنا تسلسل کا ایک دائرہ قائم کر دیتا ہے۔ تسلسل زندگی کی کیفیت ہے۔ اور کئی حالتوں میں موت یا جنوں کی طرف رہبری کرتا ہے۔

نظم و نسق کائنات پہلے قانون ہیں۔ یہ سچ ہے۔ مگر زندگی کو فرسودگی میں تبدیل کر دینا مضر ثابت ہوگا۔ زندگی کو مشین بنا لینا ایک خطرناک کام ہے۔ ہمارے مشاہدے میں آتا ہے کہ مشینیں کہنہ ہو کر گھس جاتی ہیں۔ بیکار ہو جاتی ہیں۔ اور جب ان سے زیادہ کام لیا جائے تو ان کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ بھی رہتا ہے۔

بائیبل میں درج ہے۔ انسان کی زندگی کے سال ۷۰ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کو آٹھ گھنٹے سونا چاہیئے۔ آٹھ گھنٹے کام کرنا چاہیئے۔ آٹھ گھنٹے تفریح میں صرف کرنے چاہیئے۔ اس صورت میں ۷۰ سال زندہ رہنے والا انسان اپنی عمر کے ۲۳ سال سونے ہی میں گزار دیگا۔ اور یہ مصرف بظاہر بہت غیر دانشمندانہ معلوم ہوتا ہے۔ موت کی نیند ایسی ہے کہ پھر اس کے بعد جاگنا نصیب نہ ہوگا۔

آپ ذرا ان تمام فرائض کا تصور کیجیئے جو آپ کے جسم کی طرف سے آپ پر عاید ہیں۔ ذرا دیکھیئے کہ کس طرح یہ حقیر شے ہماری خواہشات و فرصت کے قیمتی اوقات اور ہماری آزادی کو سلب کر لیتی ہے۔ ہم پیدا ہوتے ہیں۔ دکھ اٹھاتے ہیں۔ زندہ رہتے ہیں۔ اور پھر مر جاتے ہیں۔ کیا تماشا ہے۔

انسانی جسم کی قیمت چوبیس روپے سے زیادہ نہیں۔

جسم انسانی کے عناصر ترکیبی۔ یعنی مٹھاس۔ نمک۔ فاسفورس۔ خاک۔ راکھ۔ چونا۔ چربی۔ اس سے زیادہ قیمت نہیں رکھتے۔

اس بات کا تصور کیجیئے تو آپ کے غرور پر ایک کاری ضرب لگیگی۔ رابرٹ کولیرا اپنی تصنیف "اسرار زماں" میں لکھتا ہے۔

"انسانی جسم میں ۸۵٪ پانی ہے۔ ۱۵ فیصدی راکھ اور فاسفورس۔ اور پھر یہ چیزیں خود گیس اور بخارات میں تبدیل کی جا سکتی ہیں"

وہ پوچھتا ہے۔ "آخر ہم اس دنیا سے کہاں جاتے ہیں؟"

یہ ہے ہمارے جسم کی حالت۔ اور یہی جسم تمام عمر ہمیں اپنے جبر کا تختۂ مشق بنائے رکھتا ہے۔ اس کی صفائی۔ اس کی پوشاک اس کی صحت اس کی تفریح کا خیال ضروری ہے۔ اسے لطیف و نفیس خوشبو سے معطر کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے دنیا کی نعمتیں جمع کی جاتی ہیں۔

ہمارا دماغ چاہتا ہے کہ کسی اعلےٰ درجے کی کتاب کا مطالعہ کیا جائے۔ مگر نہیں۔ جسم کا تقاضا ہے کہ سیر کے لئے جانا ضروری ہے۔ وہ ٹینس کھیلنا چاہتا ہے۔

ہماری روح چاہتی ہے کہ برگ درخت ہیں "معرفت کردگار" کے دفتر مطالعہ کرتی رہے۔ وہ چاہتی ہے کہ گھنے جنگلوں کے تاریک گوشوں میں چہچہانے والے پرندوں کی لطیف آوازوں سے سرمست ہو جائے۔ آب جو کے میٹھے میٹھے نغموں سے اپنے اوپر بیخودی کا ایک عالم طاری کرے۔ مگر نہیں جسم بھوکا ہے اس کے لئے مشروبات و ماکولات کا انتظام ضروری ہے۔

اور جب مشروبات کے ناجائز استعمال سے اسے کوئی تکلیف ہو جائے تو پھر اس کے لئے قیمتی دوائی کی ضرورت! کیا تماشا ہے!

جسم ایک قاہر و جابر فرماں روا ہے۔ جس کے احکام کی متابعت ہم پر فرض ہے اور ان تمام باتوں کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ وقت کے ساتھ ہی نوجوان شاد کام جسم بوڑھا ہو جائیگا۔ تھک جائیگا۔ کسی کے لئے اس میں کشش باقی نہ رہیگی۔ آخر الامر ایک دن اس کے اجزائے ترکیبی درہم برہم ہو جائیں گے اور موت کا تاریک ہاتھ ہمیں اس کے جبر سے نجات دلادیگا۔ اس وقت جب ہماری روح اس کے چنگل سے آزاد ہو جائیگی جب وہ ہمارے کسی کام کا نہ رہیگا۔ ہاں اس وقت اس کی قیمت ۲۴ روپے ہوگی ورنہ کچھ نہیں۔

روسی

خواب

میں نے ایک خواب دیکھا۔ مہیب۔ خوفناک وحشیانہ۔

ایک پتھریلی چٹان کے ساتھ مجھے باندھکر کھڑا کر دیا گیا تھا اور آسمان سے خون کی بارش ہو رہی تھی۔ قطرے ٹپ ٹپ میرے منہ پر گرتے تھے اور پھر رینگتے ہوئے کیڑے مکوڑوں کی طرح میری چھاتی پر ڈھلک آتے تھے۔

ہواؤں میں طوفان کا سا رنگ معلوم ہوتا تھا۔ یکایک آندھی شروع ہوگئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پتھر کی چٹان ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔

ایک بار بجلی میرے پاس ایک پتھر پر گر پڑی۔ ایک لمحے کے لئے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ کان کے پردے گویا پھٹ گئے۔ میرا بدن پسینے میں شرابور ہو گیا۔

پھر اتنی ہی تیزی سے مطلع صاف ہونا شروع ہوا۔ ہواؤں کا زور کم ہو گیا۔ بارش بند ہو گئی۔ جس رسی کے ذریعے میں چٹان سے بندھا ہوا تھا ٹوٹ گئی۔ اور میں منہ کے بل نیچے کی وادی میں جا گرا۔ . . . .

. . . .

جرمنی

سمندر کا سفر

عرشہ جہاز پر سے میں نے اُفق کی طرف نظر کی تو ایک عجیب سحر آگیں منظر دکھائی دیا۔ بچپن سے مجھے دادی اماں سمندر کے عجیب عجیب قصے سنایا کرتی تھیں۔ وہ تمام افسانے مجھے یاد آگئے۔ میں گھنٹوں بیٹھا رہا۔ اور ان افسانوں کو ذہن میں دہراتا رہا۔ جب سمندر کی لہریں اُترتی چڑھتی تھیں تو مجھے معلوم ہوتا تھا گویا ان لہروں کے اندر بھتنے ناچ رہے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور دادی اماں کی صورت آنکھوں کے آگے آگئی۔ وہ مجھے اُڑنے والے آدمی کا افسانہ سنا رہی تھیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں ان سمندری پریوں کے حسن سے لطف اندوز ہوں جو ساحل پر محو رہتی تھیں۔ لیکن وہ مجھ سے بہت دور تھیں میں صرف ان کے نغموں سے متاثر ہو سکتا تھا۔

تھوڑے عرصے کے بعد میں نے سمندر کی تہ کی طرف دیکھا۔ اگرچہ وہ شہر نظر نہ آتے تھے جن کے باشندے جادو سے مچھلیوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ لیکن لاتعداد مچھلیاں سانپوں کی طرح ادھر سے اُدھر حرکت کرتی رہتی نظر آتی تھیں۔

یکایک ایک جہاز میرے جہاز کے پاس سے گذرا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی دیو لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا مسافت کا تنات کو طے کر رہا ہے اور جلدی ہی تمام دنیا کی پہنائی کو طے کرکے کسی اور دنیا میں داخل ہو جائیگا۔

اٹلی

ایک مصور کے نام ایک نقاد کا خط

پیارے دوست تم پوچھتے ہو کہ میں نے تمہاری تصویریں دیکھیں یا نہیں؟ اس کا جواب اثبات میں ہے۔

تم لکھتے ہو۔ اپنی صحیح رائے سے مطلع کرو۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ تمہاری تصویروں سے لیاقت۔ کوشش اور نیک نیتی کا اظہار ہوتا ہے تم واقعی ایک بلند روشن اور لطیف نقطۂ نظر کی طرف پرواز کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ تم ری باتوں سے گریز کرتے ہو۔ آرٹ سے محبت کرتے ہو لیکن...

ان تمام باتوں کے باوجود تمہاری تخلیقات بے معنی ہیں۔ ان کی کوئی حیثیت نہیں ان کا کوئی مصرف نہیں۔ ان میں صداقت احساس نہیں ہے۔

اس سے میری مراد یہ نہیں کہ تم چراغ کی بجائے جگنو بیچ رہے ہو۔ نہیں ہرگز نہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ تم نے ابتک اس راز کو نہیں پایا کہ زندگی کے تغیرات آرٹ میں بھی تغیرات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اسی کمی کی وجہ سے تمہاری تخلیقات بیکار ہوگئی ہیں۔

زندگی کی قطاریں۔ دنیا کے مناظر میں کائنات کے مختلف پہلوؤں میں اس قدر تغیر ہوچکا ہے پرانا آرٹ اب صحیح طور پر زندگی کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔ ضرورت ہے کہ کوئی مجتہد آرٹ کو زندہ کردے۔

جاپانی

فلسفۂ چائے نوشی

جاپان میں چائے دوا کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ لیکن کچھ وقت گذرنے کے بعد ایک لازمہ عشرت ہو گئی۔ رفتہ رفتہ جاپان نے چائے نوشی کو ایک مظہر جمال بنا لیا۔ "چائے نوشی" ایک مذہب ہے جو دنیا کی بے حقیقت اور عام اشیاء میں جستجوئے حسن وجمال پر قایم ہے۔ اس مذہب میں سادگی تناسب۔ باہمی ہمدردی کا راز اور معاشرتی نظام کی رومانیت پوشیدہ ہے۔ یہ مذہب لازماً ایک نامکمل شے ایک داغ ناتمام کی پرستش سے عبارت ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کی ناممکن زندگی میں کوئی روشن امکان ڈھونڈا جائے۔ فلسفۂ چائے نوشی صرف جمالیاتی پہلو ہی سے دلفریب نہیں بلکہ اخلاقیات اور مذہب کی طرح اس فلسفے سے ہمارے نقطہ ہائے نظر اور ذہنیتوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے، چائے نوشی "اخلاقی اقلیدس" ہے کیونکہ اس مذہب کے ذریعے ہم اس رشتے کو معلوم کر سکتے ہیں۔ جو کائنات میں اور انسان میں قایم ہے یہ مذہب مشرقی روایات کو برقرار رکھتی ہے۔ اور اپنے پیروؤں میں ذوق سلیم کی روح پیدا کردیتا ہے

یوگوسیلویا

وحشیانہ حکمت

بدگمانی وحشیانہ قانون اور وحشیانہ زندگی کا نتیجہ ہے۔ بدگمانی بربریت کا قانون ہے۔ وہ حکمت جو بدگمانی کے زہریلے پانی سے نشوونما پاکر حیات کے درخت مردہ میں جان پیدا کرنا چاہتی ہے۔ خود اپنی دشمنی ہے۔ جب انسان انسان پر بدگمانی کر رہا ہے تو اسے دوسرے آدمی خونخوار درندے نظر آتے ہیں۔ باہمی اعتبار اور ہمدردی کا رشتہ تمام تہذیبوں کی جان ہے یہ رشتہ تمام تہذیبوں سے بالاتر اور قدیم تر ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان سب سے زیادہ اہم بھی ہے۔ تہذیب کو برباد کردو۔ اور انسانیت باقی رہے گی۔ نہیں اعتبار کو برباد کردو۔ اور پھر صرف وحشی خونخوار درندے رہ جائیں گے۔

Printed & Published by Maulvi Abdulla Khan Sahib, Arshid, at the Mercantile Press & title printed at the Victoria Press, Lahore office of the Adabi Dunya, Kashmir Buildings, McLoad Road, Lahore

ہندوستان کے محکمہائے تعلیم میں منظور شدہ

سالانہ چندہ چار روپے بارہ آنے محصول وی پی ۴ر

نادار خریداروں سے تین روپے بارہ آنے (بذریعہ منی آرڈر) غریب طالب علموں سے تین روپے (بذریعہ منی آرڈر) فی پرچہ ۶ر

رجسٹرڈ

ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد (۳) بابت ماہ اگست ۱۹۳۰ء نمبر (۲)

تصاویر:۔ سہ رنگی، شکنتلا۔ (یک رنگی) پھول اور تیتری۔ سبزہ زار۔ ہسپانوی حسن۔ مسولینی کی دست راست۔ ایثار حسن۔ سید عابد علی۔ تحفہ۔

(مولوی احمد عبداللہ خاں صاحب ارشد نے مرکنٹائل پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ادبی دنیا کشمیر بلڈنگ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا)

حال وقال

ہمارے مخلص ناظرین یہ سن کر خوش ہونگے کہ اُن کا "ادبی دنیا" اِس وقت اردو ادب کے تمام ماہوار رسالوں، تمام ہفتہ وار اور ایک آدھ کو چھوڑ کر تمام روزانہ اخبارات سے زیادہ تعداد میں شایع ہو رہا ہے۔

ادبی دنیا کی کثرتِ اشاعت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ ادبی دنیا کے ہر نمبر کی اشاعت پر تینتیس ۳۳ من کاغذ صرف ہوتا ہے۔ کاغذ کی یہ کثیر مقدار اردو کے کسی اخبار یا رسالے کے ایک نمبر پر کبھی صرف نہ ہوئی ہوگی۔

ملک کے ہر حصّے اور ہر طبقے میں اِس کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ ہندوستان بھر کے محکمہائے تعلیم کسی تحریک کے بغیر تعلیمی اداروں کے لیے اِسے منظور کر رہے ہیں۔

غیر ملکوں کے ہندوستانی دنیا کے ہر آباد خطّے سے تحفۂ وطن کے طور پر "ادبی دنیا" کو خرید رہے ہیں۔

ادبی دنیا کی اِس عالمگیر ہر دلعزیزی کو دیکھ کر ہم خدائے برتر کا شکر اور اُس کے قدرشناس بندوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

مسٹر محمد اقبال بی۔اے نے ادبی دنیا کے حصّۂ خاص "دنیائے ادب" کے لئے "جرمن زبان سے" کے عنوان سے ایک مختصر سا مضمون بھیجا تھا۔ میں نے اُسے زبانوں کے تراجم کے سلسلے میں شایع کر دیا۔ چودہری محمد اکبر صاحب ایم۔اے کے خط سے معلوم ہوا کہ مضمون نگار نے اُن کی کتاب "ماہ نو" سے اقتباس کر کے اس پر "جرمن زبان سے" کا عنوان جڑ دیا تھا۔

چودہری صاحب کو خط کے جواب میں لکھ دیا گیا تھا کہ آپ کا خط مضمون نگار کے پاس بھیجا جا رہا ہے اور اُس کا جواب آنے پر "ادبی دنیا" میں اس غلطی پر اظہارِ معذرت کیا جائے گا۔

مضمون نگار نے ہمیں کوئی جواب نہیں دیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم سے دانستہ طور پر ایک اصولی غلطی ہو گئی۔

"ادبی دنیا" کے رکنِ ادارہ سید عابد علی صاحب امسال پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے کے امتحان میں دوم درجے پر کامیاب ہوئے ہیں۔ سیّد صاحب کی اس قابلِ عزت کامیابی پر ہم اپنی جانب سے اصالتاً اسٹاف اور ناظرینِ ادبی دنیا کی طرف سے نیابتہً مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

عابدؔ صاحب دورِ جدید کے ایک بلند پایہ صاحب طرز سحر نگار ہیں۔ اِن کی شاعری اردو کے چند معیاری شعرا کی خصوصیات کا ایک جلوہ زار ہے۔ ادبی دنیا کی سہ رنگی تصاویر پر ان کی بےمثل نظمیں اُن تصاویر سے زیادہ رنگین خوبصورت اثر انگیز اور اُن تصاویر کی اہمیت کو دوبالا کرنے والی ہوتی ہیں۔

ملک کے ادبی نقاد مسٹر رام بابو سکسینہ نے اردو ادبیات پر اپنی مشہور انگریزی تصنیف "ہسٹری آف اردو لٹریچر" میں اردو زبان کے منتخب افسانہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے پنجاب سے صرف دو افسانہ نگاروں سیّد عابد علی اور حکیم احمد شجاع کو کامیاب افسانہ نگار بتایا ہے۔

عابدؔ صاحب کی توجہ اور کوشش سے ہر ماہ سات آٹھ اردو کے معیاری افسانے ادبی دنیا کو نصیب ہو جاتے ہیں۔ اور اِس امتیاز میں اس کا کوئی حریف نہیں ہے۔

ہم کبھی آئندہ فرصت میں عابدؔ کی شاعری اور افسانہ نگاری پر ایک سیر حاصل مضمون شائع کر کے اردو ادب کے اِس ذہین طباع اور فاضل انشا پرداز کی ساحرانہ خصوصیات کو تفصیلی طور پر ناظرین سے روشناس کرائیں گے۔

اِس نمبر میں سیّد عابد علی عابدؔ ایم۔اے۔ ایم۔او۔ ایل۔ ایل۔ ایل بی منشی فاضل۔ ادیب فاضل ایڈیٹر رسالہ ادبی دنیا کی تصویر سرمۂ منظر فروز کے طور پر ہدیۂ ذوقِ نظر کیجاتی ہے۔

ہز ہائی نس نواب سر سیّد حامد علی خاں بہادر سابق والئے ریاست رام پور اور ہز ہائی نس نواب سر ابراہیم علی خاں سابق والئے ریاست ٹونک کی وفات سے ہندوستانی ریاستیں دو اچھے حکمرانوں سے محروم ہو گئیں۔ یہ دونوں حکمران اردو زبان کے شاعر اور اردو ادب کے حامی تھے۔

نواب سر ابراہیم علی خاں مرحوم کا تخلص خلیل تھا۔ اور نواب سر سید حامد علی خاں مغفور رشک تخلص کرتے تھے۔ اِن دونوں حضرات کی دلکش اردو غزلیات سادگی، سلاست اور خیال آفرینی کی مثال میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ نواب سر سید حامد علی خاں اپنی روایتی ادب پروری اور ادیب نوازی کے لئے مشہور تھے۔ اِن کے حکم سے "حامد اللغات" کے نام سے اردو زبان کی ایک مکمل اور مبسوط ڈکشنری ترتیب دی جا رہی ہے۔ اِن دونوں حکمرانوں کے درباروں سے ملک کے نامور اردو شعراء ہمیشہ وابستہ رہے ہیں۔

ہم ان کے قابلِ قدر جانشینوں ہِز ہائی نس نواب سید علی رضا خاں بہادر موجودہ والیٔ رام پور اور ہِز ہائی نس نواب سعادت علی خاں بہادر والیٔ ریاست ٹونک کی خدمت میں ان کی تخت نشینی کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے مودبانہ طور پر یہ التماس کرتے ہیں کہ وہ اپنی ریاستوں کی علم پروری کو قائم رکھ کر غریب اردو زبان کو بھی اپنی مربیانہ توجہات کا حصہ دار بنائیں گے۔

غزل

جب سے پہلو میں ہمارے دلِ ناداں نہ رہا ایک بھی دکھ نہ رہا ایک بھی ارماں نہ رہا

دل سے تنگ اس لئے دردِ غمِ پنہاں نہ رہا میزباں بن کے رہا صورتِ مہماں نہ رہا

تیرے دیوانوں کو آتی نہیں ترتیبِ لباس جیب اگر رہ گئی ثابت تو گریباں نہ رہا

دردِ دل پوچھنے بیٹھے ہیں دمِ نزع وہ کیا اب دوا کرتے ہیں جب قابلِ درماں نہ رہا

اُن کو آشفتہ مزاجوں کی خبر کیا رہتی جن کا گیسو بھی کسی وقت پریشاں نہ رہا

عبرت انگیز تھا عالم مری تنہائی کا ایک تارا بھی فلک پر شبِ ہجراں نہ رہا

کیا بجھائی ہے مری آبلہ پائی نے سبیل تشنہ لب آج کوئی خارِ مغیلاں نہ رہا

حُسن کے فیض سے دنیا کبھی خالی نہ رہی تو ہے موجود اگر یوسفِ کنعاں نہ رہا

احسنؔ گوشہ نشیں سے کوئی واقف کیا ہو کہ کبھی نام و نمائش کا وہ خواہاں نہ رہا

احسنؔ

(غیر مطبوعہ)

آئینۂ عالم

ایتھر اور روحِ انسانی

سرآلیور لاج جو برطانیہ کے مشہور ترین سائینسدان ہیں۔ اپنی تازہ ترین کتاب ماورائے طبعیات میں رقمطراز ہیں:-

"مجھ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ میں نے سائینس کے میدان عمل سے علیحدہ ہو کر نفسی اور روحانی مظاہر کی تحقیقات شروع کر دی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ میری تحقیقات اور میرے نتائج واقعات پر مبنی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے رفقائے کار اور اکثر حضرات ان واقعات کی صحت سے انکار کرتے ہیں۔ لیکن ایک محدود گروہ ایسا بھی ہے۔ جو ان واقعات کے وجوہ پر یقین رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی مکمل فلسفیانہ نظام عمل ان واقعات کی متعلقہ بحث سے خالی نہیں رہ سکتا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ طبعیات اور نفسیات کو مجتمع کر دوں۔ اس سلسلے میں ایتھر جیسے عالمگیر ذریعہ اجتماع کی اہمیت کی طرف توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ایتھر آخر کار فلسفے اور نفسیات کی تمام تحقیقات میں ایک اہم عنصر ثابت ہوگا۔ روحانی رہبری اور مشینیت" کو جمع کرنے کا واحد ذریعہ ثابت ہوگا۔

اگر یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ایتھر کی وسعت عالمگیر ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہی شے روح و ذہن انسانی کی مسکن ہے۔ ایتھر اور مادے کے درمیان ایک ایسا تعلق قائم ہے جس کی تشریح و توضیح ابھی تک نہیں ہو سکی۔

تجربہ شاہد ہے کہ ذہن انسانی کسی طبعی مسکن کا متقاضی ہے۔ اور از بسکہ کوئی مادی صورت یہ کام نہیں دے سکتی۔

ذہن مطلق کا وجود صرف ایتھر ہی میں ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ذہن ایتھر سے بالاتر ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ

میری نظر میں مکان کی تمام فضا ایتھر سے لبریز ہے۔ اس عالمگیر شے کے اجزائے ترکیبی دریافت نہیں ہو سکے۔ اس کو ایک نہ دبنے والی سیال شے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ جو متحرک بھی ہو اور مستدیر بھی اس اعتبار سے ایتھر بے انتہا طاقتوں کا مرکز ہے۔ وہ تمام قوتیں اور طاقتیں جو مادے کے مختلف مظاہر میں مشاہدہ کی جاتی ہیں اس آفتاب کی ایک کرن ہیں جو ایتھر میں جلوہ افگن ہے۔ میرا خیال ہے کہ طاقت اور قوت کا یہ عالمگیر مرکز زندگی سے لبریز ہے۔ زندگی اور ذہنِ انسانی کے وہ تمام مظاہر جو دنیا میں نظر آتے ہیں اس زندگی کا ایک معمولی جزو ہیں جو ایتھر میں پنہاں ہے۔

میں اس نتیجے پر کسی استدلال کی بنا پر نہیں پہنچا بلکہ تجربے۔ مشاہدے اور وجدان نے مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے کسی طرح جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ اور جسے ایکدن تمام دنیا تسلیم کریگی۔

عجیب و غریب حساب

پچھلے دنوں، آثارِ قدیمہ کا کھوج لگانیوالوں کی ایک جماعت کو قوم کارتھیج کے پرانے کھنڈروں میں ایک چھوٹی سی تھیلی ملی۔ اس میں کچھ پرانے سکے تھے جنکی قیمت تقریباً پانچ شلنگ ہوتی تھی۔ نیشنل بنک آف نیویارک کے مینجر مسٹر چالس نے اس تھیلی کو خرید لیا۔ انہوں نے اپنے بنک کے ایک ہوشیار محاسب کو بلا کر یہ تھیلی اس کے سپرد اور اس سے کہا کہ وہ حساب لگا کر بتائے کہ اگر اس رقم پر ½ ۵ فی سینکڑہ کے حساب سے برابر نفع حاصل ہوتا رہا ہوتا تو یہ رقم اب کتنی ہو جاتی؟

اس محاسب نے نفع جوڑ کر، رقم کی جو مجموعی تعداد بتائی ہے، اس کا تصور ایک انسان کے لئے اتنا ہی دشوار ہے۔ جتنا چیونٹی کے لئے پہاڑ کا۔ سنئے رقم کا مجموعہ اتنے ڈالر ہوئے۔ دائیں جانب تین کا ہندسہ لکھئے۔ اور اس کے برابر میں چھ کا ہندسہ لکھئے۔ پھر اسکے بعد انسٹھ صفر لگا جائیے اسطرح

.... ۳۶ ڈالر۔

مسٹر چالس نے اس مجموعہ کو پھر ایک دوسرے محاسب کے سپرد کیا اور اس سے کہا کہ وہ حساب لگا کر بتائے، کہ اتنی رقم سے کتنا سونا خریدا جاسکتا ہے؟

اس نے حساب لگا کر بتایا کہ اس رقم سے سونے کا ایک اتنا بڑا کرہ خریدا جاسکتا ہے جس کے دائرہ کا قطر .... ۵ میل ہوگا۔ اگر اس سونے کے کرہ کا زمین کے کرہ سے مقابلہ کیا جائے تو دونوں کی مقدار کا تناسب یہ ہوگا۔

سونے کا کرہ

زمین کا کرہ

تاجور

شکنتلا

شاعر اعظم کالیداس کے غیر فانی شاہکار شکنتلا کا ایک منظر
بھارت ورش کے مہاراج دشنت شکار کرتے ہوئے شکنتلا کے پتاکی کٹیا کے پاس آ نکلتے ہیں۔

مہاراج (اپنے آپ سے) سنو! درختوں کے اس جھنڈ سے باتوں کی آواز آرہی ہے۔ میں اس طرف جاؤنگا۔

جاتا ہے۔

دیکھو۔ آشرم کی کنیائیں بوٹوں کو پانی دینے کے لئے اسطرف آرہی ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پانی کے باسن ہیں۔ کسقدر سندر ہیں! راج بھون میں ایسی موہنی مورتیں کہاں۔ بن کے بوٹے پھلواری کے پھولوں سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ میں چھپ جاتا ہوں اور انہیں دیکھتا ہوں۔

شکنتلا اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ داخل ہوتی ہے۔

شکنتلا۔ اس طرف آؤ۔ پیاری سکھیو!

انسویا۔ پیاری شکنتلا۔ کوئی دیکھے تو یہ سمجھے کہ سوامی کنواجی کو آشرم کے بوٹوں سے تم سے زیادہ پریم ہے۔ تم، موتیا کے تازہ کھلے ہوئے پھولوں سے زیادہ نازک ہو اور سوامی جی نے تمہارے ذمے ان بوٹوں کو پانی دینے کا کام لگا دیا ہے۔

شکنتلا۔ پیاری انسویا۔ اگرچہ یہ کام میرے سپرد کیا گیا ہے۔ لیکن مجھے یہ کام نہیں معلوم ہوتا۔ مجھے ان بوٹوں سے بہت پریم ہے۔

بوٹوں کو پانی دیتی ہے۔

مہاراج دشنت۔ (اپنے آپ سے) کیا یہ سندر کنیا کنواجی کی سپتری ہے۔ اس کا لباس اس کے روپ کو دوبالا کر رہا ہے۔ کنول کے گرد سیوالا لپٹا ہوا ہو تو کنول کی خوبصورتی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ٹھنڈی کرنوں والے چاند کی جوت کو سیاہ داغ اور بھی جگمگا دیتے ہیں

شکنتلا۔ دیکھو وہ کیسر کا بوٹا اپنی ننھی ننھی ٹہنیوں سے مجھے بلا رہا ہے۔ ہوا میں اس کی ٹہنیاں ہلتی ہوئی اس طرح معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے نازک نازک انگلیاں۔۔۔۔۔۔۔

بوٹے کی طرف جاتی ہے۔

پریام ودا۔ پیاری شکنتلا ذرا اسی طرح کھڑی رہو!

شکنتلا۔ کیوں سکھی؟

پریام ودا۔ تم کیسر کے بوٹے پر جھکی ہوئی ہو اور اس طرح دکھائی دیتا ہے گویا کیسر کے بوٹے کے اردگرد نازک بیل ہو۔

شکنتلا۔ سکھی۔ تجھے پریام ودا کا نام ٹھیک دیا گیا ہے۔

دشنت۔ (اپنے آپ سے) پریام ودا سچ کہتی ہے۔ اس کے سرخ ہونٹ کھلتی ہوئی کلی سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ اس کا جسم جوانی کی جوت سے جگمگا رہا ہے۔

انسویا۔ دیکھو شکنتلا۔ یہ وہ موتیے کا بوٹا ہے جسے تم باغ کی چاندنی کہا کرتی ہو۔ کیا تم اسے بھول گئیں؟

شکنتلا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں اپنے آپ کو بھول سکتی ہوں۔ لیکن اس بوٹے کو نہیں۔ اوہ! ایک بھنورا پانی دینے کی وجہ سے اپنی جگہ سے اڑ کر میرے چہرے پر بیٹھنا چاہتا ہے۔

بھنورے کو ہٹانا چاہتی ہے

دشنت۔ آہ! خوش نصیب بھنورا ہے۔ تو دلیری سے اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کی جوت چرانا چاہتا ہے۔ اور گھوم گھوم کر اس کے کانوں کے پاس آتا ہے تاکہ اسے اپنے دل کا راز سنا سکے۔

شکنتلا۔ یہ بھنورا تو دم نہیں لینے دیتا۔ میں کہیں اور چلی جاتی ہوں آہ! یہ بھنورا تو میرے پیچھے آتا ہے۔

دشنت۔ اب میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہوں۔

آگے بڑھکر

کون ہے جو آشرم کی کنواریوں کو تنگ کرتا ہے۔

سہیلیاں مہاراج کی طرف دیکھکر شرما جاتی ہیں۔

انسویا۔ کچھ نہیں کچھ نہیں۔ صرف بھنورا ہماری پیاری سکھی کو ستا رہا ہے۔

دشنت۔ (شکنتلا سے مخاطب ہوکر) آشرم کا کیا حال ہے۔

شکنتلا خاموش رہتی ہے۔

انسویا۔ سب ٹھیک ہے۔ آپ ایسا مہمان آجائے تو ہمارے دھن بھاگ۔ پیاری شکنتلا۔ جاؤ۔ مہمان کے لئے پھل پھول اور چاول لاؤ۔ ہمارے پاس جل ہے لہذا ہم اس سے اپنے مہمان کے پاؤں دھوئینگے۔

دشنت۔ آؤ بھگت ہو چکی۔ آپکے پریم بھرے شبدوں نے میری خوب

چاند کا سفر

کیا ہم آئندہ سال چاند کا سفر کر سکیں گے؟ یہ ایک اہم سوال ہے جو اس وقت تمام دنیا کے لئے محل منظر بنا ہوا ہے۔ جن لوگوں کی گردنیں سائنس کے سامنے جھک چکی ہیں، اور جنھوں نے اسے قادر مطلق تسلیم کر لیا ہے وہ بلا پس و پیش جواب دیں گے، "ضرور بالضرور"

لیکن وہ لوگ جو کسی بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ جب تک کہ وہ اسے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ صاف کہدیں گے۔ "ناممکن"

مگر دنیا میں ایک تیسری جماعت بھی ہے۔ اور غالباً "ادبی دنیا" کے اکثر ناظرین اسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو فوراً کسی بات کو تسلیم کر لینے یا اس کا انکار کر دینے کے عادی نہیں۔ بلکہ ہر بات کو غور و فکر کی کسوٹی پر کستے ہیں وہ اس کا جواب دیں گے۔ "علم کے سامنے کوئی چیز ناممکن نہیں ہے۔"

بے شک علم کے سامنے کوئی چیز ناممکن نہیں ہے۔ کل کی بات ہے کہ ہوا میں اڑنے کو شیخ چلی کا منصوبہ خیال کیا جاتا تھا مگر آج ہم اپنی آنکھوں سے انسانوں کو پرندوں کی طرح ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ ہماری نظروں میں آج ہوائی جہاز کی وہی حیثیت ہے۔ جو کل ہمارے بزرگوں کی نظروں میں شکرم یا بہلی کی تھی۔

جب انسان نے زمانہ ماضی میں سرخ اونٹوں کی شکرم اور سپید بیلوں کی خوبصورت بہلی پر اکتفا نہ کیا، تو کون کہہ سکتا ہے کہ مستقبل میں وہ زمانہ حال کے ہوائی جہازوں پر اکتفا کر لے گا؟ نہیں، ہرگز نہیں بلکہ وہ کوئی ایسی سواری ایجاد کریگا جو اسے یورپ سے امریکہ تک، دو دن میں نہیں، بلکہ دو منٹ میں پہنچا دے۔ موجودہ زمانہ کے ہوائی جہاز اور آئندہ زمانہ کے اس ہوائی جہاز کی رفتار کا تناسب، گذشتہ زمانے کی بہلی اور موجودہ زمانے کے ہوائی جہاز کی رفتار کے تناسب سے زیادہ نہ ہوگا۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ برلن میں اس سلسلہ میں کیا کیا نئے تجربات کئے جا چکے ہیں اور کئے جا رہے ہیں؟ وہاں کے ایک مشہور کارخانے نے ایک ایسے ہوائی جہاز کا نمونہ طیار کر لیا ہے جو پروں کے ذریعے سے نہیں، بلکہ گیس کے ذریعے سے اڑا کریگا۔ اس کی مشینری میں مخصوص نالیوں کے ذریعے سے گیس پہنچائی جایا کریگی اور وہ گیس کی قوت سے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ اڑ سکیگا۔ اس قسم کے ایک ہوائی جہاز کا جب تجربہ کیا گیا تو اس کی رفتار آٹھ سیکنڈ میں سو کیلو میٹر نکلی۔

اس کارخانہ نے مشہور جرمن ہوا باز "راب" کو اس بات پر آمادہ کر لیا ہے کہ وہ اس قسم کے ایک چھوٹے سے ہوائی جہاز پر بطور تجربہ پرواز کرے۔ یہ ہوائی جہاز زمین سے ۵۰ کیلو میٹر فی منٹ کی رفتار سے اٹھیگا اور پھر بتدریج اس کی رفتار ترقی کرتے کرتے ۲۰۰ کیلو میٹر فی منٹ تک پہنچ جائیگی۔ اس میں کامیاب ہو جانے کے بعد پھر ایک دوسرے ہوائی جہاز کا تجربہ کیا جائیگا جو ۱۰۰۰ کیلو میٹر فی منٹ کی رفتار سے اڑے گا۔ اگر یہ تجربہ بھی کامیاب ثابت ہوا، تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ ہم زمین سے چاند تک محض چالیس گھنٹے میں پہنچ سکیں گے۔

اس حیرت انگیز ایجاد کا سہرا جرمن سائنسدان ماکس ؔغالیہ کے سر ہے۔ اس کے بعد پھر جس شخص نے اس کی قائم کی ہوئی بنیادوں پر عمارت کھڑی کی، وہ مشہور جرمن مہندس فریڈرک سنڈر ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ جو لوگ ان جہازوں کے تجربے کر رہے ہیں ان کا مقصد یہی نہیں کہ وہ چاند تک پہنچ جائیں۔ بلکہ ان کا مقصد یہ بھی ہے کہ وہ یہ بات جاننے سے پہلے کہ چاند کی فضا میں کیا ہے، یہ بات معلوم کر لیں کہ دنیا کی فضا میں کیا کچھ ہے؟ یہ تجربہ کرنے والے ۱۰۰۰۰ میٹر بلندی پر پہنچ کر یہ معلوم کریں گے کہ وہاں ہوا کا زور کتنا ہے۔ اور اسے کیونکر مغلوب کیا جا سکتا ہے؟ اور چونکہ جہاں تک قیاس کیا گیا ہے۔ وہاں اتنی بلندی پر ہوا کا زور یقیناً کم ہوگا۔ اس لئے یہ لوگ کوشش کرینگے کہ اس بلندی پر، یورپ اور امریکہ کے درمیان ایک خط مستقیم بنا سکیں، تاکہ ہوائی جہاز ان دونوں براعظموں کی درمیانی مسافت کم سے کم وقت میں قطع کر سکیں۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ اس قسم کے ہوائی جہازوں کی رفتار نہایت تیز ہوگی۔ اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ اتنی بلندی پر ہوا کا زور بہت کم ہوگا۔

اگر گیس سے چلنے والی مشین کی اسکیم [illegible] اس میں شک نہیں کہ اس سے دنیا کے حمل و نقل میں ایک انقلاب پیدا ہو جائے گا۔

ہوائی جہاز، سٹیمر، موٹریں، یہ سب پٹرول کی بجائے گیس سے چلا کریں گی۔ اور عالم اقتصادیات میں حکمرانی کا تاج پٹرول کے سر سے اتار کر گیس کے سر پر رکھ دیا جائے گا۔ جیسا کہ اس سے پہلے کوئلے کے سر سے اتار کر پٹرول کے سر پر رکھا جا چکا ہے۔ آئندہ زمانہ میں ہم دیکھیں گے کہ جہاز بغیر عملہ جہاز کے سمندر کے سینے کو چیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ اور ہوائی جہاز لمحوں میں دنیا کے گرد چکر لگا آئے ہیں۔ ذرا قارئین کرام آنکھیں میچ کر اس وقت کی دلچسپیوں کا تصور تو کریں۔

جب انسان کرہ ہوائی کے رازوں کو معلوم کر لے گا، تو وہ اپنے فکر کے گھوڑے اس سے آگے کے میدانوں میں دوڑائیگا اور کوشش کریگا کہ چاند تک پہنچ جائے۔ یہ کوشش پہلے پہل تو علمی پیاس بجھانے کے لئے ہوگی لیکن اگر یہ کامیاب ہوگئی تو پھر اس سے پیٹ بھی بھرا جا سکیگا۔ جیسا کہ اس سے پہلے امریکہ کی دریافت کے سلسلہ میں ہو چکا ہے۔

اس قسم کے ہوائی جہازوں کے تجربوں کے ابتدائی نتائج آئندہ موسم گرما تک معلوم ہو جائیں گے۔ اس سلسلہ میں اگر یہ پہلا قدم کامیاب رہا تو پھر دوسرا قدم ہوا کے اونچے طبقات کے مطالعہ کے لئے اٹھیگا۔ اگر وہ بھی کامیاب رہا تو پھر تیسرا قدم چاند کی دنیا میں داخل ہونے کے لئے اٹھایا جائیگا۔ اور اس طرح جول ورن کے اس خواب کی تعبیر جو اس نے چاند کی دنیا میں داخل ہونے کے متعلق دیکھا تھا پوری ہو جائیگی۔

اگر چاند کی دنیا دریافت ہوگئی تو پھر محاسبین کے دماغ دنیا کی آبادی کے بڑھنے کے فکر کے بوجھ سے بھی ہلکے ہو جائیں گے۔ اور انہیں اس غم سے چھٹکارا مل جائیگا کہ اگر دنیا کی آبادی اسی تناسب سے بڑھتی رہی تو پھر رہنے والوں کے لئے جگہ کہاں سے آئیگی؟

اس وقت سے پہلے کہ دنیا دنیا والوں پر تنگ ہو اور اس کے عطیے اس کے رہنے والوں کے لئے ناکافی ثابت ہوں۔ وہ سیاروں میں نئی بستیاں ڈھونڈ نکالیں گے اور یہاں سے ترک وطن کر کے ان نوآبادیوں کو جا بسائیں گے۔ اور اس طرح اس بیچاری دنیا کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے گا۔

سیاروں کی دنیاؤں کی دریافت کے بعد ڈاک کا کام بھی بڑھ جائے گا۔ ڈاکخانے والوں کو ہدایت جاری کرنی پڑیں گی کہ خط بھیجنے والے اس امر کی بھی تصریح کریں کہ مکتوب الیہ کس دنیا میں رہتا ہے۔

[illegible] اضافہ کرنا پڑیگا کہ زمین پر [illegible]

کیا عجب نہیں [illegible] تصور کر [illegible] اور [illegible] اور ہمارے لئے اتنا ہی [illegible] جتنا کہ ہم اب تک دیکھ چکے ہیں۔

اس ایجاد کے کتنے ہی منافع سہی، لیکن عمرانی دنیا کے لئے مفید نہ ہوگی۔ انسان حصول معاش کی سہولتوں کی وجہ سے شہری زندگی پسند کرتا ہے۔ وہ شہروں میں اس لئے گھر بناتا ہے کہ دفتروں، کارخانوں اور دکانوں پر آنے جانے میں (جو بالعموم شہر ہی میں ہوتے ہیں) زیادہ مسافت نہ قطع کرنی پڑے۔ جب شہروں میں زمین کے اوپر جگہ نہیں رہتی، تو پھر زمین کے نیچے سرنگیں کھود کھود کر ریلیں چلاتا ہے۔ ہوٹل اور دکانیں لگاتا ہے۔ کارخانے قائم کرتا ہے۔ اور بڑی بڑی عظیم الشان عمارتیں تعمیر کرتا ہے جن میں ہزاروں کاریگروں اور مزدوروں کی گنجائش ہوتی ہے۔ اور اب تو یہ صورت بھی ناکافی ثابت ہو رہی ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ بازار پاٹ کر ان کے اوپر ریلیں اور ٹرام کاریں چلائی جائیں۔ چنانچہ بعض بڑے بڑے شہروں میں اس تجویز پر عمل کرنے کے لئے تدبیریں سوچی جا رہی ہیں۔

یہ سب کچھ کیوں ہے؟ اس لئے کہ انسان کو کسب معاش کے لئے شہروں کی محدود آبادی ہی میں گھر بنانا ہے۔ لیکن اگر یہ گیس سے چلنے والی سواریوں کی اسکیم کامیاب ہوگئی، تو پھر ان لوگوں کو جو آج شہروں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ شہروں میں رہنے کی ضرورت باقی نہ رہیگی۔ کیونکہ یہ تیز رفتار سواریاں سفر کی تمام مشکلات کا خاتمہ کر دیں گی۔ اور ایک انسان جو مثلاً دہلی کے کسی کارخانہ میں کام کرتا ہے۔ اس کے لئے برابر ہوگا کہ وہ دہلی ہی میں رہے یا میرٹھ میں اپنا مکان بنائے۔ اس لئے کہ جس قدر وقت دہلی میں رہتے ہوئے، اسے اپنے گھر سے کارخانہ تک آنے میں صرف کرنا پڑیگا۔ اسی قدر وقت اسے میرٹھ سے دہلی تک آنے میں صرف کرنا پڑے گا۔

یہ ایجاد قرض داروں اور قرضخواہوں، مزدوروں اور سرمایہ داروں محکوموں اور حاکموں کی آپس کی اجنبیت کو دور کرنے میں بھی بہت موثر ثابت ہوگی۔ اور مختلف قوموں کے درمیان تعلقات کو خوشگوار بنا دیگی۔ اس لئے کہ اس کی بیگانگی اور اجنبیت کا باعث بعد مسافت ہے۔ جب مسافت کا مسئلہ حل ہو جائے گا تو وہ روڑے جو تعلقات کی عمدگی میں

حائل ہیں خود بخود راستہ سے صاف ہو جائیں گے۔

یہ ایجاد دنیا سے خونریزی اور فتنہ و فساد کا خاتمہ کر دیگی۔ اس لئے کہ اس کا اصلی باعث مختلف قوموں کی آپس کی غلط فہمیاں ہوتی ہیں، اور یہ غلط فہمیاں بعد مسافت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ جب بعد مسافت کا مسئلہ حل ہو جائے گا تو دنیا کی ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ بآسانی تبادلہ خیالات کر سکے گی اور ایک جماعت دوسری جماعت کے جذبات و حسیات سے صحیح طور پر واقف ہو سکیگی اور پھر وہ صورتیں پیدا نہ ہونگی جو دنیا کے اسٹیج پر جنگ عظیم جیسے ہولناک ڈرامے دکھا سکتی ہیں۔ دنیا میں ایک انسان دوسرے انسان کے احساسات کی پرواہ کیا کریگا اخوت انسانی کے نظریہ کو بطور ایک اصول کے تسلیم کر لیا جائیگا۔ سیاست چالاکی۔ . . . . اور عیاری کا نام نہ رہیگا۔ بلکہ وہ مختلف قوموں کے درمیان صلح و آشتی پیدا کرنے کا باعث ہو گی۔ دنیا میں سب انسان بھائی بھائی ہونگے اور دنیوی زندگی کا مفہوم اس وقت محبت اور پریم ہو گا۔ وہ پریم جس پر فرشتے بھی حسد کریں گے۔

زین العابدین سجاد (میرٹھی)

تحفہ

(یہ نظم اُس تصویر کو دیکھکر فکر کی گئی ہے جو "ادبی دنیا" میں تحفے کے نام سے شائع ہو رہی ہے)

میرے سر آنکھوں پہ تیرا تحفہ اے جانِ بہار ۔۔۔ اے گلِ گلزارِ عشرت۔ اے گُلِ افشانِ بہار
یہ تکلف کس لئے۔ اے لالۂ فردوسِ حُسن ۔۔۔ تُو نے آخر کیوں اُٹھایا ہے یہ احسانِ بہار
تُو تو خود ہی تحفۂ باغِ شباب و حسن ہے ۔۔۔ جلوۂ رنگیں ہے تیرا زیبِ دامانِ بہار
تیری رعنائی کے عشوے۔ رنگ تصویرِ شباب ۔۔۔ تیری پیشانی کے جلوے رشکِ عنوانِ بہار
تری نزہت سے گلستانِ تمنا لالہ رنگ ۔۔۔ تری نکہت سے جنوں پرور خیابانِ بہار

اب نہ وہ محفل نہ وہ ساغر نہ وہ ساقی رہا
باغ سے جب تُو نکل آئی تو کیا باقی رہا

(غیر مطبوعہ)

شاطر (غزنوی)

پندرھویں صدی میں مسلمانوں کے تعلیمی نظریات

علوم و فنون کے قریب قریب ہر شعبہ میں جو بیش بہا خدمات مسلمانوں نے سرانجام دی ہیں۔ ان کے احسان سے علمی دنیا کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ اور جبتک انسان ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ ان کے نقوش پا ہمیشہ آئندہ نسلوں کی رہبری کرتے رہیں گے۔ اور تحقیق و تدقیق کے میدان میں اس قوم کے گزشتہ علمی کارناموں کا مطالعہ ناگزیر رہیگا۔

دورِ حاضرہ میں جبکہ محققین یورپ کی جدوجہد کے بدولت تعلیم نے ایک باقاعدہ اور مکمل فن کی شکل اختیار کرلی ہے۔ آئندہ ترمیم و تنسیخ اور ترقی کے لیئے ہر تعلیمی نظریہ کی اصل و ابتدا اور اُس کی مختلف ارتقائی منازل کا کھوج لگانا لازمی سمجھا جاتا ہے اور اس غرض کے لیئے تاریخ کے اوراق پارینہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ زمانۂ حال کے ماہرین فن تعلیم بالعموم تمام تعلیمی نظریات کی بنیاد کمینیس لاک روسو وغیرہم معلمین یورپ کے قایم کردہ اصولوں پر رکھتے ہیں یا حکماء یونان کے فلسفہ پر۔

موخرالذکر ماخذ کے متعلق تو اتنا ہی کہدینا کافی ہے کہ فلسفۂ یونان کے احیاء کا باعث صرف مسلمان ہیں اور جو کچھ روشنی ان علوم کی آج ہم تک پہنچ رہی ہے وہ محض عرب مترجمین کے ذوق علمی کی رہینِ منت ہے۔

بلاشبہ گزشتہ پانچ صدیوں سے تعلیمی دنیا میں لاک۔ روسو۔ ہربارٹ وغیرہم کے نظریات ہی کا سکہ جاری ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ان معلمین یورپ سے قبل بھی نسل انسانی یا اسکی کسی ایک شاخ میں جو اُس وقت تہذیب انسانی کی حامل تھی کوئی نظام تعلیم موجود تھا یا نہیں۔

یورپ کی ذہنی علمی اور سیاسی ترقیوں کا حصہ ان ہی گذشتہ پانچ صدیوں پر مشتمل ہے۔ ان سے قبل سات سو برس کی مدت تاریکی کا زمانہ خیال کیا جاتا ہے۔ جس میں یورپ کی جہالت حد سے گزرگئی تھی یہی وہ طویل مدت ہے جس میں مسلمان انسانی تہذیب کے علمبردار تھے۔ اسی دور میں جبکہ مسلمانوں کے علمی کارنامے دنیا کو محوِ حیرت کئے ہوئے تھے۔ کیا یہ امر قابلِ یقین ہے۔ کہ ان کے پاس کوئی مستقل نظام تعلیم نہ ہوگا یا ان کے حکماء نے اس میدان کو قطعاً خالی چھوڑ دیا ہوگا؟ ان میں علماء کی کثرت اُن کی تحقیقات کی موشگافیاں اور اُن خیالات کی بلند پروازیاں ان کے نظام تعلیم کی خوبی پر خود شاہد ہیں۔

یورپ میں عام بیداری اور اُس کے ساتھ احیاء و ترویج علوم و فنون کی ابتدا ۱۴۵۳ء میں ترکوں کے فتح قسطنطنیہ کے فوراً بعد شروع ہو جاتی ہے۔ خوش قسمتی سے ایک اسلامی تصنیف ایسی موجود ہے جو اسی دور کی یادگار اور اس صدی میں مسلمانوں کے تعلیمی نظریات کا مرقع ہے۔

اخلاقِ جلالی پندرھویں صدی کے اوائل میں تصنیف ہوئی۔ اگرچہ اس تصنیف کا اصلی مبحث تعلیم الاخلاق ہے۔ لیکن چونکہ اخلاق کو فن تعلیم سے گہرا تعلق ہے۔ اس کی وسعت میں جابجا تعلیمی نظریات کے جواہر ریزے بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جن کو بنظر غایر چُن چُن کر علیحدہ ترتیب دیا جائے تو فن تعلیم کے نظریات پر ایک مستقل رسالہ بن سکتا ہے۔

یہ امر کسی ثبوت کا محتاج نہیں کہ ایک تنہا فاضل و محقق سے زمانہ جسقدر استفادہ کرتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ وہ زمانہ کے مروجہ علوم و فنون اور تحقیقات و انکشافات سے مستفید ہوتا ہے۔ پس اگر ہم یہ کہیں کہ اخلاقِ جلالی کے پیش کردہ اصول ایجاد و اختراع کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ اس موضوع پر وہ تمام مسائل جو اس زمانے کے مسلمانوں میں پایۂ ثبوت کو پہنچ چکے تھے نہایت دلچسپ اسلوب بیان۔ مشرح و مدلل طرز تحریر اور عمدہ ترتیب کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ تو اس

سے اخلاقِ جلالی کی توقیع میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی اہمیت اور فائدہ میں اس حیثیت سے مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ کہ محض اس کا مطالعہ پندرھویں صدی میں مسلمانوں کے تعلیمی نظریات کی نمایندگی کرنے کے لئے کافی ہے۔

افسوس ہے کہ اس قابلقدر تصنیف کے مصنف مولانا جلال الدین کے متعلق بجز چند امور مندرجہ ذیل کے کچھ معلوم نہیں:۔

آپ ایران کے ایک مردم خیز قریہ دوان کے رہنے والے تھے۔ اور ابو الغازی حسین مرزا والی ہرات کے دربار میں علماء و فضلاء کے اُس حلقہ میں شامل تھے جو شاہ موصوف کی قدردانی اور دریا دلی نے اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔

تعلیم کا نصب العین

(۱) مصنفِ اخلاقِ جلالی نے اس کتاب کے دیباچہ میں تعلیم کا نصب العین یوں بیان کیا ہے:۔

انسان اشرف المخلوقات کو حضرت حق سبحانہ تعالیٰ نے اپنی امانت تفویض فرمائی۔ یہ امانت خلافتِ الٰہی تھی۔ خلافت الٰہی پر انسان کا حق بوجہ متضاد صفات کا حامل ہونے کے قائم ہوا۔ اس خلافت کا مستحق ہونے کے لئے انسان کو کمال علمی و عملی کی ضرورت ہے جو تعلیم اور تربیت سے حاصل ہو سکتا ہے۔

اس سے یہ خوب ظاہر ہو جاتا ہے کہ تعلیم کا نصب العین بچے کی اخلاقی جسمانی اور ذہنی تربیت ہے۔ اور اس تربیت سے کمال علمی و عملی اور اُس سے استحقاق بخلافت الٰہی حاصل ہوتا ہے۔ اور انسان اپنی تخلیق کا منشا پورا کر دیتا ہے۔ اور مکمل انسان کہلانے کے قابل بن جاتا ہے۔

اس نصب العین کا کمینیس کے پیش کردہ نصب العین سے مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا۔ کہ یہ دونوں قریب قریب ایک دوسرے سے منطبق ہیں۔ دونوں کا منتہائے مقصود آخرت کی تیاری ہے۔ دونوں نے جسمانی تربیت اور صحت کو ذہنی و اخلاقی تربیت کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔ کمینیس کے نزدیک علم۔ تقوے۔ اور اخلاق کا مادہ انسان میں ودیعت کیا گیا ہے۔ جو بذریعہ تادیب و تربیت ترقی دیا جا سکتا ہے۔ مگر اخلاق جلالی کے مصنف فرماتے ہیں۔ کہ "قابلیت ایشاں (اطفال) بر کمال ست۔ و میل طبیعت بر رذائل در نفوس مرکوز ست" اور پھر فرماتے ہیں کہ "نفوس بمنزلۂ لوح سادہ باشد و قبول صورت بسہولت نماید" اس لحاظ سے ملا جلال الدین دوانی جان لاک اور اُس کے معاصرین علماء فرنگ کے ہمخیال ہیں۔ جو بچے کے دماغ کو ایک ایسے لوح سادہ کے مانند سمجھتے ہیں جس پر ماحول سے ہر قسم کے اثرات بآسانی مرتسم ہو سکتے ہیں۔

فی الحقیقت ان سب کا ماخذ فلاسفۂ یونان ہیں۔ اور یہ نظریہ انیسویں صدی تک ناقابل تردید سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ ہربارٹ نے فیکلٹی تھیوری کی لغویت کو دنیا پر ثابت کر دیا۔

تعلیمی نصب العین میں کمینیس اور صاحب اخلاقِ جلالی کا تطابق محض اتفاقی نہیں بلکہ یقینی طور پر یہ ثابت کرتا ہے کہ ان درمیانی دو صدیوں میں مشرق و مغرب کے مابین تبادلۂ خیالات کا زبردست سلسلہ جاری تھا۔ دنیا کی تاریخ میں یہ اہم ترین زمانہ ہے۔ یہ وہ انقلابی دور ہے جس میں مغرب بحیثیت شاگرد کے مشرق کے سامنے زانوئے ادب تہ کئے ہوئے تھا۔ شاگرد کی بیدار مغزی اور استاد کی غفلت نے اُن کی باہمی حیثیت کو اُلٹ دیا

اصول تعلیم

(۱) آغازِ تربیت کا زمانہ — صاحب اخلاقِ جلالی بچے کی تربیت کو مدتِ اصناع کے بعد ہی شروع کر دینا لازمی سمجھتے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی قبل مرد بچے کی تربیت کے لئے دایہ کا معزول ہونا لازمی خیال کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ دایہ کی کیفیت مزاجی و نفسانی بچے میں سرایت کرتی ہے

(۲) مذہبیت — مسلمانوں کے تمام ذہنی کارنامے مذہبی مرکز کے گرد گھومتے ہیں۔ چنانچہ ان کے نظام تعلیم میں بھی مذہبیت کی روح جاری و ساری ہے۔ اکثر مسائل قرآن و حدیث سے ثابت کئے گئے ہیں۔ تعلیمی نصب العین بھی مذہبی رنگ سے رنگا ہوا ہے۔ اور نصاب میں بھی مذہبی و اخلاقی تعلیم ہر بچے کے لئے لازمی ہے۔

(۳) عمومیت — مصنفِ اخلاقِ جلالی نے جو تعلیمی نصب العین پیش کیا ہے۔ اُس سے واضح ہوتا ہے۔ کہ تعلیم و تربیت ہر انسان کے لئے خواہ مرد ہو یا عورت۔ امیر ہو یا غریب شہری ہو یا دیہاتی ہر ایک کے لئے لازمی ہے۔ بچے کی تعلیم و تربیت کو والدین پر فرض بنایا گیا ہے۔

(۴) اعلیٰ علوم و فنون کی تعلیم — قدرت نے مختلف انسانوں کو

مختلف استعداد ذہنی عطا فرمائی ہے۔ بعض بچے میں فطرۃً صنعت وحرفت میں ترقی کرنے کی استعداد ہوتی ہے اور بعض خلقاً اعلےٰ ذہنی کاموں شلاً طبابت، معلمی، انجنیری، وکالت وغیرہ کے لئے موزوں ہوتے ہیں۔ ماحول اور تربیت ان کاموں میں ان کی مساعدت کرتے ہیں اُن کاموں کے علاوہ جن کے لئے فطری طور پر موزوں ہوں اگر کسی دوسرے فن کی تحصیل پر مجبور کئے جائیں تو عموماً کامیابی یا تو قطعاً نہیں ہوتی یا کم از کم خاطرخواہ نہیں ہوتی۔ اگر کامیابی نہ ہو تو عمر ضائع ہوتی ہے اور زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ انسان بجائے سوسائٹی کا مفید رکن بننے کے اس پر بار اور اُس کے لئے خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

علاوہ بریں نظام عالم ہی اسی توازن پر قائم ہے کہ مختلف لوگ مختلف پیشے بخوشی اختیار کریں ورنہ اگر سب لوگ ایک ہی طریق معاش اختیار کریں گے مذہبیت بیکار اور انسانی زندگی وبال ہو جائیگی اور علوم و فنونِ انسانی کی ترقی رُک جائیگی اور بالآخر اُن کا یکے بعد دیگرے خاتمہ ہو جائیگا۔

اس وقت ہندوستان کے لئے یہ ایک زبردست خطرہ درپیش ہے کہ روزبروز لوگ صنعت وحرفت اور دیگر پیشوں سے توجہ ہٹا کر کالجوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور تعلیم کی غرض محض تحصیل ملازمت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کے نتائج بدیہہ رونما ہو رہے ہیں۔ کہ ایک جانب تو ملک کی صنعت وحرفت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اور دوسری جانب ملک میں بیکاری اور اُس سے عام بےچینی اور بدامنی بڑھتی جاتی ہے۔

ان ہی وجوہ کی بناء پر صاحب اخلاقِ جلالی نے جہاں ابتدائی تعلیم اور اخلاقی و جسمانی تربیت کو تمام انسانوں کے لئے لازمی قرار دیا۔ وہاں اعلےٰ علوم وفنون کی تعلیم ہر بچے کی ذہنیت کے مطابق دینی تجویز کیا ہے۔

اس کے بعد مفصل بحث اس امر میں کی ہے کہ ہر بچے کی تعلیم یکساں نہ ہونی چاہیئے۔ بلکہ بچے کی فطرت کا مطالعہ کرنے کے بعد اُس کے لئے موزوں تعلیم تجویز کرنی چاہیئے۔ اس بحث کا خلاصہ اس عنوان کے ابتدا میں ہم دے چکے ہیں۔ تمام عبارت کو یہاں نقل کرنا خالی از طوالت نہیں۔

کمینیس نے بھی اس نظریہ کو تسلیم کیا ہے۔ وہ بھی پرائمری تعلیم اور مذہبی اخلاقی اور جسمانی تربیت کو ہر بچے کے لئے اور اعلےٰ ذہنی تعلیم یا تحصیل فنون کو خواص تک محدود رکھتا ہے۔ کمینیس نے یہ اصول قریب قریب نظر انداز کر دیا گیا۔ چنانچہ لاک نے تعلیم عوام پر بالکل توجہ نہ کی۔ روسو نے بھی عوام کے لئے تعلیم وتربیت غیر ضروری قرار دی اور پسٹلازی، ہربارٹ فربیل وغیرہ نے عوام کی تعلیم پر توجہ دی تو یہ تخصیص نہ کی کہ عوام کی توجہ اعلےٰ ذہنی تعلیم سے ہٹا کر صنعت وحرفت کی جانب مبذول کرنی چاہیئے۔

(۵) تقلید فطرت کمینیس روسو اور دورِ حاضرہ کے تمام ماہرین فن تعلیم تقلید فطرت کی پُرزور سفارش کرتے رہے ہیں مگر ان میں سے ہر ایک تقلید فطرت سے جداگانہ مطلب نکالتا ہے۔

(ا) کمینیس تقلید فطرت کا مطلب یوں سمجھتا ہے۔ کہ معلم کو چاہیئے کہ غیر انسانی فطرت کا مطالعہ کرے۔ اور پھر اصول تعلیم بنانے میں اس کی تقلید کرے۔ مثلاً فطرت ہر شے کی نشوونما بہ سہولت اور بتدریج کرتی ہے۔ ایک بیج ایک عرصہ کے بعد پودہ بنتا ہے۔ اور بیضۂ مرغ ایک مدت کے بعد بچے کی شکل اختیار کرتا ہے۔ پس معلم کو بھی تربیت اطفال میں جلدی نہ کرنی چاہیئے اور بتدریج ترقی کرنی چاہیئے۔

(ب) روسو نے تقلید فطرت کا یہ منشا سمجھا ہے کہ بچے کو تمدن کی مصنوعی فضا سے دور کر کے جنگل کی قدرتی فضا میں تربیت دینی چاہیئے۔ تاکہ بچے کی فطرت غیر انسانی فطرت کے ماحول میں اپنے کمال کو پہنچ سکے۔

(ج) موجودہ زمانے میں تقلید فطرت کا منشاء یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ معلم کو بچے کی فطرت کا لغایر نظر مطالعہ کرنا چاہیئے اور اس کی تعلیم وتربیت میں اسی فطرت کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ غیر انسانی فطرت کو آجکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

صاحبِ اخلاقِ جلالی بھی ان آخری معنوں میں تقلید فطرت کی حمایت کرتے ہیں۔ یعنی معلم کا فرض ہے کہ تعلیم میں فطرتِ اطفال کی مطابقت عمل میں لائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ

"اولیٰ آنست کہ در طبیعتِ کودک نظر کنند و از احوال اُو تفرس جویند"

(۶) جاذبیت مصنفِ اخلاقِ جلالی سفارش کرتے ہیں کہ طریقِ تعلیم و نصاب تعلیم بچے کی ذہنیت اور استعداد کے مطابق ہونا چاہیئے۔ نیز جسمانی سزا سے بھی منع

کرتے ہیں۔ اور دیگر دلچسپ ذرائع استعمال کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ بچوں کی صحت درست رکھنے کے لئے ورزش جسمانی اور کھیلوں کی سفارش کرتے ہیں۔

(۷) تعلیم زیر اتالیق کمینیس نے مدرسوں میں اجتماعی تعلیم پر زور دیا مگر یورپ نے اس کی سفارش پر عمل نہ کیا۔ لاک اور روسو اتالیق کے ماتحت انفرادی تعلیم دینے کے حامی تھے۔ پسٹلائزی اور ہربارٹ نے پھر بلد سے کی تعلیم اجتماعی پر توجہ کی اور یورپ نے اس طریق کو اختیار کر لیا مگر بیسویں صدی میں پھر انقلاب ہوا اور نظام مانٹسوری اور ڈالٹن پلین نے افتراقِ انفرادی کو ملحوظ رکھتے ہوئے مدرسوں اور جماعتوں کو محض بخیال نظام قائم رکھا۔ اور لغرض تعلیم انفرادی توجہ لازمی قرار دی۔

صاحب اخلاقِ جلالی نے اسی آخری طریقہ کی حمایت کی ہے اور یہی طریقہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم میں اجتناب جاری ہے آجکل جو نقائص اس مذہبی تعلیم میں نظر آتے ہیں وہ اس طریق عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ معلمین کی ناقابلیت۔ نصاب کے غیر متعین ہونے اور نظام کے فقدان کے باعث ہیں۔

(۸) جسمانی تعلیم جسمانی تعلیم پر مصنفِ اخلاق جلالی نے کافی زور دیا ہے۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کھیل اور ورزش بچے کی تعلیم و تربیت کا اہم ترین جزو ہیں۔ مگر معلم کی نگرانی وہاں بھی لازمی ہے تاکہ بُرے نتائج نہ پیدا ہوں۔ اسی سلسلے میں لاک کے "ہارڈننگ پروسس" (جفاکشی کی عادت ڈالنا) کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔

لاک نے بچے کو جفاکشی کی عادت ڈالنے کے لئے مندرجہ ذیل تجویز کی ہے:-

"انسان کی قوت کا انحصار طاقت برداشت وضبط پر ہے۔ پس بچے کو اُن اثرات سے محفوظ رکھنا چاہیئے جو اس کو کمزور دل کم حوصلہ اور عیش پرست بنا دیں۔ غذا سادہ ہونی چاہیئے۔ شراب و دیگر مسکرات و منشیات سے قطعاً پرہیز کرنا چاہیئے۔ دوا صرف انتہائی مجبوری کی حالت میں دینی چاہیئے۔ لباس اتنا گرم نہ ہونا چاہیئے کہ سردی سے پوری طرح محفوظ رکھ سکے۔ جوتے ایسے ہوں کہ اُن کے تلوں سے پانی بھی تھوڑا تھوڑا آتا رہے۔ بستر سخت ہونا چاہیئے۔ بچوں کو دھوپ میں ننگے سر اور ننگے پیر پھرانے کی بھی عادت ڈالنی چاہیئے۔"

جلالی اور لاک کا مقابلہ کرنے کے بعد یہ امر اظہر من الشمس ہو جاتا ہے کہ لاک پر مسلمانوں کے نظام تعلیم کا کسقدر گہرا اثر تھا۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ لاک نے براہِ راست اور بلا واسطہ ان نظریات کو مسلمان حکماء سے حاصل کیا تھا۔ بلکہ مسلمان حکماء سے لاک تک یہ خیالات بالواسطہ بطور وراثت، ذہنی پہنچے تھے۔

لاک نے اس امر میں قدرے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اور ایسی سفارشات بھی کی ہیں جو صحت کے لئے مفید ہونے کے بجائے باعث ضرر ہو سکتی ہیں۔ مثلاً دھوپ میں برہنہ سر و برہنہ پا پھرانا۔ ٹوٹے ہوئے جوتے پہنانا جن کے اندر پانی جا سکے۔ وغیرہ — اخلاقِ جلالی کی سفارشات ایسی لغویات سے پاک ہیں۔

(۹) مذہبی و اخلاقی تعلیم مذہبی و اخلاقی تعلیم کو تمام تعلیم و تربیت کی بنیاد خیال کیا ہے۔ اور اس کے عملی پہلو پر زیادہ زور دیا ہے۔

اخلاقی تعلیم کا ایک بھدا مگر عام طریقہ یہ ہے کہ بچے سے کہا جائے کہ ایسا کرو اور ایسا نہ کرو۔ جدید سائیکالوجی کے مطابق اس طریقہ کی انتہائی مخالفت کیجاتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ بچے کو طبعاً ان چیزوں کی طرف زیادہ رغبت ہوتی ہے۔ جن سے منع کیا جاتا ہے۔ اس معاملے میں مصنف اخلاقی جلالی کا نظریہ جدید ترین تحقیقات سے مطابقت رکھتا ہے۔

چونکہ تہذیب الاخلاق کتاب کا اصلی موضوع ہے اس لئے بہت تفصیل و بسط کے ساتھ اس مضمون پر بحث کی گئی ہے۔ اور تمام اخلاقی خوبیوں اور برائیوں کی کیفیت بیان کرکے ہر خوبی کے پیدا کرنے اور ہر برائی کو دور کرنے کا علاج پیش کیا گیا ہے۔

(۱۰) سزا سزا کے متعلق مندرجہ ذیل اصول قائم کئے ہیں۔

(ا) علوم و فنون کے سکھانے میں اور علمی کمزوریوں پر سزا نہ دینی چاہیئے۔ بلکہ اخلاقی غلطیوں یا مذہب کے فرائض ترک کرنے پر سزا دینی چاہیئے۔

(ب) جہاں تک ممکن ہو جسمانی سزا سے احتراز کرنا چاہیئے۔ اور محض شبہ پر جبتک کہ استاد اپنی آنکھوں سے طالبِ علم کو اخلاقی غلطی

کا ارتکاب کرتے ہوئے نہ دیکھے سزا نہ دینی چاہیئے ۔ اور جب اس کی نوبت آئے تو تعداد میں کم اور تکلیف میں زیادہ سزا دینی چاہیئے تاکہ عبرت ہو اور دوبارہ اُس فعل کے ارتکاب کی جرأت نہ کر سکے ۔

(ج) سزا خلوت میں دینی چاہیئے ۔ تاکہ بے شرم اور ڈھیٹ نہ ہو جائے ۔

(د) جب سزا دیجائے تو بچے کو رونے چیخنے سے اور فریاد کرنے سے منع کرنا چاہیئے ۔ کیونکہ یہ ذلیل حرکت ہے ۔

(۱۱) نصاب تعلیم اخلاقی مذہبی اور جسمانی تعلیم کے علاوہ ہر بچے کے لئے ابتدائی ذہنی تعلیم لازمی قرار دی ہے ۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد کسی فن یا اعلےٰ ذہنی تعلیم کی تحصیل ضروری خیال کی ہے ۔

تعلیم علوم میں حسب ذیل ترتیب کی سفارش کی ہے :۔

اوّل منطق پھر ریاضی اور اس کے بعد طبیعی اور اس کے بعد الٰہی کی تعلیم دینا لازم ہے مگر بعض حکما کے قول کے مطابق ریاضی منطق سے پہلے پڑھانی چاہیئے ۔ اور اس موخر الذکر ترتیب کی خود بھی تصدیق کی ہے ۔

(۱۲) فیکلٹی تھیوری اس سے مراد یہ ہے کہ یورپ کے حکماء قدیم کا خیال تھا کہ انسانی دماغ ایک لوح سادہ کی مانند ہے ۔ جس پر ماحول سے نقوش مرتسم ہوتے رہتے ہیں ۔ نیز دماغ مختلف قوتوں پر مشتمل ہوتا ہے ۔ اور ہر قوت کو کسی خاص علم میں مشق کرنے سے نشو و نما حاصل ہوتی ہے ۔ اور ایک بار ایک قوت کے ترقی کر جانے کے بعد یہ قوت ہمیشہ ہر حالت میں کام آسکتی ہے ۔ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں ۔ کہ یہ نظریہ انیسویں صدی میں ہربارٹ نے غلط ثابت کر دیا ۔ مگر اس سے قبل یہ مسلّم الثبوت خیال کیا جاتا تھا ۔

بسلسلہ نصاب تعلیم جو اقتباس ہم نے اخذ کیا ہے اُس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف اخلاق جلالی بھی اس نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں ۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ لاک وغیرہ معلمین اور حکماء یورپ تک یہ نظریہ ان ہی مسلمان علماء سے پہنچا ہوگا ۔ اور مسلمان حکماء نے یہ نظریہ فلاسفۂ یونان سے اخذ کیا ہوگا ۔

تعلیم نسواں آجکل بالعموم مسلمانوں میں تعلیم نسواں کا خیال جدید سمجھا جاتا ہے ۔ اور فی الواقع مسلمان اس میدان میں آجکل بہت پیچھے نظر آتے ہیں ۔ مگر ہمیشہ سے یہ کیفیت نہ تھی اور مسلمانوں کے اقبال کے زمانے میں تعلیم نسواں کی کثرت اور خوبی پر اوراق تاریخ شاہد ہیں ۔

دور حاضرہ میں عورتوں کی تعلیم پر تو بہت کچھ زور دیا جاتا ہے ۔ مگر مرد و عورت کے نصاب تعلیم میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا ۔ اس لئے تعلیم یافتہ عورتوں میں ایسی خوفناک برائیاں عام طور پر نظر آتی ہیں ۔ جو سوسائٹی کے لئے اہم خطرات کا موجب ہیں ۔ اور اگر آئندہ اس طرف توجہ نہ کی گئی اور یہ سیلاب یوں ہی بڑھتا رہا تو ایک دن نظام سوسائٹی کا شیرازہ اسی تعلیم نسواں کی بدولت ورق ورق ہو جائیگا ۔

اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تعلیم کی ضرورت مرد اور عورت دونوں کے لئے برابر ہے ۔ مگر دونوں کے لئے نصاب تعلیم اُن کی زندگی کی جداگانہ ضروریات کے مطابق جداگانہ ہونا چاہیئے ۔ چنانچہ صاحب اخلاق جلالی نے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے تعلیم نسواں کے مندرجہ ذیل اصول بیان کئے ہیں ۔

" در تربیتِ دختران بانچہ لائق الیشاں باشد از ملازمتِ خانہ ومبالغت در حجاب وعفت وحیا وخصال کہ در زناں بیان رفت ترغیب باید نمود ۔ وہنرہائے لائق آموخت ۔ واز خواندن و نوشتن بکلّی منع باید کرد ۔"

اس اقتباس کے آخری جزو سے شاید بعض حضرات کو یہ دھوکا ہوگا کہ عورت کو قطعاً علم سے بے بہرہ رکھنے کی سفارش کی گئی ہے ۔ مگر ہم اوپر صاحبِ اخلاق جلالی کا بیان نقل کر آئے ہیں کہ انسان ہونے میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں ۔ اس لئے اپنی پیدائش کا منشاء پورا کرنے کے لئے عورت کو بھی اخلاقی ۔ مذہبی جسمانی اور ابتدائی ذہنی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے ۔ پس "خواندن و نوشتن" سے مراد اعلےٰ ذہنی تعلیم ہے ۔ جس سے منع کیا گیا ہے ۔ چونکہ یہ نصاب تعلیم عوام کے لئے ہے ۔ اس لئے خاص صورتوں میں عورتوں کو اعلیٰ تعلیم دینے سے بھی منع نہیں کیا گیا ۔ بلکہ مدعا صرف یہ ہے کہ بالعموم عورتوں کو اعلےٰ تعلیم دیکر اعلےٰ ذہنی مشاغل میں مصروف کرنا سوسائٹی کے مفاد کے لئے مضر ہے ۔

کمینیس نے مرد اور عورت دونوں کو تعلیم دینا ضروری خیال کیا ہے مگر دونوں کے لئے ایک مدرسہ ایک معلم ایک نصاب تعلیم اور ایک ہی طریق تعلیم اختیار کیا ہے ۔ جس کی غلطی ہم اوپر بیان کر آئے ہیں ۔

لاک نے تعلیم نسواں کو قطعاً نظر انداز کر دیا ہے ۔ مگر روسو

نے تعلیم نسواں کا جو معیار قرار دیا ہے۔ وہ لفظ بلفظ اخلاق جلالی کے معیار کے مطابق ہے۔

(۱۴) معلم کی خصوصیت

آجکل معلم کا انتخاب اُس کی تعلیمی سندات کے بنا پر ہوتا ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک کامیاب معلم کے لئے کچھ اور خصوصیات بھی لازم ہیں۔ محض نفسِ مضمون سے واقف ہونا یا دوسرے الفاظ میں تبحّرِ علم کافی نہیں۔

صاحبِ اخلاقِ جلالی معلم کی خصوصیات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:-

"معلم دیندار و عاقل باشد و بریاضتِ اخلاق واقف و بطہارتِ ذیل و وقار و ہیبت و مروّت مشہور و از اخلاق ملوک و آدابِ مجالست و مواکلت بالیشاں و محاورت با ہر طائفہ از طوائفِ مردم باخبر" ۱۲

یعنی مختصراً معلم کو علاوہ عالم و فاضل ہونے کے خوش اخلاق دیندار۔ ذہین۔ ماہر تعلیم الاخلاق (جس کے ساتھ ماہر علم النفس ہونا لازمی ہے) اور بارعب (یعنی عمدہ ڈسپلن قائم رکھنے والا) ہونا چاہئے۔

(۱۵) سفر ذریعۂ تعلیم

لاک اور روسو کی طرح صاحب اخلاق جلالی بھی تکمیل تعلیم و تربیت کے لئے سفر کو لازمی خیال کرتے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ متذکرہ بالا فرنگستانی معلمین ۲۱ سال کی عمر کے بعد سفر کی سفارش کرتے ہیں۔ حالانکہ صاحب اخلاق جلالی کا خیال ہے کہ اوائل عمر میں اگر بچہ کو گھر سے دور بخیال تربیت بھیجدیا جائے تو گھر کے مضر اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"ملوک فرس فرزنداں را درمیان خدم و حشم تربیت نکردندے بلکہ با ثقات بطرفے فرستادندے تا بخشونت عیش عادت کردندے کسے کہ بہ ایں طریق نشو و نما یافتہ باشد اصلاح او مشکل بود"

موجودہ زمانے میں ہوسٹلوں کے قائم کرنے کے وجوہ میں سے مندرجہ بالا وجہ بھی خیال کیجاتی ہے۔ یعنی گھروں کے مضر اثرات سے دور رہ کر بچہ اپنی قوتوں پر بھروسہ کرنا سیکھ جاتا ہے۔

تنقید و تبصرہ

مصنفِ اخلاقِ جلالی نے تعلیم کا جو نصب العین پیش کیا ہے وہ اس لحاظ سے قابلِ تعریف ہے کہ اس میں تعلیم و تربیت کے ہر پہلو پر مناسب زور دیا گیا ہے۔ جسمانی تعلیم و تربیت کو اخلاقی و ذہنی تعلیم کی بنیاد خیال کرنا بھی موجودہ نظریات کے بالکل مطابق ہے۔ بچے کی تربیت کا آغاز پیدائش کے وقت سے کرنا۔ ہر بچہ کے لئے بلا امتیاز جنس۔ قوم و مراتب زندگی وغیرہ تعلیم کی ضرورت ظاہر کرنا۔ مطالعہ فطرتِ اطفال کی سفارش کرنا۔ تعلیم کو دلچسپ بنانے کی رغبت دلانا۔ جسمانی تربیت کے سلسلے میں کھیلوں اور ورزش کو لازمی قرار دینا۔ سزا کے متعلق خیالات اور مدرس کی خصوصیات پر نظر ان تمام امور میں جدید نظریات کے ساتھ اخلاق جلالی کا تطابق حیرت انگیز ہے۔

اتنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس نظام تعلیم میں چند بدیہی نقائص بھی ہیں مگر وہ اس زمانے کی خصوصیات تھیں اور بہر حال علم انسانی کی ترقی ہمیشہ پرانے نظریات کو غلط ثابت کرتی رہتی ہے۔

چنانچہ علم النفس کی ترقی کے ساتھ فیکلٹی تھیوری کی لغویت ثابت ہو چکی ہے۔ اسی علم سے عدم واقفیت کا نتیجہ تھا کہ جہاں مصنف اخلاق جلالی نے بچے کی فطرت کا مطالعہ کرنے کی سفارش کی ہے۔ وہاں یہ بھی فرماتے ہیں کہ بچے کے لئے تعلیم علوم و فنون کا انتخاب کرتے ہوئے نجوم سے مدد لینی چاہئے۔ اسی طرح ایک جگہ بچے کے متعلق کہتے ہیں کہ "میل طبیعت بر ذائل در نفوس مرکوز ست"۔ یعنی بچے کی طبیعت فطرتاً برائی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ علم النفس کی جدید تحقیقات نے اس فرسودہ خیال کو بھی غلط ثابت کر دیا ہے۔ فطرتاً بچہ نہ نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے نہ بدی کی جانب بلکہ ماحول میں نیکی یا بدی جس کے لئے بھی پُر زور تاثرات موجود ہونگے۔ وہی بچہ بآسانی قبول کریگا۔

مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پندرھویں صدی میں مسلمانوں کے پاس ایک شاندار نظام تعلیم موجود تھا۔ حکومت کے زوال کے ساتھ ساتھ اس قوم کے حوصلے پست خیالات تنگ اور وسائل محدود ہوتے گئے۔ بالآخر یہ اعلیٰ نظام تعلیم بجائے ترقی پانے کے رفتہ رفتہ حوالۂ طاقِ نسیاں ہو گیا۔ مگر جیسا ہم اوپر ثابت کر آئے ہیں۔ تبادلۂ خیالات کے ذریعہ اس کے اثرات بالواسطہ یورپ میں رونما ہوئے۔ یہ مبارک پودہ ایشیا سے لاکر یورپ کی سرزمین میں لگایا گیا اور وہاں کی زندگی بخش فضا میں نشوونما پاکر ایک ایسا شاندار درخت تیار ہوا کہ آج ہم اُس کے زیر سایہ اُس کے اثمار کی شیرینی سے لذت گیر ہو رہے ہیں۔

محمد عبد السلام فضلی بی۔ اے
(دہلی)

غزل

تری بزمِ ناز میں تھا جو دل کبھی شمعِ روشنِ آرزو
ستمِ زمانہ سے بن گیا وہی آج مدفنِ آرزو

مرا دل ازل کا فسردہ ہے مجھے شوق سے سروکار کیا
نہ ہوائے میکدہ ہوس نہ دماغِ گلشنِ آرزو

وہ اُمیدیں خاک میں مل گئیں وہ تمام نشہ اُتر گیا
نظر اس نے کی جو عتاب کی ہوئی برقِ خرمنِ آرزو

گئی یک بیک مری خستگی ہوئی دور ساری شکستگی
کبھی آئی بھول کے سوئے دل جو نسیمِ گلشنِ آرزو

نہ خدنگِ ناز نے رُخ کیا کبھی جانبِ دلِ بینوا
نہ گلِ مراد سے پُر ہوا کبھی اپنا دامنِ آرزو

مجھے یاد آتا ہے اپنا دل کہ بہار جس سے تھی منفعل
وہ نہالِ تازۂ رنگ و بو وہ چراغِ روغنِ آرزو

نہ کوئی ہوس ہے نہ ولولہ یہ ہے حالِ وحشتِ خستہ کا
ہے فریب خوردۂ آرزو، وہ بنا ہے دشمنِ آرزو

رضا علی وحشت

(غیر مطبوعہ)

سنہری جزائر کا بادشاہ

افراد

سنہری جزائر کا بادشاہ .... شاہ ناماران
سیاست دان ....
شہنشاہ اعظم کا سفیر ....
شہنشاہ اعظم کا کارندہ ....
سورج کے پجاری ....
شاہ ناماران کے جلاد ....
سفیر کا حبشی غلام ....
شہنشاہ کا بونا ....
شاہ ناماران کا ساغر بردار

ناماران کا سیاست دان۔ ایک شخص شہنشاہ اعظم کے ملک سے مفرور ہو کر آپ کے ملک میں پناہ گزیں ہے اور اس مقام میں چھپا ہے۔ جسکو "مقدس" کہتے ہیں۔

ناماران۔ ہمیں چاہئے کہ اُسے شہنشاہ کے حوالے کردیں۔

سیاست دان۔ آج ہی ایک قاصد یہ حکم لایا تھا کہ مفرور کو گرفتار کر لیا جائے۔

ناماران۔ ہمیں چاہئے کہ اسے شہنشاہ کے حوالے کردیں۔

سیاست دان۔ اس کے علاوہ اس کے پاس ایک فرمان شاہی ہے۔ جس میں مندرج ہے کہ مفرور کا سر کاٹکر شہنشاہ کے پاس بھیجدیا جائے۔

ناماران۔ بھیجدیا جائے۔

سیاست دان۔ حضور پرنور شہنشاہ اعظم کے باجگذار نہیں ہیں۔

ناماران۔ شہنشاہ کے فرمان کی حکم عدولی نہیں کیجاسکتی۔

سیاست دان۔ تاہم ......

ناماران۔ آج تک کسی نے ایسا نہیں کیا۔

سیاست دان۔ یہی وجہ ہے کہ شہنشاہ مغرور ہوگیا ہے اور دوسرے بادشاہوں کا مذاق اڑاتا ہے۔ اگر حضور پرنور اس کے فرمان کو تسلیم نہ کریں تو وہ کانپنے لگیگا۔

ناماراں۔ آہ!

سیاست دان۔ شہنشاہ اپنے دل میں کہیگا "کس قدر عظیم الشان بادشاہ ہے۔ میری حکم عدولی کرتا ہے۔ اور وہ لرزنے لگیگا۔

ناماراں۔ اور اگر......

سیاست دان۔ شہنشاہ آپ سے ڈر جائیگا۔

بادشاہ۔ مَیں چاہتا ہوں کہ عظیم الشان بادشاہ کہلاؤں لیکن......

سیاست دان۔ شہنشاہ کی نظروں میں آپ کی عزت بڑھ جائیگی۔

بادشاہ۔ لیکن شہنشاہ کا غصہ قیامت ہے۔ خوفناک ہے۔ گذشتہ زمانہ میں اس کا غصہ خوفناک تھا۔

سیاست دان۔ شہنشاہ بوڑھا ہوگیا ہے۔

بادشاہ۔ کسی بادشاہ سے اس پناہ گزیں مفرور کو طلب کرنا جو دربار کے مقدس حصوں میں چھپا ہوا سلامتی اور امن کا خواہاں ہو اس بادشاہ کی بڑی توہین ہے۔ بڑی تذلیل ہے۔

سیاست داں۔ بڑی توہین۔ بڑی تذلیل ہے۔

کارندہ داخل ہوتا ہے۔

کارندہ۔ اے بادشاہ۔ میں اس آدمی کی تلاش میں ہوں جو شہنشاہ اعظم کے دربار سے فرار ہوکر آپ کے محل کے اس حصے میں پناہ گزین ہے جسے "مقدس" کہتے ہیں۔ میرے پاس جستجو کا نیزہ ہے۔

بادشاہ۔ میرے خاندان کے بادشاہوں کا یہ وطیرہ نہیں رہا کہ پناہ گزینوں کو مقدس مقامات سے نکال دیں۔

کارندہ۔ شہنشاہ کا حکم ہے۔

بادشاہ۔ لیکن میں اس حکم کو پسند نہیں کرتا۔

کارندہ۔ اے بادشاہ شہنشاہ کا فرمان دیکھ!

بادشاہ فرمان لے لیتا ہے۔ کارندہ دروازے کی طرف جاتا ہے۔

کارندہ۔ میں اپنا نیزہ لیکر محل کے اس حصے کے سامنے بیٹھا رہونگا جسے مقدس کہتے ہیں۔

کارندہ چلا جاتا ہے۔

بادشاہ۔ فرمان شاہی۔ فرمان شاہی۔ ہم پر اس کی پابندی لازمی ہے۔

سیاست دان۔ شہنشاہ بوڑھا ہے۔

بادشاہ۔ بالکل درست۔ ہم اس کی حکم عدولی کریں گے۔

سیاست دان۔ وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ کچھ نہیں کریگا۔

بادشاہ۔ تاہم فرمان ......

سیاست دان۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

بادشاہ۔ سنو۔ میں شہنشاہ کی حکم عدولی کرونگا۔ میں اسے اپنے مقدس مقامات کی تذلیل کی اجازت نہیں دونگا۔ ہم مفرور آدمی کو اپنے ملک سے نکال دینگے۔

(اپنے کارندے سے مخاطب ہوکر)

ادھر آ کارندے۔ سیاہ ہاتھی دانت کا نیزہ لے جو جلاوطنی کا نشان ہے۔ اور میرے تخت کی بائیں جانب رکھا ہے۔ اور اس نیزے سے مفرور شخص کی طرف اشارہ کر۔ اس کے بعد اسے خاص دروازے سے باہر نکال دے تاکہ وہ شہنشاہ کے غضب سے محفوظ رہے۔

کارندہ چلا جاتا ہے۔

(سیاست دان سے مخاطب ہوکر)

یوں ہم شہنشاہ کے غضب سے محفوظ رہیں گے اور ہمارے مقدس مقامات کی توہین بھی نہ ہوگی۔

سیاست دان۔ اگر حضور پر نور نے صاف طور پر شہنشاہ کے احکام کی خلاف ورزی کی ہوتی تو بہتر تھا۔ شہنشاہ بوڑھا ہے اور انتقام لینے کی جرأت نہیں کرسکتا۔

بادشاہ۔ بس۔ میرا حکم صادر ہوچکا۔ اور مفرور ملک سے نکال دیا گیا۔

قاصد داخل ہوتا ہے۔ قرنا بجاتا ہے۔

قاصد۔ سفیر شہنشاہ!

سفیر شہنشاہ داخل ہوتا ہے دروازے میں کھڑا ہوکر بادشاہ کو آداب بجا لاتا ہے۔

بادشاہ۔ شہنشاہ اعظم نے اپنا سفیر بھیجنے کی تکلیف گوارا فرمائی؟

سفیر۔ میں شہنشاہ کی طرف سے بادشاہ کے لئے ایک تحفہ لایا ہوں۔ تاکہ بادشاہ کو احکام شہنشاہی کی تعمیل کے انعام میں شادکام کیا جائے۔

بے بہا شراب لعل گوں کا ایک جام

سفیر اشارہ کرتا ہے اور ایک ملازم جام شراب لیکر داخل ہوتا ہے۔ ملازم کا چہرہ جاذب نظر ہے۔ اور اس کے سنہرے بال اس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے ہیں۔

میرے شہنشاہ کا حکم ہے کہ آپ اس شراب سے لذت اندوز ہوں۔ اس کا فرمان ہے کہ میں آپ کو اس امر کی اطلاع دے دوں کہ اس شراب کے کشید کرنے والے خاک میں مل گئے۔ اور جس جگہ اس شراب کے خوشہ ہائے تاک پیدا ہوئے تھے وہ مہیب اور خوفناک لڑائیوں کے بعد صرف افسانہ بنکر رہ گئی۔ اب اس جگہ کا ذکر صرف کہانیوں میں آتا ہے۔

بادشاہ۔ تو یہ تحفہ احکام شہنشاہی کی تعظیم کے لئے ہے۔

سفیر۔ ہاں۔ سورج کے قدیم باغوں کی شراب

بادشاہ۔ شہنشاہ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ میں نے اس کے احکام کی تعمیل کردی ہے۔

سفیر۔ لوگ شہنشاہ کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔

بادشاہ۔ اور اگر میں نے مفرور کو پناہ دی ہو تو!

سفیر۔ اس صورت میں شہنشاہ کا حکم ہے کہ آپ اس (لونا سفیر کے اشارے پر ایک بدہیئت اور مکروہ جام شراب لے کر آگئے

آتا ہے) جام شراب سے شراب پئیں اور پھر آخری سلام۔

بادشاہ۔ آخری سلام۔؟

سفیر۔ آخری سلام!

بادشاہ۔ اس جام میں کیا ہے۔

سفیر۔ اس میں کوئی معمولی زہر آلود شراب نہیں ہے۔ بلکہ ایسی مہلک اور قاتل شے کہ افریقہ کے سانپ اس کا نام سن کر مسموم ہو جائیں۔ اور دور ہی سے اس جام کو دیکھکر اپنے بلوں میں گھس جائیں۔

بادشاہ۔ میں نے مفرور آدمی کو پناہ نہیں دی۔

سفیر۔ تو پھر اس شاہی تحفے کی ضرورت نہیں۔

بادشاہ۔ لیکن میں نے یہ حکم بھی نہیں دیا کہ مفرور کا سر کاٹکر شہنشاہ اعظم کے بھیجدیا جائے۔

سفیر۔ تو پھر ان دونوں تحفوں کی کوئی ضرورت نہیں۔

پہلے جام زہر آلود کی شراب زمین پر گرا دیتا ہے۔
سنگ مرمر کے فرش سے دھواں اٹھتا ہے۔
پھر دوسرا جام بھی انڈیل دیتا ہے۔

آہ! یہ شراب خوشگوار!

بادشاہ۔ میں نے مفرور شخص کو اپنے ملک سے نکال دیا ہے۔ میں نے بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی بھی نہیں کی۔ اور تعمیل بھی نہیں۔

سفیر۔ تو پھر آپ اپنا تحفہ خود چن لیجئے۔

سفیر اشارہ کرتا ہے۔ ایک حبشی
دو پیالے لیکر داخل ہوتا ہے۔

سفیر۔ شہنشاہ کا فرمان ہے کہ آپ ان دونوں پیالوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلیں۔

سیاست دان دبے پاؤں چلا جاتا ہے۔

بادشاہ۔ دونوں پیالے ایک ہی طرح کے ہیں۔

سفیر۔ کوئی شک نہیں۔ شہنشاہ کے دار الخلافے میں صرف ایک صناع ایسا تھا جو ان دو پیالوں میں تمیز کرسکتا تھا۔ اور شہنشاہ نے اُسے مروا ڈالا۔ چنانچہ اب دنیا میں ان دو پیالوں کا فرق کوئی نہیں بتا سکتا۔

بادشاہ۔ کیا جو شے ان دونوں پیالوں میں ہے وہ ایک ہی طرح کی ہے۔

سفیر۔ ہاں۔ حیرت انگیز طور پر ایک ہی طرح کی۔ شہنشاہ کا فرمان ہے کہ ان میں سے ایک پیالہ آپ انتخاب کریں۔

بادشاہ۔ کیا شہنشاہ نے دو پیالوں میں بھی زہر ڈالدیا ہے۔

سفیر۔ نہیں صرف ایک پیالے میں زہر ہے۔

بادشاہ۔ تم کہتے ہو کہ صرف ایک پیالے میں زہر ہے!

سفیر۔ ہاں۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ زہر کس پیالے میں ہے!

بادشاہ۔ اور اگر میں اس حکم ماننے سے انکار کردوں۔

سفیر۔ کئی ایسے عذاب ہیں۔ جن کا نام لینے سے رُوحِ انسانی کانپتی ہے۔ شہنشاہ بہت کم عذاب دیتا ہے۔ لیکن جب اس کا حکم ہوتا ہے اسوقت.........

بادشاہ۔ (اپنے آپ سے) پیالوں میں کیا شے جلوہ آفریں معلوم ہوتی ہے۔ بالکل شراب کی طرح۔

سفیر۔ ایک پیالے میں شراب ہے۔ روح پرور۔ جانفزا۔

بادشاہ۔ اور دوسرے پیالے میں۔

سفیر۔ کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ یہ بادشاہ کا ایک راز ہے۔

بادشاہ۔ میں اپنے ذائقہ شناسوں کو طلب کرتا ہوں۔ وہ دونوں پیالوں میں سے چکھیں گے۔

سفیر۔ افسوس۔ ایسا خطرہ نہیں برداشت کیا جاسکتا۔

بادشاہ۔ خطروں کی برداشت بادشاہ کے ذائقہ شناسوں کے فرائض میں داخل ہے۔

سفیر۔ اگر اتفاق سے "ذائقہ شناس" زہر آلود پیالہ پی جائیں تو خیر۔ چنداں مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر کہیں وہ شراب والا پیالہ پی جائیں۔ تو شہنشاہ کے تحفے کی ایسی توہین ہوگی جس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔

بادشاہ۔ کم از کم اس بات کی اجازت تو مجھے ضرور ہوگی کہ میں اپنے مندر کے پجاریوں کو بلاکر ان سے پوچھ لوں کہ مجھے کون سا پیالہ انتخاب کرنا چاہئے۔

سفیر۔ اجازت ہے۔

بادشاہ۔ پجاریوں کو بلاؤ۔

بادشاہ۔ (اپنے آپ سے) پجاری فیصلہ کریں گے۔ وہ میرے لئے انتخاب کا ناخوشگوار اور خوفناک فرض ادا کریں گے۔

(سفیر سے مخاطب ہوکر)

میرے پجاری بہت دقیق النظر ہیں۔ وہ ان دیوتاؤں کی

پوجا کرتے ہیں۔ جو سنہری جزائر کے محافظ ہیں۔
سفیر۔ لیکن شہنشاہ کے دیوتا اور ہیں۔

سورج کے دو پجاری داخل ہوتے ہیں۔
ایک ملازم ایک تپائی لئے ہوئے داخل ہوتا ہے۔

بادشاہ۔ شہنشاہ نے یہ دو پیالے بھیجے ہیں۔ میرے لئے انتخاب کرو۔ خوشبودار بوٹیاں جلا کر دیوتاؤں کو خوش کرو۔ اور ان کے فیصلے سے مجھے آگاہ کرو۔
پہلا پجاری۔ ہم دیوتاؤں کو خوش کرینگے۔ خوشبودار بوٹیوں سے ان کی طبع لطیف کو شاداں و فرحاں کر دیں گے۔ اور پھر وہ ہمارے سوالوں کا جواب دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

سفیر اور حبشی غلام کی خاموشی خوفناک طور پر بڑھ رہی ہے۔ پجاری تپائی پر جھک جاتے ہیں۔ خوشبو آتی ہے پجاری اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

پہلا پجاری۔ دیوتا محو خواب ہیں۔
بادشاہ۔ دیوتا محو خواب ہیں۔ وہ دیوتا جو سنہرے جزائر کی حفاظت کرتے ہیں۔
دوسرا پجاری۔ دیوتا محو خواب ہیں۔
بادشاہ۔ انہیں جگاؤ۔ میں ہزاروں بھیڑیں قربانی چڑھاؤنگا۔ میں سورج کے پجاریوں کو زر و انعام میں دونگا۔

پجاری پھر تپائی پر جھک جاتے ہیں۔
خوشبو کا ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے۔

پہلا پجاری۔ دیوتاؤں نے اپنا پیغام ادا کر دیا ہے۔
بادشاہ۔ کیا کہتے ہیں دیوتا۔
پہلا پجاری۔ حبشی کے بائیں ہاتھ کا پیالہ انتخاب کیا گیا ہے۔

بادشاہ حبشی کے ہاتھ سے پیالہ چھین لیتا ہے۔ سفیر کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کا چہرہ جذبات سے بالکل خالی نظر آتا ہے۔ پجاری کی طرف دیکھتا ہے یکایک وہ چونک اٹھتا ہے۔ اُسے ایک پجاری کے چہرے پر ایک عجیب کیفیت نظر آتی ہے۔ وہ پیالہ رکھ دیتا ہے۔ ایک قدم آگے بڑھ کر وہ پجاری کی طرف غور سے دیکھتا ہے۔

بادشاہ۔ پجاری۔ پجاری۔ یہ تیری آنکھوں میں کیسی چمک ہے؟
پجاری۔ دیوتاؤں کا پیغام
بادشاہ۔ مجھے شک ہے۔
پجاری۔ دیوتاؤں کا پیغام
بادشاہ۔ میں دوسرا پیالہ لونگا۔

بادشاہ حبشی کے دائیں ہاتھ والا پیالہ لے لیتا ہے۔ اور پجاری کی طرف دیکھتا ہے پھر سفیر کی طرف دیکھتا ہے۔ لیکن اس کا چہرہ پہلے کی طرح جذبات کے آثار سے عاری ہے۔ یکایک بادشاہ دائیں ہاتھ والا پیالہ پی جاتا ہے۔ سفیر اور حبشی کے چہرے آثار جذبات سے خالی رہتے ہیں۔

بادشاہ۔ خوب شراب تھی۔
سفیر۔ جان پرور۔ رُوح فزا۔
بادشاہ۔ جلادوں اور عذاب کرنے والوں کو بلاؤ۔

جلاد حاضر ہوتے ہیں۔

بادشاہ۔ پجاری سے سات سوال پوچھو۔ اور کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرو۔

سفیر رخصت ہوتا ہے۔
ایک پیالہ خالی۔ دوسرا لبریز بادشاہ کے قریب رکھا ہے۔
جلاد داخل ہوتا ہے۔

جلاد۔ سات سوال پوچھے جا چکے۔
بادشاہ۔ پھر۔
جلاد۔ جواب نہیں ملتا۔
بادشاہ۔ کیا۔
جلاد۔ پجاری نے اعتراف گناہ نہیں کیا۔
بادشاہ۔ آخری سوال پوچھو!

جلاد چلا جاتا ہے۔

بادشاہ۔ پجاری چاہتے تھے کہ میں زہر بھرا پیالہ پی جاؤں۔ تعجب ہے۔ کیوں؟ دیوتاؤں کا نام لیکر انہوں نے جھوٹ کیوں بولا۔

جلاد داخل ہوتا ہے۔

جلاد۔ آخری سوال پوچھا جا چکا۔

بادشاہ۔ پھر

جلاد۔ انہوں نے اعتراف گناہ نہیں کیا۔

بادشاہ۔ وہ آخری سوال کا جواب دینے سے انکار کرتے تھے؟

جلاد۔ وہ بولے۔ لیکن مہمل۔ فضول۔

بادشاہ۔ انہوں نے کیا کہا؟

جلاد۔ جو کچھ انہوں نے کہا وہ بادشاہ کی سماعت کے سزاوار نہیں ہے۔

بادشاہ۔ کیا کہا انہوں نے؟

جلاد۔ مہمل۔ فضول۔

بادشاہ۔ کیا ان کا کہا کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔؟

جلاد۔ وہ بولے۔ لیکن حضور پرنور کے گوش مبارک کے لئے ان کے الفاظ موزوں نہیں۔

بادشاہ۔ بولو۔ بتاؤ۔ انہوں نے کیا کہا؟

جلاد۔ جو پجاری میرے حوالے کیا گیا تھا۔ اس نے کہا "جو شخص دیوتاؤں کے مشورے کی قدر کرتا ہے۔ ان دیوتاؤں کے مشورے کی جو مستقبل کے متعلق جو کچھ جانتے ہیں وہ کبھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ بادشاہ کو زہر آلود پیالہ پینے کا پیغام دیکر انہوں نے غلطی کی تھی"۔ اس کے بعد میں نے سیدھے سادے طریق پر سوال پوچھا اور وہ مرگیا۔

بادشاہ۔ دیوتا! اس نے دیوتاؤں کا نام لیا۔

دوسرا جلاد۔ اے بادشاہ۔ دوسرے پجاری نے بھی یہی کہا۔

بادشاہ۔ سوال ان سے علیحدہ کمروں میں پوچھے گئے تھے۔

پہلا جلاد۔ میں نے پجاری کو "سرخ کمرے" میں بند کیا تھا۔

دوسرا جلاد۔ اور میں نے "تہوں کے کمرے" میں۔

بادشاہ۔ جاؤ۔

جلاد چلے جاتے ہیں۔

بادشاہ۔ تو یہ پیغام دیوتاؤں کا تھا۔

زیر لب بڑبڑانے لگتا ہے۔

بادشاہ۔ دیوتا! دیوتا! انہوں نے مستقبل میں کیا تاریک اور خوفناک راز پنہاں کر دئے ہیں۔ مستقبل قبر سے زیادہ خوفناک اور مہیب ہے۔ قبر میں صرف ایک راز ہے۔ اور مستقبل رازوں کا مدفن۔ پجاری کہتے ہیں کہ دیوتاؤں کے خیال میں میرا اس وقت مرجانا اچھا ہوتا۔ آہ! دیوتا کیا دیکھ رہے ہیں؟ ان کے سامنے کیا ہے جو میری نظروں سے پوشیدہ ہے۔ تقدیر تنہا بیٹھی ہے۔ اور برے دن تخلیق کر رہی ہے۔ ہاں! میں ان آدمیوں کو جانتا ہوں جن کو دیوتاؤں نے پہلے سے میری طرح متنبہ نہیں کیا۔ وہ یکایک چکنا چور ہو گئے۔ جس طرح نازک کشتی پتھر سے ٹکرا کر چکنا چور ہو جاتی ہے۔ آہ! دیوتا! ان لوگوں کے لئے زہر کا پیالہ پی لینا بہت زیادہ خوش گوار ہوتا! دیوتاؤں نے مجھے اشارتاً مر جانے کے لئے کہا۔ اور میں نے ان کا کہا نہ مانا۔ اب میں مستقبل کے راستے پر تنہا چل رہا ہوں۔ خطرناک تاریک مستقبل۔

کیا کروں!

دوسرے پیالے کی طرف دیکھتا ہے۔

اب بھی وقت باقی ہے۔ پیالہ خوابوں کی دنیا کی طرح شیریں اور مبہم سا نظر آتا ہے۔ خوابوں کی دنیا۔ طلسمی شیریں مبہم۔

بادشاہ دوسرا پیالہ اٹھا کر غٹ غٹ چڑھا جاتا ہے۔

سیاست دان داخل ہوتا ہے اور بادشاہ کے ہاتھ سے پیالہ چھین لینا چاہتا ہے۔ لیکن بادشاہ کے ہاتھ۔ اس کے بازو۔ اس کا جسم سب سخت ہو چکے ہیں۔ موت کی سختی ان پر چھا گئی ہے۔

سیاست دان۔ آہ!

باہر نکل کر اعلان کرتا ہے

بادشاہ ناگہاں مرگیا۔ خدا بادشاہ زربادنیر کو سلامت رکھے۔

پردہ گرتا ہے۔

عابد

ہسپانوی حسن

پھول اور تتری

سبزہ زار

فلسفۂ یونان ماقبل افلاطون

اگر آپ یورپ کے نقشہ کی طرف دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یونان ایک انسانی ہاتھ کی طرح ہے۔ جس کی انگلیاں بحیرۂ روم میں پھیلی ہوئی ہیں، اُس کے جنوب میں جزیرۂ کریٹ واقع ہے۔ جہاں سے تہذیب و تمدن کی شعاعیں یونان پر چمکی تھیں۔ مشرق میں بحر ایجین کے اُس پار، ایشیائے کوچک واقع ہے۔ آجکل یہ خطہ اقتصادی لحاظ سے پست حالت میں ہے۔ لیکن افلاطون سے پہلے یہ ملک تجارت، صنعت، اور فلسفہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مغرب میں، آیونین کے اُس پار، ملک اٹلی واقع ہے۔ اس کے جنوب میں جزیرۂ صقلیہ ہے۔ شمال میں تھسلی ایپا یرئس اور مقدونیا کے صوبے واقع ہیں جو اس زمانہ میں نیم مہذب اور جنگجو اقوام کا مسکن تھے۔

یونان کا ساحل بیحد شکستہ ہے جس کی وجہ سے قدم قدم پر خلیجیں اور کھاڑیاں بن گئی ہیں۔ سطح اندرونی عموماً مرتفع ہے۔ جابجا پہاڑیاں اور پہاڑ پائے جاتے ہیں۔ ان دونوں باتوں کی وجہ سے یونان کا ملک بہت سے قدرتی حصوں میں منقسم ہوگیا ہے اور اس زمانہ میں بمقابلۂ حال، آمدورفت اور باہمی رسم و راہ کا سلسلہ بیحد دشوار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر خطہ میں ایک مستقل حکومت اور جداگانہ اقتصادی۔ تمدنی، معاشی اور مذہبی دستورالعمل قائم ہو گیا۔ رفتہ رفتہ جسقدر مشہور اور بڑے بڑے شہر تھے۔ سب کے سب مستقل حکومتوں کا مرکز بن گئے۔ ان شہری مملکتوں میں سے ایوبیا۔ لوکرس۔ ایٹولیا۔ فوکس۔ بوشیا۔ ایکیا۔ آرگاس۔ ایلس۔ آرکیڈیا۔ سینیا۔ لیکونیا (جس میں اسپارٹا اور اٹیکا۔ جس میں ایتھنز واقع ہے) زیادہ مشہور ہیں۔ ایتھنز جو آئندہ چلکر یونان کا علمی مرکز بنگیا۔ مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ گویا یہ وہ دروازہ ہے۔ جس میں ہوکر اہل یونان، مشرقی فتوحات کی طرف متوجہ ہوئے، اور اسی میں ہوکر مشرقی صنعت و حرفت اور سامان آسائش یونانی گھروں میں پہونچتا تھا۔ اس کی بندرگاہ نہایت عمدہ تھی جس کو پائیریس کہتے تھے اور اس میں ایک دو نہیں بوقت ضرورت سیکڑوں جہاز پناہ لے سکتے تھے۔ یونانیوں کا جنگی بیڑہ بھی اسی میں پڑا رہتا تھا۔ سنہ ۴۹۰ء تا ۴۸۰ ق م میں ایتھنز اور اسپارٹا نے قدیمی رقابت کو بالائے طاق رکھکر ایرانی افواج کو پے در پے شکستیں دیں اور دنیا کو دکھا دیا کہ مٹھی بھر انسان اگر ہمت کر جائیں تو ناممکن کو ممکن بنا سکتے ہیں اگر یونانی پسپا ہوجاتے تو غالباً دنیا کی آئندہ تاریخ قطعاً بدل جاتی۔ یونان کے علاوہ اور کوئی طاقت اس وقت یورپ بھر میں ایسی نہ تھی جو ایرانی تلوار کی تاب لاسکتی لہذا ایشیا۔ یورپ پر بے غل و غش حکمران ہوجاتا۔ بہرکیف بعد اختتام جنگ، اسپارٹا نے اپنی فوج برطرف کردی۔ لیکن ایتھنز نے اپنے جنگی بیڑے کو تجارتی کاموں پر لگا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ کے بعد اسپارٹا تو پھر قدیمی حالت پر آگیا۔ لیکن ایتھنز تجارت کی بدولت طاقتور اور مالدار ہوگیا علاوہ بریں، مختلف ممالک کے باشندے تجارت کے سلسلہ میں یہاں آنے جانے لگے جن سے میل جول کی وجہ سے قدرتی طور پر ایتھنز کے باشندوں میں عقلی سرگرمی علمی بیداری اور ذہنی ترقی کا آغاز ہوگیا۔

ان حالات میں جبکہ مختلف اقوام باہمد گر ارتباط پذیر ہوتی ہیں لوگ محض روایات اور افسانوں کو مدار یقین نہیں بنایا کرتے بلکہ انہیں تحقیق و تدقیق کا مادہ پیدا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ ایتھنز میں بھی یہی ہوا۔ یہاں مختلف مذاہب اور خیالات کے لوگ ایک جگہ اکٹھے ہوتے تھے۔ باہمی تبادلۂ خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں "تشکیک" کا رنگ جھلکنے لگا۔ قاعدہ کی بات ہے کہ جب ایک شخص کے سامنے مختلف اقسام کی سو پچاس چیزیں ڈالدی جائیں تو وہ ان میں سے کسی کو بھی بآسانی انتخاب نہیں کرسکتا۔ ایتھنز میں بھی بہت سے مذاہب اور خیالات موجود تھے۔ اس لئے یہ کہنا بعید از قیاس نہیں کہ طبقہ تجار میں سب سے پہلے لاادریت پھیلی ہوگی۔ ان لوگوں نے مختلف ممالک میں مختلف مذاہب اور طریقے دیکھے ہونگے۔ اس لئے حیران رہ گئے ہونگے کہ کسے رد کریں اور کسے قبول کریں اور چونکہ سوداگر پیشہ لوگ بآسانی دوسروں کی باتوں پر اعتبار نہیں کرتے؛ اس

لئے انہوں نے ہر مذہب کے متعلق شکوک وشبہات ظاہر کئے ہونگے۔ گویا یونان میں سائینس کی بنیاد انہی لوگوں کی بدولت پڑی کیونکہ ہر چیز کو دیکھ اس کے متعلق سوالات پیدا کرنا ہی سائینس کی ابجد کہلاتی ہے۔ شرح مبادلہ کی روز افزوں پیچیدگیوں کے باعث ریاضی کی نشوونما ہوئی۔ جہازرانی کی بدولت ہیئت کو ترقی ہوئی۔ دولت کی فراوانی نے لوگوں کو اسقدر سکون اور فرصت عطا کی کہ تنہائی میں بیٹھکر زمین وآسمان کے متعلق غور وفکر کر سکیں۔ چنانچہ لوگوں نے اب محض جہازرانی ہی کی خاطر ستاروں کی چال پر غور نہیں کیا بلکہ اس لئے بھی کہ شاید معمائے کائینات کے حل کرنے میں ان سے مدد مل سکے۔ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ اولین یونانی فیلسوف، ہیئت داں بھی تھے۔ ارسطو لکھتا ہے۔ "ایرانیوں کو شکست دینے کے بعد یونانیوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ انہوں نے "علم وحکمت" کو اپنی ملکیت سمجھ لیا۔ اور ہر فن میں غور وفکر کرنا شروع کردیا۔ پہلے جن باتوں کو دیوتاؤں سے منسوب کیا جاتا تھا۔ اب ان کی تشریح عقلی طور پر ہونے لگی۔ جادو اور منتر کی جگہ فلسفہ اور سائینس سے کام لیا جانے لگا۔ یعنی علمی زندگی پیدا ہوگئی۔

شروع میں، فلسفہ زیادہ تر طبیعاتی مسائل ہی تک محدود تھا۔ لوگ جب اس مادی دنیا پر نظر ڈالتے تھے تو یہی سوال انکے دل میں پیدا ہوتا تھا کہ اشیائے مادی کس چیز سے بنی ہیں؟ رفتہ رفتہ اسی سلسلۂ خیال سے دیمقراطیس کے فلسفہ کا ظہور ہوا جس نے یہ رائے ظاہر کی کہ کائینات میں سالمات اور خلاء کے سوائے اور کچھ نہیں جو کچھ ہو رہا ہے سب انہی سالمات مادہ کا کرشمہ ہے اور یہ سالمات ایسے ہیں کہ تقسیم نہیں ہوسکتے۔ اسی لئے ان کو اجزائے لایتجزیٰ کہتے ہیں۔ یہ فلسفہ مادیت یعنی (materialism) کے نام سے موسوم ہے۔ اگرچہ ارسطو اور افلاطون کی وجہ سے یہ فلسفہ کچھ عرصہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ لیکن جب افلاطون کے خیالات کا زور کم ہوا، تو پھر از سر نو ابھرا۔ ابی قورس سنہ ۳۴۲ تا ۲۷۰ ق م اور لکریشئیس سنہ ۹۸ تا سنہ ۵۵ ق م اس فلسفہ کے بڑے زبردست حامی گزرے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ مادہ پرستی خدا پرستی کے ساتھ ساتھ چلی آرہی ہے۔ ہر زمانہ میں اس کے حامی موجود رہے ہیں۔ تفصیل کے لئے تاریخ مادیت مولفہ لینگ کا مطالعہ مفید ہوگا۔

لیکن یونانی فلسفہ کا خصوصی نشوونما، سوفسطائیوں کے خیالات کی بدولت ہوا۔ یہ پہلے حکما ہیں جنہوں نے مادہ اور طبیعات، ہیئت اور ریاضی، سب سے یکسو ہوکر اپنی توجہ تمامتر نفسیات اخلاقیات اور مابعد الطبیعات پر مبذول کی۔ اس طبقہ میں گورجیاس، ہپیاس، پروٹاگورس اور پراڈیکس بہت مشہور فلاسفہ گزرے ہیں۔ جنہوں نے تمام فلسفیانہ مسایل میں عجیب وغریب موشگافیاں کی ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق ان لوگوں نے خامہ فرسائی یا حاشیہ آرائی نہیں کی ہے۔ مختصر طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ ان لوگوں نے خدا سے لیکر چیونٹی تک ہر چیز کو محل بحث و تمحیص قرار دیدیا تھا۔ وہ کون سی شے ایسی تھی جس کے متعلق انہوں نے سوالات نہیں کئے؟ اگر ان میں کوئی عیب تھا تو یہ کہ انہوں نے فلسفہ جیسے شریف اور پاکیزہ فن کو، روٹی کمانے کا آلہ اور عوام پر اپنی قابلیت ثابت کرنے کا ذریعہ بنالیا۔ یہ لوگ بیخوف وخطر ہر قابل اعتراض بات پر اعتراض کردیتے تھے ہر بات کے متعلق سوالات پوچھ بیٹھتے تھے۔ مذہبی اور سیاسی کسی جماعت سے انکو ہراس نہ تھا جملہ عقاید مروجہ کو عقل کی کسوٹی پر کسنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ خواہ کوئی برا مانے یا بھلا۔ سیاسیات میں یہ لوگ دو گروہوں میں منقسم تھے۔ ایک گروہ جس کا حامی روسئیو گزرا ہے۔ یہ کہتا تھا کہ فطرت نیک اور اچھی ہے۔ لیکن مروجہ تمدن مذموم اور موجب خرابی ہے۔ فطرت کی رو سے جملہ بنی نوع آدم مساوی الدرجہ ہیں۔ یہ امتیازات، فطری نہیں ہیں بلکہ خود غرض افراد نے قائم کئے ہیں۔ اور قانون کچھ نہیں مگر کمزوروں پر حکومت کرنے کا آلہ۔ دوسرے گروہ کا، جس کی تقلید نیٹشا نے کی ہے، یہ خیال تھا کہ "فطرت" نہ اچھی ہے نہ بری اور فطرت کی رو سے تمام انسان غیر مساوی الدرجہ ہیں۔ اور اخلاق کچھ نہیں مگر زبردستوں پر قیود عاید کرنے کا ذریعہ۔ "طاقت" سب سے بڑی انسانی خوبی ہے۔ اور سب سے اعلیٰ انسانی خواہش ہے۔ اور اشرافیت بہترین طرز حکومت ہے۔

سنہ ۴۳۱ ق م سے لیکر سنہ ۴۰۴ ق م تک ایتھنز اور اسپارٹا باہم برسرپیکار رہے۔ بالآخر اسپارٹا کو فتح ہوئی۔ اس پر ایتھنز میں معدودیت کے حامیوں نے جمہوریت کے مٹانے کی تحریک

کی یہ طرزِ حکومت میدان جنگ میں ناکامی کا موجب ہوئی ہے اس تحریک میں ایک دولتمند شخص کیریناز نامی پیش پیش تھا۔ یہ شخص سقراط کا شاگرد تھا۔

سقراط

اگر ہم سقراط کی اس تصویر کی طرف دیکھیں جو فلارنس کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ تو ہم کو معلوم ہوگا کہ اگرچہ یہ حکیم، بلحاظ صورت دلکش نہ تھا لیکن سیرت ایسی پاکیزہ پائی تھی کہ یونانی عموماً اور ایتھنز کا نوجوان طبقہ خصوصاً اس کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ اگرچہ سقراط کے سوانح حیات، انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ لیکن افلاطون اور دوسرے مصنفین نے جو کچھ بھی اس کے متعلق لکھا ہے۔ وہ اسقدر صحیح اور واضح ہے کہ جب ہم ان تحریروں کو پڑھتے ہیں تو سقراط کی شکل ہوبہو ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

آج سے تیئس سو ۲۳۰۰ سال پہلے، ایک معمر شخص جس کا حلیہ یہ تھا "اونچا ماتھا۔ چندیا صاف۔ گول اور بارعب چہرہ، تیز نگاہیں۔ پھیکی ناک، موٹے موٹے ہونٹ، گویا دیکھکر یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص کوئی حمال یا باربردار ہے" لبادہ اوڑھے ہوئے، بلاتکلف ایتھنز کے بازاروں میں پھرا کرتا تھا، نوجوانوں کا جھمگٹا اس کے چاروں طرف لگا رہتا تھا، اور وہ ان سب کو گھیر سمیٹ کر کسی باغ یا سایہ دار مقام میں لیجا کر، یا تو عقل و حکمت کی باتیں سناتا تھا یا ان سے سوالات کیا کرتا تھا کہ جو مصطلحات تم لوگ استعمال کرتے ہو ذرا اُن کی تعریف تو کرو۔ یہ شخص سقراط تھا جو فلسفۂ یونان کا باوا آدم ہی نہیں ہے بلکہ سچائی کی راہ میں پہلا شہید اور جان نثار بھی ہے۔

یہ نوجوان جو دن رات سقراط کی صحبت میں رہتے تھے اور جن کی بدولت یورپین فلسفہ کی بنیاد قائم ہوئی۔ مختلف طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے بعض تو مالدار تھے مثلاً افلاطون اور السیبائیڈیز جو سقراط کی جمہوریت کے خلاف طنز آمیز گفتگو کو مزے لیکر سنتے تھے۔ بعض اشتراکی تھے مثلاً اینٹسٹھینیز جو اُس کی سادہ اور غریبانہ زندگی پر فریفتہ تھے۔ اور اس کے نقوش قدم پر چلنے کو دین و ایمان سمجھتے تھے۔ بعض انارکسٹ تھے۔ مثلاً ایرسٹیپس جو اُس حکومت کے خیالی پلاؤ پکایا کرتے تھے جس میں نہ کوئی حاکم ہوگا نہ کوئی محکوم بلکہ سب لوگ اُسی طرح تفکرات سے آزاد ہونگے۔ جیسے سقراط تھا۔ وہ تمام مسایل، جن کی بدولت متمدن دنیا میں آج بھی ایک طوفان بے تمیزی برپا ہے، اور جن کی بدولت غیر مختتم بحثوں کا سلسلہ چھڑا ہوا ہے۔ اُس زمانہ میں بھی نوجوانوں کے دل و دماغ میں جاگزیں تھے اور وہ لوگ اس پر یقین کامل رکھتے تھے کہ زندگی کا سارا لطف، بحث و مباحثہ ہی میں منحصر ہے۔

سقراط کی بسراوقات کے ذرائع کسی کو معلوم نہ تھے۔ لیکن اس کا خرچ بھی کچھ نہ تھا۔ نہ پاؤں میں جوتی نہ سر پر ٹوپی، صرف ایک لمبا سا کرتہ یا چُغہ ستر پوشی کے لئے کافی تھا۔ جب وہ سال دو سال کے بعد بوسیدہ ہو گیا تو کسی شاگرد نے دوسرا نذر کر دیا۔ جب بھوک لگی تو کسی شاگرد نے کھانا کھلا دیا۔ بھلا کون شخص اس بات کو دل و جان سے پسند نہ کرتا ہوگا کہ سقراط اس کے یہاں ایک دو وقت کھانا کھالے اور اپنی دلچسپ گفتگو سے تمام حاضرین ضیافت کو محظوظ کر دے۔ ہاں دنیا میں اگر کوئی شخص اس کا روادار نہ تھا یا اس کو دیکھکر آگ بگولہ ہو جاتا تھا تو وہ اس کی زوجہ زینتھیپ تھی، جو اُسے ننگِ خلائق سمجھتی تھی اور کہا کرتی تھی کہ وہ بھی کیا آدمی، جسے اپنے بیوی بچوں کا خیال نہ ہو۔ انہی وجوہات کی بنا پر سقراط بہت کم گھر کے اندر جایا کرتا تھا۔ زینتھیپ بھی سقراط سے کچھ کم بولنے والی نہ تھی۔ اور جب کبھی میاں سقراط بھولے بھٹکے گھر کی طرف آنکلتے تو وہ ایسی کھری کھری سناتی تھی کہ سارا فلسفہ غایب ہو جاتا تھا۔ افسوس کہ افلاطون نے اور مکالمات تو قلمبند کئے مگر اُن مکالمات کو جو میاں بیوی کے درمیان ہوا کرتے ہونگے، بالکل نظر انداز کر دیا!!!

سقراط کے شاگرد، اس کی بیحد عزت کرتے تھے بلکہ اکثر اس کو دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا میں بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ سقراط علاوہ فیلسوف ہونے کے "مرد میدان" بھی تھا۔ پیلا پنیشین جنگ سنہ ۴۳ تا سنہ ۴۰ ق م میں یہ فلاسفر، ادنیٰ سپاہیوں کے دوش بدوش بارہا دادِ شجاعت دے چکا تھا، اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر السیبائیڈیز (صدر جمہوریہ ایتھنز) کی جان بچا چکا تھا، اور سب سے بڑھکر یہ کہ دوسرے حکماء اور فلاسفہ کی طرح اس کو اپنی علمیت پر کسی قسم کا گھمنڈ نہ تھا۔ وہ اس بات کا مدعی نہ تھا کہ مجھے کچھ آتا ہے یا میں اسرارِ کائنات کو حل کر سکتا ہوں بلکہ وہ اپنے آپکو محض ایک "طالب العلم" قرار دیتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ ڈیلفیک آریکل نے اُسے یونان میں سب سے زیادہ عقلمند آدمی قرار دیا تھا لیکن سقراط نے اس اعزاز کی تشریح یہ کی تھی کہ میں صرف ایک بات جانتا ہوں اور

وہ یہ کہ "کچھ نہیں جانتا۔"

جب کوئی [illegible] اپنے قدیمی معتقدات، حکیمانہ عقاید، اور مسلمہ اصولوں کی صحت میں شک کرنے لگتا ہے اور ان کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتا ہے۔ تو گویا فلسفہ کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جو باتیں آج مسلمہ طور پر داخل ایمانیات ہیں اُن کے متعلق یہ کس طرح یقین کر لیا جائے کہ جن لوگوں نے اُن کو مدار یقین بنایا تھا انہوں نے سب سے پہلے عقلی پہلو سے ان کی صحت کا امتحان کر لیا تھا؟ اکثر ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ ایک شخص ذاتی خواہشات کی بنا پر کسی بات کو مدار ایمان بنا لیتا ہے۔ اُس کے بعد، لوگ اس بات کو تقلیدی طور پر صحیح تسلیم کر کے داخل عقاید کر لیتے ہیں اور عرصہ دراز کے بعد وہ "خیال" "عقیدہ" بنجاتا ہے جن سے انحراف کرنا مستوجب عذاب اُخروی یقین کیا جاتا ہے۔ الغرض جبتک انسان اپنے تمام معتقدات کو عقل کی کسوٹی پر نہ پرکھ لے اس وقت تک "فلسفہ" کا وجود ثابت نہیں ہو سکتا، اور نہ کوئی شخص فلاسفر کہلا سکتا ہے۔ اسی لئے سقراط کا تکیہ کلام یہ تھا۔

"حقیقت خود بشناس"

سقراط سے پہلے بھی بہت سے فلاسفہ گزر چکے تھے۔ مثلاً طالیس انکزیمنڈر۔ انکزیمنز۔ فیثاغورث۔ زینوفینز۔ پارمینا ئیڈیز۔ ملی سس زینو۔ ہرقلیطوس۔ لیوسی پس۔ دیمقراطیس۔ ایمپیڈ اقلیز۔ انکساغورث ڈایوجینز۔ گورجیاس پروٹاغورث وغیرہ، لیکن اُن میں سے اکثر محض طبیعات سے بحث کیا کرتے تھے۔ یونانی فلسفہ کی ابتداء اس سوال سے ہوئی۔ "دنیا کی اصل ([illegible]) اور اُس کا ابتدائی اصول کیا ہے؟" یونانی حکماء اشیائے خارجی کی ماہیت، دریافت کرنے میں منہمک رہتے تھے۔ نیز یہ کہ اس مادی دنیا میں کون سے قوانین جاری و ساری ہیں جن کی بناء پر یہ کارخانہ چل رہا ہے؟

سقراط نے ان امور کے متعلق صرف اسقدر کہا کہ یہ باتیں سب اچھی ہیں۔ لیکن ایک بات ان سب سے اچھی ہے وہ یہ کہ "خود انسان کیا ہے؟" درختوں، ستاروں اور دریاؤں سے بڑھکر "انسانی دماغ" لائق توجہ ہے یعنی یہ امر لائق تحقیق ہے۔ کہ انسانی دماغ کن اصولوں پر کاربند ہے۔ اور کہاں تک اُس کی رسائی ہو سکتی ہے؟ یعنی انسان کی منزل مقصود کیا ہے؟

لہذا اُس نے اپنی توجہ تمامتر، روح انسانی کی ماہیت۔ خاصیت اور تاثیر دریافت کرنے، مفروضات و روایات کی قلعی کھولنے، اور معتقدات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے میں صرف کر دی۔ اگر لوگ "عدل وانصاف" کے متعلق بہت یاوہ گوئی کرنے لگتے تو وہ اُن سے آہستگی کے ساتھ پوچھتا " ? L T o T " "یعنی "عدل" کسے کہتے ہیں! "عدل" کی تعریف کرو۔ آخر تم لوگ جو رات دن اصطلاحات مجردہ مثلاً عدل۔ نیکی، عزت، اخلاق، وطنیت، وغیرہ استعمال کرتے رہتے ہو۔ ان کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ بلکہ "خودی" سے تمہارا کیا مطلب ہے! تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟ تم خود کیا ہو۔ فی الجملہ سقراط اسی قسم کے اخلاقی اور نفسیاتی سوالات کیا کرتا تھا۔

بعض لوگ جو اس اسلوب سقراطی کے زخم خوردہ تھے، یعنی جن لوگوں سے سقراط یہ کہا کرتا تھا کہ بلا سمجھے بوجھے کوئی لفظ منہ سے مت نکالو وہ عام طور سے اس کے اوپر یہ الزام لگایا کرتے تھے۔ کہ یہ شخص بھی عجیب ہے! سوائے اعتراضات کرنے کے، اسے اور کچھ آتا ہی نہیں؟ پوچھتا بہت ہے بتاتا کم ہے، اور اس کے پاس آنے سے پہلے اگر دماغ میں دو شبہات ہوتے ہیں تو ملنے کے بعد دس ہو جاتے ہیں۔

بہرحال سقراط نے دو اہم سوالات کے جوابات نہایت معقول دئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ "نیکی کا اصلی مفہوم کیا ہے؟" دوسرا یہ کہ بہترین حکومت کی نوعیت کیا ہو گی؟" اور اس میں شک کیا ہے کہ اُس زمانہ کے نوجوانوں کی نظر میں ان سوالات سے بڑھکر اور کوئی سوال ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ سوفسطائیوں نے اُن کے معتقدات کو جو اولمپس کے دیوی دیوتاؤں سے وابستہ تھے، قطعاً زائل کر دیا تھا۔ اور اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اخلاقیات کے دستور العمل کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ کیونکہ جب خدا کا وجود ثابت نہیں تو پھر صرف ایک ہی بات کی پابندی کی ضرورت رہ جاتی ہے یعنی مروجہ قانون (Penal Code) کی۔ اس کے علاوہ جو جی میں آئے کرو۔ کوئی مواخذہ نہیں کر سکتا۔ صرف ملکی قانون کی پابندی کرتے رہو۔ باقی تمام معاملات میں آزاد ہو!!! ایتھنز کے نوجوانوں کا کریکٹر، اس تعلیم سے بھی بہت کمزور ہو گیا تھا کہ ہر شخص صرف اپنا ہی ذمہ دار ہے۔ دوسروں سے کوئی سروکار نہیں۔ اس انفرادیت ہی کی وجہ سے یہاں کے باشندے اسپارٹا والوں کے سامنے ہتھیار ڈال بیٹھے تھے۔ رہا حکومت کا مسئلہ، تو جو حالت ایتھنز میں اسوقت رونما تھی اس سے بدتر حالت کا تصور بھی مشکل ہے۔ مجلس مشاورت کیا تھی اچھی خاصی ڈبیٹنگ سوسائٹی تھی، مجلس منتظمہ میں دو نہیں، چار نہیں، پورے ایک ہزار ارکان شامل تھے اور ظاہر ہے کہ جب اسقدر انبوہ کثیر کسی امر کا فیصلہ

کرنے بیٹھیگا تو کسقدر طوالت پیدا ہوگی؟ یہی وجہ ہے کہ آجکل مجلس وضع قانون میں سو کی جگہ دو سو افراد شریک ہو سکتے ہیں لیکن مجلس منتظمہ میں چند نفوس سے زیادہ نہیں ہوتے کیونکہ جسقدر زیادہ مشیر ہونگے اُسی قدر زیادہ بحث و شنید ہوگی۔

الغرض سقراط کے زمانہ میں ایتھنز کی کیفیت یہ تھی کہ نہ تو وہاں کے باشندوں کے اخلاق درست تھے اور نہ وہاں کی طرز حکومت پسندیدہ تھی۔ سقراط نے ان دونوں خرابیوں کے انسداد کی تجویز پیش کی یا یوں سمجھئے کہ جو اہم سوالات اُسوقت وہاں کے سنجیدہ مزاج انسانوں کو بیچین کر رہے تھے۔ اُن کے جوابات باشندگانِ ایتھنز کی خدمت میں پیش کئے۔ اور انہی جوابات کی بدولت سقراط کو زہر کا پیالہ اور غیر فانی شہرت کا تاج نصیب ہوا۔

اگر سقراط اپنے متبعین کو مذہب سلف (بُت پرستی) کی طرف مائل کر دیتا اور ان کو مندروں میں لیجا کر مایصنعون[۴] کے سامنے جھکا دیتا، تو شہر کے تمام بڑے بوڑھے اُسے اپنا سرتاج بنا لیتے اور پاؤں دھو دھو کر پینے لگتے۔ لیکن اُن کی بدقسمتی کہ سقراط محبّ الآفلین[۵] میں سے نہ تھا بلکہ خدائے واحد کا پرستار اور "دینِ حنیف[۶]" کے نشہ میں سرشار تھا اور برخلاف عوام الناس کے، یہ یقین رکھتا تھا کہ "روحِ انسانی" مرنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ ان باتوں کے علاوہ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ حکومت کرنے کے اہل وہ لوگ نہیں ہیں جو محض اپنی قوتِ بیان سے لوگوں کو متاثر کر سکیں بلکہ وہ لوگ، جو دُور اندیش اور عقلمند ہوں، کیونکہ حکومت کے معاملات آنی اور وقتی نہیں ہوتے۔ اور جب تک طرزِ حکومت ایسے قوانین پر مبنی نہ ہو جو عامۃ الناس کی بہبودی اور ترقی کا باعث ہوں۔ اسوقت تک ملک میں بدنظمی ہی رہیگی اور کوئی شخص سچے دل سے اُن قوانین کی عزت نہ کر سکیگا۔

گویا سقراط نے مذکورہ بالا دونوں سوالات کا جواب اس پیرایہ میں دیا، جو رائے عامہ اور برسر اقتدار دونوں طاقتوں کے منشاء کے خلاف تھا۔ جماعت اشرافیت کے ارکان قلیل تعداد میں تھے اور اگرچہ یہ لوگ در پردہ سقراط کے طرفدار تھے لیکن ان کا زور نہ تھا۔ بہرکیف انقلاب برپا ہوا لیکن سقراط کی توقعات کے موافق اس کا نتیجہ جمہوریت کے حق میں نکلا۔ × × × ... اس نتیجہ کے ساتھ ساتھ سقراط کی قسمت کا بھی فیصلہ ہوگیا۔ میلی لٹس اور اینی لٹس، نمائندگانِ جمہور نے دارالعوام میں تقریریں کیں اور ایتھنز کے باشندوں سے کہا کہ اِس تمام خرابی کا ذمہ دار سقراط ہے۔ لہذا اُسے موت کی سزا دیجانی چاہیئے۔

الغرض ۳۹۹ ق م میں جبکہ سقراط کی عمر ستر سال کی تھی۔ اُسے اختلاف عقاید کی وجہ سے زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ افلاطون نے یہ تمام واقعات نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اس لئے اُن کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ سقراط پہلا شخص ہے جس نے جان دینی قبول کی۔ مگر اپنے معتقدات سے سرمو انحراف نہ کیا۔ اور اسی لئے جب تک دنیا قائم ہے اس کی شاندار قربانی، صاحبدلوں سے خراجِ تحسین وصول کرتی رہیگی۔

حواشی متعلقہ مضمون ھذا:-

[۱] ہمارے زمانہ میں بھی منطق سے یہی کام لیا جاتا ہے۔ ہندوستانی مناظرین اس شریف فن کو احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لئے استعمال نہیں کرتے بلکہ محض عوام کے قلوب پر اپنی علمیت اور قابلیت کا سکہ جمانے کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ مناظروں اور مباحثوں سے کوئی خاص فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔ مناظرہ ختم ہونے کے بعد ہر فریق اپنے ہی آپ کو فتحمند سمجھتا ہے۔ ۱۲۰

[۲] روسیو ۱۷۱۲ء میں بمقام جینوا پیدا ہوا تھا۔ اس کی تصانیف نے کینٹ کو بیحد متاثر کیا۔ جس کا خود اس کو اعتراف ہے۔ روسیو اپنے زمانہ کی کلیسائی حالت سے بہت بیزار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رومن کیتھولک اُسے لامذہب قرار دیتے ہیں ۱۷۷۸ء میں وفات پائی۔ ویبر لکھتا ہے کہ روسیو ایک مخصوص "روحانی" مذہب کا پابند تھا۔ اور "نیچر" کو خدا کا مظہر یقین کرتا تھا۔ اس کی تصنیفات فلسفۂ اخلاقیات۔ تمدن و معاشرت، اور اقتصادیات و سیاسیات جملہ فنون پر حاوی ہیں اور فرانس پر اُن کا بہت گہرا اثر پڑا تھا۔

[۳] یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے ؎ سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم (میر درد)

[۴] لفظی معنی ہیں "جو کچھ وہ (اپنے ہاتھوں سے) بناتے ہیں" مراد اصنام وغیرہ۔

[۵] لفظی معنی ہیں "غروب ہو جانے والوں کو دوست رکھنے والا" مراد اصنام پرست۔

[۶] دینِ حنیف سے مراد وہ مذہب جس میں کسی قسم کی کجی نہ ہو۔ یعنی وہ مذہب جو انسان کو خالص خدا پرستی کی تلقین کرے اس

کی تعریف قرآن مجید نے یوں فرمائی ہے " فاقم وجھک للدین حنیفا، فطرت اللہ لتی فطر الناس علیہا، لاتبدیل لخلق اللہ، ذالک دین القیم، ولکن اکثر الناس لایعلمون ۵ یعنی انسان کو لازم ہے کہ اپنا مُنہ " دینِ حنیف " کی طرف کرے یعنی اللہ تعالیٰ کی فطرت پر کاربند ہو جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کی پیدائش میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی یہی سچا اور قائم رہنے والا دین ہے لیکن بہت سے لوگ اس حقیقت کبریٰ سے ناواقف ہیں۔ "

پروفیسر یوسف سلیم

امواج وساحل

اسقدر خشک لب ہے کیوں ساحل — خستہ تن، ناتواں، شکستہ دل

کس لئے بیقرار ہیں موجیں؟ — مضمحل، دل فگار ہیں موجیں

رات دن جھیلتی ہیں وہ کڑیاں — کاٹتی ہیں عذاب کی گھڑیاں

لعل و گوہر سے کھیلتی ہیں وہ — اس پہ بھی رنج جھیلتی ہیں وہ

ان کے دل میں ہزار ارماں ہیں — ان کے سینے میں لاکھ طوفاں ہیں

چاہتی ہیں کہ مار کر شبخوں؛ — لوٹ لیں ساغر و خمِ گردوں

بند کردیں نجوم کی آنکھیں — طشتِ زر ماہتاب کی لُوٹیں

ساحلِ پیر بھی ہے ان کے ساتھ — اور ہاتھوں میں ان کے ڈالے ہاتھ

گھورتا ہے سہیل و پرویں کو — اور فلک کی بساطِ رنگیں کو؛

چاہتا ہے کہ اوجِ ماہ ملے — محفلِ ناز میں پناہ ملے؛

ماہ و زہرہ سے ہم بغل ہو وہ؛ — کہکشاں ہو دمن تو نل ہو وہ

(غیر مطبوعہ) کلیم

عزیز کسان بارگاہ ایزدی میں مضمحل صورت بنائے کھڑا تھا۔ مقدس فرشتے حلقہ کئے ہوئے تھے۔ آواز آئی لاؤ! لاؤ! اس بندے کو آگے لاؤ۔ عزیز آگے بڑھا۔ فرشتوں کے پر پھڑ پھڑا اٹھے۔ کسان آگے بڑھا۔

"ظلم۔ الٰہی ناقابل برداشت ظلم۔ زندگی کے ستائیس سال۔ صرف ستائیس۔ پروردگار! پہلے بارہ سال کیسے تھے؟ کاش وہی زندگی ہوتی۔ اُس سے اگلے تین سال۔ آہ! کیا خوشگوار دن تھے۔ ہر قدم پر نئی امنگ، نیا ولولہ۔ آخری بارہ سال۔ پروردگار کیا کچھ کہنے کی ضرورت ہے۔ تو جانتا ہے الٰہی۔ یہ دن کس طرح گزرے؟ کونسی مصیبت تھی جس سے میں دوچار نہ ہوا۔ آہ کس قدر دل گداز تھا آخری دن میں بستر مرگ پر دم توڑ رہا تھا۔ قرض خواہ گھر کا سامان نیلام کرا رہے تھے۔ بارہ سال یوسف کے کھیت تھے۔ اور میں نفع اور محنت کی یہ کونسی تقسیم تھی۔ کہ سب کچھ یوسف کی نذر ہوتا تھا۔ اور میں فاقے پر فاقہ کرتا تھا ——— انصاف! الٰہی انصاف ———!" فرشتے نے نامۂ اعمال پیش کیا۔

ایک چوری .... قدیر کے کھیت سے گھاس ...... ایک گناہ جسکی تلافی بھی دنیا ہی میں ہوگئی .... اور موت! کسان کانپ گیا۔ مقدس فرشتے ٹکٹکی باندھے ہوئے عزیز کی طرف دیکھ رہے تھے۔

خداوند کائنات کی بارگاہ میں قہقہے کی ایک گونج بلند ہوئی۔ اور آواز آئی لے جاؤ! اس مظلوم بندے کو! یوسف کو بلاؤ ———!

(۲)

یوسف بارگاہِ خداوندی میں حاضر تھا۔ سر جھکا ہوا۔ اس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ مقدس فرشتے اُسے گھسیٹے ہوئے اور آگے لے گئے۔ پُرجلال آواز آئی، نامۂ اعمال!

مقدس فرشتہ بڑھا۔ یوسف نے نامۂ اعمال اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ ایک طرف سے بالکل سیاہ دوسری جانب سے کہیں کہیں سفید ——— یوسف نے جھٹ نامۂ اعمال دوسری طرف سے بدل کر پڑھنا شروع کیا۔

تین اپاہجوں کی مدد۔ مسجد کا چندہ۔ ماں کی خدمت! .... موت! بس تین ہی۔ صرف تین نیکیاں! اُف! یوسف لرز کر چپ ہوگیا۔ نامۂ اعمال اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ فرشتے اس کی جرأت پر حیران تھے۔ یکایک وہ متبسم ہوگئے۔ کاتب اعمال بڑھا۔ اس نے نامۂ اعمال پڑھا۔

پُرہیبت جلال آواز آئی۔ عزیز کو لاؤ۔ کسان اب قدرے آسودہ تھا۔ یوسف کو دیکھتے ہی چلایا۔ ہاں ہاں پروردگار یوسف یہی یوسف ہے۔ الٰہی! انصاف!

یوسف نے کسان کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر بولا۔ پروردگار حکومت کا خوف ان مظالم کا باعث ہوا۔ کسان اور یوسف چلے گئے۔

(۳)

بادشاہ مقدس فرشتوں کے حلقے میں کھڑا تھا۔ چہرے پر رعب وجلال نظر چاروں طرف منتشر۔ نامۂ اعمال پیش ہوا۔ قانون اور انصاف، نیکی، بہادری، موت کاتب اعمال خاموش ہوگیا۔

یوسف آیا۔ اور چلایا پروردگار۔ اس کا خوف میرے مظالم کا باعث تھا۔ اس کی حکومت کا خزانہ بھرنے کے لئے زیردستوں پر ظلم کئے۔

ایک قہقہہ ———! آواز آئی۔ نہیں! بادشاہ کا نامۂ اعمال بالکل صاف ہے۔

یوسف۔ عالم الغیب! بادشاہ خود روپیہ وصول نہیں کرتا۔ حاکم اور افسر ظلم ڈھاتے ہیں۔

یوسف چلا گیا۔ بادشاہ کو مقدس فرشتے ایک نامعلوم جگہ پر لے گئے۔

(۴)

اہلکار دربار خداوندی میں سرنگوں حاضر تھے۔ نامۂ اعمال پیش ہورہے ہے۔ کاتب اعمال وفاداری۔ انصاف پسندی۔ ضبط و انتظام کے ساتھ خود غرضی۔ بے جا سختی۔ رشوت اور حق تلفی کے واقعات بھی پڑھ رہا تھا۔

دلاور اہلکار کو آگے لاؤ ———! آواز آئی! اور ساتھ ہی

یوسف حاضر ہوگیا۔

دلاور! پروردگار وفاداری۔ انصاف پسندی ضبط و انتظام یہ تو میرے فرائض میں داخل تھے۔ باقی الزامات کی نسبت میرا ایک عذر ہے۔ صرف ایک عذر!

ہاں! ہاں!! کہے جاؤ۔

میرا ایک رشتہ دار عزیز جو غربت و افلاس کی زندگی بسر کر رہا تھا ایک روز قدیر زمیندار کے کھیت میں چوری کرتا ہوا پکڑا گیا۔ وہ میرے پاس آیا۔ میں نے مقدمہ اپنے ہاتھ میں لیا اور پروردگار اس کو بچانے کے لئے اور اس جرم کی تلافی کے لئے جو کچھ کیا وہ میرے نامۂ اعمال میں لکھا گیا۔ میں اپنے تعلقات سے مجبور تھا۔

ایک ہلکے سے قہقہے کے ساتھ آواز آئی۔ بلاؤ عزیز کو۔ عزیز حاضر تھا ——!

ناظرین —— ! آپ ہی بتائیں کہ خدا کیا فیصلہ کرتا ——؟

وقار (انبالوی)

سیرِ کوہسار

یہ ترا کیف آفریں جوشِ فراواں اے بہار!
یہ ہجومِ سبزہ و گل، یہ ہوائے فرح بار

یہ تری رعنائیاں کہسار کے آغوش میں
اب دلِ شوریدہ کا مشکل ہے رہنا ہوش میں

ہر طرف حدِ نظر تک اک صفِ کہسار ہے
دور، اونچی چوٹیوں پر برف کا انبار ہے

کوہ پر شبنم کا ہر قطرہ دُرِ نایاب ہے
اور دُرِ نایاب میں محفوظ اک مہتاب ہے

جھومتی ہیں ایک مستانہ ادا سے ڈالیاں
جھولتی ہیں یا اُمنگوں میں بھری متوالیاں

ہر شگوفے کی چٹک اک نغمۂ ہنگامہ ساز
شاخِ گل پر بلبلِ شوریدہ مصروفِ نیاز

نالۂ جانسوزِ بلبل کا وہ آنا جوش میں
دردبن کر پھر سما جانا دلِ مدہوش میں

کلکِ نقاشِ ازل کے نقش یعنی تتلیاں
چوستی پھرتی ہیں رس پھولوں کا ہو کر شادماں

یا مگر کچھ شوخ پریاں تتلیوں کے بھیس میں
آ گئی ہیں سیر کرنے آدمی کے دیس میں

یہ عروسانِ بہاری، یہ نقوشِ جاں نواز
یہ نشاط آور سماں، یہ عالمِ کیف و گداز

(غیر مطبوعہ)

(اختر انصاری دہلوی)

بھوک پیاس کا فلسفہ

بھوک کا احساس تمام حیوانات کی ایک عام، نمایاں، اور مشترک خصوصیت ہے۔ جب تک آدمی زندہ رہتا ہے یہ احساس اس کے اکثر کاموں پر اثر ڈالتا رہتا ہے۔ علماء کی رائیں اس امر میں مختلف ہیں کہ "کیا دوسرے حیوانات بھی اسی طرح بھوک محسوس کرتے ہیں جس طرح انسان محسوس کرتا ہے؟" لیکن اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو تاثرات زندگی پر تسلط ہوتے ہیں ان میں بھوک سب سے زیادہ اہم ہے اور اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔

اس شعور کی عمومیت کے باوجود ہمارا علم اب تک اس کی واقعی حقیقت دریافت کرنے سے قاصر رہا ہے۔ اس کی جزوی تفصیلات بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ جب ہم کہیں کہ پیٹ خالی ہونے کے احساس کا نام "بھوک" ہے تو دراصل ہم اپنے احساسات کی حقیقت بیان نہیں کرتے بلکہ اپنے اس علم کا اظہار کرتے ہیں کہ بھوک معلوم ہونے کے وقت معدہ غذا سے خالی ہوتا ہے۔

بھوک کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگرچہ معدہ مسلسل عرصہ تک خالی رہے لیکن بھوک معینہ وقفوں کے بعد اپنے اوقات پر "دورے" کی طرح معلوم ہوتی رہتی ہے۔ اکثر بھوک کے ساتھ کمزوری، سستی، دردِ سر، تشنج، متلی، اور بیہوشی کا بھی حملہ ہوتا ہے۔ لیکن تندرست آدمی اور وہ شخص جس کے قوائے عصبی مضبوط ہوتے ہیں۔ بھوک معلوم ہونے کے وقت ان عوارض سے محفوظ رہتا ہے۔

ہمیں جب بھوک لگتی ہے تو ہم غذا مانگتے ہیں کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ کھانا بھوک کی تکلیف سے نجات دیتا ہے۔ لیکن یہ ہمیں کیونکر معلوم ہوا؟ نوزائیدہ بچہ بھوک کے احساس کے وقت کھانے کی تاثیر سے ناواقف ہوتا ہے کیونکہ غذا ہنوز اس کے معدے میں داخل نہیں ہوئی ہے۔ پس اس حالت میں غذا طلب کرنے پر اسے کونسی چیز ابھارتی ہے؟ اسے موروثی احساس ابھارتا ہے! یا فطرت کا وہ جذبہ ابھارتا ہے جو اس میں ولادت کے وقت موجود ہوتا ہے۔ اور جس کے ذریعہ سے اُسے معلوم ہو جاتا ہے کہ کھانا اس تکلیف وہ احساس کو سکون و راحت میں تبدیل کر دیگا!

اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بھوک لگنے کا سبب پوری صحت کے ساتھ دریافت نہیں ہو سکا، لیکن اس کے متعلق ایک مشہور نظریہ ہے جسے نظریہ محیطی (peripheral) کہتے ہیں۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ بھوک کا سبب ایک خاص احساس ہے جو اعصاب جسیہ کے اطراف خصوصاً معدے کے بالائی حصوں اور چھوٹی آنتوں کے نچلے حصوں میں محسوس ہوتا ہے۔ مگر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بھوک کا احساس "دماغ میں بھوک کے مرکز" سے شروع ہوتا ہے۔ جیسے خون اور عروق دماغیہ میں غذا کی قلت متحرک کر دیتی ہے۔ تجربہ سے ثابت ہوا کہ غالباً معدے کے پورے طور پر طعام سے خالی ہونے سے کچھ دیر پہلے اور خون اور عروق دماغیہ میں غذا کی کمی سے بہت دیر پہلے بھوک لگنا شروع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تجربہ بتاتا ہے کہ بھوک کی تکلیف کے ساتھ اسی حالت میں ایک قسم کی شدید اینٹھن پیدا ہو جاتی ہے جو اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب سے معدہ غذا سے خالی ہونے لگتا ہے اور اس وقت تک مسلسل اس کے دورے پڑتے رہتے ہیں جب معدے میں کچھ داخل ہو جائے یا کسی غیر معمولی طریقہ سے اس کا تدارک ہو جائے مثلاً کوئی قوی جذبہ طاری ہو جائے یا کوئی دوا اپنی تاثیر سے معدے کی حالت تبدیل کر دے۔ اس اینٹھن کو "بھوک کی اینٹھن" کہتے ہیں۔

اس اینٹھن کا دورہ ایک معمولی انسان پر ہر آدھ گھنٹہ یا پون گھنٹہ کے بعد نصف منٹ کے لئے پڑتا رہتا ہے۔ معدے میں حس و حرکت کے کئی اعصاب ہوتے ہیں جن کی شاخیں مرکزی نظام عصبی سے پھوٹتی ہیں۔ مرکزی نظام کے ساتھ عصبی اتصال کے بالکل انقطاع پر بھی یہ اینٹھن باقی رہتی ہے اور آدمی ہر حالت میں بھوک کا احساس کرتا رہتا ہے۔ بھوک کی اینٹھن کے دورے نیند کی حالت میں بیداری کی بہ نسبت زیادہ شدت اور تسلسل کے ساتھ پڑتے ہیں۔ شدید جذبات مثلاً خوف، غصہ، یا خوشی سے یہ دورے رک جاتے ہیں۔ حالاتِ عقلیہ مثلاً مطالعہ اور غور و فکر بھوک کے

معدوں کی مدت میں کوئی خاص فرق پیدا نہیں کرتے۔ اسی طرح
—— عام اعتقاد کے خلاف —— کھانے کا دیکھنا اور اس
کی خوشبو سونگھنا بھی ان پر اثر نہیں ڈالتا بلکہ اگر ان امور کا کوئی اثر
ہوتا بھی ہے تو برعکس!!!

امتحان سے معلوم ہوا کہ خون کے عناصر کیمیائی میں سے جو عنصر
بھوک کے احساس اور بھوک کی اینٹھن پر اثر ڈالتا ہے وہ "شکر"
ہے جب خون میں شکر کی مقدار بہت کم ہو جاتی ہے تو بھوک زیادہ
معلوم ہونے لگتی ہے اسی طرح بالعکس۔ غالباً اس تشریح کے بعد
شکر اور دوسری میٹھی چیزوں سے فوراً بھوک کم ہو جانے کا سبب معلوم
ہونا مشکل نہ ہوگا۔ کیونکہ شکر فوراً خون میں شامل ہو جاتی ہے۔

ذیابطیس وغیرہ امراض میں بھوک کی شدت ہوتی ہے اور بخار اور
اور اکثر ہیجانات میں، جو نظام عصبی پر اثر ڈالتے ہیں، بھوک اڑ
جاتی ہے۔ مقویات کے استعمال سے اصولاً بھوک میں کوئی نمایاں
تغیر بلاواسطہ پیدا نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "اشتہا" غذا
کے متعلق ہمارے گزشتہ تجربات کی یاد کا نام ہے اور وہ ایک ایسا
احساس ہے جو صاحب احساس کو ایک لذت یاد دلا دیتا ہے۔

جب انسان طویل روزہ رکھے تو وہ معدے کی اینٹھن سے پیدا
ہونے والی بھوک کی تکلیف کو محسوس کرتا رہیگا۔ اس اینٹھن کا دورہ
فاقہ کی وجہ سے مرنے والوں پر زندگی کے آخری لمحوں تک پڑتا
ہے۔ اس لئے یہ قول کہ "چند دن کے روزے کے بعد بھوک
باقی نہیں رہتی" صحت سے خالی ہے اور واقعات اس کی تردید
کرتے ہیں۔

"بھوک" کے متعلق یہ ایک اجمالی بیان تھا اور اب ہم "پیاس"
کی نسبت چند الفاظ کہنا چاہتے ہیں:۔

انسان کے جسم میں ۷۰ فیصدی پانی ہے اور وہ کھانے کے
بہ نسبت پانی کا زیادہ شدت سے محتاج ہے۔ نہ صرف تندرستی کے
قیام اور حصول آسائش کے لئے بلکہ زندگی قائم کرنے کے لئے!
ایک اوسط درجہ کا تندرست آدمی بغیر کچھ کھائے ۴۰ دن تک زندہ
رہ سکتا ہے۔ اس مدت کے دوران میں اس کی قوت طبیعی تو آہستہ
آہستہ گھٹتی رہیگی مگر حالت اس حد تک نازک نہیں ہوگی جس سے
کسی خطرہ کا احتمال ہو۔ لیکن اگر پانی نہ دیا جائے تو دو یا تین دن کے
بعد حالت غیر ہو جائیگی، پھر حرارت کا درجہ بلند ہوتا جائیگا۔ اور غالباً
آٹھویں دن سے بارہویں دن تک مر جانا لازمی ہے۔

پیاس کے عوارض اپنے ظہور اور کیفیت کی شدت میں ہوا کے
درجۂ حرارت اور درجۂ رطوبت پر موقوف ہیں۔ کیونکہ انسان کے
جسم سے بہت سا پانی جلد کے راستے سے پسینہ بن کر اور سانس کے
راستہ سے بخارات بن کر ضائع ہوتا رہتا ہے۔ اسی بنا پر اگر ہم دیکھتے
ہیں کہ انسان و حیوان ثقیل اور خشک غذا سے جبکہ زیادہ مدت تک
"بغیر پانی" کے زندہ رہ سکتے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں
ہے کیونکہ گردے ...... خشک غذاؤں کے فضلات خارج کرنے
میں زیادہ پانی کے محتاج ہوتے ہیں۔

پیاس کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ نمایاں اثر یہ ہوتا ہے
کہ منہ اور حلق میں خشکی اور جلن محسوس ہونے لگتی ہے۔ پیاس کی زیادتی
کے ساتھ تمام جسم میں بے چینی اور گھبراہٹ بڑھ جاتی ہے جس کی وجہ سے
غیر معمولی ہیجان اور اضطراب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پیاس بجھانے
کے لئے پانی پی لینے کے علاوہ عمل کے ذریعہ سے معدہ یا موٹی آنت
میں، یا انجکشن کے ذریعہ سے براہ راست خون میں پانی پہنچایا جاسکتا
ہے۔ حلق اور سینہ میں پیاس کے احساس کو منہ اور ہونٹوں کے پانی
سے تر کر لینے سے وقتی طور پر تخفیف کیا جاسکتا ہے۔

پیاس کی اصلیت اور اس کے اسباب کے متعلق علماء کے تین
نظریے ہیں۔ یہ سب اس امر میں متفق ہیں۔ کہ جب زیادہ مدت تک
جسم میں نیا پانی نہ پہنچے تو خون میں خشکی یا گاڑھاپن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور
جب وہ کثیف ہو جاتا ہے تو اس کی خاصیتیں تبدیل ہو کر اس میں
زیادہ "شوریت" پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت وہ "خلایائے حسیہ"
سے پانی کھینچنا چاہتا ہے جسکی وجہ سے ان کے خواص متغیر ہو کر ساتھ
ساتھ تمام جسم کے نظام ترکیبی میں خلل پڑ جاتا ہے۔ یہ تغیرات لعاب دہن
پسینہ، پیشاب، رطوبت معدہ، اور آنسوؤں کی کمی بن کر نمودار
ہوتے ہیں۔ یہ گویا جسم کا ایک مطالبہ ہوتا ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے
کہ احتیاط کے ساتھ "مائیت" کی حفاظت کی جائے۔

جن نظریات کا تذکرہ کیا جاچکا ہے ان میں پہلا نظریہ یہ ہے
کہ لعاب دہن کی کمی سے خشکی پیدا ہو جاتی ہے جو منہ اور حلق میں اعصاب
حسیہ کے اطراف کو ہیجان میں لے آتی ہے اور یہی پیاس کا سبب ہے۔
دوسرا نظریہ یہ ہے کہ خون کا گاڑھاپن دماغ کے ایک مرکز کو متہیج
کر دیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ بہت سے اعصاب حسیہ میں بھی
ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس مذہب کے معتقدین منہ اور حلق میں خصوصیت
سے پیاس کے شدید احساس کا سبب بیان نہیں کر سکتے۔

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ پیاس اعضائے ہضمیہ میں ایک تشنج کی وجہ سے معلوم ہوتی ہے۔ جو خون کے گاڑھے پن سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ سب بجا ہے لیکن ظاہر ہے کہ درحقیقت صرف پہلا نظریہ ترجیح اور قبول کا مستحق ہے۔ کیونکہ جو دوائیں تھوک کو خشک کر دیتی ہیں مثلاً اتروپین، وہ پیاس بھی پیدا کرتی ہیں حالانکہ ان سے خون میں گاڑھاپن پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ اتروپین کھانے یا طویل تقریر کرنے کے بعد منہ میں جو عارضی خشکی پیدا ہوجاتی ہے وہ حقیقی پیاس نہیں ہوتی۔ نیز نمکین غذا کھانے کے بعد جو صحیح خواہش پیاس کی پیدا ہوتی ہے وہ لعاب دہن کم ہونے اور منہ اور حلق خشک ہونے سے بہت پہلے محسوس ہونے لگتی ہے۔

خیال غالب یہ ہے کہ پیاس کی شدت کے بعد حرارت کی زیادتی کا یہ سبب ہے کہ پسینہ نکلنا بند ہوجاتا ہے اور پسینہ کے افعال طبعی میں بالاتفاق حرارت جسمی کے تخفیف بھی شامل ہے۔ لیکن خون کا گاڑھاپن نظام عصبی اور دماغ کے خانوں میں ایک حد تک ہیجان کو زیادہ کر دیتا ہے۔ حرارت جسم کا اعتدال قائم رکھنے کے لئے دماغ میں ایک مخصوص خانہ ہے جسے "ثلاموس" کہتے ہیں اس لئے خون کا گاڑھاپن لازمی طور پر براہ راست اس میں اثر کرکے ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔

جو حالات جسم کی "مائیت" کے اتلاف میں زیادتی کا باعث ہوتے ہیں۔ وہ پیاس کو بھی زیادہ کر دیتے ہیں۔ خواہ یہ اتلاف پسینہ کے غدود کے راستہ سے ہو، خواہ معدہ کے راستہ سے مثلاً قے اور دست، خواہ گردوں کے راستہ سے مثلاً ذیابطیس!

(ترجمہ) **منظور سروش** (بھوپالی)

اشعار

(۱)

محبّت، عشق، یہ سب منزلیں ہیں راہِ عرفاں کی
جسے سمجھے ہو دردِ دل حلاوت ہے وہ ایماں کی

کتابِ عشق کا باب محبّت جب سے کھولا ہے
کتابِ عقل زینت بنگئی ہے طاقِ نسیاں کی

(غیر مطبوعہ) تپاںؔ

(۲)

ہوشیاری ہے فریبِ عاشقی کھانے کا نام
عاشقی ہے بند آنکھیں کرکے لُٹ جانے کا نام

قیس اور فرہاد نے تعظیم کا سجدہ کیا
بزمِ وحشت میں جو آیا تیرے دیوانے کا نام

سرفروشی عاشقی میں کامیابی کا ہے راز
شمع کل روتی رہی سُن سُن کے پروانے کا نام

خام کارِ عشق ہیں دلدادۂ شہرت ریاضؔ
عاشقی ہے بندہ پرور گُھٹ کے مرجانے کا نام

غیر مطبوعہ ریاضؔ

انقلاب

کمپنی باغ میں آج شاندار دعوت تھی۔ میں کپڑے پہن کر بالکل تیار باہر نکلا ہی تھا کہ دروازہ کے پاس ایک آدمی کو کھڑے پایا۔ کمزور۔ ضعیف و ناتواں آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے۔ کپڑوں اور چہرہ سے صاف غربت کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں بچکر نکلنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے میرے سامنے آکر نہایت لجاجت سے کہنا شروع کیا۔

"حضور کئی دن ہوئے قسم لے لیجئے جو کچھ بھی کھایا ہو۔ ایک دانہ بھی نہیں۔ سڑک پر رات بسر ہوتی ہے۔ سردی میں مرا جاتا ہوں مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ لوگوں نے نہ جانے کیوں جھوٹی جھوٹی شکایتیں کر کے مدرسہ سے نکلوا دیا۔ کچھ دے دیجئے۔ عنایت ہوگی"۔

میں نے اس کے لباس اور چہرے کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ اس کو سر سے لیکر پاؤں تک دیکھا مجھے یقین ہوگیا۔ میں نے اسکو کہیں ضرور دیکھا ہے۔ اس دوران میں وہ برابر کہتا رہا:۔

"مجھے مانگتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن مجبوری ہے کہیں نوکری بھی تو نہیں ملتی۔ بس کچھ دلوا دیجئے۔ پھر کبھی نہ مانگونگا"۔

میں نے اس کو اچھی طرح سے دیکھا۔ آخر مجھے یاد آگیا اور بول اٹھا۔

"تم بڑے مکار ہو جی۔ مجھے بھی دھوکہ دیتے ہو۔ ابھی ایک ہفتہ ہوا تم نے مجھ سے کچھ مانگا تھا اور کہا تھا میں اجنبی ہوں۔ وطن تک کا کرایہ چاہئے۔ جھوٹے بدمعاش"۔

"نہیں حضور نہیں ...... میں طالبعلم ہی ہوں، آپ مدرسہ سے دریافت کر سکتے ہیں۔ سرکار جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگرچہ مصیبت میں ہوں لیکن دھوکہ نہیں دینا چاہتا"۔

"فضول باتیں مت بناؤ۔ بکواس مت کرو۔ بدمعاش کہیں کے۔ کبھی اجنبی بنتے ہو۔ کبھی طالبعلم۔ کچھ کام نہیں کرتے اور اس طرح لوگوں کو لوٹتے ہو۔ بس ہٹو"۔

لیکن اس نے رونا شروع کیا "نہیں سرکار، خداوند۔ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ آپ تحقیق کر سکتے ہیں"

"جی ہاں اب میں تجھ سے پاجی کے لئے تحقیق کرتا پھروں۔ میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔ اگر تم جاؤگے نہیں تو پولیس کے حوالہ کر دونگا۔ سمجھ گئے"۔

میں اُسے دھکا دیکر آگے بڑھا۔ مجھے اس سے نفرت سی ہوگئی تھی۔ کتنا جھوٹا ہے۔ کذاب۔ لیکن اُس نے بھاگ کر میرا دامن پکڑ لیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"حضور معاف فرمائیے۔ میں واقعی جھوٹ بولتا تھا۔ نہ ہی طالبعلم ہوں نہ اجنبی، ایک سوداگر کے ہاں نوکر تھا۔ شراب پینے کی بری لت پڑ گئی۔ اُس نے مجھے نکال دیا۔ دربدر دھکے کھاتا پھرتا ہوں جھوٹ نہ بولوں تو کماؤں کہاں سے"۔

"ہاں اب تم صحیح راستہ پر آئے۔ کچھ کام کرو کام۔ دنیا میں ہزاروں قسم کے کام ہیں"۔

"ٹھیک ہے صاحب بالکل ٹھیک، لیکن کیا کام کروں کہاں، کوئی کام نہیں ملتا"۔

"جھوٹ۔ جھوٹ کی تو تم کو عادت پڑ گئی ہے۔ ہزاروں کام ہیں، ہزاروں، سنتے ہو۔ مزدوری کرو۔ بوجھ اٹھاؤ۔ کسی کارخانہ میں نوکری کر لو"۔

"حضور مجھے کوئی کام نہیں دیتا۔ کوئی نہیں۔ جہاں جاتا ہوں لوگ منہ پھیر لیتے ہیں۔ کوئی دستکاری بھی تو نہیں آتی۔ آہ مر جاؤں تو اچھا۔"

"اوہو۔ خوئے بدرا بہانۂ بسیار۔ سمجھتے ہو اس کا مطلب۔ تمہارے جیسے آدمی کے لئے ہزاروں بہانے ہو سکتے ہیں۔ اچھا برتن صاف کرنے کا کام کسقدر آسان اور سہل ہے"۔

"جی ہاں سہل اور آسان تو ہے۔ لیکن کوئی کام بھی ملے۔ بیٹھے ڈپٹی صاحب کے ہاں گیا کسی کو ضرورت نہیں ہے"۔

"اچھا ضرورت ہو یا نہ ہو۔ اگر تم کو یہ کام دے دیا جائے تو کر لوگے"۔

"کرنے کی ایک ہی کہی۔ دل و جان سے کرونگا"۔

میں نے گھر کی خادمہ عباسی کو آواز دی۔ دیکھو عباسی میں نے کہا۔ ان کو باورچی خانہ میں لے جاؤ۔ جتنے برتن ہیں یہ صاف کرینگے"۔ فقیر جھجکتا جھجکتا عباسی کے پیچھے ہو لیا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ اسے

کام کی رغبت نہیں ہے وہ صرف اسوجہ سے رضامند ہوگیا تھا کہیں پھر اس کو ڈانٹ نہ بتائی جائے اُسے نہ کام کا شوق تھا نہ مرنے کا ڈر۔ درحقیقت اس پر شراب کا اسقدر اثر تھا کہ اس کے تمام اعصاب کمزور ہو چکے تھے۔

میں نے دعوت میں جانا ملتوی کر دیا اور دوسری منزل کے ایک کمرہ میں چلا گیا تاکہ کچھ دیر کے لئے تمام کیفیت دیکھ سکوں۔

عباسی اسے باورچی خانہ کی طرف لے گئی لیکن وہ اس پر عجیب نظریں ڈال رہی تھی۔ سخت نفرت کی نگاہوں سے اُسے دیکھتی تھی اور اس کے پاس تک نہ جاتی تھی۔ وہ باورچی خانہ کا دروازہ کھولکر برتن نکالنے اندر چلی گئی۔

فقیر زمین پر بیٹھ گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ عباسی نے برتن لاکر زور سے زمین پر ٹپک دئے۔ فقیر برتنوں کو صاف کرنے لگا لیکن اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

میرا غصہ اب فرو ہو چکا تھا میں نے سوچا اس کڑاکے کی سردی میں اور اسقدر ظلم۔ لیکن پھر میں نے خیال کیا یہ اُسی کے فائدے کے لئے ہے۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد عباسی نے آکر کہا کہ برتن سب صاف ہوگئے۔ میں نے ایک روپیہ عباسی کی طرف پھینک کر کہا یہ اُسے دیدو اور کہو دوسرے تیسرے دن آجایا کرو۔

اب فقیر دوسرے تیسرے دن آجاتا۔ کبھی برتن صاف کرتا۔ کبھی لکڑیاں چیرتا کبھی فرش وغیرہ صاف کرتا۔ اس کے معاوضہ میں کبھی اسے پیسے مل جاتے، کبھی کھانا اور کبھی کپڑے۔

چندماہ کے بعد دو سال کے لئے مجھے لکھنؤ جانا پڑا۔ اسٹیشن تک اسباب وہی فقیر اٹھاکر لے گیا۔ جب گاڑی میں اسباب رکھا جا چکا تو میں نے اس سے پوچھا تمہارا نام کیا ہے۔

"حضور اس بدقسمت کا نام قمرو ہے"۔

"اچھا قمرو میں دیکھتا ہوں اب تم شراب نہیں پیتے اور میرے الفاظ کا تم پر کافی اثر ہوا ہے۔ اب تم کام سے جی نہیں چراتے۔ تمہیں معلوم ہے میں بمبئی جا رہا ہوں۔ اس لئے تمہارے لئے کوئی اور کام تجویز کرنا ہوگا۔ کیا تم لکھنا جانتے ہو؟"

"جی ہاں"۔

"اچھا یہ لو خط۔ ڈپٹی صاحب کے ہاں بلی ماراں چلے جاؤ جو تمہیں کام بتائیں محنت سے کرنا"۔

جب گاڑی روانہ ہوئی تو مجھے فخر تھا کہ میں نے ایک حیوان کو انسان بنا دیا ہے۔

دو سال کے بعد میں دہلی واپس لوٹا۔ اس روز الفنسٹن سینما میں ایک زبردست کھیل تھا۔ کھیل شروع ہونے میں کچھ دیر تھی میں ٹہلنے لگا۔ یکایک آخری دروازہ کے پاس ایک آدمی کو کھڑے دیکھا۔ اوہو یہ تو قمرو ہے۔ میں اس کے پاس گیا اور کہا "کہو قمرو اچھے تو ہو"

"اچھا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔ ڈپٹی صاحب آجکل تیس روپے تنخواہ دیتے ہیں"

"مجھے بڑی خوشی ہے" میں نے فخریہ کہا "میں نے ہی تمہیں انسان بنایا۔ کہو یاد ہے نہ؟"

"جی ہاں اچھی طرح یاد ہے۔ اگر آپ اسوقت میری مدد نہ کرتے تو اس وقت بھی اپنے آپ کو اجنبی یا طالع رہی بتاتا۔ لیکن گستاخی معاف آپ سے زیادہ مدد آپ کی خادمہ عباسی نے کی۔ اس نے مجھے نجات دلائی"

مجھے بہت غصہ آیا لیکن میں نے تحمل سے پوچھا۔ "عباسی نے۔ وہ کس طرح"

"جناب اس طرح جب میں آپ کے ہاں کام کرنے آتا تو وہ کہتی شرابی۔ بدقسمت۔ مرگیا ہوتا۔ بدنصیب۔ پھر مجھے سمجھاتی۔ تم مسلمان ہو، شراب پیتے ہو۔ خدا کے قہر سے ڈرو۔ اس کے بعد وہ میرے سامنے آبیٹھتی اور خوب روتی اور کہتی۔ او بدنصیب، آخرت میں بھی تو جہنم میں جائیگا اور اس دنیا میں بھی تیرا ٹھکانا جہنم ہی ہے۔ گنہگار۔ کمینے انسان۔ بس صاحب اس نے میری وجہ سے تکالیف اٹھائیں میری ہمدردی میں سچے آنسو بہائے اور ان سب سے بڑھکر وہ میری جگہ سب کام کرتی۔ سب کام اسی نے کیا۔ میں نے کبھی کسی کام کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ سب کام وہی کرتی۔ اسی کے اثر سے میں نے شراب سے توبہ کرلی۔ اس کے شریفانہ اور ہمدردانہ برتاؤ سے مجھ میں ایک انقلاب ہوگیا۔ عظیم الشان انقلاب۔ اسی نے میری اصلاح کی۔ مجھے آگ سے نکالا ...."

وہ کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ گھنٹی کی آواز آئی میں یہ کہتا ہوا وہاں سے روانہ ہوا "اچھا اب تو کھیل شروع ہونے والا ہے۔ پھر کبھی سہی۔"

سید نصیر احمد

قومی ملّاحوں کا گیت

(از قلم جناب فاخر ہریانوی بی۔ اے)

فرشتے اپنے نورانی پروں کو پھڑپھڑاتے ہیں — فضا کی وسعتوں میں زرد قندیلیں جلاتے ہیں
مناظر شام کی ظلمت میں غائب ہوتے جاتے ہیں — پہنچ جائیں گے ہم بھی رات سے پہلے کنارے پر

لئے جاتے ہیں اپنی ناؤ کو موجوں کے دھارے پر

شعاعیں اپنے عکسِ آتشیں پر مسکراتی ہیں — سفید آئینے میں عُریاں بدن کرنیں نہاتی ہیں
کہ پریاں چادرِ آبِ رواں پر گل کھلاتی ہیں — چڑھایا ہے کسی صناع نے سونے کو پارے پر

لئے جاتے ہیں اپنی ناؤ کو موجوں کے دھارے پر

افق کی خوشنما گہرائیوں میں آفتاب اُترا — حسیں شہزادہ قصرِ نور میں باآب وتاب اُترا
شفق کے چہرۂ گلفام سے رنگیں نقاب اُترا — نگاہیں پڑ رہی ہیں شام کے روشن ستارے پر

لئے جاتے ہیں اپنی ناؤ کو موجوں کے دھارے پر

یونہی بچتے ہوئے رستے کی پوشیدہ چٹانوں سے — سفر طے کر رہے ہیں چپوؤں سے بادبانوں سے
مٹاتے ہیں سفر کی ماندگی قومی ترانوں سے — کئے جاتے ہیں ہمت ناخداؤں کے سہارے پر

لئے جاتے ہیں اپنی ناؤ کو موجوں کے دھارے پر

فاخر

(غیر مطبوعہ)

مبارزت[1]

(شہرہ آفاق فرانسیسی افسانہ نگار موپسان کا ایک دلچسپ افسانہ)

سوسائٹی میں وہ حسین نواب زادہ" کہلاتا تھا۔ مگر اس کا اصلی نام "نواب گونتران جوزف دے سوکز" تھا۔ اس کے ماں باپ انتقال کر چکے تھے اور چونکہ کافی دولتمند تھا اور مرضی کا مختار اس وجہ سے متوسط طور پر فضول خرچ اور عیاش تھا۔

وہ بھڑکیلا لباس زیب تن کرتا تھا۔ اس کی گفتگو لچھے دار اور عامیانہ ہوتی تھی۔ جس میں غرور و تمرد کے علاوہ اپنی نوابی کی شان کا زیادہ اظہار ہوتا تھا۔

اس کی محبت کے واقعات گو بہت تو نہ تھے مگر جو بھی تھے عام طور پر کافی مشہور تھے۔ اس وقت اس کی بیوی خوش و خرم تھی اور اطمینان و چین کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ وہ خوش خور و خوش پوش تھا۔ چین کی نیند سوتا تھا۔ غرض اس کی تمام زندگی انتہائی آرام و آسائش کا نمونہ تھی۔ ایسے کبھی تلخ تجربات سے واسطہ نہ پڑا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ زندگی کی کشمکش کا مقابلہ کرنے سے یکسر عاری تھا۔

وہ تیغ زنی کی حیثیت سے بھی کافی مشہور ہو چکا تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ اس کا نشانہ پورا بیٹھتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا جب مجھے کسی کے ساتھ مبارزت کا موقعہ پیش آئیگا تو میں پستول کا انتخاب کرونگا کیونکہ اس قسم کے ہتھیار سے میں اپنے مقابل کو مزد و مار سکونگا۔

ایک شام وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ تھیٹر سے واپس آرہا تھا کہ اس نے انہیں "تورتن رستوراں" میں کچھ ملائی کی برف کھانے کی دعوت دی اور انہیں اندر لے گیا۔

انہیں رستوراں میں بیٹھے ہوئے ابھی چند منٹ سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ نواب نے محسوس کیا کہ ایک شخص اس کی پاس کی ایک عورت کی طرف بہت دیر سے حریفانہ نظروں سے مسلسل دیکھ رہا تھا۔

عورت اس نظر بازی سے گھبرا کر نظریں نیچی کر لیتی تھی۔ بالآخر اس نے اپنے خاوند سے کہا "وہاں ایک شخص بیٹھا ہوا ہے جو میری طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے گھورے جا رہا ہے۔ میں تو اس سے واقف نہیں ہوں کیا تم اسے جانتے ہو؟"

خاوند جس نے اس وقت تک اس شخص کی طرف نظر نہ ڈالی تھی اس طرف دیکھ کر کہنے لگا "میں اس سے مطلقاً واقف نہیں"۔

اس کی بیوی اس پر کسی قدر مسکرا کر اور کسی قدر ترشرو ہو کر بولی۔ "افسوس ہے کہ کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں مل سکتا کہ لوگ آرام سے تفریح کر سکیں ایسے ایسے بدمعاش ——"

خاوند نے اپنے کندھے ہلا کر کہا "اگر ایک شخص ایسی ایسی باتوں کے انسداد کی فکر میں جائے تو ضرور دیوانہ ہو جائے اگر دنیا میں ایسے بداخلاق لوگ ہیں تو ان کا کیا کیا جائے"۔

نواب کو یہ گفتگو سنکر تاب نہ رہی اور اکڑ کر کرسی پر سے اٹھا۔ کیونکہ وہ اس بات کو ہرگز روا نہیں رکھ سکتا تھا۔ کہ ایک عورت کی جو اس کی مدعو اور دوست ہو اس کی اس طرح ایک عام مقام پر توہین ہو۔ اور وہ چپکا بیٹھا دیکھا کرے۔

چونکہ اس عورت کو اس نے اس رستوراں میں مدعو کیا تھا اس وجہ سے اسکا فرض تھا کہ اگر اس کی یہاں کوئی توہین کرے تو وہ اس کا بدلہ لے۔ چنانچہ وہ بپھر کر اٹھا اور اس بدطینت آدمی کے پاس پہنچا۔

"جناب! آپ ان خواتین کی طرف بہت نازیبا طریق سے گھور رہے ہیں۔ یہ شرافت نہیں۔ میں اس قسم کی حرکت ہرگز روا نہیں رکھ سکتا۔ آپ اپنی اس بدتہذیبی کی مجھ سے معافی چاہیئے"۔

اس شخص نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "جاؤ جاؤ اپنا کام کرو۔ مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو"۔

نواب نے لال پیلے ہو کر غصے کے مارے ہونٹوں کو چباتے ہوئے کہا "بس بس زبان کو لگام دو۔ ورنہ مجھے انتہائی سلوک کرنا پڑیگا"۔

آدمی نے اس کا جواب صرف ایک لفظ سے دیا —— جو بہت ہی نازیبا اور شرمناک تھا اور جو کمرہ کے اس سرے سے لیکر اس سرے تک ہر شخص نے بخوبی سن لیا اور ہر شخص اس طرف متوجہ ہو گیا۔

جس جس کی پشت تھی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ اکثر نے اپنے سر اٹھا کر دیکھا خدام یکایک ٹھہر کر اس طرح مڑے

جیسے لٹو۔

کمرہ میں خاموشی تھی کہ دفعتاً فضا میں ایک تڑاق کی آواز گونجی۔ نواب نے اس شخص کے گلے پر چپت رسید کیا تھا۔

(۲)

ہر شخص اپنی اپنی کرسی پر اٹھ کھڑا ہوا اور فریقین کے درمیان بیچ بچاؤ کرا دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد جب نواب زادہ اپنے گھر واپس آیا تو کمرہ میں ٹہلنا شروع کیا اور پندرہ بیس منٹ تک آج کے واقعہ پر غور کرتا رہا۔ اُبلتی ہوئی کیتلی کے مانند وہ کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے یا ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بالکل ناقابل تھا۔ ہاں اس وقت صرف ایک خیال تھا جو اس کے دماغ پر مستولی تھا —— یعنی اسے اس بدتہذیب شخص سے انتقام لینا تھا۔ اور اس کا ذریعہ مبارزت قرار پایا تھا۔

یہ خیال ابھی تک نیم پختہ تھا اور وہ مطمئن تھا کہ اس وقت تک اس نے کسی قسم کی زیادتی سے کام نہیں لیا تھا۔ ایک شریف النفس میزبان کی حیثیت سے اپنی مدعو خاتون کی توہین کا جواب دیا تھا اور اپنا وقار قائم رکھنے کی کوشش کی تھی۔

"کیا ہی وحشی آدمی تھا!"

یہ جملہ وہ بار بار دہراتا تھا۔

جب ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا تو وہ بیٹھ گیا اور مبارزت کے متعلق غور کرنے لگا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اسے اپنے دو دوستوں کے نام یاد آئے۔ جنہوں نے بہت سی دست بدست لڑائیوں میں اس کی معاونت کی تھی۔

پہلا شخص مارکوئیس دے، لا، تورنو ائیر تھا جو ایک مشہور پہلوان تھا۔ دوسرا کولونیل بوردوئن ایک جری سپاہی تھا اور دونوں اس کے گہرے دوست تھے۔ اسے کامل امید تھی کہ اس مقابل سے لڑنے میں بھی وہ اسے مدد دیں گے۔

دماغی ہیجان اور مسلسل گشت کی وجہ سے اسے سخت پیاس محسوس ہوئی۔ اور اس نے پے در پے تین پانی کے گلاس چڑھائے مگر پھر بھی تسکین نہیں ہوئی۔ پانی پینے کے بعد اس کے دماغ میں یہ خیال چکر لگانے لگا:—

"میرا مدِ مقابل مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتا اور ضرور بہانے بنا کر جھگڑے سے بچ جائیگا۔"

اس نے جیب میں سے وہ وزیٹنگ کارڈ نکالا جو اس نے اس شخص سے چھین لیا تھا۔

میز پر پڑے ہوئے کارڈ پر یہ عبارت درج تھی۔

"جارج لامل، ۵۱ - روموننی، پیرس"

نواب متعجب تھا کہ جارج لامل کون شخص تھا۔ اور آخر اس نے اس عورت کو کیوں گھورنا شروع کیا تھا۔ آخر کیا وجہ تھی کہ یہ معمولی سا واقعہ دو شخصوں کی زندگیوں میں ایک انقلاب عظیم پیدا کرنے کا باعث ثابت ہو —— یکایک اس کی زندگی ایک اجنبی کی زندگی سے متصادم ہو جائے .... ! اُسے تعجب ہوتا اگر یہ سنتا کہ جارج لامل بھی اس وقت اسی قسم کا خیال کر رہا تھا۔

نواب نے اپنے تئیں مخاطب کر کے کہا "خواہ کچھ ہو مجھے اس سے لڑنا چاہئیے۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ لڑائی کے لئے پستول کا انتخاب کروں یا تلوار کا"۔

تلوار سے لڑنا کوئی نئی بات نہ تھی پستول مبارزت میں بہت کم استعمال ہوتے تھے اس وجہ سے اس نے پستول کا انتخاب کیا کیونکہ اسے نشانہ کی بہت مشق تھی اور اس وجہ سے کامیابی کی زیادہ امید۔

اس نے دل میں ٹھان لیا کہ "مجھے مضبوط رہنا چاہئیے، خواہ کچھ ہی ہو اگر میں نے سختی کا اظہار کیا تو مقابل کا بھاگ جانا کوئی بڑی بات نہیں۔"

(۳)

اپنی ہی کرخت آواز سے نواب چونک پڑا۔ خیالات منتشر ہو گئے اور اس نے ہکا بکا ہو کر اپنے ارد گرد دیکھنا شروع کیا —— وہم دور ہو گیا اور اس نے تشنگی سے مغلوب ہو کر ایک اور پانی کا گلاس پیا اور پھر پلنگ پر جا لیٹا۔ اسے نیند آ رہی تھی۔

کمرہ کی روشنی گل کر کے جب وہ پلنگ پر آنکھیں بند کر کے لیٹا تو یہ خیالات دماغ پر مستولی رہے۔ "چونکہ کل مجھے مبارزت کے سلسلہ میں بہت سے کام سرانجام دینے ہیں اس وجہ سے اس وقت بہت گہری نیند کی ضرورت ہے تاکہ کل صبح تر و تازہ اور چست جاگوں اور مقابلہ کے لئے مستعد نظر آؤں۔"

بستر بہت گرم ہو گیا اور اُسے اچھی طرح نیند نہیں آئی اور پڑا پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پلنگ پر سے پھر اٹھا اور ایک اور پانی کا گلاس پیا .... اس وقت اسے خیال آیا کہ "معلوم ہوتا ہے خوفزدہ ہو رہا ہوں!"

اگر اسے لڑنے سے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا تو اس اضطراب

ویرپریشانی کی کیا وجہ تھی۔ اس کے ہونٹ کیوں تھرتھرا رہے تھے تشنگی کیوں غالب تھی۔ دل کیوں دھڑک رہا تھا ——— مگر نہیں وہ بزدل نہ تھا۔ اسے ڈرپوک نہیں کہا جاسکتا، بزدل کبھی مبارزت کے لئے آمادہ نہیں ہوسکتا۔ اس نے متعدد بار ایسی لڑائیاں جیتی تھیں۔

مگر پھر بھی وہ اسقدر مضطرب تھا کہ بار بار دل کو ڈھارس دیتا تھا "ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں صرف اپنی ذات سے ڈرو اور کسی سے مت ڈرو ——— اور اپنی ذات سے کیا ڈرنا!"

لیکن اسے خدشہ تھا کہ اس کی پریشانی عین وقت پر ظاہر نہ ہو جائے اور یہ بوکھلاہٹ اسے جان دینے پر مجبور نہ کر دے، مقابلہ کے وقت اس کا ہاتھ نہ لرز جائے۔ یا مضطرب ہو کر وہ لڑکھڑا کر نہ گر پڑے۔

"کیا میں ڈر گیا! نہیں۔ کل دیکھا جائیگا!" وہ چلایا۔ بستر پر سے اٹھا، موم بتی پھر روشن کی اور آئینہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں چمکدار اور متورم نظر آتی تھیں۔ چہرہ اترا ہوا تھا اور دلی افکار کا پتہ دیتا تھا۔

اس نے اپنے دل میں سوچا "پرسوں میں اس خبیث سے جنگ کرونگا ——— اور میں" ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاؤنگا۔ میں ہار جاؤنگا اور یہ جسم اس پلنگ پر مردہ اور سرد پڑا ہوا نظر آئیگا۔"

اس نے پیچھے مڑ کر پلنگ کی طرف دیکھا اس کے تخیل نے اپنے مردہ جسم کو پلنگ پر پڑا دیکھا ——— اسے اپنے پلنگ سے خوف محسوس ہونے لگا۔ اس نے پردہ چھوڑ دیا اور تمباکو نوشی کے کمرہ چلا گیا۔

ایک سگار نکالا اور کش لینا شروع کیا۔ اس وقت اسے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس وجہ سے نوکر کو آگ جلانے کے لئے حکم دیا۔

پھر سوچنا شروع کیا "نہیں ——— اچھی طرح معلوم ہو جائیگا کہ کسی سے مقابلہ ہوا تھا!"

آگ روشن ہو گئی اور وہ گرم ہو کر مزے سے سگار پیتا رہا اور دل ہی دل میں کہتا رہا "مجھے اب کیا کرنا چاہئیے؟ اب میرا کیا حشر ہوگا۔ کہیں ہار تو نہیں جاؤنگا؟"

وہ کرسی پر سے اٹھا اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنا شروع کیا۔ موسم گرما کی ایک خوشگوار صبح نمودار ہونی شروع ہو گئی تھی۔ تمام پریں پر ایک ہلکا قرمزی غازہ پھیر لیا۔ اور جونہی نوزائیدہ آفتاب کی منور کرنیں زمین پر چمکیں نواب کے سینہ میں امید کی ایک نورانی کرن پیدا ہو گئی۔ نئے جوش اور نئے ولولہ کے ساتھ اس نے کہا "میں بھی کیا بیوقوف ہوں کہ لڑنے سے پہلے ڈرے جاتا ہوں، جبتک کوئی واقعہ نہ ہو جائے قبل از وقت واویلا کے مصداق خوف زدہ ہونا کہاں کی دانشمندی ہے۔"

(۴)

صبح ہو گئی اور اس نے غسل کر کے نئے کپڑے زیب تن کئے اور کافی مضبوط دل کے ساتھ گھر سے نکلا۔

دل میں صرف یہ خیال جاگزیں تھا "مجھے مضبوط رہنا چاہئیے اگر میری طرف سے ذرا سے خوف کا اظہار ہوا تو وہ غالب آجائیگا۔"

اس کے معاون دوستوں نے اس کی امداد کرنے کا یقین دلایا۔ اور سب نے ملکر مبارزت کی تیاریوں کے متعلق تفصیل پر غور کرنا شروع کیا۔

"آپ ایک خوفناک مبارزت کرنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں ——— بہت خوفناک ——— فیصلہ کن!"

"پستول ضرور استعمال کرو گے؟"

"ہاں!"

"کیا آپ باقی تمام امور ہمارے ہاتھوں میں چھوڑتے ہیں؟"

نواب نے ایک خشک آواز سے جواب دیا "ہاں"

"آپ بہت اچھے نشانہ باز ہیں!"

تفصیلات سمجھانے کے بعد نواب نے ان دوستوں کو رخصت کر دیا اور خود گھر واپس آیا۔ اس کا حلق خشک ہوا جا رہا تھا اور وہ بار بار اپنی زبان لبوں پر پھیر رہا تھا ——— اس نے لنچ کھانے کی کوشش کی مگر دماغی تفکرات نے کچھ کھانے نہ دیا۔ پھر شراب (رم) منگوائی اور پے در پے چھ گلاس پئے اب اس کے دماغ کی مشین تیزی سے حرکت کرنے لگی۔

"مجھے کامل یقین ہے کہ اب سب کام ٹھیک ہو جائیگا!"

اس نے سوچا ایک گھنٹہ بعد صراحی ختم ہو چکی تھی مگر اس کا ذہنی اضطراب برابر بڑھ رہا تھا۔

رات شروع ہو گئی۔

دونوں دوست پھر آئے اور اس سے کہا "نواب صاحب! ہم آپ کا چیلنج لیکر اس کے پاس پہنچے تھے اس نے فوراً قبول کر لیا

ہے۔ اور سب کام ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہے جس جگہ مبارزت کا مقابلہ ہوگا وہاں ایک مکان کرایہ پر لے لیا گیا ہے جہاں زخمی کو لیجایا جائیگا۔ کیونکہ یہ یقین ہے کہ مقابلہ بغیر جراحت کے انجام نہیں پائیگا۔ اب ہمیں جانے کی اجازت دیں تاکہ ایک اچھے ڈاکٹر کی خدمات حاصل کرنے کا بندوبست کر سکیں۔"

دونوں چلے گئے۔

جب وہ چلے گئے تو اس نے یہ محسوس کیا کہ وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔ وہ اس ڈلیسک پر جاکر بیٹھا جس پر اس کا ملازم ابھی ابھی موم بتیاں روشن کر گیا تھا۔

ایک کاغذ نکال کر اس نے لکھا:۔

"یہ میری آخری وصیت اور عہد نامہ ہے۔"

ان الفاظ کو دیکھتے ہی وہ ڈر کر اچھل پڑا۔ دلی اضطراب اور ان الفاظ نے موت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا اور وہ اب اس قابل نہ رہا کہ کسی چیز کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کر سکے۔ یا وصیت نامہ تحریر کر سکے۔

وہ لڑنے کے لئے تیار تھا ——— تہیہ کر لیا تھا۔

خود اس نے مبارزت اور لڑائی مول لی تھی۔ جوش میں آکر اس نے ایک ایسا چیلنج دے دیا تھا جس کے پورا کرنے کے لئے اب وہ اپنے اعصاب میں پوری قوت نہ پاتا تھا۔

اس نے الماری میں سے "چتو بر بینڈز" صاحب کی کتاب "مبارزت کے قاعدے" نکالی اور اس کی ہدایات پڑھنی شروع کیں۔

اس میں مندرجہ ذیل سوالات درج دکھائی دئے:۔

"(۱) کیا وہ شخص جس سے تم لڑنا چاہتے ہو پستول چلانے کا عادی ہے؟"

(۲) کیا وہ اس فن میں ایک مشہور کھلاڑی ہے؟"

(۳) یہ کیونکر معلوم کیا جا سکتا ہے؟"

یہ پڑھنے کے بعد اس نے "مبارزت کی ڈائریکٹری" نکالی اور اس میں جارج لال کا نام تلاش کرنا شروع کیا۔ مگر اس کا نام باوجود تلاش کے نہیں ملا مگر یہ امر یقینی تھا کہ وہ اس فن کا ماہر معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس نے بے چون وچرا چیلنج قبول کر لیا تھا اور وہ بھی اس خوفناک ہتھیار سے اور پھر ایسی شرائط کے ساتھ!۔

اس نے ایک پستولوں کا بکس کھولا اور اس میں سے ایک پستول نکالا اور اس طرح تن کر کھڑا ہو گیا گویا سامنے اس کا مقابل کھڑا ہوا تھا اور وہ اس سے لڑنا چاہتا تھا۔

اس نے پستول اٹھایا اور نشست باندھی مگر اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ پیروں میں بھی لرزش تھی۔ اس پر اس نے اپنے دل کو تازیانے دیتے ہوئے کہا "ناممکن ہے! اگر یہی حالت ہے تو میں ہرگز اس قوی جوان سے نہیں لڑ سکتا!"

اس نے پستول کی نالی کو دیکھا ——— وہ ایک تاریک غار موت معلوم ہوتی تھی اسے دوستوں کا خیال آیا ان کے مذاق کلب کے لوگوں کے مضحکہ، عورتوں کی تالیاں اور اخبارات کے نوٹ غرض ہر وہ چیز یاد آنی شروع ہوگئی جو مبارزت سے انکار کرنے کا نتیجہ ہوتی ہے ——— لوگ اسے بزدل کہیں گے!

اس نے پھر پستول کو دیکھا۔ اس کی نالی اور دستہ چمک رہے تھے۔ پستول بھرا ہوا تھا۔ اور نہ معلوم کس خیال سے اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔

اب اسے اچھی طرح یقین ہو گیا کہ مبارزت کیلئے بہت دلیری کی ضرورت تھی اور اس میں اتنی جرأت نہ تھی کیونکہ وہ محض اس کے خوف سے لرزہ براندام تھا۔ ایسی حالت میں اب سوائے سوسائٹی کے سامنے شرمندہ ہونے کے کچھ باقی نہ تھا۔ اس کی تمام روائتی بہادری اور شرافت کے افسانے جن پر وہ شیخیاں مارا کرتا تھا اب مہمل ثابت ہونے والے تھے۔

کیا وہ ایک بزدل تھا؟

(۵)

کسی نہ کسی صورت سے ہمت کی ضرورت تھی ورنہ مبارزت کیا معنی؟

اس نے اپنے آپ میں اس ہمت کو نہ پایا وہ سوسائٹی کے سامنے شرمندگی بھی نہ اٹھا سکتا تھا۔ اس کا وقار اور شان خطرے میں تھی۔ چنانچہ مسلسل سوچ بچار کے بعد اس نے کچھ فیصلہ کیا اور میز پر سے پستول اٹھا کر اس کی نالی حلق میں رکھکر لبلبی دبا دی۔

جب نوکر نے "دھوں" کی آواز سنی وہ گھبرایا ہوا کمرہ میں آیا۔ دیکھا کہ اس کا آقا پشت کے بل فرش پر مردہ پڑا ہوا تھا۔

خون کے ایک چھینٹے نے اس سفید کاغذ کو جو میز پر رکھا ہوا تھا ملوث کر دیا تھا۔

اس قرمزی دھبہ کے نیچے یہ الفاظ تھے:۔ "یہ میری آخری وصیت

رات کے بھوت

جب میں نے پرانی سرائے کی دہلیز پر قدم رکھا۔ تو معمول سے زیادہ دیر ہوگئی تھی۔ کیونکہ ریگستان کے اس چھوٹے سے گاؤں میں مناظر اسقدر دلچسپ ہیں۔ خصوصاً مغرب کے وقت ایسا شاندار نظارہ ہوتا ہے۔ کہ قیامگاہ کو واپسی کا خیال بھی نہیں رہتا جب میں سرائے میں پہنچا تو میرے نئے رفیق میرا انتظار کر رہے تھے۔ یہ گاؤں کے ممتاز لوگ تھے۔ یعنی پٹواری، چوکیدار، ڈاکٹر اور ارغنونی یہ سب ایک کھردری میز کے گرد بیٹھے لمبے لمبے مٹی کے پائپ میں اپنے ہی باغوں کا تمباکو پی رہے تھے۔ میز پر ایک لمپ رکھا ہوا تھا۔ جس پر ایک سبز رنگ کا گلوب تھا۔ مجھے دیکھکر انہوں نے دوستانہ طور سے اس تاخیر پر ملامت کی۔ میں کوئی جواب نہ دینے پایا تھا کہ سرائے کا مالک تاش اور ایک سلیٹ کی تختی لیکر آیا جس سے اسپنج اور ایک سلیٹ کا قلم لٹکا ہوا تھا۔ ہم سب تاش کھیلنے بیٹھ گئے۔ پتے تقسیم ہی کئے گئے تھے کہ دہلیز پر ایک بوڑھا آدمی نظر آیا۔ جو نیلی عبا اور ڈھیلی خاکی پتلون پہنے تھا۔ اس کے پیروں میں موٹی موٹی کھڑاویں تھیں۔ اس شخص نے تانبے کی لالٹین جو ہاتھ میں لئے تھا۔ دہلیز پر رکھدی اور ٹوپی اتار کر میز کے پاس آیا۔ اور ڈاکٹر سے کہا میری بیٹی یکایک بیمار ہوگئی ہے۔ اس لئے مہربانی فرماکر میرے ساتھ ہمسایہ گاؤں رہوڈ تشریف لے چلئے۔

ڈاکٹر۔ (ہاتھ سے تاش کے پتے رکھکر) ماسٹر یان میں ابھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ یہ میرا فرض ہے

یہ کہکر ڈاکٹر نے اپنی ٹوپی سر پر لگائی اور چھڑی ہاتھ میں لیکر دہقانی سے پوچھا۔!!

"ہم جنگل سے چلیں گے نا اس راستہ میں مسافت بہت کم ہے"!

ماسٹر یان۔ اس وقت اور جنگل سے گذرنا۔ کل صبح اگست کی ۱۵ ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اس وقت جنگل میں سے قلعہ رہوڈ کے پاس جانا اچھا نہیں۔؟؟

ارغنونی۔ تم سچ کہتے ہو۔ اس کے متعلق لوگ عجیب وغریب قصے بیان کرتے ہیں۔

پٹواری صاحب نے یوں گل فشانی فرمائی............

"گاؤں کے بڈھے بوڑھے کہتے ہیں۔ کہ جب سے پادری کی موت کا حادثہ ہوا ہے۔ اس دن سے قلعہ کے مالک کی روح ہر سال رات کے وقت قلعہ کے گرد پھرتی ہے۔ اور کاغذات میں بھی ایسا ہی لکھا ہوا ہے۔ لیکن آجکل کے نوجوان ان باتوں پر اعتبار نہیں کرتے۔"

میں نے یہ قصہ سننے کے شوق میں اور تازہ ہوا کا لطف اٹھانیکے لئے ڈاکٹر کے ہمراہ جانا چاہا۔ اس نے منظور کرلیا۔ سرائے کے مالک نے ہم کو تانبے کی ایک گول لالٹین دیدی۔ کہ واپسی کے وقت ضرورت ہوگی۔

یہ لالٹین لیکر ہم تینوں روانہ ہوگئے۔ دہقانی شخص نے کہا ہم کو لالٹینوں کی ضرورت نہیں؟۔ لیکن تارے خوب چمک رہے ہیں۔ شاید موسم بدل جائے۔"

یہ کہکر اس نے دیا سلائی سے اپنا پائپ جلالیا۔

ڈاکٹر نے اس سے کہا "ماسٹر یان یہ تو کہو کیا واقعی تم ایسی صاف اور روشن رات کو ہمارے جنگل میں سے گزرتے ہوئے ڈرتے ہو؟"

ماسٹر یان۔ جناب میں ڈرپوک تو نہیں ہوں۔ لیکن اگر مجھے تمام دنیا کا سونا دیدیا جائے تب بھی آج رات کو قلعہ کے پاس نہ جاؤنگا؟

میں۔ آخر نقصان کیا ہے؟

دہقانی۔ جناب مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہاں کے رہنے والے نہیں ہیں۔ اگر آپ ہمارے گاؤں میں پیدا ہوتے تو یہ سوال نہ کرتے سب جانتے ہیں کہ رہوڈ کے بیرن کے کتوں کا غول ہر سال غراتا اور بھونکتا ہوا کھیتوں میں دوڑتا پھرتا ہے۔ اور مشکی گھوڑوں کا گلہ زنجیریں کھینچتا ہوا جنگل میں سے گزر جاتا ہے۔ شکاری نرسنگھوں تیروں اور گولیوں کی سنسناہٹ زخمی شکاریوں کی آواز ہوا میں گونجنے لگتی ہے۔ اور بڑا دہشتناک شور پیدا ہوتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کسیکو یہ غول راستہ میں ملے۔ یہ گفتگو کرتے ہوئے ہم جنگل کے پاس پہنچ گئے۔

ڈاکٹر نے کہا "اچھا شائد بیمار لڑکی ہمارا بے چینی سے انتظار

کر رہی ہوگی - اس لئے ہمیں مختصر راستہ سے جانا چاہئے" میں نے تو ہاں کہدیا - لیکن گاؤں والے کا چہرہ فق ہوگیا - اگرچہ اس کی بھی یہی خواہش تھی کہ جلد سے جلد لڑکی کے پاس پہنچ جائیں - تاہم اس نے سختی سے روکا کہ ہم اس قسم کی جرأت نہ کریں - ایک جوان شخص کے لئے کسی قدر شیخی نامناسب نہیں ہوتی - اور بجائے اس کے کہ اس سیدھے آدمی سے بحث کی جائے میں نے اپنی لالٹین روشن کی اور جنگل میں پگڈنڈی پر قدم بڑھایا - ڈاکٹر نے اپنے رہنما کو ہاتھ کے اشارہ سے خدا حافظ کہا - اس نے نہایت افسوس کے لہجہ میں جواب دیا -

"خدا آپ کی حفاظت کرے"

اور وہ دوسرے راستہ سے قدم بڑھاتا ہوا چلا گیا - اور ہم جنگل میں داخل ہوگئے - جنگل کے گھنے درختوں میں سے چاند کی بہت کم شعاعیں آرہی تھیں - صرف لالٹین کی زرد روشنی ہمارے چند قدم آگے تنگ راستہ کو روشن کرتی تھی -

گاؤں والوں کے عجیب وغریب توہمات ہماری گفتگو کے موضوع تھے - ڈاکٹر نے چند مثالیں بیان کیں اور کچھ دیر کے بعد اس نے جیب سے گھڑی نکال کر میری لالٹین کی روشنی میں دیکھکر کہا -

"اوہو گیارہ بج گئے - ہم یقیناً راستہ بھول گئے یہ جنگل اسقدر وسیع نہیں ہے - ہم رہوڑ کی طرف آگئے" ہم کچھ ٹھہر گئے - لیکن جنگل کے وسط میں جگہ معین کرنا غیر ممکن تھا - ہم سمت بھی نہیں معلوم کرسکتے تھے - کیونکہ چاند کے نقرئی کرّے پر بادل چھائے ہوئے ہوئے تھے -

ہوا سے درختوں کے پتے بج رہے تھے - اور صنوبر کے درختوں کی خشک ڈالیاں کھڑکھڑا رہی تھیں - کبھی کبھی اُلّو یا کوئی اور شکاری پرند کی آواز آجاتی تھی - وہ سیر جو ابتدا میں بڑی بہادری سے شروع کی گئی تھی - اب بیحد طویل اور دشوار معلوم ہونے لگی - میں افسوس کرنے لگا کہ ہم گاؤں والے کے ساتھ ہی کیوں نہ چلے گئے اتنے میں کچھ روشنی ہوئی تو ہم کو جنگل کا کنارہ نظر آگیا - ہم دونوں اسی طرف چلے گئے - وہاں نیچے تو ہماری آنکھوں کے سامنے جو تاریکی سے مانوس ہوگئیں تھیں وسیع کھیت تھے ان کے چاروں طرف پہاڑیاں تھیں - اور پہاڑیوں پر گھنے جنگل کھڑے تھے - کھیتوں کے درمیان چوتھائی میل کی جگہ میں شاندار رہوڑ کا قلعہ کھڑا تھا - اور اس قلعہ پر ایک مربع برج بنا تھا - اس قلعہ سے گاؤں کے پل تک سڑک کے دونوں طرف بڑے بڑے درختوں کی قطار تھی - انہی درختوں میں سے ہمکو بیمار لڑکی کے مکان تک جانا تھا - اس تمام فضا میں دل پر اثر کرنے والا گہرا سناٹا ماتمی پردہ کی طرح چھایا ہوا تھا - گہرے بادل کبھی بکھرے ہوئے کبھی جمع آسمان پر اڑتے پھر رہے تھے - تھوڑی دیر بعد چاند ابر میں سے نکل آیا - جس کی روشنی سے پورا قلعہ روشن ہوگیا - اور اس کے ہر دریچہ پر کسی قدر نیلے رنگ کی نقرئی آگ کی روشنی نظر آرہی تھی - ہمارے چاروں طرف چمگادڑیں پیچ وخم کھاتی ہوئی اُڑ رہی تھیں - اور ہوا میں ایک عجیب شور سنائی دینے لگا -

گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور ان کی ٹاپوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی - یہ خوفناک شور بڑھتا جاتا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے قریب ہوتا جارہا ہے - اور زنجیروں کی کھڑکھڑاہٹ اور ہَو ہَو ہُو ہُو کی مخلوط آواز بھی کان میں آنے لگی - ہم کو بجز قلعہ کے بیچ کے نچلے حصہ میں ایک لرزتی روشنی کے جو کبھی نمودار ہوجاتی تھی اور کبھی غائب ہوجاتی تھی - اور کوئی چیز نظر نہیں آئی -

اس کے بعد پھر سناٹا چھا گیا - لیکن سناٹا شور وغل سے زیادہ ہیبتناک تھا - میں نے ڈاکٹر کا بازو پکڑ کر آہستہ سے کہا -

"یہ کیا ہورہا ہے ...."

ڈاکٹر نے کچھ سکوت کے بعد متفکرانہ انداز میں کہا -

"رہوڑ کے قلعہ کے متعلق لوگ حیرت انگیز واقعات بیان کرتے ہیں ..... لیکن گاؤں والے مجھ سے اچھی طرح بیان کرینگے"

چند منٹ کے بعد ہم نے ایک مکان کا دروازہ کھٹ کھٹایا جس کے آس پاس اور کوئی مکان نہ تھا - ہمارے رہنما نے خود دروازہ کھولدیا اور ہمارے زرد چہرے دیکھکر کہا -

خوش آمدید .... ہم ڈر رہے تھے کہ کوئی مصیبت آگئی -

ایک بڑھیا جو چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی مریض لڑکی کے لئے کوئی پینے کی چیز تیار کر رہی تھی - بولی

جناب ہم آپ کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے - گرچہ میری بیٹی کی حالت اب اچھی معلوم ہوتی ہے -

لڑکی کا باپ میز پر سے لیمپ اٹھاکر ڈاکٹر کو قریب کے کمرہ میں لے گیا - جہاں اس کی لڑکی لیٹی ہوئی تھی - لڑکی کی ماں بھی وہ پینے کی چیز لیکر دونوں کے پیچھے لے گئی - میں تھوڑی دیر کے لئے تنہا رہ

گیا۔ یہاں اسوقت لکڑیوں کی سُرخ روشنی ہو رہی تھی۔ مَیں آج رات کے واقعات پر غور کر رہا تھا۔

اتنے میں لڑکی کی ماں مسکراتی ہوئی آئی اور اس نے آہستہ مجھ سے کہا۔

"اب وہ آرام سے لیٹی ہوئی ہے۔ خدا کا شکر ہے۔ ہمیں امید ہوگئی ہے کہ وہ بچ جائیگی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ جبتک اس کو نیند نہ آجائیگی میں یہیں ٹھہرا رہونگا۔"

اس کے بعد وہ کافی تیار کرنے بیٹھ گئے۔ مَیں نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور اس سے ان دہشتناک آوازوں کے متعلق سوال کیا۔ جو راستہ میں ہم نے سنی تھیں جب اس نے کہا۔

ہم نے بھی اس خونی بگھی کی آواز سنی ہے جس میں جہنمی گھوڑے جُتے ہوئے تھے۔ ہم نے وہ بگھی کھڑکی میں سے دیکھنے کی جرأت نہیں کی ورنہ ہم دیکھتے ہی مرجاتے۔ لیکن ہم آپ کے لئے دعا کر رہے تھے۔ اور مقدس عذرا نے ہماری دعا سُن لی کہ آپ ہمارے گھر تک پہنچ گئے۔ ہم کو خوف تھا کہ آپ کی بھی وہی حالت نہ ہو۔ جو پن چکی والے کی لڑکی سسکا کی ہوئی۔

"اسے کیا ہو گیا تھا؟"

یہ بہت ہیبتناک واقعہ ہے۔ مَیں نے اپنی جوانی میں سنا تھا۔ ہوا یہ کہ گاؤں میں تہوار کا دن تھا۔ دن بھر ناچ گانا ہوتا رہا۔ رات کو پن چکی والے کی شوخ لڑکی سسکا جس کی عمر سترہ برس کی تھی۔ ناچ کے بعد چند اور لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ گھر واپس جا رہی تھی۔ راستے میں یہ سب گاتے بجاتے چلے جا رہے تھے۔ اتنے میں بارہ بجے اور چار گھوڑوں کی بگھی کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ اور ذرا دیر بعد وہ بگھی ان کے قریب آگئی ایک لڑکے نے چلا کر کہا۔

اے کوچبان بگھی ٹھہرا، اس کے ساتھ سب نے چلا کر یہی کہا۔ بگھی ٹھہرا۔ اور شوخ لڑکی سسکا خیال سے زیادہ تیز دوڑ کر بگھی کے پیچھے پائدان پر کھڑی ہوگئی اور چلا کر بولی۔ لو میں تو گھر جاتی ہوں۔ وہ قلعہ کی طرف درختوں کی قطاروں میں غائب ہوگئی۔ گھوڑے غیظ وغضب سے بھرے ہوئے کھیتوں اور سبزہ زاروں پر دوڑتے رہے۔ اور تین مرتبہ قلعہ رہوڈ سے قلعہ کرانیتنبرگ تک جو کبھی پہاڑوں پر بنا ہوا تھا۔ گئے اور آئے۔ ہر مرتبہ قلعہ کے پھاٹک بگھی کے واسطے خود بخود کھل گئے اور زور کی آواز کے ساتھ بند ہو گئے۔ ایک لمحہ کے بعد سسکا جادو کے قلعہ میں پہنچ گئی۔ اور بگھی سے نیچے گر گئی۔ صبح کو گاؤں والوں نے اس کی لاش قلعہ رہوڈ کے پھاٹک کے سامنے پل پر پڑی ہوئی دیکھی۔ لاش پر جگہ جگہ خون کے داغ تھے۔

بوڑھی عورت جب قصہ بیان کر رہی تھی ڈاکٹر اور لڑکی کا باپ خاموش آکر کمرہ میں کھڑے ہو گئے تھے۔ لیکن میں قصے میں ایسا محو تھا کہ مجھے کچھ نہ معلوم ہوا۔ کہ یہ دونوں بھی یہیں کھڑے ہیں یا نہیں۔ جب قصہ ختم ہوگیا تو بوڑھی عورت نے اٹھکر الماری میں سے چار پیالیاں نکالیں اور کافی بھر کر ہمارے سامنے رکھدیں۔

ڈاکٹر نے لڑکی کے ماں باپ کو اطمینان دلایا کہ اب کوئی خطرہ نہیں۔ اور کچھ طبی مشورے دئے اور دوائیں تبلائیں۔ مَیں نے ڈاکٹر کی ایک بات بھی نہیں سنی۔ میں ہوا کی سنسناہٹ اور آگ کی بھڑک میں خونی بگھی کی گڑگڑاہٹ گھوڑوں کی ٹاپیں، ہنٹروں کی پھٹکار اور کتوں کے غول کا بھونکنا سن رہا تھا۔ اور دھوئیں میں مجھے بھتنے نظر آرہے تھے۔ ڈاکٹر نے میری اس حالت کا اندازہ کر لیا اور بطور مذاق بولا۔

"دوست کیا بڑی بی نے رہوڈ کا ایسا خوفناک قصہ بیان کیا۔ کہ تم کو نیند آگئی"۔

بے شک میں ان عجیب واقعات پر غور کر رہا ہوں جو میں نے سنے ہیں لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان واقعات کا سبب کیا ہے؟

بوڑھی عورت نے کہا "مَیں بیان کر سکتی ہوں لیکن میرے شوہر مجھ سے زیادہ اچھی طرح بیان کریں گے"۔

چنانچہ عورت کے شوہر نے حسب ذیل قصہ بیان کیا۔

رہوڈ کا بیرن نہایت مغرور اور متکبر آدمی تھا۔ اور شکار کا اسکو اسقدر شوق تھا کہ وہ خوشی سے اپنی روح شیطان کے ہاتھ بیچ دیتا۔ قریباً روزانہ وہ اپنے خدم وحشم کے ساتھ اس جنگل میں شکار کھیلا کرتا تھا جو آرام اور عبادت کے لئے مخصوص ہے۔ اور باوجود پادری کی فہمائش کے وہ نہیں مانتا تھا اور برابر اتوار کو بھی گھوڑے پر سوار ہوکر شکار کو چلا جایا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ اتوار کو علی الصبح شکار کو جانے لگا اور اپنے پادری سے وعدہ کیا کہ نماز تک واپس آکر شریک ہو جاؤنگا لیکن اسی کے ساتھ اس نے پادری سے یہ بھی تاکید کی کہ میری واپسی تک نماز شروع نہ کیجائے۔

پادری نے منظور کر لیا۔ اس باہمی قرارداد سے مطمئن ہوکر وہ

کھیتوں اور جنگلوں میں دیوانہ وار شکار کے لئے پھرتا رہا۔ وقت سرعت کے ساتھ گزرتا رہا۔ اور قلعہ سے گیارہ بجے کے گھنٹے کی آواز سنائی دی۔ بیرن کو اپنا وعدہ یاد آیا۔ کہ مجھے اب گھر پہنچ کر نماز میں شریک ہونا ہے کیونکہ قانون کلیسا کے مطابق نماز ۱۲ بجے سے قبل شروع ہو جانا چاہیئے۔ یہ خیال کر کے اس نے واپسی کا ارادہ کیا ہی تھا کہ وہ تین خرگوش جنگل میں بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ بیرن نے دل میں کہا ان کو ذرا دیر میں مار کر چلا جاؤں گا۔ لیکن خرگوش بہت تیز تھے۔ بیرن جسقدر تیزی سے ان کا تعاقب کرتا تھا اس سے زیادہ تیز وہ خرگوش بھاگتے تھے اور کبھی غائب ہو جاتے۔ اور کبھی پھر نمودار ہوتے۔ اور کبھی تھک کر خاموش بیٹھ جاتے اور جب بیرن ان کے قریب پہنچتا تو پھر بھاگ جاتے۔ یہاں تک کہ نماز کا وقت گزر گیا۔ لیکن بیرن کو بھی ضد ہو گئی کہ میں ان کا شکار کر کے رہونگا۔ وہ اسی دُھن میں خرگوشوں کے پیچھے بھاگتا پھرتا تھا۔ کہ قلعہ کے گھنٹہ نے بارہ بجائے۔ گھنٹہ کی آواز سنکر بیرن کچھ پریشان ہو کر ٹھہر گیا۔ خرگوش بھی کھڑے ہو گئے اور اپنے کان سیدھے کر کے اگلے پیروں سے تالیاں بجانے لگے اور ایک پُر اسرار آواز سنائی دی۔

بیرن صاحب سلام۔ اپنے شوق کی وجہ سے نماز بھی بھول گئے۔ شیطان آپ سے خوش ہے ——— اب جلدی جائیے . . .

. . . . . . لیکن بیکار ہے۔

بیرن مارے غصے کے کانپنے لگا۔ اور گھوڑے کو گھر کی طرف تیز دوڑایا شیطان پر لعنت کرتا جاتا تھا۔ لیکن اس کو یہ بھی خیال تھا کہ میں نے پادری سے تاکید کر دی ہے کہ بغیر میرے نماز شروع نہ کرے اور گو قانون کچھ بھی ہو۔ لیکن میرے حکم کی تعمیل ضرور کیجائے گی۔

جب وہ پل پر سے گزر کر قلعہ کے پھاٹک پر پہنچا تو وہاں سناٹا تھا۔ اور اسوقت کوئی شخص پھاٹک پر حاضر نہ تھا۔ یہ دیکھ کر اس کی طبیعت میں اشتعال پیدا ہوا کہ میرے استقبال کو کوئی کیوں نہیں آیا وہ گھوڑے سے اُتر کر بھنایا ہوا لگاتے ہوئے سیدھا گرجے میں پہنچا وہاں دیکھا کہ اس کے تمام ملازم اور خدمتگار دوزانو گھڑے ہیں اور پادری قربانگاہ پر دعا پڑھ رہا ہے۔

یہ دیکھکر بیرن کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اُس نے ہاتھ بڑھایا اور . . . . . . پستول کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ پادری قربانگاہ پر گر پڑا۔ اور جان بحق ہو گیا۔

اس دن سے وسط اگست میں راتوں کو گھوڑے کھیتوں میں دوڑتے پھرتے ہیں۔ بسیاہ کتے بھونکتے ہوئے گھوڑوں کے ساتھ بھاگتے ہیں۔ اور خونی گھی چٹانوں پر لڑھکتی ہوئی جاتی ہے۔ یہ پورا غول قلعہ رہوڈ سے قلعہ کرائینبرگ کی جگہ تک جہاں بیرن کا رفیق رہتا تھا تین مرتبہ جاتا آتا ہے۔ لوگ وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ دوزخی غول اگر کوئی دیکھ بھی لے تو اس کی ہلاکت کے لئے کافی ہے اگر کوئی شخص اس غول کو راستہ میں ملجائے تو وہ قلعہ کے پھاٹک تک کھنچا ہوا چلا جاتا ہے۔

یہ قصہ کہکر وہ بوڑھا آدمی خاموش ہوا تو ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔

"اگر تم پسند کرو تو ہم دونوں کل قلعہ دیکھنے چلیں گے۔ اس کے وسیع کمرے آراستہ چھتیں۔ اس کا مربع برج اس کے تہ خانے اور قیدخانے دیکھیں گے۔ اور وہ گرجا بھی دیکھیں گے۔ جہاں قربانگاہ پر پادری کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اور اس کی نماز کی کتاب ابتک وہیں رکھی ہوئی ہے جس پر خون کے دھبے ہیں۔ اس بے رحمانہ قتل کے بعد بہت جلد ظالم بیرن مرگیا۔ اور اس نے کوئی وارث نہیں چھوڑا۔ اور اس وقت سے بجز اُلوؤں اور چمگادڑوں کے کوئی انسان اس قلعہ میں نہیں رہا۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر کھڑا ہوا اور لڑکی کے کمرہ میں جاکر دیکھا لڑکی اس وقت آرام سے سو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کمرہ سے واپس آکر کہا اب ہمیں گھر چلنا چاہئیے۔

ہم نے کافی کی پیالی ختم کی۔ اور دونوں میاں بیوی سے ہاتھ ملایا ڈاکٹر نے وعدہ کیا کہ میں کل پھر آؤنگا۔ اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

مطلع اس وقت بالکل صاف تھا اور چاند خوب روشن تھا ہم کو لالٹین کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اگرچہ رات کے دو بج چکے تھے۔ لیکن اس وقت ہم نے مختصر راستہ چھوڑ کر پتھریلے راستہ سے جانا پسند کیا رہوڈ گاؤں سے گزرتے ہوئے ایک دیہاتی کی گاڑی آتی ہوئی نظر آئی۔ جب گاڑی ہمارے قریب آئی تو گاڑیبان نے ڈاکٹر کو سلام کیا۔

شب بخیر ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر۔ شب بخیر پیٹر۔

پیٹر۔ کیا آپ گھر جانا چاہتے ہیں؟ آجائیے میری گاڑی میں دو آدمیوں کی جگہ ہے۔

ڈاکٹر۔ شکریہ۔ آج رات کو ہم بہت چلے ہیں۔

گاڑی آگئی اور ہم دونوں بیٹھ گئے۔ گاڑی میں پھلوں اور ترکاریوں کی ڈلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جب گاڑی روانہ ہوئی تو ڈاکٹر نے مجھ سے مذاقاً کہا۔ اب ہم اسی خونی گاڑی میں جا رہے ہیں کیونکہ پیٹر قلعہ رہوڈ

کا معمار ہے۔

ان الفاظ سے میں بے اختیار چونک پڑا۔ لیکن ڈاکٹر نے میری گھبراہٹ نہیں دیکھی اور اس نے گاڑیبان سے کہا۔

"قلعہ سے آکر تم اسقدر جلد کہاں جا رہے ہو؟"

پلیٹر: میں ہر ہفتہ لودہن کے میلہ جایا کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں اورچونکہ راستہ بہت طویل ہے۔ اس لئے میں رات ہی سے روانہ ہو جاتا ہوں۔ آج بھی میں بہت جلد جانا چاہتا تھا۔ لیکن جب میں گاڑی میں گھوڑے جوتنا چاہتا تھا۔ تو اتفاق سے ان کی لگام ٹوٹ گئی اور گھوڑے درختوں کی قطار کے جانب بھاگ گئے اور سکتے ان کے پیچھے بھونکتے ہوئے دوڑے اور ایک خوفناک شور وغل پیدا ہو گیا۔ میں نے مشکل سے گھوڑوں کو روکا اور باگ درست کرنے میں بڑی محنت کرنی پڑی۔ دیر کی یہ وجہ ہے۔"

ان باتوں میں راستہ آسانی سے کٹ گیا اور ہم سرائے کے دروازہ پر پہنچ گئے۔ گاڑی کو رکوا کر ہم اتر پڑے اور پیٹر کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر نے مجھ سے کہا شب بخیر۔ اور کہا ماسٹر پیٹر کی تقریر غالباً تمہارے دل سے رات کے بھوتوں کا ڈر نکالنے کو کافی ہوگی۔ جو ہم کو جاتے وقت قلعہ کے پاس ملے تھے یہ کہکر وہ چلا گیا۔

میں اپنے کمرہ میں جا کر لیٹا لیکن باوجود ڈاکٹر کی آخری بات کے مجھے نیند نہ آئی۔ کیونکہ تعجب خیز واقعات نے میرے دل پر بہت اثر کیا تھا۔ اور میرا دماغ پریشان تھا۔ میں نے لیمپ روشن کیا اور میز کے پاس بیٹھکر یہ کہانی لکھنے لگا۔

مکّی۔ (بھوپالی)

غزل

مضطرب ہوں جلوۂ اُمید باطل دیکھ کر
لرزہ بر اندام ہوں بیتابئ دل دیکھ کر

ناخدائے دل کو موجوں سے یہ کیسا ربط ہے
ماہئ بے آب ہو جاتا ہے ساحل دیکھ کر

وقتِ آخر ہم نہ ٹھہرے بارِ دوشِ دوستاں
رُوح خوش ہے مرگِ غربت کا یہ حاصل دیکھ کر

زعمِ عقل و فہم اِک نادانئ معصوم ہے
اے گرفتارِ فریبِ ہوش اے دل! دیکھ کر

انتہائے لذتِ آوارگی دیکھے کوئی
بارہا لوٹ آئے ہیں آثارِ منزل دیکھ کر

چاندنی کا سیلِ عالمگیر اور پچھلا پہر
کھُل گئی آنکھیں مری دنیا کو غافل دیکھ کر

(غیر مطبوعہ) **عدمؔ**

ایثارِ حسن

گذشتہ دنوں میں فرانس کے ایک مشہور معتمد رکن حکومت قوّت بینائی سے محروم ہو گئے۔ اُنہوں نے اپنی منگیتر سے کہا۔ کہ میں اب اندھا ہو گیا ہوں اور اس قابل نہیں رہا کہ محبت اور تاہّل کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکوں۔ لیکن غیرت مند منگیتر نے جواب دیا۔ کہ یہ مجھ سے نہ ہو سکیگا۔ میں اپنی محبت میں ثابت قدم ہوں۔ چنانچہ دونوں کی شادی ہو گئی۔

مجبورِ مشیّت

بہت گہرا ہے گرچہ دل پہ اُلفت کا اثر پیاری
مگر قدرت نے مجھ سے چھین لی حسن بصر پیاری

مری دنیائے عشرت پر اندھیرا چھا گیا یکسر
اب ان آنکھوں سے کچھ آتا نہیں مجھکو نظر پیاری

میں اب بھٹکونگا مستقبل کی اُن تاریک راہوں میں
جہاں کام آ نہیں سکتا ہے کوئی راہ بر پیاری

محبت کا تری میں معترف ہوں۔ کیا کروں لیکن؟
نبھانے کی کوئی صورت نہیں آتی نظر پیاری

بن آئے کیا مشیت ہی جو محرومِ نظر کر دے!
بھُلا دے اپنے دل سے مجھکو قصہ مختصر کر دے

مختارِ محبت

یہ مانا! آدمی بے شک ہے مجبورِ مشیّت بھی
مگر تم ساتھ بینائی کے کھو بیٹھے بصیرت بھی

تعجب ہی ہوئے جاتے ہو تم مایوس کیوں آخر؟
بھُلا دی تم نے اپنے دل سے کیا میری محبّت بھی

محبّت امتیازِ کور و دیدہ ور سے بالا ہے
سمجھتے ہو مجھے تم۔ آہ! کیا ننگِ محبّت بھی

رہونگی میں شریکِ حال پیارے رنج و راحت میں
مصیبت آ پڑے تو میں اٹھاؤنگی مصیبت بھی

تمہاری شکل میرے واسطے جیسی ہو اچھی ہے!
تم اندھے ہو تو کیا غم ہے محبّت خود بھی اندھی ہے

(غیر مطبوعہ)

وقار (انبالوی)

سید عابد علی صاحب عابد
ایم اے - ایم او ایل - ایل ایل بی

شہزادی گامسولینی کی دست راست

ایثار حسن

چھاپنے والے: نیشنل آرٹ پریس انار کلی لاہور

بلاک بنانے والے: مہتہ ہاف ٹون کمپنی انار کلی لاہور

تحفہ!

عمر خیام اور اسکا عہد

(گذشتہ سے پیوستہ)

مندرجہ بالا رُباعیات سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ خیام مذہب کے بنیادی اصولوں کا منکر تھا۔ ان کا مفہوم صرف یہ ہے کہ وہ نظریۂ جبر کا قائل نہیں تھا۔ علامہ شبلی نعمانی اپنی تصنیف "شعر العجم" میں رقمطراز ہیں کہ خیام کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جبر کا قائل تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ علامہ موصوف سے غلطی ہوئی۔ جبر کے متعلق خیام نے جو رباعیات کہی ہیں ان میں ایک رنگ طنز پایا جاتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ خیام ان حکما و علماء کو اپنی تضحیک کا نشانہ بنا رہا ہے۔ جو جبر کے قائل ہیں۔

علاوہ ازیں خیام کے حالات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ خدا کے وجود سے منکر تھا۔ اس جگہ اس کی رباعیات کا حوالہ دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ ابھی ہم نے یہ سوال طے نہیں کیا کہ ان کی شناخت کا معیار کیا ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے ابن القفطی کے الفاظ نقل کر دیئے جائیں۔

وہ رقمطراز ہیں کہ

خیام کے اشعار کے باطنی معانی اسلام کے لئے زہر قاتل حکم رکھتے ہیں۔

اگر ابن القفطی کو معلوم ہوتا کہ خیام خدا کے وجود سے منکر ہے تو وہ ہرگز اس واقع کو چھپانے کی کوشش نہ کرتا۔ پھر "چہار مقالہ" "تاریخ گزیدہ"۔ "جامع التواریخ" جن میں عمر خیام کی زندگی کے جستہ جستہ حالات ملتے ہیں اس مسئلے کے متعلق خاموش ہیں۔ ان واقعات کی بنا پر یہ کہنا زیادہ قرین قیاس ہے کہ خیام کو قادر مطلق کے وجود سے انکار نہ تھا۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک مشہور فلسفی خالق کائنات کے وجود پر اعتبار رکھتے ہوئے اس عقیدے کا قائل ہو کہ انسان اپنے افعال میں مطلقاً مجبور ہے کہ "نیک و بد افعال" کا ارتکاب اس کے اختیار میں نہیں۔

ایپقوریت کے عناصر

فلسفے کا منتہائے نظر اطمینان قلب کا حصول ہے۔ کائنات میں متخالف و متضاد قوتوں میں ہنگامہ برپا ہے۔ اور انسان کا جستجو آشنا دل اس تخالف و تضاد میں ایک عنصر سکون ڈھونڈنے کی کوشش میں مصروف رہا ہے۔ فلسفے کے مختلف مذاہب اور نظریئے اس ذوق نشینی کی آئینہ داری کر رہے ہیں۔ اس بات پر تمام مذاہب متفق ہیں کہ روح انسانی میں جو خواہشات اور جذبات کا ایک طوفان بپا رہتا ہے اُس کا فرو ہو جانا اور کامل اطمینان ہو جانا کائنات کی سب کی بڑی نعمت ہے۔ لیکن اس نعمت عظمیٰ کے حصول کے ذرائع میں اختلاف ہے۔

ویدانت کے اصولوں کے مطابق فطری جذبات و خواہشات کو ترک کر دینا۔ دل کو تمام خیالات فاسدہ سے پاک کر لینا اور دنیوی تعلقات سے آزاد ہو جانے کا نام "اطمینان" ہے۔ کائنات ایک پردہ ہے جو نگار حقیقت کے لئے دل آویز پر چھایا ہوا ہے۔ اس پردے اس "مایا" کو دور کر دینے سے دل نور معرفت سے روشن ہو جاتا ہے اور انسان الوہیت کی حدود میں داخل ہو کر قادر مطلق کی ہستی میں فنا ہو جاتا ہے۔

نیو افلاطونی فلسفے کے مطابق اطمینان قلب "قادر مطلق" سے ہم آہنگ ہو جانے میں پنہاں ہے۔ دیوی دیوتا اس گہری خلیج کو پاٹتے ہیں جو خدا (نفی مطلق) اور انسان کے درمیان حائل ہے۔

شوپنہار کے خیال میں زندگی کے ارادے کو فنا کر دینے کا نام اطمینان ہے ایران کے متصوفین شعرا بھی اس اطمینان قلب کے جویا ہیں اور اس کے حصول کے لئے حسن کی پرستش اور "پیر مغاں" کے انتخاب کو ضروری تصور کرتے ہیں۔ یہ دیہی نو فلاطونی اثر ہے۔ تصوف میں "حسن" کو مظہر خداوندی تصور کیا جاتا ہے۔ اور اس مظہر کے ذریعے "حسن مطلق" تک پہنچنا باقی ذریعوں کی نسبت آسان سمجھا جاتا ہے۔

اس اطمینان قلب و مسرت کے حصول کے لئے جو نظام کار پیش کئے گئے ہیں ان میں سے اپیکورس کا فلسفہ بہت مشہور ہے۔

اپیکورس ایتھنز کا باشندہ تھا اور شروع ہی سے تفکر و تدبر کا عادی تھا۔ اس کی زندگی کے متعلق تفصیلی حالات نہیں ملے۔ البتہ نام نہاد معلمین اخلاق نے جن الفاظ میں اس کو یاد کیا ہے وہ جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ کسی معقول وجہ کے بغیر اس کے نظام عمل کو تعیش اور بدکاری کا ایک خطرناک مجموعہ خیال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کا استدلال اس فطری حقیقت پر مبنی ہے کہ ہر وہ شے جو انسان کو کرب پہنچاتی ہے۔ حیات انسانی کے لئے

معز اور ہر وہ شے جو انسان کو لذت سے آشنا کرتی ہے۔ حیات انسانی میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ گویا نفرت نے ہماری رہنمائی کے لئے مستقبل کی تاریک راہ میں ایک شمع فروزاں کردی ہے۔ احساس لذت والم ان تمام اشیاء کی معزت یا فائدہ رسانی کا معیار ہے۔ جن سے انسان کو واسطہ پڑتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اطمینان حاصل کرنے کا سب سے اچھا ذریعہ نشاط ہے۔ اور از بسکہ وہ روح کو فانی تصور کرتا ہے۔ اس لئے اس زندگی کے "اعمال نشاط" کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ آہ غالب

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

خیام میں ابیقوریت کے عناصر جا بجا پائے جاتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ خیام نے "حصول نشاط" کو "اطمینان خاطر" کا ذریعہ سمجھا اور تصوف کے اس مکمل نظام سے قطعاً متاثر نہ ہوا۔ جو ایران پر چھایا ہوا تھا۔

خیام انبساط اور نشاط کو تقریباً تقریباً "شراب" کا مترادف تصور کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب اس کی زبان پر اس شے کا نام آتا ہے تو اس جوش۔ لذت اور کیف سے آتا ہے کہ روح بالیدہ ہو جاتی ہے۔ شراب اس کے لئے نشاط سرمستی اور زندگی کے تمام خوشگوار اثرات کا سرچشمہ ہے۔ شراب کو اس نے مظہر نشاط بنا کر اس آتش سیال میں اپنے لئے دنیا کی دلفریبیاں پنہاں کر لی ہیں۔ ابیقوریت موجود ہے۔ لیکن ایک عجیب رنگ میں۔ انبساط کی خواہش قایم ہے۔ لیکن صرف شراب کے ذریعے۔

حقیقت یہ ہے کہ شراب کا تصور خیام کے دل پر وہ شاعرانہ کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ جسے اختلال خیالات کہتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مقدمۂ دیوان غالب میں رقمطراز ہیں۔

کانٹ نے اپنی کتاب KRITIK DAR URTHEILSKRAPT میں خوب کہا ہے کہ بہت سے اشعار ایسے ہوتے ہیں جن میں آزاد حسن ہوتا ہے وہ پھولوں کی طرح اپنے معنی نہیں بیان کرتے۔ بلکہ اپنی خوشبو سے مشام جان کو مسرور کرتے ہیں۔ اگر ان کے نثر کرنے اور اُن کے مطالب کے دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ کوشش ایسی ہوگی جس طرح کوئی شخص پھولوں کی خوشبو کو پانے کی غرض سے ان کے پتوں کو توڑ کر علیحدہ کرے۔ بعض اوقات انسان پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس کیفیت میں خواب کی سی حالت ہوتی ہے۔ خواب میں متخیلہ ادراک پر غالب آجاتی ہے اور عجیب پرلطف پریشان مطلب منظاہر پیش کرتی ہے۔

پارودلیتی کی مشہور نظم "میرا خواب" مرزا کے مفصلہ ذیل قطعہ سے کس قدر مشابہ ہے۔

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب
شیشۂ مے سرو سبز جوئبار نغمہ ہے

غالب نشہ کو نخل کی طرح شاداب اور ساز کو مے گسار کی طرح مست بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شیشۂ مے سرود کے جوئبار پر ایک سرو سبز ہے بودلیر لکھتا ہے کہ شاعرانہ کیفیت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب تمام حواس نہایت درجہ تاثیرات پذیر اور ذکی الحس ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں پردۂ ابد تک دیکھنے لگتی ہیں۔ پرشور مقامات میں خفیف سے آواز کو کان سننے لگتے ہیں۔ اور شور سے بالکل ناآشنا رہتے ہیں۔ اختلال خیالات واقع ہوتا ہے۔ اور جملہ اشیائے عالم اپنی صورت سے بسا اوقات دوسری صورتوں میں منقلب ہو جاتی ہیں۔ اور خیالات میں ناقابل حل اطلاقی تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ آوازیں رنگین معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور رنگ میں نغمہ پیدا ہو جاتا ہے۔ غالب کو نشہ شاداب اور ساز مست اور نغمہ آب رواں اور جام سرو سبز نظر آتا ہے۔ لیکن غالب میں یہ کیفیت ایک نہایت معتدل انداز اور صحیح حد تک ہے۔ رمبو کی طرح اُس حد تک نہیں پہنچی کہ جس طرح حروفی حروف کے اعداد میں معنی نہاں پاتے ہیں۔ وہ ہر حرف میں ایک خاص رنگ پاتا ہے۔

شراب کے متعلق خیام پر یہی کیفیت طاری ہے ساغر شراب کی تہہ میں اُسے حسین وجمیل نازنین زرنگار لباس میں مصروف رقص نظر آتی ہیں۔ شراب پھول بنکر اُڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور کیف رنگ بنکر دنیا کو شوخ رنگوں میں غرق کر دیتا ہے۔
کہتا ہے۔

ما و مے و معشوق دریں کنج خراب
جان و دل و جام و جامہ در رہن شراب
فارغ ز امید رحمت و بیم عذاب
آزاد ز خاک و باد و ز آتش و آب
ساقی نظرے کہ دل خوش از دیدن تست
جاں شاد ز خوشہ چینی خرمن تست
ناگفتہ دلت ضمیر ما سید اند
جام جم عاشقاں دل روشن تست
مے نوش کہ عمر جاودانی این است
خود خاصیت دور جوانی این است
ہنگام گل و مل ست و یاراں سرمست
خوش باش دمے کہ زندگانی این است

ساقی قدحے کہ سوز داغم نزدو
تا روغن بادہ در چراغم نزدو
دستے کہ چوں غنچہ در دماغم زدہ ست
منزم بشگافی از دماغم نزدو
ماسیم خریدار سے کہنہ دلق
دانگاہ فروشندۂ عالم یددجو
پرسی کہ پس از مرگ کجا خواہی رفت
مے پیش من آر و ہر کجا خواہی دو

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خیام اپیکورس کی طرح روح کے فانی اور مادے کے غیر فانی ہونے کا قائل تھا۔

ذہن انسانی کی تمام کارفرمائیوں کی بے ثباتی اور مادے کے تفوق کی طرف وہ کئی رباعیوں میں اشارہ کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ کے قباد و کاؤس کی شوکت و عظمت مٹ گئی۔ لیکن وہ مٹی جن سے ان کے جسم تخلیق کئے گئے تھے۔ ابھی تک دوسری شکلوں میں جلوہ گر ہے۔ حسن و جمال کے مجسمے فنا ہوگئے۔ لیکن ان کا رنگ حسین پھولوں کے لباس میں مصروف جلوہ کاری ہے۔ کمہار خود مٹ گیا لیکن اس کے برتن زبان حال سے یہ کہتے ہوئے باقی رہ گئے۔

کو کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش۔ یعنی انسان خود خاک میں مل گیا۔ اور اس کی تخلیقات جن کو وہ حقارت سے دیکھتا تھا۔ جبکہ وہ اپنے ذہن کی جدت آفرینیوں کے باعث صحیح تصور کرتا تھا۔ اس کا مذاق اڑانے کے لئے باقی رہ گئیں۔

کہتا ہے۔

اے خاک اگر سینۂ تو بشگافند
بس گو ہر قیمتی کہ در سینہ تست
ایں کوزہ چو من عاشق زارے بوداست
دربند سر زلف نگارے بودست
ایں دستہ کہ در گردن او مے بینی
دستے است کہ در گردن یارے بوداست
خاکے کہ بزیر پائے ہر حیوانے ست
زلف صنمے و ابروئے جانانے ست
ہر خشت کہ بر کنگرۂ ایوانے ست
انگشت وزیرے و سر سلطانے ست

خاک کو انسان پاؤں کے تلے روندتا ہے۔ اور خاموش۔ پائمال خاک ہنستی ہے۔ ہنستی ہے اور اس دن کے خواب دیکھتی ہے۔ جب وہ انسان کو روند دے گی۔

ایں سبزہ کہ امروز تماشا گہ تست
فردا ہمہ از خاک تو برخواہد رست

یہ مادے کی فتح خیام کو مغلوب غم کر دیتی ہے۔ اور اس غم کی تلخی کو کم کرنے کے لئے وہ شراب کی تلخی کا متمنی ہوتا ہے۔

ساقی بقدر غم نہیں تلخی شراب کی ✦ اے کاش کوئی زہر ملا دے شراب میں

خیام خود تو "اطمینان قلب" کا ذریعہ ڈھونڈھتا ہے۔ اُسے شراب تسکین کا سیلاب بہا کر لے گیا ہے۔ لیکن انسان کی جدوجہد کو دیکھکر وہ حیران ہو رہا ہے۔ آخر یہ ناچیز ذرہ کس طرف جا رہا ہے۔ کیا کر رہا ہے۔ کیوں کر رہا ہے۔ یہ سوالات ہیں جو ہر وقت اس کے دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا جواب اس کے پاس کوئی نہیں۔ اس کے علم کی انتہا یہ ہے کہ اپنے شکوک کا اظہار کر دے۔ اور جب کوئی پوچھے تو کہدے "میں نہیں جانتا"۔ اس اعتبار سے لاادریت (تشکیک) کے عناصر بھی اس کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ لاادریت یا تشکیک تھکے ہوئے یاس آشنا دماغوں کی تخلیق نہیں۔ بلکہ ایک آزاد بے پرواہ اور راز جو ذہنیت کی ترجمان ہے۔ انسانی فطرت کے رموز کو سلجھانے کی کوشش میں ادراک کی حدود سے پرے مافوق الفطرت مظاہر و مناظر تک پہونچ گیا ہے۔

انسان جو شے اُمید کو سراب میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھ کر گر نہیں پڑتا۔ بلکہ اس کے پائے شوق میں برق کی سی تیز رفتاری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ ایک دنیا کے رموز کو منکشف کرنے کے بعد ایک اور نئی دنیا کا راز دریافت کرنے کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ اور پھر اُسے ایسی چیزوں سے سابقہ پڑتا ہے جن کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا۔ وہ بے اختیار یہ کہکر اعتراف عجز کرتا ہے "میں نہیں جانتا"۔ "میں نہیں جانتا" کے معنی یہ ہیں کہ "میں نہیں جانتا لیکن جاننا چاہتا ہوں"۔

عالم انسانی محدود ہے۔ مختلف اشیاء مختلف آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ غائب اشیاء کا دریافت کرنا محال ہے۔ ایک ہی شے ایک ہی قسم کے حالات میں ایک شخص کو بُری اور دوسرے شخص کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ مظاہر و مناظر فطرت کی حقیقت دریافت کرنے کا معیار نیا ہے۔

غم میں آسمان پر شفق کا جلوہ زار خون آرزو کا سیلاب معلوم ہوتا ہے غنچے دلہائے افسردہ معلوم ہوتے ہیں۔ فنا ہو جانے والی پتیوں کا مجموعہ

نظر آتا ہے۔ خوشبو دماغ کو پریشان کرتی ہے۔ ہوا کے جھونکے اپنے دوش پر بار ہائے کرب لاتے ہیں۔ اس کے برخلاف مسرت کے عالم میں دنیا پر ایک نیا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ ہر شے شاداب اور رنگین نظر آتی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ ع

بے یار بہار خوش نباشد

پھر یہی نہیں کہ مختلف اشیا مختلف حالات میں مختلف رنگوں میں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ بلکہ ان کی ماہیت دریافت کرنے کا کوئی ایسا عالمگیر ذریعہ نہیں جو خود کسی اور ذریعے کا محتاج نہ ہو۔

لاادریت انھیں اصولوں پر مبنی ہے۔

مظاہر قدرت میں انسان تخلیق اکبر ہے۔ لیکن اس کی تخلیق کی علت غائی اور اس کی جد و جہد حیات کا انجام بھی غیر تیقن ہے۔ ایک یہی دنیا نہیں جس میں حقیر انسان بستا ہے۔ بلکہ کائنات میں اور کئی کرّے ہیں۔ ان کی تخلیق کا باعث کیا ہے۔ انسان کا ان سے کیا تعلق ہے؟ ازل اور ابد کے کیا معنی ہیں؟ یہ ایسے سوال ہیں جو انسان کی قوت تفکر کے پیدا ہونے کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔

خیام کہتا ہے۔

دورے کہ درو آمدن و رفتن ماست
آں را نہ بدایت نہ نہایت پیداست
کس مے نزند دمے دریں معنی راست
کیں آمدن از کجا و رفتن زکجاست

تیسرا مصرع تخلیق اکبر کی علت غائی کے متعلق جو مختلف نظریے قائم ہیں ان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ خیام نے "راست" کے لفظ سے اپنے "شک" کو پختہ کارانہ شک کے رنگ میں ظاہر کیا ہے۔ اُسے اس بات کا اعتراف ہے کہ انسان کی ابتداء و انتہا کے متعلق مختلف مذاہب ہیں۔ لیکن یہ امر ہنوز "پردہ شک" میں ہے کہ صحیح نظریہ کونسا ہے۔

مشنو سخن بہشت و دوزخ از کس
کہ رفت بہ دوزخ و کہ آمد ز بہشت
در پردۂ اسرار کسے را رہ نیست
زیں تصفیہ جاں ہیچ کس آگہ نیست
جز در دل خاک ہیچ منزل گہ نیست
افسوس کہ ایں فسانہ ہم کوتہ نیست
آسودہ دریں جہاں کسے دائم کیست
ایں نفسے زیر گ مے نتواں زیست

پس فائدہ در جہاں بے فائدہ چیست
از گردش چرخ ہیچ معلوم نیست
جز رنج زمانہ ہیچ موسوم نیست
ہرچند بکار خویش در مے نگرم
عمرے بگذشت و ہیچ مفہوم نیست

حقیقت یہ ہے کہ خیام کا شک ایمان کے درجے تک پہونچا ہوا ہے۔[1]

ملک ناروے کا مشہور ادیب ہنرک ابسن اپنے ناٹک "وارثان تخت" میں بادشاہ اور مغنی کے درمیان مفصلہ ذیل گفتگو لکھتا ہے۔

بادشاہ۔ تم کس طرح مغنی ہو گئے۔ تم نے فن موسیقی کس سے حاصل کیا؟

مغنی۔ جہاں پناہ۔ فن موسیقی تحصیل نہیں ہو سکتا۔

بادشاہ۔ نہیں!

مغنی۔ نہیں۔ میں نے یہ خداداد اکرام غم کے ہاتھوں پایا ہے

بادشاہ۔ تو کیا مغنی ہونے کے لئے غم کی ضرورت ہے۔

مغنی۔ مجھکو غم سے یہ دولت ملی۔ بعض کو مسرت سے یہ نعمت حاصل ہوتی ہے اور۔

بادشاہ۔ اور . . . .

مغنی یقین سے جو ایمان کے درجہ تک ہو اور شک سے . . . .

بادشاہ شک سے بھی۔

مغنی جو ایمان کے درجے تک ہو ناقص نہ ہو۔

بادشاہ۔ ناقص شک کس کو کہتے ہیں

مغنی۔ جہاں پناہ۔ جس میں شک کرنے والے کو خود اپنے شک میں شبہ ہو۔ یہ شفق ہے نور اور ظلمت دن اور رات دونوں سے محروم رکھتی ہے۔

خیام اس ہولناک اور مہیب شفق کی بھول بھلیاں میں نہیں جو نور اور ظلمت رات اور دن دونوں سے محروم رکھتی ہے۔ "شک" کا آفتاب اس کے پہلو میں جلوہ گر ہے۔ اور اسی آفتاب کی روشنی سے اس کی دنیا کا ہر ذرہ منور ہو گیا ہے۔ اس شک کی وجہ سے وہ مختلف مذاہب و ملت کے متخالف و متضاد دعوؤں سے آزاد ہو گیا ہے۔ عقل اور مذہب کی شعبدہ کاریاں اُسے نہیں ستاتیں۔ جنت اور دوزخ کے افسانے اُسے نہیں لبھاتے۔ حقیقت اور شریعت کے نازک امتیازات اس کے لئے بے معنی ہیں۔

---

[1] مقدمہ دیوان غالب

کہتا ہے

رندے دیدم نشستہ خنگ زمیں
نے کفر نے اسلام نہ دنیا و نہ دیں
نے حق نہ حقیقت نہ شریعت نہ یقیں
اندر دو جہاں کرا بود زہرہ ایں

قنوطیت یا رجائیت

خیام کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد مجھے ابھی اس امر میں شک ہے کہ اس کی رباعیات کا مرکزی خیال اور مرکزی جذبہ قنوطیت کی گہری تاریکی ہے۔ یا رجائیت کی شمع فروزاں۔

مسٹر آرتھر دتھغاند کا خیال ہے کہ ایرانی فطرتاً ایک یاس آشنا ذہنیت رکھتے ہیں اور قنوطیت کے عناصر ان کی اجتماعی زندگی کے اجزائے اعظم ہیں۔ ان کے خیال میں عمر خیام کی رباعیات سے مجموعی طور پر یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس کے ذہن پر قنوطیت کا رنگ غالب تھا۔

وہ رقمطراز ہیں

"تشکیک شئے یا اس کے قومی کردار سے ایک اور خصوصیت پیدا ہوتی ہے۔ عمر کے رباب شاعری سے ایک دردناک مسلسل اور متواتر نغمہ قنوطیت نکلتا ہے۔ جو اس کی رباعیات کا مرکزی خیال ہے۔ یہ نغمہ قنوطیت مدھم اور بلند سروں میں سنائی دیتا ہے۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خیام اس پراسرار دنیا میں تنہا ناچیز انسان کی بے بسی پر ماتم کر رہا ہے۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ تغیرات عالم اور جام فنا کی تلخیوں سے متاثر ہو رہا ہے ایمان و عرفان کے نور کے بغیر انسان ایک پیکر ناامیدی بنکر رہ جاتا ہے۔ اس کا غم عام ہے۔ تمام دنیا کے لئے ہے۔ وہ ایک قوی ہیکل دیو کی طرح کائنات کے رنج و الم کو اپنے شانوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔

خیام کے بہترین اشعار وہی ہیں جن میں عظیم و خوبصورت اشیا کے فنا ہو جانے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فنز جیرلڈ کے انگریزی ترجمے نے ان رباعیات کے دردناک انداز کو اور بھی تیز کر دیا ہے۔ اس کے اشعار سسکیاں لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

آ۔ کہتا ہے

پیش از من و تو لیل و نہارے بود است
گردندہ فلک برائے کارے بود است"

ان رباعیات کے ساتھ ساتھ جب ان اشعار کا مطالعہ کیا جائے جن میں حصول انبساط کی تلقین کی گئی ہے۔ تو یہ اندازہ قائم کرنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ کہ خیام کے اشعار کا مرکزی خیال قنوطیت ہے یا رجائیت۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا ایک طوفان بلا ہے۔ غم و رنج کے خوفناک تھپیڑے انسان کو ساحل مقصود تک پہونچنے سے دور رکھتے ہیں۔ لیکن اس طوفان فنا میں ایک طرب زار حسن و جمال بھی نہاں ہے اور اس جنت نگاہ و فردوس گوش۔ لالہ زار کی رنگینی حیات کی تمام کاہشوں کی تلافی کر دیتی ہے۔ خیام اپنی فانی زندگی کو عیش و نشاط سے لبریز کرنے کے لئے ہر شئے میں حسن دیکھتا ہے۔

لعل لب کی سرخی۔ نرگس نیم باز کی مستی اور دست حنا مالیدہ کی رنگینی کیا کم ہے۔ شفق کے دلربا جلوے۔ سحر کی ضیا پاش سحر کاری موجود ہو تو انسان غم و اندوہ کے تاریک بادلوں کی طرف کیوں نظر کرے۔ خیام بادۂ ارغواں سے غم کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہے۔ اور اس کے بعد عشق کی محبت میں غرق ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر زندگی کا لطف حاصل کرنا ہو تو پہلے "بیخودی" کا حصول ضروری ہے۔ اس کے بغیر عقل بزرگ کار اپنے مشوروں سے دل کو آشنائے غم کرتی رہے گی۔ نشاط کا حصول صرف اس حالت وجد میں ممکن ہے جو شراب ارغواں یا شراب محبت کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

غالب نے بھی کئی جگہ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

کہتا ہے۔

نہ بہار کو فرصت بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبی ہوا کہئے
نہ نگار کو الفت نہ نگار تو ہے
روانی روش و مستی ادا کہئے

(باقی آئندہ)

عابد

رہرو اور رہزن

روان ہیں رہزنوں کے قافلے صحرائے وحشت سے
یہ کیسے لوگ ہیں لڑنے چلے ہیں دیوِ فطرت سے

وہ ظُلمت ہے کہ ہیبت کا فرشتہ کانپ جاتا ہے
وہ تاریکی ہے شیطانوں کا دل بھی خوف کھاتا ہے

اسی سنسان تاریکی کے وسعت گیر دامن میں
اسی سنسان خاموشی کے بے تنویر مسکن میں

جرائم کے ہلاکت آفریں ہیجان پنہاں ہیں
لباسِ آدمی میں سنگ دل حیوان پنہاں ہیں

یہ وہ انساں ہیں جن سے آدمیت خوف کھاتی ہے
یہ وہ وحشی ہیں جن سے بربریت خوف کھاتی ہے

یہ غارتگر۔ لٹیرے۔ راہزن ہیں کاروانوں کے
یہ ہیرو ہیں سیہ کاری کے شیطانی فسانوں کے

یہ جنگل ایک گہوارہ ہے خونی وارداتوں کا
یہ صحرا ایک میداں ہے جنونی وارداتوں کا

یہاں کا ذرہ ذرہ ظلم و سفاکی کا مظہر ہے
یہاں کا آسماں اک نیلگوں خاموش پتھر ہے

نیاموں سے نکل آتی ہیں جب خونریز شمشیریں
برستی ہیں اندھیرے میں جب آتش ریز شمشیریں

تھکے ماندے مسافر جب یہاں فریاد کرتے ہیں
غریب انسان جب یوں بیکسی کی موت مرتے ہیں

زمیں پر رقص جب کرتی ہیں لاشیں بیگناہوں کی
سنی جاتی ہیں جب مظلوم آہیں بے گناہوں کی

سکونِ بیکراں میں کوئی ہنگامہ نہیں اٹھتا
زمین و آسماں میں کوئی ہنگامہ نہیں اٹھتا

غیر مطبوعہ

سید عبدالحمید عدم

چار دن کا عذاب

(ایک روسی افسانہ)

مجھے جنگل میں بھاگنا۔ گولیوں کی آواز سننا۔ شکستہ ٹہنیوں کا زمین پر گرنا۔ جھاڑیوں میں پناہ لینا خوب یاد ہے۔ جنگل کے دوسرے کنارے پر ایک سرخ شے نمودار ہوئی۔ دفعتاً سدرو جو نمبر ۱ کمپنی میں ملازم تھا چار زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اور میری طرف بڑی بڑی اور وحشت انگیز آنکھوں سے گھورنے لگا۔ اس کے منہ سے خون جاری تھا۔ اور مجھے بھی یاد ہے کہ میں نے اسکو جھاڑیوں میں پناہ گزیں ہوتے دیکھا۔ وہ قوی ہیکل اور فربہ اندام تھا۔ میں باوجود اپنی نقاہت کے اس کی طرف تیر کی مانند سیدھا دوڑتا ہوا گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے پاس سے کوئی شے نہایت تیزی سے گزری ہے۔ میرے کان انگارہ بن گئے۔ میں نے خیال کیا کہ شاید وہ مجھ پر حملہ کر رہا ہے۔ لیکن ایک مہیب چیخ کے ساتھ وہ جھاڑیوں میں پوشیدہ ہو گیا۔ شاید وہ جھاڑیوں کے اردگرد چکر کاٹتا لیکن بدحواس ہو کر اس نے اپنے آپ کو خاردار جھاڑیوں میں چھپا لیا۔ میں نے ایک ہی ضرب میں اس کے ہاتھ سے بندوق چھڑا لی۔ اور اپنا خنجر اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ ایک گرج نے مجھے بیدار کر دیا۔ ہمارے آدمیوں کے نعرہائے انبساط سے آسمان گونج اٹھا۔ جب میں جنگل سے باہر نکلا تو مجھے بیشمار گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ یکلخت نعروں کی آواز بند ہو گئی۔ اور ہمارے آدمیوں نے قدم آگے بڑھائے۔ میں وہیں پڑا رہا یہ عجیب معاملہ تھا۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب تمام آوازیں یکلخت بند ہو گئیں مجھے کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مجھے نیلے رنگ کی کوئی شے نظر آئی۔ شاید آسمان تھا۔ لیکن پھر وہ بھی مفقود ہو گیا۔

میری عجیب حالت تھی۔ میں پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اور سوائے ایک چھوٹے سے ٹکڑے زمین کے اور مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ گھاس کے چند تنکے۔ ایک چیونٹی جو ایک تنکے پر اوپر نیچے اتر چڑھ رہی تھی اور خشک پتوں کا ایک ڈھیر۔ یہ تمام اشیاء میری کل کائنات تھیں۔ اور میں یہ تمام چیزیں صرف ایک آنکھ سے دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ دوسری آنکھ کسی بھاری چیز سے بند تھی شاید وہ ٹہنی جس پر میں دراز تھا۔ میں نہایت بیتاب تھا۔ اور وہاں سے جنبش کرنے کا متمنی لیکن یہ میرے فہم و ادراک سے باہر تھا کہ میں کیوں جنبش کرنے سے قاصر ہوں۔ وقت گزر رہا تھا اور مجھے سوائے پتنگے اور شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ آخر بڑی جدوجہد کے بعد میں نے اپنا دایاں بازو جسم کے نیچے سے باہر نکالا اور اپنے دونو ہاتھوں کے سہارے سے اٹھنے کی سعی کی۔

کوئی شے صاعقہ نواز سرشت سے میرے تمام جسم میں سر سے لیکر پاؤں تک سرایت کر گئی اور میں پھر زمین پر گر پڑا۔ پھر عمیق تاریکی چھا گئی۔

میں بیدار ہوا۔ میں بلگاریا کے سیاہ فام آسمان پر روشن ستاروں کو کیوں دیکھ رہا ہوں؟ کیا میں اپنے خیمہ میں موجود نہیں؟ میں نے اس کو کیوں چھوڑا؟ میں نے ذرا جنبش کی تو میری ٹانگوں میں ایک جانگداز درد پیدا ہوا۔

میں مجروح ہو گیا ہوں۔ میں نے زخموں کو چھوا۔ دونوں ٹانگوں پہ خون منجمد تھا۔ جب میں ان کو چھوتا تو شدت درد میں اضافہ ہو جاتا۔ وہ درد دانتوں کے درد سے مشابہ تھا۔ مسلسل اور جانگسل میرے کان شعلہ انگیز تھے اور سر پتھر کی طرح بھاری۔ میں نے خیال کیا کہ میری دونو ٹانگیں زخمی ہیں لیکن کس طرح؟ میں یہاں سے اٹھایا کیوں نہیں گیا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ دشمن نے ہم کو شکست دی؟ اول تو ایک دھندلا سا خاکہ میری نظروں کے سامنے آیا پھر صاف طور پر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہم دشمن سے شکست نہیں کھا سکتے لیکن میں یہاں سے اٹھایا کیوں نہیں گیا؟ یہ کھلا میدان ہے۔ یہاں ہر شے صاف طور پر نظر آتی ہے۔ اور صرف میں ہی نہ تھا بلکہ اور بھی۔ لڑائی نہایت جنگجو تھی۔ میں نے اپنے سر کو موڑ کر چاروں طرف ایک نظر دوڑائی۔ یہ اب آسان تھا کیونکہ جب میں گھاس اور چیونٹی کو دیکھ کر اٹھنے کی جدوجہد میں گر پڑا تھا لیکن

پہلے کی طرح منہ کے بل نہیں بلکہ اپنی پشت پر۔ اسوجہ سے میں ستاروں کو دیکھ سکتا ہوں۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گو دونوں ٹانگیں مجروح ہونے کی وجہ سے یہ نہایت دقت طلب امر تھا۔ مایوسی مجھ پر کئی بار حملہ آور ہوئی۔ لیکن آخر کار میں اس پر غالب آ گیا۔ شدت درد سے میری آنکھیں اشک آلود تھیں۔ میرے اوپر نیلے آسمان کا ٹکڑا تھا جس پر ایک روشن اور بہت سے مدھم ستارے چمک رہے ہیں۔ میرے اردگرد لمبی اور سیاہ جھاڑیوں نے احاطہ کیا ہوا ہے۔

مجھے محسوس ہوا کہ میرے بال خوف سے کھڑے ہو گئے ہیں جب دشمن نے مجھے نشانہ بنایا تو میں جھاڑیوں میں آ گیا۔ یہ کسقدر تعجب انگیز ہے کہ میں زخمی ہو کر یہاں رینگتا ہوا آیا۔ اور اب درد سے بیتاب ہوں اور ہلنے سے معذور۔ شاید اس وقت مجھے ایک زخم لگا ہوگا اور دوسرا یہاں پہنچکر زردی مائل روشنی نمودار ہوئی۔ روشن ستارے مدھم ہونے لگے۔ اور چھوٹے چھوٹے ستارے غائب ہو گئے۔ نورانی چاند نکل رہا ہے۔ آہ یہ گھر میں کیسا خوشنما معلوم ہوتا ہوگا

حیرت انگیز آوازیں سنائی دینے لگیں۔ گویا کوئی گریہ وزاری میں مبتلا ہے۔ کیا کوئی میری طرح بھولا بھٹکا یا زخمی میرے نزدیک ہی کراہ رہا ہے۔ گریہ زاری کی آواز بالکل قریب تھی۔ لیکن کوئی انسان نظر نہ آتا تھا۔ اوخدا یہ تو میری گریہ زاری کی صدائے بازگشت ہے۔ آہستہ آہستہ اور موثر آہ و بکا کسقدر الم انگیز ہے۔ لیکن اس کی ماہیت حقیقی طور پر سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیونکہ میرا دماغ پریشان ہے اور سر سیکے کی طرح بھاری۔

بہتر ہے کہ میں لیٹ کر سو جاؤں۔ کیا میری تقدیر میں دوبارہ بیداری سے ہم آغوشی لکھی ہے؟ لیکن مجھے اس بات سے اب کیا سروکار ہے؟ اس وقت جب میں لیٹنے کی تیاری کر رہا ہوں۔ چاند کی ایک سفید کرن اس مقام کو بروز روشن کی طرح منور کر رہی ہے اور مجھے چند گز کے فاصلے پر ایک سیاہ چیز دکھائی دی۔ اور بٹن یا اسباب جنگ چمک رہا تھا۔ یا تو ایک نعش ہے یا کوئی زخمی۔ مجھے کیا میں تو آرام کرتا ہوں۔ یہ ناممکن ہے کہ ہمارے آدمی چلے جائیں۔ وہ دشمن کو شکست دیکر اپنی حکومت کا سکہ بٹھائیں گے۔ لیکن میں خیموں میں جلتی ہوئی آگ کی آواز کیوں نہیں سنتا۔ یقیناً نقاہت نے میری قوت سماعت سلب کر لی ہے۔ وہ ضرور یہاں ہی ہونگے۔ "مدد کرو۔ مدد کرو۔" میرے سینے سے خود بخود خفیانہ آواز نکلی مگر جواب ندارد۔ آوازرات کی مرطوب ہوا میں گونجی۔ ہر چہار سو سکوت طاری ہے۔ چاند رحم اور ہمدردی سے مجھ پر اپنا نور برسا رہا ہے۔ اگر وہ زخمی ہوتا تو میری آواز اس کو بیدار کر دیتی۔ وہ ایک لاش ہے۔ لیکن ہماری فوج کی یا دشمن کی؟ میں اس کی فکر کیوں کروں؟ نیند نے میری دھکتی ہوئی آنکھوں کو پھر بند کر دیا۔

گو میں کچھ عرصے سے بیدار ہو چکا تھا لیکن آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹا رہا۔ میں اپنی آنکھوں کو کھولنا نہیں چاہتا کیونکہ بند پلکوں میں بھی تمازت آفتاب محسوس کرتا ہوں۔ اگر میں آنکھوں کو کھولوں تو تکلیف ہوگی۔ اس کے علاوہ ساکت و صامت پڑے رہنا بہتر ہے۔ میرا خیال ہے میں کل زخمی ہوا تھا۔ ایک دن گزر چکا ہے۔ اسی طرح اور بھی گزر جائینگے۔ اور میں لقمۂ اجل بن جاؤنگا۔ بہتر ہے کہ میں جنبش نہ کروں اور میرا جسم ایسا ہی پڑا رہے۔ میرے لئے سکون قلب کسقدر بہتر ہوگا۔ لیکن کوئی چیز خیالات کی گردش میں مانع نہیں ہو سکتی۔ میرا دماغ گوناگوں خیالات اور ماضی کی یاد سے لبریز ہے۔ خیر یہ بہت دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اور اس کا اختتام قریب ہے۔ ہر شے فانی ہے۔ سوائے اخبار کی چند سطور جس میں ہمارے قلیل زیاں۔ استنے زخمی اور فلاں مقتول درج ہوگا۔ نہیں وہ میرا نام شائع نہیں کریں گے۔ وہ صرف "ایک مقتول" تحریر کریں گے۔ جس طرح کوئی کہہ سکتا ہے' ایک کتا' یہ تمام منظر میرے پیش نظر ہوا۔ یہ میری گذشتہ زندگی کا المناک منظر ہے۔ زخمی ہونے سے پیشتر میں بازار میں گھوم رہا تھا کہ ایک مجمع نے میری توجہ کو جذب کر لیا۔ یہ مجمع ایک سفید چیز کے اردگرد جو خون سے تر اور درد سے چلا رہا تھا احاطہ کئے ہوئے تھا۔ یہ ایک خوبصورت کتا تھا جو ٹریم کے نیچے آ کر کچلا گیا۔ وہ دم توڑ رہا تھا۔ عین اس طرح جسطرح کہ میں اب حالت نزع میں ہوں۔ ایک قلی مجمع کو چیرتا ہوا کتے کو گردن سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے گیا اور مجمع منتشر ہو گیا۔

کیا مجھے بھی کوئی یہاں سے لے جائیگا؟ نہیں بلکہ میں یہیں پڑا سڑ جاؤنگا۔ آہ زندگی کسقدر خوبصورت ہے۔ اس روز میں نہایت خوش تھا۔ میں ایک مست شرابی کی طرح جھوم جھوم کر گلیوں کو طے کر رہا تھا۔ او واقعات ماضی کی یاد میرا دامن چھوڑ دے۔ مجھے اذیت نہ پہنچا۔ ماضی کی مسرت اور موجودہ آلام .... درد کو برداشت کرنا اور حافظہ کی اذیت جو مشابہت کی محرک ہے سے پرہیز کرنا بہتر ہے۔ یہ اذیت درد دنداں سے بھی بدتر ہے۔

تپش بڑھ رہی ہے۔ سورج آتشیں ہے۔ میں نے آنکھ کھولی

تو مجھے وہی جھاڑیاں ۔ وہی آسمان اور ایک ہمسایہ نظر آیا ۔ وہ دشمن کی لاش ہے ۔ وہ قوی جثہ ہے ۔ میں نے اس کو پہچان لیا ۔

میری نظروں کے سامنے مقتول تھا ۔ میں نے اس کو کیوں قتل کیا؟ وہ یہاں خون میں نہایا ہوا مردہ پڑا ہے ۔ وہ کون ہے ؟ شاید میری طرح اس کی بھی ماں بوڑھی ہوگی ۔ کافی دیر تک وہ اپنے جگر گوشے کے لئے اپنے جھونپڑے کے دروازہ پر راہ دیکھیگی ۔ کیا اس کا پیارا، اس کا دستگیر اس کو فکر معاش سے نجات دینے والا واپس جائیگا؟ اور میں؟ میں اس کے بدلے جاؤنگا ۔ وہ خوش ہے وہ سنتا نہیں ۔ وہ زخم کے درد یا تشنگی یا اس مصیبت کو محسوس نہیں کرتا ۔ میرے خنجر نے اس کا کام تمام کیا ۔ اس کے سینے میں ایک بڑا سیاہ داغ ہے جس کے اردگرد خون منجمد ہے یہ میرے خنجر کا زخم ہے ۔

میں اس کا متمنی نہ تھا ۔ جب میں فوج میں بھرتی ہوا تو میرے دل میں کسی کو قتل کرنے کی خواہش نہ تھی ۔ میرے خیال میں میں نے اپنا سینہ اس کی بندوق کا نشانہ بننا کس لئے پیش کیا تھا ۔

یہ بدنصیب مصری (اس نے مصری فوج کی وردی پہنی ہوئی تھی) اسقدر موردِ الزام نہیں جسقدر کہ میں ۔ اس نے بلگاریا یا روس کا نام بھی نہ سنا تھا ۔ اس کو جانے کا حکم دیا گیا اور وہ چلا آیا ۔ اور اگر وہ انکار کرتا تو یا تو چھڑیوں کی ضربوں کا شکار ہوتا یا پاشا کی بندوق کا نشانہ بنتا ۔ اس نے استنبول سے لیکر رسچک تک کا دور دراز اور پرخطر سفر طے کیا ۔ ہمارے حملہ کی انہوں نے مدافعت کی ۔ ان کو معلوم ہوگیا کہ ہم ان کے خارا شگاف اسلحہ یا شجاعت سے خائف نہیں بلکہ برابر قدم آگے بڑھا رہے ہیں ۔ وہ خوفزدہ ہوکر اپنی جان بچانے کے لئے بھاگنے کا متمنی تھا کہ ایک کمزور آدمی نے جس کو وہ اپنے ایک ہی تھپڑ سے موت سے ہم آغوش کر دیتا ۔ اپنا خنجر اس کے سینہ میں گھونپ دیا ۔ وہ کس طرح موردِ الزام ہوسکتا ہے اور میں بھی کس طرح ؟ گو میں اس کا قاتل ہوں ۔ لیکن میں تشنگی کے عذاب کا شکار کیوں ہوگیا ؟ پیاس ؟ اس لفظ کے معنی کو کون جانتا ہے ؟ جب ہم رومانیا سے گذر رہے تھے تو آفتاب کی حرارت ۱۰۰ درجہ تھی لیکن مجھے اسقدر تکلیف محسوس نہیں ہوتی تھی ۔ آہ اگر کوئی اسوقت آجائے ۔ او خدا اس کی بڑی کپی میں ضرور پانی ہوگا ۔ مجھے صرف وہی درکار ہے اور اس کا خمیازہ کیا بھگتنا پڑیگا ؟ لیکن مجھے اس کے پاس جانا پڑیگا ۔

میں نے رینگنا شروع کیا ۔ میری ٹانگیں جکڑی ہوئی تھیں ۔ بازوؤں میں حرکت کرنے کی قدرت نہ تھی ۔ جسم سکّے کی طرح بھاری گویا میں زمین میں جکڑا ہوا تھا ۔ اور وہ نعش کوئی ۱۲ گز کے فاصلہ پر پڑی ہوئی تھی ۔ لیکن میرے لئے تو یہ فاصلہ ۱۲ میل سے کم نہ تھا ۔ میرے حلق سے شعلے نکل رہے تھے ۔ انسان پانی کے بغیر بہت جلد مرجاتا ہے ۔ لیکن پھر بھی میں رینگنے لگا ۔ ہر جنبش سے میرے جسم میں ایک جانگسل درد پیدا ہوتا تھا ۔ میں گریہ زاری کرتا ہوا رینگتا رہا ۔ آخرکار میں اس کے قریب پہنچ گیا ۔ کپی نصف سے زائد پانی سے پر تھی ۔

مقتول تو نے میری زندگی بچالی ۔ ایک کہنی کے سہارے میں نے اس کا منہ کھولا اور میں یکلخت اپنے جسم توازن قائم نہ کرسکنے کی وجہ منہ کے بل اپنے نجات دہندہ کی چھاتی پر گر پڑا ۔

میں نے پانی پیا ۔ پانی صاف ۔ گرم اور زیادہ تھا ۔ میرا رشتہ زندگی دراز ہوگیا ۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے علم وظائف الاعضا کی کتاب میں پڑھا تھا کہ انسان پانی کے ذریعہ چند ہفتے زندہ رہ سکتا ہے ۔ اور اسی میں ایک آدمی کے متعلق مندرج تھا جس نے فاقہ کشی سے خودکشی کا اقدام کیا اور وہ پانی کی وجہ سے بہت دنوں تک زندہ رہا ۔

لیکن اگر میں پانچ یا چھ دن اور زندہ رہا تو پھر کیا ہوگا ۔ ہمارے سپاہی سب چلے گئے ہیں ۔ بلغاریا والے فرار ہوچکے ہیں ۔ گردونواح میں کوئی شاہراہ نہیں ۔ میری موت اسی جگہ یقینی ہے ۔ میں تین دن کے عذاب کو ایک ہفتے میں تبدیل کر رہا ہوں ۔ کیا میرے لئے موت بہتر نہ ہوگی ۔ میرے ہمسایہ کی بندوق جو انگریزی کارخانہ کی بہترین صنعت ہے اسکی بغل میں ہے ۔ میں صرف اپنا بازو دراز کرکے اس کو حاصل کر سکتا ہوں ۔ پھر اس مصیبت سے نجات حاصل ہوجائیگی ۔ بہت سے کارتوس زمین پر بکھرے ہوئے ہیں ۔ جن کو وہ استعمال نہیں کرسکا ۔

کیا میں اپنے آپ کو ہلاک کرلوں یا کس کا منتظر رہوں؟ کس لئے؟ نجات؟ موت؟ لیکن مجھے ہمت نہیں ہارنی چاہیئے ۔ میں اپنے آخری لمحوں تک موت کا مقابلہ کرونگا ۔ اگر ایک دفعہ ہمارے سپاہی میری جستجو میں کامیاب ہوگئے تو میری جان بچ جائیگی ۔

شاید میرے اعضا صحیح و سالم ہیں ۔ اور وہ میری صحت کو بحال کرسکیں ۔ میں ضرور اپنے وطن کو مراجعت کرونگا ۔ او خدا میری ماں اور میری محبوبہ کو اس کلفت کی خبر نہ ہونے دے ۔ ان کو میری موت کا پتہ ملجائے لیکن ان کے لئے میرے دو تین یا چار دنوں کے مصائب و آلام کی حقیقت ناقابل برداشت ہوگی ۔

میرا سر چکرانے لگا ۔ میرے ہمسایہ تک کے سفر نے مجھے چکناچور

کردیا۔ اور اب یہاں اس کی جانگداز تعفن میرے لئے سوہان روح
ہے۔ اس کا رنگ سیاہ ہے کل یا پرسوں اس کی شکل وصورت کیسی
تھی۔ میں بے بال و پر یہاں اس لئے پڑا ہوں کچھ دیر آرام کرکے میں
واپس لوٹ جاؤنگا۔ خوش قسمتی سے ہوا ابھی اسی طرف چل رہی ہے
اور اس تعفن کو اپنے ساتھ لے جائیگی۔ میں وہاں بے حس وحرکت
تھکا ماندہ پڑا رہا۔ تمازت آفتاب سے میرا چہرہ اور ہاتھ جھلس گئے۔
میرے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے میں اپنے جسم کو ڈھانپ سکوں۔
میں شام کا منتظر تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ دوسری رات ہوگی۔
میرے خیالات منتشر ہوگئے اور میں اونگھنے لگا۔

میں بہت دیر تک اسی حالت میں پڑا رہا۔ لیکن جب میں نے آنکھ
کھولی تو رات اپنا سیاہ لبادہ دنیا پر ڈال چکی تھی۔ وہ سب شباہ پہلی رات
کی طرح تھیں۔ میرے زخموں میں جانگسل درد تھا۔ میرا مقتول بے حس حرکت
پڑا ہوا تھا۔ وہ میرے خیالات و تصورات پر قبضہ کئے ہوا تھا۔
کیا یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ میں اپنے عزیز و اقارب کو داغ مفارقت
دیکر اور اتنا طول طویل سفر کرکے تمازت اور اس مصیبت کا شکار ہو جاؤں۔
میں نے اس قتل کے علاوہ اور کونسے کارہائے نمایاں کو سرانجام دیئے
ہیں۔

قتل؟ قاتل؟........کون؟........میں؟

جب میں نے فوج میں بھرتی ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تو میری ماں
اور بیوی کے لبوں میں جنبش ہوئی۔ گو ان کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے۔
میں اپنے عزم میں اندھا تھا اور ان کے اشکہائے محبت کو دیکھ نہ سکا۔
میں یہ محسوس نہ کرسکا (لیکن اب اس کا احساس ہورہا ہے) کہ میں اپنے
عزیز و اقارب کو داغ جدائی دے رہا ہوں۔ لیکن اب ان کی یاد کو تازہ
کرکے اپنے آلام ومصائب میں اضافہ کیوں کروں۔ ع

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔

میرے بعض احباب و شناسا سے میری بھرتی کے وقت عجیب و
غریب حرکات سرزد ہوئیں۔
"یہ کیسا سودائی ہے جو ایسی خدمات سرانجام دینا چاہتا جس کا
وہ اہل ہی نہیں"

بادِ سحر کا جھونکا آیا۔ جھاڑیوں میں جنبش ہوئی۔ پرندے صبح کے
راگ الاپنے لگے۔ ستارے مدھم ہوگئے۔ یہ میرے تیسرے دن کی
ابتدا تھی۔ میں اس کو کس چیز سے تعبیر کروں۔ زندگی یا عذاب ہے؟

یہ تیسرا دن ہے۔ ابھی میری زندگی کے کتنے دن باقی ہیں۔ بہرحال چند!
میں بہت لاغر اور نحیف ہوگیا ہوں اور اس نعش سے دور ہٹنے سے قاصر۔
بہت جلد ہم دونوں کی حالت یکساں ہوجائے گی اور یہ ناگواری دور۔
مجھے پانی پینا چاہیئے میں نے ارادہ کیا کہ دن میں تین دفعہ یعنی صبح۔
دوپہر اور شام کو پانی پیونگا۔

آفتاب طلوع ہوگیا۔ اس کی خون کی مانند سرخ شعاعیں جھاڑیوں سے
چھن چھن کر آرہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج کا دن کل سے زیادہ آتشیں
ہوگا۔ میرے کشتے تیرے ساتھ کیا گذریگی اب ناقابل برداشت ہے۔
اس کی شکل وحشت انگیز اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ قدرتی
طور پر سیاہ اور پژمردہ تھا۔ اور اس کی جلد اسقدر سخت ہوگئی کہ کان کی پشت
سے چھٹ گئی تھی۔ اس کی پنڈلیاں جو بھاری پٹیوں سے ملبوس تھیں ورم
شدہ تھیں۔ اور ٹخنوں کے درمیانی حصہ میں پھپھولے تھے۔ اس کا جسم
پھول کر کپا ہوگیا۔ آج تمازت آفتاب سے اس کی کیا حالت ہوگی؟
اس کے قریب پڑا رہنا ناقابل برداشت ہے۔ مجھے نقل مقام کی ہر ممکن
جدوجہد کرنی چاہیئے۔ لیکن کیا مجھ میں اتنی طاقت ہے؟ میں اپنے ہاتھ
اور پاؤں کو ہلا سکتا ہوں۔ کپی سے پانی پی سکتا ہوں۔ لیکن اس بھاری اور
غیر متحرک جسم کو ہلانے سے قاصر ہوں۔ پھر بھی کوشش کرونگا خواہ ایک
گھنٹہ میں نصف گز کا فاصلہ طے کیا جائے۔
اسی جدوجہد میں صبح کا وقت صرف ہوگیا۔ شدت درد سے جان
نکلی جارہی ہے۔ لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ مجھے اس سے زیادہ
کچھ یاد نہیں اور نہ میں کبھی تصور کرسکتا ہوں کہ تندرستی کیسی چیز ہے؟ میں
درد کا خوگر ہوگیا ہوں۔ میں نے درحقیقت کوئی چھ گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا
کہ میں اپنی پرانی جگہ پر آگیا۔ لیکن میں تازہ اور لطیف ہوا سے لطف
اندوز نہیں ہوسکتا۔ اگر ایک سڑتی ہوئی لاش سے چھ گز کے فاصلہ پر
ہوا تازہ کہلائی جاسکتی ہے۔ ہوا کا رخ بدلتا رہا۔ ایک دفعہ پھر اسی
تعفن نے میرے دماغ کو پریشان کیا۔ میرے خالی دماغ کو پریشان
میرے خالی معدہ میں ایک پر درد تشنج پیدا ہوا اور جسم میں ارتعاش۔

تکان اور کسل سے چور چور ہوکر میں بیہوش ہوگیا۔ یکلخت میں نے
آواز اور گھوڑوں کی ٹاپ سنی۔ کیا یہ میرے تخیل اور تصور ہی کی کرشمہ
سازی تو نہیں؟ میں چیخ مارنے والا تھا لیکن ضبط کیا۔ بغرض محال
وہ دشمن ہوں تو پھر کیا ہوگا۔ وہ میرے آلام میں ایک عذاب الیم

اضافہ کریں گے جس کے خیال سے میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ وہ میری کھال ادھیڑیں گے اور زخمی ٹانگ کے کباب بنائیں گے اور اگر وہ اسی پر اکتفا کریں تو میں اس کو ان کی کشادہ دلی پر معمول کرونگا۔ کیا ان کے ہاتھوں میں جان بحق ہونا اس عذاب سے بہتر نہ ہوگا؟

لیکن اگر وہ ہمارے آدمی ہوئے اور کمبخت جھاڑیوں تم نے میرے اردگرد کیوں اسقدر عمیق احاطہ کیا ہوا ہے۔ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ ایک شگاف سے بہت دور ایک خندق کا دھندلا سا خاکہ نظر آسکتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اس خندق کے پاس ایک ندی ہے جہاں ہم نے جنگ سے پیشتر پانی پیا تھا اور ندی کے پار پل بنانے کے لئے ہم نے بڑے بڑے پتھروں کا انبار لگا دیا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ سوار ان پتھروں کے قریب ہونگے۔ آواز بند ہوگئی۔ میری قوت سماعت جواب دے چکی ہے۔

او خدا! اگر وہ ہمارے آدمی ہیں تو میں چلاؤنگا۔ میری آواز ندی تک پہنچ جائیگی۔ انہوں نے ادھر آنے میں کیوں تاخیر کی ہے؟ میرے صبر کا پیمانہ چھلکا جاتا ہے۔ مجھے اب نعش کی بدبو نہیں آتی۔

دفعتاً ہماری فوج نے ندی کو عبور کیا۔ ان کی سرخ گوٹ والی نیلی وردیاں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ نصف دستہ فوج ہے ان کے آگے آگے ایک سیاہ ڈاڑھی والا حاکم ایک پُر رعب گھوڑے پر سوار ہے۔ جونہی انہوں نے ندی کو عبور کیا حاکم نے اپنی زین پر مڑکر حکم دیا "کوچ کرو"۔

"خدا کے لئے ٹھہرو۔ بھائیو میری مدد کرو" میرے منہ سے ایک لرزاں فریاد نکلی۔ لیکن میری آواز گھوڑوں کی ٹاپ اور کاسک کی باہمی گفتگو میں گم ہوگئی۔ انہوں نے میری آواز نہ سنی۔ آہ غضب ہوگیا۔ مایوس ہوکر میں نے اپنا منہ زمین میں چھپالیا۔ اور گریہ وزاری کرنے لگا۔ کپی سے جو میری بدحواسی سے الٹ گئی پانی بہنے لگا جو میری زندگی۔ میری نجات اور پنجۂ موت سے مخلصی کا واحد ذریعہ تھا۔ اور تپتی ہوئی زمین میں جذب ہوگیا۔

اس اضطراب کو جو اس المناک واقعہ کے بعد مجھ پر مسلط ہوگیا احاطۂ تحریر میں لانا میری مجال سے باہر ہے۔ میں نیم وا آنکھوں سے بےحس و حرکت پڑا رہا۔ ہوا کا رخ بدلتا رہا۔ کبھی تازہ ہوا کا ایک جھونکا آجاتا اور کبھی اس تعفن آمیز ہوا سے میرے دماغ کے پردے پھٹ جاتے۔ میرا ہمسایہ اس روز ناقابل بیان وحشت انگیز تھا۔ ایک دفعہ میں نے اس کی طرف نگاہ کی تو میرے دلمیں لرزہ تنفر پیدا ہوا۔ اس کا چہرہ غائب تھا۔ اس کی ہڈیاں بے پوست تھیں اس سیاہ فام منہ کو دیکھکر جس میں سے بھیانک انداز سے دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔ میں لرزہ براندام ہو گیا۔ گو میں نے کئی مرتبہ اپنے ہاتھوں میں کاسۂ سر اٹھایا ہے اور سر کو علیحدہ بھی کیا ہے لیکن ان درخشاں بٹنوں والی وردی میں ایک پنجر نے میرے جسم میں ایک ارتعاش پیدا کردیا۔

"یہ جنگ ہے" میں نے اپنے دل میں سوچا" اور وہ اس کی نعش ہے"

آفتاب کی حدت ہمیشہ کی طرح جلا دینے والی تھی۔ میرے ہاتھ اور چہرہ جھلس گیا۔ میں نے باقی ماندہ پانی پیا۔ میں تشنگی سے اسقدر بےتاب تھا کہ گو میں نے ایک گھونٹ پانی پینے کا ارادہ کیا۔ مگر تمام پانی ایک ہی گھونٹ میں پی گیا۔ آہ میں نے ان کو کیوں آواز نہ دی جبکہ وہ میرے قریب تھے۔ اگر وہ دشمن کے آدمی ہوتے تو بھی اس عذاب سے بہتر تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مجھے ایک ایک یا دو گھنٹے اذیت پہنچاتے۔ مگر اب تو مجھے یہ معلوم نہیں کہ میں کتنا عرصہ یہاں پڑا ہوا اس عذاب کا شکار رہونگا۔

اماں! تو اپنے سنہری بال نوچ ڈالیگی اور اپنا سر دیوار کے ساتھ ٹکرائے گی۔ تو اس دن کو ملامت کریگی جب میں پیدا ہوا تو اس دنیا کو جس نے انسانی تباہی کیلئے جنگ ایجاد کی لعنت بھیجیگی۔

لیکن تجھے اور میری محبوبہ کو اس عذاب کا پتہ نہ ملیگا۔ الوداع اماں۔ الوداع میری محبوبہ ...... میری محبت۔ آہ یہ کسقدر دلخراش منظر ہے۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔

پھر اس چھوٹے سفید کتے کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ چوکیدار بے رحم تھا۔ اس نے کتے کا سر نہایت بےدردی سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا اور نالی میں پھینک دیا جسمیں عموماً گندا پانی اور فضلہ پھینکا جاتا ہے۔ لیکن وہ اس وقت زندہ تھا۔ اور تمام دن سسکتا رہا۔ میں کیسا بدنصیب ہوں کہ آج تین دن سے اس حالت نزع میں پڑا ہوا ہوں۔ کل چوتھا روز ہوگا۔ پرسوں پانچواں..... پھر چھٹا.....

آہ موت تو کہاں جاکر سوگئی آ اور مجھے اپنی آغوش میں سلالے۔

لیکن موت نہ آئی۔ اور میں اس دوزخ کی آگ میں پڑا رہا۔ میرے پاس پانی کا ایک گھونٹ نہیں جس سے اپنے خشک حلق کو تر کرسکوں۔ تعفن نے مجھے دیوانہ کردیا۔ یہ تعفن کا ایک ڈھیر ہے اور ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ۔ جب گوشت بالکل خشک ہوجائیگا تو ہڈیاں اور وردی رہ جائیگی۔ پھر میری باری ہوگی اور میں میری حالت

جھاڑیوں میں جنبش پیدا ہوئی - اور آپس میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ "تم مرجاؤ گے - تم مرجاؤ گے" اور اس کے بالمقابل جھاڑیوں نے جواب دیا۔

"تم نہیں دیکھو گے - تم نہیں دیکھو گے"

"کیوں تم ان کو یہاں نہیں دیکھ سکو گے" میرے قریب ہی ایک بلند آواز آئی - میں فوراً چونک اٹھا -

ٹوکو تیو ہماری پلٹن کا دفعدار ہے جو جھاڑیوں میں سے میری طرف نہایت رحم و محبت سے دیکھ رہا ہے -

"بیلچہ لاؤ" اس نے کہا "دو اور لاشیں پڑی ہیں - ایک ہماری اور ایک ان کی"

میں بولنا چاہتا تھا " ابھی بیلچہ نہ لاؤ - مجھے ابھی دفن نہ کرو - میں زندہ ہوں" لیکن میرے خشک لبوں سے ایک ہلکی سی آواز نکلی -

"او خدا یہ کسطرح ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ ابھی زندہ ہو - یہ تو اِوانو ہے - چلو جلدی چلو - ہمارا جوان ابھی سانس لے رہا ہے ڈاکٹر کو بلاؤ" اس نے کہا -

کچھ عرصہ بعد پانی یا کوئی اور ایسی ہی چیز میرے حلق میں ڈالی گئی - پھر ایک غشی کی سی حالت طاری ہوگئی -

تختہ ہم آہنگی سے جا رہا تھا اور اس پر مجھے آرام تھا - کبھی تو میری آنکھ کھل جاتی اور پھر بیہوش ہوجاتا - میرے بندھے ہوئے زخموں میں اب درد و کرب کا نشان بھی نہ تھا - ایک بے پایاں مسرت کی لہر میرے رگ و پے میں سرایت کرگئی -

"چلو - نیچے رکھو - تختہ کو اٹھاؤ - روانہ ہوجاؤ" پیٹر اونووچ نے جو ایڈ کلاس کا حاکم تھا حکم دیا - وہ طویل القامت - دبلا پتلا اور حلیم و سنجیدہ آدمی تھا - اس کا قد اسقدر لمبا تھا کہ اگر میں اپنی آنکھیں اس کی طرف موڑ کر دیکھوں تو اس کے کندھے اور سر آسانی سے نظر آسکتے تھے حالانکہ تختہ چار قوی جثہ آدمیوں نے اٹھایا ہوا تھا -

" پیٹر" میں نے آہستہ سے کہا -

"کیوں پیارے - طبیعت کیسی ہے" اس نے مجھ پر جھک کر کہا -

" پیٹر - ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟ کیا میں بہت جلد چنگا ہوجاؤنگا؟"

" بیوقوف - تم زندہ رہوگے - تمہارے اعصاب بے ضرر ہیں - لیکن تم ساڑھے تین دن زندہ کیسے رہے؟ تم کیا کھاتے رہے ہو"

" کچھ بھی نہیں"

" اور پیتے کیا رہے ہو"

" مجھے ایک دشمن سپاہی کی کپی مل گئی تھی - اب مجھ میں بولنے کی طاقت نہیں پھر بھی"

اچھا خدا تمہارا شامل حال رہے - سو جاؤ"

پھر وہی غشی طاری ہوگئی -

جب میری آنکھ کھلی تو میں ہسپتال میں تھا - ڈاکٹر اور نرسیں میرے ارد گرد جمع تھیں - اور ان میں ایک پیٹرز برگ کا شہرہ آفاق ڈاکٹر میرے پاؤں پر جھکا ہوا تھا - اس کے ہاتھ خون سے لبریز تھے - وہ کچھ عرصہ میرے پاؤں کے زخم کی مرہم پٹی میں مصروف رہا - پھر میری طرف نظر اٹھا کر دیکھنے لگا -

"تم اپنی خوش قسمتی پر خدا کا شکریہ ادا کرو جس نے تمہیں زندگی بخشی ہے - ہمیں تمہارا ایک پاؤں کاٹنا پڑا - لیکن اس کا کچھ مضائقہ نہیں - کیا تم بول سکتے ہو" ڈاکٹر نے کہا -

" ہاں میں بول سکتا ہوں" اور میں نے جو کچھ اوپر تحریر کیا ہے سب بیان کیا -

علاؤالدین

(ترجمہ)

چاندنی

وہ چاندنی ہے نور کی دنیا کہیں جسے
فطرت کا اک صبح تجلی کہیں جسے

ہر شے ہے کائنات کی سیمیں بنی ہوئی
ہے ذرہ ذرہ حسن کی دنیا کہیں جسے

تنویر ہے کسی کے رخ بے نقاب کی
عاشق کے دل کی شمع تمنا کہیں جسے

برپا ہے بحر نیل میں طوفان نور کا
ہے ہر حباب حسن کا چشمہ کہیں جسے

(غیر مطبوعہ) اجملؔ

عظمت

تمہارے سامنے ایک مصلح قوم ہے۔ رائے عامہ اس کے بارے میں بالکل مختلف ہے۔ ایک جماعت اس کے علم و فضل کا کلمہ پڑھتی ہے۔ اور اسے ملائک سے کم نہیں سمجھتی۔ دوسری طرف ایک گروہ ہے جس نے اسکی مذمت و برائی اپنا شعار بنا لیا ہے۔ معمولی انسانوں کی صف میں بھی اسے کھڑا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ——— یقین جانو، کہ وہ "بڑا" آدمی ہے۔

عظمت، علم و شعر، ثروت و جاہ، سے برتر ایک چیز ہے۔ شعرا بہت ہیں۔ عالموں کی تعداد بھی کم نہیں، عظمت ایک وہبی قوت ہے جو صاحب عظمت کو عام شخصیتوں سے بلند اور ممتاز کر دیتی ہے۔ اصابت رائے۔ اسلوب فکر میں عام لوگوں کو اس سے کوئی نسبت نہیں۔

ہر مسئلہ میں اس کی رائے بے لاگ ہوتی ہے، اپنے مخترعہ اصول کے سوا کسی قاعدہ و قانون کا پابند نہیں ہوتا۔ کسی انسانی عقل سے مرعوب ہونا شان عظمت کے سراسر خلاف ہے۔ اس کے ذاتی اعتماد کا یہ جائز تقاضا ہوتا ہے۔ کہ عامۃ الناس اس کے بنائے ہوئے دستور العمل کی پیروی کریں، اور اس کے نقوش پا کو نشان راہ سمجھیں۔

عظیم ترین ہستی کے تمام کارنامے مافوق العادۃ اور ممتاز نظر آئینگے۔ شاعر کا اسلوب نرالا ہوگا، اسکی زمزمہ پیرائیاں بلبل نواسنج کو شرماتی ہونگی۔ ایک انشا پرداز اپنے بلیغ انداز بیان سے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ پبلک اس کے رشحات فکر کو آنکھوں سے لگاتی ہے۔ اگر فقیہ عظمت کا مالک ہے، تو پرانے مذاہب کی بیخ کنی کے ساتھ ساتھ جدید مذہب کی طرح ڈالتا ہے۔ بادشاہ ہے تو پھر نہ پوچھئے۔ قیصر و کسریٰ کی حکومتیں اس کے قدموں پر نثار ہونگی۔ تاریخ کے صفحات اس کے درخشاں کارنامے قیامت تک دہراتے رہیں گے۔ ایک صاحب عظمت وزیر حکومت کی ایسی جدید تشکیل کرتا ہے۔ کہ ماہرین سیاست انگشت بدنداں نظر آتے ہیں۔ اگر خوش قسمتی سے رہنمائے ملت ہے، تو زمین و آسمان اس کی تعریف میں رطب اللسان نظر آئیں گے۔ اس کی معجز نمائیاں قوم کی دردمندیوں کے لئے مسیحا کا کام کریں گی۔

یہ عظمت ہے اور صاحب عظمت میں ان خوبیوں کا ہونا ضروری ہے، جہاں ایک عظیم ترین انسان ملک و قوم کی آنکھوں کا تارا ہوتا ہے، اس کی ذات جمہور کے لئے فتنہ سے کم نہیں ہوتی۔ اس کے سبب سے پبلک میں اختلاف و نفاق کی گرم بازاری ہوتی ہے۔ جدت پسند جماعت اس کی ہر صدا پر لبیک کہتی ہے۔ اس کی تعریف و توصیف میں آسمان و زمین کے قلابے ملائے جاتے ہیں۔ دوسری طرف اس کا ردعمل ہوتا ہے۔ ہجو میں نظمیں تصنیف ہوتی ہیں۔ اخبارات میں اس کے خلاف زبردست پروپگنڈا کیا جاتا ہے ——— جب دو جماعتیں اس قدر مختلف خیالات کی تبلیغ کریں گی۔ ایک دوسرے کی تردید میں ایڑی چوٹی سے زور لگائیگا۔ تو تصادم ناگزیر ہے۔ اور یہ دن رات کا مشاہدہ ہے کہ جوتی و پیزار تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

عظمت و جبروت کا مالک اس جنگ و پیکار کا ہنسی خوشی مطالعہ کریگا۔ اس لئے کہ جنگ و جدال سے اس کی عظمت پر اور مہر تصدیق ثبت ہوجاتی ہے۔

یہ مقصود نہیں کہ ممتاز ہستیوں کی تمام رائیں صائب ہوتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ قائد جو راہ عمل تجویز کرے۔ وہ ہر حال میں صحیح ہو۔ یہ بہت ممکن ہے کہ کسی مسئلہ میں ایک معمولی انسان کی رائے اس سے زیادہ صائب اور تیر بہدف ہو۔ لیکن، ہاں یہ صرف عظیم ترین ہستیاں ہیں۔ جن کی تعریف و مذمت میں زبان و قلم مصروف عمل ہوں۔ اور معتقدین و مقلدین کی جماعتیں برسر پیکار رہوں۔

حضرت علیؓ کی محبت میں ایک فرقہ کفر کی حد تک پہنچ گیا۔ دوسرے بغض و عداوت میں اسقدر جادۂ اعتدال سے ہٹ گئے۔ کہ بمشکل ان کے کلمہ گو ہونے کا یقین کیا جاسکتا ہے کسی نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو "شیخین" کے معزز لقب سے سرفراز کیا۔ کوئی ان کے صدق و اخلاص کا بھی قائل نہیں۔ محی الدین عربی ایک طرف "سرتاج اولیا" اور "قطب الاولیا" کے القاب سے مخاطب کئے جاتے ہیں۔ دوسری جماعت انہیں "شیخ الملحدین" ہی کہہ کر پکارتی رہی۔

دنیا نے ابن رشد کے کمالات کا اعتراف کیا۔ اس نے کرسی قضا کو زینت بخشی، فلسفیانہ نکتہ سنجیوں نے اسے "مجدد فلسفہ" کے نام سے مشہور کرایا، لیکن تاریخ کے صفحات شاہد ہیں۔ کہ جامع مسجد میں ان کے ساتھ بدترین گستاخیاں کی گئیں۔ اور آفتاب پر خاک ڈالنے

کی ناکام کوشش کی گئی،

ایک طبقہ امام غزالی کو "حجۃ الاسلام" کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کی محبت پرستش کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ دوسری جانب ایک گروہ نے کتاب الاحیاء کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر کر رکھ دیں۔ لوگ حیرت واستعجاب سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ ابوالعلا معری کی زندگی بھی معتقدین ومخالفین میں بسر ہوئی۔ ایک طرف کچھ دل ودماغ بنے جن پر اس کی عظمت کا سکہ تھا۔ کچھ مخالفین تھے۔ جنھوں نے ملحد وبیدین کہنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ زہر کا پیالہ پیکر حسرت ویاس کے ساتھ سقراط نے دنیائے فانی کو الوداع کہا۔ کتنا دردناک سانحہ تھا۔ ہزاروں آنکھیں تھیں۔ جو حزن والم سے اشکبار تھیں۔ لیکن اس وقت ایسے "نفوس قدسیہ" بھی دیکھنے میں آئے۔ جن کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اور فرط مسرت سے پھولے نہ سماتے۔

متنبی کے معتقدین نے اسے "ملک الشعرا" بنا کر ثریا پر پہنچا دیا۔ اس کے دیوان پر سخن گسترانہ مقدمے لکھے گئے، خصوصیات شاعری کا احیاء کیا گیا۔ دوسری طرف "سخن فہم" معاندین ہیں۔ جو اسے "شاعر" تو کیا "ناظم" بھی ماننے کے لئے تیار نہیں، ——— ایک طرف انگلستان میں شکسپیر کے پرستاروں کا زور ہے۔ جو اس کی ادبیت کے نشہ میں سرشار ہو کر یہاں تک کہہ جاتے ہیں ——— کہ "ہم سے شکسپیر کے سوا سب کچھ لے لو"۔ دوسری طرف "اہل کافروں" کا انبوہ عظیم ہے۔ جو اسے ایک "دروغگو" سے زیادہ وقعت نہیں دیتا ——— نپولین کے ثناخواں ہیں۔ جو اسے نبوت کے بام رفیع پر پہنچاتے ہیں۔ دوسرا گروہ اسے اوباش اور بازاریوں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔

لوتھر۔ نیٹشے۔ ٹالسٹائی، یہ مغرب کے مشہور عظما ہیں۔ جنہیں زندگی بھر اور موت کے بعد بھی محبت وعداوت کے جام پینے پڑے۔ جمال الدین افغانی، محمد عبدہ۔ سعد زاغلول، مصطفےٰ کامل، یہ مشرق کی قابل فخر، عظیم ترین ہستیاں ہیں۔ جن میں عمر بھر دوستوں اور دشمنوں سے واسطہ رہا۔ اور جن کے بارے میں اب بھی اسقدر رائیں مختلف ہیں۔ کہ حیرت ہوتی ہے۔

× × × × × × × ×

× × × × × × × ×

× × × × × × × ×

یہ "عظما" کی ایک جماعت ہے۔ جن کے بارے میں رائے عامہ اس حد تک مختلف ہے۔ کہ مناظرہ ومباحثہ تو معمولی چیزیں ہیں۔ کشت وخون کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ یہ اختلاف رائے خود ان کی عظمت وبڑائی کی واضح دلیل بہم پہنچا رہا ہے۔

زندگی کے یہ معنی ہرگز نہیں۔ کہ انسان آخری لمحۂ حیات تک پیٹ بھرنے کی فکر میں لگا رہے۔ دنیا ومافیہا سے کوئی سروکار نہ ہو۔ یہ حیوانات کی زندگی ہے۔

انسانی زندگی کا معیار اس سے بلند ہونا چاہیئے۔ انسان کا کمال یہ ہے۔ نگاہیں اس کی جانب بیتابانہ اٹھنے لگیں۔ ایک مقناطیسی کشش ہو، جو دلوں کو اپنی طرف کھینچ لے۔ زبان وقلم مدح وثنا میں مصروف ہوں، اچھوتوں کے سینے محبت سے معمور ہو جائیں، اعدا بروں کے کینے سے۔

عظما کی زندگی جاودانی ہوتی ہے، ان کی مسرتیں ابدی ہوتی ہیں۔ ان کی زندگی سب سے کامیاب ہوتی ہے۔ اگرچہ دنیا میں اس کے برعکس معلوم ہو۔

عظمت کی خدمت دوست ودشمن یکساں کرتے ہیں۔ "عظمت" کا مینار تعمیر وتخریب کی انتہائی کشمکش کے بعد آسمان سے باتیں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جب کسی مینار کے گرد معتقدین ومخالفین ہمکنار نظر آئیں۔ جان لو، کہ اس پر عظمت کی بلند وبالا عمارت تیار ہونے والی ہے۔

عظمت کی دیوار، بغض ومحبت کے سہارے قائم ہے۔ جب تک یہ دو ستون اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ عمارت بھی انتہائی کر و فر کے ساتھ اپنی سطوت وجبروت کا مظاہرہ کرتی رہیگی، یہ ناممکن ہے، کہ دیوار عظمت کا سارا بار محبت کا ستون اپنے کمزور کاندھوں پر اٹھائے۔

یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں۔ کہ دنیا تیری تعریف کے نغمے گانے لگے۔ اس لئے کہ زبان خلق اسی کی ثناخواں ہوتی ہے۔ جو اپنی رائے سے الگ ہو کر، عوام کے اشاروں پر حرکت کرے۔ اور "زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ بساز" کا مصداق بن جائے۔

اس سے بھی فریب میں نہ آنا، کہ دنیا تیری بغض وعداوت پر کمر باندھ لے۔ اس لئے کہ یہ شیاطین واشرار کا خاص حصہ ہے۔

ہاں! تمہیں خوش ہونا چاہیئے۔ کہ اگر خلق اللہ تمہارے بارے میں اختلاف رائے رکھتی ہے کہ یہ عظمت کی نشانی ہے۔

ایسے رہنما بننے کی کوشش کرو۔ جس کے اردگرد معتقدین ومعاندین کا ازدحام ہو۔ اس سپاہی کی زندگی نہ اختیار کرو۔ جو شجر عظمت کے پہنچنے کے لئے اپنا خون پسینہ کی طرح بہاتا ہے۔

(منفلوطی)

مسعود عالم (نوگانوی، ندوی)

فلسفۂ جذبات حیوانات

فلسفہ کی اُس شاخ کو جسے ہم فلسفۂ جذبات کے نام سے موسوم کرتے ہیں دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) فلسفۂ جذبات طبعی۔

(۲) فلسفۂ جذبات غیر طبعی۔

فلسفۂ جذبات غیر طبعی کی مختلف اقسام یہ ہیں۔

(۱) فلسفۂ جذبات اطفال۔

(۲) فلسفۂ جذبات مُسن۔

(۳) فلسفۂ تخلیقات ما فوق الفطرت۔

(۴) فلسفۂ جذبات حیوانات

زمانۂ ماسبق میں اس آخری حصۂ علم کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ اُس کی مختلف وجوہات تھیں۔ اوّلاً جانور بلحاظ اہمیت انسان سے دوسرے درجے پر آتا ہے اور شیخ سعدی کے اس مقولہ کے بموجب۔ کہ ؎

تو کارِ زمین را نکو ساختی ✦ کہ با آسمان نیز پرداختی

فلسفۂ جذبات طبعی اور فلسفۂ جذبات تعلق با انسان کی تکمیل کے بعد ہی اس علم کی طرف کافی توجہ دی جا سکتی تھی۔ علم تشریح الابدان سے عدم واقفیت سنگ راہ تھی۔ کیونکہ یہ دونوں علوم بالکل لازم و ملزوم ہیں لیکن ان دنوں جب یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہے کہ ہر علم اپنی انتہا پر پہنچکر دوسرے علوم میں غرق ہو جاتا ہے تو اب یہ نہایت ضروری خیال کیا گیا ہے کہ ہر ملحقہ علم کو دوسرے علوم کے فائدے کے لئے پورے پورے غور سے مطالعہ کیا جائے۔ اس لئے فلسفۂ جذبات حیوانات کو اب اہمیت دی جاتی ہے۔

ڈارون کے اس نظریہ ارتقا نے کہ مطابق کہ انسان جانور ہی کی کامل ارتقائی شکل کا نام ہے۔ اس علم کو اور بھی اہم بنا دیا ہے۔ اور یہ مان لیا گیا ہے کہ فلسفۂ جذبات انسانی کے سمجھنے کے لئے فلسفۂ جذبات حیوانی کا سمجھنا ایسے ہی ضروری ہے جیسے مکان کی دوسری منزل تک پہونچنے کے لئے سیڑھیوں پر چڑھنا۔

اس مضمون پر جو کچھ ہم کو قدما میں سے ورثہ کے طور پر ملا ہے وہ ان بیشمار قصوں سے عبارت ہے جو راہبوں اور پالتو جانوروں کے شائقین نے نہایت کاوش سے جمع کئے ہیں۔ لیکن چونکہ تحقیقات کا کوئی علمی طریقہ استعمال نہیں کیا گیا۔ اس لئے یہ تمام قصے یکساں طور پر ناقابل اعتبار ہیں۔ چنانچہ ان کو علمی لحاظ سے بالکل بے وقعت سمجھا جاتا ہے۔

یہ سوال کہ آیا حیوانات میں ذہن اور اُس کے لوازمات یعنی قوتہائے فہم و ادراک احساسات و جذبات موجود ہیں یا نہیں۔ نہ صرف فلسفیوں کے دماغوں میں بلکہ عوام کے دماغوں میں بھی مختلف صورتوں میں پیدا ہوتا رہا ہے۔ جانوروں کے متعلق زمانہ گذشتہ کی کہانیاں جن میں اُن کو انسانوں کا سا دل و دماغ عطا کیا جاتا تھا۔ سب اسی خیال کی شہادتیں ہیں۔ مختلف مذاہب کی روایات بھی اس خیال سے خالی نہیں ہیں۔ اس سوال کا جواب اس مضمون کا صحیح مقصد ہے۔

موجودہ زمانہ کے مطابق کام کرنے کے لئے ان امور کا خیال رکھنا اشد ضروری ہے۔

(۱) یہ کہ فلسفۂ جبلت جذبات حیوانات کامل تحقیقات کے نتائج پر مبنی ہونا چاہئے۔ نہ کہ صرف نقل اور عقل حیوانی یا طبعی کی تحقیقات پر۔

(۲) تحقیقات حتی الوسع قدرتی ماحول میں کر لی چاہئے۔

(۳) ہر واقع کو جدا اور صحیح طور پر پرکھا جائے اور اس کے متعلق تجربہ یا مشاہدہ سے پیشتر کسی قسم کی رائے دل میں قایم نہ ہو۔

چوپائے کی پیدائش کے فوراً بعد اُس کو نہایت غور سے دیکھا گیا ہے۔ اس طور پر ہم اُن کے صحیح جذبات اور احساسات کا پتہ چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے علم کے لئے یہ نہایت اچھا مواد ہے۔

تجربات کے مشاہدہ کے طریقہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان کی طرز تصریح و توضیح میں بھی کامل تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ جانوروں کے افعال ان کی افعال کے تطابق میں فلسفۂ جذبات انسانی کے ساتھ مقابلہ کر کے سمجھنے چاہئیں۔ اور اُن کے ہر فعل کو ممکن طور پر سیدھے اور سادہ طور پر حل کرنا چاہئے۔ اُن کا کوئی فعل جو استیلاف اذکار حافظہ سے حل کیا جا سکے۔ اُس کو جانوروں کی غور و فکر کا شاہد نہ سمجھا جائے۔ اور جو فعل ان کے تخیل کے ساتھ منسوب کیا جا سکے۔ اُسے تخیل تحریکی نہ سمجھا جائے یہ ایک نہایت سودمند قاعدہ ہے۔ اور اس سے مفید ترین نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ اور فوائد کے علاوہ اس قاعدے نے جبلت حیوانی سمجھنے میں مدد

دی ہے۔ اور سطحی نظر سے دیکھنے پر یہ طریقہ صحیح معلوم ہوتا۔ خیال کیا سکتا ہے کہ شک کا فائدہ جانوروں کو ملنا چاہئے۔ یعنی جن واقعات میں انسانی حالات کے ماتحت کسی فعل کا باعث ہیجان فکری ہو وہاں ان واقعات کو فہم و ادراک کا نتیجہ سمجھا جائے۔ لیکن جب ہم رابطہ گفتگو کی مثال کو لیتے ہیں تو یہ وہمی غلطی رفع ہو جاتی ہے۔ آج تک یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جانور ایک کامل زبان بنانے کے ناقابل رہے ہیں۔ اگر اعلیٰ قسم کے جانور باوجود رابطہ گفتگو کرنے کے قابل ہونے کے ایک کامل زبان نہیں بنا سکے تو یہ صرف اس لئے ہے کہ ان کے پاس موضوع گفتگو کی کمی ہے۔ اور اگر یہ درست ہے تو ان کے دماغ ارتقا کی دو مختلف کڑیاں ہیں۔ یہ فرض کر لینا قطعی درست ہوگا کہ جانوروں کا دماغ ممکن طور پر سیدھے سادے طریقہ پر کام کرتا ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسان جو سوچ سکنے کے قابل ہے۔ شاذ ہی کبھی سوچنے کی تکلیف گوارا کرتا ہے۔ جب کبھی ممکن ہوتا ہے وہ دماغی پگڈنڈیاں کام میں لاتا ہے۔ جب بھی ممکن ہوتا ہے وہ استیلاف افکار سے فائدہ اٹھاتا ہے یعنی گذشتہ واقعات کی یاد کو دماغ میں رکھکر ایک نامحسوس طریقہ پر انھیں حالات کے ماتحت بغیر سوچنے کے کاربند ہوتا چلا جاتا ہے۔ تو ہمیں خیال کو اور بھی تقویت ہوتی ہے کہ بائیسکل کا چلانا۔ جمناسٹک کے کھیل کرتب اس کی نہایت واضح مثالیں ہیں۔ ان ابتدائی اصولوں پر کاربند ہوتے ہوئے اس مختصر سی بحث کے بعد میں چند تجربات و مشاہدات بیان کروں گا۔ جو انھیں اصولوں کے مطابق مشاہدہ کئے گئے ہیں۔

دو ماہ کا عرصہ گزرا کہ ایک کوا منڈیر پر آ بیٹھا۔ ایک بچے نے روٹی کے تین ٹکڑے اس کے سامنے ڈال دیئے۔ قرب و جوار میں کوئی دوسرا کوا موجود نہ تھا۔ کوا ٹکڑوں کو دیکھنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے ٹھیرا۔ پھر اُن میں سے ایک ٹکڑا روٹی کا اٹھا کر آنگن کے ایک کونہ میں لے گیا۔ اس کونہ میں لکڑی کا ایک پوشیدہ بکس پڑا تھا۔ اس میں ایک گلی سڑی بوری پڑی تھی۔ کوے نے چونچ سے بوری کو پرے ہٹایا۔ اور ٹکڑا اندر چھپا دیا۔ پھر اُڑ کر دوسرے ٹکڑے کو انگنائی کے دوسرے کونہ میں چند لکڑیوں کے نیچے چھپا دیا۔ اور تیسرا ٹکڑا چونچ میں اٹھا کر اُڑ گیا۔ واقعہ سات اور آٹھ بجے صبح کے درمیان کا تھا۔ شام کو وہی کوا پھر لوٹا اور لکڑی کے بکس کے پاس جا کر بوری کو پرے ہٹانے کے بعد چھپایا ہوا ٹکڑا لیکر اُڑ گیا۔ دوسرے روز صبح کے وقت وہ پھر واپس آیا۔ اور لکڑیوں کے پاس جا کر دوسرے کونے میں سے ڈھونڈھ کر چھپا ہوا ٹکڑا نکال کر اُڑ گیا۔ کیا یہ سب واقعات اور کوے کے افعال جبلت حیوانی کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں؟ یقیناً کوے کے دماغ میں مفصلہ ذیل سلسلہ خیالات پیدا ہوئے ہوں گے۔ روٹی کے ٹکڑے تین ہیں ایک وقت میں میں صرف ایک لیجا سکتا ہوں کوئی اور کوا یا کوئی دوسری چیز بھی انھیں لیجا سکتی ہے۔ کسی ایسی جگہ ان کا چھپانا لازمی ہے کہ کوئی دیکھ کر نہ لیجا سکے۔ اگر باقیماندہ دونوں ٹکڑے چھپائے گئے تو جو کوا ایک کی جگہ دریافت کر لیگا وہ دوسرے کو بھی لیجائے گا۔ پھر یہ واقعہ اس کی قوت حافظہ کا شاہد ہے کہ صبح کا واقعہ اُسے نہ صرف شام تک بلکہ دوسرے دن تک یاد رہا۔ سب سے آخر میں کوے کا تین دن تک گننے کے قابل ہونا اور جمع اور تفریق کے سوالات تین ہندسوں تک حل کر سکنا تجربہ د ۱۲ چند دن ہوئے میں نے پھر ایک تجربہ کیا۔ دس بارہ ٹکڑے روٹی کے چھوٹے بڑے انگنائی میں ڈال دیئے۔ چند کوے آئے اور مختلف ٹکڑے اُٹھا کر اُڑ گئے۔ سب سے آخر میں ایک کوا آیا۔ پاس پاس پڑے ہوئے دو ٹکڑے باقی تھے اُس نے اُن میں سے ایک ایک ٹکڑا اُٹھایا اور پھر اُسے پھینک دیا۔ اور دوسرے کو اُٹھا کر منڈیر پر جا بیٹھا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ اُس کا یہ فعل اتفاقیہ تھا یا جان بوجھ کر کیا گیا۔ میں نے اس کوے کو مار کر بھگا دیا۔ مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ٹکڑا جو بعد میں لیجایا گیا پہلے کی نسبت بڑا تھا۔ یہ کوے کی قوت امتیاز ظاہر کرتا ہے۔

ایک صاحب ایک پالتو کتے کو ایک خالی کمرہ میں لے گئے۔ اور وہاں جا کر ایک سوکھی ہڈی اُس کے سامنے ڈال دی۔ چونکہ ہڈی میں کوئی کھانے کی چیز نہیں لگی ہوئی تھی اس لئے کتے نے اُسے بالکل نہ چھوا۔ اُن صاحب نے اس ہڈی کے ساتھ ایک باریک ڈور باندھ رکھی تھی جو چھت کے ساتھ پنکھے کے انکڑے میں سے نکلتی ہوئی پنکھے کے سوراخ کے راستہ کمرہ کے باہر نکل جاتی تھی۔ کمرے کے دروازے بند کر کے وہ صاحب خود باہر نکل آئے، اور ڈور کا سرا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس عرصہ میں کتا ایک نامحسوس طریقہ پر ہڈی کی طرف نظر جمائے بیٹھا رہا۔ دو منٹ کے بعد ڈور کو دفعتاً کھینچا گیا۔ ہڈی گز بھر اونچی زمین سے اُٹھی اور پھر گری۔ یہ دیکھ کر کتا چیخ اُٹھا اور پرے کونے میں دوڑتا ہوا جا کر بھونکنے لگا۔ اس تجربہ سے کتے کے دماغ پر یہ عمل ظہور پذیر ہوا ہوگا۔ کہ ہڈی ایک ایسی چیز ہے جو اُس نے اس سے پیشتر خود بخود کبھی حرکت کرتے نہیں دیکھی۔ کمرہ میں کوئی اور موجود نہیں جو اُسے حرکت دے سکتا۔ ہڈی نے فوری حرکت کی چنانچہ اُس خشک ہڈی میں کوئی ایسی خلاف فطرت چیز موجود ہے جو اُس کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ اور وہ اُس سے خائف ہو گیا۔

نیا تجربہ۔ مرغیوں کے چور جانوروں کی جبلت حیوانی سے یوں فائدہ اُٹھاتے ہیں کہ سردی کی راتوں میں گاؤں میں ڈربہ کے قریب آتے ہیں۔ مرغیوں کا ڈربہ بالعموم صحن میں بنا ہوتا ہے۔ پھر حقے کی ٹکی کا ایک سلا

ڈربے کے اندر کسی سوراخ کے راستہ اندر کر دیتے ہیں۔ دوسرے سرے کو منہ میں رکھ کر اوپر سے پھونکیں مارتے ہیں۔ مرغیاں دم بخود ہو جاتی ہیں پھر وہ دروازہ کھول کر ایک ایک کو پکڑ کر ان کی چونچیں بند کر کے لے جاتے ہیں۔ مرغیاں نلکی میں سے نکلے ہوئے سانس کو غالباً سانپ کی پھنکار سمجھتی ہیں جو اُن کا فطری دشمن ہے۔ اور اس لئے ڈر کر بالکل خاموش رہتی ہیں۔

ہمارے گھر کے سامنے ببول کے پیڑ پر کوؤں کا جوڑا رہتا تھا۔ میرے ایک قریبی رشتہ دار جو ہسپتال میں کام سیکھنے جایا کرتے تھے۔ کام پر جاتی دفعہ ہمارے ہاں ہو کر جایا کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے کوؤں کا گھونسلا اُتار ڈالا۔ اور بچے مار ڈالے۔ اُس روز سے کوؤں کا جوڑا اُن کا ایسا دشمن ہوا کہ جب وہ ہمارے ہاں آتے اُن کے سر پر کائیں کائیں کرتے ہوئے اُڑتے رہتے۔ یہاں تک کہ ہسپتال تک جو قریب ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلہ پر واقع ہے اُن کے ساتھ ساتھ جاتے اور وہاں پر بھی یہی تماشا جاری رہتا۔ یہ سلسلہ دس بارہ روز تک قایم رہا۔

اپنے بچوں سے کوؤں کی محبت بدلہ لینے کا مادہ اُن کے دماغ میں رہنا۔ اس واقعہ کی یاد اتنے دنوں تک قایم رہنا اس مشاہدہ کے ماحصل ہیں۔

رابر کتا جو اس وقت میرے پاس ہے میرے ایک قریبی عزیز کے ہاں تھا۔ اُن کو شکایت تھی کہ وہ جونہی کوئی کتاب دیکھتا ہے پھاڑ ڈالتا ہے اور کپڑوں کا تو ایک دشمن ہے۔ میں اُن کے ہاں سے کتا لے آیا۔ اور صحن میں لاکر باندھ دیا۔ آتے ہی میں نے ایک کتاب اُس کے سامنے ڈال دی۔ پرانی عادت کے مطابق اُس نے اُسے اُٹھا کر جھنجھوڑا۔ ایک ہنٹر جو پہلے ہی سے تیار رکھا رسید کیا گیا۔ پھر خاموش۔ یہی عمل کتنے کے بعد دیگرے چار بار کیا۔ اور متواتر ہنٹر کھاتا رہا۔ اُس کے بعد آج تک کتے نے منہ نہیں لگایا۔ یہی عمل کپڑوں کے بچاؤ کے لئے بھی کیا گیا۔ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ تین بار تک تو کتا کتاب کے پھاڑنے اور ہنٹر کے لگنے میں کوئی علت معلول کا تعلق قایم نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن چوتھی بار اُسے معلوم ہو گیا کہ ان دونوں چیزوں میں کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ پھر کتے کی یاد نے اُس کی مدد کی۔ اور اُس نے ہمیشہ کے لئے کتابیں پھاڑنا بند کر دیں۔ سرکس کے تمام جانور اسی اصول پر سدھائے جاتے ہیں۔

ہمارے مکان میں ایک روز اچانک کئی ہزار کیڑے نکل آئے۔ وجہ یہ تھی کہ اُن کے قریب شکر کا کھلا ٹین پڑا ہوا تھا۔ تین دن تک یہ کام چھوٹے بچوں کے سپرد کیا گیا کہ جو کیڑا سوراخ سے نکلے واپس نہ جائے لیکن ان میں ذرہ بھر بھی کمی واقع نہیں ہوتی تھی۔ چوتھے روز کسی نے ایک ترکیب بتائی۔ آٹھ نو مرغی کے بچے لاکر چھوڑ دیئے گئے۔ اب وہاں پر ایک بھی کیڑا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اگرچہ مرغی کے بچوں کے چلے جانے کے چند گھنٹے بعد وہ پھر نکلنے شروع ہو گئے۔ اس مشاہدہ سے یہ معلوم ہوا کہ گو چھوٹے بچوں نے اُن کو کئی روز تک برابر ہلاک کیا۔ لیکن چونکہ انسان کیڑے کا فطرتی دشمن نہیں ہے۔ اس لئے کیڑوں کے دماغ میں اُن کی طرف سے قدرتی خوف نہیں پیدا ہوتا تھا۔ برخلاف اس کے چونکہ مرغی کے بچوں کی خوراک کیڑے مکوڑے ہیں۔ اس لئے انہیں دیکھتے ہی اُن پر فطرتاً خوف چھا گیا۔ اور وہ چھپ گئے۔ یہ قدرتی یا فطرتی خوف جبلت حیوانی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اور اس میں اُن کی سمجھ یا فہم کا کوئی حصہ نہیں۔

حیات اینڈ برادرس کی اُس شاخ میں جو گجرات میں واقع ہے ایک روز مجھے ایک دوست کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوا۔ کارخانہ کے منیجر ہم کو شوروم میں لے گئے۔ دروازہ سے داخل ہوتے ہی ہم نے ایک ایسی چیز دیکھی کہ دفعتاً رک گئے۔ دیکھا کہ ایک سانپ کوئی ڈیڑھ گز لمبا تین انچ موٹا منہ کھولے زمین پر پڑا ہے۔ چھت کے قریب ایک چوہا چڑ چڑ کر رہا تھا۔ چوہا نہایت بیتابی سے دو فٹ دیوار پر سے نیچے اُترتا۔ اور ڈیڑھ فٹ اوپر چڑھ جاتا۔ یونہی چند منٹ اُترتا اور چڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ زمین پر اُتر آیا۔ سانپ ویسے ہی منہ کھولے بےحس و حرکت پڑا تھا۔ بھاگ کر خود بخود چوہا سانپ کے کھلے ہوئے منہ میں داخل ہو گیا۔ اور سانپ اُس کو نگل گیا۔ اس موقع پر چوہے کو کوئی فوری خوف نہیں تھا۔ بلکہ خوف جبلت حیوانی کی وجہ سے اُس کی فطرت میں داخل ہو چکا تھا۔ اور چوہے کو سانپ نے اس خوف کی وجہ سے زیر اثر لاکر ہپناٹائز کر دیا تھا۔ اس وقت خوف اور اُس کے لوازمات تمام و کمال چوہے کے بدن اور اُس کی حرکات سے ہویدا تھے۔ اور سانپ کی توجہ دیکھنے قابل تھی۔

جانوروں پر راگ کا اثر

انسان راگ کو پسند کرتا ہے۔ اور بیشتر سے ادنیٰ درجہ کے جانوروں یعنی حیوانات میں بھی یہ احساس لطف پایا جاتا ہے۔

ہم چند تجربات کا نتیجہ جو لندن کے چڑیا گھر میں کئے گئے بیان کرتے ہیں۔ ایک بینڈ باجہ جس میں دو وائلن ایک بانسری اور ایک منہ سے بجانے کا باجا تھا۔ ہر ایک جانور کے پاس باری باری سے لیجائے گئے۔ نتائج اگرچہ پریشان کن تھے۔ لیکن دلچسپ تھے۔

مثال کے طور پر گینڈے کے لئے راگ کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا اور کوئی بھی راگنی گائی جائے وہ یوں حملہ کرتا ہوا دوڑتا تھا کہ گویا بینڈ کو

توڑ دے گا۔ دھیمے سلانے والے سر، درد اور بھی سر اُس کی قوت غضب کو یکساں طور پر متحرک کر رہے تھے۔ برخلاف اُس کے دریائی گھوڑا سوائے جاز کے باقی ہر قسم کے سروں کو پسند کرتا تھا۔

بیشتر نغمے جو گینڈے کو غضب آلود کر دیتے تھے اُن کے لئے خوش آہنگ تھے۔ وہ اگلے پاؤں کھڑے کر کے جنگلے کے ساتھ ٹیک لگا کر نہایت غور سے سنتے تھے۔ حتیٰ کہ جھنجھاہٹ کی آخری سریں بتدریج فضا میں غائب ہو جاتیں۔ یہاں پر مقصد حقیقی کا کوئی سوال نہیں تھا۔ چڑیا گھر کے دریائی گھوڑے اپنے محافظ کو دیکھ کر مسرور ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اُن کو تازہ مچھلی کی یاد دلاتا ہے۔ لیکن یہاں خوراک کا کوئی سوال نہیں تھا۔ طوفان باد و باراں بجلی کی کڑک اور توپوں کی گرج دریائی گھوڑوں پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ اس لئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ صرف آواز ہی اُن کو اپنی طرف راغب کر لیتی تھی۔

چڑیا گھر کے بھیڑئیے اور گیدڑ نہایت خوشی سے راگ کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ جونہی کہ ہلکے سروں میں کوئی راگ گایا جاتا وہ اپنی تھوتھنیاں آسمان کی طرف کر لیتے اور اس قدر شور مچاتے کہ بینڈ کی آواز اُس میں ڈوب جاتی۔ چیتا خوب محظوظ ہوتا تھا۔ گایوں کے سامنے جب میٹھے سروں میں کوئی راگ گایا جاتا تو وہ پہلے کی نسبت زیادہ دودھ دیتیں۔

ناظم تالاب ہائے چڑیا گھر لکھتے ہیں کہ بینڈ مگرمچھ کو بلاناغہ اپنی طرف راغب کرتا تھا۔ حقیقتاً بینڈ بجنے پر تمام تالاب خالی ہو جاتے اور ہر جانور کناروں پر آ کر سر پانی سے باہر نکال کر دلچسپی سے راگ سننے لگتا۔ حشرات الارض میں سے بچھو راگ میں دلچسپی لیتے تھے۔

یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ تمام اقسام کے بندر راگ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ بلکہ بعض تو سنکر برافروختہ ہو جاتے ہیں۔

نغمہ اور شور

اس قسم کے تجربات کا خلاصہ لکھنا ایک دشوار امر ہے۔ ظاہراً ایک قسم کے جانور کا نغمہ دوسرے کے لئے ناپسند شور ہو گا۔ اور وہی دلچسپ نغمہ جو پرجوش اور مجذوب دریائی گھوڑے کو حلقہ بگوش کر لیتا ہے۔ سرد مزاج بلغمی کاہل گینڈے کو برافروختہ کر دے گا۔

جانوروں کے گیت جو ہمارے لئے بے ربط و بے معنی شور سے زیادہ نہیں ہیں۔ جن کے لئے مقصود ہوتے ہیں۔ اُن کے دلوں میں وجد کی حالت پیدا کر سکتے ہیں۔

بلی کی پر آشوب صدائیں اور پرانے مقبرہ کے کھنڈرات میں سے اُلو کی چیخ سننے والوں کے لئے یکساں طور پر دلچسپ ہو سکتی ہے۔ یہ کہنا نہایت مشکل ہے کہ کہاں نغمہ شروع ہوتا ہے اور کہاں پر محض شور ختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً موسم گرما میں ہمارے بجلی گھروں ہر سال ڈائنموں سے چھو چھو کر کروڑوں مچھر فنا کا جام پیتے ہیں۔ ڈائنموں کی بھن بھناہٹ نروں کو نہایت مرغوب ہوتی ہے۔ اور وہ غالباً اُسے کسی محبوب کا نغمۂ محبت سمجھتے ہیں۔ بعض جگہ مچھر کی اس فطری کمزوری سے فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔ اور اُن کے فنا کرنے میں مدد لی گئی ہے۔ ایک امریکن انجینیر نے اس مشاہدہ کو کام میں لا کر ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جو ایک خاص قسم کی آواز پیدا کرتا ہے۔ یہ آواز مچھروں کے لئے نہایت پسندیدہ ہوتی ہے۔ مچھر اس آواز کو سنکر بیتاب ہو ہو کر اُس پر گرتے ہیں اور بجلی سے جل کر خاک سیاہ ہو جاتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ بعض قسم کے چوپائے راگ سے مسحور ہو جاتے ہیں۔ اور زمانہ گذشتہ کے قصص جن میں اُن کا ذکر ہوتا ہے کسی قدر حقیقت پر مبنی ہیں۔ لیکن ایک قصہ جو دنیا بھر میں مشہور تھا نہایت بری طرح سے جھٹلایا گیا ہے۔ یعنی سانپ کا راگ پر عاشق ہونا وغیرہ۔ تجربات سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ کسی قسم کے سانپ نے کسی قسم کے راگ کے ساتھ شمہ بھر بھی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ سپیروں کا سانپ کو بین پرست کرنا محض اُن کا ایک فریب ہے۔ سانپ مست نہیں ہوتا بلکہ فطرت سے مجبور ہو کر سپیرے کی بین کو جو اُس کے ہاتھ میں ایک باقاعدگی کے ساتھ لہراتی ہے۔ کاٹنے کو اُٹھتا ہے۔ اور چونکہ ہر بار بین کے ساتھ جاتا ہے اس لئے لوگ اُس کو ناچتا ہوا تصور کرتے ہیں۔

جانوروں پر انسانی راگ کا اثر ایک مشکوک امر ہے۔ لیکن عام قسم کے جانور اپنی نوع کے راگ کو پسند کرتے ہیں۔ خصوصاً نغمہ ہائے اُلفت کو تقریباً ہر قسم کے پرندے انڈوں کے موسم میں راگی بن جاتے ہیں۔ بعض قسم کے بندروں اور بن مانسوں کے گلے ارغنوں کی قسم کے ہوتے ہیں۔ اور رات کو گھڑیال کی آواز اور موسم برسات میں مینڈکوں کا مل کر ٹرانا۔ اس قسم کی راگ کی اعلیٰ ترین مثالیں ہیں۔ ایک قسم کا جانور یعنی جنگلی چوہا مادہ کو اپنے کانوں کی خاص قسم کی رگڑ سے آواز

جنّت

وہ بالکل بیکار تھا، نکما تھا، اسے کوئی کام نہ تھا، صرف طرح طرح کے شوق تھے، وہ لکڑی کے مربع ٹکڑوں پر مٹی ڈال کر بجایا کرتا۔ بس اس کا یہی کام تھا۔ گھر میں ہر شخص اس کی شکایت کرتا، نفرت کی انتہا نہ تھی، وہ خود بھی کبھی کبھی عہد کر لیا کرتا تھا کہ اب میں اس پاگل پن کو چھوڑ دوں گا۔ لیکن پاگل پن اس کو نہ چھوڑتا۔

(۲)

بعض لڑکے سال بھر تک بالکل نہیں پڑھتے پھر بھی امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں، ٹھیک یہی اس کا انجام ہوا، اس کی تمام عمر تو بے عملی میں بسر ہوئی لیکن مرنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اسے آسمان میں جگہ مل گئی ہے، قسمت آسمان کی راہ میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتی، فرشتوں نے اسے بے عملوں کے آسمان میں لیجانے کے بجائے باعملوں کے آسمان میں داخل کر دیا۔ اس آسمان میں اور سب کچھ تو تھا لیکن اطمینان نہ تھا، یہاں مرد کہا کرتے تھے کہ دم لینے کی فرصت نہیں، عورتیں کہتیں کہ۔ میں تو چلی کام پڑا ہوا ہے، غرض سب یہی کہتے کہ وقت قیمتی ہے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ وقت بے قیمت ہے۔ جو تھا یہی کہتا کہ اب تو ہم سے کچھ اور نہیں ہو سکتا، باوجود اس پریشان حالی کے سب خوش تھے، اکثر شکایت کرتے تو صرف یہ کرتے کہ کام کرتے کرتے حیران ہو گئے

اس بیچارے کو کہیں بھی عافیت نہ تھی، نہ اس سے کسی کی موافقت ہوتی تھی، وہ راستے میں اپاہجوں کی طرح چلتا جس سے مصروف کار لوگوں کو بیحد دقت ہوتی، وہ اگر کہیں چادر بچھا کر چاہتا کہ بیٹھے اور آرام کرے تو کوئی نہ کوئی آکر اس سے ضرور کہتا کہ۔ ارے بھئی یہ کھیت ہے، اس میں دانے بوئے ہوئے ہیں۔ پھر اسے وہاں سے اٹھ جانا پڑتا۔

(۳)

ایک لڑکی روزانہ پابندی کے ساتھ گھڑا لیکر آسمان کے ایک چشمے سے پانی بھرنے آتی تھی، جو ستارے تاروں کی طرح راستے پر تھرکتی ہوئی چلتی تھی، وہ جلدی جلدی بالوں کو سنوار کر جوڑا باندھ لیتی تھی پھر بھی دو چار بال اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے رہ ہی جاتے تھے، گویا وہ اس کی آنکھوں کی سیاہی دیکھنے کے لئے جھانکتے رہتے تھے۔

وہ نکما چشمے کے کنارے ایک طرف درخت کی طرح چُپ چاپ کھڑا رہتا تھا۔

جس طرح کھڑکی سے کسی مسکین کو دیکھ کر شہزادی کو ترس آجاتا ہے اسی طرح اس بے عمل نکمے کو دیکھ کر لڑکی کا دل ہمدردی سے لبریز ہو گیا۔

لڑکی نے کہا۔ معلوم ہوتا ہے تمھیں کوئی کام نہیں ہے۔

اُس نے زور دیکر کہا۔ کام تو کروں، لیکن اس کے لئے وقت نہیں ہے۔

لڑکی کچھ سمجھ نہ سکی۔ اس نے کہا۔ مجھ سے کام لوگے ؟

اس نے کہا۔ تم سے کام ہی لینے کے لئے تو میں یہاں کھڑا ہوں۔

لڑکی نے کہا۔ کیا کام دوں ؟

اس نے کہا۔ تم پانی بھرنے کے لئے جو گھڑے لاتی ہو۔ ان میں سے ایک گھڑا مجھے دیدو۔

"گھڑا لیکر کیا کروگے پانی بھروگے؟"

"نہیں میں اس پر تصویر بناؤں گا۔"

لڑکی نے گھبرا کر کہا۔ میں جاتی ہوں، مجھے فرصت نہیں ہے۔

اسی چشمے پر روزانہ دونوں کی ملاقات ہوتی، اور وہ روز یہی کہتا کہ مجھے اپنا گھڑا دو۔ میں اس پر تصویر بناؤں گا، آخر مجبور ہو کر لڑکی نے گھڑا دیدیا۔ وہ اس کو لیکر اس پر تصویر بنانے لگا، مختلف قسم کے رنگ تھے اور مختلف قسم کے خطوط،

تصویر بن جانے پر لڑکی نے اسے خوب غور سے دیکھا، پھر بھوئیں ٹیڑھی کر کے پوچھنے لگی۔ اس کا مطلب ؟

اس نکمے نے کہا۔ اس کا مطلب کچھ بھی نہیں۔

لڑکی گھڑا لیکر گھر چلی گئی، وہ دن میں سب کی آنکھ بچا کر اسے دیکھا کرتی رات کو بستر سے اٹھ کر اور چراغ جلا کر اس تصویر کو دیکھتی، اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایسی چیز دیکھی جس کا کوئی مطلب نہیں۔

اُس روز بھی اس نکمے سے ملاقات ہوئی۔

لڑکی نے کہا۔ اب کیا چاہتے ہو؟

"تم سے کام چاہتا ہوں"

"کون سا کام دوں ؟"

"اگر تم پسند کرو تو میں رنگین سوت بٹکر چٹی باندھنے کا ڈورا طیار کردوں۔

"اس سے کیا ہوگا ؟"

"کچھ نہیں"

اب ڈورے طیار ہونے لگے اور آئینہ لیکر پٹی باندھنے میں بڑی دیر ہونے لگی، کام پڑا رہ جاتا تھا اور وقت نکل جاتا تھا۔

(۴)

دیکھتے ہی دیکھتے بیکار لوگوں کے آسمان میں بڑا خلل پڑ گیا۔ منتظمین آسمان بہت پریشان ہوئے۔ انھوں نے ایک کمیٹی کی اور کہنے لگے کہ اب سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔

آسمان کے کارندے نے اپنا قصور تسلیم کیا۔ اور کہنے لگا میں نے غلطی سے ایک نکمے کو اس آسمان میں داخل کر لیا۔

وہ نکما کمیٹی میں بلایا گیا۔ اس کی رنگین پگڑی اور کمربند دیکھ کر لوگوں نے کہا واقعی بڑی غلطی ہوئی۔

صدر نے کہا۔ تمھیں پھر زمین پر واپس جانا ہوگا۔

وہ اپنی رنگین پگڑی کو ہلاتے ہوئے بولا۔ تو پھر میں رخصت!

لڑکی بولی۔ میں بھی جاؤں گی۔

صدر حیران سا ہو گیا۔ اس نے بھی پہلی ہی بار ایسا واقعہ دیکھا جس کا کوئی مطلب نہیں ❊

(ٹیگور۔ بذریعہ سرسوتی ہندی)

ابو محمد امام الدین مدیر ترجمان

بنارس

خزینۂ دانش

پھول مرجھا کر انسان کو دنیا کے فانی ہونے کا پیغام دیتے ہیں۔ لیکن فانی انسان نہیں دیکھتا۔ نہیں سنتا۔ دنیا فنا ہو جائیگی اور صرف خدا باقی رہ جائے گا۔ ہر عشرت کے ساتھ غم ہے۔ پھول کے ساتھ کانٹے ہیں۔

(فارسی)

اروائے دیراف نامہ

تاج

یہ عمارت فن تعمیر کا ایک رنگین نقش ہی نہیں بلکہ ایک مغرور اور بے نیاز بادشاہ کا شعلۂ محبت ہے۔ جو زندگی سے لرزاں پتھر کی صورت میں آسمان کی طرف مائل پرواز ہے۔

جس طرح ایک خوبصورت نازنین کے شعلہ ہائے حسن و جمال کے سامنے انسان کی تمام سوتی ہوئی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں خون رگوں میں جوش مارنے لگتا ہے اور سانس لینے میں رکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مین اسی طرح کے جذبات تاج کا نظارہ پیدا کرتے ہیں۔

مسٹر اے ای ارنلڈ

دعا

روح کی سچی خواہش کا نام ہے۔ یہ ایک پوشیدہ شرار کی گرمی ہے۔ جو سینے کی گہرائیوں میں درخشاں ہے۔

مانٹگمری

دو بادشاہ
جیسے شیر حیوانات کا بادشاہ
ہے ویسے ہی "امرت دھارا" کا ایک
ایک قطرہ نباتات کا بادشاہ ہے
دھارا
امرت
امرت دھارا کے ایک قطرے سے امراض ایسے ڈر کر بھاگتی ہیں جیسے شیر کی ایک ایک آواز سے تمام حیوان ڈر کر بھاگتے ہیں۔ امرت دھارا
مہینوں کی امراض دنوں میں اور دنوں کی منٹوں میں اور گھنٹوں کی منٹوں میں دور کر دیتی ہے کوئی دوائی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔
اور طرفہ یہ ہے کہ ایک ہی دوائی تقریباً کل امراض کو دور کر دیتی ہے
امرت دھارا لاہور
منیجر امرت دھارا اوشدھالیہ۔ امرت دھارا بھون۔ امرت دھارا روڈ۔ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور

لمیٹڈ کمپنیاں

مشترکہ سرمایہ سے تجارت

حکومت ہند کے ایکٹ نمبر ۵ سنہ ۱۹۱۲ء نمبر ۷ سنہ ۱۹۱۲ء یا نمبر ۷ سنہ ۱۹۱۳ء کے ماتحت کمپنیاں رجسٹری کرانے کیلئے اور میمورنڈم اور آرٹیکل آف ایسوسی ایشن کی تیاری۔ نیز جملہ امور متعلقہ کی نسبت اور ضروری کارروائی انجام دینے کے لئے ہماری خدمات حاضر ہیں۔ لمیٹڈ کمپنیوں کے لئے ہر قسم کے فارم اور رجسٹر سٹیشنری وغیرہ بھی مل سکتے ہیں۔ (ادبی دنیا کا حوالہ ضرور دیجئے)

دی ایسٹرن پبلشنگ اینڈ سٹیشنری لمیٹڈ نمبر ۱ چیمبرلین روڈ لاہور

اخبار کا حوالہ دینے سے پلنگ مفت

مکھیوں اور مچھروں سے خدا کی پناہ۔ رات کی نیند دوپہر کا آرام حرام کر دیتے ہیں اور مچھروں کے کاٹنے کا نتیجہ تو ملیریا بخار کی صورت میں مہینوں بھگتنا پڑتا ہے۔ آپ آج ہی اپنے اور اپنے بال بچوں کے لئے ہم سے اعلیٰ درجے کی پائیدار مہین جالی کی نفیس مسہریاں طلب فرمائیے۔ اور چین کی نیند سوئیے۔ ان کے استعمال سے کوئی بیماری کا خوف بالکل نہیں رہتا۔ قیمت صرف چھ روپے آٹھ آنے فی عدد سائز کے لحاظ سے چارپائی اور بڑے پلنگ کے لئے یکساں کارآمد۔ سائز ۷ فٹ اور ۵ فٹ

ملنے کا پتہ ایس احمد اینڈ کمپنی پوسٹ بکس ۱۲۵ لاہور

روپی کماؤ

بے روزگاری کا جو گوہر مقصود — پھر ہر کمانا بھی ساحر نہیں

سب بے روزگاروں، بھک منگوں اور ناداروں کو دولتمند اور خوشحال بنانیوالی اردو میں اپنی قسم کی پہلی کتاب۔ انگلستان اور امریکہ میں یہ دستور ہے کہ تمام زن و مرد فالتو وقت میں فاضل کمائی کے لئے کوئی نہ کوئی شغل ضرور کرتے ہیں اور ماہوار تنخواہ سے دو چند بلکہ سہ چند زیادہ کماتے ہیں۔ روپی کماؤ۔ امریکہ کی ایک بہترین کتاب کا اردو ترجمہ ہے جسمیں گھر بیٹھے بغیر کسی سرمایہ کے کم از کم دو گھنٹہ روزانہ کی محنت سے ہر شخص دو دو روپے کی محنت سے لیکر ۵ روپیہ تک روزانہ کمانے کے قابل ہو جائے گا۔ امریکہ میں یہ کتاب کئی بار چھپ کر لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو چکی ہے۔ وجہ کیا ہے اس میں وہ وہ آسان ترین ہنر اور ایسے ایسے روپیہ کمانے کے نسخے بتائے گئے ہیں جن کو سیکھنے اور اپنے فائدہ سے کرنے کے لئے نہ کسی استاد کی ضرورت ہے اور نہ سرمایہ کی۔ ہر حیثیت اور ہر لیاقت کا آدمی ان ہنروں سے پہلے روز ہی اسطرح فائدہ اٹھا سکتا ہے جیسے کوئی بیس سال کا پرانا دستکار۔ مختصر فہرست مضامین ملاحظہ ہو۔

پرانے چیتھڑے اور ردی کاغذ کے ٹکڑوں سے روپیہ پیدا کرنے کی ترکیب۔ فوارہ کے چھلکوں سے روپیہ کمانا۔ آم کی گٹھلیوں سے روپیہ پیدا کرنا۔ چولہے کی راکھ سے کس طرح دولت پیدا کی جا سکتی ہے۔ ایک پیسہ میں دو لیمونیڈ کی بوتل تیار کرنے کی ترکیب۔ بغیر چربی اور ناک کے صابون تیار کرنا۔ جادو کا سانپ بنانا۔ چند پیسوں کی لاگت سے گھریلو پریس تیار کرنا۔ سیل آرڈر بزنس یعنی اشتہاروں کے ذریعہ سے روپیہ کمانے کی حیرت انگیز ترکیبیں۔ چوہوں کی سیکنگ سے روپیہ کمانے کی ترکیب۔ بالوں میں چھلے ڈالنے کا مسالہ۔ پیپرمنٹ کی تجارت۔ پانسکو بیچنے کے ذریعہ روزگار۔ عورتوں کے بال گھونگھر والے بنا کر روپیہ کمانے کی ترکیب۔ پانی سے لکھنے والے قلم تیار کرنا۔ کمس بار گم بنانا۔ پھول عرق تیار کرنا۔ کٹ پیس کی تجارت سے روپیہ پیدا کرنا۔ ایک پیسہ کی برفی سے ایک روپیہ روزانہ پیدا کرنے کی ترکیب۔ ایک آنہ کے سرمایہ سے آٹھ آنہ روزانہ کمانے کا طریقہ۔ دس روپیہ کے سرمایہ سے پانچ روپیہ روزانہ پیدا کرنا۔ تین روپیہ کس طرح پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ کسطرح کمائے جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ سینکڑوں قسم کے قیمتی اور مجرب نسخے بنانے کی ترکیبیں جو کوڑی کی لاگت سے تیار کر کے روپوں میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو سکتے ہیں۔ ہر کتاب کی قیمت بھی سستی ہے۔ باوجود ان خوبیوں کے قیمت صرف دو روپیہ۔

نیشنل ٹریڈنگ کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۵ لاہور

مفت

ماہوار رسالہ "تاجور" جو جنوری سنہ ۱۹۳۰ء سے جاری ہے۔ اس میں دلچسپ۔ دل خوش کن اور مفید مضامین نیز ناول سبق آموز افسانے۔ تاریخی حالات اور جغرافیائی دلچسپیاں۔ تجارتی اور سائنٹفک معلومات درج ہوتی ہیں۔ سالانہ چندہ دو روپیہ مگر ۳۱ اگست تک ڈیڑھ روپیہ۔ اس رعایت سے فائدہ اٹھائیے۔ اور فوراً ڈیڑھ روپیہ کا منی آرڈر بھیجکر پرچہ جاری کرا لیں۔

نمونہ کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

مینیجر رسالہ تاجور دفتر تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور

تبصرے

جدید مطبوعات

اسلامی تصوف

مترجم - مولانا عبدالرحیم صاحب ناظم مکتبۂ علوم

قیمت ۱۲؍ - مقام اشاعت الہلال بک ایجنسی - شیرانوالہ دروازہ لاہور

فاضل مترجم نے شیخ الاسلام حافظ ابن قیم الجوزی کی تصنیف طریق الہجرتین حصہ اول کا ترجمہ کرکے ایک اہم خدمت انجام دی ہے - اس کتاب میں اسلامی تصوف کے بنیادی اصولوں کو واضح کیا گیا ہے - مفید کتاب ہے اور اس کے دام سستے ہیں -

پیمانۂ محبت

تضمین بر غزلیات غالب
غزلیات و قطعات

مصنفہ - منشی مولا بخش ہمدم - پبلشر منشی محمد اسلم کلاکوٹ کراچی شہر - قیمت درج نہیں -

ہمدم صاحب کی تضمینوں اور غزلوں کا مجموعہ ہے - تضمینیں اکثر بے لطف ہیں - اور قیامت یہ ہے کہ صرف بے لطف ہی نہیں بلکہ غالب کے پرواز تخیل کو نہایت ہی بھونڈے رنگ میں پیش کرتی ہیں -

غالب کا مشہور قطعہ ہے -

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل ...

ہمدم صاحب تضمین فرماتے ہیں -

یہ ملک و مال اور یہ سب عظمت شہی
رفع غم و الم کے لئے لازمی سبھی
سامان انبساط دکھاتے ہیں گمرہی
ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے
قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

باقی رہی انکی اپنی غزلیں تو ان کے متعلق صرف یہ کہنا کافی ہے کہ

خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست

تجلیات سخن

(مجموعہ کلام مولوی نظامی)

مصنف - نظام الدین حسن نظامی بدایونی

اس کتاب کے مصنف وہی مشہور نظامی ہیں جو کتابوں کو اس لطافت اور نزاکت سے چھاپتے ہیں کہ دل خوش ہو جاتا ہے - اس کتاب میں ان کی نظمیں جمع کردی گئی ہیں - قیمت درج نہیں -

شہیدان ننکانہ

مصنف گورمکھ سنگھ - گورمکھ - مقام اشاعت - چوک پائیاں امرتسر قیمت ۸؍ واقعہ ننکانہ کے تفصیلی حالات پر مشتمل ہے -

پیام نور - اور اتمام حجت

مصنف - عبد الوہاب کی (بنگلور) قیمت ۲؍

کتابت - طباعت - مرغوب و گوارا -

۳۰ صفحہ کی ضخامت کی ایک مختصر سی کتاب ہے - جس میں مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے - مصنف کا دعوی ہے کہ انہیں خواب میں رسول خدا نے حکم دیا تھا کہ مسلمانوں کو آپ کا پیغام پہنچا دیا جائے -

"تاریخ"

تاریخ اور آثار قدیمہ کا ایک سہ ماہی رسالہ ہے - جو کونڈ اکبر جاہ حیدرآباد دکن سے شائع ہوتا ہے۔

حکیم سید شمس اللہ قادری اس کے مدیر ہیں - سالانہ قیمت پانچ روپیہ ہے رسالہ بڑی محنت سے ترتیب دیا گیا ہے - اور اکثر مضامین کافی ریسرچ کے بعد لکھے گئے ہیں -

اس میں کوئی شک نہیں کہ عام اردو داں پبلک کے لئے اس رسالے میں کوئی سامان دلچسپی نہیں - لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی اشاعت کا مقصد صرف "ارباب نظر" کے ذوق علمی کی تسکین ہے - اور وہ بوجہ احسن انجام پائے گا -

دنیائے ادب

عقل کا سرمایہ دار

افضل ان لوگوں کی طرف ایک حقارت کی نظر ڈال کر گذر گیا جو انارکلی میں دوکانوں کے چبوتروں پر سو رہے تھے۔ زرد سکڑے ہوئے چہرے کسی دبے سے دبی ہوئی آنکھیں بکھرے ہوئے بال۔ یہ لوگ اندھی تقدیر کے زخم خوردہ تھے۔ اور اپنی حالت کو سدھارنے کے لئے کچھ نہ کر سکتے تھے۔ آج صبح ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ آج شام کو ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ کل صبح ان کے پاس کچھ نہ ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

افضل کی یہ حالت نہ تھی۔ اُسے یقین تھا کہ کل شام تک اس کی جیبیں روپے سے بھرپور ہوں گی۔

اس کا لباس سادہ لیکن قیمتی تھا۔ اور انداز سے ایک قسم کی نفاست نمایاں تھی۔ تعلیم کی نفاست جو غربت میں بھی باقی رہتی ہے۔ اچھی تربیت کی نفاست ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس کی جیب میں اس وقت پانچ روپے چھ آنے تھے۔ انارکلی سے گذر کر وہ چنگڑ محلے پہونچا۔ ایک غیر معروف قمار خانے میں داخل ہو گیا اور اپنی ساری پونجی ہار دی۔

باقی رات اس نے گلیوں میں پھر کر گذار دی۔ ۔ ۔ ۔

صبح ایک دوا فروش کی دوکان کے سامنے اُسے ایک چھوٹا سا لڑکا نظر آیا۔ جس کے ہاتھ میں ایک بوتل تھی۔ بوتل کے گرد ایک نسخہ لپٹا ہوا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں کوئی چکدار شے تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ایک روپیہ

افضل نے مسکرا کر کہا "کہاں جا رہے ہو تم بچے؟"

لڑکے نے غرور سے جواب دیا "میں۔ میں امی کے لئے دوا لینے جا رہا ہوں۔ امی نے مجھے ایک روپیہ دیا ہے"۔

یہ کہتے ہوئے اُس نے مٹھی کھول کر ایک چمکتا ہوا روپیہ دکھایا۔ افضل نے کہا "خوب تمہاری امی نے یہ خیال نہیں کیا کہ کہیں تم کسی تانگے کے نیچے نہ آ جاؤ۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں اور راہ میں ہم ملائی کا برف کھائیں گے۔ ملائی کا برف کھاؤ گے یا میٹھی ٹکیاں لو گے؟"

افضل بچے کا ہاتھ پکڑے ہوئے دواخانے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ایک تبسم سا تھا۔ مہذبانہ دانشمندانہ اس نے دوا ساز کو نسخہ دیتے ہوئے کہا۔

خالص پانی ایک پنٹ۔ سوڈیم کلورائڈ چار گرین اور نسخہ تیار ہو گیا۔ مجھے دھوکا دینے کی کوشش فضول ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس نسخے کی کیا قیمت ہے۔

دوا ساز مسکرایا۔ نسخہ بنا کر اس نے افضل کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا "چار آنے"

پھر بولا "آپ دوا سازی کے فن کو خوب سمجھتے ہیں۔ عام طور پر اس نسخے کی قیمت ایک روپیہ لی جاتی ہے"۔

افضل بھی مسکرایا۔ باقی بارہ آنے کے پیسے اپنی جیب میں ڈالے۔ بچے کو ایک آنے کی مٹھائی لے دی۔ نسخہ اور بوتل اُس کے ہاتھ میں دیدی۔ اور اُسے یہ کہتے ہوئے رخصت کر دیا "تانگوں اور موٹروں سے بچنا"۔

یکایک دونوں طرف سے دو موٹریں بچے کی طرف آئیں۔ افضل برق مثال تیزی سے دوڑا اور بچے کو تھام کر بیچ میں کھڑا ہو گیا۔

اس کے بعد افضل ایک ہوٹل میں داخل ہوا۔ آرڈر دیا اور انتظار کرنے لگا جب خادم اس کا کھانا لیکر آیا تو افضل نے اُس سے نہایت متین اور سنجیدہ لہجے میں پوچھا "بھلا تم جانتے ہو کہ آدمیوں کی وہ تین قسمیں کونسی ہیں جنکو آسانی سے فریب دیا جا سکتا ہے؟"

ملازم نے انعام کی توقع میں جواب دیا۔

"کیوں نہیں ایک تو وہ مسافر ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"غلط ہے"۔ افضل نے ملازم کو ٹوک دیا "وہ تین قسمیں یہ ہیں۔ مرد بچے اور عورتیں"۔

اور وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

ہوٹل سے باہر نکل کر وہ ایک جعلی چٹھی لیکر ایک سیدھے سادے مسلمان

کے گھر گیا۔ اور اپنی مصیبتوں کی داستان سنا کر پانچ روپے اینٹھ لایا۔

اب دوپہر ہونے کو تھی۔ وہ سیگو ڈر دوپر سے گزر رہا تھا کہ چار خوش پوش نوجوان جوانی کی شراب میں سرشار افضل کو پہچان کر اس کی طرف بڑھے۔

ایک نے کہا "ارے افضل! بڑی دیر کے بعد تم کو دیکھا۔ آؤ دریا پر چلتے ہو۔ فرزند نے ہم سب کو دعوت دی ہے۔ آئس کریم اُڑے گی۔"

دوسرا بولا۔ کیوں نہیں۔ بھلا افضل اور انکار چلو بھی۔

افضل نے کہا "حضرات مجھے بےحد افسوس ہے۔ پورے ایک بجے مجھے خان بہادر محمد حسین کے ہاں پہونچنا ہے۔ وعدہ ہو چکا ہے۔ میں ان کے ساتھ مسوری جا رہا ہوں"۔

خوش پوش نوجوان رخصت ہو گئے۔

افضل نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ روپوں کو ٹٹولا۔ اور پھر اپنے آپ سے کہنے لگا۔

ہمت حوصلہ۔ دکھاوا زندگی کے سب سے ضروری عناصر ہیں۔

دکھاوا۔ سب دکھاوا ہے۔ زندگی کے کھیل میں دکھاوا ترپ ہے۔ مرد بچے۔ عورتیں سب اسی دکھاوے سے متاثر ہوتے ہیں۔ دکھاوا . . . .

اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

ایک بوڑھا شخص جس کے کپڑے مرکھا قطعاً اس کے گنوار پن پر دال تھا۔ اس سے خطاب کر کے کچھ کہہ رہا تھا۔

"معاف کیجئے گا۔ آپ کو معلوم ہے وحید لاہور میں کہاں رہتا ہے۔ وہ میرا لڑکا ہے۔ اور میں اکبر آباد سے آ رہا ہوں۔ لیکن مجھے اس کا پتہ یاد نہیں رہا۔"

افضل نے تلخی سے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ پولیس میں اطلاع دیجئے"۔

"پولیس۔ بوڑھے گنوار نے دردناک سے طریقے میں کہا۔

"پولیس کی کیا ضرورت ہے۔ اگر آپ مجھے بتا سکیں کہ وحید . . . ."

افضل نے اپنی مسرت کو چھپاتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا "میں کسی سعید وحید کو نہیں جانتا۔ اور میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ . . . . ."

بوڑھے نے اُمید بھرے لہجے میں کہا "سعید نہیں جناب وحید۔ اس کا قد درمیانہ ہے۔ موٹی موٹی آنکھیں۔ گندمی رنگ کوئی تیس برس کے قریب عمر اور . . . ."

افضل نے بات کاٹ کر کہا "وحید تو میرا ہمسایہ ہے۔ آپ نے پہلے کیوں نہیں کہا"۔

یہ کہکر اُس نے اپنی گھڑی نکالی۔ اس کا اصول تھا کہ جھوٹا رہنا اچھا ہے۔ لیکن گھڑی کے بغیر گزارہ کرنا بہت برا ہے۔ پھر بولا "خان بہادر محمد حسین سے میں وعدہ کر چکا تھا کہ چھ بجے ان کے یہاں پہونچوں گا۔ لیکن اب مجبوری ہے۔ میں اپنے عزیز دوست کے باپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا"۔

اس واقعے کے ایک گھنٹے بعد ایک بوڑھا سادہ لوح گنوار تھانے میں اپنے نوٹوں کی چوری کی رپورٹ درج کرا رہا تھا۔ اور افضل - - - ا - - - اگے دس نوٹ جیب میں ڈالے ہوئے گھوم رہا تھا۔ اور اپنے دل میں کہہ رہا تھا وحید۔ یہ گنوار آتے کہاں سے ہیں۔ جنھیں یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ لاہور میں وحید کا نام لیکر اس کا پتہ نہیں مل سکتا۔ مطمئن دل۔ آسودہ فلسفیانہ خیالات میں غرق وہ لوہاری دروازہ کی طرف چل پڑا۔ دروازے کے پاس ایک شکستہ حال فقیر ہاتھ پھیلا کر مانگ رہا تھا۔ افضل کو دیکھ کر اس نے دردناک انداز سے کہنا شروع کیا "داتا تیرا بھلا ہو۔ غریب کے حال . . . . ."

افضل نے اس کی طرف ایک روپیہ پھینک دیا۔

بوڑھے فقیر نے دعائیں دیتے ہوئے کہا "اللہ تیرا بھلا کرے۔ مجھے بھیک مانگنے کا شوق نہیں ہے۔ کام نہیں ملتا کیا کروں"۔

افضل نے جواب دیا۔ تم بےوقوف ہو۔ کام کرنا بیوقوفوں کا کام ہے۔ دنیا ایک کان ہے۔ دوسرے لوگ محنت کرتے ہیں۔ لیکن سرمایہ دار فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ سونا انھیں کو ملتا ہے۔ میں عقل کا سرمایہ دار ہوں۔ عقل سے کام لیکر لوگوں کو فریب دیتا ہوں۔ اور کھاتا ہوں۔

فقیر نے پھر کہا "خدا تمھیں برکت دے"۔

افضل نے جواب دیا۔ برکت رفادار کتے کی طرح آج میرا پیچھا کر رہی ہے۔ اچھا خدا حافظ۔

ایک ہوٹل کی طرف چل دیا۔

سول سٹیشن پر نکلسن روڈ کی طرف آتے ہوئے اُسے شام ہو گئی۔ ایک کوٹھی کے پاس افضل رک گیا۔ اس کوٹھی کے گرد دیوار تھی۔ لیکن افضل پنجوں کے بل کھڑا ہو کر اندر جھانک سکتا تھا۔ ایک حسین لڑکی باغ میں ٹہل رہی تھی۔ اس کا لباس سفید تھا اس کے چہرے سے تقدس کا اظہار نمایاں تھا۔ اس کی آنکھوں میں دنیا بھر کی حیا اور شگفتگی سمائی تھی۔ یہ لڑکی افضل کی پھوپھی زاد بہن تھی۔ اور افضل اس سے منسوب تھا۔ لیکن اس کی حرکتوں کے باعث اس کی پھوپھی نے افضل سے اپنی لڑکی کی شادی کر دینے سے انکار کر دیا تھا۔ افضل کے دل میں ایک طوفان اضطراب اُٹھا۔ بچپن کے معصوم دن اور . . .

آہ . . . . .

وہ تار کے ایک کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔

"کاش میں مر جاؤں"۔

(چمن)

انگریزی

جسم انسانی

سقراط نے آج سے بہت پہلے پوچھا تھا۔ آدمی کیا ہے؟ وہ کیا بن سکتا ہے؟ کیا انسان گلہائے رعنا کے لباس میں جلوہ افروز ہوگا؟ کیا وہ غنچوں کے ساتھ شگفتہ ہوگا۔ کیا وہ پرندوں کی شکل میں نغمہ پیرا ہوگا۔ کیا اس کا جسم پھر درختوں کی شاخوں میں چھپ کر ہوا کے جھونکوں کے ساتھ حرکت کرے گا؟ اور غائب کی بات پوری ہوگی؟

یہ شے جو ہمارے جسم میں موجزن ہے اور جسم کے فنا ہونے کے بعد کھو جاتی ہے۔ یہ زندگی کیا ہوگی؟ موت کے بعد اس کا کیا بنے گا؟

ایک مشہور مصنف نے ایکبار لکھا تھا "میں مارنین کے گروہ میں سے ہوں۔ اس طرح کہ اپنے جسم کو برقرار رکھنے کے لئے میں ہزاروں جانداروں کا خون بہانا روا رکھتا ہوں۔ بعض اوقات میں ڈر جاتا ہوں۔ سوچتا ہے کہ اس ذرۂ بے مقدار کو زندہ رکھنے کے لئے جسے انسان کہتے ہیں کتنی زندگیوں کو برباد کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے"

یہ ہے جسم کا جبر!

ذرا تصور کیجئے۔ روحانی دنیا میں اگر مذکورہ بالا مصنف کے اردگرد ان مذبوح جانداروں کی شکلیں جمع ہوگئیں۔ اور دردناک نظروں سے اس کی طرف دیکھنا شروع کردیا۔ تو کیا اس سے بدتر کوئی دوزخ ہو سکتا ہے؟

یہ تو ہوا جسم کے متعلق۔ آئیے اب ذرا جسم میں رہنے والوں کے حالات کا جائزہ لیں۔

حضرت ایوبؑ نے فرمایا تھا "انسان کے جسم میں ایک روح بستی ہے اور خدائے تعالیٰ نے اس روح کو زیور عقل سے مزین کیا ہے"

دی پال کے اقوال کے مطابق وجود کی تثلیث میں ہمارے جسم کو مقدس روح کے مندر ہونے کا فخر حاصل ہے۔

بہ مدت کے اشراقی مفسر کہتے ہیں کہ یہ جسم سات اور جسموں کا آشیانہ ہے۔

آخر معلوم تو ہو کہ جسم کیا ہے؟ یہ کیا شے ہے۔ جسمیں روح رہنا منظور کرتی ہے۔ یہ کمزور شے جب وقت مردہ کر دیتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ قہار و جبار مطلق کے نور بے انتہا کا ایک شرارہ ایسی حقیر شے کو اپنا مستقر بنا لیتا ہے؟ جسم کی تخلیق کا مقصد کیا ہے۔

والٹ ولٹمن ایک نظم میں کہتا ہے

"اگر دنیا میں کوئی چیز مقدس اور پاک ہے تو جسم یقیناً وہ شے ہے۔ ایک مضبوط صحت مند جسم حسین ترین چہروں سے زیادہ خوبصورت ہے۔"

والٹ ولٹمن کی نظر میں روح کی وقعت جسم سے زیادہ نہ تھی۔ اور اگر ہم جسم کو انسان کی روح اور خدا کے صفات جلال و جمال کا مظہر سمجھیں تو واقعتاً دنیا کی کوئی شے اس سے زیادہ عظیم نہیں۔

آئیے ذرا انسان کے جسم کو مظہر شان خدا تصور کر کے دیکھیں

"خدا نے انسان کو زمین کی مٹی سے بنایا۔ اور پھر اس کے نتھنوں میں زندگی کا سانس پھونک دیا۔ اور پھر انسان ایک جیتی جاگتی روح بن گیا یوں خدا نے انسان کو اپنی شکل پر بنایا۔ عورتیں اور مرد تمام خدا ہی کے بنائے ہوئے ہیں"۔

انسان جیتی جاگتی روح تو جسم ہی وہ شے ہے۔ جہاں رہ کر روح پرواز پیدا کرتی ہے۔ جسم اپنے فرائض ادا کرنے کے بعد کچھ بھی نہیں وہ ایک کم قیمت صدف کی طرح ہے۔ جس سے درخشاں موتی نکال لئے گئے ہیں۔ روح ہی سے انسان کی شخصیت بنتی ہے۔ اور ہمیں اختیار ہے کہ جس طرح چاہیں روح کو متاثر کریں۔

ہم سرمدی عقل کے پیدا کردہ ہیں۔ اور خدائے قدوس نے ہم کو تین رہبر عطا کئے ہیں۔ جس سے ہم جسم پر قابو رکھ سکتے ہیں۔

نفس شاعرہ۔ نفس نیم شاعرہ اور نفوس اعلیٰ جنکی وسیع قوتوں کا احساس تھوڑے دنوں سے انسان کو ہونے لگا ہے۔

نفس باشعور آرزو پرور جسم پر قدرت رکھتا ہے۔

کولیر کہتا ہے۔

"اگر تم ان قابلیتوں پر انحصار نہ کرو۔ جو تمہارے نفس شاعرہ میں پوشیدہ ہیں۔ اور نفس نیم شاعرہ کے احکامات کے ماتحت کام کرو۔ تو تم اپنی راہ سے تمام مزاحمتوں کو دور کر سکتے ہو۔ یاد رکھو۔ مایوسی کی کوئی ایسی حالت نہیں۔ گزشتہ زندگی کی کوئی ایسی مصیبت نہیں جسے نفس رفع نہ کر سکتا ہو۔

کیونکہ تمہارے نیم شعوری نفس میں ایک اُستاد کاریگر کام کر رہا ہے۔ جس کی کیمیاگری سے عقل کل سے استفادہ کیا ہے۔ تم اپنے صلاحیتوں کو ٹھکانے جاؤ۔ وہ اور نئی پیدا کرتا جائیگا۔"

نفس نیم شاعرہ در اصل ایک جادوگر ہے۔ جو ہماری آرزوں کو اس طرح پورا کرتا ہے۔ جس طرح الہ دین کا طلسمی چراغ یہ نفس ہماری زندگی کے تمام تجارب کا خازن ہے۔ ہم نے جو کچھ پڑھا ہے۔ سنا ہے۔ محسوس کیا ہے وہ تمام ابھی محفوظ ہے۔ اور جو لوگ اپنی قوتوں کے ارتقا پانے کے بعد اس پر قابو پاتے ہیں۔ ان کے لئے وہ اپنے تمام خزائن بے نقاب کر دیتا ہے نفس اعلیٰ جمیں قوت شاعرہ بہت بڑھی ہوئی ہے۔ دانشمندی کا چشمہ ہے جو بارگاہ کبریا سے جاری ہوا ہے۔ اور جب ہم اس پر اقتدار حاصل کریں گے تو گویا خالق کائنات کے ہم آہنگ ہو جائیں گے۔

یہ زمانہ سائنس کی ایجادات و اختراعات کا زمانہ ہے۔ اور سائنسدان آئے دن نئی نئی باتیں دریافت کرتے رہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان ابھی تک ارتقاء کے مراحل پر ہے۔ آجکل گردودی ( ) غدود کی اہمیت پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے اعمال و وظائف میں تغیر و تبدل کر کے ہم انسان کے کردار کو متاثر کر سکتے ہیں۔ انسانی جذبات و احساسات پر اقتدار پیدا کر سکتے ہیں۔ کھوئی ہوئی جوانی کو حاصل کر سکتے ہیں۔ زندگی کو ایک غیر معین وقت تک طویل کر سکتے ہیں۔ اور اپنی تمام ذہنی قوتوں کو قایم رکھ سکتے ہیں۔

دو ہزار سال ہوئے حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا تھا۔

"میری ساخت عجیب و غریب ہے۔ اور خطروں سے لبریز ہے۔ خوفناک ہے۔"

اسی طرح انسان کا جسم بھی ایک خاص مقصد کے لئے ایک خاص طریقے پر بنایا گیا تھا۔ ہماری ہڈیوں پر گوشت اور اعصاب کے ڈھانچے محض اس لئے چڑھائے گئے تھے کہ ہمارا جسم روح کا مستقر بن سکے۔ تاکہ ہم تجارب سے فائدہ حاصل کریں۔ ارتقا پائیں۔ پھلیں۔ پھولیں اور اپنے کرموں کی سزا اور جزا پائیں۔

انسان کے جسم کے تمام اجزا سائنسدانوں کی تحقیق کے ماتحت اپنے اسرار ظاہر کر چکے ہیں۔ اس پیدائش کا کوئی ایسا پرزہ نہیں جس کے متعلق تفصیلی حالات معلوم نہ ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا جسم انسانی ایک پیانو ہے۔ جسے ایک ماہر کاریگر جب چاہے توڑ پھوڑ کے رکھدے اور پھر اسی طرح جوڑ لے مگر ذرا انسان کی ہیچ مدانی دیکھیں کہ اس پیانو کے ساز اور پرزوں سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود وہ دریافت نہیں کر سکا کہ توازن و تناسب کہاں ہے وہ شے جو نغمہ پیدا کرتی ہے کہاں مستور ہے۔ زندگی کس جگہ جلوہ گر ہے! یہ نغمہ نہیں دریافت ہو سکتا۔ یہ نغمہ فضائے قدس کا ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر جسم انسانی کے ہر ایک حصے سے واقف ہیں۔ مگر وہ اس جسم میں بسنے والی روح کو دریافت نہیں کر سکتے۔

کبھی نہیں۔ کیونکہ روح فضائے قدس کی ہے۔

سائنس داں جو اس جسم سے کام لیں۔ یا ان لطیف اور نازک آلہ ہائے کار سے جن کی وجہ سے اُنھوں نے دور دراز ستاروں کے راز دریافت کر لئے ہیں وہ روح انسان کو دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

سائنسدانوں نے روح کا وزن دریافت کرنے کی کوشش کی ہے اور معلوم ہوا ہے کہ موت سے پہلے اور موت کے بعد آدمی کے وزن میں صرف ایک اونس کا فرق پڑتا ہے۔

سقراط کو یہ راز معلوم تھا۔ جب زہر کا پیالہ پینے کے بعد اس کے شاگردوں نے اس سے پوچھا "آپ کو کہاں دفن کیا جائے؟" تو اس نے جواب دیا۔ جہاں تم چاہو۔ بشرطیکہ تم مجھے پکڑ سکو"۔

وہ جانتا تھا کہ اس کی روح کسی چیز میں مقید نہیں ہو گی وہ تو بلندیوں کی طرف پرواز کر جائے گی۔

آجکل کے ایک مشہور منطقی کا خیال ہے کہ تھوڑے عرصے کے بعد انسان کے جسم میں سے سرخ خون جاتا رہے گا۔ کیونکہ یہ خون زندگی کے مادی خیالات کا آئینہ دار ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان جانداروں کو کھا کر پلنے کے لئے پیدا نہیں ہوا تھا۔ اسکے خیال میں تمام لوگوں کو زمین کی پیداوار پر قناعت کر لینی چاہئے وہ کہتا ہے کہ اسطرح خود بخود تھوڑے عرصے کے بعد ہماری رگوں میں خون کی بجائے بجلی دوڑنے لگیگی۔

عربی

صحافت مصر

جنگ عظیم صحافت کے لئے اتنی ہی مفید ثابت ہوئی ہے جتنی کہ خشک کھیتی کے لئے بارش مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اس ہولناک لڑائی نے سیکڑوں

انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ مگر اخبار نویسی کے مردہ قالب میں جان ڈال گئی۔ یہ جنگ عظیم ہی کا صدقہ ہے کہ متمدن ملکوں میں آج صحافت نہ صرف بہترین نفع بخش تجارت ثابت ہو رہی ہے۔ بلکہ حکومت کی باگ ڈور بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

جنگ عظیم سے پہلے مصر میں ایک ادبی مقالہ، چند چٹکلے۔ اور کچھ پرانی خبروں خبروں کو ایک دو ورقی کی صورت میں شائع کر دینے کا نام اخبار نویسی تھا۔ مگر ان گزشتہ پندرہ سال میں جو زبردست انقلاب ہوا ہے وہ واقعی تعجب خیز ہے۔ مصر کی صحافت نے اب پرانا لباس اتار پھینکا ہے اور زرق برق مغربی لباس پہنکر مغربی طور طریقوں سے بن سنور کر مغربی ناز و انداز دکھا کر اپنے مغربیت پسند ناظرین کا دل بھا رہی ہے۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ مصر کی صحافت اسی بلند درجہ پر پہنچ چکی ہے جس پر اس کی مغربی بہن فائز ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ اس کے نقش قدم پر چلنے کی پوری کوشش کر رہی ہے اور اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہو چکی ہے۔ آج بھی انگلستان کے مایۂ ناز پرچوں۔ ڈیلی میل۔ ٹائمس اور سنڈے پکٹوریل کے مقابلہ میں ہم المقطم۔ الاہرام، اور اللطائف المصورہ کا نام لیکر شرمندہ نہیں ہو سکتے۔

مصر میں جنگ عظیم سے پہلے اخبار نویسی کو پیشہ کے طور پر محض وہی لوگ اختیار کرتے تھے۔ جن کے لئے رزق کے دوسرے دروازے بند ہو جاتے تھے۔ یا وہ اس سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ صحافت اپنی کم مائیگی کے سبب قابل انشا پردازوں کی خدمات حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن آج یہ بات نہیں ہے۔ مصر کے بعض اخبارات اپنے ماہر فن ایڈیٹروں کو دو سو گنی اسسٹنٹ ایڈیٹروں کو سو گنی اور مترجمین اور نامہ نگاروں کو پچاس گنی ماہوار تک دے رہے ہیں۔

ہر شخص جانتا ہے ہمارا زمانہ عصر تصاویر ہے۔ اس وقت وہی اخبار مقبول ہو سکتے ہیں جو تصویروں سے مزین ہوں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر اخبارات کو حسین عورت سے تشبیہ دی جا سکتی ہے تو تصویر کو اس کا زیور کہنا بالکل مناسب ہوگا۔ کیا کوئی حسین عورت بغیر زیور کے اپنے حسن کی تکمیل کر سکتی ہے؟

مصر کے بعض اخبارات و رسائل اس وقت بہترین تصویروں سے مزین ہو کر شائع ہو رہے ہیں۔ یہاں کے مشہور اخبار الاہرام نے اس سلسلہ میں وسیع انتظامات کئے ہیں۔ ممتاز ترین تصویر ساز اور تصویر فروش کمپنیوں کے ساتھ اس کے تعلقات ہیں۔ اور اس نے تصویر کشی اور بلاک سازی کے لئے ایک مستقل محکمہ قایم کر رکھا ہے۔ مشرق و مغرب کے تمام بڑے بڑے آدمیوں اور مشہور چیزوں کے فوٹو بڑی تعداد میں اس کے دفتر میں جمع ہیں۔ الاہرام کا پڑھنے والا جب اس میں کوئی آرٹیکل یا خبر دیکھے گا تو اس کے متعلق متعدد فوٹو اس کی نظر سے ضرور گذریں گے۔ الاہرام کے علاوہ السیاستہ۔ المقطم۔ مصر الحدیثہ۔ اللطائف المصورہ اور الہلال بھی اس سلسلہ میں قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی طباعت کی دلفریبی اور اپنی تصویروں کی بوقلمونی کے سبب رنگ برنگے پھولوں کا ایک باغ معلوم ہوتا ہے۔ مصر کے اکثر اخبارات کے اپنے پریس ہیں یہ پریس طباعت کی موجودہ ترقی کے بہترین نمونے کہے جا سکتے ہیں۔ انہیں ٹائپ ڈھالنے کی مشینیں حروف کو کمپوز کرنیکی مشینیں فوٹو کے ذریعہ سے چھاپنے کی مشینیں ایک وقت میں چار چار رنگ چھاپنے کی مشینیں اور وہ تمام آلات موجود ہیں جو یورپ میں چھپائی کے کام میں خوبصورتی اور آسانی پیدا کرنے کے لئے اب تک ایجاد ہو چکے ہیں۔

ان اخباروں کے دفتر اکثر اپنی مملوکہ چار چار اور پانچ پانچ منزل کی عالی شان عمارتوں میں قایم ہیں۔ اس سلسلہ میں الاہرام۔ الہلال اور اللطائف المصورہ کی عمارتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خصوصاً الاہرام کی چار منزلہ عمارت تو بے انتہا شاندار اور خوبصورت ہے۔ اسکے کونہ کونہ پر انگریزی اور عربی خط میں اس خوبصورتی کے ساتھ الاہرام لکھا ہوا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا پھول کھل رہے ہیں۔

زین العابدین سجاد

اطالوی

اظہار صداقت

صداقت کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب دینا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کیا کیا جائے۔

غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جب ہم صداقت کا تصور کرتے ہیں تو صداقت کا اظہار مکمل ہوتا رہا ہے۔ ہم اپنے سامنے اظہار صداقت کر دیتے ہیں۔ لیکن جہاں تک صداقت کے صوتی اظہار کا تعلق ہے۔ دوسرے کو اپنے خیالات سے واقف کرنے کا تعلق ہے تو وہ ایک اور بات ہے۔ ایسی بات جو خطرناک بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی۔

صداقت کوئی پارسل نہیں کہ کوئی شخص دوسرے کے حوالے کر دے

حقیقت یہ ہے کہ ہم کبھی "صداقت" دوسرے شخص تک نہیں پہنچاتے جب ہم کسی شخص سے مخاطب ہوتے ہیں تو ہم اُسے اپنے الفاظ کے ذریعے ایک ایسی صورت حالات کی طرح متوجہ کرتے ہیں جو ہمارے ذہن میں پہلے سے صداقت کی صورت میں جلوہ گر تھی۔ تاکہ ان کی ذہنی حالت "صداقت" کے متعلق ایک سی ہو جائے۔ اور اس امر کا واقع ہونا بہت دشوار ہے خیالات کے اظہار کا ذریعہ الفاظ ہیں۔ اور الفاظ کا مفہوم صحیح طور پر کبھی متعین نہیں ہوا۔

ہسپانوی

شاعر

دنیا کی عظیم ترین شخصیت شاعر ہے۔ اس سے فطرت کا کوئی راز پوشیدہ نہیں۔ وہ اپنی اُمیدوں۔ آرزوؤں۔ کامیابیوں۔ ناکامیوں، محبت عشق کے گیت گاتا ہے۔ اور فطرت اس کے ساتھ گاتی ہے۔ وہ اپنے تصورات و احساسات کو "محبت" کی بھٹی میں ڈال کر پاکیزہ و منزہ کر دیتا ہے جھوٹ اس بھٹی میں جل جاتا ہے۔

اس کے گیت آپ کے گیت ہیں۔ میرے گیت ہیں۔

جاپانی

مشرق و مغرب

خدا جانے مغرب کو مشرق کے انداز حیات سے کب واقفیت ہوگی ہم ایشیائی واقعات اور غلط بیانی کے اس جال کو دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں، جو ہماری فطرت کے متعلق بنا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ہم یا تو کنول کا پھول کھا کر جیتے ہیں یا چوہے اور مینڈک کھا کر۔

ہندوستانی روحانیت کو جہالت کا لقب دیا جاتا ہے۔ چینی وقار و متانت کو حماقت کہا جاتا ہے۔ جاپانی حب الوطنی "جبر" کے نام سے موسوم ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہم لوگ۔ اپنے اعصاب کی بڑھتی ہوئی بے حسی کے باعث جسمانی تکلیفوں کو زیادہ محسوس نہیں کرتے۔ گویا یا تو ہم فرشتے ہیں۔ یا حیوان۔ اسی طرح اگر مغرب کو معلوم ہو جائے کہ وہاں کے رہنے والوں کے متعلق کس کس طرح کی باتیں مشہور رہیں تو وہاں کے لوگ غرق حیرت ہو جائیں۔

ہماری تحریروں میں تحیر۔ اجنبی اور غیر معنی اشیا۔ کیخلاف احساس بغاوت اور نفرا جانے کیا کچھ پایا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مغرب کیمتعلق جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی تھیں وہ تمام رفع ہو رہی ہیں جیسیں مشرق کی حمایتیں ہوتی تھیں۔ کوئی نہیں جو مغرب کو مشرق کے رازسے مطلع کرے۔ کوئی نہیں

جرمنی

سفر

وینس پہونچکر میں اُتر گیا۔ مجھے ابتک وہ شہر لطیف یاد ہے۔ سبک اور لطیف کشتی کا سفر۔ اجنبی۔ جن کی زبان سمجھنے سے میں قاصر تھا۔ شام بہار نسیم کے جھونکے۔ خاموشی۔ عالمگیر وسیع۔ سکون بخش عمارتوں کے خوبصورت حصے نظر آتے تھے۔ اور غائب ہو جاتے تھے۔

کشتی میں بیٹھکر مجھے نیند آ گئی۔ گہری نیند اور میں نے خواب دیکھنا شروع کیا۔ لالہ زار اور پھر بہار کا اثر تھا۔ پھول۔ تیتریوں کی طرح محو پرواز تھے۔

غنچوں میں حسین دجمیل پریاں مسکرا رہی تھیں۔ ذرے سونے کے ٹکڑوں کی طرح چمک رہے تھے۔ آسمان سے نور کی بارش ہو رہی تھی۔ اور اس ہجوم رنگ دنور حسن میں ایک طرف کوئی شخص ستار بجا رہا تھا۔ ننھے ہوا کے دوش پر آسمان کی طرف پرواز کر رہے تھے۔ حسن فانی حسن مطلق کی طرف جا رہا تھا۔

میری آنکھ کھل گئی۔

پانی۔ خاموش پانی چپ چاپ بہہ رہا تھا۔ وہ ہی کشتی رواں تھی۔ آہ وینس!

فرانسیسی

رات

مینہ برس رہا تھا۔ رات آگئی۔ میں منزل مقصود کی طرف جا رہا ہوں میری منزل مقصود کونسی ہے؟ تنہا تنہا گلیوں میں سے گذر کر تنہا تنہا بازاروں میں سے ہوتے ہوئے میں ایک عظیم الشان عمارت کے سامنے آ پہنچا ہوں۔ جس کے کنگرے اہرمنی کی طرح اپنے ہیکل بڑھا بڑھا کر پردۂ شب کو چاک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سیاہ لبادے میں کبھی سرخ دھیمی روشنی نظر آ رہی ہے۔ میں اندر داخل ہوتا ہے۔ شاید کوئی مندر ہے۔ عبادت گاہ ہے۔ ایک غار سا نظر آیا۔ جو سرخ روشنی سے لبریز ہے۔ ایک مہیب وعظیم بت نظر آ رہا ہے۔ دیوار کے ساتھ ایک ڈھول رکھا ہے۔ سرخ بتیاں ستونوں کی طرح دھویں کے انبار میں مبہم طور پر نظر آتی ہیں۔

ایک طرف بتوں کی ایک قطار ہے۔ ان کے ہاتھوں میں زمرد، مرجان نیلم کی چھڑیاں ہیں۔ دوسری طرف دروازے کا رنگ خون کی طرح سرخ ہے۔ خون کا رنگ دبا ہوا اور سیاہی کا رنگ تمام فضا پر چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ آہ۔ ٹوکیو۔ شہر چراغاں۔ جنت نظیر۔ گلذول

پشتو

اخلاص

دیکھ اخلاص کا مرتبہ کتنا بلند ہے۔ زمانہ اخلاص کا غلام ہے۔ آسمان پر اڑنا مشکل ہے۔ لیکن اخلاص کے لئے زمین سے آسمان تک ایک قدم ہے۔ مخلص جو غیب کی خبر جانتا ہے۔ شاید یہ الہام اخلاص کی بدولت ہے رسم و رواج ہمیشہ نہیں رہتے۔ اخلاص ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ مذہب اخلاص کے بغیر بے مزہ ہے۔ مذہب اخلاص ہی کا نام ہے۔ رندا اُس کو پیر بنا لیں گے۔ جس ساقی کے ہاتھ میں بادۂ اخلاص کا جام ہو گا۔ عجب نہیں کہ وہ صیاد جس کا دام اخلاص ہے ہما کو گرفتار کرلے۔ (دیوان رحمان) وقار

اسلامی تصوّف

اردو ترجمہ کتاب طریق الہجرتین و باب السعادتین از امام ابن قیمؒ۔ یہ کتاب تصوف اسلام کے موضوع پر نہایت جامع اور مستند کتاب ہے۔ صوفیائے کرام کے نزدیک سعادت اور سلوک الی اللہ کا تمامتر انحصار رسول صلعم کی اور شریعت کے اتباع پر ہے۔ اس لئے واضح کیا گیا ہے کہ اعلیٰ درجہ کا صوفی اور اعلیٰ درجہ کا فقیر اور سالک الی اللہ وہی شخص ہے جو طریقت اور حقیقت میں اسی شاہراہ شریعت کے صراط مستقیم کو معرفت الٰہی حاصل کرنیکا نصب العین بنا ئے۔ نیز شریعت۔ طریقت۔ حقیقت اور معرفت الٰہی کے اصول و قواعد بیان کرکے بتلایا ہے کہ فقر و عبودیت اور غنا باللہ دونوں لازم و ملزوم۔ درجات عالیہ کے حصول کا زینہ اور سعادت کا حقیقی دروازہ ہیں۔ ان درجات عالیہ کے حاصل کرنے کے بعد انسان باوجود اپنے مجسمہ کامل احتیاج کے دنیا کا غنی ترین شخص پاتا ہے اور باوجود تمام دنیوی اموال و سلطنت کی شہنشاہیت کے اوصاف فقر سے متصف پاتا ہے۔ یہ حصہ اول کا خلاصہ ہے۔ حجم ۱۶۸ صفحہ قیمت عہ باقی چار حصے زیر طبع ہیں مستقل خریداری منظور کرلیں کتاب عایت سے پہنچے گی۔

ملنے کا پتہ (ادبی دنیا کا حوالہ دیجئے)

مینجر الہلال بک ایجنسی شیرانوالہ دروازہ لاہور

کابل میں چار بادشاہ

صرف ایک سال میں چار بادشاہ۔ امان اللہ خان۔ عنایت اللہ خان بچہ سقہ اور نادر خان کی مفصل سوانحعمریاں معہ شاہی تصاویر ملکہ ثریا کے حالات زندگی معہ تصویر بچہ سقہ کی محبوبہ بینظیر کی تصویر۔ بجد دلچسپ حالات ۔۔۔ قیمت دو روپے مجلد سوا دو روپے۔

بیوقوف کی ضرورت ہمیں ایک بیوقوف درکار ہے۔ تاکہ علم قیافہ کی کتاب تحریر قدرت کے مطالعہ کے بعد ہم اس کو عقلمند بنا دیں۔ انگریزی کی مستند کتابوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ بعض جگہ عربی سے بھی امداد لی گئی ہے۔ اس کتاب کو پڑھکر ہر شخص عقلمند بن سکتا ہے۔ بجد مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت ۱۲ مجلد عہ بزم عروس عہ دلہن کی ڈائری ۸ بہار عروس ۸ بچہ سقہ کا خاتمہ عہ انگلش ٹیچر عہ معہ سائیر الفارسی بول چال عہ اُستاد مسمریزم ۱۲

ملنے کا پتہ

مینجر اردو کتاب گھر نمبر ۲ م حلقہ نمبر ۴ الاہور

ہمارے کتب خانہ سے ہر قسم کی کتابیں انگریزی اُردو ہندی۔ عربی۔ گورمکھی بکفایت مل سکتی ہیں۔

ملنے کا پتہ شیخ زندہ حسن منیجر کتب خانہ پوسٹ بکس ۹۷ الاہور

تاپ ٹز

(ادبی دنیا کا حوالہ ضرور دیجئے) (ادبی دنیا کا حوالہ ضرور دیجئے)

بیس بائیس برس کی آزمودہ بے ضرر دوائی۔ تپدینوں کا بخار پانچ روز میں غائب سات روز کے بعد بھوک حد سے زیادہ لگے۔ کمزوری کافور ہو جائے اسکی تعریف اس سے اور کیا زیادہ ہو سکتی ہے کہ تپدق جیسے مہلک بخار کو بھی اسی قلیل میعاد میں اُتار دیتی ہے۔ تجربہ لازمی ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔ (عہ ۱) (ادبی دنیا کا حوالہ ضرور دیجئے)

انٹی پائیوریا یعنی اکسیر گوشت خورہ جب مسوڑے کمزور ہو جائیں پیپ اور خون نکلتا ہو بدبو دوست آشناؤں کو نزدیک نہ آنے دے۔ چالیس چالیس روپے انجکشنوں کی فیس ادا کرکے بھی نا اُمیدی ساتھ نہ چھوڑے تو اُسوقت انٹی پائیوریا استعمال کریں۔ چندروز میں صحت ہوگی۔ ہلتے دانت مضبوط ہو جائیں گے۔ اور مثل موتیوں کے نکھر آئیں گے قیمت صرف عہ

مینجر دواخانہ تاپ ٹز مزنگ لاہور

ہندوستان کے محکمہائے تعلیم میں منظور شدہ
اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ
ادبی دنیا
مشرق و مغرب کے جدید و قدیم ادبیات کا مرقع
ستمبر ۱۹۳۰ء
ڈائرکٹر:- آنریبل جسٹس سر عبدالقادر
ایڈیٹر:- تاجور نجیب آبادی
سالانہ چندہ چار روپے بارہ آنے محصول وی پی
Copies. 5000. Price As. 6-6.

رجسٹرڈ　　ایل نمبر ۲۲۸۲

فہرست مضامین

جلد ۳　　بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۰ء　　نمبر ۳

تصاویر:۔ سہ رنگی (۱) قلوپطرہ کی موت (یک رنگی) (۲) مطالعہ (۳) کارلائل (۴) رسکن (۵) گھر کا بے زبان رکن (۶) روز حشر (۷) رنگ دبو۔ (۸) شہسوار۔

(مولوی احمد عبد اللہ خاں صاحب ارشد نے مرکنٹائل پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ادبی دنیا کشمیر بلڈنگ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا)

حال وقال

ادبی دنیا کے لئے جدید کارکنوں کی ضرورت۔

"صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے"

ادبی دنیا کے اسٹاف کو ہر حیثیت سے مکمل اور جامع بنانے کے لئے حسب ذیل حضرات کی ضرورت ہے۔

(۱) چند ایسے مستقل مضمون نگاروں کی جو

ا۔ انگریزی۔ فرانسیسی۔ عربی۔ فارسی۔ سنسکرت اور ہندی وغیرہ سے بلند اور دلچسپ مضامین کا بامحاورہ ترجمہ، خلاصہ، اقتباس اور اخذ کرنے کی مہارت رکھتے ہوں۔

ب۔ سبق آموز اور بہترین غیر ملکی افسانوں کو تلاش و تفحص کے بعد ہندوستانی معاشرہ کے سانچے میں ڈھالنے پر قادر ہوں۔

ج۔ فلسفیانہ۔ سائنٹفک اور علمی موضوعات پر اصطلاحات کی اُلجھنوں سے الگ ہو کر ایسے عام فہم، مختصر اور دلچسپ مضامین لکھنے پر قدرت رکھتے ہوں جن سے عام اردو خواں پوری طرح فائدہ اٹھا سکیں۔

د۔ دل آزاری اور فحش نگاری اور ابتذال آرائی سے بچ کر بلند پایہ ظریفانہ مضامین لکھ سکیں۔

ہ۔ اردو علم ادب کے مختلف شعبوں پر تنقیص و تقریظ سے اجتناب کرتے ہوئے محققانہ انداز میں تنقیدی مضامین لکھنے کی استعداد رکھتے ہوں

و۔ ادبی دنیا کے "آئینہ عالم" کے لئے دنیا کی اہم تحریکات، معلومات اور سبق آموز واقعات پر رہبرانہ طرز میں دلچسپ شذرات لکھ سکتے ہوں۔

ز۔ ترقی یافتہ ملکوں کی تعلیمی ترقیات اور ہندوستان کے ہر صوبے کی تعلیمی رفتار کے متعلق تازہ ترین مکمل واقفیت کے مضامین لکھ سکیں۔

ح۔ مشاہیر عالم کی سرخی کے تحت میں دنیا کے قابل قدر مصنفوں۔ موجدوں۔ رہنماؤں۔ مدبروں۔ بادشاہوں۔ بہادروں۔ خودساز (سیلف میڈ) حضرات پر مفید اور سبق آموز مضامین لکھ سکتے ہوں۔

ط۔ دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے نظامہائے حکومت اور ان کی پارلیمنٹوں کی ساخت پر بیانیہ مضامین لکھنے کی مہارت رکھتے ہوں۔

ی۔ ہندوستان کے آثار قدیمہ، ہندوستانی اقوام کے تہذیب و تمدن اور ایشیائی تاریخ سے ذریعہ مشرقی روایات اور اہل مشرق کے کارناموں کو اخذ کرکے پُر معلومات مضامین لکھ سکیں۔

ک۔ ادبی دنیا کی "دنیائے ادب" کے لئے مشرقی و مغربی زبانوں سے مفید اور خوش افروز مضامین سے دلچسپ حصوں کا ترجمہ کرکے ادبی دنیا کے اس حصے کو جامع اور مکمل بنا سکیں۔

مذکورہ بالا مضامین کے مستقل عنوان قائم کئے جائیں گے۔ اور ان عنوانوں پر مستقل طور پر مضامین لکھنے والے انشاء پرداز ادبی دنیا کے عملۂ ادارت کے رکن تصور کئے جائیں گے۔

ان مضامین کا معاوضہ ادبی دنیا کے دوسرے مضامین کی عام شرح معاوضہ سے جدا ہوگا۔ ملک کے اہل قلم میں سے جو حضرات اپنی اپنی مخصوص دلچسپی کے مطابق کسی مضمون پر مستقل طور سے خامہ فرسائی منظور کریں گے ادبی دنیا میں اُن کے ناموں کا اعلان کر دیا جائیگا۔ اُن کی تصاویر شایع کی جائینگی۔ اُن کے مختار عنوان پر حیثیت رکن ادارہ اُن کا نام دیا جائیگا۔ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو اُن کے مطبوعہ مضامین کا معاوضہ اُنہیں روانہ کر دیا جایا کریگا۔

نوٹ ۱۔ اِس سلسلے میں وہی حضرات خط و کتابت کریں جو اپنے راستے کے راہرو بھی ہوں اور راہنما بھی۔ پختہ کار، پختہ مشق، وسیع المطالعہ ہونے کے ساتھ سب سے ضروری امر یہ ہے کہ محنت و دماغ سوزی سے مضمون تیار کرنے کے عادی ہوں۔ نو مشق۔ نو کار۔ یا اپنی تحریروں کو الہامی سمجھنے والے، محنت و مطالعہ سے بیزار حضرات زحمت نہ فرمائیں۔

درخواستوں کے ساتھ نمونے کے طور پر کوئی مضمون بھی آنا چاہئے جو متعدد عنوانوں پر قلم فرسائی کر سکیں۔ اُنہیں ہر عنوان پر ایک مضمون بطور نمونہ بھیجنا پڑے گا۔

(۲)۔ ایک تعلیم یافتہ خاتون کی قلمی اعانت درکار ہے جو مشرقی و مغربی ادبیات سے "نسوانی دنیا" کے عنوان پر ماہ بماہ دنیا بھر کے تازہ ترین نسوانی حالات، نسوانی تحریکات، اور نسوانی خبروں پر مشتمل ایک مضمون پُر معلومات پیرایۂ بیان میں لکھ سکتی ہوں۔ اس کے علاوہ مشرق و مغرب کی اُن قابل خواتین پر قلم فرسائی کر سکیں۔ جن کے کارنامے صفحات تاریخ پر ثبت ہیں۔ یہ خاتون نسوانی حصے کی ایڈیٹر ہونگی۔ اُن کے ہر مطبوعہ مضمون کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں وہ حضرات جو اپنی بیویوں کے نام سے مضمون لکھواتے ہیں یا جو معاوضہ لینے کی خاطر جعلی طور پر عورت بننے کی زحمت گوارا کریں

ہیں خط و کتابت نہ کریں۔ کیونکہ مستقل طور پر فریب دینا انہیں دشوار ہو جائیگا۔

(۳) ایک ایسے آرٹسٹ کی ضرورت ہے جو ہمارے پیش کردہ خیالات کو تصویری قالب میں ڈھالنے کی مہارت رکھتا ہو۔ مشاق اور ماہر فن آرٹسٹ اپنے تصویری نمونے بھیج کر معاملہ طے کریں۔

(۴) چند ایسے خوش نویس کاتبوں کی ضرورت ہے جن کا خط نہایت پاکیزہ نہایت خوشنما اور پختہ ہو۔ درخواستوں کے ساتھ جلی و خفی نستعلیق خط (عنوانات، بغلی سرخیاں، عام خط، نوٹ کا خط) کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ نمونے۔ اجرت کتابت، یا تنخواہ کی تعیین کے ساتھ کام کی مقدار کی تفصیل بھیجی جائے۔ کام انشاء اللہ تعالیٰ مستقل ہوگا۔ — ناجوہ

شکریہ

(۱) اگست کے رسالے میں "شکنتلا" کی تصویر کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور کے مشہور آرٹسٹ لالہ رام لعل کے موقلم کا نمونہ تھی۔ اپنے مکرم دوست مسٹر گوبند سروپ (میسرز دھرم چند کپور اینڈ سنز کی فرم کے شریک) کی کرم فرمائی کا ہم دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کہ انہوں نے اپنے قیمتی البم میں سے یہ پاکیزہ تصویر ادبی دنیا کو عنایت فرمائی۔ اس تصویر کی نظر فروز طباعت دیکھ کر پنجاب کے مشہور و معروف کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور کے طباعتی کارناموں کی تصدیق کرنی پڑتی ہے۔

(۲) پنجاب کا دوسرا قابلقدر پریس مرکنٹایل لاہور ہے۔ اس کے مالک لالہ دیوان چند کو لالہ گوپالداس جیسے باخبر مینیجر اور منشی اللہ بخش جیسے مشہور ماہر طباعت فورمین کی خدمات حاصل ہیں۔ ان حضرات کی توجہ محنت اور تجربہ کاری کے سبب مرکنٹایل پریس پنجاب کے چند بہترین پریسوں میں شمار ہونے لگا ہے۔ لالہ دیوان چند تیس سال سے یہی کام کر رہے ہیں۔ اُن کی دیرینہ تجربہ کاری اس پریس کے بہترین ہونے کی ضامن ہے۔ اُنہوں نے اپنے پریس میں چیدہ چیدہ کارکن جمع کر لئے ہیں۔

ہماری رائے میں جو رسالے بہترین طباعت اور نفاست کو ضروری سمجھتے ہیں وہ مرکنٹایل پریس کی خدمات حاصل کریں۔ — مینیجر

غزل

کھو گیا تیری چاہ میں مٹ گیا تیری راہ میں
پھر بھی ہوئی نہ قدر کچھ دل کی تری نگاہ میں

دل نے یہ کہکے بارہا ہوش ہمارے کھو دئیے
کہئے تو کیا نظر پڑا یار کی جلوہ گاہ میں

پرسش حال سے غرض؟ عذر ستم سے فائدہ؟
اب کوئی آرزو بھی ہو میرے دل تباہ میں

دیکھ فریب التفات پرسش مدعا نہ کر
اب دل ناامید کو ڈال نہ اشتباہ میں

صدمۂ شام بیکسی پوچھئے اس غریب سے
میری طرح سے تھک کے جو بیٹھ گیا ہو راہ میں

ضبط ملال و غم سے بھی کام چلا نہ اے شباب
خاک ہی اڑ کے رہ گئی آہ دل تباہ میں

شباب (بدایونی)

آئینۂ عالم

بیرونی مہیجات اور انسان

مسٹر آر ولسن انگریزی کے مشہور اخبار "انکشاف" میں رقمطراز ہیں :-

موت سے کچھ عرصہ پہلے سر جیمز میکنزی ایک ایسے نظریے کے متعلق تجربے کر رہے تھے جو تکمیل تک پہنچکر علم انسانی کا ایک حیرت انگیز باب کھول دیتا۔ انسانی زندگی کی نوعیت اور ماہیت بدو عالم سے فلسفیوں اور حکیموں کے ذوق جستجو کو دعوت عمل دیتی آئی ہے۔ سر جیمز بھی اپنی زندگی کے آخری دنوں میں حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں پر غور کر رہے تھے۔ مختصر الفاظ میں کہا جا سکتا کہ وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کہیں بیرونی مہیجات خصوصاً روشنی اور آواز انسانی زندگی کے لئے مہلک تو نہیں!

اس میں کوئی شک نہیں کہ بظاہر اس مسئلے پر غور کرنا بے فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر روشنی اور آواز کے مہیجات انسانی زندگی کے لئے خطرناک ہوتے تو اب تک انسان اسقدر ترقی کس طرح کرتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس اہم مسئلے کو اس طرح سرسری طور پر فیصلہ کر دینا مناسب نہیں ہے۔ اس بات کی شہادت موجود ہے کہ روشنی اور آواز کئی حالتوں میں خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ تیز و قوی ہیج اکثر موت کا باعث ہوتا ہے۔ خیرہ کن ہجوم نور۔ بلند آواز۔ سخت دھکے یا چوٹ کے اثرات کس کو معلوم نہیں۔ اس بات کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ بعض اوقات خفیف ہیج بھی مہلک ثابت ہوتا ہے۔ سرگوشیوں میں جو باتیں کیجاتی ہیں بعض اوقات موت کا باعث بن جاتی ہیں۔ بعض حالت میں روشنی کی ایک شعاع خنجر کی دھار کی طرح مہلک ہوتی ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی آدمی چھونے سے مر جاتا ہے۔ ان حالتوں میں مہیجات ائتلاف افکار کے قوانین کے ماتحت ایسے حالات و واقعات کو یاد دلاتے ہیں۔ جو موت کا باعث ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ سب لوگ جانتے ہیں کہ جب کوئی پولیس کا آدمی قتل کے ملزم کو چھوتا ہے تو اس کے قلب کی کیا کیفیت ہو جاتی ہے۔ پھر بعض جسمانی کیفیتیں ایسی بھی ہیں جن کے دوران میں خفیف ہیج بجلی کی طرح کام کرتا ہے۔ بعض اوقات بیمار اپنے کپڑوں کے بوجھ کو نہیں برداشت کر سکتا۔ ہوا اسے بری معلوم ہوتی ہے۔ خفیف سے شور سے اس کا دل دھڑکنے لگتا ہے۔

ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مہیجات خفیف ہوں یا شدید ان کی ہلاکت آفریں قوت میں فرق نہیں آتا۔ مسٹر میکنزی کا خیال ہے کہ بیمار کی قوت ردعمل بہت کمزور ہو جاتی ہے۔ اس لئے وہ مہیجات کے خلاف اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے جدوجہد نہیں کر سکتا۔ اس کے برخلاف اچھے بھلے انسان میں ردعمل کی قوت انتہائے عروج پہ ہوتی ہے اور وہ بیرونی مہیجات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

افسوس ہے مسٹر میکنزی کو فطرت نے ہم سے چھین لیا۔ اگر وہ زندہ رہتے تو شاید ان کی تحقیقات سے بنی نوع کو بہت فائدہ پہنچتا اور اس مسئلے کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ ہو جاتا کہ "ردِ عمل کیا شے ہے۔

موجودہ تعلیم کے نقائص

ڈاکٹر ایل۔ پی جیکس پرنسپل مانچسٹر کالج نے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:-

"میں سمجھتا ہوں کہ ہم تعلیم اور صنعت وحرفت کے مسایل میں ذہن اور جسم کو انسان کے دو مختلف حصے سمجھکر ایک بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ انسان دو اجزا سے مرکب ہے یعنی ذہن جو ایک اعلیٰ درجے کی چیز ہے اور جسم جو ایک ادنیٰ شے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں کو صنعت وحرفت کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ وہی آگے چل کر ہمارے لئے مفید ثابت ہونگے۔ جن لوگوں کی دماغی تربیت کی جا رہی ہے اور جسم سے بے پروائی برتی جا رہی ہے وہ کارزار زندگی میں نسبتاً کم مفید ثابت ہونگے۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ انسان کو انسان سمجھا جائے۔ اس سے مشین کا سا سلوک نہ کیا جائے جہاں اس کے دماغ کی تربیت کی جاتی ہے۔ وہاں اس کے جسم کی طرف بھی مناسب توجہ کیجائے۔"

قلوپطرہ کی موت

قلوپطرہ کی موت

مصر کی حسین ملکہ قلوپطرہ سانپ سے ڈسوا کر مرگئی۔ شیکسپیر اس کی زبان سے کہتا ہے :-
"آج میرے دل میں غیر فانی آرزوئیں ہیں"
"انطونی اور قلوپطرہ"

مُعطّر تھا وفا سے دامنِ گوہر نگار اُس کا منوّر تھا فروغِ دلبری سے رہ گذار اُس کا
وہ خوابِ موت میں ہے اور دلکو انتظار اُس کا وہ حُسنِ سحر کار اُس کا وہ عشقِ بیقرار اُس کا
وہ روئے شعلہ زار اسکا وہ جسمِ نوبہار اسکا

وہ مشرق کا ستارہ ماہ پارہ عالم آرا تھا جبیں سے جس کی نورِ شادمانی آشکارا تھا
وفا کے دیوتا نے دلبری کا رُوپ دھارا تھا مگر فطرت کو اس تصویر کا جلنا گوارا تھا
کہ سوزِ عشق کے شعلوں سے دل ہی داغدار اسکا

وہ روئے ارغواں جو بادۂ رنگیں کو شرمائے وہ حُسن گلفشاں جو نرم ہنٹوں کے پھول برسائے
قیامت ہے کہ جسکی زلف ناگن بن کے لہرائے وہ جوشِ بیخودی میں سانپ سے ڈسوا کے مرجائے
بنفشہ کی طرح سنولا گیا رنگین عذار اسکا

ابھی تک اسکی خوشبو سے ہوائیں عنبر افشاں ہیں ابھی تک اس کے جلوؤں سے فضائیں گل بداماں ہیں
ابھی تک اسکی آنکھیں بادہ پیما شعلہ ساماں ہیں ابھی تک ماہ و انجم دیکھ کر یہ رنگ حیراں ہیں
ابھی تک موت سے ہنگامہ پیرا ہے وقار اسکا

عابدہ

عمر خیام اور اسکا عہد

(گذشتہ سے پیوستہ)

خیام کی صناعی

چند ابتدائی مسایل حسن مطلق کے علاوہ دنیا میں صرف تین چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق انسان کو کچھ علم ہے۔ فطرت۔ روح اور آرٹ (صنعت) پہلی دو چیزیں بلا واسطہ حسن مطلق کی آفرینش ہیں۔ اور آرٹ نام ہے فطرت پر روح انسانی کے عمل کا۔ اس نقطہ نظر سے انسان کی تمام تخلیقات آرٹ کے دائرے میں شامل ہو جاتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب آرٹ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ تو عام طور پر ہماری مراد فاین آرٹ ہوتی ہے۔ اور اس پہلو سے صرف وہی تخلیقات آرٹ کے نام سے موسوم ہونے کا استحقاق رکھتی ہیں۔ جس میں "حسن" کا عنصر پایا جاتا ہے۔ "حسن" کی آفرینش صنعت کا مقصد ہے۔ اور حسن کے بغیر صنعت ایک جسم بے جان۔ یہ وہ شعلہ ہے جو ذہن انسانی کو روشن کرتا ہے۔ عقل کو جلا دیتا ہے۔ جذبات کی مردہ اور ٹھنڈی راکھ میں آتش آرزو پیدا کر دیتا ہے۔

یہ تو مسلم ہے کہ صنعت کا مقصد آفرینش حسن و تخلیق جمال ہے۔ لیکن یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے کہ "حسن" کے جلوے الفاظ میں محصور ہیں یا معانی میں۔ الفاظ اور معانی کا باہمی تعلق ہمیشہ ایک معرکۃ الآرا ادبی مسئلہ رہا ہے۔ یہ نظریہ کہ صنعتی خوبی یعنی، رنگ حسن و نقش جمال معانی کے عالم خیال سے بے نیاز ہے۔ بظاہر اپنی تردید آپ کر رہا ہے۔ تازہ ترین لسانی طبعی اور نفسیاتی تحقیقات سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ انداز یعنی الفاظ کی ترتیب اور ان کا باہمی تناسب و توافق۔ معانی کی نوعیت سے مشروط ہوتا ہے۔ جس قسم کے معانی ہوتے ہیں اسی قسم کے الفاظ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہوا کہ رنگ حسن انداز میں اسوقت تک پیدا نہیں ہو سکتا۔ جب تک معانی میں بھی اس کے عناصر نہ ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک ہی عالمگیر حقیقت مختلف طریقوں سے ادا کی جا سکتی ہے کبھی خالص فلسفیانہ تشنگی و وقار کے ساتھ اور کبھی صنعتی حسن و جمال کے پہلو لئے ہوئے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انداز بیان و رنگ تحریر نے اختلاف مراتب پیدا کر دیا ہے۔ ایک تحریر ادبی شان لئے ہوئے ہے اور دوسری خشک۔ یہاں صرف انداز بیان ہی کا فرق نہیں۔ بلکہ تصور و تخیل میں بھی فرق پیدا ہو گیا ہے جس پہلو سے فلسفی نے ایک مسئلے کو دیکھا ہے۔ ادیب نے اس طرح دیکھا ہی نہیں۔

اس مشہور شعر میں

آدمی زادہ طرفہ معجون است
از فرشتہ سرشتہ وز حیواں

اور اقبال کے اس شعر میں

بلند تر ز سپہر است منزل من و تو
براہ قافلہ خورشید میل فرسنگ است

صرف انداز بیان ہی کا فرق نہیں ہے بلکہ انداز تصور و تخیل میں بھی ایک نمایاں اختلاف ہے۔

دوسری طرف محض معانی کی دل آویزی سے آفرینش جمال نہیں ہو سکتی۔ معانی کو لباس خوشنما پہنانا ضروری ہے۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ الفاظ کا انتخاب معانی سے مشروط ہے۔ اس اعتبار سے جو لوگ معانی میں جمال کو اسی طرح پنہاں سمجھتے ہیں جس طرح پتھر میں شرار وہ بھی تسلیم کریں گے کہ صنعتی حسن الفاظ کے لئے بھی لازمی ہے۔ کیونکہ جس حالت میں الفاظ کا استعمال معانی کی نوعیت سے ہوگا۔ الفاظ میں دل آویزی کا رنگ بھی ضرور پیدا ہوگا۔

مختصر طور سے کہا جا سکتا ہے کہ مناسب خیال کو مناسب الفاظ کے ذریعے ادا کرنے کا نام صنعت ہے۔ معانی اور الفاظ میں روح اور جسم کا رشتہ قائم ہے

عروس جمیل ولباس حریر

الغرض الفاظ اور معانی کا باہمی تعلق ادب کے دلچسپ اور لطیف ترین مسائل میں سے ہے۔ صناع کی تخلیقی اور اکتشافی قوت بعض اوقات نقاد کے فہم و ادراک سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے۔ کہ الفاظ اور معانی کے باہمی تعلق و تناسب کا بیان کرتے ہوئے نقاد عاجز آجاتا ہے۔ عجز فطری ہے۔ اختراع و ابداع کی الہامی قوتیں تنقید سے بلند ہیں۔ شاعر کو حقیقت اپنے پہلو میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اور نقاد اس کو چراغ عقل لے کر ڈھونڈتا ہے۔ جہاں "حقیقت" یعنی حسن کا آفتاب جلوہ گستر ہو وہاں آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ شمع کی روشنی کیا کام دے سکتی ہے۔ کبھی کبھی اس تاریک راہ میں بجلی سی چمک جاتی ہے اور نقاد حقیقت کے روئے دل آویز کو ایک لمحے کے لئے دیکھ لیتا ہے۔ اس کے بعد پھر اسی طرح ظلمات کا سا اندھیرا چھا جاتا ہے۔

الفاظ و معانی کے باہمی تعلق کی تحلیل میں فروگذاشت کی ایک دلچسپ مثال۔

علامہ شبلی اپنی معرکتہ الآرا کتاب شعر العجم کی چوتھی جلد میں رقمطراز ہیں:-

معنی کے لحاظ سے الفاظ کا اثر یہاں تک الفاظ کی نسبت جو بحث تھی وہ زیادہ تر لفظ کی حیثیت یعنی آواز اور صورت اور لہجے کے لحاظ سے تھی، لیکن شاعری کا اصلی مدار، الفاظ کی معنوی حالت پر ہے یعنی معنی کے لحاظ سے الفاظ کا کیا اثر ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اُن میں کیونکر اختلاف مراتب ہوتا ہے۔

ہر زبان میں مترادف الفاظ ہوتے ہیں جو ایک ہی معنی پر دلالت کرتے ہیں لیکن جب غور سے دیکھا جائے تو ان الفاظ میں بھی باہم فرق ہوتا ہے یعنی ہر لفظ کے مفہوم اور معنی میں کوئی ایسی خصوصیت ہوتی ہے جو دوسرے میں نہیں پائی جاتی، مثلاً خدا کو فارسی میں خدا، پروردگار، داور، ایزد، فریدگار، سب کہتے ہیں۔ بظاہر ان سب الفاظ کے ایک ہی معنی ہیں لیکن درحقیقت ہر لفظ میں ایک خاص بات اور خاص اثر ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس لئے شاعر کی نکتہ دانی یہ ہے کہ جس مضمون کے ادا کرنے کے لئے خاص جو لفظ موزوں اور موثر ہے وہی استعمال کیا جائے ورنہ شعر میں وہ اثر پیدا نہ ہوگا۔ یہ ایک دقیق نکتہ ہے اور بغیر اس کے کہ ایک خاص مثال میں ایک ایک لفظ پر بحث کر کے نہ سمجھایا جائے سمجھ میں نہیں آسکتا۔

فیضی کا شعر ہے۔

بانگِ قلم ودیں شب تار بس معنیِ خفتہ کرد بیدار

"شعر کا اصل مضمون یہ ہے کہ شاعری میں میں نے بہت سے نئے مضمون پیدا کئے" اس کو استعارہ کے پیرایہ میں یوں ادا کیا ہے کہ "میرے قلم کی آواز نے بہت سے سوتے ہوئے مضمونوں کو جگا دیا۔ اب اس کے ایک ایک لفظ پر خیال کرو۔

بانگ خاص اس آواز کو کہتے ہیں جس میں بلندی اور فخامت ہو جو جگانے کے لئے موزوں ہے، بانگ اور آواز اور صیر ہم معنی ہیں۔ اس لئے بانگِ قلم کے بجائے آوازِ قلم اور صریرِ قلم بھی کہہ سکتے ہیں لیکن اس موقع کے لئے صرف بانگ۔ موزوں ہے۔

قلم کو فارسی میں خامہ اور کلک بھی کہتے ہیں۔ لیکن قلم کے لفظ میں جو فخامت اور رعب ہے اور لفظوں میں نہیں، متکلم کے میم نے ملکر اس فخامت کو اور بڑھا دیا ہے۔ بانگ اور قلم کی ترکیب نے لفظ کو اور زیادہ پُر وزن کر دیا ہے۔

تار کو تیرہ اور تاریک بھی کہتے ہیں۔ لیکن اس مصرع میں حسنِ صورت کے لحاظ سے تار ہی موزوں ہے۔

بس کے ہم معنی بہت سے الفاظ ہیں مثلاً بسیار، کثیر، خیلے، وغیرہ لیکن بس کو لفظ میں کثرت کی جو توسیع ہے اور لفظوں میں نہیں ہے۔

ان تمام باتوں پر غور کرو تب یہ نکتہ حل ہوگا کہ اس شعر میں جو اثر ہے اس کا سبب یہ ہے کہ مضمون کی ایک ایک خصوصیت ظاہر کرنے کے لئے جو الفاظ درکار تھے اور جن کے بغیر وہ خصوصیت ادا نہیں ہو سکتی تھی سب شاعر نے جمع کر دئے اور ان باتوں کے ساتھ اصل مضمون میں اصلیت اور طرز ادا میں جدت اور ندرت پیدا کی۔

بڑے بڑے خیالات اور جذبات لفظ کے تابع ہوتے ہیں۔ ایک لفظ ایک بہت بڑے خیال یا بہت بڑے جذبہ کو مجسم کر کے دکھا سکتا ہے۔ ایک بہت بڑا مصور ایک مرقع کے ذریعہ سے غیظ و غضب، جوش اور قہر، عظمت اور شان کا جو منظر دکھا سکتا ہے۔ شاعر صرف ایک لفظ سے وہی اثر پیدا کر سکتا ہے۔

علامہ موصوف نے "بس معنی خفتہ کردہ بیدار" کا مطلب یہ سمجھا کہ میں نے بہت سے نئے مضمون پیدا کئے۔ اور درست سمجھا۔ لیکن ان کی نظر

اس طرف نہیں گئی کہ فیضی نے نئے مضامین پیدا کرنے کو "معنیٔ خفتہ" کو بیدار کرنا کیوں کہا۔
حقیقت یہ ہے کہ اس شعر میں یہی پہلو دلچسپ تھا جو نظر انداز کر دیا گیا۔ ایک سنگتراش کا قول ہے کہ بت بنایا نہیں جاتا بلکہ وہ اپنی پوری شان جمال کے ساتھ پتھر میں پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔ اس کی فطرت تقاضائے اظہار کرتی ہے وہ اپنے حسن سے نگاہوں کو تسخیر کرنے کے لئے بیتاب ہوتا ہے۔ سنگتراش صرف یہ کرتا ہے کہ پتھر کے نقاب عارضی کو دور کر دیتا ہے۔ نگار حسن کا روئے دل افروز اپنی پوری شان میں جلوہ گر ہو جاتا ہے اور اہلِ نظر پکار اُٹھتے ہیں۔

چہرہ یار سے نقاب اُٹھا
دل سے اک شور اضطراب اُٹھا

اسی طرح آرٹ کی مملکت میں ہزاروں دل افروز و جاں پرور معانی منتظر نقاب کشائی رہتے ہیں۔ "حسن" کائنات کے ذرے ذرے میں پنہاں ہے۔ شاعر صرف یہ کرتا ہے کہ اس احساس حسن کو جو اس کے دل کو ایک طلسم رنگ و بو بنائے ہوئے ہے۔ الفاظ کا جامہ پہنا دے۔ اس اعتبار سے فیضی نے نئے معانی کو "معنی خفتہ" کہا۔ اس سے بہتر تشبیہ نہ ہو سکتی تھی۔ جس طرح سویا ہوا شخص بظاہر مردہ معلوم ہوتا ہے اور اس کا وجود عدم وجود برابر ہوتا ہے۔ لیکن ایک خفیف سی جنبش ایک ہلکا سا شور اس کی رگ حیات میں لرزش پیدا کر دینے کے لئے کافی ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح معانی بکر و نو ادر فکر ہر وقت بیتاب اظہار رہتے ہیں۔ اور صناع کی انکشافی قوت ایک جنبش قلم سے انہیں منظر عام پر لے آتی ہے۔
اب پھر پڑھئے۔

بانگ قلمم دریں شب تار
بس معنی خفتہ کردہ بیدار

ایک اور مثال

اقبال کا شعر ہے۔

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

مرکزی خیال یہ ہے کہ عصر حاضر میں مسلمان امتیازات رنگ و خون و نسب میں مبتلا ہو کر اس اخوت کو بھلا بیٹھے ہیں۔ جو مذہب اسلام کا سنگ بنیاد ہے۔ حالانکہ ان امتیازات کی زنجیر سے آزاد ہو جانا ذرا بھی دشوار نہیں۔
اب اس خیال کے مختلف پہلو دیکھئے۔

"مرغ حرم" سے مسلمان مراد لیکر اقبال اسلام کی اس عالمگیر وسعت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ جو شروع سے اس مذہب کی خصوصیت رہی ہے۔ جس طرح "مرغ" اپنے پر پرواز سے فضاؤں کو طے کرتا ہوا دور دور تک جا پہنچتا ہے۔ اسی طرح مسلم اپنی زندگی کے لئے کسی خاص زمین کسی خاص فضا کسی خاص حالت کا پابند نہیں ہے۔ یہ روح آزاد "زنجیری صبح و شام وطن" نہیں ہے۔ اس کا وطن روئے زمین ہے۔ "مرغ حرم" کے بال و پر غبار آلود ہونے سے مراد یہی ہے کہ اس کی طاقت پرواز حقیقی طور پر غبار رنگ و نسب سے ضائع نہیں ہوتی۔ ایک ذرا سی جنبش سے یہ عارضی عیب "غبار آلودگی" بھی ضائع ہو جائیگا۔ یعنی ان امتیازات کو فنا کرنے کے لئے ایک حرکت استقلال کافی ہے۔ اور بس۔ اس کے بعد مسلم اپنی ابتدائی سادگی میں نمودار ہوگا۔ اور یوں فطرت کے اس پیغام کی تکمیل ہوگی جو ان الفاظ کے ذریعے ادا کیا گیا تھا۔

"الیوم اکملت لکم دینکم"
(آج کے دن میں نے تمہارے دین کی تکمیل کر دی۔)

ایک اور مثال

غالب کا شعر ہے۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دایم نقاب میں

مرکزی خیال یہ ہے کہ کائنات حسن مطلق کے جمال بے مثال کا ایک پرتو ہے۔ جس طرح صناع کی ذہنیت اور اس کے عقلی کمالات اس کی صنعتی تخلیقات سے نمایاں ہوتے ہیں۔ اسی طرح کائنات کے مظاہر و مناظر بھی خدا کے وجود کی دلیل ہیں۔ اور ان کے حسن و جمال کے شاہد۔ دنیا ہر لحظہ ترقی کر رہی ہے۔ بڑھ رہی ہے۔ اور اس آئینہ میں نگار حقیقت اپنا جلوہ دیکھ رہا ہے۔ آخر ایک دن ایسا آئیگا جب انسان اپنی تکمیل کر لیگا۔ اور الوہیت کے رازوں سے واقف ہو جائیگا۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے

فروغ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکب تقدیر ما گردوں شود روزے

اب دیکھئے یہ خیال کس طرح ادا کیا گیا ہے۔
دنیا کے ارتقائی ترقی اور انسان کے ذہنی جلا کو خدا کی "آرائش جمال" کہا ہے۔ یعنی حسن مطلق انسان کی تکمیل کر کے اپنے ذوق حسین کی تکمیل کر رہا ہے۔ مناظر کائنات کو آئینہ کہکر غالب نے وہ تمام تعلقات آئینہ کر دئے ہیں جو خدا اور انسان کے درمیان پائے جاتے

ہیں۔ انسان صفات خداوندی کا مظہر ہے۔ اور اس اعتبار سے "آئینہ جمال دوست کہلانے" کا مستحق ہے "ہنوز" کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ابھی انسانیت کی تکمیل نہیں ہوئی۔ "نقاب" یہی دنیا ہے یعنی مایا۔ جو پردے کی طرح "جان عالم" کے چہرے کو چھپائے رکھتی ہے۔ ورنہ اس آفتاب حسن کی ضیا باری سے آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ پھر اس "نقاب" میں یہی بات نہیں کہ وہ "رخسار جان عالم" کا پردہ ہے۔ بلکہ یہ بھی اشارہ ہے کہ جس طرح نقاب کو حسن کی آرائش کی اطلاع نہیں ہوتی اسی طرح دنیا کو بھی اپنی تکمیل کا پورا علم نہیں ہوتا۔ جو لوگ طوفان میں گھرے ہوئے ہیں وہ موجوں کی بلاخیزی اور قہر انگیزی کا صحیح اندازہ نہیں قائم کر سکتے۔ "سبکساران ساحل" ہی طوفان کی شدت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ انسان عام طور پر اپنے ذہنی ارتقا سے بے علم رہتا ہے۔ لیکن شاعر کی انکشافی قوت نے اس نکتے کو پا لیا ہے۔

موسیقی اور الفاظ معانی

اس سے پہلے کہا جا چکا ہے کہ صنعت کا مقصد اعلیٰ تخلیق حسن ہے۔ اب ظاہر ہے کہ الفاظ کا حسن صرف حسن صوت ہو سکتا ہے۔ ادبی "انداز" "حسن صوت" کا دوسرا نام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ الفاظ "فردوس گوش" ہو سکتے ہیں۔ جنت نگاہ نہیں۔ اس اعتبار سے "ترنم" اور "تناسب مترنم" انداز کی صفات جمالی کہلاتی ہیں۔

ترنم سے مراد شیریں خوشگوار لطیف اور سبک الفاظ کا استعمال ہے۔ قاآنی ترنم کے اعتبار سے لاجواب ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اس راز کو سمجھ گیا ہے۔ کہ شاعری نے موسیقی سے جو کچھ لیا ہے وہ حسن کی آفرینش کے لئے ضروری ہے۔ میں نے کئی بار تجربہ کیا ہے جو لوگ فارسی زبان سے قطعاً ناواقف ہیں۔ ان کو قاآنی کے اشعار سنائے ہیں۔ اور انہوں نے بے اختیار کہا ہے۔

"کسقدر مترنم اشعار ہیں"۔

مندرجہ ذیل اشعار کا ترنم دیکھئے۔

بگاہ میکبوئے من زمن خطا چہ دیدہٗ • کہ ہم چو آہوان چین ازاں خطا رمیدہٗ
بساز نقل آشنی بس است گیر و دار ہا

نہ ہمدمے کہ یکدمش زحال خود خبر کنم • نہ محرمے کہ پیش او حدیث عشق سر کنم
نہ دلبرے کہ بر رخش بہ یاد او نظر کنم • نہ بادۂ محبتے کزو دماغ تر کنم
نہ طبع را فراغتے کہ تن دہم بکار ہا

تناسب مترنم ترنم سے زیادہ لطیف شے ہے۔ یہ شے پیدا کرنے کے لئے پہلے صناع الفاظ و معانی میں خوشنما اور مناسب تعلق پیدا کرتا ہے۔ اس کے بعد لفظ کو لفظ سے فقرے کو فقرے سے اس طرح ترکیب دیتا ہے۔ کہ الفاظ کا اتار چڑھاؤ۔ اجزا کا زیر و بم اور تراکیب کی برجستگی سے ایک جادو کا سا اثر پیدا ہو جاتا ہے۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات عیاں ہو جائیگی کہ "الفاظ اور معانی" کا تعلق ادب کے ایسے مسایل میں سے ہے کہ قدم قدم پر اس کا ذکر آئیگا۔ یہاں کہا جا چکا ہے کہ "موسیقی" کے بغیر "ادب" "آفرینش حسن" کا مقصد پورا نہیں کر سکتا کیونکہ ادب صرف حسن صوت کے ذریعے تخیل کو متاثر کر سکتا ہے۔ یہ بھی کہا جا چکا ہے کہ موسیقی کے عناصر پیدا کرنے کے لئے پہلے الفاظ اور معانی کا مناسب ربط پیدا کرنا ضروری ہے تو ثابت ہوا کہ جبتک صناع الفاظ اور معانی کے تعلق باہمی کے دشوار گذار راستے کو طے نہ کریگا۔ وہ "آفرینش حسن" کی منزل کی طرف قدم نہ بڑھائیگا۔

موسیقی اور وزن

مندرجہ بالا سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ کہ الفاظ کی انتہائی صنعت گری "حسن صوت" ہے اور بس۔ شعر میں حسن صوت کی بہترین مثالیں نظر آتی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ شعر کے لئے وزن ضروری ہے۔ اور وزن تناسب و توافق کا پیمانہ ہے۔ موسیقی کے اصولوں کی طرح وزن اشعار میں الفاظ کے اتار چڑھاؤ سے ایک اثر حسن پیدا کرتا ہے۔

وزن اور موسیقی کا تعلق ایک نہایت دلچسپ بحث ہے میں نے اس فن پر کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ لیکن موسیقی سے واقفیت رکھنے کے باعث وزن کے ارکان اور موسیقی کے اصولوں میں جو مشابہت مجھے نظر آتی ہے اُسے پیش کرتا ہوں۔

سریلی آواز ستار بانسری ہارمونیم یا کسی اور ساز کے تعدد لرزش سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک سیکنڈ کے وقفے میں جس تعداد میں لرزش پیدا ہوتی ہے۔ اسے تعدد لرزش کہا جاتا ہے۔ اب اگر یہ لرزش ایک ہی تعداد پر قائم رہی تو سریلا پن کہلاتی ہے ورنہ شور ہو کر رہ جاتی ہے۔

ہر لرزش سُر کہلاتی ہے۔ اگر تعداد لرزش زیادہ ہے تو سُر اونچی ہوگی کم ہے تو نیچی۔ خاص وقتوں کے اندازہ پر گانے کو سے کہتے ہیں لے کو ناپنے کے لئے ½ سیکنڈ کا پیمانہ مان لیا گیا ہے۔ اس وقفے کو ماترا کہتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ جہاں آٹھ ماترے ہوتے ہیں وہاں گانے والا صرف چار ماترے جتنا وقت لیتا ہے۔ ایسی صورت میں لے کو دگن یا دوت کہتے ہیں۔ تمام ماتروں میں لے کے بھر جانے کو

M. [illegible] Rahmani.

چکر کہتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لے معمولی ماتروں میں پھرتی ہے اور گانے والا مقررہ الفاظ کو دوبارہ یا تین بار کہکر بالکل صحیح سم لیتا ہے۔ اسے دگن اور تگن کہتے ہیں۔

چکر میں کہیں کہیں ایسا وقفہ آتا ہے جہاں لے ذرا تھمتی ہے۔ اس ٹھہراؤ کو سم کہا جاتا ہے۔ ماتروں کی تعداد کو کئی ٹکڑوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ یہ ٹکڑے چکر کے رنگ کہلاتے ہیں۔

انگ کا وقفہ قائم رکھنے کو تال کہتے ہیں۔ جتنے انگ ہونگے اتنی تالیں بھی ہونگی۔ اس اعتبار سے چکر کے شروع اور ختم ہونے کے امتیاز کے لئے کسی تال کی آواز باقی تالوں کی آواز سے مختلف ہوتی ہے۔ اس تال کو خالی کہتے ہیں۔

وزن میں بحر کے ارکان ضرب ہونگیں۔ مثلاً

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

ایک رکن اور دوسرے رکن کے درمیان جو وقفہ ہے اسے ماترا کہا جائیگا۔

مفاعیلن کے آٹھ بار کہنے سے لے اپنے کل ماتروں میں دوڑ جائیگی۔ ایک شعر پورا ہو جائیگا۔

اس اعتبار سے کئی وزن اپنی موسیقیت کے اعتبار سے دوسرے وزنوں پر فوقیت رکھیں گے۔ مندرجہ بالا وزن میں صرف ایک سُر اپنے اپ کو دہرا رہی ہے۔ لیکن مندرجہ بالا وزنوں میں سروں کا اختلاف دیکھو۔

فاعلن مفاعیلن۔ فاعلن مفاعیلن

کہتے ہو نہ دینگے دل ہم نے گر پڑا پایا

کارگاہ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے

مستفعلن۔ مفعولن۔ مستفعلن۔ مفعولن

کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدارا

اس کی وجہ یہ ہے کہ جس راگوں میں سر میں اپنے آپ کو کم دہراتی ہیں وہاں مختلف سروں کے امتزاج سے تناسب و توافق موسیقی کا ایک گہرا اثر مترتب ہوتا ہے۔ اسی طرح جن اوزان میں ارکان کے حروف ایک دوسرے سے مختلف ہیں وہاں کثرت کو وحدت اور تضاد کو تناسب کا انگ دیکر موسیقی کا اثر پیدا کیا گیا ہے۔

اس کی ایک اور وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ راگ میں نوش نمائی اور ترصیع پیدا کرنے کیلئے معمولی سروں میں ادا کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ایک دوسری سُر کو چھو بھی لیتے ہیں۔ جو سر محض چھویا جاتا ہے۔ اسے (grace) "لطافت" کہتے ہیں۔ وہی بات کہ کثرت سے وحدت تناسب کو پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اسی طرح اوزان میں ارکان کے حروف کے اختلاف سے وزن کو مرصع اور خوش آواز کیا جاتا ہے۔ مثلاً موسیقی کے اعتبار سے

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن

میں یہ فرق ہے کہ دوسرے وزن میں ایک رکن فاعلن سے بنا گیا ہے اور اس کی لرزش کی خاطر اس میں م۔ ی۔ (grace) لطافت کے ہلکے سروں کی طرح چھولی گئی ہیں۔ اب فاعلن اور مفاعیلن میں جو اختلاف ہوگیا ہے۔ اسکو دوسری بار دہرا کر تناسب پیدا کر دیا گیا ہے۔

یہ تو ہوا اوزان کے اعتبار سے موسیقی کا اثر۔ الفاظ میں بھی اسی طرح موسیقی کا اصول کارفرما ہے۔ یعنی صناع شاعر الفاظ کو اسطرح باہمدگر ترتیب دیتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ایسی برجستگی اور شستگی سے ملتے ہیں کہ دگن کا اثر پیدا ہو جاتا ہے۔

اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار پر غور کیجئے

گلہ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے

کبھی بتکدے میں کروں بیاں تو کہے صنم بھی ہری ہری

دم زندگی۔ رم زندگی۔ غم زندگی۔ سم زندگی

غم رم نہ کر سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شان قلندری

دوسرے شعر کے الفاظ میں زندگی کی تکرار۔ غم رم اور سم غم کی ترکیب اور الفاظ کا باہمی امتزاج حد درجہ ترنم آفریں ہے۔ پہلا شعر دھیمی سروں میں شروع ہوتا ہے۔ لیکن دوسرا بڑھ جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں پہلے شعر میں تال کے اعتبار سے "اہل حرم سے ہے" خالی اور "ہری ہری" سم گنا جائیگا۔

عابد

"تنقید نگار"

یاد آیا میکہ میں مرزا سجتا ور بیگ چغتائی تھا" — قارئین کرام پر بھی واضح ہو جائیگا کہ میں اب یہ نہیں "ہوں"۔ نام تو باقی ہے اور وائے بدنصیبی میں ابھی تک روزنامہ نقاد کا تنقید نگار بھی ہوں۔ یہ خبر نہیں کہ کچھ عرصہ بعد میری ہستی میں اور کیا تغیر واقع ہوگا۔ پریشان ہوں۔ سراسیمہ ہوں۔ پراگندہ خاطر ہوں اور اپنا فسانہ زیر تحریر ہے۔ صورت حال حد [illegible]ک ہے لیکن کوشاں ہوں کہ باوجود مشکلات "آپ بیتی" ذرا و[illegible] کے ساتھ بیان کروں۔ ذرا صبر سے کام لیجئے۔ جب انسان خود اپنی ہی حقیقت فراموش کردے تو اظہار مدعا جوئے شیر کے لانے سے کم نہیں۔ ذرا غور کر لوں تو شاید اپنی داستان بیان کرسکوں۔ اور خیالات واضح کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ اچھا چند سے اجتماع حواس کی مہلت دیجئے ...... میں آخر ہوں کیا؟ کاش کے مجھے اس کا علم ہوتا۔ حیف! مردہ ہستی! مرزا ..... آ۔ ور ..... بیگ ... چغتا ... ئی!!!

حاشا، گزشتہ ایام میں یہ حرکت مجھے قطعی پسند نہ ہوتی۔ لیکن میرا مذاق سلیم تو جب سے میں تنقید نگار ہوا، بالکل بدل گیا، زمانے کی طرح پلٹ گیا۔ ہر شے اس وقت متغیر نظر آتی ہے یہ میری "آپ بیتی" ہے لیکن حقیقت میں خودستائی پر مبنی نہیں ہے۔ کیونکہ اب میں 'وہ' نہیں ہوں جو تھا۔ میری اصلیت بدل گئی ہے، میں اپنی حقیقت کو فراموش کر چکا ہوں۔

ایک زمانہ تھا کہ میں خوبصورت آدمی تھا۔ کسیقدر شرمیلا، خوشنما مونچھیں۔ دلکش چہرہ۔ خاکی لباس مجھے بہت مرغوب تھا۔ قدرے لکنت کرتا تھا جو کہ زمانۂ تحصیل علم میں ایک ہم مکتب کی صحبت کا اثر تھا۔ حسین ناہید مجھے میری فطری سادگی اور تصنع و نمائش سے احتراز کی وجہ سے پسند کرتی تھی۔ ہماری محبت یکسانئ فطرت و خیالات پر قائم تھی۔ ہم مستقبل کے لئے نہایت روح افزا اور سرور خیز امیدیں قائم کیا کرتے تھے۔ (فاحسرتا! کہ حباب کی طرح وہ ٹوٹ گئیں۔) اس کی ماں رحلت کر چکی تھی۔ اس کا باپ مجھ سے اس وجہ سے خوش تھا۔ کہ میں اس کی گفتگو میں دلچسپی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ میرے والد سربرآوردہ تھے۔ لاریب کہ میری فضائے مستقبل نہایت روشن اور خوشگوار تھی ...... ان ایام میں، میں تھیئٹر نہیں جاتا تھا۔ میری چچی راشدہ مرحومہ نے وفات سے قبل مجھے وہاں جانے سے منع کیا تھا ...... اس کے بعد میری منشار کے خلاف، مسٹر ناظم ایڈیٹر نقاد نے مجھے "ڈرامہ" کا نقاد بننے پر مجبور کیا۔ ناظم ایک بذلہ سنج، خوش مزاجی آدمی تھے، بڑا سر اور سیاہ گھونگروالے بال۔ ایک مرتبہ جب میں کلیم سے ملنے جا رہا تھا تو راہ میں انہوں نے مجھے روک لیا اور غیر معمولی خندہ پیشانی سے ملے۔

"آخاہ، چغتائی صاحب" انہوں نے فرمایا "بس آپ بہت مندول ہیں۔"

انہوں نے میرا کالر پکڑ لیا اور بہت سرعت سے دفتر لیگئے۔ ردی کی ٹوکری کے اوپر کی آرام کرسی پہ مجھے بٹھاتے ہوئے کہنے لگے۔

"براہ کرم تشریف رکھئے۔" زاں بعد وہ نہایت پھرتی سے کمرہ کے دوسری طرف گئے۔ اور چند سرخ اور زرد رنگ ٹکٹ مجھے لاکر دیدیئے۔

وہ کہنے لگے "الیگزینڈرا کمپنی" پنجشنبہ اور جمعہ کو "وطن" شنبہ کو "آنکھ کی خطا" میرے خیال میں "لیکن" — میں نے کہا۔

ڈیسک پر سے چند پروف اٹھا کر دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"میں بہت خوش ہوں کہ آپ کو فرصت ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"ہوں؟" وہ میرے جواب سے بہت متحیر ہوئے۔

میں نے دریافت کیا "کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں ان 'کھیلوں' پر تنقید کروں؟"

"جی ہاں۔ تو کیا آپ دعوت سمجھے تھے؟"

"لیکن میں تنقید نہیں کر سکتا۔"

"جی؟"

"بات یہ ہے کہ میں آجتک تھیئٹر نہیں گیا ہوں۔"

"معصوم ہستی!"

"لیکن آپ جانتے ہیں کہ میں اس فن سے نابلد ہوں۔"

"درست فرمایا۔ یہ نئی شاہراہ ہے۔ آپ اس کے عادی نہیں ہیں۔

لیکن ہمارا روزنامچہ ایک زندہ پرچہ ہے - یہاں آپ کو اپنی ذاتی رائے سے آگاہ کرنے کی اجازت ہے - بجا طرفداری کی ضرورت نہیں ہے - میں اس معاملہ میں آپ کی ذہانت اور قابلیت پر کافی بھروسہ کرتا ہوں :
لیکن میرے ذاتی خیالات ــــــ"

انہوں نے مجھے دفعتاً کھڑا کر دیا - دروازہ پر لائے اور کہنے لگے "آپ جاکر ذرا کلیم سے تو رائے لیجئے ، وہ تمام معاملات کی تشریح کر دینگے"

میں شش و پنج میں ابھی استادہ ہی تھا کہ مسٹر ناظم نے پھر دروازہ کھولا - اور "میں بھول گیا" کہتے ہوئے ایک چوتھا ٹکٹ اور میرے سپرد کیا - اور دروازہ زور سے بند کر لیا -

مجھے بیکار طوالت سے نفرت ہے - میں نے طے کر لیا کہ میں ناظم کے مشورہ پر عمل پیرا ہونگا - اور (واسطے خون تمنا) تنقید نگار بنجاؤنگا کلیم کے مکان تک میں نے راستہ آہستہ آہستہ طے کیا - اور آخر کار اسی فیصلہ پر پہنچا - فی الواقع مسٹر ناظم کا طرز ملاقات نہایت کامیاب ہے ہماری ملاقات کے چار سال میں انہوں نے شاید ہی کسی خیال کا اظہار کیا ہو جس سے اتفاق کرنے کے لئے وہ مجھے مجبور کرنے میں کامیاب نہ رہے ہوں - ممکن ہے کہ اس کا باعث میری کمزوری ہو - یہ تو واقعہ ہے کہ میں اپنے ماحول کے اثرات کو بہت جلد قبول کر لیتا ہوں - میری بربادی حقیقتاً اسی اثر پذیری کا نتیجہ ہے یہی کمزوری میری لکنت کا باعث ہوئی - خیر یہ تو جملہ معترضہ ہے - اُس دن میں سواری پر مکان کو واپس ہوا -

روز اول کے واقعات کے تذکرہ سے ، گو وہ بہت دلچسپ ہیں - میں آپ کے عزیز وقت کو ضائع نہ کرونگا - اُن کی تفصیل میں اپنے روزنامچہ کے لئے محفوظ رکھتا ہوں - نہ میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرونگا - کہ میں کس طرح " وقفہ راحت" کے بعد اپنی نشست کو بھول گیا - اور تیسرا ایکٹ گیلری میں سے دیکھا - مجھے آپ کے سامنے جس امر کا اظہار منظور ہے وہ اُن تاثرات کی بابت ہے جو مجھ پر اس شب کو مترتب ہوئے - ایکٹنگ نے مجھ پر کیا کیا اثر پیدا کیا - واضح رہے کہ میں نے اسوقت تک ایک خاموش ، تنہا پسند زندگی بسر کی تھی - میں اس سے قبل تھیٹر نہیں گیا تھا - میری طبیعت قدرتی طور پر شوخ مناظر سے بہت سرعت کے ساتھ متاثر ہو جاتی ہے - گو آپ کو یہ تکرار فضول معلوم ہو - لیکن میرا بیان سمجھنے کے لئے اس بات کو ہمہ وقت پیش نظر رکھنا چاہئے -

حیرت و استعجاب نے ، جس میں خوف کا عنصر بھی شامل تھا - اول اول مجھ پر اثر کیا - فطرت سے تضاد ، حقیقت سے بُعد ایسی چیزیں ہیں کہ ممکن ہے ایک تھیٹر کے عادی کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکیں بمحسوس نہ ہو لیکن ایک "نووارد" کی آنکھوں میں یہ سماں ضرور کھٹکنے لگتا ہے - ایکٹروں کی وہ لااُبالی - وحشیانہ حرکات ، تصنع بھرے خیالات نمائشی جذبات ، اُن کا منہ بنانا - مترنم خراٹے لینا - اُن کی مصنوعی چیخ اور بیکار ہونٹ چبانا - حقیقت سے کوسوں دور ، دہشتناک مناظر ، اور اسٹیج کے تمام امتیازات تصنع ایک فطرت کے شیدائی کو عجیب کیفیت سے آشنا کرتے ہیں - ان سب حرکات کو ، جو نووارد کو عجیب اور کسیقدر بے معنی معلوم ہوتی ہیں - عادی حضرات بس اسی طرح سمجھ جاتے ہیں جسطرح کوئی گفتگو کے مفہوم کو سمجھ لے - گویا یہ حرکات بھی خاموش زبان بن جاتی ہیں -

یہ منظر میرے لئے ایک عجیب منظر تھا - اجتماع کافی تھا - ناظرین ایکٹنگ میں محو نظر آتے تھے - میری تازہ نظروں کو یہ کیفیت ، انسانی فطرت کی تضحیک معلوم ہوئی - میں نے اسے تنقیدی اور استفسارانہ نگاہوں سے دیکھا اور خیال کیا - جیسا کہ ہر تنقید نگار خیال کرتا ہے - کہ ڈرامہ کی اصلاح میرا فرض ہے - شب کو کھانا کھانے کے بعد جو کثرت جذبات اور جوش تنقید کی وجہ سے کھایا نہ جاتا تھا - میں دفتر اپنی رائے سپرد قلم کرنے گیا - میری رائے حقارت اور استہزا کا پہلو لئے ہوئے تھی - مسٹر ناظم نے بہت مسرت کا اظہار کیا -

رات بھر خواب میں میں نے ایکٹروں کو دیکھا - گھورتے ہوئے ، سینہ کوبی کرتے ہوئے ، دراز کردہ بازوؤں اور انگلیوں کو جھٹکا دیتے ہوئے ، بُری طرح مُسکراتے ہوئے ، مایوسانہ ہنستے ہوئے ، ناامیدانہ گرتے ہوئے ، ابلہانہ مرتے ہوئے -

گیارہ بجے میں اٹھا - سر میں قدرے درد تھا - "نقاد" میں اپنی رائے کو پڑھا - ناشتہ کیا - اور کمرہ میں موتراشی کے لئے گیا - اس وقت ایک عجیب حرکت سرزد ہوئی - مجھے استرا نہیں ملا - معاً خیال ہوا کہ وہ بیگ میں بند تھا -

میں نے کہا ۔ "آہ" میں آئینہ کے سامنے کھڑا تھا - بیگ کا خیال آتے ہی خود بخود میرے منہ سے نکل گیا "آخاہ" میں نے غیر اختیاری طور پر بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو پھیلا کر جھٹکا دیا - میرا دایاں ہاتھ نادانستہ طور پر میرے شکم پر آگیا - میں ہر وقت ضابط رہتا ہوں - مجھے یہ حرکت عجیب معلوم ہوئی - میں نے اپنے اطمینان کے لئے اس کی تکرار کی - "خوب !" پھر میں کسیقدر نادم اور سراسیمہ ہو کر بیگ کی طرف گیا -

موتراشی کے بعد میرا ذہن یک بیک اس حرکت کی طرف ، جو ابھی مجھ سے بے اختیارانہ صادر ہوئی تھی - منتقل ہو گیا - اور میں نے -

بارِ دیگر آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اس حرکت کی تکرار سے اپنے آپ کو محظوظ کیا۔ "یہ بھی ایک قسم کا مرض ہے۔" میں نے کہا...... اس کے بعد جہاں تک میری یاد کام دیتی ہے میں کلیم سے ملنے گیا۔ ازاں بعد ہوٹل میں زاہدہ کے ہمراہ شریکِ طعام ہوا۔ میری موجودہ مصروفیت کی روشنی میں ہم نے اپنے مستقبل پر گفتگو کی۔ مصروفیت! حیف، یہ میری بدقسمتی کا پہلا باب، میری بربادی کی پہلی منزل تھی۔ یہ مصروفیت مجھے روزانہ تھیئٹر لیجاتی اور میں بتدریج غیر محسوسانہ تغیر پذیر ہونا شروع ہوا۔ اولین حرکت کے بعد مجھ سے نادانستہ نئے نئے افعال سرزد ہونے لگے۔ میں نے خود کو زاہدہ کے سامنے سرِ خم کرتے پایا۔ میں اس کے دراز کردہ ہاتھ کو لینے کے لئے جھکا۔ لیکن جونہی کہ میں اس غیر معمولی حرکت کو محسوس کرتا، فوراً سر بلند ہو جاتا۔ اور میرے چہرے سے اضطراب ظاہر ہونے لگتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ میرے اس رویہ کو حیرت سے دیکھتی۔ پھر میں خود اظہارِ ندامت کی "کوشش" میں مصروف ہو جاتا...... جب ناظم مجھ سے کوئی ایسا سوال کرتا جس کا جواب میں بخوبی نہ دے سکتا تو میری انگلیاں خود بخود دانتوں تک پہنچ جاتیں۔ زاہدہ سے کسی لطیف اختلاف پر میرا ہاتھ میری ابروؤں تک اٹھنے لگتا۔ دید و بازدید احباب کے موقعہ پر بھی مجھ سے ایکٹر کی ذہنیت کا اظہار ہو جاتا۔ میں سخت کوشاں تھا کہ اس سے احتراز کروں۔ مجھ سے زیادہ شاید ہی کوئی اس فن کے تصنع کو حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہو۔ لیکن میں خود کو مجبور پاتا تھا اور لگا ہے گا ہے باہمہ احتیاط میں غیر اختیاری طریقہ سے اپنی بدلتی ہوئی حالت کا اظہار کر دیتا۔

اب مجھ پر روشن ہونے لگا۔ کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ متواتر اور مسلسل فن نقالی کا دیکھنا بغیر رنگ لائے نہ رہا۔ میں ہمیشہ سے اپنے ماحول کے اثرات کو قبول کرتا رہا ہوں۔ اور اس مرتبہ بھی اسٹیج کی قربت میری اثر پذیر طبیعت پر نقش کندہ کرتی رہی۔ میری عادات و خصائل پر کافی اثر پیدا ہو چلا، رفتار و گفتار میں تصنع کا عنصر آمیز ہونا شروع ہوا۔ نقل کرنے کے "مرض" نے مجھ پر فتح حاصل کر لی۔ ہر روز میری اثر پذیر نرم زمینِ طبع پر کسی نہ کسی حرکت یا جذبہ کا عکس نقش ہو جاتا اور قائم رہتا۔ میرے شخصی امتیازات رفتہ رفتہ فنا ہونے لگے۔ اور تھیئٹر کے تاثرات نے میری حقیقت اور فطرت کو پردہ سے پوشیدہ کرنا شروع کیا۔ میں نے اپنے تخیل میں خود اپنی نئی، تبدیل شدہ ہستی کا ملاحظہ کیا۔ ایک شب تنہا بیٹھ کر، جب کہ مجھ پر خواب کی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی میں نے اسے دیکھا۔ خود کو دوسرے رنگ میں پایا۔ وہ میرا دوسرا وجود کمرہ میں ادھر

اُدھر متحرک تھا۔ وہ ایکٹ کر رہا تھا۔ وہ اپنے گلے کو ہاتھوں کی گرفت میں لاتا تھا، آنکھوں سے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتا تھا۔ چلنے میں ٹانگوں کو جھٹکتا تھا۔ رنگ پر رنگ بدلتا تھا وہ ایک انسان نما مشین معلوم ہوتا تھا۔ تصنع اس کا امتیاز، نمائش اس کی پہچان تھی۔

میں نے اس سلسلہ سے علیحدگی کی ایک ناکامیاب کوشش کی مسٹر ناظم، جتنے عرصہ میں اُن کے پاس رہا، "ترکی حوز" کی بابت گفتگو کرتے رہے۔ اور مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا موقعہ نہیں ملا۔

زاہدہ کا برتاؤ بھی بدلنے لگا۔ ہماری محبت میں جو سادگی اور آسانی تھی وہ غائب ہو گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی ہے۔ میں نے بھی بظاہر کسی قدر رنجش کا اظہار کیا لیکن دل میں میں حد درجہ نادم، ملول اور غمگین تھا۔ میں نے ملازمت سے مستعفی ہونے کی کوشش کی۔ ناظم نے ادھر اُدھر کی باتیں کیں۔ ایک سگار پیش کیا، اور مجھے پھر شکست ہوئی۔ ازاں بعد میں زاہدہ سے ملنے کے لئے عجائب گھر گیا۔ اور اس طرح صورتِ حال نہایت نازک اور دل شکن ہو گئی۔

"آہ، پیاری زاہدہ"، میں نے اس سے قبل اتنے پُرجوش الفاظ استعمال نہ کئے تھے۔ آواز میں غیر معمولی جذبہ کا اظہار ہوتا تھا۔

اس نے اپنا ہاتھ کسی قدر سرد مہری سے دراز کیا اور ساتھ ہی ساتھ میرے چہرہ کا جائزہ لیتی رہی۔ میں نے اس کی قربت کو غنیمت سمجھا اور خود کو اس کی ہمراہی کے لئے پیش کیا۔

"سجناور" اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا اور غور کرنے لگی۔ پھر اس نے مجھے دیکھا۔

میں نے کچھ نہ کہا۔ انجام میرے پیشِ نظر تھا۔ میں نے سخت کوشش کی کہ میں وہی سادگی پسند، تصنع سے پرہیز کرنے والا۔ بے ریا سجناور بن جاؤں جس سے زاہدہ محبت کرتی تھی لیکن میں ناکام رہا۔ مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ اب میں وہ سجناور نہیں جو زاہدہ کا محبوب تھا۔ میں اپنی ہستی کو ایک نئی ہستی، اپنے وجود کو ایک تبدیل شدہ وجود سمجھتا تھا۔ میری اپنی اصلی عادات و خصائل پھر حاصل کرنے کی کوشش بھی تصنع سے خالی نہ معلوم ہوتی تھی۔ مجھے خود اپنے افعال سے ندامت تھی۔ میری حرکات خود میرے لئے بعید الفہم تھیں میرے جذبات صادق تھے لیکن ان کے اظہار میں تصنع تھا۔ میری رفتار، گفتار سوائے اسٹیج کے کارکنوں کے کسی اور سے مناسبت نہ رکھتی تھی۔

اس نے کہا "سجناور! تم بدل گئے ہو۔"

میں نے کہا "آہ" اور بے اختیار اپنے شکم کو پکڑ لیا اور اپنے سر کو ایکٹروں کی طرح جنبش دی۔

اُس نے کہا "یہ دیکھو"

میں نے کسی قدر تیزی سے کہا "آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟" اور سراسیمگی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ میں خوب جانتا تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ مجھے اپنے اطوار کی بناوٹ اور تصنع آمیزی کا خوب احساس تھا لیکن میں اس بدبختی سے نجات حاصل نہ کر سکتا تھا۔

میں نے کہا "تمہارا مطلب کیا ہے؟"

اُس نے فی الواقع میری طرف اس طرح دیکھا گویا وہ مجھ سے دور رہنا چاہتی ہے۔

زاہدہ نے دریافت کیا "آخر اتنا تصنع کس لئے ہے؟ مجھے یہ پسند نہیں، پہلے تو تم اس سے آشنا نہ تھے۔"

"آشنا نہ تھا" میں نے اس کی ایک بےخبری کی حالت میں تکرار کی۔ میں نے اپنے ماحول پر ایک تیز نظر ڈالی۔

میں نے جلدی سے کہا "ہم تنہا ہیں"۔ "سنو!" میں نے زاہدہ کی طرف اپنی انگشت شہادت دراز کر دی اور غور سے زاہدہ کو دیکھکر کہا۔ "میں ایک بددعا کے زیر اثر ہوں" میں نے دیکھا کہ "سایہ دار" پر اُس کی انگلیوں کی گرفت سخت ہو گئی۔

زاہدہ نے کہا "تم کسی بدصحبت میں ہو" تمہیں اس سے احتراز کرنا چاہیئے۔ میں نے تمہاری طرح کسی کو اس قدر تغیر پسند نہیں دیکھا۔

میں نے غمگین آواز سے کہا "میں قابلِ رحم ہوں۔ رحم کرو۔"

اُس نے مجھے استفسارانہ نظروں سے دیکھا۔

اُس نے کہا "خدا معلوم کہ تم میں یہ تصنع کہاں سے آگیا ہے۔ یہ نمائش کیسی؟ کم از کم میں ایسے شخص کی ہمراہی میں رہنا قبول نہیں کر سکتی جس کی حرکات ایسی ہوں۔ چہارشنبہ کو تم نے اپنی حرکتوں سے مجھے بھی ذلیل کیا اور خود بھی نادم ہوئے۔ صاف صاف الفاظ میں، میں تمہاری ان حرکات کی بنا پر تم سے نفرت کرنے لگی ہوں۔ میں یہاں تم سے یہی کہنے کو ملی تھی کیونکہ یہاں تنہائی ممکن تھی۔"

میں نے جوشیلی آواز میں کہا۔ "زاہدہ!" میرے مشت بند ہاتھوں کی انگلیوں کے سرے سفید پڑ گئے تھے۔

"کیا تم مجھ سے ملنا نہیں ——"

زاہدہ نے جواب دیا۔ "ہاں" عورت کی قسمت یوں تو ویسے ہی دنیا میں حد درجہ پست اور نازک ہے، تمہاری ہمراہی میں تو ——"

میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو پیشانی پر مارا۔

"اچھا الوداع!"

"میں نے کہا "آہ زاہدہ!" "خدا کے لئے"

زاہدہ نے کہا "مسٹر بختاور، خدا حافظ"

انتہائی جدوجہد سے میں اپنے حواس کو قائم رکھ سکا اور میں نے زاہدہ کے ہاتھ کو مس کیا اور چاہا کہ میں اپنی حالت کو اس پر واضح کر دوں اور اپنی مجبوری کا اظہار کر دوں۔ اس نے میرے چہرہ کو نہایت گہری اور ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور ایک طرح کی ناگواری اس کے چہرہ پر ہویدا ہوئی۔

"نہیں، نہیں، مجھے علیحدگی اختیار کرنی چاہیئے" اس نے یاس آمیز لہجہ میں کہا۔ اور فی الفور وہ روانہ ہونے لگی۔ ذرا سی دیر میں وہ مجھ سے بہت دور تھی۔

خدایا، میرے دل کی گہرائیوں میں کیسا تلاطم برپا ہوا۔ مجھے کیسا اضطرار تھا۔ مجھے زاہدہ سے محبت تھی لیکن صاف طور پر کبھی اس کا اظہار طرفین سے نہیں ہوا تھا۔ افسوس کہ میری جدید ہستی اس وقت بھی مجھ پر کافی سے زیادہ حاوی تھی اور میں اپنی عادتوں کے ہاتھ مجبور تھا۔

"خدا حافظ" میں نے نیم ہشیاری میں کئی بار کہا۔ مجھے اس وقت خود اپنی ذات سے نفرت ہو گئی تھی۔ زاہدہ نظروں سے روپوش ہو گئی۔ میں نے اضطرابانہ انداز سے کہا "الوداع" اور اپنے چاروں طرف یاس انگیز نظروں سے دیکھا۔ مجھ دل شکستہ کے منہ سے بے اختیارانہ ایک چیخ نکلی۔ مشت بند ہاتھوں کو میں نے ہوا میں زور سے حرکت دی۔ عجائب گھر کی گیلری میں ایک تصویر کے پاس نہایت مشکل سے پہنچا۔ اپنے چہرہ کو ہاتھوں سے چھپا لیا۔ اور سرد آہیں بھرنے لگا۔ (عجائب گھر کے پولسمین کو یہ یقین دلانا بہت مشکل ثابت ہوا کہ میں مدہوش شراب نہ تھا۔ بلکہ بار غم کی وجہ سے دل سے ایک ٹوٹی ہوئی صدا نکلی تھی۔ میرے نعرے کی آواز نے اُسے متوجہ کیا تھا۔)

لیکن اتنا زبردست صدمہ بھی مجھے میری بدقسمتی سے بچانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے کہا۔ ہر شخص کو احساس ہے، کہ تھیٹر کی ذہنیت مجھ میں دن بدن جذب ہوتی چلی جاتی ہے۔ میں اس بات پر مصر ہوں کہ مجھ سے زیادہ کوئی اور آدمی تھیٹر کے غیر فطری کارناموں کو حقارت کی نظروں سے نہیں دیکھتا۔ مجھے اس کا سخت تکلیف دہ احساس ہے۔ میری اصل ہستی —— خاموشی

پسند اور خوش مزاج سنجتا ور ـــــ فنا ہو چکی ہے۔ میں اپنی خودی کو اس سیل رواں سے جدا نہیں کر سکتا۔ بس باد صرصر کے جھونکوں میں مثل برگ خشک ہوں۔ کہ اُڑا چلا جاتا ہوں۔ ہر شخص میری اس تبدیلی سے آشنا ہو گیا ہے۔ میرا درزی بھی اس سے آگاہ ہے۔ اس بہار میں میں نے خاکی رنگ کے سوٹ کے لئے فرمایش کی لیکن اس نے تیز آسمانی رنگ کا سوٹ میرے لئے تیار کیا۔ واقعی اُسے ہر چیز کی موزونیت کی شناخت میں کمال حاصل ہے۔ میرا دائرہ دوستی وسیع ہو گیا ہے۔ اب میری ملاقات ایکٹروں سے بھی ہے۔ مجھے ان سے دلی نفرت ہے۔ لیکن صرف انہیں کی صحبت میں مجھے یہ اطمینان نصیب ہوتا ہے کہ مجھ پر انگشت نمائی نہیں کیجا رہی ہے۔ ناظم نے بھی میری اس غیر معمولی تبدیلی کو محسوس کیا ہے۔ کلیم بھی مجھ سے کل اس بات پر رنجیدہ ہو گئے۔ کہ میں نے انہیں "عزیز لڑکے" کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ اسٹیج کی ذہنیت مجھ میں اسقدر سرایت کر چکی ہے!

حقیقت یہ ہے کہ میری اصلی شخصیت فنا ہو رہی ہے۔ خاموش اور پُرسکون زندگی بسر کرنے کے بعد مجھے تھیٹر کے تنقید نگار کی حیثیت سے نہایت ہیجان انگیز دائرہ میں داخل ہونا پڑا۔ وہاں کی رنگ پرستی نے مجھ پر کافی اثر کیا۔ بعض لوگ اس امر کو فراموش کر دیتے ہیں کہ آدمی کے افعال پر صحبت اور قربت کتنا اثر پیدا کرتی ہے۔ میں نے اس سے قبل "اسٹیج کے شکار" کے کلمے کو سنا تھا لیکن میں اسے علم بیان کی ایک صنعت خیال کرتا تھا۔ میں مزاحاً اسے ایک "مرض" کہا کرتا تھا۔ لیکن یہ مذاق نہیں۔ واقعی یہ مرض ہے۔ میں خود اپنی موجودہ حالت سے نالاں ہوں۔ لیکن یہ اضطراب لاحاصل ہے۔ یہ مرض لاعلاج ہے۔ ہر ہفتہ مجھے تین گھنٹہ یا اس سے زیادہ نئے نئے کھیلوں کو نظر تنقید اور نگاہ غور سے دیکھنا پڑتا ہے اور اس سے جو اثرات مترتب ہوتے ہیں وہ میری اس تبدیلی کو اور زیادہ پائیدار بنا دیتے ہیں۔ روز بروز میرے اطوار اسقدر پست ہوتے جاتے ہیں۔ اور میرے ہر کام میں نمائش اور تصنع اس شدت سے بڑھتا جاتا ہے کہ میں مجھے شک ہوتا ہے۔ کہ آیا یہ میری ہی ہستی ہے جو اس قسم کی غیر فطری حرکات کی مرتکب ہوتی ہے۔ یہ نئی تہذیب جو مجھ پر اسقدر حاوی ہو گئی ہے ایک پوستین کے مانند ہے جو روز بروز دبیز تر ہوتی جاتی ہے۔ اور میری اصلیت کو پوشیدہ کرتی جاتی ہے۔

مجھے کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ کیا میں اس پریشان کن جدوجہد اور کشمکش سے دست بردار ہو جاؤں۔ دنیا کی ساکن، غیر دلچسپ یاس آمیز زندگی کو، جس کے لئے میں اب اسقدر موزوں ہوں، الوداع کہوں، سنجتا ور بیگ کے نام کو کسی پیشہ ور نام سے تبدیل کر لوں۔ اور اس طرح میری تبدیلی مکمل ہو جائے۔ اور تصنع سے پُر۔ حقیقت سے دور۔ فطرت سے خلاف۔ اسٹیج کی زندگی اختیار کر لوں۔ مجھے آسائش اور آرام کی صورت صرف یہی نظر آتی ہے۔ کیونکہ عام لوگ مجھے خردمند اور غیر تمند تسلیم کرنے کے لئے طیار نہیں ہیں۔ اسٹیج پر اور صرف اسٹیج پر میں کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہوں۔ جہاں پر میرے کارناموں کو شاید نظر تحسین سے دیکھا جائے۔ پس یہی انجام نظر آتا ہے۔ لیکن میں پھر اس کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ کہ جو خاص باتیں ایک ایکٹر کو عام لوگوں سے متمیز کرتی ہیں اُن سے مجھے سخت نفرت ہے۔ مجھے اپنی چچی راشدہ مرحومہ کی رائے سے ابھی تک اتفاق ہے کہ اسٹیج میں دلچسپی ظاہر کرنا خردمندوں کا فعل نہیں ہے۔ اور اسٹیج پر کام کرنا نہایت نا اہلی ہے۔ اس وقت بھی میری دلی خواہش ہے کہ میں اس تنقید نگاری کو خیر باد کہوں اور حقیقت اور قدرت کی سچی مسرتوں سے حظ اٹھاؤں لیکن ناظم پر میرا بس نہیں چلتا۔ جب میں اس کے پاس اس خیال سے جاتا ہوں۔ تو وہ مجھے ایک زوردار سگار اور ایک جام شراب ارغوانی اور سوڈا پیش کرتا ہے اور میں اپنے اظہار خیالات میں ناکامیاب رہتا ہوں۔

(ویلز)

سید رضی الحسن چشتی

قیس کی آبلہ پائی پئے لیلیٰ دیکھو
ذوقِ آوارگیٔ دشتِ تمنّا دیکھو

عشق کی منزل اوّل ہی میں بیتاب ہے دل
آگے آتی ہے مصیبت ابھی کیا کیا دیکھو

حفیظ
(جہوشیارپوری)

(غیر مطبوعہ)

سمندر سے

(از حضرت فاخر ہریانوی)

پرستش گاہِ مغرب اس صدی کا دیوتا تو ہے فنا کا آئینہ ہے۔ مظہرِ شانِ خدا تو ہے
ترے ہر قہقہے میں شورشِ طوفاں نہاں ہے مہیب انگڑائیوں میں موت کا ساماں نہاں ہے
ازل سے کر رہا ہے پرورش تو اُن چٹانوں کو ہمیشہ گھورتی ہیں جن کی نظریں بادبانوں کو
غریب انساں ترے ساحل پہ جب قبضہ جماتا ہے تو اسکی بے حقیقت کوششوں پر مسکراتا ہے
مٹا دیتی ہیں اُس کو قہرمانی طاقتیں تیری کہ لامحدود ہیں یہ غیر فانی طاقتیں تیری
حیاتِ عارضی کی بے ثباتی ہے عیاں تجھ سے سُنے کوئی غمِ انسانیت کی داستاں مجھ سے
تری گہرائیوں میں دفن ہیں جنجیں حسینوں کی نہاں ہیں سینکڑوں سیال قبریں نازنینوں کی
اثر ہوتا نہیں تجھ پر کبھی دلسوز آہوں کا ؛ تماشا دیکھتا رہتا ہے پُر حسرت نگاہوں کا
نہ پگھلا دل ترا معصوم رُوحوں کی دُعاؤں سے چھڑایا دُودھ پیتی بچیوں کو تُو نے ماؤں سے
ہوئے ہیں جذب تیری وسعتوں میں بے کفن لاکھوں شہیدِ جذبۂ آزادیٔ قوم و وطن لاکھوں ؛

نگل جاتا ہے تُو بے خوف اُن جنگی سفینوں کو
جلا کر راکھ کر دیں جو پہاڑوں کو زمینوں کو

فاخر

(غیر مطبوعہ)

روزِ حشر (سمندر سے مردے نکل رہے ہیں)

رنگ و بو

گھر کا بے زبان رکن

لاادریت اور ابیقوریت

سقراطی تحریک کا خلاصہ تاریخی وضاحت کی خاطر ذیل میں یہ دکھا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ فلسفہ میں سقراطی تحریک کا کیا درجہ ہے۔

واضح ہو کہ اہل سفسطہ سے لیکر ارسطو تک کا زمانہ تحریک سقراطی کہلاتا ہے۔ یعنی سقراط کا ظہور شدید لاادریت کے زمانہ میں ہوا۔ کیونکہ سوفسطائیوں کی تعلیم کا نتیجہ، جیسا کہ اہل علم کو معلوم ہے۔ اس کے سوائے اور کچھ نہ نکلا کہ لوگوں میں شکوک اور شبہات پیدا ہو گئے۔ ان لوگوں نے تحقیق اور طلب علم کو بالائے طاق رکھدیا۔ اور فلسفہ و حکمت کا مقصد صرف یہ قرار دیا کہ لکھے پڑھے آدمی، عوام الناس کو مغالطے دیسکیں، یا اُن پر اپنی علمیت ناقصہ بٹھا سکے جما سکیں۔ اسی وجہ سے آج سفسطہ اور سوفسطائی، فریب اور فریبی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ان بزرگوں نے فلاسفۂ متقدمین کے خیالات سے خلق خدا کو فائدہ نہ پہونچایا بلکہ جس طرح کسی چور کے ہاتھ اگر کمند آجائے تو وہ اس کی مدد سے چوری ڈکیتی کریگا۔ اسی طرح ان لوگوں نے متقدمین کا فلسفہ پڑھ پڑھ کے لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کیا۔ اور اس کام میں کامیابی اس لئے ہوئی کہ

* * * * * * * * * *

* * * متقدمین کے خیالات نہایت ناقص اور مبہم تھے اور ان کا منطقی نتیجہ سوائے لاادریت کے کچھ نکل ہی نہ سکتا تھا۔ سقراط کی زندگی اور اس کے فلسفے، دونوں کا مقصد اس کے سوائے اور کچھ نہ تھا کہ لوگوں کو "حکمت" کی حقیقت اور اہمیت سے قرار واقعی آگاہی حاصل ہو جائے۔ اور فلسفہ کے مطالعہ اور اس سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے اُس نے چند اصول مرتب کئے جن کو "اسالیب سقراطی" کہا جاتا ہے۔ گویا فلسفہ کی بنیاد استوار کرنا اور اس کے اصول مدون کرنا اس کے فلسفہ کا خلاصہ اور لب ولباب قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے اُسے ابوالفلاسفہ کا لقب دیا گیا ہے۔

سقراط نے جب لاادریت کے اسباب پر غور کیا تو اُسے معلوم ہوا کہ مختلف فلاسفہ اُن امور کے حل کرنے میں اپنی زندگی صرف کرتے رہے ہیں، جو ان کی لیاقت سے باہر ہیں۔ مثلاً "خدا" کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ انسان ضعیف البنیان، جب اپنی ہی ذات کو پورے طور پر نہیں سمجھ سکتا۔ تو خدا کی ذات وصفات کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ لامحالہ لاادریت اور تشکیک کے قعر میں جا پڑیگا۔ علاوہ بریں کائنات اور ماوراء الکائنات[1] کے متعلق فلسفیانہ غور و فکر یا قیاس آرائی کرنا ہی، حیات انسانی کا مقصد وحید نہیں ہے بلکہ اہم بات جس کی طرف ہر شخص کو اپنی توجہ مبذول کرنی چاہئے۔ یہ ہے کہ پاکیزہ زندگی بسر کرنے کا طریق کار کیا ہے؟ پس سقراط نے لوگوں سے کہا کہ بجائے آسمان و زمین کی ساخت پر غور کرنے کے، خود اپنے نفس میں غور کرو۔ اور دیکھو کہ تمہارا کیرکٹر انسانوں کا سا ہے یا حیوانوں کا سا؟ گویا اس نے فلسفۂ اخلاق کی بنیاد ڈالی۔

افلاطون نے، جو سقراط کے سب شاگردوں میں ممتاز ہے سقراطی طریق کو بہت زیادہ عمومیت کے ساتھ استعمال کیا۔ لیکن اخلاقیات کو اس کے فلسفہ میں بھی بہت نمایاں مرتبہ حاصل ہے۔ حتیٰ کہ افلاطونی طبیعات۔ سراسر اخلاقیات ہی کی توضیح و تشریح کے لئے وقف ہے۔ اُس صداقت کی تلاش، جس کے حصول کے بعد انسان، خدائی صفات سے متصف ہو جاتا ہے، اور جس کا حاصل کرنا، افلاطون کی رائے میں ہر انسان کا فرض اولین ہے۔ دراصل ایک زبردست اخلاقی مقصد اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے۔ یعنی تکمیل صفات انسانی۔ افلاطون نے اپنی ساری عمر صرف اسی مسئلہ کے حل کرنے میں صرف کر دی کہ انسان کس طرح، ملوثات کی سی زندگی بسر کرتا ہے؟ اس کے علاوہ اُس نے سائینس کی بنیاد بھی ڈالی تھی۔ جس پر اس کے شاگرد ارسطو نے اچھی خاص عمارت قائم کر دی۔

ارسطو اور افلاطون کے نظریات میں ایک امتیازی نشان یہ ہے۔ کہ افلاطون نے اپنی توجہ تمام تر، فلسفہ اخلاق پر مبذول کی۔ اور مابعد الطبیعاتی فلسفہ کو بھی اخلاقیات سے وابستہ کر دیا۔ لیکن ارسطو کے فلسفہ میں طبیعات اور مابعد الطبیعات کو اہمیت حاصل ہے۔ اخلاقیات پر جزوی توجہ کی گئی ہے۔ اور اس کو فلسفہ کی محض ایک شاخ تصور کیا گیا ہے۔

ارسطو کے فلسفہ کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کی ذہنیت فلسفیانہ

---

[1] جو کائنات یعنی دنیا سے بالاتر ہو۔

غور و فکر کے لئے آمادہ ہو گئی۔ چونکہ اُس نے سقراطی اسلوب کو بطرز نو مدوّن کر دیا۔ اور . . . . . طبیعات اور مابعد الطبیعات دونوں کو از سر نو محل تحقیق قرار دیا۔ اس لئے فلسفہ کی تاریخ میں آگے چلکر ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا یعنی لوگوں میں تحقیق و تلاش کا مادہ پیدا ہو گیا۔

ارسطو کے بعد فلسفی رجحان پر ایک طائرانہ نگاہ

ارسطو کی وفات پر، سقراطی تحریک کے دور کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کی وفات کے بعد، اُس کے چند ممتاز شاگردوں نے اس کے فلسفہ کا درس دینا شروع کیا۔ اور قدرے اختلاف کے ساتھ اس مشغلے کو جاری رکھا۔ ان لوگوں کا رجحان زیادہ تر حسابیت کی طرف تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر مطالعہ و مشاہدۂ فطرت میں مشغول رہتے تھے۔ ارسطو کے جانشین، ہیتوفریسٹس نے تو اپنے استاد کے فلسفے کو قدرے ملحوظ رکھا بھی، لیکن اُس کے شاگرد، اسٹراٹو نے مادیت میں اس درجہ غلو[1] کیا کہ روح یا نفس ناطقہ کے غیر مادی اور غیر فانی ہونے سے قطعاً انکار کر دیا۔ آگے چلکر خدا کے وجود سے بھی انکار کر دیا گیا اور ارسطو جیسے خدا پرست فلاسفر کے شاگرد پکے دہریے ہو کر رہ گئے۔ جوں جوں یہ لوگ ارسطو کے فلسفہ اور عقاید سے انحراف کرتے گئے۔ توں توں اِن کی تعلیمات اور شخصیت کا اثر کم ہوتا گیا۔ اور ارسطو کے فلسفے کی جگہ دوسرے مذاہب پیدا ہو کر اس کے قائم مقام یا مدمقابل بنتے چلے گئے۔

ارسطو کے بعد سوسائٹی کی حالت

ارسطو کی وفات کے بعد جو فلسفیانہ مذاہب ایتھنز میں پیدا ہوئے۔ ان کا تفصیلی تذکرہ کرنے سے پہلے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یونانی اور خصوصاً ایتھنز کی سوسائٹی پر ایک نظر ڈالی جائے کیونکہ فلسفۂ مابعد ارسطو یونانی سوسائٹی کے رجحانات سے بھی ایک حد تک متاثر ہوا تھا اور ایسا ہونا بالکل قدرتی بات ہے جیسا کہ مقدمہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔

ارسطو یونان کی آزادی سلب ہو جانے کے بعد بھی کچھ عرصہ تک زندہ رہا۔ لیکن اس زمانہ بھی غلامی کے آثار ہر طرف پیدا ہو چکے تھے۔ سکندر کی وفات کے بعد رہا سہا وقار بھی معدوم ہو گیا۔ سیاسی اہمیت اور آزادی قطعاً جاتی رہی یعنی توہین و تذلیل کے تمام مدارج سالہ طے ہو گئے۔ اس غم کو بھلانے کے لئے ایتھنز کے باشندے عیش و عشرت میں مشغول ہو گئے اور چند ہی سالوں کے بعد جس طرح ایتھنز زمانۂ گذشتہ میں علمی تحریکات اور فلسفیانہ سرگرمیوں کے لئے مشہور تھا۔ اسی طرح، رقص و سرود، عیش و عشرت اور اخلاقی بدکاریوں کے لئے زبان زد خلائق ہو گیا۔ ایسا ہونا تعجب خیز نہیں۔ اس لئے کہ یہ بات عقلاً قانون فطرت نہیں۔ خلاف مشاہدہ و تجربہ نہیں ہے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی میں، ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی اقبال کا آفتاب لب بام تھا۔ سلطنت مغلیہ جسے اکبر و اورنگ زیب نے زمین سے اٹھا کر، اوج ثریا تک پہونچایا تھا۔ بستر مرگ پر لیٹی ہوئی، اپنی آخری سانسیں پوری کر رہی تھی۔ ہمسایے درکنار، خود اس کے خویش و اقارب، اس کے مال و متاع اور اسباب خانگی کو، اُس کی ٹمٹماتی ہوئی آنکھوں کے سامنے دھڑی دھڑی کر کے لوٹ رہے تھے۔ اُن کی دیکھا دیکھی، اغیار بھی دور و نزدیک سے، بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے لئے چلے آ رہے تھے۔ مسلمان ہند کی شامت اعمال، صورت نادری میں جلوہ گر ہو رہی تھی۔ تخت طاؤس سے لیکر دیوان خاص کی چھت اور ساکنان دیوان کی عظمت و وقار، غلامان سلطنت اور امرا و ان ملت کے غارتگر ہاتھوں میں بازیچہ بنی ہوئی تھیں۔ محمد شاہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ نہ صرف سلطنت اور قوم بلکہ وہ خود اور اس کے افراد خاندان، لوگوں کی نگاہوں میں دن بدن ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ اور ۱۷۳۹ء کے بعد سے تو رہا سہا وقار بھی جاتا رہا۔ لیکن باوجود ان تمام افسوسناک حقایق کے جو آٹھ پہر اس کے پیش نظر تھے، وہ خود، اُس کا محل، اس کے ارکان سلطنت، اس کے مشیران دولت، اُس کے احباب و اقارب حد یہ کہ دلی والے سب کے سب گانے بجانے رنگ رلیاں منانے، غم کے خم لنڈھانے اور بدکاریوں میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانے میں مصروف تھے۔ اگر محمد شاہ میں کچھ بھی غیرت کا مادہ ہوتا، اگر واقعی اُس کی رگوں میں تیموری خون جوش زن ہوتا اگر واقعی اس میں اخلاقی یا روحانی عنصر کا کوئی شائبہ بھی موجود ہوتا، تو وہ حملۂ نادری کو تادیب سماوی سمجھتا اور اپنی اور اپنے افراد مملکت کی اصلاح میں منہمک ہو جاتا، یا کم از کم، مرتے دم تک چپ چاپ گوشۂ عزلت میں پڑا رہتا لیکن اس میں اور اُس کی رعایا میں، حاسۂ اخلاقی، قطعاً مردہ ہو چکا تھا۔ ادھر نادر شاہ نے پیٹھ موڑی اُدھر ارباب نشاط سارنگی کے تار ملانے بیٹھ گئے اور پکھاوجی مردنگ کو آٹا کھلانے لگے۔ پکھاوج اور طبلہ دونوں کی کھال پر آٹا لگایا جاتا ہے تاکہ "تھاپ" میں "گمک" پیدا ہو جو سُننے میں اس جگہ معلوم

---

[1] بہت زیادہ توجہ کرنا۔

حقائق پیش ناظرین کئے ہیں۔ ان میں عبارت آرائی یا خیال آفرینی کو مطلق دخل نہیں ہے۔ ایک ایک لفظ تاریخی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے۔ اسلام کو تو جانے دیجئے۔ اُن کی طرف تو محمد شاہ جیسوں کی توجہ کیا مبذول ہوتی۔ سیاسی طور سے مسلمان دن بدن ضعیف ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن ایک طرف اطبائے زمان، حبوب و ادویات طیار کرنے میں مصروف تھے۔ دوسری طرف تان سین اور بیجو باورے[۱] کے نام لیوا، نت نئی چیزیں مثلاً ذہرپد، خیال، ہوری اور ٹھمریاں تصنیف کرنے میں مشغول تھے۔ تمام ملک ہاتھ سے نکل گیا مگر آنکھ نہ کھلی —

انیسویں صدی میں سلطنت مغلیہ یعنی مسلمانوں کے سیاسی اقبال کا خاتمہ ہوگیا مگر مسلمانوں کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ اگر شاہزادے اور سلاطین زادے قلعہ معلّیٰ کے اندر بٹیریں لڑانے اور مشاعرے منعقد کرنے میں اپنے اوقات عزیز بسر کرتے تھے تو رؤسا و امراء کے علاوہ عام باشندے دہلی کی گلیوں میں خاک چھانتے پھرتے تھے۔ ۱۸۰۳ء سے لیکر ۱۸۵۷ء تک کونسی آفت ایسی تھی۔ جو دلی والوں پر نازل نہیں ہوئی لیکن راگ اور رنگ جس راستہ پر پڑ چکی تھی اُس سے بال بھر اِدھر اُدھر نہ ہوئی۔ طرفہ تماشا تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی رہنما بھی اسی خواب غفلت میں گرفتار تھے۔ وہ مسلمانوں کی پستی اور زوال کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن اگر مابین علماء مباحثہ ہوتا تھا تو اس مسئلہ پر نہیں کہ مسلمانوں کی پستی کے اسباب کیا ہیں؟ اُنکی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے؟ بلکہ اس مسئلہ پر کہ مسلمانوں کے پیغمبر صاحب (صلعم) کو "علم غیب" حاصل تھا یا نہیں؟ یا اُن کا "مثل و نظیر" پیدا ہونا عند العقل ممکن ہے یا نہیں؟ قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنا حرام ہے یا مکروہ؟ فاتحہ خلف الامام جائز ہے یا ناجائز؟ انگریزی پڑھنے یا کوٹ پتلون پہننے سے، مسلمان، مسلمان رہ سکتا ہے۔ یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ —

زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ آج بیسویں صدی میں بھی مسلمان ہند اور اُن کے قائدین و زعمائے ملت۔ اُسی شاہراہ پر چل رہے ہیں جو کعبہ کی بجائے۔ ترکستان کو جاتی ہے۔۱۲

الغرض ایتھنز بھی، زوال آزادی کے بعد، اخلاقی مصائب میں سرتاپا غرق ہو چکا تھا۔ ایک زمانہ میں، یہاں کے باشندے، سادگی مزاج و لباس و خوراک و عادات ان چاروں باتوں کے لئے مشہور تھے۔ لیکن اب ہر شخص تن آسانی، راحت طلبی، عیش پسندی اور عیاشی کی طرف مائل تھا۔ جس طرح کسی زمانہ میں فلاسفہ اور حکماء کی مانگ ہوا کرتی تھی اُسی طرح اب آبداروں، باورچیوں اور گویوں کی تلاش رہتی تھی۔

مختصر یہ کہ کسی زمانہ میں کسی قوم نے عیش و عشرت کا سامان اس قدر عمدگی اور خوبصورتی کے ساتھ جمع نہیں کیا ہوگا۔ جیسا کہ باشندگان ایتھنز نے یعنی پہلے وہ لوگ اپنا دماغ۔ عقل اور حکمت کی اشاعت میں صرف کرتے تھے اب ساری دماغی قابلیت، سامان عیش کے فراہم کرنے میں صرف کرنے لگے۔ اسی وجہ سے شہر ایتھنز تمام یونان کے بیکاروں عیش پسندوں اور دولت مندوں کا مرکز بنگیا۔ مختلف ریاستوں کے خود مختار بادشاہ، سال میں چار چھ مہینے کے لئے ایتھنز میں آکر داد عشرت دینا اپنا فرض یقین کرتے تھے، اور یہاں کے باشندے اس درجہ ذلیل ہوگئے تھے۔ کہ ڈیمیٹریس کو خدا سمجھکر پوجنے لگے کیونکہ وہ نہ صرف خود عیاش تھا بلکہ عیاشوں کا سرپرست اور محافظ بھی تھا۔

مورخین فلسفۂ یونان نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ ایک طرف ایتھنز میں عشرت و عیاشی کا بازار گرم تھا۔ دوسری طرف رواقی فلسفہ لوگوں کو اخلاق حسنہ کی طرف دعوت دے رہا تھا اور عملی طور پر اپنے اخلاقی فلسفہ پر عمل کرکے سعید ارواح کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ لیکن مجھے اس امر پر کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ اس لئے ہر داعی الی الشر کے مقابلہ میں ایک داعی الی الخیر، زمانہ میں موجود رہتا ہے۔ اور دنیا کسی وقت اہل اللہ سے خالی نہیں رہتی۔ چنانچہ جس زمانہ میں محمد شاہ دہلی میں بیٹھا ہوا۔ شراب ناب کے خُم لنڈھا رہا تھا۔ اسی زمانہ میں ایک بندۂ خدا[۱]، جس کے تبحر علمی کے سامنے، بقول علامہ شبلی نعمانی مرحوم "رازی اور غزالی کے کارنامے ماند پڑ گئے"! اسی دلی میں بیٹھا ہوا۔ خلق خدا کو "دین فطرت" کی طرف بلا رہا تھا۔ تاکہ ارباب معصیت پر اتمام حجت ہو جائے۔ *

---

[۱] بندۂ خدا سے مراد حضرت مجدد شاہ ولی اللہ صاحب طاب ثراہ کی ذات بابرکات ہے جن کی وفات ۱۱۷۶ھ یعنی ۱۷۶۳ء کے قریب ہوئی تھی۔ ان کے مرتبہ کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ آج مسلمان ان کو بارہویں صدی ہجری کا مجدد یعنی ریفامر تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے چاروں فرزند آسمان علم پر آفتاب و ماہتاب ہو کر چمکے بھلا کون ہے جس نے شاہ رفیع الدین یا شاہ عبدالقادر کا ترجمہ قرآن نہیں پڑھا ان کی وفات کے بعد شاہ عبدالعزیز صاحب محدث رح دہلی میں علم کے دریا بہاتے رہے۔ ان کی وفات ۱۲۳۹ھ ۱۸۲۴ء میں ہوئی۔ چوتھے شاہ عبدالغنی تھے جن کے فرزند حضرت سیدنا شاہ اسمٰعیل شہید رح نے تقویت الایمان لکھکر مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کی لعد ماوس؟

[۲] الف مشہور راگ۔ [۳] راگنیوں کے نام۔

اندریں حالات ناممکن تھا کہ فلسفہ ان خیالات سے متاثر نہ ہوتا سقراطؔ ۔ افلاطونؔ اور ارسطوؔ کی سنجیدہ روح، مدارس سے مفقود ہو چکی تھی بلکہ ایک طرف لا ادریت کا زور تھا دوسری طرف ابیقوریت کا شور تھا اور ان دونوں کے مقابلہ میں رواقیت، عیاش طبع باشندگانِ ایتھنز

. . . .

. . . کو تبھی پاکیزگی کی طرف دعوت دے رہی تھی۔ بہر کیف اب ہم ان مذاہب کو قدرے وضاحت سے بیان کریں گے ۔

(۱) لا ادریت

پائیرو کے سوانح حیات

فلسفۂ تشکیک یا لا ادریت کا بانی پائیرو باشندۂ ایلس تھا جس کی تاریخ ولادت محقق نہیں ہو سکی۔ ابتدائی حالات بھی پردۂ خفا میں ہیں ۔ اسقدر معلوم ہے کہ ۳۲۶ ق م میں جب سکندر ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا تو پائیرو بھی اس کی فوج کے ہمراہ آیا تھا اور اس کے آنے کی غرض محض یہ تھی بیان کے جوگیوں، سادھوؤں اور فلاسفوں سے تبادلۂ خیالات کر سکے ۔ اگرچہ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ کن لوگوں سے کیا کیا گفتگو رہی ۔ اور کن کن مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوا لیکن پائیرو کی آئندہ علمی زندگی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ قیاس غلط نہیں کہ ہندو فلسفہ بھی اُسے تسلی نہ دے سکا ۔ یا انہی لوگوں سے اس کو ملاقات کا موقعہ ملا ۔ جو اسی طرح "لا ادریے" یا دہریے ہونگے ۔ کیونکہ ہندوستان میں آستکتا (خدا پرستی) کے ساتھ ساتھ ناستکتا (الحاد) بھی موجود تھی ۔ سانکھیہ درشن، جس کا چرچا اس زمانہ میں عام تھا۔ نتائج کے لحاظ سے دیمقراطیسی فلسفہ کا مماثل ہے ۔ اور پائیرو ہندوستان آنے سے پہلے دیمقراطیس کی تصانیف پڑھکر پکا مادہ پرست (دہریہ) بن چکا تھا ۔ لیکن اس فلسفہ سے اُس کی تشفی نہ ہو سکی لہٰذا وہ انجام کار لا ادری بنگیا ۔

بہر حال جب وہ اپنے وطن مالوف کو واپس گیا تو وہاں جا کر اس نے اپنی بقیہ زندگی، غور و فکر، درس و تدریس اور پاکیزہ اصولوں کے ماتحت بسر کی ۔

---

۴ شریعت کی خاطر سقراط اور حسین رضہ کی سنت کی دوبارہ زندہ کیا ۔

شاہ صاحب موصوف کی بہترین تالیف جس نے انہیں مجدد الوقت بنا دیا۔ اور اُن کے نام کو زندۂ جاوید بنا دیا ۔ حجۃ اللہ البالغہ ہے جس میں انہوں نے اسلام کا فلسفہ نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ آیات اللہ الکاملہ کے نام سے اس کتاب کا ترجمہ اردو میں بھی ہو چکا ہے۔ کاش کوئی مخلص مسلمان اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں بھی شائع کرا دے ۔ مؤلف ۱۲

۵ مولنا شبلی (ولادت ۱۸۵۷ء وفات ۱۹۱۴ء) اُن اکابرین سے ہیں جنہوں نے تشکیل ملت اسلامیہ میں معتد بہ حصہ لیا ۔ اور مسلمانوں میں علمی بیداری پیدا کی ۔ سیرت نبوی اُن کے تبحرِ علمی پر دال ہے۔ دار المصنفین اعظم گڈھ، دراصل انہی کے خواب کی تعبیر ہے جو علامہ سید سلیمان ندوی کی نگرانی میں ملک و قوم کی لائق تحسین خدمت کر رہا ہے ۱۹۱۳ء میں فقیر مولف کو مرحوم کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا ۔

۳ ۔ امام فخر الدین رازی جن کی تفسیر قرآن کسی زمانہ میں، نہایت وقعت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھی ۔ اور آج بھی بیشمار افراد اس سے استفادہ کرتے ہیں ۔ اور اس لحاظ سے اس کا جواب نہیں ہے کہ اُس میں ہر مسئلہ پر بہت کچھ فلسفیانہ بحثیں موجود ہیں ۔ حتیٰ کہ بعض علماء نے یہانتک لکھدیا کہ اس تفسیر میں سوائے قرآن کے اور سب کچھ موجود ہے ۔ انہی بزرگ کے حق میں، سیدنا و مرشدنا و مولنا رومی رحہ نے فرمایا ہے ؛ ۔

گر باستدلال کار دین بُدے ؛ فخر رازی راز دار دین بُدے

۴ہ غزالی حجۃ الاسلام محمدؒ غزالی رحہ ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں ۔ جن کی عزت ایشیا، یورپ اور امریکہ تینوں براعظموں میں یکساں ہو رہی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مرحوم غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی احیاء العلوم، رازی کی تفسیر کی طرح ضخیم اور مشہور ہے ۔ اور فلسفۂ اخلاق پر شاید اس سے زیادہ مبسوط کتاب دنیا میں موجود نہیں۔ مولنا روم رح کی مثنوی کے بعد مشرق میں اگر کسی غیر الہامی کتاب کو مقبولیت نصیب ہوئی تو غزالی کی احیاء العلوم کو ان کی خصوصیت یہ ہے کہ برخلاف دیگر علماء کے یہ بزرگ صوفی بھی تھے اور تصوف کے جملہ مدارج دس سال کی ریاضت کے بعد طے کر چکے تھے ۔ فلاسفر بھی تھے ۔ عالم شریعت بھی اور صوفی صافی بھی ۔

۵ہ ۔ دین فطرت سے مراد اسلام ہے ۔ چنانچہ آیت ذیل اس پر گواہ ہے ؛ ۔

" فاقم وجہک للدین حنیفا، فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا، لا تبدیل لخلق اللہ، ذالک دین القیم "

پس اپنا منہ یعنی توجہ دین حنیف کی طرف کرو ۔ یعنی اللہ کی پیدا کردہ "فطرت" پر کاربند ہو جاؤ ۔ جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے ۔ اس کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہوتی ۔ یہی سچا دین ہے ۔ ۱۲

پائیرو اور سقراط کا موازنہ

دونوں نے تشکیک ہی سے اپنی فلسفیانہ زندگی کا آغاز کیا لیکن فرق یہ ہے کہ سقراط نے تمام مروجہ مقبولہ حقایق کے متعلق اس لئے شک کیا کہ ان کی صحت کا امتحان کرے، لہٰذا اُس کا شک تحقیق کے لئے محرک تھا لیکن پائیرو کا شک اسے نا امیدی کی طرف لے گیا، اس نے تمام فلسفی مذاہب کا مطالعہ کیا لیکن "صداقت" کہیں نہ ملی کیونکہ محض فلسفہ کی مدد سے معمائے کائنات کا حل دستیاب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ فلسفہ محض بیکار ہے اور انسان حقایق کائنات سے واقفیت حاصل کر ہی نہیں سکتا۔ اسی لئے پائیرو نے اپنی زندگی آرام اور اطمینان کے ساتھ بسر کی لیکن بیچارہ سقراط ہمیشہ مورد آفات بنا رہا۔

پائیرو کا فلسفہ

بدقسمتی سے پائیرو کی تصانیف آج بالکل ناپید ہیں۔ جس طرح معتزلہ کی تفسیر قرآن۔ لیکن سیکسٹس ایمپریکس نے اس کے خیالات تعلیمات اور عقاید جسقدر ممکن ہو سکا، یکجائی طور پر مرتب کئے ہیں۔ اُن سے مندرجہ ذیل اقتباسات خالی از دلچسپی نہ ہونگے۔

(۱) "لا ادری" یعنی "میں نہیں جانتا"۔ جب پائیرو سے لوگوں نے فلسفہ کے متعلق سوالات کئے تو اس نے جواب میں کہا "(یقینی طور پر) میں کچھ نہیں جانتا"[۱]۔ اس دن سے اس کے مذہب کا نام ہی "لا ادریت" یا تشکیک پڑ گیا۔ اس فلسفہ کا لب لباب صرف یہ ہے کہ دنیا میں "صداقت" یا "حقیقت" کا کوئی معیار موجود نہیں ہے۔ اس دعویٰ پر مندرجہ ذیل دلائل مرتب کی جا سکتی ہیں:-

(۱) بقول ارسطو انسان صرف "مظاہر" کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ یہ "مظاہر" کیا ہیں؟ صرف اشیاء کی ظاہری صورت۔ لیکن ان اشکال کی صداقت کا معیار کہاں ہے؟ ہم ان اشکال، کی اُن اشیاء سے مطابقت کا یقین کس طرح حاصل کریں۔ جن کی یہ اشکال، ظاہری صورتیں ہیں؟ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ مختلف اشیاء مختلف اوقات میں مختلف انسانوں کو مختلف دکھائی دیتی ہیں۔ تو ان مظاہر مختلفہ میں کونسا "مظہر" حقایق اشیاء پر منطبق ہو سکتا ہے۔ اور ہم کس طرح جان سکتے ہیں کہ فلاں شکل۔ فلاں شے کی سچی تصویر ہے؟

علاوہ بریں اس بات کا یقین کس طرح ہو کہ ہم کسی شے کو پورے طور سے جان سکتے ہیں؟ مثلاً ایک "امرود" لے لیجئے ہم اُسے دیکھتے ہیں۔ سونگھتے ہیں، چھوتے ہیں۔ چکھتے ہیں۔ اس کے گرنے کی آواز سنتے ہیں تو نظارہ خوشبو۔ ذائقہ۔ احساس اور آواز یہ پانچ مختلف اشکال یا امرود کے پانچ مختلف پہلو ہیں جو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اگر انسانوں میں پانچ کی جگہ آٹھ حواس ہوتے تو امرود میں بھی پانچ کی جگہ آٹھ خواص پائے جاتے۔ اگر انسان میں پانچ کی جگہ تین حواس ہوتے تو امرود میں بھی بجائے پانچ کے تین ہی خواص پائے جاتے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا امرود کے خواص مذکورہ ہمارے حواس خمسہ پر منحصر ہیں یا اس کے ذاتی خواص ہیں؟ نیز یہ کہ پانچوں خواص ذاتی ہیں یا بعض؟ دوسری صورت میں کون سے ذاتی ہیں کون سے اعتباری؟

علاوہ بریں مختلف لوگوں کے حواس۔ مختلف اشیاء کو، مختلف اشکال میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ایک ہی شے زید کو بڑی معلوم ہوتی ہے بکر کو چھوٹی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خواص اشیاء حواس انسانی پر منحصر ہیں۔ فی الجملہ جو بات یقینی طور کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ اشیاء ہم کو فلاں فلاں طریق یا اسلوب پر دکھائی دیتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہمیں "احساسات" حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ تو یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ جو احساسات ہمیں حاصل ہوتے ہیں وہ اشیائے متعلقہ کی سچی تصویریں ہیں۔ یعنی فی الواقع وہ احساسات اُن اشیاء کے ذاتی خواص پر دلالت کرتے ہیں۔ "امرود چمکیلا اور سفید، خوشرنگ۔ خوشبودار۔ خوش ذائقہ۔ گول سڈول اور شیریں ہوتا ہے" یہ تمام باتیں بالکل صحیح ہیں۔ بشرطیکہ ان تصریحات سے ہمارا مطلب صرف اتنا ہو کہ امرود ہمیں، ایسا ایسا معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ دوسرا بھی ان صفات کو مدار یقین بنالے ممکن ہے کہ اُسے یہی امرود بدنما۔ بدذائقہ اور بدبودار اور ناہموار معلوم ہو۔

---

[۱] اس موقعہ پر یہ لطیفہ یاد آگیا:-

جان اسٹوارٹ مل (۱۸۰۶ء-۷۳ء) مشہور لاادری گزرا ہے۔ ایک مرتبہ وہ کسی ضیافت میں شریک ہوا۔ جہاں ایک معمر خاتون بھی تھی جو کلیسائی مذہب پر صدق دل سے یقین رکھتی تھی۔ اور اس نے مل کا نام اور اسکے خلاف مسیحی عقاید کا ذکر، بارہا سنا تھا اس لئے اسے دیکھنے کی بیحد مشتاق تھی۔ اس نے مل سے پوچھا لاادری کسے کہتے ہیں؟ مل نے جواب دیا "مہربان خاتون! لاادری وہ ہے جو کسی بات کو مدار یقین نہیں بناتا یعنی یقینی طور پر کسی امر کے متعلق کوئی رائے نہیں رکھتا کہ فلاں امر صحیح ہے یا غلط۔ ممکن ہے صحیح ہو ممکن ہے غلط ہو"۔ تو اس خاتون نے کہا "پھر تمہیں اس بات کا یقین کیونکر ہے کہ تمہیں کسی بات کا یقین نہیں ہے؟" مؤلف

انہیں حالات۔ فلاسفہ یہ ادعا کرتے ہیں کہ "عقل" معیار صداقت ہے اور وہ سچ اور جھوٹ۔ صحیح اور غلط میں امتیاز کر سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس بات کا کیا ثبوت کہ عقل انسانی کبھی غلطی نہیں کرتی؟ عقل کی صحت کے لئے ایک معیار کی ضرورت ہے، پھر اس معیار کی صحت کے لئے دوسرے معیار کی، پھر اس کے لئے تیسرے معیار کی، وہلم جرّا۔

پس، چونکہ ہم کو صرف مظاہر کا علم حاصل ہو سکتا ہے نہ کہ ذات شے کا اس لئے تحقیق و تلاش ایک امر لاحاصل ہے، کائنات کے معمے کو حل کرنے کی کوشش بالکل بے سود ہے۔ انسان کو صرف علم مظاہر کائنات ہی پر اکتفا کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس سے آگے بڑھنا، اس کی لیاقت سے باہر ہے۔

لیکن لاادریوں سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے اپنی دانست میں وجوبیات کا ابطال کر کے یہ سمجھ لیا کہ "مطلق علم" کا یا کسی سائنس کے مدوّن و مرتب ہونے کا بھی امکان نہیں ہو سکتا۔ یعنی انسان کائنات میں کسی شے کا کسی قدر علم بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ بیشک انسان "خدا" "کائنات" یا "نفس ناطقہ" کو بکلی احاطہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس میں کیا شک ہے کہ جو کچھ وہ جانتا ہے اس کی صحت کا عقلی طور پر امکان ضرور ہے۔ بیشک انسان بعض دفعہ غلطی بھی کرتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ تمام دنیا جہل مرکب میں مبتلا ہو جائے اور قیامت تک غلطی ہی میں گرفتار رہے۔ اس پر مفصل بحث آئندہ کی جائیگی۔

واضح ہو کہ متشککین جدید نے، جن کو ہم ([illegible]) یا لاادریے کہتے ہیں۔ اپنے مذہب میں کسی نئی بات یا دلیل کا اضافہ نہیں کیا صرف پرانی شراب کو نئی بوتلوں میں بھر کے نئے لیبل لگا دیئے ہیں۔ ہیوم صاحب نے اپنے فلسفہ میں جن دلائل کی بناء پر یہ سمجھا ہے کہ میں نے یقینیات کے قلعہ کی ساری دیواریں منہدم کر دی ہیں۔ وہ اُن سے دو ہزار سال پہلے ہی پائیرو (المتوفی ۲۸۵ ق م) نے شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی تھیں۔

"تعریف" کے متعلق پائیرو کہتا ہے کہ یہ شے بھی قطعاً بیکار ہے۔ اگر جس چیز کی ہم تعریف کرتے ہیں، وہ ہمارے حیطۂ علم میں ہے۔ تو ہم اس کو اس تعریف کی بنا پر نہیں جانتے بلکہ ذاتی علم کی بناء پر جو پہلے سے ہمیں حاصل ہے اور اگر ہم اُس شے سے واقف نہیں تو تعریف نہیں کر سکتے۔ اور اگر کریں گے تو صریحاً غلط ہو گی۔

مختصر یہ کہ لاادریوں نے اپنا فلسفہ پیش نہیں کیا بلکہ سابقین کے حکیمانہ عقاید یعنی کسی تردید ہی کو اپنا مشغلۂ زندگی بنا لیا۔

ابیقوریت

ابیقور کی لائف

ابیقور ۳۴۲ ق م میں بمقام ایتھنز پیدا ہوا تھا۔ بچپن ہی سے اُس میں غور و فکر کے آثار ہویدا تھے۔ تیرہ سال کی عمر میں جبکہ وہ استاد سے ایک نظم پڑھ رہا تھا تو اس میں ایک شعر آیا جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے جو کائنات میں نظر آتی ہے، غیر منظم مادہ یا ہیولانی اصل سے پیدا ہوئی ہے۔ ابیقور نے اُستاد سے سوال کیا جناب! غیر منظم مادہ کس شے سے پیدا ہوا؟ استاد نے کہا یہ سوال ادبیات سے تعلق نہیں رکھتا اس کا جواب مدنظر ہو تو کسی فیلسوف سے مابعد الطبیعات پڑھو" ابیقور نے اسی دن سے فلسفہ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ لیکن "گئے تھے روزے بخشوانے وہاں اُلٹی نماز گلے پڑ گئی"۔ فلسفہ کا مطالعہ تو اس لئے شروع کیا تھا کہ ایک دشواری کا حل دستیاب ہو جائے۔ مگر چند سال فلسفہ پڑھنے کے بعد ایک چھوڑ سینکڑوں شبہات اور سوالات پیدا ہو گئے۔ زیادہ تر دیمقراطیسی فلسفہ اُس کے زیر نظر رہا۔ علم کی تلاش اُسے مختلف شہروں میں لیگئی لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ بہرحال چھتیس سال کی عمر میں اُس نے ایتھنز میں درس دینا شروع کیا اور ۲۷۰ ق م میں وفات پائی۔

خصائص و عادات

ابیقور نہایت خاموشی پسند۔ صلح کل۔ نیک مزاج اور مرنجان مرنج شخص گزرا ہے۔ شہر سے باہر ایک خوشنما باغ میں مکان اور مکتب دونوں تعمیر کئے تھے اور چند مخلص دوستوں کا مجمع ہمیشہ اس کے گرد لگا رہتا تھا۔ دوستوں سے گفتگو بھی کرتا رہتا تھا اور سلسلۂ تالیف بھی جاری رہتا تھا۔ ع

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

خیال کیا گیا ہے کہ کریسی پس کے بعد، ابیقور تمام یونانی فلاسفہ میں سب سے زیادہ صاحب تصانیف گزرا ہے، لیکن آج اس کی ایک تصنیف بھی موجود نہیں ہے۔

ابیقور کے مخالفین نے اس پر اور اس کے فلسفہ پر اسقدر شدید الزامات عائد کئے کہ آج ابیقوریت عموماً رندی و بدمستی کی ہم معنی خیال کی جاتی ہے اور خود، اس فلسفے کے بانی کو ایک عیاش اور رند مشرب انسان تصور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت حال، بالکل اس

کے برعکس ہے۔ اب سوال ہوگا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ابیقوریت کو رندی اور بدمستی کا مترادف قرار دیدیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے مخالفین نے اس کے خلاف پروپیگنڈا اسقدر زبردست کیا تھا کہ حقیقت پوشیدہ ہوکر رہ گئی۔ اس کی مثال اگر درکار ہو تو دنیا کے سب سے بڑے انسان کی نظیر پیش کی جاسکتی ہے یعنی اس انسان کی نظیر جسے آج غیر متعصب غیر مسلم دنیا کی مذہبی ہستیوں میں کامیاب ترین شخصیت قرار دیتے ہیں جس سے بڑھکر بنی نوع آدم کا خیرخواہ[1] اور محسن آجتک پیدا نہیں ہوا۔ جس کا تلقین کردہ مذہب شکوک اور شبہات[2] سے پاک ہے۔ جس کی لائی ہوئی کتاب[3] آج تیرہ سو سال کے بعد بھی بلحاظ اصلیت و صحت، اپنی نوعیت میں لاجواب اور عدیم المثل ہے۔ جس کی شخصیت تمام افرادِ عالم کے لئے "اسوۂ حسنہ" کا کام دے سکتی ہے۔ اس موقعہ پہ پیش کی جاسکتی ہے۔

جو لوگ تاریخ مذاہب سے واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مذہبی دنیا میں آنحضرت ختمیت مآب صلعم سے بڑھکر کسی پاک نفس پر الزاماتِ ناروا اور اعتراضات بیجا وارد نہیں کیے گئے۔

اور اسلام جیسے صاف اور معقول مذہب کو جو دراصل دینِ فطرت اور دینِ قیم ہے۔ سب مذاہب سے زیادہ ہدفِ ملامت بنایا گیا ہے۔ یہ فعل، حروبِ صلیبیہ کے بعد، اسلام کی روز افزوں ترقی اور ہردلعزیزی کو دیکھکر، مخالفینِ حق کی طرف سے وقوع میں آیا تھا لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد یورپ کے مدبرین بھی سیاسی مصالح کی بنا پر ان مخالفین کے ہمنوا ہوگئے، انگلینڈ فرانس، جرمنی۔ اٹلی اور تمام یورپ میں اسلام اور بانیٔ اسلام کے خلاف اسقدر زہر اُگلا گیا کہ در و دیوار صدائے مخالفت سے گونج اٹھے اور ایک تو کسی نے ان الزامات کی تردید نہ کی دوسرے قرآن مجید اور اسلامیات عربی زبان میں ہیں جن سے یورپین اقوام محض ناواقف لہٰذا جو جی میں آیا لکھا اور جو الزام ذہن میں آسکا اسلام اور بانیٔ اسلام کے سر تھوپ دیا۔ معدکیوں جانیئے گلیڈسٹن[4] کہا کرتا تھا کہ جبتک قرآن موجود ہے دنیا میں امن و امان قائم نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ بیسویں صدی کے واقعات نے اس کے نظریہ کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر کر رکھدیں[5]۔ الغرض یورپین پادریوں اور مدبرین نے محض بد پاگنڈا کے زور سے یورپین اقوام کی نظروں میں اسلام اور بربریت کو ایک دوسرے کا مماثل قرار دیدیا۔

پس اسی طرح ذاتی اغراض کی بنا پر ابیقور کے مخالفین نے اس کے فلسفہ کو اسقدر بدنام کیا کہ الحفیظ والامان۔ آج انگریزی ادبیات (لٹریچر) میں ابیقوریت، ہر اُس بات کی مترادف ہے جو اخلاقِ حسنہ سے بعید ہو۔ حالانکہ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ ابیقور نہایت پاکیزہ زندگی بسر کرتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ خدا۔ معاد، حشر اجساد اور بقائے روح کا قائل نہ تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ تو نہیں نکل سکتا کہ وہ زانی، شرابخور، قمارباز اور دغاباز تھا یا حسن صباح کا بڑا بھائی۔ فی الجملہ ہم اس کا فلسفہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:۔

ابیقور کا فلسفہ

ابیقور کے نزدیک فلسفے کی علت غائی تحقیقِ حق نہیں بلکہ آسودگی اور طمانیت قلبی کا حصول ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فلسفہ وہ طاقت ہے جس کی بدولت "عقل" انسان کو راحت کے دروازہ تک پہونچا سکتی ہے۔ یعنی اُس کی زندگی کو مسرور بنا سکتی ہے۔ پس فلسفۂ اخلاق ہی سب سے اعلیٰ فلسفہ ہے اور اسی کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ مابعد الطبیعات اور منطق۔ یہ فضول علوم تو قطعاً بیکار ہیں۔ ان کے پڑھنے پڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں اگر وہ پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے اصولوں سے یعنی فلسفۂ اخلاق سے نابلد ہے تو "انسانیت" ہی سے خارج قرار دیا جائیگا۔

تمام عقلائے دہر کا اس مسئلہ پر اتفاق ہے کہ زیستِ انسانی کا مقصد اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انسان کو طمانیتِ قلب نصیب ہوجائے۔ یعنی تمام فطری خواہشات اور طبعی جذبات کی تسکین کا ساماں بہم پہنچ جائے۔ اختلاف ہے تو ذرائع حصولِ طمانیت میں ہے۔ اور مختلف ذرائع، جو مختلف لوگوں نے اس گوہرِ مقصود کے حاصل کرنے کے لیے تلقین کئے ہیں۔ آج دنیا میں مختلف مذاہب کے نام سے مشہور ہیں۔ ابیقور کہتا ہے کہ "راحت" یا انبساط کے ذریعہ سے طمانیت یا سرورِ خاطر حاصل ہو سکتا ہے۔ پس وہی افعال مستحسن اور لائقِ تعریف ہیں جن سے "انبساط" حاصل ہو اور مشاہدہ بھی اسی بات کو درست ٹھیراتا ہے جملہ حیوانات (انسان اور بہائم وغیرہ) بالطبع راحت کے جویا اور کلفت سے نفور ہیں۔ ہر متنفس، تکلیف سے بچنا چاہتا ہے اور وہی بات یا کام کرنا چاہتا ہے جس سے اُسے لذت، حظ یا انبساط حاصل ہو تاکہ اس کی بدولت اُسے راحت خوشی یا سرورِ دائمی نصیب ہو سکے۔ پس جب حیوانات بھی نادانستہ یا

---

[1] سائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ [2] ڈیون پورٹ اور باسورتھ اسمتھ۔ [3] ایڈورڈ گبن [4] سر ولیم میور۔ [5] کارلائل ۱۲

جبلی طور پر راحت کے طالب ہیں تو انسان کو بھی اسی طرف مائل ہونا چاہیئے۔ واضح ہو کہ لذت، کو محض لذت کی خاطر حاصل نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ "طمانیت قلبی" کے اصول کو ہر لذت میں مدِ نظر رکھنا چاہیئے۔ اور اگر کسی لذت کی بناء پر آئندہ راحت دائمی یا سرور و طمانیت باطنی میں نقصان واقع ہو تو محض فوری انبساط کی خاطر، دائمی راحت کو قربان نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس لذت ہی سے کنارہ کش ہو جانا ہی بہتر ہے مثلاً فضول خرچی سے تھوڑے دنوں کے لئے تو لطف نصیب ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر تمام عمر قرض اور مفلسی کا عذاب لاحق حال رہیگا۔ اس لئے فضول خرچی سے محترز رہنا ہی بہتر ہے۔ یعنی "چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات" والا مضمون نہ ہونا چاہیئے۔ اسی لئے بسا اوقات انبساط کے مقابلہ میں انقباض اور لذت کے عوض کرب گوارا کرنا بھی انسان کے حق میں مفید ہو سکتا ہے مثلاً تھیٹر، سنیما سے انبساط، اور کمرے میں بیٹھکر اقلیدس یاد کرنے سے انقباض ضرور ہوتا ہے لیکن اگر ایک انٹرنس کلاس کا طالب علم امتحان سے پہلے اپنا وقت سیر و تفریح میں بسر کرتا رہے تو تھوڑے دنوں کے انبساط کے بعد مدتوں کا انقباض لاحق حال ہو جائیگا۔

گویا برخلاف سایرنیئت کے اپی قوریت مستقل اور دائمی راحت حاصل کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔ اول الذکر فلسفہ کا بانی ارسطافیس صرف "فوری انبساط" کی طلب کو مقصدِ حیات قرار دیتا ہے۔ لیکن ابیقور نے اس کے فلسفہ کی اصلاح کی اور "دائمی سرور" کو مطمحِ نظر بنایا اور ارسطو کی طرح "سرور" اور "خوبی" (نیکی) کو لازم ملزوم قرار دیا۔ یعنی "قلب مطمئنہ" اور "حیات طیبہ" میں کوئی فرق نہیں۔ بہترین انبساط (سرور) جسمانی یا مادی نہیں بلکہ عقلی اور ذہنی ہی ہوتا ہے۔ جسقدر سرور یا انبساط بذریعۂ حواس خمسۂ ظاہری حاصل ہوتا ہے وہ بہت جلد فنا ہو جاتا ہے۔ لذیذ غذائیں۔ گلاب کی خوشبو، موسیقی اور نغمات حسین و جمیل صورتیں، چکنی اور ملایم اشیاء یہ سب آنی اور فانی باتیں ہیں۔ آپ لذیذ سے لذیذ غذا کھایئے اس کی لذت صرف اسی وقت تک ہے جبتک نوالہ حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ مثل مشہور ہے "ہر چیز خواہ کتنی ہی لذیذ کیوں نہ ہو، حلق کے نیچے اتری اور مٹی ہو گئی"۔

پھول کی خوشبو کیسی ہی دلپذیر کیوں نہ ہو چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں رہتی۔ وعلی ہذا القیاس یہی وجہ ہے کہ ابیقور نے اپنے شاگردوں کو قناعت پاک اور سادہ زندگی بسر کرنے کا حکم دیا تھا اور وہ خود بھی اعتدال کی زندگی بسر کرتا تھا۔ خوراک کے معاملہ میں بھی وہ نہایت محتاط تھا "جَو کی روٹی اور چشمہ کا پانی" اس کی روزانہ زندگی کا آئینہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ "نانِ جوین" کی تعریف ہمارے سعدی نے بھی کی ہے۔

ابیقور کہتا ہے کہ "قناعت سب سے بڑی دولت ہے خوش و خرم رہو۔ جو میسر آئے اسکو خوشی اور رضا مندی کے ساتھ قبول کرو۔ یعنی صبر و شکر کے ساتھ کھا لو۔ مثل مشہور ہے ؎

چکنی چپڑی دیکھ کے مت للچائے جی
روکھی سوکھی کھائے کے ٹھنڈا پانی پی

دولتمند وہ نہیں جس کے پاس اشرفیاں بہت ہوں۔ بلکہ وہ جس کی ضروریات کم ہوں۔

دُکھ اور تکلیف کرب اور الم، اس دنیا سے مفقود یا معدوم نہیں ہو سکتے۔ لہذا ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ جہانتک ہو سکے ان سے دامن بچاؤ۔ اور کنارہ کرو۔ نیکی (خوبی) کی بنیاد اختیار اور عقل پر ہے اور یہ دونوں جوہر ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے، کیونکہ بغیر اختیار کے ہماری عقل۔ ایک امر مجہول بن جائیگی اور بغیر عقل کے ہماری قوت اختیار، محض اندھی ہو جائیگی (یعنی گمراہ، جس طرح اندھا آدمی راستہ بھٹک جاتا ہے) پس جملہ انسانی افعال کی خوبی یا زشتی انسان کے علم اور ارادہ پر منحصر ہے، اور فلسفیانہ تعلیم و تربیت کا واحد مقصد یہی ہونا چاہیئے۔ کہ اس کی [illegible] اور [illegible] یعنی ذہن اور ارادہ دونوں مرتبۂ تکمیل کو پہنچ جائیں یعنی اس کا دماغ صحیح فیصلہ اور اس کا ارادہ صحیح راہ کو اختیار کر سکے۔

فی الجملہ اس میں شک نہیں کہ، ابیقوریت کو، اصلاح نفس انسانی کے سلسلہ میں بہت سی مشکلات کا سامنا درپیش ہوتا ہے، وہ مشکلات یہ ہیں۔ تعصب۔ حماقت۔ جہالت اور رسوم باطلہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو فی الحقیقت عقل و ہوش اور عقل و ارادہ ذاتی سے کام لیتے ہیں۔ ورنہ عموماً جیسے دیکھو لکیر کا فقیر، رسوم اور رواج کا غلام۔ اور لوگوں کے اعتراضات باطلہ سے ڈرنے والا لیکن اخلاقی اصولوں سے "نڈر" اور بے نیاز نظر آئیگا۔ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ مذہب یا اخلاق کیا کہتا ہے بلکہ یہ کہ برادری والے کیا کہتے ہیں۔

جہالت سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں:- ایک تو وہ جہالت جو "قوانین کائنات" کے عدم واقفیت کا نتیجہ ہوتی ہے اور اسی کی وجہ سے لغو توہمات اور مہمل خیالات اور باطل عقاید پیدا ہوتے ہیں مثلاً عوارض جسمانی [illegible]

دراصل ایک بیماری یا مرض ہے۔ لیکن جو مریض لاعلمی کا شکار تھیں یا ہیں۔ وہ اس قسم کے امراض کا علاج جھاڑ پھونک سے کراتی تھیں۔ اور کراتی ہیں۔ بعض امراض کو، جن کی نوعیت و ماہیت سمجھ میں نہیں آتی جھٹ پٹ دیو بھوت آسیب چڑیل وغیرہ سے منسوب کر دیتے تھے۔ اور کر دیتے ہیں۔ اور بجائے معالجہ کرانے کے جادو منتر ٹوٹکے وغیرہ سے کام لیتے تھے اور لیتے ہیں۔ یہ اقوام آج بھی دنیا کے پردے پر موجود ہیں۔

نیز اسی جہالت کی وجہ سے بے بنیاد خوف اور امیدیں پیدا ہوتی ہیں، جو انسان کی ذہنی اور ارادی قوتوں کو کمزور کر دیتی ہیں۔ پس علم طبیعات کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ دوسری جہالت وہ ہے جو "فطرتِ انسانی" یعنی (Human nature) سے عدم واقفیت کے باعث پیدا ہوتی ہے جس کے سبب سے انسان بعض اوقات اپنے ہمجنسوں کی پرستش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور صدہا مصائب اور بے شمار مصائب کا شکار رہتا ہے۔ پس علم النفس اور قوائے ذہنیہ کے مطالعہ کی ازحد ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ تیسری قسم جہالت کی عام ہے یعنی وہ جہالت جو نوشت و خواند سے ناواقفیت کی بناء پر پیدا ہوتی ہے اور ہندوستان میں ہر جگہ (خصوصاً مسلمان عورتوں میں) پائی جاتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ جہالت ہی ہندوستانیوں کی بہت سی اخلاقی کمزوریوں کا اصلی سبب ہے۔ اور جب تک یہ وبا ہندوستان پر مسلط ہے۔ ہمارا ملک آزاد نہیں ہو سکتا۔

ابی قور کہتا ہے کہ اگرچہ کرب و الم سے حتی الوسع گریز کرنا چاہئے۔ لیکن تھوڑے دنوں کی تکلیف آگے چلکر دائمی سرور کا موجب بن جائے تو اس تکلیف کو بخوشی برداشت کر لینا چاہئے اور یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا میں تکلیف کم ہے، راحت زیادہ ہے، اور سب سے اعلیٰ لذت یہ ہے کہ انسان کو اطمینان قلبی یعنی سکون دماغی حاصل ہو جائے، اور انسان ہر قسم کے تفکرات اور ذہنی انتشار سے آزاد ہو جائے۔ موت سے ہرگز نہ ڈرنا چاہئے۔ کیونکہ "جبتک ہم جیتے ہیں، موت ہمارے پاس نہیں آسکتی۔ اور جب ہم موت کے منہ میں چلے جائینگے تو ہمارا وجود ہی باقی نہ ہوگا۔ پس مرجانے کا احساس بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ موت، احساسات کا خاتمہ کر دیتی ہے۔"

روح یا نفس ناطقہ، بقول ابیقور، ایک مادی شے ہے یعنی جسم کی طرح روح بھی مادی ہے اور مرنے کے بعد فنا ہو جاتی ہے۔ پس دیوتاؤں یا خدا کے تسلیم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر ذوق اس فلسفہ کی لذت سے خبردار ہوتے تو یہ شعر زبان پر نہ لاتے:-

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

ابی قور کہتا ہے کہ مرنے کے بعد کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ "موت" ہر شے کا خاتمہ بالخیر کر دیتی ہے نہ بانس رہیگا نہ بانسری بجیگی۔

روح کے خواص یا افعال چارگانہ ہیں۔ (۱) حرکت (۲) سکون (۳) حرارت (۴) احساس۔ جسم اور روح ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ روح کا وجود جسم کے بغیر ممکن نہیں اسی طرح جسم کا وجود روح کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

ابی قور، مادہ کو ازلی ابدی اور غیر قابل فنا مانتا ہے۔ یعنی دمقراطیسی فلسفے کا پیرو ہے۔ اسی لئے رواقی اُسے دہریہ کہتے ہیں اور میری رائے میں بالکل بجا کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص دیمقراطیسی فلسفے سے ناواقف ہو لیکن وہ بقائے روح کا قائل نہ ہو تو اُسے خدا، معاد، حشر اجساد، جزا و سزا، قیامت دوزخ اور بہشت وغیرہ پر ایمان لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

بہرکیف ابی قور نے لوگوں کو لاادریت کی تاریکی سے نکالنے کی کوشش ضرور کی اور ان کو اخلاقی راہ دکھائی۔ بلکہ اخلاقیات کی بنیاد فلسفہ پر قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس کو اس کوشش میں کامیابی اس لئے نہ ہو سکی کہ اُس نے فطرتِ انسانی کا مطالعہ کامل طور سے نہیں کیا۔ اور اس لئے جزوی صداقت ہی اُس پر آشکار ہو سکی۔ ۱۲

یوسف سلیم

شہسوار

وہ آئے جب سوارِ توسنِ ناز قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے؟ (داغ)

گلستانِ وفا کا رنگ پرداز پرستانِ ادا کا ناوک انداز

شبستانِ حیا کی شمعِ روشن نیستانِ طرب کا زمزمہ ساز

نگارستانِ دل کا نقشِ رنگیں بہارِ آرزو کا رنگِ اعجاز

فروغِ بزمِ عشرت جس کے جلوے بہارِ باغِ الفت جس کے انداز

لب اُس کے ترجمانِ رازِ الفت نگاہیں آرزوئے دل کی غمّاز

جبیں رنگینیٔ قدرت کا نقشہ تو قد رعنائیٔ فطرت کی پرواز

کہانی جس کے آگے حورِ جنت فسانہ جس کے آگے ترکِ شیراز

شباب و نور و نکہت کا سراپا جنون پرور۔ ستم انگیز۔ طنّاز

یگانہ شہسوارِ عرصۂ حُسن "وہ آئے جب سوارِ توسنِ ناز

قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے؟"

وقار (انبالوی)

شہسوار

کارلائل

رسکن

مطالعہ

مرمریں مجسمہ
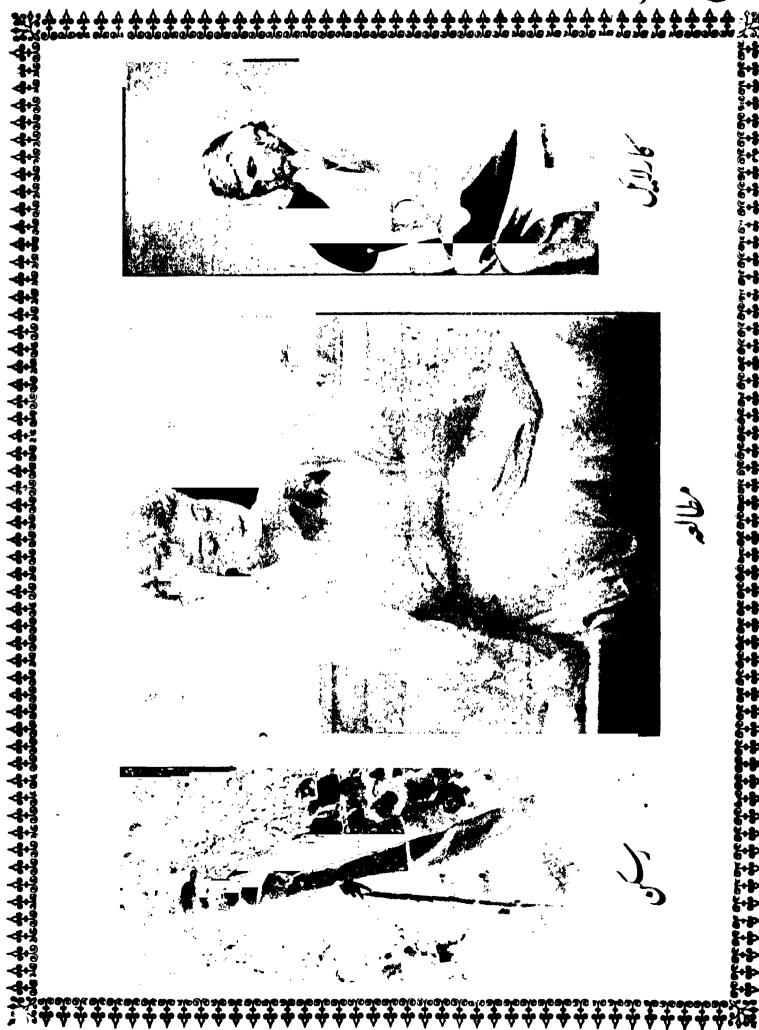
وہ چوری کے جرم میں گرفتار تھا۔ اور عدالت نے اسے ایک سال قید کا حکم سنایا تھا۔ اُس بڈھے مجرم کے اخلاق کو اور واردات کے مفصل واقعات کو سُنکر میں ششدر رہ گیا۔ میں نے اُس سے ملاقات کی اجازت حاصل کی۔ پہلے تو وہ میرے ساتھ بڑی بے اعتنائی سے پیش آیا۔ اور بات تک نہ کی۔ مگر کچھ پس و پیش کے بعد وہ اپنی سرگذشت سنانے پر آمادہ ہوگیا۔

"آپ سچ کہتے ہیں" اُس نے کہا "میں نے بھی خوشگوار دن دیکھے ہیں۔ میں نے اچھی تعلیم حاصل کی تھی۔ اور میں ایک انجنیر تھا۔ عالم شباب میں میرے پاس کافی دولت تھی۔ اور میں فرخندہ زندگی بسر کرتا تھا۔ شام کے وقت یا تو میں ناچ گھر چلا جاتا۔ اور یا کسی محفل میں بیٹھکر شراب نوشی کیا کرتا۔ وہ دن مجھے خوب یاد ہیں۔ چھوٹے چھوٹے واقعات بھی میرے دماغ میں ابھی تک محفوظ ہیں۔ لیکن با ایں ہمہ میں اپنے واقعات کے سلسلہ کی یادداشت کو مکمل نہیں کہہ سکتا۔ اس میں ایک خلا ہے۔ جس کو پُر کرنے کے لئے اپنی باقیماندہ زندگی کو میں صرف اُن باتوں کے لئے وقف کرونگا۔ جن کا لینا سے کچھ بھی تعلق ہو۔

"ہاں۔ تو جناب! اُسے لینا کہتے تھے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ وہ غریب تھی۔ لیکن وہ اپنی غریبانہ زندگی کو خوشگوار بنانے میں ہوشیار تھی۔ گویا اس کی خاص طور پر تربیت کی گئی تھی۔ وہ کھانا خود پکاتی تھی۔ لیکن اُس کے ہاتھ ایسے تھے۔ جیسے کسی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ جناب! اُس کے سادہ لباس میں ایسی کشش تھی۔ کہ ذرا سے میل جول پر دنیا اُس کی طرف خود بخود کھنچی آتی تھی۔ میں خود بھی اس سے ملنے کے بعد وہ نہ رہا ——— اور میں نے اپنی گذشتہ زندگی کی نحوست گرد کی طرح جھاڑ دی۔"

ہماری شادی ہوگئی۔ واقعات ہی ایسے ہی تھے۔ کہ وہ مجھ سے محبت کئے بغیر نہ رہ سکی۔ میں خوبصورت تھا۔ جوان تھا۔ اس کے علاوہ مختلف شعراء کا کلام بھی مجھے حفظ تھا۔ اپنی پہلی ملاقات کے واقعات کے متعلق مجھے اب کچھ یاد نہیں۔ لیکن کبھی کبھی مختلف تصویریں تاریکی کی عمیق گہرائیوں میں سے خود بخود اُبھر کر آنکھوں کے آگے کھنچ جاتی ہیں

جب کبھی ہم اکٹھے تھیٹر میں ہوتے۔ وہ خوش اور بشاش رہتی۔ یہ اُس کی خاصیت تھی، ڈرامہ کے ایک ایک لفظ سے حظ اُٹھاتی۔ اور میری طرف دیکھ کر اُس کی شیریں لبوں پر ایک ہلکا سا تبسم کھیل جاتا ——— آہ! وہ مسکراہٹ مجھے اب تک یاد ہے۔ اس کے بعد بسا اوقات ہم آپس میں مختلف جگہوں پر ملتے۔ تو وہ اپنا سر میری طرف جھکاتے ہوئے اطمینان سے کہتی "میں جانتی ہوں۔ زیادہ دیر تک یہ عیش نہ ملیگا۔ خیر کچھ حرج نہیں" مجھے وہ الفاظ اب تک یاد ہیں۔

ایک سال کے بعد میری محبت نفرت سے بدل گئی۔ میں نے اس معصوم کو تنگ کرنا شروع کیا۔ وہ کڑھ کڑھ کر مر گئی

"سالہا سال گزر گئے۔ میں نہیں بتاؤنگا۔ میں نے کن ذرائع سے اپنی زندگی بسر کی۔ لینا کے بعد درحقیقت میں نے صرف دنیاوی خواب دیکھے ——— دولت کے خواب۔ ایک دفعہ تو تقریباً پوری کامیابی جس پر میری نگاہ تھی حاصل کر چکا تھا۔ میں ہزاروں خرچ کر سکتا تھا۔ دور دراز ملکوں میں سفر کر سکتا تھا۔ میں نے پھر شادی کی۔ اور میری اولاد بھی ہوئی۔ اس کے بعد تباہی کا آغاز ہوا۔ میری تمام تجویزیں ناکام رہیں۔ میری بیوی مر گئی۔ بچوں کو اکیلا دیکھکر میں نے ان سب کو رشتہ داروں کے پاس بھیجدیا۔ اور اب خدا مجھے معاف کرے! مجھے یہ بھی علم نہیں کہ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں جیسا کہ آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میں ہر وقت شراب نوشی اور جوئے میں مشغول رہنے لگا....

میں نے ایک ایجنسی جاری کی۔ مگر وہ بھی کامیاب نہ ہوئی۔ اس میں میری تمام باقیماندہ دولت اور طاقت بھی ضائع ہوگئی۔ میں نے جوئے کے ذریعے ترقی چاہی۔ مگر قید ہوتے ہوتے بال بال بچا ——— یہ سب کچھ بلا سبب نہ تھا۔ دوست میرے مخالف ہو گئے۔ اور یوں میری تباہی شروع ہوئی۔"

"رفتہ رفتہ میں اس خستہ حالت پر پہنچا جس میں آپ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ دراصل میں ادبی مجلسوں سے نکل کر پستی کی تاریک گہرائیوں میں گر گیا۔ غلیظ لباس اور کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے میں کس جگہ جانے کی جرأت کر سکتا تھا؟ پچھلے چند سال میں مہینوں تک

بغیر شراب کے مختلف کارخانوں میں مزدور کے طور پر کام کر رہا ہوں۔ اور جب کبھی میں شراب کے لئے نکلتا۔ تو سیدھا شہر کے مشہور قمار خانوں کا رخ کرتا۔ ان تمام لوگوں کو جو راستے میں مجھ سے دوچار ہوتے میں نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھتا۔ اور ہمیشہ اسی وہم میں رہتا۔ کہ خوبیٔ قسمت سے میں جلد ہی ایک بار پھر امیر ہو جاؤں گا۔ میں کسی طرح کی غیر منقولہ جائیداد یا ایسی ہی کسی اور بات کا امیدوار رہتا۔ اور اسی لئے مجھے اپنے ساتھیوں سے نفرت تھی۔ کہ وہ اس قسم کی امید کو محض ہیچ خیال کرتے تھے۔

"خیر ایک دن بھوک اور شدتِ سردی سے کانپتا ہوا میں ایک مکان میں بلاوجہ اور بے دھڑک جا داخل ہوا۔ میرے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا: " باورچی نے چلا کر پوچھا "کیا تم لوہار ہو؟"

میں نے جواب دیا "ہاں میں لوہار ہوں" انہیں ایک میز کے تالے کی مرمت کے لئے کسی کی تلاش تھی۔ میں اردگرد لٹکی ہوئی تصویروں کے دیکھنے میں محو ہو گیا۔ میں نے کام شروع کیا۔ اور ان کی حسبِ منشاء مکمل کر دیا۔ گھر کی مالکہ نے مجھے کچھ نقدی عطا کی۔ جسے میں نے بلا پس و پیش قبول کیا۔ میری نگاہ اچانک ایک ستون پر پڑی۔ جس پہ سنگِ مرمر کا ایک بت پڑا ہوا تھا۔ پہلے پہل مجھ پر غشی طاری ہونے لگی ——— خدا جانے کیوں؟ میں غور سے اس کی طرف تکتا رہا .... کیا یہ لینا نہیں؟ ——— اور میں باور نہ کر سکا۔

"جناب! میں کہتا ہوں۔ میں لینا کو بالکل بھول چکا تھا اور اس دن پہلی مرتبہ میں سمجھا۔ کہ میں نے اسے واقعی بھلا دیا ہے۔ یکایک اس کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ مردہ جذبات اور خواب و خیال جو مدت سے میرے پہلو میں دفن ہو چکے تھے۔ جیسے کسی سمندر کی گہرائیوں میں غرق ہو چکے ہوں۔ ایک دفعہ پھر سلگ کر بھڑک اٹھے۔ میں نے لرزتے ہوئے اس بت کو دیکھا۔ اور پوچھا "معزز خاتون! کیا میں جان سکتا ہوں۔ کہ یہ مجسمہ کس کا ہے؟"

"اوہ" ۔ اس نے جواب دیا۔ "یہ بڑی قیمتی چیز ہے۔ اسے پانچ سو سال پہلے پندرھویں صدی میں تیار کیا گیا تھا۔"

اُس نے سنگ تراش کا نام بھی لیا۔ لیکن میں اچھی طرح سے سمجھ نہ سکا۔ اُس نے بتایا۔ کہ اُس کا خاوند کافی عرصہ تک اٹلی اور روس کے مشیرانِ خاص سے خط و کتابت کے بعد اسے اٹلی سے ہمراہ لایا تھا۔

لیکن "اُس نے کہا" تم شاید اسے پسند نہیں کرتے۔ تمہارا مذاق بھی موجودہ زمانہ کے مطابق ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں۔ نہ تو کان اپنی اصلی جگہ پر ہیں۔ اور نہ ہی ناک موزوں طریقہ سے بنایا گیا ہے...........؟" افسوس! بس اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔

"میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ یہ صرف شباہت ہی نہ تھی۔ بلکہ ہو بہو اُس کی اصلی تصویر تھی ——— بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ——— یہ پتھر کی صورت میں زندگی کے لئے تفریح کا سامان تھا۔ بتائیے! کس کرامات کی بنا پر ایک صناع نے پندرھویں صدی میں ہو بہو وہی نازک کان۔ دلکش آنکھیں۔ وہی غیر موزوں ناک اور پھر وہی اونچی ڈھلوان پیشانی تخلیق کی جس سے میں خوب واقف ہوں۔ دنیا میں دو مختلف وقتوں میں بالکل ایک جیسی عورتیں کس طرح پیدا ہونگی ——— ایک پندرھویں صدی میں۔ دوسری موجودہ وقت میں؟

"وہ دن میری تمام باقیماندہ زندگی کے تغیر کا باعث ہو گیا۔ میں اپنے گذشتہ کمینہ پن اور اپنی تباہی کے اسباب کو بخوبی جان گیا۔ میں اب سمجھا۔ کہ لینا ایک فرشتہ تھی۔ جو خوبیٔ قسمت سے مجھے عطا ہوئی اور جس کی میں نے قدر نہ کی۔ گذرے ہوئے زمانہ کا واپس لانا ناممکن تھا۔ لیکن ——— جس طرح کوئی قیمتی برتن کے ٹوٹے ہوئے بکھرے پڑے ٹکڑوں کو بڑی احتیاط سے جمع کرے ——— میں نے بھی اپنے اور لینا کے مابین گذرے ہوئے تمام واقعات کو جمع کرنا شروع کیا۔ وہ چند ایک تھے۔ میں نے کوشش کی۔ مگر مفصل نہ سمجھ سکا۔ تمام کے تمام مختلف جزو تھے۔ لیکن جب کبھی مجھے کوئی نئی گزشتہ بات یاد آ جاتی۔ تو میرے دل کو بڑی فرحت حاصل ہوتی۔ ان باتوں کی سوچ اور غور و فکر میں مجھے گھڑیاں گذر جاتیں۔ لوگ مجھ پر ہنستے۔ لیکن میں خوش تھا۔ میں بوڑھا تھا۔ میرے لئے از سرِ نو زندگی حاصل کرنا ناممکن تھا۔ پھر بھی میں اپنے نفس کو پراگندہ خیالات سے پاک کر سکتا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو حسد کی نظر سے دیکھنا ترک کر دیا۔ اپنے خالق کی بابت ہر قسم کی شکائتوں سے اپنی زبان روک لی۔ اور اس تبدیلی کی وجوہات کا لُبِ لباب صرف لینا کی یاد تھی:

"میرے دل میں اُس بت کو ایک بار اور دیکھنے کی تڑپ تھی۔ میں ساری ساری شام اُس مکان کے گرد سرگرداں پھرتا رہتا۔ میری تمام کی تمام کوشش صرف اُس بت کو دیکھنے میں ہی صرف ہوتی۔ افسوس! وہ کھڑکیوں سے بہت دور کافی فاصلے پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے گھر کے سامنے کئی راتیں گذار دیں۔ گھر کے ایک نوکر سے میں

دوستانہ تعلقات بھی پیدا ہو گئے۔ موسم گرما میں گھر کی مالکہ چند دن کے لئے کہیں چلی گئی۔ اب اپنی خواہش کا مقابلہ کرنا میری برداشت سے باہر تھا۔ میرا خیال تھا۔ کہ اگر میں صرف ایک دفعہ پھر لینا کا بُت دیکھ لوں۔ تو تمام واقعات شروع سے لیکر آخر تک روشن ہوجائینگے۔ اور یہ میرے لئے انتہائی مسرت اور تسکین کا باعث ہوگا۔ آخر میں نے وہ کام کرنے کا جسکی وجہ سے میں قید ہوا ہوں۔ فیصلہ کرلیا۔ آپ کو علم ہے۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اُنہوں نے مجھے ہال کمرے ہی میں گرفتار کرلیا۔ اور عدالت میں یہ بیان دیا گیا کہ میں لوہار کے بھیس میں کئی مرتبہ گھر کے اردگرد دیکھا گیا ہوں.....

.......گو دراصل میں فقیر تھا۔ تاہم جناب میری کہانی اب ختم ہوچکی ہے"۔

"مگر ہم تمہارے لئے اپیل دائر کریں گے۔ تم بری کر دئے جاؤ گے"۔

اُس نے پوچھا۔ "لیکن کیوں؟۔ نہ تو میری سزا پر کسی کو رنج ہے۔ اور نہ ہی میری ضمانت کے لئے کوئی تیار ہوگا۔ لینا کی یاد میرا مدعا ہے۔ سو خواہ کسی رہائشی مکان میں رہوں۔ یا قید خانے میں ——— میرے لئے یکساں ہے"۔

میں نہ سمجھ سکا کہ کیا جواب دوں لیکن اُس نے اُسی طرح مایوس نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے سلسلۂ کلام کو جاری رکھا۔

"صرف ایک بات مجھے پریشان کرتی ہے۔ وہ یہ کہ ممکن ہے لینا اس دنیا میں آئی ہی نہ ہو۔ اور یہ محض کثرتِ شراب نوشی سے میرے کمزور دماغ ہی کی اختراع ہو۔" میں نے کہ کھڑے کھڑے اُس بُت کی طرف دیکھتے ہوئے یہ افسانہ تیار کیا ——— تو پھر ———؟"

(ترجمہ) شریف احمد بی۔اے

غزل

جنون و عقل کو گرمِ ستیز کرتا جا ۔ رگِ حیات کی لرزش کو تیز کرتا جا

جلالِ حسن سے دامن میں بجلیاں بھر لے کمالِ عشق کو ہنگامہ خیز کرتا جا

شرارِ عشق سے شمعِ حیات روشن کر گلِ یقین کو یُوں شعلہ ریز کرتا جا

سکونِ دہر میں ہیجان و جوش برپا کر نشاطِ امن و سکون سے گریز کرتا جا

ربابِ شوق کو پھر نغمہ بار کر شاطر
چراغِ عشق کو پھر جلوہ ریز کرتا جا

(غیر مطبوعہ) شاطر (غزنوی)

نغمۂ خاموش

(یعنی محاکات، حسنِ صوت یا اظہارِ وقوع متعلق الفاظ اور انکی ترتیب)

فنِ تحریر کا وجود شکلوں کی نقل سے ہوا جس کا ثبوت قدیم مصر کے منشکل نقوش[1] ہیں۔ اس صوری رسم الخط کے بعد حروف[2] کا وجود ہوا جو کسی نہ کسی آواز کو ظاہر کرتے ہیں، حروف کی ترکیب سے الفاظ بنے جو مظاہرِ جذبات واسالیب خیالات ہوئے۔ لیکن بعض الفاظ گنجینۂ معانی ہونے کے علاوہ کسی نہ کسی آواز کی بازگشت بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح الفاظ "آواز" کے بھی قائم مقام ہیں۔ ایسے لفظوں میں ایک خاص بات یہ ہوتی ہے کہ وہ اصطلاح واشتقاق سے بالکل مبرا ہوتے ہیں۔ نہ اُن کا مادہ کسی مصدر سے نکالا جا سکتا ہے، نہ اُن کو حقیقی و مجازی معنوں کے اعتبار سے منقسم کیا جا سکتا ہے۔ البتہ قواعدِ زبان میں وہ صنائع بدائع کی ایک قسم ہو سکتے ہیں جس کو ہم "تجنیسِ صوت" کہیں گے لیکن چونکہ صنائع بدائع کا تعلق عموماً علم عروض سے ہے۔ اس لئے اگر آواز ظاہر کرنے والے الفاظ کی ترتیب سے شعر میں کوئی دلفریبی پیدا ہو تو اُس شعر میں اُن الفاظ کو تجنیسِ صوت سے متعلق کہا جائیگا۔ بالفاظ دیگر حروف کی وہ ترکیب جو لفظوں کو کسی آواز کا قائم مقام ثابت کرے اور اس ترکیب سے نظم ونثر میں دلفریبی پیدا ہو تو ایسے الفاظ "حسنِ محاکات" کی بنا پر تجنیسِ صوت سے متعلق کہے جائینگے۔ کیونکہ وہ الفاظ جو کسی قسم کی آواز کو گراموفون کے "ریکارڈ" کی طرح ادا کریں وہ آواز ہی کی ایک جنس ہیں۔

* * * * * * * * * * * * * * *

الفاظ جو محض عکس صوت یا آواز کی بازگشت ہیں عموماً بے معنی ہوا کرتے ہیں یا یوں کہئے کہ جس آواز کو وہ ظاہر کریں وہی ان کا مفہوم ہے۔ مثلاً: "کھما کا" - "دھماکا" - "کڑاک" - "گرج" - "چیخ" - "چرچراہٹ" "ٹن ٹن" اور "سن سن" وغیرہ - البتہ ان میں سے بعض ایسے الفاظ بھی ہوتے ہیں جو گو معنی نہیں رکھتے مگر اُن کا کوئی نہ کوئی نمایاں مفہوم ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً: "دت" (کتے سے)۔ "ہُش" (چڑیا سے) "ہلا" (بکری سے)۔ اسی طرح "چون چون" - "چیں چیں" - "قاقا" - "تیں تیں" وغیرہ حتیٰ کہ خود بولنے والے کی آواز کبھی کبھی اُس کا نام ہو جاتی ہے مثلاً: - "ٹٹہری" - "میمنا" - "پٹاخہ" - "گھنٹی" اور "ڈھول" وغیرہ۔ لیکن بعض الفاظ بامعنی بھی ہوتے ہیں - مثلاً "ہو کا عالم" - "سنسان" - "گھمسان" - "گپ چپ" - "گم سُم" - "غپ شپ" اور "چہل پہل" وغیرہ - اور ان بامعنی الفاظ کی تحت میں وہ الفاظ بھی آسکتے ہیں جو عکس صوت یا آواز بازگشت نہیں ہیں مگر اپنے مفہوم کی بولتی ہوئی تصویر کہے جاسکتے ہیں - مثلاً "چٹکی" - "بکوٹا" - "پنپنا" "منہ چڑانا" "پھاڑنا" - "چیرنا" وغیرہ - لیکن ان تعجب ومسرت اور خوشی وغمی کے اشاروں کا ذکر بھی یہاں غیر مناسب نہ ہوگا جو تقریر میں تو آتے ہیں مگر تحریر میں بہت کم مستعمل ہیں یا بالکل نہیں مثلاً "اونہہ"[1] (یعنی اظہارِ بے توجہی)، "آہاہا" (اظہارِ مسرت) "چہ چہ چہ" (اظہارِ تاسف)، "ہاہا" "ہوہو" - "ہی ہی" - "کھی کھی" - "قہ قہہ" اور "اف اف" وغیرہ - دورِ جدید میں "ڈراما" اور "ناول" لکھنے والے اس قسم کے الفاظ بھی حدودِ قوسین (بریکٹ) میں بطورِ اظہارِ جذبات لکھتے ہیں۔

ان کے علاوہ چند ایسے الفاظ بھی جو قدیم اردو شاعری میں مستعمل تھے مگر اب متروک ہیں - اظہارِ نزاکت کا ذریعہ ہو سکتے ہیں - مثلاً "ٹک" اور "ٹک" میر صاحب کا مشہور شعر ہے۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

---

[1] یعنی "نقوشِ مقدس" Hieroglyphic Inscriptions

[2] حروف کا وجود قدیم ایرانی رسم الخط کے ارتقاء سے ہوا - یہ رسم الخط "خطوطِ نقشی" یعنی مخروطی شکل کے نقشوں سے ترتیب دیا گیا تھا۔ یہ "خطوطِ مخروطی" انگریزی میں Cuneiform Inscriptions کہلاتے ہیں

[1] "اونہہ" پر مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے ایک علیحدہ مضمون بھی لکھا ہے۔

دیگر ؎

اے عشق بے محابا تو نے تو جان ماری
ٹک حسن کی طرف ہو کیا کیا جوان مارے

حالیؔ مرحوم کو ایسے الفاظ سے موافقت نہ تھی اور وہ خواہاں تھے کہ اس قسم کے نازک الفاظ ترک نہ کئے جائیں۔ وہ خود بھی اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کرتے تھے مثلاً ؎

اے جہان اے روشِ تازہ بدلنے والے
نت نئی چال نئی ڈھال سے چلنے والے
آج کچھ اور ہے کل اور تھی کچھ شان تری
ایک سے ایک نہیں ملتی کوئی آن تری

نزاکتِ بیان سے متعلق یہ الفاظ بامعنی ہیں :۔ "ٹک" معنی "ذرا"۔ "نت" معنی "ہمیشہ"۔

غرض آواز کو ظاہر کرنے الفاظ کی دو بڑی قسمیں ہو سکتی ہیں:۔

(۱) بہ اعتبار ساخت، آواز ظاہر کرنے والے الفاظ یا تو مفرد ہوتے ہیں یا مرکب یعنی وہ یا تو بذات خود ایک لفظ ہوتے ہیں۔ یا کسی دوسرے لفظ سے ملکر ایک لفظ کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً "قند" مفرد ہے "قلاقند" مرکب۔ "موتی" مفرد ہے۔ "موتی چور" مرکب۔ لیکن آواز ظاہر کرنے والے الفاظ زیادہ تر مفرد ہی ہوتے ہیں۔ اور جو مرکب ہوتے ہیں اُن کی ساخت دلچسپی سے خالی نہیں کیونکہ ان کی ترکیب کسی دوسرے لفظ کے ملنے پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ صرف دو ہمنوا لفظوں کی تکرار پر اور یہ تکرار[1] بھی کئی ترکیبوں پر مشتمل ہے۔ مثلاً "قُل قُل" جو صراحی کی آواز ہے۔ "صرصر" یعنی ہوا کیونکہ یہ لفظ ہوا کی روانی کو ظاہر کرتا ہے۔ اور "دلدل" جو ایک قسم کی عمیق کیچڑ[2] کا نام ہے۔ یا ایسے ٹکڑوں کی ترکیب جو ہمنوا تو ہوں مگر ہمشکل نہ ہوں جیسے "گڑبڑ" (یعنی شورش)، "دھم دھم" (باجے کی آواز) اور "گھما گھم" "چھما چھم" وغیرہ۔ یا ایسے الفاظ جو بظاہر فقرہ ہیں اور ان کی ساخت دو دو ٹکڑوں کی دو ہم شکل و ہم نوا ترکیبوں پر مبنی ہے۔ مثلاً آہ، واہ، حیف اور ہائے وائے وغیرہ۔ یا الفاظ جو بالکل مختلف ٹکڑوں کی ساخت سے فقروں کی شکل میں مستعمل ہوئے ہیں جیسے "دھما چوکڑی" اور "اچک بچاند" وغیرہ۔

(۲) بہ اعتبار مفہوم آواز کو ظاہر کرنے والے الفاظ یا تو کسی جذبہ کو ظاہر کرتے ہیں مثلاً آہ، واہ، حیف اور ہائے وائے وغیرہ۔ یا کسی جانور کی آواز ہوتے ہیں مثلاً دہاڑنا۔ بھونکنا۔ کائیں کائیں اور کوکو وغیرہ۔ پنجروں میں طوطا "میں میں" کرتا ہے۔ تیتر "پٹھیو پٹھیو" کہتا ہے۔ اور بٹیر "فٹ فٹ، فٹ فٹ" کیا کرتی ہے۔ مولانائے روم نے تو پرندوں کی آواز ظاہر کرنے والے الفاظ سے آیۂ "تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ" کی تفسیر بھی بیان کر دی ہے ؎

اے مطربِ خوش قاقا تو قی قی دمن قوقو
تو دق دق دمن حق حق تو ہی ہی دمن ہوہو
اے شاخِ درختِ گل اے ناطقِ امرِ کُل
تو کبک صفت بوبو من فاختہ سان کوکو

مفہوم کی تحت میں ایسے الفاظ کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے جو کسی آواز کا گراموفون نہیں بلکہ اصل کی نقل ہیں۔ یعنی اصل کی پوری پوری تصویر کا اندازہ اُن الفاظ کے بولنے سے ہو جاتا ہے۔ مثلاً:۔

شفاف۔ دھندلا۔ گھٹا اور اندھیرا گھُپ۔

تصویر واقعہ اور عکسِ صورت ظاہر کرنے والے الفاظ خواہ اُن کا تعلق سامعہ سے ہو خواہ باصرہ سے حضرت امیر خسروؔ سے بڑھکر شاید ہی کسی نے استعمال کئے ہوں۔ اہل ادب اب بھی کسی نقارخانہ سے "خانہ بر و خانہ برو" کی آواز سُن سکتے ہیں۔ اور دُھنیوں کی دکان سے ہر وقت "اینہم رفت و آنہم رفت" کی آوازیں سنی جا سکتی ہیں۔ ہر لفظ کی آواز اپنے لئے مخصوص حیثیت رکھتی ہے مثلاً پانی سے متعلق آواز لفظ "موسلا دھار" سے ظاہر ہے۔ اسی طرح آگ سے شعلے بلند ہوتے ہیں۔ ہوا کے جھونکے چلتے ہیں۔ خاک اڑ کر آسمان کو "دھندلا" کر دیتی ہے اور ٹھنڈی ہوا سے سبزہ "لہلہانے" لگتا ہے۔

آواز اور صورتِ واقعہ ظاہر کرنے والے الفاظ غیر زبانوں سے بھی حاصل کر لئے جاتے ہیں۔ مثلاً عربی سے "زق رق و بق بق"، ہندی سے تو نہیں معلوم کتنے ایسے الفاظ اردو میں مستعمل ہیں مثلاً "کڑاک"، "چمک"، "دھماکا"، "ڈھول" اور "اودھم" وغیرہ۔ اب انگریزی زبان سے بھی کئی الفاظ اردو میں آ گئے ہیں مثلاً "پف" (یعنی پھونک)، "کلیپ انگ" (یعنی تالیاں بجانا۔ خوشی کے وقت "چیرز" دئے جاتے ہیں۔ عزت دلانے کو "شیم" کہا جاتا ہے۔

---

[1] یہ خیال رہے کہ یہ ترکیب محض لفظی ہے۔ معنوی نہیں۔
[2] یا دریکیچ

لیکن بجائے اس کے کہ اصل انگریزی الفاظ مستعمل ہوں اُن کی نقل بنا لی گئی ہے۔ یعنی ایسے الفاظ زبان زدِ عام ہوگئے ہیں جن سے انگریزیت تو ظاہر ہے۔ مگر ان کو انگریزی زبان سے کوئی واسطہ نہیں نہ وہ کسی مستند ترکیب پر مبنی ہیں مثلاً :-

[1] "سٹریل" (یعنی خراب) "ڈیلوکاٹ" (یعنی بہت بڑا) اسی طرح "ڈبل" سے ڈبل روٹی وغیرہ۔

حُسنِ صوت ظاہر کرنے والے الفاظ جب نظم و نثر میں کسی سامعہ نواز ترتیب سے ظاہر ہوں تو ان کو اظہارِ واقعہ کی تصویر ہی نہیں بلکہ بولتی تصویر سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ انکی امداد سے شاعر اشعار میں نغمہ یا ترنم ظاہر کر سکتا ہے۔ ایسے ترنم کی مثال جو آواز پر مبنی ہو قاآنی کے مندرجہ ذیل اشعار ہیں۔ ؎

بچنگ بستہ چنگہا بنائے بستہ زنگہا
چکاوہا، کلنگہا، تدروہا، ہزارہا
بنائے خویش فاختہ دو صد اصول ساختہ
ترانہا نواختہ چو زیر و بم تارہا

ان اشعار میں نون غنہ کا ترنم اور "فاختہ" و "نواختہ" قابل غور ہیں۔ آخری مصرعہ میں "تم" "مشدد" نے تو کمال ہی کر دیا ہے۔ اسی طرح موسمِ بہار میں جنگل کی چہل پہل کا اظہار اس مصرعہ سے کیا ہے۔

ع "صدائے ہائے ہوئے ہے زہر سوئے ہزار آید"

علاوہ ان اشعار کے عندلیب کی مندرجہ ذیل غزل بھی نغمۂ خاموش کی نمایاں مثال ہے۔ ؎

زلفِ تو سنبل آمدہ گونۂ تو سمن سمن
گشتہ ز سنبل و سمن عارض تو چمن چمن
جعدِ تو دام راہِ دل گر نبود چرا بود
طرّہ بہ طرّہ خم بہ خم چنبر و چین شکن شکن
از لب و از دہانِ تو مصرو یمن شکستہ شد
شہدِ فرنت شکر شکر لعلِ لبت یمن یمن
مشکِ ختن شکستہ بہ وصفِ بچین نگفتہ بہ
موئے تو شد چو چین بہ چین روئے تو شد ختن ختن

اردو زبان میں ابھی لٹریچر کا دائرۂ اقتدار اتنا وسیع نہیں کہ ایسی مثالیں کثرت سے مل سکیں۔ پھر بھی بہت کچھ ہے خصوصاً انیس و دبیر کے کلام میں تو کثرت سے ایسی مثالیں ملیں گی۔ مثلاً (انیس) ؎

نقارۂ وغا پہ لگی چوب یک بیک
اٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگا فلک
شہپور کی صدا سے ہراساں ہوئی ملک
قرنا پھنکی کہ گونج اٹھا دشت دور تک
شور و دہل سے حشر تھا افلاک کے تلے
مردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

مندرجہ بالا بند میں الفاظ "نقارہ" "وغا" "غریو" "شہپور" اور "دہل" قابلِ توجہ ہیں۔ کیونکہ انہیں سے آواز کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح مرزا دبیر کا ایک شعر ہے ؎

تیزیِ تپِ تیغ نے بخشی نئی خفت
چین بہ جبین چین بہ جبین پشت بہ جبت

موجودہ اردو نظم میں بھی اس قسم کی جدتیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ مثالِ ذیل سے انکا اندازہ ہوگا ؎

جھن من جھن جھن جھنکار
تن من دھن سے منہ موڑیں رشتہ دنیا سے توڑیں
ہوکر دنیا سے بیزار پیار کریں آ مل کر پیار
جھن من جھن من جھن جھنکار
جھن من جھن من جھن جھنکار[1]

آواز ظاہر کرنے کے علاوہ واقعہ کی تصویر کھینچنے والے اشعار جن کو حسنِ محاکات کی بنا پر تجنیسِ صوت کی تحت میں شمار کرنا چاہیئے اردو میں کلامِ انیس سے زیادہ کہیں نہ ملیں گے مثلاً :-

فوج کی آمد:

اُمڈی ہوئی تھی فوج پہ فوج اور دَل پہ دَل
تھے برچھیوں کے صورتِ مقراض پھل پہ پھل
خنجر وہ جنکی آب میں تھی تلخیِ اجل
وہ گرز جن کے ڈر سے گری دیو منہ کے بل
ڈھالیں تھیں یوں سروں پہ سوارانِ شام کے
صحرا میں جیسے آئے گھٹا جھوم جھام کے

گھوڑا:

سمٹا۔ جما۔ اُڑا۔ اِدھر آیا اُدھر گیا
چمکا۔ پھرا۔ جمال دکھایا ٹھہر گیا
تیروں سے اڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا
برہم کیا صفوں کو پرے سے گزر گیا
جو آ گیا قدم کے تلے گرد برد تھا
چھل بل غضب کے تھے کہ چھلاوہ بھی گرد تھا

[1] ہندی الفاظ ہے ——— د

[1] از ہمایوں لاہور

تلوار کی

چمکی - گری - اٹھی - ادھر آئی ادھر گئی
خالی گئے پرے تو صفیں خون میں بھر گئی
کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی
ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اتر گئی

غل رن میں تھا یہ کیا ہے جو قہر صمد نہیں
ایسا تو رودِ نیل میں بھی جزر و مد نہیں

ہندی نظم میں اظہارِ واقعہ سے متعلق اشعار غالباً دنیا کی تمام زبانوں سے زیادہ ملیں گے - مثلاً برسات کی اندھیری رات اور ننھی ننھی بوندیں گرنے کا فوٹو اس سے بڑھکر کیا ہو سکتا ہے ؎

رین اندھیری تال کنارے مرلا جھنکارے، بادل کارے
بوندیاں پڑیں چھنیاں چھنیاں جھولا کن ڈار دے امریاں[1]

دوسرا ساون ملاحظہ ہو ؎

رم جھم رس کی دھار برسے آنند منگن اکھل جگ برسے
موہ من ترسے نیدنان برسے
سندر گھنشام کنہائی ؏
گھماری گھماری گھن گھٹا گھر آئی

ان ترانوں میں الفاظ "رم جھم رس کی دھارا" اور "چھنیاں چھنیاں" قابل توجہ ہیں - اور آخری کڑی تو گھٹا کی گھور گرج بھی ظاہر کرتی ہے -

الغرض فارسی، ہندی اور انگریزی وغیرہ کے اثر سے تجنیسِ صوت کا اردو زبان میں بھی کافی دخل ہو گیا ہے - مگر سخت تعجب ہے کہ کسی قواعدداں نے اس کی طرف غور نہ کیا - گو" اردو زبان کے قواعد جو فارسی پر مبنی ہیں اب انگلش گریمر کی تقلید پر بھی لکھے گئے ہیں - اور چونکہ انگریزی میں صنعتِ (Onomatopoeia) کی تحت میں تجنیس صوت پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے - اس لئے اردو میں بھی کم از کم تقلیداً اس کا ہونا ضروری تھا -

نظم کی خوبی ترتیبِ الفاظ میں ہے اور الفاظ کی خوبی حروف کی دلفریب ترکیب پر - اگر الفاظ اظہارِ آواز اور اظہارِ واقعہ سے متعلق ہیں تو ان کی مناسب ترتیب سے نظم بھی نمونۂ کمال ثابت ہوتی ہے - اور الفاظ کی دلفریب مناسبت اسی وقت ممکن ہے جبکہ وہ یکساں حیثیت رکھتے ہوں ساں کی آواز میں بہ لحاظ مفہوم موافقت ہو اور ساتھ ہی ساتھ عام فہم بھی ہوں - یہ نہیں کہ بلا ضرورت ایک لفظ تو ایران کا ہے دوسرا توران کا - ایک رعد کی گرج ظاہر کرتا ہے - دوسری بانسری کی آواز - یا اُن میں سے کوئی ایسا ہے کہ اس کے معنی بغیر غیاث اللغات دیکھے سمجھ میں نہیں آسکتے -

مشہور فلسفی و مورخ علامۂ ابنِ خلدون[2] نے لکھا ہے کہ "نظم و نثر لکھنے کا فن، الفاظ کی ترتیب پر مبنی ہے نہ کہ خیالات پر - خیالات تو خود بخود پیدا ہوتے ہیں - مگر اُن کو ظاہر کرنے کے لئے ایسے اسالیب کی ضرورت ہے جو خیالات سے مناسبت و موافقت رکھ سکیں - مئے ناب کے لئے ساغرِ زریں ہونا چاہیئے - اور گدلے پانی کے لئے ایک ٹھیکرا ہی کافی ہے "

آخر میں یہ ظاہر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "نغمۂ خاموش" جو دو متضاد مفہوم ظاہر کرتا ہے - صرف بہ لحاظ مطالعہ "خاموش" کہا جا سکتا ہے کیونکہ "باصرہ" کے ذریعہ سے الفاظ سامعہ کو بھی پُر لطف معلوم ہوتے ہیں - یعنی زور سے پڑھے بغیر صرف مطالعہ ہی کرنے پر وہ الفاظ سامعہ نواز ہوتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ رزمیہ شاعری کا مطالعہ ہمارے دل میں جوش و خروش پیدا کرتا ہے - اور بہاریہ اشعار کے مطالعہ سے خود اپنے آپ گانے کو جی چاہتا ہے - بس مطالعہ کی خصوصیت کو مدِ نظر رکھکر اظہارِ آواز اور اظہار واقعہ سے متعلق الفاظ و اشعار کو "نغمۂ خاموش" کہا گیا کیونکہ زور سے پڑھنے پر ہر "نغمہ" نغمہ ہے - مگر "خاموش" نہیں -

سید مقبول حسین احمدپوری

---

[1] ماخوذ از پھول والوں کی سیر

[2] "Tunis میں پیدا ہوئے (۱۳۳۲ء) اور قاہرہ میں وفات پائی - (۱۴۰۶ء)"
Browns History of Persian Literature

تیمور لنگ

ہریچند میرا بچپن کا دوست تھا جس زمانے میں ہم دونوں ہندی مڈل کلاس میں پڑھتے تھے۔ ہمیں دلی دربار دیکھنے کا موقع ملا، وہاں ہم نے مغربی تہذیب کی روشنی میں ہندوستان کے اسٹیج پر ہندوستانیوں کا پارٹ دیکھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہم دونوں زندگی کے متعدد نشیب و فراز جھیلتے ہوئے ایک مرہٹی تھیٹریکل کمپنی میں ملازم ہو گئے۔

میں اس کمپنی کا ڈرامہ نگار تھا۔ اور ہریچند اس کا چیف ایکٹر۔ انسان کے تمام جذبات پر اس کو کامل عبور حاصل تھا۔ یہی اس کی کامیابی تھی، اسٹیج پر وہ اپنے آپ کو بالکل فراموش کر سکتا تھا۔ یہی اسکی کامیابی کا راز تھا۔

ہریچند کی اس کامیابی کو کچھ اس کے ساتھی دیکھ نہ سکے۔ اُن کی متفقہ کوششیں اس کی ممتاز شخصیت کو نقصان پہنچانے کے لئے بار بار بروئے کار آئیں اور ہر بار ناکام ہو کر رہ گئیں۔ بالآخر وہ ایک رات نہایت کمینہ حرکت پر اُتر آئے۔ سنیچر کی سنہری رات تھی۔ اور اس رات میرا ایک مذاقیہ ڈرامہ شروع ہونے والا تھا۔ کسی ڈرامے کی پہلی رات جتنی جوش انگیز ہوتی ہے اتنی ہی تردد انگیز بھی ہوتی ہے۔ ڈرامے کا فیل ہونا کمپنی کے مالک کے نقصان اور میری بدنامی کا باعث تھا۔ میں نے ڈراما کے لکھنے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ تصویر کار نے پوری توجہ اور دلچسپی سے پردے تیار کئے تھے۔ گانے کے استاد نے کامل شوق اور حوصلے سے دلکش راگوں میں گانوں کو ترتیب دیا تھا۔ اس پر چیف ایکٹر تھا میرا دوست ہریچند،

جس حقیقت کو مدنظر رکھ کر میں نے ڈراما لکھا تھا ہریچند اس کی تصویر کھینچ کے دکھا دیتا تھا۔ چنانچہ گرانڈ ریہرسل میں ہمارے حریفوں نے بھی دبی زبان سے اعتراف کر لیا تھا کہ یہ ڈراما میرے اور ہریچند کے کمال کو اسٹیج کی تاریخ کے اوراق پر ثبت کر دیگا۔

ساڑھے نو بجے تماشے کی تیسری گھنٹی بجی۔ پہلے حصے کا پہلا سین شروع ہوا۔ ہریچند تقریباً سو فیٹ بلند پہاڑی چٹان پر کھڑا ہے۔ نیچے سے ایک عورت کی فریاد کانوں میں پہنچتی ہے۔ دیکھا ہر تو ڈاکو ایک تنہا عورت کے زیور چھین رہا ہے، وہ دفعتہً اوپر سے کودتا ہے مگر؟

۔۔۔۔۔۔ اس عورت کی مدد کرنے کے بجائے خود بیساختہ چیخ اٹھتا ہے۔ ڈاکو عورت کو چھوڑ کر ہریچند کی مدد کو دوڑتا ہے۔

تماشائیوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اس لئے وہ بالکل خاموش رہے لیکن میں سمجھ گیا۔ ایک طرف سے میں اور دوسری طرف سے مینجر دونوں اسٹیج میں کود سے اور ہریچند کو اندر لیجا کر دیکھا۔ اس کے ایک پاؤں میں لوہے کی ایک لمبی تیز کیل چبھ جانے سے نالی کی طرح خون جاری تھا۔ ہری چند نے مجھے پُر درد لہجہ میں کہا ـــــ کسی نے قصداً یہ کارروائی کی ہے۔" اس کے بعد وہ بیہوش ہو گیا۔

دو غیر متعلق آدمیوں کے اسٹیج میں داخل ہو جانے کی وجہ سے تماشائیوں میں انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ پردہ گرا دیا گیا اور اس حادثہ کی اطلاع دیکر تماشائیوں کو ٹکٹ کی قیمت واپس کر دی گئی۔ اس طرح کامڈی کا ڈراما ٹریجڈی میں تبدیل ہو گیا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

بدقسمتی سے کیل کا زخم زہریلا ہو کر روز بروز بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹروں نے رفتہ رفتہ پورا پاؤں کاٹ ڈالا جب کہیں زخم اچھا ہوا۔ پاؤں کے ساتھ ہریچند کو کمپنی کی ملازمت سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔ اس کے گھر جانے کا دن قریب آیا وہ ایک ایک شخص سے رخصت ہوا۔ میرے پاس بھی آیا اور کہنے لگا۔ دوست! اب تم بھی رخصت دو۔ اب اسٹیج میں تو میرے لئے کوئی ٹھکانا رہا نہیں۔ شاید وطن میں ٹھکانا مل جائے۔ ہم تم بہت دنوں ساتھ رہے۔

میں ۔ تو ایک ساتھ ہی یہاں سے چلیں گے بھی۔ میں بھی کمپنی سے استعفا دئے دیتا ہوں۔

ہریچند ۔ نہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔

میں ۔ تو تم بھی یہیں رہو۔ کمپنی کے ملازم کی حیثیت سے نہ سہی۔ میرے دوست کی حیثیت سے۔

ہریچند ۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ کمپنی کے مالک نے بھی مجھے یہاں سے جانے کو نہیں کہا۔ مگر میں ان کے لئے بوجھ بنکر نہیں رہ سکتا۔ باہر ٹانگہ میرے انتظار میں کھڑا ہے۔ گاڑی کا وقت قریب ہے۔ اجازت

دو تسلیم۔

جونہی ہریچند جانے لگا۔ میں نے اُسے روک کر کرسی پر بٹھالیا۔ اور کہا:۔

تم اتنے بے مروّت کیوں ہو گئے؟ تم یہیں رہو گے۔ تمہیں یہیں رہنا ہوگا۔

ہریچند۔ تم تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ اسٹیج پر لنگڑا آدمی کسی ڈرامے کا ہیرو نہیں ہو سکتا۔

میں۔ ہو کیوں نہیں سکتا۔ اسٹیج دنیا ہی کا مختصر سا خاکہ ہے۔

اب ہریچند کو میری باتوں کا کسی قدر یقین ہوا۔ اس نے کہا۔ کس ڈرامے کا؟

"اس ڈرامے کا" یہ کہکر میں نے صندوق سے ایک قلمی ڈرما نکالکر ہریچند کو دیا۔ جس کے ٹائیٹل پیج پر اس نے جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا۔

"تیمور لنگ"
(ڈراما)

ہریچند نے متعجب ہو کر پوچھا۔ یہ نیا ڈراما تم نے کب لکھا؟

میں نے کہا کل رات۔

ہریچند۔ صرف ایک رات میں؟

میں۔ ہاں۔

ہریچند۔ کس چیز نے تمہیں اسقدر قوّتِ عمل سے لبریز کر دیا۔

میں۔ تم نے۔ تمہاری محبت نے۔

ابو محمد امام الدین (مدیر ترجمان)

غزل

صرف اتنی ہی شرحِ ہستی ہے — ایک عنوانِ خود پرستی ہے

بادۂ غم سے مست رہتا ہوں — غم پرستی سی غم پرستی ہے

موت کی آرزو میں جیتا ہوں — میری ہستی بھی کوئی ہستی ہے

کچھ نہ پوچھو فراق کا عالم — ہر طرف بیکسی برستی ہے

میں بھی اُس جذبِ دل کا مالک ہوں — جس میں اک شانِ خود پرستی ہے

اے خدا کیا تری خدائی میں — مجھ سے بدتر بھی کوئی ہستی ہے

جس کو کہتے ہو تم دلِ جوہرؔ
حسرتوں کی وہ ایک بستی ہے

جوہرؔ عظیم آبادی

رسکن اور کارلایل

رسکن جان رسکن ۱۸۱۹ میں لنڈن میں پیدا ہوا اور ۱۹۰۰ میں مرگیا۔ وہ سکاٹلینڈ کے ایک دولتمند شراب فروش کا لڑکا تھا۔ اس نے کرائسٹ چرچ اکسفورڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہیں سے نیوڈی گیٹ انعام حاصل کیا۔ رسکن شروع سے ادب۔ شاعری اور صنعت کا دلدادہ تھا۔ سیر و سیاحت سے اس کا ذوقِ سلیم پختہ تر ہوتا چلا گیا۔ اٹلی۔ سوئٹزرلینڈ اور فرانس سے اس کے لئے بہت اثر آفریں ثابت ہوئے ۱۸۶۷ء میں وہ اکسفورڈ میں آرٹ کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اپنی عمر کے آخری حصوں میں کانسٹن چلا گیا۔

اس کی مشہور تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:۔

عصر حاضر کے مصور۔ فن تعمیر کے سات چراغ۔ فن تعمیر اور مصوری پر لیکچر۔ ہوا کی ملکہ۔ [illegible]لی کے قانون۔

رسکن کا انداز تحریر ایک خاص رنگ حسن رکھتا ہے جس کا اب تک جواب نہیں ہو سکا۔ طویل موسیقیت سے لبریز فقرے۔ تصویر کشی۔ جوش بیان اور کلام یہ تمام باتیں اس کے انداز کو اپنے معاصرین کے انداز سے ممتاز کرتی ہیں۔

آرٹ کے نقاد کی حیثیت سے وہ اپنے زمانے میں ایک سربرآوردہ شخصیت تھا۔ وہ "صداقت" پر بہت زور دیتا تھا۔

فن مصوری (ماقبل رافیل) کے شاہکار اسے بہت پسند تھے۔ اگرچہ اسے "تاثراتی" انداز مصوری سے نفرت تھی۔ لیکن وہ پہلا شخص ہے جس نے آرٹ کی صحیح معنوں میں توضیح کی۔

کارلایل کارلایل دمفریشایر میں ۴ دسمبر ۱۷۹۵ء کو پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ ایک معمار تھا۔ جین بیلی ویلش سے شادی کرنے کے بعد کچھ عرصہ وہ اڈنبرا میں رہا۔ اس کے بعد لنڈن چلا گیا۔ جہاں اس نے اپنی باقیماندہ عمر گزار دی۔

قیام لنڈن کے پہلے حصے میں اس کی تمام توجہ ایک ہی کام پر مرکوز رہی۔ یعنی "تاریخ انقلاب فرانس" اس کی زندگی حوصلہ افزا توقعات سے خالی تھی۔ اور ماحول مخالف۔ اس کے پاس تھوڑا سا روپیہ تھا۔ لیکن کتاب کے ختم ہونے تک وہ بھی ختم ہو جاتا۔

کارلائل نے کتاب شروع کر دی اور پہلی جلد کے تکمیل کے بعد اسے جان مل کے حوالے کر دیا۔ بدقسمتی سے وہ مسودہ ضایع ہو گیا۔ اور اگرچہ جان مل نے کارلائل کی مالی مشکلات کا احساس کرتے ہوئے اسے ۱۰۰ پونڈ کی رقم لینے پر مجبور کیا۔ لیکن پانچ ماہ کی محنت کے ضائع جانے کا کارلایل کو سخت صدمہ پہنچا۔ تاہم حیرت انگیز استقلال سے کام لے کر اس واقع کے دو سال بعد اس نے "تاریخ انقلاب فرانس" کو مکمل کر لیا۔ اس کی اشاعت سے کارلائل کا شمار مشاہیر میں ہونے لگا۔ دور دور تک اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ ارباب نظر نے احساس کیا کہ کارلایل ان اکابر میں سے تھا جو ملک کی تاریخ کو بدل دیتے ہیں۔

۱۸۸۱ء میں کارلایل کا انتقال ہو گیا۔

گھر کا مالک

افراد

انیس احمد .... ایک بوڑھا تاجر
جلیس .... اس کا لڑکا
کشور .... انیس احمد کی نوجوان بیوی (جلیس کی سوتیلی ماں)
خادمہ ....
محمد حسین .... انیس کا دوست - ایک وکیل
محمد رفیع .... ایک ڈاکٹر

پردہ اٹھتا ہے

ایک بڑا کمرہ - ایک طرف پلنگ پر انیس احمد بیمار پڑا ہے - بیہوش ہے - کشور پاس ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے - بوڑھی خادمہ ایک طرف دوسری چارپائی پر بیٹھی ہے -

شام کا وقت ہے - پت جھڑ کا موسم ہے - اداسی سی چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے - ابھی انیس احمد کے کمرے میں لیمپ نہیں جلے - کشور ایک ضدی زبان دراز عورت ہے جس کے والدین نے روپے کیلئے اُسے انیس احمد کے ہاتھ بیچ دیا تھا - اس سودے کی تلخی ابھی تک اس کے دل سے نہیں گئی -

خادمہ - ڈاکٹر نے کیا کہا ہے ؟
کشور - یہی کہ ان کی دل کی حالت بہت نازک ہے - ذرا سا صدمہ....
خادمہ - (سرگوشی میں) آپ کا بیچھا تو چھوٹے گا !
کشور - کیا بکواس کرتی ہو -

کشور کے الفاظ سخت ہیں لیکن اس کے لہجے سے غصے کا اظہار نہیں ہوتا -

خادمہ - بیوی ! اب اسی برس کی عمر ہونے کو آئی دکھائی نہیں دیتا - سنائی نہیں دیتا - ایسے جینے سے مرنا بھلا ہے -

دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے

کشور - دیکھنا - کون ہے - آج صبح کہہ رہے تھے کہ وکیل کو بلا کے جائیداد میرے نام منتقل کر دینگے - شاید وکیل آیا ہے - ان کو تو ہوش نہیں - اسے کل پھر آنا پڑیگا -
خادمہ - (نسوانی اشتیاق سے) تو کیا میاں جلیس کو کچھ نہیں ملیگا -
کشور - عورت ! تیری زبان تھمیگی یا نہیں - جا دروازہ کھول -

خادمہ دروازہ کھولتی ہے

خادمہ - میاں جلیس ہیں -
کشور - جلیس -
خادمہ - ہاں -

جلیس داخل ہوتا ہے - وہ ایک بلند قامت دبلا پتلا نوجوان ہے - اس کے چہرے پر ایک ہیبت سی برستی ہے - اسکی مونچھیں بڑی بڑی ہیں - آنکھیں اندر دھنسی ہوئی - ابرو گنجان - ناک لمبی - ہاتھ پاؤں چوڑے چکلے ہیں -

جلیس - شاید گھر کے مالک کو اسطرح "خوش آمدید" کہا کرتے ہیں -
کشور - یہ تمہارا گھر نہیں ہے - میرا ہے -
جلیس - سنو میں تم سے کچھ کہنے آیا ہوں -
کشور - میں کچھ نہیں سننا چاہتی - یہاں سے فوراً چلے جاؤ -
جلیس - (باپ کے پلنگ کی طرف دیکھکر) بیہوش ہے -

کشور۔ ہاں۔ اور تمہاری صورت سے بیزار۔ شرم تو نہیں آتی۔ سیدھے جیل سے آ رہے ہو گے۔ تم نے اپنے بوڑھے باپ کا دل توڑ دیا۔ اس نے تمہیں لکھایا پڑھایا۔ کمانے کے قابل کیا۔ اور تم نے اس کا صلہ یہ دیا کہ بدمعاشوں کے ساتھ مل کر چوری کی۔ جیل میں گئے۔ اور خاندان کی آبرو خاک میں ملا دی۔

جلیس۔ یہ بات ہے!

کشور۔ ہاں۔ (غصے سے) اگر تم دو منٹ کے اندر اس مکان سے نہ جاؤ گے تو میں پولیس کو بلوا کر تمہیں نکلوا دونگی۔

جلیس (دھیما ہو کر) اچھا میں چلا جاتا ہوں لیکن کم از کم کچھ کھانے کے لئے تو دو۔ بھوک کے مارے میرا بُرا حال ہو رہا ہے۔

کشور۔ کچھ نہیں ملیگا۔

جلیس۔ میں کل سے بھوکا ہوں۔

کشور۔ مجھے اس سے کچھ تعلق نہیں۔

خادمہ۔ بیوی۔ کچھ دے دیجئے میاں کو۔

کشور۔ ہرگز نہیں۔

خادمہ۔ صبح کی بچی ہوئی روٹی میں سے دیدیجئے۔

کشور۔ (نرم ہو کر) اچھا۔ (خادمہ سے) جاؤ۔ کچھ روٹی اور مکھن لا دو۔

جلیس ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔
خادمہ روٹی اور مکھن لاتی ہے۔ جلیس کھانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

جلیس۔ (کھاتے ہوئے) میرے نصیب میں یہ باسی روٹی اور مکھن تھا۔

کشور۔ خاموش! دیکھتے نہیں تمہارا بوڑھا باپ بیہوش ہے۔ جسدن سے انہیں معلوم ہوا ہے کہ تم نے چوری کی۔ اسدن سے انکی بیماری بڑھتی گئی۔ اور آج تو حالت زیادہ خراب ہے۔ پرسوں تم کو گھر سے نکل جانے کا حکم دینے کے بعد ان کی طبیعت بہت گر گئی۔

جلیس۔ (کھانا ختم کر کے) اچھا میں جاتا ہوں۔ کچھ روپیہ تو دیدو!

کشور۔ ایک پائی نہیں

جلیس۔ ادھار۔

کشور۔ ادھار۔ اور تمہیں۔ واپس کس طرح کرو گے۔

جلیس۔ (بستر کی طرف اشارہ کر کے) اس کی موت کے بعد۔

کشور۔ غلط!

جلیس اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کشور کی طرف غور سے دیکھتا ہے۔

جلیس۔ کیا اس نے مجھے عاق کر دیا ہے۔

کشور۔ تمہیں اس سے زیادہ کی توقع تھی؟

جلیس۔ آخر کچھ کہو تو۔ کیا ہوا۔

خادمہ داخل ہوتی ہے۔

خادمہ۔ وکیل صاحب آ گئے۔

کشور اور جلیس دونوں اُٹھکر دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ ایک طرف دروازے کے پیچھے کشور بیٹھ جاتی ہے۔ جلیس کھڑا ہو جاتا ہے
خادمہ محمد حسین کو ساتھ لئے ہوئے داخل ہوتی ہے۔

محمد حسین! کیا حال ہے مسٹر انیس احمد کا۔

کشور۔ (نیچی آواز میں) بیہوش ہیں۔ شاید آج تو ہبہ نامہ پر ان کے دستخط نہ ہو سکیں۔

جلیس۔ ہبہ نامہ۔ کیسا ہبہ نامہ۔ اپنے باپ کی جائیداد کا وارث میں ہوں۔

محمد حسین۔ (جلیس سے مخاطب ہو کر) سنو جلیس۔ کل تمہارے والد نے مجھے کہا تھا کہ وہ اپنی ساری جائیداد منقولہ و غیر منقولہ اپنی بیوی کے نام منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں اس انتقال کا پورا اختیار حاصل ہے۔ چپ چاپ کھڑے رہو۔ اگر تم دخل دو گے تو میں تمہیں اس گھر سے نکلوا دونگا۔ کل مسٹر انیس احمد نے خاص طور پر کہا تھا کہ وہ تم کو محروم کرنا چاہتے ہیں۔

کشور۔ آپ خود اندر جا کر دیکھئے۔ شاید اب ہوش میں ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی اس وقت آنے کا وعدہ کیا تھا۔

ڈاکٹر محمد رفیع داخل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع۔ (خادمہ سے) کیسی طبیعت ہے تمہارے میاں کی۔

خادمہ۔ جیسے آپ صبح دیکھکر گئے تھے۔ ویسے ہی ہیں۔ ہوش تو نہیں آیا۔

محمد رفیع۔ اچھا میں انہیں دیکھ آتا ہوں۔

تھوڑے عرصے کے بعد پھر داخل ہوتا ہے۔
اسکے چہرے پر تعجب اور خوف کے آثار ہیں۔

محمد رفیع۔ بیگم مسٹر انیس احمد نے عالم فانی کو خیر باد کہا۔

جلیس - کیا!

کشور چیخ مارتی ہے - پھر آہستہ آہستہ
ہلکی آواز میں رونے لگتی ہے -

جلیس حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے -

محمد حسین ! تعجب ہے - میں ابھی مرحوم کو قانونی مشورہ دینے کے لئے بلانے والا تھا - اور یہ لوگ بھی اس طرح اطمینان سے باتیں کر رہے تھے گویا اس کی حالت اچھی ہے -

محمد رفیع - مسٹر انیس احمد کو مرے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ گذر چکے ہیں -

جلیس - دو گھنٹے سے زیادہ !

محمد رفیع - جی ہاں -

ڈاکٹر محمد رفیع اور محمد حسین چلے جاتے ہیں -
کشور ان کے چلے جانے کے بعد کمرے میں آجاتی ہے

کشور - (سسکیاں لیتے ہوئے) اب تم جاؤ گے یا نہیں - جاؤ - اور مجھے تنہا چھوڑ دو -

جلیس - اب میں کہاں جاؤں گا -

کشور - مرحوم کا حکم تھا تم اس مکان میں قدم نہ رکھو -

جلیس - لیکن اب اس گھر کا مالک میں ہوں -

کشور - کیا!

جلیس - میں اپنے باپ کی تمام جائیداد کا وارث ہوں - تم صرف گذارہ لے سکتی ہو - مجھے جانے کی ضرورت نہیں - تم اپنا کوئی بندوبست کرو -

کشور - میں -

جلیس - ہاں تم -

کشور - جلیس - تم آج تو مجھے اس گھر سے نہ نکالو - تمہارا باپ میرا شوہر مردہ پڑا ہے -

جلیس - تمہیں اسی وقت جانا ہوگا -

کشور - میں نہیں جاؤں گی -

جلیس - میں پولیس کو بلوا کر تمہیں نکلوا دوں گا -

کشور رونے لگتی ہے

جلیس - ٹسوے نہ بہاؤ - خادمہ کو کہو تمہیں اپنے بھائی کے گھر لے جائے -

کشور - اچھا - میں جاتی ہوں - تمہیں اپنے گھر میں اپنے مردہ باپ کے ساتھ رات گذارنا مبارک ہو -

چلی جاتی ہے

جلیس - (اپنے آپ سے) مبارک کیوں نہیں -

اس کمرے میں جاتا ہے جہاں اس کا
باپ مردہ پڑا ہے -

جلیس - خوف کی کیا بات ہے

(لیمپ جلاتا ہے)

میں اس گھر کا آقا ہوں -

اس کی نظر مردے کے چہرے پر جا پڑتی
ہے اور وہ کانپ جاتا ہے -

یہ خوف کیسا ہے ! ایک مردے سے کیسا خوف ! میں اس گھر کا مالک ہوں

اس کے بدن میں پھر کپکپی پیدا ہو جاتی ہے

ذرا باہر جاتا ہوں - لیکن نہیں - (مردے کی طرف دیکھ کر) تم مجھے نہیں ڈرا سکتے - تم مجھے میرے گھر سے نہیں نکال سکتے -

ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے لیمپ بجھ جاتا ہے
جلیس گھبرا کے باہر نکل آتا ہے - مردے کے چہرے
پر چاند کی روشنی پڑتی ہے - وہی اس گھر کا
مالک ہے -

عابد

ابو مسلم خراسانی کا قتل

خلفائے بنو عباس کا جد ِ علی خلیفہ ابو جعفر منصور سلاطین اسلام میں ایک نہایت مدبر، دور اندیش اور بلند پایہ حکمران گزرا ہے۔ اس نے عباسیوں کی نکبت وادبار سے لے کران کے اوج وعروج تک کے سارے منظر اپنی آنکھوں دیکھے تھے۔ وہ ابو مسلم خراسانی کی جان نثاریوں اور اس کے شجاعانہ کارناموں سے جو دولت عباسیہ کے قیام میں اس سے ظاہر ہوئے بے خبر نہ تھا۔ اسے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ ابو مسلم کی خدمات جلیلہ نے آل عباس کو کس درجہ ممنون احسان بنا رکھا ہے۔ باوجود ان سب باتوں کے اس نے اپنی سلطنت کے پہلے ہی سال یعنی ۱۳۷ھ میں ابو مسلم جیسے جری وجنگ آزمودہ سپہ سالار کو جو بظاہر اس کا دستِ راست اور قوۃ بازو تھا قتل کرا دیا۔ بادی النظر میں خلیفہ منصور کے دامنِ شرف و عدالت پر یہ ایک نہایت بدنما دھبہ ہے۔ اس لئے یہ بتا دینا ضرور ہے کہ اس اقدام قتل کی تہ میں کیا کیا اسباب پوشیدہ تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ خلیفہ منصور کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اپنی حکومت کو ابو مسلم کے خار وجود سے پاک کر دیتا۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کرتا تو اس کی سلطنت کو کبھی استحکام نصیب نہ ہوتا بلکہ اگر ابو مسلم اپنے منصوبوں میں کامیاب ہو جاتا تو نہ صرف یہ کہ اسلامی دنیا از سر نو مفسدات و بدامنی کا گہوارہ بن جاتی۔ بلکہ دولت عباسیہ کی بیخ کنی بھی کچھ غیر اغلب نہ تھی۔

اسباب قتل

اصل میں ابو جعفر منصور اور ابو مسلم میں اس زمانہ سے کشیدگی چلی آتی تھی جبکہ خلیفہ سفاح نے منصور کو اپنی اور اپنے بعد ابو جعفر منصور کی بیعت لینے کے لئے خراسان بھیجا تھا اور ابو مسلم کو خراسان کی گورنری پر سرفراز فرمایا تھا۔ ان ایام میں ابو مسلم نے نہایت تمرد وسرکشی کے ساتھ منصور کی تحقیر وتذلیل کی تھی۔ چنانچہ اسی زمانہ سے ابو مسلم کے خلاف منصور کے جذباتِ خشم متلاطم چلے آتے تھے۔ ۵

منصور کے ایام ولیعہدی میں ابو مسلم نے اس کی جو توہین کی وہ تو غالباً منصور کے صفحۂ دل سے کلیۃً محو ہو چکی تھی اور اگر اس کا کوئی اثر باقی تھا تو وہ بھی ابو مسلم کے شیوۂ وفاداری سے زائل ہو سکتا تھا۔ لیکن اس نے غضب یہ کیا کہ سفاح کی رحلت کے بعد بھی سرکشی اور شورہ پشتی سے باز نہ آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منصور کی آتش غضب اس کے خلاف دن بدن زیادہ بھڑکتی اور تیز ہوتی رہی۔

اسحاق بن مسلم کہتے ہیں کہ خلیفہ سفاح کے انتقال کی خبر سننے کے بعد میں نے مکہ معظمہ سے مراجعت کرتے وقت منصور سے کہا کہ ابو مسلم کی موجودگی میں آپ کو حقیقی معنی میں سلطنت ورفعت نصیب نہیں ہو سکتی۔ منصور نے کہا۔ مجھے ابو مسلم کے متعلق تمہاری دلی کیفیت معلوم ہو گئی۔ میں نے کہا یہ درست ہے لیکن میرے نزدیک تو آپ اس کی طرف سے سخت خطرے میں مبتلا ہیں۔ منصور نے کہا تم جھوٹ بکتے ہو۔ مجھے اس کی طرف سے کوئی خدشہ نہیں ہے۔ میں یہ سنکر خاموش ہو گیا۔ ۱

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منصور کے دل پر اب واقعۂ خراسان کا کوئی اثر باقی نہ تھا۔ اور اگر ابو مسلم جادۂ اطاعت سے باہر نہ نکلتا تو منصور کے دربار میں اس کے برابر کوئی شخص مقرب وسرفراز نہ ہو سکتا لیکن اس کی تیرہ بختی نے اس کے نظام حواس کو درہم برہم رکھ کر اسے برابر کج روی پر مائل رکھا۔

ہم یہاں چند واقعات پیش کرتے ہیں جن سے ثابت ہوگا کہ ابو مسلم ان دنوں جذبات نخوت و پندار کا شکار ہو کر کس حد تک اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔

جب منصور نے حج سے فارغ ہو کر مراجعت کی اور اس کے پاس خلیفہ سفاح کے انتقال کی خبر پہنچی تو اس وقت اس کے اور ابو مسلم کے مابین ایک منزل کا بُعد تھا۔ منصور نے ابو مسلم کو لکھا کہ مجھے خلیفہ سفاح کے حادثۂ وفات کی خبر ملی ہے۔ تم بہت جلد یہاں آ کر مجھ سے ملاقات کرو لیکن ابو مسلم نے کوئی التفات نہ کیا۔ ۲

۱ الامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ جلد ۲ صفحہ ۱۳۲

۲ الامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ جلد ۲ صفحہ ۱۳۲

۵ ابن خلدون جلد ۳ صفحہ ۱۸۰ مطبوعہ مصر

چونکہ ابومسلم انقضائے حج کے بعد منصور سے آگے بڑھ آیا تھا۔ پہلے اسی کو سفاح کے انتقال کی خبر ملی تھی۔ لیکن اس نے حماقت یہ کی کہ نہ تو خلیفہ سفاح کی رحلت پر منصور کو جو سفاح کا برادر حقیقی تھا تعزیت نامہ لکھا، نہ ابوجعفر کی طرف مراجعت کی، نہ اس کی آمد کا انتظار کر کے اس سے ملجانے کی کوشش کی اور نہ منصور کی خدمت میں فوز خلافت پر ہدیہ تہنیت پیش کیا۔ منصور ابومسلم کی اس "شان بے نیازی" پر سخت کبیدہ خاطر ہوا۔ آخر منصور نے ایک عتاب آلود خط ابومسلم کو لکھا۔ تب اس نے تہنیت خلافت کی عرضداشت روانہ کی ۱ه

ابومسلم نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ دارالسلطنت انبار پہنچ کر یہ تاب لایا کہ منصور کے عم زاد بھائی عیسیٰ بن موسیٰ کو بلا کر اسے ابوجعفر منصور کے مقابلہ میں بیعت خلافت لینے کی ترغیب دی۔ لیکن عیسیٰ بن موسیٰ نے اس غدارانہ پیشکش کو سخت نفرت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ ابوجعفر منصور مسند خلافت پر بیٹھ گیا ۲ه

اس کے بعد جب منصور کے چچا عبداللہ بن علی نے منصور کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو گو ابومسلم خلیفہ منصور کی خواہش کے بموجب عبداللہ سے لڑنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ لیکن اس کا دل خلیفہ کی طرف سے صاف نہ تھا۔ جنگ عبداللہ بن علی کے بعد ایک ایسا قضیہ پیش آیا جس نے اسے منصور کی طرف سے اور زیادہ منحرف کر دیا۔ واقعہ یہ تھا کہ جب ابومسلم نے عبداللہ بن علی پر فتح پائی اور مال غنیمت جمع ہوا تو خلیفہ نے اپنے خادم ابوخصیب کو غنیمت کی فہرست مرتب کرنے کے لئے روانہ کیا۔ جب ابوخصیب نے ابومسلم کے لشکرگاہ میں پہنچ کر غنیمت کا جائزہ لینا چاہا تو ابومسلم غصہ سے بے قابو ہو گیا اور عالم برآشفتگی میں کہنے لگا۔ "منصور نے میرا اعتبار نہیں کیا۔ خیر اچھا کیا" اس وقت ابومسلم کی برہمی مزاج کا درجۂ حرارت اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ابوخصیب کی جان کے درپے ہوا مگر بعد میں کچھ سوچ کے اسے چھوڑ دیا۔ ۳ه

جب یہ واقعات منصور کے گوش گزار ہوئے اسکی کبیدگی بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچی کہ اس نے منصور نے ابومسلم کے قتل وقمع پر مائل کر دیا۔ منصور کو اب اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ جب تک ابومسلم موجود ہے وہ حقیقت میں خلیفہ نہیں کہلا سکتا۔ اب وہ سوچنے لگا کہ ابومسلم کے متعلق کسی سے مشورہ کرنے کی ضرورت ہے یا استبداد بالرائے سے کام لینا چاہیئے۔ آخر طبیعت نے فیصلہ کیا کہ مشورہ کر لینا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ مسلم بن قتیبہ کو بلا کر اس سے صلاح پوچھی۔ ابن قتیبہ نے اس سوال کے جواب میں بے ساختہ یہ آیۂ پڑھی:-

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا } اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہوتا تو یہ تباہ و برباد ہو جاتے۔

منصور یہ جواب سنکر کہنے لگا اے ابن قتیبہ تمہارا خیال بالکل درست ہے ۴ه

اب منصور سوچنے لگا کہ ابومسلم پر کیونکر دسترس پائے۔ اور یہ کانٹا کیونکر نکلے۔ منصور لباط سیاست کا بڑا زبردست شاطر تھا۔ ایسے ایسے سیاسی جوڑ توڑ جانتا تھا کہ آج کے بڑے بڑے سیاسیین کی تدبیر و سیاست بھی ان کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ منصور نے اس خیال سے کہ مبادا ابومسلم خراسان چلا جائے جھٹ مصر اور شام کی سند گورنری لکھ کر ابومسلم کے پاس بھیجدی لیکن ابومسلم جو منصور کے سیاسی ہتکنڈوں سے خوب واقف تھا حقیقت حال کو فوراً بھانپ گیا اور جزیرہ سے بعزم خراسان اس کوشش میں چل کھڑا ہوا کہ وہاں کسی علوی جوان کو خلیفہ بنا کر منصور کا رقیب بنا دے۔ ۵ه

ابومسلم کے نام منصور کا فرمان اور اسکا جواب

منصور نے یہ خبر پاکر دارالخلافہ انبار سے مدائن کی طرف کوچ کر دیا اور ابومسلم کو تباکید لکھا کہ مجھ سے آکر ملاقات کرو۔ کیونکہ بعض ایسے اہم امور کے متعلق تم سے مشورہ کرنا ہے۔ جن کا ضبط تحریر میں لانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ منصور نے اس طلب کے جواب میں لکھا:-

"اب امیرالمومنین کا کوئی ایسا دشمن باقی نہیں رہا کہ مملکت محروسہ جس کے خار وجود سے پاک نہ ہو چکی ہو۔ ملوک آل ساسان کی ایک روایت ہم تک پہنچی ہے کہ وزراء کے لئے وہ حالت سخت خطرناک ہوتی ہے۔ جبکہ ملک سے فتنہ و فساد کی آگ فرد ہو جائے۔ پس ہم امیرالمومنین کے قرب اور باریابی سے کنارہ کش ہوتے ہیں۔ ہم اس وقت تک دور بیٹھے برابر آپ کے وفادار رہیں گے جب تک

۱ه ابن خلدون جلد ۳ صفحہ ۱۸۲
۲ه ابن خلدون جلد ۳ صفحہ ۱۸۲
۳ه ابن خلدون جلد ۳ صفحہ ۱۸۳

۴ه وفیات الاعیان لابن خلکان جلد اول صفحہ ۲۸۲
۵ه ابن خلدون جلد ۳ ۱۸۳ و تاریخ الخمیس جلد ۲ صفحہ ۳۶۳

آپ ہماری جان کے خواہاں نہ ہونگے لیکن اگر آپ کو ہماری
حفاظت و صیانت منظور نہ ہوگی تو ہم بھی اس عہد کو توڑ دینگے"۔
منصور نے اس کے جواب میں یہ فرمان روانہ کیا:-

"میں تمہاری عرضداشت کا مفہوم سمجھ گیا۔ تم اُن غداروں میں
نہیں ہو جو کثرت جرائم کی وجہ سے سلطنت میں اضطراب
و فساد کی خواہش کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی عافیت اسی
میں دیکھتے ہیں کہ نظام جماعت اور شیرازۂ حکومت منتشر
رہے۔ مگر حیرت ہے کہ تم نے اپنے آپ کو ایسے لوگوں میں
کیوں شمار کر لیا؟ تم تو تادم تحریر ہماری اطاعت میں بڑے
راسخ القدم ہو۔ ہمارے ساتھ خلوص و عقیدت رکھتے
ہو۔ اور اسی ثبات و استقلال سے اس بارِ فرائض کو
اٹھائے ہوئے ہو جس کو پہلے اٹھائے ہوئے تھے۔
امیر المومنین محض تمہاری تسکین خاطر کے لئے یہ مکتوب
عیسٰی بن موسیٰ کے ہاتھ روانہ کرتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے
کہ گوش ہوش سے سنو۔ اور میں حق تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں
کہ ہر قسم کے وساوس شیطانی تمہارے دل سے نکل جائیں۔
اس بدبخت نے تمہاری نیت میں فساد ڈالنے کا اس سے
بہتر موقع کوئی نہیں پایا [1]

ابومسلم نے اس فرمان کے جواب میں خلع خلافت کی دھمکی دی اور
لکھا کہ آج تک جو میں نے خلافت عباسیہ کی دعوت و شیوع کا گناہ
کیا۔ اب اس سے تائب ہوتا ہوں۔ [2]

شاہی قاصد کی روانگی اور اسکی کامیاب جد و جہد۔

ابومسلم نے یہ مکتوب روانہ کر کے
حلوان کا راستہ لیا۔ جب یہ مکتوب
منصور کے پاس پہنچا تو اس نے
اپنے عم زاد بھائی عیسٰی بن موسیٰ
اور سربرآوردہ بنو ہاشم کو طلب کر کے ابومسلم کا خط دکھایا اور ان سے
درخواست کی کہ آپ لوگ متفق ہو کر ابومسلم کو متنبہ کریں کہ بغاوت کا
انجام اچھا نہیں ہے۔ اور لکھیں کہ تم جن خدمات کو انجام دے رہے
ہو۔ انہی کی تکمیل کرو۔ لیکن امیر المومنین کے دائرۂ اطاعت سے باہر
نہ نکلو"۔

اس خط کو منصور کا آزاد غلام ابوحمید مروزی لے کر روانہ ہوا [3]
خلیفہ نے بوقت روانگی ابوحمید کو یہ سمجھا دیا تھا کہ شروع میں تو ابومسلم سے
نہایت نرمی اور ملاطفت سے گفتگو کرنا اور افہام و تفہیم کا کوئی دقیقہ اٹھا
نہ رکھنا۔ لیکن اگر وہ کسی تدبیر سے راہ راست پر نہ آئے تو اس کے بعد کہہ
دینا کہ امیر المومنین نے قسم کھا کے فرمایا ہے کہ بنفس نفیس تم پر فوج کشی
کرونگا۔ اگر تم دریا میں غوطہ لگاؤ گے تو میں بھی تمہاری جستجو میں غوطہ لگاؤنگا۔
اور اگر تم آگ کے شعلوں میں کود پڑو گے تو میں بھی کود پڑونگا۔ یہاں تک
کہ تمہیں قتل کر ڈالوں یا خود جان بحق تسلیم کر دوں"۔

ابوحمید نے منصور کی ہدایت کے مطابق ابومسلم کو وہ خط دیا۔
جب وہ خط پڑھ چکا تو نہایت لجاجت سے گفتگو شروع کی اور ابومسلم کو
خلیفہ کی اطاعت و فرمان برداری پر مائل کرنے میں اپنی ساری قوت گویائی
صرف کر دی۔ ابومسلم نے مالک بن ہیثم سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم سنتے ہو
ابوحمید کیا کہتا ہے؟ مالک کہنے لگا آپ ایسی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آئیے
مجھے یقین ہے کہ اگر آپ خلیفہ کے پاس جائیں گے تو وہ آپ کو فوراً تنگ
شمشیر کے حوالے کر دیگا۔ ابومسلم یہ سن کے سہم گیا۔ اس کے بعد عامل رَے
سے جو وہاں موجود تھا مشورہ طلب کیا۔ اس نے بھی خلیفہ کے پاس جانے
سے منع کیا۔ ابومسلم نے ابوحمید سے کہہ دیا کہ میں دربار خلافت میں نہیں
جا سکتا۔ جب ابومسلم نے قطعی انکار کر دیا تو ابوحمید نے خلیفہ کا زبانی
پیغام پہنچانا شروع کیا۔ یہ پیغام سن کر ابومسلم کا چہرہ خوف و غصہ سے متغیر
ہونے لگا۔ [4]

اس سے پیشتر خلیفہ منصور نے ابوداؤد کو جو ابومسلم کی طرف سے
خراسان کا گورنر مامور تھا۔ ابومسلم سے قطع تعلق کر کے براہ راست دربار
خلافت سے تعلقات استوار کرنے کو لکھا تھا۔ اور اس کے صلہ میں اپنی
طرف سے خراسان کی سند امارت دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ابوداؤد نے اسکو
درپردہ منظور کر لیا تھا۔ اور انہی ایام میں ابوداؤد نے بھی ابومسلم کو خلیفہ
کی مخالفت و بغاوت سے احتراز کرنے کے متعلق ایک مکتوب روانہ
کیا تھا۔ اتفاق سے یہ مکتوب ابومسلم کے پاس اس وقت پہنچا جب کہ
ابوحمید خلیفہ کا زبانی پیغام دے رہا تھا۔ ابومسلم کے دل میں اس خط کے

---

[1] ابن اثیر جلد ۵ صفحہ ۲۳۲
[2] ابن خلدون جلد ۳ صفحہ ۱۸۳

[3] ابن قتیبہ (جلد ۲ صفحہ ۱۳۳) اور مسعودی نے تذکرہ ابوجعفر منصور میں
قاصد کا نام جریر بن یزید بجلی لکھا ہے۔
[4] ابن خلدون جلد ۳ صفحہ ۱۸۳

مطالعہ سے اور بھی زیادہ بہل سا گیا۔ ابوحمید سے کہنے لگا "گو میں نے خراسان جانے عزم صمیم کر لیا تھا لیکن اب یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے معتمد ابواسحاق کو امیرالمومنین کی خدمت میں استصواب اور طلب رائے کی غرض سے بھیج دوں"۔

جب ابواسحاق مدائن پہنچا تو سرداران بنوہاشم اور دوسرے اعیانِ دولت اس کے استقبال کو آئے اور خلیفہ نے اسے کمال عزت واحترام کے ساتھ باریاب فرمایا۔ منصور نے دوران گفتگو میں ابواسحاق سے کہا کہ اگر تم ابومسلم کو خراسان جانے سے باز رکھ کر کسی طرح میرے پاس لے آؤ۔ تو میں ولایت خراسان کا ایک حصہ تمہارے زیر حکومت کر دونگا۔ ابواسحاق کے دل میں خراسان کی متوقع حکمرانی نے طرح طرح کی امنگیں پیدا کر دیں۔ چنانچہ وعدہ کر لیا کہ جس طرح بن پڑیگا ابومسلم کو بارگاہ خلافت میں پہنچاؤنگا۔ ابواسحاق یہاں سے رخصت ہو کر ابومسلم کے پاس آیا اور طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر اسے منصور کے پاس چلنے پر راضی کر لیا۔ چنانچہ ابومسلم نے اپنے لشکر کو مالک بن ھیثم کے ماتحت چھوڑ کر تین ہزار فوج کے ساتھ مدائن کا رُخ کیا۔

ابومسلم آستانۂ خلافت میں

جب ابوایوب وزیرالسلطنۃ نے ابومسلم کو اس آن بان کے ساتھ آتے دیکھا تو اسے یہ خوف دامنگیر ہوا کہ مبادا ابومسلم کی فوج سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جس سے خلیفۃ المسلمین کی زندگی معرضِ خطر میں پڑ جائے اس خطرہ سے نجات حاصل کرنے کی یہ تدبیر نکالی کہ ابومسلم کے ایک ہمقوم کو بلا کر یہ حکم دیا کہ تم ابومسلم سے جا ملو اور اس کی وساطت سے امیرالمومنین کے حضور میں باریاب ہو۔ اور ابومسلم سے اپنے لئے ولایت کسکر کی سفارش کراؤ۔ وہاں سے تمہیں اتنی دولت ملے گی کہ مالا مال ہو جاؤگے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس نفع میں میرے بھائی کو بھی شریک کرنا۔ اور خبردار اس کام میں تاخیر نہ کرو۔ کیونکہ امیرالمومنین ابومسلم کے آتے ہی اس کا انتظام کرنے والے ہیں۔

وہ شخص فریب میں آ گیا۔ ابوایوب نے فوراً خلیفہ سے مل کر اس شخص کے لئے ابومسلم سے ملاقات کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ یہ شخص سرِراہ ابومسلم سے ملاقی ہوا۔ اور اس کو اس امر سے مطلع کر کے خلیفہ سے سفارش کرنے کی درخواست کی۔ اس خبر کو سن کر ابومسلم کا ساغرِ دل خوشی سے چھلک گیا۔ اور رنج و کلفت اور اضطراب کا کوئی شائبہ باقی نہ رہا۔ جب ابومسلم کے شہر کے قریب پہنچنے کی خبر مشہور ہوئی تو حسب احکامِ خلافت سرداران بنوہاشم اور عمائدِ سلطنت ابومسلم کے خیر مقدم کو آئے ابومسلم نے بارگاہ خلافت میں حاضر ہو کر خلیفہ کی دست بوسی کی اور استراحت کی اجازت حاصل کر کے واپس چلا آیا۔

قتل واستہلاک کی حیلہ جوئیاں۔

جب ۲۵ شعبان ۱۳۷ھ کی صبح نمودار ہوئی تو منصور نے اپنے حاجب عثمان بن نہیک کو اور چار دوسرے دربانوں کو بلوایا اور ان کو پس پردہ بٹھلا کر یہ ہدایت کر دی کہ جس وقت میں تالی بجاؤں تو ابومسلم کو فوراً قتل کر دینا۔ اس انتظام کے بعد ابومسلم بلایا گیا۔ باتوں ہی باتوں میں منصور نے اُن دو تلواروں کا تذکرہ چھیڑ دیا جو ابومسلم کو خلیفہ کے باغی چچا عبداللہ بن علی سے ملی تھیں۔ اتفاق سے ابومسلم نے اس وقت ان میں سے ایک تلوار اپنی کمر سے باندھ رکھی تھی۔ ابومسلم نے تلوار پر ہاتھ رکھکر کہا کہ یہ تلوار انہی دو میں سے ایک ہے۔ منصور نے کہا لاؤ ذرا میں بھی دیکھوں۔ ابومسلم نے تلوار کھول کر منصور کے حوالے کی۔ منصور اسے تھوڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اسے اپنے پیچھے فرش پر رکھ دیا اور باتوں ہی باتوں میں عتاب آمیز اور درشت لہجہ اختیار کر لیا اور کہنے لگا کیوں ابومسلم تم نے خلیفہ سفاح کو نزولی زمینوں کے نہ لینے کو لکھا تھا؟

ابومسلم - ہاں مجھے یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ یہ امر اُن کے لئے جائز نہ ہوگا۔ لیکن اس کے بعد میں نے اس خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہی کے فرمان کے بموجب عمل کیا کہ آپ حضرات کا دودمانِ نبوت، معدنِ علم وعمل ہے۔

منصور - اچھا تم اس کی وجہ بتاؤ کہ تم سفر حج میں میرے آگے آگے کیوں رہتے تھے؟

ابومسلم - مجھے یہ بات کچھ پسندیدہ نہ معلوم ہوئی کہ ہم اور آپ ایک چشمہ پر جمع ہوں۔

منصور - کیا تم یہ بتلا سکتے ہو کہ جب تم کو سفاح کے انتقال کی خبر ملی تھی تو تمہیں کونسی چیز میری طرف مراجعت کرنے یا قیام کر دینے سے مانع تھی؟ اگر کم از کم تم ٹھہر جاتے تو میں ہی تمہارے پاس پہنچ جاتا؟

ابومسلم - میں نے لوگوں کو نفع پہنچانے اور آپ سے پیشتر کوفہ پہنچ جانے کے خیال سے مراجعت یا قیام نہ کیا۔

منصور - اچھا تم نے میرے حکم کی تعمیل کیوں نہ کی اور تم خراسان کیوں جا رہے تھے؟

ابومسلم - میں اس ارادہ سے عازم خراسان ہوا تھا کہ وہاں سے عذرخواہی

کرکے آپ سے صفائی کرونگا۔

منصور۔ اچھا وہ زر و مال کہاں ہے جو تم نے حران میں جمع کیا تھا؟

ابومسلم۔ میں نے وہ مال فوج میں تقسیم کر دیا۔

منصور۔ کیا تو مراسلات میں اپنا نام میرے نام سے پہلے نہیں لکھا کرتا؟ کیا تو نے میری پھوپھی آسیہ بنت علی سے نسبت نہیں ٹھہرائی؟ کیا تو اس بات کا مدعی نہیں ہے کہ تو سلیط بن عبداللہ بن عباسؓ کا پوتا ہے؟ اللہ اللہ تو نے اپنی بساط سے بڑھکر قدم مارا۔ رُوسیاہ تو نے نہایت سنگلاخ راستہ اختیار کیا۔

ابومسلم ہنوز کچھ جواب نہ دینے پایا تھا کہ منصور نے پھر غیظ و غضب کے لہجہ میں کہنا شروع کیا "کیوں بے خود سر تو نے سلیمان بن کثیر کو ناحق کیوں قتل کیا؟ کیا وہ ہمارا ہوا خواہ نہ تھا؟ کیا وہ اُس زمانہ سے ہمارا نقیب نہ تھا جب کہ تو ابھی ہمارا شریک کار بھی نہ ہوا تھا؟

ابومسلم۔ چونکہ اس نے میری مخالفت کی۔ میں نے اسے ہلاک کر دیا۔

یہ سن کر منصور کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا لیکن کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ ابومسلم جرأت کرکے بول اٹھا۔

ابومسلم۔ جناب والا! یہ میری ان خدمات کا صلہ ہے جو میں نے اس وقت تک انجام دیں۔

منصور۔ (ڈانٹ کر) اے شیطان کے بچے اگر تیری جگہ پر کوئی اور ہوتا تو میں اس کو کارگذاریوں کا صلہ دیتا۔ لیکن یہ تو بتا تو نے کیا کیا؟ کیا ہماری بدولت تو نے گلچھرے نہیں اڑائے؟ کیا تو ہمارے صدقہ سے ترقی پا کر آسمان عزت پر نہیں چمکا؟

ابومسلم نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور سر نیچا کرکے منصور کے ہاتھ کو بوسہ دینے اور معذرت کرنے لگا۔ مگر منصور کی آتشِ غضب بھڑکتی چلی گئی۔ یہ دیکھ کر ابومسلم بھی آپے سے باہر ہو گیا اور عالم برافروختگی میں کہنے لگا۔ جانیے مجھے آپ کی پروا نہیں۔ میں اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔

ابومسلم پر قاتلانہ حملہ

اس پر منصور نے اس کو گالی دی اور ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر مارا۔ تالی کا بجنا تھا کہ محافظ پردہ سے نکل آئے۔ عثمان بن نہیک نے لپک کر ابومسلم پر ایک وار کیا۔ ابومسلم نے گھبرا کر کہا امیر المومنین مجھے میرے دشمن کے لئے زندہ رہنے دیجئے۔ منصور نے کہا اگر میں تم ایسے خوفناک دشمن کو پناہ دوں تو خدا مجھے ہلاک کرے" اس فقرہ کے تمام ہوتے ہی دربانوں نے تلواریں بے نیام کریں اور ابومسلم پر جھپٹ پڑے۔ یہ دیکھ کر ابومسلم کے کلیجہ سے ایک آہ نکلی۔ حملہ آوروں نے اسے آناً فاناً خواب مرگ میں سلا دیا۔ ؎

ارباب نظر کے لئے یہ واقعات عبرت و بصیرت کی درسگاہیں۔ جو کوئی اپنی بساط سے بڑھ کر قدم مارتا ہے اور اپنی قدر و حیثیت کو نہیں پہچانتا اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔ انقلاب زمانہ کا تماشہ دیکھو اور نیرنگیٔ فلک کی کرشمہ سازیوں پر غور کرو۔ کہ وہی ابومسلم جس کے نام کی ہیبت سے بڑے بڑے گردن فراز سپاہ سالار لرز جاتے تھے کس بیکسی کے عالم میں بیجان پڑا ہوا ہے۔

ابومسلم کے مارے جانے کے بعد وزیر السلطنۃ باہر آیا اور یہ کہہ کر ابومسلم کے آدمیوں کو واپس کر دیا کہ امیر صاحب (ابومسلم) ابھی خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں رہیں گے۔ تم لوگ واپس جاؤ۔ ابومسلم کے ساتھی اور لشکری یہ سن کر قصر شاہی سے واپس آئے۔ اس کے بعد ان کو خلیفہ کے حکم سے انعام و اکرام دئے گئے جن میں سے ابواسحاق کو ایک لاکھ درھم انعام ملا۔

اس کے بعد منصور نے جعفر بن حنظلہ کو طلب فرما کر اس سے قتل ابومسلم کے متعلق مشورہ طلب کیا۔ جعفر نے اس کے قتل کی رائے دی۔ منصور نے کہا۔ جزاک اللہ دیکھو یہ اس کافر نعمت کا لاشہ پڑا ہے۔ جعفر کی نظر جونہی منصور کی داہنی جانب پڑی ابومسلم کی لاش دیکھ کر جوش مسرت سے کہنے لگا امیر المومنین! آج سے آپ کی خلافت کو استحکام نصیب ہوا"

تھوڑی دیر میں ابومسلم کے ماتحتوں میں سے ابواسحاق کو طلب کیا گیا۔ ابواسحاق کے دل پر ابومسلم کا اتنا رعب چھایا ہوا تھا کہ ابومسلم کے متعلق اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ منصور نے تشفی دیکر کہا جو تمہارے جی میں ہو بے خوف و ہراس بیان کرو۔ اس کے بعد ابومسلم کی لاش کی طرف اشارہ کرکے کہا دیکھو خدا نے عزیز و برتر نے اسے ہلاک کر دیا۔"

ابواسحاق یہ دیکھ کر سجدۂ شکر بجا لایا اور سر اٹھا کے عرض پیرا ہوا اس منعم حقیقی کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے آج امیر المومنین کی بدولت مجھے امن و اطمینان بخشا۔ اس کے بعد کہنے لگا امیر المومنین بخدا میری یہ حالت تھی کہ جب کبھی ابومسلم کے پاس جاتا تھا تو کفن پہن کے اور

؎ ابن خلدون جلد ۳ صفحات ۱۸۲ تا ۱۸۴

خوشبو لگاکے جانا تھا" یہ کہہ کر اس نے جھٹ اپنا جبّہ اتارا اور منصور نے دیکھا کہ اس کے نیچے وہ درحقیقت کفن پہنے اور خوشبو لگائے تھا۔ ابواسحاق کی اس مظلومی و بےبسی کو دیکھ کر خلیفہ کا دل بھر آیا اور کہنے لگا شکر کرو کہ تم کو عافیت ملی۔

حادثۂ قتل کے بعد منصور نے ابومسلم کی طرف سے ابونصر مالک بن ہیثم کے نام اس مضمون کا خط لکھوایا کہ جسقدر مال و املاک تمہارے پاس چھوڑ آیا ہوں وہ میرے پاس روانہ کردو۔ اور اس کے بعد خود بھی چلے آؤ"۔ ابومسلم نے ابونصر کو بوقت روانگی یہ تلقین کردی تھی کہ اگر میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ایسا خط آئے جس پر پوری مہر لگی ہو تو سمجھ لینا کہ میں اس خط کا فرستندہ نہیں ہوں۔ چونکہ منصور کے فرستادہ خط پر پوری مہر ثبت تھی ابونصر بھانپ گیا کہ یہ خط منصور کا لکھوایا ہوا ہے اور بقصد خراسان ہمدان کی طرف روانہ ہوگیا۔

منصور نے یہ خبر پاکر شہرزور کی سند حکومت لکھ کر اس کے پاس بھجوادی اور اسی کے ساتھ زہیر بن ترکی عامل ہمدان کے پاس اسکی گرفتاری کا فرمان بھی بھیجدیا۔ جوں ہی ابونصر ہمدان پہنچا زہیر نے اسکو ضیافت کا حیلہ کرکے بلابھیجا اور گرفتار کرلیا۔ لیکن جب اس کے بعد خلیفہ کی جانب سے شہرزور کی سند حکومت ابونصر کے نام پہنچی تو زہیر نے اسے رہا کردیا۔ اس کے دوسرے روز منصور کا فرمان پہنچا کہ ابونصر قتل کیا جائے۔ زہیر نے اس فرمان کے جواب میں لکھا کہ میں نے پہلے اسے گرفتار کیا تھا لیکن جب اس کے نام شہرزور کی حکومت کا فرمان آیا تو اسے رہا کردیا"۔ سچ ہے جس کی خدا حفاظت کرے اس کا کوئی بال تک بیکا نہیں کرسکتا۔

ابونصر اپنی مخلصی کے بعد بارگاہ خلافت میں پہنچا خلیفہ نے اسکو اس بات پر ملامت کی کہ تم نے ابومسلم کو خراسان جانے کا کیوں مشورہ دیا تھا۔ ابونصر عرض پیرا ہوا امیرالمومنین واقعی ابومسلم نے مجھ سے صلاح لی اور میں نے اسکو نیک مشورہ دیا۔ اگر امیرالمومنین بھی مجھ سے کبھی امر میں مشورہ کریں گے تو میں اپنی صوابدید کے موافق نیک مشورہ سے کبھی دریغ نہ کرونگا۔ میری اس میں بھلا کیا خطا ہے؟ یہ سنکر منصور نے اسے عواطف خسروی سے مخصوص فرمایا اور اس کے خلوص نیت پر اتنا خوش ہوا کہ اس کو موصل کا گورنر بناکے بھیج دیا؎۔

جب ابومسلم مارا گیا تو ابوجعفر منصور کا دیدۂ دل حصول اطمینان سے روشن ہوا۔ ابومسلم کی طرف سے جو جو خطرات ہر وقت دل کو بےچین کررہے تھے رفع ہوگئے۔ حادثۂ قتل کے بعد منصور نے جامع مسجد کے ممبر پر چڑھ کر ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا جس میں کہا:-

> اے لوگو تم اُنس اطاعت کی جگہ وحشت عصیان کی راہ اختیار نہ کرو۔ صراط مستقیم پر گامزن ہونے کے بعد باطل کی تاریکیوں میں نہ بھٹکو۔ اس میں شبہ نہیں کہ ابومسلم کا آغاز خیر و خوبی کے ساتھ ہوا تھا۔ لیکن انجام بدکوشی پر ہوا۔ اس کی بدباطنی اس کے حسن ظاہر پر غالب آگئی اور آخرکار ہم کو اس کے خبث باطن اور فاد نیت کا اس درجہ یقین ہو گیا اگر اس کے صحیح حالات کسی ناصح مخلص کو معلوم ہوجاتے تو وہ ہمیں اُس کے اتنے دنوں آزاد چھوڑ رکھنے پر ملامت کرتا۔ ابومسلم برابر بیعت کو توڑتا اور ہمارے ذمہ کی تحقیر کرتا رہا۔ حتیٰ کہ ہمارے لئے اس کا خون مباح ہوگیا۔ اور اس کی سابقہ خدمات اجرائے حق کی راہ میں کسی طرح حایل نہ ہوسکیں"؎

خاکسار

ابوالقاسم رفیق دلاوری

؎ ابن خلدون جلد ۳ صفحہ ۱۸۴ ؎ ابن اثیر جلد ۵ صفحہ ۲۲۴

مرزا جمّن

مرزا جی پرانی وضع قطع کے آدمی تھے - آپ کی جو بات تھی لاجواب تھی - نماز اور روزہ کے تو سرے سے پابند نہ تھے - ہاں پیر پرستی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی - جمعہ کے روز علی الصبح خط بنواتے - پھر داڑھی - مونچھوں اور سر کے بالوں میں مہندی وغیرہ لگا کر گل حکمت ہو کر بیٹھ جاتے - غسل کے بعد پوشاک بدلتے اور بڑے شوق سے عطر لگاتے - لوگ تو مسجد کو جاتے اور آپ گھر کے صحن میں بیٹھ کر چوسر کھیلتے - لیکن زبان سے یا صمد کا ورد کرتے رہتے -

گھر سے جو کہیں جانا ہوتا تو بار بار "لو بھئی ہم تو جاتے ہیں - اب اللہ کے حوالے -"

"ابے او چھٹو بیٹا! شوخی مت کیجیو - اچھا اللہ کو سونپا تمہیں" اور پھر گھر والی سے "بچوں کا خیال رکھیو تم" کہتے ہوئے اور بار بار پلٹ کر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے تشریف لیجاتے -

جمّن کوئی دس بارہ برس کا ایک لڑکا تھا - یہ ہر وقت مرزا صاحب کے اردل میں رہتا اور سائے کی طرح ساتھ ساتھ لگا پھرتا - بازار جاتے تو دس پانچ قدم چل کر پکارتے -

"ابے او جمّن!"

اور لڑکا جواب دیتا

"یہ رہا مرزا جی -"

یار لوگوں نے آپ کا نام بھی مرزا جمّن ڈال رکھا تھا -

جب گھر سے نکلتے تو مرزا صاحب کی چھڑی بھی جمّن کے ہاتھ میں ہوتی اور چھاتا بھی - ایک پنکھا بھی اور ایک پاندان بھی - خانہ گی کے موڑ تک ہی جانا ہو - جمّن جلدی کی یہ ضروری چیزیں بغل میں دبائے ساتھ ساتھ ہوتا - اب دیکھنے والے حیران ہیں کہ یہ کیا تماشہ ہے - ایک روز مرزا صاحب اس شان سے چوک میں کھڑے چند دوستوں سے باتیں کر رہے تھے - کچھ جنگ پر باتیں ہو رہی تھیں - مرزا صاحب فرما رہے تھے -

"اجی! جرمن کی قوت کا بھی کیا ٹھکانا - ایسے ایسے جنگی آلات بنائے ہیں کہ فلک پر فرشتے بھی کان پکڑیں - یہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ ایسے گولے تیار کئے گئے ہیں جو دشمن کی بُو پا کر ان کے سر پر جا پھٹتے ہیں - اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ راشن (خوراک) کی ایسی گولیاں تیار ہوئی ہیں - کہ ایک گولی کھا لینے سے سپاہی کو آٹھ روز تک بھوک اور پیاس نہیں لگتی -"

ایک طرف سے آواز آئی -

"واہ مرزا جمّن!"

آپ اِدھر اُدھر گھور گھور کر دیکھنے لگے -

"بکنے دیجئے" ایک بولا - "اور ہاں مرزا صاحب ہم نے تو سنا ہے کہ جرمن والا ہندوستان پر بھی حملہ کرنے والا ہے -"

مرزا جی بڑی سنجیدگی سے بولے -

"اور اس میں شک ہی کیا ہے - اجی جرمن والا تو اس ملک کی چپہ چپہ زمین ماپ گیا ہے - اور خاص خاص مقامات پر گولے مارنے کے لئے نشانات بھی لگائے گئے ہیں -"

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں - یہ گولے کہاں سے پڑینگے" ایک نے پوچھا - مرزا جی ہنسکر بولے -

"اتنی بات بھی نہیں سمجھتے آپ - اجی حضرت! جرمن والوں نے اس قسم کی توپیں بنا رکھی ہیں - جن سے اپنے ملک سے بیٹھے یہاں گولے ماریں گے -

ایک آواز -

"اجی کیا کہنے آپ کے مرزا جی - حد کر دی مرزا جمّن آپ نے"

مرزا صاحب پھر آستین چڑھا کر اِدھر اُدھر آنکھیں پھرا پھرا کر دیکھنے لگے -

"اجی جانے بھی دیجئے آپ" ایک نے کہا - "ہاں مرزا جی یہ تو فرمائیے یہ آپ جب گھر سے نکلتے ہیں تو کام کو جاتے ہیں یا حج کرنے"

مرزا جی بولے -

"کیوں بھئی یہ اعتراض کیا لے بیٹھے تم - کونسی بات ہم نے دنیا جہاں سے انوکھی کی -

"آپ کہتے کیوں نہیں - کچھ بولو گے بھی؟"

"آپ خفا نہ ہوں تو کچھ عرض بھی کریں -"

"کافر ہو جو خفا ہو" مرزا صاحب بولے۔ "لیکن اس قسم کی خرافات بکنے کا کچھ مطلب بھی۔ اجی تمہارے بڑوں کو بات کرنے کا سلیقہ نہ آیا۔ تمہیں کہاں سے آنا تھا۔ الم غلم جو منہ میں آیا بک دیا۔ انسان ہو حیوان تو ہو نہیں۔ اب کچھ کہو تو ہم سنیں بھی۔ کچھ پوچھو تو ہم بتلائیں بھی۔ اب بولتے کیوں نہیں؟"

"یہ چھڑی چھاتا۔ پنکھا اور گلاس اور پاندان کیوں ساتھ اٹھائے پھرتے ہیں آپ؟"

"ہوں" مرزا جی بولے۔ "بس اتی عقل پہ آدمی بنے پھرتے تھے تم۔ انسان بات بھی کرے تو شعور سے تو کرے۔ لو اب سنو اب ہم سے۔ راستہ چلتے چلتے اگر کہیں سانپ وانپ نکل آئے تو پھر کیا لاٹھی ڈھونڈتے پھرینگے ہم۔ اور اگر بارش آجائے یا سخت دھوپ ہو تو کیا چھاتا کام نہ دیگا۔ گرمی سے پسینہ بہنے لگے تو کیا پنکھے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور پیاس لگے گی تو کیا اچھوتوں کی طرح چلّو سے پانی پیئینگے۔ اور پھر اگر گلوری کی ضرورت ہو تو کیا شہدوں کی طرح تنبولی کی دوکان پر جا کھڑے ہوں باپ دادا کی ناک کٹوائیں۔ کیوں اب تو سمجھ گئے تم۔ لیکن تم کیا سمجھو گے۔ یہ باتیں تو بہت ٹھوکریں کھانے سے حاصل ہوتی ہیں"

"سچ تو کہتے ہیں" ایک بولا۔ "گدھا ٹھوکر کھائے بغیر کب ٹھیک کام کرتا ہے۔ ایسے ہی تو مرزا جی نے بھی سیکھی ہیں"

"کیوں جی!" مرزا جی غصہ سے آستین چڑھا کر بولے۔ "تو گویا ہم گدھے ہوئے نا؟" اور پھر۔ "ابے او جمن!"

"سچ تو کہتے ہیں" جمن اکڑ کر بولا۔ یار لوگوں نے ایک قہقہہ لگایا۔

"چپ بندر کہیں کا۔ سمجھ لیں گے تجھ سے گھر چل کر" اور پھر دوستوں کی طرف دیکھکر

"تو ہاں پھر تو ہم گدھے ٹھہرے نا"

ایک ۔ "اپنی اپنی سمجھ ہے مرزا جی۔ جو آپ سمجھیں وہی درست۔ اب ہم جو اسکے خلاف کہیں تو گستاخ بنیں۔ بے ادب کہلائیں"

"لو جی! یہ ہے چودھویں صدی" مرزا جی بولے۔ "ابے او جمن!"

"یہ رہا مرزا جی۔ کیا دوں؟ چھڑی یا چھاتا؟"

"چپ رہ نامعقول۔ اب چل گھر۔ پیر جی سے پوچھیں گے۔ ایسے دوستوں سے ملنا جلنا حرام ہے یا حلال؟"

ایم اسلم

آمدِ بہار

نزہت فصلِ بہاری عیش کی بنیاد ہے — محفلِ گلشن سزاوارِ مبارکباد ہے

کونسا دل ہے جو اب مجبور ہے، ناشاد ہے — بلبلِ فریاد کش بیگانۂ فریاد ہے

داستانِ قیس ہے، افسانۂ فرہاد ہے — پتے پتے کی زباں پر عشق کی روداد ہے

پنجۂ شاہینِ وحشت سے چمن آزاد ہے — تھا جو ویرانہ کبھی اب عندلیب آباد ہے

میرے دل کی اجڑی دنیا میں بھی آجائے بہار
میرے باغِ آرزو کو جگمگا جائے بہار

(غیر مطبوعہ)

اختر انصاری
(دہلوی)

"چوری"

سائنس دان نے ایک چھوٹی سی شیشی کو خوردبین کے نیچے رکھتے ہوئے کہا:-

"اس شیشی میں ہیضہ کے جراثیم بند ہیں"

زرد رو آدمی نے خوردبین میں سے دیکھا اور بولا "مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا"

سائنس دان نے کہا۔ "اس پیچ کو گھمایئے شاید آپ کو صاف طور پر نظر آئے۔"

ٹھیک ہے ٹھیک گلابی رنگ کے ہلکے ہلکے نشان ہیں کیا قیامت ہے کہ یہ ذرے بڑھکر ایک شہر کو تباہ کر سکتے ہیں"

پھر اس نے شیشی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا "یہ زندہ ہیں؟"

سائنس دان نے جواب دیا۔ "نہیں"

زرد رو آدمی نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ کے پاس زندہ اور مہلک جراثیم تو نہ ہونگے"

"زندہ جراثیم بھی ہمارے پاس موجود ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شیشی"

سائنس دان نے الماری میں سے ایک شیشی نکالی اور کہا "یہ شیشی ہیضہ کے زندہ جراثیم سے پُر ہے"

زرد رو ملاقاتی کے چہرہ پر اطمینان کے آثار پیدا ہوئے۔ اُس نے شیشی کی طرف حریصانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "کسقدر خطرناک شے ہے"

سائنس دان اپنے ملاقاتی کے چہرہ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے سیاہ بال گہری سیاہ آنکھیں بُتا ہوا چہرہ کئی اعتبارات سے جاذب توجہ تھا۔ یہ شخص سائنس دان کی ہر بات میں دلچسپی لیتا تھا۔ سائنسدان نے غور سے تنکر کہا "اس شیشی میں ہیضہ قید ہے۔ ایک بار اس شیشی کو پانی کے کسی حوض میں توڑ ڈالئے اور پھر موت کے کرشمے دیکھئے۔ پُر اسرار غیر متوقع خوفناک دردخیز موت شہر میں موت کا فرشتہ اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتا پھریگا۔ خاوند بیوی سے جدا ہو جائیگا۔ ماں بچے سے چھوٹ جائیگی۔ موت پانی کے ذریعہ سفر کرتی ہوئی گلیوں میں داخل ہو جائیگی کنبوں کو مہلک کر دیگی۔ برتنوں میں چھپکر بیٹھ جائیگی۔ برف کے اجزا میں مل جائیگی۔ زمین میں غرق ہوکر ہزاروں جگہ اپنا خوفناک سر نکالیگی ایک بار اس شیشی کو شہر کے پینے والے پانی میں ملا دو پھر تماشا دیکھو۔"

زرد رو آدمی کا چہرہ مسرت سے تمتما رہا تھا اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"میں کہتا ہوں کہ انارکسٹ جو نظام حکومت کو برباد کرنا چاہتے ہیں ہیضے کی شیشیوں سے کیوں نہیں کام لیتے"

دروازے کو کسی نے آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ سائنس دان نے دروازہ کھولا اسکی بیوی دروازے کے پیچھے سے کہہ رہی تھی۔

"ذرا بات سننا"

جب سائنس دان واپس کمرے میں داخل ہوا تو اس کا ملاقاتی اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا سائنس دان کو دیکھ کر اس نے کہا "مجھے گمان بھی نہ تھا کہ میں نے آپ کا ایک گھنٹہ ضایع کر دیا۔ مجھے خود چار بجے ایک جگہ پہنچنا ہے حقیقت میں آپ کی باتوں نے میرے دل میں کوئی اور خیال آنے ہی نہیں دیا۔"

ملاقاتی کمرے سے باہر نکل گیا سائنس دان نے اپنے ملاقاتی کی طبعی خصوصیات پر غور کرنا شروع کیا "یقیناً وہ ایک غیر معمولی آدمی تھا۔ بیماری کے مہلک جراثیم دیکھ کر اسے کتنی مسرت حاصل ہوتی تھی اس کا چہرہ کسقدر تمتمانے لگتا تھا"

معاً اسے ایک پریشان کن خیال آیا۔ اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں پھر میز کی طرف گیا پھر بھاگا بھاگا بیوی کے پاس پہنچا اور چلایا "نسرین"

"کیوں کیا بات ہے"

"جب میں یہاں آیا تھا تو میرے ہاتھ میں کوئی چیز تو نہ تھی"

اسکی بیوی نے کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد جواب دیا "نہیں

تو مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے۔"

سائنس دان یا اللہ کہتے ہوئے سلیپر پہنے ہوئے سرپٹ بھاگا نسرین دروازے کو زور سے بند کرنے کی آواز سنکر کھڑکی کی طرف آگئی ایک تپلا دبلا سیاہ بالوں والا آدمی ایک ٹانگے میں سوار ہو رہا تھا۔ سائنس دان سر ننگے سلیپر پہنے ہوئے ٹانگے کی طرف بھاگ رہا تھا اس کے پاؤں میں سے ایک سلیپر نکل گیا لیکن اس نے کوئی پرواہ نہیں کی نسرین نے اپنے دل میں کہا پاگل ہو گئے ہیں۔ سائنس نے ان کا دماغ خراب کر دیا اور وہ چاہتی تھی کہ وہ کھڑکی کھول کر اپنے خاوند کو آواز دے کہ دبلا تپلا آدمی دوڑ کر ٹانگے پر چڑھ گیا غالباً وہ بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ سائنس دان پاگل ہو گیا ہے اس نے نیم برہنہ پا سائنس دان کی طرف اشارہ کیا اور ٹانگے والے سے کچھ کہا ٹانگے والے نے گھوڑے کو چابک لگایا اور گھوڑا ہوا ہو گیا۔ سائنس دان نے بھی گھوڑے کی سی تیز رفتاری سے بھاگنا شروع کیا۔

کچھ عرصہ نسرین کھڑکی میں کھڑی رہی اس نے سوچا "یہ تو بڑی آفت ہوئی مان لیا کہ سائنس دان اور شاعر سوسائٹی کے قواعد سے کسی حد تک آزاد ہوتے ہیں۔ لیکن آزادی کی کوئی حد بھی ہونی چاہیئے۔ اندنوں لاہور میں جرابیں پہنکر بھاگنا" ——

اس نے اپنا برقع پہنا خاوند کے جوتے اور ٹوپی ہاتھ میں لی اور گھر سے باہر نکل آئی۔ اتفاق سے ایک ٹانگہ گزر رہا تھا وہ ٹانگے پر بیٹھ گئی اور کوچوان سے کہا "سیدھے چلو مجھے ایک ایسے آدمی کی تلاش ہے جو نیلا فراک کوٹ علی گڑھی شلوار پہنے ہوئے جوتی اور ٹوپی کے بغیر بھاگ رہا ہے۔"

ٹانگے والے نے اطمینان سے جواب دیا:۔

"نیلا کوٹ بیگم صاحب جوتی اور ٹوپی ندارد؟"

اور اس نے اس انداز سے گھوڑے کو چابک لگایا گویا وہ تمام عمر اس پتے سے ہر شریف آدمی کو ڈھونڈتا رہا ہے۔

کوئی پانچ منٹ کے وقفہ کے بعد لوہاری دروازے کے اڈے کے ٹانگے والے متحیر ہو گئے ایک ٹانگہ گزرا جسکا گھوڑا بگٹٹ جا رہا تھا۔

ایک بوڑھے کوچوان نے کہا "یہ تو ناجو کا ٹانگہ ہے آج اسے کیسا کرایہ دار مل گیا جو گھوڑے کو بگٹٹ دوڑائے لئے جا رہا ہے۔"

ایک نوجوان کوچوان بولا:۔

"دیکھو تو کمبخت چابک پہ چابک لگائے جا رہا ہے۔"

اتنے میں ایک اور ٹانگہ گزرا جو پہلے سے بھی زیادہ تیز جا رہا تھا۔

بوڑھا کوچوان بولا:۔

"لو اور تماشا دیکھو شاید دوڑ ہو رہی ہے یہ علو کا ٹانگہ ہے۔"

کئی کوچوان یک زبان ہو کر چلائے۔

"شاباش ناجو مار ایک اور چابک۔"

پھر یکبارگی ایک طوفان شور برپا ہو گیا:۔

"شاباش ناجو واہ رے علو نکل جا صاف مار چابک اڑا لے جا بھگا لے جا۔"

ابھی یہ آوازیں فرو نہ ہوئی تھیں کہ ایک اور ٹانگہ گزرا۔ اس ٹانگے کو دیکھ کر کوچوانوں نے تالیاں بجائیں۔ پہلے ٹانگے میں جو شخص بیٹھا تھا وہ ہیضے کے مہلک جراثیم کی شیشی کو جان عزیز سے زیادہ گراں مایہ متاع سمجھکر مضبوطی سے ہاتھ میں تھامے ہوئے تھا اس کے دل میں متضاد جذبات کا ہجوم تھا وہ خائف تھا کہ کہیں اس کا مقصد پورا ہونے سے پہلے اسے گرفتار نہ کر لیا جائے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ شاداں بھی تھا وہ چاہتا تھا کہ اس شیشی کو جس میں اسقدر ہلاکت آفریں امکانات پوشیدہ ہیں شہر کے پانی کے ذخیرے میں انڈیل دے وہ ایک انارکسٹ تھا اور باقی انارکسٹ احمقوں کی طرح سمجھتا تھا کہ شاید عام ہلاکت سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ ابھی سے اپنے آپ کو ایک شہید تصور کر رہا تھا۔ یکایک شیشی اس کے ہاتھ میں ٹوٹ گئی کچھ سیال سی شے گر گئی کچھ شیشی میں رہ گئی۔

انارکسٹ کے بدن میں کپکپی پیدا ہو گئی۔ اس نے شیشی کو منہ کے ساتھ لگا کے باقی قطرے حلق میں انڈیل لئے۔ اب اسے احساس ہوا کہ سائنس دان سے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ اپنا کام کر چکا تھا۔ ہیضہ کے مہلک جراثیم اس کے بدن میں داخل ہو چکے تھے اور اب خدا نے چاہا تو یہ متعدی مرض دوسروں کو بھی لگ جائیگا وہ ٹانگے سے اتر پڑا۔ اور اطمینان سے سائنس دان کا انتظار کرنے لگا متوقع موت کے احساس نے اس کے انداز میں ایک شان وقار پیدا کر دی تھی جب سائنس دان قریب آیا تو انارکسٹ نے کہا:۔

"میرے عزیز دوست تم بہت دیر سے پہنچے"
اس نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا اور بولا:-
"میں نے ہیضے کے مہلک جراثیم پی لئے ہیں اب ہیضہ شہر میں پھیل جائے گا۔ میں ایک انارکسٹ ہوں۔"
سائنس دان نے انارکسٹ کی طرف تعجب اور غور سے دیکھا۔
"تم نے اسے پی لیا انارکسٹ! اچھا اب میں سمجھا"
وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ سوچکر چپ رہا۔ اس کے چہرے پر ایک خفیف سا تبسم تھا۔ انارکسٹ تانگے میں سے اترا اور انارکلی کی طرف چلدیا۔ وہ قصداً دوسرے آدمیوں سے مس کرکے چلتا تھا تاکہ متعدی بیماری سب کو لگ جائے۔ ادھر سائنسدان اپنے خیالات میں اسقدر مستغرق تھا کہ اس نے اپنی بیوی کے آنے پر ذرا بھی اظہار تعجب نہ کیا۔
"جوتے پہن لوں کیوں نہیں کوٹ بھی پہن لوں ہاں ہاں کیوں نہیں۔"
اور یہ کہنے کے بعد سائنس دان پھر اپنے خیالات میں مستغرق ہوگیا۔ نسرین کو یقین ہوگیا کہ اس کا خاوند قطعی پاگل ہوگیا۔
یکایک سائنسدان قہقہہ مار کر ہنسا۔
"بات یہ ہوئی نسرین کہ صبح یہ شخص میرے پاس آیا اور میری دوائیوں میں بڑی دلچسپی لیتا رہا۔ دراصل وہ ایک انارکسٹ تھا۔ دیکھو غش نہ کرو۔ ورنہ میں اپنی کہانی ختم نہ کرسکونگا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ ایک انارکسٹ ہے۔ میں نے اس کی اشتہا کو بڑھانے کے لئے حماقت سے یہ کہدیا کہ اس شیشی میں ہیضے کے جراثیم بند ہیں۔ یہ بات بالکل غلط تھی دراصل اس شیشی میں بیکٹریم کی وہ قسم بند تھی جس کی وجہ سے بندروں کے جسم پر نیلے دھبے پڑ جاتے ہیں اور یہ شخص اس شیشی کو لے کر بھاگ گیا کہ لاہور کے پانی کے ذخیرے کو ہیضہ کے جراثیم سے آلودہ کر دے اور اب اس نے وہ شیشی پی لی ہے۔ خدا ہی جانے اب کیا ہوگا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ اس دوائی کا ایک قطرہ پینے سے بلی کا رنگ گہرا نیلا ہوگیا تھا۔ دیکھیں انارکسٹ صاحب کا رنگ کیا ہوجاتا ہے ——
"ابھی تک میں نے اپنا کوٹ نہیں پہنا؟ لیکن میں اپنا کوٹ کیوں پہنوں؟ ان گرمیوں میں کوٹ کی کیا ضرورت ہے —— اس لئے کہ راہ میں حکیم احمد علی کا مکان پڑتا ہے۔ لیکن میری جان حکیم احمد علی کوئی دسمبر کی ٹھنڈ تو نہیں ہے۔ جس سے بچنے کے لئے کوٹ پہنا جائے۔ کیا کہا؟ اچھا لاؤ کوٹ مجھے دو پہنے لیتا ہوں۔

غزل

طوفاں بپا ہے اشکوں کا اور درد میں ڈوبے نالے ہیں!
وہ یاد آئے پھر ٹھیس لگی۔ پھر اپنی جان کے لالے ہیں
معلوم نہیں کیا بات ہے یہ۔ کیا بھید ہے یہ۔ کیا راز ہے یہ
اکثر وہی دیکھے وقفِ الم۔ جو سو نازوں کے پالے ہیں
امیدِ وفا و یادِ جفا۔ بے تابیٔ حسرتِ نظارہ
اک دل بیمارِ محبت ہے اور لاکھ ستانے والے ہیں!
کیوں صامت محوِ تفکر ہے۔ نادان تجھے معلوم نہیں!
ہر کالی رات کے پردے میں مستور سحر کے اُجالے ہیں!

صامت شامی
بی۔ اے

بچے

یہ حسین معصوم بچے اِن کی عمریں ہوں دراز ــ مہ جبیں معصوم بچے اِن کی عمریں ہوں دراز
اِن کی روحیں عصمت و پاکیزگی کی جان ہیں ــ اِن کی بھولی بھالی شکلیں زندگی کی شان ہیں
گلستانِ زیست کے یہ نرم و نازک نونہال ــ جن کے اک اک نقش سے مسحور ہے تابِ جمال
کسقدر سرسبز ہیں، شاداب ہیں، مسرور ہیں! ــ کسقدر مسرور ہیں بشاش ہیں مسحور ہیں!
آہ اِن کو انقلابِ آسماں کی کیا خبر ــ آہ اِن کو گردشِ دورِ زماں کی کیا خبر
خارزارِ زندگی ان کے لئے گلزار ہے ــ وادیٔ پُر شورِ عالم جنّت بے خار ہے
اِن کے سینے آتشِ احساس سے ویراں[1] ہیں ــ اِنکے دل بے لوث ہیں ٹھنڈے ہیں بے ہیجان ہیں

منحصر ہے اِن کے ایما پر نظامِ کائنات ــ اِن کے قبضے میں ہے گویا صبح و شامِ کائنات
سب فرشتوں کی طرح معصوم تھے بیباک تھے ــ خواہش و تحریص کے مہلک اثر سے پاک تھے
خون آشامی کا زہریلا نشہ چھایا نہ تھا ــ ظلم کی تحریک کا ہنگامِ بد آیا نہ تھا!

انقلابِ آسماں کا دَور جاری ہے مدام ــ گردشِ پیہم سے ذرّوں کو نہیں حاصل قیام
حشمتِ جمشید ہو یا بختِ دارا کا عُروج ــ ملّتِ بیضا کے دن ہوں یا نصاریٰ کا عُروج
عالمِ فانی میں کوئی طاقتِ گردوں مدار ــ رہ نہیں سکتی ہمیشہ بامراد و کامگار

یہ حسین معصوم بچے اِن کی عمریں ہوں دراز ــ مہ جبیں معصوم بچے اِن کی عمریں ہوں دراز
اِن کو نیک اعمال کی توفیق دے ربِّ جلیل ــ نیک و بد میں قوّتِ تفریق دے ربِّ جلیل
اِن کے سینے غیرت و اخلاق سے معمور ہوں ــ اِن کی روشن خاک کے ذرّے مجسّم نور ہوں
ایک دن نامِ خدا یہ بھی جواں ہو جائیں گے ــ اور ناموسِ وطن کے پاسباں ہو جائیں گے

عدمؔ

---

[1] ویران ــ ؟

چند دکھنی مرثیہ گو

گذشتہ مضمون میں (جون ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا ہے) ہم نے ذکر کیا تھا کہ عہد عادل شاہی اور قطب شاہی کے چند ایسے شعراء پیش کئے جائیںگے جن کا گویا پیشہ ہی مرثیہ گوئی تھا۔ نہیں معلوم ایسے بھی کتنے شعراء تھے جنہوں نے مرثیہ گوئی کو اپنا پیشہ بنالیا تھا۔ یہاں ہم صرف چار نام پیش کرتے ہیں یعنی کاظم (گولکنڈہ) شاہی (گولکنڈہ) مرزا (گولکنڈہ) مرزا (بیجاپور)۔

(۱) کاظم۔ ان کا نام کاظم علی اور کاظم تخلص تھا۔ گولکنڈہ (حیدرآباد) کے باشندے تھے۔ عبد اللہ قطب شاہ کے عہد میں موجود تھے۔ کثرت سے مرثیئے کہے ہیں جو عام طور پر شہرت رکھتے ہیں۔ اڈنبرہ یونیورسٹی کے بیاض میں ان کے دس مرثیئے موجود ہیں۔

ان مرثیوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کاظم کا اسلوب بیان نہایت شگفتہ ہے۔ ان میں نہ صرف مرثیہ پن موجود ہے بلکہ ادبیت کی شان بھی پائی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے کاظم اپنے زمانہ کا ایک اعلیٰ اور بلند پایہ مرثیہ گو قرار دیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ کاظم کے دس مرثیئے اڈنبرہ کی بیاض میں موجود ہیں۔ ان کے اشعار کی تعداد (۲۰۴) ہے۔ افسوس ہے کوئی مرثیہ مکمل ہم نے نوٹ نہیں کیا۔ بطور نمونہ ان کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔

تم اپنے دلبراں کی خبر لو علی دلی
بے تاج سروراں کی خبر لو علی دلی
نیزوں اوپر سراں کی خبر لو علی دلی
ظلم و ستم گراں کی خبر لو علی دلی
آرام دل سکینہ بے تاب کوں نہیں
انکھیاں میں اُس کے راہ خواب کوں نہیں
کہیں نہایو درد کے اسباب کوں نہیں
غم ہائے بے کراں کی خبر لو علی دلی

ایک دوسرے مرثیہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

آج پڑے رن میں ہے جان حسینا
ظلم و ستم سوں بن سے حیران حسینا
حیدر کا دل میں سیلے ارمان حسینا
پاسے نہیں اس درد کا درمان حسینا

ایک اور مرثیہ کے چند شعر

پے نہیں ابن حیدر آج پانی
پکاریں دین کے رہبر آج پانی
کہاں روشے زمیں پر آج پانی
مگر در حوض کوثر آج پانی
دہن سوکا کہا ہے کاظم غم سوں میرا
نہیں یہاں آسرا میرا تیرا
قلم کرتا نہیں کاغذ پہ پھیرا
ظلم سہا ہی کوں نہ رہبر آج پانی

مندرجہ بالا انتخابات سے کاظم کے مرثیہ کا اندازہ بخوبی واضح ہو سکتا ہے۔ ادبی حیثیت سے قطع نظر زبان کی صفائی کے لحاظ سے بھی قابل داد ہے۔ بلکہ صفائی کے لحاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک قطب شاہی دور کے مرثیہ گو کا کلام نہیں ہے۔ بہر حال کاظم کا خاص درجہ ہے۔

(۲) شاہی۔ شاہ قلی خاں گولکنڈہ کا مرثیہ گو تانا شاہ کے ندیموں سے تھا۔ پہلے تو فوج سے تعلق تھا مگر علمی قابلیت کے باعث بہت جلد شاہی کو شاہی تقرب حاصل ہو گیا۔ مذہب کے لحاظ سے اس کو بڑا سخت تعصب تھا۔ اپنے مرثیوں میں صحابہ کی شان میں بڑی گستاخیاں کی ہیں۔

مرثیہ گوئی میں اس کو خاص مہارت تھی۔ اور اس کے مرثیئے عام طور پر مشہور اور مقبول تھے۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب کے سپاہیوں نے ان کو زبانی یاد کر لیا تھا۔ ان کے ذریعہ وہ شمالی ہند میں بھی پھیل گئے جہاں اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں بھی پڑھے جاتے تھے

اس کے دو مرثیئے اڈنبرہ والی بیاض میں اور ایک مختصر مرثیہ مولوی صفی الدین مرحوم والی بیاض میں موجود ہے۔ ادبی لحاظ سے اس کے مرثیئے نہایت بلند پایہ ہیں۔ واقعہ نگاری کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے۔ ادبی حیثیت کے سوا زبان کے لحاظ سے بھی وہ اعلیٰ شاعر قرار دیا جا سکتا ہے

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہائے غریب تیم نانے عابد تیری زاری ہے۔

باپ کا مرنا دکھ کا بھرنا تس پر یوں بیماری ہے
تیغ کھڑی ہے دشمن سر پر واویلا دکھ بھاری ہے
درد و مصیبت عابد تم پر آج کے دن لیے جاری ہے

جبرئیل کہیں بتلا مجھ کو نام ہے کیا اس وادی کا
سنا جب کربلا ہے سن حسین علی سے ہادی کا
کیا بہشت سے پیام لیا یا علی تیری دادی کا
کٹھن گھڑی ہو پوتے میرے مجھ پر کیا سنگ ساری ہے

(۳) مرزا (قطب شاہی) مرزا ابوالقاسم نام مرزا تخلص تانا شاہ کا مصاحب تھا۔ اس کے گرفتار ہونے پر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ مرثیہ گوئی میں یدِطولیٰ رکھتا تھا۔

قدیم تذکرہ نویسوں نے مرزا کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کے بعض شعر نقل کئے ہیں۔ مگر کسی نے اس کے مرثیہ گو ہونے کی صراحت نہیں کی۔ ہماری تحقیقات کے لحاظ سے یہ مرثیہ گو تھا۔ کثرت کے ساتھ مرثیے لکھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بڑی عمر پائی۔ کیونکہ سنہ ۱۱۵۰ھ تک زندہ رہنے کا پتہ چلتا ہے۔

مرزا نے مختلف عنوانوں کے تحت مرثیے لکھے ہیں۔ اور اکثر طویل ہیں مثلاً قصہ امام حسین کے عنوان سے ایک مرثیہ ہے جس کے (۱۰۱) شعر ہیں۔ قصہ امام قاسم کے مرثیہ کے (۲۱۶) شعر۔ قصہ حر شہید کے (۱۰۹) شعر۔ مرثیہ حضرت امام کے (۲۹) شعر ہیں۔

ان مرثیوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کیا بلحاظ واقعہ نگاری اور کیا بلحاظ اسلوب بیان اور طرز ادا اور کیا بلحاظ لطف محاورہ وہ اپنے وقت کا کامل الفن مرثیہ گو تھا۔ اگرچہ زبان کی صفائی کے لحاظ سے وہ سلیس نہیں ہیں لیکن کلام میں بلا کا اثر ہے۔

ذیل میں مرزا کے مرثیوں سے کچھ انتخاب پیش کیا جاتا ہے جس سے ہمارے دعوے کی تائید ہو سکتی ہے۔

قصہ حسین والے مرثیہ میں اصغر کی شہادت کا حال

کہوں دکھ درد اصغر کا اور نور چشم سرور کا
شہ غازی کے جوہر کا کرو زاری مسلمانان
عزیزاں دل ہوا پر خون یو سن اصغر کے ماتم کوں
کئے معصوم شہادت سوں کرو زاری مسلمانان

حسین اصغر کوں منگائے ان کے تیرے تو لیائے
یزاں لشکر کئے لاشے کرو زاری مسلمانان
جیتاں پر ہانک تب مارے کہے ملے سنگدلاں سارے
برائی میں تو تم ہارے کرو زاری مسلمانان

مرزا کی تشبیہیں ملاحظہ ہوں۔

ہوئی جب تشنگی غالب امام انس و جان اوپر
خبر یوں سن کے پانی نے آپس میں پچھایا ہے
شہیداں کا لہو پر یا جب کربلا کے میدان تے
فلک تعظیم سوں اسکوں شفق کر نے اچایا ہے
ہوا تن سے جدا جب سر شہنشاہ دو عالم کا
گگن سر کا ت سورج کا شفق کے لہو میں بہایا ہے

رات کی صراحت۔

محنت قتل کی رات ہے اہل حرم پر گھات ہے
دل چور اس غم سات ہے تیرے فراقوں یا حسین
یوں رات جگ غمناک ہے عالم پو سب دنیا کے ہے
پر خون جگر دل چاک ہے تیرے فراقوں یا حسین

جنگ کا دن تاریخ فوج کی تعداد کا ذکر۔

شہ پر یوں جس دن گھر یا ماتم رہیا جگ میں یو سوز
تب محرم کی دہم تاریخ تھا ہور جمعہ روز
شہ کنے چالیس پیادے تیس ہور دو تھے سوار
ظالماں کے دل منے تب تھے سواراں بیس ہزار

انتخاب بالا سے مرزا کے کلام کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اڈنبرا والی بیاض اور مولوی صفی الدین مرحوم والی بیاض میں اس کے متعدد مرثیے ہیں۔ جن کی صراحت طوالت کی موجب ہو گی۔

سرزمین دکن میں مرزا کا بلحاظ مرثیہ گوئی وہی درجہ ہے جو شمال میں انیس اور دبیر کا۔

(۴) مرزا (بیجاپوری) علی عادل شاہ ثانی کے عہد کا نامور مرثیہ گو تھا۔ جس نے سوائے مرثیے کے کسی اور صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ مرثیہ نویسی کا ایسا شوق تھا کہ انتقال کے وقت بھی ایک مرثیہ کا عنوان ہی لکھ رہا تھا۔ بادشاہ کا تقرب حاصل تھا۔ مگر کبھی کوئی قصیدہ لکھا اور نہ مدح گوئی کی بادشاہ نے خود اس سے خواہش کی۔ مگر اس نے مدح کے بجائے ایک مرثیہ میں بجائے اپنے تخلص کے بادشاہ کا نام لکھ دیا۔

مرزا اپنی مرثیہ گوئی کو ایک مذہبی فرض تصور کرتا تھا۔ اسی انہماک کا نتیجہ تھا۔ اس کو خواب میں بھی اس کی تلقین ہوتی تھی۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے مرزا اپنا مرثیہ سنا رہا تھا۔ ذیل کے شعر کے

دلان پاکہان انار ان کرکہو سیز طبق میاسے

مصرع ثانی کے لئے مضمون نہ مل رہا تھا اس پر مدہوشی طاری ہوئی۔ دیکھا کہ آنحضرت صلعم تشریف فرما ہیں۔ اور ارشاد ہوتا ہے کہ

بنی رو بیگے محشر کون یوں تحفہ کرسے جانا ہے

مرزا نے اس کو لکھکر مرثیہ ختم کیا۔ (ص ۹۲ بساتین السلاطین برٹش میوزیم) اس کی شہادت یوم عاشورہ ہوئی بیان کیا جاتا ہے۔ ایک مرثیہ لکھ رہا تھا۔ کسی ظالم نے خنجر سے ہلاک کر دیا۔ شاہ مرتضیٰ قادری کی درگاہ میں دفن کیا گیا۔ افسوس ہے سنہ وفات معلوم نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ تیقن کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۰۸۳ھ کے قبل اس نے شہادت پائی۔

منتخب السلاطین نے مرزا کا ذکر تعریف کے ساتھ کیا ہے چنانچہ لکھتا ہے۔

"یکے از شعرائے متقولین آں زماں مرزا مرثیہ خوانست کہ زبان خود وقف حمد و نعت حضرت سید المرسلین و منقبت آیہ طاہرین نمود۔ ہرگز برائے احدے از شاہ و گدا شعر نگفت مرثیہ ہائے بے شمار کہ در ماتم شہدائے کربلا گفت زبان زد خاص مردم دکن و دیگر بلاد گردید" (ص ۲۹)

یہ سب کچھ ہے۔ مگر افسوس اس کے مرثیے دستیاب نہیں ہوتے مولوی صفی الدین والی بیاض میں جو (۳۵) مرثیے ہیں وہ اپنے اندرونی شہادت کے لحاظ سے سب کے سب گولکنڈہ والے مرزا کے ہیں۔ البتہ اڈنبرہ یونیورسٹی کی بیاض میں مرزا کے سولہ مرثیے ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے بعض بیجاپور کے مرزا کے ہوں۔ مگر تیقن کے ساتھ کسی مرثیہ کو اس سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

چونکہ ہم کو مرزا کا کلام دستیاب نہیں ہوا۔ اس لئے اس کے کلام کے متعلق کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔ مگر یہ ظاہر ہے جس شخص کی تمام عمر ہی مرثیہ گوئی میں بسر ہوئی ہو تو اس کا کلام کس پایہ کا ہوگا۔

ذیل میں ایک مرثیہ کے چند شعر لکھے جاتے ہیں جو بعض اندرونی شہادتوں کے لحاظ سے بیجاپور کے مرزا کا مرثیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

شریعت اساسی پہ اپتا ستم | حقیقت شناسی پہ اپتا ستم
بنی کے نواسے پہ اپتا ستم | سب اُمت کے آسے پہ اپتا ستم
دیا زہر پانی میں بانٹا لہاں | مولا کا کلیجے کون جا کر تہاں
جگر توڑ حسن کا پڑا بے گناہ | مدینے کے باسی پہ اپتا ستم
حسین ابن حیدر خدا کا ولی | جگر گوشۂ فاطمہ اور علی
بروج دہ و دہ کا بدر جلی | شہ کربلا سی پہ اپتا ستم

مبارک بدن سوں ہوا سر جدا
اسی غم سوں کہتا ہے مرزا سدا
کیا کیں وہ بدبخت نے اے خدا
شہنشہ پیاسے پہ اپتا ستم

قطب شاہی اور عادل شاہی عہد کے یہ چند مرثیہ گو ہیں۔ اُمید ہے کہ اس مقالہ سے ان کے کلام کا ایک خاکہ ذہن نشین ہو جائے۔ آئندہ صحبت میں اُن مرثیہ گویوں کو پیش کیا جائیگا۔ جو ان سلطنتوں کی شکست کے بعد ہوئے ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ ایف۔ آر۔ ایس۔ اے۔
(لندن)

"حُسنِ اتفاق"

پرانی وضع کی ایک بوسیدہ گھوڑا گاڑی شام کے سناٹے میں ایک ایسے پہاڑی مقام سے گزر رہی ہے جو حد درجہ وحشت ناک ہے۔ گاڑی شاندار ہے۔ اور کسی مرہٹہ سردار کی گذشتہ شان و شوکت کی یادگار معلوم ہوتی ہے۔ ہر قدم پر پہیوں کی چوں چوں حالت ماضی پر مرثیہ خوانی کر رہی ہے۔

گاڑی کے اندر ایک مرہٹہ سردار لیسونت راؤ اور ان کی لڑکی تلوتما ہیں۔ سامنے کی سیٹ پر پرانا جانثار بالاجی بیٹھا ہے۔

کسی زمانے میں سردار صاحب کی چاروں طرف دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ کئی قلعے اور گڑھیاں قبضہ میں تھیں مگر اب زمانہ بگڑ گیا، سرکار نے مقبوضات ضبط کر لئے۔ اور وہ پونا میں ایک گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہیں پونا کالج میں تلوتما پڑھتی ہے۔

کچھ عرصے سے اس کی صحت خراب ہو رہی ہے۔ اس لئے تبدیل آب و ہوا کے لئے آج سردار صاحب اپنی پرانی سواری میں سوار ہو کر پونا سے جا رہے ہیں۔

تلوتما کے چہرے سے کمزوری کے آثار نمایاں ہیں، وہ مرہٹہ وضع کی ساڑھی پہنے ہے۔ سر کھلا ہوا ہے، ہوا سرد چل رہی ہے۔ اس لئے پاؤں پر ایک کمبل ڈال لیا ہے۔

رفتہ رفتہ دن کی آخری علامات زائل ہونے لگیں اور شب کی سیاہی بڑھنا شروع ہوئی۔ ان کی گاڑی اس وقت ایک ایسے پہاڑی راستے سے گزر رہی تھی جو بہت ہی تنگ واقع ہوا تھا۔ پہاڑیوں کی خوفناک چٹانیں سڑک کی طرف جھکی ہوئی تھیں اور ان کے اوپر سفید سفید بکرے ہری ہری گھاس چر رہے تھے۔ کبھی کبھی گاڑی کی گڑگڑاہٹ اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سے چونک کر ان مسافروں کو دیکھنے لگتے تھے۔

اتنے میں مغرب کی طرف سے کالی گھٹا اٹھنی شروع ہوئی۔ موسم کے اثرات سے متاثر ہو کر سردار صاحب نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا۔ مگر دور تک کسی آبادی یا گاؤں کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ بالاجی اپنے آقا کی پریشانی کو سمجھ گیا۔ اور اس نے کوچوان سے ڈانٹ کر کہا۔ "گاڑی جلدی بڑھاؤ۔ اگر ایسے ہی چلو گے تو آدھی رات تک بھی سرائے نہ پہونچینگے"۔

کوچوان نے کہا۔ "نہیں جی! سرائے وہ سامنے آگئی"۔

سردار صاحب کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے جلدی سے دریافت کیا۔ "کہاں"؟

کوچوان نے کچھ فاصلے پر ایک ٹیلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "حضور! وہ سامنے"۔

سردار صاحب نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا "خوب یہ تو کھنڈر معلوم ہوتا ہے۔ سرائے ورائے تو کیا ہوگی۔ ہمارا تو خیال تھا کسی آرام دہ گاؤں میں رات بسر ہوگی"۔

شب کی آمد اور موسم کی خرابی دیکھتے ہوئے لیسونت راؤ کو مجبوراً اپنی کمزور اور بیمار لڑکی کی خاطر کوچوان کا کہنا ماننا پڑا۔ رات کی سرد ہوا ممکن تھا تلوتما کے لئے اس کمزوری میں نقصان رساں ثابت ہوتی۔ آخر کار سردار صاحب کے ایما سے گاڑی سرائے کے پرانے پھاٹک میں گڑگڑاتی ہوئی داخل ہوگئی۔

سرائے کی عمارت سے خوف اور وحشت ٹپکتی تھی۔ عمارت کافی بڑی تھی۔ اور متعدد کمروں کی دور تک قطار چلی گئی تھی۔ مگر ویران۔ جو لوگ گاڑی کے استقبال کو دوڑے ان کے چہرے بھی کچھ عجب وحشیانہ تھے۔ سرائے کی مالک ایک عورت تھی۔ جو متوسط العمر تھی اور دیکھنے میں بجائے بھٹیاری کے ایک زیادہ موقر درجہ کی عورت معلوم ہوتی تھی۔ اس کے گلے اور ہاتھ پیروں میں چاندی سونے کا قیمتی زیور تھا۔ ایک ادنیٰ بھٹیاری کے پاس ایسے لباس اور زیور کا ہونا ضرور شکوک نگاہوں سے دیکھا جائیگا۔

لیسونت راؤ نے ایک کمرہ اور اس کے آگے کا بڑا ہال پسند کیا۔

تلوتما کے لئے اندر کے کمرے میں سونے کا انتظام کر دیا گیا۔ بڑے ہال میں آگ روشن تھی مگر لکڑیاں گیلی تھیں اسوجہ سے دھواں گھٹ رہا تھا اور سانس لینا مشکل تھا۔

سرائے کی مالکہ مہمانوں کو ایک خادمہ کے سپرد کرتے ہوئے خود کھانے کے انتظام میں مصروف ہوگئی۔ خادمہ نہایت تنومند عورت

تھی۔ سردار صاحب کو اس کی نظریں بہت ناگوار معلوم ہوتی تھیں جنکہ
وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان تازہ وارد مسافروں کی طرف دیکھنے لگی تھی۔
سردار صاحب نے ایک چارپائی آگ کے شعلوں کے قریب کھینچ
لی اور تلوتما کو اس پر بٹھاتے ہوئے خود ایک ٹوٹے ہوئے مونڈھے پر
بیٹھ گئے۔ بالاجی سرائے کی حالت اور ٹوٹے پھوٹے سامان کو دیکھ کر
دل ہی دل میں کوچوان کو برا بھلا کہہ رہا تھا جسکی وجہ سے اس کے آقا اور
ان کی لڑکی کو اتنی تکلیف ہو رہی تھی۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ کوچوان
کی ہڈی پسلی توڑ ڈالتا۔

جب دھواں کسی طرح کم نہ ہوا سردار صاحب نے خادمہ سے
کہا "لکڑیاں گیلی ہیں۔ اچھی سوکھی لکڑیاں اگر ملیں تو لاؤ" یہ کہہ کر ایک
روپیہ نکال کر خادمہ کو دیا۔

خادمہ فوراً ہی جاکر لکڑیوں کا ایک گٹھا سر پر رکھ لائی۔ معلوم ہوتا
تھا سرائے ہی میں کہیں اسے سوکھی لکڑیاں مل گئیں۔ ہال میں پہنچتے ہی
اتفاق سے اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ بے تحاشا فرش پر گر پڑی۔ کنپٹی
سے خون جاری ہوگیا۔ اور وہ بیہوش ہوگئی۔ تلوتما نے اپنی ساڑھی کے
پلّے کو پھاڑ کر غریب عورت کی مرہم پٹی کی۔ جب اُسے ہوش آیا اس نے
حسین تلوتما کو اپنی تیمارداری میں مصروف پایا۔ ہوش سے اس کے آنسو
نکل آئے۔ اور تلوتما کے پاؤں چھو کر کہنے لگی۔

"ایشور تمہاری رکھشا کریں۔"

ابھی اس واقعہ کو زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ سرائے میں کچھ نئے مہمانوں
کی آمد کا غل پڑ گیا۔ تلوتما نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا، ایک نوجوان
گاڑی سے اترا۔ اس نے سہارا دیکر ایک بوڑھی عورت کو اتارا۔ سرائے
کی مالکہ نے ان دونوں کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ ان کے ساتھ بہت
سے نوکر تھے اور گاڑی بھی خوبصورت اور قیمتی تھی۔ نوجوان کو دیکھ کر
تلوتما کے چہرے پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ اس نے جلدی سے دروازہ
بند کر دیا۔ اور اپنے باپ کے پاس آکر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

سردار صاحب نے لڑکی کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار دیکھ کر
دریافت کیا "کیوں تلوتما، کیسی طبیعت ہے؟" مگر تلوتما نے بات
ٹالتے ہوئے کہا "کچھ نہیں۔" پھر بھی ایک غماز آنسو ڈھلک کر رخسار
پر آگیا۔ جسے اس نے اپنی ساڑھی کے آنچل سے فوراً خشک کر لیا۔

سرائے کی مالکہ نے داخل ہو کر سردار صاحب کی توجہ ہٹادی ورنہ
ممکن تھا وہ تلوتما سے مزید سوالات کرتے۔ مگر بھٹیاری کو بدحواس دیکھ
کر انہوں نے کہا "کیا ہے؟"

عورت نے معذرت کرتے ہوئے کہا "دوسرا کمرہ اسوقت گرم نہیں ہے
اگر آپ مہربانی ...."

ابھی اس کا جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ وہی بوڑھی عورت جو گاڑی سے
اتری تھی نوجوان کے ہاتھ کا سہارا لئے ہوئے ہال میں آموجود ہوئی۔
سردار صاحب اس عورت سے واقف تھے۔ وہ ایک خاندانی رانی
تھی اور اس کے ساتھ والا نوجوان اس کا بھتیجا اور وارث جائیداد تھا۔ پونا
اور کئی مقامات پر سردار صاحب نے اسے دیکھا تھا۔ اور تلوتما کے ساتھ
کئی بار اس کے ساتھ دعوتوں میں بھی شرکت کی تھی۔ جہاں اس کا نوجوان
بھتیجا بھی اکثر موجود ہوتا تھا۔

اس خاندانی عورت کو آتا دیکھ کر سردار صاحب تعظیماً کھڑے ہو گئے
اور چارپائی پر بیٹھنے کا دونوں کو اشارہ کیا۔ تلوتما کا بُرا حال ہو رہا تھا۔
نوجوان نے بڑھ کر اس سے کچھ رسمی جملے کہے۔ مگر اس نے شرم سے سر
جھکا لیا اور کچھ جواب نہ دیا آخر دونوں قریب قریب بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر باتیں ہوا کیں۔ کہ کہاں سے آنا ہوا۔ کہاں کا قصد ہے وغیرہ
پھر کھانا آیا۔ سب نے مل کر کھایا۔ کھانے کے بعد رخصت ہوتے وقت
رانی صاحبہ کی نگاہ ایک ستار پر پڑ گئی جو سردار صاحب کے ساتھ تھا اور
انہوں نے سردار صاحب سے کہا "شب بخیر کہنے سے پیشتر اگر اس ستار
کے نغموں سے محظوظ ہوں تو کیا ہے۔"

سردار صاحب نے کہا "ضرور ضرور" اور انہوں نے اپنی لڑکی کی
طرف دیکھتے ہوئے آنکھ سے اشارہ کیا۔ تلوتما بادل ناخواستہ ستار
اُٹھا لائی۔ اور سُروں کو ملانے لگی۔ انہوں نے اس کو موسیقی کی خاص تعلیم
دلائی تھی۔ تلوتما کی انگلیاں ستار پر کام کرنے لگیں اور ساری فضا دل
خوش کن نغمہ سے معمور ہوگئی۔ آواز ملانے کے بعد تلوتما نے ایک
مرہٹی گانا شروع کیا جس میں عشق کے جذبات کی ترجمانی کی گئی تھی اور
جسے فارسی کے ان اشعار سے مناسبت ہوسکتی ہے۔ ؎

صبحدم مرغ چمن با گل نوخاستہ گفت
ناز کم کن کہ دریں باغ بسے چوں تو شگفت
گل بخندید کہ از راست نرنجیم ولے
ہیچ عاشق سخن سخت بمعشوق نہ گفت

بار بار تلوتما کی کالی زلفیں اُڑ اُڑ کر اس کے رخسار پر آجاتی تھیں
اس کا چہرہ شرم سے سُرخ ہوا جا رہا تھا، وہ اپنے جذبات اور کیفیات
دلی کو چھپانے کے لئے ہر ممکن کوشش صرف کر رہی تھی کبھی کبھی
کن انکھیوں سے حاضرین کی طرف دیکھ لیتی تھی پھر جھک کر گھنسا

میں مشغول ہو جاتی تھی ۔ بہت جلد یہ صحبت برخاست ہو گئی ۔ سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد تلوتما اپنے سونے کے کمرے میں آئی اور باہر کی طرف کھڑکی میں سر رکھکر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی ۔ فاصلے پر ایک کمرے میں روشنی نظر آتی تھی اور کبھی کبھی کسی نوجوان کا چہرہ بھی کھڑکی میں سے جھانکتا ہوا معلوم ہوتا تھا ۔

تلوتما تھوڑی دیر وہاں کھڑی رہی پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور کھڑکی بند کرنے لگی ۔ اتنے میں اسے دو مانوس آوازیں کچھ سرگوشیاں کرتی ہوئی کھڑکی کے نیچے سنائی دیں ۔

" مگر اس بیچاری لڑکی کا کیا قصور ہے ۔"

غالباً کوچوان نے جواب دیا " ہم کیا کریں اسکی قسمت "۔

خادمہ نے التجا کرتے ہوئے کہا " کیا اس کی جان بخشی نہیں ہو سکتی "

کسی نے ڈانتے ہوئے کہا " اری کم بخت تیری عقل کہاں گئی ہے ۔ ایک لڑکی کے لئے ہمارے گلے کٹانا چاہتی ہے ؟"

اس کے علاوہ تلوتما کچھ نہ سن سکی ۔ اُسے خیال پیدا ہوا " کہیں یہ گفتگو میرے متعلق تو نہیں ہے ۔ کیا کسی سے اس کا تذکرہ کروں ۔ مگر ممکن ہے میرا یہ وہم ہی وہم ہو ۔"

وہ چاہتی تھی اپنے باپ سے یہ سب کہہ دے مگر پھر خیال کیا اگر کچھ نہ ہوا تو یونہی میں اُن کو پریشانی ہوگی ۔ وہ انہی خیالات میں غوطے لگا رہی تھی کہ کمرے میں ایک خفیف سی آواز دستک کی آئی ، یہ آگے بڑھی اور کان لگا کر سنا ۔ کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے ۔ لیمپ ہاتھ میں لے کر اس نے دیوار کے اس حصہ کی طرف دیکھا جدھر سے آواز آ رہی تھی ۔ وہاں ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آیا ۔ دروازہ اندر سے بند تھا ۔ تلوتما نے کہا " کون ہے ۔"

خادمہ نے آہستہ سے کہا " میں ہوں ۔ ذرا دروازہ کھولو "

تلوتما نے ہمت کر کے دروازہ کھولا تو خادمہ کو دروازے پر کھڑا پایا ۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کو کہا پھر اندر آ کر کہنے لگی ، ۔

" جلدی سے اس سرائے سے بھاگ جاؤ نہیں تو تمہاری جان کی خیر نہیں ہے ۔"

تلوتما گھبرا کر خادمہ کا منہ تکنے لگی ۔

خادمہ نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا " ایک منٹ بھی ضائع نہ کرو ۔ جس طرح ہو سکے اس جگہ کو فوراً چھوڑ دو ۔"

تلوتما نے کہا " اور سردار صاحب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

خادمہ نے پوچھا " وہ کہاں ہیں "

تلوتما نے اشارہ سے کہا " ہال میں ۔"

خادمہ نے کہا " انہیں بلا لو مگر جلدی کرو ۔"

تلوتما نے اپنے باپ کو جگا کر سب حال کہہ سنایا ، وہ بھی متوحش ہو گئے ۔ بالاجی بھی اٹھ کر پاس آ گیا ۔ اور سب خادمہ کے پاس آئے جو ان کا انتظار کر رہی تھی ۔ سردار صاحب کو دیکھ کر کہنے لگی ۔ آپ فوراً یہاں سے اپنی لڑکی کو لے کر بھاگ جائیے ۔ ڈاکوؤں نے سرائے پر قبضہ کر لیا ہے ۔ آپ کی جان خطرے میں ہے ۔ آپ اس چور دروازہ سے نکل کر باہر چلے جائیے ۔ صحن سے گزر کر آپ کو ایک ایسا ہی دوسرا دروازہ ملیگا ۔ وہاں ایک گھوڑا دروازے کے باہر کھیت میں موجود ہے اس پر سوار ہو کر آپ اپنے بائیں ہاتھ کی طرف جائیں تھوڑی دور پر ایک چشمہ ملے گا آگے سیدھی سڑک چلی گئی ہے جو آپ کو ایک محفوظ گاؤں میں پہنچا دیگی ۔ یہ کہہ کر خادمہ جانے لگی ۔ تلوتما نے کہا ایک گھوڑا ہے ہم سب کیسے جائیں ۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رانی صاحبہ بھی تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " کہتے کہتے اس کی آواز گلے میں پھنس گئی ۔

خادمہ نے تیوریاں چڑھا کر کہا " تم اور سردار صاحب اس پر جا سکتے ہو ۔ مجھے رانی وانی سے کیا مطلب ۔ میں تو تمہارے احسان کا بدلہ دینا چاہتی ہوں ۔ اب فوراً یہاں سے نکل جاؤ ۔ کہہ دینا میرا کام ہے ۔" یہ کہہ کر خادمہ چلی گئی ۔

تلوتما نے سردار صاحب کے چہرے کی طرف دیکھا ۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک رنگ جاتا تھا ۔ اور وہ بہت فکر مند نظر آتے تھے ۔

بالاجی نے موقع کی نزاکت اور خطرے کی قریب کو سمجھتے ہوئے سردار صاحب سے کہا " آپ دیر نہ کیجئے ۔ اور بائی جی کو لیکر اس راستے سے چلے جائیے ۔ میں سب نبٹ لونگا ۔ اور رانی صاحبہ کی مدد اپنی جان دیکر کرونگا ۔"

تلوتما نے مسکراتے ہوئے کہا " رانی صاحبہ کے ساتھ ایک اور نوجوان بھی ہے ۔"

بالاجی نے کہا " ہاں ہاں میں سب سمجھتا ہوں ۔ آپ کچھ فکر نہ کریں ۔ سب دیکھ لیا جائیگا ۔"

سردار صاحب کے لئے سوا اس کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ خادمہ کے بتائے ہوئے راستہ پر تلوتما کو لیکر روانہ ہو جائیں ۔ چنانچہ انہوں

نے وہی راستہ اختیار کیا۔

ان کو کھیت میں گھوڑا تیار ملا۔ رات کی سیاہی میں وہ بہت جلد سڑک پر ہو لئے۔ اور خیریت سے بتائے ہوئے گاؤں میں جا پہنچے۔ گاؤں والے خود سر لٹیرے کو مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے۔ اور اکثر ان کو بھی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ آج سردار صاحب کی زبان سب حالات سن کر ایک چھوٹی سی جماعت ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنے پر تیار ہو گئی۔

ایک فوجی افسر نے جو اتفاق سے وہاں موجود تھا اس جماعت کی کمانڈ ہاتھ میں لے لی۔ اور بہت جلد یہ لوگ ڈاکوؤں کے سر پر جا پہنچے۔ وہاں بالاجی نے حکمت عملی سے کام لے کر رانی صاحبہ کے آدمیوں کو ہوشیار کر دیا اور سب لوگوں نے مل کر رانی صاحبہ اور نوجوان کو حلقے میں لے لیا۔ ڈاکوؤں سے بڈھا وفادار نام بالاجی خوب لڑا۔ گاؤں والوں کی نئی کمک پہنچ جانے سے ڈاکوؤں کی ہمت ٹوٹ گئی۔ اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔

رانی صاحبہ مع اپنے بھتیجے کے گاؤں میں سردار صاحب کے پاس لائی گئیں۔ تلوتما بہت بے چین تھی اور سردار صاحب اس کو بار بار بالاجی کی وفاداری کے قصے سنا کر اس کے دل سے وہم مٹانا چاہتے تھے۔

آخر اس قافلے کو خیریت سے دیکھ کر سب خوش ہو گئے۔ اور سب نے بالاجی کی بہت تعریف کی۔

اس کے بعد یہ کہنا بیکار ہوگا کہ تلوتما کی شادی رانی صاحبہ کے بھتیجے سے بخیر و خوبی ہو گئی اور دو بچھڑے ہوئے دل ہمیشہ کے لئے مل گئے۔

(واشنگٹن آرونگ) شمشیر صمدی

تجلیات

ترے ستم کا گلہ تجھ سے کر رہا ہوں میں تری نگاہ کو سو بار دیکھتا ہوں میں

مجھے خبر ہے مآل بہار جو کچھ ہے گلوں کو دیدۂ پرنم سے دیکھتا ہوں میں

سفر دراز نہ تھا ذوقِ جستجو کے لئے حرم کو دیر سے ہوتا ہوا چلا ہوں میں

مری نگاہ میں دنیا کی کیا حقیقت ہے تری نگاہ سے دنیا کو دیکھتا ہوں میں

مرے عروج کی شاہد ہیں پستیاں میری بہت بلندئ پرواز سے گرا ہوں میں

فریبِ حسن مجھے میری آنکھ دیتی ہے حسین وہ اتنے نہیں جتنا دیکھتا ہوں میں

ہر ایک راہ سے میں تجھکو ڈھونڈ لیتا ہوں رہِ تلاش میں خود اپنا رہنما ہوں میں

وہ آئیں اور سکون دلِ حزیں کے لئے الٰہی آج یہ کیا خواب دیکھتا ہوں میں

(غیر مطبوعہ)

ایک ہزار کا نوٹ

خدا نے حکم دیا کہ :-

دو فرشتے جو زمین پر جانا چاہیں حاضر ہوں :-

اتنا سنتے ہی ایک درجن فرشتے حاضر ہو گئے ۔ لیکن صرف دو منتخب کیئے گئے ۔

تم ان کاغذوں کو لیکر زمین پر جاؤ ۔

فرشتے ان کاغذ کے پرزوں کو جن پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے ۔ بغور دیکھ رہے تھے اور بار بار خداوند کی طرف بھی نظریں اٹھاتے تھے ۔

کیا تم نہیں جانتے کہ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے ؟ یہاں آسمان پر تو یہ صرف ایک منقش گل بوٹے والا کاغذ کا پرزہ ہے ۔ لیکن یہی چیز دنیا میں انسانوں کی آسودگی کا ذریعہ ہے ۔ یہ کاغذ روپیہ ہے اور ہر پرزہ ایک ہزار کی قیمت رکھتا ہے ۔ تم اسے زمین پر لے جاؤ ۔ اور اُس انسان کو جو تمہارے خیال میں سب سے زیادہ حاجتمند ہو دو ۔ فوراً ہی دونوں فرشتے غائب ہو گئے ۔ اور شام کو پھر حاضر ہوئے ۔

خدا تعالےٰ نے سوال کیا :-

اچھا میرے فرشتو بیان کرو ۔ تم نے وہ نوٹ کیا کیئے ؟

پہلے فرشتے نے بیان کیا :-

میں زمین پر چلا جا رہا تھا ۔ کہ ایک شکستہ حال فقیر نظر آیا ۔ وہ نہایت ہی کثیف اور بدن پر میلے کچیلے چیتھڑے لگائے تھا ۔ اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے ۔ چہرہ سے بھوک اور مایوسی ظاہر ہوتی تھی شاید دو دن سے اس نے روٹی کا ایک ٹکڑا ابھی نہیں کھایا تھا ۔ وہ لاٹھی کے سہارے چلتا تھا ۔

فرشتے ہم آواز ہو کر چلائے ...... بدقسمت مفلوک الحال کبڑا ....

میں نے اُسے وہ نوٹ دیدیا ۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اس کے ساتھ بہت بڑی نیکی کی ہے ۔ سب فرشتوں نے تعریف کی تم نے بہت اچھا کیا ۔

خدا نے فرمایا ۔ نہیں ۔

میرے فرشتے تم نے روپیہ کو بری جگہ رکھا ۔ اور تم نے میرے دوسرے فرشتے ایک ہزار کا نوٹ کس کو دیا ۔

دوسرے فرشتے نے عرض کیا ۔

میں ایک بڑے شہر میں پہنچا ۔ میں نے ایک نہایت ہی حسین اور طرحدار نوجوان کو دیکھا وہ نہایت بیش قیمت لباس پہنے تھا ۔ چمکدار جوتا اور بانکی ٹوپی اوڑھے تھا ۔ اس کے تمام حرکات و سکنات سے غرور تمکنت ظاہر ہوتی تھی ۔ لیکن اس کی جیبوں میں سوائے خطوط کے جو قرض خواہوں کے پاس سے آئے تھے ایک پائی بھی نہ تھی ۔ اور وہ بھوکا تھا ۔ مجھے اس کی حالت پر ترس آیا اور ایک ہزار کا نوٹ اس کو دیدیا ۔ اس پر بھی فرشتوں نے کہا ۔ "تم نے بہت اچھا کیا"

مگر خداوند نے انکار کیا ۔

میرے فرشتے تم نے بھی روپیہ کو خراب جگہ رکھا ۔ اچھا آج سے ایک سال بعد پھر دنیا میں جانا ۔ اور دیکھنا کہ ایک ہزار کے نوٹوں اور ان دونوں انسانوں کا کیا حشر ہوا ۔

پورا ایک سال گزرنے پر وہ فرشتے دنیا میں گئے ۔ اور شام کو پھر خداوند تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوئے ۔

خداوند نے سوال کیا ۔

میرے دوسرے فرشتے پہلے تم بیان کرو کہ تمہارا رنگیلا نوجوان کیا کرتا ہے ؟

فرشتے نے مسکرا کر جواب دیا ۔

وہ نوجوان تو بڑا بدمعاش نکلا ۔ سال بھر تک وہ اسی ایک ہزار کے نوٹ سے عیش و عشرت کے ساتھ زندگی بسر کرتا رہا ۔ اور آج تک اس کی جیب میں وہ نوٹ موجود ہے ۔

یہ کس طرح ؟

اس طرح کہ وہ نوجوان صبح کو روزانہ نئے ہوٹل میں جاتا ہے اور کھانا کھا کر قیمت ادا کرنے کو وہ نوٹ خانساماں کو دیتا ہے ۔ لیکن خانساماں جو کہ اس نوٹ کا پورا روپیہ ادا نہیں کر سکتا جھک کر نہایت ادب سے کہتا ہے ۔ "میں التماس کرتا ہوں کہ کھانے کی قیمت دوسرے وقت ادا کر دیجئیگا" ۔

اسی طرح وہ شام کے کھانے پر کرتا ہے ۔ اس نے درزی کو بھی کچھ نہیں دیا ۔ کیونکہ اس کے پاس نقد روپیہ نہیں ہے ۔ وہ اپنے حجام

کا بھی قرضدار ہے۔ مکان کا کرایہ بھی ادا نہیں کرتا۔ باوجود اس کے سب لوگ اس کا اعتبار کرتے ہیں اور اسے کچھ روپیہ قرض بھی دیدیتے ہیں۔ اور اس کی خوشامد کرتے ہیں۔ کیونکہ لوگ خیال کرتے ہیں۔ وہ بہت آسودہ اور خوش حال شخص ہے۔ جس کے پاس ایک ہزار کا نوٹ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ نوجوان بڈھا ہو جائیگا اور ہمیشہ فارغ البالی سے زندگی بسر کریگا۔

اس بیان پر فرشتے ہنسنے لگے اور خداوند نے دوسرے فرشتہ سے کہا:۔

اور تمہارے مفلوک الحال فقیر کا کیا حال ہے؟ کیا وہ اسی طرح اس نوٹ کے ذریعہ زندگی بسر کر رہا ہے؟

فرشتہ نے افسوس کہ لہجہ میں جواب دیا۔

مجھے جلد واپس جانا چاہیئے کیونکہ وہ میرے ساتھ آیا ہوگا۔ جب میں روانہ ہوا ہوں اس وقت وہ پھانسی پر لٹکایا گیا تھا۔ یہ سنکر سب فرشتے تھرا گئے۔ خداوند نے کہا۔

کہے جاؤ

جب اس مفلس کو ایک ہزار کا نوٹ ملا تو وہ بہت خوش ہوا۔ فوراً بازار کھانا خریدنے گیا۔ اور نہایت عمدہ اور نفیس غذائیں کھائیں۔ اس کے بعد جب اس نے قیمت ادا کرنے کے لئے وہ نوٹ دیا۔ تو ہوٹل کے مالک نے اسکو پولیس کے حوالے کر دیا۔ سپاہی بدقسمت آوارہ گرد کو کوتوالی لے گئے۔ کئی روز تک اس سے دریافت کرتے رہے۔ کہ یہ نوٹ اس نے کہاں سے پایا۔ اس مفلس نے جواب دیا۔ یہ نوٹ مجھے ایک فرشتہ نے دیا ہے۔ اس جواب پر سب لوگوں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔

چند روز کے بعد پولیس اس نتیجہ پر پہنچی کہ یہ نوٹ تین مرتبہ کے قتل کا نتیجہ ہے۔ اور اس پر خون کے چھینٹے بھی نظر آنے لگے۔ انکی تعداد اتنی ہی تھی جتنی مرتبہ اس مفلس نے ڈکیٹی کی تھی اس کی لاٹھی پر خون کے نشان پائے گئے۔ بہت سے گواہ بھی مل گئے جنہوں نے قاتل کو مقتول کے گھر کے آس پاس چکر کاٹتے دیکھا تھا۔ آخرکار اس بدقسمت کو موت کی سزا دی گئی۔ اور پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

یہ ہے ایک ہزار کا نوٹ۔ ایک اس کے ذریعہ سے زندگی کا لطف اٹھاتا ہے اور دوسرا موت کی نذر ہوتا ہے۔ لیکن ہزار کا نوٹ ہر حال میں ہزار کا نوٹ ہے۔

(ماخوذ) **مکی انصاری**

غزل

پریشاں خاطری ہیں لب پہ کیوں آئے دعا میری
نہ رسوائے جہانِ آرزو ہوگی وفا میری

مجھے عہدِ گزشتہ کی وفائیں یاد آتی ہیں
میری اس انتہا سے خوب تھی وہ ابتدا میری

میری فطرت کا مقصد ہے تغیر آشنا رہنا
نہ غم ہی مستقل میرا نہ راحت دیر پا میری

مقدر میں نہیں ہے کامرانِ آرزو ہونا
سزاوارِ اجابت ہو نہیں سکتی دعا میری

نذیر عہدِ جنوں کی شوخیاں سب یاد ہیں اب تک
طبیعت تھی قیامت کی سکوں نا آشنا میری

نذیر
(واحد نذیر اسمٰعیل خاں)

انتقاد

نغمۂ دل

(شیخ نذیر احمد صاحب ظفر گجراتی کی غزلوں، نظموں، رباعیوں اور افسانوں کا مجموعہ -)

مقام اشاعت مصطفائی بکڈپو - کوچہ چابک سواراں لاہور -

قیمت ۱۲؎ - کتابت و طباعت گوارا -

بدقسمتی سے مجھے فاضل مصنف سے تعارف کا فخر حاصل ہے اور اگر یہ ناخوشگوار فرض کسی اور شخص کے سپرد کیا جاتا تو مناسب ہوتا - لیکن اس حالت میں کہ مولینا تاجور دورے پر ہیں اور ادبی دنیا کا شعبہ نقد و نظر ہمیشہ میرے سپرد رہا ہے - مجھے اس کام کو انجام دینا ہی پڑیگا - مکرمی نذیر احمد صاحب ظفر ایک نوجوان انشاء پرداز ہیں - اور میں ان کو تین چار سال کے عرصے سے جانتا ہوں - میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ مجھے "جانتے" ہیں یا نہیں - اگر وہ "جانتے" ہیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ میری حق گوئی کبھی بلند بانگ دعووں اور مسحور کن خطابوں سے مرعوب نہیں ہوئی - میں نے کبھی جنبہ داری اور تعصب سے قصداً کام نہیں لیا - اور میرا منتہائے نظریہ رہا ہے کہ ایسی "تخلیقات" جو اردو ادب کے لئے مہلک ہیں - ان پر صحیح معنی میں تجزیبی تنقید کی جائے - "نغمۂ دل" میں دس افسانے ہیں دسوں کے دسوں اس انداز میں لکھے گئے ہیں جو ادب لطیف کی تخلیق کے ضامن ہیں -

"نسیمہ فردوس کی شگفتہ کلی - فطرت کے منتہائے خیال کا ایک جاندار عکس رنگیں اپنی جوانی سے دنیا کو جوان بنائے ہوئے ہے - اس کے سنہری دراز بال روحانیت کے شبنمی قطروں میں بھیگے ہوئے ہیں - اس کی آنکھوں سے مستی و کیف کی ایک الوہیانہ بارش ہوتی رہتی ہے -

مندرجہ بالا اقتباس مشتے از خروارے کا مصداق ہے - میں نے یہ فقرے پڑھکر انتہائی کوشش کی کہ نسیمہ کے رنگ حسن و جمال کی ایک تصویر اپنے ذہن میں قائم کر سکوں - لیکن مجھے ناکامی ہوئی - میں یہ نہیں چاہتا - کہ افسانوں میں قطعاً صداقت حقیقی[1] ہو - اور جو مصنف حقائق کائنات سے سر مو تجاوز کرے اُسے گنہگار قرار دیا جائے - لیکن میں اس بات پر یقیناً مُصر ہوں - کہ کوئی صناع صداقت شعری کے اصول و قوانین کے خلاف ورزی کر کے کامیاب نہیں ہو سکتا - "بالوں" کے ساتھ "روحانیت کے شبنمی قطروں" کو جو حقیقی تعلق ہے اس سے قطع نظر ان دونو چیزوں میں کیا نسبت ہے جو پرواز تخیل کا موضوع بن سکے -

* * * * * * *

"مستی اور کیف کی بارش"، صداقت حقیقی نہ سہی - صداقت شعری تو ہے کہ نگار دل افروز کی غزال گیر آنکھیں واقعتاً سرچشمہ نشاط و کیف ہیں - لیکن مستی و کیف کی "الوہیانہ بارش" تو صداقت شعری کی حدود سے بہت دور جا پڑی - ہو سکتا ہے کہ کیف و مستی الوہیانہ ہو - لیکن یہ کہ ان کی بارش الوہیانہ ہو - ایک ایسا تخیل ہے جو صرف ایک مریض کے دماغ ہی میں آ سکتا ہے -

یہ تو ہوئیں تحریر کی خوبیاں - اب موضوع اور معانی کی سحر آفرینیاں دیکھئے -

موضوع اور اس کی جزئیات سے عدم واقفیت | افسانہ نویسی کا پہلا اصول یہ ہے کہ افسانہ نگار جس چیز کے متعلق لکھنا چاہتا ہے اس کی تمام جزئیات پر حاوی ہو - یہ نہیں کہ ہندوستان میں بیٹھکر محض تخیل سے کام لیکر چین کی معاشرت کا نقشہ کھینچدے - پریم چند کی کامیابی کا یہی راز ہے - اس کے برخلاف نغمۂ دل کا فاضل مصنف اپنے موضوع اور اس کی جزئیات سے اسقدر بے خبر ہے - کہ قاری کو یہ خیال گزرتا ہے - کہ وہ اپنا مذاق اڑانا چاہتا ہے - فیروزہ (راف نے کا نام ہے) میں منصور ہیرو ہے - اور اپنی محبوبہ کو نہیں پا سکتا - کہ محبوبہ کی ماں اپنی لڑکی کے لئے صرف تعلیمیافتہ شوہر کا انتخاب کرنا چاہتی ہے - وہ اپنی محبوبہ کی والدہ کے نام ایک خط لکھکر رکھ جاتا ہے جس میں مندرجہ ذیل فقرے ہیں -

"آپ کے منصور کی آخری التجا یہی ہے کہ تین سال تک فیروزہ کسی سے وابستہ نہ کی جائے - اگر میں اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کر واپس آؤں تو فیروزہ میری ہوگی - اگر میں نہ آؤں تو پھر آپ کو اختیار ہوگا -"

---

[1] صداقت حقیقی صداقت شعری کے مقابلے میں استعمال کیا گیا ہے - صداقت حقیقی ہے -

اس کے بعد منصور علیگڑھ میں پہلے تو کچھ دنوں پرائیویٹ پڑھتا رہا۔ پھر مصنف کے لفظوں میں اس نے پہلا امتحان بی اے کا دیا۔ فاضل مصنف کو معلوم ہونا چاہئیے کہ بی اے کا امتحان دینے کے لئے پہلے انٹرنس اور پھر ایف اے کا امتحان دینا ضروری ہے۔ ممکن ہے علیگڈھ میں لوگ "پہلا امتحان" بی۔ اے کا دیتے ہوں۔ اگر یہ صحیح ہے تو علیگڈھ کالج کے ٹرسٹیوں کو اس طرف متوجہ ہونا چاہئیے۔ اور اگر یہ صحیح نہیں تو فاضل مصنف کے اختراعات ذہنی کی داد دینی چاہئیے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد فاضل مصنف کے الفاظ میں منصور کالج میں داخل ہوتا ہے۔ پھر یونیورسٹی نے اُسے اپنے خرچ پر انگلینڈ بھیجدیا جہاں اُس نے بڑی کامیابی سے ایم۔ اے کا امتحان دیا۔ لطف یہ ہے۔ کہ یہ تمام مراحل بقول مصنف صرف دو سال اور دس ماہ میں طے ہوئے۔ فرض کیجئے کہ منصور نے انٹرنس کا امتحان بھی پرائیویٹ دیا اور ایف۔ اے بی۔ اے کا بھی پرائیویٹ دیا۔ لیکن صرف ان ہی مراحل میں اس کے چار سال صرف ہو گئے ہونگے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ دو سال دس ماہ کے عرصے میں ان امتحانات کے علاوہ انگلستان جا کر ایم۔ اے کا امتحان بھی دے۔

قوت مشاہدہ کا فقدان | فاضل مصنف ناتجربہ کار ہے۔ اور صرف ناتجربہ کار ہی نہیں بلکہ اس کی قوت مشاہدہ اسقدر کمزور ہے کہ وہ ہزاروں مرتبہ دیکھی ہوئی چیزوں سے بھی صحیح نتائج نہیں نکال سکتا "خوش نصیب" کا ہیرو اصغر نامی ایک نوجوان ہے۔ جو کسی سادہ دل حسین عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ایک دن وہ سیر کے لئے جا رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک عورت برقع میں ملبوس ٹہلتی ہوئی جا رہی ہے۔ یہاں فاضل مصنف رقمطراز ہے:۔ "اصغر نے اسے دیکھا۔ قرائن سے سادگی کے آثار ہویدا تھے" سمجھ میں نہیں آتا کہ اصغر نے کن قرینوں سے عورت کی سادگی پر استدلال کیا۔ عورت برقعہ میں ملبوس تھی۔ اور برقعہ کی تراش خراش کے متعلق مصنف خاموش ہے۔ پھر لکھتے ہیں:۔

"تھوڑی دیر بعد اس نے پھر مُڑ کر دیکھا تو برقع پوش عورت نے اس کے قریب آکر کہا "کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟"

فاضل مصنف کو معلوم ہونا چاہئیے۔ کہ برقع پوش عورتیں اس طرح اجنبیوں سے کلام نہیں کرتیں۔ اگر کوئی شریف زادی برقع پوش اس طرح کرتی ہے تو کم از کم یہ بات میرے علم میں نہیں عصر حاضر کی جو لڑکیاں اجنبیوں سے بے تکلفانہ گفتگو کر سکتی ہیں وہ برقع پوش نہیں ہوتیں۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید بے پردہ بھی اجنبی مرد سے اس طرح تخاطب نہ کریں۔ اب معلوم ہوا ہے کہ برقع پوش عورت کا نام شکیلہ ہے اور وہ اپنے باپ کو ساتھ لیکر مسوری پہاڑ پر آئی تھی۔ وہ بے حد غریب ہے اور بقول خود روپیہ بالکل ختم ہو چکا ہے۔ للعجب یہ لڑکی مال روڈ پر کمرہ لئے میں رہتی ہے۔ عسرت اور غربت اسقدر کہ ایک اجنبی سے بھیک مانگنے پر مجبور اور قیام مال روڈ پر۔

زندگی کے متعلق نقطۂ نظر | ہر ایک ناول اور افسانہ جہاں مصنف کے جذبات و اعتقادات و میلانات کا آئینہ دار ہوتا ہے وہاں بہت بڑی حد تک زندگی کے متعلق اس کے زاویۂ نگاہ کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ ناول اور افسانے کے کردار مصنف کے نظریۂ حیات کی نقاب کشائی کرتے ہیں اور اگرچہ کرداروں کی تخلیق اس صناعانہ طریقے سے کی جاتی ہے کہ وہ جیتے جاگتے آدمی معلوم ہوتے ہیں لیکن مصنف کے جذبات کا ایک رنگ ہمیشہ ان میں جھلکتا رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ Drama اور ناول میں یہی فرق ہے کہ Drama میں صناع علی الاعلان انفرادی اور ذاتی جذبات کا اظہار کرتا ہے اور ناول میں در پردہ۔ اس طرح ناول "گفتہ آید در حدیث دیگراں" کا بہترین مصداق بنجاتا ہے۔ نغمۂ دل کے افسانوں میں اوّل تو کوئی مکمل نظام عمل اور نظریۂ حیات موجود نہیں ہے۔ اور جہاں کہیں اس طرح کا رنگ جھلکتا ہے اس کے عناصر اسقدر مکروہ اور ذلیل ہیں کہ کوئی خود دار مصنف ایسے نظریے پر اعتقاد رکھتے ہوئے اپنی تخلیقات کو کامیاب نہیں کہہ سکتا۔ "فطرت کی منشا" نغمۂ دل کا دوسرا افسانہ ہے۔ اس کا ہیرو فاضل ملازمت کے برخلاف ہے اور اپنی فکرمندیوں سے مضمحل، وہ کسی مقصد کے بغیر کلکتے روانہ ہو جاتا ہے۔ راہ میں اُسے چٹاگانگ (چاٹگام) کے جج کی لڑکی ملتی ہے۔ دونو کو ایک دوسرے سے عشق ہو جاتا ہے۔ فاضل جج کی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے اور یوں مصنف کے الفاظ میں فطرت کی منشا پوری ہوتی ہے۔ روپیہ پیدا کرنے کا اس سے ذلیل طریقہ شاید ہی کسی کے تصور میں آئے۔ ملازمت کے علاوہ روپیہ کمانے کے سینکڑوں شریفانہ طریقے ہیں۔ لیکن افسوس فاضل مصنف نے اپنے ہیرو کے لئے کسی باعزت طریق کار کا انتخاب نہ کیا۔

"حسن مغلوب" "کامیاب معمود" "سلطان" "حسن کا فاتح" تمام فسانے مصنف کی مندرجہ بالا کمزوریوں کے آئینہ دار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان افسانوں کی قیمت اس کاغذ سے کمتر ہے جس پر یہ شایع کئے گئے ہیں۔

نظمیں من حیث المجموع نظمیں شعر کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ میں خود فارسی تراکیب کا مداح ہوں۔ لیکن یہ ناگوار ہے کہ مہمل ترکیبیں برتی جائیں۔ اور ان سے کلام میں ظاہری ٹیپ ٹاپ پیدا کرنے کی کوشش کیجائے "شاعر کے دل" میں مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نغمۂ الہام پرور کا اسے کہئے رباب
یا کمبل تر سکون ابتہاج ماہتاب
یا وقار آدمیت کا نظام منجلی
نطق کی گنجائشوں کا مرمریں گوہر کہیں

اگر فاضل قارئین کرام میں سے کوئی صاحب آخری معمے کا مطلب حل کر سکیں تو میں ان کا نہایت ممنون ہونگا۔ عورت کے عنوان سے انہوں نے جو نظم لکھی ہے سوائے اس کے کہ اُسے الفاظ کا گورکھ دھندا کہا جائے وہ کسی اور خطاب کی سزاوار نہیں عورت ایک ایسا عنوان ہے۔ جو دنیا کی بہترین نظم کا موضوع بن سکتا ہے لیکن میں ڈرتا ہوں کہ جنس لطیف اس نظم کی وجہ سے ہمیشہ ظفر صاحب کی شاکی رہیگی۔

چشمانِ تو زیر ابرو انند
دندانِ تو جملہ در دہانند

کی بہترین تفسیر ملاحظہ کرنی ہو۔ تو مندرجہ ذیل مصرع ملاحظہ فرمائیے۔

شوہر پرست بھی ہے خدمتگزار بھی ہے
تو مالکہ ہے گھر کی

بارش کا پہلا قطرہ ایک عامیانہ نظم ہے جس کا خیال غالباً

گھنگور گھٹا تلی کھڑی تھی
پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی

سے مستعار لیا گیا ہے۔ اس نظم میں نہ تو مولوی اسمٰعیل میرٹھی کا سا ترنم ہے۔ نہ وہ سادگی۔ نہ وہ الفاظ کا دروبست، اس کے برخلاف بارش کا پہلا قطرہ ایک ایسی تھکا اور اکتا دینے والی ٹیپ ہے جو کتاب کو ہاتھ سے پھینک دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔

غزلیات غزلیں نسبتاً اچھی ہیں۔ اور اگر ظفر صاحب مشق سخن کرتے رہے اور ادب لطیف کی نام نہاد رنگینوں۔ جاذبیتوں۔ صباحتوں اور سیمینوں کے دام سے آزاد ہو گئے تو اچھے شعر کہہ سکیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے اشعار میں۔ تیر۔ نمکدان۔ واہ ہائے گریباں خنجر قاتل۔ سبلے آبرو ئی اکثر نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ خامیاں ایسی نہیں کہ دور نہ ہو سکیں۔ کہیں کہیں غیر ضروری ردیف اور قافیہ شائگاں بھی دکھائی دیتا ہے۔ زبان صاف ہے اور نظموں کی طرح مغلق اور رنگین نہیں۔ مجھے ان کا یہ شعر مدت سے پسند ہے ؎

تیری بیداد کا انداز تغافل تو نہ تھا
تیری بیداد نہیں۔ یہ تری بیداد نہیں

مجھے حیرت ہوتی ہے اور افسوس بھی۔ کہ اس شعر کا مصنف فسانوں کے معاملے میں اسقدر کور ذوق ہے۔ ان کی غزلوں کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شاید لحد کی گود میں راحت نصیب ہو
طے کر چکا ہوں منزل عمر رواں کو میں
رفعت پسندیاں ہیں یہ میری نگاہ کی
کعبہ سمجھ رہا ہوں ترے آستاں کو میں
جلوہ ہے ہر کلی میں کسی کے جمال کا
جنت سمجھ رہا ہوں ظفر گلستاں کو میں

آخری شعر کو پڑھ کر مجھے اپنا ایک شعر یاد آگیا ؎

جنت کو اُن کے حسن سے پہچانتا ہوں میں
جنت ہے ان کی صورت زیبا مرے لئے

بہرنوع میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اس کتاب پر مفصل تنقید لکھ کر اپنے وقت کا ایک گرانقدر حصہ ضائع کیا۔ میں اپنے مقصد انتقاد کی طرف ابتدائے مضمون میں اشارہ کر چکا ہوں اور امید ہے کہ ظفر صاحب اس صاف گوئی کے لئے معاف فرمائیں گے۔

عابد

مولینا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی تصنیفات

"قول حق":- قیمت دو روپے۔ مقام اشاعت مینجر عبرت نجیب آباد

قول حق اس سوال کا جواب ہے۔ کہ مسلمانان عہد حاضر سے ہر اچھی چیز کیوں رخصت ہو رہی ہے۔ اور ہر بُرا وصف کیوں ترقی کر رہا ہے۔ کتاب کا موضوع اہم اور دلچسپ ہے۔ اس پر مصنف کے انداز بیان اور رنگ تحریر نے کتاب کی دلچسپی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے چار ابواب میں ان فتنوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ جن کے باعث مسلمان قعر مذلت میں گرتے جا رہے ہیں۔ آخری چار ابواب میں ان فتنوں کے انسداد کے صحیح طریق بتائے گئے ہیں۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر مسلمان اسے اپنی لائبریری کی زینت بنائے۔

آئینہ حقیقت نما جلد دوم:- ہندوستان کی تاریخ کے متعلق یورپی مورخوں نے جسقدر غلط بیانی سے کام لیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ مولوی ذکاء اللہ صاحب اپنی تاریخ ہندوستان اور علامہ شبلی اپنی ہر تاریخی تصنیف میں ان باتوں کی طرف تفصیلی اور جزوی اشارات کر چکے ہیں۔ ہر شخص سلطان محمد تغلق کو ایک جابر و ظالم شہنشاہ تصور کرتا ہے۔ لیکن مولینا اکبر شاہ خاں صاحب نے اپنے ناقابل اتباع انداز استدلال سے ثابت کر دیا ہے کہ یہ تمام الزامات بے بنیاد ہیں۔ یہ کتاب تاریخ نویسی میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہے قیمت ۱۲ر

خواص خاں ولی:- خواص خاں ولی ہندوستان کے مشہور شہنشاہ شیر شاہ اعظم کا سپہ سالار تھا۔ مولینا نے اس کتاب میں اس نامور سپہ سالار کے حالات بڑی تفصیل سے رقم کئے ہیں۔ اس کی زندگی عبرت و بصیرت کا خزانہ ہے۔ اور ارباب نظر کے لئے اس کے حالات میں استغنا کے وہ لعل و گہر نہاں ہیں کہ آٹھ آنے کا صرف اس گرانقدر متاع کے مقابلے میں کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

خان جہاں لودھی:- خان جہاں لودھی عہد جہانگیری کا سب سے بہادر سپہ سالار تھا۔ یہ سپہ سالار شاہجہان کے عہد میں بڑی بیدردی سے قتل کیا گیا۔ مولینا موصوف نے اس نامور سپہ سالار کو بقائے دوام کا خلعت بخشا ہے۔ جس کے لئے ہر با حمیت مسلمان کو ان کا شکر گزار رہنا چاہیئے قیمت ۶ر۔

تاریخ اسلام دو جلدیں:- قیمت ساڑھے سات روپے اس تاریخ میں خاندان عباسیہ تک ان تمام اسلامی حکومتوں کا حال مندرج ہے جو عہد عباسیہ کے آخر تک دنیا کے مختلف حصوں میں قائم ہوئیں یا قائم ہو کر فنا ہو چکی تھیں۔ مولینا کی دوسری تصانیف کی طرح یہ کتاب بھی نہایت محنت اور عرقریزی سے ترتیب دی گئی ہے۔ اس دور میں جبکہ نوجوان مسلمانوں کا گروہ اپنے آباو اجداد کے زریں کارناموں سے بے خبر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان کتابوں کا ہر لائبریری میں موجود ہونا ضروری ہے۔

سپاہیانہ زندگی:- اس کتاب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلامی زندگی نام ہے شجاعت اور دلاوری کی زندگی کا۔ جن لوگوں نے عیش و نشاط کی زندگی کو منتہائے مقصود سمجھ رکھا ہے وہ غلطی پر ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے مستعدی اور محنت کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ قیمت ۸ر

مذہب اور تلوار:- اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے۔ کہ یہ الزام قطعاً غلط ہے۔ کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا۔ قیمت صرف ۹ر

اکابر قوم:- اس رسالے میں مسلمان اکابر کے حالات زندگی درج ہیں۔ قیمت ۶ر

پردے پر ایک نظر:- موضوع نام سے ہی ظاہر ہے۔ قیمت ۶ر

گائے کی تاریخی عظمت:- " " قیمت ۴ر

وید اور اس کی قدامت:- " " قیمت ۴ر

تاج آملہ ہیر آئیل

یہ تیل تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور کا تیار کردہ ہے۔ اس کی خوشبو لطیف ہے۔ اور قیمت صرف ۱۲ر جو ایسے اچھے تیل کے مقابلے میں کسی طرح بھی زیادہ نہیں۔

دنیائے ادب

ابوالعتاہیہ اور اس کی شاعری

ابوالعتاہیہ عرب کے ان مسلمان شعراء میں سے ایک ہیں، جنکو اپنے وقت کا ملک الشعراء کہنا چاہئے۔ جو رتبہ ایران میں شیخ سعدیؒ کا فارسی میں ہے۔ وہی عرب میں ابوالعتاہیہ کو عربی شاعری میں دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس کی سادگی الفاظ سلاستِ زبان اور فطری طرزِ ادا قابل ستائش ہے۔

ابوالعتاہیہ کے کلام میں سب سے زیادہ قابل تعریف یہ امر ہے کہ وہ فلسفہ کے بلند و وسیع خیالات تک کو نہایت سلیس عبارت میں بیان کر دیتا ہے۔ جو قوافی اور بحور اس نے بالعموم استعمال کی ہیں وہ نہایت آسان اور بے حد سیدھی سادھی ہیں اس کے خیالات بھی زیادہ پیچیدہ نہیں ہوتے جن کے لئے زیادہ دماغ سوزی کرنا پڑے۔ جن خیالات کو وہ ظاہر کرتا ہے ان کے لئے وہ نہایت عمدہ چیدہ اور منتخب الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو یہی اس کی شاعرانہ کامیابی اور ہر دلعزیزی کا راز ہے۔ غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ عربی شاعری کا سب سے پہلا اور شاید سب سے آخری شاعر ہے جس نے سب سے پہلے اس قدر سادہ اور آسان زبان استعمال کی ہے اور اس طرح یہ ثابت کر دیا کہ ایک شاعر بغیر ادق اور پیچیدہ زبان لکھے ہوئے بھی شاعری کو نبھا سکتا ہے۔ اس کے کلام میں متروک الاستعمال ایک لفظ بھی نہیں ملتا۔ اور نہ اس نے محض قافیہ کی پابندی کے لئے کسی جگہ بھی کوئی ناموزوں لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کی تمام شاعری پر نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ اس کو اپنے شاعرانہ انداز اور زبان پر اس قدر عبور ہے کہ گویا وہ نہایت روانی کے ساتھ برجستہ طور پر محض اشعار میں گفتگو کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ کہا بھی کرتا تھا کہ اگر وہ چاہے تو محض اشعار میں بھی گفتگو کر سکتا ہے۔ اس سے اس کے قادر الکلام ہونے کا پتہ چلتا ہے اس نے جو فی البدیہہ نظمیں لکھی ہیں وہ اس کے معیارِ شاعری کے بالکل مطابق ہیں۔

ابوالعتاہیہ کے تمام دیوان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن امور پر اس کا قلم بالعموم جولانگاہی کرتا تھا۔ وہ زیادہ تر زہد و اتقاء، سنظر موت قناعت حوادثاتِ زمانہ اور اسی قسم کے دیگر مضامین ہوتے تھے۔ چنانچہ اکثر مقامات پر اس نے بیان کیا ہے کہ یہ دنیا محض فانی ہے۔ اور اس کے بعد ایک اور عالم ہے جس کو جاودانی کہا جا سکتا ہے۔ اور اس عالم میں انسان کی ذاتی نیکی اور زہد و اتقا ہی کام دے سکتا ہے جس کے لئے ہر انسان کو ہمیشہ تیار رہنا چاہئے۔

مسٹر نکلسن اس کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ابوالعتاہیہ یکسانیت کے ساتھ غم و اندوہ کے مناظر بیان کرتا ہے۔ انسانی مصائب اور اموات کا سچا خاکہ کھینچ دیتا ہے۔ وہ خدا سے ڈرانے اور نیکی کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ تاکہ وہ یہاں زادِ آخرت جمع کر لے۔ اگرچہ مسٹر نکلسن نے غم و اندوہ کے مضامین لکھنے پر اس کو ملامت کی ہے۔ لیکن دائرۃ المعارف اسلامیہ میں اس بارے میں اس کے بالکل خلاف شہادت ملتی ہے ادب عربی میں ابوالعتاہیہ ہی پہلا اور فلاسفر شاعر ہے۔ اور اگرچہ اس کی شاعری فلسفیانہ انداز میں ہے۔ لیکن وہ سب اسلامی عقائد کی روح رواں ہے۔ اور اس لئے اس کا اثر براہ راست ایک مسلمان کے دل و دماغ پر ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ کسی نے اس سے یہ دریافت کیا کہ آیا وہ علم العروض سے بھی واقف ہے۔ اس نے اس کا یہ جواب دیا کہ میں عروض سے بالاتر ہوں۔

چونکہ اس کو ادق الفاظ۔ پیچیدہ عبارت اور ناقابل فہم خیالات سے شروع ہی سے نفرت رہی۔ اس لئے اس کا کلام تمام دیگر عربی شعراء سے اپنی سادگی اور سلاست زبان کی وجہ سے متقدمین شعراء کے کلام میں ممتاز رہا۔ چنانچہ وہ اپنی سیدھی سادھی زبان میں نہایت لطیف پیرایہ میں خواہشات نفسانی اور پرہیزگاری کے متعلق نہایت موثر طور پر ایک جگہ لکھتا ہے۔

اشد الجہاد جہاد الہویٰ ❊ وما کرم المرء الا التقیٰ

(سب سے زیادہ مشکل جہاد انسان کا اپنے نفس کے ساتھ ہے۔
اور بغیر پرہیزگاری کے کوئی شخص برگزیدہ نہیں ہو سکتا)

یہ شعر اگر غور سے دیکھا جائے تو اپنی سلاست اور راست گوئی میں بہترین شعر کہا جا سکتا ہے۔

ابوالعتاہیہ مدینہ منورہ کے قریب ایک گاؤں عین تمر میں پیدا ہوا۔ اس کا پورا نام ابوالاسحاق اسمٰعیل بن قاسم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا باپ پیشہ کے اعتبار سے کوئی بڑا معزز شخص نہ تھا۔ بلکہ حجام تھا۔ چنانچہ اسی نسبی کمزوری کے متعلق اس نے کسی موقع پر کہا تھا۔

الا انما التقوی هی العز والکرم ÷ وحبک للدنیا هو الفقر والعدم
ولیس علی عبد تقی نقیصة ÷ اذا صحح التقوی وان حاک او حجم

(بجز ورع و پرہیزگاری اور کوئی چیز قابل عزت نہیں ہے اور تمہارے فقر اور ناداری کا سب سے بڑا سبب تمہاری دنیا کی محبت ہے۔ اور کسی پرہیزگار میں کوئی نقص نہیں ہو سکتا۔ اگر پورا پورا متقی ہو۔ خواہ کپڑا سیئے یا حجامت کرے۔

ایک اور موقع پر اسی کے متعلق اس نے ایک شعر کہا ہے۔

واذا تناسبت الرجال فما اری ÷ نسبا یقاس بصالح الاعمال

(لوگ اپنے نسب کے متعلق شیخی مارتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک کوئی نسب نیک افعال و اعمال کا مقابلہ نہیں کر سکتا)

ابوالعتاہیہ کی تربیت شہر کوفہ میں ہوئی اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ اور اس کا بھائی مصر کے چند غلاموں کی شرکت میں مٹی کے برتن بنانے کا کام کیا کرتے تھے۔ اور جب کسی نے اس سے اس کے بارے میں کہا کہ تم کمہار ہو تو اس نے برجستہ جواب دیا کہ بیشک میں بحور اور قوافی کا کمہار ہوں۔ اس کے ہمعصروں سے کسی نے لکھا ہے کہ میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ اکثر نوعمر شاعری کے دلدادہ اس زمانے میں جبکہ وہ برتن بنایا کرتا تھا۔ اس کے پاس آیا کرتے تھے۔ اور اس کے کلام سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ جو اشعار ان کو پسند آتے تھے وہ وہیں اس کے پاس مٹی کے ٹھیکروں پر ان کو لکھ لیا کرتے تھے۔

ابوالعتاہیہ کے لغوی معنی "مزور یا خبط الحواسی کے باپ" کے ہیں چونکہ اس کو ہمیشہ سے تبختر و تکبر تھا۔ اور وہ اپنی شہرت کا بھی بیحد شائق تھا۔ اس لئے اس کا لقب بھی ابوالعتاہیہ ہی ہو گیا۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ یہ لقب اس کی عادات و فضائل کے اعتبار سے بیحد موزوں تھا۔ جس کی وجہ سے وہ عرب کی ادبی اور شاعرانہ دنیا میں زندہ جاوید ہو گیا۔

وہ عربوں کی طرح گورے چٹے رنگ کا نہایت وجیہ اور خوبرو شخص تھا۔ اس کے سر پر گھونگھر والے بال نہایت خوشنما تھے۔ بحیثیت ایک شاعر کے اس کی جودت طبعی کسی ایک ہی مضمون تک محدود نہ تھی۔ بلکہ اس کی شاعری کے خوان یغما پر انواع و اقسام کے لذائذ موجود ہوتے تھے۔ چنانچہ اصمعی جیسا نکتہ چین اور دقیقہ سنج اس کے متعلق کہتا ہے کہ ابوالعتاہیہ کی شاعری ایک شاہانہ وسیع صحن کی مانند ہے۔ جس میں جواہرات۔ سونا۔ خاک۔ مٹی۔ اور کھجور کی گٹھلیاں تک ہوتی ہیں۔ اس مثال سے وہ اس کی شاعری میں تنوعات کو ثابت کرنا چاہتا ہے۔

جب ابوالعتاہیہ کو اپنے متعلق پورے طور پر یقین ہو گیا کہ خدا تعالیٰ نے اس کو شاعری کا جوہر ودیعت کیا ہے تو وہ اپنے گھر کی گمنامی سے نکل کر اس گوہر ناسفتہ کے قدردانوں کی خدمت میں روانہ ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ بغداد علم و ادب کا سرچشمہ تھا۔ چنانچہ یہ بھی اپنے ہمراہ موصل کے ایک دوست کو لیکر روانہ ہوا۔ لیکن دوران سفر میں ہی اس کا دوست اس سے الگ ہو گیا۔ اور یہ مقام حیرہ میں قیام پذیر ہو گیا۔ وہاں سے اس کی شاعری کی شہرت جا بجا پھیلی۔ اور جب اس کا چرچا خلیفہ مہدی کے کانوں تک پہنچا تو وہ اس کا نادیدہ مشتاق ہو گیا۔ اور نہایت شوق سے اس کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ شاعر نے اپنی جودت طبع سے خلیفہ کی شان میں نہایت شاندار قصائد سنا کر شاہانہ عطیات حاصل کئے۔

اس کے بعد خلفا کے دربار میں اسی طرح وہ ممتاز رہا۔ چنانچہ خلیفہ ہارون الرشید۔ خلیفہ ہادی۔ مامون الرشید۔ اس کی شاعری کی داد اپنی شاہانہ فیاضیوں سے برابر دیتے رہے۔ اور وہ اس کے بے حد مداح تھے

اس کی شاعری کی بابت تمام شعرائے عرب باتفاق رائے اس کی تعریف میں رطب اللسان رہے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ابو نواس اور چند دیگر ادیبوں میں سے کسی نے ابوالعتاہیہ کی شاعری کے متعلق دریافت کیا تو اس نے کہا کہ یہ مختلف حیثیتوں سے بہترین شاعر کہا جا سکتا ہے۔

ابوالعتاہیہ دربار خلیفہ مہدی میں ایک عرصہ تک خراج تحسین وصول کرتا رہا۔ اسی اثناء میں اتفاق سے اس کو خلیفہ کی ایک چھوکری عتبہ سے عشق ہو گیا۔ وہ شاعرانہ جذبات اور اپنی والہانہ طبیعت سے مجبور ہو کر اپنے اشعار میں بھی اس کا نام لکھنے لگا۔ اور اس کے متعلق عشقیہ اشعار کہنے لگا۔ جب اس کا علم خلیفہ کو ہوا تو وہ بہت خفا ہوا اور بالآخر اس کو قید کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب قید خانہ کی تکالیف نے اس کے دماغ کو عشق کے تمام جراثیم سے پاک و صاف کر دیا۔ تو اس نے پھر دربار خلافت میں اپنی عفو تقصیر چاہی۔ خلیفہ کو اس کی حالت پر رحم آ گیا۔ اور بالآخر اس کو رہا کر دیا گیا۔

(جعفر [illegible])

رعایتی اعلان
ایک روپیہ کی کتابیں تین آنہ میں
جواہرات کا خزانہ کوڑیوں کے مول جاتا ہے
شہنشاہ تجارت
کروڑپتی بنجاؤ
بجلی گائیڈ
نام کتاب
کتب حکمت
کتب جادو
آر مہرہ برادرس کٹڑہ شاہ عالمی گیٹ لاہور

ہمارا سامان کھیل اپنی عمدگی مضبوطی
اور نسبتاً ارزانی قیمت کی وجہ سے لاثانی ثابت ہو چکا ہے
جوں جوں شائقین کھیل کلبوں کے سکریٹری اور سکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحبان اس کو بطور آزمائش منگاتے ہیں اس کی عمدگی مضبوطی اور خوبصورتی کو دیکھ کر شیدا ہو جاتے ہیں۔ جہاں کہیں ہمارا سامان کھیل ایک مرتبہ بھی بطور آزمائش کے منگایا گیا۔ انہوں نے روزمرہ کی پریکٹس اور مقابلہ کے کھیلوں میں حسب خواہش عمدہ اور مضبوط پا کر عمدہ عمدہ سرٹیفکٹ دیئے اور اپنے بڑے بڑے قیمتی آرڈروں سے مستفیض فرمایا اور خود مستقل گاہک بننے کے لئے کمپنی کے مجسم اشتہار بن گئے۔ اگر آپ نے ابھی تک ہمارے سامان کھیل کی آزمائش نہیں کی تو ایک مرتبہ ضرور اپنا آزمائشی آرڈر روانہ کر کے ہمارے مندرجہ بالا الفاظ کی صداقت کا امتحان کریں۔ پھر ہمارے مستقل گاہک نہ بن جائیں تو کہنا۔
ہماری گارنٹی یعنی ذمہ واری
جو سامان کھیل آپ ہم سے طلب فرماویں گے اُس کی عمدگی اور مضبوطی کے ذمہ دار ہیں۔ اگر وہ رسیدگی پر ناپسند ہوں تو ۲۴ گھنٹہ کے اندر اندر واپس کر کے اپنی قیمت واپس منگالیں۔ اور اگر کھیل میں ہمارا اپنا تیار کردہ سامان کھیل جلد ناکارہ ہو جائے جس سے ثابت ہو کہ خرچ کردہ رقم حرام ہوئی۔ تو ملفیہ تحریر آنے پر دوسری چیز مفت روانہ ہو گی۔
اس وعدے سے صاف ظاہر ہے کہ ہم کبھی کسی کو برا سامان روانہ نہیں کریں گے۔ کیونکہ ہم اپنے کام کو شہرت دینا چاہتے ہیں نہ کہ اپنی شہرت محنت اور روپیہ کو برباد کرنا۔
ذیل میں فہرست سامان کھیل درج ہے جس پر ۲ فی روپیہ کی خاص رعایت دی جاوے گی حسب ضرورت طلب کریں
MALIK & CO. SIALKOT
VOLLEY BALL
HOCKEY
FOOT BALL
CRICKET
فہرست سامان والی بال
فہرست سامان ہاکی
فہرست سامان فٹ بال
فہرست سامان کرکٹ
MALIK

رنگِ تغزّل

مضمحل سعیِ چارہ گر نہ ہوئی
اور شفا قصہ مختصر نہ ہوئی

صبح ہوتی نہیں ہماری شام
ورنہ کس شام کی سحر نہ ہوئی

ترکِ تدبیر کو بھی دیکھ لیا
یہ بھی تدبیر کارگر نہ ہوئی

یوں ملی ہر نگاہ سے وہ نگاہ
ایک کی ایک کو خبر نہ ہوئی

اللہ اللہ یہ حسن پرسشِ حال
کہ مرے حال پر نظر نہ ہوئی

ہجر کے بھی ہزار پہلو تھے
یوں بھی اک وضع پر بسر نہ ہوئی

آج تسکینِ دردِ دل فانیؔ
وہ بھی چاہا کئے مگر نہ ہوئی

فانیؔ

جہانِ دلبری میں دلرُبا تجھ سا نہیں پایا
ترے حُسنِ ستم کو بھی محبت آفریں پایا

وہ آنسو جن کی کچھ قیمت نہ تھی تیری نگاہوں میں
اُنھیں کو رونقِ دکانِ جیب و آستیں پایا

سمجھتا تھا کہ ہے آزادِ مطلق مملکت دل کی
اسے بھی بادشاہِ حسن کے زیرِ نگیں پایا

نیازِ عشق نے گل کے عوض سجدے بکھیرے ہیں
جہاں تیرا قدم دیکھا وہیں نقشِ جبیں پایا

محبت حشر سازِ حسن کے تاروں کی جنبش ہے
اسی سے روحِ شاعر نے سرودِ شکریں پایا

حشرؔ

[illegible]

فرانسیسی

علم انسانی

انسان کیا ہے؟ عظیم اشیا کے مقابلے میں اس کی ہستی کچھ نہیں اور حقیر اشیا کے مقابلے میں وہ ایک بڑی چیز ہے، فطرت کی عظمت سے وہ کوسوں دور ہے۔ ادھر دوسری طرف فطرت کی حقیر اشیا سے بھی اُسے کوئی علاقہ نہیں وہ اس عدم سے ناواقف ہے جہاں سے آیا ہے اور اس ابد کو پہچاننے سے عاری جو صرف خدا کی خصوصیت ہے۔ وہ ازل کے راز کو نہیں پا سکتا۔

ذہنی تخلیقات میں اس کا دماغ وہی حیثیت رکھتا ہے جو اس کا جسم جسمانی اشیا میں۔ اس کا دماغ صرف حیات کے مراکز کا ایک مبہم سا تصور قایم کر سکتا ہے۔ اور کچھ نہیں۔ نہ اُسے مخزن کا کچھ پتا، نہ مجموعہ کا۔ ہر شے عدم سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر ازل اور ابد کے رموز میں گم ہو جاتی ہے۔ کون اس تسلسل کا راز دریافت کر سکتا ہے۔ ان رموز کا خالق قادر مطلق ہے اور صرف وہ ان رموز کو سمجھتا ہے۔ یہی حال ہمارے حواس کا ہے۔ انتہا پر پہنچ کر وہ بیکار ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی انتہائی مصیبت کو برداشت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ بہت زیادہ شور ہمیں بہرا کر دیتا ہے۔ بہت زیادہ روشنی ہمیں اندھا کر دیتی ہے۔ ایک خاص نقطے سے قریب تر یا دور تر ہو کر ہماری قوت بصیرت میں فرق آ جاتا ہے۔ تقریر زیادہ طوالت زیادہ اختصار سے بے معنی ہو جاتی ہے۔ گرمی ہو یا سردی جب حد سے گذر جائے۔ پھر ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا۔ تمام انتہائی کیفیات ہماری دشمن ہیں۔

یہ ہے ہماری صحیح حالت۔ ہم ایک وسیع مرکز پر قایم ہیں اور ادھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر حرکت کر رہے ہیں۔ علم اور جہالت کے درمیان اگر ہم زیادہ آگے بڑھنے کی کوشش کریں تو ہمارا انتہائے نظر جھلملا کر آنکھوں کے آگے سے غائب ہو جاتا ہے۔ ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے اور ہمیشہ کے لئے ہمارے دام تصور سے نکل جاتا ہے۔ یہی ہماری فطرتی حالت ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ حالت ہماری طبیعت کے خلاف بھی نہیں۔ ہمارے دل میں ہر شے کا راز دریافت کرنے کا شعلہ بھڑکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک بلند تعمیر تیار کریں اور اس قدر بلند کہ آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ اور پھر بلند ہوتا ہوتا خدا کی ہستی تک پہنچ جائے۔ لیکن ہماری عمارت تڑخ جاتی ہے۔ زمین پھٹ جاتی ہے۔ اور ہماری کوششیں برباد ہو جاتی ہیں۔

(پاسکل)

بلجیم

محبت اور خاموشی

جب جوشِ حیات مکدر ہو جاتی ہے اور اس وقت ہم گفتگو کرتے ہیں۔ جب ہم حقیقت سے کوسوں دور ہو جاتے ہیں اور اپنے بھائیوں کی طرف سے بے پرواہ تو ہم زبان کھولتے ہیں اور پھر وہی کہ ہم زبان کھولتے ہیں۔ ہمیں احساس ہو جاتا ہے کہ آسمانی بادشاہت کے مقدس دروازے ہمارے لئے بند ہو گئے۔ اس لئے ہم خاموشی کو سینے سے لگا کر رکھتے ہیں۔ اور عمل سے کام لیتے ہیں۔ ہمارے دل میں مافوق الفطرت صداقتوں کا احساس کرنے کی ایک جبلی قوت موجود ہے جو بر وقت کام کرتی ہے۔ ہم احساس کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے سامنے خاموش رہنا جن سے ہم کو کوئی تعلق نہیں یا جن سے ہم محبت کرنا نہیں چاہتے خطرناک ہے۔ صرف وہی زندگی باقی کہلا سکتی ہے جس کے اجزا خاموشی سے بنے ہوں۔ خوب غور سے سوچو۔ دل کی گہرائیوں میں جہاں فرشتے اپنے پر پھیلا کر رقص کرتے ہیں۔ خاموشی کس قدر اچھی معلوم

امرت دھارا

رجسٹرڈ ـــــ نے ـــــ رجسٹرڈ

نے جس قدر نام پایا ہے اس کی کمل تعریف کے واسطے تو بڑے بھاری رسالے کی ضرورت ہے جب میں اُن ہزاروں خطوط پر نگاہ مارتا ہوں۔ جو اکثر اصحاب امرت دھارا کی کامیابیوں اور کرشموں کے متعلق لکھتے رہتے ہیں۔ میں خوش ہوا کرتا ہوں کہ خدا نے ایسی نعمت مجھے عطا فرمائی!

امرت دھارا اُن تمام امراض کا جو عام طور پر بوڑھوں بچوں جوانوں مردوں یا عورتوں کو ہوتی رہتی ہیں مکمل علاج ہے سینکڑوں بوجھ اور کئی بس چھوٹی سی شیشی کے سامنے ہیچ ہیں وہ لوگ جو گھروں میں یا سفر میں ادویات کے بکس رکھا کرتے ہیں اب یہ چھوٹی سی شیشی جیب کے ایک کونے میں رکھتے ہیں اور وقت بے وقت جو کام یہ دیتی ہے۔ وہی لوگ جانتے ہیں ۔

امرت دھارا جس گھر میں موجود ہے۔ ایک حکیم حاذق موجود ہے۔ کوئی بھی بیماری ہو اس کو دیدو اور کرشمہ دیکھو ۔

امرت دھارا جن جیب میں موجود ہے امراض کے خطرے سے محفوظ ہے ۔

امرت دھارا کو جس نے یار بنایا امراض کو دور بھگایا جو اس کو ہمیشہ پاس رکھتا ہے خود کو اور خویش و اقربا کو دکھ سے بچاتا ہے ۔

امرت دھارا ان تمام امراض کو جو اچانک آدمی کو آ دباتی ہیں۔ جب بھی دور کرتی ہے مثلاً ہر قسم کی سر سے لیکر پاؤں تک کی درد اندرونی و بیرونی ہیضہ طاعون۔ زکام سنبیات۔ سانپ۔ بچھو وغیرہ کا ڈنگ کسی بھی تیزاب یا آگ یا زہر کا لگ جانا۔ زہر کھائے جانا۔ زخم۔ چوٹ وغیرہ وغیرہ ۔

امرت دھارا میں ہر مرض کو دور کرنے کی ایک خاص صفت ہے کوئی بھی سخت سے سخت بیماری ہو اسکو دیدو۔ اوّل تو بیماری دور ہوگی ورنہ رک تو ضرور جا دیگی۔

امرت دھارا اقریباً کل امراض کو مفید ہے اور طرفہ یہ کہ اثر فوراً ظاہر ہوتا ہے حالانکہ اس وقت آپ کو ہے جبکہ متضاد امراض پر مثلاً قبض و دست کو یکساں فائدہ دکھاتی ہے

امرت دھارا بڑی بھاری ڈس انفکٹنٹ یعنی دافع جراثیم امراض ہے طاعون کے واسطے بہت مفید ثابت ہوئی ہے ۔

امرت دھارا سچ مچ آب حیات ہے دنیا میں آج تک ایسی دوائی ایجاد نہیں ہوئی ہے یہ خداداد نعمت ہے بیدک ادویات کا کرشمہ ہے سچا دوست رفیق و غمگسار بھی ہے خوراک اس کی ۲۔۳ بوند ہے۔ مگر طرفہ یہ ہے کہ اگر غلطی سے ۱۰۔۲۰ بھی کھائی جا دیں تو کوئی نقصان نہیں ہے کسی بھی بیماری میں کسی بھی وقت کسی بھی عمر میں دیجائے خدا کے فضل سے فائدہ کرے گی ۔

امرت دھارا سینکڑوں ہزاروں کے خرچ سے بچاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر ایک منگا ہے ہمیشہ منگواتا ہے اکثر اصحاب سو پچاس شیشی سے کم آرڈر نہیں بھیجتے ہیں ایک لاکھ شیشی سالانہ کی فروخت کیا کسی اور ہندوستانی دوائی کی ہوگی ۔

نام امراض جن میں امرت دھارا مفید ہے

ہر قسم کی درد سر۔ کھانسی۔ دمہ۔ ذات الجنب۔ نمونیا۔ پیٹ درد۔ نزلہ۔ زکام۔ ہیضہ۔ بدہضمی۔ اروچی۔ اپھارہ۔ درد دانت۔ قولنج۔ اسہال۔ پیچش۔ قراقر معدہ وغیرہ کل امراض معدہ۔ بے مزگی دہن و دانت۔ دانتوں کو پانی لگنا۔ خون یا پاس۔ ورم دندان وغیرہ کل امراض دانت۔ درد کان۔ زخم کان۔ نزلہ۔ نکسیر۔ زکام۔ چھینک۔ بدبوئے بینی وغیرہ کل امراض ناک۔ درد چشم۔ دھند۔ جالا وغیرہ امراض آنکھ۔ پھوڑا۔ پھنسی ہر قسم کا زخم۔ بواسیر۔ کالا سنا۔ داد۔ چنبل۔ بھڑ۔ مکھی۔ کھٹمل۔ بچھو۔ سانپ۔ باولا کتا وغیرہ کا ڈنگ۔ بخار ہر قسم۔ سوزاک۔ آتشک۔ گلٹیاں۔ وجع۔ درد مفاصل۔ ورم تمام۔ درد اندرونی و بیرونی چوٹ۔ بواسیر۔ کمزوری دماغ۔ طاعون۔ سل۔ ہچکی۔ بیہوشی۔ امراض دل۔ امراض جگر۔ کثرت حیض۔ احتباس حیض۔ خناز یرامراض بچگان۔ نکسیر۔ سوج زبان۔ منہ کا پکنا۔ سوج لب۔ درد داڑھ۔ گلے پڑنا۔ آواز بیٹھنا۔ نیچے یا اوپر سے خون جانا۔ سوج یا پھوڑہ پستان۔ ورم طحال وغیرہ امراض تلی۔ خروج مقعد۔ درد گردہ۔ بھگندر۔ درد مثانہ۔ رحم کا پھولنا وغیرہ امراض زبان۔ رنگیمن بائی۔ پنڈلی کا پھولنا۔ پتی۔ خارش خشک و تر۔ چھپاکی۔ کثرت پسینہ۔ آگ و تیزاب وغیرہ سے جلنا وغیرہ وغیرہ ۔

احتیاط امرت دھارا کا اس قدر نام دیکھکر بہت سے اشتہار بازوں کے منہ میں پانی بھر آیا وہ مختلف نام رکھکر اپنی اوصاف کی ادویات مشتہر کر رہے ہیں۔ یاد رہے کہ امرت دھارا میری ایجاد ہے اس کے مکمل اجزا میرے سوا کوئی نہیں جانتا ہے میرے پاس بے شمار خطوط موجود ہیں کہ ایسے اشتہار بازوں سے دوائی منگوا کر لوگوں نے نقصان اٹھایا ہے۔ ہوکہ سے بچیں اور کبھی کوئی اس قسم کی سوائے امرت دھارا کے خریدیں ۔

{ ہر شیشی کے ساتھ استعمال کی کتاب ہوتی ہے ہندوستان کی جس زبان میں چاہئے خط میں لکھ دیں مفصل حالات کیواسطے رسالہ امرت مفت منگوا دیں! علاوہ ان کے دیگر ہم ادویات کی فہرست اور طبی کتب مصنفہ پنڈت صاحب کی فہرست اور رسالہ امراض مخصوصہ مرد و زن بھی جسکی ضرورت ہو لکھ کر مفت بھیجے جاتے ہیں }

خط و کتابت و تار کے لئے پتہ:۔ **امرت دھارا ۔ لاہور**

المشتہر

مینجر امرت دھارا اوشدھالیہ۔ امرت دھارا بھون۔ امرت دھارا سڑک۔ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور

ہوتی ہے۔ جب تم ان لوگوں کا تصور کرتے ہو جن سے تم کو محبت رہی ہے۔ تو ان کی گفتگو کے بدلے ان کی خاموشی کا خیال آتا ہے خاموشی خاموش لمحات محبت ایک ایسی نعمتِ الٰہی ہیں جنکا جواب نہیں ہو سکتا۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ خاموشی کے کیا معنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم خاموشی سے اس قدر ڈرتے ہیں۔ ہم اپنی خاموشی۔ سنسان اور تنہا مقامات کی خاموشی تو برداشت کرتے ہیں۔ لیکن اجتماعی خاموشی۔ ہزارہا آدمیوں کی خاموشی برداشت نہیں ہوتی۔ اس قسم کی خاموشیاں مافوق الفطرت بوجھ ہیں۔ جنکو اٹھانے کی تاب شاید ہی کسی میں ہو۔ ہم اپنی عمر کا حصہ خاموش مقامات کو ترک کرنے اور غیر خاموش مقامات کو ڈھونڈنے میں گذار دیتے ہیں۔ بہت سی دوستیاں ایسی ہیں جو صرف ایک مشترک عناد خاموشی پر قایم ہیں۔ اگر یہ زہریلا سانپ آدمیوں کی مجلس میں گھس آئے تو لوگ طرح طرح کے حیلوں سے اسے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر ناکام بھی رہتے ہیں۔

زندگی میں صرف ایک یا دو بار ایسا ہوتا ہے کہ ہم خاموشی کے صحیح معنی کو سمجھ لیتے ہیں۔ نہایت سنجیدہ مواقع پر اس ناخواندہ مہمان کو بلایا جاتا ہے۔ لیکن ان موقوں پر بیوقوف سے بیوقوف آدمی اس طرح عمل کرتے ہیں۔ گویا دیوتاؤں نے ان کو خاموشی کے صحیح معنی بتا دیئے ہیں۔

جرمنی

ابتذال و صنعت

جب کوئی مصنف اہم واقعات کو کوئی وقعت نہیں دیتا اور معمولی واقعات کو غیر معمولی اہمیت دیتا ہے۔ اس وقت کہا جاتا ہے کہ اس کے آرٹ میں ابتذال کے عناصر ہیں۔ جو مرجاتا ہے کہ اچیز کی ڈھال کے متعلق کیا کہنا چاہئے۔ وہ ڈھال کے اجزائے ترکیبی کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ ایک اور عنصر ہے جسے کمینہ پن کہا جاتا ہے۔ یہ عنصر منفی نہیں بلکہ اثباتی ہے۔ یعنی ابتذال تو نام ہے اچھی خصوصیات کی نفی کا۔ اور کمینہ پن نام ہے۔ بری خصوصیات کی موجودگی کا۔ جب تحریری بداخلاقی۔ معکوس ذہنیت۔ اور قابل نفرت جذباتی نقطۂ نظر کا رنگ پایا جاتا ہے۔ تو کہا جاتا ہے کہ آرٹ میں کمینہ پن آ گیا۔

مثال کے طور پر انتقام لینا بری بات ہے۔ مبتذل ہے۔ یعنی ہم میں شرافت اور علو تخیل کی کمی ہے۔ لیکن ذلیل ذریعوں سے انتقام۔۔ لینا کمینہ پن ہے کہ اس میں اثباتی شان پائی جاتی ہے۔

(شلر)

اطالوی

عصر حاضر کا آرٹ

افسوس پرانے زمانے کے رسوم ورواج مٹ گئے۔ صنعت کا سنہری دور گذر گیا۔ صحت اور اطمینان قلب کا زمانہ جاتا رہا۔ آج کل سائنس اور فلسفے نے پرانی قیود کو توڑ کر گذشتہ آرٹ کی راکھ پر ایک اور قصر کی بنیاد رکھی ہے۔ افسوس پرانی قیود کے ٹوٹنے کے ساتھ حسن شرافت اور محبت کے خوشنما محل بھی مسمار ہو گئے۔ پچھلے زمانے میں بڑے بوڑھے بچوں کی طرح خواب دیکھتے تھے اور ان خوابوں میں ایک رنگ حسن جمال ہوتا تھا۔ آج کل کے بچے بھی فلسفیانہ تشکک سے لبریز نظر آتے ہیں۔ انسان نے ہر چیز کو تا اینکہ اپنی ذات کو بھی اعتراضات کا آماجگاہ بنا لیا ہے۔ آج کل کوئی مذہب نہیں۔ کوئی اصول نہیں۔ کوئی حسین وجمیل شہزادی نہیں جس کے لئے صناع اپنی جان دیکر آرٹ کا بہترین نمونہ تخلیق کرنے کی کوشش کرے۔

جہاز چٹانوں سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتا ہے تو ہر شخص ذاتی اغراض کو مد نظر رکھتا ہے۔ اسی طرح آج کل کی تہذیب سائنس اور فلسفے کی چٹانوں سے ٹکرا کر چور چور ہو گئی ہے۔ اور اس تہذیب کا ہر ایک جزو

لو چرخ چہارم سے مسیحا اتر آیا

لیموں دی مسیحائی

اس نادر کتاب کا اردو ترجمہ جس نے امریکہ کی طبی دنیا میں تہلکہ بپا کر دیا تھا اور جو وہاں چھپتے ہی لاکھوں کی تعداد میں ہاتوں ہاتھ فروخت ہوگئی (THE LEMON CURE) کا اردو نام "لیموں کی مسیحائی" رکھا گیا ہے لیموں میں سر سے لیکر پاؤں تک تمام امراض انسانی کا قلع قمع کرنے کی تاثیر موجود ہے یہ بات کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی مگر امریکن ڈاکٹروں نے اس راز کو معلوم کر لیا اور آئندہ کسی شخص کا بیمار ہونا ایک عجیب بات سمجھی جائیگی ملیموں کی مسیحائی ہر ایک جلد اپنے پاس رکھنے کا یہ مطلب ہے کہ آپ نے اپنی اور اپنے خاندان کی صحت بلکہ زندگی کا بیمہ کرا لیا پھر ڈاکٹروں کا بھاری بل ادا کرنے کی ضرورت ہے نہ حکیموں کے در کی جبہ سائی کی حاجت۔ کتاب مذکور میں ایک سو سے زائد مضامین ہیں جن میں سے چند ملاحظہ ہوں:-

(۱) دیباچہ (۲) لیموں کی کیمیائی تحقیقات (۳) اس کے رس کا استعمال بطور دوا (۴) امریکن شفا خانوں میں لیموں سے علاج کیونکر ہوتا ہے (۵) لیموں کا چھلکا اور گودا بطور اکسیر اعظم (۶) لیموں بطور مصفا خون یعنی لیموں سے جلدی امراض کا علاج کرنا (۷) لیموں بطور حسن افروز۔ عورتوں کی خوبصورتی بڑھانے کیلئے لیموں سے بڑھکر دنیا میں اور کوئی چیز نہیں (۸) لیموں کے ذریعہ سے نزلہ اور کھانسی کا علاج (۹) لیموں سے سرطان کا علاج (۱۰) دل و جگر کے امراض میں لیموں کی مسیحائی (۱۱) لیموں کے علاج سے بڑی توند والے موٹے آدمی اصلی حالت پر آسکتے ہیں (۱۲) لیموں کے ذریعہ پرانی بدہضمی پیچش اور دستوں کا علاج (۱۳) لیموں سے آنتوں کی خرابی اور دائمی قبض کا علاج (۱۴) لیموں سے تپ دق ناسور اور گنٹھیا کا علاج ہ علاوہ ازیں لیموں سے جلدی بخار ملیریا، ذیابیطس، بھونہ در مثلی، اور گردہ اور خارش وغیرہ کا علاج بھی ظاہر کیا گیا الغرض اس مکمل اور جامع کتاب کا حجم ۲۰۰ صفحات اور قیمت صرف ۱ روپیہ آٹھ آنہ محصولڈاک تین جلد تک

یونیورسل ٹریڈنگ کمپنی۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۵۰ لاہور

یہ نفیس اور خوبصورت جوتیاں جن پر نہایت عمدہ سنہرا کام بنا ہوا ہے نفیس مزاج اصحاب اور بیگمات کیلئے خاص طور پر تیار کروائی گئی ہیں پہننے میں آرام دہ اور ہلکی دیکھنے میں خوشنما اور درزش اور داموں کے لحاظ سے گویا مفت ہیں گھروں میں پہننے سیلپر کا عمدہ بدل ثابت ہونگی کہیں آنے جانے کے وقت پہننے آپ کی زینت دو بالا کریں گی قیمت زنانہ سادہ مخمل یا چمڑے پر بیچ سنہرے کام والی ۲ روپے فی جوڑہ۔ مردانہ سادہ مخمل یا چمڑا پر سنہرا کام ۳ روپے فی جوڑہ۔ واضح رہے کہ یہ عام بازاری مال نہیں بلکہ خاص طور پر نفیس اور پختہ بنوایا جاتا ہے۔ پاؤں کا خاکہ فرمائش کے ہمراہ آنا چاہئے۔ اخبار کا حوالہ دیجئے پیکنگ کا خرچ نہیں لیا جائے گا۔

نیو سٹورز پوسٹ بکس نمبر ۱۴۵ لاہور

داخلہ بھوپ اندر طبیہ کالج پٹیالہ (پنجاب)

پنجاب کا سب سے پہلا۔ گورنمنٹ پنجاب اور ہز ہائینس گورنمنٹ پٹیالہ کا مسلمہ اور مستند کالج ہے۔ یہاں کے سند یافتگان کے لئے گورنمنٹ پنجاب نے ملازمت کے امتیازی حقوق ملنے کا اعلان فرمادیا ہے۔ یہاں کا سند یافتہ اپنی اور ملک کی بہترین خدمات انجام دینے کے علاوہ سو دو سو روپیہ ماہوار بہ آسانی کما سکتا ہے۔ کیونکہ یہاں طبی تعلیم کا علمی و عملی مکمل انتظام ہے۔ سرجری۔ بلغم۔ خون۔ پیشاب وغیرہ کا امتحان۔ انگریزی آلات کا استعمال ریاست کے سب سے بڑے سرکاری راجندر ہسپتال میں بڑے بڑے یورپین اور ہندوستانی ڈاکٹروں کی نگرانی میں سکھلایا جاتا ہے۔ پنجاب کے سب سے بڑے اور مشہور طبیب عالیجناب حکیم دلبر حسن خاں صاحب بھٹی شفاء الملک اس کالج کے مہتمم ہیں یہاں ہندو اور مسلم بورڈنگ علیحدہ علیحدہ معقول انعام ہیں یہاں خرچ اور قسط کم مگر تعلیم زیادہ دی جاتی ہے مفصل حالات کیلئے پراسپیکٹس اردو یا انگریزی مفت منگوائیں۔

داخلہ شروع ہے۔ المشتہر **پرنسپل بھوپ اندر طبیہ کالج پٹیالہ**

معمولی سمیت سے شاد صاحب لاہور سور سپیشلسٹ کی ایجاد کردہ
من مندرا

نامی دوا کے صرف ایک دفعہ ہی لگانے سے لاہور سور کو قطعی آرام ہو جاتا ہے لاہور سور کو لوکل سور۔ رنگ ورم۔ بغداد سور۔ دہلی سور۔ فرنٹیر سور۔ جڑ دار پھوڑا اور رنگ بی پھوڑا مغلئی پھوڑا بھی کہتے ہیں۔

من مندرا نامی دوا ہندوستان کے ہر انگریزی دوا فروش سے ملتی ہے۔ ایک شیشی کئی مریضوں کے لئے کافی ہے۔ قیمت دو روپے۔

خریدتے وقت "من مندرا" نام مجھ موجد کی تصویر سے پیکٹ پر دیکھ لیا کریں یا براہ راست

مینجر ہمالیہ فارمیسی شاہی محلہ لاہور سے

منگا لیا کریں۔

بالکل مفت۔ لاہور سور کی تشخیص اور علاج معلوم کرنے کیلئے "من مندرا" نامی کتاب ہمالہ فارمیسی لاہور سے ایک کارڈ لکھکر بالکل مفت منگا سکتے ہیں۔

حسن کارنامے
پرحسن سٹیشنری کا خط پڑھنے والے کے دل پر بہت اثر کرتا ہے۔ بعض اوقات تو صرف خط لکھنے کے کاغذ کی ظاہری شان کے باعث ہی بڑے منافع کے سودے ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اگر آپ بھی چاہتے ہیں کہ آپ کا کاروبار ترقی کرے اور لوگ آپ کے سرکلروں اور خطوط کو غور سے پڑھیں تو اپنی سٹیشنری ہمارے ہاں سے چھپوائیے۔ نرخ بالکل واجبی۔
ہم لیٹر فارم و لیٹر ہیڈ۔ بہترین ڈیزائن میں تیار کرتے ہیں۔ ہر ایک پیڈ میں ۱۰۰ شیٹ نفیس ولایتی کاغذ پر انگریزی ڈیزائن میں طبع کئے جاتے ہیں قیمت فی پیڈ دو روپے پیشگی ارسال فرمائیں۔ بصورت وی پی۔ ڈاک خرچ علاوہ۔ تین پیڈ کے خریدار کو پانچ پیڈ بھیجے جاتے ہیں۔ ایک سو وزیٹنگ کارڈ کو پر پلیٹ ٹائپ سے مطبوعہ صرف دو روپے میں۔ اپنا مضمون خوشخط بھیجئے
نیز ہمارے پریس میں ہر قسم کی اردو۔ انگریزی اور ہندی چھپائی بہتر سے بہتر اور مقابلتاً ارزاں نرخوں پر کیجاتی ہے۔ رنگین۔ دو رنگی اور سہ رنگی چھپائی بھی اعلیٰ ترین ہوتی ہے۔ آپ کو اردو یا ہندی زبان میں وزیٹنگ کارڈ اور پوسٹ کارڈ سے لے کر بڑی سے بڑی ضخیم کتاب چھپوانی ہو تو کسی اور جگہ جانے سے پیشتر ہمارے پریس سے نرخ طلب فرمائیے۔
ہاف ٹون اور لائن بلاکوں کی سادہ۔ رنگین۔ دو رنگی۔ سہ رنگی چھپائی خصوصیت سے بہترین ہوتی ہے۔ کام حسب وعدہ وقت پر انجام دیا جاتا ہے
علاوہ ازیں ہر قسم کی بہترین ربڑ کی مہریں بنوانے کے لئے ہماری خدمات حاصل کریں۔ ادبی دنیا کا حوالہ ضرور دیں۔
شیخ عبد اللطیف منیجر لائن پریس انارکلی لاہور

آپ کو برقرار رکھنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ عصر حاضر کے صناع نے

اپنے آپ کو بچانا چاہا۔ اور فطرت کے ایک سنسان میدان میں کیا رہا ہے پیچھے اسکا کیا حشر ہو۔

ہسپانوی

بیوی کی خصوصیات

میں جانتا ہوں کہ میری بیوی نہ امیر ہو نہ مفلس۔ نہ میں اُسے خرید دوں نہ وہ مجھے۔ جہاں نیکی اور خلق بستے ہیں وہاں دولت کی کمی نہیں ہوتی۔

میں چاہتا ہوں کہ وہ خوش مزاج ہو۔ کیونکہ تیرہ حیات میں ہم اس طرح بندھے ہوں گے کہ اگر وہ بدمزاج ہوئی تو ان کی سختی اور بھی ناخوشگوار معلوم ہوگی۔

میں چاہتا ہوں کہ وہ اچھا لباس پہنے۔ اس لئے نہیں کہ دوسرے اُسے دیکھ کر خوش ہوں۔ اور اس کے حسن مذاق اور رنگ انتخاب کی تعریف کریں بلکہ اس لئے کہ وہ مجھے مسرور کرسکے۔

مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ اس کا رنگ گورا ہو یا سانولا۔ اس کے بال بھورے ہوں یا سنہری۔ لیکن میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اگر اس کا رنگ سانولا ہو تو وہ اپنے آپ کو پوڈر اور غازے سے دلفریب اور بیج بنانے کی کوشش نہ کرے۔ دھوکے سے مجھے نفرت ہے۔

وہ بلند قامت ہو یا پست قد۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ جوتوں کی ایڑیاں اسی لئے بنی ہیں کہ قد کے نقائص کو دور کردیں۔ (کیپو یڈو)

عربی

اقوال صائبہ

(۱) ذہین لوگوں کو عیب لگانا گویا تمام کینہ توزوں کا بدلہ لینا ہے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو اپنے آپ کو غبی خیال کرتا ہو۔

(۲) ہر شخص شر و برائی کو دوسرے کی طرف سے تو مکروہ جانتا ہے مگر خود اس کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

(۳) ہمہ دانی اور خود آرائی کا وہی شخص دعویٰ کرتا ہے جو اپنی حقیقت سے ناآشنا ہو۔

(۴) جو غضب دشمن کے مقابلے پر ہو وہ باعثِ ناموری ہے۔ اور جو بطور تمسخر یا استہزاء ہو وہ ذلیل کرتا ہے۔ (البلاغ (قاہرہ)) انیس احمد فاروقی

ہندی

نہ وہ دن رہے نہ وہ راتیں۔ پرمیشور جانے کیا ہوگیا کہ دل کسی چیز میں لگتا نہیں جنگل۔ پہاڑ چشمے۔ تمام درد سے اور غم سے بھرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کسی غم کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔

خاموش چپ چاپ جنگل بھی اُداس اُداس نظر آتے ہیں چشمے چل رہے ہیں۔ لیکن گانے کی بجائے رو رہے ہیں۔ نہ وہ دن رہے نہ راتیں پرمیشور جانے کیا ہوگیا کہ دل کسی چیز میں لگتا ہی نہیں۔ (زندہ حسن)

بنگالی

اے دوست! تو مجھے تنہا چھوڑ کر کہاں چلا گیا۔ رات اندھیری ہے بادل چھائے ہوئے ہیں موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ میں خوف کے مارے کانپ رہا ہوں۔ لرز رہا ہوں۔ کیا ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت میرے ساتھ جنگ کرنا چاہتی ہے۔ میں اس سے کس طرح مقابلہ کروں تو میرے ساتھ تھا دنیا ہنستی تھی۔ کوئی چیز میرے لئے خوفناک نہ تھی۔ لیکن اب تو ہوا کی سائیں سائیں بھوتوں کی ہنسی کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ اے دوست تو مجھے

بقیہ بر صفحہ ۸۰۰

اردو کا علمی و ادبی ماہوار
رسالہ
ادبی دنیا
مشرق و مغرب کے جدید و قدیم ادبیات کا مرقع
اکتوبر ۱۹۳۰ء
ڈائرکٹر:- آنریبل جسٹس سر عبدالقادر
ایڈیٹر:- تاجور نجیب آبادی
سالانہ چندہ چار روپے بارہ آنے محصول وی پی ۴ر
Copies, 5000.
Price As. 6-6.

INVENTOR

& SONS

LAHORE

ہندوستان کی ٹوپیوں میں انقلاب عظیم

ایف الٰہی اینڈ سنز سوداگران کلاہ و لنگی دہلی دروازہ لاہور

Do not fail to mention ... It will pay you

رجسٹرڈ ..... ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد ۲ | بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۰ء | نمبر ۴

تصاویر:- (۱) سہ رنگی شالامار باغ کشمیر۔ یک رنگی (۲) حضرت خواجہ حسن نظامی (۳) زغارت چمنت بر بہار منت ہاست (گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند) (۴) گریس ڈارلنگ کی قبر۔ (۵) خواجہ عبدالرحیم بی اے۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ (۶) مسٹر خورشید احمد بی۔ اے۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ (۷) جاپانی شہزادی۔ (۸) معصومیت (۹) صیاد خانہ بدوش۔

غزلیات:- حضرت نیر قریشی۔ حضرت جوہر عظیم آبادی۔ حضرت نجم ندوی

مولوی احمد عبداللہ خاں صاحب ارشد نے مرکنٹائل پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپکر دفتر ادبی دنیا کشمیر بلڈنگ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا۔

حال وقال

انتظامی مشکلات نے ادبی دنیا کی ترتیب کی جانب توجہ کرنے کی مجھے کبھی فرصت نہیں دی۔ حال وقال، آئینۂ عالم اور کبھی کبھی بزمِ تحقیق کی سرخیوں پر چند صفحات لکھ پاتا ہوں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اپنے متعلقہ صفحات وقت پر نہ لکھ سکنے کے سبب کاپیاں پریس جانے سے رُکی پڑی رہیں۔ اور پرچہ وقت پر شایع نہ ہو سکا۔ رہی مضامین کی ترتیب و تہذیب اور زبان کی تسہیل و اصلاح۔ اِس کی طرف تو شاید ابتدا ہی سے مجھے توجہ کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔

اگرچہ اِس میں شک نہیں کہ ادبی دنیا کے اسٹاف میں منتخب اہلِ قلم شریک ہیں اور وہ مضامین کی ترتیب و اصلاح میں کوئی خامی باقی نہیں چھوڑتے۔ لیکن مَیں نے جن اصول پر جن مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر ادبی دنیا کو جاری کیا ہے اُنہیں میں دوسروں سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ مَیں نے دس بارہ سال تک طلبہ اور عام اُردو خوانوں کی لسانی ضروریات کا مطالعہ کیا ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ ہمارے نوجوان نئی تعلیم کے طفیل ملکی زبان سے کس درجہ ناآشنا ہو رہے ہیں۔ اور اُن میں ادبی استعداد پیدا کرنے کے لئے کس قسم کی عام فہم اور سلیس زبان کی ضرورت ہے۔ ادبی دنیا کے مضامین کی زبان اگرچہ دوسرے ادبی رسالوں کے مقابلے میں آسان ہے لیکن مَیں اُسے اِس سے بہت زیادہ آسان بنانا چاہتا ہوں۔

اب تک مَیں ادبی دنیا کی مشکلات کو حل کرنے میں اپنا تمام وقت ضائع کرتا رہا۔ اب سولہ ماہ کے تجربے سے اِس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ مالی مشکلات کی یہ گتھی میرے ناخنِ تدبیر سے کھلنے والی نہیں ہے۔ اور دماغ میں ادبی دنیا کے دفتر کو قایم کر لینے سے بلوں کے تقاضے اور تنخواہ طلب جماعت کے ہجوم کم نہیں ہو سکتے۔ اِس لئے مَیں نے فضائے دماغ سے ادبی دنیا کے دفتر کو اُٹھا لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور اب توفیق ملی تو خدا کے کاروبار میں دخل دینے کی غلطی نہیں کرونگا۔ کیونکہ مَیں اِس حقیقت کو سمجھ چکا ہوں کہ مشکلات بھی اُدھر ہی سے آتی ہیں اور اُن کا حل بھی۔ عاجز انسان نہ مشکلات پیدا کرنے کا ذمہ وار ہے نہ اُنہیں مٹانے ہی پر کچھ دسترس رکھتا ہے۔

آئندہ میں اُس دفتر میں آٹھ پہر حاضر رہنے کی بجائے جو میرے دماغ میں قائم تھا ادبی دنیا کے اِس دفتر میں کام کرونگا جو میکلوڈ روڈ پر واقع ہے۔ ہر نمبر کے مضامین خود دیکھونگا۔ مضامین کی پیچیدہ زبان کو آسان کرونگا۔ اور جو مشاہیر علم و ادب اپنے مضمون میں قلم لگانے کی اجازت نہ دیں گے اور اُن کے مضامین ادبی دنیا کیلئے ناگزیر سمجھے جائیں گے اُن کے مندرجہ مضمون کے مشکل الفاظ کے لئے آخیر میں فرہنگ لگاؤں گا۔ یہ کوشش برابر جاری رکھوں گا کہ ادبی دنیا کے مضامین کی بلندی، گہرائی اور دلچسپی زبان کے ثقل اور پیرایۂ بیان کی پیچیدگیوں میں گم نہ ہو جائے۔

وی۔پی واپس۔ ادبی دنیا کے نقصانات کی گراں باری میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ گذشتہ ایک سال میں نو ہزار روپلے کا نقصان اُٹھا چکا ہوں۔ اِس کے باوجود ادبی دنیا کو زیادہ مفید، زیادہ دلچسپ اور زیادہ شاندار بنانے میں ناعاقبت اندیشی کی حد تک روپیہ صرف کر رہا ہوں۔ ہندوستان کے قابل ترین انشا پردازوں سے گرانقدر معاوضے پر مضامین حاصل کر کے ہر نمبر کو پہلے سے زیادہ مفید اور کار آمد بنانے کی کوشش میں دن رات لگا رہتا ہوں۔

ادبی دنیا کے رجسٹروں سے اِس کی تصدیق کی جا سکتی ہے کہ اِس کے ایڈیٹوریل سٹاف (عملۂ ادارۃ) کی تنخواہوں اور مستقل قلمی معاونین کے معاوضوں کی مجموعی رقم اتنی ہے کہ اِس سے ایک اچھے روزنامے کیلئے ایک اچھا اسٹاف بہم پہنچایا جا سکتا ہے۔ پھر اِس کی تصاویر۔ اخراجات نے تو مجھے اور میرے معاصرین کو سخت مشکل میں ڈال رکھا ہے۔

ادبی دنیا کو مسلسل دیکھنے پڑھنے اور دوسرے رسالوں سے اِس کا مقابلہ کرنے والے ادبی دنیا کی اِن تمام خصوصیات کو اچھی طرح جان چکے ہیں۔ ہر خریدار کو اِس کا اعتراف ہے کہ ایسا مفید شاندار اور پھر اسقدر سستا اور کوئی رسالہ نہیں ہے۔

اپنا تمام وقت، تمام سرمایہ اور تمام جدوجہد کو نثار کرنے کا صلہ

ادبی دنیا کے خریداروں کی جانب سے یہ ملتا ہے کہ سال بھر کے بعد ایک ماہ پہلے وی پی کی اطلاع دینے کے باوجود جب اُن کے نام وی پی بھیجا جاتا ہے تو واپس کر دیتے ہیں۔ کارکنوں کو اُن خریداروں سے متعلق شکایت نہیں۔ جو دفتر کی وی پی کی اطلاع پاکر انکار لکھ دیتے ہیں۔ شکایت کیسی ایسے حضرات شکریہ کے مستحق ہیں۔ کہ وی پی کرنے سے پہلے انکاری خط لکھ کر وہ دفتر کو دس آنے کے نقصان سے بچا لیتے ہیں۔ ہاں شکایت اُن حضرات سے ہے جنہیں ایک ماہ پہلے وی پی کی اطلاع دیجاتی ہے۔ اُس اطلاع میں کھول کر لکھ دیا جاتا ہے کہ اگر آپ کی طبیعت ادبی دنیا کے مطالعہ سے سیر ہو چکی ہو تو آپ کا بڑا احسان یہ ہوگا کہ آپ ہمیں وی پی بھیجنے سے ایک انکاری اطلاع دیکر روک دیں ۔ اِس طرح آپ ہمیں وی پی کے محصول اور واپسی کی صورت میں رسالہ کی بربادی کے نقصان سے بچا لینگے۔ مگر حیرت ہے کہ ادبی دنیا کے اکثر تعلیم یافتہ خریدار تعلیم اور اخلاق کی تمام ذمہ داریوں سے یکسو ہو کر ایک اطلاعی کارڈ سے وی پی کو روک دینے کی بجائے اُسے واپس کر کے دفتر کو دس آنے کا نقصان پہنچا دیتے ہیں۔

جس ملک کے تعلیم یافتہ اپنی ملکی زبانوں کے خدمت گزار پرچوں سے یہ بیدردانہ سلوک روا رکھیں اُس ملک کی زبان اور ادبیات کا خدا ہی حافظ ہے۔

کیا وی پی واپس کرنے والے حضرات کا یہ قابلِ اعتراض رویہ اسی طرح جاری رہے گا۔ سال بھر ادبی دنیا پڑھنے کے بعد ادبی دنیا کا اپنے خریداروں پر اتنا بھی حق نہیں کہ وہ آئندہ خریداری جاری رکھنا نہ چاہیں تو وی پی کی اطلاع پاتے ہی انکاری خط لکھ کر ادبی دنیا کو واپسی کے نقصان سے بچا لیں؟

شالامار باغ:- اِس نمبر میں کشمیر کے شالامار باغ کی سہ رنگی تصویر شائع کی جا رہی ہے۔ یہ پُر فضا باغ مغلیہ سلطنت کے صنعتی کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ریلوے جاری ہونے سے پہلے ملک کے دُور دراز حصّوں سے سیاح ہزاروں میل کی کٹھن منزلیں طے کر کے اِسے دیکھنے آیا کرتے تھے۔ جب سے ریلوے کا اجرا ہوا ہے۔ اور ہفتوں کی راہ گھنٹوں میں طے کی جانے لگی ہے۔ ہر موسم گرما ہندوستان کے ہر گوشے سے اِس باغ کے ہزاروں تماشائی نارتھ ویسٹرن ریلوے کی سہولتوں کے طفیل کشمیر میں جمع کر دیتا ہے۔

گریس ڈارلنگ کی قبر:- یہ اُس جانباز لڑکی کی قبر ہے جس نے جان پر کھیل کر ڈوبتے ہوئے جہاز میں سے بہت سے مسافروں کی جانیں بچائی تھیں۔

ملک کے جن اہلِ قلم نے ادبی دنیا کے غیر مقامی اسٹاف میں کام کرنے پر آمادگی ظاہر فرمائی ہے۔ اگلے پرچے میں اُن کے ناموں کا اعلان کیا جائے گا۔

معزز مضمون نگاروں کی خدمت میں گذارش ہے کہ ادبی دنیا کے لئے مضمون لکھتے ہوئے کاغذ کے صرف ایک جانب لکھا کریں تاکہ ضروری ترمیم و تسہیل میں ایڈیٹر کو دقت پیش نہ آئے۔

نو مشق حضرات سے مودبانہ التماس ہے کہ وہ اپنی پہلی مشق کو ادبی دنیا میں شائع کرنے کے لئے بھیجنے کی زحمت ہرگز نہ فرمایا کریں۔ ہر نو مشق کے لئے یہ ضروری ہے کہ دو تین سال اپنے طور پر مضمون نگاری کی مشق کرے۔ کسی مقامی مضمون نگار سے اصلاح لیتا رہے اور پھر جب اُس کی مشق میں پختگی پیدا ہونے لگے تو اپنی قلمی شہرت کا آغاز ان اخباروں سے کرے جو بچوں کے لئے شائع کئے جاتے ہیں۔ بچوں کے اخبارات میں جب ایڈیٹر کی ترمیم و اصلاح کے بغیر اُس کے مضمون شایع ہونے لگیں تو پھر چھوٹے چھوٹے ادبی رسالوں کا مضمون نگار بنے۔ اور اسی طرح ترقی کرتے کرتے اردو ادب کے بلند پایہ رسالوں کے حال زار پر توجہ ارزانی فرمائے۔

"روم ایک دن میں روم نہیں بن گیا تھا"

پھر کوئی ایک مشق میں آزاد و حالی کیونکر بن سکتا ہے؟

حضرت خواجہ حسن نظامی:- محترم خواجہ صاحب کی تصویر اس نمبر میں شائع کی جا رہی ہے۔

ادبی دنیا کے قارئین یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ خواجہ صاحب نے ادبی دنیا کے ہر نمبر کے لئے مضمون لکھنے کا حتمی وعدہ فرمایا ہے۔ ادبی دنیا کی یہ انتہائی خوش نصیبی ہے کہ ایسا عالی جاہ انشا پرداز اُسے اس کے معاصرین میں ممتاز بنانے پر متوجہ ہوا ہے۔

تاجور

شالامارِ باغِ کشمیر

باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے　　سایۂ شاخِ گُل افعی نظر آتا ہے مجھے　(غالب)

چھپ گیا دامانِ مغرب میں نگارِ آفتاب　　بجھ گیا طوفانِ ظلمت میں شرارِ آفتاب
اشہبِ نوریں سے اُترا شہسوارِ آفتاب

ساغرِ خورشید سے چھلکی شرابِ لالہ فام　　گیسوؤں کو آ گئی کھولے ہوئے لیلائے شام
جسکی محفل میں ستارے رقص کرتے ہیں مدام

آسماں سے دیوِ ظلمت نے بڑھائے اپنے ہات　　نوچ ڈالا اپنے چنگل سے لباسِ کائنات
یہ شفق کی احمریں موجیں ہیں یا خونِ حیات

دیکھ کر تاریکیاں ہوتا ہے دل کو اضطراب　　سرو کے سائے میں لہراتی ہوئی شاخِ گلاب
جسطرح غصے میں ناگن کھا رہی ہو پیچ و تاب

ذرہ ذرہ اِس گلستاں کا شبستاں زاد ہے　　موت کے سایوں میں یہ رنگیں چمن آباد ہے
ہر گلِ خنداں مجسّم اِک لبِ فریاد ہے

درد کے نغموں سے لرزاں ہے ربابِ آبشار　　پتھروں پر مارتا ہے اپنا سر دیوانہ وار
یاد میں ہے عظمتِ ماضی کی گویا بیقرار

کس نزاکت سے گلوں پر پاؤں دھرتی ہے نسیم　　سُن رہا ہوں میں کہ ٹھنڈے سانس بھرتی ہے نسیم
مرنے والوں کی دل آرائی پہ مرتی ہے نسیم

عظمتِ ماضی تو مٹ جائے رہے وہ ارجمند　　اپنی رعنائی پہ نادم ہے یہاں سروِ بلند
لالہ و گُل کی ہنسی کیا ہے مگر اک زہرخند

دیکھتا ہے دیر سے یہ منظرِ حیرت فروش　　کوہسارِ برف پوش و سخت کوش و بے خروش
دیکھئے کب اِس سکوں پرور کو آتا ہے جوش

عابد

آئینۂ عالم

کوئلہ اور ہوا

جریدہ "انکشاف" اپنی تازہ ترین اشاعت میں رقمطراز ہے:-

آج کل کسی قوم کی دولت و طاقت کا انحصار عام طور پر کوئلے اور تیل پر رہگیا ہے۔ یہی دو معیار ایسے ہیں جن سے موجود سلطنتیں اپنی قوت کو ناپتی ہیں۔ ڈاکٹر لیونیسٹن نے ایک لکچر کے دوران میں ارشاد فرمایا تھا کہ طاقت کے اس ذخیرے پر انحصار کرنا جو صدیوں سے محفوظ چلا آتا ہے۔ (یعنی کوئلہ) برطانیہ کی کمزوری ہے - دوسرے ممالک ہر چند۔ آبشار۔ ہوا اور سورج کی روشنی سے وہ تمام فائدے اٹھا رہے ہیں جو برطانیہ کوئلے سے اٹھاتا ہے۔ کوئلے کا زمانہ اب ختم ہونے کے قریب ہے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ ہوا اور دوسرے فطرتی عناصر سے کوئلہ حاصل کرنے کے طریقے سوچے جائیں:

اس تجویز کی تکمیل میں ڈاکٹر لیونیسٹن نے ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا ہے جس سے ہوا کے ایک جز یعنی کاربانک ایسڈ سے وہی مسالے حاصل کئے جا چکے ہیں جو کوئلے سے حاصل کئے جا چکے ہیں یا جو کوئلے سے حاصل ہوتے ہیں۔ کاربانک ایسڈ کو کوئٹے کی گیس (میتھین) کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اور ابھی اس طریق کار میں مزید ترقی کی امید ہے۔

اس طرح یہ اندیشہ کہ دنیا کا کوئلہ ختم ہونے والا ہے۔ اہم نہیں رہا۔ سائنسدان اب ہوا سے وہی کام لے رہے ہیں جو کوئلے سے۔

پنجاب لٹریری لیگ

ہم اس سے پہلے پنجاب لٹریری لیگ کے نام کی اطلاع دے چکے ہیں۔ اس انجمن کے قیام کے مقاصد یہ ہیں۔ کہ اہل قلم حضرات کی تنظیم کی جائے۔ تاریخ اور ادب پر مشاہیر سے لیکچر کرائے جائیں اور ایک دار المطالعہ قائم کیا جائے۔ لیگ کا ایک ماہواری رسالہ پنجاب لٹریری ریویو کے نام سے شائع ہونے والا ہے۔

یہ مقاصد واقعی مبارک ہیں پنجاب کے تمام اکابر نے لیگ کی سرپرستی منظور فرمائی ہے۔

ان اکابر میں مسٹر اے سی ولز۔ علامہ سر محمد اقبال۔ سر شہاب الدین مسٹر جسٹس آغا حیدر۔ سر عبد القادر۔ سر محمد شفیع۔ راجہ نرندرا ناتھ۔ سر جوگندر سنگھ۔ نواب احمد یار خاں۔ حکیم احمد شجاع۔ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین۔ پروفیسر ایم۔ اے غنی۔ پروفیسر محمد شفیع۔ پرنسپل ہادی۔ مرزا محمد سعید۔ رائے بہادر لالہ کنور سین۔ اور ان کے علاوہ کئی اور حضرات شامل ہیں۔

حال ہی میں اس لیگ نے علمی ادبی تاریخی لیکچروں کا انتظام کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اصحاب مضمون پڑھیں گے۔

مندرجہ ذیل حضرات نے مضمون پڑھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

پروفیسر جے گوپال بینرجی (کلکتہ یونیورسٹی) پروفیسر کے ٹی شاہ (بمبئی یونیورسٹی) پروفیسر کے سدھانت (لکھنؤ یونیورسٹی) پرنسپل دس، منشی پریم چند۔ مسٹر او سی گنگولی۔ حضرت نیاز فتحپوری۔ پروفیسر بشیر احمد ہاشمی۔ خواجہ غلام السیدین۔ سر عبد القادر۔ حکیم احمد شجاع۔ مسٹر محمد حبیب (علیگ) مسٹر مجید ملک۔ مسٹر بھولا ناتھ۔ سید عابد علی ایم۔ اے۔ ڈاکٹر محمد اقبال مسٹر برج لعل نہرو۔ پروفیسر مترا۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ۔ پروفیسر موہن سنگھ۔ مسٹر ہرکشن لعل۔ مسٹر رتن چند۔ ڈاکٹر ویلٹے۔ وغیرہ۔

مندرجہ بالا فہرست سے اس انجمن کے مقاصد کی وسعت کا اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں اس انجمن کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اہلِ وطن نے اس انجمن کی قرار واقعی قدر دانی کی تو ملک و قوم کی فلاح کا موجب ہوگا۔

جو صاحب اس لیگ کے ممبر بننا چاہیں وہ مسٹر ڈی آر چودھری سکریٹری لٹریری لیگ پنجاب ۵٦ بیڈن روڈ لاہور سے خط و کتابت کریں۔

مغرب میں ادبی تحریروں کے معاوضے

مسٹر کولیج صدر جمہوریہ امریکہ اور گورنر سمتھ نے اپنے سوانح حیات قلمبند کرنے کا معاوضہ ایک ڈالر فی لفظ کے حساب سے وصول کیا۔ اس حساب سے مسٹر کولیج نے اپنے سوانح حیات کی تصنیف سے ایک سال کی تنخواہ سے زیادہ رقم حاصل کر لی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک ڈالر فی لفظ کی شرح معاوضہ حیرت انگیز ہے۔ لیکن مغرب کی تاریخ ادب ایسے واقعات سے خالی نہیں۔ اس سے پہلے جیمز نے اپنی نظم "میری پرانی معشوقہ" لکھکر اتنا روپیہ کمایا تھا کہ بحساب اوسط ایک لفظ کی قیمت ۵۰۰ ڈالر ہو جاتی تھی۔ الگزنڈر پوپ نے ایلیڈ کے ترجمے کے لئے ۵۰۰۰۰ ڈالر وصول کئے۔ اور وہ بھی اس وقت میں جب ڈالر کی قیمت آج سے پانچ گنا زیادہ تھی۔ سر والٹر سکاٹ کو لیڈی آف دی لیک کیلئے ۱۵۰۰۰ ڈالر ملے۔ ٹینسن کو اپنی ایک نظم کا معاوضہ ۲۵۰۰۰ ڈالر وصول ہوا۔ مقابلتہً ملٹن کو "جنت گمشدہ" کے لئے صرف ۵۰ ڈالر وصول ہو سکے۔

چین کے طالبعلم

پیکن کی قومی یونیورسٹی کے ۵۷۱ طالبعلموں میں سے ۳۲۸ طالبعلم شادی کرنے کے بعد پچھتا رہے ہیں۔ کچھ دن ہوئے طالبعلموں سے کچھ سوال پوچھے گئے تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا "کیا تم اپنی شادی سے مطمئن ہو؟" ۳۲۸ طالبعلموں نے نفی میں جواب دیا۔ ۳۱ طالبعلموں نے اثبات میں۔ باقی یا تو غیر شادی شدہ تھے۔ اور یا اپنے جذبات کا اظہار نامناسب خیال کرتے تھے۔ عام طور پر طالبعلم حسن کو بدی کی سب سے ضروری خصوصیت تصور کرتے تھے۔ چین کے طالبعلم میسولینی کی بہت عزت کرتے ہیں اور اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جغتصادیات

ایک نیا فن جو جغرافیے اور اقتصادیات کے اجتماع سے وجود میں آیا ہے۔

پچھلے دنوں پروفیسر میبرز نے اڈنبرا یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

"جغرافیے اور اقتصادیات کے باہمی تعلق کے متعلق کوئی تحقیقات نہیں کی گئی۔ اس کمی کو پورا کیا جائے تو ایک نیا علم عالم وجود میں آجائیگا۔ جسے بجا طور جغتصادیات کہا جا سکتا ہے۔ اس علم کے ذریعے علم جغرافیہ ہر شخص کیلئے انفرادی طور پر سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔

جغرافیہ حقیقت میں ام العلوم ہے۔ نجوم۔ کیمیا۔ علم الحیوانات علم النباتات۔ علم الآثار وغیرہ تمام اس علم کی تحقیقات کے شاندار نتائج ہیں۔ مختصر الفاظ میں کہا جا سکتا ہے۔ کہ علم انسانی کی پہلی کڑی جغرافیہ ہے۔

اگرچہ اس ترقی کے دور میں بھی بعض استاد ایسے ہیں جو کسی ملک کا حدود اربعہ یاد کراتے ہیں۔ لیکن عام طور پر اب جغرافیے سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اور اگر جغتصادیات کا علم عالم وجود میں آگیا تو اس فائدے کا دائرہ عمل اور بھی زیادہ وسیع ہو جائیگا۔

کھانے والی قوم اور کمانے والی قوم کا فرق

ہندوستان کے کسی شہر، کسی قصبہ، کسی گاؤں میں آپ چلے جائیے آپکو سیکڑوں ایسے لوگ ملینگے جن کے آباؤ اجداد کے اونچے محلوں کو آسمان بوسے دیتا تھا مگر اب ان کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں زمین کو سجدے کر رہی ہیں۔ جن کے آباؤ اجداد کی چوکھٹوں پر ہاتھی جھومتے تھے مگر آج انکے گھروں میں چوہے قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ مگر امریکہ میں اکثر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کے باپ لکھ پتی تھے اور وہ آج ارب پتی ہیں۔ مثال کے طور پر چند دولت مندوں سے آپکو روشناس کراتا ہوں۔

مسٹر اسٹور امریکہ کے ایک مشہور دولتمند تھے ۱۸۴۸ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو انہوں نے ۲۰ ملین ڈالر کا ترکہ اپنی اولاد کے لئے چھوڑا تھا۔ ان کی اولاد تجارت کے ذریعہ سے برابر اسے بڑھاتی ہی رہی حتیٰ کہ اب وہ ۱۵۰ ملین ڈالر ہے جس میں سے تنہا مسٹر فنسٹ اسٹور ۱۰۰ ملین ڈالر کا مالک ہے۔

اسٹینڈرڈ آئل کمپنی کے دو حصہ دار مسٹر چارلس اور مسٹر اسٹیفن اپنے انتقال کے وقت ۵۰ ملین ڈالر کے مالک تھے لیکن آج اول الذکر کی اولاد ۳۰۰ ملین ڈالر اور موخر الذکر کی اولاد ۴۰۰ ملین ڈالر کی مالک ہے۔ مسٹر ڈیوپونٹ نے اپنے انتقال کے وقت ۲۰ ملین ڈالر چھوڑے تھے لیکن آج انکی اولاد ۵۰۰ ملین ڈالر کی مالک ہے۔ —— دیکھا آپ نے یہ ہے کھانے

عمر خیام اور اسکا عہد

خیام کی صناعی

(گذشتہ سے پیوستہ)

الفاظ و معانی کا حسین و جمیل تعلق

کہا گیا ہے کہ ادب خیالات عالی کو الفاظِ عالی میں ملبوس کرنے کا نام ہے۔ یعنی الفاظ اور معانی میں ایک مخصوص رابطہ پیدا کرنا صناع کا پہلا فرض ہے۔ خیام اس فرض کی اہمیت کو سمجھتا ہے۔ اور اپنے معانی کے ہر پہلو کو اور ان پہلوؤں کے نازک سے نازک فروق مفاہیم کو ادا کرتا ہے۔ معانی کے اظہار کے لئے وہی الفاظ انتخاب کرتا ہے۔ جن کے اثرات۔ جن کی دلالتِ التزامی[1] تمام معانی کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتی ہیں۔ وہ مرکزی خیال کو ایک تراشیدہ لعل تصور کرتا ہے اور الفاظ کے مہر عالمتاب سے اس لعلِ شب چراغ کو ہر طرف سے منور کرتا ہے۔

کہتا ہے ؎

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما
کے رند خراباتیٔ و دیوانۂ ما
برخیز کہ پُر کنیم پیمانہ زمے
زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

خیال یہ ہے کہ بے ثباتیٔ عمر کی تلخی کو کم کرنے کے لئے شراب لعل کے جام پیئے جاؤ۔ یہ تلقین بظاہر عقل دور اندیش کو خطرناک معلوم ہوگی۔ خیام نے اس تلقین کو جس حسین رنگ میں پیش کیا ہے۔ اس کے پہلو دیکھئے۔

صبح کا لفظ اپنے اندر صباحت و لطافت کے ذخیرے پنہاں رکھتا ہے۔ اس وقت نیاز و عجز کے سجدوں کا خلوص روح کو عرفان کے سرچشمے سے سیراب کرتا ہے۔ پھر صبح فطرتاً شاعر اور شاعر ہی پر کیا منحصر ہے ہر ذوقِ جمال رکھنے والے شخص کے لئے نشاط و مسرت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ "صبح بنارس" کی شعریت آفریں ترکیب کس نے نہیں سنی۔

جہانگیر کہتا ہے:۔

وقت نیاز و عجز جہانگیر بادشاہ
امید آں کہ شعلۂ برق اثر رسد

سحرے کہکر خیام نے یہ تمام پہلو ادا کر دئے ہیں۔ پھر شراب نوشی کی تلقین کے لئے کسی انسان کو مشخص نہیں کیا۔ بلکہ صرف ایک "ندا" آتی ہے۔ اس ندا کا ابہام حد درجہ خیال آفریں ہے۔ یہ لفظ ذہن میں امکانات کا ایک سلسلہ پیدا کر دیتا ہے۔

"میخانہ" کا لفظ اسبات پر دلالت کرتا ہے کہ جس شخص کو تلقینِ شراب نوشی کی جارہی ہے وہ ایک میگسار ہے۔ جو خواب غفلت میں مدہوش ہے۔ "دیوانۂ ما" کہکر ندا کے ہاتف نے میگسار کی ہمدردی حاصل کر لی ہے۔

"برخیز" کسل اور ماندگی کی جان گداز کیفیات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ قوت تخیل میگساروں کی اعضا شکن انگڑائیوں۔ اور خمار کی بشوول کا تصور کر سکتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی "برخیز" شہدِ عمل کے لئے ایک تازیانے کا کام دیتا ہے۔

"پُر کنند پیمانۂ ما" پیمانۂ عمر کے لبریز ہو جانے سے عبارت ہے۔ اور اتحاد الفاظ و معانی کی اس سے بہتر مثال کیا ہو سکتی ہے کہ عمر دو روزہ کے ختم ہو جانے کو بھی میگساری کے اصطلاحی الفاظ میں ادا کیا ہے۔ یعنی ایسے محاورے کے ذریعے جس سے شراب نوش کے کان سب سے زیادہ آشنا ہوتے ہیں۔

محض الفاظ اور اُن کے اتار چڑھاؤ کے نقطۂ نظر سے رباعی میں موسیقی کا اثر دیکھئے۔ حرفوں کا اختلاف اور ان کے مجموعی توازن سے موسیقی میں اثر حسن پیدا کیا جاتا ہے۔ اس رباعی میں سحرے کی ے کی کشش اور ندا کے الف کا اختلاف دیکھئے۔ پھر سحرے "ما"

---

[1] الفاظ کا اپنے موضوع کے تمام لازم معانی پر دلالت کرنا

اور "میخانۂ ما" کے ہم قافیہ ہونے کے علاوہ توازن صوتی پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ خیام کا آرٹ کسقدر مکمل ہے۔ مجموعی طور پر جو ترنم پیدا کیا گیا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔ آخری دو مصرعوں میں "برخیز" اور "زاں پیش" کی ہم آہنگی اور تیسرے مصرعے کا چوتھے مصرعے سے موزوں تطابق تعریف سے بے نیاز ہے۔ ؎

ہرچند کہ رنگ و بوئے زیباست مرا
چو لالہ رخ و چو سرو بالاست مرا
معلوم نشد کہ در طرب خانۂ خاک
نقاشِ من از بہر چہ آراست مرا

اس سے پہلے کئی بار اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ خیام ہر حسین شے کی ہلاکت سے متاثر ہوتا ہے۔ "حسن" کی بہترین تصویر اور نازک ترین مظہر انسان ہے جو تخلیق اکبر ہے۔ یہ تخلیق اکبر جو اپنی عقل و ذہن کی ہنگامہ آفرینیوں سے بحر و بر پر حکومت کرتی ہو آخر موت کا جام پینے پر مجبور ہوتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ یہ قیامت ہے کہ آفرینش کائنات کا راز سمجھ میں نہیں آتا۔ معلوم نہیں ہوتا کہ اگر اس حسن و جمال کا انجام فنا تھا تو انسان کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر نشاطِ کار کو غم میں تبدیل ہونا تھا تو "نشاطِ کار" کی ہوس ہی کیوں پیدا کی گئی۔ مندرجہ بالا رباعی میں یہی خیال ہے۔

"رنگ و بوئے زیبا" انسان کے کمالاتِ ظاہری و باطنی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ خوبصورت رنگ آنکھوں کے ذریعے دل میں کھب جاتا ہے۔ اور بوئے خوش مشام کے ذریعے روح انسانی کو شگفتہ کرتی ہے۔ رنگ پھول کا ظاہری حسن ہے اور بو۔ باطنی اسیطرح انسان کے کمالات ظاہری و باطنی خالق اکبر کی صفات کے آئینہ دار ہیں۔

"لالہ" کا لفظ کہکر خیام نے نشاط و مسرت کی تصویر کھینچی ہے۔ گلابی اور سرخ رنگ مسرت کے آئینہ دار ہیں۔ خوشی میں چہرہ تمتماتا ہے۔ اسی لئے "روئے ارغواں" کی "رنگ آفریں"، شعرا کا محبوب موضوع ہے۔ لالے کا پھول اپنے سرخ رنگ کے لئے مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یوں بھی رنگوں میں اس کا رنگ زیادہ گہرا۔ زیادہ دلربا۔ زیادہ جاذب توجہ ہوتا ہے۔

"سرو" کو قد انسانی سے تشبیہ دیکر خیام نے "قامت رعنا" کی دلربائیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سرو باغ کے تمام درختوں میں سب سے زیادہ حسین بلند اور دلکش ہوتا ہے۔ "بلندی قامت" ایک عنصر جمال ہے۔ چنانچہ غالب کہتا ہے ؎

ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

سعدی کہتا ہے ؎

دریں باغ سروے نیامد بلند

سرو کو ادب میں ایک تمثیلی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ قامت کی درازی اور دلربائی کے لئے اس سے بہتر شے کا انتخاب نہ ہو سکتا تھا۔

"طرب خانۂ خاک" اُن تمام دلچسپیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو انسان نے اپنی دوروزہ زندگی کے لئے قائم کر لی ہیں۔ مسرت و نشاط کے جلسے۔ احبابِ زندہ دل کی تلاش۔ وہ تمام وسائل جو انسان زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے اختیار کرتا ہے "طرب خانۂ خاک" کی ترکیب نے ادا کر دئے ہیں۔

خدا کو "نقاش" کے لفظ سے مخاطب کر کے اُس کی تخلیقات کے حسن و جمال موزونی۔ اور تناسب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جس طرح نقاش کا مقصد اعلیٰ آفرینش حسن ہے۔ خدا نے بھی کائنات کے مظاہر کو حسین بنا کر ذوقِ جمال کی تسکین کی ہے۔ یہ موضوع شروع سے شاعروں اور فلسفیوں کو دعوت دیتا آیا ہے۔

غالب کہتا ہے۔ ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

پھر نقاش کے لفظ میں صرف صناع کائنات کی حسین و جمیل مخلوقات کی طرف ہی اشارہ نہیں کیا گیا۔ بلکہ "نقوش" کی بے بسی اور بیکسی کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جس طرح نقش نقاش سے شکایت نہیں کر سکتے۔ کہ انہیں کیوں ایک خاص شکل دی گئی۔ جس طرح نقش اپنے وجود کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں اُسی طرح انسان بھی خالق کائنات سے شکوہ کرنے کا اہل نہیں ہے۔ وہ بھی نقوش کی طرح اپنی تخلیق کا مقصد سمجھنے سے قاصر ہے

شاید غالب نے اپنا ایک معرکۃ الآرا مضمون خیام ہی سے لیا ہو

وہ کہتا ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

ایک جگہ غالبؔ "نقاش" کو "چمن طراز" بھی کہتا ہے ؎

رُخِ گل زغازہ کاری بہ نگاہ بندہ آئیں
نہ رسد بہ خس شکایت زچمن طراز کردن

دورے کہ دروآمدن و رفتن ماست
آں را نہ بدایت نہ نہایت پیداست
کس مے نزند دمے دریں معنی راست
کیں آمدن از کجا و رفتن بہ کجاست

معمۂ کائنات کے انکشاف کی کوشش انسان کی فطرت میں داخل ہے ۔موت اور حیات کے پیچیدہ مسائل ذہن انسانی کو بےاختیار اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ دیکھا جاتا ہے کہ کسی کو کائنات کی ابتدا اور انتہا کے متعلق صحیح علم نہیں۔ یہ راز خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں ۔ روزِ حشر اور روزِ ازل کے اسرار اسی طرح سربستہ ہیں ۔کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

حالِ دلِ دردناک معلوم نہیں
کیفیتِ روحِ پاک معلوم نہیں
جھوٹی ہے تمام علم کی لاف زنی
خاکی انسان کو خاک معلوم نہیں

یہی خیال اِس رباعی میں ہے ۔"آمدن و رفتن" انسان کی مسافرانہ حالت کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ اقامت چند روزہ ۔ہوس کا رحصولِ نشاط کی ناکام کوشش اور پھر موت !

کوئی نہیں غمگسارِ انسان
کیا تلخ ہے روزگارِ انسان

بدایت و نہایت انسانی زندگی کے بے شمار امکانات اور کائنات کے رموز کی پیچیدگی پر دلالت کرتے ہیں۔

"کس مے نزند دمے دریں معنی راست" سے انسان کی اُن تھک کوششوں کی انتہائی ناکامی مراد ہے ۔"کس" کہکر خیام نے عظیم سے عظیم شخصیت کی کوششوں کا بیکار ہو جانا مراد لیا ہے ۔

"راست" اس بات کا مظہر ہے کہ رازِ کائنات کے انکشافی نظریے یوں تو بہت سے ہیں لیکن درست کوئی بھی نہیں ۔آج جو حالت علم انسانی کی ہے کل اُسی کا مذاق اڑایا جائیگا ۔ کل تک یہ بحث تھی کہ رازِ کائنات کیا ہے ۔آج یہ سوال ہے کہ ہمیں کسی چیز کے متعلق کس حد تک علم ہو سکتا ہے ۔آہ عرفی !

حدِ حسنِ تو بہ ادراک نہ شاید دانست
ویں سخن نیز بہ اندازۂ ادراکِ من ست

"کیں آمدن از کجا و رفتن بہ کجاست" ایک صحرائے ناپیدا کنار کا منظر پیش کرتا ہے ۔ دور حدِ نظر تک دونوں طرف سے کارواں آرہے ہیں جا رہے ہیں ۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کارواں کہاں سے آیا ۔اور کہاں جائیگا ۔نگاہ اِس صحرا کے ابتدا و انتہا کو دریافت کرنا چاہتی ہے لیکن ناکام رہتی ہے ۔ کائنات کے رموز کی طرف اِس سے بہتر انداز میں اشارہ نہیں کیا جا سکتا تھا ۔

مے در کفِ من نہ کہ دلم در تاب ست
ویں عمر گریز پائے چوں سیماب ست
برخیز کہ بیداریٔ دولت خواب ست
دریاب کہ آتش جوانی آب ست

انسان نشاط کی تلاش میں سرگرداں ہے اور یہ شے ایک بار جلوہ دکھا کر غائب ہو جاتی ہے ۔عشرت کا روئے دل افروز بس ایکبار نظر آتا ہے اور پھر غم کے گہرے پردوں میں چھپ جاتا ہے ۔پارے کی طرح یہ شے انسان کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے ۔ "عمر گریز پا" کو سیماب سے تشبیہ دیکر خیام نے یہی خیال ادا کیا ہے ۔

"بیداریٔ دولت" کو خواب کہکر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ خوش نصیبی اور فرخندہ اختری عارضی ہے ۔جس طرح انسان پیدا ہونے کے بعد خواب کے حالات کو بھول جاتا ہے ۔اُسی طرح خوش طالعی کا دور فوراً گزر جاتا ہے ۔اور ہجوم افکار میں خواب کے واقعات کی طرح دھندلا دھندلا نظر آتا ہے ۔

جوانی کی آگ واقعی پانی ہے ۔پانی کو مٹھی میں کس نے بند کیا ہے ۔جوانی کو جاتے ہوئے کس نے روکا ہے ؟ جوانی کو آگ کہکر خیام نے جوانی کے ہلاکت آفریں عناصر اور جوانی کی شعلہ مزاجی کی طرف اشارہ کیا ہے ۔جب یہ شعلہ بجھ جاتا ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس راکھ میں شرر پیدا نہیں کر سکتی ۔

صداقت احساس۔ جذبہ

ادب کی بہترین تعریف میری نظر میں یہ ہے کہ اُسے "تفسیر حیات" کہا جائے زندگی کے جو مختلف مناظر و مظاہر ادیب کی نظر سے گزرتے ہیں۔ تفسیر کا نام ادب ہے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ "شعری تفسیر حیات" کی خصوصیت کیا ہے۔ شاعر اور نثر نگار کے نقطۂ نظر میں کیا فرق ہے شعر کے ضروری عناصر تخیل اور احساس ہیں۔ معلوم ہوا کہ زندگی کی تخیلی اور احساسی تفسیر کا نام شاعری ہے۔ گویا حیات کی وہ تفسیر جس میں تخیل اور جذبہ نمایاں طور پر نظر آئے۔ شعر ہے۔ اس اعتبار سے "جذبہ" یا احساس وہ شعلہ ہے جو بے جان الفاظ کو ایک آتشکدہ بنا دیتا ہے یہ وہ شئے ہے جو تخیل کے پھولوں کو شاداب رنگ و بو کرتی ہے۔ اس کے بغیر معانی اور الفاظ مردہ نظر آتے ہیں۔ موجِ حیات کا دوسرا نام "احساس" ہے۔

یہی وجہ ہے کہ "صداقت" اور صداقت شعری میں فرق ہے۔ صداقت نام ہے بیان واقعات کا۔ اور یہ خصوصیت ہے سائنس کی۔ صداقت شعری سے یہ مراد ہے کہ شاعر حقائق کے ادراک احساسی کو الفاظ کا جامہ پہنائے۔ یعنی ان جذبات کا ذکر کرے جو کسی خاص شے کو دیکھکر۔ کسی نغمے کو سُنکر۔ کسی حسین و جمیل چیز سے متاثر ہو کر اُس کے دل میں پیدا ہو۔ مسرت و غم۔ امید و بیم کی جو کیفیات حقایق پیدا کرتے ہیں ان سے بحث کی جائے۔ حقایق سے نہیں۔

شاعری میں اشیاء سے نہیں بلکہ اشیاء کے حسن اُن کے راز۔ اُن کی دلچسپی اور اُن کی احساسی قدر و قیمت سے بحث کی جاتی ہے۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے۔ کہ شاعری "حقایق" سے بے نیاز ہے یا مبالغہ شاعری کی جان ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعر مرکزی طور پر صرف حسن اشیا اور جذبات کا بیان کرتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ خارجی حالات کو یا حقایق کو غیر صحیح رنگ میں پیش کرنے کا مجاز ہے۔ شاعر کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ زندگی کے تمام مناظر و مظاہر کو صاف اور صحیح رنگ میں پیش کرے۔ "یہ صداقت" اُس شاعری کی خصوصیت ہوتی ہے۔ جسکو بقائے دوام حاصل ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض دفعہ شاعر خارجی واقعات کو غیر صحیح رنگ میں پیش کرنے سے مضمون کو زیادہ دلفریب اور دلرُبا بنا دیتا ہے۔ لیکن جو شخص واقعات کی اصل نوعیت سے باخبر ہوتے ہیں ان پر یہ فریب نہیں چل سکتا۔

تاروں بھری رات کے متعلق ایک شاعر کہتا ہے :۔

وہ روشنی کا فرش سر عرش دور دور

"نور کی عالمگیری کو روشنی کا فرش" کہکر شاعر نے واقعے کو شعریت سے لبریز کر دیا ہے۔ پھر "کا فرش" اور "سر عرش" کا امتزاج صد درجہ دلفریب ہے۔ لیکن جن لوگوں کی قوت مشاہدہ اچھی ہے انھوں نے غور کیا ہوگا کہ تاروں بھری رات میں جو نور جلوہ گر ہوتا ہے۔ وہ بہت لطیف ہوتا ہے۔ اسے روشنی کا فرش کسی طرح بھی نہیں کہا جا سکتا۔ روشنی کا فرش دلالت کرتا ہے۔ نور کی چمکتی ہوئی۔ صاف سطح پر۔ اور تاروں کے نور کی روشنی۔ نہ صاف ہے۔ نہ اسقدر تاباں۔ کہ اُسے "روشنی کا فرش" کہا جا سکے۔

اس اعتبار سے غالب کی "صداقت" شعری اور صداقت احساس کی تعریف نہیں کیجا سکتی۔ وہ کبھی کائنات کے حقائق کو غیر صحیح رنگ میں پیش نہیں کرتا۔ ایک جگہ کہتا ہے :۔

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

اکثر غزل گو شعرا کے کلام میں مرکزی جذبہ "محبت" ہوتا ہے۔ محبت کی کیفیات کی تشریح و توضیح ان کا محبوب موضوع۔ لیکن خیام کے دل میں "شراب" احساسات و جذبات کا ایک طوفان پیدا کر دیتی ہے اس کے لئے دنیا کی تمام نشاط و مسرت "تہہ ساغر" میں پنہاں ہے۔

ہے یوں کہ مجھے دردِ تہ جام بہت ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کسی محبوب و مرغوب شے کو حاصل کرنے کے جو وسیلے اختیار کئے جاتے ہیں* مثلاً روپیہ کی قدر و قیمت محض اس لئے ہے کہ اس سے انسان عیش و نشاط کے سامان خرید سکتا ہے۔

زر بر سر فولاد نہی نرم شود

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ نکتہ بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ دولت محض اپنی خاطر پسند کی جاتی ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو دنیا بخیلوں کے وجود سے پاک ہوتی۔

خیام بھی شراب سے اتنی محبت کرتا ہے کہ ساقی جو شراب عطا کرتا ہے۔ اس کے لئے بھی اس کا دل محبت سے لبریز ہے۔ جذبے کی صداقت کی اس سے بہتر مثال کیا ہو سکتی ہے۔

عابد

* امتداد وقت سے وہ وسایل ہمیشہ مرغوب و محبوب ہو جاتے ہیں۔

حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی

خواجہ عبدالرحیم بی۔ اے آنرز آئی سی ایس

مسٹر خورشید احمد بی۔ اے آئی سی ایس

ہاف ٹون کمپنی انارکلی لاہور نے بلاک بنایا

چھاپنے والے نیشنل آرٹ پریس انارکلی لاہور

گریس ڈارلنگ کی قبر

چند بچّوں کو دیکھ کر

جہاں میں مَیں نے دیدہ زیب ایوانوں کو دیکھا ہے
امیدوں کے نظر افروز کاشانوں کو دیکھا ہے

ہُوا ہوں مہ رخوں کی محفلوں میں بار یاب اکثر
رہا ہے حاضراِن کے درمیاں میرا شباب اکثر

سُنے ہیں نغمہ ہائے چنگ و نے عشرت سراؤں میں
رہا ہوں مدتوں مشرق کی متوالی فضاؤں میں

مگر اب رُوح اِن کے ذکر سے بیزار ہوتی ہے
کہ اِن میں صرف مصنوعی خوشی تیار ہوتی ہے

خوشی خالص خوشی بچّوں کے سادہ دل میں رہتی ہے
یہ لیلائے حیات افروز اِس محمل میں رہتی ہے

خوشی کی جستجو میں اپنے غم خانے سے نکلا ہوں
تلاشِ نور میں تاریک کاشانے سے نکلا ہوں

یہ دولت لے کے میرے پاس اے مہ پیکرو آؤ!
محبت کے فرشتو! اے حسین جادو گرو آؤ!

تمہارے حُسن سے دنیا حسیں معلوم ہوتی ہے
بہارِ زندگی خلدِ بریں معلوم ہوتی ہے

سُنا ہے میں نے تم کو رنج بیش و کم نہیں ہوتا
تمہارے ساتھ رہنے والوں کو کچھ غم نہیں ہوتا

سُنا ہے آسماں سے وہ تمہارے پاس آتے ہیں
محبّت کے رسیلے رس بھرے پیغام لاتے ہیں

سنا ہے مَیں نے تم غمگیں دلوں کو پیار کرتے ہو
اور اُن پر شادمانی کے محل تیار کرتے ہو

یہ سچ ہے تو اِدھر بھی ایک اُلفت کی نظر ڈالو
مرے دل کو جلا کر خاک سے اکسیر کر ڈالو

لبِ معصوم کی رنگینیوں سے پھول برسا کر
بہارِ عہدِ طفلی کے طلسمی گیت گا گا کر!

مجھے بہلاؤ اپنی دلربا شیریں نواؤں سے
کرو مسحور نوزائیدہ طفلانہ اداؤں سے

یہ ممکن ہے کہ کیفیاتِ روحانی میں کھو جاؤں
تمہارے سحر سے اک بار پھر معصوم ہو جاؤں

فاخر

ماں

ماں کے سمجھانے بجھانے کے باوجود جب رامیشور کو حصول معاش کی فکر نہ ہوئی تو ماں عاجز آکر خاموش ہو رہی۔ رامیشور کی طفلانہ فطرت چاہتی تھی کہ خرچ کی قلت تو نہ ہو لیکن کمانا بھی نہ پڑے۔ وہ دل ہی دل میں عہد کرتا کہ وہ کل سے ضرور کوئی نہ کوئی کام شروع کریگا۔ لیکن جب دوسرا دن طلوع ہوتا تو وہ پھر کسی آسان تدبیر کے سوچنے میں مصروف ہو جاتا۔

ماں نے بھی نوشتۂ تقدیر کے سامنے سر تسلیم خم کر کے اس ۲۲ سال کے پڑھے لکھے بچے کی پرورش و پرداشت کرنا اپنا فرض سمجھا۔

رامیشور بڑا صالح نوجوان تھا۔ اس کا چال چلن ہر عیب سے پاک تھا۔ صرف اتنی بات تھی کہ وہ طبیعت کا بے فکر واقع ہوا تھا۔ اس نے نہایت کامیابی کے ساتھ بی۔اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس دو حرف کے دم چھلے سے کہاں اور کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ وہ احمق یہ بھی نہیں سمجھتا تھا کہ یہ دم چھلا حاصل کرنے کے بعد کالے آدمیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔

تصویر کشی اختیار کر لینے کے بعد وہ بازو پر اپنا کیمرہ لٹکائے اور ہاتھ میں اسٹینڈ کو چھڑی کی طرح گھماتا ہر جگہ نظر آتا تھا۔ اسکی تصویریں دیہاتی مناظر سے لبریز ہوتی تھیں روزمرہ کی معمولی زندگی اُسے بہت دلفریب معلوم ہوتی تھی۔

(۲)

جب وہ اس کام کے سلسلے میں دلی سے علیگڈھ گیا تو اپنے ساتھ چھ پلیٹ لیگیا تھا۔ جنہیں اس نے پہلے ہی روز استعمال کر لیا۔ چار کو سنبھال کر بیگ میں رکھ لیا تھا اور دو سلائیڈ ہی میں چھوڑ دئے تھے۔

جب وہ علیگڈھ سے دلی واپس آنے کے لئے اسٹیشن پر آیا۔ اور اکسپریس کے انٹر کلاس میں داخل ہوا تو اس کے پاس ایک بھری اور ایک خالی سلائیڈ تھی۔

گاڑی روانہ ہوئی۔ اس نے سامنے کی بنچ پر ایک بچے کو دیکھا جو ماں کی گود میں مچل رہا تھا۔ لڑکا نہایت خوبصورت تھا۔ سرخی مائل گورے گورے گال اور پیشانی کے ارد گرد بکھرے ہوئے گھنگھریالے بال نئے فوٹوگرافر کو دلفریب معلوم ہوئے۔ اس نے ایسا خوبصورت لڑکا کبھی نہیں دیکھا تھا۔

ماں بھی بالکل بچہ کے ہمشکل تھی۔ وہی پاکیزہ حسن، وہی پیاری صورت، لیکن ماں میں عفت و حیا تھی اور بچے میں شوخی اور چلبلاپن۔ بچہ برابر مچل رہا تھا۔ کسی طرح مانتا نہ تھا۔

رامیشور نے کیمرہ کھولکر کہا ——— آؤ شیام! تمہیں ایک تماشا دکھائیں۔

بچہ کیمرے کو دیکھتے ہی کھیلے کو بھول گیا اور آکر رامیشور کی گود میں بیٹھ گیا۔

رامیشور نے پوچھا۔ تصویر کھنچواؤ گے؟

بچے نے تتلی زبان میں کہا۔ ہاں کھچوائیں گے۔

بچے کو خوش دیکھ کر ماں کا دل بھی خوشی سے لبریز ہو گیا اور وہ بیساختہ بول اُٹھی کہ ہاں کھینچ دو۔

رامیشور نے بچے کو ماں کے پاس بنچ پر بٹھا کر کیمرے کو درست کرنا شروع کیا۔

بچہ بڑے اشتیاق سے ایک عجب چیز ملنے کی امید میں کیمرے کے لینس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ ماں بھی بڑے غور سے یہ دیکھ رہی تھی کہ تصویر کس طرح کھینچی جاتی ہے۔

رامیشور نے کیمرہ ٹھیک کر لیا لیکن پھر نہ جانے کیا سمجھ کر ہچکچاتے ہوئے ماں سے کہا۔ "آپ کی بھی تصویر اتر آئیگی۔ اس میں کچھ مضائقہ تو نہیں ہے؟"

ماں نے کچھ جواب نہ دیا۔ بیگ میں سے عینک نکالکر لگائی اور کپڑے کی شکن درست کر کے بچے کے پاس آ بیٹھی۔

رامیشور کے پاس خالی سلائیڈ تھی، اس نے فوکس لگایا۔ شیام کو لینس دکھا کر کہا۔ اس میں سے چڑیا نکلیگی۔ پھر قاعدہ کے مطابق ایک۔ دو۔ تین کہکر کہا — تصویر کھنچ گئی؟

تصویر کشی تو تھی نہیں، ایک تماشا تھا جو ختم ہو گیا۔ رامیشور کیمرہ بند کر کے رکھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ماں نے کہا — [illegible]

تصویر دیجئے۔

رامیشور بڑی مشکل میں پڑ گیا۔ تصویر کہاں کھنچی تھی۔ وہ تو ایک تماشا تھا۔ سلائیڈ تو خالی تھی، اور تصویر کھنچتی بھی تو دی کیسے جا سکتی تھی؟ اسے تیار کرنے میں کم سے کم دو دن کی ضرورت ہوتی۔ لیکن اس سے پھر کہا گیا — جتنی قیمت ہو لے لیجئے تصویر دیدیجئے۔

رامیشور کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے سوچا۔ کیا وہ یہ کہدے، وہ تو ایک بہلاوا اور کھیل تھا۔ نہیں یہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ ماں نے کتنے شوق سے اپنی اور بچے کی تصویر کھنچوائی۔ پھر کیا سچ سچ کہہ کر اس کا دل توڑ دیا جائے؟ نہیں یہ مناسب نہیں ہے۔

ماں نے پھر کہا — دیکھئے، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ تصویر دیدیجئے۔

رامیشور نے کہا — ابھی تصویر کیسے دی جا سکتی ہے؟ وہ ابھی دھوئی جائیگی۔ چھاپی جائیگی جب کہیں تیار ہوگی۔

ماں نے کہا — اچھا ہم لاہور میں دھلوا لیں گے۔

رامیشور نے کہا — جی نہیں۔ اسے ذرا سی دھوپ لگی کہ خراب ہوئی۔

ماں نے پھر کہا — یہ ٹھیک نہیں ہے۔ آپ تصویر دیدیجئے ہمیں یہ معلوم نہ تھا۔

رامیشور نے کہا — کیا آپ سمجھتی تھیں کہ تصویر ابھی تیار ہو جائیگی اور آپ کو مل جائیگی؟

جواب ملا — ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ تصویر آپ ہی کے پاس رہیگی۔

رامیشور نے کہا — تو اس میں ہرج ہی کیا ہے؟

عورت تنہا نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور عورت بھی تھی۔ ایک بوڑھا ملازم تھا۔ کئی اور لڑکے تھے۔ اس نے ایکبار اپنی ساتھی عورت کی طرف دیکھا اور دیکھکر کہا — نہیں نہیں آپ تصویر دیجئے۔

رامیشور کبھی کا دے چکا ہوتا لیکن دیتا تو جب کہ کوئی چیز ہوتی بھی۔ اس نے کہا — آپ کو دینے کے معنی یہ ہیں کہ اسے خراب کر دیا جائے۔ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ توڑ دیا جائے۔ آپ کیوں میری محنت برباد کرتی ہیں؟

اس عورت نے پھر اپنی ساتھن کی طرف اس انداز سے دیکھا گویا وہ خود رامیشور کا پیچھا چھوڑ دینا چاہتی ہے۔ لیکن شاید اسے ساتھن کی طرف سے اشارہ ہوا کہ لاہور جا کر یہ بات پوشیدہ نہ رہ سکیگی۔ پھر کیا ہوگا؟

اس نے کہا — تو توڑ ہی ڈالیئے۔

رامیشور نے اپیل کرتے ہوئے کہا — جی، دیکھئے۔ میرا وطن دہلی ہے — آپ لاہور جا رہی ہیں۔ میرا آپ کا تعارف بھی نہیں ہے۔ آج کے سوا پھر شاید کبھی ملاقات بھی نہ ہوگی۔ میں پیشہ ور فوٹوگرافر بھی نہیں ہوں۔ میرے پاس تصویر رہے تو آپ کا کچھ نقصان نہ ہوگا۔

ماں نے پھر ساتھن کی طرف دیکھا پر اس کی تصویر تو کھنچی نہ تھی۔ ماں نے کہا — آپ اخبار میں بھیجدیں گے۔ اپنے کمرے میں لگائیں گے۔

رامیشور نے ساتھ ہی کہا — میں وعدہ کرتا ہوں کہ نہ میں خود لگاؤنگا اور نہ کہیں بھیجونگا۔ آپ میری محنت ضائع نہ کیجئے۔

ماں کو یقین ہو چکا تھا کہ یہ بات لاہور میں بچے کے باپ تک ضرور پہنچ جائیگی۔ وہ غریب مجبور تھی اس نے پھر کہا — نہیں آپ توڑ ہی دیجئے۔

رامیشور کے لئے یہ اور سوہان روح ہو رہا تھا کہ وہ اس درجہ بے اعتبار سمجھا جا رہا ہے۔ اس نے چاہا کہ سچی بات کہدے لیکن خیال آیا کہ یہ بات کب سچ سمجھی جائیگی۔ میں کہونگا کہ تصویر نہیں کھینچی گئی تھی۔ بچے کے بہلانے کے لئے ایک کارروائی کی گئی تھی۔ وہ سمجھینگی میں تصویر رکھنا چاہتا ہوں اس لئے جھوٹ بولتا ہوں۔ اس کو اپنی اس بیچارگی پر سخت افسوس ہوا۔

اس نے پھر کہا — اگر آپ نہ مانیگی تو میں تصویر کو توڑ ہی ڈالونگا۔ لیکن میں پھر آپ سے کہتا ہوں کہ میں دلی چلا جاؤنگا۔ اس کے بعد کبھی آپ سے ملاقات بھی نہ ہوگی۔ ایسی صورت میں اگر آپ کی تصویر میرے پاس رہی تو اس میں آپ کا کیا ہرج ہے؟ دیکھئے شیام کی تصویر میرے پاس رہنے دیجئے۔ آپ کی تصویر کے بارے میں میں نے پہلے ہی آپ سے دریافت کر لیا تھا، آپ کا یہ شیام مجھے پھر کہاں ملیگا؟ اس کا ترنگ آپ مجھ سے کیوں چھین رہی ہیں؟

اس نے کہا — تو شیام کی دوسری تصویر آپ لے لیجئے۔

لیکن رامیشور کے پاس خالی پلیٹ کہاں تھا؟ اگر ہوتا تو جھگڑا ہی کیا تھا؟

اس نے کہا — افسوس کہ میرے پاس کوئی خالی پلیٹ نہیں ہے۔

جب رامیشور نے دیکھا کہ چھٹکارا ناممکن ہے تو اس نے مجبور ہوکر کہا — اچھا لیجئے۔ اور پھر سلائیڈ کھول ڈالی۔

ماں نے کہا — دیکھئے بدل نہ لیجئے گا۔

رامیشور نے کہا — اتنی بے اعتباری نہ کیجئے۔ یہ کہکر اس نے پلیٹ نکالکر چلتی ہوئی ریل کے نیچے ڈالدیا۔

جس عورت کی تصویر نہیں کھینچی تھی شاید اس کا شبہ باقی رہا۔ اس

لئے ماں نے کہا — ذرا وہ دکھائیے تو۔ دیکھیں آپ نے پھینک بھی یا نہیں۔

رامیشور کو بڑا صدمہ ہوا۔ اس نے اٹھکر شیام کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا — میں اتنا جھوٹا نہیں ہوں۔ یہ کہکر اس نے ماں کو سلائیڈ دکھا دی۔

سا تھن نے سلائیڈ کو کھولکر اس کے ہر حصے کو انگلی سے دبا دبا کر اور ہر کونے کو ٹٹول ٹٹول کر ماں کو اطمینان دلایا کہ سچ مچ اس کے اندر کوئی چیز نہیں ہے جب اس کو رامیشور پر کسیقدر اعتبار ہوا۔

اب رامیشور نے شیام سے خوب دوستی پیدا کر لی۔ یہانتک کہ دلی پہنچتے پہنچتے وہ شیام کا پورا ماموں بن گیا۔

دلی پہنچکر ان سب کو لاہور کی گاڑی میں بٹھانے کے بعد رامیشور شیام کی ماں سے معافی مانگ کر اور سوتے ہوئے شیام کے منہ کا بوسہ لیکر اس کی ماں سے رخصت ہوا۔

دہلی اور کاموں کی عدم موجودگی میں رامیشور کوشش کر کے جرنلسٹ اور ایک سیاسی لیڈر بن گیا۔

(۳)

لاہور ضلع کانفرنس میں صدارتی تقریر کرنیکے بعد پہلے اجلاس کی کارروائی ختم کر کے رامیشور قیام گاہ پر آیا تو اس سے کوئی ۱۵ منٹ کے بعد اسے ایک رقعہ ملا جس میں لکھا تھا۔

"کیا آپ مجھے چار بجے پارک میں مل سکیں گے؟

"شیام کی ماں"

علیگڈھ کے سفر کا واقع پرانا ہو چکا تھا۔ پھر بھی رامیشور اس نقش کو نہ مٹا سکا تھا جو اس کے دل کے صفحے پر ثبت تھا۔ زمانے کی طوالت اور اس کے انقلابات نے اس نقش کو کسیقدر دھندلا کر دیا تھا رقعہ کے الفاظ نے اسے تازہ کر دیا۔

رامیشور کو خیال آیا کہ — شیام! — آہا! وہ بھی ساتھ ہوگا، وقت کا انتظار کر۔ تے کرتے چار بجے رامیشور پارک میں پہنچا تو شیام کی ماں اس کی طرف آ رہی تھی۔

اس نے پوچھا — تمہارا نام کیا ہے؟

رامیشور — رامیشور۔

شیام کی ماں — اب میں تمہیں تمہارے نام سے بلاؤنگی — رامیشور! کیا تم اب بھی تصویر کھینچ سکتے ہو؟

رامیشور نے دیکھا وہی شیام کی ماں ہے۔ پھر بھی کچھ اور ہے وہ اس کی اس عاجزانہ درخواست کا مطلب سمجھ نہ سکا۔ اس کو کچھ اندیشہ سا معلوم ہونے لگا۔ اس نے کہا — اسوقت تو کیمرہ نہیں ہے۔ اور مشق بھی نہیں ہے۔

وہ — کیمرہ لا نہیں سکتے؟

رامیشور — ابھی؟

وہ — ہاں — ابھی۔

رامیشور — ابھی کہاں سے ملیگا؟

وہ — کیوں؟ کیوں نہ مل سکیگا؟ تم تو لیڈر ہو۔ اتنا بھی نہیں کر سکتے؟

رامیشور — جاتا ہوں کوشش کرونگا۔

رامیشور کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ ماں نے بلاکر کہا — رامیشور! سنو یہ روپے لیلو۔ کیمرہ ملے تو نیا خرید لانا۔

رامیشور —

وہ — جاؤ — ابھی جاؤ۔ جلدی ہی واپس آنا۔ نہیں تو تصویر نہ کھینچ سکے گی، رات ہو جائیگی۔

رامیشور کچھ نہ کہہ سکا۔ اس منت آمیز حکم میں کچھ ایسا اثر تھا جسکی مخالفت ناممکن تھی۔

رامیشور چلا گیا۔ اور ماں بیخود اور بیجان سی وہیں بیٹھ گئی۔

گھنٹے بھر کے بعد رامیشور کیمرہ لیکر واپس آیا تو ماں ہنسنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس سے پہلے شاید وہ رو رہی تھی۔

ماں بڑی سج دھج سے آئی تھی۔ فوکس ٹھیک کر کے جب رامیشور کے ایک — دو — تین کہنے کا وقت آیا تو ماں نے اپنی تمام قوت اس کوشش میں صرف کر دی کہ چہرے پر ہنسی کی شگفتگی اور چمک نمایاں ہو جائے۔

آہ! یہ ہنسی کسقدر پُر اسرار اور دردناک تھی۔ اُس سے جتنی خوشی ظاہر ہوتی تھی۔ اس سے زیادہ غم کا اظہار ہوتا تھا۔

تصویر کھنچوانے کے بعد وہ اپنی تمام قوت صرف کر کے بمشکل سنبھل رہی پھر رامیشور کے قریب آکر بولی — ایک روز تم نے شیام کی اور میری تصویر ایک ساتھ کھینچی تھی، یاد ہے نا؟ وہ میں نے تڑوا دی تھی۔ کہیں بھول تو نہیں گئے؟ اب ایک کام کرو گے؟

رامیشور نے اقرار اور قبولیت کی نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا۔

ماں نے کہا — سنو میری تصویر تیار کرنا — ماں نے اندر کے جیب سے ایک فوٹو نکالکر دیتے ہوئے کہا — اور یہ لو شیام کا فوٹو۔ ان دونوں کی ایک تصویر بنانا۔ اور اس کا بڑے سے بڑا سائز

کرکے اپنے ہاں لگالینا۔

یہ کام تمہیں کرنا۔ کسی دوسرے کے سپرد نہ کردینا۔ جانتے ہو شیام تمہیں کتنا چاہتا تھا۔

دلی سے جب تم جدا ہوئے تو شیام سو رہا تھا۔ اس نے جاگتے ہی پوچھا۔ کہ ماں! تچھویل والے ماموں کہاں گئے؟ جانتے ہو اب شیام کہاں ہے؟ .... کیا دیکھتے ہو؟ وہ میری گود میں چھپکر تھوڑا ہی بیٹھا ہے۔ یہاں نہیں، وہ بہت بڑی گود میں بیٹھا ہے۔ دیکھتے ہو یہ سب کیا ہے؟ —— یہ آسمان ہے۔ یہ آسمان ہی پرماتما کی گود ہے، شیام اسی گود میں چھپا بیٹھا ہے۔ نظر بھی تو نہیں آتا۔ دیکھو چاروں طرف آسمان ہے۔ چاروں طرف دیکھو، کیا کہیں نظر آتا ہے؟ نظر آئے تو مجھے بھی دکھا دینا۔ میں بھی دیکھونگی۔ چپ چاپ ہی چلا گیا۔ اگر میں اسے دیکھ پاؤں تو لیوں۔ دیکھ تیرا تچھویل والا ماموں دیکھ رہا ہے"۔

رامیشور کا گلا بھرا ہوا تھا۔ جیسے آنسوؤں کا گھونٹ گلے میں پھنس گیا ہو، ماں کی زبان برابر چل رہی تھی۔ گویا جسم کی رہی سہی طاقت ایک بار ہی نکل نکل کر ختم ہو رہی تھی۔

جانتے ہو —— یہی چوتھی مارچ تھی؛ اسی روز اسی وقت وہ گیا۔ میں سال بھر سے اسی چوتھی مارچ کا انتظار کر رہی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ تم ملوگے تو تصویر کھنچواؤنگی۔ تصویر میں ہم دونوں ساتھ رہینگے اور وہ تصویر تمہارے پاس رہیگی۔ تم مل گئے۔ تصویر کھنچ گئی۔ دونوں کو ملا کر تم ایک تصویر بناوگے نا؟ دیکھو ضرور بنانا۔ بڑی سے بڑی بنانا اور اپنے کمرے میں لگانا۔ جہاں چاہے بھیجنا۔ اخباروں میں دینا۔ دوستوں کی نذر کرنا۔ جہاں نظر آئیں شیام اور شیام کی ماں دونوں ساتھ نظر آئیں۔ اب جا رہی ہوں۔ اسی کے پاس جا رہی ہوں —— ہمیشہ اسی کے پاس رہنے جا رہی ہوں۔

ماں کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ ماں نے کہا —— سنو ایک مہینہ ہوا میں بیوہ ہو چکی ہوں۔ وہ بھی چوتھی ہی تاریخ تھی۔ چوتھی تاریخ اور مارچ کا مہینہ، آج کی اس چوتھی مارچ کا دن میری زندگی کا آخری دن ہے۔ میں زہر کھا چکی ہوں۔ تین گھنٹے ہو چکے ہیں۔ اب زہر کے آخری عمل کا لمحہ دور نہیں ہے۔ میں پھر دنیا میں نہ ہونگی۔

رامیشور کے دیکھتے ہی ماں کا جسم بیجان ہو کر گر پڑا۔

جرنلزم اور لیڈری کو خیرباد کہکر رامیشور پھر اپنی بھولی ہوئی فوٹوگرافی کو یاد کرنے لگا وہ سال بھر میں شیام اور اس کی ماں کی تصویر مکمل کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کمرے میں وہ تصویر لگی وہ اس کی یادگار کا کمرہ بنگیا۔ وہاں کوئی تصویر باقی نہ رہ سکی۔

اب رامیشور نے فوٹوگرافی ہی کو اپنا ذریعۂ معاش بنالیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں وہ کامیاب فوٹوگرافر ہو گیا۔

تمام بڑے بڑے اخبارات میں شیام اور اس کی ماں کی تصویر شائع ہوئی اور ہر جگہ اس کی تعریف کی گئی۔

(ہنس)

مختار

ابو محمد امام الدین۔

(مدیر ترجمان)

جب یہ صرفِ رنگ و بو ہو جائیگی
گل کی ہستی آرزو ہو جائیگی

اب نگاہِ شوق کو رسوا نہ کر
بے نیازِ آرزو ہو جائیگی

عرضِ حسرت پر نہ تو مجبور کر
بے نیازی تیری خو ہو جائیگی

غور سے تم میری صورت دیکھ لو
شرحِ لفظِ آرزو ہو جائیگی

میری خاموشی ہی جوہر ایکدن
داستانِ آرزو ہو جائیگی

جوہر

رواقیت

تمہید اگرچہ اخلاقی برائیوں، اور آرام طلبی کی وجہ سے یونان کی شہرت ماند پڑ چکی تھی لیکن پھر بھی بعض نیک افراد ایسے موجود تھے جن کے دل میں قدیم اصول موجزن تھے۔ اور وہ حتی الوسع تمام مخالف قوتوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ تاریخ میں یہ لوگ رواقیین کے نام سے مشہور ہیں کیونکہ اس مذہب کا بانی زینو، اسٹوا۔ یعنی رواق میں بیٹھکر درس دیا کرتا تھا۔

اس اسکول (مذہب) نے بڑے بڑے نامور حکماء اور مصنفین پیدا کئے ہیں۔ چونکہ اس کی تعلیمات، رومی اصول زندگی سے مطابقت رکھتی ہیں۔ اس لئے بہت سے رومن افراد اس مذہب کے پیرو ہو گئے۔ سیسرو (مصنف) سینکا اور مارکس آریلیس وغیرہ سب رواقی گزرے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر رومی قوم بجا طور سے فخر کر سکتی ہے۔ اور اگر تمام رواقی زعماء کا حال قلمبند کیا جائے تو ایک کتاب تیار ہو جائے۔

زینو کی لائف یہ برگزیدہ انسان ۳۵۰ ق م میں بمقام سٹی واقع جزیرۂ سائپرس پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ ایک دولتمند تاجر تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو بھی اسی کام پر لگایا لیکن زینو کی قسمت میں تو فیلسوف ہونا لکھا تھا جب پہلی مرتبہ سامان تجارت لیکر قبرص سے ایتھنز کو روانہ ہوا تو تمام سامان سمندر میں تلف ہو گیا۔ اور زینو محض متاع جان لیکر یونان کے دار الخلافہ میں وارد ہوا یہاں آکر اس نے فیصلہ کیا کہ ایسی دولت جمع کرنا چاہئے جو نہ آگ میں جل سکے نہ پانی میں غرق ہو سکے۔ سقراط، افلاطون، ارسطو اور تمام مشہور حکماء کی تصنیف کا مطالعہ کیا لیکن کسی مذہب سے تسلی نہ ہو سکی چنانچہ بیس سال تک فلسفہ کے مطالعہ میں مصروف رہا۔ اور ۳۰۰ ق م میں بطور خود درس دینا شروع کر دیا۔ اور اٹھاون سال یعنی ۲۴۲ ق م تک پابندی کے ساتھ، درس و تدریس میں مشغول رہا۔ ایک دن جبکہ مدرسہ سے باہر نکلکر کسی کام کے لئے جا رہا تھا تو راستہ میں ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ فوراً اپنی پیرانہ سالی اور جسمانی کمزوری پر خیال کر کے گھر واپس آیا اور کہنے لگا "اے زمین! اگر تو یہی چاہتی ہے کہ آیندہ تجھ پر چلوں پھروں تو میں تیرے ارشاد کی تعمیل کرنے کو تیار ہوں" یہ کہکر وصیت کی۔ کلینا تھیز کو

اپنا جانشین مقرر کیا اور پھانسی کا پھندا گلے میں ڈال لیا۔

زینو کی زندگی سرتا پا زاہدانہ اور پارسایانہ تھی۔ باشندگان ایتھنز اس کو اس درجہ ایماندار سمجھتے تھے کہ قلعہ کی کنجیاں اس کی تحویل میں رکھ چھوڑی تھیں۔ اگرچہ اٹھانوے سال کی عمر پائی لیکن آخر دم تک حواس خمسہ میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔ اور دل و دماغ نوجوانوں کی طرح روشن اور مستعد رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی زندگی نہایت پاکیزہ اور سادہ تھی تمام عمر انجیر، شہد اور روٹی کے علاوہ اور کسی چیز کی طرف رغبت نہ کی۔ اس کی وفات کا لوگوں نے بڑا قلق کیا اور بطور اظہار عقیدت ہموطنوں نے ایک مجسمہ اس کی یادگار میں نصب کیا اور اس کے نیچے کتبہ لگایا "زینو وہ شخص تھا جس کی زندگی، اس کے عقاید سے مطابقت کلی رکھتی تھی" یہ فقرہ بظاہر معمولی ہے لیکن دنیا میں پیغمبروں کو چھوڑ کر شاید دس پانچ نفوس ہی ایسے گزرے ہوں جن پر یہ تعریف صادق آسکتی ہے۔

گو ایتھنز کے بعد کریسی پس جو بلحاظ تعداد تصانیف تمام حکماء سے گوئے سبقت لے گیا ہے۔ زینو کے قائم کردہ مدرسہ کا صدر مقرر ہوا۔ یہ شخص تمام علوم میں مہارت رکھتا تھا۔ اور روزانہ پانچ سو سطور کے حساب سے تصنیف کیا کرتا تھا۔ مورخین نے اس کی تصانیف کی تعداد ۷۰۵ بیان کی ہے۔ افسوس کہ آج ایک تصنیف بھی دستیاب نہیں ہو سکتی۔

رواقی فلسفہ پر ایک عام تبصرہ ارسطو اور افلاطون کی تصانیف کسی زمانہ میں مفید مطلب تھیں لیکن جوں جوں علمی ذوق کم ہوتا گیا، ان کی تصانیف بھی طبائع پر بار ہونے لگیں۔ لہذا کسی ایسے فلسفہ کی ضرورت محسوس ہوئی جو سلیس اور عام فہم ہو۔ چنانچہ رواقیت اسی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اس فلسفہ میں عملی پہلو کو نمایاں جگہ حاصل ہے چنانچہ اس فلسفہ کا لب لباب یہ ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد نہ تحصیل حکمت ہے نہ حصول راحت بلکہ پاکیزہ اور نیک زندگی بسر کرنا تاکہ انسان اپنی جوانی سے بدرجۂ اتم بہرہ اندوز ہو سکے۔ یہ فلسفہ انسان کو عمل اور نیک عمل کی طرف مائل کرتا ہے مگر یا اخلاقیات سے تعلق رکھتا ہے اور روزمرہ زندگی میں کار آمد ہو سکتا

ہے یہ بات دوسرے مذاہب میں نہیں پائی جاتی - انسان کی خوبی یہ نہیں کہ اُسے حکماء کی تصانیف پر عبور ہو بلکہ اُس میں "اخلاق حسنہ" موجود ہوں جو فلسفہ، انسان کو نکوکاری کی جانب مائل نہ کرے، اُس کا حاصل کرنا بالکل فضول ہے۔ لہٰذا زینو کی نظر میں سچا فیلسوف وہی ہے جو اعلیٰ درجے کی پاکیزہ اور نیک زندگی بسر کرتا ہے - اس کے معنی یہ ہوئے کہ اُس نے فلسفہ اور مذہب کے ڈانڈے ایک دوسرے سے ملا دئے۔ نیز حکمت (فلسفہ) کا تعلق چونکہ خیال علم اور عمل یعنی (Practice) سے ہے - اس لئے اُس نے فلسفہ کو منطق طبعیات اور اخلاق تین علوم پر تقسیم کیا - وہ کہتا ہے کہ "منطق مثل انڈے کے چھلکے کے ہے - طبعیات مثل سفیدی کے اور اخلاق مثل زردی کے۔" نیز یہ کہ انسان صرف غور و فکر کرنے یا سامان عیش و راحت مہیا کرنے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا - بلکہ عمل اور نیک عمل کرنے کے لئے۔

منطق زینو اور اُس کے جانشینوں نے افلاطون کی منطق سے اختلاف کیا ہے اور ارسطو کی منطق کو قدرے ترمیم کے ساتھ اختیار کر لیا - رواقی بھی یہی کہتے ہیں کہ کلیات کا وجود، خارج میں کہیں نہیں پایا جاتا - کریسی پس کا قول ہے کہ روح یا نفس ناطقہ سادہ صفحہ کی طرح ہے - جب انسان صاحب شعور ہو جاتا ہے تو مختلف احساسات انسان میں دماغی تبدیلی، ترقی، نشو و نما وغیرہ پیدا کرتے ہیں - ان احساسات سے "مظاہر" ہی کا علم حاصل نہیں ہوتا بلکہ خیالات عقلی کا بھی - گویا اس معاملہ میں ابیقوریت، اور رواقیت دونوں ہمخیال ہیں - ان لوگوں نے برخلاف ارسطو کے صرف چار مقولے قرار دئے۔

(۱) ذات شے (τὸ ὑποκείμενον)

(۲) اغراض یا صفات (τὸ ποιόν)

(۳) نسبتِ شے بذات خود (τὸ πὼς ἔχον)

(۴) نسبتِ شے بدیگراں (τὸ πρός τί πως ἔχον)

طبیعات اُن کی طبیعات زیادہ تر ہرقلیطوس اور ارسطو کے فلسفہ پر مبنی تھی - یہ لوگ ہر شے کو مجسم خیال کرتے تھے - صرف خلاء - زمان - مکان اور خدا کو غیر مجسم سمجھتے تھے - اُن کے نزدیک جسمانی اشیاء میں صرف ابعادِ ثلاثہ (طول عرض عمق) ہی نہیں ہوتا - بلکہ فاعلیت یا انفعال میں سے بھی کسی ایک بات کا ہونا ضروری ہے۔ نیکی بدی - خیال - صحت - موسم - ماہ و سال - عقل و فہم غرضکہ ہر چیز جس میں خواص پائے جائیں اُن کی نظر میں جسمانی یا مادی ہے - بلکہ خواص بھی - یہی وجہ ہے کہ وہ شے اور اُس کے خواص میں امتیاز نہیں

کرتے - کائنات میں دو عناصر پائے جاتے ہیں - ایک تو "ہیولیٰ" جو عنصر انفعالی ہے - دوسرا "عقل" جو عنصر فاعلی ہے۔

اگر کائنات فنا ہو جائے تو صرف دو چیزیں باقی رہ جائیں گی خدا اور یہ دونوں باہم متحد ہیں بلکہ ایک ہی ذات یا جوہر کے دو پہلو ہیں بلحاظ فاعلیت اُسی کو خدا کہتے ہیں جسے بلحاظِ انفعالیت مادّہ کہا جاتا ہے - خدا - عقلِ کل ہے - جو ہر شے کا صانع ہے - تمام کائنات میں جاری و ساری ہے جس طرح روح، جسم میں - علیم ہے حکیم ہے مُدبّر ہے - "مالکِ یوم الدین" ہے، کامل ہے - خیر محض ہے اور صاحبِ ارادہ ہے خدا، دنیا سے جدا ہے مگر اسی طرح جس طرح روح، جسم سے، اور جس طرح روح بغیر جسم کے نہیں رہ سکتی، اسی طرح خدا بغیر کائنات کے ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا، اور جس طرح روح اور جسم دونوں ملکر ایک وجود یعنی "انسان" قرار پاتے ہیں اُسی طرح خدا اور کائنات بھی ملکر ایک وجود[1] قرار پاتے ہیں - دنیا میں بدی کا وجود ہے - لیکن خدا کی مشیئت کی بناء پر نہیں ہے - اس کا یہ منشاء نہیں کہ دنیا میں بدی کا رواج ہو - اخلاقی بُرائی، تکمیل کائنات کیلئے ضروری ہے - کیونکہ جب تک سردی نہ ہو گرمی کا لطف، اور نار نہ ہو نور کا لطف تلخی نہ ہو شیرینی کا لطف نہیں آسکتا - پس "بدی" نہ دنیا سے مفقود ہو سکتی ہے - اور نہ ایسا ہونا قرینِ مصلحت ہے - ہرقلیطوس کہتا ہے کہ کائنات کی بنیاد "اضداد" پر قائم ہے[2] - پس نیکی کا وجود بھی بغیر بدی کے متحقق

---

[1] انہی باتوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے الہامی مذاہب کی ضرورت تسلیم کرنی پڑتی ہے - اہل الرواق نے دراصل وحدت الوجود - کثرت الوجود اور توحید ذات باری تینوں کو سمو کر ایک جداگانہ مذہب ایجاد کیا تھا اور جو لوگ فلسفہ یونان سے واقف ہیں اُن کو دیمقراطیسی افلاطونی اور مشائی تینوں رنگ اُن کے فلسفہ میں صاف نظر آسکتے ہیں - رواقی ایک طرف خدا کو مادّہ سے جدا ہی نہیں مانتے بلکہ مادہ ہی کو خدا سمجھتے ہیں - دوسری طرف اُسے "مالک یوم الدین" یعنی نیکی، بدی کا حساب کرنے والا نیکوں کو جزاء اور بدوں کو سزا دینے والا بھی سمجھتے ہیں - سچ ہے اگر انسان بغیر واسطۂ "روح قدس" حقیقت سے آشنا ہو جاتا تو غارِ حرا کی آواز مذہبی دنیا میں قطعاً بے سود بلکہ تحصیل حاصل قرار پاتی - مولف

[2] ذوق دہلوی نے بھی غالباً رواقیوں کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہوگا جو کہتے ہیں :-

اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے۔

نہیں ہو سکتا۔

دنیا چونکہ ایک کامل اور نیک ہستی نے بنائی ہے۔ اس لئے لازمی طور پر بہترین اور جمیل ہوگی اور اسی لئے اختلاف، کثرت اور اضداد کا وجود پایا جاتا ہے۔ کائنات میں اس درجہ اختلاف ہے کہ ایک مخلوق دوسری سے قطعاً نہیں ملتی۔ حد ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے نہیں ملتا۔ اور یہ اختلاف ہی باعثِ حسن و جمال یا موجب زیب[۵۱] و زینت ہے۔

پودے اور درخت حیوانات کے فایدہ کے لئے بنائے گئے ہیں۔ حیوانات انسان کے لئے، انسان جماعت کے لئے، اور جماعت دیوتاؤں کی خدمت کے لئے، اور دیوتا جماعت کو فائدہ پہنچانے کے لئے۔

جملہ اشیاء عناصر چہارگانہ (آتش - آب - خاک و باد) سے ملکر بنی ہیں۔ اور سوائے روح کے سب فانی ہیں۔ روح بھی بالذات فانی ہی ہے۔ لیکن وفات انسانی کے بعد ایک غیر معین عرصہ تک زندہ رہیگی، جس کے بعد ایک زبردست واقعہ (طامتہ الکبریٰ[۵۲]) رونما ہوگا اور ساری ارواح، خدا کی ذات سے متحد ہو جائینگی (قطرہ دریا سے مل جائیگا) کریسی پس نے اپنے استاد سے اس معاملہ میں اختلاف کیا ہے وہ کہتا ہے کہ صرف نکوکاروں کی ارواح، مرنے کے بعد باقی رہتی ہیں، بد اور شریر انسانوں کی ارواح جسم ہی کے ساتھ مٹی میں مل جاتی ہیں، اور روح، ایک لطیفۂ آتشیں ہے۔ جو تمام جسم میں جاری و ساری ہے۔ اور اس کا مرکز ... ب ہے نہ کہ دماغ۔ روح کے خاص اجزائے ترکیبی آٹھ ہیں۔ ایک قلب ہیں جو تمام جسم پر حکمران ہے۔ پانچ پانچوں حواس میں کارفرما ہیں۔ ایک آواز (صوت) میں جلوہ گر ہے اور ایک توالد و تناسل میں معاون ہے۔ ہر شہوت۔ جذبہ خواہش یا ہیجان، ایک خیال ہے۔ مگر ناقص نیست روح کے لئے محرک ہوتی ہے۔ انسان نہ بالکل مجبور ہے نہ قطعاً مختار بلکہ جبر و اختیار کے درمیان

اخلاقیات

زینو کے فلسفہ میں اخلاقیات کو خاص مرتبہ دیا گیا ہے اور اس کے فلسفۂ اخلاق کو پورے طور سے سمجھنے کے لئے، اُن کے تصور ذات باری سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ زینو کی رائے میں کائنات دو عناصر کا مجموعہ ہے۔ (۱) ہیولیٰ یعنی مادہ جو مختلف اشیاء میں صورت پذیر ہونے کی استعداد رکھتا ہے۔ (۲) عقل یعنی خدا جو مادہ کو مختلف صورتیں عطا کرتا ہے۔ عقل الٰہی نے مادہ پر حکومت کرنے کے لئے چند قوانین بنا دئے ہیں جنکو (یونانی عبارت [illegible]) یعنی اسباب موثرہ کہتے ہیں۔ پس اگر عقل ہی خالق و صانع کل شئی ہے تو عقلی اصولوں کے مطابق زندگی ہی، اخلاقی زندگی قرار دیجا سکتی ہے۔ اور چونکہ تمام کائنات، قانون عقل کے ماتحت ہے اس لئے اخلاقیات کے لئے بھی ایک ہی اصول معین ہے:-

(یونانی عبارت [illegible])

یعنی "قوانین فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہئے"۔ زینو کہتا ہے کہ جو شخص فطرتِ الٰہیہ کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتا وہ کسی صورت سے نکوکار نہیں کہلا سکتا۔ "نیکی" کی استعداد ہر ذی عقل میں ودیعت شدہ ہے۔ اُس کی نشو و نما "عقل" پر منحصر ہے۔ جو شخص عقل و حکمت کی طرف متوجہ ہوگا وہی "نیک" زندگی بسر کر سکیگا۔ اور یہی خصوصیت انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ پس "فطرت[۵۳]" کی متابعت کرو اور فطرت کے مطابق وہی زندگی قرار دیجا سکتی ہے جسمیں "زندگی کے جملہ ارکان ترکیبی باہمدگر ہم آہنگ اور متوازن ہوں۔ افعال انسانی کا اچھا برا ہونا فاعل کی نیت[۵۴] پر منحصر ہے، اور نیت کی پاکیزگی عقل کی متابعت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

گویا زندگی کے ہر شعبہ میں عقل ہی کو حاکم بنانا چاہئے۔ یعنی انسان سراپا "ادراک[۵۵]" ہے۔ اِس نظریہ کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ہر بات، جو انسان کی حیاتِ مدرکہ میں مزاحمت کرے۔ زندگی کے لئے خطرناک ہے۔ لہذا اُس سے پرہیز کرنا چاہئے جسمانی راحت و سرور لائق اعتناء نہیں ہے۔ ہر عقلمند آدمی کو اِن باتوں سے احتراز لازم ہے کیونکہ جذبات انسان کو اپنا غلام بنا لیتے ہیں، عقل ہی کی بدولت اِس غلامی سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ لہذا ہر انسان پر فرض ہے۔ کہ "جذبات" پر غالب آسکے اور "لذاتِ حسی" سے کنارہ کرے تاکہ پاکیزہ زندگی بسر کر سکے۔

---

[۵۳] یہ ایک عظیم الشان حقیقت ہے جسکو ابھی تک انسان نے پورے طور سے نہیں سمجھا ہے۔ اگر بنی نوع آدم "فطرت اللہ" کی اطاعت اپنا شعار بنالیں تو مذہب و دین کے جھگڑے آن واحد میں مٹ جائیں اور دنیا میں صرف ایک ہی مذہب باقی رہ جائے جو یہ کہتا ہے "فاقم وجہک للدین حنیفا۔ فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا لاتبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم ولکن اکثر الناس لایعلمون"

[۵۴] انما الاعمال بالنیات یعنی خوبی و زشتئی اعمال، نیت پر موقوف ہے۔

[۵۵] حالانکہ انسان میں ادراک کے علاوہ جذبات اور وجدان بھی پایا جاتا ہے۔

فی الجملہ، رواقیوں نے یہ سمجھا کہ احساس کلفت سے بالاتر ہوجانا انسانیت کی دلیل ہے حالانکہ جذباتِ طبعی کو بکلی فنا کردینا سراسر منافئ انسانیت ہے۔ مذہب یا فلسفہ وہی لائقِ قبول ہے جو اِن دونوں پہلوؤں کو برقرار رکھے۔ انسان میں عقل بھی ہے۔ اور احساس بھی پس وہ مذہب یا فلسفہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا جو عقل کو خارج کردے اور محض جذبات ہی سے اپیل کرے۔ اِسی طرح وہ مذہب یا فلسفہ بھی مقبول نہیں ہوسکتا جو جذبات کو فنا کرکے محض عقل ہی سے سروکار رکھے۔ اگر ایسا ہوتا تو پیشوایانِ مذاہب قطعاً تارک الدنیا ہوجاتے لیکن ہم جانتے ہیں کہ دنیا کی سب سے بڑی اور مذہبی شخصیتوں میں سب سے کامیاب ہستی نے شادی بھی کی اور مثل انسانوں کے زندگی بسر کی، نیز رام چندر کرشن موسیٰ عیسیٰ کنفوشس۔ نانک زرتشت۔ بدھ یہ سب برگزیدہ افراد جذبات اور انسانی جذبات کے حامل تھے اِن کے پہلو میں وہ دل تھا جو راحت والم سے متاثر ہوتا تھا۔ پس کسی شخص کا یہ کہنا کہ ہم خوشی اور تکلیف سے بالاتر ہیں۔ اپنے نفس کو دھوکا دینا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ جب کسی شخص پر مصیبت آئے تو وہ خاموش رہے لیکن اِس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ اُسے رنج نہیں ہے۔ رواقیوں کی نظر میں فقدانِ احساس سب سے بڑی خوبی ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو دنیا کے راحت والم سے بے نیاز ہوجانا کوئی قابل تعریف بات نہیں ہے۔ دنیا میں رہ کر پھر علائق دنیوی سے آزاد ہونا بیشک مستحسن قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس کے پاس پھوٹی کوڑی نہ ہو وہ کیا دعویٰ کرسکتا ہے کہ میں شراب نہیں پیتا یا کمزور انسان کیا دعویٰ کرسکتا ہے کہ میں کسی کو ایذا نہیں پہنچاتا۔

رواقیت کا روشن پہلو

لیکن اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ رواقیت میں کوئی خوبی نہیں۔ بلاشک میں اِس فلسفہ کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ مولنا حالیؒ فرماتے ہیں ؎

کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں
ہوں اُس میں گلے سڑے اگر دانے چند

رواقیت میں جو ایک اصولی کمزوری تھی وہ میں نے بیان کردی کہ اِس فلسفہ نے انسان کی فطرت کے ایک پہلو کو نظر انداز کردیا۔ لیکن اِس کے یہ معنی نہیں کہ رواقیت سراپا مردود ہے۔ باوجود اِس نقص کے، میں اِس فلسفہ کو ماقبلِ اسلام کے تمام فلسفوں سے بہتر اور برتر خیال کرتا ہوں۔ اور زینو کو ملہم ربانی تو نہیں لیکن نہایت بلند پایہ مصلح یقین کرتا ہوں۔ کیونکہ اِس کے فلسفہ کی تمام بنیاد اِس بات پر ہے کہ انسان کو خدا نے اسفل اعلیٰ[1] اور ارفع مرتبہ پر پیدا کیا ہے کہ جو شخص پاکیزہ زندگی بسر نہیں کرتا وہ اپنے آپ کو مطلق نہیں جانتا اگر وہ یہ جانتا کہ خدا نے مجھے زمین پر آسمانی زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا کیا ہے تو اُسے بالضرور اپنے مرتبہ کا احساس ہوتا، اور انسان کو نیکی کی طرف مائل کرنے کے لئے کسی خارجی اثر کی ضرورت نہیں صرف یہ کہدینا کافی ہے کہ اے انسان! تو اپنے مرتبہ کو پہچان اور شایانِ شان زندگی بسر کر۔ رواقیت ہمارے اندر خودداری، اعتماد علی النفس، اور انضباطِ ذاتی جیسی خوبیاں پیدا کرتا ہے کیونکہ یہی خوبیاں اِس فلسفہ کا مقصود اور نصب العین قرار دی گئی ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے چند نامور رواقی مصنفین کے خیالات سے، اِن اوراق کے ناظرین کو روشناس کرادوں:۔

(۱) سینیکا لکھتا ہے "لوگوں کی خاطر کوئی کام نہ کرو۔ بلکہ ضمیر کی خوشنودی کی خاطر" "وہ کام کرو جس سے خدا خوش ہو نہ کہ وہ جس سے بندے خوش ہوں"۔ "جو شخص اِس لئے نیکی کرتا ہے کہ اُسے شہرت حاصل ہو وہ نکوکار نہیں بلکہ خود غرض ہے"

"بڑا آدمی، خاک میں ملجانے کے بعد بھی بڑا ہی رہتا ہے"

(۲) مارکس آریلیس لکھتا ہے۔ "اِس بات کو فراموش نکرنا چاہئے۔ کہ یہ بات ممکن ہے کہ ایک شخص بالکل گمنام ہو لیکن سب سے بڑا ہو"

"اگر تم نیکی کا معاوضہ طلب کرو تو اِس کے یہ معنی ہیں کہ تمہاری آنکھ تم سے معاوضہ طلب کرے۔ محض اِس بات کے لئے کہ اُس کی بدولت تم مناظرِ کائنات سے لطف اندوز ہوئے ہو"

چونکہ رواقی الٰہیات میں روحِ انسانی کو لطیفۂ ربانی بلکہ بحرِ وحدت کا ایک قطرہ، قرار دیا گیا ہے۔ اِس لئے رواقی اخلاقیات اور الٰہیات باہم مربوط ہوگئی ہیں۔ مثلاً:۔

"نیک شخص وہ ہے جسے ہر دم رفاقتِ آلٰہی نصیب ہو" "خدا سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے"۔ "خدا ہمارے خیالات میں بھی مداخلت کرتا ہے"

تسلیم و رضا کی تعلیم بھی بخوبی دی گئی ہے مثلاً ایپکٹیٹس لکھتا ہے۔ "خدا نے جس حالت میں تمہیں رکھا ہے اُس میں خوش و خرم رہو" "اگر تمہیں نقصان ہو تمہاری اولاد ضائع ہوجائے تو شکایت

[1] لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ٥ انی جاعل فی الارض خلیفۃ ٥

مت کرو۔ جس نے یہ دنیوی چیزیں دی تھیں، اُسی نے واپس لیں اور وہ پھر بھی عطا کرسکتا ہے۔"
سینکا لکھتا ہے " یہ ضروری نہیں کہ نیکوکار دنیاوی لحاظ سے فارغ البال اور دولتمند ہوں۔ خدا بعض ابتلاء نازل کرتا ہے تاکہ کریکٹر کی تکمیل ہو اور انسان الٰہی صفات سے متصف ہوکر معیت الٰہیہ کے لائق ہوجائے۔

یوسف سلیم

فرہنگ وحواشی متعلقہ مضمونِ ہذا

۱۳ تان سین ۔ اکبر اعظم کا خاص گویا تھا، قوم کا برہمن تھا ۔ ہری داس سوامی سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی تھی ۔ علامہ ابوالفضل آئینِ اکبری میں لکھتے ہیں کہ "ایسا گویا اس ہزار سال کے اندر پیدا نہیں ہوا۔" تان سین کے قبضہ کا راگ "کانہرہ" تھا جسے سنگیت درپن میں "کرناٹکی" کے نام سے بیان کیا گیا ہے ۔ اکبر کو یہ راگ بیحد پسند تھا اور چونکہ "کانہرہ" ثقیل لفظ ہے ۔ اس لئے اس کا نام بدلکر "درباری" رکھدیا، یہ راگ اِس نام سے تمام ہندوستان میں مشہور ہے ۔ تان سین نے اپنی خداداد لیاقت کی بدولت کئی راگ نئے ایجاد کئے جن کا نام ونشان "گرنتھوں" میں نہیں پایا جاتا مثلاً میاں کی ملار میاں کی ٹوڈی ۔ میاں کا سارنگ وغیرہ ۔ تان سین کے باپ مکرند پانڈے نے دہلی میں برضا ورغبت خود اسلام قبول کیا تھا ۔ چنانچہ تان سین مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا ۔ اس کی قبر گوالیار میں آج بھی زیارتگاہِ خاص وعام بنی ہوئی ہے ۔ ۱۲

۱۴ الف بیجو باورا ۔ گوالیار کے فرمانروا راجہ مان تنوار کے دربار میں ملازم تھا ۔ یہ راجہ موسیقی کا بڑا ماہر اور قدردان تھا ۔ زمانۂ حکومت ۱۴۸۶ء سے ۱۵۱۶ء تک ہے ۔ بیجو کا اصلی نام بیجناتھ تھا ۔ موسیقی میں عدیم النظیر تھا اور اس درجہ محو کہ لوگ اسے بیجو باولا یا باورا کہتے تھے ۔ راجہ مذکور کی وفات کے بعد بیجو کی آخر عمر سلطان بہادر والئی گجرات (زمانۂ حکومت ۱۵۱۶ء تا ۱۵۲۶ء) کے دربار میں کٹی اسی زمانہ میں نائک بیجو نے ایک نئی قسم کی ٹوڈی ایجاد کی جس کا نام بادشاہ کے نام پر "بہادری ٹوڈی" رکھا ۔

۱۵ دُھرپد ۔ خیال ہوری ۔ ٹھمری وغیرہ یہ سب گانے کی اقسام ہیں ۔ جن کی تفصیل اس لئے نظرانداز کی جاتی ہے کہ ناظرین کی طبایع پر بار نہ ہو ۔ ۱۲

۱۶ عندالعقل ۔ عقل کے نزدیک ۔

۱۷ فاتحہ خلف الامام ۔ مقتدی کا امام کے پیچھے، سورۂ فاتحہ نماز میں تلاوت کرنا ۔

۱۸ قائدین وزعمائے ملت ۔ سرداراں اور قوم کے رہنما ۔

۱۹ Dionysius ۔ جزیرۂ صقلیہ کا خودمختار حاکم جو عیش وعشرت کی غرض سے اپنا زیادہ وقت ایتھنز میں صرف کیا کرتا تھا ۔

۲۰ داعی الی الشر ۔ بدی کی طرف بلانے والا، خواہ انسان ہو یا کوئی اور ۔

۲۱ سانکھیہ درشن ۔ ہندوؤں میں فلسفہ کے چھ درشن (مذاہب یا اسکول) ہیں منجملہ ان کے ایک سانکھیہ درشن بھی ہے جس کا بانی کپل گذرا ہے جس نے دیمقراطیس کی طرح یہ تعلیم دی ہے کہ مادہ ازلی ہے، کائنات خود بخود بنگئی، خدا کا وجود نہیں ۱۲

۲۲ معتزلہ ۔ یہ لفظ اعتزال سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں علیحدہ ہونا یا کنارہ کرنا ۔ اس اسکول کا بانی واصل ابن عطا ہے جو امام حسن بصری کا شاگرد تھا کسی مسئلہ پر استاد اور شاگرد کے درمیان ناچاقی ہوگئی ابن عطا درس سے اٹھکر چلا آیا ۔ استاد نے کہا "اعتزل عنّا" یعنی وہ شخص ہم سے جدا ہوگیا ۔ اسی دن سے لوگ اسے معتزلی کہنے لگے ۔ یہ لوگ اپنے آپ کو "اصحاب العدل والتوحید" کہتے تھے ۔ قرآن شریف کی تفسیر عقلی اصولوں پر کی ۔ شیعہ فرقہ کی دینیات زیادہ تر معتزلی عقاید پر مبنی ہے ۔ مامون الرشید کے زمانہ میں ان لوگوں کو بہت عروج ہوا ۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان کا زور جاتا رہا ۔ آج خال خال، اس خیال کے لوگ کہیں نظر آجاتے ہیں ۔ سرسید مرحوم نے اپنی تفسیر قرآن انہی بزرگوں کے اصول تفسیر پر لکھی تھی ۔ ۱۲

۲۳ اسی لئے حافظ کہتے ہیں :۔ حدیث از مطرب ومے گو وراز دہر کمتر جو ● کہ کس نکشود ونکشاید بحکمت ایں معمارا

۲۴ ہیوم (David Hume) بقول ڈاکٹر وِنڈل بینڈ، ہیوم انگلستان کا سب سے بڑا فیلسوف گزرا ہے ۱۷۱۱ء میں پیدا

ہوا ۱۸۷۶ء میں وفات پائی ۔مفصل آئندہ ۔ ۱۲

۱۴ہ گلیڈسٹن ۔ انیسویں صدی میں مشہور انگلستانی مدبر گزرا ہے ۔ وکٹوریہ کے عہد میں کئی دفعہ وزیر اعظم منتخب ہوا ۔ ترکوں کا جانی دشمن تھا ۔

۱۵ہ گلیڈسٹن کہا کرتا تھا کہ دنیا میں جنگ وجدل کا باعث قرآن کا وجود ہے لیکن ۱۹۱۴ء میں جو خوفناک لڑائی یورپ میں چھڑی تھی اس کا باعث قرآن نہ تھا ۔ بلکہ گلیڈسٹن کے ہم مذہب تھے ۔ اور سوائے ترکوں کے باقی سب متخاصمین غیر مسلم تھے ۔ عارضی طور پر یہ جنگ ۱۹۱۹ء میں ختم ہوگئی ۔

۱۶ہ حسن صباح ۔ فرقہ باطنیہ اسمعیلیہ کا بانی ، اشر الناس ، بلکہ ابلیس مجسم جس نے لاکھوں انسانوں کو جن میں بڑے بڑے علماء حکماء صوفیاء مشاہیر اعد نلوک بھی شامل ہیں ، محض اختلاف عقاید کی وجہ سے ، اپنے اندھے فدائیوں کے ہاتھوں سے ہلاک کرا دیا ۔ اس شخص نے دامن کوہ میں ایک فرضی جنت بنائی تھی جس میں حسین وجمیل عورتیں بوالہوسوں کے پھانسنے کے لئے مہیا کی تھیں ۔ ان کے لالچ میں اس کے مرید جن کو حشیش (بھنگ) پلا کر بدمست کر دیا جاتا تھا (اسی وجہ سے اس کے متبعین کو حشیشی بھی کہتے ہیں) ناگفتہ بہ ظالمانہ کاروائیاں کر گزرتے تھے ۔ مذہب اس کے نزدیک شہوت پرستی کا دوسرا نام تھا ۔

۱۷ہ Cyrenaism ۔ اس فلسفہ کا بانی Aristippus بمقام سائرین واقع ملک افریقہ غالباً ۴۳۵ ق م میں پیدا ہوا تھا ۔ اس کے والدین خوشحال تھے اس لئے ارسٹی پس کا ابتدائی زمانہ بہت عیش وعشرت میں بسر ہوا ۔ جوانی میں فلسفہ کا شوق ہوا غالب ۴۱۶ ق م میں یونان کا رخ کیا اور سقراط کے حلقۂ درس میں شامل ہوا ۔ ۳۹۹ ق م تک ساتھ رہا ۔ سقراط کی وفات کے بعد خود فلسفہ کا درس دینے لگا ۔ اس نے لذت وسرور کو حیات انسانی کا مقصد قرار دیا ہے اور اپی قورس نے اسی کے فلسفہ پر اپنے خیالات کی بنیاد قایم کی تھی ۔ یہ شخص حساب مساحت اقلیدس ، نجوم ، ہیئت ان تمام علوم کو بیکار سمجھتا تھا ۔ کیونکہ افعال انسانی کو ان سے کوئی علاقہ نہیں ہے ۱۲

۱۸ہ سسرو ۔ مشہور رومن فلاسفر ولادت ۱۰۶ ق م وفات ۴۳ ق م ۔

۱۹ہ سینکا ۔ ولادت ۳ء وفات ۶۵ء نیرو قیصر روم کا اتالیق تھا ۔ اصلی باشندہ اسپین کا تھا لیکن روم میں عمر بسر ہوئی ۱۲

۲۰ہ مارکس ۔ شہنشاہ روم ۱۶۱ء سے ۱۸۰ء تک حکومت کی بادشاہ بھی تھا اور فلاسفر بھی ۔ صوفی بھی اور حکیم بھی ۱۲

۲۱ہ ہرقلیطوس ۔ تاریخ ولادت ووفات متحقق نہ ہوسکی لیکن اسقدر معلوم ہے کہ ۵۰۰ ق م میں فلسفہ کا درس دے رہا تھا ۔ قدیم فلاسفہ میں نہایت نامآور گزرا ہے ۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ "آگ" اصل کائنات ہے ۔ ۱۲

۲۲ہ حالی ۔ خواجہ الطاف حسین حالی پانی پت کے رہنے والے ۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء اردو میں نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی ۔ ان کی مسدس ان کا نام زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے ۱۲

۲۳ہ Epictetus یہ حکیم بچپن میں کسی کا غلام تھا لیکن اسکی آزادی روح دیکھکر اس کے مالک نے آزاد کر دیا ۔ روم میں مدتوں تک رہا لیکن وہاں سے کسی بات پر جلاوطن کر دیا گیا تو یونان میں درس دینا شروع کر دیا ۔ اس کی تعلیمات اس کے شاگرد ایریانس نے نہایت شرح وبسط کے ساتھ قلمبند کی تھیں ۔ ۹۰ء کے قریب اس کی شہرت دور ونزدیک پھیل چکی تھی ۔ تاریخ ولادت ووفات معلوم نہ ہوسکی ۔

۲۴ہ سیکٹس ۔ نام ہے ایمپریکس لقب ہے شہر مٹیلینی کا باشندہ اور ہیروڈوٹس لاادری کا شاگرد رشید تھا ۔ اس نے فلسفہ تشکیک کو منتہائے عروج پر پہنچا دیا ۔ ابتدائی تعلیم یونان میں حاصل کی بعد ازاں سکندریہ چلا گیا کیونکہ ایتھنز کی علمی رونق سب سکندریہ میں مجتمع ہوگئی تھی ۔ وہیں عمر گذار دی ۔

نغمہ

ہلکی، ہلکی سرد ہوا میں
کالی، کالی مست گھٹا میں
چاندنی کی وجد آموز ضیا میں
رات کی اس خاموش فضا میں
کون ترنم ریز ہوا

کون ترنم ریز ہوا
عالم حشر انگیز ہوا

بجلی کی ہر لہر کے ساتھ
بادل کے ہر قہر کے ساتھ
یعنی سازِ دہر کے ساتھ
ہوش رُبا، سرمست ادا میں
کون ترنم ریز ہوا

کون ترنم ریز ہوا
کون ترنم ریز ہوا

رُوح کو تڑپا، تڑپا کر کے
سینہ میں دل کو گرما کر کے
"عالم نغمہ" پر چھا کر کے
کیف اثر، پُر جوش صدا میں
کون ترنم ریز ہوا

کون ترنم ریز ہوا
عالم حشر انگیز ہوا

ساز وہ چھیڑا جاتا ہے
عالم کھویا جاتا ہے
"نغمہ" ڈوبا جاتا ہے
درد بھری، دلسوز نوا میں
کون ترنم ریز ہوا

کون ترنّم ریز ہوا　　عالم حشر انگیز ہوا

ہوش برنگِ مستی ہے　　کھوئی ہوئی سی ہستی ہے

سونی دل کی بستی ہے　　سحر اثر انداز و ادا میں

کون ترنّم ریز ہوا

کون ترنّم ریز ہوا　　عالم حشر انگیز ہوا

نظریں آج پریشاں ہیں　　روحیں وجد بداماں ہیں

حسن کی موجیں رقصاں ہیں　　شعبدۂ اعجاز نما میں

کون ترنّم ریز ہوا

وفا فرخ آبادی

کون ترنّم ریز ہوا　　عالم حشر انگیز ہوا

غزل

کہیں ایسا نہ ہو اُٹھ جائے دستِ ناتواں میرا　　جنوں انگیزئ اُلفت نہ لے اب امتحاں میرا

کوئی بے شُبہ اِس پردے میں سرگرمِ نوازش ہے　　وہیں پر کیوں گری بجلی جہاں تھا آشیاں میرا

نہ پوچھیں اہلِ دل ہنگامہ آرائی محبت کی　　وہی اب دشمنِ جاں ہے جو کل تھا رازداں میرا

قیودِ رہبر و منزل سے میں آزاد ہوں لیکن　　مرے نقشِ قدم پر آرہا ہے کارواں میرا

کوئی حد بھی تو ہونی چاہیئے اِس نامرادی کی　　لٹے گا ہر نئی منزل پہ کب تک کارواں میرا

حیات و مرگ کی ہر جستجو بیکار ہے نیّرؔ
مری منزل وہیں ہے سانس رُک جائے جہاں میرا

نیّرؔ

سزا و جزا

(ایک نہایت سبق آموز افسانہ)

اِس واقعہ کو صدیاں گزر چکی ہیں کہ ایک شام کو بوڑھا بشیر اور
ں بوڑھی بیوی رقیہ اپنی جھونپڑی کے آگے بیٹھے ہوئے سورج
غروب ہونے کے خاموش اور دلفریب نظارہ میں محو تھے۔ وہ
وڑا بہت کھانا، جو اُن کو میسر آیا تھا کھا چکے تھے اور سونے
، پہلے ایک دو گھنٹے آرام سے گزارنا چاہتے تھے۔ اس لئے
ں میں اپنے باغیچہ کے، اپنی گائے کے، اپنی پالی ہوئی مکھیوں
،، اور اپنی انگور کی بیلوں کے (جو جھونپڑی کی دیواروں پر چڑھی
ئی تھیں اور جن پر بہت سے گچھے پکنے کے قریب تھے) متعلق
ں کر رہے تھے۔ لیکن لڑکوں کی وحشیانہ چیخ پکار اور کتوں کے
ونکنے کی خوفناک آوازیں، نزدیک کے گاؤں میں زیادہ سے
یادہ تر ہوتی گئیں یہاں تک کہ اُن کو ایک دوسرے کی بات سننی
وار ہو گئی۔

"آہ! پیاری" بشیر نے جوش سے چلا کر کہا۔ کوئی نہ کوئی غریب
افر ہمارے ہمسایوں میں رات گزارنے کی فکر میں ہوگا۔ اور
ں نے اُسے کھانا کھلانے اور آرام دینے کی بجائے، جیسا کہ
ں کی عادت ہے۔ اپنے کتے اُس کے پیچھے لگا دئے ہیں۔"

"افسوس!" رقیہ نے جواب دیا "ہمارے ہمسائے اپنے
لوم سماجیوں سے ذرا بھی مہربانی سے پیش نہیں آتے، وہ اپنے
ں کو کس بُری طرح سے پرورش کرتے ہیں۔ اور جب وہ مسافروں
پتھر پھینکتے ہیں تو والدین خوش ہوتے ہیں اور انہیں شاباش دیتے
ں"

"ان کا انجام اچھا نہ ہوگا" بشیر نے اپنے روئی کے گالے
یسے سفید سر کو ہلاتے ہوئے کہا۔

"پیاری! سچ تو یہ ہے کہ کوئی عجب نہیں اگر یہ لوگ اپنے
دات و اطوار کو درست نہ کریں تو کوئی خوفناک بلا تمام گاؤں
اجائے۔ اُسے ہر ایک چیز پر قدرت حاصل ہے۔ کل ہی
ؤں میں طاعون، ہیضہ یا کوئی اور خطرناک بیماری بھیج دنے یا
آسمان سے آگ برسانے لگے، پھر یہ کیا کرلیں گے؟ ...... میرے
اور تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ جب تک خدا ہمیں روٹی کا ایک
ٹکڑا بھی دے، ہمیں خانماں برباد اور محتاج مسافر کو وہی دینا چاہئے"

"بالکل ٹھیک" رقیہ نے کہا۔ "اور ہم ایسے ہی کریں گے"

یہ بوڑھے میاں بیوی بہت ہی غریب تھے۔ میاں بیوی کو
پیٹ بھرنے کے لئے بیحد محنت کرنا پڑتی تھی۔ بوڑھا بشیر تمام
دن اپنے باغیچہ میں کام کیا کرتا تھا۔ اور رقیہ ہر وقت یا تو چرخہ کاتتی
رہتی، یا اپنی گائے کے دودھ سے مکھن اور پنیر بنائی یا کوئی اور
کام کرتی رہتی۔ ان کی خوراک روٹی، دودھ اور سبزی کے علاوہ
کچھ نہ ہوتی تھی۔ کبھی مکھیوں کے چھتے سے شہد اور کبھی کبھی بیلوں
کے پکے ہوئے انگور بھی میسر آجاتے تھے۔ دونوں بہت رحمدل
تھے۔ وہ خوشی سے بغیر کھانا کھائے تمام دن گزار دیتے اور اپنی
روٹی، تازہ دودھ کا پیالہ اور چمچہ بھر شہد اُس تھکے ماندے مسافر کو
جو ان کے دروازے پر آکر دستِ سوال دراز کرتا تھا، دیدیتے۔
ان کا خیال تھا کہ مہمان خدا کے بھیجے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی لئے
وہ ان کا اپنے سے زیادہ خیال رکھتے تھے۔

اُن کی جھونپڑی گاؤں سے کچھ دور، نصف میل کے قریب کشادہ
وادی میں ایک ٹیلے پر واقع تھی۔ جب دنیا نئی نئی بنائی گئی تھی اس
تمام وادی میں ایک جھیل پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں مچھلیاں اِدھر سے
اُدھر اُدھر سے اِدھر اچھلا کرتی تھیں۔ پانی کے کنارے لمبی لمبی
گھاس اگی ہوئی تھی، لمبے لمبے درختوں اور اونچی اونچی پہاڑیوں کا عکس
جھیل کے شفاف اور کشادہ دامن پر ہر وقت پڑتا رہتا تھا۔ آہستہ
آہستہ پانی خشک ہوگیا۔ اِدھر اُدھر سے لوگ آئے، زمین
کو کاشت کیا اور مکان بنا لئے۔ اور اب یہ ایک زرخیز زمین کا
ٹکڑا تھا۔ اس میں اب پرانی جھیل کا کوئی نشان باقی نہ تھا۔ البتہ
ایک چھوٹی سی ندی گاؤں کے بیچوں بیچ بہتی تھی اور تمام گاؤں

کو سیراب کرتی تھی جھیل کو خشک ہوئے اتنی مدت گزر چکی تھی کہ وہاں ناریل کے درخت اُگے، بڑھے، پھلے پھُولے اور بہت پرانے ہو کر گر گئے۔ اُن کی جگہ اور درخت اُگے اور اُتنے ہی بڑے ہو کر گر گئے۔ پھر اُن کی جگہ اور............ اسی طرح پانچ چھ دفعہ اُگے، بڑھے اور بڑھ کر گر گئے............ ایسی اچھی اور زرخیز وادی کہیں دُور دُور نہ تھی۔ وہاں ہر قسم کی نعمتیں موجود تھیں۔ مگر وہاں کے باشندے ظالم تھے اور سنگدل۔ وہ اُن نعمتوں پر بھی خدا کا شکر ادا نہ کرتے تھے۔ اور اپنے ہم نوع بھائی بہنوں پر ظلم و ستم روا رکھتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس قابل ہی نہ تھے کہ ایسی جگہ رہیں جہاں قدرت نے اتنی فراخدلی سے سب نعمتیں مہیا کر رکھی تھیں۔ وہ پرلے درجے کے سنگدل اور خود پرست تھے۔ اُن کے پتھر کی طرح سخت دلوں میں نہ غریب کے لئے رحم تھا نہ بے گھروں کے لئے ہمدردی۔ جب اُنہیں کوئی یہ بتاتا کہ ہر انسان کو ایک دوسرے کی محبت کا فرض ادا کرنا ہے کیونکہ کوئی دوسرا طریقہ ایسا نہیں کہ جس سے ہم خدا کی مہربانیوں اور عنایتوں کا شکریہ ادا کر سکیں تو وہ نہایت بے پروائی سے ہنس دیتے۔ وہ شریر النفس آدمی اپنے بچوں کو بھی اپنا جیسا ہی بناتے اور اُنہیں اپنی تمام عادتیں سکھاتے تھے۔ اور جب وہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو کسی غریب مسافر کے پیچھے دوڑتے، چیختے اور پتھر پھینکتے ہوئے دیکھتے تو اُن کا دل بڑھانے کے لئے تالیاں بجاتے اور "شاباش" کہتے۔ انہوں نے بڑے قدآور اور خونخوار کتے بھی پال رکھے تھے۔ یہ ظالم خوفناک کتے، مسافروں کے پیچھے بھونکتے، غراتے اور لمبے لمبے سفید دانت نکالتے۔ پھر وہ اُن میں سے کسی کی ٹانگ کسی کا کپڑا پکڑ لیتے۔ اور اگر مسافر تھکا ماندہ ہوتا تو اس سے پہلے کہ وہ اپنی جان بچا کر بھاگے اُس کی حالت دگرگوں اور قابلِ رحم ہو جاتی۔ وہ غریب مسافروں کے ساتھ بہت ہی وحشیانہ اور مضرت رساں سلوک کرتے تھے۔ خاص طور پر اُس وقت جب کوئی مسافر بیمار، نحیف و ناتواں، یا لنگڑا، لولا اور بوڑھا ہوتا۔ اگر مسافروں کو ایک دفعہ بھی معلوم ہو جاتا کہ گاؤں کے بے رحم آدمی، ظالم بچے۔ اور خونخوار کتے اِس بُری طرح سے پیش آتے ہیں تو وہ اس راستے سے میلوں دور پرے چلے جاتے اور بھولے سے بھی گاؤں کے قریب نہ پھٹکتے۔ اُن دیہاتیوں میں اِس سے بھی زیادہ بُری بات یہ تھی کہ جب امیر آدمی اپنی پُر تکلف گاڑیوں میں، یا خوبصورت گھوڑوں پر سوار ہو کر گاؤں سے گزرتے اور ان کے نوکر نئے نئے بھڑکیلے کپڑے پہنے جلو میں ہوتے، تو دیہاتی بہت ہی زیادہ مہذب اور خوشامدی بن جاتے، اپنی ٹوپیاں اُتار اُتار کر بہت ادب سے جھک کر سلام کرتے۔ اگر لڑکے کچھ شرارت کر بیٹھتے تو انہیں سزا دی جاتی اور اگر کتے ذرا بھی بھونکتے تو مالک انہیں لاٹھیوں سے مارتے اور رسی سے باندھ دیتے اور دو دو روز کھانے کو نہ دیتے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ دیہاتی اُس روپے کی زیادہ قدر کرتے تھے، جو مسافروں کے پاس ہوتا تھا۔ اور اُس انسانی جوہر کی کچھ پروا نہ کرتے تھے جو بادشاہ اور فقیر میں یکساں ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب بوڑھے بشیر نے گلی کے دوسری طرف لڑکوں کا شور اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سُنیں تو وہ بے چین اور ملول ہو کر اپنی بیوی سے باتیں کرنے لگا۔ ایک دفعہ بہت ہی زیادہ شور اٹھا اور بہت دیر تک رہا۔

"میں نے کتوں کو ایسے بے تحاشا بھونکتے نہیں سنا" بوڑھے بشیر نے فکر کے لہجہ میں کہا۔ "اور نہ بچوں کو اتنا چیختے" اس کی نیک دل بوڑھی بیوی نے جواب میں کہا۔

وہ دونوں اپنی کٹیا کے آگے بیٹھے ہوئے، ایک دوسرے کی باتوں پر سر ہلاتے رہے، اور آوازوں کا شور نزدیک سے نزدیک تر آتا گیا۔ وہ اضطراب کی حالت میں کھڑے ہو گئے اور اُس ٹیلے کے قریب ہی، جس پر اُن کی کٹیا تھی، دو مسافروں کو پیدل آتے ہوئے دیکھا۔ ان کے پیچھے پیچھے خونخوار کتے ایڑیوں پر دانت مارتے ہوئے آ رہے تھے۔ تھوڑی دور پر لڑکوں کا ایک جتھا تھا۔ بیدرد لڑکے اپنی پُوری پوری طاقت سے اُن پر پتھر پھینک رہے تھے۔ اور آوازے کستے تھے۔ دونوں مسافروں میں جو زیادہ کم عمر، دبلا اور پھرتیلا تھا کبھی کبھی پیچھے مڑ کر اپنی لاٹھی سے کتوں کو ہٹا دیتا تھا۔ اور دوسرا مسافر جو بہت لمبا تھا چپ چاپ چل رہا تھا گویا ان شریر لڑکوں اور ناپاک کتوں کے اذیت پہنچانے کی پروا کرنا اس کے نزدیک غیر شریفانہ فعل تھا۔

دونوں مسافر بہت پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اُن کی جیب میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی اور شاید اسی وجہ سے دیہاتیوں نے اپنے بچوں اور کتوں کو اس وحشیانہ سلوک سے نہ روکا۔

"میری پیاری!" بشیر نے رقیہ سے کہا۔ "آؤ ہم چل کر اُن کا استقبال کریں۔ وہ بہت تھکے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ دیکھو! تو پہاڑی پر نہیں چڑھ سکتے۔"

"تم جاؤ اور اُن کا استقبال کرو"۔ رقیہ کٹیا میں گھس گئی اور بشیر کچھ دور آگے انہیں لینے چلا گیا۔ وہاں جا کر اُس نے اپنے ہاتھ ایسی

مہمان نوازی کے انداز میں پھیلائے کہ "خوش آمدید مہمانو! خوش آمدید!" کہنے کی بھی ضرورت نہ رہی۔

"شکریہ" نوجوان مسافر نے اپنی تکلیف اور تکان کو خیال میں نہ لاتے ہوئے نہایت نرمی سے کہا۔ "یہ اُس سلوک کے بالکل برعکس ہے جو گاؤں والوں نے ہمارے ساتھ کیا۔ خدارا جلدی بتائیے، آپ ایسے برے ہمسایوں میں کیوں رہتے ہیں؟"

"آہ" بوڑھے بشیر نے مسکراتے ہوئے کہا "خدا نے مجھے یہاں آباد کر رکھا ہے، وہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن دوسری وجہوں کے علاوہ ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ میں اپنے ہمسایوں کی بدسلوکی کا کچھ تھوڑا بہت بدل دے سکوں۔"

"بہت اچھا۔ بزرگوار صاحب! بہت اچھا!" مسافر نے ہنستے ہوئے کہا "اور اگر آپ سچ سچ پوچھتے ہیں، تو میرے ساتھی کو اور مجھے واقعی آرام کی ضرورت ہے۔ اُن بدکار بچوں نے ہم پر پتھر پھینکے۔ اور کتوں نے کاٹنے کی بہت کوشش کی۔ ایک نے میرا چوغہ بھی پھاڑ ڈالا...... میں نے بھی اپنی لاٹھی سے اُس کی ناک پر ایسی ضرب لگائی کہ آپ نے اتنی دور بھی اُسے درد سے کراہتے سنا ہوگا۔"

بشیر کو اُس کی خوش مزاجی پر بہت ہنسی آئی۔ مسافر کی شکل دیکھنے سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دن بھر کے لمبے سفر سے تھکا ہوا ہے۔ اُس کا لباس بہت ہی بھدا تھا۔ اُس کے سر پر ایک ایسی ٹوپی تھی جس کے کنارے پھٹ کر دونوں کانوں پر آگئے تھے۔ گرمی کا موسم ہونے کے باوجود اُس نے ایک لمبا چوغہ پہن رکھا تھا۔ پہن کیا رکھا تھا بدن پر لپیٹ رکھا تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ کپڑے بہت ہی میلے کچیلے تھے۔ اس کے پاؤں میں جوتیاں ضرور تھیں مگر ایک تو اندھیرا چھا گیا تھا اور دوسرے بشیر کی نظر تیز نہ تھی لہذا وہ اُن میں کوئی خاص بات نہ دیکھ سکا۔ مسافر اتنا ہلکا پھلکا تھا کہ اُس کے قدم خود بخود زمین سے اوپر اٹھتے معلوم ہوتے تھے، یا یوں نظر آتا تھا کہ وہ کوشش کر کے اُنہیں نیچے رکھتا ہے۔

"میں بھی جوانی میں سُبک رو تھا" بشیر نے مسافر سے کہا "مگر ہمیشہ شام کو تھکن محسوس ہونے لگتی تھی۔"

"سفر میں انسان کو لاٹھی سے بہت مدد ملتی ہے" مسافر نے کہا "اور یہ دیکھئے! میرے پاس بھی ایک خوشنما چھڑی ہے۔"

یہ چھڑی بشیر کے لئے بہت ہی عجیب چیز تھی۔ اس نے اس کی چھڑی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ زیتون کی لکڑی چوٹی پہ دو پر لگے ہوئے تھے اور دو مصنوعی سانپ بل کھاتے ہوئے اُوپر چڑھ رہے تھے۔ اور چونکہ بشیر کی نظر کمزور تھی اور اندھیرا بھی ہو گیا تھا۔ اس لئے اُنہیں اصلی سانپ سمجھا۔

"یقیناً کتنا عجیب عصا[2] ہے!" اس نے کہا "دو پروں والا عصا! یہ لڑکوں کے پھُدکنے کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوگا۔"

دونوں مسافر اور بشیر جھونپڑی کے دروازہ پر پہنچ گئے۔

"دوستو!" بوڑھے بشیر نے کہا "اس چارپائی پر بیٹھ جاؤ میری بیوی، رقیہ آپ کے لئے کھانا لینے گئی ہے۔ ہم غریب آدمی ہیں۔ مگر جو کچھ بھی حاضر ہوگا آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔"

نوجوان مسافر نے کمال بے پروائی سے اپنے آپ کو چارپائی پر گرا دیا اور جونہی وہ گرا اُس کی لاٹھی بھی زمین پر گر پڑی۔ عصا کے گرنے سے ایک نہایت عجیب و غریب مضحکہ انگیز بات وقوع پذیر ہوئی۔ عصا خود بخود زمین سے اٹھا اور اپنے ننھے ننھے پر پھیلا کر اُڑتا جھونپڑی کی دیوار سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں یہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ البتہ سانپ اُسی طرح بل کھاتے رہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ بوڑھے بشیر کو اُس کی نظر دھوکا دے رہی تھی۔

وہ ابھی کوئی سوال نہ کرنے پایا تھا کہ بڑے مسافر نے اُس کی توجہ عجیب و غریب عصا کی طرف سے اپنی طرف مبذول کر لی۔

"کیا" اُس نے دبی ہوئی آواز میں پوچھا "اس جگہ جہاں آپ کا گاؤں ہے پرانے زمانہ میں ایک جھیل پھیلی ہوئی نہ تھی؟"

"جب سے میں پیدا ہوا ہوں" بوڑھے بشیر نے کہا "اور آپ دیکھتے ہیں کہ میں کتنا بوڑھا ہوں، یہاں سرسبز کھیت اور چراگاہیں ہیں۔ بڑے بڑے درخت ہیں۔ اور ایک ندی گاؤں کے درمیان بہتی ہے۔ نہ میرے باپ نے اور نہ اُس کے باپ نے کبھی گاؤں کو دوسری حالت میں دیکھا ہے، اور یہ میرے مرنے کے بعد بھی جب کہ دنیا مجھے فراموش کر دیگی، اسی طرح رہیگا۔"

"ایسی باتیں پیش گوئی کرنے کے قابل نہیں ہوتیں" مسافر نے کہا، اور اُس کی موٹی آواز کچھ کرخت بھی تھی۔ اس نے اپنے سر کو ہلایا اور سیاہ گھنگریالے بال ہوا میں لہرانے لگے "چونکہ اُنہوں نے خدا کے احسانات اور مہربانیوں کو بھلا دیا ہے۔ اس لئے یہی بہتر ہے کہ یہاں وہی پرانی جھیل موجیں مارنے لگے۔"

---

[1] تیز رفتار

[2] لاٹھی۔

بشیر نے مسافر کی طرف دیکھا اور سہم گیا۔ اُس کا خوف اور زیادہ ہو گیا، جب اُس نے دیکھا کہ اجنبی کے غصہ نے روشنی کو تاریکی میں تبدیل کر دیا ہے، اور اُس کے سر کی ایک خفیف جنبش نے فضائے بسیط میں رعد و برق کا ایک طوفان اٹھا دیا ہے۔ لیکن ایک ہی لمحہ میں مسافر کا چہرہ اتنا نرم اور خوشگوار ہو گیا کہ بوڑھا تمام ڈر بھول گیا۔ اور اُسے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ مسافر اگرچہ ظاہرا غریب ہے اور پا پیادہ سفر کر رہا ہے، تاہم کوئی معمولی آدمی نہیں۔ اُس نے سمجھا کہ وہ کوئی شہزادہ ہے جو بھیس بدل کر رعایا کا حال معلوم کرنا چاہتا ہے۔ یا اسی قسم کا کوئی اور آدمی ہے اور بہت زیادہ عقلمند، جو دنیا میں اس لئے گھوم رہا ہے کہ اُس کی عقل میں اضافہ ہو۔ یہ خیال زیادہ درست تھا۔ کیونکہ جب اُس نے مسافر کے چہرہ پر نظر ڈالی، تو دیکھا کہ اُس کی ایک ہی نظر میں اتنے خیالات پوشیدہ تھے جن کا وہ عمر بھر مطالعہ نہ کر سکتا تھا۔

رقیہ کھانا تیار کر رہی تھی۔ مسافر بشیر سے نہایت مہذبانہ گفتگو کرنے لگے۔ چھوٹا بہت زیادہ باتونی تھا اور ایسی حرکتیں اور نقلیں کرتا تھا کہ بوڑھا بشیر ہنستا ہی رہا اور کہنے لگا "میں نے آپ سا ظریف اور ہنس مکھ آدمی عمر بھر نہیں دیکھا"

"میرے نوجوان دوست!" اس نے کہا، کیونکہ وہ اچھی طرح ایک دوسرے سے کھل گئے تھے۔

"آپ کو کس نام سے پکاروں؟"

"جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں میں بہت سبک رو ہوں" مسافر نے کہا "اس لئے اگر آپ مجھے 'سیماب' کے نام سے پکاریں تو بہت موزوں ہوگا۔"

"سیماب۔ سیماب" بشیر نے مسافر کے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔ گویا اُس کی ہنسی اڑا رہا ہے۔ "یہ تو بہت عجیب نام ہے۔ اور کیا آپ کے ساتھی کا نام بھی ایسا ہی ہے؟"

"یہ بات رعد سے دریافت کیجئے" سیماب نے بعید از فہم انداز میں کہا "اس سے زیادہ بلند کسی کی آواز نہیں"

یہ بات خواہ مذاق میں کہی گئی تھی یا سنجیدگی سے، مگر بشیر کے دل میں دوسرے مسافر کی طرف سے دہشت ضرور بٹھا دیتی۔ اگر بڑے مسافر کے چہرہ پر مہربانی اور تلطف کے آثار اسے نظر نہ آتے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہ تھا کہ جھونپڑی کے دروازہ کے سامنے ایک بہت بڑا جسیم آدمی سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ جب بشیر اُس سے ہمکلام ہوا تو اُس نے ایسی سنجیدگی اور عقلمندی سے جواب دیا کہ بشیر اپنے دل کے تمام راز اُسے بتانے کے لئے تیار ہو گیا۔ انسان کی فطرت ہے۔ کہ جب اُسے کوئی ایسا شخص مل جاتا ہے جو اُس کے نیک و بد میں اُس سے زیادہ تمیز کر سکتا ہو، تو وہ اپنا دل کھول کر اُس کے آگے رکھ دیتا ہے۔ اور یہ نہیں سوچتا کہ کسی سے دل کی بات نہ کہنی چاہئے۔ بشیر سیدھا سادہ اور نیک دل تھا، اُس کے دل میں کوئی خاص راز نہ تھا۔ اُس نے اپنی زندگی کے تمام جھگڑے چھیڑ دئے۔ اُس نے بتایا کہ وہ اور اُس کی بیوی رقیہ لکھنو کے رہنے والے ہیں۔ بیس سال کی عمر میں آ کر یہاں آباد ہوئے تھے اور اُس کے بعد اُن میں سے کوئی بھی اس کٹیا سے پندرہ بیس میل پرے نہیں گیا۔ دیانتداری اور محنت سے پیٹ بھرتے ہیں۔ اُس نے یہ بھی ظاہر کیا کہ وہ غریب ضرور تھے مگر صبر و قناعت کی دولت سے مالا مال۔ اور رقیہ بہت عمدہ پنیر اور مکھن بناتی ہے انہیں ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت ہے۔ اس لئے اُن کی خواہش ہے کہ موت انہیں جدا نہ کر سکے۔ اور جس طرح اپنی تمام زندگی میں ایک ساتھ رہے ہیں، اُسی طرح ایک ساتھ اس دنیائے فانی کو الوداع کہیں۔

مسافر چپ چاپ بیٹھا ہوا سب کچھ سنتا رہا۔ جب بشیر خاموش ہو گیا تو اس کے پُر نور چہرہ پر مہربانی کا تبسم برسنے لگا۔

"آپ بہت اچھے بزرگ آدمی ہیں" اس نے بشیر سے کہا۔ "اور آپ کی شریک زندگی بھی بہت نیک دل بوڑھی عورت ہے۔ یہ مناسب ہے کہ آپکی خواہش پوری کر دی جائے"

بشیر نے محسوس کیا کہ شفق سے ایسی روشنی نمودار ہوئی، جس سے تمام آسمان جگمگا اٹھا۔

رقیہ اس اثنا میں کھانا تیار کر چکی تھی۔ وہ دروازہ پر آئی اور معافی مانگنے لگی۔ کہ "ہم آپ کی خاطر تواضع نہ کر سکیں گے۔ جو کچھ تھوڑا بہت میسر آیا وہ حاضر ہے۔ اگر ہم جانتے کہ آپ آرہے ہیں" تو میں اور میرا خاوند ایک لقمہ بھی نہ کھاتے اور آپ کو اچھا کھانا مل جاتا۔ خیر میں نے آج کے دودھ میں سے تھوڑے سے کا تو پنیر بنا لیا تھا اور باقی رکھ چھوڑا ہے۔ ہم اپنی روٹی بھی آدھی کھا چکے ہیں۔ آہ ..... مجھے غریب ہونے کا کبھی رنج نہیں ہوتا۔ سوائے اُس وقت کے جب کوئی غریب مسافر ہمارے دروازے پر دستک دیتا ہے"

"سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا، میری اچھی ملکہ! آپ تکلیف نہ کریں" بڑے مسافر نے کہا مہمانوں کے ساتھ ہمدردی خوراک میں

ساہ کرداک

کرامت و معجزہ کا کام لیتی ہے اور بُری سے بُری خوراک بھی آبِ حیات اور امرت میں تبدیل ہوجاتی ہے ۔"

" ہمیں آپ سے دلی ہمدردی ہے ۔" رقیہ نے زور دیتے ہوئے کہا " اور تھوڑا سا شہد جو بچ رہا ہے ، اور انگوروں کا گچھا بھی آپ ہی کے لئے ہے ۔"

" محترمہ رقیہ! یہ تو دعوت ہے دعوت!" سیماب نے مسکراتے ہوئے کہا " اور آپ دیکھینگی میں کتنی دلیری سے اپنا کام سرانجام دونگا ۔ مجھے اپنی عمر میں اتنی بھوک نہیں لگی جتنی کہ آج لگ رہی ہے ۔"

" افسوس ہے ہم پر " رقیہ نے اپنے خاوند کے کان میں کہا ۔ " اگر نوجوان اتنا زیادہ بھوکا ہے تو یہ کھانا بہت کم رہیگا ۔"

سب کے سب جھونپڑی میں چلے جاتے ہیں ۔

آپ کو یاد ہوگا کہ سیماب کا عصا جھونپڑی کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا تھا ۔ جب اُس کا مالک اُسے چھوڑکر دروازہ میں داخل ہوگیا تو اُس نے کیا کیا! اپنے پر پھیلا دئے اور باورچیخانہ کے فرش پر اچھلتا ہوا سیماب کی کرسی کے پیچھے نہایت سلیقہ سے کھڑا ہوگیا ۔ بوڑھا بشیر اور اُس کی بیوی مہمان نوازی میں اتنے منہمک تھے کہ اُنہیں عصا کی کارگذاریوں کی مطلق خبر نہ ہوئی ۔

جیسا کہ رقیہ نے کہا تھا کھانا واقعی دو مسافروں کے لئے بہت ہی کم تھا ۔ ایک چھوٹی سی چوکی پر کچھ حصہ بھوری ڈبل روٹی کا رکھا ہوا تھا ۔ اُس کے ایک طرف پنیر کا ٹکڑا تھا اور دوسری طرف ایک پیالی میں شہد ۔ انگوروں کے گچھے بھی تھے اور تختے کے ایک طرف مٹی کا چھوٹا سا لوٹا رکھا ہوا تھا جس میں دودھ تھا اور جب رقیہ نے دو گلاس بھر کر مسافروں کے آگے رکھدئے تو بہت کم دودھ اُس میں باقی بچا ....

رقیہ آئندہ ہفتے بھی فاقہ کرنے کے لئے تیار تھی ۔ اگر ایسا کرنے سے مسافروں کے لئے کچھ زیادہ کھانا میسر آجائے ۔ چونکہ کھانا کم تھا ۔ اِس لئے وہ یہ آرزو کئے بغیر نہ رہ سکی کہ " کاش یہ اتنے زیادہ بھوکے نہ ہوتے ۔"

دونوں مسافروں نے بیٹھتے ہی دودھ کے دونوں گلاس ایک ہی دفعہ میں خالی کردئے ۔

" مہربان ماں ۔ تھوڑا سا دودھ اور دیدیجئے " سیماب نے کہا آج گرمی بہت زیادہ تھی اور مجھے بہت زیادہ پیاس لگ رہی ہے ۔"

" معزز مہمانو " رقیہ نے گھبراہٹ میں کہا " گو یہ باعثِ افسوس ہے اور باعثِ شرم بھی ، مگر سچ تو یہ ہے کہ لوٹے میں مشکل سے ہی دودھ کے ایک دو قطرے ہونگے ۔ آہ آج ہم نے فاقہ کیوں نہ کرلیا!"

" کیوں " سیماب بولتے ہوئے اٹھا اور برتن کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا " میرے خیال میں در اصل معاملہ اتنا بڑا نہیں جتنا کہ آپ بتاتی ہیں ۔ ابھی تو لوٹے میں بہت دودھ باقی ہے "

یہ کہکر اُس نے لوٹے سے ، جو رقیہ کے خیال میں بالکل خالی تھا ، صرف اپنا گلاس بھرا بلکہ اپنے ساتھی کا بھی ۔ رقیہ حیران رہ گئی اُسے اپنی نگاہ پر سخت تعجب ہوا کہ وہ کیا دیکھ رہی ہے ! اُس نے یقیناً تمام دودھ اُلٹ لیا تھا اور لوٹے کو چوکی پر رکھنے سے پہلے اُس کے اندر بھی نظر ڈال لی تھی ۔

" لیکن میں بوڑھی ہوں " رقیہ نے خیال کیا " شاید مجھے یاد نہ رہا ہو ۔ بہرحال ہر ساہب لوٹا ضرور خالی ہوگیا ۔ اِس میں سے دو گلاس اور بھر لئے گئے ہیں "

" کیا خوش ذائقہ دودھ ہے!" سیماب نے دوسرا گلاس ختم کرتے ہوئے کہا " مجھے آپ معاف فرمائینگی ۔ اگر میں تھوڑا سا اور مانگوں " رقیہ نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ سیماب نے لوٹے کو بالکل اُلٹ لیا ہے اور خاص طور پر دوسرا گلاس بھرتے ہوئے ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا تھا ۔ تاہم اس نے عملاً بتانے کے لئے لوٹا اٹھایا اور سیماب کے گلاس پر اس طرح الٹا کہ وہ واقعی دودھ ڈال رہی تھی اُسے یقین تھا کہ دودھ کی ایک بوند بھی گلاس میں نہ گریگی ۔ لیکن وہ یہ دیکھکر ششدر رہگئی کہ لوٹے سے دودھ اتنی تیزی سے گرا کہ گلاس کو لبالب بھر کر چوکی پر بہنے لگا ۔

دونوں سانپ ، جو سیماب کے عصا پر بل کھا رہے تھے ، بڑھے اور گرے ہوئے دودھ کو چاٹنے لگے ۔ مگر نہ رقیہ نے اُنہیں دیکھا اور نہ بشیر نے ۔ اِس دودھ سے نہایت عمدہ خوشبو آتی تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بشیر کی گائے نے اچھی سے اچھی بوٹیاں ، جو زمین پر پیدا ہوسکتی ہیں چری تھیں ۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ آپ میں سے ہر ایک کو کھانا کھاتے ہوئے اِس خوش ذائقہ اور خوشبودار دودھ کا ایک ایک پیالہ نصیب ہو ۔

" اور اپنی بھوری ڈبل روٹی کا بھی ایک ٹکڑا " سیماب نے کہا " اور تھوڑا سا شہد بھی "

رقیہ نے ٹکڑا کاٹ کر دیا۔ جب اُس نے اور اُس کے شوہر نے کھانا کھایا تھا تو یہ روٹی اتنی خشک اور سخت تھی کہ آسانی سے کٹتی بھی نہ تھی اور اب ایسی نرم ہوگئی تھی گویا چند گھنٹے پہلے تنور سے نکالی گئی تھی۔ رقیہ نے وہ ریزے جو کاٹتے ہوئے چوکی پر گر گئے تھے اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لئے۔ اُن کا ذائقہ نہایت لذیذ تھا۔ اُسے مشکل سے یقین آیا کہ یہ وہی روٹی تھی جو اُس نے خود اپنے ہاتھ سے پکائی ہے۔ اور ہاں! شہد کے متعلق تو ہم نے بتایا ہی نہیں کہ وہ کتنا نفیس تھا اور اُس میں سے کیسی خوشبو آتی تھی اور دیکھنے میں کسقدر خوشنما معلوم ہوتا تھا۔ اُس کا رنگ اصلی سونے کے مانند تھا اور اُس میں ہزاروں پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ مگر اِن پھولوں کی نہیں جو زمین کے باغوں میں پیدا ہوتے ہیں، بلکہ فردوسی پھولوں کی جن کی تلاش میں مکھیوں کو ضرور آسمان پر جانا پڑتا ہوگا۔ تعجب اس بات کا ہے کہ مکھیاں اُن غیر فانی، خوبصورت اور نہایت خوشبودار پھولوں کو چھوڑ کر دوبارہ بشیر کے باغ میں کیوں آجاتی تھیں۔ ویسا شہد نہ کبھی کسی نے چکھا تھا، نہ سونگھا تھا اور نہ دیکھا تھا تمام باورچیخانہ اُس کی خوشبو سے مہک رہا تھا اور خوشبو بھی اتنی تیز اور اچھی تھی۔ کہ اگر کوئی شخص وہاں کھڑا ہوکر آنکھیں بند کر لیتا تو جھونپڑی کی چھوٹی چھوٹی گرد آلود دیواریں اُس کے دل و دماغ سے فراموش ہوجاتیں اور یہ خیال کرتا کہ وہ باغ کے ایک ایسے گوشے میں ہے جہاں ہر چہار طرف چھتے ہی چھتے لگ رہے ہیں۔

گو رقیہ ایک نیک دل بوڑھی عورت تھی مگر اُس کے دل میں بھی یہ خیال آ ہی گیا کہ سب باتیں غیر معمولی طور پر وقوع پذیر ہو رہی ہیں اس لئے وہ مہمانوں کو روٹی اور شہد دیکر اور اُن کے آگے انگوروں کا ایک ایک گچھا رکھ کر بشیر کے پاس بیٹھ گئی اور جو کچھ دیکھا تھا اُسے بتایا۔

"دیکھنا تو درکنار کبھی تم نے ایسا سُنا بھی ہے؟" اس نے دریافت کیا۔

"نہیں کبھی نہیں" بشیر نے جواب دیا اور ایک خفیف سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر آگئی "میری پیاری بیوی! میرا خیال ہے کہ تمہارا دھیان کسی اور طرف ہوگا۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو ضرور لوٹے کو دیکھتا ممکن ہے کچھ دودھ رہ گیا ہو اور تم نے دیکھا ہو۔ بس۔"

"آہ۔ میرے سرتاج! جو تمہارے دل میں آئے کہتے رہو" رقیہ نے کہا "مگر یہ معمولی آدمی نہیں ہیں"۔

"اچھا! اچھا!" بشیر نے مسکراتے ہوئے کہا "شاید ہوں اور ظاہر بھی ہے کہ یہ کبھی امیر آدمی ہونگے اور مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ یہ ایسا اچھا کھانا کھا رہے ہیں"۔

ہر ایک مہمان نے اپنا اپنا انگوروں کا گچھا اٹھا لیا۔

رقیہ (جس نے اپنی آنکھیں بھی مل لی تھیں تاکہ زیادہ صاف دکھائی دینے لگے) کی رائے تھی کہ گچھے بڑے ہوگئے ہیں اور پہلے سے بہت اچھے۔ ہر ایک انگور سے الگ الگ رس بہا جاتا تھا۔ اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ اُن ناتراشیدہ بیلوں پر ایسے اچھے انگور کیسے آگئے۔

"کیا اچھے انگور ہیں!" سیماب نے اپنے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا "معزز میزبان! فرمائیے آپ یہ انگور کہاں سے لائے تھے؟"

"اپنی بیلوں سے" بشیر نے جواب میں کہا۔ "آپ اُن کی ایک شاخ سامنے کی کھڑکی سے دیکھ سکتے ہیں لیکن میں اور میری بیوی سمجھتے تھے کہ اِن میں انگور اچھے نہیں لگتے۔"

"میں نے اِن سے اچھے انگور کبھی نہیں کھائے" مہمان نے کہا "کیا آپ مہربانی فرماکر دودھ کا ایک اور گلاس عنایت کریں گے۔ اور پھر میں شہزادوں سے بہتر کھانا کھاؤنگا"۔

اِس دفعہ بشیر خود آگے بڑھا۔ جو باتیں اُسے رقیہ نے بتائی تھیں وہ اُن کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا تھا، گو وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کی بیوی کبھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔ اور جس بات کو وہ ایک مرتبہ سچ مان لے وہ کبھی غلط نہیں ہوتی، مگر یہی ایک ایسا معاملہ تھا جسے وہ اپنی آنکھ سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے لوٹا اٹھایا اور اُس کے اندر کنکھیوں سے جھانکا۔ اُسے کامل یقین ہوگیا کہ لوٹے میں دودھ کی ایک دو ہی بوندیں ہیں، زیادہ نہیں لیکن فوراً ہی لوٹے کے تلے سے ایک چھوٹا سا سفید چشمہ اُبلا اور لوٹا کنارے تک شیریں اور خوش ذائقہ دودھ سے بھر گیا۔

یہ بھی غنیمت ہوا کہ بشیر نے حیرت میں معجز نما لوٹا زمین پر نہ گرا دیا۔

"کمالات دکھانیوالے مسافرو! آپ لوگ کون ہیں؟" اُس نے اپنی بیوی سے بھی زیادہ حیران ہوکر دریافت کیا؟۔

"آپ کے دوست نیک نہاد بشیر! اور آپ کے مہمان" بڑے مسافر نے اپنی مخصوص نرم اور گہری آواز میں کہا، اور اُس کی آواز کی ملائمت سے بشیر کا خوف فوراً ہی کافور ہوگیا۔

"مجھے بھی ایک گلاس اور عنایت کیجئے۔ اور خدا کرے آپ کا لوٹا دودھ سے کبھی خالی نہ ہو۔"

کھانا کھا چکنے کے بعد مسافروں نے لیٹنے کے لئے کہا۔ بشیر اور

رقیہ یہ چاہتے تھے کہ تمام رات بیٹھے ہوئے اُن سے باتیں کئے جائیں اور جو جو عجائبات اِن میاں بیوی نے دیکھے ہیں۔ اُن کے متعلق دریافت کریں۔ مگر بڑے مسافر کا ایسا رعب پڑا کہ وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکے۔

اور جب بشیر نے سیماب کو علیحدہ لے جا کر یہ دریافت کیا کہ آسمان کے نیچے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہ ایک پرانے لوٹے سے دودھ کا چشمہ پھوٹ نکلے، تو اس نے اپنے عصا کی طرف اشارہ کیا۔

"سب کچھ بھید اس میں ہے" سیماب نے کہا "اور اگر آپ کو کچھ پتہ چل جائے تو مجھے بھی بتائیں، میں آپ کا بہت ممنون ہونگا۔ میں نہیں جانتا کہ اِس عصا میں کیا راز ہے؟ یہ ہمیشہ ایسے ہی عجیب کام کرتا رہتا ہے۔ اکثر میرے لئے کھانا لاتا ہے اور بہت دفعہ چرا لے جاتا ہے۔ اگر مجھے بیہودہ باتوں پر یقین ہوتا تو میں یہ ضرور کہتا کہ اِس عصا پر کسی جن یا جادو کا اثر ہے۔"

اُس نے اور کچھ نہیں کہا اور اُن دونوں کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ فی الفور تاڑ گیا کہ میاں بیوی، دونوں سمجھ رہے ہیں کہ وہ اُن سے مذاق کر رہا ہے۔

عصا بھی سیماب کے ہمراہ اُچھلتا ہوا باہر چلا گیا۔

بشیر اور رقیہ کچھ دیر بیٹھے ہوئے شام کے واقعات پر گفتگو کرتے رہے اور پھر فرش پر لیٹ کر گہری نیند سو گئے۔ جس کمرے میں وہ خود سویا کرتے تھے اُس میں مہمانوں کو لٹا دیا تھا اور اُن کے پاس لکڑی کے تختوں کے علاوہ کوئی بستر نہ تھا...... خدایا! وہ لکڑی کے تختے اتنے نرم ہو گئے ہوں جتنے کہ اُن کے دل۔

بوڑھے بشیر اور اُس کی بیوی کی صبح سویرے آنکھ کھل گئی۔ مسافر بھی اُٹھ بیٹھے اور چلنے کی تیاری کرنے لگے۔

بشیر نے مہمان نوازی کے طور پر کہا "آپ ذرا سی دیر اور ٹھہریں رقیہ گائے کا دودھ دوہنے گئی ہے وہ آکر آپ کے لئے روٹی پکا دیگی اور شاید ناشتے کے لئے ایک دو انڈے بھی مل جائیں"۔ مگر اُن دونوں نے اِس خیال سے کہ سورج کی گرمی سے پہلے سفر کا کچھ حصہ طے کر لیا جائے، جانے کی اجازت چاہی اور بشیر اور رقیہ کو کچھ دور اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ تاکہ وہ اُنہیں راستہ بتا دیں۔

وہ چاروں، بے تکلف دوستوں کی طرح ہنستے بولتے جھونپڑی سے روانہ ہو گئے۔ تعجب ہے کہ بوڑھا جوڑا بڑے مسافر سے بھی بے تکلف ہو گیا تھا اور اُن کی روحیں اِس کی روح میں ایسے مل گئی تھیں جیسے کہ پانی کی دو بوندیں بے پایاں سمندر میں، اور سیماب اپنی صاف، تیز اور ظریف طبیعت سے اُن کے دل کی باتیں معلوم کر رہا تھا۔ مگر بوڑھا جوڑا یہ چاہتا تھا کہ وہ اتنا حساس نہ ہوتا۔ اور اپنے عجیب اسرار عصا کو، جس پر سانپ لہرا رہے تھے کہیں دور پھینک آتا۔ لیکن پھر سیماب کوئی نہ کوئی ایسی مذاق کی بات کہہ دیتا کہ وہ اُسے اور اُس کے سانپوں والے عصا کو تمام عمر کے لئے اپنی جھونپڑی میں ٹھہرانے کو خوشی سے تیار ہو جاتے۔

"آہ۔ کیا ہی اچھا ہو" بشیر نے جب دروازہ سے تھوڑی دور چلے گئے۔ سانس کھینچتے ہوئے کہا "اگر ہمارے پڑوسیوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ مسافروں سے ہمدردی کرنے سے کیا چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ ضرور اپنے کتوں کو باندھ دینگے اور اپنے بچوں کو کبھی پتھر نہ پھینکنے دیں گے"۔

"یہ گناہِ کبیرہ ہے اور باعثِ شرم" رقیہ نے جلدی سے کہا "اور میرا ارادہ ہے کہ میں آج جا کر انہیں اُن کی بُری حالت سے آگاہ کر دوں"۔

"مجھے ڈر ہے" سیماب نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ اُن میں سے ایک کو بھی نہ پائینگی"۔

بڑے مسافر کی پیشانی پر بل آ گئے اور پسینے کے چند قطرے بھی نمودار ہوئے۔ رقیہ اور بشیر کو اتنا خوف محسوس ہوا کہ اُن کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اور وہ حیرت سے اُس کے چہرہ کو تکنے لگے۔

جب وہ غریب مسافروں سے برادرانہ سلوک کرنے کے روادار نہ تھے" بڑے مسافر نے کہا "تو وہ اِس زمین پر، جسے خدا نے انسانی ہمدردی اور محبت کا مسکن بنایا ہے، رہنے کے قابل نہ تھے"!

"اور میرے دوست! یہ تو بتائیے" سیماب نے مذاق کے پیرایہ میں دریافت کیا اور اُس کی آنکھوں میں شرارت بھری ہوئی تھی۔ "جس گاؤں کے متعلق آپ باتیں کر رہے ہیں، وہ ہے کہاں؟ ہمارے کس طرف ہے؟ مجھے تو دکھائی دیتا نہیں"۔

بشیر اور رقیہ وادی کی طرف مڑے۔ جہاں ایک دن پہلے، ہاں صرف ایک دن پہلے سورج غروب ہوتے وقت، اُنہوں نے چراگاہیں بھی دیکھی تھیں، مکانات و باغات بھی، درختوں کے جھنڈ بھی کشادہ گلیاں بھی، کھیلتے ہوئے بچے بھی، چلتے پھرتے دیہاتی بھی، اور خوشی اور خوشحالی بھی۔ اُن کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب

انہیں گاؤں کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ وہ زرخیز وادی بھی جس میں گاؤں واقع تھا، غائب تھی۔ ہر چہار طرف جھیل کا پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ اور اُس ساکن اور شفاف پانی میں آس پاس کی پہاڑیوں کا عکس پڑ رہا تھا۔ ایک لمحہ تک جھیل بالکل ساکن رہی، پھر اُس میں اُبال سا آگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پانی اُچھلنے اور چھلکنے لگا اور اُس میں سورج کی شعاعوں سے ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہوگئی۔ بوڑھے جوڑے کو محسوس ہوا کہ وہ جھیل کو وہاں سالہا سال سے دیکھتے رہے ہیں اور گاؤں کے متعلق سب باتیں اُنہیں خواب معلوم ہوئیں۔ مگر پھر اُنہیں برباد عمارتیں اور وہاں کے باشندوں کی صورتیں اور عادات و اطوار یاد آگئیں۔ یہ کوئی خواب نہ تھا۔ وہاں کل شام گاؤں بھی تھا اور گاؤں والے بھی تھے مگر اب کچھ بھی نہ تھا، صرف جھیل ہی جھیل تھی۔ بوڑھے اور نرم دل بشیر اور رقیہ نے بسورتے ہوئے کہا "اور ہمارے غریب ہمسایوں کا کیا حال ہوا"

"اب وہ انسان نہیں رہے" بڑے مسافر نے اپنی بارعب آواز میں کہا اور اُس کی آواز کے ساتھ فضا میں بہت دور گرج کی آواز سنائی دی۔ "اُن کی زندگی سے نہ کوئی فائدہ تھا نہ بھلائی۔ اُن کے دل اپنے بھائیوں کی مصیبتوں پر بھی نہ پسیجتے تھے اور اُنہیں اپنی زندگی کے سُدھارنے کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ اِس لئے وہی پہلی جھیل اُن پر پھیل گئی ہے تاکہ آسمان اُس کے صاف و شفاف آئینہ میں اپنا منہ دیکھا کرے"

"اور اُن جاہل آدمیوں کے متعلق یہ ہے" سیماب نے شرارت آمیز مسکراہٹ سے کہا "کہ وہ سب کے سب مچھلیاں بنا دئیے گئے ہیں۔ تبدیلی اُن میں بہت کم کی گئی ہے۔ کیونکہ اُن کے خون سفید ہوگئے تھے اور اُن کے دل ایسے ہی سخت تھے جیسے کہ مچھلی کی کھال۔ اِس لئے مہرباں ماں رقیہ! جب آپ کو یا آپ کے خاوند کو بھنے ہوئے گوشت کی خواہش ہوا کرے تو کانٹے ڈالکر نصف درجن اپنے پڑوسیوں کو کھینچ لیا کیجیے!"

"نہیں" رقیہ نے کانپتے ہوئے کہا "میں ہرگز ایسا نہ کرونگی۔ اپنے پیٹ کے لئے اُن کے کباب نہ بناؤنگی"

"نہیں" بشیر نے بھی ڈرتے ہوئے کہا "ہم اُنہیں کبھی نہ کھائینگے"

"نیک نہاد بشیر!" بڑے مسافر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اور مہربان رقیہ! آپ نے بے گھر مسافروں کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اور آپ ہی کی نیک باطنی کی وجہ سے دودھ نے آبِ حیات کا مزا دیا اور بھدی روٹی اور شہد نے امرت کا، آپ کی جو دلی خواہش ہو، ارشاد فرمائیے، پوری کر دیجائیگی"

بشیر اور رقیہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے، یہ بتانا مشکل ہے کہ اُن میں سے کون بولا، مگر ایک ہی نے دونوں کی دلی آرزو بیان کی۔

جب تک ہمارے دم میں دم ہے، ہم ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں اور جب مریں تو ایک ساتھ مریں۔ کیونکہ ہم ہمیشہ اپنے سے دوسرے کا خیال زیادہ رکھتے رہے ہیں"

"ایسا ہی ہوگا" مسافر نے مہربانی سے کہا "اور اب اپنی جھونپڑی کی طرف خیال کیجئے"

انہوں نے نظر اٹھائی اور سنگ مرمر کا عالیشان اور کشادہ مکان اپنی کٹیا کی بجائے دیکھکر غرقِ حیرت ہو گئے۔

"وہ آپ کا مکان ہے" مسافر نے دونوں کو محوِ حیرت دیکھکر ہنستے ہوئے کہا "اِس محل میں اُسی دل سے مہمان نوازی کیجئے، جس سے کہ کل اِس کٹیا میں ہمارے ساتھ کی تھی"

میاں بیوی شکریہ ادا کرنے کے لئے اُس کے پاؤں پر گر پڑے مگر نہ وہاں وہ تھا نہ سیماب۔

بشیر اور رقیہ اُس سنگ مرمر کے محل میں رہنے لگے، اُن کا تمام وقت چین آرام اور اطمینان میں گزرتا تھا۔ اور جو مسافر اُس طرف آنکلتا تھا اُس کی دل سے خاطر و مدارات کرتے اور اُسے ذرا بھی تکلیف نہ ہونے دیتے تھے۔ دودھ کے لوٹے میں وہی عجیب بات رہی۔ وہ کبھی خالی نہ ہوا۔ جب کبھی کوئی شریف، نیک باطن اور دیانتدار آدمی اُس میں سے دودھ پیتا تو اُسے محسوس ہوتا کہ اُس نے اِس سے اچھا، خوش ذائقہ اور تقویت بخش دودھ کبھی نہیں پیا اور اگر کبھی کوئی لالچی اور بددل آدمی پیتا تو وہ یہ اعلان کرتا کہ دودھ بہت کڑوا اور خراب ہے۔

دونوں میاں بیوی، اپنے سنگ مرمر کے محل میں رہتے رہے۔ بہت مدت رہتے رہے یہاں تک کہ وہ بے حد بوڑھے ہوگئے۔ آخرکار ایک ایسی صبح آئی جب بشیر اور رقیہ کی خوشگوار صورتیں جن پر ہمیشہ مہمان نوازی کی مسکراہٹ برستی رہتی تھی۔ غائب ہوگئیں۔ مسافروں نے اِدھر اُدھر، مکان کی چھتوں پر، تہ خانوں میں، غرضیکہ ہر جگہ اُن کی تلاش کی مگر بے سود۔ بہت جستجو کے بعد اُنہوں نے دروازے کے سامنے دو بڑے بڑے درخت دیکھے اور اُن میں سے کسی کو

بھی یہ یاد نہ پڑتا تھا کہ وہ دونوں درخت ایک دن پہلے وہاں موجود تھے۔ اُن کی جڑیں زمین میں بہت گہری جمی ہوئی تھیں اور نازک نازک شاخیں اور چھوٹے چھوٹے پتے محل پر اور دالان پر سایہ کئے ہوئے تھے۔ ایک بلوط کا درخت تھا اور دوسرا زیتون کا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اُن کی شاخیں آپس میں بہت ہی خلط ملط تھیں اور ایسے بل کھا رہی تھیں گویا کہ بغل گیر ہو رہی ہیں۔

مسافر اُن عجیب و غریب درختوں کے نیچے کھڑے ہوئے حیرت سے باتیں کر رہے تھے کہ اُن کے اُگنے اور اتنے بڑھ جانے کے لئے کم سے کم ایک صدی درکار ہے۔ ایک ہی رات میں یہ کیونکر اُگے، بڑھے، پھلے پھولے اور اتنے بڑے ہو گئے کہ بادِ صبا کا جھونکا آیا اور درختوں کی ملی جُلی شاخوں میں حرکت پیدا ہو گئی اور ایک خفیف سی آواز آئی جیسا کہ دونوں درخت سرگوشی کر رہے ہوں۔

"میں بوڑھا بشیر ہوں"، شاہ بلوط کے درخت نے کہا۔

"میں بوڑھی رقیبہ ہوں" زیتون کے درخت سے آواز آئی۔

لیکن چونکہ ہوا تیز چلنے لگی تھی۔ اس لئے دونوں درخت ایک ساتھ ہی بول اُٹھے۔ "بشیر، رقیبہ رقیبہ بشیر" گویا کہ ایک ہی میں دونوں تھے اور دونوں میں ایک، یا دوسرے معنوں میں وہ دونوں ایک قالب دو جان کی مثال تھے اور دل کی گہرائیوں میں باتیں کرنے لگے۔ بوڑھے جوڑے نے ایک نئی زندگی اختیار کر لی تھی اور اس طرح بشیر کو بلوط کی اور رقیبہ کو زیتون کی شکل میں خوشی کے ساتھ ایک صدی اور گزارنی تھی۔ اُن کا تاریک و سیاہ سایہ بھی مہمان نواز تھا جب کوئی راہ چلتا مسافر وہاں آ کر بیٹھ جاتا تو اُسے اپنے سر کے اوپر پتوں میں سے آواز آتی جو بشیر اور رقیبہ کی آواز سے بالکل مشابہ تھی۔

"خوش آمدید! خوش آمدید!! پیارے مہمان! خوش آمدید!!!"

کسی نیک دل آدمی نے اِن درختوں کے اردگرد ایک پکا چبوترا بنوا دیا جس سے بوڑھے بشیر اور رقیبہ کی روحیں بہت خوش ہوئیں۔ مدتوں تک تھکے ماندے، بھوکے پیاسے مسافر وہاں آ کر آرام کرتے اور اُس معجز نما لوٹے سے دودھ پیتے رہے۔

(ماخوذ) حمید الظفر احمد شاہ آبادی

قصرِ گیتی

(از حضرت عطاء اللہ کلیم)

سرابِ رنگ و بو ہے ایک پُر اسرار بستی ہے
جہاں کے ہر در و دیوار پر ہیبت برستی ہے

یہ سقفِ منقش، فرشِ دلکش ہے زمرد کا
مگر فطرت سکوں کو قصرِ گیتی میں ترستی ہے

کہیں ہے منظرِ عشرت، کہیں تصویرِ ناکامی
نقوشِ مختلف سے زینتِ ایوانِ ہستی ہے

ازل سے آنکھ محوِ جستجو ہے ہمنشیں، لیکن
ابھی تک صاحبِ خانہ کی صورت کو ترستی ہے

غمِ انجام سے اس قصر میں آتش بجاں ہوں میں
خدا جانے! گرفتارِ بلا یا میہماں ہوں میں

(از سر ولیم واٹسن) کلیم

اجتماعِ اضداد

اور

مرزا غالب

دنیا جسے کہتا ہے زمانہ فانی
ہے ایک طلسمِ "اجتماعِ اضداد"

وجود و عدم، امید و بیم، راحت و تکلیف، افراط و تفریط۔ نیکی و بدی اور ہاں اور نہیں وغیرہ الفاظ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی طرح خیالات و معانی بھی ایک دوسرے کی ضد ہو سکتے ہیں مثلاً یہ کہنا کہ :-

میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

یا ایسا ہی کوئی اور خیال ظاہر کرنا جس میں متضاد رعایتیں برتی گئی ہوں۔ یعنی اُس میں "اجتماعِ ضدین" ہو اور بظاہر الفاظ و خیالات ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہوں خواہ خیالات فلسفہ سے متعلق ہوں مثلاً ؎

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے "نہیں ہے"

یا علم النفس و جذبات سے مثلاً ؎

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

خواہ تنقیدِ معاشرت سے متعلق ہوں مثلاً ؎

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

خواہ محض حسنِ خیال سے مثلاً ؎

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی؛
لکھ دیجیو یا رب اُسے قسمت میں عدو کی

اندازِ بیان کی یہ شان جیساکہ متذکرۂ بالا اشعار سے ثابت کیا گیا ہماری زبان کے مایۂ ناز شاعر مرزا غالب میں بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہ ایک ایسا انداز ہے جس کو قدرت نے نظامِ عالم کے لئے منتخب کر لیا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ہر وجود عدم کی دلیل ہے۔ ہر امید کے ساتھ بیم و حرمان کی نیش زنی موجود ہے۔ ہر تکلیف راحت کی رہنما ہے اور ہر عیش میں ایک کیفِ غم پنہاں ہے۔ روزِ روشن کے بعد شبِ تاریک ہے اور ہر کمال وابستۂ زوال ہے۔ یعنی "اجتماعِ اضداد" پر تنظیمِ عالم کا دار و مدار ہے اور جسے "راحت" کہتے ہیں وہ محض "سکونِ اعتدال" ہے جو "ابتدا" اور "انتہا" کے درمیانی منازل میں سعیِ ناتمام کی ایک خوشگوار کیفیت کے سوا کچھ نہیں۔ غرض ؎

یاں ہوش سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا
اُس بزم میں ہشیار ہوا بھی نہیں جاتا

شعرائے اردو میں میرؔ صاحب کا کلام نہایت سادہ اور نازک ہوتا ہے۔ مومنؔ کے کلام میں طنز غالب ہے اور اکبرؔ الہ آبادی کی شاعری چونکہ تنقیدِ معاشرت پر وقف ہے۔ اِس لئے اُس کو "ہجوِ ملیح" (parody) پر مبنی سمجھنا چاہیئے۔ اِسی طرح غالبؔ کے کلام میں "اجتماعِ اضداد" (Complexity of Extremes.) ہے کیونکہ دیوانِ غالبؔ میں شاید ہی کوئی ایسا شعر ملے جس میں متضاد رعایتیں نہ موجود ہوں۔ یا جس میں ایک قسم کا تضادِ ملیح نہ پایا جاتا ہو۔ خواہ ایک خیال دوسرے خیال کی ضد ہو یا ایک لفظ، ایک فقرہ یا ایک مصرعہ دوسرے لفظ، فقرہ یا مصرعہ کی ضد ہو۔ شعر میں "اجتماعِ اضداد" ضرور ہوگا ؎

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

غرض "اجتماعِ اضداد" سے وہ خاص قسم کا اندازِ بیان مراد ہے۔ جس میں بظاہر متضاد رعایتوں کی زیادتی پائی جاتی ہو۔ مرزا صاحب نے (۱) بہ اعتبارِ اندازِ بیان لفظی نکتوں میں (۲) اور بہ اعتبارِ اظہار

خیال معانی و مفہوم میں متضاد رعائتیں رکھی ہیں جن کی مثالیں ذیل میں لکھی جاتی ہیں۔

(۱) اندازِ بیان میں متضاد ترکیبیں بالکل مخالف مفہوم رکھنے والے فقروں اور الفاظ سے ظاہر کی گئی ہیں مثلاً :۔ درد کا دوا ہونا، مشکل کا ذریعۂ آسانی ہونا۔ مرنے سے جینے کا لطف ثابت کیا جانا وغیرہ حتیٰ کہ اشعار میں الفاظ کی ترکیبیں بھی اسی انداز پر شاہد ہیں ؎

سفینہ جبکہ کنارے پہ آلگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

عشق و عاشقی کی داستان ہی عموماً رنگِ تغزل کی جان ہے اور شکوہ و شکایت سے اس میں ایک نرالی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ ذرا اشعارِ ذیل میں شکوہ و شکایت کی دلفریبیاں ملاحظہ ہوں۔ اور یہ کہ ایک مصرعہ دوسرے مصرعے کی ضد ہے۔ گویا ہر شعر ایک ترازو ہے اور دونوں مصرعے ترازو کے دو پلے جن میں نیکی و بدی کی طرح متضاد مفہوم رکھنے والے الفاظ وزن کئے گئے ہیں اگرچہ اس موازنہ سے محض شکوہ و شکایت مقصود ہے ؎

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں سرِ پرشور بے خوابی سے تھا دیوار جُو
واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

اسی طرح سینکڑوں اشعار رنگ تضاد میں ڈوبے ہوئے معلوم ہونگے۔ ذیل میں بہت زیادہ نمایاں اشعار کا انتخاب کیا جاتا ہے :۔

(۱) قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

(۲) بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

(۳) زخم گر دب گیا لہو نہ تھما ؛
کام گر رک گیا روانہ ہوا ؛

(۴) گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

(۵) پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

(۶) رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

(۷) ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی ؛

(۸) مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی ؛

(۹) ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

(۱۰) مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

(۱۱) ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

(۱۲) عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

مندرجۂ بالا اشعار اور اُن کے مفہوم میں بظاہر کوئی نہ کوئی تضاد ضرور ہے۔ اسی بنا پر اکثر نقادانِ سخن غالبؔ کو "انتہا پسند" بتلاتے ہیں۔ لیکن باعتبار اظہارِ حقیقت مرزا صاحب نے ہر انتہا کو اعتدال کے ماتحت رکھا ہے۔ اور یہ ثابت کر کے دکھلایا ہے کہ ہر انتہا میں کوئی نہ کوئی ابتدا پنہاں ہوتی ہے اور ہر ابتدا دلیلِ انتہا ہے۔ مثلاً یہ کہ ہمارا وجود فنا کی دلیل ہے :۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

یا یہ کہ ہر مایوسی میں امید پنہاں ہے :۔

کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

سلہ "عیش مایوسی اور غالب"

یا یہ کہ موت ہی سے زندگی کا لطف ہے۔ یعنی موت کا خیال ہی دنیا میں ہمارے کاموں کا محرک ہے اِس لئے :-

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

چنانچہ ایسی ہی متضاد ترکیبوں سے غالب نے نہایت مشکل اور پیچیدہ حقائق پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس قسم کی مثالوں سے غالب کا پورا دیوان مملو ہے مثلاً :-

(۱) ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں۔
(۲) ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں
(۳) نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی
(۴) مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیئے۔
(۵) دشوار۔ تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

علیٰ ہٰذالقیاس اِن متضاد رعایتوں کو خواہ "اجتماعِ اضداد" کہئے یا "جدتِ مبالغہ" سے تعبیر کیجئے ہر حال اِن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی حقیقتِ پنہاں کی تفسیر ہے۔

(۲) یہ اعتبارِ خیال آفرینی و فلسفہ غالب اخلاقِ مسیحی کے پیرو ہیں۔ اور اُن کا فلسفہ برکلے کے فلسفہ پر مبنی ہے۔ فلسفۂ اخلاق (ETHICS) کے اعتبار سے غالب "اجتماعِ اضداد" کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے متضاد طرزِ بیان میں یہ کہتے ہوئے نظر آئیں گے :-

جو مدعی بنے اُس کے نہ مدعی بنئے
جو نا سزا کہے اُس کو نا سزا کہئے

اور مواعظ نہایت سادہ اور فصیح ہونگے جن میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں مثلاً ؎

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی
جب توقع ہی مٹ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

جس طرح برکلے کہتا ہے کہ عالم محض "نقشِ خیال" ہے۔ اِسی طرح مرزا صاحب بھی فرماتے ہیں کہ "عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے"۔ برکلے کہتا ہے کہ کوئی شے انسان کی نظروں میں ہمیشہ یکساں نظر نہیں آتی۔ اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے مگر دراصل وہ نہیں ہوتی۔ غالب کا شعر ہے ؎

در ہر مژہ برہم زدن ایں خلق جدید ست
نظارہ شناسد کہ ہماں است ہماں نیست

اور اسی مفہوم کو لئے ہوئے غالب کا یہ دوسرا شعر ہے ؎

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے۔ نہیں ہے

یہ بھی بظاہر ایک قسم کا "تضادِ ملیح" ہے۔ یعنی جو چیز نظر کے سامنے ہو اس کو یہ کہنا کہ نہیں ہے۔ بالکل ایک ایسی بات ہے جو بظاہر مہمل ہو۔ مگر حقیقتاً ایسا نہیں۔

میر صاحب کی طرح غالب نے بھی دنیاوی زندگی کو ازل و ابد کے درمیان ایک منزل مانا ہے۔ میر صاحب کہتے ہیں ؎

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

مرزا صاحب کسی قدر اختلاف کے ساتھ موت کو زندگی اور زندگی کو موت کی دلیل سمجھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہمارا وجود فنا کی دلیل ہے۔ یعنی ―

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اور چونکہ ہر انتہا سے کسی نہ کسی قسم کی ابتدا کا وجود ضروری ہے اس لئے فنا کے بعد پھر بقا ممکن ہے :-

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

اس طرح مرزا صاحب اپنی ہمت عالی میں میر صاحب سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ لیکن میر و مرزا دونوں نے تسلیم کیا ہے کہ مقصدِ وجود محبت ہے۔ اس کو بھی مرزا صاحب اپنے متضاد انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

غرض مرزا کی دشوار پسندی، دقتِ نظر، فلسفہ پردازی، دقیق ترکیبوں اور عجائب لغات کا بہت کچھ راز اُن کے مخصوص اندازِ بیان یعنی "اجتماعِ اضداد" میں پنہاں ہے۔ "اجتماعِ اضداد" کی کسی ایک چیستاں کو لیجئے اور متضاد الفاظ کو الگ الگ کر کے معانی و خیالات

کو بھی فرد فرد کر لیجے تو "گنجینۂ معانی" کا طلسم[1] بالکل ٹوٹا ہوا نظر آئیگا۔ اور معلوم ہوگا کہ مرزا نے متضاد ترکیبوں میں کوئی نہ کوئی ایسا "پیام غیب" پنہاں کر رکھا تھا۔ جس میں اگرچہ بظاہر ایک "کیف مایوسی" شامل ہے مگر وہ دراصل "ہمت افزائی" اور "امید افزائی" کا شاہکار اور "عیش روحانی" کا حامل ہے۔

غالب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور نہیں معلوم کہ "گنجینۂ معانی" سے آئندہ کتنے بنوع بنوع جواہرات اور بھی حاصل کئے جائیں مگر "اجتماع اضداد" اہل نظر کی نگاہوں میں بالکل ایک نئی تحقیق ہے۔ امید تو ہے کہ کلام غالب سے ذوق رکھنے والے احباب اور غالب کی شاعری پر دات رات بھر غور و خوض کرنے والے طالب علم مرزا کے اندازِ بیان یا اسٹائل کی اس کار آمد تحقیق سے بھی بے خبر نہ رہیں گے۔

سید مقبول حسین احمد پوری

[1] خود غالب کا شعر ہے ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اسکو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

عظمتِ ایثار

یوں کرمکِ شب تاب بھی ہے شعلہ بداماں — جو کود پڑے آگ میں پروانہ وہی ہے
ہونے کو تو دیوانوں سے معمور ہے دنیا — لیلیٰ کو جو محبوب ہو دیوانہ وہی ہے
لاحق نہ جسے عشق میں ہو فکرِ پس و پیش — دانائے خرد ہے وہی، فرزانہ وہی ہے
جو مردِ وفا آگ میں غیروں کی بھی جل جائے — شمع رخِ محبوب کا پروانہ وہی ہے

دل ہی نہیں جو درد کی تصویر نہ بن جائے!
ہو صید کوئی خود ہدفِ تیر نہ بن جائے!

اللہ کے بندوں سے نہیں جس کو محبت — اللہ کی الفت کا سزاوار نہیں ہے
اس چشم سے نکلیں گے کہاں گوہرِ الفت — غیروں کی مصیبت میں جو خونبار نہیں ہے
کمزور کے آگے جسے جھکنا نہیں آتا — وہ مجرمِ اخلاق ہے خوددار نہیں ہے
پائیگا وہ کیا دولتِ یزداں کے خزانے — جس دل میں غریبوں کیلئے پیار نہیں ہے

جو مستِ مئے الفتِ نوعِ بشری ہیں
اللہ کے دربار میں مقبول وہی ہیں

روش صدیقی

مصر قدیم کی حیاتِ اجتماعی

زمانۂ قدیم میں مصر والے حسن و جمال کی پرستش، آرائش و زیبائش کے ساتھ شغف، اپنی سحر آموز موسیقی، لطیف اور دلکش رقص، فرحت انگیز عطر، مدرج پھول اور ویات بے نظیر مجسمہ سازی، عیش کوشی، تصویر کشی اور سنگ تراشی کی وجہ سے تمام دنیا میں امتیاز خصوصی کے سرمایہ دار تھے۔ زمانۂ قدیم میں ان کے ارتقا کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے عورت کو نہایت بلند اور رفیع مرتبہ عطا کیا تھا۔ عورت تمام اُن امتیازات اور حقوق سے متمتع ہوتی تھی جو مردوں کو حاصل تھے۔ مصریوں کا عورتوں کے ساتھ یہ سلوک اُس زمانہ کے یونانیوں کے طریقہ سے قطعاً مخالف تھا۔ یونانیوں نے مرد کے مقابلہ میں عورت کو بہت پست اور ذلیل مرتبہ سمجھا تھا۔ حق تو یہ ہے کہ اُس زمانہ میں جب دُنیا تہذیب و تمدن کے نام سے ناآشنا تھی عورتوں کے ساتھ مصریوں کا سلوک بیحد تعجب انگیز ہے۔ یونانی خود اعتراف کرتے ہیں کہ مصر قدیم کی عورت ایسے عظیم و رفیع مرتبہ پر پہنچی ہوئی تھی کہ مرد شادی سے قبل عورت کو اپنی اطاعت اور محبت کا یقین دلانے پر مجبور ہوتا تھا۔ غریب اور امیر ہر شخص صرف ایک ہی عورت کو اپنا شریک حیات بناتا تھا۔ وہ عورت کو ہر حیثیت سے مرد کے مساوی سمجھتے تھے۔ شاہی فرامین، معاہدات اور حکومت کے تمام احکام پر شاہ کے نام کے ساتھ ملکہ کا نام لکھنا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ جب بادشاہ فوت ہو جاتا تھا تو ملکہ اس کی جگہ حکمران تسلیم کیجاتی تھی۔ چنانچہ مصر کے تختِ حکومت پر بہت سی عورتیں فائز ہوئی ہیں اور اُنھوں نے انتہائی ہوشمندی اور دانائی سے فرائضِ حکومت انجام دئے۔

قدمائے مصر آجکل کی طرح اپنی نسبت باپ کی طرف نہیں کرتے بلکہ ماں کی طرف کرتے تھے۔ زمین کی مالک صرف عورت ہوتی تھی۔ اور اسے کُل اختیار حاصل ہوتا تھا کہ وہ اپنے ترکہ کے لئے جس کے حق میں چاہے کر جائے۔ موجودہ زمانہ کے اجتماعی فیصلے کے خلاف ان کا عقیدہ تھا کہ بھائی بہن کی شادی جائز ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آجکل یہ بات بہت مذموم نظر آتی ہے لیکن تاریخ کے حقایق کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اس قسم کی شادیوں کا طریقہ عام طور پر رائج تھا۔ . . . .

اُس زمانہ کے تمام واقعات شاہد ہیں کہ عموماً ان کی حیات زوجیہ نہایت مبارک و مسعود ثابت ہوتی تھی۔ عورتیں سیرگاہوں اور شکارگاہوں میں اپنے شوہروں کے ساتھ جایا کرتی تھیں۔ زمانۂ قدیم کی اکثر تصاویر میں دکھا جاتا ہے کہ عورت اپنے شوہر کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ہے چھوٹے چھوٹے بچے ان کے قدموں میں بیٹھے ہوئے ہیں اور شیرخوار بچہ ماں کے کاندھے سے لپٹا ہوا ہے یا بڑا بیٹا باپ کے برابر بیٹھا ہوا ہے۔ یہ ایک خاندان کے اتحاد و محبت اور اُس کے افراد کے ارتباط کی حقیقی صورت ہے۔ گھر والے ایک دوسرے کو ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ پکارتے تھے مثلاً کہتے تھے "ننھے محبوب"، "لطیف محبوبہ"، "جانِ عشق" وغیرہ۔ یہ پیار، یہ محبت اور یہ اُلفت ایک خاندان کو بالکل متفق اور متحد بنا دیتا تھا۔ قدمائے مصر کا ایک مصنف لکھتا ہے کہ

"مرد کے لئے اس کے گھر سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہیں"

"عقلمند نوجوان وہ ہے جو اپنے نفس کے لئے ایک گھر بنائے اور اپنی زوجہ کے ساتھ محبت کرے"

ایک مصری باپ کا سب سے بڑا فرض یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنا گھر بیٹے کے لئے چھوڑ جائے۔ اور اپنی حرفت اسے سکھا جائے۔

اگر بیٹا اپنے ضعیف باپ کی اعانت نہ کرنا چاہے۔ یا اس کی مساعدت پر قادر نہ ہو تو قانون یہ فرض لڑکی پر عائد کر دیتا تھا کہ وہ اس کی کفالت اور اعانت کرے۔ اگرچہ بظاہر یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے لیکن جب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہی باپ کے متروکہ کی حقیقی وارث ہوتی تھی تو یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ضعیف باپ کی خدمت کا مطالبہ بھی قانوناً اس سے کیا جا سکتا ہے۔ البتہ بیٹا بعض دوسرے امور کا ذمہ دار تھا۔ مثلاً اُس کا فرض تھا کہ وہ باپ کے ذکرِ جمیل کو ہمیشہ قائم رکھنے کی کوشش کرے، مذہبی مراسم ادا کرے، ضروری قربانیاں دے اور اُسے اپنے خاندان کے قبرستان میں دفن کرے۔ جو بیٹا ان تمام واجبات کو ادا کر دیتا تھا اور اپنی ماں سے محبت اور اخلاص کا معاملہ کرتا تھا۔ وہ بہت سعادت مند اور نیک بخت سمجھا جاتا تھا۔

وہ منظر بھی کتنا پیارا ہوتا تھا۔ جب باپ اپنے بیٹے کو اپنی آخری ساعتوں میں نصیحت کرتا تھا کہ

"میں نے تمہاری ماں کو تمہارے سپرد کیا، اس نے تمھیں اپنے بطن

میں رکھا' ——— تمہارے لئے طرح طرح کے مصائب برداشت کئے" اس نے تمہیں مدرسے میں داخل کیا تاکہ تم علم حاصل کرو' وہ ہر روز مدرسہ میں تمہارے لئے کھانے پینے کی اچھی اچھی چیزیں بھیجتی تھی' اور جب تم بڑے ہوئے تو اس نے تمہارے لئے اچھی بیوی تلاش کر کے اس سے تمہاری شادی کر دی۔

لہذا اب جبکہ تم متاہل ہو گئے اور اپنے گھر کے سردار بن گئے تو تمہیں اپنی اس ماں سے کبھی آنکھیں نہ پھیرنی چاہئیں جس نے تمہیں جنا۔ اور نہ اپنی بیوی سے بیمروتی اور نامہربانی کا برتاؤ کرنا چاہیئے جس نے اپنی تمام خواہشات تمہاری مرضی کے تابع کر دیں۔ ان دونوں میں سے کسی کو بھی زجرو توبیخ نہ کرو۔ تاکہ وہ تمہارے لئے کبھی بددعا نہ کرے۔

ماں اپنے بچوں کی تربیت کرتی تھی اور ایام طفولیت میں انہیں تعلیم دلاتی تھی۔ وہ تمام متاع کا وارث اپنی بڑی بیٹی کو قرار دیتی تھی۔ باپ اپنے بچوں کو ادب و تہذیب سکھاتا تھا۔ اور اپنے بڑے بیٹے کو اپنی صنعت کی تعلیم دیتا تھا۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ایک خاندان کے افراد کتنی مضبوطی کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہونگے۔ یہ وابستگی صرف رشتۂ محبت ہی کے ذریعہ نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ اُن کے فرائض اور ذمہ داریاں بھی ایسی تھیں جن سے ارتباط کا پیدا ہونا لازمی تھا۔

قدمائے مصر اپنی صبح کی قیمتی ساعات کو کھلے میدانوں' صاف ستھری ہوا' سرسبز و شاداب باغات اور فرحت افزا مقامات میں صرف کرتے تھے۔

عام طور پر مکانات میں بہترین قسم کی قلعی کرنے اور اعلیٰ قسم کے روغنوں سے اُن پر خوشنما بیل بوٹے بنانے کا رواج تھا۔

ایک شریف آدمی کا مکان مندرجۂ ذیل مکانیت پر مشتمل ہوتا تھا۔

اہل خاندان کے رہنے کے مکان' چوپایوں اور جانوروں کے مکان' غلہ رکھنے کے مکان' مہمان خانہ' ملاقات کا کمرہ' حیوانات کی تربیت گاہ' خدام اور ملازمین کے رہنے کے مکانات' مختصر یہ کہ اس کی ذات کے ساتھ ایک اچھا خاصا قریہ آباد ہوتا تھا۔ چنانچہ آمتن کا قصر جو جنوبی مصر کا ایک امیر تھا" مربع شکل کا ہے۔ اور اس کے ایک ضلع کی لمبائی تین سو قدم ہے۔ زمانۂ قدیم میں بعض مکان لکڑی کے بھی ہوتے تھے۔

مکانوں میں بہترین قسم کا قیمتی اثاثہ جمع کیا جاتا تھا چنانچہ سونے کے کمرہ میں خوبصورت تخت' آرام دہ اور خوشنما بستر' قیمتی قالین جو زمین پر بچھائے جاتے تھے یا ان سے دیواروں کو مزین کیا جاتا تھا۔ انواع و اقسام کی عمدہ عمدہ کرسیاں' اطلس و دیبا کے نرم نرم گاؤ تکئے' دروازوں پر حریر وغیرہ کے پردے' سونے چاندی کے ظروف' ہاتھی دانت کے صندوق قد آدم آئینے جن کے چوکھٹے سونے یا چاندی کے ہوتے تھے' زنگار رنگ عطر دان کے قرابے' اور اسی طرح کی دوسری بیشمار چیزوں کا ہونا ضروری تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ آج مصری خاتون جس تہذیب و ترقی کی مالک ہے اب سے ہزاروں سال پہلے کی مصری عورت بھی اس سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اور مصر کا موجودہ تمدن جسے مغربی تمدن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ زمانۂ قدیم کے تمدن سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے۔ بلکہ زندگی کے بہت سے شعبوں میں تو قدیم تمدن جدید تمدن سے کہیں آگے تھا +

بچوں کی تعلیم

زمانۂ قدیم میں مصریوں کا یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی بچہ اپنی عمر کے چوتھے سال میں قدم رکھتا تھا اس کے والدین اسے کسی مدرسہ میں داخل کر دیتے تھے۔ بچہ کو صرف اتنا لباس پہنایا جاتا تھا کہ جس سے اس کا جسم چھپ سکے۔ اس کے کالے کالے بال داہنے کان پر گندھے ہوئے لٹکتے رہتے تھے۔

بچہ کو سب سے پہلے مدرسہ میں لکھنا اور پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔ اس امر کا بہت خیال رکھا جاتا تھا کہ اس کی عقل پر کسی طرح کا بار نہ پڑے کیونکہ مصر کا قدیم رسم الخط بہت مشکل تھا۔ طالب علم کے لئے ضروری تھا کہ وہ مصر کے دونوں رسم الخطوں کو اچھی طرح سمجھ لے اور ان کے فرقوں کو یاد رکھے۔ یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ قدمائے مصر کے جو مخطوطات ہمارے ہاتھ آئے ہیں ان میں سے ہر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اور جو شخص ان مخطوطات کو زیادہ کاوش کے ساتھ دیکھے گا اسے معلوم ہوگا کہ اساتذہ جب شاگردوں کی کاپیوں پر اصلاح کرتے تھے تو پہلے خود کسی دوسری چیز پر لکھ کر دیکھ لیتے تھے اس کے بعد شاگرد کی کاپی یا تختی پر بین السطور میں لکھتے تھے۔ کافی تحقیق کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ ان کی اکثر تجویزیں حکمائے قدیم کے فلسفہ اور ماضی بعید کے قصہ کہانیوں کے متعلق ہوا کرتی تھیں۔

بچے مدرسہ کے نام سے کانپتے تھے اور اوقات مدرسہ کو نہایت بیم و ہراس کی حالت میں گذارتے تھے کیونکہ وہاں مدرس کو بہت مارا کرتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ سے یہ مثل مشہور ہے کہ طالب علم کے کان اس کی پشت پر ہوتے ہیں اور وہ بغیر پٹے کچھ سنتا ہی نہیں ہے۔

ایک نوجوان نے اپنے اُستاد کو اس کے احسانات کے شکریہ میں لکھا ہے۔

کہ جب میں بچہ تھا۔ آپ نے اپنی بیش بہا معلومات سے مجھے مالا مال کردیا۔ بالخصوص آپ کی ضربات نے مجھے معارف علیہ سے سیراب ہونے میں بڑی مدد دی۔

جب کسی استاد کو یہ معلوم ہوجاتا تھا کہ فلاں [illegible] اس قدر سرکش ہے کہ اس پر کوڑوں کی مار کا کوئی اثر ہی نہیں [illegible] اس کے ساتھ نہایت سخت اور لرزہ براندام کردینے والا معاملہ کیا جاتا تھا۔

اس تشدد کا فائدہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ دوسرے [illegible] اور سرکش طلبہ اس سے عبرت اندوز ہونگے۔

دوپہر کے وقت مدارس میں چھٹی ہوجایا کرتی تھی۔ اس وقت طلبہ پر بہجت و سرور کی ایک عجیب کیفیت مستولی ہوتی تھی۔ اور یہ اس بات کی دلیل تھی کہ اب انھیں مدرسہ کا کوئی کام گھر پر کرنا باقی نہیں ہے۔ اس پر ہم قیاس کرسکتے ہیں کہ سخت سزاؤں کی وجہ سے ان مدارس کی بدحالی کا جو قیاس ہم نے کیا تھا وہ صحیح نہ تھا۔

جب طالب علم کا خط پختہ اور عمدہ ہوجاتا تھا تو استاد اُسے عصر حاضر کی بہترین کتابوں سے مختلف قطعات لکھنے کے لئے دیتا تھا۔ اس طریقہ کو اختیار کرنے سے اُستاد کی دو غرض ہوتی تھیں۔ اول یہ کہ طالب علم کا خط خوبصورتی اور حُسن کے انتہائی مراتب پر پہنچ جائے۔ دوسرے یہ کہ وہ قدما کے بہتر اسلوب تحریر سے واقف ہوکر اپنے طرز نگارش کو بہتر بنا سکے۔ دلکش الفاظ چست ترکیبوں کے استعمال پر قادر ہوسکے۔ یہی وجہ تھی کہ اُستاد کبھی تو شاگرد سے کسی دینی کتاب کی عبارت نقل کرواتا تھا اور کبھی اُستاد قصّے لکھنے کے لئے دیتا تھا۔ کیونکہ زمانۂ قدیم میں مصری افسانوں اور قصوں سے بے انتہا شغف رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وضع قصص کی اولیت کا فخر مصریوں کو حاصل ہے۔

تجربہ سے یہی ثابت ہوا کہ ان قطعات کے نقل کرنے سے طلبہ کا خط [illegible] اچھا ہوجاتا تھا اور ان کی عقل و خصائل حمیدہ بھی تجلی ہوجاتے تھے اور ان کی معلومات میں نہایت گراں قدر اضافہ ہوجاتا تھا۔

بسا اوقات اُستاد اپنے شاگردوں کو ایسی نصیحتیں سنایا کرتا تھا جو کسی [illegible] بادشاہ نے اپنے ولی عہد کو کی ہوں۔ یا اُس کی کتاب سے اس قسم کی باتیں پڑھ کر سُنا تا تھا۔

کبھی اُستاد شاگرد سے کہتا تھا کہ یہ فرض کرکے کہ تمھارا اُستاد کسی دور دراز مقام پر مقیم ہے اسے ایک خط لکھو۔ اس قسم کے خطوط میں طلبہ نہایت وقیع اور قوی آرا، و امثال کا اظہار کیا کرتے تھے۔

جب طالب علم کا خط درست ہوجاتا تھا تو اسے حساب بھی سکھاتے تھے لیکن اس وقت تک حساب کے بہت ہی کم قاعدے لوگوں کو معلوم تھے۔ صرف جمع، تفریق اور ضرب کی تعلیم نہایت اختصار کے ساتھ دیجاتی تھی۔ تقسیم کا طریقہ نہیں پڑھایا جاتا تھا کیونکہ اساتذہ اس سے خود بھی نابلد

تھوڑی سی مساحت کی تعلیم بھی دیجاتی تھی۔ ابتدائی تعلیم مدارس کی یہاں پہونچکر ختم ہوجاتی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بچوں کی تعلیم کی نوعیت ان اعمال پر موقوف ہونی چاہیئے جن سے اسے مستقبل میں سابقہ پڑنے والا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کاتب عمومی ہونے کا ارادہ رکھتا تھا تو اُسے لکھنا، پڑھنا اور حساب کتاب جاننا ہی کافی تھا اور اس سے زیادہ معلومات کی اسے ضرورت نہ تھی۔ لیکن جو شخص یہ چاہتا تھا کہ اسے کوئی فوجی عہدہ ملجائے اُس کے لئے ضروری تھا کہ کسی مدرسۂ حربیہ میں داخل ہوکر خاص طور پر اس فن کی تعلیم حاصل کرے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ مذہبی ذمہ داریوں کا بار اُٹھائے تو اس کے لئے لازم تھا کہ کسی دینی درس گاہ میں داخل ہوکر علوم دینیہ کی تحصیل کرے۔

قدمائے مصر صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے تھے کہ بچے ابتدائی یا اعلیٰ تعلیم سے فارغ ہوجائیں۔ بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت سی ایسی چیزیں تھیں جن کو بچوں کے ذہن میں راسخ کرنے کے لئے وہ انتہائی کوشش کرتے تھے۔ مثلاً بڑوں کا احترام کرنا، آداب مجلس کا سیکھنا، والدین کے حقوق کو پہچاننا وغیرہ +

عبدالوحید صدیقی

خمیدہ درخت

دو گھنٹے کے سفر کے بعد سرو قد درختوں اور گھنی جھاڑیوں نے میری توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور میرے دل میں درختوں کے سائے میں آرام لینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ میں ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں تھا۔ نصف گھنٹے کی چڑھائی کے بعد مجھے ایک میدان نظر آیا۔ میں آگے بڑھا تاکہ کسی نہایت ہی دلفریب مقام پر بیٹھکر اپنے دل کی کلفتوں کو دور کرسکوں۔ مجھے ایک خمیدہ درخت نظر آیا۔ پہاڑی کے دامن میں ایک دریا مرغزاروں میں بہتا ہوا دور نیلے افق میں گم ہو گیا تھا۔ وہاں تمدن کا نام ونشان نہ تھا۔ کہیں کہیں جگہ گاؤں میں پرندوں کے گھونسلے نظر آتے تھے۔ پتوں کی سرسراہٹ۔ مکھی کی بھنبھناہٹ اور مرغزاروں میں مویشیوں کی آواز اس جگہ کے سکوت کو توڑ رہی تھی۔

میں اس خمیدہ درخت کے تنے پر بیٹھ گیا۔ اور گرد ونواح پر ایک نظر ڈالی تو مجھے معاً خیال ہوا کہ یہ جگہ ضرور قدیم دیوتاؤں کا مسکن ہوگی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میری نگاہ ایک سفید مربع کاغذ پر جا پڑی جو درخت کے ساتھ چسپاں تھا۔ میں نے جو غور سے دیکھا تو اس پر سیاہی سے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:۔

"کھانا کھانے کے لئے گھر جا رہا ہوں۔ بیس منٹ کے اندر واپس آجاؤں گا۔"

اگر کوئی شے میرے لئے باعث رنج ہوسکتی ہے تو وہ اُن لوگوں کے افعال ہیں جو قدرتی اشیاء کو بدنما کرتے ہیں۔ لیکن جب میں نے دفتری ضابطے کی ایک یادگار اس دلفریب جگہ پر درخت کے ساتھ چسپاں دیکھی تو میرے دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ کسی چالاک اور ہوشیار ظریف کا فعل ہے۔

اِس فقرہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی شخص اس جگہ اپنا دنیاوی کاروبار سرانجام دیتا ہے اور اس کا وقت نہایت قیمتی ہے۔ چائے کی ایک پیالی پینے کے بعد اپنے کام میں مشغول ہو جاتا ہوگا۔ مجھے اسقدر ہنسی آئی کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی ایسا رفیق ملجائے جو میرے ساتھ بیٹھے اور خوب زور سے ہنسے۔ میں نے دوبارہ اِس کاغذ کو دیکھا وہ الفاظ بالکل صاف تھے۔

اب میں سوچنے لگا کیا وہ ستم ظریف اب لوٹے گا؟ کیا واقعی یہ کاغذ کچھ حقیقت رکھتا ہے؟۔ آخر میں نے ارادہ کیا کہ اُس مقررہ وقت تک یہاں انتظار کروں اور میں خمیدہ درخت کے تنے پر لیٹ گیا اور سگرٹ جلا کر اس منظر کی خاموشی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ ابھی بمشکل دس منٹ گزرے ہونگے کہ کسی آدمی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ اُس کا قد درمیانہ تھا۔ چہرہ پژمردہ۔ اور آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اُس کا کوٹ لمبا اور ٹوپی گول تھی۔ وہ شاخوں کو ہٹاتا ہوا جلدی جلدی درختوں کے درمیان قدم اٹھاتا تھا۔ اُس نے اُسی جگہ پہنچ کر ٹوپی اتاری اور ایک اضطراب کے ساتھ کسی کیل کا متلاشی ہوا۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے۔ کہ میں نے آپ کو بہت دیر تک زحمت انتظار نہیں دی۔

میں نے کہا "ہرگز نہیں"

اس نے پوچھا۔ "کیا آپ کو مسٹر رشید نے یہاں بھیجا ہے"؟

میں نے نیچے اترتے ہوئے جواب دیا "نہیں" میں یونہی ادھر نکل آیا تھا"

اُس کے چہرے پر ایک نا امیدی کا سا رنگ جھلکنے لگا۔

اُس نے کہا "مسٹر رشید اور اُس کے احباب سے میرے تعلقات ہیں کیا آپ ان لوگوں کو جانتے ہیں جو ممتاز منزل میں رہتے ہیں"؟

میں جانتا تھا کہ ممتاز منزل کوئی دو میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں عظیم الشان کوٹھی ہے۔ اُس گاؤں میں تقریباً پچاس ست آدمی رہتے تھے۔

میں نے جواب دیا۔ "جی"

وہ چند لمحوں تک میری طرف دیکھتا رہا پھر اُن گھنی جھاڑیوں کے قریب جا کر وہ نیچے جھکا اور غور سے دیکھکر ایک پتھر اٹھایا جس کے نیچے سے اُس نے کاغذوں کا ایک پلندا نکالا۔ پھر بولا "معلوم نہیں آپ میری مدد کرسکتے ہیں یا نہیں......... از راہ کرم ایک سگرٹ عنایت کیجئے۔

میں نے اپنا سگرٹ کیس نکالا اور اُسے ایک سگرٹ دیا۔

اس نے کہا شکریہ۔ گھر میں میری سگرٹ نوشی پسندیدگی کی نظر سے دیکھی نہیں جاتی۔ یہ کہکر اُس نے شمال کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے

اس فرش [illegible] میں سے سرخ اینٹوں کی ایک عالیشان عمارت نظر آئی۔

میں نے چند لمحوں کے بعد کہا۔ "یہ نہایت خوشگوار جگہ ہے۔"

ان الفاظ نے میرے ساتھی پر حیرت انگیز اثر کیا۔ وہ ایک شکستہ ٹہنی پر بیٹھ گیا اور غیظ و غضب کی حالت میں ہزاروں صلواتیں سنا ڈالیں۔

"میں اس مقام سے نفرت کرتا ہوں۔ دن رات یکساں ہیں۔ درخت اور مرغزار ایک ہی حالت میں رہتے ہیں۔ کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ میرے لئے اس میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔" میں ہمہ تن گوش رہا۔ آخر کچھ دیر کے بعد وہ اٹھا اور سگرٹ کے متعدد کش لگا کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ کبھی کبھی وہ کھڑا ہو جاتا اور ان جھاڑیوں سے اشارۃً گفتگو کرنے لگتا۔

آخر اس نے میری طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھا اور اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ اس نے غم انگیز آواز سے کہا۔ "میں نے تیس سال ایک غلام کی طرح کام کیا ہے۔ اور لوگ بھی اسی طرح کام کرتے ہیں مگر بالکل تندرست ہیں۔ میں بدنصیب ہوں۔ میں اب بھی کام کر سکتا ہوں۔ اور اس غرض سے یہاں آتا ہوں۔ اس کام میں مسٹر رشید میری مدد کرتے ہیں۔ وہ گاہکوں کو میرے پاس بھیجتے ہیں۔ اور کیا آپ جانتے ہیں۔" اس نے رازداری کے لہجہ میں آہستہ سے کہا۔ "میں نے ایک چٹھی رساں مقرر کر رکھا ہے جو میری چٹھیاں یہاں پہنچا جاتا ہے۔ یہ میری ڈاک کا صندوق ہے۔" وہ نیچے جھکا اور ایک بڑا پتھر اٹھایا۔ "آپ کوئی حصہ خریدنا چاہیں تو میں کوشش کر سکتا ہوں۔"

وہ میری طرف نہایت متردد نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اور جب میں نے اس سنہری موقعہ سے فائدہ اٹھانے سے انکار کیا۔ اس نے ایک آہ بھری اور اس پتھر کے نیچے ان کاغذوں کو دوبارہ دبا دیا۔

اس نے پوچھا۔ "کیا آپ نے کسی اہم کام میں حصہ لیا ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "ایسے کاموں میں کوئی حصہ نہیں لیا۔"

اس نے نہایت درشتی سے کہا۔ "کیا آپ جانتے ہیں کہ میرا "اہم کام" سے کیا مطلب ہے۔" "لاکھوں انسان کام کرتے ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ میں اس مقام پر کیوں آتا ہوں۔ یہ میرے قدیم دفتر کی یاد تازہ کرتا ہے۔ دیکھو اس کا سائز اتنا تھا۔ یہاں پر میری میز تھی اور میرے سیکرٹری کی میز یہاں تھی۔ یہاں آتشدان تھا اور کھڑکی کے نزدیک ایک پریس تھا۔ اور یہاں الماریوں میں کاغذات تھے۔ ربڑ کی منڈی میری قبضۂ قدرت میں تھی۔ اور پھر" آہ "قدرت!"

اس نے کوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔ "دو سال سے میں یہاں مقید ہوں۔"

میں نے کہا۔ "قدرت پر بھروسہ رکھو۔"

وہ چلا کر بولا۔ "قدرت۔ قدرت۔ قدرت۔ قدرت کے متعلق کچھ نہ کہو۔ دو آدمی تالاب میں گرتے ہیں۔ قدرت کو اس بات کی کیا پروا ہے کہ ایک اپنے دشمن کو غرقاب کرنے میں کوشاں ہے اور دوسرا ایک کتے کی جان بچانے میں۔ دیکھئے دونو موت کے پنجہ میں ہیں۔ قدرت آپ کو غیر معلوم راستوں اور دلدلوں میں پھنسا کر تباہ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ انسان خود قدرت ہے۔"

دور کھیتوں میں دھواں آسمان کی طرف آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔

"میرا باپ خرادی[1] تھا۔ وہ مجھے بڑھئی کا کام سکھانے کا متمنی تھا۔ لیکن میری امیدیں زیادہ دلفریب تھیں۔ میں نے ایک تھوک فروش کے ہاں ملازمت کر لی۔ تین سال تک میں نے اس کے تہ خانہ میں بجلی کی روشنی سے کام کیا۔ پھر میں اس دوکان کا منتظم مقرر ہو گیا۔ پانچ سال تک منتظم کا کام کرتا رہا۔ تقریباً چار ہزار روپیہ میرے نام بنک میں جمع تھا۔ اس کے بعد کئی سال تک بشیر کی معیت میں کمیشن ایجنٹ رہا۔ لیکن ربڑ کی خرید و فروخت نے میری زندگی کو بالکل بدل دیا۔ میرا تعارف ارشد سے ہو گیا جو ربڑ کی تجارت کو خوب سمجھتا تھا۔ اس کے ذریعے ربڑ کا تمام کام میرے قبضے میں آ گیا۔ میں نے صرف ایک ہی دن میں ٹیلیفون پر گفتگو کر کے چار ہزار روپیہ کمائے۔"

سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"ان دنوں ارشد کے دوست و احباب کے ذریعے ہم نے خام اشیاء کی خرید و فروخت سے واقفیت حاصل کر لی۔ پھر وہ جزائر ملایا چلا گیا اور ہم دونوں دو سال تک نہایت محنت سے کام کرتے رہے۔ یک لخت مصیبت کا پہاڑ میری گردن پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے مرنے کا تار موصول ہوا۔ اس کے بعد میں نے نہایت محنت اور جانفشانی سے کام کیا لیکن بے سود۔ سکاٹ لینڈ کی ایک دکان کے مالک میری تباہی کے متمنی تھے اور میں ان کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا۔"

اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور کچھ لمحوں کیلئے خاموش بیٹھا رہا۔ وہ ذہن میں گذشتہ واقعات کو دہرا رہا تھا۔

اس نے اچانک سرخ اینٹوں والی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا بھائی بہت نیک تھا۔ وہ تا دم زیست میرے ساتھ مہربانی اور شفقت سے پیش آتا رہا۔"

پھر اس نے نفرت سے کہا۔ "وہ بڑھئی تھا۔ اس کی آمدنی وسطاً

[1] بڑھئی

سود و سود ماہوار ہوگی۔ وہ شادی شدہ تھا اور اُس کے پانچ بچے تھے۔

کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ "تم بھی عام آدمیوں کی طرح ہو۔ تم جیسے سیکڑوں آدمیوں سے سابقہ پڑا تھا۔ میں تمہیں بتاتا ہوں میں لاکھوں روپے کا مالک تھا۔ ہزاروں آدمی ملازم تھے۔ تم لوگ یہاں آئے ہو اور "قدرت" "قدرت" بکنے لگے ہو۔ ان بدنصیب درختوں کی طرف دیکھو۔ وہ گرمی میں سرسبز، موسم خزاں میں زرد اور موسم سرما میں بے برگ و بار ہوتے ہیں۔ سالہا سال سے یہی کیفیت ہے۔ میں اس منظر سے اُکتا گیا ہوں۔ انسان کی طرف دیکھو۔ اُس کی زندگی اور تغیر و تبدل کا ملاحظہ کرو۔ وہ کیا کر سکتا ہے۔ اُس کے لباس، سامان، مکان شہر اور اس کی طاقت کا اندازہ لگاؤ۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کا مطلب تجارتی کاروبار کو فروغ دینے کی طاقت سے ہے؟"

"ہاں بالکل درست"

"تجارت کو فروغ دینے کی طاقت .... انسان کو امیر یا غریب بنانے کی طاقت؟"

اُس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ کوئی اور آدمی بھی اس جگہ موجود ہے وہ خوش پوش اور خوش وضع تھا۔ وہ نیلے سرخ کا کوٹ اور ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ اس نے میرے ساتھی سے کہا۔

"السلام علیکم، مسٹر خالد آپ یہاں موجود ہیں۔ اب تمہارے قیلولہ[1] کا وقت ہے۔" پھر اس نے میری طرف رُخ کر کے سلام کیا۔ اُس کی شیریں آواز نے میرے ساتھی پر تعجب انگیز اثر ڈالا۔ اس کے چہرے کی شگفتگی زائل ہوگئی۔ بڑھاپے اور پژمردگی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اُس کا سر جھک گیا اور بمشکل چند لمحے گذار رہا۔ وہ نو وارد کے ساتھ ہو لیا۔

[1] کھانے کے بعد دوپہر کو کچھ دیر کے لئے سو جانا۔

راہ میں مجھے ایک چٹھی رسان ملا۔ میں نے مزید معلومات کی تحقیق کے لئے اسکو روک لیا۔ اور یونہی ایک جگہ کا پتہ دریافت کیا۔ پھر میں نے پوچھا "تم کہاں جا رہے ہو۔"

"تین چار میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے وہاں جا رہا ہوں۔"

"جہاں تک تم جانا چاہتے ہو وہاں تک چڑھائی ہے نا؟"

اُس نے پوچھا۔ "میں کہاں جانا چاہتا ہوں۔"

"اُس مکان تک جس کے تین سرخ مینار ہیں۔"

"آپ کا اشارہ مسٹر خالد کی طرف ہے جو 'گلستان' کا مالک ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا وہ گلستان نامی کوٹھی کا مالک ہے۔"

"اگر اسکو اپنے روپے کے ضائع ہو جانے کا خوف نہ ہوتا تو وہ ایسی نئی کوٹھیوں کا مالک ہو جاتا۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔ "دلچسپ بات ہے۔ ایک عظیم الشان کوٹھی کا مالک اور پھر اس اجاڑ بیابان پہاڑی کے قریب اپنی چھٹیاں وصول کرتا ہے۔"

اس نے جواب دیا۔ "جن لوگوں کے پاس روپیہ ہے وہ اپنی ہر خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں۔"

میں نے اس معاملہ میں زیادہ معلومات حاصل کرنے کی غرض سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ دولت اس کے لئے باعث مسرت نہیں۔"

چٹھی رسان نے دائیں پاؤں کو گھمایا گویا وہ چلنے کی تیاری کر رہا ہے۔ پھر اس نے جیب سے سگرٹوں کی ڈبیہ نکالی اور ایک سگرٹ سلگایا۔ پھر اس نے ہینڈل پر جھک کر کہا۔ "اگر ایک شخص دولت سے تہی دست ہے تو وہ اپنے دل کو صرف اس خیال سے خوش کر سکتا ہے کہ کم از کم کسی دوسرے انسان کے پاس تو دولت موجود ہے اور اگر کوئی شخص دولت سے مالا مال ہے تو وہ دوسرے کو تہی دست دیکھ کر خوش ہو سکتا ہے۔ میں نے زندگی کے راز کو ان الفاظ میں حل کر دیا۔ اگر انسان ان واقعات پر غور کرے تو سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔"

(ترجمہ) علاؤالدین

زندگی کیا ہے سکوں ناآشنا رہنے کا نام — موت فقدانِ طپش کی سختیاں سہنے کا نام

رُوح کو بیدار کرنا ہے تو فریادی نہ بن — اصل نغمہ ہے رباب دل کے چپ رہنے کا نام

عشق کیا ہے رُوح کے بیدار ہونے کی نوید — شاعری لوگوں میں اُس کے برملا کہنے کا نام

جاپانی شہزادی

معصومیت

صیادِ دام بدوش

جوگن اور پپیہا

"گیت"

سُن لے میرا گیت

پپیہے سُن لے میرا گیت

جوگن ہوں میں گانے والی — پریم کا راگ سُنانے والی

پی پی کرنا پریم سے پیارے ہے یہ تیری ریت — اُلفت کا ہے جام پپیہے سُن لے میرا گیت

پپیہے سُن لے میرا گیت

جوگن ہوں میں گانے والی — پریم کا راگ سُنانے والی

میرے من کی بات

پپیہے میرے من کی بات

پی پی کا تجھ کو دُکھ بھاری — پریم کی میرے لگی کٹاری

غم کی سر پہ چھائی گھٹا سی بیرن کالی رات — تیرے من کی بات پپیہے میرے من کی بات

پپیہے میرے من کی بات

پی پی کا تجھ کو دُکھ بھاری — پریم کی میرے لگی کٹاری

مجھے وہی بیراگ

پپیہے مجھے وہی بیراگ

جس کے ہے تو پریم کا پیاسا — اُسی کی ہے اِس دل میں لاسا

دونوں ہی کے لگی بدن میں ہائے برہ کی آگ — تجھکو جو احساس پپیہے مجھے وہی بیراگ

پپیہے مجھے وہی بیراگ

جس کے ہے تو پریم کا پیاسا — اُسی کی ہے اِس دل میں لاسا

اندرجیت شرما

اسپرانٹو

ایک بین الاقوامی زبان

ادبی دنیا کے کسی گزشتہ نمبر میں ہم اسپرانٹو[1] کے متعلق ایک مضمون لکھ چکے ہیں۔ آج ہم چاہتے ہیں کہ اسی سلسلہ میں کچھ مزید معلومات ناظرین کے سامنے پیش کریں۔

عرصہ دراز سے دنیا کی حریف قوموں کو گلے ملانے کے لئے جہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکی کو علم کی روشنی سے جگمگانے کے لئے، صنعت و حرفت کو اہم ترقی پر پہنچانے کے لئے اور تجارت کو کامیاب بنانے کے لئے ایک بین الاقوامی زبان کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی تھی۔

سب سے پہلے مشہور فاضل لیبنتز نے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یہ تجویز پیش کی کہ حروف ہجا کی جگہ ہندسوں کو استعمال کیا جائے اور کلمے بجائے حرفوں سے مرکب ہونے کے ہندسوں سے مرکب ہوا کریں۔ اس لئے کہ جس طرح حروف معانی پر دلالت کر سکتے ہیں اسی طرح ہندسے بھی معانی پر دلالت کر سکتے ہیں لیکن اس کی یہ تجویز عملی جامہ نہ پہن سکی اور ضرورت جوں کی توں باقی رہی۔

لیبنتز کے بعد ایک جرمنی عالم ہرمن ویلز اس میدان میں آیا۔ اس کی تجویز تھی کہ لاطینی زبان کا انتخاب کر کے اسے دنیا کی بین الاقوامی زبان بنا دیا جائے۔ لیکن اس سلسلہ میں اس کی اور اس کے ساتھیوں کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں اور کامیابی کا جھنڈا اس کے ہاتھ بھی نہ آیا۔

ان کے بعد لیون بولاک نے "نیلی زبان" شیلیر نے "وولا پوک" اور سولیا رسنے "نوترال" اور "بازومان" ایجاد کر کے دنیا کی اس اہم تمدنی عمرانی تجارتی اقتصادی علمی اور ادبی ضرورت کے حل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کسی کی کوشش ٹھکانے نہ لگی۔ اور یہ زبانیں کسی نہ کسی خرابی کی وجہ سے غیر مقبول ہو کر رہ گئیں۔

حتیٰ کہ ۱۸۸۷ء میں پولینڈ کے ایک نوجوان فاضل ڈاکٹر لوئس زامنہوف نے اپنی ایک انقلابی کوشش اسپرانٹو کی صورت میں پیش کی۔ اسپرانٹو ان تمام خرابیوں سے مبرا تھی جو اس سے پہلے بعض دوسری زبانوں کو غیر مقبول بنا چکی تھیں اور ان تمام خوبیوں سے مرصع تھی جو ایک بین الاقوامی زبان کی کامیابی کے لئے ضروری ہیں۔ چنانچہ دنیائے علم و ادب میں اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور قبولیت عامہ کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا گیا۔

اسپرانٹو کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے معاونین نے کبھی یہ ارادہ نہیں کیا کہ اپنی زبان کی بیل منڈھے چڑھانے کے لئے دوسری زبانوں کی جڑیں کاٹ دیں۔ بلکہ اسپرانٹو کی ترویج سے ان کا مقصد محض یہ تھا کہ دنیا کا ہر شخص اپنی ملکی زبان کے ساتھ ساتھ اسپرانٹو جیسی سہل و مختصر زبان سے بھی واقف ہو جائے تاکہ سفر کے وقت ان پریشانیوں سے محفوظ رہے۔ جو بعض اوقات اجنبی زبانوں کے نہ جاننے کے سبب پیدا ہو جاتی ہیں۔

ویلز کی طرح زامنہوف کا بھی پہلے پہل یہی خیال تھا کہ لاطینی زبان کا انتخاب کر کے اسے دنیا کی بین الاقوامی زبان بنا دے۔ لیکن بہت جلد اسے اپنی رائے کی غلطی معلوم ہو گئی اور اس نے اپنی کوشش کی باگ دوسری طرف پھیر دی۔ اس نے دنیا کی مختلف زبانیں سیکھنی شروع کیں اور اپنی قابل رشک ذہانت اور حافظہ کی مدد سے تھوڑے ہی عرصہ میں ستائیس زبانوں کا ماہر ہو گیا۔ وہ ان ستائیس اجنبی زبانوں کو اپنی مادری زبان کی طرح بولتا تھا۔

اس نے عرصہ دراز کی مسلسل محنت کے بعد ان تمام زبانوں میں سے وہ الفاظ انتخاب کر لیے جن کا تلفظ سہل اور دائرہ استعمال وسیع تھا اور وہ قواعد چھانٹ لیے جو بے انتہا جامع اور حد درجہ آسان تھے۔ اور اس طرح دنیا کی تمام زبانوں کا بہترین سرمایہ اسپرانٹو کی گود میں لا کر ڈال دیا۔ یہ اس کی مختلف زبانوں کی اس حیرت انگیز واقفیت ہی کا صدقہ تھا کہ وہ اسپرانٹو جیسی آسان اور جامع زبان کی ایجاد میں کامیاب ہو گیا۔

زبان اسپرانٹو کی گرامر محض سولہ آسان قاعدوں پر مشتمل ہے اور اس زبان کی ڈکشنری میں محض اتنے الفاظ ہیں کہ ایک شخص انہیں

[1] انٹرنیشنل۔

محض چند گھنٹوں میں یاد کر سکتا ہے۔

اسپرانٹو کی سہل الحصولی

اسپرانٹو کی پہلی خاص خوبی اس کی سہل الحصولی ہے۔ ایک جاپانی عالم جو عرصہ دراز سے اسپرانٹو کی تعلیم دے رہا ہے اس کی سہل الحصولی پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے "میرا تجربہ ہے کہ اگر ایک معمولی ذہن و حافظہ والا طالب علم صرف ایک گھنٹہ روزانہ اس زبان پر صرف کیا کرے تو وہ ایک مہینہ میں بخوبی اس زبان کا ماہر ہو سکتا ہے۔"

اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص سے خط و کتابت کرنا چاہے جس کی زبان سے وہ واقف نہیں ہے تو اب اسے اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ مکتوب الیہ کی زبان کو سیکھنے کی الجھنوں میں پڑے یا اس زبان کے کسی جاننے والے کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتا پھرے۔ بلکہ اس کے لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ اسپرانٹو کی کتاب کا صرف دو گھنٹے مطالعہ کرے۔ اس مختصر مطالعہ کے بعد وہ اس زبان میں ایک غلطیوں سے پاک و صاف خط لکھنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اگر مکتوب الیہ اسپرانٹو سے واقف ہے تب تو کوئی دشواری ہی نہیں ورنہ وہ بھی خط پڑھنے کے لئے یہی تدبیر کر سکتا ہے۔

اسپرانٹو کے بے انتہا آسان اور بے انتہا مفید ہونے پر مندرجہ ذیل واقعہ سے کچھ روشنی پڑے گی۔

۱۹۰۵ء کا واقعہ ہے کہ فرانس کے کسی شہر میں ایک نووارد روسی امترووفسکی نامی کو چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ ملزم روسی کے سوا کوئی اور زبان نہ جانتا تھا اور اس شہر کے حکام روسی زبان نہ جانتے تھے۔ اب شہر میں کسی روسی زبان جاننے والے کی تلاش شروع ہوئی تاکہ مقدمہ میں وہ ملزم کی ترجمانی کر سکے۔ لیکن یہ کوشش بیکار تھی اس لئے کہ شہر بھر میں کوئی شخص روسی زبان جاننے والا نہ تھا۔ مجبوراً یہ تجویز ہوئی کہ کسی مترجم کو پیرس سے بلایا جائے۔ اور ملزم کو اس دوران میں جیل خانے میں رکھا جائے جس وقت غریب روسی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالکر اسے جیلخانے بھیج گیا تو اس کے رخساروں پر آنسو بہ رہے تھے اور اس کے غم آلود چہرے سے اس کی بیگناہی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ اشاروں سے سب کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کوئی کچھ نہ سمجھ سکتا تھا۔

ایک خدا ترس وکیل جو اسپرانٹو کے معاونین میں سے تھا اس کی اس بیچارگی اور بیگناہی سے بہت متاثر ہوا۔ اور اس نے اس بیگناہ کو اس مصیبت سے چھڑانے کی ایک کامیاب تدبیر کی۔ یہ وکیل سیدھا اپنے گھر گیا اور اپنی لائبریری میں سے ایک چھوٹی سی کتاب نکال لایا جس میں روسی زبان میں اسپرانٹو کے قواعد لکھے تھے اور عدالت سے حکم حاصل کر کے یہ کتاب ملزم کو پکڑا دی۔ دو دن کے بعد وکیل جیل میں ملزم سے ملنے آیا۔ ملزم اس دوران میں اسپرانٹو پر عبور حاصل کر چکا تھا۔ چنانچہ اس نے نہایت صفائی کے ساتھ وکیل سے اپنے مقدمہ کے متعلق بات چیت کی اور دلائل سے یہ بات ثابت کر دی کہ جو الزام اس پر لگایا گیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ وکیل نے اس کے بیان کئے ہوئے واقعات کی روشنی میں عدالت میں اس کی طرف سے پیروی کی اور غریب روسی کو بری کر دیا گیا۔ ایک اور واقعہ سنیے۔

اسوج کے رہنے والے دو دوستوں نے روس کے راستہ سے رومانیا کے سفر کا ارادہ کیا۔ لیکن یہ دونوں اسوجی زبان کے سوا کوئی اور زبان نہ جانتے تھے۔ اس لئے ان کے واسطے بڑی مشکل کا سامنا تھا اس مشکل کو حل کرنے کی انہوں نے یہ تدبیر نکالی کہ اسپرانٹو سیکھنی شروع کی۔ چند روز میں جب یہ اسپرانٹو سے اچھی طرح واقف ہو گئے تو انہوں نے ان روسیوں کے پتے معلوم کیے جو اسپرانٹو جانتے تھے اور روس کا سفر شروع کر دیا۔ روس کے جس شہر میں یہ داخل ہوتے تھے وہاں کے اسپرانٹو جاننے والے ان کا پرتپاک خیر مقدم کرتے تھے۔ انسان کے ذریعہ سے ان کی تمام ضروریات پوری ہو جاتی تھیں۔

اس طرح کامیابی کے ساتھ روس کا سفر ختم کر کے جب یہ دونوں دوست رومانیا کے سرحدی شہر میں داخل ہوئے تو وہاں کے دارالسلطنت کے ایک مشہور اخبار نے اپنے ایک نمائندہ کو ان سے سب سے پہلے انٹرویو کرنے کیلئے سرحد کی طرف چلتا کیا۔ چلنے کو تو یہ صاحب چلدیئے لیکن انہیں راستہ میں خیال آیا کہ میں اسوجی زبان سے ناواقف ہوں اور اسوجی میری زبان سے۔ گفتگو ہوگی تو کیونکر ہوگی؟ زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم۔ لیکن بہت جلد انہیں اپنی مشکل کا حل سمجھ میں آگیا۔ انہیں اخبارات کے ذریعہ سے معلوم ہو چکا تھا کہ دونوں اسوجی اسپرانٹو جانتے ہیں۔ لہذا ان حضرات نے اسپرانٹو کی کتاب حاصل کر کے اس کا مطالعہ شروع کیا اور منزل مقصود تک پہنچتے پہنچتے اس زبان میں ماہر ہو گئے اور جس تدبیر سے دونوں اسوجیوں نے اپنی مشکل آسان کی تھی۔ اسی تدبیر سے انہوں نے بھی اپنی مشکل آسان کر لی اور اسپرانٹو کی جان کو ہزاروں دعائیں دیں۔

اسپرانٹو کی جامعیت: اسپرانٹو کی دوسری خاص خوبی اس کی جامعیت

ہے۔ دقیق سے دقیق علمی مفہوم اور لطیف ادبی تخیل جسے دنیا کی اکثر زبانیں باوجود اپنے سرمایہ کی کثرت کے ادا کرنے سے قاصر ہیں اسپرانٹو میں نہایت آسانی کے ساتھ بہترین طریقہ پر ادا کیا جا سکتا ہے جن لوگوں کو کسی علمی یا ادبی تصنیف کے ترجمہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بعض اوقات مترجمین کو اپنی زبان میں وہ مخصوص الفاظ نہیں ملتے جو بعض مخصوص معانی کو ادا کرنے کے لئے اصل کتاب میں استعمال کئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بالعموم ترجمہ میں کتاب کے اصلی خدوخال ظاہر نہیں ہوتے اور اُس کی حقیقی روح فنا ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن نہایت فخر کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اسپرانٹو کا دامن اس عیب سے پاک ہے۔ پیرس یونیورسٹی کے پروفیسر مسٹر بوراک نے حال ہی میں لیبنٹز کی ایک دقیق فلسفی کتاب کا ترجمہ اسپرانٹو میں کیا ہے۔ آپ یہ معلوم کر کے تعجب کریں گے کہ ترجمہ کا دامن اصل کتاب کی تمام خوبیوں سے بھرا ہوا ہے اور اگر کوئی فاضل شخص اصل و ترجمہ دونوں کا گہری نظر سے بھی مطالعہ کرے تو بھی اسے ترجمہ میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں معلوم ہوگی۔

یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ اسپرانٹو میں ترجمہ جہاں اپنی جامعیت کے اعتبار سے بے مثال ہے وہاں اپنی آسانی کے لحاظ سے بھی بے نظیر ہے۔ اس زبان کی یہی دو خوبیاں ہیں جن کے دم سے دنیائے علم و ادب کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

انجمن ترقی اسپرانٹو ۱۹۰۵ء میں فرانس کے شہر بولون سومیر میں ایک عجیب و غریب منظر دیکھا گیا۔ یہاں یورپ اور امریکہ کے مختلف حصوں سے رنگ برنگ کے سیکڑوں "ناطق جانور" آ جمع ہوئے۔ اور انہوں نے بھانت بھانت کی بولیاں بولنی شروع کر دیں۔ شہر والے سہمی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھتے تھے اور حیرت و تعجب کے ساتھ ان کی بولیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر یہ کوشش فضول تھی۔ انگریز، ہسپانی، بلغاری، اطالوی، امریکی، روسی، اور دوسری قومیں اپنی اپنی بولیاں بول رہی تھیں اور کچھ عرصہ کے لئے بولون سومیر چڑیا گھر بن کر رہ گیا تھا۔

لیکن دوسرے ہی دن اس حالت میں عظیم الشان تغیر پیدا ہو گیا۔ یہ مختلف رنگ اور مختلف زبانوں کے انسان ایک بڑے ہوٹل کے ہال میں جمع ہوئے۔ اور کندھوں سے کندھے ملا کر بیٹھ گئے۔ زبانوں اور لہجوں کی ساری تفریق مٹ گئی اور سب کے سب ایک ہی زبان میں گفتگو کرنے لگے۔ اب ایسا معلوم ہونے لگا کہ یہ سب ایک ہی ملک کے فرزند اور ایک ہی مدرسہ کے طالب علم ہیں۔

آپ سمجھے یہ لوگ کون تھے؟ یہ انجمن ترقی اسپرانٹو کے پہلے اجلاس کے شرکا تھے جو مختلف ملکوں سے ڈیلیگیٹ بن کر آئے تھے اور یہ جلسہ انجمن ترقی اسپرانٹو کا پہلا اجلاس تھا۔ اس اجلاس کی صدارت خود اسپرانٹو کے موجد ڈاکٹر زامنہوف نے کی تھی اور وہ اسی جلسہ میں اسپرانٹو کے حق ایجاد سے انجمن ترقی اسپرانٹو کے حق میں دستبردار ہو گیا تھا۔ اس نے انجمن مذکور کو پوری طرح حق دیدیا تھا کہ وہ اسپرانٹو کی ترقی و اشاعت کے لئے جو وسائل مناسب سمجھے اختیار کرے اور وقتاً فوقتاً اس میں جس قسم کی ترمیمیں ضروری سمجھے عمل میں لائے۔

اگرچہ انجمن کے اس اجلاس میں کل ۶۵۰ ڈیلیگیٹ شریک ہوئے تھے مگر یہ تعداد ہر سال زیادہ ہوتی گئی۔ چنانچہ انجمن کے دوسرے اجلاس میں جو جنیف میں منعقد ہوا ایک ہزار ڈیلیگیٹ شریک ہوئے اور لیبنٹز کا مشہور ڈراما "جبریہ شادی" فرانسیسی سے اسپرانٹو میں ترجمہ کر کے کامیابی کے ساتھ کھیلا گیا۔ انجمن کے تیسرے اجلاس میں جو کیمبرج میں منعقد ہوا تین ہزار ڈیلیگیٹ شریک ہوئے اور مشہور ڈراما "ترستان برنار" کھیلا گیا۔ حتیٰ کہ ۲۸ اگست ۱۹۲۸ء کو بلجیم کے شہر انتورپ میں جب اس انجمن کا بیسواں اجلاس منعقد ہوا تو اس میں دنیا کے مختلف حصوں سے پندرہ ہزار ڈیلیگیٹ شریک ہوئے جو دنیا کی تیس قوموں کے نمائندے بن کر آئے تھے۔ اس موقع پر یہاں اسپرانٹو کے ایک بین الاقوامی کالج کے افتتاح کی تقریب بھی نہایت شان و شوکت کے ساتھ منائی گئی۔

انجمن ترقی اسپرانٹو کے سالانہ جلسوں کی اس بڑھتی ہوئی رونق اور ان کے اس ابھرتے ہوئے جذبۂ عمل کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا غلط نہیں ہے کہ عنقریب اسپرانٹو مشرق و مغرب میں اپنے جھنڈے گاڑ دیگی اور کالوں اور گوروں کی زبانوں پر اس کا سکہ چلیگا۔

سجاد

مرزا نے کہنا شروع کیا "میرے ماموں (آپ جو کچھ بھی کہئے) ایک لکھ پتی کروڑ پتی - یا ارب پتی تھے - اُن کی جایداد لاکھوں کی تھی اور وہ سب کی سب میرے لئے چھوڑ گئے -"

میں نے مرزا کے پھٹے پرانے کپڑوں کی طرف دیکھا جن میں پیوند لگے تھے - اتفاق سے میری نظر اُن کی عینک پر پڑ گئی جس کا شیشہ تک ٹوٹا ہوا تھا - مرزا نے دوبارہ زور دیتے ہوئے کہا "جناب ذرا خیال تو کیجئے "سب جایداد" ایک ایک کوڑی -

میں نے حیرت سے مرزا کو خوش کرنے کے لئے کہا "آپ کی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے"

مرزا نے گلاس منہ سے لگاتے ہوئے کہا "آہ وراثت کی جایداد اکثر بُرے نتیجے پیدا کرتی ہے - اُس کا لہجہ یاس آمیز تھا -

میں نے کہا "شاید"

"میرے ماموں مصنف تھے - اُنہوں نے ڈھیر کی ڈھیر کتابیں لکھ ڈالیں"

"اچھا"

مرزا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہی تو بڑی خرابی تھی" پھر دانتوں میں خلال کرنے لگے -

مرزا نے ہونٹ چاٹتے ہوئے کہا "حضرت! میرے ماموں کو کتابیں لکھنے کا مرض تھا - بلکہ یوں کہئے خبط تھا - وہ کتب خانۂ عامہ کے لائبریرین تھے - جیسے ہی جایداد میں اُنہوں نے کتابیں لکھنا شروع کر دیں میرے خیال میں یہ ایک بالکل بیکار اور واہیات مشغلہ ہے - خیر - اگر کسی دوسرے باوقار شخص کو اتنی جایداد ملتی وہ فوراً ٹھاٹ سے رہنا شروع کر دیتا - دو درجن پاجامے بنواتا اور وہ بھی کس سے - وائٹ وے لیڈلا کی دکان سے - مگر ہمارے ماموں میاں ہمیشہ اِن باتوں سے دور رہے - آپ کو غالباً یہ سُنکر تعجب ہوگا کہ اُن کے پاس مرتے دم تک سونے کی ایک گھڑی بھی نہ تھی - ایسے لوگوں کے پاس دولت کا کیا کام ہے - مگر دولت اندھی مشہور ہے - ہمارے ماموں نے کیا کیا - ایک بڑا سامان کرایہ پر لے لیا - لاکھوں کتابیں خرید ڈالیں چالیس من کاغذ - کئی درجن قلم اور سیاہی کی بوتلوں کے - لئے آرڈر دیدیا اور اطمینان سے کتابیں تصنیف و تالیف کرنے لگے - میری سمجھ میں اِس کی علت غائی ابھی تک نہیں آئی - مگر انہوں نے دنیا میں اگر صرف یہی کام کیا"

اپنے ماموں سے کافی جایداد ملی تھی - اِس وقت اُن کی عمر تیس ۳۴ سال کی تھی - دنیا میں صرف میری والدہ (چند رشتہ کے بھائیوں کے علاوہ) اُن کی حقیقی قرابت دار تھیں - اُن کا کوئی اور نہ تھا - اور میں اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں -

دوسرے رشتہ داروں کے یہاں بھی صرف ایک ہی لڑکا تھا - وہ اُسے لیکر اُن کے پاس پہنچے - کمرے میں پہونچتے ہی لڑکے نے بدتہذیبی شروع کی - بچپن ہی سے اُن لوگوں نے اُس کی عادتیں بگاڑ دی تھیں - ماموں صاحب نے ناراض ہوتے ہوئے ڈانٹا، اِس کو یہاں سے لے جاؤ .... اِس واقعہ کو میری خوش قسمتی برد وال سمجھا گیا - میری والدہ بہت ہوشیار واقع ہوئی ہیں - انہوں نے کل باتیں دل ہی دل میں طے کر لیں مگر زبان سے ایک حرف نہ نکالا -

"ہمارے ماموں بھی عجیب قطع کے شخص تھے - آپ کا لباس سبحان اللہ - سر پر چاروں طرف تو سخت بال تھے لیکن بیچ میں چاند نظر آتی تھی - جیسے جاپانی گڑیا - آپ ہمیشہ ٹخنوں تک نیچی اچکن اور گھٹنا پہنتے تھے - سر پہ مارواڑی وضع کی پگڑی ہوتی تھی - کپڑوں کے شوقین تو بہت تھے مگر ظاہری حالت فقیروں سے بدتر معلوم ہوتی تھی - خیر آپ کسی ایک مکان میں جم کر نہیں رہے - آج یہاں ہیں تو کل وہاں - آپ کا ایک مخصوص گاؤ تکیہ تھا اور ایک بوریا - گاؤ تکیہ کے متعلق مشہور تھا کہ وہ حضرت غالبؔ کے استعمال میں رہ چکا ہے - اور بوریا آتشؔ جیسی بزرگ ہستی کے زمانے سے چلا آرہا تھا - معلوم نہیں کہاں تک اس روایت کی تصدیق ہو سکتی ہے - بہرحال آپ کو یہ دونوں چیزیں حد درجہ عزیز تھیں اور ہر نئے مکان میں پہلے یہی دونوں چیزیں رونق افروز ہوتی تھیں - ہمارے ماموں صاحب اپنی تصنیفات کے عام پسند نہ ہونے کا الزام اپنی لائبریریا کے سر پر تھوپتے تھے - مگر یہ کبھی نہ سمجھے کہ یہ خود اپنے دماغ کا قصور

ہے۔ آپ کو یہ بھی خبط تھا کہ مشہور مصنفین کے جائے سکونت کی تلاش رہا کرتی تھی۔

اُن کا نام آپ کے سامنے لینا فضول ہے۔ آپ اُنہیں نام سے کبھی نہ پہچان سکیں گے۔ اُن کی تصنیفات سے لوگ عام طور پر واقفیت تک نہیں ہیں۔ بلکہ میں تو یوں کہونگا۔ وہ اِس قابل ہی نہیں ہیں کہ کوئی بھلا آدمی اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔

"انہوں نے ہر علم و فن کی کتابوں کو پڑھا اور ہر موضوع پر ہرزہ سرائی کی۔ مگر کوئی اُن کی کسی ایک کتاب کا نام بھی نہیں جانتا۔"

"اکثر وہ لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کرتے، قوم کو کس چیز کی سب سے زیادہ حاجت ہے؟ پھر خود ہی کہتے۔ ایک رہبر کی۔ ایک ایسے پیشوا کی جو اُسے پستیوں سے نکال دے۔ آجکل قوم میں شیرازہ بندی نہیں ہے۔ نفاق و افتراق کے زہریلے اثرات پھیل رہے ہیں۔ کبھی وہ مجھے مخاطب کر کے کہتے۔ احمد! تم جانتے ہو ہماری قوم اِس بدتر حالت میں کیوں ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ لوگ عالموں کی قدر نہیں کرتے۔ مصنفوں کی وقعت ذرہ برابر نہیں ہے۔ در بدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ قوم اُنہیں پاگل اور دیوانہ سمجھتی ہے۔ اُن کی نصیحتوں پر عمل کرنا تو درکنار اُن کو سننے تک کی روادار نہیں ہے۔ لیکن احمد! اگر قوم آنکھیں کھولے۔ اپنے ہی خواہوں کو پہچانے۔ تو میں گو مصنفین کا خاک پا ہوں مگر اتنا دعوے رکھتا ہوں کہ قوم کو اِس گمراہی اور ذلت سے نکال کر سیدھے رستے پر ضرور لگا دوں گا۔ اُسے ایسی جگہ پر پہنچا دونگا جہاں کوئی اِس کا ہمسر نہ ہوگا۔ چین آرام سے زندگی بسر ہوگی۔ ہر طرف مال و دولت کی فراوانی ہوگی۔ دودھ اور شہد کی نہریں جاری ہونگی"

"ہمارے ماموں اِس قسم کی باتیں ہر وقت کیا کرتے تھے۔ اُنہیں ہر دم قوم اور اُسکی اصلاح کی فکر رہا کرتی۔ اُن کی خواہش تھی کہ مولانا حالی کی طرح وہ بھی کوئی مسدس لکھ کر نام پیدا کریں۔

میری ماں ہفتے میں اکثر ایک دو بار مجھے نہلا دُھلا کر ماموں صاحب کے پاس لے جایا کرتیں اور میں بھی اُن کی باتوں میں بظاہر دلچسپی لیا کرتا۔ چپ تمیز سے بیٹھا رہتا۔ چوں نہ کرتا۔ اُن کا یہ حال ہوتا کہ دنیا بھر کے قصے دُہرایا کرتے جن میں مجھے مطلق دلچسپی نہ ہوتی۔ مگر ماں کے حکم کے خلاف بھی نہیں کر سکتا تھا۔

رفتہ رفتہ میں تنہا جانے لگا۔ مجھے خیال پیدا ہو چلا تھا کہ شاید ترکہ اسی طرح سے مل جائے۔ میں نے دیکھا ماموں صاحب کے پاس کوئی متنفس نہ پھٹکتا تھا۔ ان کی عادت تھی کہ ہر اُس شخص کو مبارکباد کا خط ضرور لکھتے جو دنیا میں مشہور ہو جاتا۔ اُسے اپنی تصنیف کردہ کتابوں کے پلندے کے پلندے بھیجا کرتے اور اُسے مدعو کیا کرتے کہ وہ آکر اُن سے قوم کی موجودہ تباہی کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرے۔ لیکن آنا تو درکنار بہت لوگوں نے جواب تک نہ دیا۔

ماموں صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایسا معلوم ہوتا۔ کہ کسی مطبع میں جا پہنچے ہیں۔ ہر طرف سامان منتشر نظر آتا۔ مکان کی نشست گاہ میں خطوط کے ڈھیر ملتے۔ یہ خطوط نظام حیدر آباد بیگم بھوپال۔ نواب رام پور اور ایسے ہی بڑے بڑے لوگوں کے نام ہوتے۔ نشستگاہ کے بعد والے کمرہ میں ماموں صاحب خود ہوتے تھے مگر اِس ہیئت کذائی سے کہ کمرے میں چار سو کتابیں بکھری پڑی ہیں۔ فرش پر پھٹے اور مڑے تڑے ہوئے ردی کاغذات کا ڈھیر ہے۔ لکھتے لکھتے کاغذ نوچ ڈالنا اور گولی بنا کر پھینک دینا مصنفوں کی عادت ہوتی ہے جو لیاقت کے محدود ہونے کی شہادت ہے۔ تپائی۔ میز۔ ہر جگہ بسکٹوں کے آدھے کھائے ہوئے ٹکڑے اور چائے کی خالی پیالیاں بے ترتیبی سے رکھی ہیں۔ وہیں کسی کونے میں آپ کو ماموں صاحب نظر آتے کہ تہبند باندھے ہوئے کسی پرانی کتاب کی ورق گردانی کر رہے ہیں قلم کان میں اٹکا ہوا ہے۔ اور ہاتھ میں پنسل ہے۔ جس سے جگہ جگہ نشان لگاتے جاتے ہیں۔ پاس ہی قلم تراش بھی کھلا رکھا ہے کہ بوقت ضرورت پنسل کو بنا لیا جائے۔

مجھے دیکھتے ہی کہنے لگتے۔ احمد! ذرا ٹھہرو۔ ارے ایک ذرا۔ بہت ٹھیک۔ بالکل درست۔ بھئی کیا بات سوجھی ہے۔

ارے میاں احمد تم دیکھتے ہو ہمارا ملک ابھی تک ابتدائی مرحل سے گزر رہا ہے۔ اُس کو بڑی بڑی دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرنا ہے۔

ہاں تو ہمارے ماموں کی باتیں ہمیشہ ایسی ہی ہوا کرتیں۔ اور مجھے دیکھتے ہی وہ قوم اور ملک کا تذکرہ کرنے لگتے۔ وہ صرف باتیں ہی نہیں کرتے بلکہ مجھے اپنی کتابیں بھی دیا کرتے کیسی کتابیں؟ ایک ایک اُن میں سے چھ چھ سو صفحات کی ہوتی۔ معاذ اللہ۔ کتابوں کے نام بھی خوب ہوتے۔

"قادر وطن کی پکار، طلسم تعصب، قومی قربانیاں" وغیرہ وغیرہ

نام تو تھا تنے زبردست اور پُر اثر۔ مطلب کچھ بھی نہیں۔

آخری ملاقات سے قبل اُنھوں نے مجھے ایک کتاب دی۔ وہ اُس وقت بیمار تھے اور ظاہری حالت اچھی نہیں تھی۔ میں ایسی باتوں کی تاک میں رہا کرتا تھا۔ اِس لئے ان کیفیات کا مجھے خوب اندازہ ہے۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور وہ زندگی سے ناامید ہو چکے تھے۔

کتاب دیتے وقت فرمانے لگے، "احمد! قسی القلب۔ گراں گوش قوم کو میرا یہ آخری پیام ہے۔ یہ کہتے کہتے اُن کے زرد رخساروں پر موتی جیسے سفید آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ واقعی اب ؎

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائیگا جب لاد چلیگا بنجارا

کے مصداق آخری وقت قریب تھا۔ پچاس ساٹھ تصنیفات کا ذخیرہ ردی سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا۔

ماموں صاحب گویا ہوئے "احمد۔ مجھے خیال ہوتا ہے ...... کہ ...... کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔ اُن کی سسکیوں سے میں بھی متاثر ہوا۔ آج یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ناامیدی کی جھلک اُن میں دیکھی۔ کچھ لمحے غور کرنے کے بعد پھر کہنے لگے۔ "احمد میں نے سخت حماقت کی۔ تمام عمر فضول برباد کر دی۔ آہ۔ خدائے برتر علیم و دانا ہے۔ وہی دلوں کے راز جانتا ہے۔ میں نے خود نمائی یا خود پسندی کے لحاظ سے ہرگز ایسا نہیں کیا تھا۔ میرا خیال .... تھا ......"

اِس کے آگے وہ اور کچھ نہیں کہہ سکے۔ جملہ ناتمام رہ گیا۔ کتاب مجھے دیدی۔ اور چہرہ کو ہاتھوں سے چھپا کر سرد آہیں بھرتے رہے۔ میں نے دیکھا اُن کے ہاتھ پاؤں میں رعشہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُن کی آنکھیں پھر بدستور چمکنے لگیں (مجھے اُن کی ایک ایک حرکت خوب یاد ہے۔ کیونکہ گھر پہنچکر والدہ کے سامنے اُن کے ہر ایکٹ کو دہرانا پڑا تھا) اُنھوں نے کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "اسے لیجاؤ اور پڑھنا۔ یہ میری سب سے آخری تصنیف ہے۔ میں نے اپنی تمام جایداد تمہارے نام کر دی ہے۔ خدا کرے تم اِس کا جائز استعمال کرو۔ اِس کے بعد اُن کا سانس پھول گیا اور وہ زور زور سے کھانسنے لگے۔

مجھے خوب یاد ہے۔ کہ جیسے میں گھر پہنچا۔ اور جب دوبارہ ماموں صاحب کے پاس گیا تو وہ کس طرح بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ اُنکا سانس زور سے چل رہا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سکرات کا عالم ہے۔ مگر مجھے دیکھتے ہی اُن کے سر پر کتاب کا بھوت سوار ہو گیا۔ بمشکل تمام آہستہ سے کہا۔ کیا کتاب پڑھی تھی۔

اُن کے خوش کرنے کو میں نے کان کے پاس جاکر کہا، "تمام رات اُسی کو پڑھتا رہا۔ اُن کے چہرہ پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے چاہا کچھ اور کہوں مگر دیکھتا کیا ہوں کہ اُن کی حالت ابتر ہو چلی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے منکا ڈھل گیا اور انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن چہرہ پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جسے نشان فیروزمندی سمجھنا چاہئے۔

ہمارے ماموں صاحب کا خاتمہ اِس طرح سے ہوا۔ اُن کا جنازہ ہم لوگوں نے بڑی شان سے اٹھایا۔ خیرات میں اپنی سب پونجی ہم نے لٹا دی۔

اب وصیت نامہ کی تلاش ہوئی۔ پہلے تو ذرا شانِ بے اعتنائی سے اِدھر اُدھر ڈھونڈا گئے مگر جب صبح سے شام ہو گئی تو ذرا بے چینی شروع ہوئی۔ کرسیاں اُلٹ ڈالیں۔ میزوں کے خانے نکال ڈالے۔ حتیٰ کہ دیواروں تک کو ٹھونک بجا کر دیکھ لیا مگر اُس کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ ہر وقت مخالفین کے پہنچنے کا ڈر لگا ہوا تھا۔ مختار صاحب سے دریافت کیا تو انھوں نے بھی وصیت نامہ کی موجودگی کی تصدیق کی کہ ایک مہینہ ہوا لکھا گیا تھا۔ سفید کاغذ پر تھا۔ مضمون بہت مختصر تھا.... ..... مگر ہم کو کوئی وصیت نامہ نہیں ملا۔ والدہ نے گھر سر پر اٹھا لیا۔ بیچارے مُردے کی روح بھی قبر میں لرز گئی ہوگی۔

ایک بار ماموں صاحب سے اور والدہ صاحبہ سے کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ اُس زمانہ میں انھوں نے ایک وصیت نامہ اُسے "یہاں سے لیجاؤ" والے لڑکے کے حق میں لکھا تھا۔ وہ اُس وقت کام آیا۔ اور کل جائیداد اُس اوباش کو مل گئی ...."

مرزا یہاں پہنچکر خاموش ہو گئے

میں نے کہنا شروع کیا "شاید آپ ...."

مرزا نے مجھے روکتے ہوئے کہا "ذرا توقف کیجئے۔ ذرا توقف کیجے۔ آج صبح ایک عجیب بات ہوئی جو سب سے بڑھکر ہے۔ اُسے بھی سن لیجئے۔ ہاں تو جایداد اُس لڑکے کو مل ہی گئی۔ وہ بالغ تھا۔ اِس لئے قبضہ دلا دیا گیا اور اُس نے اُسے تباہ کرنا شروع کر دیا۔ جوا۔ شراب اور عیاشی خاص مشاغل تھے۔ جب میں اِن باتوں کا خیال کرتا ہوں میرا خون اوٹنے لگتا ہے۔ اُس نے بہت جلد تمام جائیداد کو ٹھکانے لگا دیا۔ ایک پھوٹی کوڑی تک نہ رکھی۔ اب تین سال سے مجھے اُس کا کچھ حال معلوم نہیں ہے۔

"مجھ پر اِس عرصے میں بڑا سخت وقت گزرا۔ میری ماہانہ بیدی

ماموں کے انتقال سے وابستہ تھیں جس کا یہ حشر ہوا۔ آپ سے کیا پردہ۔ سچ عرض کرتا ہوں۔ میں آجکل کوڑی کوڑی کو محتاج ہوں۔ سارا سرمایہ ماموں کی موت میں لٹا دیا۔ اب رکھا کیا ہے۔

ہاں تو آج صبح اُن کتابوں کے ڈھیر کی طرف میرا خیال گیا جو برسوں سے ایک کونے میں پڑی تھیں اور جن کا کوئی پرسان حال نہ تھا خیال ہوا شاید بنیا ہی ان کی کچھ قیمت لگا دے اور تنگ الحال آ ٹے دال کا سہارا ہو جائے۔ اگرچہ میں نے عہد کیا تھا کہ اُنہیں میں اپنے سے جُدا نہیں کرونگا۔ مگر اس وقت کچھ ایسا جنوں سوار ہوا کہ کتابوں کو دیکھتے ہی میں نے زور سے ایک ٹھوکر ان کو لگائی۔ کمرے میں ہر طرف کتابیں بوٹ کی ٹھوکر سے منتشر ہوگئیں۔ ایک ذرا اوپر کو اُچھلی اور اس کے اندر سے .... آپ سمجھتے ہیں کیا نکلا؟ جناب وہی وصیت نامہ جسے ماموں صاحب مرحوم نے اپنی اس آخری کتاب میں رکھدیا تھا. جو انہوں نے مجھے اپنے بستر مرگ پر دی تھی۔

مرزا نے اپنا ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے اور اپنے سر کو ذرا جنبش دیکر پُر ملال لہجے میں کہا "میں نے کتاب کھولنا تو درکنار اس کے ورق بھی نہیں تراشے تھے۔" پھر چھت کی طرف دیکھکر زہرخند سے کہا "کیا خوب جگہ وصیت نامہ کے لئے تجویز کی تھی۔ سبحان اللہ۔

مرزا نے ہاتھ سے مکھی مارتے ہوئے کہا "دیکھا آپ نے۔ اسکو فنا فی التصنیف ہونا کہتے ہیں۔ بیچارے نے میرے ساتھ کوئی چالاکی نہیں کی تھی۔ وہ غریب یہی سمجھتا تھا کہ میں اس کی کتابوں کو ذوق و شوق سے پڑھتا ہوں۔ لیکن اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک شخص دوسروں کے طبائع کو کہاں تک سمجھ سکتا ہے ؎

ہرکس بخیال خویش خبطے دارد

(ایچ، جی، ویلس)

شمشیر صمدی

اسیرِ جدائی

ہو اگر طاقتِ پرواز میسر مجھ کو! شوق لے جائے اُڑا کر ترے در پر مجھ کو!

تیلیاں سخت قفس کی ہیں نہیں چلتا زور ورنہ تو "چاند" ہے اور میں ترا دیوانہ "چکور"

کچھ زمانے سے ہے پیارے مری تقدیر جدا کہیں صیاد سے ہوتا بھی ہے نخچیر جدا

قسمتِ عاشقِ مجبور ہے قسمت میری حسرتِ اُلفتِ مغموم ہے حسرت میری

آنکھ ہی میں جو شکستہ ہو وہ آنسو ہوں میں قید ہو جو گلِ پژمردہ میں وہ بُو ہوں میں

آہ! آزاد ہو جلنے کے لئے پروانہ اور اس میں بھی ہو مجبور ترا دیوانہ

مگر اے دوست! یہ ضبطِ غمِ فرقت کب تک یعنی میں قیدیٔ زندانِ مصیبت کب تک

ایک دن قیدِ حوادث سے رہا ہونا ہے
ترے در تک مری قسمت کو رسا ہونا ہے

روش صدیقی

تقلید

علوم جدیدہ میں تقلید سے زیادہ کوئی بحث سود مند نہیں ہے ۔ . . . . انسان کی شخصیت صرف "دیکھا دیکھی" اور نقالی کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے اور سماج میں تہذیب و تمدن کا رواج صرف تقلید کے ذریعہ سے ہوتا ہے اگر لوگ تربیت اور حضارت میں اس قوت کی اہمیت کو پوری طرح سمجھ لیں تو یقیناً یہ ایک قابل قدر چیز ثابت ہو اور وہ بغیر پس و پیش کے اپنے معاملات کی درستی کے خاطر اس کی تہذیب و تنظیم پر اپنی پوری توجہ منعطف کر دیں ۔ لیکن عام طور پر ذاتی خواہشات کا زیادہ پاس کیا جاتا ہے ۔ اپنی رائے پر فریفتگی کا اظہار کیا جاتا ہے ۔ اور تکبر و نمایش کی محبت میں تقلید جیسی نافع اور سود مند چیز سے انحراف و اعراض روا رکھا جاتا ہے ۔ اس لئے اگر تقلید کے اصول کو روشن دلایل اور مناسب اسلوب کے ساتھ پیش کیا جائے تو ممکن ہے کہ ہم اپنی اجتماعی زندگی کے ارکان کی اصلاح کر سکیں اور "فوضویت" کی اس بڑھتی ہوئی لہر کو روک سکیں جو روز بروز ہمارے ماحول پر چھائی جا رہی ہے ۔

تقلید کیا ہے؟ تقلید ایک نفسیاتی کیفیت کا نام ہے خواہ وہ شعوری ہو یا غیر شعوری، جس کا کام یہ ہے کہ کسی سابقہ نفسیاتی کیفیت کا اعادہ کرے (Lalande Vocabulaire Tom. I) اس بنا پر تقلید کبھی علم، احساس اور ارادہ کے ساتھ ہوتی ہے ۔ اور کبھی اس کے برعکس ۔ × × × × × جب تقلید مقلد کے ارادہ سے ہو تو اُسے "حقیقی تقلید" کہتے ہیں ۔ اور اگر مقلد اس فعل کا ارادہ نہ رکھتا ہو جس کی وہ تقلید کرتا ہے تو اس کی تقلید کو "نفسیاتی نقالی" سے موسوم کرتے ہیں ۔ مختلف قسم کے افعال منعکسہ مثلاً بولنا، چلنا، پھرنا، ہنسنا، رونا، اور کھانسنا، اور انفعالی حالات مثلاً خوف، غضب، اور شرمندگی، یہ سب کے سب بلا ارادہ نقالی کے ذریعہ سے منتقل ہوتے رہتے ہیں ۔ اس بنا پر تقلید کو دو قسم پر تقسیم کر سکتے ہیں :۔ فطری تقلید اور ارادی تقلید ۔ گویا بلا ارادہ نقالی صرف دیکھنے والوں کی حیثیت سے تقلید کہی جا سکتی ہے ۔ کیونکہ جو مقلد اس قسم کے افعال کی تقلید کرتا ہے وہ نہ اس کا احساس کرتا ہے نہ اس جانب اس کا خیال منتقل ہوتا ہے ۔

ان الفاظ کے معانی کی جو تحدید فرانسیسی (فرنچ) عالم مالابرٹ[1] نے کتاب "علم النفس" میں کی ہے وہ بہترین کہی جا سکتی ہے ۔ اس نے لکھا ہے کہ "تقلید" کا یہ مفہوم ہے کہ کوئی شخص بالارادہ دوسروں سے افعال و اعمال کا اقتباس کرے ۔ "بلا ارادہ نقالی" کا یہ مفہوم ہے کہ بغیر ارادہ اور شعور کے کسی کی نقل کی جائے، اور "تلقین" کا یہ مفہوم ہے کہ ایک شخص بالارادہ دوسرے شخص میں کوئی شعوری کیفیت پیدا کر دے ۔ درانحالیکہ ثانی الذکر کا ارادہ اس میں شامل نہ ہو ۔

ان احوال کے توسط سے افکار، رجحانات، اور افعال ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں ۔ ہر ایک تخیل کو اپنے وجود کے ابتدائی دور میں مخالفت سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ لیکن جب اس کے متبعین کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے تو لوگ ضرورتاً اس کی تقلید کرنے لگتے ہیں ۔ اور یہ تخیل ایک معمولی عادت بلکہ فطرت ثانیہ کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے ۔

تقلید بیک وقت نفسی اور اجتماعی قوت ہے کیونکہ وہ ایک شخص سے دوسرے شخص تک اور ایک جماعت سے دوسری جماعت تک انتقال صفات میں مدد دیتی ہے ۔ یہاں تک کہ بعض اوقات جماعتوں کی تقلید افراد کی تقلید سے زیادہ مہتم بالشان بن جاتی ہے ۔ گویا تاروں کا ایک سلسلہ ہے جو تمام انسانوں پر پھیلا ہوا ہے ۔ جب ایک جگہ اس سلسلہ کو برقی رو سے متصل کر دیا جائیگا تو اس کے اثرات فوراً دوسروں تک سرایت کر جائیں گے ۔

اگر تم تقلید کی قوت اور حیات انسانی میں اس کے عمل کو معلوم کرنا چاہو تو "بچہ" کو دیکھ لو ۔ بچہ کے اکثر افعال و صفات مثلاً گفتگو، سادہ چال ڈھال، اور اخلاق میں تقلید کا گہرا رنگ چڑھا ہوا نظر آئیگا ۔ بچہ فطرتاً ماں کی تقلید کرتا ہے ۔ اس کی خوشی سے خوش اور اس کے رنج سے رنجیدہ ہوتا ہے ۔ یہاں تک کہ اس کے کھیلوں کا زیادہ

---

[1] Malapert. Lecons de Philosophie t. l. P. 128 paris lib Hatier

لہ وہ حالت جس میں ہر قسم کی بالادست قوتوں سے انکار کر دیا جائے ۔ (مترجم)

…اپنے والدین کی تقلید سے ماخوذ ہوتا ہے۔ لڑکی اپنی ماں کی تقلید میں گڑیا کو بچھونے پر سلاتی ہے۔ اسے بہلانے کے لئے گاتی ہے۔ اسے کھانا کھلانے اور پانی پلانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے کپڑے سیتی اور اس کا لباس تبدیل کرتی ہے۔ لڑکا اپنے باپ کی تقلید میں دفتر جانے کی تیاری کرتا ہے، ٹوپی پہن کر اور چھڑی لیکر گھر سے روانہ ہوتا ہے۔ شکاری بنتا ہے۔ لکڑی کے گھوڑے پر سواری کی مشق کرتا ہے۔ اور کبھی اپنے کھیل کے دوران میں خود "باپ" بنکر چھوٹے بھائیوں اور دوستوں کو "بیٹوں" کا پارٹ ادا کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ بچوں میں قوتِ تقلید بہت فراوانی کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس کے اسباب میں سمجھ کے ضعف، اس کے جہل، تاثر کی جانب اس کے میلان، اور اس کی شخصیت کی نشوونما نہ ہونے کو شمار کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اسے دوسروں کی جانب میلان ہوتا ہے اور وہ صرف اس لئے اُن کی تقلید کرتا ہے کہ اسے ان سے محبت ہوتی ہے، ان کی نقالی کرتا ہے کیونکہ وہ اسے اپنی برتری کا ذریعہ خیال کرتا ہے، وہ اپنے آپ کو سوداگر، سپاہی، سوار، مسافر، گاڑیبان، موٹر یا ریل گاڑی فرض کرتا ہے۔ اور ان تمام حرکات و افعال کی یوں تقلید کرتا ہے گویا وہ حیاتِ اجتماعی کے لئے تیاری کر رہا ہے۔

دوسرے لوگوں کے کمال کا اعتقاد ہمیں آمادہ کرتا ہے کہ انہی جیسے خیالات اختیار کریں۔ چنانچہ ہم ان کی روش کی جانب مائل ہوجاتے ہیں، ان کے بہترین افکار و اقوال اور افعال و اعمال کی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ ان کے رجحانات، مرغوبات، اور اعتقادات سے خوشہ چینی کرتے ہیں، اور علم و شرف اور دولت کی قیمت ان کو پیش نظر رکھ کر مقرر کرتے ہیں۔ ہم انہی جیسا لباس پہنتے ہیں، جہاں وہ جاتے ہیں وہیں ہم بھی جانے لگتے ہیں۔ جہاں وہ ٹھہرتے ہیں، اپنے مکانوں کو اسی قسم کے فرنیچر سے آراستہ کرتے ہیں جو انہیں مرغوب ہو، اپنے کپڑے اسی درزی سے سلواتے ہیں جسے وہ پسند کریں، اور اپنی ضروریات کی چیزیں اسی تاجر سے خریدتے ہیں جس پر انہیں اعتماد ہو۔ جو تقلید کرے اور جس کی تقلید کی جائے ان دونوں میں تقلید رابطہ پیدا کر دیتی ہے۔ اور ان دونوں کو صفاتی اشتراک اور رجحانی اتحاد کی دعوت دیتی ہے۔ افراد ایک دوسرے کی تقلید کرتے ہیں اور وہ اقوال میں مشابہ اور افعال میں مماثل ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ تقلید یکسانی اور نزدیکی پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔

تقلید واضح ہو یا خفی۔ قوم کے تمام طبقات میں پائی جاتی ہے۔ اور سماج کی تمام اقسام میں، خواہ ان کا تعلق دیہات سے ہو یا شہروں سے اس کے وجود کا پتہ لگتا ہے۔ زمانہ گزشتہ میں دنیا کی اکثر قدیم حکومتوں میں محلاتِ شاہی پر حاجبوں کا تقرر ہوا کرتا تھا۔ جو آداب ملوک کی رعایت کے فرائض ادا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ مقربانِ دولت اور رعایا کو لباس، تخاطب، اور سوال کے متعلق ان امور کی جانب متوجہ کرتے رہتے تھے۔ جن کا لحاظ حضور شاہی میں لازمی سمجھا جاتا تھا۔ آج ہم ان حاجبوں کے فرائض کی تفصیلات سن کر ہنسی اڑاتے ہیں لیکن اگر موجودہ تمدن پر غائر نظر ڈال کر اس زمانہ اور موجودہ زمانہ کا مقابلہ کیا جائے تو یہ تعجب زائل ہو جائیگا کیونکہ آجکل درزی، نامہ نگار اور ناول نگار ہمارے لباس، آداب، اور افکار پر نئی نئی تراش خراش اور ایجادات کے ذریعہ سے حکومت کر رہے ہیں۔ اس حیثیت سے وہ شاہی حاجبوں سے بہت مشابہ ہیں۔ بلکہ تاثیر کے لحاظ سے ان سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ قوم پر بلا واسطہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ کیا آجکل سلام، ملاقات، مجالست، معاملات، تجارت، اور عیادت کے لئے خاص اصول مقرر نہیں کر لئے گئے ہیں؟ جب کوئی شخص کسی محفل رقص یا جلسہ تعزیت یا دربار میں جاتا ہے تو خاص قسم کا لباس پہننا ضروری سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ تمدن جدید نے مختلف قسم کی مجالس کے لئے خاص آداب اور مخصوص اوقات کی مناسبت سے مردوں اور عورتوں کے لئے خاص خاص لباس مقرر کر دئے ہیں۔ صبح کو وہ لباس نہیں پہنا جاتا جو دوپہر کو پہنا جاتا ہے اور دوپہر کو وہ لباس نہیں پہنا جاتا جو شام کو پہنا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اجتماعی مواقع میں سے ہر موقع کے لئے ایک طریقہ اور مسلک ہوتا ہے جو اس سے مخصوص ہوتا ہے۔ زبان، مذہب، سیاست، حقوق، حروب، اور فنونِ لطیفہ یعنی تعمیر، موسیقی، تصویر، شعر، اور ادب ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہوتی ہیں۔ ہر زمانہ کے لئے خاص موسیقی، سیاست، زبان، اور آداب پائے جاتے ہیں۔ جو اجتماعی فضا کی شرائط سے متفق ہوتے ہیں۔ اس لئے انسان اپنے ہم عصروں کے ساتھ گھل مل جانے میں ان کی تقلید سے زیادہ کسی چیز کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کی تقلید بعض عام مسائل سے متجاوز نہیں ہوتی اور اس کے بعد وہ دوسروں سے ظاہر و باطن میں مشابہ ہوجاتا ہے۔

تقلید خواہ بالارادہ ہو یا بلا ارادہ ان عام اصول کے ماتحت ہوتی ہے۔ جنہیں ٹارڈ نے کتاب "اصول تقلید" میں جمع کر دیا ہے۔ ان اصول سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قوت کا نفسیاتی و اجتماعی زندگی میں کتنا عظیم الشان اثر ہوتا ہے۔ ہم یہاں اس میں سے بعض اصول

کا تذکرہ مناسب خیال کرتے ہیں۔

پہلا اصول ٹارڈ کہتا ہے کہ باطنی تقلید ظاہری تقلید پر مقدم ہے یعنی ہم لباسوں، صنعتوں، اور ظاہری وضع قطع کی تقلید سے قبل افکار، آراء، اور جذبات کی تقلید شروع کر دیتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف اور ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ کی طرف وضع (فیشن) منتقل ہوتی رہتی ہے لیکن اس کی تقلید اس وقت تک نہیں کی جاتی جب تک جذباتی مشابہت کا احساس نہ کر لیا جائے۔ اسی طرح کوئی قوم دوسری قوم کی "مادیات" میں اس وقت تک تقلید نہیں کرتی جب تک دونوں میں معنوی حیثیت سے کوئی اتصال قائم نہ ہو جائے کیونکہ ہر مادی تقلید اس نفسیاتی کیفیت کی ترجمان ہوتی ہے جس نے تقلید پر آمادہ کیا۔ سولھویں صدی میں اس وقت تک اسپین کی وضع قطع فرانس میں منتقل نہیں ہوئی جب تک وہاں اسپینی حکومت کے زیر سایہ اسپینی آداب کا رواج نہ ہو گیا۔ سترھویں صدی میں فرانسیسی اوضاع واطوار اور فنون لطیفہ کا یورپ میں اس وقت تک رواج نہیں ہوا جب تک اہل فرانس ادبیات وسیاسیات میں تمام اقوام یورپ پر فائق نہ ہو گئے۔ اس بنا پر ادبی بیداری مادی بیداری سے پہلے ہوتی ہے۔ اور بسا اوقات مذہبی عقائد مذہبی لباس سے پہلے منتقل ہو کر رواج پذیر ہو جاتے ہیں۔ یہی حال افکار و معانی کا ہے جو الفاظ سے زیادہ سریع الانتقال ہوتے ہیں پسندیدگی، اعتماد، محبت، اور اطاعت کا بغض و حسد اور حقارت سے، امید کا ناامیدی سے، اور سستی کا لالچ سے زیادہ تیزی کے ساتھ رواج ہو جاتا ہے۔ قومیں عملی تقلید سے پہلے افکار کی تقلید شروع کر دیتی ہیں۔ زیادہ صاف لفظوں میں یوں سمجھئے کہ معنوی اشیاء میں مادی اشیاء سے پہلے تقلید کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ:-

(۱) افکار کی تقلید الفاظ و آثار سے پہلے ہوتی ہے۔ اور

(۲) اغراض و مقاصد کی تقلید وسائل و ذرائع پر مقدم ہوتی ہے۔

اس بنا پر جو قومیں اپنے ملک کی توسیع کرنا چاہتی ہیں وہ پہلے سے داعی اور مبلغ (پروپیگنڈا کرنے والے) بھیج دیتی ہیں تاکہ وہ اس کے اسباب مہیا کریں اور قوم میں اس تسلط کو قبول کر لینے کی استعداد پیدا کر دیں۔ چنانچہ پروپیگنڈا تجارت سے مقدم ہے اور اشتہار تقسیم کرنے والا تجارتی ایجنٹ سے زمانی حیثیت میں سابق ہوتا ہے۔ اشتہار تقسیم کرنے والا خیالات کو متوجہ کرتا ہے اور ایجنٹ سرمایہ تجارت حاصل کرتا ہے، جس طرح مبلغ اپنے پروپیگنڈے کی ضرورت پیدا کر دیتا ہے اور فاتح کے داخل ہونے کے لئے راستہ صاف کر دیتا ہے۔

یہ صفات جنہیں ٹارڈ نے ذکر کیا ہے گویا وہ ان کے ذریعے اجتماعی امور کی نفسیاتی توجیہات بیان کرنا چاہتا ہے۔ میرا یہ یقین نہیں ہے کہ وہ ہر حالت میں ان اصول کی تعمیم میں حق بجانب ہے کیونکہ ہر معاملہ میں تقلید کا باطن سے ظاہر کی طرف منتقل ہونا درست نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی باطنی امور سے پہلے امور ظاہری کی تقلید شروع کر دیتا ہے۔ جاپانیوں نے اہل یورپ سے مادی زندگی کے تمام لوازم اخذ کئے خواہ وہ بحری ہوں یا بری اور انتظامی ہوں یا تجارتی و صنعتی کیونکہ انہوں نے سمجھ لیا کہ موجودہ زمانہ میں سلطنت کی قوت انہی ارکان پر قائم ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی مشرقیت کو زائل نہیں ہونے دیا اور مشرقی طرز معاشرت، مذہب، جذبات، اور اخلاق وعادات وغیرہ معنوی امور کے تحفظ میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ انہوں نے اہل یورپ کی صرف ظاہری زندگی میں تقلید کی اور ان امور کو جن کا تعلق باطن سے ہے قطعاً ہاتھ نہیں لگایا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم باطن کی تقلید سے پہلے ظاہر کی تقلید شروع کر دیتے ہیں۔ ہم دوسروں کے جذبات کا ادراک کئے بغیر ان کی وضع اختیار کر لیتے ہیں۔ اور داخلی تغیر سے پہلے اپنے ظاہر کو متغیر کر لیتے ہیں۔ یہ اصول عورتوں اور بچوں پر خصوصیت سے منطبق ہوتا ہے، ان مصلحین پر بھی حاوی ہوتا ہے جو اپنی زبان کا رسم الخط تبدیل کر کے قوم میں ذہنی انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں، نیز ان لوگوں پر بھی صادق آتا ہے جو انگریزی یا کسی دوسری اجنبی زبان میں سلام کرتے ہیں حالانکہ وہ سلام کے الفاظ کے علاوہ اس زبان سے قطعاً ناواقف ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی دوسری ایسی مثالیں موجود ہیں جو ٹارڈ کے نظریہ کی تائید نہیں کرتیں اور بتاتی ہیں کہ ظاہر سے باطن کی طرف اور باطن سے ظاہر کی طرف دونوں طرح تقلید کا انتقال ممکن ہے۔

دوسرا اصول تقلید کا رخ فطری طور پر پستی سے بلندی کی جانب ہوتا ہے۔ یعنی نچلے طبقے کا آدمی بلند طبقے کی، چھوٹا بڑے کی، پیچ ذات شرفا کی، ضعیف قوی کی، بچہ والدین کی، شاگرد اپنے استاد اور بڑے دوستوں کی، چھوٹا تاجر بڑے تاجر کی، عورت مرد کی، اور مردان امور میں جن میں عورتیں ان پر فائق ہیں عورتوں کی تقلید کرتے ہیں۔ رعایا اپنے حاکموں کی تقلید کرتی ہے۔

"الناس علیٰ دین ملوکہم"[1] کا نظریہ بالکل واقعیت پر مبنی ہے کیونکہ مقربین دولت فرمانرواکی تقلید کرتے ہیں اور قوم مقربین دولت سے اپنی تفریحات اور اپنی وضع قطع کا اقتباس کرتی ہے[2]۔ اگر بادشاہ کسی وقت اپنے سینے کا بٹن لگانا بھول گیا تو محل کے تمام آدمی اس کی تقلید کرنے لگتے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ ایک عام وضع بن جاتی ہے۔ اگر ملکہ کشادہ پیشانی ہے اور وہ اپنی پیشانی کا بدنما عرض چھپانے کے لئے آڑی پٹی استعمال کرتی ہے تو یہ پٹی عورتوں میں ایک فیشن کے طور پر رائج ہو جاتی ہے۔

چھوٹوں کا بڑوں کی تقلید کی طرف میلان اس نتیجہ پر پہنچا دیتا ہے۔ کہ پوتے اپنے داداؤں کی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں داداؤں نے قوم کی بزرگی کا سنگ بنیاد قائم کیا ہے، قوم میں کیرکٹر پیدا کر دیا ہے اور اس کے اخلاق و عادات کی نشو و نما میں عملی حصہ لیا ہے۔ یہ خصائل ایک پشت سے دوسری پشت کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ اور اسی طرح ماضی و حال میں ارتباط کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

اس کا یہ بھی نتیجہ ہوتا ہے کہ مفتوح اقوام عام حالات میں حکمران اقوام کی تقلید کرتی ہیں۔ جب مشرق قوی تھا تو مغرب نے مشرق کی شاگردی کو فخر سمجھا اور آج مشرق بے چون و چرا مغرب کی تقلید کر رہا ہے۔ کیونکہ مغرب مادی و ذہنی ہر دو اعتبارات سے مشرق سے قوی تر ہے لیکن یہ قاعدہ وہاں منطبق نہیں ہوتا جہاں مفتوح اقوام تہذیب و تمدن میں ممتاز اور مستحکم حیثیت رکھتی ہوں۔ مثلاً رومی یونان پر اپنی مادی قوت سے غالب آ گئے لیکن یونان نے ان کی تقلید نہیں کی۔ کیونکہ اس کی اپنی تہذیب رومیوں سے کہیں زیادہ وسیع اور بلند تھی۔ اس کی بجائے الٹے رومی یونان کی تقلید کرنے لگے۔ اور ان سے علم و اخلاق اور فنون کا اکتساب شروع کر دیا۔ یہی حال عربوں اور ترکوں کا ہوا ترک اپنے عروج کے زمانہ میں مادی قوتوں کے طفیل ہی عربوں پر غالب آ گئے۔ لیکن درحقیقت عرب ان پر علوم و آداب کے ذریعہ سے حکومت کرنے لگے تھے۔

جو امور اس قاعدہ کی تائید کرتے ہیں۔ ان کے منجملہ اہل دیہات شہریوں کی تقلید اور اپنی خواہشات میں ان کا اتباع کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کے اندر علو قدر میں مباہات اور منافست پائی جاتی ہے۔ پایہ تخت دوسرے شہروں پر اپنے افکار، اپنی سیاسیات، اپنی صحافت، اپنی وضع، اور اپنے ذوق کے اعتبار سے مسلط ہو جاتا ہے۔ اور اس سے نکلنے والی شعاعیں اطراف ملک کو ایک شیرازہ میں منسلک کر دیتی ہیں۔ گویا وہ ایک روشن آفتاب ہے جس سے اطراف ملک اکتساب نور کرتے رہتے ہیں یا بقول ٹارڈ کے وہ ایک بڑا پہاڑ ہے جو کوہ ہمالیہ کے مشابہ ہے۔ اور اس سے چشمے اُبل اُبل کر فضائے وطن کو سیراب کرتے رہتے ہیں۔ فرانس کا ہمالیہ پیرس ہے، جرمنی کا برلن، اور انگلستان کا لندن!

مذہبی اصلاحات اور اجتماعی تحریکات کی ابتدا عموماً شہروں سے ہوتی ہے پھر اس کے بعد اطراف میں منتشر ہو جاتی ہیں۔ اسلام، مسیحیت، بودھ مت، انقلاب فرانس، اور روسی اشتراکیت کا ظہور دیہات و قصبات سے پہلے دارالسلطنتوں اور شہروں میں ہوا۔ کیونکہ شہروں کی ضروریات اور وہاں کے اجتماعیاتی ہجوم کا ذہنی تحریکات کی پیدائش اور ان کی پختگی پر بڑا اثر پڑتا ہے۔

یہ تمام دلائل ثابت کرتے ہیں کہ ہمیشہ پست بلند کی تقلید کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اس میں کمال کا احساس کرتا ہے۔ غلام اپنے آقا کی، ماتحت اپنے افسر کی، عاشق اپنے معشوق کی اور مغلوب غالب کی تقلید کرتا ہے۔ لیکن جب نیچے طبقہ کے لوگ اونچے طبقہ والوں کی تقلید کرتے ہیں تو بعض وقت یہ امر اونچے طبقہ والوں پہ گراں گزرتا ہے اور وہ جس امر میں تقلید کی جائے اسی کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ یورپ میں اعلیٰ طبقہ کی خواتین نے بال کٹانا ایجاد کیا اور ان سے مزدور پیشہ طبقہ کی عورتوں میں اس کا رواج ہو گیا۔ جب یہ عادت عام ہو گئی تو بلند و پست میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا اور امیر طبقہ کی خواتین نے تفوق قائم رکھنے کی خاطر بال کٹانا ترک کر دیا۔ یہی حال لباس کا ہے۔ پہلے نیچا لباس پہنا جاتا تھا، پھر اونچا پہنا جانے لگا اور جب اونچے لباس کا عام رواج ہو گیا تو اسے پھر نیچا کر دیا گیا۔ مجھ سے بعض عہدیداروں کے متعلق بیان کیا گیا کہ وہ رئیس کے لباس کی تقلید کرتے تھے اور رئیس اُسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا تھا۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ رتبہ کے امتیاز کے علاوہ ظاہری ہدایت میں بھی ممتاز رہے۔

لیکن نیچے درجے کے لوگ اونچے درجے کے ہر آدمی کی تقلید نہیں کرتے بلکہ جب اونچے درجہ کے آدمی متعدد ہو جاتے ہیں تو ان میں سے قریب تر کا انتخاب کرکے اس کی تقلید کی جاتی ہے۔ بچہ استاد سے

---

[1] لوگ اپنے بادشاہوں کے مسلک پر ہوتے ہیں
[2] Baudrillart: Histoire du luxe

Tarde: Lois de l'imitation. P. 245

جاہل اپنے ساتھیوں کی تقلید کرتا ہے اور غریب آدمی امراء میں سے اپنے ہمسایوں کی تقلید کرتا ہے۔ جب قوم کا پست طبقہ بلند طبقہ کی تقلید کرنا شروع کر دے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں طبقوں کا بُعد کم ہو گیا ہے۔

یہ لازمی نہیں ہے کہ جو صفات انسان کو ممتاز اور بلند بنا دیتی ہیں وہ مادی ہی ہوں۔ بلکہ کبھی اخلاقی صفات بھی ہوتی ہیں۔ قوی بھی ضعیف کی تقلید کرتا ہے جب ضعیف اس سے زیادہ باعزت، زیادہ بارسوخ اور زیادہ عالی ہمت ہو۔ رومہ کی شہنشاہی حکومت میں انجیل غریب یہودیوں کے ذریعہ سے شایع ہوئی کیونکہ انجیل کی مذہبیت رومی مذہبیت سے زیادہ مکمل تھی۔ اسی طرح ہندوستان اور چین میں اسلام کی اشاعت حکومتوں کے بل پر نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اسلام ان معمولی سیاحوں، نادار فقیروں، اور بے سروسامان روحانی پیشواؤں کے ذریعہ سے پھیلا ہے۔ جو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے تھے۔ بعض وقت کسی چیز کی فائدہ مندی اس کے قبول کرنے کی استعداد نہ ہونے کے خلاف اس کے رواج کی ضامن ہو جاتی ہے۔ قدماءِ اہل مصر ایشیاء ایشیائیوں، اور ہر اس چیز کو حقیر سمجھتے تھے جو ایشیا کے راستے سے آئے لیکن اس تحقیر نے انہیں ایشیائی گھوڑے استعمال کرنے سے باز نہیں رکھا کیونکہ وہ زیادہ مکمل، زیادہ بہتر، اور مصری گدھے سے زیادہ نفع رسان تھے۔ ہندو باوجودیکہ چھوت چھات کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں تاہم پہلے یونانی اور پھر انگریزی طب نے ہندوستان میں اسقدر رواج پایا کہ اس خاص مسئلہ میں اب کوئی پرہیز اور تعصب باقی نہیں رہا ہے۔ کبھی تکبر بھی تقلید سے باز رکھتا ہے۔ امریکہ کے ہندوستانیوں نے اب تک یورپی تہذیب و تمدن کو قبول نہیں کیا ہے۔ کیونکہ وہ اسے ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں۔

لباس میں امتیاز کی خواہش سب آدمیوں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔ سمور کی گرانی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ایک رنگ کے دو عدد مشکل سے ملتے ہیں اور جب اس کو پہن لیا جائے تو دوسرے شخص کے پاس اس رنگ کا لباس نظر نہیں آئیگا۔ عورتوں میں خاص طور پر یہ میلان پایا جاتا ہے اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ جس سے وہ محبت کرتی ہیں وہ وضع، لباس، ہمت، قوت اور حسن و جمال میں ممتاز حیثیت رکھتا ہو۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی میں تقلید کا کس قدر اثر ہے۔ نیز قوم کے تمام طبقات میں فیشن کے تیزی سے رائج ہونے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ فیشن ہر چیز پر غالب ہو گیا ہے اور اس نے تمام اوضاع اجتماعی کو گھیر لیا ہے۔ کبھی بالوں کو کٹوا دیا جاتا ہے کبھی بڑھا لیا جاتا ہے۔ پاجامہ کی مہریاں کبھی تنگ رکھی جاتی ہیں کبھی فراخ، اسی طرح آرائش کے لئے دستی اور عینک کا استعمال کرنا یا بالوں کا سنوارنا کبھی ایک حالت پر نہیں ٹھہرتا۔ بلکہ اکثر لوگ بعض رایوں کے اتباع، بعض پسندوں کے اختیار کرنے، اور بعض لذات پر ترجیح دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ورزش، رقص، سینما، تھیئٹر، علم و ادب، اور سیاحت کو فیشن کے طور کے لوازم حیات میں داخل کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض کام صرف دوسروں کے ساتھ مساوات قائم رکھنے کے لئے کرنے پڑتے ہیں۔ موسم گرما کی تفریح گاہوں میں اس لئے نہیں جاتے کہ صحت اچھی رہیگی، دماغ کو آرام ملیگا۔ اور قلب کو فرحت حاصل ہوگی بلکہ وہاں فیشن کے زیر اثر جاتے ہیں جو لوگوں کو موسم گرما میں تفریح گاہوں کی سیر پر آمادہ کر دیتا ہے۔ نیز اس میں اشتہارات کی تاثیر کو بھی بڑا دخل ہے۔ اہل یورپ نے اس میں بڑی بڑی جدت طرازیاں کی ہیں یہاں تک کہ صنعتی و تجارتی اشتہارات کے نئے نئے ڈھنگ پیدا کرکے انہیں علم و ادب اور اخلاق و سیاست سے منطبق کر دیا ہے۔ انہوں نے یہ حقیقت بخوبی ذہن نشین کر لی ہے کہ اکثر لوگ "بھیڑوں" کی ذہنیت رکھتے ہیں اور اندھا دھند تقلید کے سوا ان میں گرہ کی عقل کم ہوتی ہے۔

مجھ سے دِلّی کے ایک مشہور تاجر نے شملہ میں تذکرہ کیا کہ ہماری اقتصادی حالت ہمیں پہاڑ پر قیام کرنے کی اجازت نہیں دیتی لیکن ہم اپنے مقررہ طرز عمل میں تبدیلی بھی نہیں کر سکتے کیونکہ اگر ہم اس کے خلاف کریں تو لوگوں کی نگاہوں میں ہماری وقعت دو کوڑی کی نہ رہے۔

آدمی کا اپنا گھر ان مکانوں سے زیادہ خوش قطع، ہوادار، اور آرام دہ ہوتا ہے۔ جو پہاڑی مقامات میں اس کے لئے مہیا کئے جاتے ہیں لیکن وہ تبدیل آب و ہوا سے زیادہ دوسروں کی تقلید کے شوق میں اپنا گھر چھوڑ دیتا ہے۔ بعض وقت وہ مقام جہاں کا ہم قصد کرتے ہیں دوسرے بلند مقامات کے مقابلے میں حفظان صحت کی شرائط کے لحاظ سے ناموزوں ہوتا ہے۔ لیکن ہم محض اس لئے اس کا انتخاب کر کے اسے دوسرے مقامات پر ترجیح دیتے ہیں کہ وہاں جانا فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دوسروں سے مختلف الرائے ہوتا ہے لیکن جب وہ کسی ایسے جلسے میں جا پھنستا ہے

جہاں رائے عامہ اس کی مؤید نہ ہو تو وہ اپنا وقار قائم رکھنے کے لئے رائے عامہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اس بنا پر انسان کبھی استقلال سے زندگی بسر نہیں کرتا اور اپنی خوشی سے کسی وضع کو اختیار نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ دوسروں کی نقالی کرتا اور ان کے سہارے زندگی بسر کرتا ہے۔ مطمح نظر قائم کرنے میں بھی تقلید کرتا ہے اور اس کے حصول کے لیے جو ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں ان میں بھی تقلید سے کام لیتا ہے۔ ذوق، رائے، لہجہ، گفتگو، نکات، اور اسالیب ادبیہ میں خود دوسروں کی تقلید کرتا ہے اور پھر دوسروں سے اپنی تقلید کراتا ہے، گویا وہ ایک درمیانی واسطہ ہے جہاں صورتوں کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

تقلید کی طاقت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ اچھے برے سب پر مشتمل ہے۔ ہم بری باتوں میں بھی اسی طرح تقلید کرتے ہیں جس طرح اچھی باتوں میں۔ یہاں تک کہ بعض وقت برائیوں کا نیکیوں سے زیادہ جلد رواج ہو جاتا ہے۔ مثلاً یورپ میں ورٹر کے مصائب نامی کتاب شائع ہونے کے بعد ناکام عاشقوں کی خودکشی کے واقعات خوفناک طریقہ پر زیادہ ہو گئے۔ ریختی کی ایجاد اور زہر عشق جیسی مثنویوں کی تصنیف نے ہندوستان کے اخلاق پر عموماً اور مسلمانوں کے اخلاق پر خصوصاً جو ناگوار اور مضر اثر ڈالا وہ محتاج تشریح نہیں ہے۔ ایک شخص اتفاقاً اپنی زوجہ کو قتل کر دیتا ہے، دوسرے اس کی تقلید کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ غلطی معاج عام کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ قتل، رشوت، کفر، ریاکاری، جھوٹ، اور دھوکہ بازی تقلید ہی کے ذریعے سے منتقل ہوتے ہیں جس طرح محبت، حسن اخلاق، امید، ایمان اور عام نیکیوں کا حال ہے۔

اس بنا پر ہر تقلید پسندیدگی کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ "لا ووٹن" نے تقلید فاسد کو اس مینڈک کی حکایت سے خوب واضح کیا ہے جس نے بڑھ کر بیل کے برابر ہو جانا چاہا تھا۔ اس کا قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مینڈکی نے ایک بیل کو دیکھا۔ اسے بیل کا ڈیل ڈول اور سجیلا پن بہت پسند آیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی طرف دیکھا اور اسے اپنا نحیف ولاغر حقیر جسم دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ اس نے چاہا کہ جسامت میں بیل کی طرح بن جائے۔ اس نے پھیلنا اور پھولنا شروع کیا اور اپنے ساتھ والی مینڈکی سے پوچھنے لگی "دیکھو! کیا میں بیل کے برابر ہو گئی؟"

دوسری مینڈکی نے جواب دیا "نہیں ابھی تم بہت چھوٹی ہو!" وہ اسی طرح اپنے آپ کو بڑا بنانے کی کوشش کرتی رہی لیکن جب اپنی ساتھی سے پوچھتی "دیکھو! کیا میں بیل کے برابر ہو گئی؟" وہ یہی جواب دیتی "نہیں ابھی تم بہت چھوٹی ہو!" یہاں تک کہ آخر کار اس کا پیٹ پھٹ گیا اور وہ مر گئی۔

ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو دوسروں کی غیر ممکن الحصول تقلید میں اس مینڈکی سے مشابہ ہیں۔ انسان کو چاہیئے کہ ان لوگوں کی تقلید کا قصد کرنے سے پہلے جن کی مساوات کسی طرح ہو ہی نہ سکتی ہو اپنی قوت و استعداد کا جائزہ لیلے۔ اسے یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ جس طرح بھلائی کی تقلید ممکن ہے اسی طرح برائی کی بھی ممکن ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ تقلید کو ان نیک کاموں تک محدود کر دیا جائے جو ہماری عادات اور معاشرت سے متضاد نہ ہوں۔ ٹارڈ کے مذکورہ بالا اصول کے تحت میں ہم اہل یورپ کی تقلید کر سکتے ہیں کیونکہ وہ علمی و نظری علوم، اور مادی زندگی یعنی صنعت، تجارت، اور زراعت میں ہم سے زیادہ قوی ہیں اور خانگی و اجتماعی زندگی کی باقاعدگی میں ہم سے بہتر ہیں۔ لیکن ہم بغیر اس کے کہ ان کی عادات میں سے اپنی اجتماعی ضروریات کے مناسب امور کا انتخاب کریں ہر بات میں ان کی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم بعض اوقات تقلید فاسد کی وجہ سے ان عادات کو بدنما بنا دیتے ہیں جن کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ نہ مغربی طرز معاشرت کی آئینہ دار ہوتی ہیں، نہ ہماری زندگی سے میل کھاتی ہیں۔ تقلید فاسد ہمیں اہل یورپ سے قریب نہیں کرتی بلکہ ہمیں ان سے دور کر کے طلب کمال میں مانع ہو جاتی ہے۔

بیشک فیشن کی بہت سی چیزیں مفید اور قابل تعریف ہیں اور ان سے معاشرت کی بلندی اور تمدن کی ترقی میں کافی مدد ملی ہے لیکن بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جنہیں ہم باقاعدگی سے استعمال کرتے ہیں اور وہ فیشن میں داخل ہیں لیکن ان سے کسی قسم کا فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔ تمام فیشن قانون فطرت کے ماتحت ختم ہو جانے والے ہیں۔ کیونکہ وہ زیادہ تر وقتی ہوتے ہیں البتہ شرافت اور حسن اخلاق اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ شرافت اور حسن اخلاق غیر فانی ہیں بالقول لابرویر کے "وہ فنا سے بالاتر ہیں!"

میرے خیال میں قرب ماخذ کے باوجود جو چیز ہمیں ترقی سے روکے ہوئے ہے وہ دو مسئلوں پر ہے (انتہا [illegible]) کورانہ پسندی، اور ایجاد پر تقلید کو ترجیح دینے کی عادت ہے۔ یہاں تک کہ ہماری

شخصیتیں پراگندہ اور ہماری قوتیں چور چور ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص تقلید میں اجتماعی فوائد کے بجائے اپنی ذاتی خواہشات کو مقدم سمجھتا ہے۔

اس لئے عقلمند کو چاہئے کہ اس نفسیاتی ملکہ کو منظم طریقہ پر استعمال کرے اور اس میں صرف بہتر چیزوں کی تقلید پر اکتفا کرے ایک عربی ضرب المثل ہے کہ "مجھے اپنے دوستوں کے نام بتاؤ، میں بتا دونگا کہ تم کون ہو" میں کہہ سکتا ہوں کہ "مجھے اس شخص کا نام بتاؤ جس کی تم تقلید کرتے ہو، میں بتا دونگا کہ تم کون ہو" کیونکہ ہر شخص کی قیمت کا اندازہ اس کی تقلید سے کیا جا سکتا ہے اور انسان کا انتخاب اس کی عقل پر دلالت کرتا ہے۔

بلاشبہ ہر معاملہ میں اہل یورپ کی تقلید کی خواہش ان امور میں جو موجودہ زمانہ کی ضروریات کے مطابق نہیں ہیں اسلاف کی تقلید اور متناقص امور سے جلد متاثر ہو جانے کی عادت ہماری شخصیت کے ضعف اور ہمارے قوٰی کی کمزوری کی علامت ہے۔ تاریخ میں ہمارے لئے عبرت اور ہدایت کے سبق موجود ہیں۔ ہمیں ماضی کی جانب لوٹ کر دیکھنا چاہئیے اور مشاہیر عالم کے حالات زندگی کا مطالعہ کرنا چاہئیے ہم میں سے ہر شخص کو چاہئیے کہ ان غیر معمولی ہستیوں میں سے کسی ایک کو نمونہ کے طور پر پیش نظر رکھے جنہوں نے اپنی اصلاحات اور جدت فوازیوں کے ذریعہ سے "بشریت" کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ بڑی ہستیاں بشریت کے مندر میں "دیوتاؤں" کی طرح غیر فانی ہیں۔ اگر ہم چاہیں کہ دنیا میں عزت اور شرافت کے ساتھ یاد کئے جائیں تو ہمیں چاہئے کہ ان بزرگوں کا نام زندہ کریں اور ان کے نقش قدم پر چلنا شروع کریں۔ ان کی حیات میں ایک ایسا نمونہ موجود ہے جو اس "تقلیدی دور" میں، جس سے ہم گزر رہے ہیں، شمع ہدایت بن سکتا ہے۔ جب ہم اپنی تقلید میں صرف نیکیوں پر اکتفا کرینگے اور ایک ایسا نمونہ قائم کریں گے۔ جس کی پیروی کی جا سکے تو ہماری آئندہ نسلیں بھی ہمارے نقش قدم پر چلیں گی اور یہ بلند مطمح نظر جس کی ہم نے اپنی زندگی میں خدمت کی ہے ان کی طرف منتقل ہو جائیگا۔

بقول "لاکرس" کے انسان ان دوڑنے والوں کی طرح ہیں جو اپنے ہاتھوں میں مشعلیں لئے ہوئے ہیں۔ ہر شخص مقررہ حد تک دوڑنے کے بعد اپنی مشعل دوسرے نئے آدمی کو سپرد کر دیتا ہے۔ یہ نیا مشعل پانے والا پہلے کی طرح ایک حد معین تک دوڑ کر یہ امانت دوسرے کو سونپ دیتا ہے اسی طرح یہ سلسلہ قائم رہتا ہے یہاں تک کہ مشعل منزل مقصود تک پہنچ جاتی ہے۔ جب ہم میں سے ہر شخص کے ہاتھ میں ایک مشعل ہے تو ہم پر فرض ہے کہ بجھنے سے پہلے انہیں اپنی اولاد کے سپرد کر دیں۔ ان کی بتیوں کی حفاظت کریں، اور ان کے لئے نئی بتیاں مہیا کرتے رہیں جو پاک صاف، اور خالص روغن میں ڈوبی ہوئی ہوں۔

منظور سروش (بھوپالی)

غزل

(از سید ابراہیم نجم ندوی)

اُس تک گزر خیال نہ وہم و گماں کا ہے — سودا سرِ نیاز میں جس آستاں کا ہے

پہونچا نہ خضر حیف، سر منزل فنا — بچھڑا ہوا رفیق مرے کارواں کا ہے

بلبل وہ ہوں کہ باغ تصور کی سیر ہے — صیّاد کا ہے خوف نہ ڈر باغباں کا ہے

لغزشِ گناہ

اُٹھایا ہاتھ میں چابک مہابت کے فرشتے نے
نکالی طیش میں آنکھیں ہلاکت کے فرشتے نے

جگایا خوف نے پُرشور طوفانوں کی رُوحوں کو
قیامت خیز وحشت ناک ہیجانوں کی رُوحوں کو

اُفق سے ایک سیلِ بیکراں اُٹھا سیاہی کا
یکایک آسماں پر کھنچ گیا نقشہ تباہی کا

کڑکتی اور چمکتی بجلیوں نے پیچ و خم کھائے
گرجتے اور برستے بادلوں کے قافلے آئے

بڑھے ہر سمت سے طوفان یوں ہیبت فشاں ہو کر
دہل اُٹھی فضا ہنگامہ زارِ الاماں ہو کر

کہا ہاتف نے اب دنیا کی شامت آنیوالی ہے
قیامت آنیوالی ہے، قیامت آنے والی ہے

یہ ہیبتناک منظر دیکھکر دریا کے ساحل پر
یکایک چھاگئی وحشت کسی انسان کے دل پر

وہ سمجھا سب نتیجہ ہے یہ اُس کی روسیاہی کا
تہیہ ہو رہا ہے غیب میں اُس کی تباہی کا

نہیں منظور طولِ شیطنت ہرگز خداؤں کو
بہت طیش آگیا ہے سرکشوں پر دیوتاؤں کو

ہراسِ موت بن کر چھاگئی دیوانگی اُس پر
ہوا ایسا کہ یکسر چھاگئی دیوانگی اُس پر

لرزتا، کانپتا جاکر ہوا روپوش مندر میں
کہ خطرہ ہو نہیں سکتا کوئی اللہ کے گھر میں

عدمؔ

"دوست"

(دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست)

کوئی سات آٹھ سال کا ایک لڑکا عدالت کے سامنے پیش تھا۔ پھٹے پرانے کپڑے تھے۔ نہ سر پر ٹوپی تھی نہ پاؤں میں جوتا۔ ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی۔ لیکن چہرے سے کسی قسم کا خوف و ہراس ظاہر نہ ہوتا تھا۔ پولیس نے قلچہ چرانے کے جرم میں اس کا چالان کر دیا تھا اس نے عدالت میں یہ بیان لکھوایا:۔

"میرا نام جمال ہے۔ میرا باپ مر چکا ہے۔ اس کا نام عبداللہ تھا۔ میری ماں زندہ ہے۔ اس نے دوسری شادی کر لی ہے۔ میرا سوتیلا باپ مجھے پیٹتا ہے۔ اور گھر میں نہیں رہنے دیتا۔ میں دو دن سے بھوکا تھا جب بھوک سے عاجز آ گیا تو قلچہ فروش کی دکان سے ایک قلچہ اٹھا لیا۔ میرے پاس پیسے نہیں تھے اس لئے قلچہ فروش نے مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ ماں کے سوا میرا اور کوئی رشتہ دار نہیں۔ میں اپنے گھر واپس نہیں جانا چاہتا۔ کیونکہ وہاں مجھے پیٹا جاتا ہے۔"

چونکہ ملزم کی نیک چلنی کی ضمانت دینے والا کوئی نہیں تھا عدالت نے اسے جیل بھیج دیا۔

جمال ایک مدت تک جیل میں رہا۔ یہاں اس نے نجاری کا کام سیکھا۔ لیکن وہ بھی برائے نام۔ آخر جب وہ جیل سے نکلا تو اب سوچنے لگا کہ کہاں جائے اور کیا کرے۔ کوڑی پاس نہ تھی کام کے لئے اوزار وغیرہ کہاں سے خریدتا۔ دن بھر بازاروں میں ادھر ادھر گھومتا رہا۔ جب رات ہوئی تو کسی دکان کے تختے پر پڑ رہا۔ اگلا روز بھی یونہی گزر گیا۔ بھوک نے سخت پریشان کر رکھا تھا معاً اسے خیال آیا کہ لوگ ان محتاجوں کو جو مسجدوں میں جا بیٹھتے ہیں عموماً روٹی کھلا دیتے ہیں چنانچہ اسی امید پر جمال بھی ایک مسجد میں گیا۔ مغرب کی نماز ہو رہی تھی۔ نمازیوں کے جوتے ادھر ادھر پڑے ہوئے تھے۔ وہ انہیں اٹھا اٹھا کر ایک قطار میں رکھنے لگا۔ اچانک ایک چھوکرے نے شور مچایا "پکڑو۔ چور جوتیاں لے چلا" اس خوف سے کہ کہیں لوگ سچ مچ سے چور سمجھ کر پکڑ ہی نہ لیں۔ وہ مسجد سے نکل بھاگا۔ لیکن تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ لوگوں نے اسے لپک کر پکڑ لیا۔ اور اگلے روز جوتیاں چرانے کے جُرم میں پولیس نے اس کا چالان کر دیا۔ عدالت سے اسے ایک سال کی سزا ہوئی۔

جُوں توں کر کے یہ سال بھی گزرا۔ اور وہ جیل سے نکل کر پھر شہر میں آموجود ہوا۔ اور پھر بازاروں میں پریشان حال پھرنے لگا۔ آخر ایک نانبائی کی دوکان پر جا کر کہا۔

"میں بھوکا ہوں نام اللہ ایک روٹی دلا دو۔"

نانبائی بولا۔

"چل ہٹا کٹا ہو کر بھیک مانگتے شرم بھی نہیں آتی۔"

جمال۔ "کہو تو برتن صاف کر دوں۔ لکڑیاں پھاڑ دوں۔"

نانبائی۔ "چل دور ہو۔ ہٹ ایک طرف راستہ چھوڑ گاہک کا۔"

جمال مایوس ہو کر چلا گیا۔ چوک میں پہنچا تو ایک جگہ لکڑیوں کی دوکان تھی۔ اس امید میں کہ شاید کوئی کام مل جائے ایک طرف بیٹھ گیا تھوڑی دیر بعد ایک سپاہی نے آ کر لکڑیاں خریدیں۔ جمال بولا

"کہو تو میں اٹھا کر لے چلوں۔"

"اٹھا لو۔"

جمال نے لکڑیاں اٹھائیں اور سپاہی کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جب سپاہی گھر پہنچا تو جمال نے مزدوری مانگی۔

سپاہی۔ "کیسی مزدوری؟"

جمال۔ "کیوں لکڑیاں اٹھا کر نہیں لایا۔"

"لیکن میں نے کب کہا تھا۔ تم تو اپنی مرضی سے آئے جاؤ چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

جمال۔ "یہ اچھی رہی" اور پھر "دو چار پیسے ہی دیدو۔ بھوکا ہوں روٹی کھا لوں گا"

سپاہی۔ "دور ہو بدذات کہیں کا"

جمال۔ "دیکھو گالی مت دو۔"

بھلا سپاہی ایسی گستاخی کی تاب کب لا سکتا تھا۔ غصہ سے اس زور سے جمال کے تھپڑ مارا کہ غریب کے منہ سے خون بہنے

ا۔ دملوں میں ہاتھاپائی تک نوبت پہنچی سپاہی اسے کھینچتا ہوا
کی لے آیا۔ پولیس نے بدمعاش سمجھکر چالان کردیا اور عدالت
نے تیسرے جرم کی پاداش میں پانچ سال قید کا حکم سنایا۔

یہ عرصہ بھی جُوں توُں کرکے کٹا۔ لیکن اب جب وہ جیل سے نکلا
روٹی کمانے کے کئی ایک ڈھب سیکھ چکا تھا۔ جیب کاٹنا۔
جوا کھیلنا۔ نقب لگانا۔ قفل توڑنا۔ یہ سب کرتب اُس نے اندر ہی
سیکھ لئے تھے۔ آج بھی جب وہ رہا ہوکر نکلا تو پاس پھوٹی کوڑی
نہ تھی۔ لیکن ایک مقراض تھی جو وہ کسی نہ کسی طرح اندر سے لے
آیا تھا۔ شہر میں آکر وہ چوک میں اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ آج نانبائی کی
دکان پر پلاؤ اور قورمہ پیٹ بھر کر کھانے کے بعد بھی اُس کے پاس
چار پانچ روپے تھے۔ اگلا دن چڑھتے ہی وہ پھر بازار میں آموجود
ہوا۔ لیکن ابھی اس نے پہلے شخص کی جیب پر ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ ایک
سپاہی نے اسے دیکھ لیا اور جھٹ گرفتار کرلیا۔ اب چوتھی بار اسے
دس سال کی سزا ہوئی۔

جماؔل کو جیل میں آئے اب ساتواں سال تھا۔ لیکن اب جیل کی
زندگی کے دن کچھ اس بیتابی سے نہ گزرتے تھے جیسے پہلے گزرا کرتے
تھے۔ وہ اب بھی دل میں سوچا کرتا تھا کہ جیل سے نکلکر کیا کریگا۔ وہ
کبھی اس بات پر بھی پچھتایا کرتا تھا کہ اس نے چوری کا پیشہ کیوں
اختیار کیا۔ شاید کوئی کام مل ہی جاتا۔ ساتھ ہی اسے لوگوں پر بھی
غصہ آتا کہ خلقت کیوں اتنی سنگدل ہوگئی ہے۔ کہ بھائی بھائی کی مدد
سے گریز کرتا ہے۔ کبھی وہ عدالتوں کو کوستا اور کہتا۔
"کون کہتا ہے کہ دنیا میں انصاف ہے۔ کبھی کسی نے میری
بات پر غور نہ کیا۔ بھوک کی شدت سے بیتاب ہوکر صرف ایک
قلچہ چرانے کے جرم میں بچپن ہی میں جیل دیکھنا نصیب ہوا۔ کاش
حاکم اتنا تو خیال کرتا کہ ایک بچے کے لئے بھوک کسقدر ناقابل برداشت
چیز ہے۔ پھر میں نے لوگوں کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلانا چاہا کہ میں مسجد
میں جوتے چرانے کیلئے نہیں آیا تھا۔ لیکن لوگوں نے میری قسموں
کا اعتبار نہ کیا۔ ایک نمازی کے چھوکرے کی بات تسلیم کرلی گئی۔
.... اور پھر اس پاجی سپاہی سے تو کسی نے اتنا بھی نہ پوچھا
کہ تم لکڑیاں جو اٹھوا کر لائے تو پیسے کیوں نہ دئے۔ لیکن مجھے ایک
سپاہی سے ہاتھاپائی کے جرم میں سزا ملگئی.........

کاش مجھے آرام سے زندگی بسر کرنے کا ایک ہی موقع مل جاتا؟"
جیل کے محافظوں کے ظالمانہ سلوک سے تنگ آکر ایک روز
قیدیوں نے شورش کردی اور لگے سپاہیوں کو مارنے۔ شام کا
وقت تھا قیدی جیل کا دروازہ توڑنے کی کوشش کررہے تھے۔
اور آخر ایک سخت جدوجہد کے بعد دروازہ توڑنے میں کامیاب
ہوگئے۔ لیکن جونہی دروازے سے باہر نکلے سپاہیوں نے
باڑ ماری۔ بہت سے گرے۔ لیکن چند ایک باہر نکلنے میں کامیاب
ہوگئے۔ انہی میں جماؔل بھی تھا۔ دروازہ کی طرف آنے سے پیشتر
وہ باورچی خانہ سے باورچی کے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھا لایا تھا۔ جیل سے
باہر نکلتے ہی وہ ایک کھیت میں جا چھپا۔ اور جیل کے کپڑے اتار
کر ایک اجلا جوڑا پہن لیا۔ باقی سب کپڑے وہیں چھوڑ دئے اور صبح
ہونے سے پیشتر بہت دور نکل گیا۔ دن بھر کھیتوں میں چھپا رہتا اور
رات کو چلتا۔ جب بھوک لگتی تو کچی پکی ترکاریاں کھا کر پیٹ بھر لیتا۔
اسی طرح سفر کرتے کرتے وہ ایک شہر میں آنکلا۔ ابھی شہر میں قدم
رکھا ہی تھا کہ اذان کی آواز اس کے کان میں پڑی۔ وہی جماؔل جس نے
آجتک خدا کی درگاہ میں سر نہ جھکایا تھا اذان کی آواز سنکر کھڑا ہوگیا۔
اور جب اذان ہوچکی تو مسجد میں آیا اور وضو کرکے ... نمازیوں کی
سب سے پچھلی صف میں سر جھکا کر جا بیٹھا۔
آج جمعہ تھا۔ کچھ دیر بعد خطبہ شروع ہوا۔ جمال بھی غور سے
سننے لگا۔ ایک مقام پر امام نے کہا۔
"اور جنت کے دروازے نیکوں کے لئے ہروقت
کھلے رہتے ہیں..... لوگو! نیکی کا راستہ اختیار کرو۔ وہ
لوگ جو گناہ کرکے توبہ کرلیتے ہیں۔ اور نادم ہوتے ہیں۔
اللہ اُن کے گناہ معاف کردیتا ہے .... جو لوگ
اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ گناہ سے ڈرتے ہیں۔ صابر
اور قانع رہتے ہیں۔ وہ کبھی پریشان نہیں ہوتے۔"
جب خطبہ ہوچکا تو جماؔل نے بھی "جو نیت امام کی سو میری" کے
مصداق کے مطابق نماز تو پڑھ لی لیکن اب اس کے کانوں میں امام
کے امید افزا الفاظ گونج رہے تھے۔
"جو لوگ اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ گناہ سے ڈرتے
ہیں صابر اور قانع رہتے ہیں وہ کبھی پریشان نہیں ہوتے۔"
یہ وہ الفاظ تھے جو جماؔل نے آج پہلی بار سنے تھے اور جو کیف اور
اطمینان اِن الفاظ سے اُسے حاصل ہورہا تھا اُس کا دل ہی خوب

جانتا تھا۔ اس نے آج دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ اب جو ہو سو ہو۔ نیک بننے کی ضرور کوشش کرونگا۔ نماز ختم ہو چکی تھی۔ لوگ مسجد سے نکل رہے تھے۔ مسجد میں ایک جگہ کوڑا کرکٹ پڑا تھا۔ جمال کی جو نظر پڑی تو سب سے پہلے کوڑا کرکٹ اُٹھا کر باہر پھینکدیا اور پھر کوئیں سے پانی کے ڈول نکال نکال کر مسجد کا صحن دھونے لگا۔ اس کار خیر میں ایک اور نوجوان نے بھی اُس کا ہاتھ بٹایا جب یہ کام ہو چکا تو وہ نوجوان بولا۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"بے وطن ہوں۔"

"کیا کام کرتے ہو۔"

"اللہ مالک ہے کوئی کام مل ہی جائیگا۔"

"یہاں کب سے آئے ہو؟"

"آج ہی آیا ہوں۔"

"آخر کچھ کام کاج جانتے بھی تو ہو گے۔"

"کچھ بُری بھلی نجاری بھی جانتا ہوں۔"

"اوزار کہاں ہیں؟"

جمال مسکرا کر بولا۔

"جب اللہ کچھ دیگا تو اوزار بھی لے لونگا۔"

نوجوان۔ "سنو! میں معمار ہوں۔ میں بھی یہاں مسافر ہوں۔ جہاں میں کام کرتا ہوں تمہیں بھی وہاں کچھ کام مل جائے گا۔ ہاں تمہارا نام کیا ہے۔"

جمال۔ "میرا نام جمال ہے۔ لیکن تم مجھے کل ملو گے کہاں؟"

نوجوان۔ "میں سرائے میں رہتا ہوں۔ میرے ساتھ آجاؤ۔"

جمال۔ "چلو۔ لیکن تم نے اپنا نام تو مجھے تبلایا ہی نہیں۔"

نوجوان۔ "میرا نام فضل ہے۔"

جمال اور فضل کی ملاقات جو مسجد میں ہوئی تھی۔ ایسی مبارک ثابت ہوئی کہ دونوں ایک دوسرے کے غمگسار دوست بن گئے۔ اور دوستی بھی ایسی کہ باید و شاید۔ دونوں کھاتے تھے اور ملکر کھاتے تھے ایک روز جمال نے فضل سے ہنسکر کہا۔

"ایک بات پوچھوں۔ بُرا تو نہ مانو گے۔"

فضل۔ "تم پوچھ تو دیکھو۔"

جمال۔ "تم اُداس کیوں رہتے ہو۔"

فضل۔ "کوئی بات نہیں۔ کوئی بات ہو تو بتاؤں۔"

جمال۔ "سچ سچ بتاؤ جھوٹ سے کیا فایدہ۔"

فضل۔ "بات یہ ہے کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔"

جمال۔ "لیکن وہ ہے کون؟"

فضل۔ "اس کا باپ چوکیداری کرتا ہے۔"

جمال۔ ہنسکر بولا۔

"مجھ سے ذکر تک بھی نہیں کیا۔"

"تم سے شرم آتی تھی۔"

"شادی کیوں نہیں کر لیتے۔"

"کیا کروں کچھ بن نہیں پڑتا۔"

"کیا؟" جمال نے پوچھا۔ "لڑکی نہیں مانتی۔"

"وہ تو مانتی ہے۔" فضل بولا۔ "کون جانے اُس کا باپ کیا کہے۔"

"اگر لڑکی مانتی ہے تو پھر کون سی مشکل ہے۔ تم اس کے باپ سے پوچھ تو دیکھو۔"

شہر میں موسمی بخار کی شکایت تھی۔ کئی روز سے جمال کو بھی بخار آتا تھا۔ پہلے تو وہ کام پر جاتا رہا۔ لیکن جب طبیعت زیادہ بگڑی تو پھر کام پر جانا چھوڑ دیا۔ پانچ دس روپے جو بچا رکھے تھے وہ سب صرف ہو گئے۔ لیکن جب تک سکت رہی خیراتی ہسپتال سے جاکر دوائی لے آتا۔ جب بہت لاچار ہوا تو ایک روز فضل سے کہا۔

"میری حالت اچھی نہیں۔ مجھے خیراتی ہسپتال میں داخل کرا دو۔"

فضل۔ "یہ کیوں؟ یہاں کیوں نہ رہو۔"

جمال ایک دوبار اِدھر اُدھر سر ہلا کر بولا۔

"میرے پاس کوڑی بھی نہیں۔"

فضل۔ "نہ سہی۔ پھر کیا؟"

"دوا کہاں سے آئیگی...... کھاؤں گا کیا۔"

فضل۔ "چلو بس اب چپ رہو تم۔ خدا کی قسم مجھے اگر معلوم ہوتا کہ تم اسقدر بیمار ہو تو تم کو کبھی ہسپتال نہ جانے دیتا لیکن تم تو ہمیشہ مجھ سے اپنی حالت چھپاتے ہی رہے۔"

جمال۔ "نہیں فضل! نہیں۔"

فضل۔ "بس رہنے بھی دو........ وہ دوست ہی کیسا جو مصیبت میں کام نہ آئے؟"

جمال کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

جمال ایک عرصہ بیمار رہا۔ اور فضل نے اس محبت سے علاج بھی کیا اور خدمت بھی کی۔ کہ دیکھنے والے بھی عش عش کرا ٹھے۔ جب جمال پھر کام پر جانے لگا تو دل میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ دوست کے احسان سے کیسے سبکدوش ہو۔

سرائے میں جس کوٹھری میں فضل اور جمال رہتے تھے۔ اس کے ساتھ کی کوٹھری میں ایک رنگساز رہتا تھا۔ جمال تو اکثر لوگوں سے الگ تھلگ ہی رہا کرتا لیکن فضل کبھی کبھی اس رنگساز کے پاس بھی جا بیٹھتا۔ ایک روز جو جمال کام سے واپس آیا تو رنگساز اپنی کوٹھری میں سرائے کے مالک سے بہت غصہ سے باتیں کر رہا تھا۔ جمال دیوار کے ساتھ لگ کر سننے لگا۔ رنگ ساز کہہ رہا تھا۔

"تم نے ہر قسم کے لچے شُہدے یہاں رکھے ہیں۔"

"ہوا کیا؟ سرائے والا بولا" آخر کچھ میں بھی تو سنوں؟"

رنگساز۔ "کل میں مزدوری کے دس دس کے دو نوٹ لایا تھا۔ آج دونوں نوٹ گم ہیں۔ میرے روپے دلوا دو۔ ورنہ میں پولیس میں جا کر رپورٹ کر دونگا۔"

سرائے والے نے پوچھا" تمہارا کسی پر شک بھی ہے؟"

"شک؟ ہے کیوں نہیں۔ میں نے فضل کے سامنے اپنے صندوق میں رکھے تھے۔"

سرائے والا۔" لیکن تمہارے صندوق کا تالا بھی نہیں ٹوٹا ہوا۔"

رنگساز۔" مجھے تالا والا ٹوٹنے سے مطلب نہیں۔ میرے دونوں نوٹ گم ہیں۔ دونوں نوٹوں پر نیلے رنگ کے داغ تھے میں پہچان سکتا ہوں۔ ..... کچھ کرنا ہے تو کرو۔ ورنہ میں پولیس کو بلاتا ہوں۔"

سرائے والا۔" تو پھر تم چاہتے کیا ہو؟"

رنگ ساز۔" یہی کہ پہلے اس فضل کی تلاشی لی جائے۔"

سرائے والا اور رنگ ساز دونوں کوٹھری سے نکلے اور جمال بھی دیوار سے ہٹکر اپنی کوٹھری میں جا بیٹھا۔

سرائے والے نے جمال سے کہا" سنو جمال!" یہ تمہارے دس کے بیس روپے کسی نے چرا لئے ہیں۔ اسے فضل پر شک ہے۔ فضل کا صندوق کونسا ہے؟"

جمال نے اشارے سے بتلا دیا۔ جب قفل توڑ کر فضل کا صندوق کھولا گیا تو کپڑوں کی ایک تہ میں دس دس روپے کے دو نوٹ مل گئے۔ ان دونوں پر نیلے رنگ کے دھبے تھے۔ رنگ ساز خوشی سے بولا:۔

"کیوں میں سچ کہتا تھا نا....... لو دیکھ لو۔ دونوں پر نیلے رنگ کے داغ ہیں یا نہیں۔"

اتنے میں فضل بھی آ گیا۔ سرائے والا بولا:۔

"کیوں بھئی یہ کیا بات ہے۔ ہم تو تم کو شریف آدمی سمجھتے تھے"

فضل نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ جمال اسوقت تک خاموش تھا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ فضل کو ایسی کیا ضرورت کہ اس نے روپے چرا لئے۔ جب سرائے والا اور رنگ ساز ایک دو آدمیوں کے ساتھ فضل کو پولیس کی چوکی کی طرف لے چلے تو جمال بھی ساتھ ہو لیا۔ کوتوالی پہنچکر فضل کو پولیس کی حراست میں ایک طرف بٹھلا دیا گیا جمال بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اب اس نے اپنے دوست کی آبرو بچانے اور اس کے احسان کا معاوضہ دینے کا دل میں پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ اسے فضل کی جوانی پر ترس آ رہا تھا۔ اور وہ سمجھتا تھا کہ اگر اسے ایک بار سزا مل گئی تو پھر اس کی تمام زندگی برباد ہو جائیگی۔

دونوں دوست خاموش بیٹھے تھے۔ سرائے والا اور رنگ ساز داروغہ جی سے باتیں کر رہے تھے۔ جمال نے فضل سے پوچھا۔

"یہ تم نے کیا غضب کیا؟"

فضل نے اپنے دوست کی طرف دیکھا اور ایک آہ بھر کر کہا۔

"لڑکی کا باپ روپے مانگتا تھا........"

جمال بات کاٹ کر بولا۔

"سمجھ گیا۔ لو آج سے توبہ کرو۔ کہ آئندہ کبھی ایسا کام نہیں کرو گے....... اگر تم سے پوچھا جائے کہ تم نے روپے چرائے تو اپنی لاعلمی ظاہر کرنا۔ خبردار بھولنا نہیں....... سنتے ہو۔ میرے صندوق میں جو روپے ہیں انہیں کام میں لاؤ۔"

اتنے میں داروغہ نے بیان لکھنے کے لئے فضل کو اندر بلایا۔ جمال بھی ساتھ ہی اندر چلا گیا۔ اور پیشتر اس کے کہ فضل کچھ کہے وہ بولا:۔

"یہ شخص بے گناہ ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ روپے میں نے چرائے تھے۔"

داروغہ۔ "تم نے چرائے تھے...... تو پھر دوسرے کے صندوق میں کیسے چلے گئے؟"

جمال۔ "میں نے خود رکھ دیئے تھے...... مجھے پکڑ لو میں مفرور قیدی ہوں...... میں چار بار قید ہو چکا ہوں۔ آخری

آہ ثروت آرا

اردو زبان کے گرامی قدر افسانہ نگار سید افضل علی ایم۔ اے جو مرحوم رسالہ مخزن کے دورِ کہولت میں اپنی قابلِ رشک انشا پردازی کے جوہر دکھا چکے ہیں اپنی جوانا مرگ بیوی ثروت آرا کی وفات پر مظاہرۂ رنج و الم کے طور پر ایک منظوم نوحہ ادبی دنیا کو ارسال فرما رہے ہیں۔

مرحومہ ثروت آرا، مکرمہ نذر سجاد کی چھوٹی بہن تھیں۔ ذہانت و فطانت کی نعمت کے ساتھ قدرت نے انہیں بلند ادبی ذوق بھی عطا فرمایا تھا۔ گذشتہ سال سید افضل علی نے بیوی کی مسلسل علالت کے سبب اپنے احباب کے اصرار پر دوسری شادی کر لی تھی۔ غیورِ محبت ثروت آرا اس صدمے کو برداشت نہ کر سکی۔ اور پچھلے دنوں دل کی حرکت بند ہو جانے سے اُس کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن　　　خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

پیری میں زندگی کا سہارا نہیں رہا　　　تم کیا گئیں کہ کوئی ہمارا نہیں رہا
جب تم نہیں تو کس کو دکھائیں جگر کے داغ　　　کس سے کہیں کہ زیست کا چارا نہیں رہا
تم کیا خفا ہوئیں کہ زمانہ بدل گیا　　　یکسر کسی میں خلق و مدارا نہیں رہا
تھا التفاتِ خویش و اقارب ترے طفیل　　　اب دوستوں میں ذکر ہمارا نہیں رہا
باجی شریکِ درد تھیں تم جن سے سرگراں　　　وہ کیا جئیں گی ایک بھی پیارا نہیں رہے
انعامِ اشکبار نوازش جگر فگار　　　سجاد کو بھی صبر کا یارا نہیں رہا
ہے آج سوگوار تہوّر علی بھی! آہ　　　جینا اُسے بھی اپنا گوارا نہیں رہا

ثروت تم آہ! نذرِ نہنگِ اجل ہوئیں!　　　اب اپنے بحرِ غم کا کنارا نہیں رہا
آماجگاہِ ناوکِ بیدادِ غم ہے آہ　　　یہ دل کہ جس میں جلوہ تمہارا نہیں رہا

افضل علی

ثروت آرا کا جواب

عالمِ ارواح سے

کچھ دوستوں میں رسمِ مروت نہیں رہی　　　چاہت نہیں رہی وہ محبت نہیں رہی
پھر زندگی سے آدمی بیزار کیوں نہ ہو　　　جب زندگی میں کوئی حلاوت نہیں رہی
آرام سے ہوں گوشۂ مرقد میں محوِ خواب　　　اب مجھکو تم سے کوئی شکایت نہیں رہی
جو ہے رفیقِ عیش وہ دیکھے جگر کے داغ　　　وہ چارہ گر ہے پاس جو ثروت نہیں رہی
تم جس کے شکوہ ہائے محبت سے تھے خفا　　　ہو مژدہ وہ ہلاکِ شکایت نہیں رہی
کھایا تمام عمر فریبِ وفائے دوست　　　آخر کھلا کہ مجھ سے محبت نہیں رہی
اس مرگِ تلخ کام پہ ہو زندگی نثار　　　مجھ سے تمہارے دل میں کدورت نہیں رہی

افضل جہاں، جہان سے بیزار ہے کہ اب
افضل علی کو اُس کی ضرورت نہیں رہی

۱؎ نذر سجاد　۲؎ سید حیدر یلدرم بی۔ اے　۳؎ ثروت آرا کا لقب

دُنیائے ادب

ہندوستانی تعلیم کا معیار اور تعلیم کی اصلی غرض

مسٹر فچ (مشہور مغربی ماہرِ تعلیمات) کا خیال ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد یہ ہے کہ متعلم کی خوابیدہ صلاحیت کا اِس طور پر احیاء کیا جائے کہ اُس کی آئندہ زندگی اُس کی بیدار صلاحیت سے منتفع ہو سکے اور اُس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اُس کو زندگی کیونکر بسر کرنی ہے۔"

اِس سے زیادہ پھر مقصدِ تعلیم کی توضیح محال ہے۔ اگر کوئی نظامِ تعلیم ایسا ہے جو اِن مقاصد میں ناکامیاب ہے تو وہ اس متبرک نام کا مستحق نہیں۔ تعلیم کی حالت بالکل قلعی کی سی ہے جس سے اصلی جوہر روشن ہو جاتا ہے۔ ہر انسان میں آپ کوئی نہ کوئی روشن پہلو ضرور دیکھیں گے یہی وہ جوہر ہے جس کا احیاء تعلیم کا مقصد اصلی ہونا چاہیئے۔

اِس صورت کو ملحوظ رکھ کر دو امور غور طلب ہیں۔

(۱) یہ کہ بچّوں کی ابتدائی زندگی میں یہ جوہر تھوڑی سی تعلیم و تدریس کے بعد دریافت ہوتا ہے۔ اِس لئے ابتدا ہی سے آپ کسی ایسی تعلیم کو اُس سے مخصوص نہیں کر سکتے جو اُس کے جوہرِ خوابیدہ کے عین مطابق ہو۔ ابتداءً تعلیم ضرور کسی قدر عام ہوگی اور پھر اس کے بعد اُس دریافت کے مواقع حاصل ہونگے۔ آبائی ماحول و گرد و پیش کبھی بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے اِس لئے کہ بچّوں میں غیر محسوس طریقہ پر اُس پیشہ کی مناسبت کے اثرات پیدا ہو جاتے ہیں جن کو وہ ہوش سنبھالتے ہی اپنے اردگرد دیکھتا ہے۔ ایک بنیئے کا بچہ جس دن سے ہوش سنبھالتا ہے اُسی دن سے وہ اپنے ہر چہار طرف حساب و کتاب، ناپ تول تجارتی اشیاء کے نرخ اور اُن کے طریقِ فروخت کے تذکرے سُنتا ہے اور دیکھتا ہے یہ گرد و پیش اُس کی ذہنیت پر غیر معمولی اثر ڈالتے ہیں اور وہ بڑا ہو کر اسی طرح سوچتا ہے اور سمجھتا ہے۔

(۲) با اینہمہ آپ کبھی اُن مستثنیات[1] کو (جو متعدد ہیں) نظر انداز نہیں کر سکتے۔ جب ایک ولی کے گھر شیطان یا شیطان کے گھر ولی پیدا ہوتا ہے۔ ان صورتوں میں بھی استاد کا فرض ہے کہ وہ بچہ کے "جوہرِ خوابیدہ" کو دریافت کرے اور اُسی کے مطابق تعلیم دے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ ایسے بچے جو آبائی مذاق و پیشہ سے علیحدہ شوق و ذوق رکھتے ہیں اُن کی ذہنیت سطحِ عامہ سے بالاتر ہوتی ہے۔ اِسی کو انگریزی زبان میں جینیس کہتے ہیں۔ ایسے بچّوں کی تعلیم اگر اِن کے مذاق کے مطابق دی جاتی ہے تو وہ غیر معمولی انسان بنجاتے ہیں۔ اور دنیا میں کارِ نمایاں انجام دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر آپ ان کو نظر انداز کر دیں گے تو اس سے قوم و ملک کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے کہ ایسا ایک بچہ اسی گرد و پیش کے سو بچّوں کے برابر ہوتا ہے۔

غالباً یہ امر کسی توضیح کا محتاج نہیں کہ تعلیم صلاحیت کے عین مطابق ہونی چاہیئے۔ تعلیم و صلاحیت کا اختلاف تعلیم کو بیکار اور صلاحیت کو برباد کرتا ہے۔ آج ہندوستان کی موجودہ بیکاری کا راز صرف یہی تعلیم و صلاحیت کا اختلاف ہے میں نے صدہا ایسے نفوس دیکھے ہیں جو وکالت میں صرف اس لئے ناکامیاب ہیں کہ اُن کی صلاحیتِ فطری کسی دوسرے پیشہ سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ موجودہ نسل میں اِس اختلاف کے تین اسباب ہیں۔

(۱) موجودہ تعلیم یافتہ نسل کے ولی و والد عموماً انگریزی نصابِ تعلیم سے بالکل ناواقف تھے۔ اُن کے نزدیک لڑکے کا انگریزی مدرسہ میں پڑھنا ہی کافی تھا۔ مضامین کا انتخاب بھی بچّوں کی سہولت پسند طبیعت ہی پر منحصر ہوتا۔ نہ ان کی تعلیم کا کوئی نگراں تھا اور نہ سرپرست۔ گویا اُن کا تعلیمی دور بالکل غیر ارادی طور پر ختم ہوا جس میں بجز کتاب رٹنے یا امتحان پاس کرنے کے اور کچھ نہ تھا۔

(۲) دوسرا سبب غیر ملکی حکومت کی غیر مفید پالیسی تھی جس نے ہندوستان میں تعلیم کی ترویج صرف اس لئے ضروری سمجھی تھی کہ ادارۂ حکومت میں ایسے ماتحتوں کی ضرورت تھی جو قلیل تنخواہ پر حکومت کی مشینری چلا سکیں۔

(۳) تیسرا سبب ہندوستان کی خود غلامانہ ذہنیت تھی جس نے مغرب کی ہر سوغات پر لبیک کہا اور کبھی اس پر غور کرنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ آیا یہ نئی شراب ہماری پرانی بوتلوں میں رکھی بھی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اس غفلت کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ادبیات و فنون

[1] عام قاعدے سے الگ۔

فنا ہو گئے اور اب اگر ہم نے کبھی ترقی کی بھی تو اس کی بنیاد مشرقی تہذیب و تمدن نہیں بلکہ مغربی نمائش پرستی اور مادیت ہوگی وہ ترقی ہماری ترقی نہ ہوگی بلکہ مغربی ترقی ہوگی۔ ہم کو اپنی شکست کا مغرب کی فتح کے سامنے اعتراف کرنا پڑیگا۔

جیسا میں عرض کر چکا ہوں کہ تعلیم کا مقصد متعلم کو طریقۂ زندگی کی تلقین ہے۔ اگر آپ ہر دارالعلوم سے ہر سال ایک سو بھی گریجویٹ ایسے نکالیں جو کتابی معلومات میں یکہ و تنہا ہوں لیکن جن کی علمیت اُن کی روزمرہ زندگی کے لیے کوئی مفید نتیجہ نہ برآمد کر سکے تو میں یہ سمجھوں گا کہ آپ نے اسی تعداد میں سو سو بزاخفش دنیا میں چھوڑ دئے جو نہ صرف مفید نہیں ہیں اور جنہوں نے اپنی زندگی و دولت مفت برباد کر دی بلکہ وہ قوم و ملک کے لئے مضر ہیں۔ ہربرٹ اسپنسر (دنیا کا مایۂ ناز ماہر تعلیمات) کا خیال ہے۔

"یہ سوال کہ ہم کو کس طرح زندگی بسر کرنا چاہیئے۔ سب سے زیادہ اہم ہے۔ نہ صرف مادی لحاظ سے بلکہ ہر لحاظ سے وہ بڑا کلیہ جس میں تمام جزوی مسائل داخل ہیں۔ وہ یہی ہے کہ اخلاق کو کل مواقع اور حالات کی مناسبت سے تربیت دی جائے۔ ہم اپنے جسم سے کس طرح سلوک کریں اپنے معاملات کو کس طرح انجام دیں اور خاندان کی پرورش کس طرح کریں۔ ایک ملکی باشندہ کی حیثیت سے ہم پر کون سے فرائض عاید ہوتے ہیں۔ اور ہم اُن کو کیونکر انجام دیں۔ ہم شادمانی کے اُن ذرائع سے کیونکر فائدہ اٹھائیں جو فطرت نے ہمارے لئے مہیا کئے ہیں اور ہم اپنی قابلیتوں کو کس طرح صاف کریں کہ اُن سے ہم کو اور نیز دوسروں کو اعلیٰ فوائد پہنچیں۔ الغرض کامل زندگی کس طرح حاصل کریں۔ جبکہ ان اصولِ زندگی کا سیکھنا ہمارے لئے اہم اور ضروری ہے تو اس لئے یہی وہ سب سے اہم امر ہے جو تعلیم سے حاصل ہونا چاہیئے۔ تعلیم کا فرض یہ ہے کہ ہم کو کامل زندگی کیلئے تیار کرے۔ کسی نصاب تعلیم کے جانچنے کا صرف ایک یہی معقول طریقہ ہے کہ اُس میں اِس امر کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ اُس سے مقاصد مذکورہ بالا کہاں تک پورے ہوتے ہیں۔"

اب آپ اس معیار کو پیش نظر رکھ کر ذرا ہندوستان کے موجودہ نصاب تعلیم کو ملاحظہ فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ کہاں تک اس پر پورے اترتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ اس تعلیم سے اِن کا جہل بہتر تھا۔ بقول حالیؔ ؎

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کماتے
یہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کے

ہماری تعلیم (اگر وہ تعلیم کہی جا سکتی ہے) مقاصد تعلیم سے بالکل معرا و مبرا ہے۔ نہ ہمیں اخلاق کی تعلیم دی جاتی ہے۔ نہ ہم کو یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ جسم سے کس طرح سلوک کریں؟ نہ ہم کو اس کی خبر ہے کہ اپنے خاندان کی پرورش کس طرح کریں۔ نہ ہمیں یہ آتا ہے کہ بطور ایک رعایا ہمارے فرائض کیا ہیں۔ غرض ہم ایک "پڑھے لکھے جاہل" ہیں جس کا علم کتابی معلومات تک محدود ہے۔

بطور مثال آپ ایک ساتویں درجہ کے لڑکے کو لے لیں جس کی عمر تخمیناً ۱۳ سال کی ہے (سابق قانون کے مطابق ۱۶ سال سے کم عمر کا لڑکا انٹرنس کے امتحان میں شرکت سے ممنوع تھا) آپ اب ملاحظہ فرمائیں کہ اس تیرہ سالہ بچہ کو کون کون سے مضامین پڑھنے ہوتے ہیں۔

(۱) انگریزی (الف) زباندانی (ب) قواعد (ج) ترجمہ (د) غیر معینہ کتب
(۲) حساب (الف) اقلیدس (ب) ہندسہ (ج) الجبرا۔
(۳) جغرافیہ (الف) سیاسی۔
(۴) تواریخ
(۵) ہندی
(۶) اردو۔
(۷) فارسی یا سائنس (الف) فزکس (ب) کسٹری یا ڈرائنگ۔

انگریزی کی شقوں کو اگر آپ علیحدہ مبحث نہ بھی تسلیم کریں تب بھی بقیہ جو مباحث کی تقسیم ہیں اُن کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اس طرح کم و بیش ایک ۱۳ سالہ لڑکے کو ۱۱ مضامین پڑھنے پڑتے ہیں۔ پھر اگر اس کو "کندۂ ناتراش" نہ کہا جائے تو تعجب ہے۔

دوسرا نقص اس نصاب تعلیم کا جس سے اغراضِ تعلیم فوت ہوتے ہیں یہ ہے کہ مباحث کی کثرت، دریافت، احیار جوہر کی مانع ہوتی ہے۔ مسٹر رِچ کا خیال ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد طلبا کی استعداد اور اُن کے جوہر کی کامل شگفتگی ہے۔ مگر یہاں بجائے شگفتگی کے استعداد و جوہر کی پژمردگی ہے۔

اس تعلیم کا صحت پر جو اثر پڑ سکتا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔

علاوہ بریں جو طریقۂ امتحان کا رکھا گیا ہے وہ دراصل امتحانِ قابلیت نہیں ہے بلکہ ابتلا و آزمائش ہے۔

ثانوی و اعلیٰ تعلیم کی عمومیت نے بھی ملک کو سخت نقصان پہنچایا چونکہ آج کل تعلیم کا اصل مقصد حصول ملازمت ہے اور اسکا اصل معیار سعی و سفارش اس لئے کسبِ صلاحیت و قابلیت کی طرف کسی کو توجہ نہیں ہوتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے لوگ بھی ثانوی مدارس اور دارالعلوم سے امتحانات میں کامیاب ہوکر نکلتے ہیں جن کی قابلیت صرف کتابوں تک محدود رہتی ہے۔ آج کل زمانہ کسی ایک فن میں کمال پیدا کرنے کا ہے لیکن یہاں غرض تکمیلِ فن نہیں بلکہ تکمیلِ نصاب ہے پھر ایسی صورت میں کمال کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ آپ اپنا نصاب تمامتر مغربی اصول پر مرتب کریں۔ مگر ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ خُذ ما صفا ودَع ما کدر، مغرب میں ابتدائی تعلیم لازمی ہے لیکن ہندوستان کی طرح ابتدائی تعلیم کے اوقات گنتی اور پہاڑوں میں بیکار صرف نہیں کئے جاتے بلکہ یہ ابتدائی دور صرف اس لئے معین کیا گیا ہے کہ اس زمانہ میں استاد لڑکے کے صحیح جوہر کا پتہ چلائے۔ ہندوستان میں بدترین اساتذہ (جنکو میانجی، یا منشی جی کہئے) ابتدائی مدارس کے لئے مقرر ہوتے ہیں۔ مغرب میں حالت بالکل اس کے خلاف ہے۔ بچوں کی تعلیم کے لئے صرف وہی اساتذہ مقرر کئے جاتے ہیں جو طفولیت کی علم ذہنیت کے مطالعہ میں کافی وقت صرف کر چکے ہیں۔ اور جو جانتے ہیں کہ بچوں کے لئے کیا شے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ یہاں لغو و لاطائل کتابیں صرف سازشوں کی بنا پر نصابِ تعلیم میں داخل کر لی جاتی ہیں۔ مگر مغرب کا جو حال ہے آپ اُس کا صرف اس واقعہ سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ [illegible] میں لندن یونیورسٹی نے ایک کمیشن کا تقرر صرف اس لئے منظور کیا تھا کہ وہ سارے ملک کا دورہ کرکے بچوں سے دریافت کرے کہ وہ کس طرح کی نظمیں پسند کرتے ہیں۔ جب کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی تب نصابِ تعلیم میں ایک کتاب داخل ہوئی۔

میرا خیال ہے (اور اس میرے دعوے کے موید مغرب کے متعدد ماہرانِ تعلیم ہیں) کہ ابتدائی تعلیم کا دور مشکل ترین دور ہے اور اس کے لئے قابل ترین اساتذہ درکار ہیں۔ ایک مسن و معمر شخص سے یہ اخذ کر لینا نہایت آسان ہے کہ اس کا رجحانِ طبیعت کس طرف ہے اور وہ زندگی کے کس شعبہ کو بہت مرغوب سمجھتا ہے لیکن ایک ناسمجھ بچہ سے اخذ کرنا بہت دشوار ہے۔

استاد کا کام صرف اخذِ جوہر ہی نہیں ہے بلکہ تربیتِ جوہر بھی ہے۔ ہندوستان کے ہزارہا ہونہار بچے صرف اس لئے بڑے ہوکر ناکامیاب زندگی بسر کرتے ہیں کہ بچپن میں کسی نے اُن کے صحیح جوہر کا پتہ نہیں چلایا اور اگر چلایا بھی تو کوئی اُس کی تربیت کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ ہندوستان میں پیشہ کا انتخاب صلاحیت و قابلیت پر [illegible] نہیں ہوتا۔ کوئی غیر ارادۃً آبائی پیشہ اختیار کرتا ہے۔ کوئی [illegible] کی ملازمت [illegible] کرتا ہے۔ کسی کی سہولت پسند طبیعت محض آرام طلب پیشوں کی طرف راغب ہوتی ہے۔ غرض یہ ایسی ابتدائی غلطی ہے جس سے ہندوستان کی کثیر آبادی تباہ و برباد ہے۔

تقریباً تمام مغربی ممالک میں ابتدائی تعلیم لازمی و جبریہ ہے اس کے بعد ثانوی مدارس میں صرف وہی طلبہ جاتے ہیں جن کی صلاحیت اس امر کی اجازت دیتی ہے۔ پرشیا (جرمنی) میں ثانوی تعلیم بھی جبریہ ہے لیکن وہی طلباء ثانوی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں جن کو سند یکیٹ اس قابل پاتی ہے۔ بیمار، غبی، مجہول العقل ثانوی تعلیم کے حصول سے ممنوع ہیں۔ اب ثانوی تعلیم جب ختم ہوئی تو پھر ایک انتخاب عمل میں آتا ہے۔ ہر شخص اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکتا۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے خاص شوقِ علم ضروری ہے۔ اس پابندی کا ایک نہایت مفید نتیجہ یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد جو طلباء نکلتے ہیں وہ اپنے فن میں کامل و ماہر ہوتے ہیں۔ جتنے مختلف مضامین کی تعلیم ہندوستان میں ہوتی ہے وہ مغرب میں ممکن نہیں۔ بسا اوقات ایسی پابندیاں بھی عاید کردی گئی ہیں کہ ایک یا دو مضمون سے زیادہ طالب العلم نہیں لے سکتا۔ ایک طرف تو اس پابندی سے طلباء کو نامناسب مشقت نہیں اٹھانی نہیں پڑتی اور دوسری طرف ان کو تکمیلِ فن میں بیحد سہولت ہوتی ہے۔

ہماری غلامانہ ذہنیت صرف اسی تعلیم کو مفید سمجھتی ہے جس سے سرکاری ملازمت مل سکے لیکن مغرب میں چونکہ یہ معیار نہیں ہے اس لئے ہر شخص ہر فن کو بطور فن حاصل کرتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مغرب میں ہر فن کے قدرداں ہیں۔ خواہ وہ معمولی لہو و لعب ہو یا اعلیٰ تعلیمی صیغہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کامل الفن اپنی معاش کی طرف سے مطمئن ہو جاتا ہے۔

تلخیص ماسبق سے آپ پر یہ واضح ہو جائیگا کہ تعلیم کا مقصد احیاء و تربیت جوہر ہے اور اگر کوئی تعلیم ان مقاصد سے معرا ہے تو پھر وہ تعلیم نہیں ہے۔

(ذکیا [illegible])

انگریزی

تھور کی غلطی

مَیں نے یہ سنا کہ تھور نے غلطی سے کونین کی جگہ مارفیا کھا لیا ہے تو مجھے تعجب ہوا۔ وہ میڈیکل کالج کا طالب علم تھا۔ یہ غلطی اس سے کس طرح سرزد ہوئی؟

بہرحال میں اس کے گھر پہنچا۔ وہ بیہوش تھا۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے خدا جانے کیا کچھ پلایا۔ آدھ گھنٹے کے بعد تھور کو ہوش آیا۔ ڈاکٹر صاحب کا حکم تھا کہ اسے جگائے رکھو۔ اگر سو گیا تو پھر فیصلہ ہے یہ کہکر ڈاکٹر صاحب تو اپنی فیس لے کر رخصت ہوئے۔ مَیں نے اپنا کام شروع کیا۔

تھور میری طرف نیم وا آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

مَیں نے کہنا شروع کیا۔

"سنو تھور۔ تم بال بال بچے۔ تم کیسے طالب علم ہو کہ کونین اور مارفیا میں امتیاز نہیں کر سکے؟"

تھور نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"افوہ! ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میرے کانوں کے پاس شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ بھئی سونے دو۔"

اور وہ سو گیا۔

مَیں نے سوچا۔ یہ تو بُری بات ہوئی۔ اس کو جگانے کی کیا تدبیر اختیار کی جائے۔ مَیں نے اُسے جھنجوڑا۔ وہ جاگ اُٹھا۔

افیون کا ست۔ ایک خواب آور دوا جو زیادہ تعداد میں خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

مَیں نے بلند آواز میں کہا۔ "جاگو"

لیکن ابھی یہ لفظ میرے منہ ہی میں تھا کہ تھور پھر سو گیا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ میں اس کے جسم کو جھنجوڑ کر اسے نہیں جگا سکتا۔ کوئی ایسی بات کرنی چاہیئے جو اس کے ذہن کو متاثر کرنے۔ میں نے سوچنا شروع کیا۔ ایسی بات کیا ہو۔ آخر ایک بات سمجھ میں آ گئی۔ تھور کے دل میں صنف نازک کی بہت عزت تھی۔ اگر کوئی دوست اُسے چھیڑنے کے لئے یہ کہہ دیتا کہ "تم صنف نازک کا احترام نہیں کرتے اُن کے جذبات کو مجروح کر دیتے ہو" تو وہ لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو جاتا۔

میں نے ایک فرضی قصہ گھڑا۔ ایکبار پھر اُسے جھنجوڑا۔ وہ جاگ پڑا۔ مَیں نے حقارت سے کہا "سنو تھور میں تمہارا دوست تھا۔ لیکن آج یہ معلوم ہوا ہے کہ تم اپنی دولت کے نشے میں صنف نازک کا احترام کرنا فراموش کر چکے ہو۔ جس دن سے تمہیں دولت ملی ہے اُس دن سے تم نے اپنی غریب منگیتر سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ مَیں تمہیں نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ تھور کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اُس نے کمزور آواز میں کہا۔

"مجھے ذرا اُٹھ لینے دو۔ تمہاری ہڈیاں توڑ دونگا۔"

میں نے کہا۔ "تم کیا ہڈیاں توڑو گے۔ مجھ سے بچتے رہنا۔ کہیں صنف نازک کی ہمدردی کے جذبے سے متاثر ہو کر تمہارا لہو نہ پی جاؤں"۔

تھور نے بستر سے اُٹھنے کی ناکام کوشش کی۔ مَیں نے اُسے دھکیل کر پھر چارپائی پر گرا دیا۔

اُس نے کہا۔ "تم میرے دوست تھے۔ لیکن آج سے دشمن ہو یہ یاد رکھو مَیں اس توہین کا بدلہ لونگا۔"

اس طرح میں پندرہ بیس منٹ اُسے تنگ کرتا رہا۔ اس کے بعد وہ سو گیا۔ اب اُس کی نبض ٹھیک چل رہی تھی۔ پسینہ آرہا تھا۔

جب وہ سو کر اُٹھا۔ تو اُس نے میری طرف ایک عجیب نظر سے دیکھا۔ پھر بولا۔

"مَیں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے فرائض کا احساس کرایا۔ مَیں آج ہی اپنے گاؤں جاتا ہوں تاکہ اپنی منگیتر سے نکاح کر لوں"۔

حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

مَیں نے جو قصہ گھڑا تھا۔ وہ سچ نکلا۔ واقعی تھور نے اپنی غریب منگیتر سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

(ماخوذ)

از سبزی

جاپانی

جاپانی شاعری کے چند نمونے

بہار کے دنوں میں تالاب اور جھیلیں پانی سے لبریز ہو جاتے ہیں۔
اور موسم گرما چاروں طرف پہاڑ کی عجیب چوٹیوں سے اپنے بادل آویزاں
کر دیتا ہے۔ خزاں میں چاند اپنی روشن ترین کرنیں نچھاور کرتا ہے۔
لیکن سردیوں میں صرف ایک سبز شے نظر آتی ہے اور وہ صنوبر ہے۔

جب بہار باغ کے ہر درخت کو معطر کر دے تو میں اپنے گلدستہ کے
لئے کسی ایک پھول کا انتخاب کس طرح کروں؟

اگر ہم غیر ملکی لوگوں کو دور۔ دھند کے کناروں پر۔ کو بیو کی فصل گل
کی خوبصورت صبح کا منظر دکھا سکتے۔ اس طرح ۔تاباں کی خوشبو
کو معطر کر۔ہی ہو۔ تو یقیناً وہ بھی اس حسین سرزمین کے لئے بیقرار
ہو جاتے۔

اطالوی

آرزو

اگر آپ دن بھر انسانوں کی گفتگو سنتے رہیں تو آپ پر روشن ہو جائیگا
کہ اس دنیا میں ہر شخص کسی ایسی بات کی آرزو اپنے دل میں چھپائے
ہوئے ہے جس کا حصول اُس کے لئے ناممکن ہے۔ ہر شخص یہ
سمجھتا ہے کہ نہ پوری ہونے والی آرزوئیں غیر مفید ہیں مضحک ہیں۔
لیکن پھر ہر شخص اس قسم کی آرزوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ قارون کی دولت۔
چنگیز کی طاقت۔ سرکشیا کا حسن حاصل کرنے کی خواہش ہر دل میں
موجود ہوتی ہے۔ میں اس بات کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ ناممکن
آرزوؤں کی طرف مائل ہونا ذہن انسانی کے تنزل کی نشانی ہے۔
لیکن میں اپنے دوستوں کو یہ مشورہ ضرور دونگا۔ کہ تخیل کی اس آوارگی
کا زیادہ دیر تک شکار نہ ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص اس پرواز
تخیل کا دلدادہ ہے۔ اور جو اپنے خیالات کی روانی کو نہیں روک سکتا وہ
شخص اُس قوت عمل کے ایک بڑے حصے سے محروم ہو جائیگا جو پیکار حیات
میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔

جرمنی

ظرافت اور ابتذال

عام طور پر ادب کو مبتذل عناصر سے پاک رکھا جاتا ہے اور جس مصنف
کی تحریریں اس قسم کے عناصر پائے جائیں جن میں ابتذال کا رنگ جھلکتا
ہو اُسے بدذوق کہنے میں تامل نہیں کیا جاتا۔ لیکن ظریفانہ تحریروں میں
عناصر کے استعمال کی اجازت ہے۔ مشاہدے میں آیا ہے
کہ خوش اطوار مہذب۔ خوش ذوق حضرات بھی اکثر فطرت کے صحیح
لیکن بگڑے ہوئے مرقعوں پر ہنستے ہیں۔ اس کے علاوہ خوش ذوق
اور خوش اطوار اور معمولی لوگوں کے رویے میں جو اختلاف ہوتا ہے
اُس کا اظہار بھی بعض اوقات ہنسی کا موجب ہوتا ہے۔ پھر اکثر
ڈراموں اور ناولوں میں واقعہ نگاری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بد ذوق
اشخاص کی گفتگو کو اصلی رنگ میں پیش کرنا پڑتا ہے۔ اس واقعہ نگاری
کو بدذوقی نہیں کہا جا سکتا۔ ارسٹوفینیس کے بہت سے ڈرامے اس
قسم کے مناظر سے بھرے ہوئے ہیں جو یہی وجہ ہے کہ مجھ کو
...تبع مضحک" [illegible] میں لکھا ہے۔

یونیورسل لمیٹڈ
انشورنس میں ایک نیا اضافہ
یہ فخر صرف یونیورسل پراویڈنٹ کمپنی لمیٹڈ کو ہی حاصل ہو کہ پانچ روپیہ ماہانہ ادا کرنے پر آپ ہزاروں کے حقدار ہو سکتے ہیں
کمپنی کا ممبر بننے کیلئے صرف تین دفعہ پانچ روپیہ بمعہ مجوزہ فارم درخواست بھیج دیجئے ہر ممبر کی وفات پر اس کے وارثوں کو ہزاروں روپے ادا کئے جاتے ہیں۔ اگر ممبر پندرہ سال تک زندہ رہے تو روپیہ اس کو ملجاتا ہے
مفصل حالات کیلئے فہرست قوانین اور فارم درخواست ذیل کے پتہ سے طلب کیجئے۔ معتبر و باسنتار بارسوخ ایجنٹوں کی ضرورت ہے "ادبی دنیا" کا حوالہ ضرور دیجئے
یونیورسل پراویڈنٹ فنڈ کمپنی لمیٹڈ مال روڈ لاہور
خرید و فروخت کی بہترین جگہ
دی یونائیٹڈ کمیشن مارٹ گورنمنٹ اینڈ سول کمیشن
نمبر ۱- ایبٹ روڈ لاہور ٹیلیفون نمبر ۹۸۰
ضرورت
ان انٹرنس و مڈل پاس شدہ نوجوانوں کی جو ہمارے کالج سے ٹائپ، شارٹ ہینڈ سیکھ کر معقول ملازمتیں حاصل کرنی چاہیں
پراسپکٹس بالکل مفت ادبی دنیا کا حوالہ دیکر پتہ ذیل سے طلب کریں!
امپیریل کالج آف کامرس میکلوڈ روڈ لاہور
پامسٹ گائڈ (با تصویر)
(مصنفہ آئی۔ ڈی وا پامسٹ لاہور)
یہ علم پامسٹری میں ہاتھ ریکھا اشارات سے بھری ہوئی
کی طویل حجم اور ضخامت اندازوں قابل دید کتاب ہے جس میں فن
خطوط و نشانات اور ہر انگلی کیفیت نہایت مشرح
ایک انجان آدمی بھی لکیروں
حال دریافت کر سکتا ہے
بیان کی گئی ہیں جن کے ذریعے انسانی قسمت کا
اسکے علاوہ تمام نشانات مثلاً تل، داغ، دھبہ وغیرہ کی تشریح کی گئی
ہے جو انسانی ہاتھ پر قدرت نے بنائے ہیں۔ کتاب نہایت جامع مستند اور عام فہم ہے
المشتہر
نارتھ انڈیا پامسٹ بیورو حلقہ نمبر ۳ لاہور

ناروے

پریوں کی کہانیاں

نقادوں نے "پریوں کی کہانیوں" کی بڑی بڑی قسمیں مندرجہ ذیل قرار دی ہیں۔
"شعری" "اخلاقی" "ظریفانہ" "متصوفانہ" بعض کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جن میں مندرجہ بالا قسموں کا مجموعہ سمجھا جاسکے۔ بعض کہانیاں ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ کر غیر ملک کا لباس پہن لیتی ہیں۔ لیکن ناروے کی وہ کہانیاں جنہیں "منظری" کہا جاتا ہے۔ اپنی نوعیت نہیں بدلتیں۔ ناروے میں اس قسم کی کہانیاں عام ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ یہاں کی کہانیوں میں ایسے فطرتی مناظر کا ذکر آتا ہے جو ناروے سے خاص ہیں۔ اور اس طرح فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کہانیاں ناروے کے مصنفین کی طبعزاد ہیں۔ یا دوسرے ملکوں سے آئی ہیں۔
سنڈنگ کی ایک تصویر میں ایک لڑکے کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ وہ وحشت زدگی کے عالم میں ایک تاریک اور سنسان جنگل میں سے بھاگ رہا ہے۔ جنگل کے سایوں۔ ہوا کی سنسناہٹ۔ خاموشی۔ درخت کی جڑوں نے کسی ایسے مافوق الفطرت وجود کی صورت اختیار کر لی ہے جو لڑکے کو اپنے چنگل میں دبوچنا چاہتا ہے۔
یہ منظر خاص ناروے کی منظری کہانیوں کا "منظر" ہے۔

جوہن بوجر (ناروے)

روسی

ادب

تمام ادبی تخلیقات۔ نثر سے متعلق ہوں یا شعر سے۔ اُن احساسات اور تخیلات میں غرق ہوتی ہیں جن میں بنی نوع انسان مشترک طور پر حصہ دار ہیں۔
پیدائش کے راز کو حل کرنے کے بعد ہم موت کے راز میں غرق ہو جاتے ہیں۔ ہم کو ایک عظیم الشان مقام پر پھینک دیا گیا ہے۔ ہم اس مقام کو "کائنات" کہتے ہیں۔ لیکن ہمیں اس عجیب شے کے متعلق کوئی صحیح علم نہیں۔ ہماری تنہائی بے مثال ہے۔ اس خوفناک تنہائی کا مکمل احساس بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ لیکن یہ احساس کسی نہ کسی صورت میں ہر شخص کے دل میں موجود رہتا ہے۔ اس احساس کا اظہار اور اس کے پیدا کردہ اندوہ کا بیان بھی ادب کا ایک موضوع ہے۔ انگلستان کا بائرن۔ اطالیہ کا لیونارڈ اوینچی انتہائی کے شاکی ہیں۔

(مکسیم گورکی)

پشتو

غرض مندی

اگر تو دوسروں سے کچھ غرض نہ رکھے تو کوئی تجھ سے غرض نہ رکھیگا۔ جس شخص کو دنیا سے کچھ غرض نہیں اسکی کشتی نہیں ڈوبتی۔ تنہائی پسند خلوت میں آرام سے ہے۔ شہرت پسندوں کو غرض نے رسوا کیا ہے۔ دنیا بے وقوفوں کی بستی ہے۔ عقلمند کو دنیا سے کوئی غرض نہیں۔ رحمان! میں درد محبت میں بیقرار ہونے پر بھی اسطرح خاموش ہوں کہ مجھے دوا سے کوئی غرض نہیں۔۔۔

(دیوان رحمان) فقار (انبالوی)

فارسی

شجاعت

ہمارے علما کی تعلیم ہے کہ جو شخص خطرے کے وقت لڑائی کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس کی حماقت کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ یا تو وہ اپنے دشمن کو مغلوب کر لیتا ہے۔ اور اُسے مار ڈالتا ہے۔ یا دشمن اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے۔ اگر وہ اپنے دشمن کو جام موت پلاتا ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ اُس کے ذمے بیگناہ کا خون ہے اور اس قتل کی سزا اُسے ضرور ملیگی۔ اگر اُس کا دشمن غالب ہو تو اس کیلئے دوزخ کا دروازہ کھلا ہے۔ اِن حالات میں یہ کہاں کی دانائی ہے۔ کہ آدمی ایسا کام کرے جس کا نتیجہ ناکامی اور عذاب ہو!

عبید زاکانی

سنسکرت

اقوال صائبہ

گنہگار یہ سمجھ کر گناہ کرتا ہے کہ وہ واقعات سے مجبور ہے۔

دانا لوگ جوئے کو۔ عورتوں کی محبت کو شراب کو خطرناک تصور کرتے ہیں بلیکن دیکھا جاتا ہے کہ یہی لوگ اِن چیزوں کے دلدادہ بھی ہوتے ہیں۔

مرد ہو یا عورت۔ جوان ہو یا بوڑھا۔ وقت سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتا ہے۔

آدمی کو بڑھاپے یا موت سے کوئی شے نہیں بچا سکتی۔ دوا مقدس کتابیں۔ جادو۔ سب بیکار ثابت ہوتا ہے۔

کوئی کسی کا نہیں۔ ہم جو اپنے رشتہ داروں سے ملتے ہیں۔ تو ہماری مثال ان مسافروں کی سی ہے جو چوراہے پر ملیں۔

یوگوسلیویا

انسانی زندگی کا انجام

انسانی کشمکش کا انجام موت ہے۔ قبر میں دنیا کے تمام افکار محو ہو جاتے ہیں۔ ہماری رُوح کے کمزور جہاز کے لئے ایک اور بیکراں سمندر پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ سمندر ایک پُر اسرار شے ہے جسے فانی آدمیوں کی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ گہوارے سے لیکر گور تک انسان بہت کم حقیقتوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ اور موت کے بعد کے واقعات کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جب ہم موت کے بعد کے واقعات سے بحث کرتے ہیں تو ہماری گفتگو بچوں کی بے معنی بکواس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

قبر کا کتبہ ہمارے نقوشِ قدم میں سے آخری نقش ہے۔ ذرا قبر کو کھودو۔ اور دیکھو۔ وہ ذہانت۔ وہ قوتِ استدلال کہاں گئی؟

یہ چیزیں قبر میں نہیں ہیں!
وہ حسن۔ دولت۔ شہرت کہاں گئی!

یہ چیزیں بھی قبر میں نہیں ہیں۔
یہ چیزیں اس طرح محو ہو گئیں جس طرح رات کی خاموشی میں اُلّو کی چیخ غائب ہو جاتی ہے۔ ہوا کی طرح۔ دھوئیں کی طرح۔

([illegible])

سنو میں آپکے بھلے کی کہوں
آپ کیوں اداس ہیں۔ کیا آپ کو کسی لڑکے یا لڑکی کی
شادی کرنی ہے تو آپ دی انڈین میوچل پراویڈنٹ فنڈ نمبر ۱
نسبت روڈ لاہور کے ممبر بن جائیے اس میں ایک یا دو روپیہ ماہوار چندہ دیدو سے
رقم ادا شدہ کا دس گنا تک ملنے کی امید ہے پس موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیجئے اور آج ہی پراسپکٹس منگوا کر درخواست ممبری کریں (۲) اگر آپ بال بچوں کو در حقیقت پیار
کرتے ہیں تو ان کی امداد کیلئے کچھ انتظام کر دیں شرح چندہ ماہواری صرف ایکروپیہ یا آٹھ آنہ ہے (۳) اگر آپ بیکار ہیں تو ایجنسی لیکر اپنی مشکل آسان کر سکتے ہیں
شرح کمیشن نہایت معقول ہے درخواست ممبری بنام
(ادبی دنیا کا حوالہ ضرور دیجئے)
سکریٹری دی انڈین میوچل پراویڈنٹ فنڈ نمبر ۱ نسبت روڈ لاہور روانہ کریں

ادبی و علمی کتابوں میں خاص رعایت
دیگر خاص کتابیں
نام کتاب
مفتاح العلوم شرح مثنوی مولانا روم
تمام کتابیں منگانے کا پتہ محمد جمیل منیجر کتب خانہ جواہر العلوم حلقہ ۲۵ لاہور

ہندوستان کے محکمہائے تعلیم میں منظور شدہ
اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ
ادبی دنیا
مشرق و مغرب کے جدید و قدیم ادبیات کا مرقع
نومبر
ڈاکٹر آنریبل جسٹس سر عبدالقادر
ایڈیٹر تاجور نجیب آبادی
سالانہ چندہ چار روپے بارہ آنے محصول وی پی بھر
Copies. 5000. Price As. 6-6.

TO YOU.

You are requested to persue the advertisements of this Magazine, and make it a rule to refer Adabi Dunya when writing to those. It will facilitate entering into business and bring success.

F. M. SAQI,
Advertising Manager,
ADABI DUNYA,
LAHORE.

ہندوستانی لڑکوں اور لڑکیوں کا باتصویر ہفتہ وار اخبار

پریم

ملا تاجور و پروفیسر چھجو لال ایم اے دہلوی کی ایڈیٹری میں شائع ہوتا ہے اس اخبار کی امتیازی خصوصیات جن پر اب تک یہ کاربند رہا ہے حسب ذیل ہیں

(۱) نہایت سادہ سلیس اور ایسی عام فہم زبان استعمال کی جاتی ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کی سمجھ میں آسکے (۲) بچوں کی زبان میں بچوں کیلئے ایسی کہانیوں کا سلسلہ جن کے ذریعہ شہری زندگی کے ہر شعبے کے متعلق ہر قسم کی معلومات کا ذخیرہ غیر محسوس طور پر اُن کے دماغ میں منتقل کیا جا سکے (۳) پریم سبھا کے عنوان کے تحت میں ہم جماعتوں کی پر مذاق باہمی گفتگو کے ذریعے بچوں کو مضمون نویسی و خطوط نویسی، اُردو کی تذکیر و تانیث، اُردو الفاظ کی املا کی درستی۔ ضروری گرامر۔ ادب۔ اخلاق تاریخ و جغرافیہ، سائنس۔ بڑے چھوٹے اور برابر والوں سے گفتگو کے آداب کی ایسے دلچسپ طریقے سے تعلیم دینا کہ بچے محسوس بھی نہ کریں کہ ہم کوئی سبق پڑھ رہے ہیں (۴) موجودہ کورسوں نے بچوں کے جذبۂ ظرافت (ہیومرس نیچر) کو مٹا دیا ہے۔ اس جذبہ کو ایسی نتیجہ خیز اور پر مذاق کہانیوں کے ذریعے بچوں میں پیدا کرنا جو شریفانہ مذاق کی حد سے باہر نہ ہوں (۵) ایسے پر معلومات اور دل لبھانے والے مضامین شائع کرنا جو بچوں میں اُردو ادب کیلئے پیاس پیدا کریں (۶) آسان و موزوں اور ایسی رس بھری زبان میں چھوٹی چھوٹی نظمیں چھاپنا جو بچوں کیلئے سبق آموز ہونے کے علاوہ دماغی تفریح کا باعث ہوں (۷) بچوں میں ملکی رواداری اور مذہبی رہنما پیشواؤں کی عزت کے پاکیزہ جذبات پیدا کرنا (۸) اخبار جس محنت اور غور کے ساتھ ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکیگا کہ ہر فقرے کو بہت سے فقروں سے انتخاب کر کے جانچ تول کر مضمون درج کیا جاتا ہے۔ ایڈیٹر کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اخبار کے تمام مضامین کے ہر فقرے کے متعلق یہ بتا سکتا ہے کہ یہ فقرہ کیوں درج کیا گیا۔ اور اس کے بجائے کوئی فقرہ کیوں نہ استعمال کیا گیا (۹) اس اخبار کو جس نوعیت سے ترتیب دیا جاتا ہے اس کے متعلق ہماری رائے ہے کہ متوسط ذہانت کا ایک بچہ سال بھر بغور پڑھکر اُردو معلومات میں انٹرینس کے طالب علم کی برابری کر سکیگا۔

ذیل میں اس کے متعلق بہت سی رایوں میں سے چند رایوں کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے

اخبار ٹریبیون لاہور - پریم لڑکوں اور لڑکیوں کا ہفتہ وار باتصویر رسالہ ہے، جو مشہور اُردو شاعر مولانا تاجور نجیب آبادی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ سٹاف میں مولانا موصوف کے علاوہ لالہ چھجو لال ایم اے دہلوی آنریری ایڈیٹر کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ لکھائی، چھپائی دیدہ زیب۔ طرز ادا صاف زبان سادہ جسے ہر اُردو خواں بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ مضامین آسان دلچسپ اور بچوں کے لئے ہر طرح سے موزوں و سبق آموز ہیں رسالہ کی قابل ذکر امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ہر قسم کے فرقہ وارانہ مضامین سے پاک ہے۔ اسکا واحد مقصد یہ ہے کہ بچوں میں اخوت و ہمدردی کے پاکیزہ ترین جذبات پیدا کئے جائیں۔ ٹریبون ۲۴ جنوری ۱۹۲۶ء

جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی - بچوں کا یہ ہفتہ وار باتصویر رسالہ مولانا تاجور نجیب آبادی کے زیر ادارت شائع ہوتا ہے۔ اس کے جاری کرنے سے فاضل ایڈیٹر کا مقصد یہ ہے کہ ہندو مسلم بچوں کے دلوں میں ابتدا عمر سے ہی باہمی اتحاد و الفت کا بیج بو دیا جائے۔ کسی کو یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ یہ مقصد نہایت بلند ہے، مولانا تاجور زبان اُردو کے مشہور ادیب، ناقد ہیں اور مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ انکی نگرانی میں جو مضامین چھاپے جائینگے وہ ضرور بلحاظ لفظی اور معنوی خوبیوں کے اعلیٰ معیار کے ہونگے

خان بہادر میر ناصر علی خاں صاحب ایڈیٹر صلائے عام دہلی - یہ رسالہ پریم بظاہر اگرچہ بچوں کیلئے سمجھا جاتا ہے مگر میں بڈھا بھی اسے جی لگا کر پڑھتا ہوں۔ شاید اس وجہ سے کہ مزاج میں بڈھا اور بچہ ایک سمجھا جاتا ہے۔ رسالہ پریم کے اہتمام چھپائی اور کاغذ کی تعریف تو بیکار ہے ان خوبیوں کا جواب مشکل ہے۔ مگر اسکے مضامین کی خوبی بھی لاجواب ہے جنکو پڑھکر بچے تو بچے جوان اور بڈھے بھی خوش

حضرت خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے سے - بچے اور عورتیں اس کو نہایت شوق سے پڑھتے ہیں اور اس کے آنے کی راہ دیکھا کرتے ہیں۔ بہت ہی خوبصورت اور رنگین باتصویر رسالہ ہے کہ اس کے ایڈیٹر طبع انسانی کے فلسفہ کو خوب سمجھتے ہیں۔

خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب ایم اے آئی ای ایس ڈویژنل انسپکٹر مدارس لاہور ڈویژن - میری رائے میں رسالہ پریم ہندوستانی بچوں کیلئے بہت مفید دلچسپ اور کار آمد ہے۔ خصوصاً اس کا یہ پہلو کہ مختلف قوموں کے بچوں کو رواداری اور محبت کی تعلیم دیتا ہے۔

مولوی احمد عبداللہ خاں صاحب ارشد نے مرکنٹائل پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپکر دفتر ادبی دنیا کشمیر بلڈنگ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا۔

رجسٹرڈ ..... ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد ۳ — بابت ماہ نومبر ۱۹۳۰ء — نمبر ۵

تصاویر:- (۱) سدنگی) وادیٔ کانگڑہ (۲) محوِ خیال - (۳) رفتۂ خواب - (۴) سید حسن برنی بی - اے ایل ایل بی - (۵) آنریبل ملک فیروز خاں نون (۶) آنریبل ڈاکٹر گوکل چند نارنگ - (۷) غالب -

حال و قال

ادبی دنیا کے غیر مقامی اسٹاف کے متعلق جو اعلان کیا گیا تھا اُسے پڑھکر ملک کے بہت سے مشہور اہلِ قلم نے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ ابھی کچھ ناموں کا انتخاب باقی ہے جن حضرات کے متعلق فیصلہ ہو چکا ہے اُن کے اسمائے گرامی شایع کئے جاتے ہیں۔

سیّد حسن برنی۔

ملک کے مشہور گراں پایہ مصنّف سیّد حسن برنی. بی. اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ایڈووکیٹ کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ اُن کی بے نظیر تالیف "البیرونی" انجمن ترقیِ اردو کی چند مفید ترین مطبوعات میں سے ہے۔ البیرونی کو جنہوں نے مبصرانہ نگاہ سے پڑھا ہے وہ حسن برنی کی مورخانہ تحقیق و تدقیق کی داد دے سکتے ہیں۔

ادبی دنیا اپنی اِس خوش طالعی پر جتنا بھی فخر کرے بجا ہے۔ کہ سیّد حسن برنی جیسا منتخب انشا پرداز، مایۂ ناز مصنّف اور سحر طراز ادیب اِس کے عملۂ ادارت میں شامل ہے۔

سیّد صاحب موصوف نے ایک خاص پروگرام مرتب فرمالیا ہے آئندہ اُن کے تنقیدی تاریخی اور علمی مقالات ادبی دنیا میں مسلسل شایع ہوا کریں گے۔ ہم سیّد صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اُنہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود اپنی خدمات کا کوئی معاوضہ لینا منظور نہیں فرمایا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ شاید اُنہوں نے ہماری ضروریات کو عریاں شکل میں دیکھ لیا ہے۔

مسٹر کنھیالال ایم۔ اے۔

مشہور اردو رسالہ چاند کے ایڈیٹر مسٹر کنھیالال صاحب ایم اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ الہ آباد نے ادبی دنیا کے حصّہ "دنیائے ادب" کے لئے مختلف زبانوں سے ترجمہ اور اقتباس کا کام اپنے ذمہ لیا ہے۔

صاحب موصوف کے مفید مضامین کی زبان اردو کی بجائے ہندوستانی ہوتی ہے۔ یعنی مروجہ حجازی اردو کے بدلے وہ عام فہم سلیس، اور سادہ زبان میں مضمون نگاری کرتے ہیں۔ اور یہی ادبی دنیا کا مقصدِ اشاعت ہے۔ آپ نے بھی اپنی خدمات بلامعاوضہ پیش کی ہیں۔

مولینا سجاد میرٹھی۔ مولوی فاضل پنجاب یونیورسٹی فاضل دیوبند۔ کے عربی ادب سے مترجمہ مضامین ادبی دنیا میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آئندہ وہ غیر مقامی عملۂ ادارۃ کے رُکن کی حیثیت سے ادبی دنیا کے لئے مستقل طور پر مصر و بیروت کے مجلۃ الہلال — المقتطف۔ الزہرا۔ الکلیۃ اور دیگر معیاری رسالوں سے بلند ترین مضامین کا ترجمہ کیا کریں گے۔

حضرت خواجہ حسن نظامی کا ایک بلند پایہ مضمون موصول ہو چکا ہے آئندہ آپ کے بیش بہا مضامین مسلسل شائع ہوا کریں گے۔

خواجہ صاحب کا اندازِ تحریر اپنی شگفتگی، دل آویزی اور حسن آفرینی کے اعتبار سے نقاد کے تجزیے سے بالاتر ہے۔ اُن کے الفاظ اور معانی میں ایسا موزوں رابطہ ہے کہ فنِ تنقید زعمِ ہمہ دانی کے باوجود اُن کے مدارجِ فن کے سامنے عاجز نظر آتا ہے۔ عموماً اہلِ قلم ایفائے عہد کو وہ اہمیت نہیں دیتے جو مذہب میں اُسے حاصل ہے لیکن خواجہ صاحب کے متعلق ہم اپنے ناظرین کو یہ اطمینان دلا سکتے ہیں۔ کہ اُن کے وعدے ایفا ہونگے۔ ایک مذہبی رہنما ہونے کی حیثیت سے ہم بجا طور پر اُن سے یہ توقع کر سکتے ہیں۔

اِس اشاعت میں آنریبل ڈاکٹر گوکل چند نارنگ اور آنریبل ملک فیروز خاں نون کی تصاویر شائع ہو رہی ہیں۔

نئے انتخاب کے بعد حکومت خود اختیاری کا قلمدانِ وزارت ڈاکٹر صاحب موصوف کے سپرد کیا گیا ہے۔ ملک صاحب موصوف وزیرِ تعلیم مقرر ہوئے ہیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اِس سے بہتر انتخاب نہ ہو سکتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب اپنی قانون دانی، تدبر اور قوتِ بیان کے لئے مشہور ہیں۔ اِن کی ذات سے ملک کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔

ہم ڈاکٹر صاحب موصوف کے انتخاب پر اس لئے بھی زیادہ مسرور ہیں کہ وہ ایک قابلقدر اردو شاعر ہیں۔ شاید یہ بات عام طور پر اہلِ علم و ادب کو معلوم نہ ہو۔

ملک صاحب موصوف اپنے سیاسی تجربے، گزشتہ کامیاب وزارت اور اپنی ذہانت و بیدار مغزی کے باعث ہر دلعزیزی حاصل کر چکے ہیں۔

آنریبل سر جوگندر سنگھ وزیرِ زراعت انگریزی کے مشہور انشا پرداز ہیں۔

زراعتی محکمے میں اِن کے دیرینہ کامیاب تجربے، اِن کی شہرت، اِن کی مسلمہ قابلیت نے اِن کو اس معراجِ سیاسی پر پہنچا دیا۔ کہ وزارت کے اعزاز کے لئے اُن کا کوئی حریف نہیں ہوا۔

چند مفید تجاویز۔

ادبی دنیا کو زیادہ سے زیادہ مفید، دلچسپ اور شاندار بنانے کا خیال ہمیں آٹھ پہر گھیرے رہتا ہے۔ آئے دن نت نئی تدبیریں سوچتے ہیں۔ اور مقدور بھر اُن پر عمل کرتے ہیں۔ گزشتہ ڈیڑھ سال میں ایک دن بلکہ ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جب ہم نے ادبی دنیا کو ہر حیثیت سے مکمل اور آراستگی و پیراستگی سے بے نیاز سمجھا ہو۔

اِس اشاعت سے ہم نے "تنقیدِ شعری" کے لئے ایک صفحہ وقف کر دیا ہے۔ اِس کا مقصد یہ ہے کہ ملک کے نوجوانوں میں صحیح ذوقِ شعر پیدا کیا جائے اور اُن کو اِس بات سے آشنا کیا جائے کہ آرٹسٹ اپنی تخلیقات کو کیسے نادر معانی سے لبریز کر دیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر نوجوان شعر کو "تفریح" خیال کرتے ہیں۔ اُن کو یہ خیال ہی نہیں آتا کہ اچھے شعر کے الفاظ و تراکیب اپنی خیال آفرینی کے اعتبار سے بے نظیر ہوتے ہیں۔ اِن میں یہ قوت ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں ایک سلسلۂ خیال پیدا کر دیں۔ کوشش کی جائیگی کہ اِس صفحے میں فن کے اُن تمام نکات کا لحاظ رکھا جائے جو شعر سے مخصوص ہیں۔ اور خالص جمالیاتی نقطۂ نظر سے تنقید کی جائے۔ اِس سلسلے میں ہم نے پہلے غالب کا ایک شعر انتخاب کیا ہے۔ ہم اپنے ناظرین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اِس سلسلے میں ہماری مدد کریں۔ بلند پایہ شعر ارسال کریں۔ اگر وہ ہمارے معیار پر پورے اُترے تو صفحۂ جمیل پر شائع کئے جائیں گے۔ اور دوسرے صفحے پر اُن کی تنقید و تفسیر شائع کی جائیگی۔

ہم نے محسوس کیا ہے کہ اردو میں کثرت سے غلط الفاظ اور تراکیب رائج ہو گئی ہیں۔ اردو انشا پردازوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو عربی اور فارسی سے ناواقفِ محض ہونے کے باوجود اپنی تحریروں میں کثرت سے عربی اور فارسی الفاظ و تراکیب کا استعمال کرتا ہے۔ اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض الفاظ بے محل استعمال ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ الفاظ کا غلط تلفظ عام ہوتا جا رہا ہے۔ ہم کوشش کرینگے کہ وقتاً فوقتاً ایسے الفاظ کی تشریح کرتے رہیں۔ تاکہ اردو خواں حضرات معمولی غلطیوں اور فروگذاشتوں سے محفوظ رہیں۔

ہم مسرت سے اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ افسانوں اور ڈراموں کے متعلق ادبی دنیا جس مقصدِ اعلیٰ کو منتہائے نظر بنائے ہوئے تھا وہ پورا ہوتا نظر آ رہا ہے۔ اربابِ علم و فن نے غور کیا ہوگا کہ ادبی دنیا میں ایسے افسانے جن کا مرکزی جذبہ ہوس یا محبت کا تاریک پہلو ہو شائع نہیں ہوتے۔ اِس قسم کے افسانوں کی اشاعت سے بھی پرہیز کیا جاتا ہے۔ جن میں کوئی عنصر مخربِ اخلاق ہو۔ ہم خوب سمجھتے ہیں۔ کہ ادب کا مقصد تخلیقِ حسن ہے۔ اور کوئی ادبی تحریر خالص اخلاقی نقطۂ نظر سے نہیں جانچی جا سکتی۔ اکثر ادب میں تضاد و توازن کی خاطر . . . . . . زندگی کے تاریک اور گناہ آلود پہلو بھی دکھائے جاتے ہیں۔ لیکن اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نیکی اور حسن کو زیادہ درخشاں رنگوں میں پیش کیا جائے۔

سب کچھ سہی لیکن ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ "صنعت [illegible] کی خاطر" کا نظریہ صحیح ہے۔ ادب تعبیر و تصویرِ حیات ہے۔ اور مظہرِ حیات کی طرح اپنے مظاہر میں لامحدود۔ مگر زندگی اعلیٰ ترین اخلاق کے اصول پر قائم ہے۔ اور جو ادیب اخلاق کے اصول سے بے پرواہی برتیگا وہ گویا زندگی سے بے پرواہی برتنے کا مرتکب ہوگا۔ اِس اعتبار سے اُس کا ادب کسی طرح بھی ادبِ عالیہ نہیں کہلا سکتا۔ اِس بات کو مدِنظر رکھتے

ہوئے ہم صرف وہ افسانے شائع کرتے ہیں جو ہر طرح ہمارے معیار پر پورے اُتریں۔ آج سے پانچ چھ ماہ پہلے ہمارے ناظرین شکایت کرتے تھے کہ ہمارے افسانے روکھے پھیکے ہوتے ہیں۔ لیکن اب اس قسم کے خطوط آ رہے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عام طور پر ذوقِ ادب شگفتہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور مذاقِ سلیم نکھر رہا ہے۔ ادبی دنیا کے وہی خریدار جو افسانوں کو خشک کہتے تھے اب اُن کی تعریف کرتے ہیں۔

ہم خوش ہیں کہ ہم نے افسانوں کے متعلق ذوقِ عام کو بلند کرنے میں کچھ مفید کام انجام دیا ہے۔

ادبی دنیا کی نظمیں بھی ایک خاص معیار کو مدِ نظر رکھکر فکر کی جاتی ہیں اہلِ علم کی رائے میں ان نظموں کی شان نرالی ہوتی ہے۔ حیات افروز، رنگ آفریں اور بلند پایہ نظمیں شائع کرنا ادبی دنیا کی خصوصیت ہے۔

"عمر خیام اور اُس کا عہد" دو تین قسطوں کی اشاعت کے بعد تکمیل تک پہنچ جائیگا۔ اور کتابی صورت میں شائع کیا جائیگا۔ اہلِ نظر نے اِس مضمون کے متعلق حوصلہ افزا خطوط ارسال فرمائے ہیں۔

بنگال سے مولینا حبیب اللہ کا نوازش نامہ موصول ہوا ہے جس میں اُنہوں نے اِس مضمون کو بنگالی میں ترجمہ کرنے کی اجازت طلب کی ہے۔ اِس قدردانی کے لئے ہم اُن کے ممنون ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک اردو میں فنِ تنقید کے شاہکار بہت کم ہیں۔ اِس بات کی ضرورت شدّت سے محسوس کی جا رہی ہے کہ مشہور شعرا کے کلام پر انگریزی اصول کی روشنی میں مفصل اور تعمیری تنقید کی جائے۔ تاکہ عام اردو خواں حضرات میں صحیح ذوقِ تنقید پیدا ہو اور وہ خود اچھا شعر پڑھکر اپنے دل میں یہ طے کر سکیں کہ شعر میں کیا بات تھی جو اُن کے دل کو گرما گئی۔

فلسفۂ قدیم و جدید پر جو سلسلۂ مضامین پروفیسر یوسف سلیم نے شروع کیا ہے اُسے ارباب بصیرت نے بہت پسند فرمایا ہے۔ ہم پروفیسر صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے اندازِ بیان ایسا شگفتہ اختیار کیا ہے۔ کہ دلچسپی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

اِس ایک مضمون کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادبی دنیا خالص علمی رسالوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے۔

آجکل سرگودھا میں راولپنڈی ڈویژن کی تعلیمی کانفرنس کا اجلاس ہو رہا ہے۔ ڈویژن کے تمام ہیڈ ماسٹر۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹران مدارس اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ مدارس اور تعلیمی معاملات میں دلچسپی لینے والے حضرات شریک ہیں۔ اجلاس میں تعلیم کے متعلق بیش بہا تجاویز منظور کی گئیں۔ اس کے علاوہ طریقِ تعلیم اور نظام کار کے متعلق مفید مباحثے ہوئے۔

مقامِ مسرت ہے کہ عام پبلک نے بھی اِس مفید کام میں بڑھ چڑھکر حصّہ لیا۔ ہندوستان میں جہاں عام طور پر تعلیم کا فقدان ہے عام لوگوں کا تعلیمی معاملات میں دلچسپی لینا ظاہر کر رہا ہے کہ ملک کی حالت سُدھر رہی ہے

مولینا تاجور کو بھی دعوتِ شرکت دی گئی تھی۔ آپ نے ایک مضمون "دیسی زبانیں اور محکمۂ تعلیم" پڑھا جو بہت پسند کیا گیا۔

جو مفید اور بیش بہا مضامین کانفرنس میں پڑھے گئے ہیں ہم اُن کے حاصل کرنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ اور امید ہے کہ وقتاً فوقتاً انہیں شائع کرتے رہینگے۔

ملک محمد الدین صاحب اڈیٹر صوفی نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ اُنھوں نے لاہور میں اپنے روشن دماغ فرزند ملک محمد اسلم ایم۔ اے کی زیرِ نگرانی ایک اردو اکیڈیمی قائم کی ہے جس کا مقصد اردو کی بلند پایہ کتابوں کی اشاعت ہوگا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اِس قسم کے اداروں کے قیام سے ادب کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ اور دست بدعا ہیں کہ ملک صاحب کی مساعی مشکور ہوں۔

اپنے مضمون نگاروں کی خدمت میں ہم پھر عرض کرتے ہیں کہ مضمون کاغذ کے صرف ایک صفحے پر لکھا کریں۔ بعض حضرات اپنا مضمون واپس منگوانے کیلئے خط لکھتے ہیں تو مضمون کا نام لکھنا بھول جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں اڈیٹر کو بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خط میں مضمون کا نام ضرور ہونا چاہئے۔

ادارہ

آئینۂ عالم

ایک قدیم کھوپری

جزیرہ سن نکولاس کے جنگل میں، جو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مغربی ساحل کے قریب واقع ہے، حال ہی میں ایک انسانی کھوپری دستیاب ہوئی ہے جس کی داہنی کنپٹی میں تیر کی نوک ہنوز پیوست ہے، یہ کھوپری نہایت پرانی ہے۔ غالباً طوفانِ نوح سے پہلے کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کے وحشیوں میں نہایت قدیم زمانہ سے تیر اندازی کا فن موجود ہے۔

تصویرِ گویا

شعرا کو پہلے زمانہ میں یہ دقت محسوس ہوتی تھی کہ قاصد حالِ دل حسب دلخواہ نہیں بیان کر سکتا تھا۔ جرمن کے کاریگروں نے ایسا فونوگراف ریکارڈ بنایا ہے جو فوٹوگراف بھی ہے جس شخص کی تصویر لیجائے اُس کی آواز بھی فوٹو پر نقش یا ثبت ہو سکتی ہے۔ اس طرح آپ اگر کسی دوست کو کوئی پیغام پہنچانا چاہیں تو اپنا فوٹو ریکارڈ بھیجدیجئے۔ آپ کا دوست پہلے آپ کے فوٹو سے مسرور ہوگا۔ پھر اُس کو باجہ کی گردش کناں پلیٹ پر رکھدیگا تو تصویر زبانِ حال سے خود "حال دل" بیان کرنے لگیگی۔ غالباً اس ایجاد سے رسم وراہ کی دنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوجائیگا۔

نیا مدارِ ستارہ

جس طرح ہندوستان "بے فکروں" کے لئے مشہور ہے اُسی طرح امریکہ اصحاب غور و فکر کے لئے حال ہی میں وہاں کے مشہور شہر اوہیو کے ایک نوجوان نے جو دن کو فیکٹری میں کام کرتا ہے اور رات کو سیاروں کی چال سے دل بہلاتا ہے۔ نیا مدار ستارہ دریافت کیا ہے۔ جو ابھی تک بڑے بڑے ہیئت دانوں کی نگاہِ دوربین سے پوشیدہ تھا۔ ہارورڈ یونیورسٹی نے اس نوجوان کو ایک عمدہ دوربین تحفہ میں دی ہے تاکہ وہ اپنی تحقیقات کا دائرہ وسیع کر سکے۔ اُس نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے اور جو کچھ پس انداز کرتا ہے وہ کتابوں کی خریداری میں صرف کر دیتا ہے۔ اُس کے والدین اوہیو کے قریب ایک گاؤں میں کاشتکاری کرتے ہیں۔ اسی جگہ اُس نے ایک چھوٹی سی رصدگاہ اپنے خرچ پر بنوائی ہے۔ کیا عجب ہے آگے چل کر یہ نوجوان گلیلیو کا ہمسر ہو جائے!

فطرت میں شوقِ خودکشی

فطرت کا طریق کار عموماً یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ حیوانات کو بقائے حیات کی طرف مائل کرتی ہے۔ چنانچہ ہر ذی رُوح میں اپنی جان بچانے کا جذبہ فطری طور پر موجود ہے۔ لیکن جہاں دیگر امور میں استثنا پایا جاتا ہے۔ وہاں اس اٹل اور عالمگیر اصول میں بھی یہ رنگ نظر آرہا ہے۔ جزیرہ نمائے اسکینڈینیویا کا لیمنگ (اُود بلاؤ کی قسم کا ایک جانور جو چوہے سے بڑا ہوتا ہے) اور نیوزیلنڈ کی ٹام کاڈ (مچھلی کی ایک قسم) یہ دونوں حیوان خودکشی پر تُلے ہوئے ہیں۔ اول الذکر جانور، ملک ناروے میں بکثرت ہوتا ہے اور جب اُن کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے تو براہِ راست سمندر کی طرف کوچ کر دیتے ہیں، راہ میں جو شے سامنے آتی ہے اُسے کھاتے ہوئے یا کم از کم خراب کرتے ہوئے بڑھتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ زمین ختم ہو جاتی ہے۔ اور سمندر کی لہروں سے بغلگیر ہو جاتے ہیں۔ آخر الذکر کی کیفیت یہ ہے کہ جب اُن کی تعداد بے اندازہ ہو جاتی ہے تو موجوں کے ساتھ خود بخود کنارے پر آکر تھوڑی دور تک خشکی میں لوٹتی چلی جاتی ہیں۔ بچے اور بوڑھے لاکھوں کی تعداد میں اٹھا کر بازاروں میں لاتے ہیں اور ان مردہ مچھلیوں کو سکوں کی شکل میں تبدیل کر لیتے ہیں۔

ایشیائی عورتوں میں بیداری کا احساس

ایشیائی عورتوں کی ایک انجمن قائم کی گئی ہے۔ جس کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

(الف) مشرقی تمدن کے عناصر مشترک ہونے کی حیثیت سے تمام ایشیائی عورتوں میں اتحاد کا احساس پیدا کرنا۔

(ب) مشرقی تمدن وتہذیب کے مفید عناصر کا جائزہ لینا۔ اُن کے تحفظ و بقا کی کوشش (سادگی۔ فلسفہ۔ آرٹ۔ عظمت مادری کا احساس۔ روحانی بیداری۔

(ج) مشرقی تہذیب وتمدن کے مضر عناصر اور نقائص کو رفع کرنے کی کوشش کرنا۔ (بیماری، بچوں کی موت۔ شادی بیاہ کے رسوم ورواج۔

(د) مغربی تہذیب کے اُن عناصر کا انتخاب جو مشرق کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ (تعلیم۔ لباس۔ آنے جانے کی آزادی)

(س) تبادلۂ خیالات سے ایک دوسرے کی تقویت کی کوشش کرنا۔

(ش) دنیا میں امن قائم کرنے کی کوشش کرنا۔

اِن مقاصد کو پڑھکر اندازہ ہو سکتا ہے کہ انجمن کا منتہائے نظر کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں۔ کہ انجمن ایشیا کی تاریخ تمدن میں ایک نئے باب کا اضافہ کریگی۔

ایشیا کی عورتوں میں قوتِ عمل و احساسِ اتحاد کا پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ایشیائی تہذیب کے دن اچھے آگئے۔

ایشیا تمدن وتہذیب کا گہوارہ ہے۔ تمام مذاہب کے بانیوں نے اسی سرزمین میں جنم لیا۔ اور اسی اعتبار سے آج تک اس مادیت میں بھی اپنی روحانیت کے لئے مشہور ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ اس خطہ کی عورتوں کے دل میں یہ احساس پیدا ہوگیا ہے کہ وہ اپنی روایات تمدن کے تحفظ کی طرف متوجہ ہوں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ سائنس کے انکشافات نے معلوماتِ عامہ میں حیرت انگیز اضافے کئے ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ سائنس کی قوت اندھی ہے۔ بے پرواہ ہے کہ اس سے انسان کی تخریب کا کام لیا جاتا ہے یا تعمیر کا۔ جہاں سائنس نے ہمارے لئے ترقی کی سیکڑوں شاہراہیں کھول دیں وہاں نفرت اور جنگ کی تاریخ میں بھی خونیں اور آتشیں بابوں کا اضافہ کر دیا۔ ہلاکت آفریں، آلاتِ جنگ۔ بم گیس۔ طیارے۔ تمام سائنس کی ایجادات ہیں۔ جو خدائے تعالیٰ کی تخلیق کو مٹا دینے کے لئے، جلا دینے کے لئے، کچل دینے کے لئے، عالم وجود میں آئیں ہیں۔

ایشیا کی عورتوں نے عصرِ حاضرہ کی اِس خصوصیت کا احساس کر کے اپنا ایک مقصد "عالمگیر امن کے قیام کی کوشش کرنا" بھی مقرر کیا ہے۔

ہم دست بدعا ہیں کہ اِن کی کوششیں بار آور ہوں اور یورپ کے مدبرین کی طرح اِن کے دعوے اور عمل میں کوئی تفاوت نہ ہو۔

دنیا میں سب سے بڑا مکان

نیویارک میں آجکل ایک عمارت، تماشا گاہِ مرد وزن بنی ہوئی ہے۔ جو سطح زمین سے ۶۱۷ فیٹ بلند ہے۔ ۲۱ ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔ اُس میں ہر روز ۱۸۷۵۰۰ گیلن پانی اور ۲۰۰۰۰ کیلوواٹ بجلی روزانہ خرچ ہوتی ہے۔ اُس مکان میں پولیس بھی ہے۔ شفاخانہ بھی، ڈاک خانہ بھی ہے اور بنک بھی۔ اسکول بھی ہے اور لائبریری بھی۔ ہوٹل بھی ہے۔ قہوہ خانہ بھی ٹینیس کورٹ بھی ہے۔ اور حوض بھی۔ مختصر یہ کہ جملہ ضروریاتِ زندگی کے لئے اس مکان کے باشندوں کو باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

موسم میں حسب مرضی تبدیلی

جس طرح بٹن دبانے سے کمرے میں روشنی ہو جاتی ہے اُسی طرح اب امریکہ میں ایک خاص قسم کا بجلی کا پنکھا ایجاد ہوا ہے جس کی بدولت کمرے میں مئی جون اور دسمبر دونوں موسموں کا لطف اُٹھایا جا سکتا ہے۔ اگر گرم ہوا کا بٹن دبایا جائے تو کمرہ گرم ہو جائیگا۔ اور اگر سرد ہوا کا بٹن دبایا جائے تو سرد ہو جائیگا۔ جب کمرے کی ہوا حسب مرضی گرم یا سرد ہو جائے تو پنکھا بند کر دو۔

دنیا میں سرد ترین جگہ

نیوجرسی واقع ملک امریکہ کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کا نام ایلیزبتھ ہے۔ اگر آپ نیوجرسی سے ایلیزبتھ جائیں تو راستے میں آپ کو ایک جگہ برف کا ایک عظیم الشان انبار جمع ملیگا یہ گودام دنیا میں سرد ترین مقام ہے۔ یہاں کا ٹیمپریچر درجۂ صفر سے بھی ۱۰۹ درجے نیچے ہے۔ یہاں کی سردی کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ قطبِ شمالی کا ریچھ بھی جو تمام حیوانات میں سب سے زیادہ سردی پسند ہے، یہاں نہیں رہ سکتا۔ اگر ذرا دیر توقف کرے تو کام تمام ہو جائے۔

منطقۂ شمالی کے راز

آجکل سائنس کی دنیا میں منطقۂ بارد شمالی کے راز دریافت کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ باہمت اور حوصلہ مند اشخاص اس بات کی ٹوہ میں ہیں کہ کوئی ایسی تدبیر دریافت ہو کہ گرین لینڈ کی ۸۰۰۰ ۸۰ برفانی سطح کے راز معلوم ہو جائیں۔ ناظرین کو معلوم ہوگا کہ گرین لینڈ کی سرزمین قریب قریب تمام کی تمام برف سے ڈھکی ہوئی ہے۔ اس برف کی گہرائی کی دریافت نہیں ہو سکی۔ اس سطح برفانی کے متعلق یہ سوالات بہت اہم ہیں کہ آیا وہاں ہوائی جہاز اُتر سکتا ہے یا نہیں۔ انسان وہاں زندہ رہ سکتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ انہیں سوالوں کے تسلی بخش جوابات پر مہمات کی کامیابی اور ناکامیابی کا دارومدار ہے۔ پھر تماشا یہ ہے کہ ان باتوں کا صحیح جواب دریافت کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ وہاں کی آب و ہوا کی کیا کیفیت ہے اور ہواؤں کا رُخ کس طرف ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ برفانی سطح کو عبور کرنا ناممکن ہے اس کیلئے ہر مہم کے اراکین اس سطح کے کنارے پر کیمپ لگانے کے لئے مجبور ہونگے۔ جرمن اور انگلستان کے اولوالعزم سائنس دان یہ دریافت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ پرواز کے راستے کون کون سے ہیں۔

انگریزوں کی مہم ایک نوجوان کی سرکردگی میں کام کر رہی ہے۔ اراکین بھی نوجوان ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اربابِ علم اس اراکین کی نوجوانی کو مہم کے لئے خطرناک تصور کرتے ہیں۔ لیکن اُن پر ایسی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کئے جا رہے ہیں۔ اس مہم کے اراکین نے اپنا مرکز انگما سالیک کو بنایا ہے۔ ایک پارٹی ساحل سے دو سو میل تک برفانی سطح پر سفر کر چکی ہے۔ مہم کے ساتھ ایک جہاز بھی ہے جو ساحل مقامات کے تحقیق میں مفید ثابت ہوتا ہے۔

جرمن مہم مشہور و معروف سائنس دان پروفیسر الفریڈ ویگینر کی قیادت میں ہے۔

صاحب موصوف اس سے پہلے گرین لینڈ میں کام کر چکے ہیں ان کے ساتھ بیس اور مشہور سائنس دان ہیں جن کو اپنے فن میں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ اس مہم کے مقاصد میں سطح برفانی کی گہرائی کا انکشاف بھی شامل ہے۔ دونوں مہموں کے اراکین تعاون باہمی سے ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

جب نوجوانی کی آتش طبعی اور بڑھاپے کی تجربہ کاری مل جائے تو کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ۱۹۳۹ میں جب منطقۂ شمالی کے راز دریافت کرنے کی بین الاقوامی کوشش کی جائیگی اُس وقت اِن دونوں مہموں کے نتائج

ایک اور عالمگیر جنگ کا اعلان

جس دن سے ۱۹۱۹ کی مہیب اور ہولناک جنگ ختم ہوئی ہے اُس دن سے یورپ کے لئے معاشرتی اقتصادی اور تجارتی مشکلات کا ایک نیا باب کھل گیا ہے۔ ہر ملک کے ماہر اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح حالات سُدھر جائیں۔ اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جنگِ عظیم کا ردِ عمل عمل سے بھی زیادہ خوفناک ثابت ہوا۔ اس سلسلے میں پروفیسر گلبرٹ مرے اور سٹر برنز نے پیشین گوئی کی ہے کہ عنقریب ایک اور عالمگیر جنگ ہوگی سائنس کے مہلک حربوں سے کام لیکر انسان ایک بار پھر جانوں کے ساتھ کھیلیگا۔

پروفیسر برنز نے تو وقت کا تعین بھی کر دیا ہے۔ اُن کے خیال میں یہ جنگ ۱۹۴۰ - ۱۹۳۵ کے درمیان واقع ہوگی۔

پروفیسر گلبرٹ مرے کا ارشاد ہے:۔

آجکل ہم اتحاد کے ذریعے ایک اور مہیب جنگ کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ آئندہ جنگ میں فریقین کا تعین اِن قرضوں کے ذریعے ہوگا۔ جو مختلف ممالک ایک دوسرے کو دے رہے ہیں۔

مسولینی اور امن

میجر ای ڈبلیو پالسن سے ملاقات کے دوران میں اٹلی کے متعلق اطمینان حاکم مسولینی نے جسے بعض یورپی اقوام "جنگ کا دیوتا" کہتی ہے۔ صاحب موصوف کو اطمینان دلایا کہ اٹلی جنگ کی تیاریوں میں مصروف نہیں ہے۔

آپ نے ارشاد فرمایا:۔ "اندرونی ترقی اور قوم کی بہتری کے لئے امن اشد ضروری ہے۔ اگرچہ اس کی جغرافیائی حالت ایسی ہے کہ اُسے ہر وقت اپنی مدافعت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ ہم آسٹروی قوم سے بھی جو ہمارے سخت دشمن تھے مضبوط تعلقات رکھتے ہیں۔ ہمارے اختلافات مٹ چکے ہیں پرانی دشمنیاں فراموش کر دی گئی ہیں۔ بعض ملکوں میں یہ مشہور ہے کہ اٹلی ہوسِ ملک گیری کے پنجے میں گرفتار ہے اور شاید خواب دیکھتا ہے جو لوگ ایسا خیال کرتے ہیں وہ اٹلی کی ضروریات سے بے خبر ہیں۔" تاجور

تقریظ

شادی شدہ عورتیں۔ چارلس لیمب کے ایک بلند پایہ مضمون کا ترجمہ ہے۔ چارلس لیمب لطافتِ انداز و نفاستِ تحریر کے لئے مشہور ہے۔ ظرافت کے ہلکے ہلکے چھینٹے معاشرتی مسائل کے متعلق [illegible] فقرے ہیں کے انداز میں حسن کا ایسا اثر پیدا کرتے ہیں جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔
"شادی" ایک ایسا موضوع ہے جس کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن جو کچھ لیمب نے لکھا ہے۔ اس سے زیادہ شگفتہ اور دلچسپ تحریر کوئی اس موضوع پر نہ ہو سکتی تھی۔

راہب:۔ او ہنری کے ایک افسانے کا ترجمہ ہے۔ او ہنری دورِ حاضرہ کا سب سے بڑا افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی افسانہ نویسی کی یہ خصوصیت نہایت نادر ہے کہ وہ معمولی واقعات سے ایسے غیر معمولی نتائج اخذ کرتا ہے کہ پڑھنے والا حیران بھی ہوتا ہے اور مسرور بھی۔
راہب کا لطف اس کے غیر متوقع انجام میں پنہاں ہے اور ہم اس کے متعلق کچھ تفصیل سے لکھ کر پڑھنے والوں کے لطف کو ضائع کرنا نہیں چاہتے۔

ننھا سوداگر:۔ ایک مطالعہ نفسی ہے جس میں کردار نگاری اپنے معراجِ کمال پر پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ افسانہ آدھ گھنٹے میں اختتام تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اس مختصر سی مدت میں مصنف نے بچوں کے جذبات و احساسات کی ایک بلیغ تشریح کر دی ہے۔

جرمن یونیورسٹیوں کا نظامِ تعلیم:۔ نہایت کار آمد مضمون ہے اور کاوش سے لکھا گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مضمون نگار حضرات اور تخیل افسانے [illegible] لکھنے کی بجائے اس قسم کی علمی موضوعات کی طرف متوجہ ہوں۔

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہدے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

صحت:۔ کے متعلق صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ یہ ایک طنز ہے جس میں شہریوں کے اندازِ معاشرت کے نقائص دکھائے گئے ہیں۔

پہلا جنتی۔ مختصر ہے لیکن اس میں ڈرامیائی کشمکش کے تمام عناصر موجود ہیں۔ نعمان کا کردار کسقدر دلچسپ ہے۔ مصنف نے قصداً موضوع کی سنجیدگی اور اہمیت کو کم کرنے کے لئے نعمان کے کردار میں ظرافت کے پہلو شامل کر دئے ہیں۔ اس کا فقرہ "ایک روپیہ دلواؤ" ڈرامے کے ختم ہونے کے بعد کانوں میں گونجتا رہتا ہے۔

ایکٹر کی وصیت:۔ فاضل افسانہ نگار نے جس حسین انداز میں انسانی تخیل کی فریب کاری کی تصویر کھینچی ہے اس کی بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

وادیٔ کانگڑہ:۔ یہ پُر بہار وادی جس کا ایک منظر اس اشاعت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے حسین ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ افسوس ہے کہ ہندوستان کے امرا اپنے جنت نشان وطن کی رنگین اور عطر آگیں فضا کو چھوڑ کر سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کے مناظر میں صحت کے جویا ہوتے ہیں۔ یہ وادی تو اسقدر دلفریب ہے کہ اگر ایک بار انسان دیکھ لے تو مرتے دم تک آنکھوں سے اس کی تصویر اور دماغ سے اس کا تاثر محو نہ ہو۔ ملک کو نارتھ ویسٹرن ریلوے کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس کی بدولت آج اس ارضی جنت کے دروازے کھل گئے ہیں۔ ہم ناچیز انسانوں کو بھی پریوں کی اس آماجگاہ میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی ہے۔

ایک پُربہار وادی

(از حضرت عابد)

یہ وہ زمیں ہے کہ پتّہ پتّہ بہار کے گیت گا رہا ہے　　یہ وہ زمین ہے کہ ذرّہ ذرّہ نشاط سے مُسکرا رہا ہے
ترنّمِ آبجو کی لرزش سے رُوح کو وجد آ رہا ہے　　پہاڑ پر ابر جلوہ گر ہے جو بیل بوٹے بنا رہا ہے
یہ منظرِ زرنگار نورِ بہار سے جگمگا رہا ہے

قدم قدم سبزہ زارِ جنّت روش روش ہے ارم بساماں　　بہار رنگیں نشاط رنگیں نسیمِ نازک خرام رقصاں
فضائے گلشن کی وسعتوں میں چراغِ لالہ ہوا فروزاں　　کہ ساغرِ سبز سے مے آتشیں کے انوار ہیں درخشاں
دماغ ڈوبا ہے مستیوں میں نظر پہ نشہ سا چھا رہا ہے

یہاں کے پھولوں کی جلوہ کاری پہ چاندنی ہو نثار یارب　　یہاں کے رنگِ خزاں سے شاداب ہو نشاطِ بہار یارب
یہاں محبت کے دلربا زمزمے ہیں سحرکار یارب　　یہاں کی تابانیوں کے ہوں مہر و ماہ آئینہ دار یارب
یہ منظرِ جانفزا تری دلکشی کے جلوے دکھا رہا ہے

عابد

عمر خیام اور اُس کا عہد

خیام کی صناعی

(گذشتہ سے پیوستہ)

جذبہ کہتا ہے :-

ساقی قدحے کہ سوزِ داغم نزود
تا روغنِ بادہ در چراغم مزود
بے شکہ چوں غنچہ در دماغم زمے ست
مغزم بتکانی ۔ از دماغم نزود

خیام نے زندگی کو چراغ کہا ہے ۔ جن حضرات نے مرقعِ چغتائی میں "چراغِ عمر" کی تصویر دیکھی ہے وہ تصور کر سکتے ہیں کہ زندگی کی تشبیہ چراغ سے کتنی واضح ہے ۔ ہوا کا خفیف سے خفیف جھونکا ۔ مینہ کا چھوٹے سے چھوٹا قطرہ ۔ چراغ کو گُل کرنے کے لئے کافی ہے ۔ اسی طرح انسانی زندگی سیکڑوں حوادث کے درمیان قائم ہے ۔ اس چراغ کے لئے خیام شراب کو "روغن" قرار دیتا ہے ۔ روغن چراغ کی فروزانی کے لئے ضروری ہے اسی طرح خیام کے نزدیک زندگی کے لئے "تابشِ بادہ" ضروری ہے ۔

دوسرا شعر اس کیفیت کا مظہر ہے کہ شراب اُس کی زندگی کا ایک جزو بن گئی ہے ۔ مومن نے کیا خوب کہا ہے ؎

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

اس سے پہلے کہا جا چکا ہے ۔ کہ "شراب" خیام کے لئے دنیا کی تمام مسرتوں کا خزانہ ہے ۔ یہ نام اُس کے منہ سے اس جوش سے نکلتا ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ ایک جگہ کہتا ہے ؎

ماکم خریدارِ مے کہنہ و نو ۔۔۔۔ وانگاہ فروشندۂ عالم بہ دو جو
پرسی کہ پس از مرگ کجا خواہی رفت ۔۔۔۔ مے پیش من آر و ہر کجا خواہی رو

زندگی اور اُس کے متعلقہ مسائل سے بے نیازی اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ ایک شخص خیام کو حکیم عمر خیال کر کے اُس سے مسائلِ حیات کے سُلجھانے کی درخواست کر رہا ہے ۔ اور وہ دوزخ و جنت کے افسانوں کو ایک جنبش سے مسترد کر کے کہہ دیتا ہے کہ

مے پیش من آر و ہر کجا خواہی رو

خواجہ حافظ کے "بادہ و ساغر" میں بھی ایک کیف ہے ۔ لیکن پروفیسر نکلسن کے لطیف قول کے مطابق صوفی شعرا کا کلام ہمیشہ ذومعنی ہوتا ہے ۔ اس اعتبار سے خواجہ صاحب کے اشعار کی جذباتی قیمت بہت گھٹ جاتی ہے ۔ خیام کے اشعار کے متعلق کبھی یہ سوال پیدا نہیں ہوا کہ کہیں یہ شراب شرابِ معرفت تو نہیں ۔

ذیل میں ہم اس کی کچھ رباعیات درج کرتے ہیں ۔ جن سے اندازہ ہو سکیگا کہ اس کی خمریات میں "جذبہ" کس جوش سے کارفرما ہے ؎

ساقی نظرے کہ دل خوش اندیشِ تست
جاں شاد ز خوشہ چینیٔ خرمنِ تست
ناگفتہ دلت ضمیرِ ما مے داند
جامِ جمِ عاشقاں دلِ روشنِ تست

ساقی قدحے کہ شمعِ دل در نگرفت
تا زآتشِ مے زندگی از سر نگرفت
آہ! از مۓ لعلت کہ بریں بادہ ناب
ہر کسے کہ لبے نہاد لب برنگرفت

آخری مصرعے میں اشتیاق اور سرمستی کی جو عجیب کیفیت پنہاں ہے وہ اربابِ ذوق پر روشن ہے ؎

ساقی غمِ من بلند آوازہ شدست　　سرمستیِ من برون زاندازہ شدست
باموئے سفید سرخوشم کز خطِ تو　　پیرانہ سرم بہارِ دل تازہ شدست

ساقی نظرے کہ دل زاندیشہ تہی ست　　شیراں ہمہ رفتہ اند سرِ بیشہ تہی ست
ہر شب کہ حباب کفِ نخے شیشہ بچرخ　　امروز کہ دورِ مالبود شیشہ تہی ست

اے ساقی ازاں مے کہ دل و دینِ منست　　پُرکن قدحے کہ جانِ شیرینِ منست
گر نیست شراب خوردن آئینِ شما　　معشوقہ بجام خوردن آئینِ من ست

ساقی گل و سبزہ بس طربناک شدست　　دریاب کہ ہفتۂ دگر خاک شدست
مے نوش و گلے بچیں کہ تا درنگری　　گل خاک شدست سبزہ خاشاک شدہ ست

اندازکی صفاتِ تخیلی

ہم کئی بار اس حقیقت کی طرف اشارہ کرچکے ہیں۔ کہ خیال یا جذبہ کسی تصنیف کو "ادب" کے دائرے میں نہیں لاسکتا ۔ ادبی تخلیق کے لئے ضروری ہے کہ تخیل۔ تصوّر اور جذبے پر اپنا عمل کرے ۔ اس عمل کا نتیجہ "صنعت" کی صورت میں نمودار ہوتا ہے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ الفاظ کا جامہ پہننے سے پہلے تصور صنّاع کے ذہن میں ایک تخیلی جامے میں ملبوس ہوجاتا ہے ۔ وہ تصویر جسے صنّاع قرطاس پر منتقل کرنا چاہتا ہے۔ پہلے اس کے ذہن میں کھنچ جاتی ہے تخیل کی تعریف نہیں کی جاسکتی یہ شے اپنے مظاہر اور اپنے اعمال میں اسقدر پُراسرار طریقے سے کام کرتی ہے کہ اس کی کوئی جامع اور مانع تعریف ہو ہی نہیں سکتی ۔ یہی وہ شے ہے جو تصاویر اور موسیقی کی تخلیق کرتی ہے ۔ اور اس طرح حسِ بصارت وسماعت کو متاثر کرتی ہے ۔ فنِ مصوری میں تخیل کا عمل اس طرح ہوتا ہے کہ آنکھیں لطف اندوزِ حسن ہوتی ہیں ۔ اور موسیقی میں اس طرح کہ "نغمے" فردوسِ گوش بن جاتے ہیں، ادب ان دونوں حسیّوں کو متاثر کرتا ہے ۔ گویا یہ وہ شراب دو آتشہ ہے جس میں "موسیقی" اور "مصوری" کے عناصر مل گئے ہیں ۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ادب میں قوتِ تخیل اپنا عمل صرف سماعت وبصارت تک محدود رکھتی ہے ۔ لیکن غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ ہمارے دوسرے حواس بھی ادبی تخلیقات کے عملِ تخیل سے متاثر ہوتے ہیں۔

ماہر ادیب اپنے زورِ قلم سے ہمارے مشام کو خوشبو و معطر فواکہات سے ایک روحِ تازہ بخشتا ہے۔ عنبر آفریں ہوا میں ل

کو سیلابِ مسرت میں غرق کردیتی ہے ۔ یعنی وہ تمام احساسات جو قوتِ شامہ اور قوتِ ذائقہ سے خاص ہیں پیدا ہوجاتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ تاثر "حقیقی" نہیں بلکہ تخیلی ہے ۔

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ تخیل کا لفظی مظہر کیا ہے ؟۔ قوتِ تخیل الفاظ سے کس طرح ظاہر ہوتی ہے ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ عملِ تخیل کا اظہار الفاظ میں تین طریقوں پر ہوتا ہے:۔

(الف) قوتِ تخیل کے زیرِ اثر صنّاع تشبیہات واستعارات ۔ صنایع وبدایعِ لفظی ومعنوی سے کام لیتا ہے ۔ اور اپنے موضوع کو زیادہ صاف اور روشن رنگ میں پیش کرتا ہے ۔

(ب) اظہارِ خیال کے لئے صنّاع ایسے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے جن کو اپنے معانی سے صوتی تعلق ہوتا ہے ۔ اور اس طرح قاری کو بعینہٖ وہی اصوات سنائی دیتی ہیں جو مصنف کے ذہن میں تھیں ۔

(ج) مصنف ایک ناقابلِ اتباع صنّاعی چابکدستی سے کام لیکر قاری کے ذہن میں ایک سلسلۂ خیال پیدا کردیتا ہے ۔ یہ خیال آفرینی قوتِ تخلیق کا ایک راز ہے جو صرف جوہرِ قابل کو معلوم ہے۔ مصنف ایسے الفاظ کا استعمال کرتا ہے جو قانونِ ایتلافِ افکار کے ماتحت ۔ اپنی دلالتہائے التزامی کے باعث ۔ اپنے تعلقاتِ صوتی کی وجہ سے یا ہماری ذہنی کیفیات کی بنا پر ایسے معانی پیدا کرتے ہیں جو الفاظ سے بالاتر ہیں ۔ یعنی مصنف اُن باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ جن کو وہ بیان نہیں کرسکتا ۔ وہ کچھ کہہ جاتا ہے جو الفاظ کے جامے میں نہیں سماتا ۔ وہ ایک لفظ میں ایسا گنجینۂ معانی پنہاں کردیتا ہے جو اس کے لغوی معانی سے کہیں زیادہ لطیف اور خیال افریں ہوتا ہے ۔ جس طرح بعض اوقات کسی پھول کو دیکھ کر کسی معطر شے کو سونگھ کر انسان پچھلے واقعات کی یاد میں کھو جاتا ہے ۔ اسی طرح بعض اوقات صناع اپنے الفاظ کے ذریعے قاری کے ذہن میں ایک سلسلۂ خیال پیدا کردیتا ہے ۔ انداز کی اس صفت سے تصویر زیادہ روشن اور اور رنگین نظر آتی ہے ۔ دنیائے حواس میں کسی شے سے اس قوت کو تشبیہ نہیں دی جاسکتی ۔

تشبیہات واستعارات

مندرجۂ بالا سطور سے واضح ہوگیا ہوگا کہ تشبیہ اور استعارہ

آرائشِ کلام کے لئے استعمال نہیں کئے جاتے بلکہ موضوع کے کسی پہلو کو زیادہ واضح اور روشن کرنے کے لئے برتے جاتے ہیں۔ "آرائشِ کلام" سے مراد یہ ہے کہ رخسار کو گل اور زلف کو ناگن لکھ کر محض ظاہری گرمیٔ سخن پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ورنہ عارضِ محبوب کو کسی معمولی پھول سے تشبیہ دیکر اس کا کوئی ایسا پہلو واضح نہیں کیا گیا جس پر دیکھنے والوں کی نظر نہ پڑتی تھی۔

تشبیہ اور استعارہ کا مقصد یہ ہے کہ جو حقیقت کسی طرح ادا نہیں ہو سکتی اُس کو ادا کیا جا سکے۔ جو مضامین شبلی کے الفاظ میں نازک اور لطیف ہوتے ہیں وہ معمولی الفاظ کا جامہ نہیں پہن سکتے۔ اُن کی لطافت اس قسم کی ہوتی ہے کہ الفاظ کے ساتھ مس کرنے سے بلبلوں کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ ایسے لطیف مضامین کو ادا کرنے کے لئے صرف تشبیہات و استعارات موزوں ہو سکتے ہیں۔

پھر صرف یہی نہیں۔ بعض ایسی ذہنی کیفیات ہیں جن کو صرف تشبیہ اور استعارے سے سمجھایا جا سکتا ہے۔ نازک خیالی اِن کیفیات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے تشبیہ و استعارہ کے چراغ سے نور مستعار لیتی ہے اور فضائے تخیل کو منور کر دیتی ہے۔

نگاہ مے رسد از نغمۂ دل افروزے
بمعنی کہ بروجامۂ سخن تنگ است

ہماری زبان میں جو الفاظ اب کوئی حیثیت نہیں رکھتے لیکن دراصل اپنے اندر ایک جہانِ معانی لئے ہوئے ہیں۔ اُن کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ اُن حقائق کو ادا کرنے کے لئے سخن کے مختلف پہلو معمولی الفاظ میں نہیں سما سکتے۔ استعارے اور تشبیہات کس قدر موزوں ثابت ہوتے ہیں۔

ایک مصنف رقمطراز ہے:۔

زبان نازک خیالی کی متجر ہے۔ یا یوں کہو۔ کہ اگر ہمیں کسی قوم کی شاعری سے پوری واقفیت حاصل کرنی منظور ہو۔ تو ہمیں صرف اُس کے اشعار یا نظم کی رنگینی میں رنگی ہوئی روایات ہی کو نہیں دیکھنا چاہئے۔ بلکہ ہمیں بہت سے الفاظ بھی ملیں گے جو فرداً فرداً نازک خیالی کے پرورش یافتہ اور دلفریب نقش و نگار سے آراستہ ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اُن میں نظم کا عطر کھینچ کر بھر دیا گیا ہے۔ کسی لفظ مذکور میں عالمِ ذہنی اور عالمِ اجسام کی کسی بڑی مشابہت اور مناسبت باہمی کا نقشہ کھنچا ہوا ہے۔ عالمِ اجسام کی رنگ آمیزی کی مدد سے عالمِ ذہن کی تصویریں صاف اور روشن۔ اور قیام و دوام کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ ممکن ہے۔ کہ اب تصویریں مبتذل۔ بے حیثیت۔ اور معمولی سی دکھائی دینے لگی ہوں۔ اور شاید انہی الفاظ کی بدولت جو ہر ایک آدمی کے اثاثہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ ایسی معلوم ہو رہی ہوں لیکن جس شخص نے پہلے اس مشابہت کو تاڑا۔ اور اُس کے اظہار کے لئے ایک نیا لفظ ایجاد کیا تھا۔ یا کسی پرانے لفظ کو جو پہلے اپنے لغوی معنوں ہی میں استعمال ہوتا تھا۔ اصلاحی اور استعاری معنے دیئے۔ وہ بزرگ ہر طرح سے سخن آفرین کے لقب کا مستحق ہے اور اُس کی نازک خیالی اور سخنوری بیشک اس قابل ہے کہ اُسے سحر بیانوں کے زمرے میں شمار کیا جائے۔

مثلاً جس بندۂ خدا نے کسی کے برباد ہو جانے کا خیال اوّل ہی اوّل ظاہر کیا تھا۔ ضرور ہے کہ اُس نے بہت دفعہ آندھی اور ہوا کو خس و خاشاک اُڑاتے دیکھا ہوگا۔ اُس نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ یہ خس و خاشاک تنکا تنکا ایک دوسرے سے جُدا۔ کوئی کہیں۔ کوئی کہیں اپنے اصل مقام سے کوسوں دُور۔ طوفان باد کے جھونکوں سے اُڑتے پھرتے ہیں۔ اور پھر اِن کی جمعیت کا حاصل ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اِن کا قرار مشکل اور ان کا نام و نشان مفقود ہو جاتا ہے۔ خس و خاشاک کی اس بیچارگی اور آوارگی کو اُس نے ایک مصیبت زدہ انسان کی حالت سے مقابلہ کیا۔ اور کچھ فرق نہ پایا۔ اُس کی نازک خیال طبیعت نے فوراً اُس نامراد و کمبخت انسان کی حالت بیچارگی کو بھی بربادی کے لفظ سے تعبیر کیا۔

بخت کے متعلق بھی بیدار و خوابیدہ کے الفاظ پہلے استعمال کرنے والے ذہن نے جاگتے اور سوتے انسان و حیوان کی حالتوں پر غور کر کے یہ الفاظ بخت پر چسپاں کئے ہیں۔ جاگنے کی ہوشیاری۔ جلبِ منفعت۔ و دفع مضرت میں چابکدستی۔ اپنی حفاظت اپنی زندگی کے سامان مہیا کرنے کی فکر اور طاقت۔ سوتے کی بیکسی۔ کس مپرسی۔

بیچارگی اور ہو بہو موت کی سی صورت۔ شاعرانہ مذاق کیلئے کافی روانی مثالیں **خوش طالعی** اور **شومئی بخت** کی ہیں۔

اوپر ہم نے یہ بھی ذکر کیا تھا۔ کہ الفاظ اکثر اخلاقی حقائق کے شاہد ہوتے ہیں۔ اللہ جلشانہٗ نے الفاظ پر ایسی مُہرِ صداقت لگائی ہوئی ہے کہ انسان اتنے حقائق سے آگاہ نہیں جتنے وہ زبان سے شب و روز نکالتا ہے۔ وہ بڑے بڑے زبردست اصول بیان کرتا ہے۔ جو بعض اوقات اس کے اپنے برخلاف بھی ہوتے ہیں۔ اور جن کو وہ معمولی رواج سوسائٹی سمجھ کر رائج کرتا رہتا ہے۔ خود **دنیا** کا لفظ ہی ہمیں بتا رہا ہے۔ کہ اس کے ساتھ دل لگانا جائز نہیں۔ اس کی اصلیت بعض کے نزدیک "**دنی**" کمینہ ہے۔ اور اس لئے اس سے امیدِ وفا رکھنا فضول۔ اور اگر اس کے ساتھ اور اس کی چیزوں کے ساتھ موانست پیدا کرتے ہیں۔ تو اس سے بڑھکر ہماری کیا حماقت ہو سکتی ہے۔ ہم اسے کمینہ جانتے ہیں۔ اور دن رات اسے اس نام سے پکارتے ہیں۔ اور یہ بھی ہمیں تجربہ سے معلوم ہے۔ کہ کمینوں سے تعلق اچھا نتیجہ پیدا نہیں کرتا۔ تو پھر اس سے **محبت** کا خواہاں ہونا اور نباہ کی امید رکھنا نادانی ہے۔ **تعیش**۔ عیش و کامرانی کے معنوں میں مستعمل ہے۔ مگر اصل لغت میں کم معاش ہونا ہے۔ اور اس برتے پر ہم اپنی کامرانی پر نازاں ہیں۔ ہمارے **عیش و عشرت** دراصل سوائے مل بیٹھنے اور اوقات بسری کے اور کچھ بھی نہیں۔ زندگانی کا زمانہ اور اپنے گھر میں بال بچوں میں بیٹھ کر ہی گذارنا عیش و عشرت ہے۔ اور اس سے زیادہ ہیچ اور فضولیات۔ فضولیات جو انسان کی بے تمیزی نے ضروریاتِ زندگی کے ساتھ ملا کر اپنی اخلاقی حالت کو کئی درجے نیچے گرا دیا ہے۔ اور اس کا نام **عیش و عشرت** رکھ دیا ہے۔ عیش و عشرت کے سامان مہیا کرنے میں جو انسان نے غلطی کھائی ہے۔ اس کی زیادہ وجہ ماہیت و حقیقت دنیا و مافیہا کو بھول جانا ہے۔ عیش و عشرت کے سامان مہیا کرنے میں میخانہ کی طرف اس کی آنکھ دوڑتی ہے اور یہ نہیں جانتا کہ عیش و عشرت کہاں۔ یہ تو بربادی اور ویرانی کی طرف دوڑا جا رہا ہے۔ میخانہ کا نام ہی اسے حقیقتِ حال سے آگاہ کر رہا ہے۔ مگر مستی ہے کہ کچھ نہیں سوجھتا۔ خرابات۔ مے اور میخواروں کی جولانگاہ۔ حقیقتِ میخواری کا اظہار کس انداز سے کر رہا ہے **خرابات** میخانہ کا مرادف ہے۔ اور وہاں سوائے خرابات۔ بربادی اور ویرانی کے کچھ بھی نہیں۔ مے خواری۔ خرابات سے ہی شروع ہوتی ہے اور اس کا انجام بھی خرابات ہی ہے۔ اس کی ابتدا بربادی انتہا ویرانی ہے۔

اپنے دل میں ہم چاہے کچھ ہی سمجھیں اور اپنی طرف سے چاہے خوشی کے سامان مہیا کرنے میں سعی کریں۔ اور انہیں **عیش**۔ زندگی کے جزو قرار دیں۔ مگر ہماری اپنی زبان زبان جو ہمارے ایسے سامان پر مُہرِ صداقت لگانے سے نہیں رُکی۔ ایک زبردست ناصح ہے اور ہمیں ڈنکے کی چوٹ بتا رہی ہے کہ حقیقی خوشی یہاں کسی ایسے سامان سے میسّر نہیں ہو سکتی۔ یہ سامان تو ویرانی اور بربادی کے ہیں۔ اگر **مسرت**۔ خوشی درکار ہے تو وہ یقیناً اُس دنیا سے۔ خرابات سے۔ کہیں پرے ہے۔ جہاں ہم روحانی سیر کے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے معلوم ہوگا کہ تشبیہ اور استعارے کا حسین استعمال اچھے صنّاع کی خصوصیت ہے۔ استعارے اور تشبیہ سے معانی کا ایک دفترِ بے پایاں مختصر الفاظ میں بند کر دیا جاتا ہے۔ جس بات کی تفصیل کے لئے صفحات کے صفحات درکار ہوتے وہ ایک حسین تشبیہ ایک جمیل استعارے کے ذریعے بہ وجہ احسن ادا ہو جاتی ہے۔

خیام کے استعارات اور تشبیہات حقائق کو روشن کرتے ہیں۔ موضوع کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتے ہیں۔ لطیف مضامین کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔ اُن معانی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو کسی اور طرح ادا نہ کئے جا سکتے تھے۔ ذہنی کیفیات کی تشریح کرتے ہیں۔ مطالب و مفہوم کو صحیح رنگ میں پیش کرتے ہیں۔

کہتا ہے ؎

آنہا کہ محیطِ فضل و آداب شدند ۔ در کشفِ علوم شمعِ اصحاب شدند

رہ زین شبِ تاریک نبُردند بروں ۔ گفتند فسانۂ و در خواب شدند

معمۂ کائنات خیام کا محبوب موضوع ہے۔ اس ضمن میں وہ

یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ جو لوگ اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ بے سود ہے۔ جانِ عالم کے چہرے کو نقاب کچھ اس طرح چھپائے ہوئے ہے کہ اس کو دور کیا ہی نہیں جا سکتا۔ حیات و کائنات کے رموز کے انکشاف کے متعلق جو نظریے قائم کئے جاتے ہیں تمام باطل ہیں۔ ان کی حیثیت افسانوں سے زیادہ نہیں۔ دنیا کو "شبِ تاریک" سے استعارہ کر کے خیام نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس تاریکی میں جو لوگ راہ ڈھونڈھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ آخر کہیں گے "گفتند فسانۂ"۔ اس حقیقت کا مظہر ہے۔ کہ اسرارِ حیات کے متعلق جو نظریے پیش کئے گئے ہیں افسانوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ "در خواب شدند" سے مراد وہ گہری غفلت اور سرمستی ہے جو انسان پر طاری رہتی ہے۔

ما لعبتکانیم و فلک لعبت باز
از روئے حقیقتی و نہ از روئے مجاز
بازیچہ ہمے کنیم بر نطعِ وجود
رفتیم بصندوقِ عدم یک یک باز

انسان کی تمام تدابیر باطل ہیں۔ وہ سوچتا ہے یہ ہوگا وہ ہوگا اپنے لئے آرزوؤں کا ایک محل تیار کرتا ہے۔ اس کو شمعِ تخیل سے منور کرتا ہے۔ در و دیوار کو اپنے خونِ تمنا سے رنگیں کرتا ہے۔ اور پھر تقدیر اس تاش کے گھر کو اس کھلونے کو اس شیش محل کو اپنی ایک خفیف سی ٹھوکر سے برباد کر دیتی ہے۔

ویرانی ہی ویرانی مایوسی ہی مایوسی

اس بے کسی کے عالم میں انسان کچھ نہیں کر سکتا۔

مندرجہ بالا رباعی اسی حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ انسان کی بے کسی کی اس سے بہتر تصویر کیا ہو سکتی ہے کہ اُسے لعبت کہا جائے پتلی! اب تک وہ "اسکے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے"۔ ذاتی رائے اور ذاتی ارادے کے فقدان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

جس طرح لعبت باز گڑیوں کو حسبِ مطلب نچانے کے بعد اپنے پٹارے میں بند کر دیتا ہے۔ اسی طرح لعبت باز فلک انسان کو دنیا میں کھلا کر پھر صندوقِ عدم میں بند کر دیتا ہے۔ آہ انسان۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اپنی مرضی سے کر رہا ہوں اور ادھر حقیقت یہ ہے کہ لعبت باز فلک اُسے انگلیوں پر نچاتا ہے۔ اور پھر جب انسان اپنے لئے اس کھیل کے دوران میں قصرِ عشرت تعمیر کر لیتا ہے تو اس لعبت کو فنا کر دیتا ہے۔ اور قصرِ عشرت کی بلند دیواریں اپنے ساکنوں کا مرثیہ پڑھنے کے لئے باقی رہ جاتی ہیں۔

با سرو قدے تازہ تر از خرمنِ گل
از دست مدہ جامِ مے و دامنِ گل
زاں پیش کہ ناگہ شود از گرگِ اجل
پیراہنِ عمر تو چوں پیراہنِ گل

اس رباعی میں موت کی تشبیہ گرگ سے اور پیراہنِ عمر کی تشبیہ پیراہنِ گل سے تعریف سے بے نیاز ہے۔

ایں چرخِ فلک کہ ما درو حیرانیم
فانوسِ خیال از و مثالے دانیم
خورشید چراغ دان و عالم فانوس
ما چوں صوریم کاندرو حیرانیم

انسان کے محدود علم کی طرف اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے اس کے علاوہ تقدیر کے اٹل۔ احکامات کے مقابلے میں انسان کی تدبیر کی رسوائی اس کی بے بسی اور بے کسی کی مظہر ہے۔ مندرجہ بالا رباعی میں خیام نے انسان کی "چارہ فرمائیوں" کی ناکامی اور اس کی حیرانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انسان کی تشبیہ فانوسِ خیال کی تصویروں سے اسقدر کامل ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ عین اسی طرح جس طرح تصویریں لبِ شکایت نہیں کھول سکتیں۔ انسان بھی "سرگردانی" کے مسلسل حملوں سے پائمال ہو کر کچھ نہیں کر سکتا۔

صبح است دمے بر سرِ گل رنگ زنیم
ویں شیشۂ نام و ننگ بر سنگ زنیم
دست از املِ دراز خود باز کشیم
در زلفِ دراز و دامنِ چنگ زنیم

خیام "ننگ و ناموس" کے خیال کو فراموش کرنا چاہتا ہے اور اس آرزو کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ "آؤ اس شیشۂ ناموس کو پتھر پر دے ماریں"۔ ایک نازک اور لطیف شیشے کو پتھر پر دے مارنے کا جو نتیجہ ہوگا وہ ظاہر ہے۔ ریزہ ریزہ ہو جائیگا۔ اور اس طرح کہ پھر اس کا جوڑنا محال ہو جائیگا۔

ساقی نظرے کہ ہمدمِ غم مائیم
محروم ز خورشید چو شبنم مائیم

ہر چند کہ عالمے ست محروم ز تو
محرومِ ترین خلقِ عالم مائیم

مہرِ عالمتاب رگِ کائنات میں خونِ حیات پیدا کرتا ہے۔ اس کے گوناگوں اعمال سے لالہ و گل کی رنگ آفرینیاں وجود میں آتی ہیں۔ اس کی تابش سے ایشیائی شعرا کے عقیدے کے مطابق جواہر پیدا ہوتے ہیں۔ غرضیکہ آفتاب کائنات کا روشن ترین عنصر ہے۔

خیام نے اپنی محرومی کو شبنم کی محرومی سے تشبیہ دی ہے۔ خورشید سے آفتابِ حقیقت مراد لیا ہے۔ اس سے پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ خیام کو کائنات کے مرکزی مسائل کے متعلق شک ہے۔ اس شک کو رفع کرنے کے لیے حقیقت کا آفتاب درخشاں ہونا چاہئے لیکن خیام اس سے محروم ہے۔ حقیقت اُسے نہیں ملتی۔ اُس کی محرومی اس خورشید سے اسی طرح کی ہے جس طرح شبنم کی۔ "خورشید اور شبنم" کا اجتماع ناممکن ہے۔ محرومی کی اس سے بہتر مثال نہ ہوسکتی تھی کہ آفتاب کے ہوتے ہوئے شبنم کا وجود قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ غالب کہتا ہے۔

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

انتقالِ اصوات

ہم کہہ چکے ہیں کہ قوتِ تخیل اپنے پُراسرار فن سے کام لیکر ایسے الفاظ کا انتخاب کرتی ہے جن کی صوت اپنے معانی سے ایک خاص تعلق رکھتی ہے اور اس طرح وہ اصوات جو مصنف کے ذہن میں تھیں قاری کو سنائی دیتی ہیں۔ یعنی بعض[1] الفاظ گنجینۂ معانی ہونے کے علاوہ کسی نہ کسی آواز کی صدائے بازگشت بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح الفاظ آواز کے بھی قائم مقام ہیں۔ ایسے لفظوں میں ایک خاص بات یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ اصطلاح و اشتقاق سے مبرا ہوتے ہیں نہ اُن کا مادہ کسی مصدر سے نکالا جاسکتا ہے۔ البتہ قواعدِ زبان میں وہ صنایع و بدایع کی ایک قسم ہوسکتے ہیں جس کو ہم تجنیسِ صوت کہیں گے۔

خیام کے کلام میں اِس تجنیسِ صوت کی کئی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

مے در کفِ من نِہ و برآور غلغل بالنعرۂ عندلیب و صوتِ بلبل
بے نغمہ اگر روا بُد سے مے خوردن مے در سرِ شیشہ مانگ ربے قُل قُل

[1] ادبی دنیا ستمبر ۱۹۳۳ء۔ "نغمۂ خاموش"

برخیز و بیا کہ چنگ بر چنگ زنیم مے نوش کنیم و نام بر ننگ زنیم
سجادہ بیک پیالۂ مے بفروشیم وین شیشۂ زہد بر سرِ سنگ زنیم

آن قصر کہ بر چرخ ہمی زد پہلو بر درگہِ او شہان نہادندے رُو
دیدیم کہ بر کنگرۂ اش فاختۂ بنشستہ ہمی گفت کہ "کو کو کو کو"

مندرجۂ بالا رباعیات میں غلغل کا تعلق شور سے۔ نعرہ کا بلند آواز سے۔ قلقل کا صراحی کی غٹ غٹ سے۔ چنگ کا نغمہ ساز سے۔ جو صوتی اور معنوی تعلق ہے وہ ظاہر ہے۔

خیال آفرینی

خیام کے اشعار سلسلہ جنبانِ خیال ہیں یعنی ان کو پڑھکر انسان اپنے ذہن میں حسین و جمیل امکانات اور تاثرات کا ایک سلسلہ قائم کرسکتا ہے اور خود ایسے معانی تخلیق کرسکتا ہے جو اشعار کے الفاظ سے پیدا نہیں ہوتے۔

من ہیچ ندانم کہ مرا آنکہ سرشت از اہلِ بہشت کرد یا دوزخ زشت
جامے و بتے و بربطے برلبِ کشت این ہر سہ مرا نقد و ترا نسیہ بہشت

جامے و بتے و بربطے برلبِ کشت اپنے اندر ایک جہانِ حسن و رنگ و بو لئے ہوئے ہے۔ "جام" اور شرابِ خوشگوار کی ارغوانی موجیں، حسین و جمیل ساقی

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ

مہوش و دلربا، جسکے خرامِ ناز سے آواز پیدا نہیں ہوتی۔ سبک رو لطیف۔ "بتے" نگارِ دل افروز۔ اور صرف اِس لفظ میں وہ تمام اندازہائے حسن پنہاں ہیں جو ذہن میں آسکتے ہیں۔ بُت کی تعریف کرکے خیام نے اپنے معانی کو اور اپنے تصورِ حسن کو محدود و مقید نہیں کیا۔ اپنے اپنے تصور و تخیل کی مطابقت میں پڑھنے والے "بُت" کا تصور کرسکتے ہیں۔ گیسوؤں کی وہ کونسی آرائش ہے آنکھوں کی وہ کونسی مستی ہے۔ عشوہ و غمزہ کی وہ کونسی شوخی ہے۔ انداز کی وہ کونسی دل آویزی ہے جو "بُت" کے لفظ میں پنہاں نہیں۔ بربطے برلب کشت۔ یعنی

سرو سبز و شیشۂ مے جوئبار نغمہ ہے
"بربطے برلب کشت"

ساقی۔ نگار۔ شراب۔ جوئبار۔ ان عناصر کے مجموعے سے جو اثر مترتب ہوتا ہے اور جس نظارے کا خیال آتا ہے وہ کسقدر حسین ہے اور اپنے امکانات کے اعتبار سے کتنا لامحدود ہے۔ **عابد**

آنریبل خان بہادر سرچودھری شہاب الدین
پریزیڈنٹ پنجاب کونسل

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور

ڈاکٹر ٹیگور ۔ [illegible]

چودہری ظفر اللہ خان صاحب بیرسٹر ایٹ لا
ایم ۔ ایل ۔ سی

چھاپنے والے نیشنل آرٹ پریس انارکلی

ٹیگور سے

ہمارے مشرقی جذبات کی رنگیں زباں تُو ہے
ہماری ایشیائی سادگی کا ترجماں تُو ہے
حسیں افکار میں روحانیت کا رنگ بھرتا ہے
مبلّغ ہے قلم کے زور سے تبلیغ کرتا ہے
ٹپکتی ہے مئے پاکیزگی تیرے خیالوں سے
فضا بھرتی ہے آہیں تیرے ہلکے ہلکے نالوں سے
الٰہی زمزموں سے رُوح کو بہلا رہا ہے تُو
کچھ اس انداز سے میٹھے سُروں میں گا رہا ہے تُو
کہ تجھ پر ایشیائی شاعری انجم لٹاتی ہے
حسیں فطرت ترے اسرار میں کھوئی سی جاتی ہے
سراپا محو ہے تو حُسنِ رنگیں کی اداؤں میں
چھُپی بیٹھی ہے تیری شخصیت تیری نواؤں میں
دیا ہے جاودانی رنگ سوز و ساز کو تُو نے
مجسّم کر دیا ہے عشق کی آواز کو تُو نے
سکوتِ شب میں تُو نے چھیڑ رکھا ہے رباب اپنا
بیاں کرتا ہے گا کر حُسن سے رنگین خواب اپنا

فاخر

(البیان سے)

ایکٹر کی وصیّت

ہنری یارک کتب خانہ میں بیٹھا ہوا اپنی طویل زندگی پر خاموش تبصرہ کر رہا تھا۔ وہ مُسکرایا۔ ہاں ۸۰ سال کی عمر میں اِسے سو دُنیا کی دنیا کے ساتھ کوئی وجہ شکایت نہ تھی۔ وہ ۵۵ سال تک اسٹیج کا بادشاہ رہا۔ زمانہ اُس کے آرٹ کا قائل ہو چکا تھا۔ وہ ہمیشہ ہیرو کا پارٹ کیا کرتا تھا۔ اور بادشاہ کا پارٹ تو گویا اسی کے لئے مخصوص تھا۔ اس کے دوست ازراہِ ظرافت اسے کنگ یارک یا ڈیوک آف یارک کہا کرتے تھے۔ یہ لقب اِسے بہت پسند تھا۔

ایکٹری کو خیرباد کہنے کے باوجود وہ اپنا شاہی زرّین جُبّہ پہنے ہوئے تھا۔ اور اب اس مہتم بالشان کتب خانہ میں اس کا انداز اُس بوڑھے تاجدار کی طرح تھا۔ جو نصف صدی تک کامیاب اور مرعوب کُن حکومت کرنے کے بعد اپنی وسیع سلطنت اپنے بچوں کے مابین تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ حیاتِ مُستعار کو آخری الوداع کہنے سے پیشتر اُس کا ارادہ تھا کہ وہ اپنی ملکیت کے متعلق باضابطہ وصیت کر لے۔

اُس نے باوقار متانت کے ساتھ پَر کا قلم اُٹھایا۔ میز پر موی کاغذ کے چند تختے پڑے تھے وہ لکھنے کو تھا۔ کہ اُس کی گذشتہ زندگی کے بوقلموں واقعات متحرک تصاویر کی طرح اُس کی چشم تخیل کے سامنے پھر گئے۔ اُس کے حریف اور نکتہ چین اپنی کم ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ایک نقاد تو خصوصیت سے آخری دم تک مخالف رہا۔ اُس نے ایک رات یارک کے "کام" پر تبصرہ کے دوران میں یہ فقرہ لکھا تھا۔ کہ "کل رات ہنری یارک نے کنگ میئر کا پارٹ کیا۔ لیکن اُس بڈھے تاجدار کی عمیق تلخ کامیوں کا حق ترجمانی ادا نہ کر سکا۔" اور اُس کے قلم نے یہاں تک حرکت کی تھی کہ ملک الموت نے اُس کی لوحِ زندگی پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔

اِس واقعہ کی یاد سے یارک کی مُسکراہٹ ایک ہلکی سی افسردگی کے ساتھ آمیز ہو گئی۔ دراصل اِن لوگوں میں یارک کے فن کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ اُن کے دل کا نہیں بلکہ دماغ کا قصور تھا۔ یارک نے زندگی کی آخری منزل پر شاہانہ عفو سے کام لے کر اپنے تمام دشمنوں کو معاف کر دیا۔ اُس نے قلم کو دوبارہ سیاہی سے تر کیا۔ اور لکھنا شروع کیا۔

"میں بہ سلامتی ہوش و حواس یہ وصیّت کرتا ہوں۔ کہ میں وکٹر تھیٹر کو جو سٹریٹ نمبر ۱۵ نیویارک شہر کے جنوب مشرقی کونے میں واقع ہے۔ اور جس کا طول ۱۸۴ فٹ اور عرض ایک سو فٹ ہے۔ اور جسکی عمارتی حیثیت میرے قانونی مشیر باقاعدہ طور پر واضح کر دیں گے۔ مسٹر فریڈرک وائٹ کے سپرد کرتا ہوں جو ...."

ہنری یارک کا قلم یکایک رُک گیا۔ کیا روزا کا نام وصیت میں درج کرنا خلافِ مصلحت تو نہ ہوگا۔ اس نے ایک لمحہ بھر سوچنے کے بعد اِس فقرہ کو ختم کر دیا۔

" روزا وائٹ کا پوتا ہے۔"

ہاں مسٹر فریڈرک وائٹ یارک کا نہیں بلکہ مس روزا وائٹ کا پوتا تھا۔ اور بس یہی ایک شخص اُس عورت کا رشتہ دار باقی تھا۔ جس سے یارک نے ایک مرتبہ عہدِ شباب میں محبت کی تھی۔ اور جس کی یاد بہار و خزاں کے اتنے دور گزرنے پر بھی اُس کے دل میں ابھی تک تازہ تھی۔ خود روزا نے بھی اُس کے ساتھ ایک مرتبہ اظہارِ محبت کیا۔ کوئی وجہ نہیں کہ وکٹر تھیٹر اِس عورت کے پوتے کو نہ دیا جائے۔

آہ روزا وائٹ! حُسن و عشق کے صدہا واقعات اِس نام میں مضمر تھے۔ یارک کی اُس کے ساتھ آخری ملاقات اسی وکٹر تھیٹر میں ہوئی تھی۔ ہاں۔ کون سا سال تھا۔ غالباً ۱۸۸۰ء کے موسم خزاں میں یقین نہیں آتا۔ کہ اس واقعہ کو ایک رُبع صدی گزر چکا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے۔ کہ یارک نے ہملٹ کا پارٹ کیا تھا حاضرین نے اُسے بار بار خراجِ تحسین ادا کیا کھیل ختم ہونے پر وہ اسٹیج کے پچھلے دروازہ سے باہر جانے کو تھا۔ کہ روزا نے اُس کے "ہیپ

آکر کہا۔ "پارک۔ آج تو تم نے کمال کر دیا!" ایک طویل جدائی کے بعد یہ غیر متوقع ملاقات پارک کے لئے سراسر سرمایۂ عیش تھی۔ اُس نے موقع غنیمت پاکر کہا۔

"روزا مجھے معاف کر دو۔ کیا واقعی ہمارا رشتۂ محبت ہمیشہ کے لئے ٹوٹ چکا ہے۔ کیا میرے لئے اب کوئی امید باقی نہیں رہی؟"

پارک اتنی مدت کے بعد اپنے تخیل میں صاف دیکھ رہا تھا۔ کہ روزا نے اپنے چہرہ پر ایک دنیائے تبسم سمیٹتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں ہنری نہیں۔ (اس کی آنکھوں میں اپنی بڑی بڑی معنی خیز آنکھیں ڈال کر) لیکن ہم دوست کی حیثیت میں مِل سکتے ہیں۔"

پارک نے اُس بارگاہِ حسن میں سر جھکا کر پھر کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ قصور میرا تھا۔ لیکن خدا کے لئے مجھے ایک اور موقع دو۔"

روزا نے کسی قدر مصنوعی متانت سے جواب دیا۔ کہ "ہنری اب تو ہمارا معاملہ طے ہو چکا ہے۔........"

ہنری پارک اِس واقعہ کو کیونکر بھلا سکتا تھا۔ کہ روزا محض اس کے فن کی داد دینے کے لئے نہیں آئی تھی۔ بلکہ اُس ملاقات میں اُسے یہ تبلانا مقصود تھا۔ کہ مسٹر وائٹ سے میری شادی ہونے والی ہے۔

ہنری پارک کا قلم جذباتِ قلبی کے ہیجان سے لرزنے لگا۔ اُس نے قلم کو میز پر رکھدیا۔ اور اِس ملاقات کے آخری منظر کی یاد اُسکے دل میں تازہ ہو گئی:۔

"تھیٹر خالی ہو چکا تھا۔ ہم دونو اُس کے سایۂ دیوار میں کھڑے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں روزا کو حاصل کرنے کی ایک آخری سربکف کوشش کروں۔ وہیں دوزانو ہو کر اُس کا دامن پکڑ لوں۔ اور با چشم گریاں محبت میں ڈوبی ہوئی سوز و گداز سے لبریز ایک ایسی تقریر کروں کہ اُسے یارائے صبر نہ رہے اور وہ بے اختیار سسکیاں بھرتی ہوئی میرے ساتھ نئے سرے سے پیمانِ محبت استوار کرے لیکن اُس کی شادی کی خبر سنکر میری طاقتِ گویائی مسلوب ہو گئی۔ میں دیر تک اُس کی طرف دیکھا کیا پھر ہم دونو عالمِ سکوت میں ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔"

موی کاغذ پر الفاظ خشک ہو چکے تھے۔ اِس کے باوجود اُس نے جاذب سے کام لیا۔ اور پھر پَر کے قلم کو سیاہی میں ڈبو کر اُسے ایک جھٹکا دینے کے بعد لکھا:۔

"میرا وہ مکان جو آرٹ پیلیس کے نام سے مشہور ہے اور ۳۲ سٹریٹ نیویارک میں واقع ہے۔ اور جس کی عمارتی حیثیت میرے قانونی مشیر باقاعدہ طور پر واضح کر دیں گے۔ میں اسے مع ساز و سامان اور جملہ تصاویر کے .... مسٹر فریڈرک وائٹ کے سپرد کرتا ہوں جو روزا وائٹ کا پوتا ہے۔"

ہنری پارک کے قلم میں از سرِ نو حرکتِ اضطراری پیدا ہوئی۔ حسن و عشق کی ہیجان[1] پرور داستانِ مسلسل اُس کے تخیل کے فلم پر رونما ہو گئی۔ اُسے یاد آگیا کہ میں روزا سے پہلی مرتبہ کب کہاں اور کیونکر ملا تھا؟۔ اُسکی کمپنی اُن دنوں شکاگو میں تھی۔ کونسا کھیل جاری تھا؟۔ ہاں "آخری ملاقات"۔ اُس زمانے میں بھی پارک ایک باکمال ایکٹر کی حیثیت میں بہت مشہور ہو چکا تھا۔ اِس کھیل کے بعد اُس کی شہرت نصف[2] النہار پر پہنچ گئی۔

اُس نے ہیرو کے پارٹ میں عاشقِ ناکام کی خونابہ فشانیوں کا حق اس سوز و گداز سے ادا کیا کہ سامعین اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ تھیٹر میں کوئی آنکھ نہ تھی جو آنسو سے تر نہ ہوئی ہو۔ دوسرے یا شاید تیسرے روز کا ذکر ہے۔ کہ پارک شہر سے باہر جھیل کا نظارہ دیکھنے کے لئے گیا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ پارک ایک ٹیلے پر کھڑا تھا۔ پانی کی نیلگوں موجیں حدِ نگاہ تک رقص کر رہی تھیں۔ بارش ہونے لگی۔ سخت بارش۔ پارک واپس آنے کو تھا۔ کہ یکایک ایک قہقہے کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔ وہ رُک گیا۔ ایک لڑکی اُس کی طرف دوڑی آرہی تھی۔ ہوا کے تند جھونکوں سے اس کے بال سنہری پردے کی طرح ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ہاں سنہری پردے کی طرح۔ وہ پارک کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے جھیل کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے ایک اور قہقہہ لگایا جو قدرت کے طوفانی منظر پر ایک حسین و جمیل تبصرہ[3] تھا۔ اُنہوں نے ٹیلے پر سے دیکھا۔ کہ ایک حبشی ماہی گیر اپنا جال پانی سے نکال رہا ہے۔ اور دوسرا اپنا جال نکال چکا ہے۔ اِس دوسرے ماہی گیر نے اوپر

[1] پُر اضطراب۔ [2] حدِ کمال۔ [3] ریویو۔

آنکھ اٹھائی - اِن دونو کو ٹیلے پر دیکھا - اور ہنسا - ہاں ہنسا - پارک کو اُس کے چمکتے ہوئے دانت صاف نظر آ رہے تھے - پارک اور وہ لڑکی واپس آ گئے - اِس رومان[1] انگیز ملاقات کا نتیجہ پیہم ملاقاتیں - ضیافتیں رقابتیں - غلط فہمیاں اور .... جدائی -

روزا ایک پادری کی لڑکی تھی - اور جب پارک شادی کے لئے اُس کے باپ کی اجازت حاصل کرنے کی خاطر اُن کے مکان پر گیا - تو وہ اپنے ڈرائنگ روم میں تھا - انگیٹھی روشن تھی - باپ کو ایک دن پہلے اُن کی محبت کا علم ہو چکا تھا - وہ اٹھا اور خشمگیں انداز میں بولا -

"میں اپنی لڑکی کو تھیٹر کے دوزخ میں نہیں جھونک سکتا - ایک ایکٹر - او خدا ! میری لڑکی اور ایکٹر سے شادی کرے - او میرے خدا"

روزا نے قہقہہ لگایا جس نے پادری کے طوفانی احتجاج[2] پر ایک تازیانے کا کام دیا - پارک کو ایک اور بات یاد آئی - اور وہ یہ کہ روزا کی ماں پارک کی طرفدار تھی - خدا اُس کی روح کو شگفتہ رکھے -

یہ ملاقات اُس کی زندگی میں ایک تاریخی حیثیت رکھتی تھی - اُسے یہاں تک یاد تھا - کہ اس کمرے میں انگیٹھی کے اوپر طاق پر ایک خوشنما کھلونا جہاز پڑا تھا - وہ ابھی تھیٹر تک نہ پہنچا تھا - کہ رستے میں اُسے روزا مل گئی - روزا کی زندگی قہقہہ و شادمانی کا ایک تلاطم پیہم تھی - پارک نے اپنے آخری لمحوں میں روزا کی بے وفائی کو اپنی بدقسمتی پر محمول کیا - اُس نے بہت جلد پارک کے رقیب وائٹ سے شادی کر لی - لیکن دنیا کا یہی دستور ہے - پارک نے پھر قلم اُٹھایا اور لکھنا شروع کیا :-

"کرسٹل ہوٹل جو ریلوے اسٹیشن کو جاتے ہوئے براڈوے اسٹریٹ کے دائیں طرف واقع ہے اور جس کی آمدنی ایک ملین ڈالر سالانہ ہے - نیز وہ باغ جو اُس ہوٹل سے متصل واقع ہے میں اُسے مسٹر فریڈرک وائٹ کے سپرد کرتا ہوں جو روزا وائٹ کا پوتا ہے"

پارک کا ہاتھ تھرتھرانے لگا - اُس کے دماغ میں خیالات کا ایک نیا چکر پیدا ہوا - پارک کو روزا کی موت کے چوتھے دن بعد اُس کے خاوند مسٹر وائٹ سے ملنے کا اتفاق ہوا - وہ ایک ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے - پارک کی خاموشی میں جذبۂ رقابت کارفرما تھا - کھانا ختم ہونے پر ہلکی شراب کی باری آئی - وائٹ نے اپنے گلاس کو ایک چمچے سے ضرب لگاتے ہوئے پوچھا :-

"آپ کی کمپنی کتنے روز ٹھہرے گی"

جامِ شراب اور چمچہ ! پارک کو اپنے رقیب کی یہ حرکت پسند نہ آئی - اُس نے سوچا کہ آخر روزا کے لئے اِس میں کونسی بات موجب کشش تھی - کہ اُس پر فریفتہ ہو گئی - لیکن نہیں - روزا کا اُس کی محبت میں گرفتار ہونا اِس امر کا بدیہی[1] ثبوت ہے کہ اِس میں کوئی خاص خوبی ضرور ہے -

غرضیکہ بڈھے ایکٹر کے دماغ میں گذشتہ ساٹھ ستر سال کے واقعات ایک اُلجھے ہوئے ناقابلِ تشخیص[2] سلسلے میں چکر کاٹ رہے تھے - ابھی اُسے اپنی وصیت کا آخری حصہ لکھنا باقی تھا - روزا وائٹ کے پوتے کے علاوہ کوئی اور شخص یا انجمن تو نہیں جو امداد کی مستحق ہو - پارک کے پاس ابھی ایک اور چیز تھی - جس کے بالمقابل وہ اپنی ساری جائداد کو بالکل ہیچ سمجھتا تھا - وہ ایک خط تھا - تاریخی خط جو نیویارک ٹائمز کے چیف ایڈیٹر نے ایک مرتبہ اُسے لکھا تھا -

پارک نے یہ خط جیب سے نکالا اور پڑھنا شروع کیا -

نیویارک ٹائمز مورخہ ۱۲ مارچ ۱۸۹۷ء

مائی ڈیئر ہیری -

میں مدت سے آپ کا پارٹ دیکھنے کا متمنی[3] تھا - کل رات آپ نے شہنشاہ اگسٹس کا پارٹ اِس خوبی سے ادا کیا - کہ میں اُسے دیکھنے کے بعد آپ کو زمانۂ حاضر کا سب سے بڑا آرٹسٹ کہہ سکتا ہوں - آپ کے فن میں جدت ہے - جذبات کی تصویر آرائی میں آپ کا ملکہ ایک ماہرِ خصوصی کی حیثیت رکھتا ہے - مجھے کھیل کے خاتمے پر ایک دوست نے بتایا - کہ بعض نقاد آپ پر نکتہ چینی کرتے ہیں - ایسے لوگ یقیناً آرٹ کے اصول سے قطعاً ناآشنا ہونگے - یا اُن کی جرح و نقد کسی ذاتی کاوش یا جذبۂ حسد پر مبنی ہے - میں نے ٹائمز کے نقاد کو خاص ہدایت کر دی ہے کہ وہ آئندہ آپ کے اعجاز نما فن کو خصوصیت سے ملحوظِ خاطر رکھے -

---

[1] رومان - داستانِ درد - [2] پروٹسٹ -

[1] کھلا - [2] دریافت - [3] آرزومند -

میں ہوں آپ کا صادق
میکائیل ڈائینا
ایڈیٹر ٹائمز

ہنری یارک نے یہ خط پڑھا۔ اور پھر بآوازِ بلند کہا۔ "میرے آرٹ کا شاہد۔ میری زندگی کا سب سے گرانقدر سرمایہ! میں اسے یقیناً مسٹر فریڈرک کے حوالے نہیں کر سکتا۔ کیا میں اُسے امریکہ کی مجلسِ مصنفین کے حوالے نہ کر دوں کہ وہ اسے فروخت کر ڈالیں۔ اور اس کے عوض جو چند لاکھ ڈالر وصول ہوں۔ وہ معذور الخدمت[1] اور مفلوک الحال ایکٹروں کے امدادی سرمائے میں شامل کر دئے جائیں۔ نہیں نہیں۔ یہ خط آرٹ سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ میں اسے اپنی آخری آرام گاہ میں اپنے سینے کے ساتھ رکھونگا۔ اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس کا سارا جسم لرزنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ زندگی کی آخری کشمکش میں اُس نے اپنا خط سینے سے لگانے کی کوشش کی۔ لیکن تماشہ گاہِ ہستی میں اُس کا پارٹ ختم ہو چکا تھا لوگوں نے اُس کی موت کی خبر سُنی اور کہا۔ افسوس وہ نامور اور یکتا ایکٹر ساری عمر افلاس زدہ رہا۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ پاگل ہو گیا تھا۔ اور اُس عظیم الشان مکان میں رہتا تھا۔ جو امریکہ کے امیر ایکٹروں کی مجلس نے اپنے مفلوک الحال معاصرین کے لئے بنا رکھا ہے۔ یہاں وہ شاہی لباس میں ملبوس اپنے آپکو بے شمار روپیہ اور تھیٹروں اور ہوٹلوں کا مالک سمجھتا تھا۔ یہ وصیت بھی اسی سراب نما تخیل[2] کا نتیجہ تھی۔ اُس کا سرمایۂ حیات دراصل وہ ایک خط تھا جو ٹائمز کے ایڈیٹر نے ازراہِ قدردانی اُس کے نام لکھا تھا۔

غیر معروف جرنلسٹ

[1] اپاہج۔ اور از کار رفتہ لوگ

[2] سراب نما تخیل۔ ایسا خوش نما تخیل جو کچھ اصلیت نہ رکھتا ہو۔

بہار کی شگفتگی

فضا کی ساری دلکشی تبسموں میں کھو گئی
بہار کی شگفتگی نظر میں جذب ہو گئی
تمام تر تجلیاں
حریم دل میں ضو فشاں
تاثراتِ رنگ و بو
فروغِ کیفِ آرزو!
فروغِ کیفِ آرزو تاثراتِ رنگ و بو!

(۲)

ہزارہا لطافتیں ادائے التفات میں
بھری ہوئی ہیں نزہتیں تمام کائنات میں
نسیم عطر بیز ہے
شباب جلوہ ریز ہے
چمن بھی ہے شراب بھی
اُٹھا لے ہاں رباب بھی
اُٹھا لے ہاں رباب بھی چمن بھی ہے شراب بھی!

منظور سروش (بھوپال)

دمشق کی موجودہ حالت

"جب عرب فرمانرواؤں نے دمشق اور اُس کے مضافات کی سیر کی تو اُن میں سے ہر ایک کے مُنہ سے بے اختیار یہی نکلا کہ "دمشق تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے زمرد میں نیلم نصب کر دیا ہو" کچھ عرصہ کے بعد یہ قول ضرب المثل ہوکر رہ گیا۔ ظاہر ہے کہ اس قول میں صداقت ضرور مضمر ہوگی۔ جن سیاحوں نے دمشق کی سیر کی ہے وہ اس مقولے کی صحت و صداقت پر مُہرِ تصدیق ثبت کرتے ہیں۔

دمشق کی ساری زیبائش اور خوبصورتی کا انحصار اُس نہر پر ہے جو اُس کے گرداگرد بہتی ہے۔ جب آپ شہر میں داخل ہونگے تو سب سے پہلے اسی نہر کا پُل عبور کرنا پڑیگا۔ شہر کے اندر بھی ہر سڑک اور گلی کوچے میں اس بڑی نہر کی شاخیں مارپیچاں کی طرح بل کھاتی ہوئی چلی گئی ہیں۔ اُن کی بدولت، موسم میں اعتدال بھی پیدا ہوگیا ہے اور شہر کے اندر جسقدر افتادہ زمین ہے، سب انار، نارنگی، انگور، ناسپاتی، سیب اور کھجور کے باغیچوں میں تبدیل ہوگئی ہے۔ کیسے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنہوں نے ان باغیچوں میں اپنی رہائش کے لئے خس و خاشاک سے پاک چھوٹے چھوٹے بنگلے بنوا رکھے ہیں جب آپ شہر کے وسط میں پہنچیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جونپور کی طرح دمشق بھی اس نہر یا مصنوعی دریا کے دائیں بائیں آباد ہے یہ نہر شہر کے وسط میں سے گزرتی ہے۔ اور اس کے کنارے قدیم زمانہ کی صدہا عالیشان عمارات زبانِ حال سے اپنے بنانے والوں کی عظمت کی گواہی دے رہی ہیں اِس نہر سے ہزاروں چھوٹی چھوٹی نہریں نکلی ہیں اور شہر کے تمام مکانات کے سامنے سے گزرتی ہیں تاکہ باشندوں کو ہر وقت تازے پانی کا آرام رہے۔ تمام بڑے بڑے مکانات میں فوارے لگے ہوئے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی حوضیں بنی ہوئی ہیں، اُن کے گرداگرد نارنگی کے پودے لگے ہوئے ہیں۔ گویا دمشق میں نہروں کا جال بچھا ہوا ہے۔

اگر کسی ہوائی جہاز پر چڑھ کر شہر پر طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ دمشق ایک عظیم الشان باغ ہے یا ایک عظیم الشان باغ میں ایک شہر بسا ہوا ہے۔ یہ حالت آج سے نہیں بلکہ جب سے دمشق آباد ہے اُسی وقت سے قائم ہے۔ ہر مسجد، ہر مدرسہ، ہر صومعہ، ہر مکتبہ ہر کوچہ، ہر بازار، ہر محل اور ہر جھونپڑا، غرضیکہ جو چیز ہے باغ کے اندر ہی بنی ہوئی ہے۔ وہیں شہر بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اِس کے معنی صاف ظاہر ہیں کہ دمشق کا وجود اِس نہر ہی کے سہارے قائم ہے۔

عام طور پر مسلّم ہے کہ دمشق دنیا میں سب سے پرانا شہر ہے۔ یعنی بنارس اور پیکن سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ مسیح سے ڈھائی تین ہزار سال پہلے کی تاریخوں میں اِس شہر کا ذکر موجود ہے۔ ممکن ہے بنارس یا پیکن اِس سے بھی زیادہ پُرانا ہو لیکن اِن شہروں کی قدامت تاریخی طور پر ثبت نہیں ہو سکتی۔ اِس شہر پر بارہا مختلف بادشاہوں نے حملے کئے۔ باشندوں کو قتل کیا، اور شہر کو اُجاڑا، لیکن تھوڑے دنوں کے بعد پھر اصلی حالت پر آگیا۔ وجہ یہ ہے کہ یہ شہر مصر، یونان، عراق، اور عرب اِن چار ملکوں کے درمیان میں واقع ہوا ہے اور ہمیشہ سے تجارت، صنعت اور حرفت کا مرکز رہا ہے اور یہاں کا بازار اِن تمام ملکوں کے سوداگروں اور سیاحوں کا ملجا اور ماوا رہا ہے۔ قدیم زمانے میں فوجی ساز و سامان اِسی شہر سے تمام ممالک میں جاتا تھا۔ یہاں کی تلوار اور زرہ تمام دنیا میں مشہور ہے۔ علاوہ بریں، اگر کوئی شخص مصر سے عراق کو جائے تو راستہ میں یہی ایک شہر ایسا ہے جہاں مسافروں کو ہر قسم کی چیزیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اِن وجوہ کی بنا پر دمشق قدیم الایام سے، دنیائے قدیم کے لئے جاذبِ توجہ رہا ہے۔

آجکل، اگرچہ بہت سے نئے شہر دنیا میں ترقی پذیر ہیں لیکن دمشق کی عظمت اور دلکشی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ہندوستان سے یورپ جانے کا آسان اور نزدیک کا راستہ یہ ہے کہ کراچی سے بصرہ تک جہاز میں، بصرہ سے دمشق تک موٹر میں، دمشق سے ریلوے ٹرین آپ کو تیار ملیگی، قسطنطنیہ ہوتے ہوئے یورپ کے جس ملک میں جی چاہے، جا سکتے ہیں۔

دمشق کی صنعت و حرفت بھی آجکل ترقی پذیر ہے۔ پیتل لوہے، ہاتھی دانت اور جواہرات کی بنی ہوئی چیزیں، بکثرت لندن اور نیویارک، قاہرہ اور کلکتہ کے بازاروں میں بھیجی جاتی ہیں، اور قدردان بنہایت شوق سے اُن کو خرید کر، اپنے گھروں کو سجاتے ہیں۔

یہاں کا میوہ بھی خشک وتر دونوں صورتوں میں، مختلف ممالک کو بھیجا جاتا ہے۔ اگرچہ دمشق میں مشرقیت کافی طور پر نمایاں ہے لیکن مغربیت کا اثر بھی آہستہ آہستہ پھیلتا جاتا ہے۔ دکانوں کی آرائش، لباس، وضع قطع، اور معاشرت ان سب باتوں میں یورپین تمدن کی جھلک نمودار ہو رہی ہے۔

دمشق کا قدیم بازار جسے "صراطِ مستقیم" کہتے ہیں، آج بھی قدیمی شان و شوکت کے ساتھ قائم ہے۔ یہ بازار شہر کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے یعنی اُسی قدر لمبا ہے جسقدر دمشق۔ حضرت مسیح کا مشہور شیدائی اور مسیحیت کا پُرجوش مبلغ سینٹ پال بھی اسی بازار میں چل پھر کر لوگوں کو دینِ مسیحی کی طرف بلایا کرتا تھا اور وہ مشہور کھڑکی بھی ابھی تک محفوظ ہے جس میں سے سینٹ پال نے رات کے وقت، ایک ٹوکری میں بیٹھ کر راہِ فرار اختیار کی تھی۔

آجکل دمشق پر فرانسیسی حکومت ہے۔ حکومت نے شہر کی تمدنی علمی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی بہت کچھ کوشش کی ہے جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں لیکن دیسی صنعت کو فروغ دینے کے لئے جو ذرائع اختیار کئے ہیں اُس کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان سرگرمیوں کا مرکز، "فرنچ انسٹیٹیوٹ آف دمشق" کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن دراصل یہ کوئی فرنچ انسٹیٹیوٹ نہیں بلکہ اسلامی آرٹ اور آثارِ قدیمہ کا انسٹیٹیوٹ ہے۔ اس انسٹیٹیوٹ یا انجمن کی بنیاد فرنچ جنرل گوراڈ نے ۱۹۲۲ء میں ڈالی تھی جو اس زمانہ میں، ملکِ شام کا ہائی کمشنر (ناظمِ اعلیٰ) تھا، اور اس کا دفتر اسعد پاشا العظیم سابق والیِٔ شام کے محل میں واقع ہے جو ۱۷۴۹ء میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ محل ایک نہایت عالی شان عمارت ہے اِس کے اندرونی کمروں میں نہایت اعلیٰ درجہ کی گلکاری اور پچی کاری کے نمونے موجود ہیں۔ لیکن حکومت کی عدم توجہی کی بناء پر بعض حصے بوسیدہ ہو گئے تھے۔ اس لئے بہت اچھا ہوا کہ فرنچ حکومت کی توجہ اس عمارت کی طرف مبذول ہوگئی۔ جنرل مذکور نے بصرفِ زرِ کثیر تمام عمارت کی مرمت اور اصلاح کرادی اور یقین ہے کہ یہ عمارت اب زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہیگی۔

فرنچ انسٹیٹیوٹ، تھوڑے عرصہ میں آثارِ قدیمہ اور مشرقی آرٹ دونوں کی مشہور درسگاہ، اور دار المطالعہ بنجائیگا۔ کیونکہ آٹھ نو سال کے قلیل عرصہ میں ہی اس کی شہرت دور و نزدیک پھیل گئی ہے۔ اور آج اس انسٹیٹیوٹ میں، اٹلی اور فرانس تک کے طلبا، تحصیلِ فنون میں مشغول نظر آتے ہیں۔ اس مرکز میں اسلامی تاریخ کے پڑھانے کا بھی خاص انتظام ہے۔ ایک عظیم الشان کتب خانہ اور عجائب خانہ بھی اِسی مقصد کی تکمیل کے لئے مہیا کیا گیا ہے۔ اِس عجائب خانہ میں سامرہ۔ فسطاط۔ انطاکیہ۔ حنانیہ اور دیگر مقامات سے دستیاب شدہ نادر الوجود اشیاء فراہم کی گئی ہیں۔ قدیم یونانی اور رومی مصوری، بت تراشی اور تحریروں کے نمونے اور مسلمان بادشاہوں کے سونے چاندی کے سِکّے۔ خلفائے بنو امیہ کے فرامین اور شاہی دستاویزیں، قدیم اسلحہ کے نمونے، قدیم عربوں کے اصنام یہ چیزیں اس عجائب خانہ کی اہمیت کا باعث ہیں۔

اِن امور کی بناء پر یہ قیاس کرنا بیجا نہیں ہے کہ اگر فرنچ حکومت کی توجہ اِسی طرح اِس درسگاہ کی طرف مبذول رہی تو بیس تیس سال کے بعد یہ انسٹیٹیوٹ، یورپ کے محققین اور طلبائے اسلامیات وغیرہ کے لئے ایک نعمتِ بے بہا بنجائیگا۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ قدیم شہر جس کا نام بہت سے شاہی خاندانوں کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ نئی حکومت کے ماتحت اپنی سابقہ عظمت کو برقرار رکھ سکیگا اور کوئی تعجب نہیں اگر اُس کا مستقبل اُس کے ماضی سے بھی زیادہ شاندار ثابت ہو۔

(ہندوستان ریو) مہتاب رائے

غزل

(از حضرت جگر مرادآبادی)

اب میری نگاہوں سے ہر جلوہ گریزاں ہے | نظارے کو کیا کہیے منظر ہی پریشاں ہے
اک حسن کا دریا ہے، اک نور کا طوفاں ہے | اس پیکرِ خاکی میں یہ کون خراماں ہے
پھر عشقِ جنوں پیشہ یوں سلسلہ جنباں ہے | راہیں بھی گریزاں ہیں منزل بھی گریزاں ہے
اک سازِ محبت ہی کل عالمِ امکاں ہے | تو چھیڑ تو دے ظالم ہر تار رگِ جاں ہے
آغاز سے آخر تک دل بیخود و حیراں ہے | جب عشق نگہباں تھا اب حسن نگہباں ہے
مجھکو مرے عصیاں سے کیا خاک ڈرائیگا | زاہد وہی زاہد جو رحمت سے گریزاں ہے
تو رازِ محبت کو سمجھا ہی نہیں ورنہ، | پابندیٔ انساں ہی آزادیٔ انساں ہے
عالم میں یہ کب طاقت ہستی کی یہ کیا قدرت | تو خود جو خراماں ہے سایہ بھی خراماں ہے
صدقے ترے ہونٹوں کے رنگینی و رعنائی | اک موجِ تبسم میں کل رازِ گلستاں ہے
اک شاہدِ بیتابی، اک پیکرِ محبوبی؛ | ہر درد میں شامل ہے ہر سانس میں پنہاں ہے

ہر جلوے سے مستغنی ہر حسن سے بیگانہ
اک وحدتِ کامل ہے اب کفر نہ ایماں ہے

جگر (مرادآبادی)

آنریبل ڈاکٹر گوکل چند نارنگ ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا
وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ پنجاب

آنریبل ملک فیروز خان نون ایم اے بیرسٹر ایٹ لا وزیر تعلیم پنجاب

سید حسن برنی بی۔اے ایل ایل بی رکن ادارۂ ادبی دُنیا

بلاک بنانے والے ہاف ٹون کمپنی انارکلی لاہور

چھاپنے والے: نیشنل آرٹ پریس انارکلی لاہور

شادی شدہ عورتیں

ایک مجرد آدمی کی حیثیت سے میں نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ شادی شدہ لوگوں کی خامیوں اور کمزوریوں کو جمع کرنے میں صرف کیا ہے تاکہ اِس طرح اپنے آپ کو اُن مسرتوں سے محروم رہ جانے پر تسلی دے سکوں جن کو کہا جاتا ہے کہ میں نے ناکتخدا[1] رہ کر کھو دیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میاں بیوی کے باہمی جھگڑوں نے مجھ پر کچھ زیادہ اثر ڈالا ہے۔ یا میرے اُن غیر اجتماعی عزایم کو راسخ کرنے میں کچھ حصہ لیا ہے۔ جن کو میں مدت سے معقول وجوہ کی بنا پر اختیار کر چکا ہوں۔ بلکہ شادی شدہ لوگوں کے مکانوں میں جہاں میں اکثر جاتا رہتا ہوں جس چیز سے مجھے فی الحقیقت تکلیف ہوتی ہے وہ ایک بالکل مختلف نوعیت کی غلطی ہے یعنی یہ لوگ آپس میں ضرورت سے زیادہ اُلفت کرتے ہیں۔

نہیں "ضرورت سے زیادہ الفت" بھی نہیں۔ اِس سے میرا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ اِس کے علاوہ مجھے اِس سے تکلیف بھی کیوں ہو؟ ایک دوسرے کے ساتھ رہکر مکمل عشرت حاصل کرنے کی غرض سے اِن لوگوں کا اپنے آپ کو ساری دنیا سے الگ کر لینا ہی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو باقی سارے عالم پر ترجیح دیتے ہیں۔ مگر مجھے شکایت اِس بات کی ہے کہ یہ لوگ "ترجیح و پسندیدگی" کے اس جذبے کو اسقدر بے محل عُریانی کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔ خصوصاً ہم مجردوں کے منہ پر تو اِس کو اتنی تلخی اور گستاخی کے ساتھ کھینچ مارتے ہیں کہ آپ اِن لوگوں کی صحبت میں یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آپ کے ساتھ اس قسم کی کوئی "ترجیح و پسندیدگی" وابستہ نہیں ہے۔

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر انہیں مُضمر[2] رکھا جائے یا مسلّمات میں شامل کر دیا جائے۔ تو اُن سے کسی قسم کا رنج نہیں پہنچتا لیکن ظاہر کر دینے کے بعد اُنہی میں سے اذیت کے بہت سے پہلو نکل آتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی سادہ لباس اور غیر دلکش صورت رکھنے والی لڑکی سے واقف ہو اور اس سے مل کر کسی دن وہ گفتگو کی ابتدا اِس جملے سے کرے کہ "خاتون! چونکہ آپ نہ اسقدر مالدار ہیں نہ اسقدر حسین کہ میرے لائق ہوں۔ اِس لئے میں آپ سے شادی کرنے کے لئے تیار نہیں" تو آپ اُس کو اِس بیہودگی کی بنا پر سرزنش کا سزاوار سمجھیں گے۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ اگر قرب اور موقعہ ملنے کے بعد بھی اُس شخص نے اُس لڑکی سے شادی کی درخواست نہیں کی تھی تو اِس کا مطلب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ شادی پسند نہ کرتا تھا۔ اور وہ دونوں اِس حقیقت سے اسقدر اچھی طرح واقف تھے جیسا کہ لفظوں میں صاف صاف کہدیا گیا ہو۔ مگر کوئی ذی ہوش لڑکی محض اِس بات کے ایک حقیقت ہونے کو وجہ جنگ قرار نہیں دے سکتی۔ پھر بالکل اِسی شخص کی طرح کسی شادی شدہ خاتون کو بھی یہ حق نہیں ہے۔ کہ وہ لفظوں سے۔ یا لفظوں سے زیادہ معنی خیز نظروں سے مجھے یہ بتائے کہ میں وُہ خوش قسمت انسان نہیں ہوں جس پر خاتون کی نظرِ انتخاب پڑی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میں نہیں ہوں اور یہ میرے لئے کافی ہے۔ بار بار کی یاد دہانی بھلی نہیں معلوم ہوتی۔

کسی شخص کی طرف سے علم یا دولت کی نمائش بھی کافی جگر سوز ثابت ہو سکتی ہے۔ مگر پھر اِس نمائش کا مفید پہلو اِس کی مکافات کر دیتا ہے۔ مثلاً وہی علم جس کے اظہار سے مقصد میری توہین ہو۔ میری قابلیت میں اضافہ کرتا ہے۔ اِسی طرح ایک دولتمند آدمی کے محلوں اور تصویروں پر۔ اُس کے باغوں اور چمنوں پر، مجھے ایک حقِ تصرف ملجاتا ہے۔ مگر ازدواجی مسرتوں کی نمائش سے جو تکلیف پہنچتی ہے اُس کی مکافات کسی طرح نہیں کیجا سکتی۔ یہ نمائش ایک خالص ہتک ہے۔ جس کی حد ہے نہ انتہا۔

شادی ہا اپنے بہترین عنوان کے لحاظ سے اک وحدتِ ملک ہو اور بس۔ پھر وہ بھی بے انتہا رشک انگیز قسم کی۔ تقریباً سب ہوشیار مالکوں کا یہ دستور ہے کہ وہ اپنی قیمتی مِلک کو اپنے ہمسایوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں کہ مبادا وہ کم نصیب لوگ، اُن کے حقِ ملک پر شبہ اور اعتراض کر کے اُن کی حالت کو نازک بنا دیں۔ مگر یہ شادی شدہ

---

[1] ناکتخدا۔ کنوارا [2] مضمر۔ پوشیدہ۔ [3] مانی ہوگی۔

[4] شادی کی خوشیوں۔

لوگ اپنی وحدت ملک کے ناپسندیدہ حقوق کا اشتہار نہایت بےشرمی سے تمام دنیا میں دیتے پھرتے ہیں۔

مجھے دنیا کی کوئی چیز اسقدر تنفر انگیز نہیں معلوم ہوتی جتنا کہ وہ سرور و انبساط، وہ خود اطمینانی، وہ سکون جو ایک نئے بیاہے ہوئے جوڑے کے چہروں میں چمکتا ہے خصوصاً خاتون کے چہرے میں، یہ آپ کو بتاتا ہے کہ خاتون کی قسمت اس دنیا میں متعین ہو چکی اور یہ کہ اب آپ اُس کو پانے کی امیدوں سے ہاتھ دھو لیجئے، یہ سچ ہے۔ خود مجھے بھی کوئی امید نہیں ہے۔ اور شاید خواہش بھی نہیں، مگر جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں، یہ اُن صداقتوں میں سے ہے جو مسلمات میں شامل ہونی چاہئیں نہ کہ قابلِ بحث چیزوں میں۔

ان عورتوں کی خود بینیاں اور خود پسندیاں یقیناً زیادہ رنج دہ ہوتیں اگر وہ اتنی غیر معقول اور نادان نہ ہوتیں۔ یہ عورتیں ہم بے بیاہے ہوئے لوگوں سے پوری واقفیت نہ رکھتے ہوئے بھی اسقدر ہمہ دانی کا ادعا کرتی ہیں کہ العظمۃ للہ[1]۔ ہم اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں کہ یہ عورتیں اپنے ہم مشربوں کے طلسمی احوال سے ہمارے مقابلے میں زیادہ واقف ہیں۔ ہم کو اُن کے ساتھ زیادہ آزادی کے ساتھ ملنے کے مواقع بھی میسر نہیں ہیں۔ مگر اِن کی سرکشی دیکھئے کہ اپنی حدود پر قانع نہ رہ کر ہر جگہ ہر مسئلہ میں خود کو مستند سمجھتی ہیں۔ اگر اِن کی موجودگی میں کوئی مجرد آدمی کسی معمولی سے معمولی مضمون پر یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ اظہار رائے کا حق رکھتا ہے۔ لب کشائی کی جرأت کرے تو فوراً اُس کی زبان بندی کر دیجاتی ہے یہ کہکر کہ وہ اہلیت نہیں رکھتا۔ میرے شناساؤں میں سے ایک نوجوان خاتون نے جس کی شادی کو لطف یہ ہے کہ کچھ زیادہ دن بھی نہیں ہوئے بمشکل سے اِس تبدیلِ حالت پر پندرہ روز کا عرصہ گزرا ہوگا، خود مجھے مچھلیوں کی پرورش اور فروختگی کے بہترین طریقوں پر گفتگو کرتے ہوئے، ایکدن بطرزِ استہزا[2] یہ سوال قائم کر دینے کی ہمت کر لی کہ آخر میں ایک دیرینہ ناکتخدا ہوتے ہوئے خواہ مخواہ کیوں ایسے معاملات میں دخل اندازی کی ہمت کیا کرتا ہوں؟۔

اب تک جو کچھ میں نے کہا ہے وہ بیخیوں اور تکبروں کے مقابلے میں قطعاً ہیچ ہے۔ جو یہ لوگ صاحبِ اولاد ہو جانے پر اپنے آپ میں شامل کر لیتے ہیں۔ ہزار مرتبہ کوشش کی مگر اب تک میں یہ سمجھنے سے عاجز ہوں کہ آخر بچے والا ہونا کیا فخر و ناز کی بات ہے۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ کہ اِن بچوں میں کونسی قدرت ہے۔ بازاروں اور تنگ و تاریک گلیوں میں اِن کے غول کے غول پھرتے ہیں۔ غریب سے غریب شخص کے پاس یہ نعمت بکثرت ہوتی ہے۔ بہت ہی کم شادیاں ایسی ہوتی ہیں جن میں یہ سودا نہ ملتا ہو۔ کتنے ہی بچے آوارہ ہو جاتے ہیں اور والدین کی خوش امیدیوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ بُری راہوں کو اختیار کر کے افلاس کی مصیبتوں میں گرفتار ہوتے ہیں۔ ذلت اور بدنامی سہتے ہیں اور پھانسی پر چڑھتے ہیں۔ مجھے بتاؤ کہ اِس میں کیا قدرت ہے جو وجہ غرور بن سکے؟ ہاں، اگر بچے چھوٹے چھوٹے عنقا ہوتے جو سال میں صرف ایک ہی پیدا ہوتا ہے۔ تو شاید کوئی عذر مل سکتا مگر اسقدر عام ہوتے ہوئے۔!

میں اُس ہتک آمیز تعرض کی طرف توجہ نہیں دلاتا جو یہ شادی شدہ خواتین بچوں کی مائیں ہو جانے پر اپنے شوہروں کے مقابلے میں برتتی ہیں۔ وہ جانیں اُن کا کام۔ مگر میں یہ سمجھ سکتا کہ آخر ہم لوگوں سے جو بہرحال اُن کے پیدائشی محکوم نہیں ہیں۔ کیوں اس بات کی توقع کیجا سکتی ہے کہ اُن کے لئے نذریں فراہم کر کے پیشکش کریں۔ اس خراج یا ٹیکس کی وجہ؟" نوعمر بچے ایسے ہیں جیسے دیو کے ہاتھ میں تیر۔ خوش قسمت ہے وہ انسان جس کا ترکش اِن تیروں سے پُر ہو" — عورتوں کی مذہبی تعلیم کے لئے وضع کی ہوئی کتابوں میں یہ جملہ موجود ہے اور میں اس سے متفق ہوں۔ مگر اِن تیروں سے بھرے ہوئے ترکشوں کو ہم پر کیوں خالی کیا جاتا ہے؟ بچے تیر ہیں اور ضرور ہیں مگر ہمیں چھیدنے اور زخمی کرنے کے لئے تو نہیں ہیں۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ اِن تیروں کا پھل دو شاخہ ہوتا ہے اور دو کانٹوں میں سے کسی ایک کا پیوست ہو جانا یقینی ہے مثلاً اگر آپ کسی ایسے مکان میں جائیں جو بچوں سے بھرا ہوا ہو اور اپنے تخیل میں مستغرق ہونے کی وجہ سے اُن کی طرف دھیان نہ کریں یا اُن کی محبت آمیز باتیں سُنی اَن سُنی کر دیں۔ تو آپ کے متعلق فی الفور یہ فیصلہ صادر کر دیا جائیگا۔ آپ ایک سخت دل، غم پسند اور بچوں سے نفرت کرنے والے آدمی ہیں۔ اِس کے خلاف اگر آپ اُن سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کریں۔ اگر اُن کی پیاری اور بھولی باتوں سے مسحور ہو کر اُن کے ساتھ کھیلنے کا تہیہ کریں تو یقین کر لیجئے کہ کسی نہ کسی عنوان سے اُن بچوں کو کمرے سے باہر بھیجدیا جائیگا۔ یا یہ کہا جائیگا کہ وہ بہت شور و غل کرتے

---

[1] خدا کی پناہ۔ [2] مذاق اڑانا۔

ہیں - یا یہ بتایا جائیگا کہ مسٹر غیر معلوم بچوں کو پسند نہیں کرتے - وہی ہیں جن نے کھانا بہتیرا کا ایک نہ ایک کانٹا ضرور آپ سب کے گلے میں ترازو ہوگا۔

میں ان خواتین کے رشک و حسد سے درگزر کرسکتا ہوں - اور اُن کے بچوں کے ساتھ کھیلنے سے بھی باز رہ سکتا ہوں - اگر اس سے اُن کو کچھ دکھ پہنچتا ہے - مگر اس چیز کو یقیناً نامعقول سمجھتا ہوں کہ اُن سے محبت کرنے پر مجبور کیا جاؤں جب کہ کوئی موقعہ بھی نہ ہو۔ مثلاً آٹھ، نو یا دس آدمیوں کے پورے خاندان سے بلا تفریق و امتیاز محبت کرنا اور سارے بچوں سے پیار رکھنا صرف اس لئے کہ بچے ہوتے ہی کچھ دلکش ہیں - ایک لغویات ہے -

مجھے یہ کہاوت معلوم ہے کہ "مجھے چاہو اور میرے کتے کو بھی" اگرچہ یہ کہاوت ہمیشہ یکساں طور پر قابلِ عمل نہیں ہوتی خصوصاً اگر کتے کو آپ کے ستانے کے لئے یا کمیں میں آپ کی طرف بھونک کر لپکنے کے لئے قصداً اکسایا جائے، تاہم میں کوشش سے کسی نہ کسی طرح اس بات میں کامیاب ہوسکتا ہوں کہ ایک کتے یا کتے سے کمتر غیر جاندار چیز سے (مثلاً یادگار، انگوٹھی، گھڑی، درخت یا وہ جگہ جہاں آخری مرتبہ ملاقات ہوئی تھی) محبت کرنے لگوں اس لئے کہ مجھے اپنے دوست سے محبت ہے اور ہر وہ چیز جو اس کی یاد دلائے مجھے عزیز ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ چیز اپنی فطرت کے اعتبار سے سادہ ہو۔ یعنی میرا تخیل جو رنگ بھی اس میں بھرنا چاہے وہ اس کو قبول کرلے۔ لیکن بچوں کی خود اپنی ایک مخصوص طبیعت ہوتی ہے، اُن کا اپنا ایک قدرتی اور مستقل وجود ہوتا ہے - وہ بذاتِ خود یا دلچسپ ہوتے ہیں یا غیر دلچسپ - اُن کی صفات کے لحاظ سے اُن سے یا محبت کیجا سکتی ہے یا نفرت - ایک بچے کی فطرت اس سے کہیں زیادہ سنجیدہ ہوتی ہے کہ اس کو کسی دوسری ذات کا محض لاحقہ قرار دیا جائے - اور اُس کی محبت کو دوسرے کی محبت کی فرع - میرے نزدیک ان بچوں کی بڑے آدمیوں کی طرح اپنی اپنی جداگانہ شخصیت ہوتی ہے -

مگر آپ کہیں گے کہ کم سنی یقیناً ایک دلکش چیز ہے - بچپن کے نازک و شاداب سالوں میں کوئی ایسی چیز ہے جو ہمارے لئے اپنے میں جذب پنہاں رکھتی ہے - آپ درست کہتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ بچوں کے ساتھ میں نرمی برتتا ہوں - مجھے معلوم ہے کہ ایک پیارا

ا۔ پیوست ہوگا۔ چبھ جائیگا - ۲۔ لاحقہ - ضمیمہ - دُم چھلا

بچہ فطرت کی عزیز ترین چیز ہے - میں اُن کا بھی استثنا نہیں کرتا جو ان بچوں کی وجہ پیدائش ہیں - مگر جسقدر کسی چیز کی قسم زیادہ عمدہ ہوتی جاتی ہے اُسیقدر زیادہ یہ ضروری ہوتا جاتا ہے کہ وہ چیز اپنی قسم میں سے بھی بہترین ہو مثلاً جنگل کے خودرو پھول اپنی خوبیوں کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتے - اس لئے ان کے انتخاب میں زیادہ دردسری کی ضرورت بھی نہیں ہے - مگر گلاب چونکہ اپنی تراش اور خوشبو کے اعتبار سے بہترین پھول ہے - اس لئے اس کو چھانٹنے میں بہت باریک نظری سے کام لیا جاتا ہے - اور یوں بھی صدقوں اور بچوں کے متعلق میرا معیار بہت بلند رہا ہے -

مگر یہ بھی بدترین مصیبت نہیں ہے - مجرد آدمی کو اس سے زیادہ کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے - مثلاً اگر آپ اُن شادی شدہ خواتین سے کافی بے تکلف نہ ہوجائیں تو وہ آپ کی بے توجہی کی شکایت کرتی ہیں - اس شکایت سے بچنے کے لئے ملاقاتیں کرنی پڑتی ہیں - تعلقات پیدا کرنے ہوتے ہیں - لیکن اگر بدقسمتی سے اُن کا شوہر کوئی ایسا شخص ہو جس سے آپ شادی سے قبل دوستانہ مراسم رکھ چکے ہوں - یعنی اگر آپ بیوی کی طرف سے نہ آئے ہوں - اگر خاتون کی جماعت کے ساتھ آپ نے گھر میں قدم نہ رکھا ہو بلکہ شادی کے گمان و خیال سے بھی بہت قبل اُن کے خاوند سے آپ کے مخلصانہ اور آزادانہ روابط[1] رہے ہوں تو پھر آپ ہوشیار رہئے - آپ کی حیثیت خطرے میں ہے - بارہ مہینے پورے ہونے سے قبل ہی آپ دیکھیں گے کہ آپ کے دوست کا سلوک رفتہ رفتہ سردمہری میں بدل رہا ہے اور انجام کار وہ وقت آجائیگا جب آپ کا دوست آپ سے قطع تعلق کرنے کے لئے بہانے تلاش کرنے لگیگا - میں کسی ایسے دوست کی وفاداری پر اعتماد نہیں کرسکتا جسکی دوستی کی ابتدا اُس کی شادی کے زمانے سے بعد نہ ہوئی ہو -

خاص خاص حدود کے اندر تو شاید یہ خواتین اس قسم کی بیبیاں روا بھی کردیں - مگر یہ چیز وہ کبھی برداشت نہیں کرسکتیں کہ وہ شخص جو اب اُن کا خاوند ہے اور پہلے کچھ بھی نہ تھا - اس بات کی جرأت کرے کہ اُن سے مشورہ لئے بغیر کسی شخص سے عہدِ دوستی و وفاداری باندھ لے - پھر اس مسئلے میں وہ اس چیز پر بھی غور کرنا ضروری خیال

---

[1] روابط - تعلقات

نہیں کرتیں بلکہ خود اُن کی اور اُن کے شوہروں کی شناسائی سے کسقدر قبل یہ عہد تکمیل ہوا تھا۔ ہر ایک طویل دوستی، ہر ایک پرانی محبت اور بے تکلفی کو اُن کے نزدیک اُن کے حضور پیش ہونا چاہئے۔ تاکہ وہ اُس پر اپنی مُہر تصدیق ورضامندی ثبت کر دیں۔ جیسے کوئی نیا حکمران شاہزادہ تمام اُن پرانے سکوں کو جو اس کے عہد حکومت اور غالباً آثار ولادت سے بھی پہلے رائج تھے جمع کرنے کا فرمان شائع کرتا ہے کہ اپنی سلطنت کی نئی مُہر اُن پر لگوا دے۔ پھر آپ خود تصور فرما سکتے ہیں کہ میرے جیسے زنگ خوردہ پرانے سکوں کا اِن نئی ٹکسالوں میں کیا حشر ہوتا ہوگا۔

ایسے دوستوں کی توہین کرنے اور اُن کو اپنے شوہروں کے اعتبار و اعتماد سے محروم کرنے کے لئے یہ خواتین جو طریقے اختیار کرتی ہیں۔ اُن کی انتہا نہیں۔ ایک طریقہ "تضحیک" کا ہے۔ یعنی جو کچھ بھی آپ کہیں اُس پر یہ خواتین اِس طرح حیرت سے ہنستی ہیں گویا آپ عجائبُ المخلوقات میں سے ہیں۔ اور بیحد انوکھی اور نرالی باتیں کرتے ہیں۔ اِس مقصد کے لئے جس تعجب آمیز انداز سے وہ آپ کو تکتی ہیں۔ اُس کا دفعیہ نہیں ہو سکتا۔ یہ عمل جاری رہتا ہے حتیٰ کہ آپ کا ذہنی دوست جو آپ کی اصابت رائے کا کبھی معتقد تھا اور اسی وجہ سے آپ کی ضمنی اور غیر اہم لغزشوں سے چشم پوشی کر لیا کرتا تھا۔ اب شک کرنے لگتا ہے کہ کہیں واقعی آپ کوئی چہل پسند انسان تو نہیں ہے جس کے ساتھ ایام نا کتخدائی میں روابط رکھنا تو کافی لطف انگیز ہو سکتا ہے لیکن خواتین کے سامنے ایسے شخص کو پیش کرنا ہرگز مناسب نہیں۔ یہی طریقہ ہے جو میرے خلاف اکثر و بیشتر برتا جاتا ہے!

دوسرا طریقہ "مبالغے" یا طعن کا ہوتا ہے۔ یعنی اگر وہ یہ دیکھیں کہ اُن کا شوہر آپ سے خاص وابستگی رکھتا ہے۔ اور جس جذبۂ احترام پر اُس کی بنیاد ہے اُس کا ہلانا سہل نہیں ہے تو پھر وہ ایک غیر معتدل مبالغے کے ساتھ آپ کے ہر لفظ کی داد وتحسین دینے پر اُتر آتی ہیں یہانتک کہ آپ کا عزیز دوست، جو خوب جانتا ہے۔ کہ سب اُسی کی قدر افزائی کے لئے کیا جا رہا ہے۔ احسان مندی کے بار سے خستہ ہو کر، جو اسقدر اخلاص کا حق واجب ہے، اپنی گرمجوشیاں کم کرتے کرتے معمولی دوست کی سطح تک اُتر آتا ہے۔ اِس مناسب و معتدل حدِ محبت کے پیدا ہوتے ہی خود خاتون بھی بغیر کسی قسم کی اذیت یا کوفت کے، خود بھی اپنے شوہر کے ساتھ آملتی ہیں۔

اُنہی بے تعداد طریقوں میں سے تیسرا طریقہ "غلط فہمی" کا ہے۔ وہ ایک معصوم سادگی کے ساتھ یہ سمجھنے میں ہمیشہ غلطی کرتی ہیں۔ کہ آخر وہ خاص چیز کیا تھی جس نے اوّل اوّل اُن کے خاوند کو آپ کے ساتھ دوستی کرنے پر مجبور کیا تھا۔ فرض کیجئے کہ آپ کی اخلاقی پاکیزگی، اور کیریکٹر کی قوت نے اگر دوستی کی یہ زنجیر بنائی تھی جس کے توڑنے کے خاتون درپے ہیں تو پھر وہ آپ کی گفتگو میں زورِ اظہار کی کمی محسوس کر کے اپنے شوہر سے سوال قائم کرینگی "پیارے تم نے تو کہا تھا کہ تمہارے دوست نہایت شگفتہ طبع اور خوش گفتار آدمی ہیں"؟ اور اگر اِس کے برعکس آپ کی گفتگو کی دلربائیوں نے آپ کے دوست کو موہ لیا تھا اور اسی وجہ سے وہ آپ کی اخلاقی کمزوریوں پر چشم پوشی کرتا تھا، تو پھر خاتون کسی ایسی ہی کمزوری کو گرفت کر کے اپنے خاوند سے دریافت کرینگی "پیارے تم تو کہتے تھے کہ تمہارے دوست بہت نیک خدا ترس آدمی ہیں"، میں نے جب ایک خاتون کو ملامت کرتے ہوئے اُس سے یہ پوچھا کہ آخر وہ کیوں میرے ساتھ اِس بے احترامی اور بے اعتنائی کا برتاؤ کرتی ہے۔ جس کا میں سزاوار نہیں تو اُس نے جواب دیا کہ "شادی سے پہلے میرے خاوند نے جیسا آپ کا حلیہ بیان کیا تھا اُس کو سُن کر تو میں آپ سے ملنے کی بہت شائق تھی۔ مگر آپ کو دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی۔ اپنے شوہر کے بیان کے مطابق تو میں یہ سمجھتی تھی کہ آپ ایک دراز قامت جبین صورت فوجی وضع کے انسان ہونگے۔ لیکن حقیقت اِس کے بالکل برعکس نکلی" خاتون نے چونکہ اظہار مافی الضمیر[1] میں نہایت صفائی سے کام لیا تھا۔ اِس لئے میں نے لحاظ کیا ورنہ پوچھتا کہ جب خود اُن کے خاوند میں اِن خوبیوں میں سے کوئی چیز بھی نہیں پائی جاتی تو انہیں کیا حق ہے کہ وہ اُس کے دوستوں کے متعلق ایسی توقعات قائم کریں۔ اِس لئے کہ میرے دوست کی حدود جسمی قریب قریب میری ہی جیسی ہیں۔ وہ اپنے بوٹ سمیت پانچ فٹ پانچ اِنچ ہیں میں اُن سے آدھا انچ زیادہ ہوں اور اُن کے چہرے اور بالوں سے بھی فوجی صفات اتنی ہی دور ہیں جتنی مجھ سے۔

بہرحال یہ اُن عذابوں میں سے چند ہیں جن سے مجھے اِن شادی شدہ

[1] مافی الضمیر۔ دلی خیال۔

لوگوں کے مکانوں پر دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اُن سب کو ایک ایک کرکے گننا ایک لاحاصل کوشش ہوگی۔ اِس لئے میں اُن کے ایک اور نامناسب طرزِ عمل پر نظرِ ڈالکر بس کرتا ہوں۔ خواتین بعض اوقات ہم لوگوں سے ایسا برتاؤ کرتی ہیں جیسے ہم اُن کے شوہر ہیں اور شوہروں سے اِس طرح پیش آتی ہیں جیسے کہ وہ "ہم" ہیں۔ میری مراد یہ ہے کہ ہم سے بے تکلفی برتتی ہیں۔ اور اُن سے رسمیت۔ مثلاً کل میری نے مجھے بہت رات گئے تک اپنے پاس رکھا اور اِس بات پر چڑچڑاتی ہیں کہ مسٹر نامعلوم[1] ابتک گھر نہیں آئے۔ اور مچھلیاں جو پکی تھیں سب خراب ہوگئیں۔ مگر اُنہوں نے اِس جرأت اور اپنے لفظوں میں اِس بدتہذیبی کو روا نہ رکھا کہ وہ اُن مچھلیوں کو ہاتھ تک لگانے کی مجرم ہوتیں لیکن اِس طرح میری نے آدابِ خانہ داری کو بدل دیا۔ اِس لئے کہ رسمیت صرف اِس لئے ایجاد ہوئی ہے کہ اِس کی مدد سے اُن بے چین کرنیوالے احساسات سے نجات حاصل کیجائے۔ جو انسان کے دل میں یہ دیکھکر پیدا ہوتے ہیں کہ وہ کسی شخص کی محبت کا اتنا مالک نہیں جتنا کوئی دوسرا۔ اِس کا مُدعا صرف یہ ہوتا ہے کہ تہذیب اور شائستگی کو محبت اور بے تکلفی کا قائم مقام بناکر ایک جھوٹا سکون حاصل کیا جائے۔

اپنے خاوند کا انتظار کرنے کی بجائے اگر فرض کیجئے کہ میری میرے انتظار میں کھانا لئے بیٹھی رہتیں اور اپنے خاوند کے کہنے کے باوجود بھی سونے نہ جاتیں تو یہ ایک بالکل مناسب اور موزوں بات ہوتی۔

میرے خیال میں معمولی حیا اور وضعداری کے علاوہ، اور کوئی ایسی "رسمیت" نہیں جسے بیویاں شوہروں کے ساتھ برتنے پر مجبور ہوں۔ اِسی علت کی بنا پر مَیں اِس بات کے خلاف بھی ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہوں کہ خود اپنے دسترخوان پر کوئی بیوی اپنے شوہر کے آگے اچھی اچھی چیزوں کی رکابیاں سرکاتی رہے اور میری ناکتخدا قوتِ ذائقہ کے لئے کم لذیذ کھانوں کی رکابیاں مناسب سمجھ کر میرے آگے پیش کرے! نہیں مَیں اِس قسم کی جرأت کو معاف نہیں کرسکتا۔

اب اِن شادی شدہ لوگوں کی شکائتیں کرتے کرتے تنگ آگیا ہوں۔ وہ اپنے کرداروں میں تبدیلی کریں ورنہ مَیں وعدہ کرتا ہوں کہ نام بنام ہر ایک کی برائیاں قلمبند کرونگا جس کو دیکھ کر مجرم لرز اُٹھیں گے۔

(چارلس لیمپ)

انیس احمد رشدی

[1] شوہر

اقوال مشاہیر

الفانسو دہم شاہ اسپین کا قول ہے۔ کہ "شادی اُسی صورت میں کامیاب ہوسکتی ہے جب خاوند بہرا ہو اور بی بی اندھی ہو"

آرک بشپ آف کولون نے ڈیوک آف الوا (ہسپانی جنرل) سے کہا تم اہلِ ہالینڈ پر حملہ آور کیوں نہیں ہوتے۔ تو اُس نے جواب دیا۔ "ایک سپہ سالار کا مطمح نظر جنگ آزمائی نہیں ہوتا بلکہ کامیابی"

ٹیسٹ

میں ایک ڈاکٹر سے ملا۔ ملتے ہی اُس نے پوچھا۔ "آپ کو شراب پیتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا؟"

میں نے جواب دیا۔ "کافی عرصہ ہو گیا اب تو!"

ڈاکٹر ایک نوجوان شخص تھا۔ اس کی عمر ۲۰ اور ۳۰ کے درمیان معلوم ہوتی تھی۔ یوں تو وہ عینک لگائے ہوئے تھا لیکن اُس کی صورت نپولین سے ملتی جُلتی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے اُس سے اُنس سا ہو گیا۔

اُس نے کہا۔ "دیکھئے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ دورانِ خون پر شراب کا کیا اثر ہوتا ہے۔"

اب اُس کی صورت نپولین سے اور بھی مشابہ ہو گئی۔ میرا اُنس اور بھی بڑھ گیا۔ اُس نے میرا دایاں بازو ننگا کر دیا۔ اور مجھے وہسکی کا ایک جام دیا۔ اس کے بعد اُس نے میرے بازو پر کوئی طبی آلہ لگا دیا۔ نبض پر ہاتھ رکھا۔ ایک ربڑ کا ٹیوب میرے بازو کے ساتھ لگا دیا۔ اُس میں ایک قسم کا تھرمامیٹر لگا ہوا تھا۔ پارہ اوپر سے نیچے۔ نیچے سے اوپر حرکت کرنے لگا۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن ڈاکٹر کہتا تھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پارہ ۳۲ یا شاید ۴۵ درجے چڑھ گیا ہے۔ اُس نے کہا "آپ نے دیکھا۔ دورانِ خون پر شراب کا کیا اثر ہوتا ہے؟"

میں نے کہا "حیرت انگیز۔ تعجب خیز! ازراہِ نوازش ایک جام اَور عنایت کیجئے۔ اور میرے دوسرے بازو کے خون پر شراب کا اثر دیکھئے۔"

اُس نے کہا۔ "نہیں نہیں۔ کافی ہے!"

اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے سمجھا مجھے "خدا حافظ" کہنا چاہتا ہے۔ میرا خدا حافظ ہے۔ گویا اب میرا زندہ رہنا محال ہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ وہ میری اُنگلی میں سوئی چبھو کر خون کا قطرہ نکالنا چاہتا تھا۔ خون کا قطرہ لیکر اُس نے غور سے دیکھا۔ پھر بولا "یہ ہیموگلوبن طریقۂ علاج ہے آپ کے خون کا رنگ خراب ہے۔ سرخ ذرات کی کمی ہے!"

اِس کے بعد اُس نے میری چھاتی کو ٹھونک بجا کر دیکھنا شروع کیا۔ اِس کے بعد اُس نے اپنے چہرے پر سنجیدگی کی تمام علامات طاری کر لیں۔ اور کئی غیر معروف اور حیرت انگیز بیماریوں کا نام لیا۔ ان ناموں کے اخیر میں اکثر "ایٹس" آتا تھا۔ میں نے فوراً اُسے ۳۲ روپے ادا کر دئے۔

میں نے پوچھا "جن بیماریوں کا میں شکار ہوں۔ اُن میں سے کوئی لازماً مہلک تو نہیں ہے؟"

اُس نے دل جمعی سے جواب دیا۔ "تمام کی تمام مہلک ہیں۔ لیکن اِن کی رفتار کو روکا جا سکتا ہے۔ اگر آپ تندہی سے علاج کریں اور پرہیز کریں تو شاید اسی نوّے سال تک زندہ رہیں۔"

میں نے ڈاکٹروں کے بلوں کا حساب کرنا شروع کیا۔

ڈاکٹر نے کہا "سب سے پہلی بات جو ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آپ کسی صحت بخش جگہ قیام کریں۔ اِس بات کی ضرورت ہے کہ آپ کا نظامِ عصبی .... اپنا کام کرنے لگے۔ تکان اور کسل کا اثر دور ہو جائے۔ میں خود آپ کے ساتھ چلونگا۔ اور آپ کے لئے کسی موزوں مقام کا انتخاب کرونگا۔"

چنانچہ ڈاکٹر مجھے ایک صحت بخش مقام .... پر لے گیا۔ وہاں پتھروں۔ لمبے لمبے درختوں اور برف کے سوا اور کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ "صحت بخش مقام" کے سپرنٹنڈنٹ نے مجھے یقین دلایا کہ اس کے ہسپتال میں کسی بیماری کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ سب "مریض" ایک کھانے کے کمرے میں جمع ہوتے ہیں۔ جب میں پہلی بار کھانے کے کمرے میں گیا تو وہاں اور کئی مریض جمع تھے۔

ڈاکٹر نے میرے لئے ناشتہ لانے کا حکم دیا۔

"فاسفو گلیسریٹ آف لایم۔ اور نکس وامیکا کی چائے!"

یہ بات سنتے ہی مریضوں نے شور مچا دیا۔ "مالیخولیا کا مریض۔ مالیخولیا کا مریض"

کئی مریضوں نے کہا "نہیں۔ کثرت شراب نوشی"

ڈاکٹر نے یہ حالت دیکھی تو دبے پاؤں کھسک گیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر کا نائب مجھے صحت بخش مقام کی "ورزش گاہ" کی طرف لے گیا۔ اس نے ایک معمر خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے۔ یہ خاتون شمیم اختر ہے۔ "کلیم" کی مدیرہ تھی۔ اس نے ایک ناول لکھا تھا "محبت کیوں محبت کہلاتی ہے" دماغ خراب ہو گیا۔ اب یہاں لکڑیاں چن کر صحت کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے"

ایک طرف ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اوندھے گھڑے پر پانی ڈال رہا تھا۔ میرے رہبر نے کہا "یہ شخص ایک لکھ پتی امیر ہے۔ جو تجارت کے پریشان کن حالات کی وجہ سے اپنے حواس کو جواب دے بیٹھا ہے۔"

میں نے پہاڑی راستے سے نیچے اترنا شروع کیا۔ میرا رہبر چلاتا رہا۔ حضرت کہاں چلے۔ اے حضرت۔ سنئے تو"

میں نے سُنی اَن سُنی ایک کر دی اور یہ کہکر کہ "واپس جا رہا ہوں" اپنا رستہ لیا۔ میں ایک ہوٹل میں جا ٹھہرا۔ میں نے کلرک سے کہا۔

"مجھے ایک ایسے کمرے کی ضرورت ہے جس میں تکان کم ہو جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ شور و غل سے دُور رہ کر ذرا آرام کروں۔ تاکہ میرا نظامِ عصبی باصحت ہو جائے"

کلرک نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔ پھر بولا۔

"بندہ پرور۔ کسی ڈاکٹر سے ملئے۔ ہوٹل میں ایسے کمرے کہاں۔"

اس واقعے کے ایک ہفتے کے بعد میں اپنے نیورلین شال ڈاکٹر سے ملا۔ اب مجھے اُس سے اُنس باقی نہ رہا تھا۔

اُس نے کہا "آپ کو چاہیئے کہ سمندر کا سفر اختیار کریں اور کسی اچھے دوست کو ساتھ لے جائیں"

میں نے جواب دیا "سمندری پریاں ...."

اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "اچھا۔ اگر آپ سفر نہیں کرنا چاہتے تو کسی اور ڈاکٹر سے بھی مشورہ لیجئے"

میں نے ایک اور ڈاکٹر سے مشورہ لیا۔

اُس نے پوچھا "آپ کے سر میں درد رہتا ہے؟"

"نہیں"

"ابرؤں میں؟"

"نہیں"

"بائیں پنڈلی کے نیچے"

"نہیں"

"آنکھیں بند کرو"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

"اب پیچھے کی طرف چھلانگ لگاؤ"

میں نے پیچھے کی طرف چھلانگ لگائی۔ میرا سر دروازے سے ٹکرایا۔ ڈاکٹر نے معافی مانگی۔ اور دروازہ بند کر دیا۔

"اپنے ناک کو بائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے چھوؤ"

میں نے حکم کی تعمیل کی۔

ڈاکٹر کہنے لگا۔ "اب میری انگلی کی طرف دیکھو۔ اب اس تصویر کی طرف۔ انگلی کی طرف۔ تصویر کی طرف۔ انگلی کی طرف تصویر کی طرف"

میں نے پھر حکم کی تعمیل کی۔ ڈاکٹر نے کہا "اس طرح یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ تمہارا دماغ صحیح ہے یا نہیں"

میں نے دل میں سوچا یہ تو بہت آسان ترکیب ہے۔ ہاں اگر ڈاکٹر صاحب یہ کہتے۔ "خالی الذہن ہو کر اس نقش رنگ کی طرح جو دیوار سے زاویہ قائمہ بنا رہا ہے۔ ایک سیدھی نظر کرو۔ اور اب واپس بلکہ توجہ کو منعطف کرتے ہوئے میری انگلی پر نظر جماؤ" تو شاید مشکل پیش آتی۔

میں واپس ہوا۔ ڈاکٹر نے جو نسخہ دیا تھا وہ ایک دوا ساز کے پاس لے گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نسخے کی قیمت پندرہ روپے ہوگی۔ میں نے نسخے میں سوراخ کر کے اُس میں دھاگا ڈالا اور گلے میں ڈال لیا۔ اصل بات یہ ہے کہ مجھے جادو کے ٹوٹکوں پر اعتماد ہے۔ میں نے سوچا نسخہ کو ٹوٹکا کیوں نہ بنائیں۔

غرض اسی طرح دن گزرتے گئے۔ یہ تو مجھے معلوم ہو گیا کہ میں بہت بیمار ہوں۔ کام کاج کرنے کے ناقابل۔ ہر ایک ڈاکٹر کی یہی رائے تھی۔ لیکن مشکل یہ آ پڑی تھی کہ میری بیماری کا پتا نہ چلتا تھا۔ نہ کوئی علاج ہو سکتا تھا۔

آخر میں اپنے چچا زاد بھائی کے پاس جا ٹھہرا وہ گاؤں میں رہتا تھا۔ کھلی ہوا۔ اچھا موسم۔ سادہ زندگی۔ رات کو سکون آرام۔ دن کو ورزش۔ اس زندگی نے مجھ پر اثر کرنا شروع کیا۔ نیند آنے لگی۔ بھوک کھل گئی۔ خدا جانے کیا ہو گیا۔ اب مجھے خوف معلوم ہونے لگا۔ اگر یہی حالت رہی تو میں اچھا ہو جاؤنگا۔ پھر کیا ہوگا؟ یہ تو بڑی

مصیبت ہوئی! اب مجھے کافی تجربہ ہوگیا تھا۔ میں فوراً گاؤں کے ڈاکٹر کے پاس گیا۔ میں نے چھوٹتے ہی کہا "ڈاکٹر صاحب۔ مجھے مالیخولیا۔ دورانِ سر۔ متلی۔ بواسیر۔ ورمِ طحال۔ دردِ جگر۔ ضعفِ قلب۔ اور بدہضمی کی شکایت ہے۔ میں پرہیزی کھانا کھاؤنگا۔ ورزش کرونگا۔ کھلی ہوا میں رہونگا۔ خدا حافظ"

یہ کہہ کر میں رخصت ہوا۔ یکایک مجھے کچھ خیال آیا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ڈاکٹر ابھی تک اپنی جگہ پر بیٹھا تھا۔ میں نے کہا "میں ایک بات بھول گیا۔ اور وہ یہ کہ میں آرام و سکون کی زندگی بسر کرونگا"

اس کے بعد میرا جی ذرا خوش ہوگیا۔ یہ خیال دل میں جمانے کے بعد کہ میں واقعی بہت بیمار ہوں مجھے اتنی مسرت ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ ایک مالیخولیا کے مریض کے لئے اس سے بدتر اور کیا حالت ہوسکتی ہے کہ وہ یہ خیال کرے کہ اس کی بیماری جاتی رہی ہے۔

لیکن اس کا بھی کوئی فایدہ نہ ہوا۔ کھلی ہوا میں رہنے سے اور باقاعدہ ورزش کرنے سے میری حالت بہت زیادہ سدھر گئی۔ اب پھر مجھے رنج ہونے لگا۔ اب کیا ہوگا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اچھا ہوتا چلا جا رہا ہوں۔ بہر نوع میں پھر گاؤں کے ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اب میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ وہ پنشن لے کر اپنے گاؤں میں آ رہا تھا۔ اُس کے چہرے سے خوش مزاجی ہویدا تھی۔ میں نے خود ہی اُس کے سامنے اپنی چھاتی ٹھونکی۔ اپنی نبض تھامی۔ اور پیچھے کی طرف چھلانگیں لگائیں تاکہ وقت نہ ضائع ہو۔

ڈاکٹر نے میری طرف غور سے دیکھا۔ پھر بولا "بندہ پرور۔ آپ کی بیماری بہت سخت ہے۔ ممکن ہے آپ زندہ رہیں۔ لیکن بڑی دشواری پیش آئیگی۔"

میں نے کہا "ارشاد فرمائیے۔ میرا کیا علاج ہے! میں اپنی تمام دولت کو برباد کرنے کے لئے تیار ہوں بس علاج ہوجانا چاہئیے"

ڈاکٹر نے اپنا پائپ سلگایا۔ پھر بولا۔

"آپ کی بیماری بہت خطرناک ہے۔ دنیا میں صرف ایک ایسی چیز ہے جس سے آپ کا علاج ہوسکتا ہے"

میں نے اشتیاق سے پوچھا "وہ کیا ہے؟ میں زہر۔ سونا فاسفورس۔ نکس وامیکا۔ امونیا اور خدا جانے کیا کیا استعمال کر چکا ہوں وہ کیا شے ہے؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا "اس گاؤں کے گرد و نواح میں جو پہاڑ دور تک پھیلے ہوئے ہیں اُن کے دامن میں کہیں ایک جڑی بوٹی اُگتی ہے۔ اگر وہ ملجائے تو آپ کی شکائتیں رفع ہوسکتی ہیں"

میں نے کہا "میں تیار ہوں"

ڈاکٹر بولا "ہر روز شام کو میں آپ کے ساتھ چلونگا"

اس دن سے ہمارا معمول ہوگیا کہ اُس جڑی بوٹی کی تلاش میں مارے مارے پھرا کرتے۔ چلتے چلتے میرے پاؤں میں چھالے پڑ جاتے۔ بدن دُکھنے لگتا۔ لیکن ڈاکٹر کہتا "محنت سے کام ہوتا ہے۔ ہمت نہ ہارو"

چھ ماہ کے بعد میری تمام شکائتیں رفع ہوگئیں۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ بوٹی کیا تھی۔ وہ بوٹی ورزش تھی۔ جس کے بغیر میرا دماغ خراب ہو رہا تھا۔

عابد

اقوالِ مشاہیر

جب سکندر نے دیوجانس کلبی (مشہور فلاسفر) سے کارنتھ میں ملاقات کی تو اُس کی گفتگو اور شانِ استغنا سے اسقدر متاثر ہوا کہ بے اختیار کہہ اٹھا "اگر میں سکندر نہ ہوتا تو دیوجانس بننا پسند کرتا"

جب وہ مشرقی فتوحات کے لئے مقدونیہ سے روانہ ہونے لگا تو اپنی ذاتی جایداد کی آمدنی اپنے دوستوں میں تقسیم کر دی۔ ایک دوست نے پوچھا "تم نے اپنے لئے کیا رکھا؟" جواب دیا "اُمید"

"چاند"

رگِ احساسِ باطن چھیڑنے والی حسیں دُنیا — نظر افروز ہے کتنی تری نور آفریں دُنیا
زمیں تصویر بنجاتی ہے جب اک موجِ ساکن کی — نقابِ شب میں چھپ جاتی ہیں جب رعنائیاں دن کی
ہوا کی نرم رَو جس وقت عنبر بیز ہوتی ہے — تری نازک خرامی کتنی دل آویز ہوتی ہے

فضا کروٹ بدلتی ہے، ستارے مسکراتے ہیں — ہوائیں رقص کرتی ہیں، شگوفے گنگناتے ہیں
زمیں کا ذرہ ذرہ حُسن سے لبریز ہوتا ہے — دلوں میں اک گداز کیفیت انگیز ہوتا ہے
ترے صہبا بکف "جلووں" سے جب آنکھیں ملاتی ہیں — تو دریا کی سکوں آمادہ موجیں جھوم جاتی ہیں

کھُلے میداں میں، فردوسِ نظر رنگینیاں تیری — نقاب اُٹھے، نظر آتی ہیں، جب محوِ ضیا پاشی
تو ہر شے تیرے گرد و پیش جھک جاتی ہے سجدے میں — فضا میں نرم موسیقی کی ہوتی ہیں رواں موجیں
وہ پھر شیریں ترنم چھیڑتی ہے تیری رخشانی — ترے قدموں پہ رکھدیتی ہے دُنیا اپنی پیشانی

تجھے دیکھا ہے یوُں گرمِ تماشا بارہا میں نے — جبینِ شوق سے چُومے ہیں تیرے نقشِ پا میں نے
نیازِ عشق کے پہروں مجھے منظر دکھائے ہیں — ترے آگے پرستاری کے میں نے گیت گائے ہیں
شرابِ تند برقِ خرمنِ اجزائے ہستی ہے — حیاتِ نو مگر پاتا ہے میکش مستعار اِس سے

تجھے اے وہ کہ جسکی زُلف کے سائے میں پنہاں ہے — وہ کیفِ زندگانی جو مرے جینے کا ساماں ہے
وہ جس کے رُخ کی ادنیٰ سی جھلک سرشار کرتی ہے — مرے خوابیدہ تر احساس کو بیدار کرتی ہے
تصوّر میں بھی جس کے مسکرانے کی ادا مجھ کو — وہ مئے ہے لالہ گوں برسوں جسے محفوظ رکھا ہو

تجھے ہاں بھولنے والے، تجھے میری خبر بھی ہے — مری صبر آزما ناشادمانی پر نظر بھی ہے؟

نگاہِ ماہ پوری تابشوں سے جلوہ آرا ہے   زمیں کی ظلمتوں میں چاندنی کا رقص برپا ہے
تو آ، دل میں دبی چنگاریوں کو آکے بھڑکا دے   گھڑی بھر کے لئے تاریکِ غم، آغوش چمکا دے

نہ لے ماہ، بیدل، دیکھ کر ناشادماں مجھ کو   کہاں سے لیگیا، میرا غمِ پنہاں کہاں مجھ کو
میں اُس دنیا کی فانی وسعتوں کا رہنے والا ہوں   کشاکش پر ہے جسکی زندگی وہ موجِ دریا ہوں
مری ہستی ہے اِک ترکیب اجزائے پریشاں کی   ہوا کی رَو میں لرزاں ہیں، بنائیں میرے ایواں کی

تجھے معلوم ہے، اے ماہ، رازِ ہستیٔ فانی ؛   کہ ہے لبریز کن آلام سے دنیائے انسانی
کبھی پائی ہے تیرے دل نے گرمی سرد آہوں سے ؟   گزر تیرا ہوا ہے، عشق کی پیچیدہ راہوں سے ؟
لیا ہے جان دیکر، کیا کبھی درسِ وفا تو نے ؟   سہی ہے "روزگارِ ناموافق" کی جفا تو نے ؟

ملی ہے موت کی لذت تجھے بھی زندگانی میں ؟   کبھی کھوئی ہے تو نے قوتِ دل نوجوانی میں ؟
کبھی تڑپی ہیں، پیہم بجلیاں تیرے نشیمن پر ؟   خزاں کی آندھیاں آتی رہی ہیں تیرے گلشن پر ؟
بہے ہیں خون کے دریا، تری شاداب وادی میں ؟   ملی ہیں تجھ کو ماتم کی صدائیں سازِ شادی میں ؟

تری دنیا میں بھی رہتے ہیں، یہ ہمت شکن چرچے ؟   جبینِ زندگی سے پھوٹتے ہیں موت کے چشمے ؟
رہا کرتا ہے کیا اے ماہ تیری سرزمین پر بھی ؟   وقارِ آدمیت، صرفِ پندارِ خداوندی ؟
وہاں بھی ہیں غم افزا کیا ترانے شادکامی کے ؟   فلک پر بھی رواں ملتے ہیں، کیا سکّے غلامی کے ؟

فضائے نور میں بھی یہ دھندلکے پیش آتے ہیں ؟   وہاں بھی نخلِ ہستی خونِ دل سے سینچے جاتے ہیں ؟
پرافشاں ملتی ہیں آزادیاں دامِ اسیری میں ؟   شبابِ زندگی دم توڑتا ہے قصرِ پیری میں ؟
پتنگے موت کی تاریک وادی سے گزرتے ہیں ؟   تری محفل میں بھی یوں شمع کے جلوے نکھرتے ہیں ؟

نہیں۔ اے ماہ تو اِن کاوشوں سے آشنا کیوں ہو   تری دنیا کے روشن اسقدر ظلمت فزا کیوں ہو ؟
مگر اتنا بتا اے آسمانی جلوۂ کامل ؟   نظر آیا ہے تجھ کو بحرِ ہستی کا کہیں ساحل !
یہاں بھی کیا کبھی عشرت جھلک اپنی دکھائے گی ؟   بتا ! کیا روحِ انسانی کبھی آرام پائے گی ؟

راہب

ہڈسن[1] کا راہب[2] اپنے غار کے قریب ایک غیر معمولی جوش کی حالت میں ٹہل رہا تھا۔ یہ غار کیبکل نامی پہاڑ کی (جس کا سلسلہ لبِ دریا تک پھیلا ہوا تھا) ایک شاخ کے سرے پر واقع تھا۔ اِردگرد کی تمام پہاڑیاں گھنے درختوں سے ڈھکی ہوئی تھیں جن میں بے شمار وحشی گلہریوں اور کٹھ پھوڑوں[3] نے اپنے مسکن بنا رکھے تھے جو ہر وقت موسمِ گرما کے ناپائدار جلووں کی بے ثباتی کا نوحہ کرتے رہتے تھے۔

پہاڑیوں کے سرسبز دامن اور لبِ دریا کی کف آلود جھاڑ کے درمیان گزرنے والی سڑک ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے سفید جالی کا ایک خراب پیوند۔ ایک نامعلوم سی پگڈنڈی کشادہ سڑک میں سے نکل کر پہاڑی گھاٹیوں پر چکر کھاتی ہوئی راہب کے غار کے منہ تک آکر ختم ہوگئی تھی۔ ندی کے بہاؤ کے رُخ ایک میل کے فاصلے پر "ڈیولوپوائینٹ" نامی سرائے واقع تھی جو موسمِ گرما کے دلدادگان کی ایک سیرگاہ تھی۔ یہ لوگ اپنے برقی پنکھوں والے سرد کمرے چھوڑ کر یہاں آجاتے تھے کہ پتلی پتلی ٹانگوں والے ملاحوں کے بڑے بڑے شکاروں[4] میں بیٹھ کر آفتاب کی جھلستی ہوئی دھوپ کی سیر کریں اور فضا کو اپنے مسرت انگیز قہقہوں سے آباد کردیں۔

اِس راہب کا حُلیہ حسبِ ذیل تھا۔

عمر چالیس کے لگ بھگ۔ سر پر لمبے لمبے بال جو سروں پر آکر خم دار ہوگئے تھے۔ خوشنما آنکھیں۔ لمبوتری سفید داڑھی۔ اُن داڑھیوں سے ملتی ہوئی جنہیں کچھ سال پہلے خود ساختہ روحانی پیشواؤں نے جو سرزمینِ مغرب پر ٹڈیوں کی وبا کے بعد مسلط ہوگئے تھے۔ عوام میں رواج دیا تھا۔ عبا۔ یہ ٹاٹ کی قسم کی کوئی چیز معلوم ہوتی تھی جسے کاٹ کر ایک ایسے لباس کی شکل دی گئی تھی۔ کہ اگر لندن کا کوئی کاریگر درزی اس نوع کے لباس تیار کرتا تو اچھی خاصی جائداد بنا لیتا۔

لمبی لمبی اُنگلیاں۔ سُتواں ناک اور طور و اطوار اُسے راہبوں کی اُس جماعت سے بالاتر ثابت کر رہے تھے جو پانی سے ڈرتے ہیں۔ اور اپنی نقدی غاروں کے اُن پوشیدہ مقامات میں جن کے اوپر سنگین دیواریں صلیب کے نشانات کُھدے ہوتے ہیں۔ سیپ کے ظروف میں چھپا رکھتے ہیں۔

یہ غار ہی راہب کا تمام گھر نہ تھا بلکہ گھر کا ایک حصہ تھا۔ گھر کیا تھا۔ سرکنڈوں کا ایک بھدا سا جھونپڑا جس کی دیواروں پر مٹی کا پلستر کیا گیا تھا۔ چھت پر تانبے کی تہہ چڑھی تھی جس سے اِس پر دھول جمنے نہ پاتی تھی۔ خاص مکان کے پتھر کی سلیں تپائیوں کا کام دیتی تھیں۔ چنار کے کھُردرے تختوں کا ایک بھدا سا بُک شیلف[5] تھا۔ لکڑی کا ایک ٹکڑا پتھر کے دو مستقیم ٹکڑوں پر رکھا تھا۔ یہ اُس کی میز تھی۔ یہ فرنیچر اُس سامان کے بین بین تھا جو کبھی قدیم انگریزی گرجاؤں اور براڈوے کے اُن تہ خانوں میں دیکھنے میں آتا تھا جہاں گوشت کے پارچے رکھے جاتے تھے۔ وحشی جانوروں کی کچھ کھالیں دیوار سے آویزاں تھیں جنہیں راہب نے نیویارک میں خریدا تھا۔

جھونپڑے کا پچھواڑا غار سے ملا ہوا تھا۔ اِس جگہ راہب پتھر کی ایک بدنما انگیٹھی پر کھانا تیار کیا کرتا تھا۔ اُس نے ختم ہونے والے استقلال اور ایک دقیانوسی تیشے کی مدد سے سنگین دیواروں میں جابجا قدرتی طاق کھود رکھے تھے۔ جن میں آٹا۔ گوشت۔ چربی۔ مٹی کا تیل۔ خمیر بنانے والا اسفوف وغیرہ عام ضرورت کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

اِس جگہ راہب نے دس سال گزارے تھے۔ "ڈیولوپوائنٹ" نامی سرائے کے مسافروں کی گفتگو کا عام موضوع صرف اُسی کی شخصیت ہوتی تھی۔ نئے آنے والے مہمان "وادی کی پُراسرار صداؤں" کے بعد صرف اِسی موضوع[6] میں اظہارِ دلچسپی کرتے تھے۔ یہ راہب دور دور تک ایک روشن دماغ عالم کی

[1] ایک جگہ کا نام۔ [2] عیسائیوں کا تارک الدنیا فقیر۔ [3] ایک پرندہ کا نام [4] چھوٹی کشتی

[5] کتابیں رکھنے کا۔ [6] مدارِ گفتگو۔

حیثیت سے مشہور تھا جس نے متلون المزاج حسن کی بیوفائی سے تنگ آکر دنیا کو ترک کر دیا تھا۔ سرائے والوں کا معمول تھا کہ ہفتے کی رات کو اشیائے خور و نوش کا ایک خوان پوشیدہ طور پر اُسے بھیج دیتے ہیں۔ وہ اپنے جھونپڑے سے زیادہ دور کہیں نہیں جاتا تھا۔ سرائے کے جو مہمان اُس کو ملنے آتے تھے اُس کی علمی معلومات، تدبّر اور فلسفیانہ روشن دماغی سے متاثر ہو کر جاتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ یہ ایک عجیب انسان ہے؛ اِس دفعہ گرمیوں میں سرائے مہمانوں سے کچھا کچھ بھری ہوئی تھی چنانچہ ہفتے کی رات کو اُس کے خوان میں عام خوراک کے علاوہ اور بھی چند لذیذ کھانے ہوتے تھے۔

آج بظاہر راہب کسی مہمان کے انتظار میں تھا۔ اُس نے نہایت خوش اسلوبی سے سر کے لمبے لمبے بال بنا کر ریش مقدس کو دو حصّوں میں تقسیم کیا۔ اور جب سنگین طاق پر رکھی ہوئی الارم گھڑی نے پانچ بجے کا اعلان کیا تو اُس نے بھی اپنی عبا اٹھائی۔ اُسے احتیاط کے ساتھ برش سے صاف کیا پھر شاہ بلوط کا ایک عصا[1] سنبھالا اور آہستہ آہستہ باہر کو جاتے ہوئے جھونپڑے کے ارد گرد کے جنگل میں غائب ہو گیا۔

اُسے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کیونکہ سامنے باریک پگڈنڈی پر جس کی سطح صنوبر کے کانٹوں کے فرش کی وجہ سے ناملائم ہو رہی تھی۔ ٹرین ہوم[2] خاندان کی مشہور بہنوں میں سب سے چھوٹی لیکن سب سے زیادہ حسین بیرڈکس جھکے ہوئے قدم اُٹھائے چل رہی تھی۔ اُس کا لباس سر کی خوشنما ٹوپی سے لے کر کینوس کی گرگابی تک تمام آسمانی رنگ کا تھا۔ یہ رنگ اگر کہیں کہیں عشق پیچاں کی نوخیز کلی کے سائے کی مانند پھیکا تھا جو موسم بہار میں ہفتہ کے دن نور کے تڑکے جھومتی ہے تو کہیں کہیں شوخ بھی تھا۔ اُس رنگ سے مشابہ جو کبھی کبھی پیر کو صبح کے نو بجے بہار کے چہروں پر نظر آجاتا ہے۔ جب دھوبن نے دُھلے ہوئے کپڑے لانے میں دیر کی ہو۔

بیرڈکس نے اپنی آسمانی رنگ کی چھتری پگڈنڈی کے ایک طرف صنوبر کے کانٹوں میں چھپا دی اور ایک سرد آہ کھینچی۔ ادھر راہب نے بھی اپنے ایک پاؤں کی ایڑی سے دوسرے پاؤں کے ٹخنے سے لپٹا ہوا گھاس کا تنکا علیحدہ کیا۔ یہ دیکھتے ہی حسینہ کا چہرہ نیلگوں ہو گیا۔ لیکن اُس کی زعفرانی آنکھوں کے حسن نے راہب کو بھی اسیرِ کمندِ نظر کر لیا۔

حسینہ۔ جس نے ابھی تک دم بھی نہ لیا تھا۔ اور جو پہاڑی کی چڑھائی سے ابھی تک ہانپ رہی تھی راہب سے مخاطب ہو کر ایک نرم و شیریں لیکن کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"راہب بننے میں بھی لطف ہے۔ دوشیزہ لڑکیاں پہاڑ کی گھاٹیاں عبور کر کے تم سے باتیں کرنے آتی ہیں"۔

راہب نے اپنے بازو سمیٹ لئے اور ایک درخت سے تکیہ لگا کر بیٹھ گیا۔ بیرڈکس نے پھر ایک سرد آہ بھری اور صنوبر کے کانٹوں سے اٹے ہوئے فرش پر اِس طرح سمٹ کر بیٹھ گئی۔ جیسے کوئی نیلے پروں والا پرندہ گھونسلے میں بیٹھا ہوتا ہے۔ راہب نے بھی اپنے پاؤں ٹاٹ کی عبا سے باہر کھینچتے ہوئے اُس کی تقلید کی اور بولا۔

"نہیں بلکہ پہاڑ بننے میں مزا ہے۔ نیلے نیلے لباس والے فرشتے اوپر ہی اوپر اُڑ کر گزر جانے کی بجائے اُس کی سیر کے لئے رُک جاتے ہیں"۔

بیرڈکس نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

"امّی کو درد کی شکایت تھی اِس لئے وہ جلد ہی سو گئیں ورنہ شاید میں آج نہ آسکتی۔ اُس موٹی کالی دقیانوسی سرائے میں بلا کی گرمی پڑتی ہے لیکن ہمارے پاس اتنا پیسہ کہاں کہ دوسری جگہ جا سکیں"۔

راہب بولا۔

کل رات میں اِس بلند چٹان کی (جو ہمارے سروں کے اوپر واقع ہے) چوٹی پر چڑھا۔ سرائے کی تمام روشن بتّیاں نظر آتی تھیں اور کبھی کبھی جب ہوا کا رخ موافق ہو جاتا تھا تو موسیقی کے ایک دو سُر بھی پہنچ جاتے تھے۔ اُس وقت میری تصور کی آنکھوں نے دیکھا کہ تم پھولوں کی خوشبو کے درمیان "جرمن ناچ" کی خواب آور موسیقی کے ساتھ اجنبیوں کے ساتھ خوبصورتی سے محوِ رقص ہو۔ خیال کرو اُس وقت میں نے اپنی تنہائی کو کتنا محسوس کیا ہوگا؟

مشہور "ٹرین ہم" خاندان کی بہنوں میں سب سے کم عمر لیکن سب سے زیادہ حسین بہن نے ایک سرد آہ بھری اور حسرت ناک

---

[1] لاٹھی۔ [2] ایک مشہور خاندان

لہجے میں کہا۔

"تمہارا قیاس غلط تھا - واقعی میں غیروں کے ساتھ خوبصورتی سے محوِ رقص تھی - امی کی کہنیوں اور شانوں میں درد تھا - وہ کبھی کبھی اس عارضے میں مبتلا ہو جاتی ہیں - اور مجھے کوئی آدھ گھنٹہ اس بدبودار مرہم کی مالش کرنی پڑی - ٹھیک! تم اُسے اپنے خیال میں پھولوں کی خوشبو سمجھے ہو گے؟ تمہیں معلوم ہے کل شام شہر میں ہفتہ وار ناچ تھا جس میں مغربی گوشے کے کچھ لڑکے اور کئی دوسرے نوجوان بھی شریک ہوئے تھے مگر مجھے ابتک یاد ہے کہ امی ایک کھلی ہوئی ہوادار کھڑکی کے بالمقابل تین گھنٹے بیٹھی رہیں جس کا نصف وقت تو ۸۵ درجۂ حرارت قلم بند کرنے میں اور باقی موسم سرما کے کپکپا دینے والے جھونکوں میں گزارنا پڑا - ذرا اس مکروہ حالت کا تصور کرو - کہ امی کے شانے سوجے ہوئے ہیں - اور وہ درد کی ٹیس سے کراہ رہی ہیں - میں اُسے خواب گاہ تک پہنچانے جاتی ہوں اور اُس کی کہنیوں کی مالش کرتی ہوں - پھر تمہیں حیرت میں ڈالنے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ اُمی کے بازو کی جسامت کئی ہی مکعب انچ ہے جس پر پٹی باندھنے کے لئے بھی وقت چاہئے - آہ میں خیال کرتی ہوں کہ راہب کہلانا کتنا باعثِ مسرت ہے - یہ عبا جو تم پہنے ہوئے ہو تمہارے جسم پر کتنی پھبتی ہے - کیا تم نے اسے خود تیار کیا ہے یا سرائے والوں نے بخشی ہے - آہ بوٹوں کی بجائے کھڑاویں پہننے سے روح کو کیسی پُرمسرت تسکین حاصل ہوتی ہوگی - ذرا سوچو ہمیں کتنی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں - میری گرگابی کا سائز کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو مگر اُس سے میری ایڑیاں ہر وقت بھنچی ہوئی رہتی ہیں - آہ کیا عورتیں راہب نہیں بن سکتیں؟

یہ کہکر اُس نے ایک سرد آہ بھری اور پھر نرم لہجے میں بولی -

میں نے تمہاری سرگزشتِ محبت بھی سُنی ہے - سرائے والوں نے اُسے کارڈوں کی پشت پر چھپوا رکھا ہے - مقدس راہب کیا واقعی وہ بہت حسین و جمیل تھی؟

راہب نے بڑبڑاتے ہوئے کہا -

"ہوٹل کے بلوں کی پشت پر اوہ! مگر مجھے دنیا کی بک بک کی کیا پروا ہے - ہاں واقعی وہ اپنی مثال آپ تھی - میں سمجھتا تھا کہ اُس جیسی دوسری حسین عورت صفحۂ ہستی پر موجود نہیں ہے -

اس لئے جب سے اُسے ترک کر دیا باقی ماندہ زندگی کو تنہا گزارنے کے لئے اس پہاڑی پر چلا آیا - کہ عمرِ چند روزہ کو اُس کی یاد میں صرف کر دوں -

مس ٹرین ہم بولی - واقعی یہ ایک شاندار ایثار ہے - میں خیال کرتی ہوں کہ راہب کی زندگی ایک معیاری زندگی ہوتی ہے - کوئی قرضخواہ تنگ کرنے نہیں آتا - کسی کی دعوت میں* میں بھی ایسی ہو جاؤں - مگر میرے ایسے کہاں نصیب؟ اگر میں نے اس موسم میں شادی نہ کی تو میرا اس بات پر سچا یقین ہے کہ امی مجھے اِس بات کے لئے بے حد مجبور کرینگی - اِس لئے نہیں کہ میں دن بدن عمر میں زیادہ یا بدشکل ہوتی جا رہی ہوں - بلکہ اِس لئے کہ اب ہماری اتنی حیثیت نہیں رہی - کہ کوہستانی زندگی سے زیادہ دیر تک لطف اندوز ہو سکیں - مگر میں ذاتی طور پر شادی سے متنفر ہوں - ہاں اگر کرونگی بھی تو کسی ایسے شخص سے جسے میرا دل انتخاب کریگا - یہی باعث ہے کہ میں راہب بننا چاہتی ہوں - سُنا ہے کہ راہب کبھی شادی نہیں کرتے - کیا یہ بات سچ ہے؟

راہب بولا - بہتوں نے شادی کر لی ہے - مگر اُس وقت جب اُنہیں کوئی دل پسند شے (بیوی) دستیاب ہو گئی تھی -

سب سے چھوٹی لیکن سب سے زیادہ حسین دوشیزہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا -

"لیکن بعض صرف اِس لئے بھی تو راہب ہو گئے ہیں کہ یہ دل پسند شے اُن سے کھوئی گئی تھی - کیا ایسے راہب اب موجود نہیں ہیں؟

راہب نے چڑ کر کہا -

کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے یہ شے کھو دی ہے - عقل انسان کو پہاڑ کی کھوہ میں بھی حاصل ہو جاتی ہے اور ٹیلوں کی دنیا میں رہ کر بھی

مس ٹرین ہم نے کہا -

بے شک اگر ٹیلے میں عقل پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہو - میرے گھر والے تو عقل میں بڑے ٹیلے ہی ہیں - ہم چار بہنیں ہیں - میرے سوا باقی سب بیاہ دی گئی - سب روپے کے ساتھ بیاہ دی گئیں - امی میری بہنوں پر کتنا فخر کرتی ہیں - وہ اُنہیں بڑے دنوں میں نہایت خوشنما آرٹ

* [illegible]

گیلنڈ ڈ بھیجتی رہتی ہیں۔ اب ——— صرف میں ہی رہ گئی ہوں مجھے تاکید کی گئی ہے کہ کسی قلاش پر نظر نہ ڈالوں ——— راہب نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر"

حسین دوشیزہ بولی۔

لیکن مجھے معلوم ہے کہ راہبوں کے پاس بڑے بڑے بیش قیمت طلائی ظروف ہوتے ہیں۔ جنہیں وہ بلوط کے اونچے اونچے درختوں کی جڑوں کے قریب زمین میں چھپا رکھتے ہیں۔ مجھے سب معلوم ہے۔

راہب نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔

"مگر میرے پاس نہیں ہیں"

مس ٹرین ہوم بولی

مجھے اس کا افسوس ہے۔ اب تک میں یہی سمجھتی تھی کہ کوئی راہب اس دولت سے محروم نہیں ہوتا۔ ہاں یاد آیا اب مجھے گھر واپس جانا چاہئیے۔

حقیقت میں وہ نہایت حسین اور خوش رو تھی۔

راہب بولا۔ حسین لیڈی :—

اُس نے کہا۔ میرا اصلی نام بیٹریکس ٹرین ہوم ہے۔ لیکن بعض لوگ مجھے ٹریکس بھی کہتے ہیں۔ تم سرائے میں مجھ سے ملنے ضرور آنا۔

راہب نے جواب دیا۔ میں دس سال سے کبھی اپنے غار سے سو قدم کے فاصلے پر نہیں گیا۔

لیکن اُس نے دوبارہ کہا۔

"تم مجھ سے وہاں ضرور ملو۔ جمعرات کے علاوہ کسی روز شام کو۔"

راہب ایک نحیف انداز میں مسکرا دیا۔

حسین دوشیزہ نے اپنے زرد آسمانی رنگ کے سائے کی تہوں کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ اچھا لو خدا حافظ! میں تمہارا انتظار کرونگی لیکن یاد رہے جمعرات کی شام کو نہیں۔

لطف ہوتا اگر سرائے کے آئندہ چھپنے والے کارڈوں کی پشت پر راہب کے متعلق جو عبارت ہے اُس میں مندرجہ ذیل سطور کا اضافہ کر دیا جاتا۔

"اپنی دس سال سے بھی زیادہ تنہا زندگی کے دوران میں صرف ایکبار پہاڑ پر رہنے والے راہب نے اپنے مشہور غار کو چھوڑا۔ صرف ایک بار۔ جب ٹرین ہوم خاندان کی بہنوں میں سب سے چھوٹی اور سب سے حسین بیٹرکس کے ساحرانہ حسن کی کشش نے اُسے نیچے سرائے تک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔"

راہب جھونپڑے میں واپس گیا تو دروازے کے باہر بوب بنکلے کھڑا تھا۔ یہ اُس کا قدیمی دوست تھا اور اُس وقت کا ساتھی جب اُس نے دُنیا کو ترک بھی نہ کیا تھا۔ بنکلے دلدادگانِ موسم گرما کی طرح مختلف الالوان لباس میں ملبوس تھا۔ کروڑپتی بنکلے جس کا چہرہ بھدا سا۔ لیکن بالکل صاف اور استقلال و دور اندیشی کی تصویرِ مجسّم تھا۔ اُس کی انگلیاں ہیرے کی انگوٹھیوں سے مزین تھیں۔ جیب میں بیش قیمت زنجیر سے آویزاں ایک گھڑی تھی۔ بنکلے عمر میں راہب سے دو سال بڑا تھا لیکن بُشرے سے پانچ سال چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ راہب کو دیکھتے ہی چلا اُٹھا۔

تم اِن مونچھوں اور اِس لمبی عبا کے باوجود ابھی تک وہی ہیمپلینس (راہب کا نام) ہو۔ میں نے سرائے میں ہوٹل کے بل کی پشت پر تمہاری بابت پڑھا تھا۔ سرائے والوں نے تمہاری سرگزشت کھمن کے اشتہار اور "ہم کوٹوں اور چھتریوں کے ذمہ دار نہیں ہیں" کے بین السطور[1] شائع کر رکھی ہے۔

راہب نے کہا۔

تم بھی بعینہٖ وہی ہو۔ اندر چلے آؤ اور یہاں آکر بیٹھ جاؤ۔ اُس چونے کے پتھر کی چٹان پر کیونکہ اس کی سطح عام پتھروں سے زیادہ نرم ہے۔

بنکلے بولا۔

پیرمرد! میں ابھی تک تمہارے متعلق حیرت میں ہوں۔ یہ بات تو میری بھی سمجھ میں آتی ہے کہ تم ایک عورت کو دس سال تک ترک کر سکتے ہو لیکن یہ نہیں سمجھ سکتا کہ دس سال ایک عورت کی خاطر کس طرح برباد کئے جا سکتے ہو۔ میں خوب جانتا ہوں۔ کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ اِن حالات میں عام طور پر ہر شخص کا طرزِ عمل یہی ہوتا ہے۔ ایڈتھ کار[2] ——— اس نے تمہارے علاوہ اور پانچ چھ نیاز مندوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ لیکن ان میں سے

[1] سطروں کے بیچ میں۔ [2] راہب کی بیوفا محبوبہ کا نام۔

صرف ایک شخص نے غار کی رہائش اختیار کی۔ باقیوں نے شراب، سیاسیات اور اسی نوع کے دیگر مشغلوں میں علاجِ دردِ دل تلاش کرلیا۔ مگر ہیمپ سچ کہنا کیا ایڈتھ کار دنیا کی حسین ترین عورت نہ تھی؛ بلند خیال، بلند نسب، مغرور جو اپنے اصولوں کو زندگی کی منعمات کے حصول کے لئے استعمال کرتی تھی۔

راہب بولا۔

"میں نے جب سے دنیوی تعلقات کو ترک کیا ہے۔ اُس کے متعلق پھر کوئی بات نہیں سُنی"۔

بنکلے نے کہا۔

"اُس نے مجھ سے شادی کرلی تھی"۔

راہب جھونپڑے کی چوبی دیوار سے تکیہ لگاکر بیٹھ گیا اور حالتِ بیتابی میں پاؤں کی ایڑیوں کو فرش پر رگڑنے لگا۔

بنکلے بولا۔

میں خوب سمجھتا ہوں کہ تم نے اسے کتنا محسوس کیا ہے۔ مگر خیال کرو اگر وہ مجھ سے شادی نہ کرلیتی تو اور کیا کرتی۔ اُس کی چار بہنیں تھیں۔ ماں تھی اور وہ بڈھا باپ تھا، جس نے (جیسا کہ تمہیں بھی اُس کا علم ہے) اپنا تمام سرمایہ بیلونوں کے بیوپار میں لگادیا تھا۔ لیکن اُن کی مالی حالت سُدھرنے کے بجائے ہر روز بد سے بدتر ہی ہوتی گئی۔ ہاں تو تمہاری طرح میں بھی ایڈتھ کے لچھنوں سے واقف تھا لیکن پھر بھی میں نے اُس سے شادی کرلی۔ اُسوقت میری حیثیت دس لاکھ کی ہوگی۔ جسے میں نے اِس وقت تک پچاس ساٹھ لاکھ تک پہنچادیا ہے۔ ایڈتھ مجھ سے زیادہ میری دولت کی خواہاں تھی۔ وہ ہر وقت چابیوں کے گچھے کی حفاظت میں مشغول رہتی تھی۔ جس وقت تم نے گلہری کی طرح غار کو اپنا مسکن بنایا اُس کے دو ماہ بعد ہم دونوں میاں بیوی بن گئے تھے۔ اُس وقت تو میں بھی اِس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔

"لیکن اب ——— "

راہب نے پوچھا۔

اب ہم پہلے سے بھی زیادہ ایک دوسرے کے خیر خواہ اور دوست ہیں۔ دو سال کا عرصہ ہوا کہ اُس نے مجھ سے طلاق نامہ حاصل کرلیا۔ سبب وہی کہ ہمارا نباہ مشکل تھا۔ میں نے کوئی استغاثہ دائر کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔

بنکلے۔ اچھا اچھا۔ اچھا تو ہیمپ[1] واقعی تم نے یہ مضحکہ انگیز گھروندا ساخوب کھود رکھا ہے۔ تم ہمیشہ ناول کے ہیرو کی طرح دشوار پسند رہے ہو۔ تم نے خیال کیا ہوگا کہ اِس طرح تم ایڈتھ کو اپنی جانب دوبارہ مائل کرنے میں کامیاب ہوجاؤ گے۔ ممکن ہے تمہیں اِس میں کچھ کامیابی بھی حاصل ہوئی ہو لیکن میرے دوست میرے خیال میں یہ غار پسندی اور بڑی بڑی مونچھیں اِس مہم کو سر نہیں کرسکتیں۔ اُسے تو صرف روپیہ ہی جیت سکتا ہے۔ اچھا تو تُمہیں دیانتداری سے کہو کہ کیا اپنے متعلق تمہارا یہ خیال نہیں ہے۔ کہ تم اب تک بیوقوف بنے رہے ہو؟۔

راہب اپنی گھنی داڑھی کی آڑ میں مسکرادیا۔ وہ طبعاً اِس سے پہلے بھی اور اب بھی متموّل لیکن خام طبع بنکلے سے اتنا بلند واقع ہوا تھا کہ اُس کی غیر متین گفتگو بھی اُس کے غصّے کو متحرک نہ کرسکتی تھی۔ مزید براں تنہا مطالعہ اور رشیق افکار نے اُسے دنیا کی عام غرور پسندی سے بالاتر کر دیا تھا۔ یہ مختصر سادامن کوہ اُس کے نزدیک اولیمپس[2] سے کم نہ تھا جس کے اوپر والے کنارے سے وہ بجلیوں کے تیروں کو وادی میں بسنے والے انسانوں پر برستے ہوئے دیکھتا تھا۔ تو پھر کیا یہ دس سال جنہیں اُس نے ترکِ لذّاتِ افکار، معیار پرستی اور دنیائے دُنی کی زندہ تحقیر میں صرف کیا تھا۔ محض بیکار گئے تھے۔ نہیں۔ کیونکہ سب سے کم عمر لیکن سب سے حسین۔ ایڈتھ سے بھی حسین۔ اِس سے بھی کئی گنا حسین۔ دوشیزہ زمین کی پستیوں سے اِس کے پاس پہاڑ پر پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ یہی وہ خیال تھا جس کے دماغ میں آتے ہی وہ اپنی داڑھی کی آڑ میں مُسکرادیا۔

جب یہ جھونپڑا بنکلے کی موجودگی کے داغ سے پاک ہوگیا اور سب سے پہلا دُھندلا ستارہ صنوبر کے درختوں پر نمودار ہوا۔ تو راہب نے طاق میں سے خمیر بنانے والے سفوف کا ڈبہ اُٹھایا۔ وہ ابھی تک اپنی داڑھی کی آڑ میں مسکرا رہا تھا۔

دروازے میں خفیف سی سرسراہٹ ہوئی۔ ایڈتھ کار[3] اپنے بے پایاں حسن دلربایانہ شان اور اُن تمام ایرانہ شوکتوں کے ساتھ

---

[1] راہب کا نام۔ [2] دیوتاؤں کی بہشت۔ [3] راہب کی مطلقہ بیوی

دبے جسے اُس نے پچھلے دس سال میں حاصل کیا تھا، دہلیز میں گڑی تھی۔

وہ زیادہ باتیں کرنے کی عادی نہ تھی۔ اُس نے راہب کی طرف اپنی بڑی بڑی متفکر سیاہ آنکھوں سے دیکھا۔ راہب بھی تصویرِ حیرت بنا کھڑا تھا۔

آخر ایڈیتھ نے طلسمِ سکوت توڑتے ہوئے ایک ہلکے اور صاف لہجے میں کہا۔

مَیں سرائے میں قیام پذیر ہوں۔ وہاں مَیں نے تمہارے حالات سنے تو دل نے کہا کہ ایک بار ضرور ملنا چاہئے۔ مَیں تم سے معافی کی خواستگار ہوں۔ مَیں نے اپنی مسرّت روپے کے ہاتھ فروخت کر دی۔ کیونکہ مجھے دوسروں کی معاش کی فکر بھی تھی (آہ مگر اس سے میری برأت ثابت نہیں ہوتی) سرائے والوں نے مجھ سے یہ بھی ذکر کیا کہ تم نے صرف میری خاطر دس سال قربان کر دئے ہیں۔ ہیمپٹن! میں اُس وقت اندھی تھی اور یہ نہ دیکھ سکتی تھی کہ دنیا کی تمام دولت ایک وفادار دل کے مقابلے میں بالکل بے حیثیت شے ہے۔ اگر ——— آہ لیکن شاید اب تیر کمان سے نکل چکا ہے۔

اُس کا یہ بیان گویا ایک محبت کرنے والی عورت کے غرور میں چھپی ہوئی ایک درخواست تھی۔ مگر راہب نے ایک ہلکے سے نقاب کی آڑ میں سے یہ بات نہایت آسانی سے معلوم کر لی کہ اُس کی بیوی اُس کے ساتھ دوبارہ رہنے کی خواہشمند ہے۔ بشرطیکہ وہ خود اِس امر کو پسند کرے۔ اُس نے ایک سنہری تاج جیت لیا ہے۔ بشرطیکہ وہ اُسے پہننا قبول کرے۔ اس کے دس سال کی مستقل المزاجی اور وفاداری کا انعام اُس کے پاس پہنچنے کو بیتاب ہے۔ بشرطیکہ وہ اُس کے استقبال کو اپنا ہاتھ پھیلائے۔ "جادوئے قدیم کی مرتعش روشنی لمحہ بھر کے لئے اُس پر چمکی اور پھر یکے بعد دیگرے اُس نے غم و غصّے کی اُن مردانہ حسیات کو جو محبت کے ٹھکرائے جانے پر پیدا ہوتی ہیں اور اُن جذباتِ نفرت کو جن کا باعث ایک عورت کا دوبارہ محبت کی بھیک طلب کرنا ہے محسوس کیا۔ لیکن سب سے آخر ترین ہم خاندان کی بہنوں میں سب سے خوبصورت بہن کی زرد

۱ راہب کا نام۔ ۲ کسی عقیدے کی جانب اشارہ ہے۔ ۳ کانپتی ہوئی۔

آسمانی رنگ کی خیالی تصویر نے اُس کے دماغ کی آنکھوں کو منوّر کر کے اُسے پھر مستحکم کر دیا۔ چنانچہ وہ صفوف کے خمیر بنانے والے ڈبے کو سینے کے ساتھ دباتے ہوئے ایک عمیق لہجے میں بولا۔

"اب وقت گذر چکا ہے۔"

ایڈیتھ نیچے جانے والی پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ بیس گز چل کر ایک بار پھر مُڑی اور اُس نے مُڑ کر راہب کو دیکھا۔ لیکن اب راہب نے برتن کے ڈھکنے کو گھمانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اُس کی بڑی بڑی پُرحسرت آنکھوں کو جو شام کے دُھندلکے میں چمک رہی تھیں۔ خوب دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اپنے چوبی دروازے پر غیر متاثر حالت میں کھڑا رہا۔ حتّےٰ کہ اُس نے کوئی اشارہ بھی نہ کیا۔

جیسے ہی جمعرات کی شام کو چاند افق پر نمودار ہوا۔ راہب پر دنیا کی دیوانگی مُسلّط ہونے لگی۔

سرائے میں بلینڈ بُر کا سینو" گایا جا رہا تھا۔ موسیقی کی کچھ اُڑتی ہوئی تانیں جو پریوں کے ناقوس سے بھی زیادہ نازک و لطیف تھیں۔ کبھی کبھی اِس بلندی تک بھی پہنچ جاتی تھیں۔ رات نے ہڈسن کو ایک غیر محدود سمندر کی طرح وسیع کر دیا تھا۔ سامنے ساحل پر چلنے والوں کی روشنی دُھندلی نظر آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ چراغ وہ نہیں جن کی روشنی میں چلنے والی گاڑیاں ٹھوس سڑکوں پر قطعِ مسافت کرتی ہیں۔ بلکہ کچھ چمکتے ہوئے ستارے ہیں جنہیں زمین سے کروڑوں میل کے فاصلے پر دوُر۔ افق کی پستی کے دامن میں جڑ دیا گیا ہے۔ سرائے کے سامنے جگنوؤں کی جگمگاہٹ سے پانی میں چراغاں کا عالم ہو رہا تھا۔ یا کچھ دخانی کشتیاں تھیں۔ جن میں گیس اور تیل کی بدبو موجود تھی۔ ایک وقت تھا کہ راہب اِن چیزوں سے مانوس رہ چکا تھا۔ وہ سرخ و سفید دھاریوں والے شامیانے کے سائے میں حسن کے ساتھ کھیل چکا تھا۔ لیکن اب وہ دس سال سے چھچھوری دنیا کی صدا ہائے بازگشت کی طرف سے تقریباً بہرا بنا رہا تھا۔ مگر آج کی رات اُس کے کان دنیا کی پُرمسرّ

۱ مضبوط۔ ۲ خمیر بنانے کے لئے۔ ۳ ایک گیت۔ ۴ اُس جگہ کا نام۔ ۵ صدائے بازگشت۔ وہ آواز جو کسی ویرانے جنگل۔ یا کنویں میں آواز دینے سے پیدا ہوتی ہے۔

آغازِ حل کے لئے نکل چلے تھے۔

بینڈ میں سے والٹز[1] کی — ہاں والٹز کی سُریلی تانیں نکل رہی تھیں۔ وہ کتنا احمق تھا کہ اُس نے ارادۃً ایک ایسی ہستی کے لئے جس نے اُسے دُنیا کی ناپائدار مسرتوں کی خاطر ترک کر دیا تھا۔ تقویمِ[2] حیات میں سے اپنی زندگی کے دس سال پھاڑ ڈالے تھے۔

"ٹم۔ ٹی ٹم۔ ٹم۔ ٹی۔ ٹم ٹی" آہا! والٹز کس طرح جاری تھا۔ لیکن یہ سال ضائع نہیں ہوئے۔ کیا اُسے دنیا کا ایک قیمتی موتی اور روشن ستارہ —— خاندان کی سب سے کم عمر لیکن سب سے حسین بہن —— تھی؛ مگر اُس نے تو تاکید کی تھی۔ کہ جمعرات کی شام کو نہ آنا۔ ممکن ہے وہ اُس وقت والٹز کی دلکش تانوں کے ساتھ ساتھ شہر کے نوجوانوں میں سے کسی ایک کے ساتھ آہستہ آہستہ لطیف انداز سے محوِ رقص ہیں۔ اور وہ بے نصیب شخص جس نے اُس کی خوشنما آنکھوں میں اُن اشیا کا مطالعہ کیا ہے جو اُس کی زندگی کے کھوئے ہوئے دس سالوں کی تلافی کے لئے کافی ہے۔ اپنے غار میں جنگلی درندے کی طرح منہ بنائے پڑا رہے۔ جہنم میں جائے یہ قید[3]۔ میں وہاں ضرور جاؤنگا۔

اُس نے اپنی "مارکس اوریلیس"[4] کی کتاب زمین پر پٹک دی۔ ٹاٹ کی عبا جسم سے علیحدہ کر دی اور غار کے ایک کونے سے ایک ٹرنک جو خاک میں اٹ رہا تھا کھینچ کر باہر نکالا اور مشکل سے اُس کے ڈھکنے کو دور کیا۔

وہاں موم بتیوں کی کمی نہ تھی۔ چنانچہ چشم زدن میں غار کی تاریکی روشنی سے مبدل ہو گئی۔ کپڑے جو دس سال پہلے کے فیشن کے مطابق کاٹے گئے تھے۔ قینچیاں۔ اُسترے۔ ٹوپیاں۔ جوتے۔ اُس کا تمام لباس اور تمام چیزیں جسے اُس نے پہلے ترک کر دیا تھا۔ اُنہیں اُن کی پُرسکون خلوت گاہ سے نہایت بیدردی سے باہر نکالا گیا۔ جو اُس وقت ایک درد انگیز بے ترتیبی کی حالت میں فرش پر بکھری پڑی تھیں۔

قینچی کے دونوں پروں نے اُس کی داڑھی کے بالوں کو اتنا ہلکا کر دیا کہ کند اُسترے اُس پر اپنے فرائض کو بخوبی سرانجام دینے لگے۔ راہب اپنے بال خود نہ کاٹ سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے اُنہیں شانہ کر کے بُرش سے اوپر چڑھا لیا۔ انسانی ہمدردی ہمیں اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم کہ ہم ایک ایسے شخص کی جو سوسائٹی اور اُس کے لوازمات سے اتنی مدت بے تعلق رہا ہو۔ دلی حسرتوں اور جفاکشیوں کے ساتھ اظہارِ ہمدردی نہ کریں۔

آخر کار راہب غار کے اندرونی گوشے میں گیا۔ وہاں اُس نے زمین کی نرم مٹی کو لوہے کے ایک بڑے چمچے سے کھودنا شروع کر دیا۔ کھُدے ہوئے گڑھے میں سے ٹین کا ایک ڈبہ اور ڈبے میں سے تین ہزار ڈالر کے نوٹ باہر نکالے جو ایک ریشمی کپڑے میں دھاگے سے مضبوط بندھے ہوئے تھے۔ اِس بات سے تو اب تمہیں بھی یقین آ گیا ہوگا۔ کہ وہ صحیح معنوں میں راہب تھا۔

اب وہ ڈگیں بھرتا ہوا پہاڑ کے دامن سے نیچے اُتر رہا ہے۔ اِس حالت میں آپ اُس پر ایک جھلکتی ہوئی نگاہ ڈالیں۔ ایک لمبا سلوٹیں پڑا ہوا سیاہ رنگ کا فراک کوٹ جو ٹخنوں تک پہنچ رہا ہے۔ بلغم کے رنگ سے ملتا ہوا سفید پاجامہ درزی کے لوہے سے ناآشنا۔ پیازی رنگ کی قمیص۔ سفید اور سخت کالر۔ کالر کے ساتھ ایک چمکدار نیلے پروں والی تیتری یا ٹائی بٹن والے موزے۔

اِن سب کے معائنہ کے بعد دس سال کی طویل مدت کا بھی خیال کریں۔ تنکوں کی تنگ کنارے والی ٹوپی (جس پر ایک فیتہ تھا) کے اندر سے اُس کی لمبی لمبی جٹائیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ مختصر یہ کہ ایک ایسا لباس کہ چاہے آپ دیکھنے میں کتنے ہی مشاق کیوں نہ ہوں۔ پہلی نظر میں اُسے کبھی نہ پہچان سکتے اور یہی سمجھتے کہ کوئی شخص شہزادہ "ہیملٹ" کا پارٹ ادا کرنے جا رہا ہے۔ اور اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کبھی نہ کہہ سکتے کہ یہ ایک راہب ہے۔ جس نے ایک عورت کی محبت کی خاطر اور اس طرح ایک دوسری عورت کی محبت جیتنے کے لئے دس سال ایک غار میں بسر کئے ہیں۔

ناچ گھر کی عمارت دریا کے پانی پر چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جس کے اندر چمکدار بتیاں اور بجلی کے کہرآلود قمقمے نور کی ہلکی ہلکی بارش کر رہے تھے۔ سراسمے کے سینکڑوں عورت۔ مرد اندر سے باہر اور باہر سے اندر اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ یہ عمارت اس پگڈنڈی کے (جس سے راہب نیچے اُترا تھا) بائیں جانب

۱؎ ایک گیت۔ ۲؎ تقویم۔ جنتری۔ ۳؎ بیٹرکس کا یہ حکم کہ جمعرات کی شام کو نہ آنا۔ ۴؎ ایک رومن شہنشاہ جس کے اخلاقی اقوال مشہور ہیں۔

واقع تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کوئی جشن ہو رہا ہے۔ کیونکہ اُس کی کھڑکیاں روشنی سے معمور تھیں۔ موسیقی کا دریا لہریں مار رہا تھا۔

ایک سیاہ فام حبشی سفید جاکٹ پہنے ہوئے ناچ گھر کے آہنی دروازے میں سے (جس کے دو رویہ سنگین ستون تھے اور ستونوں میں آہنی شمعدان بنے ہوئے تھے) باہر نکلا۔

راہب نے اُس سے پوچھا۔

"اِس وقت یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

حبشی ملازم بولا۔

"حضور جمعرات کی شام کا معمولی ناچ"

"اور ساتھ والے بڑے کمرے میں؟"

"یہاں ایک دعوت ہے۔"

پھر راہب نے نظریں اُوپر اُٹھا کر پہاڑ کی سرائے کو دیکھا جہاں سے موسیقی کی ایک مسرت آفریں لے گویا اُن پر اچانک برس پڑی تھی۔

راہب نے پوچھا۔

"اور وہاں شاید یہ مینڈلسٹن کا باجا رہا ہے۔

"ہاں تو وہاں کیا ہو رہا ہے؟"

حبشی بولا۔

"اوپر سرائے میں ـــــ ایک شادی کی رسم ادا ہو رہی ہے۔"

کس کی شادی؟

مالدار بنگلے کی شادی یہاں کی ایک حسین نازنین مس ٹرین ہوم کے ساتھ۔

فاخر ہریانوی بی۔اے

غزل

عشق کی کشمکش نے کام کیا ؛ قصۂ زندگی تمام کیا ؛
وہ تماشے کو دیکھتے ہی رہے مرنے والے نے اپنا کام کیا
اُف رے ذوقِ طلب کی آگاہی کہیں سجدہ کہیں قیام کیا
ہر قدم پر ہے جلوۂ نیرنگ تم نے نیرنگیوں کو عام کیا
فرصتِ زندگی عجب شے تھی کیوں خرابِ خیالِ خام کیا
تھا تجسس ترا نماز میں بھی کبھی سجدہ کبھی سلام کیا

مرگِ جوہر پہ کوئی کیوں روئے
کونسا اُس نے ایسا کام کیا

جوہر

جرمن یونیورسٹیوں کا نظامِ تعلیم

اگر میں واعظی کا پیشہ چھوڑنے پر مجبور کیا جاؤں تو میں معلمی کو اختیار کر دوں گا۔ (لوتھر)

کچھ عرصہ ہوا ایک انگریز مصنف نے علوم کے اُن ماہرین و فنون کی فہرست مرتب کی تھی جن کو آج تک نوبل پرائز مل چکا ہے۔ اور اُن اعداد سے مختلف قوموں کے قوائے ذہنی (ذہنی طاقتوں) کا اندازہ کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ آٹھ جرمنوں کے مقابل میں تین انگریزوں اور ایک امریکن کو انعام ملا ہے۔ انعامات معتبر تحقیقات کے بعد اُن لوگوں کو عطا کئے جاتے ہیں جنہوں نے علم کیمیا طبعیات میں کئی ایجاد یا علمی تجسس و تلاش سے انسانی معلومات میں کوئی قابل قدر اضافہ کیا ہو یا میدان ادب میں کوئی ایسا شاہکار پیدا کیا ہو جس پر نسل انسانی فخر کر سکے یا دنیا کے امن و امان کے لئے کوئی بیش بہا خدمات انجام دی ہوں۔ انعامات کی اہمیت اور وقعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اگرچہ ڈاکٹر نوبل نے اُن انعامات کے لئے اس صدی کے شروع سالوں میں ہی سرمایہ وقف کر دیا تھا مگر اب تک صرف ایک ہندوستانی کو ادبی انعام ملا ہے۔ اس کا سہرا بنگال کے سر اور بنگالی ادب کے لئے یہ امر باعثِ ناز ہے۔

در اصل حق بات یہ ہے کہ باوجود اقتصادی[1] انحطاط جنگ عظیم کے صدمات اور تاوان جنگ کے جرمنی نے جس ہمت سے علمی تحقیقات کے معیار کو بلند رکھا ہے۔ یہ اس کے لئے قابلِ اطمینان ہی نہیں بلکہ باعثِ فخر ہے۔ آج معاشیات۔ کیمیا۔ طبعیات۔ نباتیات۔ علم رنگ سازی وغیرہ میں جرمنی یورپ کی تمام قوموں سے پیش پیش ہے۔ اس کا ادنیٰ سا ثبوت یہ ہے کہ لندن یونیورسٹی کے قوانین کے مطابق تمام سائنس کے طلبہ کو جرمن زبان لازماً پڑھنی پڑتی ہے۔ تاکہ وہ جدید جرمن رسالوں اور کتابوں سے پورا استفادہ[2] حاصل کر کے اپنے مضامین کی تکمیل کر سکیں۔

ہندوستان کا نظامِ تعلیم انگریزی طرزِ تعلیم کا ایک دھندلا سا خاکہ ہے۔ اہلِ ملک کو کبھی یہ موقعہ ملا ہی نہیں کہ آزادیٔ رائے سے کام لیکر نظامِ تعلیمی کی کوئی اصلاح کر سکیں اُدھر حکومت نے وہی طرزِ تعلیم رائج کر دیا جس سے وہ آشنا تھے۔ بلکہ ایک قابل ماہرِ تعلیم کا تو یہ مقولہ ہے کہ جو اصولِ تعلیم ولایت میں اس سال بے کار اور فرسودہ قرار پائے جاتے ہیں وہی اگلے سال ہندوستان میں رائج کر دئے جاتے ہیں۔ انہیں غلطیوں کا نتیجہ ہندوستان آج بھگت رہا ہے۔ انگریزی طرزِ تعلیم کی پیروی کرنے کا نتیجہ زیادہ نقصان دہ اس وجہ سے بھی ہوا کہ خود انگریزی میں فنِ تعلیم میں جدت طرازی[3] یا اصلاح نہیں ہوئی بلکہ اُن کی روش اس بارے میں مجددانہ نہیں بلکہ مقلدانہ[4] رہی ہے۔

۱۹۱۹ء کی اصلاحات میں خوش قسمتی سے تعلیم کو وزیرِ تعلیم کے سپرد کیا گیا ہے جو اپنے پالیسی کے واسطے کونسل کے سامنے جواب دہ ہے اور قوم کے نمایندے جو ضروری اصلاح یا تجدید طرزِ تعلیم میں کرنا چاہیں ہو سکتی ہے۔ اِن حالات میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی نئی کتاب "نظامہائے تعلیم" بہی خواہانِ قوم کے لئے عموماً اور اُن ممبرانِ کونسل کے لئے جو تعلیم اور احیاء[5] علوم کو ملکی ترقی کا ایک ضروری عنصر سمجھتے ہیں۔ شمعِ ہدایات کا کام دیگی۔ اس کتاب میں قابل مصنف نے انگریزی۔ المانی[6]۔ فرانسیسی اور ہندوستانی نظامہائے تعلیم پر ایک مبسوط اور مکمل بحث کر کے آخر میں ہندوستانی نظامِ تعلیم کا دوسرے ملکوں کی طرزِ تعلیم سے موازنہ کیا ہے اور ہندوستانی نظامِ تعلیم پر ایک ماہرِ تعلیم کی نظر سے تنقید کی ہے۔ اور اس تجربہ کی مدد سے جو انہوں نے مصری انگریزی اور جرمن درسگاہوں میں تعلیم حاصل کر کے اور فرانسیسی اور اطالوی درسگاہوں کے عینی[7] مشاہدہ سے حاصل کیا ہے۔ ہندوستانی طریقِ تعلیم کے نقائص کو دور کرنے کے لئے تجاویز پیش کی ہیں۔

---

[1] روزی کمانے کے طریقوں اور وسیلوں کی کمی۔
[2] استفادہ کرنا۔ فائدہ اٹھانا۔
[3] اپنی عقل سے ایجاد کر کے۔ [4] دوسروں کی پیروی کر کے۔
[5] زندہ رکھنا۔ [6] المانی۔ جرمن۔ [7] عینی مشاہدہ۔ خود دیکھ کر۔

یہ مضمون بھی اسی کتاب سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے اور بیشتر اعداد و شمار اسی میں سے لئے گئے ہیں۔

جرمنی میں اسکولوں کا آغاز ازمنۂ وسطیٰ[1] سے ہوا اور ۱۳۴۸ء میں پریگ یونیورسٹی۔ پیرس یونیورسٹی کے نمونہ پر قائم کی گئی۔ جرمنی کے نظامِ تعلیم کی بنیاد کو لوتھر نے مستحکم[1] کیا اور کومینیس۔ پسٹالزی اور فروبل اسی عمارت کو ثریا[2] تک اٹھاتے گئے۔ لوتھر نے جبری تعلیم کی ترویج[3] کا زبردست پروپیگنڈا کیا اور آخر کار اُس کے نیک ارادوں میں خدا نے برکت دی اور ۱۶۱۹ء میں ریاست وائمر میں سب سے پہلے لازمی اور جبریہ تعلیم قرار پائی۔ اس کے بعد کومینیس (جس کا حلقۂ اثر تعلیمی دنیا میں اتنا ہی وسیع تھا جتنا لوتھر کا مذہبی دنیا میں) نے تو اپنی زندگی ہی درس[4] و تدریس کے لئے وقف کر دی۔ اس کو تو فنِ تعلیم کا پیغمبر کہنا چاہئے اور اس کی کتاب گریٹ ڈائیڈکٹک کو اس کا آسمانی صحیفہ۔ لوتھر لاطینی زبان کا زبردست مؤیّد تھا مگر کومینیس پہلا شخص ہے جس نے لاطینی زبان کے خلاف سب سے پہلے علمِ بغاوت کھڑا کیا اور مادری زبان کو نصابِ تعلیم میں اس کا جائز حق دلانے کی کوشش کی۔ اسکولوں میں مادری زبان کا داخلہ ایک بیج تھا اس نظامِ تعلیم کا جو اب پھیلتے پھیلتے ایک شاندار درخت ہو گیا ہے۔ جس کی جڑیں کہیں تو بحرِ اوقیانوس کے اُس پار جا نکلی ہیں اور کہیں بحرِ ہند کی موجوں کا منہ چوم رہی ہیں۔

یہی وہ اصل الاصول[5] ہے جس کا اثر ہندوستانی نظامِ تعلیم میں بھی محسوس ہو رہا ہے۔ اور انگریزی جو زبردستی اردو کا حق غصب کر گئی تھی۔ تدریج[6] جگہ خالی کر رہی ہے۔ ٹیگور کا قول ہے:۔

"اعلیٰ اور ارفع خیالات صرف مادری زبان میں ہی ادا ہو سکتے ہیں" اسی اصول پر کومینیس کاربند تھا۔

کومینس کے بعد قابل جرمن فلسفی ہربارٹ (Herbart) نے بہت کچھ فنِ تعلیم کی خدمت کی۔ اگرچہ عملاً تو وہ کچھ ایسا زیادہ کام نہ کر سکا۔ مگر وہ پہلا شخص تھا جس نے تعلیمی علم النفس پر ایک غائر نظر ڈالی اور اُس کی گتھیوں کو سلجھا کر اُسے ایک منظم فن کی شکل میں مکمل کر دیا۔ اس کے بعد جرمنی میں وہ شخص پیدا ہوا جس نے تعلیمی نظریات[7] کو تہ و بالا کر دیا اور طریقِ تعلیم کو ایک نئی جِلا دے دی۔ وہ فروبل (Froebel) تھا۔ وہ بچوں کو اصلی معنوں میں نونہالانِ قوم اور اُستاد کو ایک باغبان سمجھتا تھا۔ اسی سلسلہ میں اُس نے کنڈر گارٹن یا گلزارِ نونہال[1] کا تخیل دنیا کے سامنے پیش کیا اور صرف تخیل ہی نہیں بلکہ عملاً بھی اُس کے لئے گفٹس (Gifts) یا تحائف ایجاد کئے۔ جن سے بچہ کھیلتا ہے اور جن سے آہستہ آہستہ چیزوں کی خاصیتیں وزن۔ جسامت[2] وغیرہ کا انکشاف[3] ہوتا رہتا ہے۔ فروبل کا جسم مغربی ہی ہو مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا دماغ مشرقی تھا۔ نہیں تو مشرق سے دور افتادہ ملک میں ایک نوجوان کے دل میں وحدت الوجود[4] کے مسئلے کی اُلجھنوں کے کیا معنی ہیں۔ فروبل کے ہر تحفے کا ایک مادی اور دوسرا روحانی پہلو ہے۔ اس کا مقصد ان تحائف[5] سے یہ نہیں کہ بچوں کے حسیات[6] نازک اور تیز ہو جائیں۔ اور مادی دنیا کے سربستہ راز اُن پر منکشف[7] ہو جائیں بلکہ اُس کا مقصد اس سے برتر اور عالی تھا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ یہ باغِ قدرت کے تازہ پھول (بچے) اُسی سانِ سرمدی[8] میں سرمست ہو جائیں جس میں وہ خود چور تھا اور اپنا صحیح رشتہ اُس ذاتِ واحد سے جوڑیں جو منبع و مرجع[9] کل ہے۔ اگرچہ فروبل زندہ نہیں ہے اور اُس کی روحانیت کی بھی یورپ پوری قدر نہ کر سکا مگر اُس کے کنڈر گارٹن کو سب نے سر آنکھوں پر لیا۔ اور یہ اب اپنے مدارج ارتقائی[10] طے کرتا ہوا ایک مکمل فن کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

جن لوگوں نے آج سے پندرہ سولہ سال پہلے تعلیم پائی۔ اُن کے دل میں اب تک ایک چھوٹے سے کمرے کی یاد ہو گی۔ جس میں ہر ایک لڑکے کے سامنے پلیٹ میں گندھی ہوئی چکنی مٹی رکھی ہوئی ہے۔ استاد سامنے کھڑا ہے۔ اور ہاتھ میں تھوڑی سی مٹی لئے ہوئے اچھے لہجے میں گاتا ہے۔ ع

تھوڑی سی مٹی لے کے چڑیا بنائیں گے ہم

---

[1] مضبوط اور پائیدار۔ [2] ستارے۔ [3] رائج کرنا۔ رواج دینا [4] تعلیم۔ [5] صحیح اور اصلی قانون۔ [6] بتدریج۔ آہستہ آہستہ [7] نظریات۔ نظریہ کی جمع۔ رائے۔ خیال۔ تھیوری۔

[1] بچوں کی پھلواڑی۔ [2] بڑائی موٹائی۔ [3] معلوم ہونا۔ دریافت ہونا۔ [4] تصوف کا ایک مسئلہ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ دنیا میں صرف ایک ہی ذات موجود ہے اور وہ خدا کی ذات ہے۔ [5] تحفہ کی جمع۔ [6] کسی بات کو محسوس کرنے اور معلوم کرنے کی قوتیں۔ [7] ظاہر۔ [8] ہمیشہ رہنے والی خدا کی ذات۔ [9] سب کا سرچشمہ اور سب کا آخری ٹھکانا۔ [10] ترقی کے درجے۔

پنجاب کی بدقسمتی سے جلد ہی یہ صوبہ کنڈر گارٹن کے استادوں کے فقدان[1] سے اس نعمتِ عظمےٰ سے محروم ہوگیا مگر جرمنی میں آج تمام ملک میں کنڈر گارٹن اسکولوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے اور ہر ایک جرمن بچے کے لئے کنڈر گارٹن اسکول کی حاضری لازمی قرار دی گئی ہے۔

یہ مختصراً اُس ملک کی تعلیم کی تاریخ ہے جو اب تک تعلیم کو ترقی دینے اور فنِ تعلیم میں جدت طرازی اور اختراع[2] کرنے میں اوروں سے کبھی پیچھے نہ رہا۔ اور اب بھی باوجود اقتصادی کمزوری اور قومی شیرازہ بکھرنے کے تعلیمی منازل[3] ہمت اور استقلال کے ساتھ تیزی سے طے کر رہا ہے۔

آج جرمنی میں ۴۹ یونیورسٹیاں ہیں جن میں ۱۱۳۰۶۵۷ طلبا ہیں اور کُل آبادی ۶۲ ملین یا قریباً ۶ کروڑ ہے۔ اِدھر ہندوستان میں ۱۴ کروڑ آبادی کے لئے ۱۸ یونیورسٹیاں ہیں۔ تمام ریاستوں کی تعداد جو جمہوریت میں شامل ہیں ۲۶ ہے۔ اور محکمۂ تعلیم ہندوستان کی طرح سے ریاستوں ہی کو تفویض[4] کر دیا ہے۔ اور ہر ایک ریاست نے اپنی ضروریات کے مطابق نظامِ تعلیم میں لازمی ردوبدل کرلیا ہے۔

سرسی۔ وی رامن جب ولایت گئے تو سر رتھر فورڈ سے جامعہ[5] کیمبرج میں ملے۔ وہاں سرسی۔ وی رامن کو دیکھ کر بیحد حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر رتھر فورڈ کے شاگرد بیشتر اوقات کرکٹ یا ٹینس میں گزار دیتے ہیں اور صرف چند گھنٹے علمی تحقیقات میں صرف کرتے ہیں۔ اِس کے مقابلے میں جرمن طلبہ بیحد جفاکش اور محنت کے عادی ہوتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں موسم سرما میں صبح سات بجے سے رات کے نو اور موسم گرما میں صبح چھ سے رات کے نو بجے تک برابر کام جاری رہتا ہے۔

جنگ عظیم کے قبل جرمن قوم میں ایک ڈسپلن اور ضبط تھا جو اُن کا جزوِ زندگی بن گیا۔ یہی وہ تنظیم تھی جس نے عساکر[6] متحدہ کا چار سال تک جان توڑ مقابلہ کیا۔ اور اسی فوجی ضبط کی ادنےٰ مثال ہنڈن برگ لائن تھی۔ جنرل ہنڈن برگ کے عساکر سے زیادہ ضبط اور ڈسپلن کا نمونہ تمام یورپ پیش نہیں کرسکتا۔ دورانِ سفر میں ہر سپاہی کے لئے ٹرین کے وقت مقرر۔ گاڑی میں نشست کا نمبر معین۔ جس ہوٹل میں جاکر ٹھیرنا ہے اُس کا تعین۔ جس رستے سے گزرنا ہے اُس کا تعین غرض کہ ہر سپاہی کا کھانا پینا سونا لیٹنا سب متعین تھا۔ گویا وہ ایک انسان نہ تھا جو اپنی قوتِ ارادی سے کام لیکر آزادانہ روش اختیار کرسکتا ہو بلکہ ایک مشین تھا جس کی کل اُس کے افسر بالا کے ہاتھ میں تھی۔

ایسے ضبط کو فوجی ڈسپلن کہا جاتا ہے۔ اور ماہرین تعلیم کی نظر میں ایسے ڈسپلن کی کوئی وقعت نہیں۔ تعلیم کا اصلی مقصد اور معلم کا ضروری فرض طلبہ کی قوتِ ارادی کو صحیح راستے پر ڈالنا ہے نہ کہ بیجا اور بے موقعہ دست اندازی سے اسکو سلب[1] کر دینا یہ ممکن ہے کہ اس وقت جبکہ بچہ اسکول میں ہے معلم اُس کے ہر غلط اقدام[2] کی تصیح کر دے۔ مگر جب بچہ سنِ شعور کو پہنچا اور اُس نے دنیا میں قدم رکھا تو اُس وقت تک اگر اُس نے اپنی قوتِ ارادی۔ جذبات اور وجدانیات کو ایک صحیح سانچے میں نہیں ڈھال لیا تو اُسے ہر قدم پر لغزشیں اور ہر منزل پر ٹھوکریں کھانی ہونگی۔ اِسی وجہ سے معلم کا فرض ہے کہ طلبہ کی قوتِ ارادی کو ایک حد تک کام کرنے کی آزادی دیدے۔

جرمن قوم جو ضبط کی اتنی دلدادہ۔ اور آج سے نہیں ابدالآباد[3] سے۔ آپ لوتھر کے وعظ اُٹھاکر پڑھیں جن میں اُس نے گھریلو یا خانگی ضبط کی تلقین[4] کی ہوئی ہے۔ اور اس بات پر زور دیا ہے کہ کس طرح ہم گھروں میں ضبط قائم کرکے ملک اور قوم کی خدمت کرسکتے ہیں۔ مگر یہی قوم جب اپنے بچوں کو درسگاہوں میں بھیجتی ہے تو اُنہیں ہر طرح کھلے بندوں پھرنے کی اجازت دے دیتی ہے۔ کہ جہاں جی چاہے رہیں اور جہاں جی چاہے پڑھیں۔ اسی آزادی کا دلفریب نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ ایک حقیقی شیدائی علم کی طرح ایک جامعہ سے دوسری اور دوسری سے تیسری میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ایسی درسگاہ میں جاکر ٹک جاتے ہیں جو اُن کو اُن کے بلند ترین مطمح نظر[5] کے حصول میں سہولتیں بہم پہنچا سکے۔ دراصل یہی جامعوں[6] کی یگانگت اور طرزِ تعلیم کی ہمہ گیری[7] ہے جس نے جرمن تمدن کو یورپ کے لئے طرۂ امتیاز[8] بنا دیا۔

ہندوستان میں ایک جامعہ سے دوسری میں منتقل ہونا حیرت

---

[1] کمی۔ [2] ایجاد۔ [3] منزلیں اور درجے۔ [4] سپرد
[5] جامعہ یونیورسٹی، کُلیہ کالج۔ [6] جمع عسکر۔ فوجیں عساکر
متحدہ برطانیہ۔ اٹلی اور فرانس کی فوجیں۔

[1] چھین لینا۔ [2] اقدام۔ آگے بڑھنا پیش قدمی کرنا۔ [3] ہمیشہ ہمیشہ
[4] تعلیم۔ [5] مقصد۔ [6] یونیورسٹیوں۔ [7] سب تک
پہنچنا۔ [8] مراد۔ باعثِ فخر۔

وشبہ کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور جو مشکلات ہندوستانی طالب علم کو یونیورسٹی بدلنے میں پیش آتی ہیں وہ ناگفتہ[1] بہ ہیں۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہاں ایک جامعہ سے دوسری میں جانا بے مصرف سا بھی معلوم ہوتا ہے۔ جب ایک بے روح اور غیر دلچسپ یکسانیت ملک کی تمام درسگاہوں پر مسلط ہو رہی ہے تو طالب علم کو کیا غرض ہے کہ اپنے خویش و اقارب گھر بار کو چھوڑ چھاڑ ایک جامعہ سے دوسری میں بھٹکتا پھرتا رہے۔ لارڈ اروِن نے جامعہ دہلی کے جلسۂ تقسیم اسناد[2] میں جو تقریر کی تھی اُس کے الفاظ بھی اُنہیں مطالب[3] کے مترادف[4] ہیں۔

"ہر ہندوستانی یونیورسٹی کو چاہیئے کہ کم سے کم ایک فن میں لازمی تعلیمی آسائشوں کو مہیا کرے تاکہ ملک کے تمام طلبہ اُس فن کی تکمیل وہاں کر سکیں۔ اِس طریق سے بمبئی فنِ تجارت یا مہندسی[5] میں۔ کلکتہ فنونِ[6] لطیفہ میں بہت کچھ ملک اور قوم کی خدمت کر سکتے ہیں۔ اور اُس امدادِ باہمی کا اعلیٰ نمونہ پیش کر سکتے ہیں۔ جو مغربی درسگاہوں میں پائی جاتی ہے"۔

انہیں الفاظ کا مصداق آج جرمن یونیورسٹیاں بنی ہوئی ہیں۔ اور آج کسی جرمن یونیورسٹی میں ایسا طالب علم اکا دُکا ہی نکلیگا جس نے دو تین یونیورسٹیوں کے اساتذہ[7] کے سامنے زانوئے ادب طے نہ کیا ہو۔

ایک خاص نقص جس کو جرمن ماہرینِ تعلیم دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں یہ ہے کہ اُن نوواردوں کے لئے جو نئے نئے یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں۔ ایسی ہدایات اور رہنمائی کا انتظام کیا جائے جس سے اُنہیں زندگی کی صحیح شاہراہ پہ چلنے کی عادت پڑ جائے۔ جرمن یونیورسٹیوں میں فی الحال نہ تو کوئی مکمل جماعت بندی اور نہ مرتب لکچروں کا سلسلہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ہونہار مگر ناتجربہ کار بچوں کا بھٹکتے پھرنا اور تضیع اوقات کرنا قوم کے مفاد کے لئے کتنا مضر ہے؟ آج جرمنی کے لئے یہ سوال اتنا ضروری نہیں کیونکہ وہاں

---

[1] کہنے کے لائق نہیں۔ [2] ڈگریاں تقسیم کرنے کا سالانہ جلسہ۔ [3] مطلب کی جمع۔ [4] ہم معنی ایک جیسے۔ [5] انجینیری۔ [6] شاعری موسیقی۔ تصویرکشی وغیرہ کے فن فنون لطیفہ کہلاتے ہیں۔ [7] اساتذہ۔ استادان

تعلیم یافتہ طبقے میں بیکاری کی شکایت روز بروز بڑھ رہی ہے اِس سوال پر کبھی ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا گیا۔ ایک مرتبہ ناظم تعلیمات صوبۂ متحدہ نے بیکاری کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے ایک تجویز پیش کی تھی جو معقول اور قابلِ عمل معلوم ہوتی ہے۔

"تمام صوبے میں مختلف شہروں میں ایسے ادارے[1] کھولے جائیں جو والدین اور سرپرستوں کو مختلف علوم و فنون۔ سرکاری محکمہ جات۔ اور مغربی درسگاہوں۔ کی بابت صحیح معلومات بہم پہنچا سکیں۔ اور نوجوانوں کو پیشے کے انتخاب میں ایسا مشورہ دے سکیں جو پختہ کاری اور تجربہ کا نتیجہ ہو۔ اِن سب اداروں کا مرکز لکھنؤ میں ہو"۔

اِس تجویز کو پیش کئے ہوئے چند سال گزر گئے ہیں۔ مگر ہنوز اِس پر کوئی عمل درآمد نہیں کیا گیا۔ اور اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ بے روزگاروں کے اعداد[2] ترقی پر ہیں۔ اور قوم کا وہ بیش قیمت سرمایہ یعنی اس کے نوجوان عنصر کا قیمتی وقت بے مصرف گزرتا جا رہا ہے۔

جامعہ میں معاشرتی زندگی:۔ انگریزی یونیورسٹیوں کی طرح جرمن درسگاہوں میں طلبہ کی رہائش[3] پر کوئی پابندیاں نہیں ہیں۔ دار الاقامہ کی رہائش لازمی نہیں اور طلبہ بالعموم[4] یونیورسٹی سے باہر اپنے گھروں میں رہتے ہیں جو کنبہ دار تو ہوتے ہیں مگر عسرت[5] یا کسی دوسری وجہ سے طلبہ کو رہائش اور کھانا مہیا کر دیتے ہیں۔ ایسے خاندانوں کی فہرست یونیورسٹی کے ایک افسر کے پاس جس کو پیڈل کہتے ہیں بنی ہوئی رہتی ہے۔ یہ افسر طلبہ کو مناسب جائے رہائش بہم پہنچانے میں مدد دیتا ہے یہ سہولت انگریزی یونیورسٹیوں میں میسر نہیں ہے۔ جامعہ میں کئی طرح کی انجمنیں ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جو مختلف مضامین کے نام سے موسوم ہیں:۔

انجمن سائنس۔ انجمن ادب۔ انجمن تاریخ۔ دوسری صرف تفریحی انجمنیں۔

اِن انجمنوں کے اجلاس ہر ہفتے منعقد ہوتے ہیں۔ ایک ممبر کسی مضمون یا تقریر سے جلسے کا افتتاح[6] کرتا ہے۔ اس کے بعد کچھ ترنم سے کچھ گیت گائے جاتے ہیں اور یہ رائف کے لائحہ عمل[7] کا

---

[1] ادارہ۔ انسٹی ٹیوشن۔ [2] گنتی۔ [3] رہائش سکونت میں کثرتِ استعمال سے صحیح ہو گیا ہے (ایڈیٹر)۔ [4] عام طور پر۔ [5] تنگدستی [6] آغاز ابتدا۔ [7] پروگرام

آغاز ہوتا ہے جس کا انجام جو لی شراب کے جام پر جام لنڈھانے پر ہوتا ہے۔ نغمہ و سرود کے بعد مزاحیہ[1] تقریریں شروع ہوتی ہیں۔ اور جلسہ صبح کے تین یا چار بجے تک رہتا ہے۔ اِس کا بیشتر حصّہ مے نوشی اور خوش گپیوں میں گزرتا ہے۔ تعجب خیز امر یہ ہے۔ کہ بحث و مباحثہ کی انجمنیں اک سرے سے ناپید ہیں۔ یہی انجمنیں انگریزی درسگاہوں کا ایک ضروری جزو ہیں اور پارلیمنٹ کے بڑے بڑے مقرر بالعموم وہی لوگ ہوتے ہیں جو جامعہ آکسفورڈ یا کیمبرج میں یونین کے صدر یا معتمد[2] رہ چکے ہیں۔

مگر اہلِ جرمنی کا رویہ اِس بارے میں بالکل مختلف ہے۔ ایک دفعہ ایک پروفیسر نے جُوں تُوں کر کے ایک انجمن مباحثہ منعقد کر ہی دی۔ اُس میں بڑے بڑے اساتذہ نے حصّہ لیا۔ اور رات بھر بحث ہوتی رہی۔ ہر شخص منطقی دلائل سے اپنے نظریے کو پیش کرتا تھا اس کے مخالفین اُس سے بڑھ چڑھ کر دلیلیں پیش کرتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وقت ختم ہوگیا اور مناظرہ کرنیوالے کسی منطقی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔ اِس پر اِن انجمنوں کو جامعہ کی معاشرتی زندگی سے بالکل خارج کر دیا گیا۔ فی الحقیقت ہندوستان کے مذہبی مناظروں کے سلسلۂ لامتناہی[3] سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مباحثے میں بجائے تحقیق اور منصف مزاجی کے طرفین اپنی بات منوانے پر تُلے ہوتے ہیں اور بجائے منطق کے جذباتی پہلو زیادہ نمایاں ہوتا ہے پھر بھی ایک تعلیمی درسگاہ میں انجمن مباحثہ کی موجودگی اُن تمام قوتوں کو بھڑکاتی ہے جو آجکل کی جمہوریت کونسلوں اور مجلسوں میں قابلِ تحسین سمجھی جاتی ہیں اور اِس ایک پہلو سے اُن کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

خصوصیات:۔ جرمن کی درسگاہوں میں چند ایک خصوصیات ہیں جو دوسری جگہ اگرچہ بالکل مفقود[4] نہیں مگر پھر بھی بہت کم درجے پر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً پروفیسر کا لقب جرمنی میں ایک وقار اور شان رکھتا ہے اور اُس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ پروفیسر لوگ کبھی کسی سرکاری منصب یا عہدہ کے لئے درخواست نہیں دیتے۔ یہ اُن کے لئے باعثِ ننگ ہے۔ عہدے اور ملازمتیں ہمیشہ پیش کی جاتی ہیں۔ تاکہ وہ انہیں شرفِ قبولیت بخشیں۔

[1] ظریفانہ۔ [2] سیکرٹری۔ [3] سلسلۂ لامتناہی نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ [4] کم کم۔

موجودہ وزیرِ تعلیم ھمّا بیکر ہیں جو کسی زمانے میں عربی کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔

خبر گرو کی بھگتی[1] میں تو شاید جرمنی قدیم ہندوستان سے بازی نہ لے جا سکے۔ مگر اہلِ ملک کی جدتِ طبع[2] نے ایک نئی بات نکالی جو کم از کم آجتک تعلیمی دنیا میں عدیم المثال[3] ہے۔ اِس کی دھندلی سی شکل ہمیں امریکن درسگاہوں میں نظر آتی ہے جہاں ہر طالب العلم اپنے زورِ بازو سے کما کر اپنے تعلیمی اخراجات کا کفیل[4] ہوجاتا ہے۔ مگر جرمنی نے جو غریب طلبہ کی امداد کے لئے نئی تجویز نکالی ہے یہ وہی ہے جس کے ذریعہ سے ریفیسن نے گزشتہ صدی میں غریب کسانوں کو قرض کے ناقابلِ برداشت بوجھ سے رہائی دلائی اور جو آجکل انجمنِ اتحادِ باہمی کے نام سے موسوم ہے۔ ان انجمنوں کے معرضِ وجود[5] میں آنے کی وجہ جرمنی کا جنگِ عظیم کے بعد اقتصادی انحطاط۔ مارک[6] کی قیمت کا گھٹنا۔ ملک کی تجارتی اور صنعتی و حرفتی ترقی کی روک اور ادائیگی تاوانِ جنگ تھی۔ طلبہ نادار۔ گورنمنٹ غریب۔ اب مدد لیں تو کس سے لیں۔ اِسی بیکسی کی حالت میں پہلی تعلیمی انجمن امداد باہمی کی بنیاد ڈرسڈن میں فروری ۱۹۲۱ء میں ڈالی گئی۔ یہ آج ایک بہت ہی شاندار تحریک بن گئی ہے۔ اور اس کے بیشمار فرائض کی ادائیگی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ انجمن کی دکانیں طلبہ کی ہر ضروری اشیاء کو مناسب بلکہ کم قیمت پر مہیا کرتی ہیں۔ مثلاً بوٹ ۷۵ فیصدی قیمت پر مل سکتے ہیں۔ غریب طلبہ کو کپڑے نصف ہی قیمت پر مل سکتے ہیں۔ ہوٹل میں کھانا ۲۰ فیصدی قیمت پر میسر آجاتا ہے۔ طلبہ کو دوائیں بہم پہنچانا۔ غریب طالبعلوں کو موسم گرما کی چھٹیوں میں کسی کام پر لگوانا۔ قرض یا وظائف دینے انجمن کی مصروفیتوں میں سے چند ایک ہیں پانچ دار الاقامتہ (بورڈنگ ہاؤس) انجمن نے حکومت کی مالی امداد سے بنوائے ہیں تاکہ طلبہ کی رہائش کا سوال بآسانی حل ہو جائے۔ مگر سب سے دلچسپ اور مفید خدمت جو انجمن کر رہی ہے۔ یہ ہے کہ پرانے طلبہ سے کتابیں لیکر نادار طلبہ کو بہم پہنچاتی اور ممبران کو ٹائپ مشین مہیا کرتی ہے۔ یہ مشینیں ممبر اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ اور ٹائپ کا کام سیکھتے یا اجرت پر کام کرتے ہیں۔

[1] خدا کی عبادت۔ [2] طبیعت کی اُپج۔ [3] بے مثال۔ [4] ذمہ دار۔ [5] قائم ہونے۔ [6] جرمن کا ایک سکہ۔

انجمن کی فراخدلی اور وسعت نظری میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا ۔ اس اعلیٰ تنظیم سے نہ صرف آج جرمنی فائدہ اٹھا رہا ہے بلکہ دیگر اقوام بھی اس فیض سے محروم نہیں ہیں۔ گزشتہ سال انجمن نے ایک سو وظائف چینی طلبہ کے لئے مخصوص کئے تھے اور تین وظیفے ہندوستانی طلبہ کے لئے۔ ہندوستانی وظائف کے اعلان سب اخبارات میں شائع ہوئے تھے ۔ یہ وظائف میونچ یونیورسٹی کی طرف سے دئے گئے ہیں ۔ اور مفت خوراک اور رہائش کی شکل میں دئے جاتے ہیں۔

تیسری بات یونیورسٹیوں اور صنعت و حرفت کا وہ مضبوط رشتہ ہے جس نے ان دونوں کو یکجان و دو قالب بنا دیا ہے ۔ اسی رابطے کے بیش قرار نتائج ”آف زیپلن۔ رنگ سازی اور کیمیائی ادویات ہیں۔ اسی برتے پر جرمنی نئی سے نئی ایجاد و اختراع کرتا ہے اور اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ منڈی میں اپنے آپ کو اسے تجارتی طور پر کامیاب بناتا ہے ۔ جرمنی میں ٹکنیکل ایجادوں کی کثرت کی وجہ یہ ہے کہ اول تو صنعت و حرفت کی تعلیم ہی لازمی اور جبریہ قرار دے دی گئی ہے ۔ اس پر صنعتی کمپنیوں اور درسگاہوں کی امداد باہمی سونے پر سہاگے کا کام دے رہی ہے۔ یہی ایک بڑا سبق ہے جو اس ملک کے طریق تعلیم سے لیا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی نظام تعلیم محض ادبی اور کتابوں کی اوراق گردانی تک محدود ہے ۔ اہلِ حکومت جنہوں نے موجودہ طرزِ تعلیم کی بنیاد ڈالی ۔ اہلِ دفتر پیدا کرنا چاہتے تھے جو کمپنی بہادر کے منشی خانے کے فرائض سر انجام دیں ۔ وہ اپنے مقاصد میں بالکل کامیاب رہے مگر اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی تعلیم پر نادانستہ طور پر وہ ضربِ کاری لگا گئے کہ اس سے پچاس سال تک دشوار معلوم ہوتا ہے۔

نظامِ تعلیم میں اصلاح کا سوال بیکاری کی روز افزوں ترقی سے روز بروز زیادہ اہم ہوتا جاتا ہے۔ جتنی بیکاری کی کمیٹیاں مختلف صوبجاتی کونسلوں مثلاً بنگال ۔ مدراس ۔ یو۔پی ۔ پنجاب وغیرہ نے اس مسئلہ کی تحقیقات کے لئے مقرر کی ہیں سب اس بات پر متفق ہیں کہ تعلیم صنعت و حرفت کی طرف بچوں کا رجحان طبع کرایا جائے. کمیٹیاں بنیں ۔ اجلاس منعقد ہوئے ۔ شہادتیں لی گئیں۔ مگر عملاً ہنوز روزِ اول والا معاملہ ہے ۔ ابھی وقت ہے کہ رہنمایانِ قوم اس مسئلے کی اہمیت کو سمجھ لیں ۔ اور بجائے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے کے اس خطرے کا مردانہ وار مقابلہ کریں ۔

غزل

گل و نسریں سے رنگیں تر ہے ذوقِ رنگ و بو میرا
نمو پاتا ہے خوں سے لالہ زارِ آرزو میرا

فروغِ ماہ کی رنگینیاں باطل ہیں اے ساقی!
شرابِ آتشیں سے جگمگاتا ہے سبو میرا

چمن زادوں کے نغمے گونج ہیں میری نواؤں کی
چمن کے ذرے ذرے سے جھلکتا ہے لہو میرا

پہنچتا ہے مجھے انوار گاہِ بزمِ انجم تک
نقابِ لالہ و گل میں نہیں چھپتا نمو میرا

وہ عالم ہے کہ گردِ راہ روشن ہے تجلی سے
کہاں لایا ہے **عابد** مجھ کو ذوقِ جستجو میرا

زندگی

شمعِ سحر کے دل سے پوچھ حسرتِ محفلِ حیات — نیزۂ غم سے چاک ہے سینۂ ساحلِ حیات
آہ! یہ بیکسی تری۔ رہبر و منزلِ حیات — توڑ گئی قدم ترے قیدِ سلاسلِ حیات

ہے ابھی راہ میں لگی ظلمتِ شامِ زندگی

عشرتِ رنگ و بو کہاں گلکدۂ شباب میں — موجۂ آبجو کہاں چشمۂ آفتاب میں
مستِ تصورِ نشاط۔ گم ہے کہاں کے خواب میں — جامِ ہوس کو دور پھینک زہر ہے اس شراب میں

سلسلۂ الم کو توڑ۔ دامنِ زندگی کو چھوڑ

گوشۂ خامشی میں بھی غم سے نہ مل سکی نجات — عرصۂ زندگی رہا مورِدِ صد حوادثات
دفترِ رنج و یاس ہے شرحِ کتابِ کائنات — موت کی نیند کے سوا۔ کیا ہے تلافیٔ حیات

قیدِ الم ہے زندگی۔ دوزخِ غم ہے زندگی

صبح ہے صبحِ نامراد۔ شام ہے شامِ غم فروز — روز ہے روزِ حشر خیز۔ شب ہے شبِ الم فروز
طرزِ فلک جفا طراز۔ دورِ زمیں ستم فروز — دشمنِ خواہشات ہے۔ زندگیٔ عدم فروز

آہ! اسیرِ زندگی۔ زخمیٔ تیرِ زندگی

شاکیٔ بادِ غم رہی شمعِ حریمِ آرزو — محرمِ تیرگی رہی چشمِ کلیمِ آرزو
قلب میں تیر تار ہا نشترِ بیمِ آرزو — روح سے دور ہی رہی موجِ نسیمِ آرزو

بابِ اثر نہ مل سکا۔ غنچۂ دل نہ کھل سکا

نوکِ سنانِ یاس سے زخمِ ہوس سیا تو کیا — تلخیٔ صبر کا پہاڑ سر پہ اٹھا لیا تو کیا
روح کی خواہشات پر جبر اگر کیا تو کیا — دوزخِ غم خرید کر۔ آہ! کوئی جیا تو کیا

سلسلۂ الم کو توڑ۔ دامنِ زندگی کو چھوڑ

روشن صدیقی

ننّھا سوداگر

ابھی اُس کی عمر ہی کیا تھی۔ یہ تو وہ زمانہ تھا جب معمولی سی کڑی بات اُس کے نازک دل کی گہرائیوں میں اُتر کر اس درجہ راسخ ہو جاتی تھی کہ دم دلاسا مطلق کارآمد ثابت نہ ہوتا تھا۔ اُسے ابھی سے اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اُس کے دوسرے بھائی وہیں تعلیم پاتے تھے۔

وہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کی مالی حالت کچھ زیادہ طمانیت بخش نہ تھی، مگر تعلیم حاصل کرنا ضروری تھا۔ آمدنی کی کمی کی وجہ سے خواہ اُس کو ہزار طرح کی تکلیفات کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ مگر اپنے بھائی بہنوں کی طرح اُس کا مدرسہ جانا اور قدیم خاندانی روایات کو برقرار رکھنا ازبس ضروری تھا۔

دو باتیں اُس کے دل سے کبھی محو نہیں ہو سکتی تھیں۔ ایک یہ کہ گھر میں روپیہ اسقدر کافی نہ تھا کہ خود وہ اور اُس کے بھائی بہن وقت پر کوئی ضروری کتاب خرید سکیں۔ دوسرے یہ کہ جبتک کپڑوں میں کثافت کی وجہ سے تعفن نہ پیدا ہو جائے اور وہ جگہ جگہ سے چاک ہو کر خود ہی زبانِ حال سے فریاد نہ کرنے لگیں اُن کا تن سے جدا ہونا دشوار تھا۔

وہ دن اُس کی یاد سے کبھی نہیں مٹ سکتا جب وہ ایک ایسا کوٹ زیبِ بدن کر کے اسکول بھیجا گیا تھا جس میں اُس کی بڑی بہن کی چھین اور بیل سے بچی ہوئی آستین لگی ہوئی تھی۔ اور پیر میں سینڈل ایڑی کے زنانے جوتے تھے۔ اس سے کیا کہ وہ اُس وقت بالکل ہی بچہ تھا، اور مدرسہ میں لڑکوں کی تعداد بھی زیادہ نہ تھی۔ فرض کیجئے وہ بڑا ہوتا اور لڑکوں کی تعداد بھی کافی ہوتی، لیکن پھر بھی یہ باتیں اسی سہولت کے ساتھ عمل میں آ سکتی تھیں۔ وہ محسوس کرتا کہ بعض لڑکے اُسکو اِس حالت میں دیکھ چکے ہیں۔

حامد ہی کو لیجئے۔ ظہیر کی طرح کلائی مروڑ دینے کی اُس کو مطلق پروا نہ تھی بلکہ وہ اِس سے زیادہ تکلیف دہ اندازِ بیان سے واقف تھا۔ رنج کے معاملات جن کا اُس سے کچھ تعلق نہیں ہوتا تھا وہ اِس قدر کھود کھود کر دریافت کرتا تھا کہ پناہ بخدا۔ پھر یہ نہیں کہ ایک بات کا جواب پاکر خاموش ہو جائے۔ یہ اُس کی خصلت میں داخل نہ تھا، بلکہ بات میں بات نکالنا اُس کی عادت بن چکی تھی۔ وہ طرح طرح سے حرف حرف پر اُس کی زبان پکڑتا اور اُس کو زک پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔ حامد نے اُس کو کبھی سیدھی طرح مخاطب نہیں کیا۔ ہمیشہ "تو" ہی سے بات کی۔ اُس کے لباس، کتاب، قلم دوات غرضیکہ ہر ایک چیز پر اعتراض کیا۔

وہ اِن تمام باتوں کا مجرم اپنے ماں باپ کو گردانتا تھا۔ جو اُس وقت اُس کو ایسی شرمناک زندگی بسر کرنے پر مجبور کر رہے تھے اپنے باپ اور پیاری ماں پر روپیہ کی کمی کا الزام اِس طرح رکھتے ہوئے اُس کا بھولا سا معصوم چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اُس کو تکلیف ہوئی کہ کیوں ایسے گندے خیالات اُس کے دل میں پیدا ہوئے۔ مگر اِس کو کیا کیا جائے اُس کی موجودہ خستہ حالت اُسے مجبور کرتی تھی۔ کہ وہ اپنی .... خیالی باتوں پر قائم رہے۔

اِس قسم کے خیالات جب اُس کے دماغ میں پیدا ہوتے تو وہ اپنی آنکھیں زور سے بھینچ لیا کرتا تھا تاکہ وہ کسی طرح نکل جائیں۔ لیکن اِس میں اُس کو کبھی کامیابی نہیں ہوئی یہی وجہ تھی کہ کبھی کبھی اُس کو حامد کی باتوں کا بھی یقین ہو جایا کرتا تھا، کہ وہ اُس کے متعلق جو یہ کہتا کہ "اُس کی زندگی چوہے سے بھی بدتر ہے۔ اور اُس کو چاہیئے کہ کسی تالاب میں ڈوب کر مر جائے" صحیح ہے۔

اُس نے اکثر خودکشی کا ارادہ کیا، مگر ہر مرتبہ موت طرح طرح کی خونخوار صورتیں بنا بنا کر اُس کے سامنے آموجود ہوئی۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ گویا کوئی عقب سے ہاتھ پکڑ کر ایسا کرنے سے منع کرتا ہے۔ اُس کو ہر مرتبہ اپنی بزدلی کا احساس ہوتا اور اب وہ اپنے سے نفرت کرنے لگا تھا۔

وہ اسکول سے واپس آ رہا تھا آج خلافِ معمول اُس کے جیبے کو جلد چھٹی مل گئی تھی۔ وہ خوش تھا۔ چلتے چلتے اُس نے اپنی جیب کو ٹٹولا۔ اُسی جیب کو جس کے متعلق اُسے یقین تھا کہ اِس میں کوئی سوراخ نہیں ہے۔ کئی روز ہوئے اُس نے دو پیسے اِس میں ڈالے تھے۔ اُن

کا دل بیٹھ گیا۔ اس پر ایک خوف سا طاری ہونا شروع ہوا جیب میں اتنا بڑا سوراخ موجود تھا کہ پیسے ڈالے چلے جاؤ اور پتہ نہ چلے۔ وہ رُک گیا۔ بدن تھر تھرا رہا تھا۔ چاہتا تھا کہ اسکول واپس جائے اور راستے میں پیسوں کو تلاش کرے۔ اِس ارادے سے وہ دو ایک قدم پیچھے ہٹا۔ لیکن اگر نہ ملے؟ .... اُس کا بڑا بھائی محمود ابھی مدرسہ ہی میں ہوگا، اُس کے پاس ایک آدھ آنہ ضرور نکل آئیگا۔ کاش وہ ایک ہی پیسہ دیدے۔ اِس پیسے کی مونگ پھلی شام کے ناشتے کے واسطے کافی ہوگی۔ مگر یہ محمود کے ساتھ بے انصافی ہے۔ ممکن ہے وہ یکے پر گھر جانا پسند کرے۔ دو تین پیسے صرف ایک ہی آدمی کا کرایہ ادا کر سکتے ہیں۔

مگر کیا یہ سچ ہی کہ اُس کے دونوں پیسے گر گئے؟ ایک امید موہوم کے سہارے پر اُس نے دوبارہ نہایت احتیاط کے ساتھ اپنی جیبوں کی تلاشی لی۔ دنیا اسکو پھر اپنی اصلی حالت پر نظر آنے لگی۔ دونوں پیسے جیب میں موجود تھے۔ یہی نہیں بلکہ اب اُسے وہ چونی بھی یاد آگئی جو اُس نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر جمع کی تھی، اور حفاظت کے خیال سے اوپر کی جیب میں رکھ چھوڑی تھی۔

ایک چونی! سولہ پیسے!! چار آنے!!! یہ یقیناً ایک کارآمد رقم تھی۔ مدرسے میں ایسے لڑکے بھی تھے جنہیں اسقدر رقم روزانہ خرچ کے لئے ملا کرتی تھی۔ نویں یا دسویں کلاس کے لڑکوں سے مطلب نہیں۔ خود اُس کے ہم جماعت روز اسقدر پیسے خرچ کر ڈالتے تھے۔ کلیم اللہ، جس کو بگاڑ کر لڑکوں نے "کلا" کر دیا تھا، اُس کے ساتھ پڑھتا تھا۔ وہ چوک کے ایک بڑے ہوٹل کے منیجر کا لڑکا تھا۔ اس کی جیب میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی کھانے کی مزیدار چیز ہوا کرتی تھی۔ اُس نے دو ایک مرتبہ کوشش بھی کی کہ کسی طرح کلیم سے دوستی پیدا کرے۔ مگر اُس نے التفات نہ کیا۔ کلیم سے دوستی پیدا کرنے کی ہر کوشش پر اُس کا ضمیر اُسے ملامت کرتا تھا۔ اِس لئے کہ اُس کا ارادہ طمع پر مبنی تھا کہ شاید کسی روز اُسے بھی ناشتے میں شریک ہونے کی دعوت دیجائے۔ اب وہ خوش تھا کہ اس "پیام محبت" کو یوں ٹھکرا دیا گیا۔

(۲)

وہ یہی سوچتا سوچتا چوک سے بہت آگے نکل آیا۔ سامنے کباڑیوں کی دوکانیں تھیں۔ اُس نے خیال کیا کہ کچھ دیر انہیں میں تلاش کیا جائے۔ اپنے والد سے کبھی سنا تھا کہ بانکی پور والے خدابخش مرحوم کو اسی طرح ایک پنساری کی دوکان پر کتابوں کے ڈھیر میں سے چند نہایت بیش قیمت کتابیں جن میں قلمی نسخے بھی تھے، ہاتھ لگ گئی تھیں۔ کیا تعجب ہے کہ اُسے بھی کوئی قیمتی کتاب تلاش سے ملجائے۔ کیا اخبارات آئے دن اِس قسم کے قصّوں سے پُر نہیں ہوتے کہ کسی شخص نے کوئی کتاب نہایت معمولی قیمت پر خرید کرنے کے بعد اُسے فروخت کر کے اپنی زندگی بنائی ہو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اُس کی سوئی ہوئی قسمت بھی اسیطرح نہ جاگ اُٹھے، اور اُس کو بھی گودڑی میں لعل نہ مل جائے۔

شہر کا یہ حصّہ "منڈی" کہلاتا تھا۔ ہر قسم کی چیزیں بکفایت فروخت ہوتی تھیں۔ ایک دوکان پر پھلوں کا انبار رکھا تو سامنے مٹھائی والے کی دوکان تھی اور دوسری جانب ایک بسکٹ والا طرح طرح کے بسکٹ سامنے رکھے بیٹھا تھا۔ یہاں داخل ہوتے ہی اُس کا دماغ اُن تمام اشیاء کی خوشبوؤں سے مہک اُٹھا۔ وہ اپنے دل پر جبر کر کے ہر ایک کے سامنے سے گزر رہا تھا، مگر بسکٹ والے کی دوکان کا منظر کچھ اسقدر دلآویز تھا کہ وہ اپنے دل میں پیسوں کا حساب کرنے پر مجبور ہوگیا۔ طرح طرح کے ہندوستانی اور ولایتی بسکٹوں کے ٹکڑے مختلف ڈھیروں میں لگے ہوئے تھے۔ سوچتے سوچتے، آخرکار اُس نے جیب سے اکنّی نکالکر دوکاندار کے سامنے ڈالدی، اور دو تین ڈھیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سب میں سے تھوڑا تھوڑا دینے کو کہا۔ دوکاندار نے سودا تول کر اُس کے حوالے کیا،

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ اُدھر روانہ ہوا جہاں "عقلمند اور خوش قسمت" انسانوں کے واسطے "خزانہائے بے بہا" جمع تھے۔ بھیڑ اسقدر زیادہ تھی کہ اس کو ذرا سا فاصلہ طے کرنے میں سخت دقّت کا سامنا ہوا۔ مگر آخرکار وہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کی ٹانگوں کے بیچ میں سے نکلتا ہوا کباڑیوں کی دوکانوں تک پہنچ ہی گیا۔ یہاں ایک دوکان پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کتابوں کے ایک ڈھیر کے درمیان خونخوار بھیڑیے کے مانند بیٹھا ہوا تھا۔

طب، فقہ، اور فلسفہ کی کتابیں، اور پرانے پھٹے ہوئے ناول ہر چہار طرف ایک بے ترتیبی کے عالم میں پڑے ہوئے تھے مگر وہ اِن چیزوں کی قدر کرنے سے ہنوز قاصر تھا۔ اُس کی

نگاہیں صرف اسکولی کتابوں کی تلاش کرتی تھیں ۔ ایک زحمت کا سامنا تھا ۔ کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار جاتا ، مگر وہ حد درجہ ثابت قدمی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہا ۔ اور آخر اپنی محنت کا پھل حاصل کر کے چھوڑا ۔ وہ اِس علم اور فن کے "انبار" سے ایک کتاب لے کر برآمد ہوا ۔ جغرافیہ کا نسخہ اُس کے نزدیک نہایت بیش قیمت تھا ۔ بجز اِس کے کہ سرورق پر نہایت بھونڈے خط میں کتاب کے پہلے مالک کا نام تحریر تھا ، اور کوئی بات ایسی نہ تھی جو اُس کے بالکل نئے ہونے پر دلالت نہ کرتی ہو ۔ کتب فروش نے اُس کی قیمت ڈیڑھ آنہ بتائی ۔ اور قبل اِس کے کہ دوکاندار اپنے الفاظ سے پھر جانے کا قصد بھی کرے ، قیمت اُس کے سامنے ڈال دی گئی ۔ مگر اب اُس کے دل میں ایک خوف پیدا ہونا شروع ہوا کہ مبادا کتاب کے بیچ سے چند صفحات غائب ہوں ۔ اُس کے ہاتھ کتاب کی ورق گردانی کے وقت کانپ رہے تھے ، مگر یہ خوف بے بنیاد ثابت ہوا ۔ کتاب ہر طرح سے مکمل تھی ۔

وہ روانگی کا قصد کرتے ہوئے کتابوں پر ایک آخری نظر ڈال رہا تھا کہ اتفاقاً ایک گوشے میں چکر ورتی کے "علم الحساب" پر نظر جا پڑی ۔ وہ بے قرار ہو کر اُس کی طرف بڑھا ۔ ڈیڑھ آنے پیسے اور دیکر کتاب بغل میں دبا چلتا ہوا کہ اگر زیادہ دیر کھڑا رہا تو بقیہ دو پیسے بھی کتاب والے کی نذر ہو جائیں گے ۔

یکوں کے اڈے کے مقابل سے گزرتے ہوئے اُس کا دل ڈانواں ڈول ہو چلا تھا کہ بقیہ دو پیسے بھی صرف کر ڈالے ، اور گھر آرام سے پہنچے ۔ لیکن بالآخر یہ سوچکر کہ اگر ان خریدی ہوئی کتابوں کے فروخت کرنے کی کوئی صورت نہ نکل سکی تو وہ بالکل تھک ہو جائیگا ، اُس نے یہ خیال ترک کر دیا ۔

چوک پہنچکر جس دوکان میں وہ داخل ہوا اُس کا مالک ایک کریہہ المنظر (بدشکل) انسان تھا ۔ اُس نے کتابوں کو دیکھنے کے واسطے اپنی عینک ناک کے بالکل آخری حصہ پر رکھ لی اور نہایت بے پروائی کے ساتھ کتابوں کے سرورق کا ملاحظہ کیا ۔ اُس کے چہرے کا انداز بد سے بدتر ہوتا جا رہا تھا ۔ اور آخر کار بغیر کچھ کہے سُنے کتابیں واپس کر دیں ۔ غریب کا دل بیٹھ گیا ، اور وہ سوچنے لگا کہ غالباً یہ دونوں کسی کام کی نہ تھیں جبکہ "چکر ورتی" تک دوکاندار کی توجہ اپنی طرف منعطف نہ کرا سکی ۔

وہ سڑک پر کتابوں کو سینے سے لگائے ہوئے پریشان کھڑا تھا ۔ سامنے ایک دوسرے کتب فروش کی دوکان تھی ، وہ اندر جانا چاہتا تھا ۔ مگر یہ خیال کر کے رُک جاتا کہ شاید کتاب والے نے اُسے ہم پیشہ کی دوکان میں جاتے اور جوں کا توں واپس آتے دیکھا ہو ، مگر پھر اُس نے ہمت سے کام لیا ، اور ایک جست میں اندر داخل ہو گیا ۔ ایک لالہ جی ٹاٹ کے ٹکڑے پر آلتی پالتی مارے اس شان سے بیٹھے تھے کہ گویا ایرانی قالین پر جلوہ فرما ہیں ۔ گرمی کے سبب بدن پر بجز ایک میلی دھوتی کے ، جو جگہ جگہ سے چاک نظر آتی تھی ، اور کچھ نہ تھا ۔ پیٹ کی جسامت ، اُن کی عادات ، اور چربی پیدا کرنے والی غذا کے استعمال کی طرف اشارہ کر رہی تھی ۔ اِس نووارد کو دیکھ کر اُنہوں نے اپنی نگاہ اوپر اٹھائی اور کتابوں کو لالچی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے لینے کو ہاتھ بڑھا دیا ۔ ہر طرح سے بغور معائنہ کرنے کے بعد ، لالہ جی نے ایک ہاتھ سے اپنا منڈا ہوا سر کھجلاتے ہوئے اور اُن چند بالوں کو جو حجام کی دستبرد سے بچا لئے گئے تھے دو انگلیوں سے مروڑتے ہوئے دونوں کتابوں کی قیمت بعینہ وہی تجویز کی جتنے کی وہ خریدی گئی تھیں ۔ اُس وقت یہ ننھا سوداگر بالکل ہراساں نہ ہوا ۔ اُس کو یہ معلوم ہو گیا کہ اِس کی پسند بُری نہ تھی ۔ کتابیں فروخت کیجا سکتی ہیں ۔ زیادہ دام اس کو نہ ملیں ، نہ سہی ۔ وہ یہاں واپس آ کر اپنی خرچ کی ہوئی رقم پھر حاصل کر سکتا تھا ۔

وہ سڑک پر نہایت احتیاط کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھتا چلا جا رہا تھا ۔ تین آنے کی آواز اب تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی ۔ تھوڑی دیر کے واسطے اُس کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اِس سے زائد اِن کی قیمت وصول ہونا دشوار ہے ۔ مگر اُس کے دل نے گوارا نہ کیا کہ اسقدر زحمت اٹھانے کے بعد اُن سے کچھ فائدہ حاصل نہ کیا جائے ۔ اِس کے علاوہ سامنے والے نکڑ پر ابھی حال ہی میں دو نوجوانوں نے ایک نئی دوکان کھولی تھی ۔ سُنا جاتا تھا کہ بشرط پسند وہ ہر کتاب کو نصف قیمت پر خرید لیتے تھے ۔ ممکن ہے اُس کو وہاں کامیابی ہو ، اور اگر وہ ناکامیاب رہا تو تین آنے کہیں نہیں گئے ۔

وہ دوکان پر پہنچا تو ایک بھیڑ لگی تھی ۔ ہر طبقہ کے لوگوں کا اژدہام تھا ۔ بعض لوگ کتابیں فروخت کر رہے تھے تو چند خریدنے کی غرض سے کھڑے تھے ۔ دونوں حصہ دار باری باری سے ہر ایک شخص سے مخاطب ہو رہے تھے ، آخر کار اُس کا نمبر بھی آیا

اُن میں سے ایک آدمی ننھے سوداگر کی طرف متوجہ ہوا۔ اور آنے کی وجہ دریافت کی۔ جواب میں اُس نے دونوں کتابیں آگے بڑھا دیں۔ دکان والے نے ایک سرسری نظر اُن پر ڈالی اور کہا "چکروَرتی مجھ کو نہیں چاہیئے۔ اِس دوسری کتاب کی قیمت تین روپے ہے۔ میں ڈیڑھ میں خرید لونگا۔"

(۳)

وہ پھر باہر سڑک پر کھڑا تھا۔ ڈیڑھ روپیہ اُس کے کوٹ کی اوپر والی جیب میں بحفاظت موجود تھا۔ اور مکان صرف پانچ منٹ کے راستے پر۔ یہ سب اُس کی حکمت عملی کا نتیجہ تھا۔

پہلے تو اُس نے یہ خیال کیا کہ دوبارہ "منڈی" میں جاکر اپنی قسمت آزمائی کرے۔ مگر اب اُسے بھوک معلوم ہورہی تھی۔ ساڑھے چار بج رہے تھے۔ اگر جلدی نہ کیگی تو محمود اس سے قبل مکان پہنچ جائیگا۔ اور پھر اُس کو دقت کا سامنا ہوگا۔

وہ اپنے خیالات میں غرق ہورہا تھا کہ کاش یہ چوبیس آنے، چوبیس روپیہ ہوتے، کہ وہ اپنی ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر اُس کو پیار کرتا۔ اور تمام روپیہ اُس کی گود میں ڈالدیتا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُس وقت وہ کن الفاظ میں اس کو مخاطب کریگی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوجائینگی۔ اور وہ اس کو گود میں اٹھاکر گلے سے لگالیگی۔

مگر یکایک اُس کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اب اُس کے کاندھے پر کسی نے تحکمانہ انداز سے اپنا ہاتھ رکھدیا۔ یہ ظہیر تھا جو اُس کو چاروں طرف گھماگھماکر سر سے پیر تک بغور دیکھ رہا تھا۔ غصے کے آثار اُس کے چہرے سے نمودار تھے۔ اُس نے اپنا بدصورت چہرہ اُس کے منہ کے قریب لاکر کہا "حضرت! یہ آپ یہاں کیا کررہے ہیں؟ اور اِس وقت!"

سوال اِس پیرایہ میں کیا گیا تھا گویا اُس کو کسی جگہ کچھ کرنے کا حق حاصل نہ تھا۔ اور ممکن ہے کہ اسکول کے باہر ظہیر سے دوچار ہوجانا اسکول کے قوانین کے خلاف ہو۔ وہ یہ سب باتیں دفعتاً بھول گیا۔ ظہیر کی انگلیاں اُس کی کمزور گردن میں گڑی جارہی تھیں اُسے غصہ آرہا تھا کہ ظہیر کو اِس طرح سر راہ کسی کو پکڑ لینے اور فضول سوالات کی بوچھار کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟

"کیا بھوک میں زبان چبا گئے۔ جو نہیں بولتے ہو؟" یہ اُس کا دوسرا سوال تھا۔

اُس نے مڑکر دیکھا۔ سڑک اُس وقت فی الجملہ خالی تھی۔ جو کچھ راہ گیر تھے بھی اُن کو اُس کی مطلق پروا نہیں تھی کہ یہ کیا ہورہا ہے۔ عرصہ ہوا جب وہ اِس بات کا تجربہ کرچکا تھا کہ دنیا کو مظلوم کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔

سڑک پر، اور اسکول میں مار کھانے میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ یہ ایسی سزائیں تھیں جن کی اپیل نہیں ہوسکتی تھی۔ اور کسی سوال کی گنجائش نہ تھی۔ "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس" والا مضمون تھا۔

یکایک اُس کے دماغ میں اپنی کامیابی کا خیال دوڑ گیا۔ اور اُس کے غصہ میں اضافہ ہوگیا۔ کہ یہ بے عقل ایک کامیاب "سوداگر" کے ساتھ اِس قسم کا سلوک روا رکھ رہا تھا۔ خوف اُس کے دل سے دور ہوگیا۔ اُس نے مڑکر ایک گھونسا ظہیر کی ناک پر رسید کیا۔ حملہ اِس قدر اچانک تھا کہ ظہیر کے مضبوط ہاتھ سے اُس کی گردن چھوٹ گئی۔ اور وہ اُس کے پنجہ سے نکل بھاگا۔ مگر تھوڑی دور چلکر اُس نے اپنی رفتار سست کردی۔ اور دیکھنے لگا کہ ابھی تعقب شروع ہوا یا نہیں۔

ظہیر کو مار کر اُس نے مدرسے کے "پاک" قوانین کی خلاف ورزی کی تھی۔ اپنے سے بڑے پر ہاتھ اُٹھانے کا اُس کو حفاظتِ خود اختیاری میں بھی حق حاصل نہ تھا۔ اُس کو اپنے بھاگنے اور بزدلی کا اظہار کرنے پر شرم محسوس ہورہی تھی۔ اِس لئے اُس نے اپنی رفتار سُست کردی۔ اور جوتے کے فیتے باندھنے کے بہانے عرصہ تک وہاں کھڑا رہا۔ آخرکار ظہیر اُس کے سر پر آگیا۔

تیزی کے ساتھ وہ اُس کی گرفت سے نکل گیا۔ مگر بھاگا نہیں۔ اُس نے سامنے کھڑے ہوکر مقابلہ کیا۔ کچھ دیر کے واسطے ظہیر کا دماغ چکرا گیا۔ اُس کو تعجب تھا کہ اتنے سے ننھے کو اُس پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کیونکر ہوئی۔ اب اُس نے اپنی پوری طاقت سے اُسکو مارنا شروع کیا۔ چھوٹے لڑکے کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاگیا۔ مگر اِس پر بھی اُس کے دماغ میں ایک خیال تھا۔ اور وہ ظہیر کو مارنے کا جس کی تعمیل اُس کے کمزور ہاتھ اب بھی نہ کرسکتے تھے۔

اب وہ بالکل بے دم ہوچکا تھا۔ یہ تمام آدمی اُس کے گرد کیوں جمع تھے؟ سڑک پر معمولی شریر لڑکوں کی طرح لڑنا سخت حیاسوز تھا۔

اُس نے اپنے رہے سہے حواس کو جمع کیا۔ کوئی ہمدرد انسان اُس کو ہاتھ پکڑ کر اُٹھا رہا تھا، اور رومال سے ہونٹوں پر لگا ہوا خون پونچھ رہا تھا۔ سامنے ظہیر ایک شریف صورت شخص کی گرفت میں کھڑا تھا۔ اُس کا چہرہ حد سے زیادہ زرد تھا۔ "تم کو شرم نہیں آتی کہ اپنے سے چھوٹے لڑکے کو اس طرح مار رہے ہو۔ جی میں تو آتا ہے کہ تم کو بھی اسی طرح درست کیا جائے۔" یہ الفاظ جو اُس کو سنائی دیئے اور وہ اُٹھ بیٹھا۔

لوگوں نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ظہیر رہائی کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا، مگر وہ ایسے چنگل میں پھنسا کہ نکلنا دشوار تھا۔ تین برس سے وہ اسی طرح اپنے سے چھوٹوں کو زد و کوب کیا کرتا تھا، اور ہر شخص نے ہمیشہ اُس کا ساتھ دیا۔ مگر آج یہ نئی بات تھی کہ تمام آدمی اُس کے خلاف نظر آ رہے تھے۔ اور اُس کے مقابلے میں ایک کمزور کی حمایت کی جا رہی تھی۔ آخرکار اُس کو ایک دھکا دیکر نکال دیا گیا۔

کوئی شخص ہاتھ میں چند روپے دیتے ہوئے ملائمت کے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "یہ روپے تمہاری نئی کتابیں خریدنے کے لئے ہیں۔ تمہاری کتابیں بالکل بیکار ہو گئی ہیں؟"

وہ فخریہ انداز سے اُٹھا، اور چلنے کا ارادہ کیا۔ بھیڑ نے نکلنے کے لئے اُسکو جگہ دیدی۔ وہ بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اُسکی آنکھیں آنسوؤں سے پُر تھیں۔ اور رو رہا تھا۔ وہ شرم سے پسینے پسینے ہو گیا تھا۔ ایک گوشے میں جا کر اُس نے آنسو پونچھنے چاہے، مگر وہ کسی طرح بند نہ ہو سکتے تھے۔

آخر ایسے روپیہ سے کسی کو کیا حاصل جب اُس کا نتیجہ رونے کی صورت میں نکلے۔ وہ بہت سوچتا تھا مگر وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ مینہ برس کر کھل جانے کے بعد جس طرح تمام کائنات میں ایک سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اُس نے بھی اپنے آپ کو مطمئن پایا۔ وہ ایک شیرنی والے کی دوکان کے نزدیک کھڑا ہوا تھا۔ دو قدم آگے بڑھکر دوکاندار سے کہنے لگا "کیوں جی! آٹھ آنے کی تو بہت سی مٹھائی آتی ہوگی؟"

(ماخوذ)

حفیظ الرحمٰن

غزل

سُندر مُکھ ہے پریم ٹھکانا

میں نے سُکھی جگ میں پہچانا — ہے سُکھ ناشی لگن لگانا
دور سکھی ری نین ملانا — سنگ پیا کے کبھی نہ جانا

سُندر مُکھ ہے پریم ٹھکانا

ڈال میں جب تک پھول لگا ہے — تازہ تازہ ہرا بھرا ہے
جب وہ کسی کے جی کو بھایا — ڈال سے ٹوٹا ہاتھ میں آیا
ہاتھ کے لگتے ہی مرجھایا

اپنے من میں ہر ہر گانا — پریم بھجن سے جی بہلانا
سنگ پیا کے کبھی نہ جانا — ہے سُکھ ناشی لگن لگانا

سُندر مُکھ ہے پریم ٹھکانا

مقبول احمد پوری

پہلا جنتی

افرادِ مجلس

ہیوم .... قدیم یونان کا ایک فلسفی۔ عمر ساڑھے تین سو سال۔
کیٹی .... ہیوم کی بیوی
نینسی .... ہیوم کی ہفت سالہ لڑکی۔
ولسن .... ہیوم کا لڑکا۔
نعمان .... ہیوم کا بیوقوف شاگرد۔

چند دیگر شاگرد

عزرائیل .... رُوح قبض کرنے والا فرشتہ۔

وقت .... صبح آٹھ بجے
مقام .... ہیوم کے مطالعہ کا کمرہ

سین

ایک بڑی میز کے چاروں طرف چند کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔ میز کے ایک طرف کرۂ ارض اور مقیاس الساعت[1] رکھا ہے۔ دوسری طرف چند کتابیں رکھی ہیں۔ ہیوم درمیانی کرسی پر بیٹھا مطالعۂ کتب میں مشغول ہے۔

ہیوم۔ (کتاب کے اوراق پلٹتے ہوئے) سخت تعجب ہے! سمجھ میں نہیں آتا کہ اس معمولی سے فقرے کا مطلب شاگردوں کو کیا بتاؤں۔ کامل ایک ہفتہ غور و خوض کرتے گزر گیا۔ لیکن ہنوز روزِ اول ہے۔ کیا میں اپنے شاگردوں سے کہدوں کہ وہ ایک ایسا اسرار ہے جس تک ادراکِ انسانی کی رسائی نہیں؟ لیکن نہیں۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ میں ایک مشہور فلسفی ہوں۔ مؤرخ ہوں۔ سائنسداں ہوں۔ میری دماغی اور ذہنی قابلیت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھ چکا ہے۔ اسطرح میرے وقار میں فرق آجائیگا۔

نعمان اندر داخل ہوتا ہے۔ اُس کے ایک ہاتھ میں ٹوپی ہے اور دوسرے میں قینچی۔

ہیوم۔ (اپنے خیال میں محو ہے) اگر یہ مناسب نہیں ہے تو کیا میں

---

[1] زمانۂ قدیم میں وقت معلوم کرنے کا ایک آلہ ہوتا تھا۔ جس کے نچلے حصہ میں پانی اور اوپر کے حصہ میں ایک مقررہ مقدار اناج کی ڈالدی جاتی تھی جس کا ایک دانہ خاص وقفہ سے ایک سوراخ کی راہ پانی میں گرتا جاتا تھا۔ تمام اناج ختم ہونے پر ایک گھنٹہ شمار ہوتا تھا۔

اصلی حقیقت اُن کے گوش گذار کردوں؟ کیا اُن سے صاف
کہہ دوں کہ شہر بابل کی فصیل پر کندے ہوئے فقرے میں "عالمِ غیر فانی"
سے مراد وہ مقام ہے جہاں ہم سب کو مرنے کے بعد جانا ہے۔
اور اُس عالم کے دو مختلف حصّے "جنّت" اور دوزخ کے نام
سے موسوم ہیں۔ آسمانی مخلوق ملائکہ کہلاتی ہے۔ ہم سب کو پیدا
کرنے والی ہستی کا نام خدا ہے؟

نعمان۔ آپ میری بات نہیں سنیں گے؛ مجھے ایک روپیہ کی سخت
ضرورت ہے۔

ہیوم۔ (توجہ نہیں کرتا) لیکن یہ بھی ناممکن ہے مجھے کامیابی نہیں
ہو سکتی۔ کیونکہ میں اپنے غیر فانی نظریے اور زبردست استدلال
سے لوگوں کی عقلوں پر پردہ ڈال چکا ہوں۔ انہیں گمراہ کر چکا ہوں
اپنے فلسفہ کی تعلیم سے سب کے یہ بات ذہن نشین کر چکا ہوں
کہ خدا کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ جنّت و دوزخ اور ملائکہ کے بھی منکر
ہو چکے ہیں۔ اب بالکل متضاد بیان سُن کر وہ ضرور مجھ کو خبطی
سمجھیں گے۔

نعمان۔ بہت دیر ہو گئی۔ (عاجزی سے) مجھے ایک روپیہ
دیدو۔

ہیوم۔ بیوقوف نعمان جا۔ مجھے پریشان نہ کر۔

نعمان۔ تم مجھے بیوقوف تصوّر کرتے ہو۔ لیکن یاد رکھو۔ میری ہستی
تمہارے لئے کارآمد ثابت ہوگی۔ لاؤ اسی بات پر ایک روپیہ
دلواؤ۔

ہیوم۔ (ہنس کر) اچھا تم روپیہ لیکر کیا کروگے؟

نعمان۔ میں اپنے ناشتے کے لئے تھوڑے سے آلو کچھ مچھلیاں
اور چند تیتر خریدونگا اور ایک پتیلی بھی مول لونگا تاکہ وہ سب
چیزیں پکا سکوں۔

ہیوم۔ تمہارے ہاتھ میں قینچی کیوں رہتی ہے۔

نعمان۔ میں نہیں بتاؤں گا۔ ورنہ تم اُن کو مار ڈالو گے۔ روپیہ دلواؤ۔

ہیوم۔ کن کو مار ڈالونگا؟

نعمان۔ میں نہیں بتاتا۔ مجھے روپیہ دو۔

ہیوم۔ دو روپیہ لے لو۔ دونوں باتیں بتادو۔

نعمان۔ نہیں صرف ایک روپیہ دیدو۔

ہیوم۔ اچھا چار روپیہ لے لو اور بتادو۔

نعمان۔ لاؤ۔ (روپے لیکر) سنو۔ روزانہ رات کو ماہی گیر ساحل
دریا پر جال ڈالدیتے ہیں۔ تاکہ رات کے سکون میں مچھلیاں جال
میں پھنس جائیں لیکن خدا کے مقدس فرشتے رات کو زمین پر
اُترتے ہیں۔ اور جب منہ دھونے کے لئے پانی میں ہاتھ
ڈالتے ہیں تو وہ بھی مچھلیوں کے ساتھ قید ہو جاتے ہیں۔
ماہی گیروں کے جاگنے سے پہلے میں جال کی ڈوریاں کاٹ
دیتا ہوں۔ اور فرشتے آزاد ہو کر آسمان کی طرف پرواز کر جاتے
ہیں۔ چنانچہ اس وقت بھی یہی کارِ خیر انجام دیکر آرہا ہوں۔ اور
آج تو فرشتوں کے سردار نے بہت پُر زور الفاظ میں میرا شکریہ
ادا کیا تھا۔

ہیوم (قہقہہ لگا کر) بیوقوف آدمی۔

ایک فرشتہ اندر داخل ہوتا ہے تمام کمرہ
منوّر ہو جاتا ہے۔

ہیوم۔ تم کون ہو؟

فرشتہ۔ میں ایک آسمانی فرشتہ ہوں۔ اور میرا نام عزرائیل ہے۔

ہیوم۔ تم کس مقصد سے آئے ہو؟

عزرائیل۔ تمہیں ایک پیغام دینے۔

ہیوم۔ کس کا پیغام؟ اور کیسا پیغام؟

عزرائیل۔ خدا کا پیغام۔ یعنی یہ کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر تمہاری
روح تمہارے قالب سے نکل جائیگی۔

عزرائیل ایک مٹھی بھر اناج "مقیاس الساعت"
میں ڈال دیتا ہے۔

عزرائیل۔ جب اناج کا آخری دانہ پانی میں ڈوب جائیگا۔ تو تم
مر جاؤ گے۔

ہیوم۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ میری روح کہاں جائیگی؟

عزرائیل۔ دوزخ کے سب سے زیادہ بھیانک اور تاریک
حصّے میں۔

ہیوم۔ کس جرم میں؟

عزرائیل۔ تمہارا جرم یہ ہے کہ تم تین سو سال سے اس قسم کی
تعلیم دیتے رہے ہو۔ جس سے تمام لوگ گمراہ ہو گئے ہیں
اور ہو رہے ہیں۔ آج دنیا میں ہر متنفس خدا کے وجود کا منکر
ہے۔ تین سو سال سے کوئی شخص جنّت میں داخل نہیں ہو

کوثر و تسنیم کے حوضوں پر کائی جم گئی ہے۔ کیونکہ ان کو استعمال کرنے والا کوئی نہیں۔ درختوں میں پھل اور میوے لگتے ہیں لیکن سوکھ کر جھڑ جاتے ہیں۔ انہیں کھانے والا کوئی نہیں۔ درخت کے آگے جنگلی پودے اور جھاڑیاں اُگ آئی ہیں۔ کواڑوں کی کنڈیاں وغیرہ زنگ آلود ہو گئیں ہیں۔ کیونکہ دروازے تین سو سال سے نہیں کھلے۔ تمام فرشتے کاہل اور سُست ہو گئے ہیں اور اس وقت بھی بعض جمائیاں اور انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ کیونکہ جنت میں کوئی شخص نہیں جس کی وہ خدمت کریں لیکن اے فانی انسان! یاد رکھ کہ اِن تمام باتوں کے باوجود خدا کی خدائی میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔

ہیوم۔ لیکن مَیں تو خدا کا منکر نہیں ہوں۔ میرا تو جنت و دوزخ اور ملائکہ پر بھی ایمان ہے۔

عزرائیل۔ یہ سب درست ہے لیکن دوسروں کو تم نے صراطِ مستقیم سے گمراہ کر دیا ہے۔

ہیوم۔ لیکن اگر میں صدقِ دل سے توبہ کر دوں تو کیا عذابِ الٰہی سے بچ جاؤں گا؟

عزرائیل۔ ہاں یہ ممکن ہے۔ خدا رحیم ہے۔ لیکن ایک شرط ہے۔

ہیوم۔ (چونک کر) ایک شرط!! جلد بتاؤ وہ شرط کیا ہے؟ — (مقیاس الساعت کو گھورتے ہوئے) آہ! وقت گزرتا جا رہا ہے۔ جلدی کرو۔ جلدی شرط بیان کرو۔

عزرائیل۔ سنو اگر تم توبہ کے ساتھ ساتھ تمام دنیا میں سے صرف ایک ایسا شخص تلاش کر لو جو خدا کے وجود کا صدقِ دل سے معتقد ہو تو تمہاری رُوح جنت میں جا سکتی ہے۔ ورنہ نہیں۔ اور یہ واضح رہے کہ یہ کلمات میرے نہیں ہیں بلکہ خدا کا ارشاد ہے وہ اپنے گنہگار بندوں کو بخشنے کے لئے ہر وقت تیار ہے۔ اور اگر تم نے ایسا آدمی تلاش کر لیا تو تم ہی وہ خوش نصیب شخص ہو گے جو حضرت آدم کے بعد "پہلا جنتی" کہلاؤ گے۔

نعمان کمرے سے باہر چلا جاتا ہے۔

ہیوم (مایوسی کے لہجہ میں) اچھا مَیں کوشش کرونگا۔

عزرائیل غائب ہو جاتا ہے۔

ہیوم۔ افسوس میں نے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا.......لیکن اس اظہارِ تاسف کی ضرورت نہیں۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے شاگرد میرے انتظار میں باہر کھڑے ہیں۔ ان میں سے یقیناً کوئی نہ کوئی ایسا بھی ہو گا جو میرے دلائل کو اچھی طرح نہ سمجھا ہو اور ابھی تک خدا کے وجود پر اعتبار رکھتا ہو۔

گھنٹی بجاتا ہے۔ شاگرد آجاتے ہیں۔ نعمان بھی اُن کے ساتھ ہے۔ سب بیٹھ جاتے ہیں۔

ہیوم خاموش کھڑا ہے۔

ایک شاگرد۔ معلوم ہوتا ہے آج ہمارے استاد کی طبیعت خراب ہے۔ بہت پریشان معلوم ہوتے ہیں۔

نعمان۔ ہاں۔ مجھ کو پریشانی کی وجہ معلوم ہے۔

دوسرا شاگرد۔ اچھا بتاؤ۔

نعمان۔ ایک روپیہ دلواؤ۔

سب شاگرد ہنس پڑتے ہیں۔

ہیوم۔ (بہت زور کے لہجہ میں) خاموش!.......... میرے عزیز طالب علمو! کیا تم میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ خدا کون ہے۔

ایک شاگرد۔ خدا کوئی شے نہیں۔

دوسرا شاگرد۔ متقدمین کے خیال کے مطابق ایک مفروضہ ہستی جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔

تیسرا شاگرد۔ لیکن ہمیں ان باتوں پر یقین نہیں ہے۔

چوتھا شاگرد۔ اور نہ ہم یقین کر سکتے ہیں۔

ہیوم۔ اگر تم میں سے کوئی اُس کے وجود کا ذرا بھی معتقد ہے۔ تو اقرار کرے۔ مَیں ناراض نہیں بلکہ خوش ہونگا۔

سب شاگرد۔ (یک زبان ہو کر) نہیں جناب ہرگز نہیں۔ اور ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے اپنے علم سے ہمیں اِس قابل بنا دیا ہے۔ کہ آج دنیا کا کوئی عالم استدلال سے ہمارے اعتقادات نہیں بدل سکتا۔

ہیوم کے چہرے پر زردی چھا جاتی ہے کچھ دیر خاموش رہتا ہے۔ لیکن وقت کے ضائع ہونے کے خیال سے چونک پڑتا ہے۔

ہیوم۔ کیا تم میں سے کوئی اُس شخص کو بھی جانتا ہے جس سے گزشتہ ہفتہ میری بحث ہوئی تھی۔ خدا کے وجود کا مسئلہ ہی زیرِ بحث تھا۔ اور وہ شخص خدا کے وجود کا معتقد تھا۔ تم سمجھے۔

ایک شاگرد۔ ہاں۔ اُسے میں جانتا ہوں۔ لیکن اُس روز کی بحث

سے اُس کے عقاید بھی بدل گئے۔ اب وہ ہمارا ہی ہم خیال ہوگیا ہے۔

ہیوم (کچھ دیر خاموش رہ کر) افسوس عزیز طالبعلمو! مَیں نے تمام دنیا کو دھوکا دیا۔ اور تمہیں بھی ایک عرصہ سے گمراہ کر رکھا ہے۔ درحقیقت اِس دنیا کا اور اِس میں رہنے والی مخلوق کا پیدا کرنیوالا خدا ہی ہے۔ جو ہمارے مرنے کے بعد ہماری روحوں کو ہمارے اعمال کے مطابق جنّت و دوزخ میں بھیج دیگا۔ اور ہمارے اعمال لکھنے کے لئے فرشتے مقرر ہیں۔

ایک شاگرد۔ (اپنے ایک ساتھی سے) معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارے اُستاد کے دماغ کا توازن بگڑ گیا ہے۔

دوسرا شاگرد۔ ہاں معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ بہت بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔

نُعمان۔ مجھے اِس کی وجہ معلوم ہے۔ ایک روپیہ دو تو ابھی بتلادوں۔

ہیوم۔ تمہاری سمجھ میں آیا یا نہیں۔ (کچھ جواب نہ پاکر) اچھا تم سب چلے جاؤ۔ میری طبیعت خراب ہے۔

تمام شاگرد چلے جاتے ہیں۔ ہیوم ایک آہِ سرد کھینچتا ہے پھر اپنی بیوی کو بلانے کی خاطر گھنٹی بجاتا ہے۔

ہیوم۔ (عالمِ خیال میں) عموماً عورتیں بہت ناقص العقل ہوتی ہیں۔ ممکن ہے وہ ابھی تک خدا کی معتقد ہو۔

کیٹی۔ (اندر داخل ہوکر) ابھی چائے تیار نہیں ہوئی۔ ذرا توقف کیجئے۔

ہیوم۔ مجھے چائے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ خدا کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟

کیٹی۔ مبارک ہو کہ تمہاری محنت رائگاں نہیں گئی۔ بہت عرصہ غور و فکر کرنے کے بعد مَیں اِس نتیجے پر پہنچی ہوں۔ کہ دراصل خدا کا کوئی وجود نہیں۔ پہلے جو وقت مَیں عبادت میں گزارتی تھی اب پرندوں اور کیاریوں کی دیکھ بھال میں صرف کرتی ہوں......

ہیوم۔ (قطع کلام کرکے) اچھا تم چلی جاؤ اور وِلسن کو بھیج دو۔

کیٹی چلی جاتی ہے اور تھوڑی دیر بعد وِلسن اندر داخل ہوتا ہے۔

وِلسن۔ آبا جان۔ مجھے اپنے دوستوں کے ساتھ تماشے میں جانا ہے۔ آج مَیں آپ کے ساتھ باغ نہیں جاؤنگا۔

ہیوم۔ اچھا مت جانا۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اب خدا کے متعلق تمہارا کیا عقیدہ ہے؟

وِلسن۔ آپ شاید میرا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ لیکن اب جبکہ تمام دنیا آپ کے علم سے فائدہ اُٹھا رہی ہے تو مَیں کس طرح جاہل رہ سکتا ہوں۔ مرتے دم تک مَیں ایسی کسی چیز کے وجود کا معتقد نہیں ہوسکتا جو نظر نہ آتی ہو۔

ہیوم۔ اچھا تم جاؤ اور نینسی کو بھیج دو۔ (اپنے دل میں) نینسی سات سال کی بچّی ہے میری باتوں کا اُس کے دل پر بالکل اثر نہ ہوا ہوگا۔

وِلسن نینسی کو بھیج دیتا ہے۔ چھوٹی بچّی ہنستی ہوئی آکر اپنے باپ کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی ہے۔ ہیوم اُسے گود میں اُٹھا لیتا ہے اور کہتا ہے۔

ہیوم۔ پیاری نینسی! خدا کسے کہتے ہیں؟

نینسی۔ آبا جان! پہلے تو مَیں جانتی تھی کہ وہ ہمارا آسمانی باپ ہے لیکن ایک دفعہ آپ نے بتایا تھا کہ وہ ایک کھلونا ہوتا ہے اُس سے افریقہ کی بیوقوف لڑکیاں کھیلتی ہیں۔ مجھے یقین تو نہ آتا لیکن جب امّی جان اور آکا بائی نے بھی ویسا ہی کہا۔ تو مجھے اعتبار آگیا کہ خدا نام ہے ایک پتھر کے کھلونے کا جس سے چھوٹی بچیاں کھیلتی ہیں........

ہیوم نینسی کو بھی بھیج دیتا ہے۔ نُعمان اندر داخل ہوتا ہے۔

نُعمان۔ میرے محترم استاد کیا حال ہے؟ اگر تم کو صبح کے چار روپوں کا رنج ہے تو مَیں واپس کئے دیتا ہوں۔ مجھے تو صرف ایک روپیہ کی ضرورت تھی۔

ہیوم کچھ دیر خاموش رہتا ہے۔ اچانک کامیابی کی ایک لہر اُس کے چہرے پر دوڑتی ہے۔ منہ سُرخ ہوجاتا ہے۔

ہیوم (کھسیانی ہنسی کے ساتھ) میرے بیوقوف نُعمان! خدا کے متعلق تمہارا کیا عقیدہ ہے۔

نُعمان۔ حکیم جٹنس کا خیال ہے کہ نیم کی کونپلیں فسادِ خون میں مفید ہیں۔

ہیوم۔ (مقیاس الساعت کو گھورتے ہوئے) ارے ظالم جلدی کر

وقت ضائع ہو رہا ہے ۔ ..... میرے سوال کا جواب دے ۔

نعمان ۔ کل صبح میں گرجا گھر گیا تو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ بجائے عبادتِ الٰہی کے لوگ تاش کھیل رہے ہیں ۔

ہیوم ۔ (روتے ہوئے) ہائے ظالم! ..... یہ تو میرے سوال کا ..... جواب نہیں ہے ۔ ..... رحم کر ..... ورنہ میری رُوح ..... آہ میری رُوح ..... دائمی عذاب میں مبتلا ہو جائیگی ۔

نعمان ۔ اور دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ وہ آپ ہی کے فلسفیانہ خیالات کا اثر ہے ۔ جو وہ لوگ ....

اناج کا آخری دانہ پانی میں ڈوب جاتا ہے ۔
ہیوم لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے ۔ دھماکے کی آواز سُن کر تمام شاگرد اور ہیوم کے بیوی بچے اندر آجاتے ہیں ۔ ہیوم کے منہ سے ایک سفید دُھواں نکلتا ہے ۔ فرشتہ ظاہر ہوتا ہے اور اس دُھوئیں کو اپنی مُٹھی میں لیکر غائب ہو جاتا ہے ۔

کیٹی ۔ (چلاّ کر روتے ہوئے) ہائے! میرا عزیز شوہر اس جہان سے رخصت ہو گیا ۔

ایک شاگرد ۔ آج صبح ہی سے اُن کی طبیعت علیل تھی ۔

نعمان ۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ آج صبح ایک فرشتہ آیا تھا اور ہیوم کو اُس کی موت کا پیغام دے گیا تھا ۔ یہ بھی کہہ گیا تھا کہ اگر وہ موت سے پہلے ایک ایسا شخص تلاش کرے جو خدا کے وجود کا معتقد ہو تو اُس کی رُوح جنت میں جائیگی ۔ ورنہ دوزخ میں ۔ چنانچہ وہ آخر دم تک اُس شخص کو ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتا رہا ۔

ایک شاگرد ۔ ناکامیاب کوشش کیوں؟ تم تو اپنے آپ کو خدا کے وجود کا معتقد بتاتے ہو ۔

نعمان ۔ ہاں ۔ اور میں مُنکر کب ہوا ہوں ۔

دوسرا شاگرد ۔ پھر تم نے اس بات کا اقرار ہیوم کے سامنے کیوں نہ کر لیا؟

نعمان ۔ اس کی وجہ سُننے سے پہلے ایک روپیہ دلواؤ ۔

ایک شاگرد فوراً روپیہ دے دیتا ہے

نعمان ۔ (ایک روپیہ لیکر) اصل بات یہ ہے کہ جب فرشتہ پہلی مرتبہ باہر گیا تو دروازے پر میں نے اس سے ملاقات کی ۔ اور اُسے یقین دلا دیا تھا کہ ہیوم کو کسی شخص کے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ۔ میں صدقِ دل سے خدا کے وجود کا معتقد ہوں ۔ اور اُسے تنبیہ کر دی تھی کہ استاد کی رُوح دوزخ میں نہ جانے پائے ۔ چنانچہ فرشتے کے قول کے مطابق حضرت آدم کے بعد ہیوم ہی "پہلا جنتی" ہے

پردہ گرتا ہے ۔

(ماخوذ) **فضل حق قریشی**

رباعی

یا رب وہ کونسا ہے مزاہمت وبود میں
جو دل ہے ذرّے ذرّے کا جوشِ نمود میں
شاخِ شجر کو چیر کے غنچہ عیاں ہوا
اور مُسکرا کے کھل گیا ذوقِ وجود میں

(ترجمہ از فارسی)

فلسفۂ اشراق

فلسفۂ اشراق یا نوفلاطونیت کی تاریخ بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فلسفۂ ماقبل کا خلاصہ بیان کردیا جائے۔ تاکہ ناظرین اوراق کو اُن تغیرات کے سمجھنے میں آسانی ہو جو آئندہ رونما ہوئے اور جن کی بنا پر اس نئی علمی تحریک یعنی (فلسفۂ اشراق) کی بنیاد قایم ہوئی۔ اور فلسفے کی سرگرمیوں کا مرکز یونان یا ایتھنز سے تبدیل ہوکر سکندریہ (مصر) قرار پا گیا۔

(۱) فلسفۂ ماقبل اشراق پر ایک طایرانہ نگاہ

ہم لکھ چکے ہیں کہ سقراط سے پہلے یونانی فلسفہ، جیسا کچھ بھی تھا۔ سوفسطائیوں کے ہاتھوں میں بازیچۂ اطفال بن کر رہ گیا تھا، جن کے نزدیک فلسفیانہ غور و فکر کا مقصد صرف یہ تھا کہ عوام پر اپنی قابلیت کا سکہ جمایا جاسکے یا اُن کے قلوب میں ہر شے کے متعلق شکوک پیدا کئے جاسکیں، چنانچہ اِن لوگوں کی بدولت یونان میں لاادریت کی بنیاد پڑی۔ لیکن اس تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے قدرت نے سقراط کو پیدا کردیا۔ جس کی آغوش سے افلاطون جیسا شخص تعلیم پاکر نکلا اور اُس کا شاگرد ارسطو جیسا حکیم ہوا۔ اِن دونوں نے لاادریت کے اثر کو زایل کردیا۔ لیکن جب ارسطو کے بعد پھر لاادریت کا زور ہوا تو کوئی ارسطو اُس کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں نہ آیا۔ اگرچہ ارسطو کے بعد فلسفے میں کئی مذاہب پیدا ہوگئے۔ مثلاً لاادریت، ابیقوریت، رواقیت اور مجلس جدید لیکن اِن سب میں، لاادریت بہت زبردست تھی۔ کیونکہ اِس مذہب کے مقلدین نے طالیس سے لیکر ارسطو تک تمام فلاسفہ سے خوشہ چینی کی تھی اور جس مذہب میں جو بات مفید مطلب نظر آئی اُسے اختیار کرلیا اور ہر طرح مسلح ہوکر کامیابی کے ساتھ فلسفہ کے قلعہ پر گولہ باری شروع کردی۔ اُن کے اعتراضات کے سامنے تمام حکمتِ قدیمہ بیکار ہوکر رہ گئی۔ اگرچہ فلاسفہ اُن کے اعتراضات کا جواب دیتے تھے۔ لیکن عوام الناس پر انہی کا اثر غالب تھا، اور اُن کی نظر میں فلسفہ ایک ظنی امر باقی رہ گیا تھا، حالانکہ فلسفے کا مقصد یہ ہے کہ یقین پیدا کرے۔ سوائے فلاسفہ کے عوام کو فلسفیانہ صداقتوں پر مطلق ایمان نہ تھا۔

لیکن سقراطی فلسفہ کا ایک پہلو ہنوز زندہ تھا۔ یعنی فلسفۂ اخلاق اور فلاسفۂ مابعد مثلاً افلاطون اور زینو وغیرہ نے اس شعبے کو خاص ترقی دی۔ لہذا اب دے کر فلسفے کا سہارا یہی علم اخلاق رہ گیا تھا اور زینو نے اس علم کی بنیاد (Common Sense) یعنی عامۃ الناس کے تجربہ و مشاہدہ پر رکھی تھی۔ اگرچہ یہ بنیاد مابعد الطبیعات کے لئے مناسب نہیں۔ لیکن اخلاقیات کے لئے موزوں ہوسکتی ہے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ چوری کرنا بُری بات ہے۔ سچ بولنا اچھی بات ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بہرکیف اس پہلو سے قطع نظر کرکے فلسفے کے جسقدر اہم مسایل تھے۔ سب کے کاندھوں پر شکوک اور شبہات کا انبار لاد دیا گیا اور یہ بات ظاہر ہے کہ بنانا مشکل ہے، بگاڑنا آسان ہے۔ اعتراضات کی ایسی ہوا چلی کہ فلاسفہ ناامید ہوگئے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ طالیس نے اس سوال سے فلسفیانہ غور و فکر کا آغاز کیا تھا، کہ کائنات کا آغاز کس طرح ہوا؟ لیکن آج صدیاں گزر جانے کے بعد بھی کوئی تسلی بخش جواب اس سوال کا نہیں مل سکا۔ پس اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے فلسفے کو ظنیات میں داخل کردیا۔ "عقل" جب اس طرح سپرانداز ہوجائے تو خواہ مخواہ ایمانیات کے قلعہ میں پناہ گزیں ہونا پڑیگا۔

سکندریہ کے مشرق سے فلسفۂ اشراق کا طلوع

سکندریہ گزشتہ سطور میں فلسفہ کا جو نقشہ پیشِ ناظرین کیا جاچکا ہے۔ اس کو ملاحظہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالنا دشوار نہیں ہے کہ فلسفہ اندریں حالات، یونان میں زیادہ دنوں تک قیام نہ کرسکتا تھا۔ جب ایک شے کسی ملک میں مقبول نہ ہو تو وہ ع

اگر ماند شبے دیگر نمی ماند

کی مصداق ہوجائیگی۔ حالت یہ تھی کہ ہر فیلسوف اور ہر مذہب، ادعا میں پیش پیش تھا۔ لیکن بارِ ثبوت دوسروں کے کاندھے پر رکھنا چاہتا

تھا۔ دعاوی بہت تھے لیکن دلائل کم۔ سوالات ہر جگہ ملتے تھے۔ لیکن اُن کا حل کہیں دستیاب نہ ہوتا تھا۔ انسان اپنی عقل و دانش کی بنا پر جسقدر مذاہب قائم کر سکتا ہے، اہلِ یونان نے سبھی قایم کر چھوڑے تھے۔ لیکن ہر جگہ "ہنوز دلی دور است" کا نقشہ نظر آتا تھا۔ قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص سوال یا شبہ وارد کرتا ہے تو اُس کی وجہ سے عقلا میں تحریکِ معنوی پیدا ہوتی ہے اور اس طرح فلسفے میں نئی نئی راہیں کُھلتی ہیں۔ لیکن اب تو جسقدر سوالات ہو سکتے تھے سب وارد کئے جا چکے تھے بلکہ پُرانی شراب نئی بوتلوں میں بھی ڈالی جا چکی تھی لہذا وہی پرانے سوالات، کسی دماغی تحریک کا باعث کس طرح ہوتے؟

جب اربابِ دانش اور فلاسفۂ یونان بذاتِ خود سوالات کا جواب نہ دے سکے تو اُنہوں نے ترکِ وطن پر کمر باندھی اور اُن مقامات پر مدارس قائم کئے جہاں اس سے پہلے فلسفے کا چرچا مطلق نہ تھا۔ اِس زمانہ میں دو ہی شہر ایسے تھے جہاں فلسفیانہ غور و فکر کو نشو و نما نصیب ہو سکتی تھی۔ ایک روم دوسرا سکندریہ۔ اِن لوگوں کے لئے بالکل وہ مسائل پرانے اور فرسودہ تھے لیکن رومی اور مصری افراد کے لئے بالکل نئے ثابت ہوئے اور اُنہوں نے نہایت دلچسپی کے ساتھ اُن میں حصّہ لینا شروع کر دیا۔

الغرض یونان سے نکلکر فلسفہ، روم اور سکندریہ میں پناہ گزیں ہوا، لیکن رومن فلسفہ، دراصل یونانی فلسفے کی ادنیٰ اور کم سواد تقلید سے آگے نہ بڑھ سکا۔ بیشک فلسفے نے رومن شاعری، فصاحت و بلاغت، قانون اور ادبیات جملہ فنون کو رنگیں اور مزیّن کر دیا لیکن رومیوں کی قومی زندگی میں اُسے کوئی خاص مرتبہ حاصل نہیں ہوا، اور نہ اربابِ ہوش نے اُسے اپنی ایمانیات میں داخل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں سے کوئی شخص، ارسطو کا ہم پلّہ پیدا نہیں ہوا۔

سکندریہ (مصر) میں معاملہ کچھ اَور ہی تھا۔ مصریوں نے بذاتِ خود غور و فکر کر کے فلسفۂ یونان میں مختلف مذاہب پیدا کئے اور نئے خیالات اور عقاید اُس میں داخل کر کے، اپنی جدّت طرازی کا ثبوت بہم پہنچایا۔ فلاطونس، پراقلیس اور فرفریوس جیسے مشہور حکماء نے اُسے چار چاند لگائے اور اِن کے شاگردوں نے مسیحت کو بھی اپنے رنگ میں رنگیں کر دیا۔

سکندریہ کی عظمت کا راز اُس کے مرکزِ تجارت ہونے میں مضمر تھا، دنیا کے مختلف ممالک کے باشندے بسلسلۂ تجارت یہاں آتے تھے۔ اور...... فلاسفہ اور اُن کی علمی مجلسوں کا حال اپنے ہموطنوں کو سناتے تھے۔ لہذا اِس شہر کو وہی مرتبہ حاصل ہو گیا جو آج آکسفورڈ یا کیمبرج کو حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ سکندریہ تمام شہروں سے گوئے سبقت لے گیا اور اُس کی شہرت کے آگے ایتھنز اور روم کی کچھ حقیقت باقی نہ رہی۔ در و دیوار سے علم و فن کی صدا آنے لگی۔ گلی کوچوں میں مدرسے قائم ہو گئے گویا حزیں نے جو کچھ اصفہان کے متعلق لکھا ہے۔ وہ لفظاً لفظاً سکندریہ پر صادق آسکتا ہے۔ مرد در کنار عورتیں بھی فلسفہ اور حکمت کا درس دینے لگیں۔ لیکن بُرا ہو مذہبی تعصب اور جنون کا!!!

مسیحیوں نے چند روز تک تو فلاسفہ کے ساتھ علمی مناظرے کئے لیکن جب دیکھا کہ ہم عقل، اور دانش کی رُو سے بازی نہیں لیجا سکتے تو اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئے اور وہی کام شروع کر دیا۔ جو متعصب اور جنونی لوگ کیا کرتے ہیں۔ بیگناہ افراد کو محض اِس جُرم میں قتل کیا کہ وہ ایسے علوم پڑھاتے تھے۔ جن کو پڑھنے کے بعد لوگ مسیحیت کے خلافِ عقل ہونے پر بے شمار دلائل قایم کر سکتے تھے اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یونان اور سکندریہ۔ انطاکیہ اور روم غرضکہ جہاں جہاں اُن کا بس چلا فلسفے کے مدارس جبراً بند کرا دئے۔ جس طرح بیگناہ یونانی اور رومی رعایا کو بزورِ شمشیرِ عیسائی بنایا اُسی طرح فلسفے کا پڑھنا پڑھانا بھی جُرم قرار دیا گیا۔ حد ہے کہ سکندریہ کا مشہورِ عالم کتب خانہ جس میں پانچ لاکھ سے زیادہ قلمی کتابیں تھیں۔ اُن لوگوں کے ایماء اور حکم سے آگ کی نذر کر دیا گیا۔ جن کو آج "اولیا" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ مسیحیوں نے ہزار سال تک، علم و حکمت کی شمع گُل کرنے کے لئے سر توڑ کوشش کی ہزارہا انسانوں کو محض اِس جُرم میں قتل کر دیا کہ وہ فلسفہ حاصل کرتے تھے یا عقل سے کام لیتے تھے۔ محکمۂ احتساب کی خونیں تاریخ اِس پر شاہد ہے جسٹینین کے فرامین اِن لوگوں کی علم دشمنی پر گواہ ہیں۔ ہائی پیشیا جیسی فرشتہ سیرت، معصوم صفت عالمہ فاضلہ کا پاک خون، جو سکندریہ کی سڑکوں پر من دہاڑے بہایا گیا۔ آج بھی اپنی بیگناہی اور سینٹ سِرل کے تعصب مذہبی پر آوازِ بلند گواہی دے رہا ہے۔ اور اسی طرح ہائی پیشیا کے بہت سے بھائی اور بہنیں سِرل جیسے رحمدل اُسقفوں (مذہبی پیشواؤں) کی

توجہات کا نشانہ ہو گئے۔ برونو، گیلیلیو، کاپرنیکس اور بہت سے حکماء کی رقت انگیز زندگیاں، اُن کی "بے نظیر رحمدلی" پر نوحہ خوانی کر رہی ہیں۔ لیکن اسکندریہ کے کتب خانہ کو نذرِ آتش کرنا ایسا واقعہ ہے جو ان سب پر فوقیت رکھتا ہے یہ وہ نقصان عظیم ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ کریسی لیس نے ۷۰۵ (سات سو پانچ) تصانیف چھوڑی تھیں۔ آج ایک تصنیف بھی نہیں ملتی۔ اسی طرح ہزارہا نہیں بلکہ پانچ لاکھ سے اوپر کتابیں ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے ناپید ہو گئیں۔ افسوس کہ میں اسجگہ زیادہ تفصیل کے ساتھ نہیں لکھ سکتا۔ مندرجۂ ذیل کتابیں اس بحث پر کافی روشنی ڈال سکتی ہیں:-

(۱) معرکۂ مذہب و سائینس۔
(۲) یورپ کے ارتقائے ذہنی کی تاریخ۔ مؤلفۂ ڈاکٹر ولیم ڈریپر
(۳) تاریخ اخلاقِ یورپ۔
(۴) آغاز و عروج عقلیت۔ مؤلفۂ ڈاکٹر ہارٹ پول لیکی۔
(۵) تنازع مابینِ سائینس۔ مؤلفۂ ڈاکٹر وہایٹ۔

فی الجملہ صدیوں تک اسکندریہ علم و فن کا مرکز بنا رہا اور تمام دنیا کے مذاہب بھی اپنے خیالات کی اشاعت کرتے رہے جن کی وجہ سے مذہب اور فلسفہ میں اختلاط لازمی تھا۔ یہیں افلاطون کے جانشین لاادریین کے نام لیوا، یہودی اور مسیحی علماء، مصری بُت پرست صوفیائے پاک طینت، مادہ پرست، عناصر پرست، مدارس قائم کئے ہوئے اپنے اپنے خیالات کی اشاعت میں مصروف تھے۔ گویا اسکندریہ مختلف مذاہب اور خیالات کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔

فائیلو

واضح ہو کہ "الگزینڈرین اسکول" میں وہ تمام حکما شامل ہیں۔ جنہوں نے یونانی لاادریت سے تنگ آکر، فلسفۂ نو کی آغوش میں پناہ لی تھی۔ لیکن ہم ان تمام حکماء کو کسی ایک اسکول (مذہب) کا پابند قرار نہیں دے سکتے، ہاں یہ لوگ اسکندریہ کی علمی تحریک میں ضرور مشترک طور سے حصہ لینے والے قرار دئے جا سکتے ہیں۔ ان لوگوں میں نوفلاطونی یا اشراقیون سب سے زیادہ نامور گزرے ہیں۔

فائیلو (یہودی النسل) ان لوگوں کا سرغنہ اور سردار گزرا ہے یہ شخص جناب مسیح سے چند سال بیشتر اسکندریہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت اگرچہ یہودی علما اور یہودی مدارس کے ماتحت ہوئی تھی لیکن یونانی فلسفے کا اثر، اسکندریہ کی فضا میں سرایت کر چکا تھا۔

چونکہ جوہر قابل تھا اس لئے اُس پر یونانی فلسفے نے اپنا رنگ اچھی طرح جما دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب اور فلسفہ کی آمیزش سے ایک نیا مذہب یعنی اشراق پیدا ہو گیا۔ فائیلو سے پہلے، یہودی مذہب اور توریت وغیرہ کی تفسیر و تشریح محض نقلی رنگ میں کی جاتی تھی لیکن فائیلو پہلا شخص ہے جس نے نقل میں عقل کا پیوند لگایا۔ گویا توریت اور فلسفے کو سمو کر ایک معجون مرکب تیار کر دی۔ یہ شخص اگرچہ افلاطون اور مجلس جدیدہ کی تعلیمات سے بیحد متاثر ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی اُس کا دماغ مشرقی تھا۔ اور مذہب خصوصاً یہودی مذہب اُس کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ اس لئے اگر فلسفہ انسان کو تشفی کامل نہیں عطا کر سکتا تو نکر سے۔ ایک چیز اور بھی ہے جو آڑے آ سکتی ہے۔ وہ "ایمان" ہے جو دراصل عطیۂ الٰہی ہے جس کا مبدار دماغ نہیں بلکہ رحمتِ خداوندی ہے، اور سوفروسنہ یعنی پرہیزگاری اور تقویٰ اختیار کرنے سے یہ نعمتِ عالیہ حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ فائیلو نے یہ عقیدہ کہ "عقل انسانی انتہائی معیارِ صداقت نہیں ہے" افلاطون سے نہیں لیا بلکہ کارنیاڈیز سے، لیکن پھر بھی یہ تخیل دراصل افلاطون ہی کے اس خیال پر مبنی ہے "کہ عقلِ انسانی ذاتِ باری تعالیٰ سے واقف نہیں ہو سکتی۔ ہاں اُس کی ہستی کا اثبات کر سکتی ہے۔" پس اگر عقل خدا کی ماہیت دریافت کرنے سے قاصر ہے۔ تو لامحالہ "انتہائی یا آخری معیارِ صداقت" قرار نہیں دی جا سکتی۔ اسی لئے عقل کے اوپر ایک معیار ہونا چاہئے۔ اور وہ معیار ایمان ہے۔ ممکن ہے افلاطون نے خوبی یا نیکی کو ایمان کا ہم پلہ قرار دیا ہو کیونکہ وہ مکالمات میں لکھتا ہے کہ نیکی ایسی شے نہیں جو مدرسہ میں حاصل ہو سکے بلکہ یہ تو ایک نعمتِ ربانی ہے۔ بالفاظِ دیگر۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بہرکیف اس نقطہ سے فائیلو کا فلسفہ آئندہ چلکر الٰہیات کی صورت میں مبتدل ہو جاتا ہے۔ گویا فلاسفی، تھیالوجی بنجاتی ہے۔ خدا، بقول فائیلو، ایک ناقابلِ اظہارِ حقیقت ہے۔ یعنی

تواں در بلاغت بہ سحباں رسید
نہ در کنہ بیچون سبحان رسید

کوئی شخص بذریعۂ الفاظ خدا کی ماہیت کو کما حقہٗ بیان نہیں کر سکتا نہ

بال سفید نہیں ہونگے
کیونکہ
روح شباب
ایک بہترین اور بے نظیر چیز ثابت ہوئی ہے!
رفیق زندگی
دفتر روح شباب اندرون بھاٹی دروازہ لاہور

پنجاب میں دانتوں کے مشہور ماہر ڈاکٹر ایم جلال الدین ڈینٹل سرجن ۲۲ مال روڈ پر رہتے ہیں
مسلم بنک آف انڈیا لمیٹڈ انارکلی لاہور
مسلم بنک آف انڈیا لاہور مسلمانوں کا سب سے پرانا اور بہترین بنک ہے اس بنک کے ڈائرکٹر بالکل بلا معاوضہ قوم کی خدمت کرتے ہیں اسلئے ہر ایک خیر خواہ قوم کا فرض ہے کہ اس بنک کیساتھ حساب کھولے اور اپنا تمام کاروبار اس بنک کی معرفت کرے میعادی امانتوں پر یہ بنک معقول منافعہ دیتا ہے اس میں روپیہ جمع کرانا ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہے
شاخیں:۔ کشمیری بازار لاہور، امرتسر، جالندھر شہر، دھلی، آگرہ، کانپور، سیالکوٹ پشاور، سری نگر کشمیر ہیں بینکرز:۔ امپیریل بنک لمیٹڈ، سنٹرل بنک لمیٹڈ
یہ بنک ہر قسم کا کاروبار کرتا ہے حسابات فلوٹنگ فکسڈ ڈیپازٹ سیونگ بنک رکھے جاتے ہیں جن پر خاطر خواہ منافع دیا جاتا ہے قرضہ جات اچھی کفالتوں پر دیے جاتے ہیں ولایتی بلوں کی وصولی اور ادائیگی گاہکوں کیلئے کی جاتی ہیں جہازی مال کی روانگی اور چھڑائی کا کام معمولی کمیشن پر کیا جاتا ہے، ڈرافٹ چک، بلٹیاں لنبستاً ارزاں نرخوں پر خرید و فروخت کی جاتی ہے ولایتی ڈرافٹ کی خرید و فروخت رعایتی نرخوں پر کی جاتی ہے
حصص قابل فروخت ہیں ایک حصہ کی قیمت مبلغ یکصد روپیہ ہے ہیڈ آفس یا برانچ سے خط و کتابت کریں اور ادبی دنیا کا حوالہ ضرور دیں
المشتہر
محمد حسین سکریٹری مسلم بنک آف انڈیا لمیٹڈ انارکلی لاہور
علم جراحی کی حیرت انگیز ایجاد
دلروز
لاہور سو، اورینٹل سور، معلائی سور، ناسور، داد، چنبل، خنازیر، رسولی، غرضیکہ ہر قسم کی جلدی بیماری کا آزمودہ اور شرطیہ تیر بہدف علاج ہے ہر قسم کی گلٹیوں کو تحلیل کرتی ہے دوران استعمال میں نہ زخم باندھنے کی ضرورت اور نہ نہانے کی ممانعت
قیمت فی شیشی دو روپے محصولڈاک ۱۲ ذمہ خریدار
شیخ طاہرالدین انارکلی لاہور پنجاب
ادبی دنیا کا حوالہ ضرور دیں

وہ حیطۂ عقل میں آسکتا ہے۔ اُس کے موجود ہونے کا علم تو ہو سکتا ہے مگر اُس کی ذات کا علم نہیں ہوسکتا۔

اگرچہ ہم خدا کو پورے طور سے نہیں جان سکتے لیکن اُس کی خدائی یا الوہیت کا تھوڑا بہت علم ضرور حاصل کرسکتے ہیں۔ اور یہ بات بواسطۂ عقلِ اوّل ممکن ہوسکتی ہے۔ واضح ہو کہ فائیلو کی یہ اصلاح لوگاس[۱۹] یا لاگاس مختلف صوفیانہ مذاہب میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ لاگاس ایک یونانی لفظ ہے۔ اور انگریزی سیکڑوں الفاظ ایسے ہیں جو اس مشہور اصلاح کی ترکیب سے بنے ہیں۔ مثلاً تھیالوجی۔ تھیاس بمعنی خدا اور لوجیا یا [illegible] بمعنی بیان۔ اسی طرح سائیکالوجی۔ فزیالوجی وغیرہ خود انگریزی لفظ بمعنی منطق، لاگاس ہی سے مشتق ہے۔ جس کے معنی کئی ہیں لفظ، قول، بحث، عقل، بیان، گفتگو وغیرہ وغیرہ۔

خدا، چونکہ دنیا، الوراء اور عقولِ انسانی سے بالاتر ہے۔ انسان کی دانش و فہم، اُس تک پہنچ نہیں سکتی۔ اس لئے کسی "واسطہ" یا "وسیلہ" کی ضرورت لاحق ہے جو خدا اور انسان کے درمیان "رشتہ" یا تعلق پیدا کراسکے، اور اُس کی مرضی انسان پر آشکارا کرسکے۔

علاوہ بریں خدا مجرد[۲۰] ہے وہ مادہ سے کسی طرح تعلق پیدا نہیں کرسکتا، مادی اور کثیف دنیا کو بھلا اُس نورِ مجرد سے کیا تعلق؟ اِس لئے ایک ہستی ایسی ہونی ضرور ہے جو ایک طرف خالق سے وابستہ ہو۔ دوسری طرف مخلوق سے، جو خدا اور بندوں کو باہم ملادے اور انسان کی "شفاعت" کرسکے۔ صوفیائے قدیم اس واسطۂ فرضی کو عقلِ اوّل کہتے تھے۔

فائیلو اس عقل کو خدا کا تصور قرار دیتا ہے۔ اس تصور کے دو پہلو ہیں،

(۱) تصور، بحیثیتِ تصور، جبکہ وہ خدا کے ذہن میں مستور ہو۔ تو "عقلِ کل" کہلاتا ہے اور جب وہ "تصور" بحیثیتِ خالق، کائنات کو پیدا کرتا ہے، تو عقلِ فعّال[۲۱] کہلاتا ہے۔ خدا چونکہ علّتِ تامہ ہے اس لئے معلول کا سرزد ہونا لازمی ہے، جب سے خدا ہے اُسی وقت سے "معلول" بھی ہے۔ اِس معلول یعنی عقلِ اوّل نے کائنات بنائی۔ غرضکہ تین حقائق کا وجود ثابت ہوا۔ اوّل خدا۔ دوم عقل سوم کائنات۔

اس تفصیل سے دو باتیں سمجھ میں آسکتی ہیں اولاً فائیلو نے فلاطونیت اور شرقی تصوف دونوں کو باہم مربوط کردیا۔ ثانیاً فلسفے میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگیا۔ یعنی فائیلو نے دوبارہ فلسفے اور مذہب کو متحد کردیا۔ یہی آمیزش یا اتحاد، الگزینڈرین اسکول کا طغرائے امتیاز ہے۔ "عقل" تو کائنات کی گتھی سلجھانے میں ناکام رہی، اور لوگوں نے اِس مشکل کو حل کرنے کی مختلف ترکیبیں بھی سوچیں لیکن ہر ترکیب یا تجویز کا نتیجہ لاادریت ہی پر منتہی ہوا۔ اندریں حالات طبقۂ صوفیا رہنمائی کے لئے آمادہ ہوا تاکہ جو عقدہ ناخنِ عقل سے وا نہیں ہوا وہ ایمان سے حل ہوجائے۔

بہرحال فائیلو نے فلسفے کو ایمان کے ماتحت کردیا حالانکہ فلسفہ نام ہے۔ کائنات کے اسرار کی عقلی تشریح کا۔ ممکن ہے کہ "عقل" اِس راز کی پردہ کشائی نہ کرسکے لیکن دقت تو یہ ہے کہ اگر عقل کو ایمانیات کے ماتحت کردیا جائے تو پھر وہ اپنے منصب قدیمہ پر بحال نہیں رہ سکتی ہے بلکہ عقل کسی چیز کے ماتحت رہکر "عقل" نہیں کہلاسکتی خصوصاً فلسفے میں تو یا عقل کو خود مختار بنائیے یا برطرف کردیجئے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ جہانتک عقل کام کرسکتی ہے وہاں تک آپ تابعِ عقل ہیں۔ اور جہاں عقل قاصر ہو وہاں ایمان کو اُس کا قائم مقام بنادیا جو باتیں حیطۂ عقل سے خارج ہیں۔ ہمیں اختیار ہے کہ اُن پر ایمان رکھیں یا نہ رکھیں، لیکن ہم کسی طور پر بھی اِس ایمان کو فلسفیانہ یا عقلی رنگ میں تسلیم نہیں کرسکتے۔ مثلاً خدا کی ماہیت کا سمجھنا عقلِ انسانی سے خارج ہے کوئی شخص خدا کو نہیں سمجھ سکتا۔ کہ وہ کیا ہے۔ پس اِس کے متعلق اعتقادیات کی جسقدر تعلیم ہوگی

آنانکہ وصفِ حسنِ تو تعزیر می کنند
خوابِ ندیدہ را ہمہ تعبیر می کنند

کا مصداق ہوگی، عقلی طور سے ثابت نہیں ہوسکتی۔

(باقی آئندہ)

پروفیسر یوسف سلیم

تنقیدِ شعری

ڈھونڈھے ہے اُس مغنئ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے (غالب)

موسیقی کے اثرات مختلف ہوتے ہیں۔ بعض راگوں کو سنکر رُوح احساسات میں کھو جاتی ہے۔ غم افزا۔ دھیمے دھیمے سُر۔ درد کا ہلکا ہلکا احساس پیدا کرتے ہیں۔ بعض راگ دل میں جوش و خروش پیدا کرتے ہیں۔ بعض راگوں سے عشرت و نشاط کے نغمے نکلتے ہیں۔ "دیپک" کا عنصرِ امتیازی سوز و گداز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی ماہر گویا اس راگ کو ادا کرے تو جل کر مر جائے۔ میں نے دیپک کسی سے نہیں سُنا۔ لیکن اُس کی ایک آدھ راگنی ضرور سُنی ہے۔ بال گندھرکی "دھنس باندھ لیو نا سکتے ہیں رام چندر" جو تلنگ کا مود میں گائی گئی ہے۔ دل میں ایک ایسی موجِ اضطراب پیدا کرتی ہے۔ جسے تقریباً روحانی کونت کہا جا سکتا ہے۔ غالب بھی اس شعر میں کسی ایسے مغنی کو ڈھونڈتا ہے۔ جس کا راگ اُس کی رُوح کو درد کے اثرات سے لبریز کر دے۔ تاکہ شاعر کاہشِ واندوہِ حیات سے چھوٹ جائے۔ اور ایک طوفانِ نغمہ میں دنیا سے رخصت ہو۔ یہ شعر شاعرانہ موت کی آرزو کا اظہار کرتا ہے۔ غالب نگار خانۂ حیات سے اس طرح رخصت ہونا چاہتا ہے کہ راگ کے شعلے اُس کی روح کو تحلیل کئے دیتے ہوں۔ "ڈھونڈھے ہے" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ مغنیٔ آتش نفس جس کی صدا میں شعلے لرز رہے ہوں آسانی سے نہیں ملتا۔ "آتش نفس" مغنی کے اضطراب والتہاب؛ اس کے سانس کی تابش کام و دہن کی سوزش۔ اور نغمے کی حدت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

"صدا" کو "جلوۂ برقِ فنا" سمجھنا غالب کی خصوصیاتِ شاعری میں سے ہے۔ بوڈلیر کا قول ہے کہ شاعرانہ کیفیات میں ایک درجہ ایسا آتا ہے جب اختلالِ حواس واقع ہو جاتا ہے۔ آنکھیں پردۂ ابد تک دیکھنے لگتی ہیں۔ اُسوقت نگ شاعر کے لئے نغمے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور نغمے رنگین صورتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی کیفیت میں غالب نے یہ شعر کہا ہے۔ ؎

نشہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب
سرِ و سبزِ شیشۂ مے جو بُبارِ نغمہ ہے!

"مغنیٔ آتش نفس" کی تلاش میں اسی کیفیت سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مغنیٔ آتش نفس ایسا ہو کہ اُس کی صدا۔ اُس کے نغموں کی لرزش، اُس کے ترنم کا گداز "برقِ فنا" کی صورت اختیار کرے۔ اور "برقِ فنا" اُس کی ہستی کو جلا کر خاک کر دے یعنی نغمے صرف صورت ہی اختیار نہ کریں بلکہ ایک خاص نور بیں اور شعلہ آفریں صورت اختیار کریں۔

اڈیٹر

محوِ خیال

رفتۂ خواب

جگت جیت برڈوڈ انجینئرنگ کالج امرتسر
یہ کالج بارہ برس سے جاری ہے۔ سینکڑوں پاس شدہ طلباء ہر ایک انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہیں۔ گورنمنٹ کے
بہت سے حکام اور ہر محکمہ کے انجینئروں نے یہاں کی تعلیم۔ ضبط نظم و نسق۔ سامان اور سٹاف کی تعریف فرما کر طلباء کو گورنمنٹ کی
ملازمت کے لئے نہایت عمدہ قرار دیا ہے۔ سب اوورسیر۔ اوورسیر کلاس کے علاوہ مئی ۲۸ء سے ہم نے بجلی کی کلاسز بھی کھول دی ہیں
جن کے لئے انجن اور بجلی پیدا کرنے کی مشین ہزارہا روپے کی منگائی ہیں۔ سٹی اینڈ گلڈس لنڈن کے امتحان فسٹ گریڈ
کے لئے بھی طلباء کو تیار کیا جاتا ہے۔ الیکٹریشن اور الیکٹریکل مستری کلاسز میں اس وقت تک ڈیڑھ سو طلباء داخل ہو چکے ہیں۔ کالج ایک
مینیجنگ کمیٹی کے زیر نگرانی نہایت عمدگی سے چل رہا ہے۔ اس کی نمایاں ترقی سے خوش ہو کر ہز ہائی نس مہاراجہ صاحب بہادر معہ القاب
کپورتھلہ و ہز ایکسیلنسی کمانڈر انچیف افواج ہندوستان نے بھی اپنے اسمائے گرامی سے ممنون فرما کر اس کی سرپرستی
فرمائی ہے۔
غرضیکہ یہ کالج اپنی خوبیوں کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ کالج کی روز افزوں ترقی کا اندازہ اس کے
ملازم شدہ طلباء کی فہرست اور حکام کے سرٹیفکیٹوں سے بھی ہو سکتا ہے۔ جو پراسپیکٹس کے ساتھ مفت بھیجے جاتے
ہیں۔
المشتہر
سید احمد حسن مینیجنگ ڈائرکٹر
پنجاب کے دارالسلطنت لاہور
میں لکھائی چھپائی کیلئے اگر بہترین عمدہ سستا کاغذ حاصل کرنا ہو تو لاہور
کی مشہور و معروف دوکان میسرز متھراداس چھٹن لال سوداگران کاغذ
براندرتھ روڈ لاہور کے ہاں تشریف لائیں رسالہ ادبی دنیا کا کاغذ ہمیشہ
ہماری دوکان ہی سے جاتا ہے اور نمبر ہذا کا کاغذ بھی ہماری ہی دوکان کا
ہے چیز بہترین، قیمت واجبی۔ لہذا جب بھی آپکو کسی قسم کے کاغذ کی
ضرورت ہو طلب فرمائیں۔ آپ ہمیشہ مطمئن رہیں گے۔
خادم ملت میسرز متھراداس چھٹن لال سوداگران کاغذ
براندرتھ روڈ۔ لاہور پنجاب

دُنیائے ادب

آمد و آورد

ادبی دنیا میں آمد و آورد کے الفاظ نہایت فریب دہ ہیں۔ نا واقفوں نے آمد کا مفہوم یہ سمجھ لیا ہے کہ ادھر شاعر نے ہاتھ میں قلم پکڑا اُدھر سرچشمۂ غیب سے مضمون اور معنی کا سیلاب اُس کے دماغ میں اُمنڈنے لگا۔ اور وہاں سے صفحاتِ قرطاس پر پھیل گیا۔ یہ محض طفلانہ خیال ہے۔ اگر کوئی شاعر بغیر کدوکاوش کے شعر پر شعر کہے جاوے تو اُس کی حیثیت قافیہ پیمائی اور تُک بندی سے بڑھ کر نہ ہوگی۔ ایسے کلام کا شمار ادبِ عالیہ میں نہیں ہو سکتا۔ اور نہ وہ زندہ رہنے کی چیز ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات جبکہ شاعر کی طبیعت جوش پر ہو دو چار اعلیٰ درجے کے برجستہ شعر نکل آئیں لیکن اِن کی حقیقت دریا میں قطرہ کے سی ہے۔ بالعموم اسی کلام کو زندگیِ جاوید حاصل ہوتی ہے۔ جو کسی بڑے شاعر کی جگر کاوی کا نتیجہ ہو۔ اساتذۂ سخن کی بھی تمام ادبی پیداواروں کو یکساں قبولِ عام کی سند حاصل نہیں ہوتی۔ ان کا وہی شجرِ کلام سرسبز و شاداب ہو کر بارآور ہوتا ہے جسے اُنھوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ شیکسپیر کو ہملٹ (جہاں گیر) اتھیلو (جعفر) اور "وینس کے سوداگر" کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہ کمیڈی آف ایررس (بھول بھلیاں) مڈسمر نائٹ ڈریم (جامِ اُلفت) اور ونٹرس ٹیل (مریدِ شک) کو میسّر نہیں۔ اسپینسر کے "پرمتولین" کو جو اعلیٰ رتبہ ملا وہ "ملکہ پری" کے دوسرے قصوں کو نصیب نہیں ہے۔ شیلی کی نظم "شبابِ مغرب" کی فرحت بخشی "بغاوتِ اسلام" کی اندوہناکی کی ضد ہے براوننگ کی نظم "رنگ اینڈ دی بک" میں جو اثر و دلکشی موجود ہے اس سے "تسارڈیلو" کے صفحات خالی ہیں۔ کولرج کے "قدیم ملاح" سے ہر شخص محظوظ ہوتا ہے۔ لیکن اُس کے مذہبی خیالات کی خشکی سب کو بیزار کر دیتی ہے۔ جانسن کا "تذکرہ شعرا" بیسیوں بار زیورِ طبع سے مزین ہوا۔ لیکن "ریسیلاس" کا نام صرف کتابوں کی فہرست میں پایا جاتا ہے۔

میر تقی میر کی غزلوں میں بہتر نشتر پوشیدہ ہیں۔ لیکن اجگرنامہ شکارنامہ ساقی نامہ وغیرہ صرف ان کی بزرگی کی یادگار ہیں۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان نے سب کے دلوں کو مسحور کر لیا۔ لیکن ان کی غزلوں کا جادو کسی پر نہ چل سکا سودا کے قصائد کی ایک عالم میں دھوم ہے۔ لیکن اُن کی جو بیسیوں مثنویاں ہجو یا ہزل کی پست سطح سے کبھی نہ اُبھریں۔ میر انیس آسمانِ مرثیہ پر آفتاب بنکے چمکے لیکن ان کی غزلوں میں ستاروں کی سی ٹمٹماہٹ بھی نہیں پائی جاتی تھی، اسی لئے وہ ناپید بھی ہوگئیں۔ داغ جب تک ماسپود میں رہے بڑے بڑے شاعروں سے معرکہ رہا۔ مقابلہ و مسابقت کے جوش میں زمینِ شعر پر خونِ جگر سے لالہ کاریاں کیں۔ داغہائے دل کی بہاریں دکھائیں، اور نہایت سرسبز و شاداب "گلزار" تیار کیا۔ حیدرآباد آئے تو یہاں کی امیرانہ زندگی نے انھیں عیش پرست و سہل انگار بنا دیا۔ چنانچہ اس دور میں اُنھوں نے کئی چمن لگائے لیکن کوئی بھی "گلزار" کی شادابی کو نہ پہونچ سکا۔ شوقِ معنی آفرینی کی برکانی حدت نے غالب کے دل و جگر کو سیلِ آتش بنا دیا تھا۔ اس لئے ان کے ہر شعر میں بجلی کی سی گرمی تیزی۔ چمک اور تڑپ پائی جاتی ہے۔ امیر مینائی کا شعر ہے ؎

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

وہ اپنی قادر الکلامی اور فنی مہارت کی مدد سے ضخیم دواوین مرتب کرتے ہیں لیکن رنگ پھیکا رہتا ہے۔ کیونکہ ان میں خونِ جگر کی آمیزش نہیں ہے گو ہر انتخاب اور جو ہر انتخاب میں وہ میر اور درد کا رنگ بھرنا چاہتے ہیں مگر کٹھن ہے۔ ایک ایک مصرعہ کی تیاری میں ان کے بدن کا سیروں لہو خشک ہوتا ہے۔ اس لئے بہرو انتخابات میں اکثر موتی کی لڑیاں نظر آتی ہیں۔ الغرض ہر شاعر کا وہی کلام زندہ رہتا ہے جو کدوکاوش کے بعد سرانجام پائے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی خیال یا جذبہ شاعر کے دل و دماغ میں فوراً پیدا ہو۔ لیکن مؤثر و دلپذیر پیرائے میں اسکا اظہار دشوار امر ہے شاعری میں "آمد" کوئی اہمیت نہیں رکھتی یہ محض ایک دل خوش کن لفظ ہے۔ بڑے سے بڑا شاعر بھی کوئی ایسا عظیم الشان کارنامہ پیش نہیں کر سکتا جسکی تکمیل کیلئے اُس نے خون پانی ایک نہ کیا ہو۔ جب شاعر اپنا جگر خون کرتا ہے تو لعل اُگلتا ہے۔ چنانچہ تمام شعراء کی جانب سے آتش فرماتے ہیں ؎ . . . .

یونانی

سکندر اور ہندی فلسفی

اپنے حملہ کے دوران میں سکندر نے دس ہندی فلسفی گرفتار کئے۔ جو سندھیوں کو اُس کے مقابلہ کے لئے اُکساتے تھے۔ یہ فلسفی دانائی اور حاضر جوابی میں عدیم النظیر تھے، سکندر نے اس بات کا امتحان کرنا چاہا۔ اور ہر ایک سے سوال کئے اور کہا کہ اگر جواب غلط ہوا تو قتل کردیئے جاؤ گے۔ پہلے ایک فلسفی سے پوچھا گیا کہ مُردوں کی تعداد زیادہ ہے یا زندوں کی۔ جواب ملا کہ زندہ انسانوں کی۔ کیونکہ مردوں کا شمار ہی کیا ہے۔ پھر حسبِ ذیل گفتگو ہوئی۔

سکندر۔ سب سے بڑے جانور کہاں پیدا ہوتے ہیں زمین پر یا سمندر میں۔

دوسرا فلسفی۔ زمین پر کیونکہ سمندر بھی زمین کا ایک حصّہ ہے،

سکندر۔ سب سے دانا جانور کون ہے۔

تیسرا فلسفی۔ جو کسی نے آج تک نہیں دیکھا۔

سکندر۔ تم نے سندھیوں کو کیا کہکر لڑائی کے لئے اُبھارا تھا

چوتھا فلسفی۔ صرف یہی کہ یا باعزت زندگی بسر کرو۔ یا مردوں کی طرح کٹ مرو۔

سکندر۔ دن بڑا ہے یا رات؟

پانچواں فلسفی۔ دن ہے۔ کم از کم ایک دن، جیسا سوال ویسا جواب

سکندر۔ انسان ہر دلعزیز کیسے ہو سکتا ہے۔

چھٹا فلسفی۔ طاقتور بنکر۔ لیکن لوگوں کو مرعوب نہیں کرنا چاہیئے۔

سکندر۔ انسان دیوتا کیسے بن سکتا ہے،

ساتواں فلسفی۔ دیوتا بننے کے لئے وہ کام کرنا چاہیئے جو انسانوں کے لئے ناممکن ہے۔

سکندر۔ موت ہمہ گیر ہے یا زندگی۔

آٹھواں فلسفی۔ زندگی موت سے طاقتور ہے۔ کیونکہ یہ اپنے ساتھ لاکھوں حوادث و بلیّات لاتی ہے۔

ایک ہندوستانی فلسفی نے سکندر کو نظم و نسقِ مملکت کے لئے ایک نصیحت کی۔ اور وہ یہ تھی۔ ایک پُرشکن، خشک کھال کو زمین پر بچھایا۔ اور اُس کے کناروں کو روندا۔ جب کھال کے ایک کنارے پر دباؤ پڑتا تو یہ دوسری جگہوں سے اُبھرتی آخرکار اس نے اپنا پاؤں عین درمیان میں دھرا۔ اور کھال زمین کے ساتھ ہموار ہو گئی۔ اس تمثیل سے اس نکتہ کی طرف اشارہ تھا کہ بادشاہ کو سلطنت کے عین وسط میں سرحدوں سے زیادہ وقت صرف کرنا چاہیئے۔

(پلوٹارک)

فرانسیسی

زندگی

زندگی ایک آزمائش ہے — ہمارے علما ہمیں رات دن یہی سناتے رہتے ہیں۔ میں نہیں جانتا۔ لیکن کم از کم یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم اس مقولے کو تسلیم نہیں کرسکتے۔ زندگی اُن بچّوں کے لئے کیسے آزمائش ہو سکتی ہے جو پیدا ہوتے ہی مرجاتے ہیں۔ یا ان فاترالعقلوں کے لئے جن کے دماغ جواب دے چکے ہیں۔ کیا خوب! ان اعتراضات کا جواب کئی دفعہ دیا جا چکا ہے۔ بجا۔ جواب تو ہے لیکن برہانِ قاطع نہیں، دُنیا امتحان کے کمرہ سے مشابہ نہیں، بلکہ کمہار کے گھر کی طرح ہے۔ جہاں ہر قسم کے برتن نامعلوم اغراض کے لئے

یونیورسل لمیٹڈ
انشورنس میں ایک نیا اضافہ
ٹیلیفون ۲۶۹
یہ فخر صرف یونیورسل پراویڈنٹ کمپنی لمیٹڈ کو ہی حاصل ہے کہ پانچ روپیہ فیس ادا کرنے پر آپ ہزاروں کے حقدار ہو سکتے ہیں
کمپنی کا ممبر بننے کیلئے صرف فیس داخلہ پانچ روپیہ بمعہ مجوزہ فارم درخواست بھیجدیجئے ہر ممبر کی وفات پر اس
کے وارثوں کو ہزاروں روپیہ ادا کئے جاتے ہیں اگر ممبر پندرہ سال زندہ رہے تو روپیہ اس کو ملجاتا ہے
مفصل حالات کیلئے فہرست قوانین اور فارم درخواست ذیل کے پتہ سے طلب کیجئے معتبر اور دیانتدار اور
بارسوخ ایجنٹوں کی ضرورت ہے "ادبی دنیا" کا حوالہ ضرور دیجئے
المشتہر
یونیورسل پراویڈنٹ فنڈ کمپنی لمیٹڈ امال روڈ لاہور
ہر گھر میں ایک طبی رسالہ کی ضرورت ہے
مشیر الاطبا
نمونہ مفت
ہندوستان کا بہترین مصور طبی رسالہ ہے
شباب کے اعادہ و بقا کی بہترین تدابیر کا مجموعہ
شباب کا راز
ضرور مطالعہ کیجئے
منیجر مشیر الاطبا
پنجاب
پامسٹ گائیڈ (بالتصویر)
مصنفہ آئی ڈی وا پامسٹ لاہور
نارورن انڈیا پامسٹ بیورو حلقہ نمبر ۳ لاہور
ٹیلیفون نمبر ۹۴

بنتے ہیں۔ بہت سے برتن بنتے بنتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور پھینک دیئے جاتے ہیں۔ استعمال ہونے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ دوسرے مضحکہ خیز اغراض کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ یہی ہمارا حال ہے،

وقت گذرتا جاتا ہے اور ہماری عزیز ترین خواہشات کا خون کرتا جاتا ہے۔ تعریف و توصیف کے خواب کو باطل کرتا ہے۔ عشق اور اس کی دلفریب لغزشوں کو جھلا دیتا ہے۔ ایمان اور اُمید کی بنیادوں کو کھوکھلا کرتا ہے۔ اور معصومیت کے پودے کو پیرہن برگ سے عریاں کرتا جاتا ہے۔ کم از کم اسے ہمارے لئے ہمدردی اور رحم چھوڑ دینا چاہئے ہمدردی انسانی خاصہ ہے۔ خدا نہ کرے کہ ہم پرانے دیوتاؤں کے دشمنوں کی طرح پتھر کے بن جائیں۔ ہمیں مصیبت زدہ لوگوں کی غمگساری کرنی چاہئے۔ کیونکہ وہ بلاؤں کا شکار ہو رہے ہیں خوش قسمت لوگوں سے بھی ہمدردی کرنی چاہئے۔ کیونکہ یہ لکھا ہے کہ جو لوگ بچتے ہیں۔ ان پر مصیبتیں آنے والی ہیں۔ (اناطول فرانس)

اطالوی

مسرّت

شاید دنیا میں کسی چیز کا اتنا ذکر نہیں ہوتا جتنا کامیاب زندگی کا مگر بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اسے صحیح طور پر جانتے ہیں۔ ہر شخص کا مدعا یہ ہے کہ مسرت حاصل کرے۔ لیکن ہزاروں میں سے کوئی یہ نہیں جانتا کہ مسرت کسے کہتے ہیں۔ ہم اندھا دُھند اس کی تلاش کرتے ہیں۔ اور جلد بازی کی وجہ سے بھٹکتے رہتے ہیں۔ اور منزلِ مقصود سے دور جا پڑتے ہیں۔ اسی لئے ہمیں یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ ہمارا منتہائے نظر کیا ہے۔ اگر ہم غلطی پر نہیں تو ہمیں روزانہ معلوم ہوتا جائیگا۔ کہ ہماری سعی کس حد تک مشکور ہوئی ہے۔ لیکن ہم گمراہ لوگوں کے ہاؤ ہو سے متاثر ہو کر اُن کے پیچھے چل پڑیں تو خاک چھانتے پھریں گے۔ ہمیں ایک رہبر کامل کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ سفر نرالا ہے۔ کسی دوسرے سفر میں شاہراہ منزل تک پہنچاتی ہے۔ یا اگر کوئی آدمی راستہ بھول جائے تو عوام اُسے ٹھیک راستہ بتا دیتے ہیں۔ لیکن برعکس اس کے اس سفر میں شاہراہ سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ اور لوگ بجائے رہبری کے قعر ذلت میں گرا دیتے ہیں۔ دنیا کی رسوم کو نہیں بلکہ عقلِ سلیم کو مشعلِ ہدایت سمجھنا چاہئے۔ ہم ایک شکست خوردہ فوج کی طرح ہیں۔ پہلے ایک سپاہی گرتا ہے۔ پھر دوسرا اُس پر گرتا ہے۔ پھر تیسرا دوسرے پر گرتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ حتیٰ کہ میدان زخمیوں سے پٹ جاتا ہے غضب یہ ہے کہ ہم دوسروں کی نقل سے تباہ ہوتے ہیں۔ نشاۂ زندگی کے سوال کا فیصلہ کثرت رائے سے نہیں ہو سکتا ہے مثلاً عالم ایسا نہیں کہ بہترین چیز سے زیادہ آدمی خوش ہوں، عوام فیصلہ نہیں کرتے بلکہ ہر مقولے کو سوچے سمجھے کے بغیر تسلیم کرتے چلے جاتے ہیں۔

دنیا ہی خوشی سے سرشار ہو جاتا ہے لیکن جب کبھی ایک آدمی ہوش میں آتا ہے تو اُسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ جو اُس نے کیا ہے نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔ جس چیز سے وہ ڈرتا تھا۔ حقیقت میں وہ ان تمام سے اچھی تھی۔ جن کے لئے اس نے دعائیں کیں۔

مسرّت وہ نہیں جو دیرپا نہ ہو۔ سکون دماغی توازن کو کہتے ہیں جس میں واقعات کی ندی کے اُتار چڑھاؤ سے کوئی فرق نہیں آتا۔ (سینکا)

جرمنی

بیداد و تغافل

اُنھوں سے شیریں نانک میں دم گرر کھا ہے۔ بعض نے دشمنی کی وجہ سے بعض نے دوست بنکر۔ اُنھوں نے میری شراب زندگی کو زہر آلود

کر دیا ہے۔ بعض نے دوست بنکر اور بعض نے کھلی مخالفت سے۔ مگر وہ جس کے ہاتھوں مجھے سب سے زیادہ تکلیف پہونچی ہے وہ ایسی ہے جس نے: مجھے چاہا ہے نہ مجھ سے نفرت کی ہے

(ہاسٹنے)

جاپانی

سات گیت

(۱)

آہ! شبنم میں چاہتا ہوں کہ زندگی کا گرد و غبار تجھ سے دھولوں

(۲)

سر راہ ایک شخص مسافروں کو دیکھنے کا مشتاق تھا۔ ایک گدھا آیا اور اسے کھا گیا۔

(۳)

اے پیاری چڑیا۔ اُن ننھی ننھی جانوں کو تنگ نہ کر۔ جو بیرے پھولوں میں دکھائی دے رہی ہیں۔

(۴)

ایک تالاب ویرانے میں بے حرکت نظر آتا ہے ....

کچھ عرصہ تک نہ کوئی آواز آتی ہے نہ پانی میں ہیجان برپا ہوتا ہے۔ یکایک ایک مینڈک اُس میں کود پڑتا ہے۔

(۵)

میدان جنگ میں شگفتہ پھول ہیں۔

یہی ہے جو بیس ہزار بہادروں کا نشان باقی رہ گیا ہے۔

(۶)

جو کبھی نوجوان تھے۔ آج بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ان کے بال سفید ہیں اور لاٹھیوں کا سہارا لئے قبروں کے پاس جھکے ہوئے ہیں

اے جھینگر! تیری مسرت ناک آواز سُنکر کسے خیال آسکتا ہے کہ تیری زندگی اتنی تھوڑی ہے۔

(باشو)

چینی

تنہائی

میں نے جھونپڑا آبادی میں بنایا۔ لیکن تیجے گھوڑوں اور گاڑیوں کی آواز سنائی نہیں دیتی۔

کیا تم سنو گے کہ یہ کیونکر ممکن ہے؟

جو شخص دنیا سے دل لگاتا ہے آبادیوں میں بھی صحرا پیدا کر لیتا ہے۔ میں پھول چنتا ہوں۔ یا دور کی پہاڑیوں پر نظر جما کر گزارتا ہوں

جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو کوہسار کی ہوا تازہ اور فرحت بخش ہوتی ہے۔ پرندوں کے جوڑے واپس آشیانوں میں آتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں معنی خیز ہیں۔ لیکن جب ہم انھیں لفاظ کا جامہ پہنانا چاہتے ہیں تو یکایک جواب دے دیتی ہیں۔

(تاؤ چاین)

انگریزی

مشین

تجھکو میں مدت سے جانتا ہوں۔ لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کی دیوانگی کس دن سے شروع ہوئی۔ آج دو ماہ ہوتے ہیں کہ

"میوو چائنا"

خط و کتابت دکان کے حسب ذیل پتہ پر کیجیے۔

المشتہر

یونیورسل ٹریڈنگ کمپنی ... لاہور

..ted & Published by Maulvi Abdulla Khan Sahib, Arshid, at the Mercantile Press & title printed at the Victoria Press, Lahore office of the Adabi Dunya, Kashmiri Buildings, McLoad Road, Lahore